اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

جلد نمبر ۵

(بوزنطیہ ...... پیاگ)

۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء

بارِ دوم: ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

ادارۂ تحریر

مجلسِ انتظامیہ

بار اول - فروری ۱۹۷۱ء

ناشر: سید شمشاد حیدر، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع: امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز) ناظم مطبع

مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

بار دوم: رجب المرجب ۱۴۲۵ھ ستمبر ۲۰۰۴ء

زیر نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف

اختصارات و رموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائکلوپیدیسی (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ا یا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F.Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: *Apendice a la adicion Codera de Tecmila*، در *Misc de estudios y textos arabes*، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل = ابن الابار = تکملۃ الصلہ، *Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera*، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ا یا ۲ یا ۳ یا ۴ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فانیان = *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ فانیان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, 11).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d` Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از C.Defremery و *B.R.sanguinetti*، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد.

ابن حوقل، کریمرز - وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (*BGA,II*، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (*BGA*, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر ......، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = *Prolegomenes d'Ebn Khaldoun*، طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (*Notices et lExtraits,XVI-XVII*).

ابن خلدون: روز نتھال = *The Muqaddimah*، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان *Les Prolegomensesd` Ibn Khaldun*، ترجمہ و حواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وسٹنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol
دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رستہ، ویت Les Atours precieux: Wiet، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) ولیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں).

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V).

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وستفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وستفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء وج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء.

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸/۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وستفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA, I) وبار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ بعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica.

ت ا = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/۱۹۱۱ تا ۱۳۵۱/۱۹۳۱ء.

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء.

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۰۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS,XI، سلسلہ جدید).

حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیوٰۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پرووِنسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء.

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۰ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبدالمعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ربیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبدربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع ملر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲ء۔

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ۔ش۔

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء۔

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔

فلٹن و لنگز: Martin Lings و Alexander S. Fulton: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء۔

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء۔

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء۔

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد، بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء۔

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ۔

م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl. Indica۔

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش۔

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ۔

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش۔

المسعودی: مروج = المسعودی: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء۔

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA, VIII)۔

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA, VIII)۔

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء۔

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء۔

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ۔

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء۔

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء ببعد۔

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء۔

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء۔

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴ء)۔

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*,VI)؛ معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء۔

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII)۔

یعقوبی، ویت = Wiet: *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء۔

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I. II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*. II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Nöldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=1.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher: Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding= Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed, Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatan Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of PersianArt = ed.by A.U.Pope, Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI, NIS=the same, New Imperial Series.

ASI, AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais J.' Arachcologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ea.

BSE[2]=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI[1]=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI[2]=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.
MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.
MTM=Mili Taebbuler medjmuast.
MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.
MW=The Muslim World.
NC=Numismatic Chronicle.
NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.
OA=Orientalisches Archiv.
OC=Oriens Christianus.
OCM=Oriental College Magazine, Lahore.
OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore
OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.
OM=Oriente Moderno.
Or.=Oriens.
PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.
PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.
Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.
PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.
QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.
RAfr.=Revue Africaine.
RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.
REI=Revue des Etudes Islamiques.
REJ=Revue des Etudes Juives.
Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.
RHR=Revue de l' Histoire des Religions.
RI=Revue Indigene.
RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.
RMM=Revue du Monde Musulman.
RO=Rocznik Orientalistyczny.
ROC=Revue de !' Orient Chretien.
ROL=Revue de l' Orient Latin.
RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.
RSO=Rivista degli Studi Orientali.
RT=Revue Tunistenne.
SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.
SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.
SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.
SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.
SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.
SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).
SI=Studai Islamica.
SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).
Stud. Isl.= Studia Islamica.
S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).
SYB=The Statesman's Year Book.
TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.
TD=Tarih Dergisi.
TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).
TM=Turkiyat Mecmuasi
TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.
TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.
Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI,NS=the same, New Series.

Wiss.Veroff.DOG=Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

*مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد = f.,ff.,sq.,sqq.

بذیل مادّہ (یا کلمہ) = s. v.

دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے = see; s.

رکّ بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے = q.v.

بمواضع کثیرہ = passim.

کتاب مذکور = op.cit.

دیکھیے لغوی مفہوم (قارِب یا قابِل) = cf.

ق۔م (قبل مسیح) = B.C.

م (متوفی) = d.

محل مذکور = loc. cit.

کتاب مذکور = ibid.

وہی مصنف = idem.

ھ (سنہ ہجری) = A.H.

ء (سنہ عیسوی) = A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a

کسرہ (ـِ) = i

ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل: aj kal)

ی = ī (سیم: Sim)

و = ū (ہارون الرشید: Hārūn al-Rashid)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ـٖ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ـُ = ü کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (ترکیہ: Turkiya)

ـٗ = ō کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول: kōl)

ـٰ = ā کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اَرْجَب: arādjāb؛ رَجَب: radjab)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بسمل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

حرف			حرف			حرف			حرف		
ب	=	b	ح	=	ḫ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	Kh	ش	=	sh، ch	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	l
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t	ذ	=	ḋ	ط	=	ṭ	م	=	m
تھ	=	th	ڈ	=	dط	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ڈھ	=	dh	ع	=	ʿ	ن	=	n
ٹھ	=	ṭh	ر	=	r	غ	=	gh	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	ʾ
چ	=	č	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	ch	ژ	=	ž, zh						

متبادل اردو عربی حروف

g	=	گ	s	=	س	ḥ	=	ح	b	=	ب
gh	=	گھ	sh، ch	=	ش	Kh	=	خ	bh	=	بھ
l	=	ل	ṣ	=	ص	d	=	د	p	=	پ
lh	=	لھ	ḍ	=	ض	dh	=	دھ	ph	=	پھ
m	=	م	ṭ	=	ط	d̄	=	ذ	t	=	ت
mh	=	مھ	ẓ	=	ظ	dط	=	ڈ	th	=	تھ
n	=	ن	ʿ	=	ع	dh	=	ڈھ	t	=	ٹ
nh	=	نھ	gh	=	غ	r	=	ر	ṭh	=	ٹھ
w	=	و	f	=	ف	rh	=	رھ	th	=	ث
h	=	ہ	ḳ	=	ق	ṛ	=	ڑ	dj	=	ج
ʾ	=	ء	k	=	ک	ṛh	=	ڑھ	djh	=	جھ
y	=	ی	kh	=	کھ	z	=	ز	č	=	چ
						ž, zh	=	ژ	ch	=	چھ

* بوزنطیہ: یا روماے نو (جسے مسلمان رُوم کہتے ہیں) غیر عیسائی رومیوں کی سلطنت اور شہر روما (اطالیہ) کا مسیحی جانشین یورپ کی سیاسی اور ثقافتی روایات کا ۳۲۴ سے ۱۴۵۳ء تک پشت و پناہ تھا۔ اس کے پاے تخت قسطنطینیہ (زمانۂ حاضر کے استانبول) کی بنیاد قسطنطینوس (Constantine) اعظم نے دو وجہوں سے رکھی تھی: ایک تو یہ کہ قدیم روما کی غیر مسیحی اور جمہوری اور دورِ متأخر کی نیم پارلیمانی اور شاہی روایت سے قطع روابط کیا جائے، دوسرے یہ کہ سب سے زیادہ مخدوش سرحدوں کے نزدیک ایک محفوظ تر پاے تخت کی ضرورت بنی تھی۔

ارتقا کی درمیانی منزلیں: رومیؔ قلمرو پہلے شہنشاہ اغسطس Augustas (۲۷ ق م تا ۱۴ء) ھی کے ماتحت بوزنطی سلطنت کے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گئی تھی، یعنی ملوکیت کا آغاز ہو چکا تھا گو ابھی پارلیمانی شکل و صورت کا بھیس باقی تھا۔ ٹرایانوس Traianus (۹۸ تا ۱۱۷ء): پہلا غیر اطالوی شہنشاہ، ھدریانوس Hadrianus (۱۱۷ تا ۱۳۸ء): یونانی اور مشرقی ولایات کے ساتھ مساوی سلوک۔ مشرقی عقائد مذھبی کا سرکاری طور پر اعتراف؛ مشرقی فن کے رجحانات گنبد اور طاق کی ترویج کا آغاز۔ انطونیوس Antonius Pius (۱۳۸ تا ۱۶۱ء): فلاحِ عوام پر مبنی سلطنت سے استبدادیت کی طرف انتقال؛ قومدوس Commodus (۱۸۰ تا ۱۹۲ء): مشرقی عقائد دینی کا غلبہ؛ سپتیمیوس سیوروس Septimius Severus (۱۹۳ تا ۲۱۱ء)، کاراکلا Caracalla (۲۱۲ تا ۲۱۷ء)، الاگبال Elagabal (۲۱۸ تا ۲۲۲ء)، سیوروس الاسکندر Severus Alexander (۲۲۲ تا ۲۳۵ء)؛ فلپوس عربس Philippus Arabus (۲۴۴ تا ۲۴۹ء): مشرقی نسلوں کے شہنشاہ، پہلے بربری، پھر شامی اور آخر میں شرق اردن کا ایک بدوی۔ کاراکلا کے ماتحت مقتدر رومی شہریوں اور رومی رعایا کے درمیان امتیازات کا خاتمہ ہو گیا، الاگبال کے عہد میں شام کے سورج دیوتا اور شمالی افریقہ کی چندر دیوی کی پوجا روما کے اہم سرکاری عقائد دینی میں شمار ہونے لگی۔ شامی صوبے اور غسّانیوں کی سرحدی عرب ریاست روز بروز خوش حال ہوتی گئی۔ اوریلیانوس Aurelianus (۲۷۰ تا ۲۷۵ء): ایرانی دیوتا متھراس Mithras (آفتاب غیر مغلوب) کی پوجا سرکاری طور پر دینی عقیدہ بن گیا اور شہنشاہ ھی کو یہ دیوتا سمجھا جانے لگا۔ تدمر (Palmyra) کے عربوں نے ملکہ زنوبیہ Zenobia کے ماتحت ایشیائی صوبوں میں ایک مشرقی سلطنت قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی (۲۶۷ تا ۲۷۳ء) اسے آخر کار اوریلیانوس Aurelianus نے کچل دیا۔ اب فوجیں زیادہ تر سرحد کے بربری باشندوں میں سے بھرتی کی جانے لگیں۔ دیوقلیسیانوس Diocletianus (۲۸۴ تا ۳۰۵ء)، شہنشاہوں (Augusti) اور ولی عہدوں (Caesers) کے ماتحت قلمرو کی باقاعدہ تنظیم کی گئی تا کہ شعوب توتونیہ (Teutons) (جنھیں وسط ایشیا کے طوائف ھنوں Huns نے مغرب کی طرف دھکیل دیا تھا) اور قوم پرست ساسانی خاندان (۲۲۶ تا ۶۳۶ / ۶۴۲ء) کے ماتحت ایرانیوں کے مسلسل حملوں سے ملک کا دفاع بوجہ احسن کیا جا سکے۔ درباری رسوم و آداب اور نظمِ حکومت کے اوضاع قدیم مشرق کے اسلوب پر مرتب کیے گئے۔ مسیحیوں پر ظالمانہ تشدّد کیا گیا جو عام طور پر ناکام رہا۔

مسیحی رومی سلطنت: مدت کی مسلسل خانہ جنگیوں (۳۰۸ تا ۳۲۴ء) کے بعد قُسطنطین الاوّل الکبیر لیکینیوس Licinius کی شرکت میں (۳۱۲ء) اور پھر بلا شرکت غیرے (۳۲۴ تا ۳۳۷ء) شہنشاہ بن گیا۔ ۳۱۳ء میں میلان Milan کا

فرمان صادر ہوا، جس کی رو سے مسیحیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۳۲۵ء میں نیقیا (Nicaea) کی کونسل نے مسیحی اعتقادنامہ مرتب کیا۔ مرتد یولیانوس Julian (۳۶۱ تا ۳۶۳ء) نے قدیم‌تر مذہب کو اصلاح کردہ شکل میں دوبارہ زندہ کیا۔ تھیوڈوسیوس Theodosius (الاول الکبیر) (۳۷۹ تا ۳۹۵ء) نے ۳۸۰ء میں مسیحیت کو سلطنت کے واحد مذہب کی حیثیت دے دی، اور ۳۹۲ء کے فرمان سے بت پرستی کی سختی سے بیخ کنی کر دی۔

۳۲۴ء میں قسطنطین نے قدیم یونانی شہر بوزنطیہ (Byzantium) کے محلِ وقوع پر ایک نیا پایۂ تخت قُسْطنطینیہ کے نام سے تعمیر کیا، جس میں ایک اعلٰی درجے کی قدرتی بندرگاہ "شاخ زرین" (Golden Horn) تھی۔ یہ مقام ایشیا اور یورپ کی بڑی سڑکوں اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے بحری راستوں کے نقطۂ تقاطع پر واقع تھا۔ خشکی کی طرف سے اس کی حفاظت آسان تھی، کیونکہ یہ ایک جزیرہ‌نما پر تعمیر کیا گیا تھا اور سمندر کی طرف سے شمال میں آبنائے باسفورس Bosphorus اور جنوب میں بحیرۂ مرمرہ Marmora اور حلّس پنطس Hellespontus (درِ دانیال) کی آبناؤں نے اسے محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کی اندرونی فصیلیں قُسْطنطین نے تعمیر کیں اور ۴۱۳ء میں تھیوڈوسیوس ثانی (۴۰۸ تا ۴۵۰ء) نے اس کی بیرونی سہ گونہ شہر پناہیں تیار کیں۔ انھیں استحکامات کی وجہ سے اس عظیم‌الشان شہر نے صدیوں تک بہت سے محاصروں کا مقابلہ کیا، اور اسی لیے وہ ایک ایسا مرکز بنا رہا جہاں سے رومی سلطنت ہمیشہ اپنے چھنے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی رہی۔ بندرگاہ کی تجارت خوب پھلی پھولی تھی اور صنعتوں نے بے حد ترقی کی تھی، جن کی وجہ سے اعلٰی درجے کی اشیائے تعیش آس پاس کے ملکوں میں بھیجی جاتی تھیں اور ہر طرف سے دولت و ثروت کھنچی چلی آتی تھی۔ اس مال و دولت کی وجہ سے ایک اعلٰی درجے کی مسلّح فوج رکھی جا سکتی تھی، جسے بربری قوموں کے بے شمار مستاجر عسکریوں کی امداد بھی حاصل تھی: خطرناک دشمنوں کو روپیہ دے کر لوٹایا جا سکتا یا اپنے ساتھ ملایا جا سکتا تھا اور غیر مہذب وحشی قوموں کو بہت غور و فکر سے ایجاد کردہ درباری رسوم کے جاہ و جلال سے مرعوب کیا جا سکتا تھا۔ تعلیم کا معیار اعلٰی تھا، جس کی وجہ سے صرف قدیم یونانی اور رومی فن اور ادب ہی کا احیا نہ ہو رہا تھا بلکہ علمی فن حرب کی بنیادیں بھی مضبوط کی جا رہی تھیں۔ اعلٰی درجے کی ترقی‌یافتہ فوجی انجینئرنگ (مثلاً آتش یونانی جسے کلینیکوس Kallinikos نے ایجاد کیا تھا اور جو آج کل کے آتش پاش (flame-thrower) کی ابتدائی صورت تھی)، نفسیاتی اسلوب جنگ اور دقیق سیاست بھی رو بہ ترقی تھی۔ ان تمام کامیابیوں کی بدولت بوزنطی بڑی بڑی آفات کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے تھے اور نہایت ناموافق حالات سے بچ نکلتے تھے، لیکن اس کے باوجود ایک مسلسل (گو سست رفتار) انحطاط ناگزیر ثابت ہوا، کیونکہ بربروں کے حملوں سے صوبوں کی حالت کبھی پوری طرح درست نہ ہوئی۔ ان کے یونانی آبادکاروں کی جگہ مشرقی آبادیاں (شمالی افریقہ، مصر اور شام کی) یا (ایشیائے کوچک، بلقان، اطالیہ اور ہسپانیہ کے) نئے بربری مہاجر غالب آتے گئے اور جب ۱۲۰۴ء میں چوتھی صلیبی جنگ کے یورپی سورماؤں نے مکّاری سے قسطنطینیہ پر قبضہ کر لیا تو بوزنطی قلمرو کی کمر ٹوٹ گئی۔

مغربی قلمرو کا ہاتھ سے جاتے رہنا: قسطنطینی، تھیوڈوسیوسی اور یوسطینانوسی خاندانوں (حدود ۳۲۴ تا ۶۱۰ء) کے ماتحت رومی قلمرو کا مغربی

نصف حصہ ہاتھ سے جاتا رہا ۔ قسطنطین کے پوتے یولیانوس کی موت (۳۶۳ء) کے بعد قلمرو دوبارہ تقسیم ہو چکی تھی (مشرق میں یوبانوس Jovianus اور والنس Valens اور مغرب میں ویلنتینیانوس Valentinianus اول، گراتیانوس Gratianus اور ویلنتینیانوس دوم) ۔ تھیوڈوسیوس اول کبیر (۳۷۹ - ۳۹۵ء) نے اپنی حکومت کے آخری برسوں میں قلمرو کو ازسرِ نو متحد کیا، لیکن اس کی وفات کے بعد وہ ایک بار پھر تقسیم ہو گئی ۔ اس کا بیٹا آرقادیوس Arcadius قسطنطینیہ پر حکمران ہوا، اس کے بعد تھیوڈوسیوس دوم، مرقیانوس Marcianus، لیو اوّل، زینون Zenon، انسطاسیوس Anastasius اول اس کے جانشین ہوئے ۔ اس کا دوسرا بیٹا انوریوس Honorious راونّہ Ravenna میں تخت نشین ہوا، (۴۰۰ء سے پو Po کی دلدلوں کی وجہ سے محفوظ)، اور اس کا جانشین ویلنتینیانوس سوم ہوا، جس کے بعد مغربی قلمرو پارہ پارہ ہو گئی ۔ ایشیا میں ایرانیوں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جنگیں ہوتی رہیں، جن کے دوران میں ارمینیہ نے، جو سابقًا سلطنت پارتھیا Parthia کی ایک ولایت تھا، عیسائیت قبول کر لی اور ۳۸۷ء میں بوزنطیہ کی سیادت تسلیم کر لی ۔ لیکن حقیقی مسئلہ یہ تھا کہ شمالی سرحد کو مختلف توتونی قبائل اور وسط ایشیائی ہُن قبیلوں نے آتّیلا Attila (۴۳۴ تا ۴۵۳ء) کی زیر قیادت پامال کر دیا تھا ۔ جب قدیم رومی فوج کے پیشہ ور فوجی دستوں (legions) کو قوطیوں (Goths) کے ساز و سامان سے لیس گھڑ سواروں نے ادرنہ (۳۷۸ء) کے مقام پر شکست فاش دے دی تو اس کے بعد شہنشاہ اپنی قلمرو کا دفاع صرف ہُنوں، قوطیوں اور دوسرے جرمن مستاجر سپاہیوں ہی کی مدد سے کر سکتے تھے ۔ چونکہ یہ نئے آبادکار بغایت ناقابلِ اعتماد تھے لہٰذا قلمرو کا شمالی حصہ بالکل تاخت و تاراج ہو گیا ۔ آرکادیوس (۳۹۵ تا ۴۰۸ء) کے ماتحت قوطی مستاجر سپاہیوں نے قسطنطینیہ پر تقریبًا قبضہ ہی کر لیا تھا ۔ اس طرح قسطنطینیہ کے شہنشاہوں نے بربر قبیلوں کو شہر کے بجائے مغربی رومی قلمرو پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور راونّہ Ravenna کے شہنشاہوں نے انہیں اطالیہ کے جنوبی اور مغربی صوبوں کی طرف پیش قدمی کرنے پر آمادہ کیا ۔ ان تمام صوبوں کے کھو بیٹھنے کو کچھ مدت تک یوں چھپانے کی کوشش کی گئی کہ ان حملہ آور قبائل کے سرداروں کو بڑے بڑے رومی خطابات و اعزازات دے دیے گئے ۔ اس طریقے سے (۴۰۰ء کے قریب) ڈینیوب کے صوبوں گال Gaul، برطانیہ، ہسپانیہ اور (۴۲۹ء میں) شمالی افریقہ پر قوطوں، فرانکوں، برغندیوں Burgundians اور وندالوں Vandals نے قبضہ کر لیا ۔ ۴۵۱ء میں قطلونیہ Catalaunia کے میدانوں (موجودہ فرانس) میں ایک بہت بڑی جنگ ہوئی، جس میں ان نئے آباد کاروں کی امداد سے ہُنوں کو شکست فاش دے دی گئی، مگر تھوڑی ہی مدت بعد توتونی قبائل نے بھی رومی سیادت کی ظاہری علامات کو بھی خیرباد کہہ کر اطالیہ پر حملہ کر دیا، لیکن روما اور راونّہ دونوں کا دفاع ان وحشی قبائل نے کیا جو رومیوں کی حمایت پر آمادہ کر لیے گئے تھے ۔ مغربی رومی قلمرو کے حکمران سٹیلیخو Stilicho، ایتییوس Aetius، ریکیمر Ricimer اور اودواکار Odovakar جیسے توتونی تھے ۔ روما کو الاریخ Alarich نے ۴۱۰ء میں اور گایزریخ نے ۴۵۵ء میں تاخت و تاراج کیا ۔ ۴۷۶ء میں اودواکار مغربی رومی سلطنت کے آخری شہنشاہ کو تخت و تاج سے معزول کر کے خود اطالیہ کا بادشاہ بن بیٹھا ۔ ۴۹۳ء میں مشرقی قوطی سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ مشرقی رومی

شہنشاہ یوسطینیانوس Justinianus اول (۵۲۷ تا ۵۶۵ء) نے مغربی رومی صوبوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی آخری کوشش کی (شمال افریقہ ۵۳۳ تا ۵۴۸ء، اطالیہ ۵۳۵ تا ۵۵۴ء، ہسپانیہ ۵۵۰ء)، لیکن ان جنگوں نے سلطنت کو، جس کی آبادی وبائی امراض سے پہلے ہی کم ہو چکی تھی، بالکل ہی درماندہ کر دیا ۔ ہسپانیہ پر مغربی قوطوں (۵۸۵ء) نے قبضہ کر لیا، اطالیہ پر لومبارد (Lombards) قابض ہو گئے (۵۶۸ء)، شمالی افریقہ بربروں کے حصے میں آیا، بلقان کے ملکوں پر صقالبہ (Slavs) کا عمل دخل ہو گیا اور ترکی اوار (Avars) نے قسطنطینیہ تک کو خطرے میں ڈال دیا۔

ایشیا مسلمانوں کے قبضے میں: اب تک ایرانیوں کے ساتھ جو تصادم ہوتا رہا تھا اس کی شدت اس وجہ سے کم ہو گئی تھی کہ قلمرو ساسانیہ پر بھی وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبائل خصوصاً سفید ہن (White Huns) حملہ آور ہو گئے تھے، لیکن ۵۰۳ء میں آخر الذکر لوگوں کو ہندوستان میں شکست فاش ہوئی اور ۵۴۲ء میں ایرانیوں اور ترکوں کی متحدہ فوجوں نے انھیں بالکل ہی پامال کر دیا ۔ اس واقعے سے جو اطمینان کی صورت پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر خسرو انوشیروان (۵۳۱ تا ۵۷۹ء) نے شام، ارمینیہ اور قفقازی صوبوں کو تاخت و تاراج کر دیا، مگر ایک گرانقدر خراج دے کر اس سے پیچھا چھڑایا گیا (۵۶۲ء)۔ تاہم ایرانیوں نے خسرو ثانی (۵۹۰ تا ۶۲۹ء) کے عہد میں ۶۰۵ ۔ ۶۰۹ء میں اور پھر ۶۱۰ تا ۶۳۰ء میں از سرِ نو حملے کیے ۔ ارمینیہ، شام، فلسطین، مصر بلکہ بحیرۂ مرمرہ تک ایشیاے کوچک بھی ہاتھ سے نکل گئے اور یروشلم اور مسیحیوں کے مقدس ترین تبرکات بھی ایرانیوں کے ہاتھ آئے، مگر ہرقل Heraclius (۶۱۰ تا ۶۴۱ء) نے زیرکی سے عین ایران کے قلب میں حملے کر کے ایرانیوں کو شکست دے دی ۔ خسرو دوم قتل کر دیا گیا اور سلطنت ساسانی پارہ پارہ ہو گئی، لیکن بوزنطیہ پر بھی آوار نے عقب سے حملہ کر دیا (۶۲۶ء) ۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تفاسیر قرآن بذیل آیت غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ [الروم] : ۱)]۔

. . .[عہد اسلامی میں] ساسانی قلمرو تو اسی دن پاش پاش ہو گئی جب اس کا آخری طاقتور سپہ سالار رستم (جو نو عمر یزدگرد سوم کا نائب السلطنت تھا) جنگ قادسیّہ (۶۳۶ء) میں شکست کھا کر مقتول ہوا اور بوزنطیہ کے ہاتھ سے شرق اردن کا شہر بُصْریٰ (۶۳۴ء) اور دمشق (۶۳۵ء) بھی نکل گئے ۔ جنگ یرموک میں ان کی شکست (۶۳۶ء) کے بعد پورا شام، بیت المقدس (۶۳۷ تا ۶۳۸ء) اور مصر و اسکندریہ (۶۴۱ تا ۶۴۲ء) رومیوں کے ہاتھ سے چھن گئے ۔ ان کی مقامی فوج بد حال تھی اور مقابلے کے لیے تیار نہ تھی ۔ ان کے سپہ سالار آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے ۔ عام آبادی تاجروں، افسروں اور بڑے زمینداروں کے یونانی یا نیم یونانی طبقۂ اعلٰی کو ظالم اور ملحد سمجھتی تھی اور اس لیے ان سے سخت نفرت کرتی تھی ۔ مقامی نسطوری اور قبطی کلیساؤں پر مظالم روا رکھے جاتے تھے کیونکہ وہ تثلیث کے بجاے خداے واحد پر ایمان رکھتے تھے، اس لیے ملکی لوگ عربوں سے ہمدردی رکھتے تھے، کیونکہ وہ ان کی زبان کو بھی سمجھتے تھے، اور ان کے مذہب کو بھی محض اپنے مذہب کی ایک دوسری شکل خیال کرتے تھے ۔ ۶۵۰ء تک بالائی عراق، ایشیاے کوچک اور بوزنطی شمالی افریقہ کے بعض حصّے بھی جاتے رہے ۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد قبرص (Cyprus)، اقریطش (Crete)، روڈس (Rhodes)، صقلیہ (Sicily)، بحیرۂ ایجین Aegaean کے سواحل پر بھی مسلمانوں کے حملے شروع

هو گئے - ٦٧٠ء میں شمالی افریقه اور (قرطاجنه Carthage) بھی هاتھ سے نکل گیا اور ٧١١ء میں شَریش (Jerez de la Frontera) کی لڑائی کے بعد هسپانیه نے بھی هتھیار ڈال دیے - کچھ عرصے تک بوزنطی اپنے میں اس دباؤ کا مقابله کرنے کی صلاحیت نه پاتے تھے - قسطنطین ثالث (٦٤١ تا ٦٦٨ء) نے اپنا پاے تخت صقلیه کے شهر سِرقوسه Syracuse میں منتقل کر دیا، لیکن وہ وهاں قتل کر دیا گیا - قسطنطین رابع (٦٦٨ تا ٦٨٥ء) کے عهد میں عربوں نے اپنے بحیرۂ مرمرہ کے مستقر سیزیکوس Cyzicus سے قسطنطنیه پر بھی حمله کر دیا (٦٦٧ تا ٦٧٢ - ٦٧٣ء)، لیکن آتش یونانی اور طوفان سے سخت نقصانات اٹھا کر بالآخر پسپا هونے پر مجبور هو گئے - تاهم ایشیاے کوچک کو مَسْلَمَه نے پامال کیا اور بلقانی ریاستوں پر بلغاری چڑھ دوڑے، جنهوں نے ٦٧٩ء میں قسطنطین چهارم کو شکست دے دی - ٧١٤ء میں عربوں نے دردانیال کو عبور کیا اور ٧١٦ تا ٧١٧ء میں پھر خشکی اور تری دونوں طرف سے قسطنطینیه کا محاصره کر لیا، لیکن شدید سردی، بھوک، آتش یونانی اور بلغاریوں کی مزاحمت نے انهیں پھر پیچھے هٹنے پر مجبور کر دیا.

بوزنطیه کا سنهری دور: ایسَوری (Isaurian، ٧١٧ تا ٨٠٢ء)، فریجیانی (Phrygian، ٨٢٠ تا ٨٦٧ء) اور مقدونی (Macedonian، ٨٦٧ تا ١٠٥٥ء) خاندانوں کے ماتحت بوزنطیه نے ایشیاے کوچک اور ریاستهاے بلقان کو مسلمانوں، صقلابیوں اور شمال کے ترک حمله آوروں سے بچائے رکھا، گو صقلیه اور اطالیه قبضے سے نکل گئے - لیو ثالث (٧١٧ تا ٧٤١ء) نے الیون قره حصار (Acroinon) کے مقام پر عربوں کو شکست دی اور قسطنطین خامس (٧٤١ تا ٧٧٥ء) نے امویوں اور عبّاسیوں کی باهم کشمکش کے دوران میں ایشیاے کوچک پر پھر قبضه کر لیا، کیونکه سابقه عرب حملے کے مصائب نے یونانیوں اور بلغاریوں میں وحدتِ کامله پیدا کر دی تھی، لیکن اس کے بعد سیاسی اور مذهبی افتراق (افتراقِ بت شکنی، دیکھیے نیچے)، مغرب میں شارلمان کی بحثیت شهنشاه تخت نشینی (٨٠٠ء) اور بلغاریوں کے ساتھ لڑائیوں کی وجه سے سلطنت بے حد کمزور هو گئی اور انهیں لڑائیوں میں نقفور (Nicephorus) اول قتل هو گیا (٨١١ء) - خلیفه المَهْدی (٧٨٢ تا ٧٨٣ء) کے ماتحت هارون الرّشید کی سرکردگی میں ایک حمله هوا جس سے آئرین Irene (نائبۂ سلطنت براے قسطنطین سادس (٧٨٠ تا ٧٩٧ء) اور بعد میں ملکه (٧٩٧ تا ٨٠٢ء) نے مجبور هو کر صلح کی استدعا کی - پھر هارون الرّشید کے تحت ایک اور حمله هوا جس سے خراج میں اضافه هو گیا (٧٩٨ء) - اس اثنا میں بوزنطیوں نے سرحد عرب کے ساتھ ساتھ استحکامات کا ایک مضبوط خط قائم کر دیا کیونکه وهاں همیشه جنگ و پیکار کا سلسله جاری رهتا تھا، لیکن یه خط بالکل بیکار ثابت هوا کیونکه گرفتار شده صقلابی آبادکاروں نے سرحدی پهره داروں کی حیثیت سے بت شکنوں اور بت پرستوں کی باهمی کشمکش سے فائده اٹھا کر طامس Thomas کے ماتحت علم سرکشی بلند کیا - طامس کو المامون کی مدد سے انطاکیه میں شهنشاه بنا دیا گیا، لیکن میخائل (Michael) ثانی (٨٢٠ تا ٨٢٩ء) نے بلغاریوں کی امداد سے اسے شکست دے دی - تھیوفیلوس Theophilius اول (٨٢٠ تا ٨٢٩ء) کو مسلمانوں نے شکست دی (٨٣٠ء)، لیکن کلیکیا Ciliciuo میں اسے فتح حاصل هوئی - ٨٣١ء میں اسے دوباره هزیمت هوئی: تاهم اس نے پھر حمله کر دیا، لیکن چونکه المعتصم نے اپنی فوج بھیج دی تھی اس لیے ٨٣٨ء

میں اس کے ہاتھ سے عمّوریہ (Ammorium) چھن گیا (جو فریجیا میں اس خاندان کا مسکن تھا) ۔ معاملات اس قدر خراب ہو گئے کہ بوزنطیوں نے پہلی دفعہ یہ سوچا کہ مغربی ممالک سے امداد کی استدعا کریں، لیکن عربوں کو اپنی بعض داخلی مشکلات کی وجہ سے واپس جانا پڑا، اور بعد میں امیرِ ملطیہ (Melitene) عمر نے بحیرۂ اسود پر آمیسوس Amisus (صامسون) کے خلاف جو مہم بھیجی بوزن Poson کے مقام پر اسے تباہ کر دیا گیا (۸۶۳ء).

مصر اور شمالی افریقہ کے عربوں نے جنوب اور مغرب سے قلمرو پر متوازی حملے کیے؛ چنانچہ اِقریطش چھن گیا (قَنْدِیہ، مأخوذ از خندق کی بنیاد رکھی گئی) ۔ صقلیہ میں بادشاہت کے ایک مدعی یوفیموس Euphemius نے مسلمانوں کو بلا لیا تھا؛ چنانچہ یہ بڑی سیراقوزہ Gyracorse کے سوا سب کا سب ہاتھ سے نکل گیا ۔ جنوبی اطالیہ پر عربوں کے حملے ہونے لگے، روما خطرے میں پڑ گیا اور باری Bari پر عربوں کا قبضہ ہوگیا.

اسی زمانے میں بلغاریوں نے ریاستہاے بلقان میں ایک بڑی سلطنت قائم کر لی، لیکن انھوں نے بورِس Boris (۸۵۲ تا ۸۸۹ء) کے زمانے میں دینِ مسیحی قبول کر لیا (۸۶۴ء)، اور بالآخر روسیوں نے (یعنی روس کے نارمن Norman فاتحوں نے) ۸۶۰ء میں قسطنطنیہ پر سمندر کی طرف سے حملہ کیا.

یہ وہ دور تھا جس میں تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں بحرانی کیفیت رونما ہو گئی، اس لیے بازل اوّل Basil (۸۶۷ تا ۸۸۶ء) کے عہد میں بوزنطیوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا ۔ جنوبی اطالیہ میں باری اور تارینت Tarent دوبارہ فتح کر لیے گئے، لیکن صقلیہ کا باقی حصہ (۸۷۸ء میں) اور مالٹا دونوں ہاتھ سے نکل گئے ۔ لیو سادس (دانشمند) (۸۸۶ تا ۹۱۲ء) بحیرۂ ایجین Aegean میں عربوں کے حملوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوا، کیونکہ اس کے امیرالبحر ہمیریئس Himerius کو (۹۰۶ء میں) فتح حاصل ہوئی، لیکن قسطنطینوس Constantine سابع (۹۱۳ تا ۹۵۹ء) اور رومانوس Romanus اوّل لیقپینوس Licapenus (۹۱۹ تا ۹۵۹ء) نے مسلمانوں پر کئی فتوحات حاصل کیں اور بالآخر الجزیرہ کے سرحدی علاقے میں پر میلیتینہ (مَلَطْیہ) (۹۳۴ء) اور الرُّھا (Edessa) پر قبضہ کر لیا (۹۴۴ء) ۔ رومانوس ثانی (۹۵۹ تا ۹۶۳ء) نے کریٹ (اقریطش) اور بنو حَمْدان کے پاے تخت حلب (باجگزار ریاست) پر، نقفور (Nicephorus) ثانی نے فوقاس Phocas (۹۶۳ تا ۹۶۹ء)، کلیکیا Cilicia، قبرص اور انطاکیہ پر قبضہ کر لیا (۹۶۹ء) ۔ یوحنّا زیمسزیس (John Tzimisces) (۹۶۹ تا ۹۷۶ء) نے دمشق، لبنان اور فلسطین (باستثناے یروشلم) فتح کر لیے ۔ اسی زمانے میں بوزنطیوں کو ریاستہاے بلقان میں ایک شدید جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا، جہاں بلغاریوں نے قسطنطنیہ کو خطرے میں ڈال رکھا تھا ۔ لیوسادس نے مجاروں (Hungarians) کو بلغاریوں کی سرکوبی پر مقرر کیا اور پھر پچنق Pechenegs کو مجاروں پر چھوڑ دیا، لیکن بلغاریہ نے اپنی قوت دوبارہ بحال کر لی، پھر یوحنّا زیمسزیس نے اسے فتح کر لیا ۔ اس ملک میں دوبارہ علم بغاوت بلند ہوا، لیکن اسے پھر مغلوب کر لیا گیا ۔ پچنگ قومان Cumans اور اوزہ ترکوں سے لڑائیاں ہوئیں، اور بالآخر کیف کے روسیوں نے ۹۰۷، ۹۴۱ اور ۹۴۴ء میں قسطنطنیہ پر حملے کیے.

ان مسلسل و متواتر جنگوں کا نتیجہ ایک معاشرتی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا ۔ فوج اور بڑے زمینداروں نے دفتری حکومت کو بے دخل کر دیا، جو اب تک بڑے اقتدار کی حامل چلی

آ رہی تھی ۔ انجام یہ ہوا کہ بوزنطیوں کی حکومت اپنی فوج سے بدگمان ہو گئی اور قُسْطَنْطِین عاشر دوکاس Ducas (۱۰۵۹ تا ۱۰۶۷ء) کے عہد میں ایشیاے کوچک کے باہر کی تازہ فتوحات سے ہاتھ دھو بیٹھی ۔ ۱۰۷۰ء میں بیت المقدس گیا، پھر انطاکیہ رخصت ہوا ۔ سلجوقیوں کے دوسرے سلطان آلپ ارسلان [رک بآں] نے ارمینیہ، کلیکیا اور قباذق (Cappadocia) (مشرقی ایشیاے کوچک) کو فتح کر لیا اور مَلازگِرد (ارمینیہ) کی جنگ (۱۰۷۱ء) میں بوزنطی فوج کاملاً تہس نہس ہو گئی ۔ قیصر رومانوس رابع دیوجانس Romanus Diogenes (۱۰۶۷ تا ۱۰۷۱ء) قید کر لیا گیا ۔ ایشیاے کوچک کا پورا داخلی علاقہ چھن گیا، جہاں سلیمان بن قُتَلْمِش نے ایقونیم Iconium، یعنی قونیہ (روم) کی سلطنت کی بنیاد رکھ دی ۔ سلجوقوں نے سمرنا بھی لے لیا اور بحیرۂ ایجین Aegean کے بعض جزائر اور بحیرۂ مرمرہ Marmora پر کیزیقوس Cyzicus اور نیقیا Nicaea [= ازنیق] بھی چھین لیے، اور مغرب میں نارمنوں نے رابرٹ گسقرد Guiscard کے ماتحت جنوبی اطالیہ پر قبضہ کر لیا (۱۰۷۱ء) اور پچنق Pechenegs اور اوزہ ترکوں نے ریاستہاے بلقان کو تاخت و تاراج کر دیا ۔

حروب صلیبی کا زمانہ (۱۰۸۱ تا ۱۲۶۱ء): کومنانوں (Comnenes) (۱۰۵۹ - ۱۰۸۱ تا ۱۱۸۵ء) اور انگیلیوں Angeli (۱۱۸۵ تا ۱۲۰۴ء) نے جس قلمرو پر حکمرانی کی اس میں صرف جنوبی بلقان اور ایشیاے کوچک کے سواحل شامل تھے ۔ انہیں وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں کی طرف سے تو اطمینان ہو چکا تھا کیونکہ وہ مستقل طور پر آباد ہو چکے تھے اور عیسائی مذہب بھی اختیار کر چکے تھے ۔ لیکن اب انہیں شمال سے افرنجی Frank (یعنی فرانسیسی، جرمن، انگریز، ہسپانوی اور نارمن) صلیبیوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا جو مسیح کے ملک فلسطین اور بالخصوص شہر بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مشرق میں اپنی نئی ریاستیں قائم کرنے کے خواب بھی دیکھ رہے تھے ۔ بوزنطیوں نے اس تحریک کو اپنے مقصد کی خاطر ایک خاص راستے پر لگانے کی کوشش کی (تاکہ ایشیاے کوچک اور شام پر دوبارہ قبضہ ہو جائے)، لیکن کسی قدر ابتدائی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ خود بھی اسی رجحان کا شکار ہو گئے ۔ انہوں نے افرنجی (یا لاطینی) شاہی خاندانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر لیے اور بوزنطی سلطنت کی حمایت کے لیے لاطینی سورماؤں کی خدمات بھی حاصل کر لیں ۔ اور ان اقدامات کی وجہ سے خود بوزنطی دربار بھی "نیم مغربی" سا ہو گیا ۔ الکسیس Alexius اول [کومنان] (۱۰۸۱ تا ۱۱۱۸ء) کے ماتحت نارمنوں نے بلقان میں سے گزر کر قسطنطینیہ پر حملہ کر دیا، اور بوزنطیہ کو وینس کی جمہوریہ کے لیے وسیع امتیازات و رعایات منظور کرنا پڑیں، تا کہ وہ رابرٹ گسقرد Robert Guiscard کے بحری رسل و رسائل کو مسدود کرنے پر آمادہ ہو جائے ۔ آخر رابرٹ کی موت (۱۰۸۵ء) نے قسطنطینیہ کو بچا لیا، لیکن ۱۰۹۰ تا ۱۰۹۱ء میں پچنق اور ترکی قازق طاخس Tachas نے پاے تخت کا محاصرہ کر لیا ۔ پچنق کو تو کومانوں Cumans نے تباہ کر دیا اور طاخس کو سلطان قونیہ نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا ۔ پہلی حرب صلیبی (۱۰۹۶ تا ۱۰۹۹ء) کے دوران میں سلجوقیوں کو اسکی شہر [رک بآں] کے مقام پر شکست ہوئی ۔ مغربی ایشیاے کوچک پر پھر قبضہ بحال ہو گیا، بحالیکہ براے نام بوزنطی سیادت کے ماتحت انطاکیہ، الرہا، طرابلس اور بیت المقد-

میں لاطینی حکومتیں قائم ہو گئیں ۔ یوحنا ثانی قلویان Calojan (۱۱۱۸ تا ۱۱۴۳ء) نے ایشیاے کوچک اور ارمینیاے کوچک (کلیکیا) کے صوبوں کو دوبارہ فتح کیا اور انطاکیہ کے حاکم کے اظہار اطاعت کو بھی قبول کیا، لیکن مانویل Manuel اول (۱۱۴۳ تا ۱۱۸۰ء) کے ماتحت، جو ایک افرنجی سورما کی سی زندگی بسر کرتا تھا، الرّھا پر موصل کے اتابک [عمادالدین] زنگی (۱۱۴۴ تا ۱۱۴۶ء) نے قبضہ کر لیا ۔ سلجوقیوں نے ایشیاے کوچک پر دوبارہ اقتدار بحال کرنے کے لیے بڑی کوشش کی ۔ دوسری صلیبی جنگ ناکام ہو گئی ۔ جرمن سورماؤں کو سلجوقیوں نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا، اور فرانسیسی بھی نہایت تباہ کن نقصانات کے بعد ہی ارض مقدس تک پہنچ سکے ۔ ۱۱۵۸ء اور ۱۱۷۰ء کے درمیان بوزنطیہ کو پھر شام کی لاطینی ریاستوں کی سیادت حاصل ہو گئی، لیکن موریوکیفلون Myriocephalon کے مقام پر اسے تباہ کن شکست کھانا پڑی، جس میں پوری بوزنطی فوج تباہ ہو گئی اور ایشیاے کوچک ہمیشہ کے لیے قبضے سے نکل گیا ۔ تیسری صلیبی جنگ بھی ناکام تو ہوئی، لیکن بالکل تباہی سے بچ گئی ۔ اب گویا بوزنطیہ الکسیس Alexius ثانی (۱۱۸۰ تا ۱۱۸۳ء) اور اندرونیقوس Andronicus اول (۱۱۸۳ تا ۱۱۸۵ء)، قسطنطینیہ کے "رچرڈ سوم" کے درمیان کشمکش کی وجہ سے ایسا کمزور ہوا کہ اس کا وجود بالکل ہی مجاہدین صلیبی کے رحم و کرم پر موقوف رہ گیا ۔ دوسری بلغاری سلطنت کی بنیاد ۱۱۸۶ء میں رکھی گئی ۔ قبرص آزاد ہو گیا اور اس کے بعد لوسنیان Lusignan خاندان کے ماتحت (۱۱۹۲ء میں) ایک لاطینی بادشاہت بن گیا ۔ نارمنوں نے بلقانی صوبوں پر حملہ کیا اور ہوھنشتاؤفن Hohenstaufen کا ایک حملہ بڑی ہی دقّت سے روکا جا سکا ۔ آخر کار الکسیس رابع (۱۲۰۳ - ۱۲۰۴ء) نے چوتھی صلیبی جنگ کے بندقی، فرانسیسی اور جرمن سورماؤں کو طلب کر لیا ۔ جب الکسیس Alexius خامس مورزوفلیس Mourtzouphles کے عہد میں ایک قومی بغاوت کو فرو کیا جا چکا تو صلیبی سپاھیوں نے (۱۲۰۴ء) میں قسطنطینیہ کو تاخت و تاراج کیا اور سلطنت آپس میں تقسیم کر لی ۔ متعدد باجگزار ریاستوں، مثلاً تسّالونیک Thessalonica، اپیرس Epirus، آتنہ (ایتھنز) اور موریہ پر بالڈون فلاندری کو شہنشاہ بنا دیا گیا اور اہلِ بندقیہ (وینس) نے بھی ایک عمدہ مستعمرانہ قلمرو حاصل کر لی ۔ جب ادرنہ کی جنگ (۱۲۰۵ء) میں بلغاریوں نے لاطینی سورماؤں کا قریب قریب قلع قمع کر دیا تو بعد میں تسالونیک اور اپیرس کا بیشتر حصّہ بھی انھوں نے فتح کر لیا (۱۲۳۰ء)، لیکن ۱۲۳۵ء میں یونانیوں نے قسطنطینیہ کا محاصرہ کر لیا، اور بالآخر ۱۲۶۱ء میں اس پر قابض ہو گئے۔

بوزنطیہ کی آخری سلطنت: (۱۲۰۴ تا ۱۲۶۱ تا ۱۴۵۳ء) نیقیا Nicaea (ازنیق)، طرابزون اور اپیرس میں چھوٹی چھوٹی بوزنطی ریاستیں ابھی تک محض اس لیے مغلوب و مفتوح ہونے سے محفوظ رہیں کہ مغول نے سلجوقیوں پر اور بلغاریوں نے لاطینیوں پر فتح پائی تھی ۔ نیقیا Nicaea (ازنیق) کے لاسکاریسی (Lascarid) خاندان (۱۲۰۴ تا ۱۲۶۱ء) کے ایک جرنیل میخائیل Michael ثامن (۱۲۶۱ تا ۱۲۸۲ء) نے قسطنطینیہ کے آخری حکمران خاندان کی بنیاد رکھی ۔ جسے پالیولوغس Palaeologues کہتے تھے ۔ قسطنطینیہ پر قابو پانے کی غرض سے اسے اہلِ جنوآ Genoa کی امداد کی ضرورت تھی، چنانچہ اس کے بعد سلطنت کی تجارت اطالویوں کے ہاتھ میں چلی گئی جلد ہی وہ بھی تباہ و برباد ہو گئی ۔ قسطنطینیہ ۱۲۰۴ء کی تاخت کے بعد کبھی نہ پنپ سکا ۔ اس کے بعد یہ ایک

مفلس، لیکن متمدن شہر رہ گیا ۔ اس کی آخری شان و شوکت محض ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی تک محدود تھی ۔ مزید برآں یوحنّا (John) خامس (۱۳۵۱ تا ۱۳۹۱ء) اور یوحنّا ثامن (۱۴۲۵ تا ۱۴۴۸ء) نے اپنی اندرونی زورآزمائی میں ترکانِ آلِ عثمان سے اعانت بھی طلب کر لی تھی ۔ یوحنّا سادس (۱۳۴۱ تا ۱۳۵۴ء) کو اپنی ایک بیٹی سلطان کے حرم میں بھیجنا پڑی اور مانویل Manuel ثانی (۱۳۹۱ تا ۱۴۲۵ء) مدت دراز تک ترکوں کے پاس بطور یرغمال رہا ۔ ادھر تو مانویل ثانی اور یوحنّا ثامن امداد کی بھیک مانگنے کے لیے یورپ کا دورہ کر رہے تھے اور ادھر سلاطینِ عثمانی نے برسہ، نیقیا (ازنیق) اور نیقومیدیا Nicomedia [= ازمید] (۱۳۲۵ تا ۱۳۳۰ء) اور باقی ایشیاے کوچک ۱۳۴۰ء میں لے لیا ۔ اسی طرح ۱۳۵۴ء میں دردانیال کے کنارے گلیپولس (گیلی بولی) اور تراکیا (Thrace) ۱۳۸۹ء میں، سلطنت سربیا، جس نے ۱۳۳۰ء سے بلغاریوں کی جگہ لے لی تھی، اور ۱۳۹۳ء میں بلغاریا ان کے قبضے میں آ گیا ۔ یورپ چونکہ ''موت اسود'' (Black Death = طاعون) سے بے حد کمزور ہو رہا تھا اس لیے کافی امداد نہ دے سکتا تھا ۔ پانچویں صلیبی جنگ، شاہِ ہنگری سجسمنڈ Sigismund کی سرکردگی میں لڑی گئی، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ دریاے ڈینیوب کے کنارے نیقوپولس Nicopolis کے مقام پر ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ۔ اس وقت قسطنطینیہ محض اس لیے بچ گیا کہ تیمور سمرقندی کو انقرہ کے سلطان بایزید پر فتح حاصل ہو گئی تھی (۱۴۰۲ء)، لیکن تیمور ۱۴۰۵ء میں فوت ہو گیا اور سلطنت عثمانی کو پھر ہوش آ گیا ۔ آخر کار وہ حرب صلیبی جس کی قیادت پولینڈ اور ہنگری کے بادشاہ کر رہے تھے وارنہ Varna کے مقام پر ناکام ہو گئی (۱۴۴۴ء) ۔ قسطنطین حادی عشر (۱۴۴۹ تا ۱۴۵۳ء) کے ماتحت یونان میں آخری مقبوضات بھی چھن گئے، چونکہ سلطان محمد ثانی نے مستحکم قلعوں اور عظیم توپوں سے دردانیال اور باسفورس دونوں کو بند کر دیا تھا اس لیے قسطنطینیہ کا تعلق بیرونی دنیا سے منقطع ہو گیا تھا ۔ اپریل ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد ثانی نے محاصرہ شروع کر دیا ۔ قسطنطین نے اہل وینس اور اہلِ جنوآ Genoa سے، خصوصًا گوانی گستینیانی Giovanni Giustiniani سے، امداد حاصل کر لی ۔ اگرچہ اہلِ اطالیہ نے ترکی بیڑے کو ایک معمولی شکست تو دے دی لیکن سلطان محمد نے خشکی کے راستے سے اپنے جہازوں کو ''شاخ زرین'' کی بندرگاہ میں پہنچا دیا اور عیسائیوں کے بیڑے کا قلع قمع کر دیا ۔ پاے تخت کی فصیلیں ٹوٹی پھوٹی ہوئی اور قابلِ مرمت تھیں (کیونکہ جب کبھی انھیں مرمت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ترک ہمیشہ بوزنطی یرغمالوں کو تہ تیغ کر دینے کی دھمکی دیا کرتے تھے) اور ترکوں کی اژدردم توپوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں ۔ ۲۹ مئی کو بابِ سان رومانوس St. Romanus توڑ دیا گیا ۔ شہنشاہ اور گستینیانی مارے گئے ۔ شہر تاخت و تاراج ہوا اور اس کے بعد ترکی کا پاے تخت قرار پایا ۔

ثقافتی اہمیت : بوزنطیہ اپنی تاریخ کی ایک ہزار سال سے زیادہ مدت میں یونانی رومی ثقافت اور ابتدائی مسیحی تہذیب کے بہترین ورثے کا حامل و محافظ رہا ۔ اس ورثے کی نوعیت قدیم ترین یونانی ۔ رومی زمانے کے ورثے کی سی نہ تھی، بلکہ بحیرۂ روم اور ایشیا کے عناصر کا ایک امتزاج تھا جو بعد کے زمانے میں وجود میں آیا ۔ اس کے فن کو پارتھیائی (Parthian) اور سوریائی اثرات نے نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا ۔ اس کا ادب تصوف اور مذہب کا آمیزہ تھا اور اس کے اسلوبِ زندگی پر پہلے ساسانی ایران اور اس کے بعد وسط ایشیا

کے اثرات نمایاں تھے - بوزنطی کلیسا اور اس کے گنبد ساسانی ایرانی فن تعمیر ہی سے ترقی پا کر بنے تھے - ایا صوفیا کی شاندار عمارت، جو ۵۳۲ تا ۵۳۷ تا ۵۹۵ء میں قسطنطینیہ میں تعمیر ہوئی تھی، حقیقت میں کئی صدیوں تک دنیا بھر کی سب سے بڑی عمارت شمار ہوتی رہی اور اس کا گنبد بھی وسعت کے اعتبار سے عدیم المثال تھا - بوزنطیہ کی نقاشی، خصوصاً خاتم کاری (Mosaic) فطرت کو جہانِ آئندہ کی سنجیدگی کی روح کے ساتھ ایسے فنی اسلوب میں ڈھالتی تھی جو علامتی معانی سے لبریز ہوتا تھا - اس کے فنونِ عملی قیمتی ہونے کے لحاظ سے اور نازک صناعی کے اعتبار سے بےنظیر تھے (خصوصاً ہاتھی دانت کا کام، چاندی اور سونے کی تکفیت اور میناکاری وغیرہ) - آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں ایک بت شکن تحریک وجود میں آئی جو کلیساؤں میں اشکال و صور کی نقاشی کو ممنوع کر دینے کی حامی تھی . . . لیوثالث نے بتوں کو تباہ کرنے کا جو فرمان صادر کیا وہ خلیفہ یزید ثانی کے اسی قسم کے ایک فرمان کے تین سال بعد صادر ہوا تھا، چنانچہ مؤرخ تھیوفانیس Theophanes اسی بنا پر اسے "عربی ذہنیت" کا بادشاہ قرار دیتا ہے - بوزنطی تہذیب کے اثرات بہت گہرے اور وسیع تھے - روس، ارمینیہ، بلغاریا اور سرویا (یوگوسلاویا) بوزنطی روایات ہی کے وارث ہیں - مغربی یورپ نے قرونِ وسطٰی کے آغاز میں بوزنطیوں ہی کے فن، لباس اور ادب کی نقالی کی تھی - دمشق اور قرطبہ کے امویوں نے بوزنطی صناعوں سے بھی کام لیا تھا (بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ، جامع دمشق، شرق اردن میں قصیر عمرہ، اندلس میں مسجد قرطبہ) سامرا میں عباسیوں کے محلات و قصور میں بوزنطی نقاشی کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں - خلیفہ المنصور اور المأمون کی سرپرستی میں یونانیوں کے علمی کتب و رسائل کا ترجمہ جرجیس، قسطا بن لوقا، حنین بن اسحٰق اور اس کے بھتیجے حبیش نے کیا - الکندی، الفارابی اور الخوارزمی کی کتابوں میں بلکہ ان کے مخطوطات کی تصویروں سے بھی بوزنطی اثرات نمایاں ہیں - تاریخ عرب کے بعد کے دوروں میں بھی بوزنطی نمونے واضح ہیں - زمانۂ مابعد کے ترکانِ عثمانی کی گنبد دار مسجد بھی بوزنطی فن تعمیر کی ترقی یافتہ صورت ہے - دورۂ تجدید علم و ادب (Renaissance)، یعنی پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بوزنطیہ کے مہاجر اہلِ علم نے اطالیہ میں علوم قدیمہ کے مطالعے کا شوق از سرِ نو زندہ کیا، اور اس طرح ان تصورات اور اصولوں کی حوصلہ افزائی کی جو زمانۂ حاضر کی فکری ترقیات پر منتج ہوئے.

مآخذ: (الف) سلطنت بوزنطیہ: (۱) H. I. Bell: *Egypt from Alexander the Great to the Arab Conquest*، آوکسفرڈ ۱۹۴۸ء؛ (۲) R. Byron: *The Byzantine Achievement*، لنڈن ۱۹۲۹ء؛ (۳) Charles Diehl: *Byzance, Grandeur et Décadence*، پیرس ۱۹۲۰ء؛ (۴) وہی مصنف: *Histoire de l'Empire Byzantin*، پیرس ۱۹۱۹ء؛ (۵) R. Grousset: *Histoire des Croisades et du Royaume Franc de Jérusalem*، تین جلدیں، پیرس ۱۹۳۴-۱۹۳۶ء؛ (۶) M.V. Lechvenko: *Histoire de Byzance*، پیرس ۱۹۴۹ء؛ (۷) F. Lot: *Le Fin du Monde Antique et les Debuts du Moyen-Age*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۸) C. W. Oman: *Byzantine History in the Early Middle Ages*، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۹) E. Pears: *The Destruction of the Greek Empire and the Story of the Capture of Constantinople by the Turks*، لنڈن - نیویاک ۱۹۰۳ء؛ (۱۰) A. Pernice: *L' Imperatore Eraclio*، فلورنس ۱۹۰۵ء؛ (۱۱) A. A. Vasillev: *History of the Byzantine Empire*، ص ۳۲۴ تا ۱۴۵۳،

میڈیسن ۱۹۰۲ء؛ (۱۲) A. Wächter : Der Verfall des
Griechentums in Kleinasien im 14 Jahrhundert، لنڈن
۱۹۰۳ء؛ (۱۳) V. Worth : *Catalogue of the Imperial*
Byzantine Coins in the British Museum، دو جلدیں،
لنڈن ۱۹۰۸ء ـ (ب) بوزنطی ثقافت: (۱۴) J.H. Breasted :
Oriental Forerunners of Byzantine Painting، شکاگو
۱۹۲۴ء؛ (۱۵) O. M. Dalton : *Byzantine Art and*
Archaeology، آوکسفرڈ ۱۹۱۱ء؛ (۱۶) N. P.
Kondakov : *Les Costumes Orientaux a' la Cour*
Byzantine (*Byzantion 1, 7, 1924*)؛ (۱۷) Steven
Runciman : *Byzantine Civilization*، لنڈن ۱۹۳۳ء؛
(۱۸) D. Talbot Rice : *Byzantine Art*، آوکسفرڈ
۱۹۳۵ء؛ (۱۹) J. Strzygowski : *Ursprung und Sieg*
der altbyzantinischen Kunst، وی انا ـ (ج) اسلامی
دنیا سے روابط : (۲۰) H. F. Amedroz : *An*
Embassy from Baghdad to the Emperor Basil II،
در *Journal Royal Asiatic Society*، لنڈن ۱۹۱۴ ـ
۱۹۱۵ء؛ (۲۱) E. Amélineau : *La Conquête de*
l'Egypte par les Arabes، در *Revue Historique*
۱۱۹: ۲۷۳، ۱۹۱۵ء؛ (۲۲) E. W. Brooks : *Byzantines*
and Arabs in the Times of the Early Abbasides،
در *English Historical Review*، ۱۵ : ۷۲۸،
۱۹۰۰ء؛ (۲۳) M. Butler : *The Arab Conquest of*
Egypt، آوکسفرڈ ۱۹۰۲ء؛ (۲۴) M. Canard : *Les*
Expeditions des Arabes contre Constantinople، در
Journal Asiatique، ۲۰۸ : ۶۱، ۱۹۲۶ء؛ (۲۵)
R. Dussaud : *Les Arabes on Syrie avant l' Islam*،
پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۲۶) W. Eichner : *Die Nachrichten*
über den Islam bei den Byzantinern, (*Islam*)، ۲۳ :
۱۳۳، ۱۹۷، ۱۹۳۶ء؛ (۲۷) K. Güterbock : *Der*
Islam im Lichte Byzantinischer Polemik، برلن
۱۹۱۲ء؛ (۲۸) J. Laurent : *Byzance et les Turcs*
Seljoucides dans l'Asie Occidentale jusqu'en 1081،
نینسی ـ پیرس ۱۹۱۳ ـ ۱۹۱۴ء؛ (۲۹) وہی مصنف :
Byzance et l'origine du sultanat de Roum (*Malanges*
Charles Diehl)، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۳۰) W.H. Ramsay :
The Attempts of the Arabs to Conquer Asia Minor
(641-694) and the causes of Their Failure، در
Belletin de l' Academie Roumaine، باب تاریخ، ۹،
۱۹۲۴ء؛ (۳۱) M. Silberschmidt : *Das Orientalische*
Problem zur Zeit der Entstehung des Türkischen
Reiches، لائپزگ و برلن ۱۹۲۳ء؛ (۳۲) A.A. Vasiliev :
Byzance et les Arabes، دو جلد، برسلز ۱۹۳۵ تا
۱۹۵۰ء؛ (۳۳) وہی مصنف : *Hārūn ibn Yahyā and His*
Description of Constantinople، در *Annales Institut*
Kondakov، ج ۵، ۱۹۳۲ء؛ (۳۴) J. Wellhausen :
Die Kämpfe der Araber mit den Römern in der
Zeit der Omaijaden، گوٹنگن ۱۹۰۱ء؛ (۳۵) E. Diez :
The Mosaics of the Dome of the Rock at Jerusalem،
در *Ars Islamica*، ص ۲۳۵، ۱۹۳۴ء؛ (۳۶) H.Grégoire :
L'Epopée Byzantine et ses Rapports avecs l'Epopee
Turque et l'Epopee Romane, Bruxelles (*Académie*)،
۱۹۳۰ء؛ (۳۷) وہی مصنف : *Echanges* (*Byzantion*)
Epiques Arabo-Grecs، جلد ۷، ۱۹۳۲ء؛ (۳۸) وہی
مصنف و R. Goossens : *Byzantinisches Epos und*
arabischer، در *ZDMG*، ۸۸ : ۲۱۳، ۱۹۳۴ء؛ (۳۹)
E. Herzfeld : *Die Malereien von Samarra*، برلن
۱۹۲۷ء؛ (۴۰) Eustace de Lorey : *L' Hellénisme et*
l'Orient dans les Mosaiques de la Mosquée des
Omaiyades, (*Ars Islamica*)، ۱ : ۲۲، ۱۹۳۴ء؛ (۴۱)
A. Musil : *Kuseir Amra*، دو جلد، وی انا ۱۹۰۷ء؛
(۴۲) J. Strzygowski : *Amra und seine Malereien*،
در *Zeitschrift für Bildende Kunst*، جلد ۱۸، ۱۹۰۸ء؛
(۴۳) Kurt Weitzmann : *The Greek Sources of*
Islamic Scientific Illustrations، در *Archaeologica*

Orientalia in Memoriam Ernst Herzfeld، نیویارک ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۳ ۔

(H. Goetz)

* بُوسْتَان : اس کی مخفف صورت ''بُستان'' بھی ہے ۔ فارسی کا لفظ ہے (مگر عربی میں بھی مستعمل ہے، جس کی جمع عربی قاعدے کی رو سے بَساتِین ہے) ۔ یہ لفظ ''بُو'' اور ''ستان'' کا مرکب ہے اور عمومًا ترکاری باغ (ترکی میں) اور کبھی کبھی پھلوں کے باغ کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی میں عام باغ کے لیے مستعمل ہے ۔ الجزائر کی بولی میں اس کے معنی سرو کے ہیں (Beaussier) اور بیروت میں توت (Mulberry) کے درختوں کے کنج کے ہیں ۔ مشرقِ وسطٰی میں یہ بہت سے جغرافیائی ناموں کا حصہ ہے ۔ ایران کے مشہور شاعر سعدی [رک بآں] کی معروف کتاب کا نام بھی بوستان ہے، جو ۶۵۵ھ/ ۱۲۵۷ء میں شیراز میں لکھی گئی ۔ اس کتاب کی حیثیت کلاسیکی ہے اور ان تمام ملکوں میں جہاں فارسی کا رواج ہے، خصوصًا ایران، ہندوستان، وسطِ ایشیا اور عثمانی ترکی میں یہ درس میں شامل رہی ہے ۔ پاک و ہند کے مصنفوں نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں ۔ علاوہ بریں ترکی میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں شَمْعِی اور سُودِی کی شرحیں بہت مشہور ہیں (یہ دونوں سولھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئیں) ۔ فاضل سعدالدین مسعودی تفتازانی [رک بآں] نے ۷۵۵ھ/ ۱۳۵۴ء میں اس کا ترجمہ ترکی [نظم] میں کیا (E. J. W. Gibb : A History of Ottoman Poetry، ۱ : ۲۰۲) ۔ کئی دوسری زبانوں مثلاً بنگالی، سندھی اور پنجابی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ۔ یورپی زبانوں میں اس کے خاص خاص ترجمے یہ ہیں : Forbes Falconer کا انگریزی ترجمہ (Selections، لنڈن ۱۸۳۸ء)؛ جرمن میں Graf منظوم ترجمہ (Sa'di's Lustgarten، Jena ۱۸۵۶ء) اور اسی زبان میں Baron Schlechta-Wssehrd کا ترجمہ (ویانا ۱۸۵۲ء)، Barbier de Meynard کا ترجمہ فرانسیسی میں (پیرس ۱۸۸۰ء) اور Constantin Čaikin کا ترجمہ روسی نظم میں (ماسکو ۱۹۳۵ء) ۔ قدیم ترین مخطوطات میں اس کتاب کا نام سعدی نامہ ہے ۔ [بوستان (= باغ) کی ترتیب و آرائش اور اس کے فنون اور مختلف اسلامی ملکوں میں اس کی ترقی کے کوائف کے لیے رک بہ باغ؛ نیز رک بہ بزمی انصاری : بوستان، در ۱۱، بار دوم، لائڈن].

(سعید نفیسی)

* بُو سَعِید : [= البُوسَعِیدی]، عُمان اور زَنجبار کا حکمران خاندان، جو اَزْدِی نسل سے ہے ۔ [دولت بوسعیدیہ] کا بانی احمد بن سعید عُمان کے یَعْرُبی امام سَیْف بن سلطان ثانی کے تحت صُحار کا والی ہو گیا تھا ۔ اس نے صُحار کو نادر شاہ کے سپہ سالار محمد تقی خان شیرازی کے حملے کے وقت کامیابی کے ساتھ بچایا اور شیرازی نے چند شرائط پر صلح کر لی ۔ پھر اپنی جنگی طاقت اور حکمت عملی کی بدولت یہ احمد عمان کا مالک بن بیٹھا ۔ شاہِ [ایران] ترکوں سے ایک لڑائی میں الجھا ہوا تھا اور اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا ۔ احمد نے امام کا لقب کب اختیار کیا، یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ۔ عمومًا اسے ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء کا واقعہ بتایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا؛ [۱۱۶۷ھ کے حق میں کچھ شہادت موجود ہے؛ دیکھیے الزرکلی] ۔ وہ طبعًا ایرانیوں کے مقابلے میں ترکوں کا طرفدار تھا اور اس نے ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں بصرے کو بچانے میں ترکوں کی مدد بھی کی ۔ اس نے تجارت کو فروغ دیا اور ہندوستان کے سمندری ڈاکوؤں کے دبانے میں مدد دی ۔ اس کا بیٹا سعید ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۳ء میں

اس کا جانشین ہوا، لیکن ہر دلعزیزی حاصل نہ کر سکا اور کنارہ کش ہو کر الرُّستاق چلا گیا۔ اس نے اختیارات اپنے لڑکے حامد کے سپرد کر دیے، لیکن امام کا لقب اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد اس خانوادے کے کسی فرد نے یہ لقب اختیار نہیں کیا بلکہ بعد کے فرمانروا سیّد کہلاتے تھے، اگرچہ ملک کے باہر عموماً سلطان مشہور تھے۔ سعید ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء میں بقید حیات تھا اور بعد کے دس سال کے اندر فوت ہوا۔ حامد (م ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱-۱۷۹۲ء) کے بعد اس کا چچا مسمّی سلطان اس کا جانشین ہوا اور اسی نے چاہبار، ہُرمز، کِشم، بندرعبّاس اور بحرین کو مسخّر کیا۔ ایران چاہبار اور بندرعبّاس بو سعید کو پٹے پر دینے پر رضامند ہو گیا۔ گوادر پہلے ہی اس کے قبضے میں تھا۔ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں اس نے ایک معاہدہ کرکے برطانیہ کو اجازت دی کہ وہ بندرعبّاس میں ایک کارخانہ بنائے اور اسے مورچہ بند کر لے اور وعدہ کیا کہ فرانسیسیوں کو یا ولندیزیوں کو، جب تک وہ برطانیہ سے جنگ کرتے رہیں گے، اپنے علاقے میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اپنی عمر کے آخری ایّام میں اس کو وھابیوں کے حملے کا ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں وہ لِنگہ کے قریب ایک بحری لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد تخت سلطنت حاصل کرنے کے لیے جو لڑائی ہوئی وہ بدر بن سَیف نے وھابیوں کی مدد سے جیت لی، مگر اسے سعید بن سلطان نے قتل کرا دیا اور پھر خود اپنے بھائی سالم کے ساتھ مل کر (۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۰-۱۸۲۱ء) تک اور سالم کی وفات کے بعد خود اکیلا حکومت کرتا رہا۔

سعید اپنے خاندان میں سب سے ممتاز فرمانروا گزرا ہے، لیکن عرب میں اس کی حکومت اکثر مخدوش ہو جاتی تھی اور اس کا سبب یا تو خاندانی نزاع یا وھابیوں کا حملہ ہوتا تھا۔ باہمی نزاع کی وجہ سے صُحَار کا علاقہ قَیس بن احمد کے خاندان کی قیادت میں کچھ مدّت کے لیے خود مختار ہو گیا اور وھابیوں سے کبھی تو کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑایا جاتا تھا اور کبھی وہ برطانیہ کی مداخلت کا خوف دلانے سے رک جاتے تھے۔ سعید برطانیہ کا پکّا حلیف تھا اور اس نے خلیج فارس کے قواسم کے خلاف برطانیہ کی مہموں میں مدد دی۔ ... ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء میں اس نے لونڈی غلاموں کی تجارت پر سخت پابندی لگا دی، چنانچہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں افریقہ سے لونڈی غلام در آمد کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ سعید کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے افریقی مقبوضات کو ترقی دے کر ایک تجارتی مملکت بنا دیا، جس کی تقویت بحری طاقت سے کی۔ افریقہ میں یعربی اماموں کی مفتوحات کا بڑا حصّہ اس وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا جب عمان پر ایرانیوں نے یورش کی۔ سعید جب تخت پر بیٹھا تو اس کے زیر اقتدار فقط زنجبار پمبا کا ایک حصّہ اور شاید مافیا Mafia اور لامو Lamu رہ گئے تھے، نیز کِلوہ، جسے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوبارہ حاصل کر لیا گیا تھا۔ سعید نے رفتہ رفتہ اپنی حکومت عرب اور سواحلی نوآبادیوں پر مُقدشو Mogadishu سے راس ڈلگاڈو Delgado تک قائم کر لی۔ سب سے کڑی مقاومت ممباسہ [رکَ بآں] پر ہوئی۔ حامی اور بنتو قبائل نے برّعظیم پر اس کے اقتدار کو برائے نام ہی مانا۔ بڑے بڑے جزیروں میں بھی سعید کو قبیلہ وھادمو Wahadimu (Mwenyi Mkuu) واپمبا (Diwani) اور وتمبتو (Sheha) کے سردار صرف خراج ادا کرتے تھے۔ اس صدی کے اواسط میں ونگا Vanga سے پنگانی Pangani تک باستثناے تنگا Tanga سارا ساحل سعید اور اُسمبرا Usambara کے بادشاہ کے مشترک قبضے میں تھا، یعنی یہ بادشاہ

اپنے عمّال نامزد کرتا اور سعید ان کی توثیق کرتا تھا ۔ سعید کی نوسی بی Nossi Bé کو لے لینے کی کوشش فرانسیسیوں نے نہیں چلنے دی ۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ء میں سعید نے جزائر کوریا موریا Kuria Muria برطانیہ کے حوالے کر دیے ۔

سعید کی وفات (۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء) کے بعد اس کا بیٹا ثوینی مسقط پر اور ایک اور بیٹا ماجد زنجبار پر قابض رہے ۔ یہ جھگڑا لارڈ کیننگ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے فیصلے کے مطابق ماجد کا زنجبار پر قبضہ تو بحال رہا، لیکن وہ بطور معاوضہ ایک رقم سال بہ سال ثوینی کو ادا کرتا تھا، جس کی بابت بصراحت کہہ دیا گیا تھا کہ یہ خراج نہیں ہے ۔ ماجد کا جانشین برغش ہوا، جس نے سعید کی وفات پر اور اس کے چند سال بعد پھر حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی ۔ اس وقت برطانیہ کے نمائندے سرجان کرک Sir John Kirk کا بہت زور ہو گیا تھا اور ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں غلاموں کی تجارت بالکل بند کر دی گئی ۔ مشرقی افریقہ میں جرمنوں کا نفوذ ہو جانے کی وجہ سے ایک انگریزی ۔ فرانسیسی ۔ جرمن تحقیقاتی جماعت مامور کی گئی تا کہ بو سعیدی مملکت کی حدود متعیّن کر دی جائیں ۔ اس جماعت کے فیصلے کے مطابق برغش کو زنجبار، پمبا، چھوٹے چھوٹے جزیرے جو ان سے بارہ میل کے فاصلے کے اندر ہوں، جزیرہ نمائے لامو، تنگی Tungi سے کپنی Kipini تک کا ساحلی علاقہ دس میل اندر تک، کسمیو Kismayu، براوا Barawa، مرکہ، مقدشو اور ورشیخ کا حاکم تسلیم کر لیا گیا ۔ آگے چل کر لامو Lamu برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو اور شمالی بندرگاہیں اٹلی کے حوالے کر دی گئیں ۔ ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء میں ایک اور انگریزی ۔ جرمنی سمجھوتے کے تحت دریائے امبا Umba کے شمالی جانب کے مقبوضات جرمن نے خرید لیے اور باقی تقریباً سارے کا سارا علاقہ انگریزوں کے زیر سیادت آ گیا ۔ اس کے بعد بڑی اقطاع پٹے پر اٹھا دیے گئے ۔ ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۱ - ۱۸۹۲ء میں ملکی انتظام کو نئے سرے سے منظّم کیا گیا اور ایک انگریز وزیر اعلٰی (جنرل لائڈ میتھیوز Gen. Lloyd Mathews) مقرر کر دیا گیا ۔ خالد بن برغش نے ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء اور ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ - ۱۸۹۶ء میں اقتدار چھین لینے کی کوشش کی ۔ اس کی دوسری بار کی کوشش کے زمانے میں ایک انگریزی جنگی جہاز نے اس کے محل پر گولہ باری کی ۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ - ۱۸۹۷ء میں غلامی کی قانونی حیثیت بالکل ختم کر دی گئی ۔ علی بن حمود (۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء تا ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی صغر سنی میں انگریز وزیر اس کا نائب السلطنت رہا ۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں زنجبار کی ذمے داری برطانوی محکمۂ خارجہ سے محکمۂ مستعمرات کی طرف منتقل کر دی گئی ۔

ثوینی کو، جو کیننگ کے فیصلے کے مطابق عمان پر قابض رہا تھا، قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بیٹے سالم پر قتل کی سازش میں شریک ہونے کا شبہہ تھا اور وہ تھوڑے ہی دن حکومت کرنے پایا تھا کہ عزّان بن قیس نے اسے نکال باہر کیا ۔ اور یہ عزّان خود خانہ جنگی میں مارا گیا ۔ ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں ترکی اس پر راضی ہو گیا کہ عزّان کے بھائی ابراہیم کے ساتھ مل کر عمان کو آپس میں تقسیم کر لے ۔ صُحار ابراہیم کے حصّے میں آیا، لیکن دو سال بعد اسے ترکی نے چھین لیا ۔ اس بد عملی کے زمانے میں ایران نے بندر عبّاس کو دوبارہ اجارے پر لے لیا (۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۲ء) اور چاہبار Čāhbār پر بھی دوبارہ مسلّط ہو گیا ۔ ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء کے قریب عیسٰی بن صالح کے زمانے میں اندرون ملک میں ایک مخالفانہ تحریک

کا آغاز ہوا۔ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء میں سالم الخَرَوصی کو امام منتخب کیا گیا اور ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ - ۱۹۱۵ء میں باغیوں نے مسقط پر حملہ کر دیا، جسے ایک ہندوستانی دستۂ فوج کی مدد ہی سے بچایا جا سکا۔ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء میں سالم کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین محمد بن عبداللہ نے سید تیمور سے سمجھوتا کر لیا، جس کی رو سے اندرونِ ملک کے قبائل کو داخلی خود مختاری مل گئی۔ جدید عمان میں ظُفار داخل ہے، اور سلطان کِشم اور راْس الخَیمہ کے شیخ کے علاقے اور صحرا اس کی سرحدیں ہیں۔ فُجیرہ کے گردا گرد ساحل پر ایک محافظ قلعہ ایک علیحدہ ''ماسون'' (trucial) ریاست ہے [جس میں از روے معاهدہ جنگ نہیں ہوتی]۔ اس خاندان کا شجرۂ نسب ذیل میں درج ہے۔ عربی اعداد عمان اور زنجبار دونوں کا، رومن ہندسے فقط عمان کا اور حروف تہجی فقط زنجبار کا حاکم ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ تاریخیں ہر حکمران کی تخت نشینی کی دی گئی ہیں۔ [شجرۂ ذیل کو بائیں سے دائیں پڑھیے]۔

(۱) امام احمد بن سعید بن محمد بن سعید
۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء

- (۴) سلطان ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ - ۱۷۹۲ء
  - (۶) سعید ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ - ۱۸۰۶ء
    - (ب) برغشں ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء
      - (ج) خلیفه ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء
      - محمد
        - (و) حمود
          - (ز) علی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء (دست برداری ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء، م ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء)
    - (د) علی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء
    - (الف) ماجد ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء
    - (iv) ترکی ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء
      - (v) فیصل ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء
        - (vi) تیمور ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء
          - (vii) سعید ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء
    - (i) ثوینی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء
      - (ہ) حامد ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء
      - خروب
        - (ح) خلیفه ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء
      - (ii) سالم ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء
    - خالد
  - (۵) سالم ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ - ۱۸۰۶ء؛ ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ - ۱۸۲۱ء
- سیف
  - بدر
- قیس
  - عزّان
    - قیس
      - (iii) عزّان ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء
- (۲) سعید (امام) ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء
  - (۳) حامد؟ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء

مآخذ : (۱) سیّد سعید کی وفات تک کے لیے سب سے بڑا عربی مستند مآخذ ابن رزیق کی ''وقائع'' ہے جس کا ترجمہ جی - پی - بیجر G. P. Badger نے *History of the Imāms and Sayyeds of Omān* کے نام سے کیا ہے، Hakluyt Society ۱۸۷۱ء - اصل عربی کتاب طبع نہیں ہوئی اور اس وقت اس کا مخطوطہ کیمبرج یونیورسٹی میں محفوظ ہے زیر عدد Add. ۲۸۹۲؛ لیکن ابن رزیق تاریخوں کا زیادہ خیال نہیں رکھتا - ان میں سے بعض کی تصحیح ایک گمنام مصنّف کے مخطوطے سے کی جا سکتی ہے، جو موزۂ برطانیہ میں موجود ہے، زیرعدد Add. ۲۳۳۹۳ - امام احمد کی تاریخوں کے لیے دیکھیے : (۲) C. F. Beckingam، در *JRAS*، ۱۹۴۱ء؛ (۳) عبداللہ بن حمید السالمی : تحفۃ الاعیان بسیرۃ اہل عمان، قاہرہ ۱۳۵۰ھ؛ (۴) R. Coupland : *East Africa and its Invaders*، اور *The Exploitation of East Africa*؛ (۵) L. W. Hollingsworth : *Zanzibar Under the Foreign Office*؛ (۶) W. H. Ingrams : *Chronology and Geneologies of Zanzibar Rulers*، زنجبار ۱۹۲۶ء؛ (۷) B. Thomas : *Arab Rule under the Āl Bū Sa'īd Dynasty of Oman*، در *Proceedings of the British Academy*، ج ۲۴؛ (۸) R. Said-Ruete : *Said bin Sultan (1791-1856), ruler of Oman and Zanzibar*، لنڈن ۱۹۲۹ء؛ (۹) وہی مصنّف : *Dates and references of the History of Āl Bū Sa'īd Dynasty*........، لنڈن (؟) ۱۹۳۱ء؛ (۱۰) وہی مصنّف، در *Isl.*، شمارہ ۲۰ (۱۹۳۲ء) : ص ۲۳۷ تا ۲۴۶؛ (۱۱) C. U. Aitchison : *A Collection of Treaties, Engagements and Sanads*، ج ۱۲، حصّہ ۲، ج ۳، حصّہ ۴؛ نیز دیکھیے مآخذ بذیل مادّہ بحر فارس اور زنجبار .

(C. F. BECKINGHAM)

بُوسَنَہ : (بوسنیا اور ہرزگووینا).

(۱) عام خاکہ : بوسنیا اور ہرزگووینا، جن کا کل رقبہ اکاون ہزار ایک سو انتیس کیلو میٹر ہے، ۴۲ درجے ۲۶ ثانیہ اور ۴۵ درجے ۱۵ ثانیہ عرض بلد شمالی اور ۱۵ درجے ۴۴ ثانیہ اور ۱۹ درجے ۴۱ ثانیہ طول بلد مشرقی کے اندر واقع ہے - یہ اس طرح یوگوسلاویا کے مغربی — زیادہ تر کوہستانی — خطے کو گھیرے ہوئے ہے، جس میں معدنی ذخائر، قوت آبی اور جنگلات بکثرت ہیں - یہ دو جغرافیائی اور تاریخی خطوں، یعنی بوسنیا اور ہرزگووینا پر مشتمل ہے - بوسنیا کا نام ملک کے نسبۃً زیادہ بڑے شمالی حصے پر دلالت کرتا ہے، جب کہ ہرزگووینا دریاے نرتوا Neretva کے طاس سمیت جنوبی اضلاع پر مشتمل ہے - بوسنیا نام دریاے بوسنا سے مأخوذ ہے (بوسنیا کے معنی غیر یقینی ہیں، لیکن بلاشبہہ یہ اصلاً الّیری زبان کا لفظ ہے)، جو ملک کے وسطی حصے میں بہتا ہے - اسی دریا کے منبع اور بالائی طاس کے ارد گرد ایک ضلع کے آثار دریافت ہوئے تھے جو بوسنہ کہلاتا تھا (اس کا سب سے پہلے ذکر Constantine Poryphyrogenitus نے کیا، جس نے اسے سربیا میں شامل خیال کیا) اور قدیم آباد کار اسلاوی قبائل کے افراد اس میں آباد تھے - پے در پے ملکی اور غیرملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ تغیّرات کے بعد یہ خطّہ آخر ایک نئی مملکت کا مستقل جزو بن گیا، جو اسی (بوسنہ) نام سے موسوم ہوئی - بادشاہ تورتکو (Tvrtko) اوّل (۱۳۵۳ تا ۱۳۹۱ء) کے عہد حکومت میں یہ مملکت شمال مغرب کے ایک چھوٹے سے ضلعے کو چھوڑ کر نہ صرف بوسنیا اور ہرزگووینا کے موجودہ علاقے پر بلکہ ساحل ادریاتیک Adriatic کے بڑے حصے اور اس کے نواح میں جنوب اور جنوب مشرق کے اضلاع پر بھی مشتمل تھی - ترکوں کی حکومت میں بوسنیا عثمانی سلطنت کا ایک سنجاق تھا اور ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء سے ایک ایالت، جس میں موجودہ

بوسنیا اور ہرزگووینا کی بہ نسبت زیادہ رقبہ شامل تھا۔ یہ صورت نہ صرف پہلے بلکہ بارھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے / سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کچھ علاقہ چھن جانے کے بعد بھی رہی۔ ہرزگووینا کا نام پندرھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے، جب ایک امیر Stjepan Vul... Kosača نے اپنے وقت کے شاہ بوسنیا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے سینٹ ساوہ کا ''ہرزگ'' (یعنی ڈیوک یا امیر) ہونے کا اعلان کیا۔ یہ خطّہ بعد میں ہرس گووینا (ہرزگ کی سرزمین) کہلانے لگا اور ترکی میں ہرسیک ایالی یا ہرسک سنجاغی۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کا موجودہ علاقہ تقریباً اس رقبے کے مطابق ہے جو آسٹریا کی حکومت کے تحت (۱۸۷۸ سے ۱۹۱۸ء) اسی نام کے صوبے اور (۱۹۱۸ء) سرب، کروٹ اور ساووین کی مشترکہ مملکت کا ایک حصّہ ہو گیا تھا۔ اس خطّے کی حدود اور وسعت میں نئی مملکت کے (جو نام نہاد Vidovdan آئین کے تحت بنی) زیرِ انتظام کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یوگوسلاویا میں پارلیمانی حکومت کی بساط الٹ جانے کے بعد (۱۹۲۹ء) وہاں ایک آمرانہ حکومت نمودار ہوئی۔ یہ اُن نو بڑی بڑی انتظامی وحدتوں پر مشتمل تھی جو banovina کہلاتی تھیں۔ اس تقسیم نے ملک کی حدود کو بدل ڈالا، کیونکہ دو ایسے banovina یا صوبوں کے مع اپنے صدر مقاموں کے جو بوسنیا اور ہرزگووینا کے اندر تھے (یعنی سراجیوو اور بنالوقہ) اب ہمسایہ علاقے کے حصّے بن گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا اور ہرزگووینا کے علاقے کے بعض حصّے اس صوبے میں شامل ہو گئے جس کا صدر مقام سپلٹ Split تھا، بحالیکہ ہرزگووینا کا ایک حصّہ اس صوبے میں شامل کر دیا گیا جس کا صدر مقام مونٹنگرو Montenegro میں تھا۔ زمانۂ حال کے یوگوسلاویا میں روایتی تاریخی حدود کے اندر ایک علیٰحدہ عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا بنا دی گئی ہے۔

یوگوسلاویا کی ایک جمہوریہ کی حیثیت سے بوسنیا [= بوسنہ] اور ہرزگووینا [= ہرسک] کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم ان آئینوں پر مبنی ہے: وفاقی عوامی جمہوریۂ یوگوسلاویا کا تحریری آئین، جو ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو منظور ہوا؛ عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا کا آئین مؤرخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء؛ ۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء کا آئینی قانون، جو وفاقی عوامی جمہوریہ یوگوسلاویا کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم کے اساسی اصولوں اور حکومت کے وفاقی اجزا کے متعلق ہے؛ اور ۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء کا آئینی قانون جو عوامی جمہوریۂ بوسنیا اور ہرزگووینا کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم اور حکومت کے جمہوری اعضا سے متعلق ہے۔

عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا کی، یوگوسلاویا کی دوسری جمہوریتوں کی طرح اپنی ایک عوامی مجلس قانون ساز ہے، جس کی مجلس عاملہ اور اعلٰی سرکاری دفاتر (= سکریٹریٹ) سراجیوو Sarajevo [= سرای] میں ہیں، جو اس جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ ملک کو بارہ اضلاع اور ایک سو چونتیس پرگنوں (Communes) میں تقسیم کیا گیا ہے (۱۹۵۸ء)۔

بوسنیا اور ہرزگووینا کی آبادی [۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء کی سرشماری کے مطابق] بتیس لاکھ ستر ہزار نو سو اڑتالیس ہے۔ یہاں کے لوگ سربوکروٹ Serbo-Croat زبان بولتے ہیں (بجز قلیل التعداد سلووینی اور مقدونی آبادکاروں اور قومی اقلیتوں کے)، لیکن قومیت کے اعتبار سے یہ اس طرح بٹے ہوئے ہیں: سرب (جن کی اکثریت مشرقی کلیسا سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کی ہے اور بقیہ مسلمان ہیں)، کروٹ Croats (جو زیادہ تر رومن کیتھولک عیسائی اور بقیہ مسلمان

ہیں) اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو اپنی قومیت واضح نہیں کرتے (ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے).

۱۹۵۳ء کی سر شماری کے ابتدائی نتائج کی رو سے بوسنیا اور ہرزگووینا میں آبادی کا تناسب یہ تھا: ۱۰۰۳ فیصد بغیر قومیت کے: ۳۰۰۱ مشرقی کلیسا کے عیسائی، ۲۱۰۴ فیصد رومن کیتھولک عیسائی، ۳۲۰۳ فیصد مسلمان. اور ۹۰۹ دوسری قومیتوں کے افراد.

۱۹۵۳ء کی سر شماری کے آخری اور سرکاری نتائج جو اب طبع ہو چکے ہیں مفصلۂ ذیل ہیں: سرب بارہ لاکھ چونسٹھ ہزار تین سو بہتر — ۴۴۰۳ فیصد (جس میں . . . مسلمانوں کی تعداد شامل ہے) کروٹ چھے لاکھ چوّن ہزار دو سو انتیس — ۲۳ فیصد (جس میں . . . مسلمانوں کی تعداد شامل ہے) - غیر اعلان کردہ یوگوسلاوی آٹھ لاکھ اکانوے ہزار آٹھ سو — ۳۱۰۴ فیصد (جن میں آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار چار سو چھیاسی مسلمان تھے) - دوسرے لوگ سینتیس ہزار تین سو نواسی — ۱۰۳ فیصد.

یہاں کے باشندے اپنی مشترکہ زبان اور گہرے نسلی روابط کے باوجود تین گروہوں میں منقسم ہیں، جس کا سبب تاریخی اثرات بھی ہیں، لیکن سربوں اور کروٹوں کے درمیان قومی اختلافات کی تشکیل کرنے کے ذمّےدار زیادہ تر مختلف مذہبی اعتقادات ہیں - بوسنیا اور ہرزگووینا صدیوں تک سلطنت عثمانیہ کا سر دی علاقہ رہے اور مشرق و مغرب کے عین کنارے پر واقع تھے جہاں دونوں طرف کے اثرات پڑتے رہے - اب ان کے قبول اسلام سے ایک اور نیا عنصر پیدا ہو گیا - آسٹریا - ہنگری کی حکومت کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی آبادی کی جماعت بندی سرکاری طور پر بلحاظ قومیت کی گئی (بجز ان قلیل التعداد آبادکاروں کے جن کی قومیت کی باقاعدہ علیحدہ تصریح کر دی جاتی تھی)، حالانکہ پوری آبادی کی اکثریت میں قومی وحدت کا شعور پیدا ہو رہا تھا، چنانچہ مشرقی کلیسا کے عیسائیوں نے سرب ہونے کا اور رومن کیتھولک عیسائیوں نے کروٹ ہونے کا ادّعا کیا - دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے تک بلغراد Belgrade اور زگرب Zagreb دونوں ہی بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ قومی رشتہ رکھنے کے مدعی تھے، چنانچہ مسلم آبادی کے ایک حصّے نے، جو زیادہ‌تر تعلیم یافتہ شہری طبقے پر مشتمل تھا، مذکورہ علاقوں میں بالترتیب اپنے سرب اور کروٹ ہونے کا اعلان کر دیا.

بایں ہمہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت غیر متأثر رہی اور انہوں نے اپنے آپ کو سرب یا کروٹ ظاہر کرنے سے احتراز کیا - جدید یوگوسلاویا میں قومیت کے مسئلے پر شخصی رائے اور احساسات کا کامل طور پر لحاظ رکھا گیا ہے - نتیجةً سربوکروٹ زبان بولنے والے مسلمان اس معاملے میں آزاد ہیں کہ اپنے آپ کو سرب ظاہر کریں یا کروٹ، یا اپنی قومیت کو ظاہر ہی نہ کریں - دیگر اسباب کے علاوہ یہ واقعہ کہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں سربوکروٹ بولنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جو اپنی قومیت کی تعیین نہیں کرتے، بوسنیا اور ہرزگووینا کو یوگوسلاویا میں ایک جداگانہ جمہوریہ بنانے میں فیصلہ کن ثابت ہوا.

ترکوں کی چار سو برس کی حکومت (۸۶۷ھ / ۱۴۶۲ تا ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) کا نتیجہ نہ صرف یہ نکلا کہ آبادی کا ایک بڑا حصّہ مشرف باسلام ہو گیا بلکہ پورے ملک میں اس کا ایک نقش بھی باقی رہ گیا - بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں اور غیرمسلموں سبھی کی زبان سربوکروٹ ہے - نتیجةً مشرقی ثقافت کے عناصر نہ صرف مسلمانوں بلکہ بوسنیا اور ہرزگووینا کی کل آبادی کے انداز اور طریق معاشرت میں مضبوطی

سے جڑ پکڑ چکے ہیں . . . .

یہ عالمگیر جنگ ثانی اور یوگوسلاویا کی نئی حکومت کی انقلابی تدابیر انجام دینے کے بعد کی بات ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی صنعت‌کاری کی وجہ سے بوسنیا اور ہرزگووینا کے قدرتی وسائل سے پورا پورا کام لیا گیا ۔ ۱۹۴۵ء سے متعدد صنعتی کارخانے اور ادارے قائم کیے گئے ہیں ۔ چھوٹے بڑے برقآبی اور حربرقی (thermo-electric) قوّت پیدا کرنے کے مقامات بنائے گئے اور صنعت کان کنی کو عہد جدید کے مطابق بنا کر وسعت دی گئی ۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۳ء تک کے عرصے میں بوسنیا اور ہرزگووینا کی صنعتوں اور کان کنی میں جو سرمایہ لگایا گیا اس کی مجموعی رقم ۲۳۶۴۹۳۰ لاکھ دینار یا کل زیر عمل سرمائے کا ۶۱٫۳ فیصد ہے ۔ ملک کو بدرجۂ اَتم صنعتی بنانے کے اس دور کے بعد سرمایہ لگانے کی حکمت عملی میں قدرے ردّ و بدل اور حسب حال درستی کرنا پڑی ۔ ۱۹۵۷ء میں جو سرمایہ لگایا گیا اس کی مجموعی رقم پچھتر ارب چھیاسٹھ کروڑ ستر لاکھ بنتی ہے، جس میں سے تین لاکھ اڑتیس ہزار چار سو ساٹھ صنعت اور کان کنی پر صرف ہوئے ۔ ملک کو اس تیزی سے صنعتی بنانے کے نتائج بوسنیا اور ہرزگووینا کی زراعت پیشہ آبادی کے تناسب کی بابت سرکاری اعداد و شمار کی باضابطہ اطّلاعات سے بھی مترشح ہوتے ہیں جو حسب ذیل تھا :-

	۱۸۹۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۳۱ء	۱۹۴۸ء	۱۹۵۳ء
کاشتکاری ـ جنگل بانی اور ماہی گیری کا کام کرنے والے :	۸۸٫۴	۸۶٫۶	۸۳٫۴	۷۶٫۷	۶۳٫۵
دوسرے کام کرنے والے :	۱۱٫۶	۱۳٫۴	۱۶٫۵	۲۳٫۳	۳۶٫۵

قومی معیشت کے دوسرے شعبوں میں خصوصاً زرعی زمین کے استعمال اور مویشیوں اور بھیڑوں کی پرورش کے لحاظ سے ترقی کی شرح اتنی تیز نہیں رہی، لیکن زرعی حکمت عملی میں حالیہ رجحانات کے نتیجے میں اب زیادہ زور زمین کی کاشت اور زراعت کی دوسری اقسام پر دیا جانے لگا ہے ۔ ۱۹۵۷ء میں بوسنیا اور ہرز گووینا میں زرعی زمین ۲۶۱۳۰۰۰ ہیکٹر (ہیکٹر = ۲٫۴۷۱ ایکڑ) تھی، جس میں سے ۶۴٫۷ فیصد قابل کاشت تھی اور بقیہ چراگاہیں اور کوہستانی مرغزار (۳۵ فیصد) اور دلدلی اور نیستان (۰٫۱ فیصد) کی اراضی تھیں۔

جہاں تک ذرائع مواصلات کا تعلق ہے بوسنیا و ہرزگووینا ابھی تک اپنے پچھلے نامساعد حالات کا خمیازہ بھگت رہا ہے، خصوصاً ریل کی پٹری بچھانے کے معاملے ہیں ۔ ۱۹۵۷ء میں اس ملک میں دو ہزار ایک سو گیارہ کیلومیٹر ریل کی پٹری تھی، جس میں سے ایک ہزار تین سو انتالیس معیاری چوڑائی (چار فٹ آٹھ انچ) کی تھی اور اس کے مقابلے میں ایک ہزار تین سو انتالیس کیلومیٹر چھوٹی پٹری (چار فٹ آٹھ انچ سے کم) کی تھی۔

۱۹۵۶ء کے دوران میں بوسنیا اور ہرزگووینا کی قومی پیداوار کی مجموعی مالیت ۲۱۵۶۳۹۰ لاکھ دینار تھی ۔ بڑے بڑے ذرائع اور رقوم (لاکھ کے شمار میں) جو ہر ایک ذریعے سے حاصل ہوئیں، مندرجۂ ذیل تھیں:

صنعت اور کان کنی	۱۰۸۴۴۶۰
زراعت	۴۶۸۲۸۰
تعمیرات	۱۱۱۵۴۰
مواصلات	۱۹۸۷۷۰
جنگلات	۱۰۰۴۱۰
دستکاریاں	۵۶۵۳۰
تجارت اور سربراہی	۱۳۶۴۰۰

ملک کی کم ترقی یافتہ معاشی حالت کی طرح

لوگوں کی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں تہذیبی پسماندگی بھی موجود ہے ۔ آسٹریا ۔ ہنگری کی حکومت نے فرقہ وارانہ مدارس کا خاتمہ کیے بغیر سرکاری نگرانی میں ابتدائی مدارس قائم کیے ۔ ۱۹۱۱ء میں لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا، پھر بھی ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں صرف تین سو چوہتّر سرکاری نگرانی کے ابتدائی مدارس تھے ۔ سرکاری نگرانی والے اور فرقہ وارانہ مدارس کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ ان میں پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں کی فقط ۱۸٫۵۵ فیصد کو تعلیم دی جا سکتی تھی ۔ مملکت یوگوسلاویا کی حکومت صرف سرکاری ابتدائی تعلیم کے مدارس کو تسلیم کرتی تھی، مگر پھر بھی پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں میں سے بمشکل ایک تہائی ہی داخل ہو سکتے تھے ۔ ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ء میں ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد صرف ایک ہزار بانوے تھی، اس لیے اس وقت تک بڑے پیمانے پر ناخواندگی پھیلی رہی ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مدارس کی تعداد بڑھانے اور بالغوں کی ناخواندگی کم کرنے کی عظیم مساعی کے باوجود ۱۹۵۳ء کے سرکاری اعداد و شمار مظہر ہیں کہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں دس برس کی عمر سے زائد کل اکیس لاکھ سولہ ہزار اشخاص میں سے دو لاکھ پچیس ہزار ناخواندہ مرد اور چھے لاکھ پندرہ ہزار ناخواندہ عورتیں تھیں.

۱۹۴۵ء اور اس کے بعد کے سنین میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں خواندگی اور تعلیم کا معیار بلند کرنے کی خصوصی کوششیں کی گئیں، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں کل دو ہزار چار سو چھے ابتدائی تعلیم کے مدارس (جن میں تسلسلی اور ہشتسالہ تعلیم کے مدارس شامل ہیں)، سینتیس بڑے مدارس (ثانوی کلاسیکی یا گرامر سکول)، ایک سو انسٹھ پیشہ ورانہ تربیتی مدارس اور ستائیس دوسرے مدارس تھے ۔ بالغوں کے لیے، چھبیس دوسالہ ابتدائی مدارس، دس ثانوی مدارس، کارکنوں کے لیے بارہ پیشہ ورانہ مدارس، انیس مدارس تربیت یافتہ کاریگروں کے لیے اور گیارہ دیگر مدارس تھے ۔ جنگ کے کچھ عرصے بعد سراجیوو میں سات شعبوں پر مشتمل ایک یونیورسٹی نیز ایک موسیقی کی اکادمی اور کئی سائنس کے ادارے قائم کیے گئے ۔ مزید برآں بوسنیا اور ہرزگووینا میں اب اساتذہ کے تین تربیتی کالج، متعدد بڑے (پیشہ ورانہ) تربیتی کالج، چھے تھیئٹر، ساٹھ سائنس کے کتب خانے، تین سو پچیس عوامی کتب خانے، اٹھارہ عجائب گھر اور ایک ریڈیو نشرگاہ ہے [بوسنہ کے تازہ حالات کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا بذیل مادّہ].

مآخذ : (۱) *Statistički godišnjak FNRJ za 1958*، بلغراد ۱۹۵۸ء؛ (۲) *Rezultati popisa stanovništva 1953*، کتاب ۱، *Vitalana i etnička obeležja* (عوامی جمہوریۂ یوگوسلاویا کا آفاقی دفترِ اعداد و شمار انگریزی اور فرانسیسی میں اعداد و شمار مہیا کر دیتا ہے)؛ *Informativni podaci o srezovima i opštinama* (جسے بوسنیا اور ہرزگووینا کے دفترِ اعداد و شمار نے شائع کیا)، سراجیوو، ۱۹۵۸ء؛ (۳) *Enciklopedija Jugoslavije*، جلد ۲، S.V. Bosna i Hercegovina) Zagreb ۱۹۵۶ء.

۲ - ترکی حکومت کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی تاریخ:

(الف) ترکوں کے زمانۂ عروج میں:

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلام کا تمکّن ترکی حکومت کے قائم اور مضبوط ہونے کے ساتھ وابستہ ہے ۔ ترکی کا پہلا حملہ ۷۸۸ھ/ ۱۳۸۶ء میں بوسنیا کے پہلے بادشاہ تورتکو (Tvrtko) ۱۳۵۳ تا ۱۳۹۱ء بادشاہ از ۱۳۷۷ء) کے عہد

حکومت میں ہوا جب کہ اس کی قوت اوج کمال پر تھی ۔ دوسرا حملہ ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں ہوا، جب ترکی فوجوں کو Vojvoda Vlatko Vuković کے ہاتھوں شکست ہوئی ۔ دوسرے ہی سال بوسنیا کی فوج نے سربیا کے والی (ڈیوک) لازار Lazar کی طرفداری سے Vlatko Vuković کی قیادت میں جنگ قوصوہ Kossovo میں حصہ لیا ۔ دوران جنگ میں سلطان مراد کو کاری زخم آیا اور وہ لڑائی کے خاتمے پر جان بحق ہو گیا ۔ پھر بھی شہزادۂ بایزید فتح پانے اور ڈیوک لازار کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ جنگ قوصوہ کے بعد ڈیوک کے جانشینوں کو ترکوں کی سیادت تسلیم کرنا پڑی ۔ سربیا کے باج گزار ہو جانے سے بوسنیا کی حیثیت بہت کمزور ہو گئی ۔ شاہ تورتکو کا جانشین صرف ان علاقوں پر حکومت کرنے کا مجاز ٹھیرا جو واقعی اس کی ملکیت تھے، جبکہ بوسنیا کا بیشتر حصہ آزاد امرا کے زیر اقتدار تھا، جن میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے علاقے پر پورا اقتدار حاصل تھا ۔ ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ - ۱۳۹۲ء میں ترکوں کی فتح سکوب (Skopje) سے ایک ایسے سرحدی علاقے کی تشکیل عمل میں آئی جس کے ڈانڈے بوسنیا اور سربیا سے ملتے تھے ۔ سکوب پہلے سنجاق بے پاشا یگت کا صدر مقام بنا، اس پاشا کا جانشین اس کا بیٹا اسحٰق ہوا ۔ ۸۱۸ھ/ ۱۴۱۵ء سے ترک یہاں بار بار تاخت کرتے رہے، جس کے نتیجے میں ملک کے اندرونی معاملات میں اور بوسنیا کے جاگیردار نوابوں اور تخت کے مدعیوں کی باہمی روزافزوں مخاصمتوں میں ترکیہ کا اثر و نفوذ بھی برابر بڑھتا ہوا محسوس کیا جانے لگا ۔ تورتکو ثانی (۱۴۲۰ تا ۱۴۴۳ء) نے اپنی تخت نشینی کے تھوڑے دن بعد ترکیہ کی سیادت کو تسلیم کر لیا، پھر ترکوں نے شاہان بوسنیا کو خراج ادا کرنے کا پابند بنا لیا (از ۸۳۲ھ/۱۴۲۸ - ۱۴۲۹ء) ۔ وہ چند موقعوں پر کئی شہروں میں عارضی طور پر قابض ہو گئے اور ان میں حفاظتی فوج متعین کر چکے تھے، لیکن نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ہودیجد Hodidjed اور اس کے نواحی علاقے، یعنی سراجیوو کے موجودہ ضلع میں انہوں نے اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لیے، اور یہاں ایک سرحدی (عسکری) صوبے کی تشکیل ہوئی جس کا نظم و نسق والی، سکوب عیسٰی بے بن اسحٰق بے کے ہاتھ میں تھا اور وہ براہ راست ایک اعلٰی ترکی عہدےدار کے ماتحت تھا جس کا خطاب وویودا voyvoda (= رئیس) تھا ۔ نظم و نسق کے لحاظ سے اس خطے میں دوعملی تھی، اس لیے کہ نواحی اضلاع کے بوسنوی رئیس ترکوں کے باج گزار تھے ۔ یہ انتظامی علاقہ ترکی کے ۸۰۹ھ / ۱۴۰۰ء کے دفتر جمع بندی میں باقاعدہ مندرج ہے لیکن اس میں سرای اووسی Saray Ovası نامی بستی کے بندوبست کا کوئی ذکر نہیں گو اسی نام کے ایک ضلع کا اندراج موجود ہے ۔ بہر نوع سراجیوو کی بنا پڑنے کی تاریخ مملکت بوسنیا کے زوال سے پہلے تک جاتی ہے، اس لیے کہ سرای اووسی کے قبضے کا اندراج ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ - ۱۴۶۲ء میں ہوا ہے ۔ اس زمانے میں Stjepan Tomaš (۱۴۴۳ تا ۱۴۶۱ء) تخت بوسنیا کا مالک تھا ۔ اس نے مغربی ممالک کی مدد پر بھروسا کیا، لیکن ترکوں کو خراج دینے کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکا ۔ اس موقع پر پاپاے روم نے نہ صرف بادشاہ کے کیتھولک مذہب اختیار کرنے کا بلکہ "الحاد" کے انسداد کرنے کا بھی مطالبہ کیا ۔ الحاد سے مراد (عیسائیوں کا) وہ نیا فرقہ تھا جو جبر و تعدی کے باوجود مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا اور ایک مستقل مذہب بن گیا تھا ۔ آخر کار بادشاہ نے بادل ناخواستہ ان

سلاحدہ کی دار و گیر کے احکام صادر کر دیے اور
انھوں نے ترکی کے مقبوضہ اضلاع اور اس علاقے
میں پناہ لی جو آگے چل کر ہرزگووینا بنا ۔ ترکوں
کو نہ صرف اس مملکت کے مذہبی مناقشات سے بلکہ
آبادی کے طبقاتی اختلافات سے بھی فائدہ پہنچا ۔
مملکت بوسنیا اور سربیا کی آمرانہ حکومت کو
بادشاہ کے بیٹے Stjepan Tomašević اور سربیا کی ایک
شہزادی کے درمیان شادی ٹھیرا کر متحدّ کرنے کی
کوشش کی گئی، مگر یہ اس آمرانہ حکومت اور
اس کے دارالحکومت سمدریوو Smederevo کے سقوط
پر منتج ہوئی (۱۴۵۹ء) - Stjepan Tomašević
(۱۴۶۱ - ۱۴۶۳ء) بوسنیا کا آخری بادشاہ اپنے
باپ سے کہیں زیادہ مغربی ممالک کی امداد کا
دست نگر ہوتا چلا گیا۔

۸۶۷ھ / ۱۴۶۲ - ۱۴۶۳ء میں جب بادشاہ
نے خراج ادا کرنے سے انکار کیا تو ترکی فوجوں نے
خود سلطان کی قیادت میں بوسنیا پر حملہ کر دیا
اور اسے بہ سرعت فتح کر لیا، مگر ترکی فوجوں کے
واپس ہٹ جانے کے تھوڑے دن بعد ہی ہنگری کے
بادشاہ کوروینس Matthias Corvinus نے بوسنیا پر
چڑھائی کر دی اور شہر جج سی Jajce اور
ملحقہ اضلاع پر قبضہ جما لیا ۔ دوسرے سال ہنگری
کی فوجوں نے سربرنک Srebrenik مسخر کیا اور
دو ''باناتیں'' (سرحدی ضلعے جن پر بان Bana
حکمرانی کرتا تھا) قائم کر دیں، جن میں سے ایک
کا صدر مقام جج سی میں اور دوسرے کا سربرنک میں
تھا ۔ ان دونوں کو ملا کر ہنگری کا ایک سرحدی
عسکری صوبہ بنا دیا گیا ، جس میں ساوہ Sava کے
جنوب کی پٹی کا اضافہ کر دیا گیا ۔ نویں صدی
ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں
یہاں سے متعدّد یلغاریں ہوئیں جن کی انتہا
سراجیوو کا سہ روزہ قبضہ تھا ۔ شاہ Matthias نے اپنے
ایک جاگیردار کو بوسنیا کا برائے نام بادشاہ بھی
بنا دیا تھا ۔ ادھر ترکوں نے اس سے بھی پیشتر
مملکت کے مفتوحہ اضلاع سابق خاندان شاہی کے
ایک عمزاد بھائی کو دے کر ایک برائے نام
بادشاہت قائم کر دی تھی جو صرف ۸۸۱ھ /
۱۴۷۶ء تک قائم رہی۔

بوسنیا کا پہلا سنجاق بے محمد بے مِنّت
اوغلو تھا ۔ ہرزگووینا کی سنجاق کی بنیاد ۸۷۴ھ/
۱۴۶۹ - ۱۴۷۰ء میں رکھی گئی (ہرزگووینا کا
بقیہ حصّہ ترکوں نے ۸۸۶ھ کے اختتام / ۱۴۸۲ء
کے آغاز میں فتح کیا تھا) ۔ بعد میں ایک اَور سنجاق
قائم ہوگئی، جس کا صدر مقام زورنک Zvornik میں
تھا ۔ ''باناتِ سربرنک'' ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں ترکوں
کے قبضے میں آ گئی، جنھوں نے مہاج Mohács کی
جنگ (۱۵۲۷ء یا ۱۵۲۸ء) کے بعد جج سی اور
بنالوقہ (Banjaluka) [رَكَ بان] پر بھی قبضہ کر لیا ۔
بوسنیا سے ترک لیکا Lika میں پہنچے اور انھوں نے
دالماچیہ Dalmatia کا بیشتر حصّہ بشمول حصار
کلس Klis قبضے میں لے لیا ۔ سلاوونیا Slavonia کی
فتح میں بوسنیا کا سنجاق بے بھی شریک تھا ۔

بوسنہ کی سنجاق کا صدر مقام سراجیوو میں
تھا (دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی
کے وسط تک) جہاں سنجاق بے غازی خسرو بے
نے بہت سی شاندار عمارات تعمیر کرائیں ۔ خسرو بے
وہاں ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ - ۱۵۲۰ء میں حاکم سنجاق
کی حیثیت سے آیا اور ۹۴۸ھ / ۱۵۴۱ء میں فوت
ہوا ۔ اس وقت تک سراجیوو کا شہر ایک وسیع اور
اہم مقام بن چکا تھا ۔ تاہم سنجاق کا صدر مقام
بنالوقہ میں منتقل کر دیا گیا (دسویں صدی ہجری /
سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب)، جس کا
تعمیری نقشہ اور تعمیر بحیثیت ایک اسلامی شہر
کے فرہاد سوکولووچ Sokolović (صوقوللو) کے

ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ فرہاد صوقوللو، جو بوسنیا کا والی تھا، پورے صوبے کا پہلا پاشا (= بیلربے) ہو گیا تھا ۔ ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں بوسنیا کی ''ایالت'' کی تشکیل ہوئی، جس کا صدر مقام بنالوقہ [رک بآں] مقرر ہوا، جو ان سات سنجاقوں پر مشتمل تھا: (بوسنیا، ہرزگووینا، کِلس، کرکہ، پکرج، زورنک اور پوزغا) ۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے موجودہ رقبے کے علاوہ اس ایالت میں سلاوونیا، لیکا اور دالماچیہ کے اقطاع نیز سربیا کے سرحدی اضلاع شامل تھے ۔ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل، یعنی سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ ایا'ت آٹھ سنجاقوں سے مرکب تھی، اور گیارھویں صدی ہجری کے پہلے عشرے کے اختتام / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں پوزغا کی سنجاق کو کنزسا Kanizsa کی ایالت میں شامل کر دیا گیا تھا.

ترکی فتح سے بوسنیا اور ہرزگووینا کی عمرانی ہیئت میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ اس زمانے میں جب بوسنیا ترکی کے قبضۂ اختیار میں آیا، سلطنتِ عثمانیہ کی عمارت کی بنیادیں اور تنظیم بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی.

ترکوں نے جب یہ ملک فتح کر لیا تو پھر اس میں اپنا معاشرتی نظام بھی رائج کرنا شروع کیا، جو سختی سے ایک مرکزی حکومت اور ان کے اپنے عسکری اور جاگیرداری آئین پر مشتمل تھا ۔ اس سے نتیجۃً معاشی اور معاشرتی معاملات میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ کان کنی، جو زراعت کے بعد سابقہ بوسنیا کے معاشی اشغال کی اہم‌ترین شاخ تھی، نئے حکمرانوں نے خود لے لی اور تمام کانیں سلطان کی ملکیت بن گئیں ۔ اعلٰی مرتبے کے طاقتور جاگیردار رئیسوں کا، جو اپنے اپنے علاقے کے مالک ہوتے تھے، دور ختم ہو گیا ۔ زمینداری کے طریقوں میں نظامِ تیمار [رک بآں] کا آئین جاری کیا گیا، جس کی باگ ڈور ایک مرکزی محکمے کے ہاتھوں میں تھی ۔ سنجاقوں کا انتظام ان کے والیوں کے ہاتھ میں تھا، جو براہِ راست سلطان کی نگرانی میں ہوتے تھے اور جن کی آمدنی بادشاہوں کے بعد سب سے زیادہ ہوتی تھی ۔ والیوں کی تبدیلیاں بہت جلد جلد ہوا کرتی تھیں ۔ دوسری طرف کسانوں پر سے دباؤ دور ہو گیا اور بھیڑوں کی پرورش میں ترقی ہونے لگی ۔ دیہاتی علاقوں میں عام طور پر برادری کے بزرگوں کی سرداری کے دستور چلتے تھے اور ایک حد تک اندرونی خود مختاری نظر آتی تھی.

اسی زمانے میں عظیم مذہبی اور نسلی تغیّرات رونما ہوے، جنھوں نے کل آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ وسیع پیمانے پر اسلام کی ترویج ہوئی، بعض کوھستانی، خصوصاً ہرزگووینا کے اضلاع میں پرورش حیوانات میں نمایاں طور پر ترقی ہوئی اور بھیڑیں پالنے والوں کو سر سبز زراعتی اضلاع میں، جو جنگوں وغیرہ کے سبب ویران ہوگئے تھے، دوبارہ آباد کیا گیا ۔ زرخیز علاقوں میں بس جانے کے بعد ایسے ہزاروں بھیڑیں پالنے والے زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس طرح ویران علاقوں کی بہتری کے لیے کام کرنے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد فراہم ہو گئی ۔ اس بات کے پیش نظر کہ آبادکاروں کی حیثیت سے انھیں بڑی اہمیت حاصل تھی، گلّہ پروروں کی حیثیت سے جو مراعات پہلے انھیں دی گئی تھیں وہ بھی بحال رکھی گئیں ۔ تاہم جاگیرداری نظام اور مستقل آبادکاری کی ترقی کے ساتھ یہ آبادکار کثرت سے مزارع یا ''رعایا'' بن گئے ۔ ان میں چونکہ بیشتر کلیساے یونان کے پیرو سرب تھے لہٰذا بہت سے اضلاع، جن میں پہلے کوئی سرب آبادی نہ تھی، اب ان سے آباد ہو گئے.

دوسری طرف اسلام کے پھیلنے کی وجہ سے

حکمران مذہب کو تمام طبقوں، یعنی کسانوں، جاگیرداروں اور شہری لوگوں میں سے اپنے پیرو اور طرف دار حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی ۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں اشاعتِ اسلام کے موضوع کا ابھی تک جامع انداز میں مطالعہ نہیں کیا گیا، اس لیے یہ ابھی ایک حل طلب مسئلہ ہے ۔ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے عام مسلّمہ رائے یہ تھی کہ عیسائیوں کے ایک فرقے کے متبعین، جو بگومل Bogumils کہلاتے ہیں، کی پوری جماعت حلقه بگوش اسلام ہو گئی ۔ جس کا سبب اخلاقی قوانین میں نظریات کی یکسانی اور کلیسائے روم کی طرف سے ان پر سابقہ جور و تعدّی بتایا گیا ہے ۔ آج بھی کئی محقّق (A. Solovjev و دیگر) یہ رائے رکھتے ہیں ۔ امرائے بوسنیا چونکہ سارے کے سارے اکٹھے مشرف به اسلام ہوے تھے، لہٰذا انھیں اپنی جاگیریں بدستور رکھنے کی اجازت دے دی گئی اور اس طرح بوسنیا اور ہرزگووینا میں زمین کے دوامی حقِ کاشت کے روایتی طریقے میں تیرھویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ نظامِ تیمار محض بالائی ڈھانچے کے طور پر رائج کر دیا گیا ۔ پہلی عالمگیر جنگ سے قبل اس نظریے کے بڑے بڑے مؤیّدوں میں سے ایک Truhelka تھا ۔ Ć. Truhelka اور دوسروں کے قول کے مطابق بوسنیا کو بالکل ابتدا ہی سے سلطنت عثمانیه میں ایک جداگانه حیثیت حاصل تھی ۔

دونوں عالمگیر جنگوں کے درمیانی زمانے میں یوگوسلاویا کے بعض مؤرّخوں (V. Čubrilović اور V. Skarić) نے ان نظریات کو بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ ان کی رائے یه تھی که (الف) اسلام کی ترویج بتدریج ہوئی تھی؛ (ب) فتح کے بعد نظامِ تیمار قائم ہو جانے کے سبب امرائے بوسنیا کے پاس ان کی جاگیریں باقی نہیں رہی تھیں اور (ج) دوامی حقِ کاشت کا آئین، جیسا که اٹھارھویں صدی عیسوی میں رائج تھا اور بعد کی صدی میں جاری رہا، اس نے صرف پرانے زمینداری نظام کے قالب کے اندر ہی بتدریج نشو و نما پا کر یہ صورت اختیار کی تھی ۔

جدید یوگوسلاوی مؤرّخوں نے اوّل درجے کے ترکی مآخذ کی طرف توجّه دلائی ہے، خصوصاً جمع بندی کے دفاتر کی طرف، جن سے زیرِ بحث زمانے میں یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ پر روشنی پڑنے کا امکان ہے، تاہم ان تحقیقات کے سارے نتائج ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے . . . .

بوسنیا کے جاگیردار شروع ہی میں ترکوں کی طرف آنے لگے تھے، جب که انھیں اپنے مناقشات کے تصفیے کے لیے بارسوخ ترکوں کا سہارا لینا پڑتا تھا، چنانچه پفلووچ Pavlovic کے ڈیوک خاندان کی زمین کا اندراج ۸۵۹ھ / ۱۴۵۴ ـ ۱۴۵۵ء کی جمع بندی میں یکمشت خراج (مقاطعه) ادا کرنے والی زمین کی حیثیت سے ہوا تھا (دیکھیے باش وکالت آرشیوی، مالیه دفتر، ص ۴۴۵) ۔ Herzeg Stjepan کی روش خاصی مدّت تک ترکوں پر مکمل اعتماد کی رہی ۔ اس کے بیٹوں کو بھی اسی طرح کچھ عرصے تک ترکوں پر اعتماد کرنا پڑا ۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ترکوں کی طرف چلا گیا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور ہرسک زاده احمد پاشا کے نام سے بایزید ثانی اور سلیم اوّل کی حکومتوں میں پانچ مرتبه وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا ۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے باشندوں کی ایک معقول تعداد، جو نومسلم جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی، نیز قانون "دیوشیرمه" Devshirme کے ذریعے "رعایا" سے فراہم کیے ہوے اور دربار سلطانی کے تعلیم یافته نوجوان آگے چل کر وزیر یا وزیر اعظم کے عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے ۔

محمد پاشا سکولوچ (صوقوللو) جو ممتاز ترین عثمانی مدبّروں میں سے تھا اور ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء سے ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء تک وزیر اعظم رہا، بوسنیا کے ایک معزز سربی خاندان سے تھا جس کے عیسائی رشتہ‌دار پچ Peć کی بطریقی کی بحالی (۱۵۵۷ء) کے بعد سربیا کے بطریق ہوے ۔ بوسنیا نژاد اشخاص کے، جو جلیل القدر عہدوں پر فائز تھے، اور ان کے اقارب کے درمیان خون کے رشتوں نے بوسنیا کے بعض (مسیحی) خاندانوں کو جاہ و دولت دلوانے میں بڑی مدد دی . . . .

عیسائی ''سپاہیوں'' کی مسلمان اولاد اور نو مسلم خاندانوں کے افراد جنھوں نے ترکی حکومت کے تحت اپنی حالت کو سنوار لیا تھا بعد میں ''سپاہی'' اور ''زعیم'' کی حیثیت میں نیز حصاروں کے دزداروں [قلعه‌داروں] اور دیگر اعلٰی عہده‌داروں کی حیثیت میں ملتے ھیں ۔ بوسنیا کو سرحدی علاقه ہونے کی وجه سے جو اہمیت حاصل تھی، اس سے وہاں کے اصلی مسلمان باشندوں کو اثر و رسوخ اور قوت حاصل کرنے میں مدد ملی ۔ یه سچ ھے که ترکی افواج کی ظفریابی اور حکومت ھنگری کے ماتحت علاقوں پر حملے کے بعد کثیرالتعداد سپاهیوں کو نئے مفتوحه علاقوں میں آباد ہونے کا حکم دیا گیا، لیکن اس کے بعد وہ نتائج ظہورپذیر نہیں ہوے جو سربیا میں ہوے تھے، جہاں ترکی کے ھنگری پر حمله کرنے کے ساتھ ھی اشاعتِ اسلام کا سلسله عملاً ختم ھو گیا ۔ بوسنیا اور هرزگووینا میں اشاعتِ اسلام کا نتیجه یه نکلا که مسلمان وسیع پیمانے پر نه صرف شہری لوگوں میں سے بلکه دیہاتی لوگوں میں سے بھی بھرتی کیے گئے .

ترکی حکومت کے قیام کے بعد بوسنیا کے شہر ترقی کرنے اور بڑھنے لگے ۔ ترکی کاریگری، خصوصاً مشرق قریب کی صناعی کی خصوصیات بوسنیا کے پہلے دور کی دستکاری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافته تھی ۔ نتیجةً بوسنیا اور هرزگووینا میں ترکی حکومت کی پہلی دو صدیوں میں دستکاریوں اور اهل حرفه کی برادریوں نے بہت ترقی کی ۔ چرم سازی، زرگری اور ان صنعتوں میں جو عسکری ساز و سامان تیار کرنے اور شہری لوگوں کی ضروریات مہیا کرنے سے تعلق رکھتی تھیں بہت زیادہ ترقی ہوئی ۔ اس کے برعکس عثمانی صنعت کان‌کنی بوسنیا یا سربیا کی به نسبت کم ترقی یافته تھی جہاں سیکسنی Saxon آبادکاروں نے کان‌کنی کے اپنے فنی طریقے اور قواعد رائج کیے تھے ۔ کانوں کے علاقوں میں، جو شاهی جاگیروں (''خاص'') میں مدغم ہو گئے تھے، ترکی حکام کے دفتر شاهی ضوابط کے اجرا سے صنعت کان‌کنی کو ترکی حکومت کی ابتدائی صدی میں دھکا لگا اور اس کے نتیجے میں پیداوار کم ہو گئی خصوصاً قیمتی پتھروں کی پیداوار، لیکن لوہے کی پیداوار میں خفیف سا اضافه ہوا ۔ ان اسباب کی بنا پر بوسنیا اور هرزگووینا میں شہروں کی ترقی — عسکری وجوه کے علاوه جو شہروں کے محلّ وقوع کے انتخاب اور بنانے کے لیے اهم ترین عنصر تھیں — صنعت کان‌کنی کے ساتھ وابسته نہیں تھی، بلکه دستکاریوں کی ترقی اور ان کی متعلّقه تجارت کے ساتھ وابسته تھی ۔ ترکوں کے بنائے ہوے تمام شہر ایسے مقامات پر واقع ہوتے تھے جہاں رسل و رسائل کے مواقع لازماً اچھے ہوتے تھے ۔ دسویں صدی هجری / پندرهویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف کے بعد بوسنیا کے قدیم کان‌کنی کے شہروں میں اشاعتِ اسلام کا سلسله شروع ہوا، لیکن سست رفتار تھا اور ان کی آئنده ترقی کے لیے اتنا سازگار نه تھا جتنا ان شہروں میں جو ترکوں نے سابقه منڈیوں کے مقامات پر بنائے ۔ من جمله دوسرے شہروں کے اس کی ایک عمده مثال

سراجیوو اور بنالوقه کے شہر ہیں جو ترکی حکّام اور چھاؤنیوں کے صدر مقامات ہونے کی حیثیت سے وسیع ہوے اور صنعتی مرکزوں اور تجارتی نوآبادیوں کی شکل میں ترقی کر گئے - مسلم دفتری ملازمین اور فوجی سپاہیوں کے علاوہ، ایسے شہروں کی آبادی، مسلمانوں کے مختلف مقامات سے یہاں آ جانے کے سبب بڑھتی چلی گئی - یه مسلمان مشرقی رسوم اور آداب زندگی اپنے ساتھ لائے - بہرحال شروع میں علاقۂ دبرونک Dubrovnik کے تجّار ھی یہاں بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے.

بوسنیا اور هرزگووینا میں اهم‌ترین شہروں کی بنا انفرادی والیوں کی ذاتی اپج کی مرهونِ منت تھی - ان شہروں میں اور ان کے اردگرد ھی والیوں کی ذاتی املاک، کارخانے، مکانات، حمّام اور دکانیں ہوا کرتی تھیں، جنھیں وہ اپنی زندگی ھی میں مذھبی اور رفاھی مقاصد کے لیے وقف کر جاتے تھے - اس طرح مسجدیں، تکیے اور دینی مدارس کثرت سے تعمیر ہوے، نیز کتب خانے بنے، جو مساجد یا مدارس کے ساتھ ملحق ہوتے تھے، اور درویشی سلسلوں نے ایسی تقریبات و رسوم جاری کیں جو شہری آبادی کی دل‌کشی کا موجب ہوں - غرض بوسنیا کے شہر ترکی قوت کے حصار اور اسلامی ثقافت کا رکن رکین بن گئے - شہروں سے دیہاتی علاقے بھی متأثر ہوے، جہاں سے کسان اور دوسرے لوگ کثرت سے شہر کی طرف کھنچے چلے آتے تھے - شہروں میں نقل مکانی کرنے والوں میں اکثریت کسانوں کی تھی جو مشرف باسلام ہو چکے تھے، اور شہری غیر مسلم بھی جلد ھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے، چنانچه شہروں میں عیسائی اور یہودی باشندے بہت قلیل تعداد میں رہ گئے تھے.

بوسنیا اور هرزگووینا کی سنجاقوں کے سب سے پہلے ترکی جمعبندی کے دفاتر سے ایسی تحریری شہادت ملتی ھے جو اس بات کی تصدیق کرتی ھے کہ ابتدا میں شہروں اور ان کے مضافات کے باشندے جوق در جوق بگوش اسلام ہوے - اس عہد کے آغاز میں، جیسا کہ سرکاری کاغذات سے عیاں ھے، بوسنیا کی سنجاق میں نومسلم کسان صرف سراجیوو کے شہر کے اردگرد ھی پائے جاتے تھے - ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء میں اس سنجاق میں پچیس ہزار سے زائد عیسائیوں کے مکانات اور تیرہ سو سے کچھ اوپر عیسائی بیواؤں کے مکانات تھے اور چار ہزار سے زائد غیرشادی‌شدہ مسیحی مرد تھے - اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے تقریباً چار ہزار پانچ سو مکانات اور دو ہزار تین سو سے زائد مجرد ذکور تھے (قبّ باشی وکالت آرشیوی، تاپو دفتری عدد ۲۴) - هرزگووینا کی سنجاق کے سب سے پرانے جمعبندی کے دفتر براے سال ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷ء سے صاف طور پر واضح ھے (تاپو دفتری عدد ۵)، اور اسی طرح دوسرے دفاتر سے بھی عیاں ھے کہ اسلام آناً فاناً نہیں پھیلا تھا اور نه اس مفروضے کے ثبوت میں کوئی شہادت موجود ھے کہ بےقاعدہ فوج کے مسیحی سپاھی جو بوسنیا کے الحادی کلیسا سے تعلق رکھتے تھے، فاتحین سے جوق در جوق مل گئے تھے - صرف هرزگووینا کے بعض کوهستانی دیہاتوں ھی میں، جیسا کہ دفاتر سے مترشّح ھے، "بوسنیا کے کلیسا کے مخلص ماننے والے" (Krstjani) پائے جاتے تھے - نیز کاغذات میں یه بھی ھے کہ بوسنیا کے کلیسا کے کچھ ماننے والے بوسنیا کی سنجاق کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھی رہتے تھے - ان کی موجودگی کی یه واحد نظیر تھی - ایسا معلوم ہوتا ھے کہ بادشاہ Stjepan Tomaš اور بادشاہ Stjepan Tomašević کے عہد حکومت میں عیسائی ملاحدہ پر بیس برس تک جو تعدّی ہوتی

رہی اس کے سبب بوسنیا کا الحادی کلیسا درہم برہم ہو گیا۔ Herzeg Stjepan Vukčić کے راسخ العقیدہ فرقے میں دوبارہ آ جانے نے بھی ہرزگووینا میں بوسنیا کے الحادی یا جداگانہ کلیسا کی حیثیت کو کمزور کر دینے میں ضرور حصّہ لیا ہوگا ۔ ترک حکومت نے سربیا کے کلیسائے یونانی (قدیم) کو تسلیم کر لیا تھا ۔سلطان کی برات (رك بآں) [فرمان] کے ماتحت اس کلیسائے قدیم (Orthodox) کو بہت سے حقوق و مراعات حاصل تھے ۔ کیتھولک کلیسا کو بھی سلطان محمد ثانی فاتح کی طرف سے بعض مراعات حاصل ہوئیں ۔ جمعبندی دفاتر کے اعداد و شمار سے یہ بات عیاں ہے کہ ''بوسنیا کے کلیسا کے مخلص پیرو'' (یعنی نام نہاد الحادی فرقے کے عیسائی) ہرزگووینا کے دورافتادہ الگ تھلگ اضلاع میں چلے گئے تھے ۔ اس بات کی کوئی تحریری شہادت موجود نہیں ہے کہ اس زمانے میں ملک کے ان اضلاع میں اسلام کی اشاعت ہوئی یا لوگ مشرف باسلام ہوئے، لہٰذا اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ بوسنیا کے مسیحی ملاحدہ بیشتر علاقوں میں پہلے ہی سے (یونانی یا کیتھولک کلیسا) میں واپس آ چکے تھے ۔ اس سے اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ یہ ملاحدہ یا بوسنیا کے کلیسا کے پیرو جوق در جوق مشرف باسلام ہوئے تھے ۔

بایں ہمہ یہ قرین قیاس ہے کہ کیتھولک کلیسا کی سابقہ جور و تعدّی اور ساتھ ہی (راسخ العقیدہ) یونانی کلیسا کے دباؤ سے، جسے کلیسائی محصولات وصول کرنے کا حق حاصل تھا، بوسنیا کے کلیسا کے قدیم متبعین کے قبول اسلام کے لیے حالات سازگار بن گئے ہوں ۔ بہر حال اسلامی مراکز کے طور پر شہروں کی نشوونما اور ملحقہ دیہاتی علاقوں پر ان کے اثر و نفوذ کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام بعض علاقوں میں بہت پہلے، یعنی نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی ہی میں مستقل طور پر دیہاتیوں میں پھیلتا چلا گیا ۔ اس طرح دھقانوں میں وسیع پیمانے پر اشاعت اسلام کی بنیاد پڑی ۔ اسلام لانے والے دھقانوں کو پوتور [یعنی نو مسلم] کا امتیازی نام دیا گیا ۔ ان کا مذھب اسلامی اور دیگر عناصر، یعنی نیم عیسائی جاھلی اور عیسائی نیز ملحد عیسائیوں کے عقائد سے مرکب تھا ۔ اسی بنا پر مسلمان جاگیردار اور مذھبی اھل علم ان مسلمان دھقانوں کو اپنے برابر سمجھنے پر مائل نہ تھے ۔

سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے دوران میں جاگیردار طبقے کی، جو اس وقت تک کامل طور پر مسلمان ہو چکا تھا، روزافزوں قوت کو روکنے کے لیے اقدامات کیے گئے ۔ بوسنیا کے ''سپاھیوں'' کو نئے مفتوحہ علاقوں کی طرف بھیج دیا گیا اور ان کے خالی کردہ '' تیمار'' دوسرے اضلاع کے ''سپاھیوں'' کو تفویض کر دیے گئے ۔ چفتلکوں کی ھیئت بدل دی گئی اور انھیں ''رعایا''، یعنی کاشتکاری اراضی بنا دیا گیا ۔ اس عہد میں اور زیادہ تر آئندہ زمانے میں متعدد درباری ناجائز وسائل اور رشوتوں کے ذریعے بوسنیا میں جائدادیں حاصل کرنے لگے ۔ پھر بھی دفاعی ضروریات خصوصاً سرحدی علاقوں کے دفاع کے پیش نظر اور کثیر اراضی کے ویران و خراب ہو جانے کے باعث یہاں کے لیے رعایتیں دینا پڑتی تھیں ۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف کے بعد جاگیردار رئیسوں اور فوجی حکام کے پاس جو ''چفتلک'' اراضی تھیں ان کی تعداد بالخصوص سرحدی علاقوں میں بدستور بڑھتی چلی گئی ۔ قپودان (کپتان) کا عہدہ پہلے سرحدی علاقوں کے دریاؤں کی نگہداشت سے متعلق تھا، اب وہ اضلاع کے قلعوں اور دفاعی استحکامات کی نگرانی کا عہدہ ہو گیا اور اس کے دفتر سے مقامی

جاگیرداروں کا طبقہ ھمیشہ مؤثر امداد حاصل کرنے کا یقین رکھ سکتا تھا ۔ بوسنیا کی جداگانہ ایالت، یعنی صوبہ‌داری قائم ھوئی تو وھاں کے ملکی طبقۂ امرا کی روز افزون اھمیّت میں مزید اضافہ ھوگیا ۔

دسویں صدی ھجری / سولھویں صدی عیسوی کا آخری نصف بوسنیا کے خاص خاص شہروں کے بڑی تیزی سے نمو پانے اور ترقی کرنے کا زمانہ ثابت ھوا ۔ اس کے نتیجے میں اطالوی شہروں کے ساتھ مقامی حوصلہ‌مند تجّار اور Dubrovnik سوداگروں کی تجارت میں بھی مستقل اضافہ ھوتا چلا گیا ۔ مسلمان باشندے چونکہ اکثریت میں تھے، اس لیے انھیں بعض مراعات حاصل تھیں اور وہ عیسائی آبادی سے علیحدہ خاص محلّوں میں رھتے تھے ۔ نوواردوں کے ھجوم کے سبب بعض اھل حرفہ کی جماعتوں نے ان پر اپنا دروازہ بند کر دیا، لہٰذا مسلمان آبادی ساوہ سے پرے کے شہروں اور مقامات میں نقلِ مکانی کر گئی ۔

(ب) ترکی قلمرو میں بحران کا زمانہ اور عثمانی ترکوں کی عسکری شکستیں:

بوسنیا کی ایالت کے انتظامی ڈھانچے اور حدود نے گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جو متعیّن صورت اختیار کر لی تھی، تقریباً اس صدی کے اواخر تک اس میں کوئی رد و بدل نہیں ھوا ۔ ان دنوں ایالت کے والی کا لقب وزیر ھوتا تھا اور دارالحکومت ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء میں بنالوقہ سے سراجیوو میں تبدیل ھوگیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

بوسنیا کے ''سپاھیوں'' کے مطالبات کو جنھیں صوبہ دار (پاشا) کی تائید حاصل تھی، تسلیم کرتے ھوے سلطان احمد (۱۶۰۳ تا ۱۶۱۷ء) نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے ''تیماروں'' کو خاندانی وراثت کے حقوق (''اوجاق لق'') مل گئے ۔ مرحوم کے بیٹے، بھائی یا خاندان کے ساتھ رھنے والے دیگر رشتےدار وارث ھوتے تھے ۔

زمین کے حقِ کاشت اور معاشی حکمت عملی میں تغیّرات سے زیادہ‌تر عیسائی کسان ھی متأثر ھوتے تھے، مسلمان کسانوں کی زمینوں میں شاذ و نادر ھی مداخلت کی جاتی تھی ۔ بڑھے ھوے محصولات اور استحصال زر نے کسانوں کے ان دو طبقوں میں اور زیادہ فرق پیدا کر دیا ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عیسائی کسان کثرت سے سرحد کے پار بھاگ بھاگ کر جاتے لگے اور ایسے اشتہاری مجرموں (ترکی میں هایدوت) [معرب شکل حیدود، جمع حیادید] کی تعداد بڑھ گئی جو رھزن بن کر شاھراھوں کے امن و امان کے لیے خطرہ بن گئے ۔

زراعت اور قومی معیشت کے دیگر شعبوں میں ترقی کے رجحانات جو ابتدائی عہد میں واضح تھے، دسویں صدی ھجری / سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی عیسوی کے دوران میں اور زیادہ نمایاں ھو گئے ۔ صنعتِ کان کنی بدستور زوال پذیر رھی اور اس صدی کے اواخر میں وہ اپنی انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی ۔ سولھویں صدی کے نصف آخر اور سترھویں صدی کے نصف اول میں بڑھتی ھوئی تجارت اور کاروبار کے سبب شہر بڑھتے اور ترقی کرتے رھے ۔ بندر ڈبرونک Dubrovnik کی حریف بندرگاہ سپلٹ Split کا ۱۵۹۲ء میں کھل جانا بوسنیا کی تجارت کے لیے بڑی اھمیت کا واقعہ ثابت ھوا ۔ شہروں کے اھل حرفہ کی جماعتیں کلیۃً ینی‌چری سپاھیوں کے زیرِ تسلّط آئیں اور اس سے یہ اور بھی محدود تنظیمات کی صورت میں بدل گئیں ۔ شہری اَعیان [رکِ بآں] اور ذی اثر ''آغا'' روزافزون تعداد میں نمودار ھوے ۔ تاھم شہروں کی آبادی کا ایک حصّہ عیسائی تھا، جس میں سے کچھ

اہل حرفہ اور دکان‌دار تھے - دیہاتی لوگوں کے کثرت کے ساتھ شہروں میں نقل مکانی کر کے آ جانے سے متروکہ زمینوں پر لگان بہت زیادہ بڑھ گیا - دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اور گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں بعض شہر وسعت و اھمیّت میں بڑھ گئے، خصوصاً شہر سراجیوو، مگر جمع شدہ سرمائے کی بہتات سودخواری کے رواج کو فروغ دینے کا باعث ہوئی - مسلمانوں کی خوشحال جماعت کے علاوہ شہروں میں امیر تاجروں اور سوداگروں کے عیسائی خاندان بھی تھے اور یہ عیسائی سودخوار تھے - شہری معاشرت کی ہیئت سے مترشح ہوتا تھا کہ دولت‌مند اور سیاسی لحاظ سے بارسوخ طبقے اور شہری غربا کے ادنٰی طبقے کے درمیان زیادہ نمایاں فرق ہوتا جاتا ہے - گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں سراجیوو کے مفلوک‌الحال لوگوں میں، جو زیادہ‌تر مسلمان تھے، شدید قسم کی شورشیں اور بلوے ہوے۔

گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں یورپ میں ''تیس سالہ جنگ'' ترکوں کے خلاف کسی بڑی عسکری کارروائی میں مانع رہی، لیکن اس صدی کے نصف آخر میں دو طویل جنگیں بڑے مصائب لائیں اور انھوں نے ایالت بوسنیا کی معاش اور معاشرت کا معیار پست کر دیا - وینس کے خلاف جنگ (۱۶۴۴ تا ۱۶۶۹ء) اور ھبس‌برگ Habsburgs کے خلاف نسبۃً مختصر جنگ (۱۶۶۳ تا ۱۶۶۴ء) دونوں ان علاقوں میں ہوئیں جو ایالت بوسنیا سے تعلق رکھتے تھے اور یہاں بار بار یورشیں واقع ہوئیں - اس وجہ سے عیسائی آبادی سرحد پار چلی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پناہ‌گیروں میں سے بیشتر لوگ، جو اُسکوجی کہلاتے تھے، وینس کی فوج میں بھرتی ہو گئے - ھرزگووینا میں بھی بےچینی تھی اور لوگوں نے شورشیں برپا کیں - جنگوں کے بعد چودہ برس تک خوش‌آئند امن کا دور دورہ رہا اور اس کا نتیجہ مجموعی طور پر ترکی قوت کے استحکام کی صورت میں نکلا - وی‌انا پر حملے سے ''اتحاد مقدّس'' (Holy Alliance) کے ساتھ نئی جنگ کا آغاز ہوا، جو بہت عرصے تک رہی (۱۶۸۳ تا ۱۶۹۹ء) - ایک مرتبہ ساوہ کے جنوب میں بوسنیا کا علاقہ اصل میدان کارزار بننے سے تو بچ گیا لیکن بوسنیا کے ایک لشکر کو جنگ میں حصّہ لینا اور سرحدوں کی مدافعت کرنا پڑی - ۱۶۸۸ء میں آسٹریا کے فوجی دستے ساوہ کے جنوب میں چند اضلاع پر عارضی طور پر قابض ہو گئے اور نو سال بعد شہزادہ یوجین Eugene نے جنگ سنٹا Senta کے بعد سراجیوو تک پیش‌قدمی کی اور ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۷ء میں اسے جلا ڈالا - عیسائی آبادی خصوصاً رومن کیتھولک ترک وطن کر گئے اور حملہ‌آور فوج کے ساتھ پسپا ہوگئے - یہ طویل جنگیں اپنے پیچھے طاعون کی وبا چھوڑ گئیں۔

کرلووکی Karlovci کے صلح نامے (۱۱۱۰ھ / ۱۶۹۸ - ۱۶۹۹ء) کی شرائط کے تحت بوسنیا کی ''ایالت'' میں معمولی ردّ و بدل کے ساتھ شمال مغرب کی جانب بوسنیا اور ھرزگووینا کی موجودہ سرحدیں قائم رہیں . . . .

مسلمان مہاجرین، جو ہنگری کو حوالے کیے ہوے علاقوں، سلاوونیا، کروٹیا اور دالماچہ سے بوسنیا کی متروکہ یا کم‌آباد زمینوں پر آباد ہونے کے لیے آئے، انھیں چنتلک کی حیثیت سے یہ زمینیں قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دی گئی - یہ آبادکار عیسائی حکومتوں اور عیسائی بغاوت کرنے والوں سے سخت ناراض تھے اور اس بات نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں اور زیادہ اختلافات اور تفرقہ پیدا کیا - نو آبادکاروں کی کچھ تعداد

شہروں میں آ گئی جن میں بیشتر تاجر، صنعت‌کار اور فوجی لوگ تھے۔

ایالت بوسنیا کے معرض خطر میں ہونے کے سبب مسلمان آبادی کو بڑی جانفشانی کرنا پڑتی تھی - پژاروَک Požarevac کے صلح نامے (۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۷ - ۱۷۱۸ء) کے تحت ساوہ کے جنوب میں ایک پٹی آسٹریا کے حوالے کر دی گئی تھی اور مغربی سرحد کے گرد و پیش کی کچھ علاقے بھی آسٹریا اور وینس کے قبضے میں چلے گئے تھے، مگر طاعون کی تباہ کاریوں، ساتھ ھی فصلوں کی خرابی کے تسلسل اور بھاری جانی نقصان کے باوجود، جو بوسنیا کے ''سپاھیوں'' کو اٹھانا پڑے تھے، حکیم اوغلو علی پاشا کی قیادت میں ایک بوسنیائی فوج نے ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں آسٹریا کی فوج کو بنالوقه کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی - معاهدهٔ بلغراد (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) نے آسٹریا کو بجز قلعهٔ گُرجان کے باقی ان تمام علاقوں سے بے دخل کر دیا جو معاهدهٔ پژاروَک کی رو سے اس کے قبضے میں آ گئے تھے۔ . . .

بوسنیا کے صوبے‌دار (وزرا) دولت حاصل کرنے کی خاطر اور ان محصولات اور رشوتوں کے عوض جنھیں وہ یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے دیتے تھے صوبے میں نئے نئے محاصل یا رسوم و مواجب جاری کرتے یا ان کی شرحیں بڑھا کر اپنا تاوان وصول کر لیتے تھے - یہ واقعہ ھے کہ محصولات کی تاریخ ادائی سے چھے تا نو ماہ پیشتر ھی بارہا ان کی پیشگی ادائی کے طور پر کچھ سامان رکھوا لیا جاتا تھا - انھیں باتوں سے مشتعل ھو کر مفلوک‌الحال شہری اور مسلم کسان بارھویں صدی ھجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب دس برس تک بغاوتیں اور شورشیں برپا کرتے رھے - ان حالات نے شہر اور مفصّلات دونوں کی تجارت پر یکساں مضر اثرات ڈالے اور ملک کی اقتصادی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن گئے۔

آسٹریا اور ترکی کے درمیان جنگ (۱۷۸۸ تا ۱۷۹۱ء) میں سرحدی اضلاع کی مدافعت کی ذمے‌داری بوسنیا کی افواج پر تھی - بعض سرحدی قلعوں پر قبضہ کرنے (۱۷۸۸ تا ۱۷۹۱ء) کے سوا آسٹریا کی فوجوں کو بہت ھی کم کامیابیاں ھوئیں - سوِشْتو Svishtov کے صلح نامے (۱۷۹۱ء) کی شرائط کے تحت ترکی اپنے علاقے کے ایک قلیل حصے سے دستبردار ھو گیا اور آسٹریا نے مفتوحه قلعوں کو خالی کر دیا۔

تیرھویں صدی ھجری کے شروع / اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سلطان سلیم ثالث نے زیادہ‌تر ینی‌چریوں کی قوت کو کچل دینے کے لیے مختلف تدابیر و اصلاحات کا ایک سلسله شروع کیا - ان مجوّزہ اصلاحات کا منشا مسلم طبقهٔ امرا کی جمی جمائی بنیادوں اور ان کے چھائے ھوے اثر و نفوذ نیز بوسنیائی ایالت کے شہروں کی مسلم آبادی کی امتیازی حیثیت کے سراسر خلاف جاتا تھا۔

(ج) ترکی کا عہدِ اصلاحات اور بوسنیا میں بغاوتیں:

ترکی کی نئی اصلاحات نے بوسنیا کے مسلمانوں میں لازماً غصہ پیدا کیا اس لیے کہ وہ مسألہ عسکری نظام میں مداخلت کرتی تھیں، نیز وہ ینی‌چریوں اور 'سپاھی' فوج کے خلاف جاری کی گئی تھیں - سربیا میں شورش پسندوں کے خلاف کئی مہمّوں میں بوسنیا کے 'بے' آغا اور کثیرالتعداد شہری شامل ھوے - تاھم بوسنیائی فوج کو مشر Mišar کے مقام پر ۱۸۰۶ء میں شکست ھوئی - اس کے تھوڑے ھی عرصے بعد بوسنیا میں سربی کسانوں نے کئی بار بغاوتیں کیں، لیکن

انہیں جلد ہی فرو کر دیا گیا ۔ ہرزگووینا میں ''دروبنجکوں'' (Drobnjaks) کی بغاوت کو کاملاً فرو کرنے کے لیے مقابلۃً کہیں زیادہ سعی کرنا پڑی ۔ بوسنیا کے مسلمانوں نے بھی ۱۸۱۳ء میں سربیا کی بغاوت فرو کرنے میں حصّہ لیا ۔

نپولین کی براعظم یورپ کی ناکابندی کے زمانے میں نقل و حمل کی تجارت ترقی کر گئی ۔ اس عہد میں زیادہ‌تر بوسنیا کی سڑکیں روئی کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہوتی تھیں ۔ یہ کاروبار زیادہ‌تر سربی اور یہودی سوداگر کرتے تھے جو نتیجۃً خوب دولت‌مند ہو گئے ۔ شہروں کے مسلم تاجر اپنی خوشحالی کے لیے مراعات اور حقوق خصوصی پر تکیہ کرتے تھے ۔ سراجیوو نے، جو اہم‌ترین شہر تھا، وزرا (= صوبہ‌داروں) کے معاملے میں بہت حد تک آزادی حاصل کر لی تھی ۔ وزرا اور شہریوں کے درمیان سنگین اختلافات و تنازعات کے واقعات اکثر و بیشتر رونما ہوتے رہتے تھے جو کبھی کبھی مسلّح مقابلے کی صورت بھی اختیار کر لیتے تھے ۔ ۱۸۲۰ء میں جلال الدین پاشا کے تقرر اور آمد کے بعد جانوں کی بہت سی قربانیوں کے بعد کہیں جا کر امن و امان بحال ہوا ۔ ینی‌چریوں کی جماعت کا ختم کر دیا جانا عوام کی ایک اور بغاوت کا سبب ہو گیا، خصوصاً سراجیوو میں جسے عبدالرحمٰن پاشا نے فرو کیا ۔ پھر بھی عام بےچینی اور اصلاحات کی مزاحمت برابر جاری رہی ۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء میں جب اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے اور فوج کی تشکیلِ نو کرنے کی کوششیں کی گئیں تو حسین قپودان گراداسچوچ Gradaščević [= گرادچک] کی قیادت میں بوسنیا کے مسلم امرا میں بغاوت پھوٹ پڑی ۔ باغی بوسنیا اور ہرزگووینا کی مکمل خوداختیاری اور اپنا وزیر آپ منتخب کرنے کے حق کا مطالبہ کرتے تھے ۔ بوسنیا کو صرف سالانہ خراج سلطان کو ادا کرنا ہوتا ۔ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لیے جاتے تو اس سے امرا کے امتیازات اور موجودالوقت عسکری نظام کا تحفظ ہو جاتا، مگر لڑائی کے آغاز ہی سے ہرزگووینا کے ''قپودانوں'' نے علی آغا رضوان بگوویچ کی قیادت میں اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی ۔ حسین قپودان کی شاہی افواج پر فتح اور وزیراعظم کے ساتھ مفاہمت ہو جانے کے باوجود اس سردار کی (جو جمادی‌الاولٰی ۱۲۴۷ھ کے اوائل / ۸ تا ۱۱ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو بطور وزیر منتخب ہوا) ذاتی ہوسِ جاہ اور بوسنیا کے رہنماؤں کی رقابتوں کی وجہ سے ابتدائی بڑی بڑی کامیابیاں بھی بہت جلد اکارت گئیں ۔ یہ بغاوت (۱۸۳۲ء میں) فرو کر دی گئی اور علی پاشا موصوف کی حکومت میں ہرزگووینا کے ''پاشالِق'' ہونے کا اعلان کر دیا گیا (۱۸۳۳ء) .

شورش فرو کر دینے کے بعد موروثی قپودانی عہدہ (۱۸۳۵ء میں) ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ''مسلّم لِق'' نے لے لی ۔ بہت سے قدیم ''قپودان''، ''اعیان'' اور ''سپاہی'' بھی (اس طبقے کی منسوخی کے بعد) ''مسلّم'' مقرر ہو گئے اور انہیں سپہ سالاروں کی اسامیاں دے دی گئیں ۔ عثمانی حکومت نے بوسنیا کے امرا اور خودسر شورش‌پسندوں کے ساتھ جس طریقے سے برتاؤ کیا وہ بظاہر تلطّف آمیز، لیکن حقیقت میں سخت تھا ۔ تاہم تنازعات پھر بھی جاری رہے، خصوصاً اہالیانِ سراجیوو اور وزرا کے درمیان ۔ اس مزاحمت کو بالآخر عمر پاشا نے فرو کیا، جو پہلے آسٹریا کا ایک ماتحت فوجی سردار تھا ۔ وہ لیکا (کروئیا) میں پیدا ہوا تھا ۔ جب اسے ایک خاصی بڑی فوج کا سردار بنا کر اور خصوصی اختیارات دے کر بوسنیا بھیجا گیا (۱۸۵۰ تا ۱۸۵۲ء) تو وہ بوسنیا کے طبقۂ امرا کا سیاسی اثر و رسوخ زائل کرنے اور اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں

کامیاب ہو گیا ۔ اس نے علی پاشا کو مروا ڈالا اور ہرزگووینا کی ''پاشالق'' منسوخ کر دی ۔ بوسنیا چھے ''قائم مقام لقوں'' اور ہرزگووینا تین ''قائم مقام لقوں'' میں تقسیم کر دیا گیا ۔ سراجیوو کا شہر ''وزیر'' کی سرکاری سکونت گہ بن گیا ۔

ان اصلاحات و اقدامات نے ملکی معاشیات کے بعض شعبوں کی ترقی میں مدد دی ۔ تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا، لیکن منڈیوں کے فروغ سے پیشہوروں کی ''برادریاں'' معرض خطر میں پڑ گئیں ۔ بہت سے شہری سربی خاندان خوشحال ہو گئے اور اس کے نتیجے میں ان کا اثر و نفوذ دیہاتی اضلاع میں بھی محسوس ہونے لگا۔

تاہم اصلاحات اتنی وسعت و گیرائی نہیں رکھتی تھیں کہ زرعی نظام کی روح اور اس کے مسائل کو متأثر کر سکتیں ۔

طاہر پاشا، وزیرِ بوسنیا نے (۱۸۴۸ء میں) زرعی مسئلے کے تصفیے کا بیڑا اٹھایا ۔ اس کی نئی تجویز کے تحت مالکان ''چفتلک'' سالانہ فصل کا ایک تہائی وصول کرنے کے مجاز ٹھیرے ۔ بیگار ختم کر دی گئی، بجز ہرزگووینا کے جہاں 'کمت' (= کاشتکار) کو فصل کا ایک تہائی سے بھی کم دینا ہوتا تھا ۔ ضلع سراجیوو میں چفتلک کے مالک بعض شرائط، مثلاً اپنے 'کمت' کو بیج، بیل اور مکان مہیا کرنے کے پابند تھے ۔ اب ان شرائط کا اطلاق بوسنیا کے تمام اضلاع پر ہونا قرار پایا ۔ بایں ہمہ مالکان ''چفتلک'' ہر جگہ فصل کی ایک تہائی تو وصول کرنے لگے، لیکن بیگار لینے پر مصر رہے، اور وہ اپنی ذمےداریاں بھی پوری نہیں کرتے تھے ۔ اس سے کسانوں میں بہت بے اطمینانی کا ظہور ہوا اور خود مالکان ''چفتلک'' بڑی مطمئن نہ تھے ۔ اس مسئلے کا قطعی تصفیہ ہو جانے سے پہلے کئی ناکام کوششیں کرنا پڑیں، تاآنکہ وہ زرعی قانون (رمضان ۱۲۷۶ھ کے دوران میں) منظور ہوا جس کا اجرا صفر ۱۲۷۶ھ / ستمبر ۱۸۵۹ء میں بذریعۂ فرمان کیا گیا اور جس کی رو سے ''کمت'' سے متعلق مروّجہ طریقوں ہی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ۔ پھر بھی محصولات اور دوسرے واجبات کے لیے کل بوسنیا اور ہرزگووینا میں کوئی یکساں اصول عائد کرنے کا قاعدہ نہیں بنایا گیا ۔ جہاں تک زمین کے حقوقِ کاشت کاری کا تعلّق ہے مذکورۂ بالا قواعد ۱۹۱۸ء تک نافذ رہے ۔

ان غیرتسلیبخش حالات سے، انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب کسانوں کی شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ ۱۸۷۵ء کی بڑی بغاوت میں جوق در جوق عیسائی کسانوں کے ساتھ ''آغاؤں'' اور ''بیئوں'' کے کاشتکار بھی شریک ہو گئے، اور جب سربیوں کی شہری آبادی نے بھی حصّہ لیا تو خاص طور پر سربیا اور مونٹےنگرو کے ترکی کے خلاف جنگ میں شامل ہو جانے کے بعد اس شورش کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ۔ یہ سچ ہے کہ ہرزگووینا میں بغاوت عامة الناس نے اٹھائی تھی، لیکن بوسنیا میں صرف سرحدی علاقے ہی اس میں شامل تھے ۔ اس بغاوت کے موقع پر دولِ یورپ نے مداخلت کی ۔ سان سٹفانو San Stefano کے معاهدے میں یہ بات واضح طور پر قرار پائی کہ ترکی بوسنیا اور ہرزگووینا کو حکومتِ خود اختیاری عطا کرےگا ۔

مؤتمر برلن کی شرائط کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کو آسٹریا ۔ هنگری کی امانت میں دے دیا گیا ۔ آسٹریا ۔ هنگری کی جن افواج کو ملک پر قبضہ جمانے کے لیے بھیجا گیا تھا ان کا غیر متوقع طور پر بوسنیا کے مسلمانوں نے مقابلہ کیا ۔ ان باغیوں کی قیادت ادنی طبقات کے افراد کر رہے تھے، کیونکہ ممتاز بوسنیا ترکی حکّام اور فوج کے

واپس چلے جانے کے بعد لڑائی میں حصّہ لینے پر رضامند نہ تھے؛ چنانچہ انھیں عوامی سرگروھوں نے حملہ آوروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور سراجیوو میں عوام کی حکومت قائم کرنے پر لوگوں کو اکسایا تھا ۔ یہ قبضہ ۲۹ جولائی کو شروع ھوا اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو مکمل ھوا ۔ بعض مقامات پر خصوصًا سراجیوو کے شہر اور گرد و نواح میں جو سخت مزاحمت کی گئی اس کا قلع قمع کرنے کے لیے بہت سخت قسم کی تدابیر اختیار کی گئیں۔

مآخذ: بوسنیا اور ہرزگووینا میں ترک عہد حکومت کے متعلّق تواریخی مطالعات بہت ھی غیرمکمل ھیں، گو حال ھی میں بہت ترقی ھوئی ہے ۔ اس عہد پر روشنی ڈالنے والا بہت سا متعلقہ تاریخی مواد ابھی تک شائع نہیں ھوا ۔ اس مواد کی فراھمی و تصحیح کا کام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سراجیوو کے ذمّے ہے ۔ اس عہد کے ابتدائی حصّے کے خصوصی اھمیّت رکھنے والے ترک دفاتر مساحت (مع ''قانون نامے'') استانبول میں باش وکالت آرشیوی میں رکھے ھیں ۔ ''وقف نامے'' (جن پر F. Spaho، H. Kerševljaković، G. Elezović، Š. Sahanović اور دوسروں کی روداد یں درج ھیں) نیز سترھویں صدی کے ''قاضی سجلّ'' مع جزوی یادداشتوں کے از سولھویں صدی عیسوی اور سرکاری یادداشتیں اھم ھیں (اورینٹل انسٹی ٹیوٹ خسرو بے لائبریری وغیرہ) ۔ بوسنیا کی ''ولایت'' کی بعض سرکاری یادداشتیں (انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے) سراجیوو کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ھیں ۔ بعد کے زمانے کی قابل قدر معلومات غیر مطبوعہ وقائع بعنوان تاریخ دیار بوسنہ مرقومۂ صالح صدقی افندی حاجی حسنووچ Hadžihusejnović میں پائی جاتی ھیں، جو مُوَقّت کے نام سے معروف تھا ۔ یہ کتاب انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں لکھی گئی تھی اور اس کا قلمی نسخہ سراجیوو کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے ۔

مآخذ کے زیادہ اھم مجموعے مفصلۂ ذیل ھیں: (۱) C. Truhelka: *Tursko-slovjenski spomenici dubrovačke arhive*، Glasnik Zem. muzeja Bosnia and Herzegovina، ۱۹۱۱ء؛ (۲) H. Šabanović: *Najstarije vakufname u Bosni Prilozi za orijentalnu filologiju*، جلد دوم (۱۹۵۱ء)، جلد سوم و چہارم (۱۹۵۲ء)؛ (۳) *Monumenta Turcica historiam Slavorum Mer. illustrantia, I, Kanuni i Kanunname*، جلد ۱ (طبع اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سراجیوو)، سراجیوو ۱۹۵۷ء؛ (۴) J. Matasović: *Fojnička regesta Spomenik Srpske Akademije Nauka*، جلد ۹۲ (۱۹۳۰ء)؛ (۵) بوسنیا میں دریافت ھونے والے مشرقی زبانوں میں کتبے طبع از M. Mujezinović، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۲، ۱۹۵۱ء، جلد ۳، ۴ (۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ء) وغیرہ ۔ اھم سفرناموں میں سے جو قابل قدر معلومات اور اعداد و شمار (سترھویں صدی عیسوی سے) کے حامل ھیں وہ ھیں جو Kuripešić (۱۵۳۰ء) اور اولیا چلبی کے لکھے ھوئے ھیں ۔ وہ مآخذ جن کا تعلّق ۱۸۷۵ء کی بغاوت کے آغاز سے ہے انھیں H. Hadžibegić نے شائع کیا ہے: *Turski dokumenti o početku ustanka u Hercegovini i Bosni 1875*, *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۱ (۱۹۵۰ء).

بوسنیا کی عام تواریخ: (۱) S. Bašagić: *Kratka uputa u prošlost Bosne i Hercegovine*، سراجیوو ۱۹۰۰ء؛ (۲) M. Prelog: *Provijest Bosne u doba osmanlijske vlade*، ج ۱ - ۲، سراجیوو ۱۹۱۲، ۱۹۱۳ء، دونوں ھی تاریخی اعتبار سے پرانی ھوچکی ھیں: (۳) V. Ćorović: *Historija Bosne i*، بلغراد ۱۹۴۰ء (فقط پہلی فصل ھی ۱۴۸۲ء تک شائع ھوئی ہے)؛ (۴) *Istorija naroda Jugoslavije i*، بلغراد ۱۹۵۳ء، ص ۵۱۳ تا ۵۷۶ (نیز ۱۸۳۲ء تک)؛ (۵) ترکی حکومت کے

تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی تاریخ کا مجمل بیان اس کتاب میں پایا جاتا ہے : *Istorija naroda Jugoslavije*، جزء۲ (مطبوعہ نسخے موجود ہیں)، پندرھویں، سولھویں، سترھویں صدی عیسوی کا مؤلف N. Filipovic، اٹھارھویں صدی عیسوی کا مؤلف H. Kreševljaković اور تاریخ ثقافت کا مؤلف H. Šabanović ہے - ترکی زبان کا غیر مطبوعہ تاریخی مواد استعمال کیا گیا ہے، خصوصًا دفاتر مساحت کا، نیز مآخذ اور کتابیات کے حوالے دیے گئے ہیں - مخصوص موضوع کی کتابیں اور رسالے : (۱) H. Sabanović : *Pitanje turske vlasti u Bosni do pohoda Mehmeda II 1463 god : Godisnjak : Ist. društva Bosne i Hercegovine vii (1956)*؛ (۲) وہی مصنف : *Bosanski pašaluk do kraja XVII vijekapostanak i upravna podjela* (تحقیقی مقالہ زیر طبع)؛ (۳) H. Kreševljaković : *Kapetanije u Bosni i Hercegovini*، سراجیوو ۱۹۵۳ء؛ (۴) M. Handžić : *Pogled na sudstvo u Bosni i Hercegovini za vrijeme turske vlasti*، سراجیوو ۱۹۳۰ء؛ (۵) Ć. Truhelka : *Historička podloga agrarnog pitanja u Bosni*، Glasnik Zem. muzeja xvii (۱۹۱۰ء)؛ (۶) V. Čubrilović : *Poreklo muslimanskog plemstva u Bosni*، Jug. časopis اول ، ۱ (۱۹۳۵ء)؛ (۷) M. Handžić : *Islamizacija Bosne i Hercegovine i porijeklo bosanskohercegovačkih muslimana*، سراجیوو ۱۹۴۰ء؛ (۸) A. Solovjev : *Nestanak bogumilstva i islamizacija Bosna*؛ *društva Bosne i Hercegovine* جلد ۱، ۱۹۴۹ء؛ (۹) N. Filipović : *Pogled na osmanski feudalizam (s posebnim obzirom na agrarne odnose) Godišnjak Ist. društva Bosne i Hercegovine*، ج ۴، ۱۹۵۲ء؛ (۱۰) B. Djurdjev : *O vojnucima sa osvrtom na razvoj turskog feudalizma i na pitanje bosanskog agaluka*، Glasnik Zem. muzeja ج ۲، ۱۹۴۷ء؛ (۱۱) N. Filipovic : *Odzakluk timari u Bosni i Hercegovini*، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۵ (۱۹۵۴ - ۱۹۵۵ء)؛ (۱۲) H. Kerševljaković : *Gradska privreda i esnafi u Bosni i Hercegovini, Godišnjak Ist. društva Bosne i Hercegovine* (۱۹۴۹ء)؛ (۱۳) V. Skarić : *Staro rudarsko provo i tehnika u Srbiji i Bosni*، بلغراد ۱۹۳۹ء؛ (۱۴) V. Skarić : *Sarajevo i njegova okolina od najstarijih vremena do austro-ugarske okupacije*، سراجیوو ۱۹۳۷ء؛ (۱۵) A. Handžić : *Bosanski namjesnik Hekimoglu Ali-paša*، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، جلد ۵ (۱۹۵۴-۱۹۵۵ء)؛ (۱۶) F. Spaho : *Pobuna u tuzlanskom srezu polovicom osamnaestog vijeka*، در Glasnik zem. muzeja، ج ۲۵ (۱۹۳۳ء)؛ (۱۷) A. Bejtić : *Bosanski namjesnik Mehmedpaša Kukavica i njegove zadužbine u Bosni* (۱۷۵۲ تا ۱۷۵۶ء، ۱۷۵۷ تا ۱۷۶۰ء)، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۶ و ۷ (۱۹۵۶ - ۱۹۵۷ء)؛ (۱۸) V. Skarić : *Iz prošlosti Bosne i Hercejovine XIX vijeka*، در *Godišnjak Ist. društva Bosne i Hercegovine*، ج ۱ (۱۹۴۹ء)؛ (۱۹) L. Ranke : *Die letzten Unruhen in Bosnien 1820-1832*، در *Histpolitische Zeitschrift*، ج ۲ (۱۹۳۵ء)؛ (۲۰) V. Popović : *Agrarno pitanje u Bosni i Hercegovini i turski neredi za vreme reforme Abdul-Medžida* (۱۸۳۹ تا ۱۸۶۱ء)، بلغراد ۱۹۴۹ء؛ (۲۱) J. Koetschet : *Erinnerungen aus dem Leben des Serdar Ekrem Omer Pascha*، سراجیوو ۱۸۸۵ء؛ (۲۲) J. Koetschet : *Osman pascha der letzte grosse Wesir Bosniens und seine Nachfolger*، سراجیوو ۱۹۰۹ء؛ (۲۳) V. Čubrilović : *Bosanski ustanak 1875-1878*، بلغراد ۱۹۳۰ء.

۳ - بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی

ثقافت:

ترکی فتح کا ایک نتیجه یه هوا که بوسنیا اور هرزگووینا کی آبادی کا ایک حصه مشرف باسلام هو گیا اور اسلامیت نے پورے ملک کی طرزِ زندگی اور ثقافت پر اپنا نقش ثبت کر دیا ۔ بوسنیا اور هرزگووینا میں مسلمانوں کی قومی اور نجی دونوں قسم کی طرزِ زندگی ترکی حکومت کے عهد میں خصوصاً شهروں میں بهت حد تک ویسی هی هو گئی جیسی که سلطنت عثمانیه کے دوسرے صوبوں میں تهی ۔ ان ولایات میں اسلامی ثقافت کا فروغ شهری آبادیوں کی بدولت هوا ۔ اس لیے که اس ثقافت کے واضح خد و خال اپنی خصائص و حدود کے اعتبار سے زیادہ‌تر شهری تهے، اگرچه مسلمان کسانوں کی طرزِ زندگی میں خود ان کی بعض واضح خصوصیات بهی تهیں ۔ یورپ کی تقلید کی وجه سے بلاشبهه مشرقی ثقافت کے عناصر — خصوصاً عیسائیوں میں — ترکوں کے عهد کے بعد زائل هونے لگے تهے اور جب یه ملک یوگوسلاویا کا ایک حصه بن گیا تو پهر وه افزوں طور پر زائل هونے لگے ۔ بایں همه مشرقی ثقافت کے خصوصی عناصر آج تک بهی معدوم نهیں هوے ۔ مسلمانوں هی میں نهیں بلکه عیسائی آبادی تک میں بهی وه ناپید نهیں هوے ۔ مشرقی طریق زندگی کے بهت سے خد و خال، مثلاً رهن سهن، گهر کے ساز و سامان، کهانا پکانے، کهانے پینے کی عادات اور بعض پرانی رسموں میں ابهی تک نظر آتے هیں۔ زرگری، قالین بافی اور عملی صنعت و حرفت کی دوسری بهت سی انواع میں مشرقی طریقے ابهی تک اکثر مستعمل هیں.

اسلامی ثقافت کے اثر و نفوذ کے سب سے زیاده دیر پا نقوش فنِ تعمیر اور شهری منصوبه بندی کے میدان میں پائے جاتے هیں ۔ مشرقی شهروں کے نقشے کے بعض اصولوں کا اطلاق اس لیے بلا دقت هوا که جگه جگه بلند سطح کے قطعات موجود تهے ۔ بوسنیا کے بهت سے شهر اب بهی سابقه خاص طرز کے نقشے کی نشاندهی کرتے هیں جن میں دو حصّے هوتے تهے، یعنی ''چارشو'' (کاروباری یا تجارتی مرکز) اور ''محلے'' (سکنی محلّے).

ترکی حکومت کے زمانے کی شهری منصوبه‌بندی اور عام تعمیر کے تین مراحل قرار دیے جا سکتے هیں: (الف) ابتدائی عهد تقریباً سولهویں صدی عیسوی کے اختتام تک، (ب) دوسرا عهد، سترهویں صدی کے اختتام تک اور (ج) تیسرا عهد، بوسنیا اور هرزگووینا میں ترکی حکومت کے اختتام تک ۔ مسلم شهری آبادیوں کے ابتدائی نشو و نما کے عهد میں یه صدر، والی اور ترک عمائد تهے جنهوں نے وه عبادت‌گاهیں اور سرکاری عمارات بنوائیں جو یادگاری تعمیرات کی نمائنده مثالیں تهیں ۔ اسی عهد سے بوسنیا اور هرزگووینا میں فنِّ تعمیر کی اسلامی طرز کی نفیس‌ترین یادگاروں کا آغاز هوتا هے، مثلاً فوچه Foča کی مسجدِ اَلَدژه (۱۵۵۰ء)، مسجد غازی خسرو بے (۱۵۳۰ء)، سراجیوو کی مسجد علی پاشا (۱۵۶۱ء)، بنالوقه کی مسجد فرهاد پاشا (۱۵۷۹ء)، مدرسهٔ غازی خسرو بے (۱۵۳۷ء)، جو سِلژکجه Seldzukija اور بعد میں کُرشُلیجه موسوم هوا، مع حمّام غازی خسرو بے (قبل ۱۵۳۷ء) اور سراجیوو کا برسه بِزستان [مسقّف بازار] (۱۵۵۱ء)، نیز بهت سی اور یادگاریں ۔ عهدِ ثانی میں اهل حرفه کی برادریوں کے قیام اور تیز رفتار ترقی کے باعث یه زیادہ‌تر دکان‌دار اور سوداگر تهے جنهوں نے تعمیراتِ عامّه کی ذمے‌داری لی ۔ اس عهد سے تعلق رکهنے والی مثالیں ظاهری صورت میں نسبةً کم عالی شان هیں، بجز معدودے چند عمارتوں کے جن کی تعمیر صدر، والیوں یا بعض عالی مرتبت ترکی عمائد کے هاتهوں هوئی هے، مثلاً سراجیوو کا تکیهٔ حاجی سِنان (۱۶۴۰ء) ۔ تیسرے

عہد کے فن تعمیر سے تنزّل کے آثار اور بعد کے زمانے میں وہ یورپی اثرات اور ان طرزوں کی نقّالی نمایاں ہے جو ترکی کے شہروں میں رواج پا گئی تھیں۔ بلا واسطہ اثر و نفوذ کی بعض علامات بھی موجود ہیں۔ تاہم اس عہد نے فنّی جدّت کی بہت سی دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔ وزیر کی سرکاری جاے سکونت ہو جانے کی حیثیت سے شہر تراونک Travnik کی نشو و نما اس عہد کی خصوصیت کی آئینہ دار ہے۔ مسجد سلیمانیه (موجودہ عمارت کی تاریخ تعمیر ۱۸۱۶ء ہے) ایک ''بزستان'' کے اوپر تعمیر ہوئی۔ اس عہد میں متعدد قدیم مساجد کی مرمت کر کے انہیں دوبارہ اصل حالت پر لایا گیا۔ عالی شان تعمیراتِ عامّہ کی ساخت میں مسلمان ماہرینِ تعمیر نے ترکی صنّاعی کے بنیادی عناصر کی نمائش کی ہے، اگرچہ اس کی تمام اوضاع اور خصوصیات کا اظہار بوسنیا اور هرزگووینا میں نہیں ہوا۔ چھوٹی مسجدوں اور وقف کی عمارات نیز سکنی مکانوں کو مقامی ماہر فن معمار بناتے تھے، لہٰذا ان عمارات میں فنّ تعمیر کی بعض انفرادی [مقامی] خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ترکی حکومت کے بعد کے زمانے میں اسلامی فنِّ تعمیر میں صریحی انحطاط کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آسٹریا۔هنگری کی حکومتوں نے مغربی عربی (Moorish) طرز کی نقل کر کے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس طرز کی عمارات بوسنیا اور هرزگووینا میں اسلامی فن تعمیر کے ابتدائی نمونوں اور آسٹریا کی حکومت کے آخری زمانے کے نمونوں دونوں سے الگ نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ نہ تو بوسنیا کے اندرونی علاقوں کے مناظر سے ہم آہنگ ہیں اور نہ آب و ہوا کے لحاظ سے موزوں ہیں۔ غرض مذکورہ طرز کی عمارات ناکام ثابت ہوئیں۔ اس طرز کی سب سے بڑھکر نمائندہ مثال سراجیوو کا ایوانِ بلدیه ہے۔ بوسنیا اور هرزگووینا کا طرز تعمیر جہاں تک اس کا اطلاق سکنی مکانوں پر ہوتا ہے بالکل مفقود ہو جانے سے پہلے کچھ مزید مدّت تک قائم رہا۔

ترکی، عربی اور فارسی اصل کے الفاظ و محاورات کی بہت بڑی تعداد بوسنیا اور هرزگووینا میں روزمرّہ کے استعمال میں ہے اور به نسبت دوسرے علاقوں کے جہاں سربی کروٹ بولی جاتی ہے اس خطّے میں زیادہ رائج ہیں۔ ابتدائی ادبی اسلوب میں بھی ان مستعار الفاظ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا، مگر جب سے معیاری سربی کروٹ زبان کو ترقی ہوئی اور اس کے اثرات پھیلے، یعنی ۱۸۷۸ء سے اور زیادہ تر ۱۹۱۸ء سے، تب سے یه ترکی الاصل الفاظ اور جملے روز بروز متروک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ترکی حکومت کے دوران میں بوسنیا اور هرزگووینا کے مسلمانوں (خصوصاً مقامی مسلم امرا کے درمیان، نجی خط و کتابت میں ایک شکستہ سریلی (Cyrillic، قدیم سلاوی خط جو سینٹ سرل سے منسوب ہے) رسمِ خط رائج تھا۔ سربی کروٹ زبان کی ادبی کتابوں میں، جنہیں بوسنیا اور هرزگووینا کے مسلمان تیار کرتے تھے، عربی حروف استعمال ہوتے تھے۔ بعض سربی کروٹ مذہبی درسی کتب میں بھی، جو آسٹریا کے دور میں اور قبل جنگ یوگوسلاویا کے عہدِ حکومت میں لکھی گئیں، بھی عربی رسم خط استعمال میں رہا۔ ان حروف میں چھپی ہوئی کتابیں ابھی تک دستیاب ہوتی ہیں۔ الفاظ کے ہجے شروع میں تو من مانے رہے، مگر رفتہ رفتہ ان کے مسلّم قواعد بن گئے۔ بایں ہمه ۱۹۱۰ء سے یه عربی حروف مذہبی درسی کتب میں بھی شاید ہی کبھی استعمال ہوے ہوں۔

بوسنیا یا هرزگووینا کے مسلمانوں کی سربی کروٹ یا مشرقی زبانوں میں ادبی تصانیف کا جامع مطالعه ابھی تک نہیں کیا گیا۔

عوامی گیتوں اور عام پسند شاعری کے ذوق شوق میں بوسنیا اور هرزگووینا کے مسلمانوں میں اپنے هم‌وطن عیسائیوں سے بہت هی کم فرق تھا - بوسنیا اور هرزگووینا کے ''گسلروں'' (guslars) کی قدیم رزمیّہ تالیفات سربی-کروٹ رزمیہ نظموں کی تمام بنیادی خصوصیّات کی حامل هیں - ان میں اختلاف هے تو محض مختلف مذهبی اور سیاسی انداز فکر کا، یا ترکی محاوروں کے نسبۃً بکثرت استعمال کا یا بڑی رزمیہ نظموں سے هٹ کر قطعات یا چوبولوں (ballads) کی طرف رجحان پایا جاتا هے - ''حسن اغینچہ'' Hasanaginica ایک مقبول بوسنیائی نظم دنیاے ادب میں بہت معروف هے - ابتدائی قسم کی عوامی رزمیہ نظمیں بوسنیا اور هرزگووینا کے جنوب میں محفوظ هیں - بعد کی مسلم رزمیہ نظم کی ایک صنف مغربی سرحدی ضلع کے لوگوں میں تیار هوئی جسے ''کرجینہ'' Krajina کہتے هیں - ایسی نظموں کو ''تمبوریچہ'' (چھوٹا طنبورہ، Mandolin) کی سنگت میں ترنّم سے پڑھا جاتا تھا اور وہ ''گسلروں'' (guslars) کی عام پسند نظموں سے کئی لحاظ سے مختلف هوتی تھیں - بوسنیا اور هرزگووینا کے مسلمانوں کی عوامی عشقیہ شاعری کا جب ان کے هم‌وطنوں کی اس صنف کے ساتھ تقابل کریں تو وہ بھی بلکہ دوسری اصناف سے بڑھکر اپنی جداگانہ خصوصیات کے متعدّد پہلو رکھتی هیں - ان میں سب سے معروف اور مقبول عام عشقیہ نظمیں وہ هیں جنھیں سِوْدالنکہ sevdalinkas کہتے هیں - زبان، بنیادی موضوعات اور موسیقیت کے مشرقی اثرات سے قطع نظر، جو ان تالیف میں هویدا هیں، وہ صحیح معنوں میں بوسنیا اور هرزگووینا کے مسلمانوں کی مخصوص نظمیں هیں اور سارے یوگوسلاویا میں پسند کی جاتی هیں اور ان سے لطف اٹھایا جاتا هے۔

ان مطالعات کے نتائج سے جو اب تک شائع هو چکے هیں اندازہ کریں تو کہا جا سکتا هے کہ بوسنیا اور هرزگووینا کے جن مسلم شعرا نے مشرقی زبانوں میں طبع آزمائی کی انھوں نے زیادہ‌تر ترکی میں، اس سے کم فارسی میں اور بہت هی کم عربی میں لکھا هے - ترکی زبان کے مصنّفین میں سے کئی بوسنیا کے باشندے تھے اور ان میں سے بعض ممتاز شعرا گزرے هیں، مثلاً درویش پاشا بن بایزید آغا (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں قتل هوا)، جو موستر Mostar (هرزگووینا) میں پیدا هوا تھا، اور مشہور و معروف صاحب طرز شاعر هے، محمد نرگسی (م ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء)، جس کی ولادت سراجیوو کی تھی - صرف یہی نہیں کہ یہ دونوں بوسنیا اور هرزگووینا میں پیدا هوے، بلکہ وہ مدّت مدید تک وهاں عہدوں پر متمکن بھی رهے — درویش پاشا، بوسنیا کے پاشا کی حیثیت سے اور محمد نرگسی مدّرس اور قاضی کی حیثیت سے - اسی طرح احمد سودی بوسنوی الاصل (م ۱۰۰۵ھ/۱۰۹۶-۱۰۹۷ء) ایرانی ادب عالیہ کا مشہور شارح تھا [اس نے مثنوی مولانا رومی کی شرح لکھی هے] - فارسی زبان کے بہت هی پُرگو شاعروں میں سے ایک موستر کا شیخ فوزی (م تقریباً ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) هے، جو ترکی میں بھی شعر کہتا تھا - احمد وحدتی (م ۱۰۰۷ھ/۱۰۹۸-۱۰۹۹ء) جو وشگراڈ کے قریب دُبرون Dobrun کا رهنے والا تھا، . . . سراجیوو کا حسن قائمی (م ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱-۱۶۹۲ء) اور اُسکوفی بوسنوی، جسے هوائی بھی کہتے هیں (م تقریباً ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰-۱۶۵۱ء)، جو تزلہ دنجہ Tuzla Donja میں پیدا هوا، نیز متعدّد بوسنوی اور هرزگوینی شعرا ترکی اور سربی-کروٹ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے- اسکوفی بوسنوی نے ترکی نظم میں سربی - کروٹ زبان

کی لغت تبار کی تھی ۔ تیرھویں و چودھویں صدی ھجری/انیسویں و بیسویں صدی عیسوی میں زمانۂ حال تک متعدد شاعر ھوے ھیں جنھوں نے ایسی مذھبی نظمیں لکھیں جن میں دیرینہ روایات کی روح پائی جاتی ھے ۔ اس طرز کی شاعری میں قابل لحاظ وہ نعتیہ نظمیں ھیں جو میلادِ نبی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم) کی صفت و ثنا میں لکھی گئی ھیں، ورنہ ابتدائی عہد کی ایسی نظمیں محض تراجم ھوتے تھے جن میں ترکی اصل کی نقالی کی جاتی تھی، اگرچہ آگے چل کر بعض طبعزاد تخلیقات بھی معرضِ ظہور میں آئیں۔

بوسنیا اور ھرزگووینا کے مسلمان اھل قلم کی قدیم نثر زیادہ‌تر عربی میں تھی اور یہ کتابیں بڑی تعداد میں دینیات کے مضامین، شرعی قوانین، نظم و نسقِ حکومت اور تاریخ سے تعلق رکھتی ھیں ۔ ان مصنفوں میں بہت سے اگرچہ بوسنیا اور ھرزگووینا کے باشندے تھے تاھم استانبول اور سلطنتِ عثمانیہ کے دیگر حصوں میں رھتے اور کام کرتے تھے، مثال کے طور پر عبداللہ بوسنوی (م ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء) فلسفۂ تصوف پر رسالوں کا مصنف اور ابن العربی کی فصوص الحکم کا شارح، حسن کافی جو فقہ اور سیاسیات پر ایک ممتاز مصنف تھا، پروسک (آق حصار Akhisar) میں پیدا ھوا اور اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے آبائی وطن ھی میں اسے عمر بھر کے لیے ''قاضیلک'' کا منصب (عہدۂ قضا) حاصل ھوا اور وھیں اس نے ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں وفات پائی ۔ وہ اپنی دوسری تصنیفوں کے علاوہ مشہور و معروف کتاب نظام العالم کا مصنف بھی تھا ۔ ایسے چالیس کے قریب مصنفوں کا نام لیا جا سکتا ھے جو بوسنیا اور ھرزگووینا کے عہدِ علمی میں مذھبی اور فقہی مطالعات کے میدان میں سرگرم عمل تھے ۔ ترکی مؤرخوں کی ایک خاصی تعداد بوسنوی مسلم خاندانوں کی اولاد سے ھوئی ھے (مثلاً ابراھیم پیچوی)؛ لیکن خود بوسنیا اور ھرزگووینا میں ترکی زبان میں تاریخ‌نویسی بعد کے زمانے کی پیداوار ھے ۔ بارھویں صدی ھجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کا ایک ممتاز بوسنوی تاریخ‌نویس، جو ترکی میں لکھتا ھے، قاضی عمر نوی تھا جو غزوات حکیم اوغلو علی پاشا کا مصنف ھے ۔ یہ کتاب بوسنیا میں 'از اوائل محرم ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء تا اواخر جمادی الاولی ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء کے تاریخی واقعات سے بحث کرتی ھے ۔ اس کتاب کی پہلی طباعت ابراھیم متفرقہ کے ھاتھوں ھوئی ۔ بعد ازاں دوبارہ طبع ھوئی اور اس کا ترجمہ انگریزی اور جرمن میں ھوا ۔ بارھویں صدی ھجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیرھویں صدی ھجری/انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے چند ممتاز وقائع نویسوں (مصطفی باش اسکی صالح صدقی) کے نام محفوظ ھیں، جنھوں نے اپنے عہد کے واقعات قلم‌بند کیے ۔ ان مؤرخوں میں جنھوں نے ترکی حکومت کے متأخر عہد اور ملک پر آسٹریا کے قابض ھو جانے کے بعد کے حالات لکھے ھیں مندرجۂ ذیل ھیں : صالح صدقی افندی حاجی حسینوچ Hadzihusejnovic (م ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء)، محمد انوری کنچ (۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ - ۱۸۵۵ء تا ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ء) تاریخی مواد کا جامع جس کی اس نے اپنے ھاتھ سے کتابت کی (۲۸ جلدیں، مخطوطے کا ایک نسخہ غازی خسرو لائبریری سراجیوو میں رکھا ھوا ھے) ۔ دیرینہ وقائع‌نویسی کے فن میں عبوری تبدیلی شیخ سیف الدین افندی کمورہ (م ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء) کی تصنیفات میں نمایاں ھے ۔ اسی طرح ابتدائی اسلامی علوم کی بعض خصوصیات اور ابتدائی وقائع نویسوں کے بعض تصورات ڈاکٹر صفوت بے باش آغچ (۱۸۷۰ تا ۱۹۳۴ء) کی تصنیفات میں بھی ھویدا ھیں، جو

ترکی عہد کا پہلا جدید مؤرّخ اور بوسنیا و ہرزگووینا کا پہلا مستشرق عالم اور شاعر بھی تھا ۔ بایں ہمہ افسانوی (romantic) کتب سے قطع نظر، جو ابھی تک پرانے مسلکوں کا دامن تھامے ہوئے ہے (ڈاکٹر صفوت باشی آغچ اس کا ممتاز نمائندہ ہے) ۔ سنہ ۱۸۷۸ء اور خصوصیت سے ۱۹۰۸ء کے بعد سے بوسنوی مسلمانوں کی ادبی سرگرمیوں کا رجحان زیادہ سے زیادہ سرب اور کروٹ ادبیّات میں مدغم ہو جانے کی طرف رہا ہے ۔ اے ۔ ایف ۔ دزابیچ Dzabić (م۱۹۱۸ء)، مفتی موستر اور مذہبی آزادی کے مجاھد نے ترکی میں عربی زبان و ادبیّات کے استاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ۔ نیز اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کے معاصرین کی منتخب نظموں کا مجموعہ بھی شائع کیا ۔

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی تعلیم و ثقافت کے گہوارے دوسرے ترکی صوبوں کی طرح ''مکتب''، ''مدرسے'' اور مذہبی ادارے (مسجدیں، ''تکیے'' وغیرہ) ہوا کرتے تھے ۔ عام دستور یہ تھا کہ ہر مسجد سے ملحق ابتدائی تعلیم کے مکاتب قائم ہوتے، جن میں قرآن مجید کی تعلیم، نوشت و خواند اور مذہب کے ضروری مبادی پڑھائے جاتے تھے ۔ ثانوی اور اعلٰی تعلیم کی درس گاھیں ''مدرسہ'' کہلاتی تھیں اور وہ بھی ترکی نمونے کے مطابق قائم کی گئی تھیں ۔ سراجیوو میں قدیم ترین ''مدرسہ'' کی تاریخ بنا، جس کی تحریری شہادت محفوظ ہے، دسویں صدی ھجری کے ربع اول / سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے تعلّق رکھتی ہے ۔ ۹۴۳ھ/ ۱۵۳۶ - ۱۵۳۷ء کے ''وقف نامے'' کی رو سے غازی خسرو بے مدرسے کی اس کے کتب خانے سمیت، بوسنیا کے سنجاق بے نے بنیاد رکھی تھی ۔ اس کی عمارت دوسرے برس پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور ابھی تک مسجدِ خسرو بے حرم کے داخلے کے دروازے کے بالمقابل کھڑی ہے ۔ مدرسے کے کتب خانے کو آگے چل کر غازی خسرو بے کے وقف کا ایک مستقل رفاھی ادارہ بنا دیا گیا تھا اور اس وقف نے اس کے حدودِ عمل کو وسیع کرنے میں مدد دی ۔ اس کے موجودہ اثاثے کی فہرست میں مشرقی زبانوں کی کتابیں ،جو ابتدائی ذخیرے میں تھیں اور مزید برآں بعد کے جمع کردہ نسخوں کی کثیر تعداد اور وہ مخطوطات اور ترکی دستاویزات ہیں جنھیں اوقاف، مدارس اور نجی کتاب خانوں سے حاصل کیا گیا ہے ۔ مدارس کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ پھر بھی ان میں سب سے مشہور مدرسۂ غازی خسرو بے رہا، جس سے اب مضامین دینیات کی تعلیم کے لیے ثانوی درس گاہ کا کام لیا جاتا ہے ۔ کئی درویشی سلسلے تصوّف کی تعلیم میں اور فارسی زبان کے مطالعات میں مصروف کار تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا درویشی ''تکیہ'' بوسنیا کے آخری سقوط سے پہلے بنا تھا ۔ غازی خسرو بے کی تعمیر کردہ ''خانقاہ'' میں بعض لائق ملاحظہ عمارتی جزئیات ھیں ۔ اس کی نگہداشت اور مذہبی اور عام تعلیم کے اخراجات ''وقف'' سے ادا ہوتے تھے ۔

سرکاری طور پر دی جانے والی تعلیم کی عام ترقی اور تعلیمی عمارتوں کی ابتدا طوپال عثمان باشا کی وزارت (= صوبیداری کے زمانے) سے ھوتی ہے جب اس نے پہلا ''رشدیہ'' اور ''مکتبِ حقوق'' (انتظامی قانونی مدرسہ) قائم کیے، جن کے بعد عام دارالمطالعے کی بزم اور دفترِ طباعت کا افتتاح ہوا ۔ تعلیمی قانون (۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) کی دفعات کے تحت تعلیمی ملازمتوں اور مدارس کی نگرانی و کفالت حکومت کے ذمّے ہوتی تھی ۔ نجی یا مختلف جماعتی نوعیت کے اداروں میں مداخلت نہیں کی گئی لیکن وہ بھی سرکار کے زیر نگرانی تھے ۔ اس قانون کی دفعات کا نفاذ بوسنیا اور ہرزگووینا میں پورے طور

پر نہیں ہوا، گو ''صِبیان مکتبی'' اور ''رشدیّات'' نیز فنّی اور تربیتی مدرسے قائم کیے گئے ۔ سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ترکی حکومت کے اختتام کے قریب نو سو سترہ مکتب، تینتالیس مدرسے اور اٹھائیس رشدیّے تھے ۔ اس کے علاوہ سراجیوو میں ادنٰی درجے کا ایک مدرسۂ حربیہ، استادانِ مکتب کے لیے ایک تربیتی درس گاہ اور ایک تجارتی مدرسہ قائم تھا۔

فرقہ‌دارانہ مدرسوں میں مداخلت کیے بغیر آسٹریا ۔ ہنگری کے حکّام نے خود اپنا سرکاری نظامِ تعلیم رائج کرنے سے ابتدا کی؛ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی تھی ۔ ''مکتب'' اور ''مدرسے'' بدستور مذہبی تعلیم‌گاہوں کی حیثیت سے جاری رہے ۔ ۱۹۰۹ء کے قانون نافذہ کے ضوابط کے تحت مسلمان بچوں کی ''مکتبوں'' میں حاضری لازمی تھی اور کوئی مسلمان بچہ پہلے ''مکتب'' میں پڑھے بغیر ثانوی مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا ۔ ''ان 'مکاتب'' کی اصلاح کے لیے بعض اقدام کیے گئے، لیکن اکثرصورتوں میں ان پر عمل در آمد نہ ہوا ۔ ۱۹۰۹ء میں تقریباً ایک ہزار پرانے ''مکتب'' (''صبیان مکتبی'') اور بانوے اصلاح شدہ طرز کے (''مکتب ابتدائیہ'') تھے ۔ مسلمان بچوں کے مکتبوں میں رشدیّہ کا بھی شمار تھا اور انھیں اس حیثیت سے نصاب تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ باقی صرف دیہات اور ایک چھوٹے قصبے برچ میں رہنے دیا گیا تھا ۔ ''مدرسے'' ادنٰی مذہبی ملازموں کے لیے تربیت گاھوں کا کام دیتے تھے اور ۱۸۸۷ء میں شرعی قانون اور شرعی عدالتوں کے ہونے والے قاضیوں کے لیے ایک درس گاہ کا قیام عمل' میں آیا تھا ۔ مجلس اوقاف نے ۱۸۹۲ء میں استادان ''مکتب'' کی تربیتی درس گاہ کی بنیاد رکھی ۔ سراجیوو کے سرکاری گرامر سکول کے مسلمان شاگردوں کو اس بات کا اختیار تھا کہ انھیں کلاسیکی یونانی پڑھائی جائے یا عربی۔

عالمگیر جنگِ اوّل کے بعد یوگوسلاویا کی مسلسل حکومتوں کے دوران میں فقط سرکاری ابتدائی مدارس ہی تسلیم کیے گئے، گو ان کی قلیل تعداد قابلِ تعلیم عمر کے بچوں کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی ۔ ابتدائی مدارس میں پڑھنے والے سب بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا ۔ مکاتب ابتدائی تیاری کے یا صرف قرآن مجید پڑھانے کے غیرتعلیمی ادارے بن گئے ۔ تمام ثانوی مدارس میں بھی دینیات پڑھائی جاتی تھی ۔ ۱۹۱۸ء میں ایک سرکاری شرعی ثانوی مدرسہ سراجیوو میں کھولا گیا ۔ شرعی قاضیوں کی تربیت کا مدرسہ ۱۹۳۷ء تک بدستور قائم رہا جبکہ شریعت اور اسلامی دینیات کی ایک اعلٰی درس گاہ جامعہ کے درجے کی قائم کر دی گئی ۔ مجلسِ اوقاف استادانِ مکتب کے تربیتی ادارے اور ''مدرسوں'' کو — جو اب زیادہ تر دینیاتی مضامین کی تعلیم کے ثانوی مدارس ہیں — چلانے کے مصارف کی کفیل ہوئی ۔ مدرسوں کے متعلق ابتدائی اصلاحات ۱۹۳۳ء میں نافذ کی گئیں اور ۱۹۳۹ء میں ایک معیّن لائحۂ عمل اختیار کیا گیا، جس کا منشا انھیں نیچے کے ثانوی سکولوں کی مانند جامع قسم کا بنانا تھا ۔ غازی خسرو بے کا مدرسہ اس اعتبار سے مستثنٰی تھا، کیونکہ اس میں اعلٰی ثانوی نصاب پڑھایا جاتا تھا ۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے متعدّد مسلمانوں کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے مشرقی یونیورسٹیوں سے سند فضیلت حاصل کی ۔ مسلمان شاگردوں اور طلبہ کو وظائف دینے، نیز اقامتی مدارس کے چلانے، ان کے اہتمام اور دیگر تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا کام، جو وقف سے مختص تھا، کم از کم غیر دینی تعلیم کے معاملے میں [illegible]ی ایک مسلم مجلسوں گجرت، روزدنیکہ وغیرہ نے رفتہ رفتہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

نئے یوگوسلاویا میں مذہبی جماعتیں اور مجالس حکومت سے علیحدہ کر دی گئی ہیں، لیکن حکومت مذہبی فرقوں کو امداد دے سکتی ہے - (۱۹۰۳ء کے مذہبی فرقوں کے قانون کی دفعات کے تحت) مذہبی تعلیم صرف معابد کے بالکل قرب و جوار ہی میں دی جا سکتی ہے، تاہم مذہبی فرقے اپنے مذہبی عمّال اور عملے کی تربیت کے لیے سکول کھولنے کے مجاز ہیں - مکاتب جن میں مذہبی مسلم فرقے کے نزدیک مسلمان بچوں کی حاضری لازمی تھی، ۱۹۵۰ء تک موجود تھے؛ اس کے بعد کُل بوسنیا اور ہرزگووینا میں بند کر دیے گئے.

آسٹریا.ہنگری کے نظم و نسق کے دوران میں اور قبل جنگ، یوگوسلاویا میں علم کے ان اسلامی شعبوں کی تعلیم جن کا تعلّق دین اور مشرقی زبانوں سے ہوتا تھا متذکرۂ بالا مدارس و کلّیات کی سرگرمیوں سے گہرا تعلّق رکھتی تھی - اسی زمانے میں سراجیوو کا Zemaljski Muzej (= موزہ یا متحف) ترکی کے سرکاری محافظخانوں سے مشرقی مخطوطات اور تاریخی دستاویزیں فراہم کرنے میں منہمک تھا - عجائب گھر کے عملے میں متعدّد کام کرنے والے مشرق کی ادبی اور تاریخی دستاویزوں کا مطالعہ کرتے تھے - یہی وہ جگہ تھی جہاں اس میدان میں جدید تحقیقاتی مطالعات کی ترقی کے مناسب حالات پیدا کیے گئے (*C. Truhelka*، *V. Skarić*، *F. Spaho*، *R. Muderizović* و دیگر).

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد گذشتہ برسوں میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں سے متعلق مشرقی علوم کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے - چنانچہ سراجیوو کے گرامر سکول میں مشرقی اور مغربی کلاسیکی علوم دونوں قسم کا درسی نصاب پڑھانے کا انتظام کر دیا گیا ہے - جامعۂ سراجیوو میں، جس کی بنیاد ۱۹۴۹ء میں رکھی گئی تھی، مشرقی لسانیات (ترکی، عربی اور فارسی زبانوں اور ادبیّات) کا ایک شعبہ ہے، نیز ترکی عہدِ حکومت کے دوران میں یوگوسلاویا کے لوگوں کی تاریخ کے مطالعات کی طرف خصوصی توجہ دینے کے ساتھ تاریخ کے شعبے میں ترکی کا درس بھی دیا جاتا ہے - سراجیوو اورینٹل انسٹیٹیوٹ میں، جس کی بنیاد ۱۹۵۰ء میں رکھی گئی تھی، مشرقی مخطوطات اور ترکی تاریخی مواد کا گران قدر ذخیرہ موجود ہے، جو سب کا سب وہاں کے Zemaljski Muzej سے حاصل کیا گیا ہے - اپنا سال‌نامہ شائع کرنے کے علاوہ اورینٹل انسٹیٹیوٹ ترکی مآخذ اور مخطوطات کا جو یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ سے خاص تعلّق رکھتے ہیں، ایک باقاعدہ ذخیرہ جمع کرنے میں مصروف ہے (*Monumenta turcica historiam Slavorum Meridionalium illustrantia*) - چنانچہ مطالعات کا ایک وسیع میدان، جو ترکی، عربی اور فارسی زبانوں، ترکی عہد حکومت میں یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ اور علم کی بہت سی دوسری اسلامی شاخوں سے تعلق رکھتا ہے اور جو پہلے مذہبی اداروں اور جماعتوں کے احاطۂ عمل میں تھا، اب غیر مذہبی ہاتھوں میں آ گیا ہے.

مآخذ : (۱) A. Hangi : *Die Moslims in Bosnien-Hercegovina—ihre Lebensweise, Sitten and Gebräuche*، سراجیوو ۱۹۰۷ء؛ (۲) A. Bejtić : *Spomenici osmanlijske arhitekture u Bosni i Hercego ni, Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۳ تا ۴، سراجیوو ۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ء؛ (۳) A. Skaljić : *Turcizmi u narodnom govoru i narodnoj književnosti Bosne i Hercegovine*، ج ۱ تا ۲، سراجیوو ۱۹۵۷ء؛ (۴) K. Hörman : *Narodne pjesme muslimana u Bosni i Hercegovini*، ج ۱ تا ۲، سراجیوو ۱۹۳۳ء؛ (۵) *Hrvatske narodne pjesme—skupila Matica Hr-*

...vatska، Junačke pjesme (muhamedovske): ج ۳ تا ۴، Zagreb ۱۹۳۳ء؛ (۶) A. Nametak: Narodne junačke muslimanske pjesme، سراجیوو ۱۹۳۳ء؛ (۷) H. Dizdar: Sevdalinke—Izbor iz bosansako-hercegovačke narodne lirike، سراجیوو ۱۹۴۴ء؛ (۸) M. Murko: Die Volksepik der bosnischen Mohammedaner، در Zeitschr. d. Vereins f. Volkskunde، ج ۹ (۱۹۰۹ء)؛ (۹) وهی مصنف: Tragom srpsko-hrvatske narodne epike-Putovanja u godinama ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۲ء، ج ۱ تا ۲ (طبع Jugoslavenska akademija znanosti i umjetnosti)، Zagreb ۱۹۵۱ء؛ (۱۰) A. Schmaus: Studije o krajinskoj epici (طبع Jugosl akad znanosti i umjetnosti)، Zagreb ۱۹۵۳ء؛ (۱۱) Kemura- Ćorović: Serbo-kroatische Dichtungen bosnischer Moslims aus dem XVII., XVIII. und XIX. Jh.، سراجیوو ۱۹۱۲ء؛ (۱۲) D.M. Korkut: Makbul-i arvf (Potur Šahidija) Usküfi Bosnevije, Glasnik Hrv. zem. muzeja liv، سراجیوو ۱۹۴۳ء؛ (۱۳) محمّد بن محمّد العانخی البوسنوی: الجوهر الأسنی فی تراجم علماء و شعراء بوسنة، قاهره ۱۳۴۹ھ؛ (۱۴) M. Handžić: Književni rad bosansko hercegovačkih muslimana، سراجیوو ۱۹۳۴ء؛ (۱۵) M. Malić: Bulbulistan du Shaikh Fewzi de Mostar, poète herzegovinien de langue persane، پیرس ۱۹۳۵ء؛ (۱۶) M. Braun: Die Anfänge der Europäisierung in der Literatur der moslemischen Slaven in Bosnien und Herzegowina، لائپزگ ۱۹۳۴ء؛ (۱۷) F. Bajraktarević: O našim mevludima، بلغراد ۱۹۳۷ء؛ (۱۸) O. Sokolović: Pregled štampanih djela na srpskohrvatskom jeziku muslimana Bosne i Hercegovine od 1878-1948 god.، سراجیوو ۱۹۵۷ء، (Glasnik Vrhovnog starješinstva za 1955-57 g.)؛ (۱۹) Dj. Pejanović: Srednje i stručne škole u Bosni i Hercegovini، سراجیوو ۱۹۵۳ء؛

۴ - بوسنیا اور هرزگووینا میں ۱۸۷۸ء کے بعد سے ملّت اسلامیہ کا حال:

بوسنیا اور هرزگووینا پر سلطان کے شاهی حقوق ۱۹۰۸ء تک تسلیم کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ آسٹریا۔هنگری نے یہ صوبہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا - تاهم اس دو عملی حکومت میں بوسنیا اور هرزگووینا کی حیثیت زیادہ تر آسٹریا۔هنگری کے دورنگے آئین کے سبب غیر متعیّن رهی۔

یہ صوبے ایک دهرے اقتدار کے ماتحت تھے جسے الحاق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی آسٹریا کی وزارتِ خزانہ استعمال کرتی تھی - دونوں حکومتوں میں سے هر ایک انتظامی حکمت عملی، ریلوے لائنوں کی تعمیر اور ملک کی تجارت اور مالیات سے تعلق رکھنے والے امور کے متعلق متعیّنہ حقوق رکھتی تھی۔

اس سارے عہد میں بوسنیا اور هرزگووینا میں آسٹریا۔هنگری کا نظم و نسق دفتر شاهی تھا اور اس میں پولیس مسلّط رهی - حاکمِ اعلٰی ایک فوجی سپہ سالار هوتا تھا - محکموں کی تعداد چار تھی، جو بعد میں چھے هو گئی - ۱۸۲۲ء میں، گورنر کا دیوانی نائب (civil adlatus) مقرر کیا گیا اور دیوانی عمّال پوری طرح اس کے ماتحت آ گئے - انتظامی مقاصد کی خاطر ملک چھے ''اوکرگوں'' (Okrugs) (ولایات) میں منقسم تھا - بنالوقہ، بہاچ Bihać، موستر Mostar، سراجیوو، تراونک Travnik اور طوزلہ، اور پھر یہ ''اوکرگ'' ''سرزوں'' (Srezes = اضلاع) اور اسپوستواؤں (Ispostavas = سب سے چھوٹی انتظامی وحدتوں) میں منقسم تھے - ۱۹۰۶ء میں جا کر عدلیہ کو ملکی حکومت سے علیحدہ کیا گیا - الحاق کے بعد هی ۱۹۱۰ء میں

ایک آئین مع ''سابور'' (Sabor = مجلس ملکی) عطا کیا گیا ۔ ''سابور'' بہتّر مندوبین اور بیس نامزد (بہ حیثیت عہدہ) اراکین پر مشتمل ہوتی تھی ۔ نامزد اراکین کچھ تو مذہبی نمائندے ہوتے تھے (مسلمانوں میں رئیس العلماء، ناظم محکمۂ اوقاف اور تین مفتی) اور کچھ اعلٰی عہدے دار ۔ مندوب اپنے رتبے کے مطابق تین شعبوں (curiae) کے لیے منتخب ہوتے تھے، جن میں سے پہلا دو گروہوں پر مشتمل تھا اور بڑی جائدادوں کے مسلمان مالکوں کا تعلق پہلے گروہ سے ہوتا تھا ۔ انتخابی حلقے فرقہ‌وارانہ بنیاد پر شعبوں کی تشکیل کرتے تھے ۔ اس آئین نے حکومت کے بارے میں ''سابور'' کے اختیارات کو بہت ہی محدود کر دیا تھا اور دوسری طرف آسٹریا ۔ ہنگری کی وزارتِ مالیات کے بارے میں حکومت کے اختیارات پر بھی بہت سی قیود عائد کر دی تھیں۔

۱۹۱۲ء میں گورنر کو دیوانی محکموں سے متعلق کچھ مزید اختیارات سونپ دیے گئے ۔ ''سابور'' معطّل کر دی گئی اور پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں اس کا کوئی اجلاس نہ ہوا ۔

اس حقیقت کے باوجود کہ آسٹریا ۔ ہنگری کی حکومت نے نظم و نسق میں جدید آئین رائج کیے، تجارت اور بالخصوص کان کنی اور چوب کی صنعت کو فروغ دیا، سڑکیں اور ریل کی پٹریاں بنائیں، نیز سکول اور متعدد سائنسی ادارے قائم کیے، لیکن معاشرے کی ہیئت ترکیبی میں کسی لحاظ سے کوئی فرق نہ آیا ۔ یہ سچ ہے کہ آسٹریا ۔ ہنگری کے حکّام اس طریق سے مسلم طبقۂ امرا کے بیشتر حصّے کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تاہم زرعی مسئلے کے حل نہ ہونے کے باعث زراعت میں جمود پیدا ہو گیا، اور اس کا اثر کسانوں پر بالخصوص کمتوں kmets پر (جو زیادہ‌تر یونانی کلیسائے قدیم کے پیرو تھے) بہت ہی مضر پڑا ۔ اور ۱۹۱۱ء سے قانون گروہی واگزاشت اراضی (Facultative Redemption of Land Act) کی منظوری سے بھی زرعی مسئلے کا کوئی حل نہ ہوا ۔ اس قانون کی رو سے زمیندار اور مزارع کے رائج الوقت تعلّقات میں فقط معمولی سی تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔

۱۸۸۲ سے ۱۹۰۳ء تک بوسنیا اور ہرزگووینا میں آسٹریا ۔ ہنگری کی حکمت عملی کے سلسلے میں بڑا کردار B. Kallay نے ادا کیا، جو اس دہری سلطنت کا وزیرِ مالیات تھا اور دوسری طرف ایک مشہور و معروف مؤرخ بھی تھا ۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کو اس دہری بادشاہی کے تحت ایک جداگانہ وحدت کی حیثیت سے رکھنے کی خاطر اور سربی و کروٹی وطن پرستی کی تحریک کو روکنے کے لیے کیلے نے ایک بوسنوی قوم اور بوسنوی زبان پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ مگر یہ حکمتِ عملی ملکی باشندوں میں حامیوں کی کافی تعداد فراہم کرنے میں ناکام رہی، کیونکہ سرب اور کروٹ قومی لحاظ سے باشعور ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی اکثریت، جس نے اپنی قومیت کا اعلان نہیں کیا تھا، اپنا اصلی وطن ترکی کو خیال کرتی تھی ۔ مزید برآں بہت سے مسلم خاندان ترکی میں آباد ہو گئے تھے اور مسلم رہنما ہمیشہ بوسنیا اور ہرزگووینا پر عثمانی سلطان کے حقوق سلطانی پر زور دیتے تھے ۔ غرض مسلمانوں کے تعلیم‌یافتہ اور زمینداروں کے طبقے کے ایک بہت ہی قلیل حصّے نے بوسنوی قومیت کے اصول کو اپنایا ۔

سربیا کی سیاسی تحریک نے اپنی بیشتر مساعی کو کلیسائی معاملات اور سربی قومی مدارس کو چلانے میں آزادی حاصل کرنے میں صرف کیا ۔

آسٹریا ۔ ہنگری کے حکام کے بعض اقدامات کے متعلق مسلمانوں میں روز بروز بدظنی پیدا ہوتی گئی ۔ مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو اپنی نگرانی میں لے آنے کی غرض سے حکومت نے ۱۸۸۲ء میں

''رئیس العلما'' کا عہدہ اختراع کیا، جو بوسنوی ہرزگوینی مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی سرگروہ ہوتا تھا - نیز ایک سب سے اعلٰی مذہبی جماعت (Ulema Medžlis = مجلسِ علما) قائم کی، جس کی صدارت رئیس العلما کرتا اور اس کے ساتھ چار ارکان ہوتے تھے - یہ تنظیم اتنی بڑھی کہ اس نے مجلسِ اوقاف کے اختیارات کو بھی اپنی زیرنگرانی کر لیا - مسلمانوں نے پریشان و خوفزدہ ہو کر (۱۸۸۶ء میں) شہنشاہ کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں ''اوقاف'' کے معاملات میں آزادی کا مطالبہ کیا - ۱۸۹۹ء میں مفتی موستر جابچ A.F. Džabić کی قیادت میں بوسنیا و ہرزگووینا میں تمام مسلمانوں کے لیے مذہبی اور تعلیمی آزادی کے حصول کے لیے زبردست جد و جہد شروع ہوئی - یہ جد و جہد کلیسائے یونان کی (سربی) تحریک سے وابستہ ہو گئی - جابچ زیادہ سے زیادہ مراعات کے مطالبے پر اصرار کرتا تھا، لیکن رائے شماری میں ہار گیا - ۱۹۰۰ء میں وزیر کیلے کے سامنے ملت اسلامیہ کے لیے ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا، جس میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں سلطان کے شاہی حقوق پر خصوصی زور دیا گیا تھا، لیکن یہ اصول آسٹروی۔ہنگروی حکام تسلیم کرنے پر رضا مند نہ تھے - جب مفتی موستر جابچ سلطان سے مشورہ کرنے کے لیے استانبول روانہ ہوا تو اسے بوسنیا و ہرزگووینا میں دوبارہ داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی - ۱۹۰۶ء سے اور اس کے بعد اس تحریک نے زیادہ منضبط و متعیّن صورت اختیار کر لی - علی بیگ فِردَوس کی صدارت میں تنظیم ملّتِ اسلامیہ کی جماعت منتظمہ منتخب ہوئی - یہ تنظیم اگرچہ جانداد رکھنے والے طبقوں کے مفادات کی حمایت کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی آزادی عطا کیے جانے کے لیے بھی حکومت سے مذاکرات شروع کر دیے - یہ مذاکرات التوا میں پڑے رہے، کیونکہ آسٹریا۔ہنگری کے حکّام کوئی بات جس میں سلطان کے شاہی حقوق کا اشارہ ہو سننے کے لیے تیار نہ تھے - البتہ صوبے کے سلطنت میں الحاق کے بعد جب شہنشاہ نے بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کی خوداختیاری حکومت کے متعلق قانون (Vekf-Mearaf = وقفِ معارف) کی منظوری دے دی تو شرائط تسلی بخش طور پر طے ہو گئے - اس قانون کے تحت اوقاف، اور مدارس و کلیات کے اوقاف کے متعلق اعلٰی انتظامی اختیارات ''وقف معارف'' کی ایک مجلس (Sabor) کو تفویض کر دیے گئے، جو آٹھ نامزد سرکاری (بہ حیثیت عہدہ) ارکان (رئیس العلما، چھے مفتی اور ناظم مجلس اوقاف) اور چوبیس غیر سرکاری اراکین پر مشتمل تھی، جنھیں مجالس ضلع کی جماعتیں منتخب کرتی تھیں - اس کا صدر رئیس العلما جماعت (بہ حیثیت عہدہ) ہوتا تھا - ''وقف معارف'' کمیٹی سابور کی مجلسِ انتظامیہ اور مجلسِ عاملہ کا کام کرتی تھی - ''وقف معارف'' بورڈ کی ثانوی درجے کی انجمنیں اضلاعی کمیٹیاں تھیں، جنھیں اضلاعی مجلسیں منتخب کرتی تھیں اور مؤخّر الذکر میں جماعت džamat اسمبلیاں اور ''جماعت'' مجلسیں ہوتی تھیں - ارفع ترین مذہبی اختیار ''مجلس علما'' کو حاصل تھا جو چار ارکان پر مشتمل ہوتی تھی اور جس کا صدر ''رئیس العلما'' ہوتا تھا - رئیس العلما اور ان ارکان کا انتخاب ایک جداگانہ انتخابی جماعت کرتی تھی جو چھے مفتیوں اور چوبیس نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی تھی - انتخابی جماعت رئیس العلما کی اسامی کے لیے تین (منتخب) امیدواروں کے نام شہنشاہ کے سامنے پیش کرتی، جن میں سے ایک کو شاہی فرمان کے ذریعے رئیس مقرر کیا جاتا تھا - رئیس اسی

صورت میں اپنے فرائض سر انجام دینا شروع کرتا جب وہ مذہبی فرائض ادا کرنے کے لیے استانبول کے "شیخ الاسلام" سے "منشورہ" (= اجازت نامہ) حاصل کر لیتا ۔ متعلقہ درخواست آسٹریا۔ ہنگری کے توسط سے استانبول میں پیش کرنا پڑتی تھی ۔ "مجلس علما" میں کوئی اسامی خالی ہو جاتی تو وزارت مالیات دو نامزد ارکان میں سے کسی ایک کو نامزد کر کے اسے پر کرتی تھی ۔ ہر "اکرگ" (ولایت یا قسمت) کا اپنا ایک مفتی ہوتا تھا، جسے حکومت ان امیدواروں میں سے نامزد کرتی جنھیں "مجلس علما" پیش کرتی تھی ۔ اعلٰی مذہبی عمال اور شہری ملازموں کی تنخواہیں صوبائی میزانیے سے ملتی تھیں ۔ اس قانون نے مسلمانوں کے فرقہ‌وارانہ مدارس نیز شرعی حاکمان عدالت کے بارے میں مذہبی عمّال کے حقوق کے سوال کا بھی فیصلہ کر دیا۔

بوسنیا اور ہرزگووینا کے یوگوسلاویا میں شامل ہو جانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی مذہبی ملّت کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا۔ مزید برآں بوسنیا اور ہرزگووینا کے باہر یوگوسلاویا میں بھی مسلمان موجود تھے۔ تاہم ۱۹۰۹ء کا قانون بوسنیا اور ہرزگووینا میں ۱۹۳۰ء تک نافذ رہا۔ مسلمانوں کی ایک علٰیحدہ مذہبی تنظیم تھی جو سربیا، مقدونیا اور مونٹنگرو پر حاوی تھی۔ زرعی اصلاح پر عمل درآمد سے مسلمان مالکان جائداد کو بوسنیا اور ہرزگووینا میں "اوقاف" کی بہ نسبت زیادہ نقصان پہنچا کیونکہ "اوقاف" کی زیادہ‌تر جائداد دیہاتی علاقے میں ہونے کے بجائے شہری قطعات پر مشتمل تھی۔ اس کے باوجود بوسنیا اور ہرزگووینا میں "وقف" کی تنظیم میں لامرکزیت نیز مالیاتی انتظام میں ابتری اور بدعنوانیوں نے "وقف" کی جائداد کو بھی بہت نقصان پہنچایا۔

یوگوسلاویا میں پارلیمانی حکومت کی منسوخی کے بعد ۱۹۳۰ء میں اسلامی مذہبی فرقے اور سلطنت یوگوسلاویا میں اس کے آئین کے متعلق ایک قانون منظور کیا گیا ۔ اس طرح پہلی با اختیار مسلم مذہبی جماعتیں ایک ہی رئیس، یعنی "رئیس العلما" اور ایک ہی بالا دست جماعت، یعنی "مجلس علما" کے ماتحت یکجا کر دی گئیں ۔ آخرالذکر میں "رئیس العلما" کے ساتھ صرف سابقہ صدر مجلس علما شامل ہوتے تھے ۔ "رئیس العلما" کی سرکاری سکونت‌گاہ اور اسلامی مذہبی فرقے کے بورڈ کا دفتر بلغراد میں منتقل ہو گئے، تاہم ان کے علاوہ دو "علما مجلس" اور دو "وقف معارف" کی کونسلیں مع اپنی انتظامی کمیٹیوں کے اور تھیں جن کے مرکزی دفاتر سراجیوو اور سکوبچے Skobče میں تھے ۔ نسبةً کم‌اختیار والے مفتی، اضلاعی "وقف معارف" بورڈ، جس کا رئیس شرعی حاکم عدالت ہوتا تھا اور "مجلس جماعت" تھے جس کا صدر "امام جماعت" ہوتا تھا ۔ اس قانون اور آئین کی اہم خصوصیات اس حقیقت میں دیکھی جا سکتی ہیں کہ بیشتر اسامیوں پر تقرر نامزدگی کے ذریعے کیا جاتا تھا ۔ اور "رئیس العلما" کا عہدہ "مجلس علما" پر بھی فوقیت رکھتا تھا ۔ "رئیس" فی الحقیقت مملکت میں ایک متحدہ اسلامی ملّت کا سردار اور نشان تھا، مگر نظم و نسق میں دو عملی تھی (سراجیوو اور سکوبچے) ۔ رئیس "مجلس علما" کے ارکان اور مفتیوں کی اسامیوں کے امیدوار کا انتخاب بھی خاص خاص ضابطوں سے منضبط کیا گیا تھا ۔ انتخابی مجلس سے توقع کی جاتی تھی کہ رئیس کے عہدے کے لیے تین امیدوار چنے گی جن میں سے ایک وزیر انصاف اور وزیر اعظم کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے نامزد ہوتا تھا ۔ نیز وزیر انصاف کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے ہی مجلس علما کے ارکان اور مفتی نامزد

ہوتے تھے.

۱۹۳۶ء میں ایک نیا قانون اور آئین منظور ہو جانے کے ساتھ تبدیلیاں تو کی گئیں لیکن ان سے نہ تو اس وحدت میں جس کا مظہر رئیس کا عہدہ تھا اور نہ دوسری مجالس کی دو عملی میں کوئی فرق پڑا۔ اسلامی مذہبی فرقے کے بڑے نمائندے مفصلۂ ذیل تھے: مجلسِ جماعت، اضلاعی وقف کمیشن، سراجیوو اور سکوپچے میں مجلس علما، وقف معارف کی بڑی مجلس (Sabor)، سراجیوو اور سکوپچے میں، جس کے ساتھ مجلس کی کمیٹیاں، وقف بورڈ اور پھر رئیس العلما مع چیدہ یا پوری کونسل کے۔ رئیس کی سرکاری سکونت‌گاہ سراجیوو میں تھی۔ مفتی کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ ضوابط کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ منتظم مجالس اور عمّال کے تقرر میں، سرکاری نامزدگی کا دخل تھا اس لیے کہ مجلس علما کے ارکان کے انتخاب کے لیے ہر ایک اسمبلی دس ارکان کا انتخابی حلقہ منتخب کرتی تھی جو ''رئیس'' کے امیدواروں کے انتخاب کے لیے خود ایک انتخابی مجلس کی تشکیل کرتے تھے۔ پھر پہلے کی طرح امیدواروں میں سے ایک (عموماً وہ جسے زیادہ ووٹ ملتے تھے) وزیرِ انصاف کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے ''رئیس'' مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ تنظیم تھی جس کے ذریعے ''یوگوسلاوی مسلم آرگنائزیشن'' نے، جس کی قیادت M. Spaho کے ہاتھ میں تھی، مسلمانوں میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کیا۔

نئے یوگوسلاویا میں اسلامی مذہبی فرقے کی حیثیت اور حقوق کا تحفظ آئین میں ضروری دفعات کے ذریعے کر دیا گیا ہے اور مختلف مذہبی فرقوں کے متعلق ۱۹۵۳ء کے قانون کے ذریعے وہ منضبط بھی ہو گیا ہے۔ مذہبی تنظیمات حکومت سے علیحدہ کر دی گئی ہیں، کیونکہ مذہبی معتقدات کو ایک نجی معاملہ سمجھا گیا ہے۔ مذہبی فرقے اپنے مذہبی عمّال اور عملے کی تربیت کے لیے سکول چلا سکتے ہیں۔ حکومت بھی مذہبی فرقوں کو امداد دے سکتی ہے.

یوگوسلاویا میں اسلامی مذہبی فرقے پر حکومت ''وفاقی جمہوریۂ عوام یوگوسلاویا'' کے اس آئین کے ضوابط کے ذریعے کی جاتی ہے جسے اعلٰی ''وقف'' اسمبلی نے مسلمانوں کے لیے ۱۹۴۷ء میں بنایا اور منظور کیا تھا۔ اس عرصے میں بعض دفعات تبدیل کر دی گئی ہیں اور بعض کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس آئین نے یوگوسلاویا میں مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی وحدت کو نہ صرف ''رئیس العلما'' کے عہدے بلکہ اعلٰی وقف اسمبلی کے قیام کے ذریعے عملی صورت دی ہے۔ ساتھ ہی سلطنت کی وفاقی ساخت کا بھی ان ''مجالس علما'' اور ''وقف اسمبلیوں'' کے ذریعے لحاظ رکھا گیا ہے جو چار جمہوریتوں میں قائم کی گئی ہیں جہاں مسلم آبادی کی معقول تعداد موجود ہے۔ سب سے اعلٰی اختیار ''رئیس'' اور ''وقف اسمبلیوں'' کے چار ارکان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ''رئیس العلما'' اور اعلٰی اختیار کے ان چار ارکان کو اعلٰی وقف اسمبلی منتخب کرتی ہے [رَكَ بہ یوگوسلاویا].

مآخذ: (۱) V. Skarić و O. Nuri Hadžić و N. Stojanović: *Bosna i Hercegovina pod austro-ugarskom upravom, Srpski narod u XIX veku*، بلغراد ۱۹۳۸ء؛ (۲) A. I. Balagija: *Uloga vakufa u verskom i svetovnom prosvećivanju naših muslimana*، بلغراد ۱۹۳۳ء؛ (۳) M. Begović: *Legislation relative à l'organisation des affairs réligieuses des musulmans en Yougoslavie*، *Annuaire de l'Association Yougosl. de droit int.* بلغراد - پیرس ۱۹۳۳ء؛ (۴) *The Statute of 1909 concerning autonomous government of Islamic re-*

ligious and Vakf Mearif affairs in Bosnia and Herzejovina؛ (۵) Law of January 31st 1930 concerning the Islamic Religious Community in the Kingdom of Yugoslavia؛ (۶) Constitution of the Islamic Religious Community in the Kingdom of Yugoslavia (۹ جولائی ۱۹۳۰ء)؛ (۷) Law of March 25th 1936 concerning the Islamic Religious community in the Kingdom of Yugoslavia؛ (۸) Constitution of the Islamic religious community in the Kingdom of Yugoslavia، ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء؛ (۹) Law of May 27th 1953 conerning the legal position of religious Communities؛ (۱۰) Constitution of the Islamic Religious Community in the FPR of Yugoslavia (Glamik Vrhovnog Islamskog starjesinstva) (FNRJ, br. 1-3 و 1957)، Enciklopedija Jugoslavije، ج ۳، (Begović : Islam u Jugoslaviji) زیر طبع؛ [(۱۱) وہ ماخذ جو Encyclopaedia Brit. کے مقالۂ Bosnia کے آخر میں درج ہیں]۔

(BRANISLAV DJURDJEV)

* **بوسنہ سرای** : رَکَ بہ سرای۔

* **بُوشَنْج** : المعروف بہ فُوشَنْج، فارسی زبانِ وسطی میں غالبًا پُوشنگ، قدیم ایرانی شہر، جو دریائے ہری رُود کے جنوب میں اور ہرات سے، جو دریا کے شمال میں ہے، مغرب جنوب مغرب میں دس فرسنگ (ایک یوم کی مسافت) پر واقع تھا (یاقوت، ۱ : ۷۵۸)۔ یہ شہر زمانۂ قبل از اسلام میں موجود تھا اور افسانوی روایت کی رو سے اس کی بنیاد یا تو (اس کے نام کو دیکھتے ہوئے) قصبے کے مرکزی کردار پَشَنگ (افراسیاب کا بیٹا اگرچہ قدیم رزمیات میں اس کا باپ بتایا گیا ہے) نے رکھی تھی یا ساسانی بادشاہ شاپُور اوّل (۲۴۲ تا ۲۷۲ء) نے (G. Marquart : Erānshahr، ص ۹۳) ۔ ۸۸ ء میں اس شہر کا ذکر نسطوری اسقف کے صدر مقام کے طور پر ملتا ہے (وہی کتاب، ص ۶۳؛ تاہم Jean Dauvillier : Les Provinces Chaldéennes "de l'Extérieur"، در "Mélanges Cavallera"، Toulouse ۱۹۴۸ء، ص ۲۶۹ تا ۲۸۲)؛ Wilh. Tomaschek : Zur historischen Topographic von) Persien ، ۱، وی انا ۱۸۸۳ء : ۷۸) نے اس کا رشتہ Theophrastus کے Πισάγγαι سے جوڑا ہے۔

یہ شہر ۶۵۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور دو سو برس تک عربوں اور مشرقی ایران کے کوہستانی علاقوں کے درمیان، جو ابھی پوری طرح مفتوح نہیں ہوئے تھے، سرحد کا شہر رہا۔ انھیں کوہستانی علاقوں سے اسے اس موقع پر امداد حاصل ہوئی جب اس نے ۴۱ھ / ۶۶۱ - ۶۶۲ء میں اور پھر ۱۶۰ھ / ۷۷۶ - ۷۷۷ء میں عربوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ۹۲ھ / ۷۱۱ء سے ۹۴ھ / ۷۱۳ء تک یہ مقام خوارج کے زیرِ تسلّط رہا۔ اس شہر کے پُر سکون دَور کا آغاز اس وقت ہوا جب آلِ طاہر [رَکَ بآں] کے عہد میں اس علاقے کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام بڑی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خاندان طاہریہ کا بانی اسی شہر کا باشندہ تھا۔ آگے چل کر بُوشَنج کا تعلق سیستان سے ہو گیا اور ۳۹۲ھ / ۱۰۰۳ء میں وہ خاندان غزنویہ کی حکومت کے ماتحت آ گیا (قب B. Spuler : Iran in früh-islamischer Zeit، لائپزگ ۱۹۵۲ء، ص ۱۹، ۲۵، ۵۱، ۵۳، ۷۱ ببعد، ۱۱۱، ۳۰۱ مع حوالہ جات دربارۂ ماخذ)۔

اس زمانے میں بُوشنج کا رقبہ ہرات سے نصف کے قریب ہوگا۔ قرونِ وسطٰی کی پُوری مدّت میں یہ ایک مستحکم قلعے کے طور پر مشہور رہا۔ اس کے تین دروازے تھے۔ اقتصادی اعتبار سے اس کی اہمیّت کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہرات سے نیشاپور اور ہرات سے کوہستان جانے والی سڑکوں کے

سنگھم پر واقع تھا (الاصطخری، ص ۲۶۷، آخری سطر، ۲۶۸ : سطر ۸؛ ابن رستہ، ص ۱۷۳ س ۱۷ بعد؛ حدود العالم، ص ۶۴، ۱۰۴، ۳۲۷؛ حمد اللہ المستوفی : نزھۃ، ص ۱۵۲ ببعد، ۱۷۷ تا ۲۲۰، ترجمہ ص ۱۵۰؛ ۱۷۱، ۲۱۲) - مزید برآں بوشنج میں عمارتی لکڑی اور چوبی کام کی صنعتیں تھیں جو قریبی جنگلوں سے لکڑی کی بہم رسانی کے باعث جاری رہتی تھیں (المقدسی، ص ۳۰۷ ببعد (مبنی بر الاصطخری)؛ Spuler : کتاب مذکور، ص ۴۰۸؛ Le Strange، ص ۴۳۱).

چنگیزی مغول کی فتح کے بعد ان کے باجگزار شاھان کرت (یا کرت [رَکَ بآں] ۱۲۴۵ تا ۱۳۸۹ء کے عہد میں بوشنج پر ایک نسبۃً پر سکون دور گزرا، تا آنکہ وسط ذوالحجہ ۷۸۲ھ / مارچ ۱۳۸۱ء میں تیمور نے اسے فتح کر کے بڑی سختی سے تباہ و برباد کر دیا، لیکن تھوڑا ھی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ یہ از سر نو تعمیر کر لیا گیا - پندرھویں صدی میں (حافظ آبرو [رَکَ بآں] کے ھاں) اس کا ذکر بار بار آیا ہے - ۸۹۷ھ/ ۱۴۹۱ - ۱۴۹۲ء میں لوگ اس کے قریب ایک رباط دکھاتے تھے جس کی تعمیر حضرت ابراهیمؑ سے منسوب کی جاتی تھی [معین الدین الزمچی] الاسفزاری : روضات [الجنات] فی [تاریخ] ھرات، مطبوعہ در JA، ۵ : ۱۶ [جولائی تا دسمبر ۱۸۶۰]، ص ۴۹۳ ببعد) - اس کے بعد یہ مقام تاریخ کے صفحات سے محو ہو جاتا ہے؛ قیاس ہے کہ یہ ازبکوں اور ترکمانوں کی تاختوں سے تباہ و برباد ہو گیا - بقول W. Tomaschek : *Topographie*، ۱ : ۷۸ موجودہ شہر غوریاں اسی کے محلِ وقوع پر واقع ہے .

([B. SPULER و] W. BARTHOLD)

* **بُوشَہر** : (بُوشیر)، ایران کے اُستانِ ھفتم (فارس) کا ضلع اور شہر - شہر کا محلِ وقوع ۲۸ درجہ ۵۹ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۵۰ درجہ ۵۲ دقیقہ طول بلد مشرقی (گرینچ) ہے - بوشہر ایک طویل اور تنگ جزیرہ نما کے شمالی سرے پر بھربھرے پتھر کی آگے بڑھی ہوئی ایک نیچی پہاڑی پر واقع ہے - جزیرہ نما کو اندرونی ملک سے ملانے والی یہ خاکنائے اتنی نشیب میں ہے کہ جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو بعض اوقات یہاں سیلاب آ جاتا ہے؛ اسی لیے یہاں ایک بلند پشتے کا راستہ بنا دیا گیا ہے تا کہ ایسے موقعوں پر بوشہر اور ملک کے اندرونی علاقوں کے درمیان سلسلۂ مواصلات قائم رہے - جزیرہ نما کے جنوبی سرے پر بوشہر سے ساڑھے سات میل پر ریشہر کے قدیم شہر کے کھنڈر واقع ھیں جہاں سے بابل کے زمانے کے مردوں کی راکھ رکھنے کے مٹکے اور خطِ میخی میں لکھے ہوئے کتبے بر آمد ہوئے ھیں - ری شہر کو غالبًا وھی ''یونانی شہر'' (Ἰώνακα) سمجھنا چاہیے جس کا ذکر چرکس Charax کے مصنف اسیڈور Isidore نے کیا ہے - ساسانی بادشاہ اَردشیر نے اسے از سرِ نو بسایا اور اس کا نام ریو اردشیر رکھا - ریشہر اسی کا مخفف ہے - دسویں - سولھویں اور گیارھویں - سترھویں صدیوں میں یہاں پرتگیزوں کی ایک نو آبادی اور قلعہ تھا .

بوشہر کے نام کے اشتقاق کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، چونکہ ''ابو شہر'' (شہر کا باپ) سے کوئی موزوں مفہوم برآمد نہیں ہوتا اس لیے ''ریشہر'' کے مفروضے کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اس کا اصل نام ''بخت اردشیر'' (''اردشیر نے بخش دیا) ہوگا - یہ اشتقاق ممکن ہونے کے باوجود مشکوک ہے - اٹھارھویں صدی میں برطانوی ملاحوں نے اس کا نام بگاڑ کر ''Busheer'' اور ''Bushire'' کر دیا .

بوشہر کا سب سے پہلے ذکر بظاہر یاقوت (۱ : ۵۰۳) کے ھاں ملتا ہے - اس کی حیثیت ۱۷۳۴ء

تک ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی، تا آنکہ نادر شاہ [رک بآں] نے اسے خلیج فارس میں اپنی بحریہ کا مستقر بنایا اور بندر نادریہ کا نام دیا (دیکھیے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی *Gombroon Diary*، بابت پنجم / شانزدہم جولائی ۱۷۳۴ء، در *Persia and the Persian Gulf Records*، انڈیا آفس لائبریری، و L. Lockhart : *Nadir Shah*، لنڈن ۱۹۳۸ء، ص ۹۲ تا ۹۳) - بعد ازاں بوشہر میں ایک بہت بڑا جنگی جہاز تعمیر کرنے کی ایک ناکام کوشش کی گئی - اس کے لیے لکڑی خشکی کے راستے مازندران کے جنگلوں سے لائی گئی تھی جس پر بے انتہا محنت اٹھانا پڑی - جب ۱۸۱۱ء میں سر ڈبلیو - اوسلی Sir W. Ousley بوشہر کے ساحل پر اترا تو اس نے وہاں اس جہاز کی باقیات دیکھی تھیں (رک بہ Sir W. Ouseley : *Travels in Various Countries of the East, more particularly Persia*، لنڈن ۱۸۱۹ء، ۱ : ۸۸؟) - اگرچہ جہاز بنانے کا یہ تجربہ تو ناکام رہا، تاہم بو شہر کی طرف نادر شاہ کی توجہ مبذول ہونے کے باعث یہ خوب پھلنے پھولنے لگا - مزید برآں آگے چل کر جب انگریزی اور ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندر عباس [رک بآں] سے اپنے کارخانے یہاں منتقل کر لیے تو اسے تجارتی اعتبار سے بڑا فائدہ پہنچا - بوشہر کی ترقی کی ایک اور بہت اہم وجہ یہ تھی کہ کریم خان زند [رک بآں] کے عہد میں ایران کا دارالحکومت شیراز قرار پایا جس کے ساتھ بوشہر ایک تجارتی شاہراہ کے ذریعے ملا ہوا تھا - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوشہر نے ملک کی مرکزی بندرگاہ کی حیثیت سے بندر عباس کی جگہ لے لی اور یہ مقام اسے ڈیڑھ صدی تک حاصل رہا - ابراہام پارسنز Abraham Parsons، جو ۱۷۷۰ء میں بوشہر گیا تھا، بیان کرتا ہے کہ جب وہ سمندر کے راستے بوشہر کے قریب پہنچا تو اسے زمین دکھائی دینے سے پہلے وہاں کے مکانات نظر آئے - وہاں سمندر اس قدر اتھلا تھا کہ بڑے جہاز ساحل سے کوئی تین میل پرے لنگر انداز ہوا کرتے تھے - اس کے اندازے کے مطابق وہاں کی آبادی معمولی حالات میں تقریباً بیس ہزار تھی، لیکن جن دنوں وہ وہاں گیا تھا، تقریباً دو تہائی آبادی بصرے [رک بآں] کے محاصرے پر گئی ہوئی تھی - دیکھیے اس کی تصنیف *Travels in Asia and Africa*، لنڈن ۱۸۰۸ء، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸ -

انیسویں صدی میں بطور بندرگاہ کے بوشہر کی اعلٰی حیثیت آسانی سے قائم رہی - برطانیہ اور ایران کی مختصر سی جنگ کے دوران میں برطانوی فوج نے دسمبر ۱۸۵۶ء میں شہر پر قبضہ کر لیا جو آئندہ مارچ صلحنامے پر دستخط ہونے تک برقرار رہا - بوشہر کے ساتھ برطانیہ کا تعلق، جو پہلے صرف تجارتی تھا، لیکن بعد ازاں سیاسی بھی ہو گیا (کیونکہ یہ خلیج فارس میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کا صدر مقام بن گیا تھا)، وقت گزرنے پر زیادہ اہم ہوتا گیا - اس تعلق کے باعث شہر کی تجارت میں دوسرے ممالک نے بھی حصّہ لیا - انیسویں صدی کے اواخر میں تجارت کی تفصیلات و جزئیات اور جہازوں کی آمد و رفت کا حال برطانوی ریزیڈنٹ کی انتظامی رودادوں (Administrative Reports) میں ملتا ہے، جو ۱۸۷۶ء کے بعد سے برابر لکھی جاتی رہیں - یہ رودادیں کلکتے میں *Selections from the Records of the Government of India Foreign Department* میں شائع ہوئی تھیں (Freiherr M. von Oppenheim کی تصنیف *Vom Mittelmeer zum persischen Golf*، برلن ۱۹۰۰ء، ۲ : ۳۱۰ تا ۳۱۷ میں جو جدولیں ۱۸۹۳ سے ۱۸۹۷ء تک کے عرصے سے متعلق ہیں وہ انھیں مطبوعات پر مبنی ہیں).

بیسوی صدی کے ربع اوّل میں بوشہر بدستور خوشحالی کی راہ پر گامزن رہا، لیکن ۱۹۳۸ء میں

ٹرانس ایرانین ریلوے کی تکمیل اور بندر شاپور اور خُرّم شہر کے ترقی پانے کے باعث اسے ملک کی بڑی بندرگاہ کی حیثیت حاصل نہ رہی ۔ بوشہر کے برعکس بندر شاپور اور خُرّم شہر دونوں میں مال کی گودیاں اور جہاز سے بندرگاہ تک جانے والے پُشتے تعمیر کیے گئے ہیں اور وہاں بڑے بڑے جہاز آ کر ٹھیر سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ دونوں بندرگاہیں ریلوے کے ذریعے تہران اور اندرونِ ملک کے دوسرے شہروں سے ملی ہوئی ہیں ۔

۱۹۴۶ء میں بوشہر کی آبادی پندرہ ہزار تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی منصوبہ‌بندی کا ادارہ (Persian Plan Organisation) بندرگاہ کو ترقی دینے اور شہر کو دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کا قصد رکھتا ہے، لیکن اگر اس منصوبے پر پوری طرح عمل درآمد ہو جائے تو بھی قرینہ نہیں ہے کہ بوشہر بطور بندرگاہ اپنی سابقہ اعلٰی حیثیت کبھی دوبارہ حاصل کر لے گا ۔

مآخذ : (۱) C. Niebuhr : Voyage en Arabic et en d'autres Pays circonvoisins، ایمسٹرڈم ۱۷۸۰ء، ۲ : ۷۵-۷۶؛ (۲) James Morier : A Second Journey through Persia، لنڈن ۱۸۱۸ء، ص ۳۸ تا ۴۵؛ (۳) J. B. Fraser : Narrative of a Journey into Khorasān، لنڈن ۱۸۲۵ء، ص ۴۵ تا ۵۸؛ (۴) J. R. Wellsted : Travels to the City of the Caliphs، لنڈن ۱۸۴۰ء، ۱ : ۱۳۰ تا ۱۳۶؛ (۵) W. A. Shepherd : From Bombay to Bushire and Bussora، لنڈن ۱۸۵۷ء، ص ۱۲۳ تا ۱۵۴؛ (۶) H. Petermann : Reisen im Orient، لائپزگ ۱۸۶۱ء؛ (۷) F. Spiegel : Erānische Altertumskunde، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱ : ۹۰؛ (۸) C. Ritter ; Erdkunde، ۶ : ۱۲ و ۸ : ۷۷۹ تا ۷۹۸؛ (۹) J. de. Morgan : Mission scientifique en Perse. étude géographique، پیرس ۱۸۹۵ء، ۲ : ۳۰۰ تا ۳۰۲؛ (۱۰) W. Tomaschek در SBAk. Wien، ج ۱۲۱، مقالہ ۸ (۱۹۰۸ء) : ۶۱ تا ۶۳؛ (۱۱) G. N. Curzon : Persia and the Persian Question، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۲ : ۲۳۰ تا ۲۳۶؛ (۱۲) E. Sachau : Am Euphrat und Tigris، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۲ تا ۱۴؛ (۱۳) A.T. Wilson : The Presian Gulf، اوکسفرڈ ۱۹۲۸ء، ص ۳۱، ۵۰، ۷۳، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۳، ۱۸۵، ۲۰۳، ۲۵۷، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۸۳؛ (۱۴) رزم آراء و نوتاش، فرہنگ جغرافیای ایران، ۷ : ۴۰؛ (۱۵) راہنماے ایران (مطبوعۂ شعبۂ جغرافیۂ ایرانی جنرل سٹاف، تہران ۱۹۵۱ء)، ص ۶۰ (نقشہ شہر، ص ۶۱).

(L. LOCHART)

بُوشِیر : رَكَ بہ بُوشہر.

بُوصِیر : یا ابوصِیر، مصر میں واقع کئی مقامات کا نام ۔ یہ ایسے مقامات کا نام ہے جہاں اوسیرِس Osiris دیوتا کو خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا .

ابُو صِیر کا نام اسکندریہ کے مغرب کے مضافات کے وسیع علاقے میں ملتا ہے اور Taposiris Magna کے محلِ وقوع کی یاد تازہ کرتا ہے .

بُوصِیر دریاے نیل کی شاخ دُمیاط (Damietta) کے مغربی کنارے پر الغربیّہ کے صوبے میں واقع ہے ۔ قرونِ وسطٰی میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور ایک قریبی بستی بنا سے ملا ہوا تھا، اسی لیے اسے ''بوصِیر بنا'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا ۔ بوصِیر قدیم زمانے میں مشہور تھا ۔ یہاں ایک اسقف رہتا تھا اور یہ کُورۃ (pagarchy) کا صدر مقام تھا .

بُوصِیر السِّدر، صوبۂ الجیزۃ میں واقع ہے جہاں ابھی تک بعض اہرام موجود ہیں ۔ عبداللطیف نے اس کا جو حال قلمبند کیا ہے وہ ایک اعلٰی درجے کی دستاویز ہے، یہی بات ان اکتشافات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جن کا ذکر اس نے اس

قصبے کے قبرستان کے سلسلے میں کیا ہے۔

وہ بُوصیر جیسے قرونِ وسطٰی میں بُوصیر۔ قُوریدس کہا جاتا تھا اور جو کم از کم گیارھویں / سترھویں صدی سے بُوصیر المَلَق کے نام سے مشہور ہے، مصر متوسّط کی مغربی پٹی کے اندر صوبۂ فیوم کے مدخل پر واقع ہے۔ چونکہ بہت سے مقامات کا نام بُوصیر ہے اس لیے عرب مصنّفین کو اس امر کے تعیّن میں بہت دشواری پیش آتی ہے کہ [آخری] اموی خلیفہ مروان [ثانی] جہاں فوت ہوا اس بُوصیر کا صحیح محلِّ وقوع کون سا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے، اور مقامی روایت سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مروان نے اپنے آخری ایام بُوصیر المَلَق میں گزارے تھے۔ قُدامة نے پہلے ھی یہ اطلاع دے دی ہے۔ اس قصبے کے ارد گرد ایک چند روزہ صوبہ بُوصیریہ وجود میں آ گیا تھا جو صوبجات اَطْفیح اور بہنسا کے درمیان واقع تھا۔

اس دستاویزی ثبوت کے مخالفین پر مشتمل مصنّفین کی ایک اور جماعت کی راے میں امویوں کو آخری شکست بُوصیر نام ھی کے اس مقام پر ہوئی تھی جو اُشْمُونَین کے بالمقابل، دریاے نیل کے دوسرے کنارے، بُوصیر المَلَق سے تقریباً ۱۸۰ کیلومیٹر جنوب میں واقع تھا۔ اسی علاقے کے بارے میں دعوٰی کیا جاتا تھا کہ یہ فرعون کے ساحروں کا وطن تھا۔ بقول الادریسی اس کے زمانے میں بھی یہاں کے باشندے جادوگری میں کچھ نہ کچھ شہرت رکھتے تھے۔ اس خاص بُوصیر کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

اور آخر میں ایک بُوصیر۔ دفدنو صوبۂ فیوم میں واقع ہے۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی: بُلدان، ص ۳۳۱، ترجمه Wiet، ص ۱۸۰؛ (۲) قُدامة، ص ۲۴۷؛ (۳) الادریسی: *Descr. de l'Afrique*، ص ۳۰، ۱۳۰، ۱۰۰؛ (۴) عبداللّطیف، ص ۱۷۱، ۲۰۲ تا ۲۰۶؛ (۵) ابن مَمّاتی، ص ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸؛ (۶) یاقوت، ۱: ۷۶۴؛ (۷) المسعودی: التنبیه، ص ۳۲۸، ۳۳۱؛ (۸) *Avertissement*، ص ۴۲۳، ۴۲۷؛ (۹) ابوالفداء: تقویم، ترجمه ۱ (الف)، ص ۱۴۸؛ (۱۰) ابن دُقماق، ۴: ۱۳۱، ۵: ۱۱۵؛ (۱۱) Vattier: *L'Égypte de Murtadi*، طبع جدید از Wiet، دیباچه ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ (۱۲) المقریزی، طبع Wiet، ۳: ۱۹۳، ۴: ۱۳۹، ۵: ۹۶ - ۹۷ (جہاں مروان کی وفات کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے)؛ (۱۳) ابن جِیْعان، ص ۶۳، ۷۳، ۱۳۹، ۱۵۱، ۱۵۱؛ (۱۴) علی پاشا، ۸: ۲۵؛ ۱۰: ۶ تا ۱۱؛ (۱۵) Amélineau: *Géographie*، ص ۷ تا ۱۱؛ (۱۶) Salmon: *Répertoire*، در *BIFAO*، ۱: ۶۵؛ (۱۷) Breccia: *Alexandrea ad Aegyptum*، ص ۱۲۳ تا ۱۳۰؛ (۱۸) J. Maspero و G. Wiet: *Matériaux pour servir à la géographie de l'Égypte*، ص ۵۳ تا ۵۶۔

(G. WIET)

البُوصِیْری: ابو عبداللہ شرف الدّین محمّد [بن سعید] بن حمّاد بن مُحْسِن (بن عبداللہ بن صَنْہاج ابن ہلال)۔ عربی شاعر [اور صوفی]، جن کا قصیدہ ''بُرْدَة'' خاص طور پر مشہور ہے، بربری نسل سے تھے، ان کا تعلق قبیلۂ صَنْہاجة کی ایک شاخ بنو حبنون سے تھا۔ ان کے باپ مصر کے قصبۂ بُوصیر (واقع میان فیوم و بنی سُوَیف) کے تھے اور والدہ دَلاص (دریاے نیل کی مغربی جانب) کی۔ انہیں مختلف وجوہ سے ان کی نسبتیں ''الصَّنہاجی'' اور ''الدَّلاصی'' اور دلاص۔ بوصیر ملا کر ''الدّلاصِیْری'' بھی آتی ھیں، لیکن البوصیری کی نسبت سے مشہور ہوے۔ یکم شوال سنہ ۶۰۸ھ (المقریزی نے سنہ ۶۰۸ یا ۶۱۰ھ بھی لکھا ہے) / ۷ مارچ سنہ ۱۲۱۲ء سہ شنبہ کو پیدا ہوے۔ بچپن اور تعلیم کی بابت کم معلومات

ھیں ۔ بعد کو بلبیس میں [الشرقیہ کے] کاتب، یعنی محرّر (=مُباشر) کے عہدے پر مامور ہوے اور حسابی کام انجام دیتے رہے، لیکن کوئی نمایاں حیثیت نہیں حاصل کی ۔ [کچھ عرصہ بیت المقدس، مدینۂ منورہ اور مکۂ معظمہ میں بھی رہے] ۔ آخر عمر میں پنڈلی ٹوٹ جانے کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے اور قاہرہ میں قیام پذیر ہو گئے ۔ وھیں سنہ ۶۹۶ / ۱۲۹۶ - ۱۲۹۷ء (السیوطی اور حاجی خلیفہ نے بالترتیب ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ - ۱۲۹۶ء اور ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ - ۱۲۹۵ء بھی لکھا ھے) میں انتقال کیا اور امام الشّافعی کے مقبرے کے جوار میں مدفون ہوے۔

البوصیری نے حفظِ قرآن کا ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی کھولا تھا ۔ انھیں سیرت سے خاص شغف تھا، اس کے ساتھ ھی عیسائیوں اور یہودیوں سے مناظرے کا بڑا شوق رکھتے تھے، اسی غرض سے انھوں نے انجیل اور توراۃ کا براہِ راست مطالعہ کیا اور جیسا کہ ان کے اشعار شاھد ھیں، مخالفین کا ردّ خود نہیں کی مقدس کتابوں سے کیا ۔ خطّاطی میں بھی بڑی مہارت اور شہرت حاصل کی ۔ [البوصیری کو تصوف اور شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا ۔ شعری حسن و لطافت، عذوبتِ الفاظ، ترکیبوں کے بانکپن کی وجہ سے ان کی شاعری کی بڑی داد دی جاتی ھے] ۔ جب الصاحب زَین الدّین یعقوب بن [الزبیر] کا قرب حاصل ھوا [تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کی مدح میں شاندار قصیدے لکھنے شروع کیے اور یہی قصائدِ نعتیہ ان کی شہرت کا باعث ہوے، بالخصوص قصیدۂ بردہ] ۔ صوفیہ کے یہاں البوصیری کا بڑا درجہ ھے، اور انھیں بسا اوقات مرتبۂ ''غوثیۂ کبرٰی'' تک پہنچا دیا جاتا ھے ۔ انھوں نے ابوالحسن الشّاذلی کے خلیفہ ابو العبّاس المرسی (وفات بمقام اسکندریہ سنہ ۶۸۶ھ) سے طریقت سیکھی تھی۔

البوصیری کی شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ھے : اوّل قبل سفر حج (جو ۶۵۴ھ کے بعد کا واقعہ ھے)، دوم بعد واپسی حج ۔ پہلے دور کے دو اھم قصیدے ھیں : ایک اللامیّۃ فی الردّ علی النصارٰی و الیہود، دوسرا ''ذُخْرالمَعاد فی مُعارَضَۃ بانَتْ سُعاد'' ۔ یہ دوسرا قصیدہ، جیسا کہ نام سے ظاھر ھے حضرت کَعْب رضؓ بن زُھَیر کے مشہور قصیدے (رکّ بہ بانت سعاد) کے مقابلے میں ھے، البتہ غزل اور تشبیب سے عاری ھے، وعظ و ارشاد اور محاسبۂ نفس ھی سے ابتدا کی گئی ھے ۔

دوسرے دور کا سب سے مشہور کارنامہ وھی قصیدۂ بُردَۃ ھے جس کا اصلی عنوان ''الکواکب الدُّرِّیَّۃ فی مَدْحِ خَیْرِ البَرِیَّۃ'' ھے [اس مشہور قصیدے کا پس منظر یہ ھے کہ البوصیری اتفاق سے بعارضۂ فالج بیمار ھو گئے جس سے ان کے جسم کا نصف حصّہ بالکل بےکار ھو گیا ۔ البوصیری کہتے ھیں کہ میں نے بیماری کی حالت میں یہ قصیدہ ترتیب دینا شروع کیا ۔ جب یہ مکمل ھو گیا تو میں اسے بار بار پڑھتا، خدا کے حضور میں رو رو کر گڑگڑاتا، عاجزی اور تضرّع سے دعائیں مانگتا اور اللہ تعالٰی سے اس قصیدے کی بدولت صحت کے لیے درخواست کرتا ۔ اسی حالت میں ایک رات سو گیا تو خواب میں حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و سلّم کو دیکھا ۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے مریض جسم پر پھیرا اور ایک چادر (=بُرْدَہ) مجھ پر ڈال دی ۔ جب میں بیدار ھوا تو میں نے اپنے آپ کو صحت‌یاب پایا ۔ میں اٹھا اور گھر سے باھر نکل گیا ۔ پھر آھستہ آھستہ یہ قصہ مشہور ھو گیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس قصیدے کی برکت سے صحت و شفا نصیب ھونے لگی (فوات الوفیات، ۲ : ۳۱۸ ببعد) ۔ یہ قصیدہ ۱۶۲ ابیات پر مشتمل ھے، مطلع ۱۲ ابیات، نفس اور خواھشات نفس ۱۶، نعتِ رسولؐ

۳۰، مولد النبیؐ ۹۱، معجزات و دعوت ۱۰، مدح القرآن ۱۷، معراج النبیؐ ۱۳، جہاد النبیؐ ۲۲، استغفار ۱۲، مناجات ۹ ۔ اس شہرۂ آفاق قصیدے کا اردو، انگریزی، لاطینی، المانی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور ایک سو کے قریب عربی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں شرحیں لکھی گئیں ۔ عبیداللہ بن یعقوب الفناری، ابن ہشام النحوی، خالد بن عبداللہ الازہری اور شہاب الدین القسطلانی (شارح البخاری) کی شروح خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ بہت سے شعرا نے قصیدۂ بردہ کی تثلیث، تخمیس، تسبیع اور تشطیر رقم کی ہیں] ۔ یہ قصیدہ بعض حلقوں میں بکثرت پڑھا جاتا ہے اور ان کے عقیدے میں اس کے مختلف ابیات مختلف بیماریوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کی طاقت رکھتے ہیں ۔ [عبدالسلام بن ادریس المراکشی نے اس موضوع پر ایک کتاب بعنوان خواص البردۃ فی برء الداء لکھی ہے) ۔ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب [رک باں] نے اس قصیدے سے متعلقہ اوہام سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ۔

البوصیری کا ایک اور نعتیہ قصیدۃ "الھمزیۃ فی المدائح النبویۃ" بھی خاصا مقبول ہے ۔ البوصیری کی شاعری پر عام نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح شعرا خاص طور پر حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعبؓ بن زہیر کی پیروی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ الفاظ کی ترکیب گتھی ہوئی اور عبارت چست ہے ۔ نعت رسولؐ کے علاوہ دوسرے قصائد میں ملازمین حکومت کے احوال کا بیان اور ان کی نااہلی، بدخلقی اور رشوت ستانی کی شکایت غالب ہے ۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کے ہاں مفاد عامہ کا ایک تصور پایا جاتا ہے اور وہ اسی کی وکالت کرتے ہیں ۔

البوصیری کا دیوان ۱۹۰۵ء میں مصر سے شائع ہوا ہے ۔ دیوان البوصیری (طبع محمد سعید کیلانی، مطبوعۂ مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ) کا متن دارالکتب المصریہ کے دو قلمی نسخوں (۲۳۱۱ ادب و التیموریہ، ۸۲۸ شعر، مؤخرالذکر نسخے کو السید محمود شکری الآلوسی نے اپنے لیے نقل کرایا تھا) پر مبنی ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن شاکر الکتبی : فوات الوفیات (طبع محمد محی الدین عبدالحمید)، مصر ۱۹۵۱ء، ۲ : ۳۱۲ تا ۳۱۹؛ (۲) السیوطی : حسن المحاضرۃ، القاہرہ ۱۲۹۳ھ، ۱ : ۲۶۰؛ (۳) ابن تغری بردی : المنہل الصافی مخطوطۂ دارالکتب المصریہ، عدد ۱۱۱۳، تاریخ)، ۳ : ۱۰۸ تا ۱۱۰؛ (۴) المقریزی : المقفی (مخطوطۂ دارالکتب المصریۃ، عدد ۲۷۵۳، تاریخ)؛ (۵) براکلمان، ۱ : ۲۶۴ تا ۲۶۷ [تکملہ، ۱ : ۴۶۷ تا ۴۷۲]؛ (۶) البستانی : دائرۃ المعارف، بذیل مادۂ بردۃ، بوصیر، (۷) وآ، بذیل مادہ؛ (۸) ابن العماد : شذرات الذہب، ۵ : ۴۳۲؛ (۹) علی باشا مبارک : الخطط الجدیدہ، ۱۰ : ۸].

(سید محمد یوسف [و ادارہ])

بوعبدل : رک بہ نصر، بنو.

بوعلی قلندر : رک بہ ابوعلی (بوعلی) قلندر.

بوعلی سینا : رک بہ ابن سینا .

بوغا الشرابی : رک بہ بغا الشرابی.

بوغا الکبیر : رک بہ بغا الکبیر.

بوغاز : [رک بہ بوغاز ایچی (Bogız-İçi)].

بوغاز ایچی : (Boğaz-ici = بوغازیچی)، یعنی آبنائے کا اندرونی حصہ؛ ایک اصطلاح جو ترکی میں باسفورس کے لیے اور بالخصوص ان سواحل، قطعات آب، خلیجوں اور راسوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو باسفورس کے درمیانی حصے میں داخل ہیں ۔ باسفورس کا نام (یونانی Βόσπορος,

لاطینی : Bosporus، Bosphorus) تھریسی اصل کے کسی لفظ سے مشتق ہے (قب Pauly-Wissowa) - یہ تنگ آبنائے، یعنی تھریسی باسفورس (جو اس نام سے اس لیے پکاری جاتی ہے کہ سمیری (Cimmerian) باسفورس سے اس کی تمیز ہو سکے جو بحر آزوو Azov اور بحر اسود کے درمیان ہے اور آبنائے کرچ Kertch کہلاتی ہے) بحیرۂ مارمورا (جسے زمانِ قدیم میں Propontis کہتے تھے اور ترکی میں مرمرہ دینزی Marmara Denizi کہلاتی ہے) اور بحیرۂ اسود (جو قدیم زمانے میں Pontus Euxinus کہلاتا تھا اور جسے ترک قرہ دینز کہتے ہیں) کو ملاتی ہے - بوزنطی اس کا ذکر کرتے وقت اکثر اسے صرف τὸ Στενόν، یعنی ''آبنائے'' کہتے تھے اور یہ لاطینی لوگوں میں صلیبی جنگوں کے زمانے میں ".brachium S Georgii" کے نام سے مشہور تھی (قب Tomaschek) - ترکی مآخذ میں اسے بہت سے مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً خلیج بحرِ سیاہ، خلیج قسطنطینیہ، قسطنطینیہ بوغازی، استانبول بوغازی وغیرہ - لفظ بوغاز کے معنی ترکی میں گلے یا حلقوم کے ہیں، لیکن جغرافیائی ناموں میں اس کا مفہوم ''تنگنائے'' یا ''آبنائے'' ہوتا ہے (قب مثلاً کولک بوغازی Külek Boghazi یعنی Clician Gates) یا چناق قلعہ بوغازی Čanaḳ-Ḳal'e Boghazi در دانیال (Dardanelles) -

باسفورس کی اوسط لمبائی تیس کیلومیٹر ہے اور اس کی چوڑائی مختلف مقامات پر تقریباً سات سو میٹر سے لے کر تین ہزار پانچ سو پچاس میٹر تک ہے - اس گزرگاہ آب کے درمیان پانی کی ایک بڑی تیز دھار (تین سے پانچ کیلومیٹر تک فی گھنٹہ) بحیرۂ اسود سے بحیرۂ مارمورا کی طرف بہتی ہے، لیکن اس کے مقابل ایک اور دھار سطح آب کے نیچے اور سواحل کے ساتھ ساتھ بالکل مخالف سمت میں بہتی ہے - ان مشہورتر مقامات کے جو اس آبنائے کے کناروں پر پائے جاتے ہیں نام حسب ذیل ہیں (یہ نام ان کی رائج الوقت ترکی شکلوں میں دیے گئے ہیں) : یورپ کے ساحل پر جنوب سے شمال کی طرف علی الترتیب یہ مواضع موجود ہیں : توپ خانہ (بوزنطی Argyropolis)، بشک طاش (بوزنطی Diplokionion)، اورتہ کوی (بوزنطی Hagios Phokas)، آرناود کویی (بوزنطی Anaplous)، بیبک (بوزنطی Challai)، روم ایلی حصاری (بوزنطی Phoneus)، استینیہ (بوزنطی Sosthenion)، ینی کوی (بوزنطی Neapolis)، طرابیہ (بوزنطی Therapeia)، بویوک درہ (بوزنطی Kalos Agros) اور روم ایلی قواغی - ایشیائی ساحل پر علی الترتیب شمال سے جنوب کی طرف یہ مقامات ہیں: آنادولو[=آناطولی] قواغی (بوزنطی Heiron)، بے کوز، پاشا باغچہسی، چبوقلو (بوزنطی Irenaeon)، قانلیجہ، آناطولی حصاری، قندیللی (بوزنطی Brochthoi)، چنگل کویی، بیلربیی، قوزغون جق، (Kuzguncuk، بوزنطی Chrysokeramos) اور اسکودار (سقوطری، بوزنطی Skoutarion جو Chrysopolis میں ایک شاہی محل تھا) - زمانۂ قدیم کے خیال کے مطابق اصلی باسفورس اس جگہ ختم ہو جاتی ہے جہاں آج کل روم ایلی قواغی اور آناطولی قواغی واقع ہیں اور اس خط کے باہر شمال کی جانب کے سمندر کو بحیرۂ اسود کا حصہ خیال کیا جاتا تھا.

بوزنطیوں نے باسفورس کے شمالی سرے کو روم ایلی قواغی اور آناطولی قواغی کے علاقے میں مستحکم کیا تھا جہاں آبنائے کی چوڑائی تنگ ہو کر تقریباً ایک ہزار میٹر رہ جاتی ہے - بوزنطی قلعے کے نشانات اب بھی روم ایلی قواغی کے شمال میں پہچانے جا سکتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ عثمانی سلطان محمد ثانی نے اس پرانے قلعے (اسکی قلعہ) کو مسمار کر دیا اور اس کا ملبہ ۸۵۶ھ / ۱۴۵۲ء میں روم ایلی حصاری کی تعمیر میں

کام آیا (قب Gabriel، ص ۷۷ اور ۸۱) ۔ آناطولی قواغی میں بھی ایک بوزنطی قلعہ پایا جاتا تھا، جسے ترک یروس قلعہ سی کہتے تھے (قب Byz. Hieron) یا جنویز قلعہ سی ۔ مؤخرالذکر نام اس واقعے سے نکلا ہے کہ ۱۳۵۰ء میں جنیوا والوں نے باسفورس کے شمالی حصّے کی دفاع کی قیادت بوزنطیوں سے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

باسفورس کا ساحلی علاقہ مسلمانوں کی حکومت میں اس وقت آیا جب چودھویں اور پندرھویں صدی میں عثمانلی ترکوں کی سلطنت بڑھی اور پھلی پھولی۔ عثمانلی سلطان بایزید اول (۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء تا ۸۰۵ھ / ۱۴۰۳ء) نے آبنائے کے ایشیائی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جسے آناطولی حصاری کہتے ہیں (یہ گوزلجہ حصاری کے نام سے بھی معروف ہے) ۔ سلطان محمد ثانی نے ۸۵۶ھ/ ۱۴۵۲ء میں اس میں جا بجا اضافے اور اصلاحیں کیں ۔ آناطولی حصاری کے مقابل یورپی ساحل پر اور اس مقام پر جسے بوزنطی Phoneus (یونانی Φωνεύς نیز Φονέας اور Φωνεας) کہتے تھے، محمد ثانی نے اسی سال روم‌ایلی حصاری تعمیر کیا (اسے اکثر بوغاز کیسن بھی کہتے ہیں، یعنی جو گلا کاٹتا ہے یا جو آبنائے کو قطع کرتا ہے) ۔ سلطان نے ان دونوں قلعوں کو توپخانوں سے آراستہ کیا جن سے باسفورس کے، جو یہاں سب سے زیادہ تنگ ہو گئی ہے (تقریباً ۷۰۰ میٹر)، مقابل کے کنارے پر گولہ‌باری ہو سکتی تھی ۔ ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطینیہ فتح ہو گیا تو بحیرۂ اسود درحقیقت ایک ترکی جھیل بن کر رہ گیا ۔ ۸۶۵ھ/ ۱۴۶۱ء اور ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء میں سلطان محمد ثانی نے بحیرۂ اسود پر جنیوا والوں کے سابق اقتدار کو ختم کر دیا ۔ علاوہ بریں ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء ہی میں قرم (کریمیا) کے تاتاریوں کا خانِ آخر کار عثمانی ترکوں کا باج‌گذار بن کر رہ گیا ۔ اب روم‌ایلی حصاری اور آناطولی حصاری اور اس کے ساتھ ہی بوزنطیوں کے وہ سارے قدیم استحکامات جو باسفورس کے شمالی سرے میں باقی رہ گئے تھے اپنی سابقہ اہمیت کھو بیٹھے۔

سکون و اطمینان کی ایک طویل مدت کے بعد بالآخر شمال کی جانب سے ایک خطرے کے ڈراؤنے آثار اس وقت نمودار ہوے جب قازق Cossack بحری لٹیروں نے ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۴ء میں بحیرۂ اسود کے جنوبی کنارے پر سنوپ Sinope کو لوٹ لیا ۔ اس کے دس سال بعد ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ - ۱۶۲۴ء میں انھوں نے خود باسفورس کو بھی قتل و غارت کا نشانہ بنایا اور یورپی ساحل کے مقامات صاری یر، بویوک دره طرابیہ اور ینی‌کوی کو تباہ کر ڈالا ۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے سلطان مراد رابع کے عہد (۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء تا ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۴۰ء) میں دو نئے قلعے بنائے گئے، ایک روم‌ایلی قواغی کے علاقے میں اور دوسرا آنا طولی قواغی کے نزدیک ۔ ان دو قلعوں کا ذکر (جنھیں باسفورس کے اس حصّے کے دفاع کے لیے بوزنطیوں کے انتظامات کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے) اولیا چلبی (۱ : ۴۶۱) نے ''قلعۂ کلید البحر'' کے نام سے کیا ہے، یعنی وہ قلعے جوقرہ دِنِز، یعنی بحیرۂ اسود کے لیے چابی کا کام دیتے تھے ۔ اب ان کے آثار باقی نہیں، کیونکہ یہ دونوں انیسویں صدی کے دوران میں منہدم کر دیے گئے تھے (Gabriel، ص ۸۲) ۔

جب عثمانی ترک ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء تا ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں روس کے خلاف لڑائی میں ناکام رہے تو انھوں نے باسفورس کے دفاع کی نئے سرے سے تنظیم کی، چنانچہ ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ - ۱۷۷۴ء میں بحیرۂ اسود کے یورپی ساحل پر قلعۂ بغداد جِق (Kilyos) اور مشرقی ساحل پر قلعۂ

ریواند جق کے مقام پر جو آبنائے سے ذرا ہی باہر تھا، اور اسی طرح آبنائے سے شمال کی سمت جانے کے راستے پر واقع فنر روم ایلی اور فنر آناطولی کے نزدیک نئے استحکامات بنا دیے گئے ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یورپی ساحل پر غریب چه اور بویوک لیمان کے مقام پر اور ایشیائی ساحل پر روم ایلی اور آنا طولی قواغی سے اوپر پویراز لیمانی میں مزید قلعے تعمیر کیے گئے ۔ دفاع کے اس نظام کا نام ''قلاع سبعه'' (''سات قلعے'') رکھا گیا ۔ سلطان سلیم ثالث کے عہد (۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء تا ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء) میں باسفورس کے اس جدید نظامِ دفاع کی توسیع اور تکمیل کی کوشش برابر جاری رهی ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قدیم استحکامات کی مرمت اور تجدید هوتی رهی جو باسفورس خاص کی حدود کے اندر داخل تھے اور روم ایلی اور آنا طولی قواغی کے جنوب میں واقع تھے اور بحیرۂ مارمورا کی سمت میں تھے ۔ تاهم اسی زمانے میں ''مشرقی سوال'' کا اس کی جدید شکل میں ظہور بھی هوا، دردانیال اور باسفورس پر قبضه اور اس کا دفاع اب نه صرف سلطنتِ عثمانیه هی کے لیے بلکه یورپ کی بڑی طاقتوں کے لیے بھی ایک اهم مسئله بن گیا جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں اس آبنائے پر ایک بین الاقوامی اقتدار قائم کر دیا جو بہت کچھ معرضِ نزاع میں رها ہے اور جس میں اکثر تغیر هوتا رهتا ہے۔

مآخذ: (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامه، ۱، استانبول ۱۳۱۴ھ: ۴۰۳ ببعد؛ (۲) حاجی خلیفه: جہان نما، ص ۶۶۳؛ (۳) P. Gyllius: *De Bosporo Thracio Libri Tres*، Lyon ۱۵۶۱ء؛ (۴) Baron de Tott: *Mémoires sur les Turcs et les Tartares*، Maestricht ۱۷۸۰ء، حصه ۳: ص ۱۲۲ ببعد؛ (۵) J.B. Lechevalier: *Voyage de la Propontide et du Pont-Euxin*، پیرس ۱۸۰۰ء؛ (۶) Ch. Pertusier: *Promenades Pittoresques dans Constantinople et sur les rives du Bosphore*، پیرس ۱۸۱۵ء و ۱۸۱۷ء؛ (۷) J. Von Hammer-Purgstall: *Constantinopolis und der Bosporos*، Pesrth ۱۸۲۲ء؛ (۸) Comte Andréossy: *Constantinople et le Bosphore de Thrace*، پیرس ۱۸۲۸ء؛ (۹) J. Ebersholt: *Constantinople Byzantine et les Voyageurs du Levant*، پیرس ۱۹۱۸ء؛ (۱۰) W. Tomaschek: *Zur historischen Topogrqphie von Kleinasien im Mittelalter* (*SBAk. Wien Phil-Hist-Cl., Bd-CXXIV*)، ویانا ۱۸۹۱ء، ص ۲ تا ۳؛ (۱۱) R. Janin: *Constantinople Byzantine: Développement Urbain et Répertoire Topographique* (*Institut Francais d'Études Byzantines: Archives de l'Orient Chrétien, No. 4*)، پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۳۲۶ تا ۳۳۳؛ (۱۲) وهی مصنف: *d'Eglise Byzantine sur les rives du Bosphore* (Côte Asiatique)، در *Revue des Études Byzantines*، جلد ۱۲، پیرس ۱۹۵۴ء: ص ۶۹ تا ۹۹؛ (۱۳) S. Toy: *The Castles of the Bosporus*، آوکسفرڈ ۱۹۳۰ء؛ (۱۴) A. Gabriel: *Châteaux Turcs du Bosphore* (*Mémoires de l'Institut Fraçais d'Archéologie de Stamboul*)، شماره ۶، پیرس ۱۹۴۳ء؛ (۱۵) E. Chaput: *Voyges d'études géologiques .... en Turquie*، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۱۵۱ ببعد، ۲۳۷ ببعد، ۲۸۷ ببعد؛ (۱۶) A. Merz: *Hydrographische Untersuchungen in Bosporus und Dardanellen* (*Veröffentlichungen des Instituts für Meereskunde*، Neue Folge, Reihe A, Heft 18) beorb. L. Möller، beorb. L. Möller، برلن ۱۹۲۸ء؛ (۱۷) P. Ullyot and Orhan Ilgaz: *The Hydrography of the Bosphorus*، در 2 *Geographical Review*، ج ۳۶، شماره ۱، ۱۹۴۶ء؛

ص ۳۳ ببعد؛ (۱۸) Pauly-Wissowa، ج ۳/۱ (۱۸۹۷ء)، بذیل مادۂ Bospors: عمود ۷۴۱ تا ۷۵۷؛ (۱۹) ق آ، ترکی بذیل مادۂ بوغازایچی Boğaziçi (از بسیم دارکوت و ایم ۔ طیّب گوک بلگین)؛ (۲۰) اٹھارھویں سے بیسویں صدی تک باسفورس کی بین الاقوامی حیثیت کے لیے قب A. Sorel: *La Question d'Orient au XVIIIe siècle*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۲۱) S. Goriainov: *Le Bosphore et les Dardanelles*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۲۲) E. Driault: *La Question d'Orient depuis ses origines jusqu'à la paix de Sèvres*، پیرس ۱۹۲۱ء؛ اور (۲۳) *La Question d'Orient*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۲۴) P. P. Graves: *The Question of the Straits*، لنڈن ۱۹۳۰ء؛ (۲۵) جمال توکین Cemal Tukin: عثمانلی امپراطورلغی دورنده بوغازلر مسئله سی، استانبول ۱۹۴۷ء؛ (۲۶) *Constantinople et les Détroits, documents secrets*، ماسکو ۱۹۳۲ء؛ (۲۷) E. Brüel: *International Straits: A Treatise on International Law*، ج ۲، حصّہ ۴ (ترکی آبنائیں)، کوپن ہیگن ۔ لنڈن ۱۹۴۷ء؛ (۲۸) *The Problem of the Turkish Straits*، ریاستہاے متحدۂ امریکہ کا دارالطباعت، واشنگٹن ۱۹۴۷ء۔

(V. J. PARRY)

بُوق: اسمِ جنس ہے اور ہر قسم کے قرنا، نرسنگا یا نفیری کے لیے بولا جاتا ہے ۔ پھونک سے بجنے والے کل آلات جو پیالی کی شکل کے ایک دہانے کے ذریعے بجائے جاتے ہیں دو قسموں میں منقسم ہو سکتے ہیں: (۱) نرسنگا یا مخروطی نلکی کی نوع کے آلات اور (۲) تُرم یا اُسطوانی نلکی کے قسم کے آلات.

نرسنگا کی نوع کے آلات: خواہ وہ ''صُور'' ہوں یا ''ناقُور'' جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں ۶ [الانعام]: ۷۳؛ ۷۴ [المدّثّر]: ۸؛ ۷۸ [النّبا]: ۱۸) سب نرسنگے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء) اور الجوہری (م حدود ۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء) فرماتے ہیں کہ قدیم ایرانی اور عرب یقیناً جانوروں کے سینگ کی طرح کے ایک مخروطی نلکی کے قسم کے آلے سے واقف تھے ۔ اس کی مثال چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فن میں بھی مل سکتی ہے، جس میں ایک ایشیائی فوجی سپاہی کو ایک ایسا ہی آلہ بجاتے ہوے دکھایا گیا ہے، جب کہ ایک یونانی فوجی سپاہی ایک سیدھی تُرم بجا رہا ہے (Gerhard: *Apulische Vasen*، لوح ۲) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب قَرن کی طرح کے ایک ہلالی شکل کے نرسنگے سے واقف تھے (Seybold: *Glossarium Latino-Arabicum*، ص ۵۱۹)، اس کے ہم مخرج الفاظ آشوری زبان میں ''قرنُو'' اور عبرانی زبان میں ''قِرِن'' کی شکل میں ملتے ہیں؛ یہ آلہ ایران میں ابھی تک سیلانی درویش استعمال کرتے ہیں ۔ ترکی روایت کے مطابق ''درویش بُروسو'' (بُوریسی) (درویشی نرسنگا) کی ایجاد ایران کے افسانوی بادشاہ منوچہر نے کی تھی (اولیا چلبی، ۱/۲: ۲۳۸)، اس آلے کے نمونے کے لیے دیکھیے Advielle، ص ۹ اور Lavignac، ص ۳۰۷۵، جو اسے غلطی سے ''نفیر'' کہتے ہیں ۔ حقیقی نمونے عجائب گھروں میں دیکھے جا سکتے ہیں، مثلاً The Crosby Browne Collection، نیویارک، عدد ۲۳۴۳ ۔ چوتھی تا چھٹی صدی ہجری / دسویں تا بارھویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا ہسپانوی مُوری ہاتھی دانت کا نرسنگا وکٹوریا و البرٹ میوزیم لنڈن میں موجود ہے (عدد ۲۹۰۳ / ۱۸۶۲) ۔ اس سے بڑے بڑے آلات بھی استعمال ہوتے تھے ۔ ابن بطّوطہ (م ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء) نے سوڈان میں ہاتھی دانت کے بنے ہوے ایک ایسے ہی آلے کا ذکر کیا ہے (*Voyages*، ۴: ۴۱۱) ۔ اسی سے عاجی نرسنگے (Oliphant horn) کی اصطلاح وضع ہوئی ہے ۔

ایک اندلسی عرب الشُّقَندی (م ۶۲۹ھ/ ۱۲۳۱ء) ایک دیوھیکل قرن یا نرسنگے کا ذکر کرتا ھے جو ''ابوقُرون'' (نرسنگوں کا باوا) کے نام سے معروف ھے، جیسا کہ اَلمَقَّری نے بیان کیا ھے (نفح الطیب، ۲ : ۱۴۴)، جو دیوھیکل نرسنگے (''البوق الکبیر'') کی مانند ھوگا، یعنی قدّ آدم، جس کا ذکر محمد الصّغیر نے کیا ھے (تذکرۃ النّسیان، ص ۵۴) .

جزیرہ نماے عرب کے رھنے والوں کو دوسری صدی ھجری / آٹھویں صدی عیسوی میں ایک ایسے نرسنگے کا حال معلوم تھا جو گھونگے کا بنا ھوا تھا ۔ اللیث بن المظفّر لکھتا ھے کہ اسے آٹا پیسنے کی چکیوں والے استعمال کرتے تھے، اور یہ ''مِنقاف'' یعنی کوڑی کے مشابہ بل کھایا ھوا گھونگا تھا، جو بظاھر ھندوستان کے ''سنکھ'' سے ملتا جلتا تھا (Day : *Music and Musical Instruments of Southern India*، ص ۱۵۱) ۔ اسی آلۂ موسیقی کو عرب بُوق کہا کرتے تھے ۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں یہ جنگ میں کام آنے والا آلہ نہیں تھا، اس لیے کہ اس زمانے میں عرب لڑائی میں سنکھ یا تُرم استعمال نہیں کرتے تھے (ابن خَلدون : مُقدّمۃ، ۱۷ : ۴۴) ۔ ایک شاعر، جس کا بیان الاَصمعی (م ۸۲۸ء) نے نقل کیا ھے ، لکھتا ھے کہ بُوق اس مقصد کے لیے نصرانی استعمال کیا کرتے تھے، اور بقول الجوھری عربوں نے اس کا جنگی استعمال انھیں سے سیکھا ھے ۔ حقیقت میں لفظ بُوق کا اشتقاق یا تو یونانی لفظ ''Bwxávn'' یا لاطینی ''buccina'' سے ھے (ڈوزی : *suppl.*)، گو تاج العروس میں اس کا اشتقاق فارسی لفظ بُوری سے بیان کیا گیا ھے جو صریحاً بعید از قیاس معلوم ھوتا ھے (Lane : *Lexicon*) ۔ آٹھویں صدی میلادی میں اخوان الصفاء نے صوتیات پر بحث کرتے ھوے مثال کے طور پر ''بُوق'' کا ذکر کیا ھے ۔ اسی زمانے سے ''بُوق'' تمام بلاد اسلامیہ میں جنگی اور جلوسوں کی موسیقی میں اھم کردار ادا کرنے لگا (دیکھیے طبل خانہ) ۔ الف لیلۃ و لیلۃ (طبع میکناٹن Macnaghten، ۱ : ۸۰؛ ۲ : ۳۸۲، ۳۰۴) میں ان مقاصد کے لیے وہ مستقل استعمال کیا جاتا ھے، حالانکہ ''نفیر'' یا ''تُرم'' کا ذکر صرف ایک ھی مرتبہ آیا ھے (۲ : ۶۵۶)؛ تاھم یہ بات ذھن نشین کر لینی چاھیے کہ ''بُوق'' کی اصطلاح ان تمام آلاتِ موسیقی کے لیے استعمال ھوتی تھی جو مخروطی نلکی کی طرح ھوتے تھے، چاھے ان کی شکل ھلالی ھوتی یا سیدھی، اور اس بات کا لحاظ نہیں تھا کہ وہ گھونگے، سینگ یا دھات کی بنی ھوئی ھے ۔ ضمناً دھات کے سینگ (ترکی ''پرنج بورو'') کے متعلق یہ دعوی کیا جاتا ھے کہ اسے پانچویں صدی ھجری / گیارھویں صدی عیسوی کے سلجوقیوں نے رائج کیا تھا (اولیا چلبی، ۱/۲ : ۲۳۸)، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ دھات کے آلاتِ موسیقی ایرانی اور بوزنطی اس سے بہت پہلے استعمال کرتے تھے یہ بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ فارسی میں ''بوق'' کا ذکر فردوسی (م ۴۱۱ھ/ ۱۰۲۰ء) کے زمانے سے چلا آتا ھے اور قیاس یہ ھوتا ھے کہ وہ آلۂ موسیقی، سیدھے سینگوں سے ذرا مختلف تھا جنھیں طاقِ بُستان کے مجسّموں (۵۹۰ تا ۶۲۸ء) میں دکھایا گیا ھے اور وھاں یہ قسم ابھی تک پائی جاتی ھے (Advielle، ص ۹؛ Lavignac، ص ۳۰۷۵) ۔ اسلامی اندلس میں الحکم ثانی (م ۳۶۹ھ/۹۷۹ء) کے بوقات پر سونے کے پترے چڑھائے جاتے تھے ۔ اسی فرمانروا نے یہ اختراع کی کہ نلکی میں سوراخ کیے تاکہ ان پر انگلیاں حرکت کر سکیں اور اسے بجانے کے لیے منہ کی جانب کاسہ نما مُنہنال کے بجاے ایک نے داخل کی اور یوں سیکسوفون کی قسم کا ایک آلۂ موسیقی ایجاد کیا [رک بہ مزمار] ۔ ھسپانوی البوق albogue اسی کی یادگار ھے ۔

''بوق'' کا ترکی اور ایرانی مترادف ''بورو'' (''بوری'') تھا (حاجی خلیفہ: ۱ : ۰۰۰ ۴؛ مِنِسکی، بذیل مادۂ ''بوق''؛ اولیا چلبی، ۱ / ۲ : ۲۳۸؛ Toderini، ۱ : ۲۳۸) - یہ لفظ جدید مصری اور شامی عربی میں بھی ملتا ہے (ایمری : English-Arabic Vocabulary، بذیل مادۂ Bugle؛ Ronzevalle، در MFOB، ۶ : ۲۹) - بلقان کی زبان میں یہ لفظ ''بورہ'' bore اور بوریہ Boriye ہو گیا ہے (قب سنسکرت کا ''بھریا'' Bhariya اور گھانا زبان کا بورو buro) - چغتائی زبان میں ''برغو'' یا ''بورغو'' ایک ایسے بڑے نرسنگے کو کہتے ہیں جس کا رواج مغل اور تاتاری حکمرانوں کے زمانے میں اسلامی لشکروں میں ہوگیا تھا - ابن غیبی (م ۱۴۳۵ء) لکھتا ہے کہ یہ آلہ نفیر یا تُرم سے زیادہ لمبا ہوا کرتا تھا، اور ہندوستان میں برگہ Buruga کے نام سے اب تک باقی ہے (Day، ص ۱۰۳؛ Lavignac، ص ۳۰۸)، جہاں اسے ''کرنا'' [=قرنا] بھی کہتے ہیں؛ اسی نوع کا ایک اور آلۂ موسیقی، جس کا ذکر عرب مصنفین نے کیا ہے، ''شبور'' ہے - الجوہری لکھتا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں اور مجد الدین ابن الأثیر (م ۱۲۱۰ء) نے صحیح طور پر قیاس کیا ہے کہ یہ عبرانی زبان کے ''شوفر'' سے مستعار لیا گیا تھا - فردوسی ''شیپور'' کو قدیم عسکری آلاتِ موسیقی میں سے شمار کرتا ہے - A. X. Idelsohn نے جس عربی لفظ ''شفر'' کی موجودگی کا ذکر کیا ہے (Jewish Music، ص ۴۹۰، اور J. Reider، در J Q R، جنوری ۱۹۳۴ء) اسے بغیر تصدیق کے تسلیم نہیں کرنا چاہیے - Fetis ''شبور'' کے نام کے تحت ایک جدید عربی تُرم کا ذکر کرتا ہے (Hist. gén.، ۲ : ۱۵۷) لیکن دیکھیے Mahillon (۱ : ۱۸۲؛ نیز Saturday Review، جون ۱۸۸۲ء، ص ۶۹۶).

(۳) تُرم کے نمونے کے آلات : بیلن کی شکل کے نالی والے آلات میں سب سے بڑا آلہ ''نفیر'' ہے؛ گو یہ نام اکثر اوقات سنکھ کی قسم کے بالکل سیدھے آلے کے لیے استعمال ہوتا ہے (دیکھیے Host : Nachrichten von Marokos og Fes، لوحہ ۳۱)، اس ضمن میں ''نفیر'' کا نام پہلے پہل پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کے زمانے میں آتا ہے، گو اس زمانے سے پہلے کے لوگ بھی اس قسم کے آلۂ موسیقی سے واقف ہو سکتے ہیں - Kurt Sachs (Reallexikon der Musik-instrumente، بذیل مادّہ) غلطی سے اس لفظ کو ''نَفَخَ'' بمعنی پھونک مارنا سے ماخوذ سمجھتا ہے - اس اصطلاح ''نفیر'' کے اصلی معنی لڑائی کی طرف بلانے کے تھے اور اس لیے جو تُرم اس مقصد کے لیے وہ استعمال کرتے تھے اسے ''بُوق النّفیر'' یعنی ایک جنگی سنکھ یا تُرم کہنے لگے، ابن الطقطقی : الفخری، ص ۳۰ میں ایک بڑے بُوق کا ذکر کرتا ہے جو بوق النّفیر کے مشابہ تھا، جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام بُوق بہ نسبت نفیر کے حجم یا لمبائی میں چھوٹا ہوا کرتا تھا - نفیر کی تیز و شوخ آواز، جو غالبًا اس کی بیلن نما شکل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، فوج کو ہدایت دینے کے لیے بُوق کی بھدّی آواز سے، جو اس کی مخروطی نلکی سے نکلتی ہے، کہیں بہتر ہوتی ہے - اُن دونوں آلات کا فرق ان افعال سے واضح ہو جاتا ہے جو ان کے بجانے کے لیے عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ہم پڑھتے ہیں کہ بُوقی نے اپنا بُوق پھونکا (نَفَخَ)، لیکن نفیر کے بجانے کے لیے لفظ ''صَاحَ'' (یعنی چنگھاڑا) استعمال ہوتا ہے، مختلف قسم کے نفیروں اور بوقوں کے لیے، جو فوجی باجوں میں استعمال ہوتے ہیں، رک بہ طبل خانہ - ابن غیبی کے زمانے میں نفیر کی لمبائی ایک سو اڑسٹھ سینٹی میٹر یعنی

دو گز کے برابر ہوتی تھی۔

بقول ابن غیبی کَرنا [=قرنا]، ایک قسم کا تُرم تھا جو اپنی نلکی کے درمیان میں 'S' کی شکل میں مڑا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض کی لمبائی بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔ فارسی لغات میں اس لفظ کا املا ''کَرنائے'' لکھا ہے اور شاہنامۂ فردوسی میں بھی تلفّظ اختیار کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے (Buhle، ص ۸ ۲؛ Schlesinger، ص ۲۷ : ۳۲۶، ۳۰۳؛ Galpin، ص ۲۰۰) کہ بیلن جیسے نلکی کے آلاتِ موسیقی مشرق سے مستعار لیے گئے تھے۔ شاید Buccins Turcs اور cors Sarrasinois میں، جو صلیبی جنگوں کے وقائع نویسوں کے نوشتوں میں محفوظ ہیں، ''نفیر'' اور ''کرنا'' بھی شامل تھے، شاہ رچرڈ (Richard Coeur de Lion) تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹ تا ۱۱۹۲ء) میں tubae، litui، corni اور buccinae سے اچھی طرح لیس تھا، لیکن ہم صقلیہ میں مِسِّینہ Messina کے مقام پر ایک ایسے تُرم کے متعلق پڑھتے ہیں جو tuba سے مختلف تھا۔ کیا یہ اس جزیرے میں Hohenstaufen مسلمانوں کے لشکر کی ''نفیر'' ہو سکتی ہے؟ پھر بھی اگر مغرب بیلن نما نفیر کے لیے مشرق کا مرہونِ منّت تھا تو اس احسان کا بدلہ بھی اتار دیا گیا تھا، چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ مراکش میں سلطان المنصور (۱۵۷۶ تا ۱۶۰۲ء) کے تحت ''طُرُنبطہ'' (ہسپانوی زبان میں Trompeta)، جو پیتل کا بنا ہوتا تھا، استعمال ہوتا تھا اور نفیر جتنا لمبا تھا (تذکرۃ النسیان، ص ۱۱۷، مترجم ''نِجر'' لکھتا ہے)۔ ترک بھی یورپی تُرم (Tūrumpata borusu) نیز انگریزی تُرم (ingiliz borusu) سے واقف تھے۔ انگریزی تُرم گلے میں ڈالنے والا جدید آلۂ موسیقی ہے (اولیا چلبی، ۱ / ۲ : ۲۳۸) ۔ Niebuhr اور Villoteau دونوں نے سترھویں تا انیسویں صدی عیسوی کے آلاتِ موسیقی کے فنّی نقشے اور تفصیلات دی ہیں۔

مآخذ : (۱) ابن غیبی [: جامع الالحان]، Bodleian مخطوطہ (Marsh، عدد ۲۸۲، رق ۸۰)؛ (۲) ابوالفضل : آئین اکبری، طبع Blochmann، کلکتہ ۱۸۷۳ - ۱۸۷۳ء؛ (۳) Advielle : La musique chez les Persans، پیرس ۱۸۸۵ء؛ (۴) الف لیلۃ و لیلۃ، طبع Macnaghten، کلکتہ ۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء؛ (۵) Amery : English - Arabic Vocabulary، قاہرہ ۱۹۰۵ء، بذیل مادّۂ بگل Bugle؛ (۶) آرنلڈ : The Legacy of Islam، آوکسفرڈ ۱۹۳۱ء؛ (۷) Ars Asiatica، جلد ۱۳، پیرس ۱۹۲۹ء، لوحہ ۱؛ (۸) Bonanni : Gabinetto armonico، روم ۱۷۲۲ء؛ (۹) P. Brown : Indian Painting Under the Moghals، آوکسفرڈ ۱۹۲۴ء؛ (۱۰) Buhle : Die musikalischen Instrumente in den Miniaturen des frühen Mittelalters، لائپزگ ۱۹۰۳ء؛ (۱۱) Catalogue of the Crosby Brown Collection of Musical Instruments، نیویارک ۱۹۰۳ - ۱۹۰۵ء؛ (۱۲) Chardin : Voyages . . . en Perse، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ء؛ (۱۳) Day : The Music and Musical Instruments of Southern India . . . . لنڈن ۱۸۹۱ء؛ (۱۴) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، لنڈن ۱۸۳۶ء؛ (۱۵) فارمر Farmer : Studies in Oriental Musical Instruments، سلسلۂ دوم، لنڈن ۱۹۳۹ء؛ (۱۶) Minstrelsy of the Arabian Nights، لنڈن ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) Fétis : Histoire générale de la musique، پیرس ۱۸۶۹ - ۱۸۷۶ء؛ (۱۸) Galpin : Old English Instruments of Music، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۱۹) حاجی خلیفہ : کَشفُ الظُّنُون، طبع Flügel، لائپزگ ۱۸۳۵ء؛ (۲۰) Höst : Nachrichten von Marokos og Fes، کوپن ہیگن ۱۷۷۹ء؛ (۲۱) ابن بَطُّوطَۃ: Voyages..... مترجمۂ C. Defrémery، پیرس ۱۸۵۳ - ۱۸۵۸ء؛

(۲۲) ابن خلدون : *Notices et extraits*، پیرس ۱۸۵۸ء؛ (۲۳) رسائل اخوان الصفاء، بمبئی ۱۸۸۷ - ۱۸۸۹ء؛ (۲۴) Kaempfer : *Amoenitatum exoticarum*، لیمگو ۱۷۱۲ء؛ (۲۵) Lavignac : *Encyclopédie de la musique*، جلد ۵، پیرس ۱۹۲۲ء؛ (۲۶) Mahillon : *Catalogue . . . du Musée Instrumental du Conservatoire Royal de Musique de Bruxelles*، جلد ۱، Ghent ۱۸۹۳ء؛ (۲۷) وہی مصنف : *La Tromptte, son histoire*، برسلز ۱۹۰۷ء؛ (۲۸) المقری : نفح الطیب، لائڈن ۱۸۵۵ - ۱۸۶۱ء؛ (۲۹) مارٹن Martin : *Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey*، لنڈن ۱۹۱۲ء؛ (۳۰) Pedro de Alcala : *Art . . . la lengu a araviga*، غرناطہ ۱۵۰۵ء؛ (۳۱) Niebuhr : *Voyage en Arabie*، ایمسٹرڈم ۱۷۷۶ - ۱۷۸۰ء؛ (۳۲) *Survey of Persian Art*؛ (۳۳) Ribera : *La Musica de las Cántigas*، میڈرڈ ۱۹۲۲ء؛ (۳۴) Sachs : *Real Lexikon der Musik-instrumente*، برلن ۱۹۱۳ء؛ (۳۵) Schiaparelli : *Vocabulista in Arabico*، Firenze ۱۸۷۱ء؛ (۳۶) Schlesinger : مقالہ *Trumpet* در *Encyclopaedia Britannica*، نیویارک ۱۹۱۰ - ۱۹۱۱ء؛ (۳۷) Seybold : *Glossarium Latino-Arabicum*، برلن ۱۹۰۰ء؛ (۳۸) Toderini : *Letteratura Turchesca*، وینس ۱۷۸۷ء؛ (۳۹) Villoteau : *La Description de l'Egypte, état moderne*، پیرس ۱۸۰۹ - ۱۸۲۶ء.

(H. G. FARMER)

بوقا : شمالی شام کا ایک مقام، جو اب باقی نہیں رہا ۔ اس کا نام غالبًا ایک سریانی اصل کا لفظ ہے جس کے معنی ''مچھر'' کے ہیں، اسی سے لامنز H. Lammens نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دلدلی علاقہ تھا ۔ اس کا ذکر اسلام کی ابتدائی صدیوں کی تحریروں میں آتا ہے ۔ اس کی زیادہ قدیم تاریخ کا کوئی علم نہیں، مگر ابوعبیدہ کی انطاکیہ اور قنسرین کی فتوحات کے تذکروں میں اس کا نام آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے عہد میں اسے کچھ نہ کچھ اہمیت حاصل تھی ۔ اس وقت یہ جراجمۃ [رك بآن] کے علاقے کے قریب تھا، جسے البلاذری نے جبل اللکام (امانوس Amanus) کے اندر بیاس اور بوقا کے درمیان بتایا ہے ۔ پھر یہ ان مقامات میں سے ایک ہے جنھیں امیر معاویہؓ یا اموی خلیفہ الولید کے زمانے میں ملک سندھ کے زط [رك بآن] یعنی جاٹوں کے بسانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا؛ چنانچہ وہ عراق سے آئے اور اپنی بھینسوں سمیت وہاں آباد ہو گئے ۔ آگے چل کر بوقا کے حفاظتی انتظامات خلیفہ ہشام نے اور مضبوط کر دیے اور وہاں ایک قلعہ بنا دیا ۔ Leo Phocas کے شام پر حملے کے دوران میں بوزنطیوں نے ۳۳۸ھ / ۹۴۹ - ۹۵۰ء میں اس کا محاصرہ کر لیا ۔ اس زمانے میں بوقا عواصم [رك بآن] کے علاقے میں شامل تھا، لیکن چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں ابن شداد اور یاقوت نے اس کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ باتیں اس سے بھی پہلے زمانے میں واقع ہوئیں ۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ کن حالات کے زیر اثر اس پر تباہی آئی یا کب اسے چھوڑ دیا گیا، مگر صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ اپنی پہلی اہمیت کھو چکا تھا ۔ لامینس H. Lammens (لا۱، لائڈن، بار اول) نے اپنے قیاس سے، جس کی بنیاد کتابی مآخذ پر تھی، اس کا وہ محل وقوع معین کیا ہے جو عمق [رك بآن] نام کے نشیب میں واقع تھا اور انطاکیہ کی جھیل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا.

مآخذ : (۱) البلاذری : فتوح، ص ۱۴۹، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۶۸؛ (۲) BAG، اشاریات؛ (۳) ابن شداد، مطابق Ch. Ledit : *Machriq*، ۳۳ (۱۹۳۴ء) :

۹ے ببعد؛ (۴) یاقوت، ۱ : ۶۶۲؛ (۵) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۳؛ (۶) M. Canard: *Histoire de la dynastie des Hamdanides*، ۱، الجزائر ۱۹۵۱ء: ۲۲۷، ۲۲۹، ۶۶۲.

(J. SOURDEL-THOMINE)

* بُوقَلا : ایک اصطلاح جو الجزائری عربی (قبّ Baúxαλις) میں مستعمل ہے - اس سے مراد ایک دو دستے والا مٹی کا برتن ہے، جسے عورتیں اعمالِ استخارہ کے دوران میں استعمال کرتی ہیں جو اسی کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں - اس عمل کی بنیاد یہ تھی کہ عمل کرنے والی ایک مخصوص دعا کے بعد فی البدیہہ شعروں پر مشتمل ایک مختصر سی نظم کہی جاتی تھی، اسے بھی بوقلا کہتے تھے اور اس سے فال لی جاتی تھی - یہ اعمال ایسے زمانے میں جب کہ بحری قزاقی اپنے عروج پر تھی خاصے مقبول رہے کیونکہ عورتیں اپنے مردوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھیں جو بحری سفر پر گئے ہوئے ہوتے تھے اور آگے چل کر ایک گھریلو کھیل بن گئے - حال ہی میں ابن شنب S. Bencheneb نے *AIEO*، الجزائر ۱۹۵۶ء، ص ۱۹ تا ۱۱۱، میں اسے ایک بہت عمدہ مقالے کا موضوع بنایا ہے (اس میں کئی متون کا ترجمہ بھی شامل ہے).

(ادارہ)

* بُوقَلَمُون : رکّ بہ ابُو قَلَمُون.

* بُوقِیر: رکّ بہ ابوقیر.

* بوکریش : [= بُکرِش] رکّ بہ بخارسٹ.

* بوکووینا : Bukovina رکّ بہ خَتن Khotin .

* بُوگرا : مشرقی پاکستان کا ایک شہر جو اسی نام کے ضلع کا صدر مقام بھی ہے - اس کا عرض بلد ۲۴ درجے ۵۰ دقیقے شمالی اور طول بلد ۸۹ درجے ۲۳ دقیقے مشرقی ہے اور یہ دریاے کراتویہ Karatoya کے مغربی کنارے پر واقع ہے - ۱۹۰۱ء میں ضلع کی آبادی بارہ لاکھ پانچ سو اٹھاسی اور شہر کی آبادی پچیس ہزار تین سو تین تھی - شہر کی غالب آبادی مسلمان ہے؛ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) سے پہلے بھی سارے بنگال کے اندر اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی - ان میں زیادہ‌تر اگرچہ وہ نو مسلم ہیں جو پہلے کوچ Kōč یا راج بنسی کہلاتے اور شمالی علاقوں میں آباد تھے اور بعد میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم یہاں کچھ پٹھان اور سیّد بھی پائے جاتے ہیں - اس ضلع اور شہر میں طوفان اور سیلاب آتے رہتے ہیں جو بعض اوقات بڑے ہولناک ہوتے ہیں - ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں طوفان نے اس ضلع کے بہت سے مکان اور درخت تباہ و برباد کر ڈالے - ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں جب ڈیڑھ گھنٹے کی مختصر مدّت میں اٹھارہ انچ بارش ہوئی تو یہ شہر تقریباً غرقاب ہوگیا تھا، یہاں شدید زلزلے بھی اکثر آتے رہے ہیں - ۱۸۸۵، ۱۸۸۸ اور ۱۸۹۷ء کے شدید زلزلوں سے جان و مال کا بڑا نقصان ہوا - ۱۸۹۷ء کے زلزلے میں شہر کے پختہ اینٹوں کے بہت سے مکان تباہ ہو گئے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ضلع کے باشندے ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں کثرت سے مسلمان ہوگئے ہوں گے، کیونکہ بہت سے دیہات کے نام ابھی تک ہندوانہ ہیں، مگر وہاں کوئی ہندو باشندہ نہیں ہے - ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے، جو مغل بادشاہ کا نائب تھا، اس ضلع کو دوبارہ فتح کیا تو اس نے شیرپور میں مٹی کا ایک کچا قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام جہانگیر کے نام پر سلیم‌نگر رکھا - ایک قلعہ سہاستھان Mahast'han میں بھی تعمیر کیا گیا تھا جو اب ویران پڑا ہے - شیرپور، شیرخان

کا بسایا ہوا ہے، جو بنگال کا افغان حاکم تھا (تقریباً ۶۶۶ھ / ۱۲۶۸ء تا ۶۷۰ھ / ۱۲۷۲ء) ۔ ان دونوں مقامات میں آثارِ قدیمہ کثرت سے ہیں، مگر خود شہر کے اندر صرف ''بوگرا محل'' ہی، جو اب چودھری خاندان کی قیام گاہ ہے، ایک ایسی جگہ ہے جو کسی قدر قدیم اور دلچسپ ہے [جدید تاریخی و معاشرتی حالات کے لیے رک بہ پاکستان (مشرقی)]۔

مآخذ: (۱) *Statistical Account of Bengal*، کلکتہ ۱۸۷۶ء، ج ۸؛ (۲) S. S. Day: *Final Report on the Survey and Settlement of Jaypur Estates*، کلکتہ ۱۸۹۹ء؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۲۵۶ تا ۲۶۳؛ (۴) *History of Bengal* (مسلم عہد)، طبع جادو ناتھ سرکار، ۲، ڈھاکہ ۱۹۴۸ء: ۲۰۲ تا ۲۰۳، ۲۱۱، ۲۳۵؛ (۵) J. N. Gupta: *Bogra*، الٰہ آباد ۱۹۱۰ء۔

(بزمی انصاری)

بُولاق: مملوک عہد اور ترکی زمانے کے قاہرہ کے بالکل قریب ایک چھوٹا سا شہر اور جنوبی مصر سے قاہرہ کی تجارت کی دریائے نیل پر واقع بندرگاہ ۔ یہ اس ریت پر تعمیر کیا گیا تھا جو دریائے نیل اس وقت پیچھے چھوڑ گیا تھا جب [سلطان] صلاح الدین [ایوبی] کے عہد سے آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے دوران میں اس کا راستہ ایک سے ڈیڑھ کیلومیٹر مغرب کی طرف ہٹ گیا تھا [رک بہ قاہرہ] ۔ اسے قاہرہ سے ناصری نہر جدا کرتی تھی، جسے سلطان محمد بن قلاؤن نے ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں بنایا تھا اور اصحابِ ثروت کو یہ ترغیب دی تھی کہ وہ بولاق میں اپنے مضافاتی (Villas) مکان (مَنْظَرۃ) بنوائیں، جن کے ساتھ بعد میں مسجدیں اور حمّام وغیرہ شامل کر دیے گئے ۔ دفترِ محصولات کو قاہرہ سے وہاں منتقل کر دیا گیا ۔ ۱۳۰۰ھ کے قریب بولاق کی آبادی تقریباً چوبیس ہزار تھی اور یہاں چوبیس مسجدیں (بشمول مسجد ابوالعلاء جو ایک زیارت‌گاہ اور مقام عرس (مولد) ہے)، اوکِل Okells، زرعی پیداوار کے گودام، جہازسازی کے کارخانے وغیرہ تھے ۔ محمّد علی [پاشا] نے وہاں اور کارخانے اور بھٹیاں تعمیر کیں، جن کا مقصد مصری زندگی کو موجودہ زمانے کے مطابق بنانا تھا ۔

بولاق اپنے مطابع کے لیے مشہور ہے ۔ یہ مصر کے اولین مطابع ہیں جو نپولین بونا پارٹ کی مہم کے چند روزہ مطبعوں کے بعد مصر میں قائم کیے گئے ۔ ایک مختصر مصری جماعت، جس کی تربیت میلان Milan میں ہوئی تھی، ۱۸۲۱ء میں چھاپے کی مشینیں اپنے ساتھ لے کر واپس آئی اور ۱۸۲۲ء میں مطبع بولاق لبنانی الاصل نقولا المسابکی (م ۱۸۳۰ء) کی نگرانی میں اپنی پوری گنجائش کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو گیا ۔ یہ مطبع حکومت کی ملکیت تھا اور کئی مرتبہ نئی ایجادات کے مطابق بنایا گیا ۔ ۱۸۶۲ء میں اسے (عبدالرحمٰن رُشدی پاشا کی اور پھر ۱۸۶۵ء میں خدیو اسمٰعیل کے ایک بیٹے کی) نجی ملکیت میں دے دیا گیا ۔ ۱۸۸۰ء میں حکومت نے اسے دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ۱۸۹۴ء کے بعد سے انگریزی اہتمام و نگرانی میں اسے مزید ترقی دی گئی ۔ اور بعدازاں دوبارہ مصری نگرانی میں اس کی بنیاد فوجی ضروریات (دستی کتب وغیرہ) اور ملکی نظم و نسق (سرکاری مجلّہ الوقائع المصریّۃ) کے لیے رکھی گئی تھی ۔ یہ مطبع زمانۂ حال کے ادبی احیا کا ایک بڑا سبب ہے ۔ اس نے اپنے طور پر یا مخصوص افراد کے لیے ترجمے اور عربی، ترکی اور فارسی کی بہت سی مستند (Classical) تصانیف اور یورپی زبانوں کی بعض کتابیں بھی شائع کیں ۔ نجی مطابع کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے، جس نے قاہرہ کو عربی کتابوں کی تجارت کا مرکز بنا

دیا، بالآخر یہ اس عملی اجارہ‌داری سے محروم ہو گیا جو اسے حاصل تھی۔

زمانۂ حال میں بولاق کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ موجودہ شہر قاہرہ کا ایک محلّہ ہے۔

مآخذ : (۱) المقریزی : الخطط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۳ : ۲۱۲ تا ۲۱۰، ۲۳۵؛ (۲) Description de l'Egypte، ۱۸ (حصّہ ۲)، پیرس ۱۸۲۹ء : ۳۷۳ تا ۳۷۶؛ (۳) The Maulids of Egypt : J.W. McPhersan، قاہرہ بدون تاریخ (۱۹۴۰ء کے بعد کی)؛ (۴) ابوالفتوح رضوان : تاریخ مطبعة بولاق، قاہرہ ۱۹۵۳ء، جس میں مکمّل حوالے مل سکیں گے؛ [زیدان : تاریخ آداب اللغة، ۴ : ۳۰۶ ببعد]۔

(J. JOMIER)

* **بولو** : (بولی = قدیم بثینیم Bithynium کے قریب، جو بعد میں کلاڈیو پولس Claudiopolis کہلایا) اس کا عرض بلد ۴۰ درجے ۱۰ دقیقے شمالی اور طول بلد ۳۱ درجے ۳۰ دقیقے مشرقی ہے، آناطولی کی ایک شمال مغربی ولایت کا صدر مقام ہے، جس میں جنگلات بہت ہیں۔ بلندی سات سو دس میٹر اور رقبہ گیارہ ہزار ایک سو چالیس مربع کیلومیٹر ہے، اس کا محلّ وقوع دریاے سقاریہ کے خم اور بحر اسود کے درمیان ہے۔ ۱۹۵۵ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار آٹھ سو چوراسی اور صوبے کی آبادی تین لاکھ اٹھارہ ہزار چھے سو بارہ تھی۔ بولو ایک میدان میں دریاے بولو صویو [= بولی صوبی] کے کنارے پر واقع ہے، جہاں سخت زلزلے آتے رہتے ہیں، جن میں ۲۶ مئی ۱۹۵۷ء کا زلزلہ خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ شہر ایک شاہراہ پر واقع ہے اور استانبول سے دو سو ترسیٹھ کیلومیٹر اور انقرہ سے دو سو آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں بتیس مسجدیں، ایک حمام جو ۷۹۱ھ/۱۳۸۸-۱۳۸۹ء میں تعمیر ہوا، ایک درسگاہ برائے تربیت معلمات، سکول برائے تعلیم حفاظت جنگلات اور دیگر ابتدائی اور ثانوی سکول، ایک ہسپتال اور جدید کوئلے کی ریت (briquette) اور لکڑی کے کارخانے ہیں۔ بولو کوراوغلو Köroghlu، عاشق دِردلی Ashik Derdali اور اچھے باورچیوں کا وطن ہے۔ اَبَنت کی جھیل اس کے جنوب مغرب میں سینتیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتاترک نے بولو میں ۱۷ تا ۱۹ جولائی ۱۹۳۳ء قیام کیا اور [عصمت] انونو نے ۵ سے ۷ اگست ۱۹۳۹ء تک۔ اس کی قضائیں آق چقوجہ Ak-chakodja، بولو Bolu، دُوزجہ Dūzdja، گِردہ Gerede، گوای نواک Göynük، قبرسجق Kibrisdjik، مِنگن Mengen، (جہاں ۱۹۵۶ء سے پتھر کا گندمی رنگ کا کوئلا (lignite) نکالا جا رہا ہے)، مُدرنو mudurnu، سِبن Seben اور یغلجہ Yeghildja ہیں۔ بولو ۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء کے قریب ترکوں کے قبضے میں آیا، اور ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تا ۸۲۷ھ/۱۴۲۳ء اسفندیار اوغللری کے زیر فرمان رہا۔ اس کے بعد ترکوں نے اسے دوبارہ لے لیا اور شاہزادۂ سلیمان نے اس پر حکومت کی (۹۱۴ - ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء) اور ۱۳۳۸ھ/ اپریل ۱۹۲۰ء میں ناکام خلافت اردوسی کا صدر مقام رہا (تاریخ، ۴ : ۶۷، ۳۰۴؛ نطق، ص ۱۱)۔ بولو ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۲ء تک آناطولی کی ایالت کا ایک ضلع (سنجاق) رہا اور ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء تک محصّلاق، ۱۳۳۱ھ/ ۱۸۶۴ء تک ایک مستقل سنجاق اور ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء تک قسطمونی Kastamonu سے ملحق رہا۔ اس کے بعد اسے ایک مستقل لواء کی حیثیت دی گئی، یہاں تک کہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں اسے ایک ولایت بنا دیا گیا۔

مآخذ (۱) Bolu Gezisi : R. Aker، استانبول ۱۹۳۹ء؛ (۲) οἱ πρῶτοι Οθωμανοί : G. Arnakis، ایتھنز ۱۹۴۷ء، ص ۱۷۴ ببعد، ۲۰۰؛ (۳) برکان : قانونلر، ص ۲۸ ببعد؛ (۴) بولو لواسی سالنامہ سی، بولو ۱۹۲۵ء؛ (۵) Turquie d' Asie : Cuinet، ۴ : ۳۳۶ تا ۳۶۱، ۵۰۶

تا ۹۳۰؛ (۶) زیلہ ۔ دانشمان : چاملر و گوللز اولکہ سی بولو، استانبول ۱۹۳۵ء؛ (۷) دوکومان آیلر مجموعہ، عدد ۲، ''بولو'' ص ۱ تا ۶۰؛ (۸) Iller Bankasi : بولو اعمار پلانی، انقرہ ۱۹۵۸ء [پیمانہ] = ۱ : ۲۰۰۰؛ (۹) T. Z. Isitman : بولو جغرافیاسی، استانبول ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) M. Z. Konrapa : بولونک عثمانلی ترکیہ سنہ گیریسی، در تدریسات مجموعہ سی، عدد ۱۰ (اپریل ۱۹۵۲ء) : ص ۳۰ تا ۳۳ نیز عدد ۸ اور ۹ : ۳۴ تا ۳۶؛ (۱۱) A.D. Mordtmann : *Anatolien* ......، Hanover ۱۹۲۵ء، ص ۲۶۷ تا ۲۷۵؛ (۱۲) L. V. de St. Martin : *Description .. .. de l'Asie Mineure*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۱ : ۳۰۴، ۳۶۲، ۳۹۵ تا ۳۹۶، ۴۱۸، ۴۳۳ ببعد؛ ۲ : ۳۶۱ تا ۳۶۵، ۶۸۷، ۷۱۲ تا ۷۱۹؛ (۱۳) K. Sapmaz : بولو ... اور مانلق ... عائلہ زراعت ...، انقرہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) S. Saribay : استقلال سواشندہ مدرنو ۔ بولو ۔ دوزجہ، آیدین ۱۹۳۳ء؛ (۱۵) F. Taeschner : *Anatolisches Wegenetz* .. ..، لائپزگ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء، ۱ : ۶۱، ۱۹۰، ۱۹۳ تا ۱۹۹، جداول ۲۳ تا ۲۶؛ ۲ : ۲۳، ۲۴ تا ۳۴، ۵۳، ۵۶، ۶۳؛ (۱۶) ترک انسیکلوپیدی سی، ۷ : ۲۴۷ تا ۲۵۰؛ (۱۷) ترکیہ ببلیو گرافیاسی، استانبول ۱۹۲۸ء، مواضع کثیرہ؛ (۱۸) ترکیہ قلاووزو، انقرہ ۱۹۳۶ء، ۱ : ۶۳۵ تا ۶۴۳ (تصویر اور ۱ : ۱۰۰۰۰۰۰ پیمانے کا نقشہ)؛ (۱۹) ترکیہ ییللیغی ۱۹۴۷ء، استانبول ۱۹۴۷ء، ص ۱۲۱، ۱۲۹، ۱۳۸، ۱۴۰، ۲۸۹؛ مطبوعہ ۱۹۴۸ء، ص ۶۸، ۸۶ تا ۸۷؛ (۲۰) وطن مملکت علاوہ لری، ۱، استانبول ۱۹۵۳ء، عدد بولو ۱۴ : ۱ تا ۱۲؛ (۲۱) مزید حوالوں کے لیے رك بہ ت، بذیل مادہ (از B. Darkot).

(H. A. Reed)

بُولْوَادِین : (بعض اوقات کَرمَک، قدیم پولی بوتم Polybotum)، ۳۸ درجے ۴۴ دقیقے عرض بلد شمال، ۳۱ درجے ۳ دقیقے طول بلد مشرق میں، اَفیُون قرہ حصار [رک بآں] کی ولایت میں ایک بلدیہ اور قضا، جس میں یہ خود اور اِسحاقلی ناحیہ شامل ہیں اور چھبیس گاؤں ہیں (اس کا سابق ناحیہ چای، جس میں بیس گاؤں ہیں ۱۳۲۷ھ / یکم اپریل ۱۹۰۸ء کو ایک علیحدہ قضا بن گیا) ۔ ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء میں اس شہر کی آبادی بارہ ہزار چھے سو چار اور پورے ضلع کی اکسٹھ ہزار دو سو اسی تھی؛ بلندی نو سو میٹر، رقبہ دو ہزار چار سو بیس کیلومیٹر ۔ بولوادین افیون کے مشرق میں پینتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر چای ناسی ریلوے سٹیشن کے آٹھ میٹر شمال میں، سازلی اور اِیبر جھیلوں اور آقارچای سے سیراب ہونے والے ایک زرخیز میدان کے شمال میں پرانی شاہراہ بغداد اور نئی شاہراہ اِسکی شہر ۔ قونیہ پر واقع ہے ۔ بولوادین ۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء تا ۷۲۲ھ / ۱۳۲۰ء کے قریب اشرف اوغللری [رک بآں] کے زیرِ نگین تھا، اسے مراد اوّل نے فتح کر لیا تھا، مگر ۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء کے بعد اسے گرمیان اوغللری نے واپس لے لیا، پھر مراد ثانی نے ۸۳۲ھ / ۱۴۲۸-۱۴۲۹ء میں دوبارہ لیا، اور [مشہور معمار] سِنان نے سلیمان اوّل کے عہد میں اسے جزوی طور پر تعمیر کیا (مسجد، رستم پاشا کا حمّام اور فوارہ، قبّ اوزون چارشیلی : کتابہ لر، ج ۲) ۔ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں یہ چند روز کے لیے باغی اوزون خلیل کے تصرّف میں آ گیا تھا ۔ یہ قصبہ اگست ۱۹۲۲ء میں اہل یونان کے خلاف قوم پرستوں کے جوابی حملے سے پہلے ایک بہت اہم عسکری صدر مقام تھا.

مآخذ : (۱) جمہوریتک ۱۵ ییلی ایچندہ افیون، استانبول ۱۹۳۸ء؛ (۲) آئی ۔ ایچ ۔ دانشمند : *Kronology* کرانولوجی ...، مواضع کثیرہ؛ (۳) ہیمر Hammer : *Staatsv*، ۲ : ۲۷۵؛ ۲ : ۲۰۵ تا ۲۰۶؛ (۴) کپر F. Kiper : افیون قرہ حصار، والیک نوتلرمدن برتاچ خاطرہ، استانبول ۱۹۳۵ء؛ (۵) *Murray's Handbook for Travellers in*

... *Asia Minor*، طبع Sir Charles Wilson، لنڈن ۱۸۹۵ تا ۱۹۰۵ء، ص ۱۳۲، مطبوعہ ۱۸۸۰ء، ص ۳۰۲، مطبوعہ ۱۸۷۷ء، ص ۳۶۶؛ (۶) آئی۔ اوکدای : افیون قرہحصاری گزتہ لری، قلیے ۱۹۳۷ء؛ (۷) سالنامۂ، برائے خداوندگار ولایتی، سال ۱۲۹۶ھ، ۱۳۰۱ھ، ص ۳۷۷، ۱۳۰۲ھ، ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۶ھ، ۱۳۲۱ تا ۱۳۲۳ھ؛ (۸) L. V. de St. Martin : *Description. . . de l'Asie Mineure*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۲ : ۵۵۹، ۶۱۱؛ (۹) W. Shepherd : *Hist. Atlas*، مواضع کثیرہ؛ (۱۰) M. Y. Suslu : اشرف اوغللری تاریخی یے شہر قلاوزوزو، قونیہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۱) F. Taeschner : *Anatolisches Wegenetz...*، ۱ : ۱۰۲، ۱۲۶، جداول ۷ تا ۸، ص ۱۹۷ ببعد؛ (۱۲) وہی مصنف : جہان نما، طبع ایم، نشری، ۱ : ۲۴۹ و ۲ : ۱۷۱؛ (۱۳) ترک انسکلوپیدی‌سی، ۷ : ۲۰۵؛ (۱۴) ترکیہ بلیو گرافیاسی، ۱۹۲۸ء، مواضع کثیرہ؛ (۱۵) ترکیہ قلاوزوزو، انقرہ ۱۹۳۹ء، ۱ : ۳۷، ۵۷ تا ۶۰، نقشہ (پیمانہ) ۱ : ۸۰۰۰۰۰، مقابل ص ۷۰؛ (۱۶) ترکیہ ییلگی، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۸، مطبوعہ ۱۹۳۸ء، ص ۸۲؛ (۱۷) اسمعیل حقی اوزون چارشیلی : افیون قرہحصار، صندقلی، بولوادین ... دہ‌کی کتابہ لر، استانبول ۱۹۲۹ء؛ (۱۸) وہی مصنف : عثمانلی تاریخی، انقرہ ۱۹۴۷ء، ۱ : ۱۲ تا ۱۳، ۱۶۹، ۲ : ۹۳؛ (۱۹) ا ا، ت، بذیل مادہ (بسیم دارکوت)، مزید حوالوں کے لیے۔

(H. A. REED)

* **بولور طاغ** : رک بہ پامیر۔

* **بُلُوک**: (= بولک؛ فعل بولمک bölmek سے) جس کے معنی ہیں، ایک حصّہ، ایک جز یا ایک قسم۔ مشرقی ترکی اور فارسی میں ایک صوبے یا ایک علاقے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، مگر اناطولی کی ترکی زبان میں تنظیمات [رک بآن] کے بعد اس لفظ سے پیدل یا سوار فوج کے دستے مراد لیے جانے لگے، جو ایک یوزباشی (کپتان) کے ماتحت ہوں۔ عثمانی فوج کی قدیم تنظیم میں لفظ بولوک قپوقولی Kapi-Kulu [رک بآن] اوجاقوں odjaks نیز صوبے کی فوجوں اور اعلٰی فوجی افسروں کے خدم و حشم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بولوک کی تعداد یکساں نہیں ہوتی تھی، مثلاً ینی چری اوجاق میں جو ایک ہزار جوانوں پر مشتمل ہوتا تھا، سو سو جوانوں کے دس بولوک ہوا کرتے تھے۔ بولوک کا افسر یا یاباشی (پیدل فوج کا سردار) کہلاتا تھا۔ گیلی بولو (گیلی پولی) کے عجمی اوغلان [رک بآن] اوجاق میں جس میں پہلے چار سو آدمی ہوتے تھے، پچاس پچاس جوانوں کے آٹھ بولوک ہوتے تھے۔ ان بولوکوں پر ایک افسر مقرر ہوتا تھا، جسے چورباجی کہتے تھے۔ ینی چری اوجاق کی تعداد بعد میں اتنی بڑھا دی گئی تھی کہ ایک اوجاق ایک سو ایک بولوک پر مشتمل ہونے لگا، جسے جماعت اور اورتا orta بھی کہتے تھے۔ ہر بولوک کا نام اور کام الگ الگ ہوتا تھا، مثلاً بولوک ۱ تا ۳ جماعت شتربان (اونٹ ہانکنے والوں کی جماعت) کہلاتے تھے، اٹھائیسواں بولوک امام حضرت آغا کا بولوک تھا، بولوک ۶۰ تا ۶۳ صولاق اورتاسی Solok-ortasi (یا صولاق محافظوں کا اورتا) کہلاتے تھے۔ سگبان (شاہی شکاری کتوں کے محافظوں) کا ۱۴۵۱ء تک ایک مستقل اوجاق تھا، لیکن اس سنہ سے سلطان محمد ثانی نے اسے ینی چری کے اوجاق میں بطور پینسٹھویں اورتا کے شامل کر دیا۔ تاہم ان کی ایک مستقل تنظیم پھر بھی باقی رہی، جس میں چونتیس بولوک تھے۔ ہر بولوک کی تعداد اور نام اور کام بھی الگ الگ تھے، جب بایزید ثانی یا سلیم اوّل کے عہد میں ینی چری کے آغا نے ایک منظّم بغاوت کر دی تو قصر شاہی نے ایک اور آغا کا

تقرر کیا، جس کی اپنی علیحدہ تنظیم تھی اور اس تنظیم میں ''آغا کے بولوک'' اکسٹھ کی تعداد میں مقرر کیے گئے، اس امید پر کہ اس سے اوجاق میں قوتوں کا توازن قائم ہو جائے گا، چنانچہ بولوک کا لفظ جب استعمال ہوتا تھا تو عموماً اس سے یہ بولوک مراد ہوتے تھے۔ بصورت دیگر اگر بولوک سے زرہ ساز، توپچی، اور توپیں کھینچنے والوں کے کسی اوجاق کا بولوک مراد ہوتا تھا تو اس کا اور اس کے اوجاق کا نام مذکور ہوتا تھا۔ قپوقولی کے سوار اوجاق میں چھے بولوک تھے۔ ان کے افراد ''بولوک خلقی'' (چھے بولوک کے لوگ) کہلاتے تھے، سپاهیوں اور سلاحداروں کو مستثنٰی کر کے انہیں ''بولوکات اربعہ'' (چار بولوک) کہتے تھے۔ مصر کے سات عثمانی اوجاق ''بولوکات سبعہ'' (یعنی سات بولوک) کہلاتے تھے۔ ان مختلف بولوکوں کے افسروں کی تنخواهوں کی شرح الگ الگ ہوتی تھی اور ان کی ترقی کے قواعد بھی الگ الگ تھے۔ اوجاقوں کی طرح بولوکوں کی اہمیت بھی حکومت کی نظروں میں وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ بولوکوں اور اوجاقوں کے مفصّل حالات کے لیے دیکھیے اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتی تشکیلاتندن قپوقولی اوجاقلری، ج ۱، ۱۹۴۳ء اور Gibb، اور Bowen، ج ۱، بمدد اشاریہ۔

(اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی)

* **بولوک باشی:** ایک لقب جو مملکت عثمانیہ کی سیاسی تنظیم میں عمّال کے مختلف گروهوں کے سرداروں کو دیا جاتا تھا۔ قدیم عثمانی فوجی تنظیم میں ینی چری کے اوجاق میں بولوک کے سردار عام طور پر یا یاباشی یا سرپیادہ کہلاتے تھے، لیکن عجمی اوغلان کے بولوک میں سرداروں کو چورباجی Čorbadji کہا جاتا تھا۔ صرف ''آغا کے بولوکوں'' [رَكَ بہ بولوک] کے سرداروں کا لقب بولوک‌باشی ہوتا تھا، اور ان کا سب سے اعلٰی افسر ''باش بولوک باشی'' کہلاتا تھا۔ بولوک باشی گھڑ سوار ہوتے تھے اور ان کے گھوڑے کی زین سے ایک لوہے کا گرز اور ایک ڈھال بندھی رہتی تھی۔ جب سلطان قصر سے نکل کر کسی مسجد کی طرف جاتا تھا تو بولوک باشی اس کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ یہ مزیّن لباس پہنے ہوئے ہوتا تھا اور اس کے ہاتھ میں نیزے کے بجائے ایک سرکنڈا ہوتا تھا۔ سلطان سلیمان قانونی کے عہد حکومت میں ''آغا کے بولوکوں'' کے اٹھاون بولوک باشی تھے۔ ان کی روزانہ تنخواہ نو ایسپر (Aspers) تھی۔ بعد کے زمانے میں ان کی تعداد اور تنخواہ دونوں بڑھ گئی تھیں۔ باش بولوک باشی کو ترقی دے کر نیچے درجے کا ''آغاے اوجاق'' بنایا جاتا تھا اور اس کا لقب ''قطار آغالری'' ہوتا تھا (یعنی قطاروں یا کاروانوں کے آغا)۔ آغا کے بولوکوں کے بولوک باشی کو جب کوئی ''تیمار'' [رَكَ بآن] (جاگیر) عطا کی جاتی تھی تو ان کا شمار محافظانِ قلعہ میں ہوتا تھا اور انہیں عمر بھر کے لیے آٹھ هزار سے لے کر پندرہ هزار اسپر ملتے تھے۔ ینی چری اوجاق کے علاوہ قپوقولی [رَكَ بآن] کے سواروں کے بھی اپنے بولوک باشی ہوتے تھے اور ایسے ہی سگبانوں (محافظانِ سگانِ سلطان)، لوند (levends)، یعنی بے قاعدہ فوج اور تفنگچیوں (بندوق برداروں) کے بھی اپنے اپنے بولوک باشی ہوتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی Uzunçarsili: عثمانلی دولتی تشکیلاتندن قپوقولی اوجاقلری، ج ۱، ۱۹۴۳ء اور Bowen & Gibb، ج ۱ بمدد اشاریہ۔

(اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی)

بون: Bone رَكَ بہ العنّابۃ۔

بُونۃ: رَكَ بہ العنّابۃ۔

* **البُونی** : مُحیی الدّین ابوالعبّاس احمد بن علی البُونی (یعنی باشندہ بُونَه) کا شمار پُر اسرار علوم [سحر و طلسمات وغیرہ] کے اہم‌ترین عرب مصنفین میں ہوتا ہے - اس نے ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں وفات پائی - وہ کہانت اور غیب‌دانی کے موضوع پر کتاب سرّالحکم کا مصنف ہے اور اس نے بَسْمَلَة کے فضائل اور اسماے حُسْنٰی و حروفِ ابجد پر چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کی ہیں - ان رسائل میں کراماتی تعویذوں، پُراسرار (Cabalistic) حروف اور دیگر طلسماتی علامات کا ذکر ہے.

ان مسلمانوں میں جو جادو اور تعویذوں کا کاروبار کرتے ہیں البُونی کی تصانیف آج بھی سب سے زیادہ مستعمل ہیں - مغرب میں بعض مصنفوں نے ان کتابوں سے بہت کام لیا ہے، مثلاً Reinaud : *Monuments Arabes, Persans et Turcs, du cabinet de M. le Duc de Blacas*، ۲ جلدیں، ۱۸۲۸ء، کے اس حصے میں جس میں اس نے سحرزدگی سے بحث کی ہے، اور M. Doutte : *Magic et Religion dans l'Afrique du Nord*، کے کئی حصوں میں.

جادو پر ایک دلچسپ مخطوطه، جو پیرس کی قومی لائبریری (Bibliothèque Nationale) (شماره ۲۶۶۲) میں موجود ہے، جزوی طور پر البُونی کی تصانیف پر مبنی ہے - اس کتاب میں البُونی کا حوالہ صریحاً غلطی سے شرف الدین کے نام سے دیا گیا ہے (دیکھیے (۱) Carra de Vaux : *Notes sur les Talismans et conjuration arabes*، *Journ. As.* : ۱۹۰۷ء، ۱ : ۵۹۲؛ (۲) وہی مصنف : مقاله *Charms and Amulets (Muhammaddan)*، در *Encyclopaedia of Religion and Ethics*؛ نیز قبّ (۳) براکلمان : *Geschichte der Arabischen Literatur*، ۱ : ۴۹۷).

(B. CARRA DE VAUX)

بونیوال : رک به احمد پاشا بونیوال.

* **بوهره** : (Buhrah، Bohrās Bohoras)، مغربی هند کا ایک مسلم فرقه (جو زیادہ تر هندو نسل سے ہے اور جس میں کسی قدر یمنی عربوں کے خون کی آمیزش ہے) - یه لوگ بیشتر اسمٰعیلی فرقے کے شیعه ہیں اور اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصر کے فاطمی خلفا میں سے المُستعلی [۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء تا ۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء] کے اس دعوے کی حمایت کرتی ہے که وہی اپنے باپ المُستنصر کے بعد تخت نشینی کا جائز حقدار تھا (فاطمیوں کی تاریخ کے لیے رک به فاطمیه اور اسمٰعیلیه) - المُستعلی نے اپنے بھائی نزار کی مخالفت کی تھی، جس کے حامیوں (حشیشیوں Assassins) کے هندوستان میں نمائندے خوجے (Khodjas) [رک بآں] کہلاتے ہیں - بوهره کے معنی تاجر یا بیوپاری کے ہیں (یه گجراتی لفظ وهوروو vohōrvū سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں بیوپار کرنا، تجارت کرنا) - اس لفظ سے یه واضح ہوتا ہے که [هندوستان کے] جو لوگ دائرۂ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہوے ان کا پیشه کیا تھا - یه بات ایک عربی تصنیف الترجمة الظّاهرة . . . . . . میں صاف طور پر مذکور ہے (دیکھیے بیان آئنده اور قبّ آصف اے - اے - فیضی *Ismaili Law of Wills*، آوکسفرڈ ۱۹۰۳ء، ۳، حاشیه ۲)، مگر یه نام مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے - ۱۹۰۱ء کی سر شماری کے کاغذات میں چھے ہزار چھے سو باون هندوؤں اور پچیس جین مت کے پیروں نے اپنے آپ کو بوهره لکھوایا - ان کی صحیح تعداد کسی قدر مشکوک ہے، کیونکه هندو بوهروں، سنّی بوهروں (جو گجرات میں اور خاص طور پر راندیر میں پائے جاتے ہیں) اور جینی بوهروں کو کبھی کبھی اسمٰعیلی بوهروں کے ساتھ ملتبس کر دیا جاتا ہے - ۱۹۰۱ء میں مسلم

بوھروں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار دو سو پچپن بتائی گئی تھی، جن میں سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار تین سو سات بمبئی پریزیڈنسی [بھارت] میں رہتے تھے ۔ فرقوں کے تحت بوھروں کی مندرجۂ ذیل تعداد دی گئی ہے :—

بوھرہ

١٩١١ء	١٩٢١ء	١٩٣١ء
٩٢٠٨١	١٠٨١٥٠	١١٠١٢٣

١٩٤١ اور ١٩٥١ء کی سر شماری کی روداد میں فرقوں کی تقسیم نہیں دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاک و ہند میں اس وقت ان کی صحیح تعداد بتانا ناممکن ہے ۔ آبادی کی فطری افزائش کا لحاظ رکھتے ہوئے پاک و ہند میں ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ اور تمام دنیا میں دو لاکھ کے قریب ہوگی، جن میں سیلون اور مشرقی افریقہ کے کاروباری لوگ داخل ہیں۔

بوھرے دو بڑی جماعتوں میں منقسم ہیں، ان میں سے بڑی جماعت، جو سب کے سب تاجر ہیں، شیعوں کی ہے، دوسری جماعت سنیوں کی ہے، جس میں زیادہ تر کسان اور کاشتکار ہیں ۔ راندیر (گجرات) کے کچھ سنّی بوھرے برما میں کاروبار کرتے ہیں اور وہاں انھوں نے خوب دولت اکھٹی کر لی ہے ۔ اسمٰعیلی بوھروں کے کچھ خاندان اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنھوں نے عرب اور مصر سے نکل کر ہند میں پناہ لی تھی ۔ اس دعوے کا ثابت کرنا مشکل ہے ۔ لیکن باہمی رشتہ ناتا، خصوصاً یمن کے مُستعلیہ لوگوں سے شادی بیاہ کی متعدّد مثالیں موجود ہیں ۔ حال ہی میں سلیمانی بوھروں کے ہاں سنّیوں، اثناعشری شیعوں، ہندوؤں یہاں تک کہ یورپ والوں سے بھی باہمی شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوئے ہیں، لیکن بوھروں کی اکثریت اپنے گروہ کے باہر شادی نہیں کرتی ۔

اس میں شک نہیں کہ بوھروں کی غالب تعداد ہندو نسل سے ہے، جن کے آبا و اجداد کو اسمٰعیلی مبلّغوں نے اسلام میں داخل کیا تھا ۔ عام روایت یہ ہے کہ ان میں سے پہلا مبلّغ عبداللہ نامی ایک شخص تھا، جسے فرقۂ مُستعلیہ کے امام نے یمن سے بھیجا تھا ۔ اس مبلّغ کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ٤٦٠ھ / ١٠٦٧ء میں کھمبایت (Cambay، جنوبی ہندوستان) میں اترا اور سرگرمی کے ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت کرنے لگا ۔ یہ قصہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے ۔ ان میں سے ایک روایت عربی کے ایک رسالے الترجمة الظّاھرة لفرق البورهة (كذا؟ البوهرة) الباهرة میں مذکور ہے ۔ اس کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی کی شاخ میں موجود ہے اور جھاویری (K. M. Jhaveri) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے (*A Legendary History of the Bohoras*، در *Journal Bombay Branch Royal Asiatic Society*، *1933*، سلسلۂ جدید، ٩ : ٣٧ تا ٥٢) ۔ اس کا اصل متن ایچ ۔ ایم ۔ فخر (طالب) نے *Journal Bombay Branch Royal Asiatic Society, 1940*، سلسلۂ جدید، ١٦ : ٨٨ میں شائع کر دیا ہے ۔ دیگر روایات کے مطابق مستعلیوں کے پہلے مبلّغ کا نام محمد علی تھا، جس کی قبر آج تک کھمبایت میں موجود ہے (م ٥٣٢ھ / ١١٣٧ء) ۔ اس وقت اَنہلواڑہ کا چالوکیہ خاندان گجرات پر حکومت کر رہا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہندو حکومت نے اسمٰعیلی مبلّغوں کو اپنے مذہب کی اشاعت کی اجازت دے رکھی تھی اور اس نے ان کے تبلیغی کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی، جس سے ان مبلّغوں کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی ۔ ١٢٩٧ء میں یہاں کی مقامی ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایک صدی تک گجرات کم و بیش دہلی کی حکومت کے زیر نگین رہا ۔

بہر حال گجرات کے آزاد حکمرانوں کے زمانے میں (۱۳۹۶ تا ۱۵۷۲ء)، جو سنّی عقائد کی اشاعت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بوہروں کو چند موقعوں پر سخت دار و گیر سے دو چار ہونا پڑا۔

۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء تک اس فرقے کا پیشوا یمن میں رہتا تھا اور بوہرے اس کی زیارت کرنے وہاں جاتے تھے، آمدنی کا عُشر اسے ادا کرتے تھے اور اپنے قضیے فیصلے کے لیے اس کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس کے بعد ۹۴۶ھ میں یوسف بن سلیمان ترکِ وطن کر کے یمن سے ہندوستان آ گیا اور سدھ پور (ریاست بمبئی) میں سکونت اختیار کی۔ اس کے تقریباً پچاس سال بعد جب ۹۹۶ھ / ۱۵۸۷-۱۵۸۸ء میں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ہو گیا تو اس فرقے میں کچھ باھمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ گجرات کے بوہروں نے، جو اس فرقے کی اکثریت تھے، داؤد بن قطب شاہ کو اس کا جانشین منتخب کیا اور اس کے تقرر کی خبر (عربی: نصّ) اپنے ہم مذہبوں کو یمن بھیجدی۔ مگر مؤخرالذکر نے، جن کے ساتھ اس فرقے کے تھوڑے سے ہندوستانی بھی شامل تھے، ایک شخص سلیمان نامی کے دعاوی کی تائید کی، جو کہتا تھا کہ جانشینی کا حق اسے پہنچتا ہے، کیونکہ داؤد ابن عجب شاہ نے اس کی بابت اسے تحریری حکم دے دیا تھا۔ یہ وثیقہ ابھی تک سلیمانی ''دعوت'' کے قبضے میں موجود ہے (اس فرقے کے جماعتی انتظام کو ''دعوت'' کہتے ہیں اور اس کی آخری تا کا تلفّظ کرتے ہیں)، لیکن اس کی صحت کی علمی، تنقیدی یا قانونی طور پر کبھی چھان بین نہیں کی گئی۔ سلیمان کی وفات احمد آباد میں ہوئی، جہاں اس کی قبر کا اور اس کے حریف داؤد بن قطب شاہ کی قبر کا ان دونوں کے ماننے والے اپنے اپنے طور پر احترام کرتے ہیں۔ جو لوگ سلیمان کے دعاوی کو تسلیم کرتے ہیں وہ سلیمانیہ کہلاتے ہیں اور ان کا داعی یمن میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا کارندہ ''منصوب'' کہلاتا ہے اور سلیمانی ''دعوت'' کا صدر مقام بڑودہ ہے جہاں اسمٰعیلی مخطوطات کا ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ ان دونوں میں ایک اَور فرق یہ ہے کہ داؤدی گجراتی زبان کی ایک شکل استعمال کرتے ہیں، جو عربی الفاظ اور جملوں سے معمور ہے۔ یہ لوگ اس زبان کو عربی خط میں لکھتے ہیں اور اسی میں اپنے انتظامی فرامین جاری کرتے ہیں اور خطبے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سلیمانی ان تمام اغراض کے لیے اردو استعمال کرتے ہیں۔

داؤدی بوہروں کا پیشوا عموماً بمبئی میں رہتا ہے، لیکن اس کا صدر مقام سورت میں ہے اور ''ڈیوڑھی'' کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں جگہ اسمٰعیلی مخطوطات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ سورت میں ایک عربی مدرسہ ہے، جو ''درسِ سَیفی'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام آج کل کے داعی سیّدنا طاہر سَیف الدین کے نام پر رکھا گیا ہے [ان کا انتقال ہو چکا ہے اور اب ان کے جانشین ان کے بیٹے ہیں]۔ ان کا دفتری لقب الداعی المطلق ہے۔ عام طور پر لوگ انہیں ''ملّاجی صاحب'' یا ''سیّدنا صاحب'' کہتے ہیں اور ان کے مرید ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ان کے حضور میں ان کے گروہ کی ایک بڑی تعداد ایک مخصوص انداز میں اظہار عجز و نیاز کرتی ہے، جسے ''تقبیل الأرض'' [زمین بوسی] کہتے ہیں۔ بظاہر یہ رسم فاطمیوں کے زمانے سے چلی آتی ہے اور اس میں اور سجدے کی مقرّرہ شکل میں بہت کم فرق ہے۔ شادی اور موت کی رسموں اور مقررہ نمازوں کے ادا کرنے میں مقامی عہدےدار عوام کی بخوبی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ عہدےدار ''عامل'' کہلاتے ہیں، جنھیں ملّاجی صاحب مقرر کرتے ہیں اور

''دعوت'' کے ملازم هوتے هیں۔ ان کے فرائض وهی هیں جو سنّیوں کے هاں ''قاضی'' انجام دیا کرتے هیں۔ اس کے علاوہ وہ ملّاجی صاحب کے سامنے مختلف جھگڑے فیصلے کے لیے پیش کرتے هیں اور ان کا اپنے حلقے والوں پر بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ بوهرہ جماعت کی ایک خصوصیت، جو پاک و هند اور دیگر مقامات میں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ یہ پیشوں (یا محلّوں) کے لحاظ سے اپنے الگ الگ جتھے (guilds) بنا لیتے هیں اور دوسروں کے ساتھ تعلقات کم رکھتے هیں۔ یہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے اور دیگر مذاهب کے متبّعین کے ساتھ تو ایسے تعلقات کا سوال هی پیدا نہیں هوتا، اور عوامی امور میں بہت کم حصّہ لیتے هیں۔ عام طور پر یہ لوگ تجارت پیشہ هی هیں، لیکن پاک و هند، سیلون اور مشرقی افریقہ کے کچھ حصّوں میں خصوصاً سلیمانی فرقے کے لوگ عوامی زندگی میں داخل هونے لگے هیں اور سرکاری ملازمت بھی قبول کرنے لگے هیں.

داؤدی فرقے سے کٹ کر دو چھوٹے چھوٹے فرقے اَور بن گئے هیں، لیکن انھیں زیادہ اهمیت حاصل نہیں ہے، مگر یہاں ان کا ذکر مناسب ہے: (۱) علیّہ بوهرے، جنھوں نے ۱۶۲۴ء میں بڑے ملّا شیخ آدم کے پوتے علی کی گدی نشینی کے دعوے کی حمایت کی۔ ان کے مقابلے میں شیخ طیّب تھے، جنھیں خود شیخ آدم اپنا جانشین نامزد کر گئے تھے؛ (۲) ناگوشتیے، جو علیّہ فرقے سے تقریباً ۱۷۸۹ء میں علیحدہ هو گئے تھے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاهر هوتا ہے وہ گوشت‌خوری کو گناہ قرار دیتے هیں۔ جعفری بوهروں کا بڑا حصّہ داؤدی بوهروں کی اولاد ہے، جو مظفّرشاہ (۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء تا ۸۱۳ھ / ۱۴۱۱ء) کے عہد حکومت اور اس کے بعد کے گجرات کے بادشاهوں کے زمانے میں سنی هو گئے تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد میں اضافہ هندو نومسلموں کی بدولت هوا۔ انھوں نے اپنا نام ایک صوفی پیر سیّد احمد جعفر شیرازی (پندرهویں صدی) کے نام پر رکھا ہے، جن کی اولاد کو وہ اپنا روحانی پیشوا مانتے هیں اور ان کی تعظیم و تکریم بجا لاتے هیں.

بوهرے اپنی مذهبی کتابوں کو مخفی رکھتے هیں، لیکن حال هی میں ان کی بعض فقہ کی (جیسے دعائم الاسلام [و کتاب الاقتصار])، تاریخ کی (جیسے سیرة سیّدنا المؤیّد) اور فلسفے کی (جیسے راحة العقل اور الرّسالة الجامعة) کتابیں چھاپ دی گئی هیں۔ اس کی مزید تفصیل ان مآخذ میں ملے گی جن کا ذکر W. Ivanow کی *Guide to Ismaili Literature*، لنڈن ۱۹۳۳ء، میں کیا گیا ہے، جسے دوسری بار طبع کرنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ ان کے مذهب اور عقائد کے لیے دیکھیے: زاهد علی: همارا اسمٰعیلی مذهب اور اس کی حقیقت (اردو) حیدر آباد (دکن)، ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء۔ اس کتاب میں ''حقائق'' (یعنی اسمٰعیلیہ کی مخفی تعلیم) کی پوری تشریح خود اس فاضل بوهرے نے کی ہے۔ حال هی میں آصف فیضی نے مستعلیہ اسمٰعیلی فرقے کے مخطوطات کا ایک مجموعہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانے کو دیا ہے۔ ان کتب کی تعداد ایک سو ساٹھ ہے.

مآخذ: عام تصانیف: (۱) نور اللہ بن شریف الشُشتری: مجالس المؤمنین (مجلس دوم الخ)؛ (۲) علی محمد خان: مرآت احمدی، بمبئی ۱۳۰۷ء، ۲: ۸۷؛ (۳) A. K. Forbes: *Ras Mala or Hindoo Annals of the Province of Goozerat*، ۱: ۳۳۳ تا ۳۴۴ (لنڈن ۱۸۵۶ء)؛ (۴) *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۹، بمبئی ۱۸۹۹ء، حصّہ ۲: ص ۲۴ ببعد؛ (۵) D. Menant: *Les Bohoras du Guzarate*، در *RMM*، ۱: ۴۶۵ ببعد؛ نیز رک بہ (۶) مقالات ''فاطمیہ''، ''اسمٰعیلیہ'' اور ''قاضی نعمان''؛ (۷) زاهد علی کی

کتاب مذکور بالا؛ (۸) The : Sh. T. Lokhandwalla Bohoras, a Muslim Community of Gujarat، در St. Islamica، ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۷ تا ۱۳۰؛ (۹) عباس حسین الحَمْدانی : The Ismaili Da'wa in Northern India، قاهره ۱۹۵٦ء .

تاریخ دعوت : ابھی تک بوھروں کی علمی طرز پر کوئی مفصّل تاریخ نہیں لکھی گئی پھر بھی ایک عربی تصنیف، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی، دیکھنا چاہیے یعنی مُنتزع الأخبار (۲ جلد، دیکھیے W. Ivanow : Guide عدد ۳۳۰)، جس پر ایک گجراتی تصنیف کی بنیاد رکھی گئی ھے، جو عربی رسم الخط میں سنگی طباعت پر ہوئی: موسم بہار فی اخبار الدّعاۃ الأخیار، ۳ جلد از (میاں صاحب) محمد علی بن جیوا بھائی، بمبئی، بدون تاریخ .

اسمٰعیلی دعوت پر ادب کا بیشتر حصہ ابھی تک طبع نہیں ھوا، لیکن W. Ivanow نے اس کا ذکر کر دیا ھے (کتاب مذکور مع اضافه از Paul Krons در REI، ۱۹۳۲ء، ص ۳۸۳ تا ۴۰۹)۔ مزید مآخذ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے : A. A. A. Fyzee : Materials for an Ismaili Bibliography، ۱۹۲۰ - ۱۹۳۴ء، در Journal of Bombay Branch of the Royal Asiatic Society، ۱۹۳۵ء، ص ۵۹ تا ٦۵ اور مجلّهٔ مذکوره، ۱۹۴۰ء، ص ۹۹ تا ۱۰۱ ۔ بعض اهم مُتون حال هی میں ڈاکٹر محمد کامل حسین نے طبع کر کے شائع کیے ھیں (قاھرہ) .

فقه : القاضی النّعمان [بن محمّد] : دَعائم الاسلام، ج ۱، طبع آصف فیضی، قاھرہ ۱۹۵۱ء، اس کی دوسری جلد بھی [چھپ چکی ھے، نیز دیکھیے وھی مصنّف : کتاب الاقتصار، طبع بمحمد وحید میرزا، دمشق ۱۹۵۷ء] .

(آصف فیضی)

بُوَیْه (بنو) : ان تمام حکمران خاندانوں میں اهم‌ترین خاندان، جنھوں نے پہلے ایران کی سطح مرتفع اور پھر عراق میں، خراسان اور ماوراء النّهر کے سامانیوں کے دوش بدوش حکومت کی اور جو ابتدائی اسلام کے عرب اقتدار اور پانچویں صدی هجری/ گیارھویں صدی عیسوی کی ترکی فتوحات کے درمیانی عهد میں بقول منورسکی ''ایرانی غلبے'' (Iranian Intermezzo) کی نشان دہی کرتے ھیں۔ اس خاندان کا نام بُوَیْه یا بُوْیَه سے مآخوذ ھے، جو ان تین بھائیوں کے والد کا نام تھا جو اس خاندان کے بانی ھیں ۔ ان تینوں بھائیوں کے نام یه ھیں : علی، الحسن اور سب سے چھوٹا احمد ۔ یه لوگ دَیْلَمیوں [رَكَ بآں] کی آبادی میں شامل تھے، جنھوں نے نیا نیا اسلام (شیعی) قبول کیا تھا اور ان دنوں بڑی تعداد میں مشرقی مسلمان افواج میں، جن میں خلیفه کی فوج بھی شامل تھی، بھرتی کیے جا رہے تھے .

کسی حد تک یه دیلمی هی تھے جنھوں نے بویہیوں کی آمد پر اقتدار حاصل کیا اور نظام حکومت پر اپنا رنگ چڑھا دیا ۔ جو دیلمی دَیلَم میں رہ گئے انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لیں، جو بعض اوقات پھیل کر آذربیجان تک پہنچ گئیں، لیکن جو دیلمی ایران اور عراق میں تھے انھوں نے ترقی کر کے ایک اهم سیاسی حیثیت حاصل کر لی ۔ بُوَیہی شروع میں تو اپنے ایک هم وطن ماکان بن کاکی کے پیرو رہے، جو سامانیوں کا ملازم هو گیا تھا، اور پھر ان کے گیلانی حلیف مرداویج [رَكَ بآں] کے ساتھ مل گئے تاکه دونوں مل کر اپنے مشترک دشمن، طبرستان کی زیدی ریاست (جو کبھی رےّ تک پھیلی ہوئی تھی) سے مقابله کریں ۔ یه لوگ اس وقت بھی اسی گیلانی مَرْداویج کے تابع تھے جب اس نے وسطِ ایران میں اپنی ایک وسیع خود مختار

ریاست قائم کی لیکن کچھ عرصے بعد انھوں نے اس کے ساتھ کسی قدر سرکشانہ رویہ اختیار کیا ۔ جب علی کچھ دن کے لیے اصفہان کا مالک ہوا اور پھر مستقل طور پر فارس کا حکمران ہو گیا تو اس نے مَرْداوِیج کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کے لیے، باوجود شیعہ ہونے کے، خلیفہ کی منظوری حاصل کر لی کہ اس صوبے پر اس کی حکومت قائم رہے گی ۔ خلیفہ نے آسانی سے یہ منظوری اس لیے دے دی کہ عباسی لشکر میں اسی صوبے کو دوبارہ فتح کرنے کی قوت نہیں تھی ۔ علی اس وقت بھی اس صوبے پر قابض تھا جب ۳۲۳ھ / ۹۳۴ء میں مَرْداوِیج قتل ہوا ۔ بویہیوں کا سب سے بڑا بھائی علی، سامانیوں کے حلیفوں یا ان مختلف قبائل سے جن کا خلیفہ پر اثر تھا، لڑائیاں لڑتا رہا [رَكَ بہ عمادالدّولۃ، معزّالدولۃ اور رکن الدولۃ] اور اس نے صوبۂ فارس پر اپنا قبضہ قائم رکھا ۔ اس کے بھائی الحسن نے سارے الجبال پر اپنا قبضہ جما لیا اور سب سے چھوٹے احمد نے ایک طرف تو کرمان پر اور دوسری طرف خوزستان پر قبضہ کر لیا ۔ ان مستحکم قلعوں پر اور بالخصوص مؤخّرالذکر مقامات پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے بویہی دوسری جماعتوں کے ساتھ حصول اقتدار کی اس کشمکش میں شریک ہو گئے جو عراق اور دیگر ممالک خلافت میں، جو یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی امیرالامرا کے زیر انتظام چلے آ رہے تھے، چل رہی تھی ۔ اس بات کا پتا دقیق مطالعے ہی سے چل سکتا ہے کہ ان سازشوں اور بغاوتوں کے موقع پر جن کا سلسلہ ہر طرف جاری تھا بویہی کسی خاص فرقے کے ساتھ اتحاد رکھتے تھے یا نہیں ۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو احمد ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں بغداد میں داخل ہو گیا اور جو نظام حکومت اس نے وہاں قائم کیا وہ ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء تک چلتا رہا ۔ اس دور جدید کا افتتاح ناموں کے فوری تغیّر سے ہوا ۔ احمد، علی اور الحسن نے خلیفہ سے علی الترتیب معزّالدولۃ، عمادالدّولۃ اور رکن الدولۃ کے القاب حاصل کر لیے اور آئندہ تاریخ میں وہ انھیں القاب سے مشہور ہوے ۔ کچھ عرصے بعد عماد الدّولۃ (علی) کی وفات ہو گئی، چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے فارس کا فرمان‌روا اس کا بھتیجا عَضُدُ الدّولۃ ہوا جو رکن الدّولۃ (الحسن) کا بیٹا تھا ۔ جب معزّالدّولۃ (احمد) کی وفات کے بعد رکن الدولۃ (الحسن) کا بھی انتقال ہو گیا (۳۶۶ھ / ۹۷۷ء) تو عَضُدُالدّولۃ سارے خاندان بویہ کا سردار قرار پایا ۔ اس نے اپنے بھتیجے عزّالدولۃ بختیار کو عراق کی حکومت سے برطرف کر دیا اور فقط اپنے بھائی مؤیّد الدّولۃ کو ایران کے باقی‌ماندہ حصے پر، جو بویہیوں کے زیر اقتدار تھا، حکومت کرنے کی اجازت دی، اس لیے کہ اسے اس کی وفاداری پر اعتماد تھا ۔ عَضُدُ الدّولۃ نے، جو خاندان بویہ کی سب سے ممتاز اور نمایاں شخصیت ہے، خاندان میں مکمّل اتفاق اور اتحاد قائم کیا [دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۸ء].

عراق کے باہر جو جدید ولایتیں بنیں ان سے صرف ولایتوں کی اس تعداد ہی میں اضافہ ہوا جو ایک صدی سے مملکت عبّاسیہ کے اندر پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں ۔ عراق کی ولایت نے، جو بویہیوں کے تحت تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ خلافت عباسیہ کی اس آخری مستحکم پناہ‌گاہ میں حکومت کا وہی طرز جاری رہنے دیا جو دیگر مقامات پر مقبولیت حاصل کر چکا تھا، لیکن اس ولایت عراق کو ایک اہم خصوصیت یہ بھی حاصل تھی کہ بغداد خلافت کا مرکز تھا ۔ یہ سچ ہے کہ بویہیوں نے اس پر قبضہ کر کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ان حالات پر مُہر توثیق ثبت کر دی جن کی بدولت خلافت عملاً ان فوجی سپہ سالاروں کے

زیرِ اقتدار جا چکی تھی جنھیں ترقی دے کر امیرالامرا بنا دیا گیا تھا، لیکن اس صورت میں یہ فرق البتہ تھا کہ وہ شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور اس لیے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ آیا وہ ایسی خلافت کو ختم کرنے کے خواہاں نہ ہوں گے جس کا جواز ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس طرح کی کوئی بات پیش نہیں آئی۔ بلاشبہہ معزّالدولۃ جانتا تھا کہ شیعہ اقلیت میں تھے اور یہ کہ اگر اس نے خلافت کو بغداد میں ختم بھی کر دیا تو وہ کسی اَور جگہ نمودار ہو جائے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اپنے اقتدار میں رکھا جائے تاکہ اس کی ولایت میں جو سنّی ہیں ان پر اس کے اقتدار کا جواز باقی رہے اور دوسرے بیرونی دنیا سے اس کے سیاسی تعلقات مضبوط ہو جائیں، اس لیے کہ سنّی حکمرانوں کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اخلاقی اعتبار سے ان کا اقتدار تسلیم کیا جاتا تھا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ خلافت ہی نے بویہیوں کو ان کی سرکاری حیثیت عطا کی تھی اور انھوں نے اپنا ظاہری طرزِ عمل ہمیشہ ایسا رکھا جیسے وہ سچے دل سے خلافتِ عبّاسیہ کے جواز کو تسلیم کرتے تھے۔

اُس کے علاوہ خلافت کے ساتھ بویہیوں کے تعلقات کی بنیاد ان کے مذہبی عقائد پر بھی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بویہی زیدی تھے اس لیے کہ دیلم انھیں زیدیوں کے داعیوں کا میدان رہ چکا تھا جنھوں نے طبرستان میں اپنے سیاسی اثرات اور اپنے قوی حلقے قائم کر رکھے تھے اور ادھر خود دیلم کی عین سرحدوں پر ان کے حریف الأُطْرُوش [رَكَ بآن] کے کارندوں نے ۹۰۰ء کے قریب اپنا حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا۔ تاہم دیلم میں اسمٰعیلی بھی تھے (مِسْکویہ، ۲ : ۳۲ تا ۳۰) اور اطروش یا اس کے جانشینوں کے حلقۂ متبعین میں اثناعشری بھی موجود تھے، اور مَرْداویج، شاید اسمٰعیلی پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر، سامانی سنّیوں کے ساتھ مل کر طبرستان کے زیدیوں سے لڑا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ابھی اثناعشری عقائد کی تبلیغ کا آغاز ہی ہوا تھا اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ متأخّر بویہی معاشرے پر زیدی عقائد اور معتزلی اثرات اتنے نمایاں تھے، لیکن بویہی فاتحین سیاست کو مذہب پر ترجیح دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ معزّالدولۃ کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ خلافت کو اپنے لواحقین میں سے ایک شخص زیدی علوی کے سپرد کر دے، لیکن محض اس خوف سے کہ اگر اسے خلیفہ بنا دیا گیا تو اس کی اطاعت مذہبًا واجب ہو جائے گی اس کے بعد یہ خیال اس کے دل میں پھر کبھی پیدا نہیں ہوا۔ شیعوں کی مختلف شاخوں کا باہمی فرق اب تک زیدی ریاستوں کے باہر (بہ استثنائے جماعت اسمٰعیلیہ) واضح اور معیّن نہیں ہوا تھا اور اثناعشری میلان، عراق میں اور غالبًا وسطِ ایران میں یقینی طور پر شیعیت کا غالب میلان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سلطنت کا اختیار بویہیوں کے قبضے میں آ رہا تھا (اور کیا یہ محض اتفاقی بات تھی؟) تو یہ عقیدہ عام ہوتا جا رہا تھا کہ اس عہد کے بعد جس میں اماموں میں سے کوئی امام بذات خود موجود ہو اور اس کے آگے کے عہد کے بعد جس میں اس کا وکیل اس کی جگہ کام کر رہا ہو ایک زمانہ غیبوبت کبرٰی کا آئے گا جس میں اماموں یا ان کے وکیلوں میں سے کسی کے متعلق کوئی علم نہیں ہوگا۔ اس لیے اگرچہ عباسی خلیفہ شیعیوں کے نزدیک صحیح معنوں میں برحق نہیں بھی تھا لیکن شیعی مذہب سے رواداری برتتا تھا تو کم از کم اس کی خلافت کو برداشت کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا [اگرچہ بویہیوں نے بلا امتیاز شیعیوں اور معتزلیوں کو اپنے اندر قبول کیا، لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اثناعشری رہے]۔

فرمانروایان بنو بویه

۴۴۷ بغداد پر طغرل بیگ کا قبضہ اور الملک الرحیم کی اسیری

۴۴۸ . [فَضْلُوْیہ کا قبضہ]

عراق اور فارس کے متحد رہنے کا زمانہ : ۳۶۷ تا ۳۷۲ھ؛ ۳۷۶ تا ۳۷۹ھ؛ ۳۸۸ تا ۴۰۱ھ اور ۴۳۵ تا ۴۴۷ھ .

عراق اور کرمان کے متحد رہنے کا زمانہ : ۳۳۴ تا ۳۵۶ھ اور ۳۸۰ تا ۳۸۸ھ .

کرمان اور فارس کے متحد رہنے کا زمانہ : ۳۳۸ تا ۳۶۷ھ (۳۷۲ھ تک عراق کے ساتھ متحد رہا) ؛ ۳۸۰ تا ۴۰۳ھ، ۴۱۹ تا ۴۴۰ھ .

کرمان سب سے الگ رہا : ۴۰۳ تا ۴۱۹ھ اور ۴۴۰ تا ۴۴۸ھ .

عراق سب سے الگ رہا : ۳۳۴ تا ۳۶۷ھ؛ ۳۷۹ تا ۳۸۰ھ؛ ۴۱۶ تا ۴۳۵ھ .

فارس سب سے الگ رہا : ۳۲۲ تا ۳۳۸ھ؛ ۳۷۲ تا ۳۸۰ھ .

عراق، فارس اور کرمان کے مابین اتحاد رہا : ۳۶۷ تا ۳۷۲ھ؛ ۳۸۸ تا ۴۰۳ھ؛ ۴۳۵ تا ۴۴۰ھ .

الجبال، اس خاندان کے ابتدائی دور سے قطع نظر، ہمیشہ سب سے الگ رہا .

عُمان ہمیشہ فارس سے متحد رہا، سوائے اس مختصر مدت کے جب یہ بعہدِ صمصام الدولۃ عراق سے متحد ہو گیا تھا.

بصرہ اور اھواز، عضدالدولۃ کے بعد، اکثر عراق سے الگ رہے یا سلطنت عراق کے قلب میں ان کی خود مختار حکومت قائم رہی؛ بسا اوقات انھیں سلطنت فارس میں شامل کر لیا گیا .

مکمل شجرۂ نسب کے لیے دیکھیے زمباور Zambaur، ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ و Q .

بویہیوں نے کبھی یہ منصوبہ نہیں بنایا کہ شیعہ سنیوں پر ظلم و ستم کریں - یہ دونوں فرقے ان کی فوج میں شامل تھے اور در اصل ان کی خواھش یہ تھی کہ شیعیت نہ صرف اس بنا پر بویہیوں کی مرھونِ منّت ہے کہ انھوں نے اسے ایک تنظیم کی صورت دی بلکہ انھوں نے کسی حد تک ان کے عقائد کا ایک ڈھانچا بھی تیار کیا - دولت‌مند شیعیوں اور ''شریفوں'' کو عباسی عہد کے آخری دنوں میں جو اھمیت حاصل ھوئی اس کا علم سب کو ہے -

یہی دو جماعتیں تھیں جن پر، فوج سے قطع نظر، بویہی حاکموں اور مقامی آبادی کے معاشری روابط کا انحصار تھا - اس نظامِ حکومت نے علویوں، یا جیسا کہ انھیں عام طور سے کہا جاتا ہے، طالبیوں کو ایک ایسی مستقل منظّم جماعت بنا دیا جو عبّاسیوں کی ہم پایہ ھو، حالانکہ اس سے پہلے یہ خاندان عبّاسیوں کے بڑے خاندان کا محض ایک جز تھا اور عبّاسیوں کو اس پر ایک طرح کا غلبہ حاصل تھا - عقائد کی سطح پر، اول تو اس وجہ

سے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی تک خود اماموں کی موجودگی اور اس حقیقت نے کہ اثنا عشری مدت دراز سے ایک منفیانہ انداز میں شیعیوں میں ایک ایسی جماعت بن کر رہ گئے تھے جس نے کسی عملی بغاوت میں حصّہ نہیں لیا تھا علماے حدیث و نظریات کے کام میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی ۔ بویہیوں نے آکر اس ضائع کردہ وقت کی تلافی کر دی ۔ الکُلینی [رَكَ بآں] تو، جسے فقہاے شیعہ میں پہلا بڑا عالم مانا گیا ہے اور جسے اثنا عشریوں نے خاص طور پر اپنا عالم تسلیم کیا ہے، بویہی اقتدار کے شروعؑ ہی میں ایران میں وفات پا چکا تھا، لیکن دوسری اس سے زیادہ اہم شخصیت ابن بابَوَیْه (بابُوَیه) [رَكَ بآں] کی تھی، جس نے اس صدی کے تیسرے ربع میں الکُلینی کی جگہ سنبھالی ۔ بویہیوں نے اس کے کام کی بڑی حوصلہ افزائی کی ۔ اس کے بعد اور شیعی علما بھی جن میں علویوں کے قدیم مرکز قُم کے رہنے والے عرب بھی شامل تھے اور جن کی اہمیت ایرانی شیعیت میں بھی مسلّم ہے بغداد میں دو بھائی الرَّضی اور المُرْتَضی شریف تھے ۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں شہر کے اصلی مالک تھے اور بویہیوں، خلیفہ اور عوام کے درمیان واسطے کی حیثیت رکھتے تھے اور علاوہ بریں شیعیوں میں محدّث اور فاضل کی حیثیت سے بھی بزرگ سمجھے جاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت جب کہ سنّی اپنے چار مسلکوں (مذاہب اربعہ) کو مسلم مسلک تسلیم کرانے پر زور دے رہے تھے یہ دونوں بھائی اس بات کے خواہشمند تھے کہ شیعیت کو بھی ایک پانچویں مسلم مسلک کی حیثیت سے امت کے نظام میں داخل کر لیا جائے ۔ بویہی نظام حکومت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان مذہبی رسوم کی تشکیل یا تائید ہے جو آج تک شیعیت کی خصوصیات چلی آتی ہیں ۔ شاید دیلمیوں کے رواج سے متأثر ہو کر معزّالدولة نے ''عاشوراء'' کے ماتم کی رسم کھلم کھلا جاری کی یا اسے ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ۔ اسی نے عید ''غَدیرِ خُم'' کی بنا بھی ڈالی ۔ علوی مشہدوں کو آراستہ اور مزّین کیا گیا اور عضدالدولہ وہاں دفن ہوا ۔ شیعی مدرسے بنائے گئے، مثلاً وزیر سابور کا دارالعلم، جس کے لیے اوقاف قائم کیے گئے، جو فاطمیه یونیورسٹی [الازہر] (۳۹۳ھ / ۹۹۳ء) کی نقل تھا اور سلجوقیوں کی سنّی ''نظامیہ'' یونیورسٹی سے کہیں پہلے بنایا گیا تھا ۔ مسجدوں میں شیعی طریقے سے عبادت کی جانے لگی اور اذان کا بھی وہی طریقہ جاری کیا گیا ۔

حالات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ تسلیم شدہ خلیفہ مؤثر انداز میں حکومت کر سکے ۔ ناصرالدولة کے لقب کی طرح، جو ہمدانیوں کو دیا گیا تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا لقب تھا، بویہیوں کے القاب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے اقتدار کو قانونی حیثیت خلیفہ ہی کے حکم سے حاصل ہوتی تھی لیکن در حقیقت عملی طور پر سارا اقتدار انہیں کے ہاتھ میں تھا ۔ خلیفہ المُستَکفی، جس نے ان کا خیر مقدم کیا، ان سے پہلے اور بہت سوں کو اقتدار میں اپنا شریک کر چکا تھا ۔ اس کے بعد اس کا جانشین اس کا ذاتی دشمن المُطیع ہوا، جسے خود انیس سال کے بعد اپنا تخت الطّائع کو دینا پڑا، اس لیے کہ معزّالدولة کے وارثوں کی باہمی جنگ میں وہ غلط فریق کی حمایت کر بیٹھا تھا ۔ الطّائع کو بھی آگے چل کر القادر کے لیے تخت چھوڑنا پڑا، لیکن بویہیوں کے عہد میں، جس میں ایک صدی کے اندر تین سے اوپر حکمرانوں نے حکومت کی، خلفا کی مدّت خلافت اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں خاصی طویل رہی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی حکومت

برائے نام تھی، رہے القاب تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ جوں جوں ان کی قدر گھٹتی گئی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، چونکہ خاندان شاہی کا ہر ایک شہزادہ اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے خاندانوں کا ہر ایک شہزادہ لقب کا دعویدار بن گیا، اس لیے اس کی ضرورت آ پڑی کہ بویہیوں کے سب سے بڑے سردار کو دو دو لقب بلکہ بعد میں تین تین لقب تک دیے جائیں، مثلاً عَضُدالدّولة کا لقب تاج المِلّة وغیرہ بھی تھا ۔ بویہیوں کا آخری حکمران تو اس میدان میں اتنا آگے نکل گیا کہ اس نے اپنے لیے ایسا لقب اختیار کر لیا جس کا آخری لفظ ''دین'' تھا ۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا اور اس میں ایک ایسا پہلو مضمر تھا کہ خلیفہ اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا ۔ اسی طرح عَضُدالدولة کے بعد سے یہ دستور ہو گیا کہ جو شہزادہ اقتدار میں سب سے بڑا ہوتا تھا وہ ''امرا'' پر اپنی فوقیت جتانے کے لیے اپنے آپ کو ''مَلِک'' کہتا اور کہلواتا تھا، یہاں تک کہ ایران میں تو اس نے ساسانیوں کا قدیم لقب شاهنشاه اختیار کر لیا تھا اگرچہ عراق میں ایسا نہیں ہوا ۔

جہاں تک اقتدار کے عملی پہلو کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ بات خصوصیّت سے توجه طلب ہے کہ بغداد میں حکومت کا کوئی ایسا ادارہ باقی نہیں رہا تھا جو اپنے قیام کے لیے قانونی اعتبار سے بھی خلیفہ پر انحصار رکھتا ہو ۔ اگرچہ تھوڑے زمانے تک، ناصرالدّولة کے عہد میں، یہ صورت قائم رہی ۔ ہر چیز اور خصوصیّت سے وزارت کی حیثیت ایک ایسے ادارے کی تھی جس کا ''امارت'' سے براہِ راست تعلق تھا، حالانکہ اس تغیر سے فرائض کی تقسیم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ۔ اگر تعیین مقام کیا جائے تو کہا جائے گا کہ بغداد میں ہر چیز اس وقت دارالمملکة (دیکھیے بیان آئندہ) کی تحویل میں تھی ۔ اس زمانے کے دوران میں کہ جب وزارت یا امارت کو، نظام حکومت (خلافت) کی طرف سے کسی حد تک ثبات اور استقلال عطا ہوا بویہیوں کے وزیروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اقتدار میں خلافت کے بڑے سے بڑے وزیر سے بھی کسی طرح کم نہ تھے اور وہ اپنے عہدے پر بھی زیادہ مدّت تک فائز رہتے تھے ۔ انھیں وزیروں میں سے معزّالدّولة کے تحت المُهَلّبی، رُکنالدّولة کے تحت ابن العَمِید، مؤیّدالدّولة اور فخرالدولة کے تحت صاحب ابن عَبّاد تھے ۔ یہ تینوں خوب شائستہ اور مہذب ہونے کے علاوہ بڑے مُدَبِّر اور منتظم بھی تھے ۔ پھر بھی بعض بویہی، خُصوصاً عَضُدالدّولة، جو ان سب میں زیادہ عظیم الشان تھا، اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ سلطنت کے محکموں کا آخری نظم و اختیار عملاً اپنے ہاتھ میں رکھیں ۔ عملی اعتبار سے وزیروں کا کام دو یا تین خاص اشخاص کے سپرد کر دیا جاتا تھا، جو کبھی القاب کے ساتھ اور کبھی القاب کے بغیر کام کرتے تھے ۔ بویہی چونکہ عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے اس لیے اقتدار کے پہلے دور میں ان کے لیے صرف یہی ممکن تھا کہ وہ اپنے سے زیادہ قابل وزرا کے کام سے فائدہ اٹھائیں ۔ آخری بویہیوں کے عہد میں وزارت زیادہ کمزور ہو گئی تھی، حالانکہ وزیر اکثر ایک ہی گھرانے کے لوگ ہوتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ خلیفہ کے پاس اب بھی انتظامی اور قضائی محکمے موجود تھے، لیکن یہ محکمے یا تو ایسے امور کے انتظام میں مصروف رہتے تھے جن کا تعلق خاص خلیفہ کی ذات سے ہوتا تھا اور یا امیروں کی طرف سے بین الاقوامی خط و کتابت کا کام انجام دیتے تھے ۔

خلیفہ کے فرائض یہ تھے کہ مال و متاع اور

سامان کا انتظام کرے اور محل کا نظم و نسق درست رکھے ۔ اپنی ذات اور محل سے باہر خلیفہ کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ خیراتی کاموں کی نگرانی کرے اور سنیوں کی شرعی اور مذہبی زندگی کی دیکھ بھال کرے ۔ شہر بغداد کے انتظام میں بھی اس کی تھوڑی سی اخلاقی ذمے داری تھی ۔ خلیفہ کی آمدنی، خاندانی اور ذاتی ذرائع سے الگ، اب وہ نہیں تھی جو وہ پہلے حکومت کے مالیے میں سے اپنے لیے علیحدہ رکھ لیا کرتا تھا، اس لیے کہ اب اجرتوں اور تنخواہوں کا فیصلہ خلیفہ کے ہاتھ میں نہیں تھا ۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ ناصرالدولہ کے زمانے میں تھا، امیر خزانۂ عامہ سے کچھ رقم اسے جیب خرچ کے طور پر دے دیا کرتا تھا حالانکہ پہلے زمانے میں خزانے کا سارا اختیار اسی خلیفہ کو حاصل تھا ۔ خلیفہ کو جو کچھ اب ملتا تھا وہ پہلے کے مقابلے میں تو کم تھا لیکن اب بھی وہ اس کی شان اور مرتبے کے مناسب تھا، یعنی بویہیوں کے ابتدائی حکمرانوں کے عہد میں اس کی مقدار دو لاکھ یا تین لاکھ دینار تھی ۔ وہ کثیرالتعداد تحائف جو اسے ساری اسلامی دنیا اور خارجی سلطنتوں کے سفیر دیا کرتے تھے اور وہ رقم جو اسے بویہیوں سے تیوہاروں اور سرکاری تقریبوں پر ملتی تھی اس کے علاوہ تھی، لیکن اس کے مقابلے میں چندوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو سخت ملکی ضرورتوں کے وقت بویہی اس سے زبردستی وصول کر لیا کرتے تھے ۔ خلیفہ کے شرعی اور مذہبی اختیارات میں یہ چیزیں داخل تھیں : مسجدوں کے اماموں اور خدام کا تقرر اور نگرانی، خاص طور سے بغداد میں جہاں خلیفہ القادر نے اپنی بےبسی اور بےاختیاری کی کمی اس طرح پوری کی کہ بویہی حکومت کی مرضی کے خلاف سنی رسوم و قانون کو زبردستی رائج کرنے کا حکم نافذ کیا ۔

حکومت کے خلافت کے ہاتھ سے نکل کر امارت کے ہاتھ میں چلے جانے سے حکومت کے طور طریقے میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ عملاً بویہی حکومت نے سلطنت پر پورا عسکری تسلط اور اقتدار قائم کر دیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ انتظام عامہ کے عام فرائض کا ادا کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے اس عسکری اقتدار کے معنی یہ ہوے کہ ایک لحاظ سے فوجی اختیار اور اقتدار ان محکموں میں بھی دخل‌انداز ہوگیا جو پہلے اس کے احاطۂ اقتدار سے باہر تھے ۔ تبدیل شدہ صورت حال میں سب سے زیادہ خطرناک نتائج ''اِقْطاع'' [رَكَ بآں] کے نظام میں پیدا ہوے ۔ مدت دراز سے وفادار حامیوں اور پھر زیادہ کثرت کے ساتھ فوجی سرداروں کو خلیفہ انعام کے طور پر سرکاری زمینوں کا ایک حصہ عارضی طور پر دے دیا کرتا تھا، لیکن تقریباً پچھلی ایک صدی سے انعام کا یہ ذریعہ مسدود اور ناکافی ہو گیا، اس لیے اعلٰی فوجی افسروں کو کبھی کبھی یہ اختیار دے دیا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص علاقے سے محصول وصول کر لیں ۔ اس رعایت کے بدلے میں انھیں حکومت کے خزانے میں اسلامی عُشر [رَكَ بآں] کے سوا اَور کچھ داخل نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ بویہی نظام نے حمدانیوں کا اتباع کرتے ہوے اس طریقے کو زیادہ وسعت دی اور اس رواج کو سختی سے جاری کیا ۔ بہت سے اضلاع اسی نئی نوعیت کے ''اقطاعات'' کی صورت میں باقاعدہ تقسیم کیے جانے لگے اور اب عُشر ادا کرنے کی شرط بھی اٹھا دی گئی ۔ مِسْکَوَیہ اور اس سے پہلے ثابت بن سِنان نے اس نظام کے کچھ نتائج کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ مرکزی نظم و نسق کے نقطۂ نظر سے اس کے معنی یہ تھے کہ ملک کے ایک حصے میں مالی معاملات طے کرنے کا اختیار حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا، اور اس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ

حکومت کو اس کا علم بھی نہیں رہا کہ کس طرح کا لگان اور کتنا لگان وصول کیا جاتا ہے۔ اگر متفرق اضلاع کی مالی قیمت کا اندازہ سرسری طور پر ممکن بھی ہو تو یہ اندازہ کرنا اب دیوان الخراج کے دائرۂ عمل میں نہ تھا، بلکہ فوجی لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ جب "دیوان الخراج" نے دیکھا کہ اس کے بہت سے فرائض اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو اس نے اپنے عملوں اور شعبوں کی تعداد میں کمی کر دی، لیکن بویہیوں کے یہ "اقطاعات" بطور جاگیر نہیں دیے جاتے تھے، بلکہ انھیں تنخواہوں کا بدل سمجھا جاتا تھا۔ اگر صاحبِ اقطاع کو اپنے ضلع سے مقررہ رقم وصول ہونے کی توقع نہ ہوتی یا کوئی اور معقول سبب ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے یا حکومت کی اجازت سے اس کا کسی اور سے مبادلہ کر سکتا تھا۔ یوں اقطاعی ضلع سے اس کا کوئی مستقل تعلق نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس عارضی ملکیت کی ترقی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس عارضی ملکیت کو محض مستقل جائداد بنانے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا، لیکن ابھی تک یہ لوگ صوبائی حکومت کے اقطاع پر قابض نہیں تھے۔ اگر وہ کسی وقت اس طرح کے فرائض انجام دیتے تو اس کا معاوضہ انھیں معمول کے مطابق مل جاتا۔ وہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ اقطاع کی آمدنی سے فوجیں رکھیں۔ ہر سپاہی کو اس کی تنخواہ براہ راست خزانۂ عامّہ سے ملتی تھی خواہ وہ کسی شکل میں ملے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ تنخواہ کا ایک غیر معینہ حصّہ ابھی تک جنس کی شکل میں ملتا تھا اور زمین کے ایک حصّے کا انتظام اب بھی پرانے طریقے کے مطابق سرکاری عہدیدار ہی کرتے تھے، جیسا کہ اس عہد کی حساب کتاب کی ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔

ان تحفّظات کے ساتھ، معاشری اور اقتصادی حیثیت سے فوجی افسروں پر مشتمل ایک نیا اور زیادہ طاقت‌ور طبقۂ شرفا، متوسّط طبقے کے لوگوں، بڑے تاجروں، شہری زمینداروں اور اعلٰی افسروں کے اس بر سرِ انحطاط طبقۂ شرفا پر غالب آتا جا رہا تھا جو عباسیوں کے عہد اقتدار میں اپنے انتہائی عروج پر تھا، لیکن بویہیوں کے بڑے حکمرانوں کے عہد میں امرا نے اس نوخیز طبقے پر نمایاں اقتدار حاصل کر لیا اور اس بات کو بڑی اہمیت دی کہ یہ نیا طبقۂ شرفا شُرطہ (= پولیس)، امنِ عامّہ (حِمایہ) اور محاصِل پر بھی ان کے اقتدار کو پوری طرح تسلیم کرے۔ ان حالات میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ لگان کے معاملے میں کوئی رعایت کی جائے، اس لیے کہ فوجوں کے اخراجات کا انحصار انھیں لگانوں پر تھا۔ اس اصول کا اطلاق تنخواہ اور اقطاع پر یکساں ہوتا تھا۔ لگان ادا کرنے والوں کے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لگان کون وصول کرتا ہے۔ نامور بویہی وزیروں نے فتوحات کے اس دور کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ ملک میں صحیح نظم و نسق قائم کریں۔ اس دور میں جہاں نئے محصول لگائے گئے وہاں بعض محصول معاف بھی کیے گئے۔ ابتدائی بویہی حکمرانوں کے زمانے میں سکّے کی حالت بھی مستحکم تھی، لیکن ساتھ ہی اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب عَضُدالدّولۃ کے جانشینوں نے کپڑا بُننے والوں پر محصول لگانے کی کوشش کی، جن کی صنعت پر بغداد میں رہنے والے ہزاروں کاریگروں کی روزی کا انحصار تھا، تو بغداد میں شورشیں اور ہنگامے ہوئے۔ ان بویہی حکمرانوں کے عہد میں سلطنت کی مالی آمدنی اس آمدنی سے کسی قدر زیادہ

تھی جو خلافت کے تحت اتنے ہی رقبے سے حاصل ہوتی تھی - جہاں تک زراعت کا تعلق ہے ان شورشوں اور فسادوں سے جو بویہیوں کی فتح کے پہلے واقع ہوے تھے آبپاشی کے نظام میں بہت خلل آ گیا تھا - ان ذمےداریوں کے علاوہ اس نظام کی درستی اور مرمت اور جدید نہریں بنانے کے کام کا بوجھ بھی بویہی حکومت کے سر پر پڑا - انھوں نے ان سڑکوں اور پلوں کو بھی نئے سرے سے درست کیا جن کے راستے تجارتی آمد و رفت ہوتی تھی، اور بغداد، شیراز اور اصفہان کے شہروں کو حکمرانوں کے وہاں موجود رہنے کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچا - انھوں نے ان شہروں میں شاندار محل بنوائے - مشرقی بغداد میں ان تمام عمارتوں کا مجموعہ بجاے دارالخلافة کہلانے کے دارالمملکة کے نام سے موسوم ہوا - شیراز کے شہری دروازوں پر کُرد فنا خُسرو کے پاس عضدالدّولة نے جو عمارتیں بنائیں انھیں دیکھ کر المُقدّسی وجد میں آ گیا - عراق اور فارس کے قریبی ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی طریقوں کو فارس میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان دونوں میں انتظامی اتحاد کبھی نہ ہو سکا - یہ ارتباط، جس سے ممکن ہے مقامی صنعتوں کو کچھ فائدہ پہنچا ہو، اس ارتباط سے بالکل مختلف تھا جو اس عہد کے پہلے اور اس کے بعد پیدا ہوا اور جس نے عراق اور ایران کے باہمی ارتباطات کا رخ وسطی سطح مرتفع کے پار خراسان کی طرف پھیر دیا۔

ثقافتی اعتبار سے شروع کے بویہی تعلیم سے بےبہرہ اور ناتراشیدہ تھے، لیکن ان کے اخلاف نے ایرانیوں کے تہذیبی اثرات قبول کیے - سامانیوں کے قدیم ایران کے مقابلے میں وہ ایران جو بویہیوں کے زیر اقتدار تھا ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے عرب اثرات کا نمونہ معلوم ہوتا تھا - ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شروع کے بویہیوں کو، جن کے وزیر ابن العَمِید اور ابن عَبّاد تھے، عربیت کے اسی رجحان کی بدولت اس عہد کے دو معروف فاضلوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا - اس کے علاوہ ان کے دربار میں عربی شعرا کا ایک جمگھٹا تھا - بویہیوں ہی کے زمانے میں ابوالفَرَج الاِصْفہانی نے کتاب الاغانی اور ابن النّدیم نے الفہرست تصنیف کی جو عربی ادب کے دو بیش بہا خزانے ہیں - گو ابو اسحاق الصّابی کو عَضُدالدّولة کے خلاف شکایتوں کا موقع ملا تھا تاہم اس کے پوتے مؤرّخ ہلال الصّابی نے آخری بویہیوں کے زیرِ سایہ بغداد میں آرام و آسایش کی زندگی بسر کی، اور فلسفی اور مؤرّخ مِسکَویہ کی سرپرستی بھی انھیں نے کی - بالعموم بویہیوں نے علما کی قدردانی کی، بالخصوص ان علما کی جن کا علم عملی فوائد کا حامل تھا - اس قسم کے علما میں علوم دینیہ کو چھوڑ کر ذیل کے لوگوں کے نام قابل ذکر ہیں : جغرافیہ‌داں الاِصْطَخْری، ریاضی‌داں ابوالوفاء البوزجانی، النّسَوی جس نے ''اعداد'' کو رواج دیا، وہ ہیئت‌داں جن کے لیے شرف‌الدّولة نے بغداد میں ایک رصد گاہ بنوائی، اطبا (جیسے المَجُوسی) جن کے لیے یہ بات باعث مسرت و فخر تھی کہ عضدالدولة نے ان کے لیے بغداد کے قدیم قَصرالخُلد میں ایک مشہور شفاخانہ قائم کیا اور شیراز میں بھی اسی طرح کا ایک شفاخانہ [رَكّ به بیمارستان] بنوایا - مختلف بویہی حکمرانوں نے شیراز، رَے اور اصفہان میں جو کتب خانے قائم کیے، ان کی تعریف ساری دنیا نے کی ہے - یہ بات سب کے علم میں ہے کہ شمس الدّولة کے عہد میں ابن سِینا نے ایک درسگاہ قائم کی اور ترقی کر کے ایک اونچے منصب (وزارت) پر پہنچا - ان بادشاہوں کے اولو العزم وزیر بھی اپنی فیاضیوں میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تاوقتیکہ انھیں یہ شبہہ نہ ہوتا کہ

جس کی سرپرستی وہ کر رہے ہیں وہ آگے چل کر ان کا حریف بن جائے گا (جیسا کہ ابن عبّاد کے مقابلے میں ابو حیّان التّوحیدی) ۔ ابن البوّاب، جو ایک بلند مرتبہ بویہی تھا، نسخِ خوش‌نویسی کے موجدوں میں سے ایک تھا ۔

بویہیوں اور ان کے وزیروں نے ان روایتی علوم و فنون کی سرپرستی کے علاوہ جن کی نوعیت خالص عربی تھی جدید قسم کے فارسی ادب سے بھی پوری دلچسپی لی ۔ اگرچہ پہلی دیلمی نسل کے لوگ اتنے مہذب نہیں تھے جو اس قسم کا کوئی ادّعا کرتے، لیکن ان کے اخلاف صحیح معنوں میں دیلمی ہونے کی بہ نسبت پوری طرح ایرانی تھے ۔ یہ بات بلا سبب نہ تھی کہ انھوں نے شاھنشاہ کا لقب اختیار کیا، جس کا خواب مرداویجی دیکھا کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنے لیے ایک ساسانی شجرۂ نسب بھی تیار کرایا ۔ اگرچہ ادبی میدان میں ان کے کارناموں کا مقابلہ سامانیوں کے کارناموں سے نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ان کے دربار میں ان کے اپنے فارسی شعرا تھے اور فردوسی کی بہاءالدّولة کے دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ زرتشتی مذھب کا مستقل زوال، جب کہ یہ مذھب بویہی حکومت کے ابتدائی دور میں صوبۂ فارس میں خاصے عروج پر تھا، غالبًا کسی حد تک اسی بات کا نتیجہ تھا کہ آئندہ کے لیے یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ ایک قومی حکومت کے زیر سایہ خود مسلمانوں کے اندر ایک جداگانہ مذھبی حلقہ قائم کیا جا سکے ۔

اگر زیادہ معتبر شہادت میّسر آ سکے تو ممکن ہے یہ ثابت ہو جائے کہ ایرانی فنون کی تاریخ میں بویہی عہد کا مقام بھی خاصا شاندار تھا ۔ ان کی عمارتوں کا ذکر اس سے پہلے کسی اور ضمن میں کیا جا چکا ہے، جن میں عبادت گاھوں کی تعداد محلّوں، قلعوں اور شفاخانوں کے مقابلے بیں بہت کم ہے ۔ حال ھی میں جو کپڑا دستیاب ھوا ہے اس سے اس بات کا امکان ھو گیا ہے کہ ایرانی دستکاری کے اس شعبے کا مطالعہ علمی حیثیت سے کیا جائے ۔ بویہی عہد کے فنون اور صنعت و حرفت پر حال ھی میں ایک کتاب E. Kühnel کی چھپی ہے (دیکھیے مآخذ)، قارئین سے اس کے مطالعے کی سفارش کی جاتی ہے ۔

بحیثیت مجموعی یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دوسرے مقامات کی طرف بویہیوں کے عہد میں بھی علاقائی ولایات کے قائم ہو جانے اور اس طرح جگہ جگہ نئی عدالتیں اور نئے تہذیبی مرکز بن جانے کا نتیجہ یہ ھوا کہ تہذیبی سرگرمیاں اب بغداد کے باھر بھی پھیلنا شروع ھو گئیں ۔ اس وقت تک تو بغداد تہذیب و تمدن کا کم و بیش تنہا ثقافتی مرکز تھا ۔ نیز روحانی زندگی کی ترقی اور اشاعت ھوئی اور اسے مختلف لوگوں کی ضروریات سے مرتبط کر کے اس میں ایک نئی طرح کی توانائی پیدا کر دی گئی۔

بویہیوں کی خارجہ حکمت عملی ان کے عقائد سے بالکل متأثر نہیں ھوئی ۔ چوتھی صدی هجری / دسویں صدی عیسوی میں ایران میں ان کے بڑے بڑے حریف سامانی اور ان کے باجگذار زیاری (مرداویج کے اخلاف) اور صفّاری (سِیستان کے حاکم) تھے ۔ قدرتی طور پر انھوں نے سامانیوں کے مقابلے میں، خراسانی باغیوں خصوصًا سِمجُوریوں کا ساتھ دیا اور اس صدی کے آغاز میں غزنویوں کے عروج اور بالآخر سامانیوں کے قطعی زوال سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ شمال مغرب میں ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ دیلمیوں کے چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر اپنا مبہم سا تسلط قائم رکھیں، تاکہ جب کبھی زیاریوں سے یا کُردوں سے ان کی لڑائی ھو تو یہ خاندان ان کا ساتھ دیں ۔ کردوں سے ان کا مقابلہ دو حیثیتوں سے

تھا : خارجی حکمت عملی کے تحت آذربیجان کی سمت میں اور داخلی امن و امان کے یعنی بہتر نظم و نسق عامّہ کے سلسلے میں ''انجبال'' کے علاقے کی طرف (حسنویہی کرد) ۔ یہی کیفیت ان لڑائیوں کی بھی تھی جو عضدالدولۃ کے عہد کے بڑے حصے میں قفص کے اور کرمان اور مکران کے بلوچوں سے جاری رہیں ۔ اس سلسلے میں آخری کڑی عمان کا قبضہ تھا، جو جنگی اعتبار سے اس علاقے کا نہایت اہم ساحلی مقام تھا ۔ اس پر کبھی فارس کے بویہی قبضہ کر لیتے تھے اور کبھی عراق کے، اور یہ قبضہ اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر ہوتا تھا ۔ بصرے کے بریدیوں کے خاتمے کے بعد عراق عرب میں بویہیوں کی پہلی دو نسلوں کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ پہلے حمدانیوں کو غیر جانب دار رکھیں اور پھر بالآخر انھیں ختم کرنے کی کوشش کریں، جو انھیں کی طرح شیعہ ہونے کے باوجود عرب تھے اور بغداد میں کچھ عرصہ پہلے سے ان کے حریف کی صورت میں سامنے آئے تھے ۔ حالات کا فطری تقاضا یہ تھا کہ عرب کی سرحدوں پر، عراق میں بطیحہ میں اور نیز خلیج فارس میں امن قائم رکھنے کے لیے بحرین کے قرامطہ سے چھوٹے پیمانے پر ایک طرح کی دائمی جنگ جاری رکھی جائے۔

۹۶۸ء میں جب فاطمی [رک بآں] مصر میں اور پھر شام میں نمودار ہوے تو دوسرے دور کے بویہیوں اور ان کے وارثوں کو ایک ایسے مسئلے سے دو چار ہونا پڑا جو پہلے دور کے بویہیوں کے سامنے نہیں تھا ۔ اس نئے خاندان کا دعوی یہ تھا کہ وہ علوی النسل ہیں اور یہ بات شیعیوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ ثابت ہوئی ۔ اس خاندان کے ارادے اقتدار حاصل کرنے کے تھے ۔ اسی ارادے اور دعوے کو تقویت دینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی مملکت میں توسیع کی کوشش کریں، لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ تمام شیعی فرقے اسمٰعیلی عقائد کو قبول کریں، اس لیے کہ حکومت فاطمیہ کے سرکاری عقائد یہی تھے ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی مشکل تھی کہ ان دو قوتوں میں لڑائی نہ ہونے پائے جو مصر اور عراق کے درمیانی علاقوں پر اپنا تسلّط جمانے کی کوشش میں مصروف تھیں ۔ جب قرامطہ نے فاطمیوں سے لڑنا شروع کیا تو بویہیوں نے کبھی ان کا ساتھ دیا اور کبھی ان عرب قبائل کے ساتھ شریک ہو گئے جو ایک محاذ پر فاطمیوں سے لڑ رہے تھے اور حمدانیوں اور ان کے جانشینوں کی مدد کی جو دوسرے محاذ پر فاطمیوں سے لڑ رہے تھے ۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ خلیفہ القادر نے فاطمیوں کے خلاف جو محضر تیار کیا تھا (۴۰۲ھ / ۱۰۱۱ء) اس میں بویہیوں کی حکمت عملی کا کہاں تک دخل تھا اور کہاں تک اس کے پیچھے یہ مقصد کام کر رہا تھا کہ اسمٰعیلیوں کے اثر کو ملک میں پھیلنے سے روکا جائے ۔ بہر حال اس نظریے کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی کہ یہ محضر بویہیوں کی مرضی کے خلاف تیار کیا گیا تھا اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس پر سنّی اور اثنا عشری داناؤں کے دستخط تھے ۔ خاندان بویہ کے خاتمے کے قریب جا کر یہ صورت پیش آئی کہ ایک بویہی ابو کالیجار نے المؤید الشیرازی اسمٰعیلی داعی کے بیانات کو کسی قدر توجہ کے ساتھ سنا، گو کم سے کم سرکاری طور پر، اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا البلخی : سیرۃ الشیرازی، ص ۱۱۸؛ ابو شجاع ص ۲۳۲) اور اس واقعے کو کہ جب بغداد میں آل بویہ کا اقتدار ختم ہو چکا تھا تو ان کے ترکی سپہ سالار البساسیری [رک بآں] نے سلجوقی فاتحین کے خلاف فاطمی خلافت سے اتحاد کا اعلان کیا، اگرچہ

زمان اقتدار میں وہ اس بات کے سخت خلاف تھا، اس لیے کہ ایک وہی قوت تھی جو اس حالت میں بویہیوں کی مدد کو آ سکتی تھی، آل بویہ کی عام پالیسی کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آل بویہ کی حکومت شروع سے کتنی ہی قوی اور مضبوط نظر آتی رہی ہو اور اس کے بعض کارنامے کتنے ہی شاندار رہے ہوں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں بعض کمزوریاں بھی تھیں ۔ ان میں سے کچھ کمزوریاں تو ایسی تھیں جو عموماً دوسری سلطنتوں میں بھی ہوتی ہیں، لیکن بعض انہیں کے ساتھ خاص تھیں ۔ پھر کچھ کمزوریاں ایسی بھی تھیں جو اندر سے نہیں پیدا ہوئیں تھیں بلکہ باہر سے آئی تھیں ۔ کمزوریوں کی مؤخرالذکر قسم میں سمندری تجارت کا وہ اضطراب‌انگیز انقلاب تھا جس کا بویہی اقتدار کے ختم کر دینے میں بڑا ھاتھ تھا ۔ یہ بات یقینی ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ء کے قریب بحرِ ہند کی طرف سے مغرب سے جو تجارت جاری تھی اس کا راستہ خلیج فارس کے راستے سے نہیں رہا، بلکہ اس کا رخ بحر قلزم کی طرف بدل گیا (دیکھیے B. Lewis : *The Fatimids and the Route to India*، در *Revue de la Fac. de Sc. Econ. d'Istanbul*، ۱۹۵۳ء) ۔ جس طرح زیرین عراق کی مسلسل مضطربانہ حالت اور بحرین میں قرامطہ کا وجود، جن پر بویہی کبھی پوری طرح قابو نہ پا سکے، اس صورت حال کا ذمے دار تھا اسی طرح فاطمی اور بوزنطی فتوحات سے عراق اور شام کے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جانے کو بھی یقیناً اس میں بڑا دخل ہوگا، لیکن غالباً جو چیزیں ان سب باتوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی ہوں گی ان میں سے ایک فاطمیوں کا اقتصادی غلبہ تھا اور دوسرے وہ مساعد حالات جنھوں نے اطالیہ کے تجارتی جہازوں کو اس طرف متوجہ کیا ۔ ایک طبعی آفت نے سیراف کو، جو اس وقت تک خلیج فارس کی بڑی بندرگاہ تھا (سنہ ایک ہزار عیسوی کے لگ بھگ)، تباہ کر دیا اور شہر پھر دوبارہ تعمیر نہ ہوا ۔ سیراف کی تباہ کے بعد سے خلیج پر جزیرۂ کیش کے سردار کا تسلّط جم گیا، جس کی حیثیت کم و بیش ایک سمندری سردار (corsair chieftain) کی تھی ۔ گو صحیح طور پر ان نتائج کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو ان واقعات کی وجہ سے رونما ہوے، لیکن یہ کہنا بھی غالباً صحیح نہ ہوگا کہ ایک طرف تو تاجروں کے طبقے پر، جو بڑھتے ہوے فوجی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے، اور دوسری طرف بویہی حکومت کی اندرونی اقتصادی حالت پر اور اس کے نتیجے میں ان کی عام قوت استحکام پر اس کا اثر برا نہیں پڑا ۔ ۱۰۰۰ء سے پہلے ہی بویہیوں کی مالی حالت یہ ہو گئی تھی کہ انہیں اپنے نقرئی سکّے کی قیمت کم کرنا پڑی تھی اور غالبًا یہی وجہ تھی کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس غرض کے لیے سونے کا استعمال برابر بڑھتا رہا گو یہ باعث استعجاب ہے کہ آخر یہ سونا ان کے پاس آتا کہاں سے تھا ۔ بویہی محصول (ضریبہ) بڑھانے پر مجبور ہوے، یہاں تک کہ انہیں دوسروں کو محصول وصول کرنے کا ٹھیکہ دینے اور املاک کو فروخت کرنے وغیرہ کے محکمے قائم کرنے پڑے۔

ان سب کمزوریوں سے بڑھ کر وہ خانگی اور خلقی کمزوری تھی جو بویہیوں کے علاوہ اس زمانے کی مشرق قریب کی بہت سی حکومتوں میں مشترک تھی اور جو خلافت کی تباھی کا باعث بنی تھی ۔ اس کے باوجود کہ بویہی فوج کو تنخواہ کے علاوہ اقطاع بھی عطا کیے جاتے تھے لیکن خلیفہ کی فوج کی طرح وہ بھی خوش اور مطمئن نہیں تھی ۔ خلیفہ کی فوج کی طرح بویہی فوج کو بھی اس کا

احساس تھا کہ وہ حکومت کا بنیادی پتھر ہے لیکن فوج میں اتحاد نہیں تھا ۔ اصلی دیلمی فوج زیادہ دن تک کام نہ دے سکی اور مرداویج کی طرح بویہیوں کو، بغداد کی فتح سے پہلے ھی اپنے فوجی دستوں میں ترکمانی غلاموں کو بھرتی کرنا پڑا، جن کا وجود مشرق کی ہر مسلمان فوج کے لیے ناگزیر سا تھا ۔ یہ ترکی غلام ایک طرف تو دیلمیوں کی وقتاً فوقتاً ہونے والی بغاوتوں کو فرو کرنے کے کام آتے اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان میں اکثر گھڑسوار تھے ۔ ان کے مقابلے میں دیلمی، جو پہاڑوں اور جنگلوں کے رہنے والے تھے، پیادہ فوج کے سپاھی تھے ۔ کبھی کبھی کرد اور قُفص وغیرہ بھی فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے ۔ ان مختلف گروھوں کے درمیان جو رقابت تھی اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی تھی کہ بویہیوں نے خلافت سے جو ترک لیے تھے وہ سنّی تھے ۔ بالآخر یہ ہوا کہ نامعلوم اسباب کی بنا پر دیلمی فوجوں کی بھرتی آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی اور ان بویہیوں کے آخری اخلاف جنھوں نے دیلمیوں کی مدد سے حکومت حاصل کی تھی تمام و کمال ترکی سپاھیوں میں گھر کر رہ گئے ۔

زوال کا تیسرا سبب، جو بویہی خاندان کے ساتھ مخصوص ہے، قوت کا انتشار ہے ۔ ہم پہلے ھی لکھ چکے ھیں کہ ابتدا ھی سے بویہیوں کی تین الگ الگ ریاستیں تھیں اور وہ ایک متحدہ حکومت نہ تھی ۔ یہ صورت حال ان حالات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے جن کے تحت فتوحات عمل میں آئیں، لیکن اس کا ایک سبب ضرور یہ بھی ہوگا کہ ان لوگوں میں اقتدار کا تصوّر گھرانے یا خاندان کے اقتدار پر منحصر تھا ۔ قوت اور اتفاق دونوں کی مدد سے عضدالدّولة نے سلطنت میں مکمّل اتحاد پیدا کر لیا، لیکن اسلاف کی طرح اس نے بھی اسے مستقل بنانے کی کوشش نہیں کی، چنانچہ [اس کی موت کے بعد] یہ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ۔ قوت کا یہ انتشار، جو بویہی خاندان کو قراخانی اور سلجوقی ترک خاندانوں سے پہلے کے تمام مسلم خاندانوں سے ممتاز کرتا ہے، تینوں بھائیوں کے مرتے ھی، جو اس سلطنت کے بانی تھے، اندرونی کشمکش اور نزاع کا باعث بن گیا ۔ فوج اور تمام مفسدہ پرداز لوگوں نے اس حالت سے اس حد تک فائدہ اٹھایا کہ خاندانی نظام کی اس خرابی نے آگے چل کر فوجی اقتدار اور نظام حکومت کی دیگر کمزوریوں سے پیدا ہونے والی برائیوں کو کئی گنا بڑھا دیا ۔ شہری باشندوں کی شورشیں، جو ابتدائی بویہیوں کے لیے سخت خطروں کا پیش خیمہ بنی تھیں، دوبارہ شروع ہو گئیں؛ اصطخر کی بغاوت قدیم دارالسلطنت کی تباھی کا باعث ہوئی، اور بغداد پر بعض اوقات عیّاروں [رِنْد بان] کا قبضہ رہنے لگا ۔ اگر قُتُوّة کی متأخر اسناد کو معتبر سمجھا جائے تو ابو کالیجار بھی انھیں میں سے ایک تھا ۔ مذھبی توازن کے جس طریقے پر بویہی عامل تھے اس سے صرف یہ نتیجہ نکلا کہ بغداد میں اور اس کے علاوہ دوسرے شہروں میں شیعیوں اور سنّیوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے، اور غالی حنبلیوں نے تو اس حد تک زیادتی کی کہ بعض اکابر ائمہ کے مشہد اور بویہیوں کی قبروں کو آگ لگا دی ۔ متأخر بویہی، خصوصاً عراق میں، اتنی بھی قوت نہ رکھتے تھے کہ کسی کو اپنا تابع فرمان بنا سکیں ۔

بویہیوں کی کمزوری اور بے بسی نے کسی حد تک خلافت کو فائدہ پہنچایا ۔ خلیفہ کو، جو کبھی کبھی ان کے خاندانی جھگڑوں میں حکم بنتا تھا، کسی حد تک اس کا کھویا ہوا اقتدار اور اثر واپس مل گیا، کم سے کم عراق کے مسائل کی

حد تک تو یہ بات بالکل درست تھی ۔ تقریباً ایک صدی کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی کہ خلیفہ القائم نے اپنے لیے ایک وزیر مقرر کیا ۔ اس کا نام ابن المُسلمہ تھا اور وہ کٹر سنّی تھا ۔ ایک ادارے کی حیثیت سے خلافت کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی امید اب ایک موہوم خیال سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی ۔ اس کے لیے نامور قاضی الماوردی کا رسالہ الاحکام السلطانیة دیکھیے، جو سیاسی حکمت عملی کے سلسلے میں خلیفہ کا بہت مقرّب تھا ۔ سنّیوں کے حلقوں میں یہ امید بھی ظاہر کی جانے لگی کہ ایک بےدین سلطنت کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ جائے گا ۔ یہ درست ہے کہ محض بویہی اقتدار کا ضعف ایسی چیز نہیں تھی کہ اس کی بنا پر خلافت میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی کہ وہ ایک خودمختار حکومت قائم کر سکے، لیکن کم سے کم اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ شاید لوگوں کو ایک راسخ الاعتقاد اور زیادہ قابلِ احترام محافظ میسّر آ جائے ۔

بویہیوں کی جگہ لینے کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی ۔ ان میں سے بعض تو صرف مقامی اقتدار کے طالب تھے اور بعض اپنے مفاد کی خاطر مشرق کے بلاد اسلامیہ کو متحد کرنا چاہتے تھے ۔ حمدانیوں کے زوال کے کوئی بیس سال بعد، دیار بکر کے مروانی کردوں سے نمٹنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ الجزیرہ میں عُقیلی عربوں کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے ۔ جبال کے حسن‌ویہی خاندان کے زوال کے بیس سال بعد اسی علاقے میں عنّازی کردوں کی سیادت کو تسلیم کرنا پڑا ۔ وہ مختلف بدوی قبائل اس کے علاوہ ہیں جن کا عراق عرب یا عراقی شامی سرحدی علاقوں پر قبضہ تھا اور جو اس تقریباً خود مختار ریاست کی سرحدوں پر بھی چھائے ہوے تھے جو بغداد کے دروازوں کے قریب بطیحہ کے دلدلی علاقے میں واقع تھی ۔

ایران میں ایک گھرانا بویہیوں کے رشتہ داروں کا تھا، اور اسی وجہ سے وہ کاکُویہی یا کاکُوئی کہلاتے تھے، (یہ کاکُویہ سے بنا ہے جس کے معنی دیلمی زبان میں ماموں کے ہیں) ۔ اس نے پہلے اصفہان اور پھر ہمذان پر قبضہ کر لیا، لیکن سب سے بڑا خطرہ مشرق کی جانب سے پیش آیا ۔ یہاں غزنویوں کی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور محمود غزنوی نے کھلم کھلا خلافت کو آزاد کرنے کے عزم کا اعلان کر دیا تھا ۔ اسی دوران میں بویہیوں کے باہمی جھگڑوں اور نادانیوں سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے فرزند مسعود کو رَےّ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا ۔ اس کی فوجوں نے بویہی حریفوں کو تہ تیغ کر دیا (۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء) ۔ محمود کی وفات کے بعد سلجوقیوں نے مسعود کو شکست دی اور باقیماندہ بویہیوں کو ذرا سانس لینے کا موقع ملا ۔ لیکن سلجوقیوں کی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور انھوں نے ایک سنّی حکومت قائم کرنے کا ایک منظّم منصوبہ بنایا ۔ خلافت کے حامیوں میں بہت سے ان کے ساتھ شامل ہو گئے ۔ بویہیوں نے ناچار سلجوقیوں کے اقتدار کو تسلیم کیا، لیکن اس سے انھیں کوئی نفع نہیں پہنچا ۔ ۱۰۵۵ء میں طُغرل بیگ بغیر مزاحمت کے بغداد میں داخل ہو گیا اور بویہی المَلک الرّحیم کو گرفتار کر لیا ۔ شیراز میں فوجوں کے اجتماع اور استحکام کے باوجود فارس بھی مطیع اور فرمانبردار ہو گیا، کیونکہ اس پر شمال اور کرمان دونوں جانب سے حملہ کر دیا گیا تھا ۔ اس وقت بویہی خاندان کی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو گیا ۔

مآخذ : مصادر: خوش قسمتی سے ہمارے قبضے میں سرکاری مراسلات اور وثائق کے تین ذخیرے ہیں :

ایک تو خلیفہ المطیع اور الطائع کے کاتب ابو اسحٰق الصابی کا ذخیرہ، جو تاریخ سیاست دول کے مطالعے کے لیے از حد مفید ہے (اس کے کچھ اقتباسات ۱۸۹۸ء میں شکیب ارسلان نے طبع کیے، بیشتر حصّہ غیر مطبوعہ ہے)؛ دوسرا وزیر صاحب ابن عبّاد کا ذخیرہ (صرف وہ کاغذات محفوظ ہیں جن کا تعلق مؤیدالدّولہ کے عہد سے ہے، طبع عبدالوہّاب عزّام و شوقی ضیف، قاہرہ ۱۹۴۷ء)، یہ اندرونی انتظام مملکت کے مطالعے کے لیے بہت مفید ہے؛ تیسرا عبدالعزیز بن یوسف کا جو عضدالدّولہ کے تحت سلطنت کا ایک بڑا عہدےدار تھا، ذخیرہ (خلاصہ از Cl. Cahen در ... *Studi Orientallistici in onore G. Levi della Vida*) - یہ تینوں ذخیرے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے ہیں؛ نیز دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشٰی، ۱۳: ۱۲۹ و ۱۳۹ .

تاہم بڑے مآخذ کتب تاریخ ہیں - اس کے لیے بنیادی کتاب تاریخ ثابت بن سنان ہے، جسے ہلال الصابی نے مکمّل کر کے ۴۴۷ھ تک پہنچا دیا ہے - اس کے علاوہ جو کچھ بویہی عہد کی بابت محفوظ ہے وہ ایک اقتباس ہے جس کا تعلق ۳۸۹ھ کے اواخر سے لے کر ۳۹۳ھ کے اوائل کے درمیانی زمانے سے ہے، مگر اس کا عام مضمون بعد کی تواریخ میں لے کر اسے آگے جاری رکھا گیا ہے، جن تاریخوں نے اس سے کام لیا ان میں سے پہلی تاریخ مسکویہ اور اس کے خلف ابوشجاع کی کتاب تجارب الامم [رک بہ ابن مسکویہ] ہے، جس کا واحد مخطوطہ ہلال الصابی کی کتاب کے حصّے کے ساتھ منسلک ہے (مکمل کتاب طبع و ترجمہ، Margoliouth: *The Eclipse of the Abbaside Caliphate*، ۷ جلد، ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ء)- اس کے ساتھ ہی ذیل کی تواریخ بھی ہیں: محمد بن عبدالملک الہمذانی: تکملۃ التجارب، جس میں تجارب [الامم]، کو مکمّل کیا گیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی گئی ہے (فقط ۳۶۷ھ تک کے واقعات تک محفوظ و دستیاب ہے طبع کنعان، در مشرق، ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۸ء)؛ ابن الاثیر: الکامل؛ سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزمان (اس کا وہ حصّہ جو اس عہد سے متعلق ہے غیر مطبوعہ ہے، یہ اس کے سلف ابن الجوزی کی المنتظم سے زیادہ مکمل ہے، جس میں سے اس نے مواد لیا ہے)، یہ ان آخری تین مآخذ میں ۳۹۳ھ کے بعد کے واقعات درج ہیں - ابو اسحٰق الصابی نے ایک معذرت نامہ بشکل تاریخ (اپنے آپ کو قید سے چھڑانے کے لیے) لکھا تھا، جس کا نام الکتاب التاجی (بنام عضدالدّولہ تاج الملّۃ) تھا - اس کا ابتدائی حصّہ جو حال ہی میں یمن میں دوبارہ دستیاب ہوا ہے Dr. Minovi کے پاس ہے (مگر اس تک میری رسائی نہیں ہو سکی)؛ معلوم ہوتا ہے یہ کتاب متأخر مؤرخوں کو معلوم تھی - ان کے علاوہ عربی تواریخ کے ذخیرے میں سے مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: المسعودی: مروج، ۹: ۱ تا ۳۴ (حسب و نسب)؛ یحیی الانطاکی؛ ابن ظافر: الدول المنقطعۃ (فاطمیوں کے ساتھ تعلقات، غیر مطبوعہ مگر وسٹنفلٹ: *Geschichte der Fatimiden-Chalifen*، نے اس سے کام لیا ہے؛ ابن خلکان (سیرت معز، رکن اور عماد الدولۃ)؛ ابن طقطقی [کتاب الفخری] (آخر زمانے کی - مگر شیعی روایات)؛ العتبی: (غزنویوں کے ساتھ تعلقات)؛ اور ماری بن سلیمان: *Nestorian History*، طبع Gismondi، روم ۱۹۰۳ء، جسے بلاوجہ نظر انداز کر دیا گیا ہے.

فارسی تواریخ ہمارے سامنے سب سے پہلے مجمل التواریخ کی شکل میں آتی ہیں (طبع بہمنیار، ۱۹۳۰ء)، جس کے مصنّف کا نام معلوم نہیں - یہ بویہی تاریخ کے لحاظ سے الہمذانی کے ساتھ مرتبط ہے اور نیز سرحدی ریاستوں کے وقائع سے بھی تعلق رکھتی ہے، یعنی غزنوی (گردیزی، بیہقی) زیاری اور بحر خزر کے جنوب کے دیگر خاندان (ابن اسفند یار)، اس کے علاوہ چند اہم مقامی تواریخ فارسی میں ہم تک پہنچی ہیں، مثلاً حسن بن محمد قمی کی تاریخ قم، طبع جلال الدین تہرانی، ۱۹۳۴ء، اور نامعلوم مصنّف کی تاریخ سیستان،

طبع بہار، ۱۹۳۷ء.

تاریخ سے ملتے جلتے ادب میں بعض اطلاعات التنوخی کی نشوار (ص ۱۳، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۶۹)، نیز مطبوعہ دمشق کے ۱۹۳۰ء کی جلد میں ص ۱۰۰) میں ملیں گی۔ کتب سیر کے اندر فاطمی داعی المؤیّد الشّیرازی کی خود نوشت سیرة، طبع کامل حسین، قاهره ۱۹۴۹ء (جس کا تعلق ابو کالیجار کے وقت کی دعوت سے ہے)، قابل ذکر ہے، ایسے شاعروں کے دواوین اور مجموعہ ہاے اشعار جیسے الثّعالبی : (یتیمة)، الباخرزی : دُمیة، التّوحیدی (خصوصاً کتاب الامتاع) بھی مفید ہیں، بعض اصلی معلومات یاقوت : ارشاد، ۲ : ۲۷۳ ببعد؛ ۳ : ۱۸۰ ببعد؛ ۵ : ۳۴۷ ببعد؛ ۶ : ۲۵۰ ببعد وغیرہ.

جغرافیے کے تین بڑے مشہور ماہروں الاصطخری، ابن حوقل اور المقدّسی — تینوں بویہیوں کے ہم عصر ہیں اور پہلا تو ان کی رعایا ہی میں سے ہے — کی تصانیف کے ساتھ ناصر خسرو کے سفرنامہ کا اور بعض ان معلومات کا جو یاقوت کی معجم البلدان (خصوصاً ۳ : ۹۱۳، مقالہ سامیران) میں اور ابن بلخی کے فارس نامہ (طبع نکلسن، تاریخی بیانات، ص ۱۱۷ تا ۱۱۹) میں موجود ہیں، اضافہ کیا جا سکتا ہے.

قانونی نظام سے متعلق تصانیف میں یہ کتابیں کام کی ہیں : الماوردی : الاحکام السلطانیة، اس کا ضمیمہ بھی دیکھنا چاہیے، جو حال ہی میں الازہر میں دستیاب ہوا ہے؛ رسوم دارالخلافة، جو ہلال الصّابی یا اس کے فرزند محمد کی تصنیف ہے اور جس کا موضوع ''خلافت کا طرزِ عمل اور قوانین قضا بویہیوں کے عہد تک'' ہے (مجھے یہ کتاب پروفیسر دوری، بغداد، کی عنایت سے دستیاب ہوئی) - بویہیوں کے عہد کی تاریخ مالیہ کا مطالعہ ابوالوفاء البوزجانی کے رسائل پر حساب مالیہ (غیر مطبوعہ) اور ایک گمنام مصنّف کی کتاب الحاوی [اور نظام الملک کا سیاست نامہ] (طبع Schefer خصوصاً ص ۱۸۳ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی تاریخ کے لیے دیکھیے وہ تصانیف دینیہ جن کا اوپر ذکر آیا ہے - خاص طور پر ابن بابویہ کی کتابیں.

کتبات کی بابت معلومات *RCEA* (۵ : ۱۸۳۱ تا ۱۸۳۲، ۱۸۷۷، ۱۹۰۶؛ ۶ : ۲۰۷۹، ۲۱۷۷؛ ۷ : ۲۰۷۷) میں ملتی ہیں۔ ان معلومات کی تکمیل G. Wiet : *Soieries Persanes* (جس سے اقتباس ذیل میں دیا گیا ہے) سے کرنی چاہیے - سکّوں کی بابت معلومات کے لیے، جو ناقص طور پر مطبوعہ ہیں، علاوہ Lane-Poole : *Catalogue of the British Museum*، کے دیکھیے G. C. Miles : *A Numismatic History of Rayy*، ۱۹۳۸ء.

زمانِ حال کی دراسات (مطالعے، تحقیقات) : بویہیوں کے حالات کا کوئی تفصیلی اور جامع مطالعہ موجود نہیں، اس کے لیے کچھ معلومات V. Minorsky: *La domination des Daylamites*، پیرس ۱۹۳۲ء، میں ملیں گی، جن سے آگے کا راستہ معلوم ہوگا۔ اس کے علاوہ قارئین کو B. Spuler : *Iran in früh-Islamischer Zeit*، ۱۹۵۲ء، اور A. Mez : *Die Renaissance des Islams* کے ان حصوں سے مدد لینا چاہیے جو خاص طور پر بویہیوں کے لیے وقف ہیں - زیادہ خصوصی حالات سے ذیل کی تصانیف میں بحث کی گئی ہے : محسن عزیزی : *La domination arabe et l'épanouissement du sentiment national en Iran*، ۱۹۳۸ء؛ *Survey of Persian Art*، ج ۲ اور ۳؛ G. Wiet : *Soieries Persanes*، ۱۹۴۸ء، ص ۹۹ تا ۱۷۸ (اس سے کہیں زیادہ وسیع معلومات پر مشتمل ہے جو کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے؛ اے - دوری A. Duri : تاریخ العراق الاقتصادی فی القرن الرابع الهجری، بغداد ۱۹۴۸ء؛ C. Elgood : *A Medical History of Persia*، ۱۹۵۱ء؛ Donaldson: *The Shi'ite Religion*، ۱۹۳۳ء؛ R. Strothmann :

Die Zwölfer-Schi'a، ۱۹۲۵ء (جس کا خلاصہ [آ]، لائڈن، بار اول میں بذیل مادۂ شیعہ دیا گیا ہے)؛ H. Laoust کا دیباچہ بر *La Profession de Foi d'Ibn Batta*، ۱۹۵۸ء؛ Cl. Cahen : *L'évolution de l'iktā*، در *Annales ESC*، ۱۹۵۳ء، اور E. Tyan : *Institutions de droit public musulman*، ج ۲، ۱۹۵۷ء، فصل ۱ (مگر قب *Arabica*، ۱۹۵۸ء، ص ۷۰ ببعد) - مفروق کبیر نے اپنے لنڈن یونیورسٹی کے غیر مطبوعہ مقالۂ علمیہ سے جس کا عنوان *The Buwahid dynasty of Baghdad from the accession of Izz al-dawla to the end* ہے، چند مقالات نکال کر، بالخصوص مقالۂ *Cultural Development under the Buwayhids of Baghdad*، در *Journal of the Asiatic Society of Pakistan*، جلد ۱، ۱۹۵۶ء چھپوا دیے ہیں۔

خصوصی مطالعہ‌جات جو لائق توجہ ہیں حسب ذیل ہیں: H. Bowen : *The Last Buwayhids*، در *JRAS*، ۱۹۲۹ء؛ N. Abbott : *Two Buyid Coins* (جس کے ساتھ مفصّل تاریخی شرح ہے)، در *AJSL*، ج ۵۶، ۱۹۳۹ء؛ Cl. Cahen : *Notes pour l'histoire de la himaya*، در *Mélanges Massignon*، ج ۱؛ Amedroz : *Three years of Buwayhid Rule*، در *JRAS*، ۱۹۰۱ء؛ وہی مصنّف : *Der Vizier Ibn al-Amid*، در *Der Islam*، ج ۳؛ M. H. Al-Yāsin : الصّاحب ابن عبّاد، بغداد ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء (نقطۂ ثقافتی نقطۂ نظر سے)؛ E. Kühnel : *Die Kunst Persiens unter den Buyiden*، در *ZDMG*، ۱۹۵۶ء؛ گُرکیس عوّاد : الدّار المُعزّی فی بغداد، در *Sumer*، ج ۱۰، ۱۹۵۰ - ۱۹۵۲ء - خارجی تعلقات کی بابت محمد ناظم : *The life and times of Mahmud of Ghazna*، ۱۹۳۱ء؛ M. Canard : *Les Hamdanides*، ج ۱، ۱۹۵۱ء؛ اے۔ کسروی : شہریاران گمنام، تہران ۱۳۳۵ھ/۱۹۲۸ء (بر آذربیجان در قرن رابع ہجری مطابق قرن عاشر عیسوی، قرن خامس ہجری مطابق قرن حادی عشر عیسوی)۔

(Cl. Cahen)

به آفرید بن فَرْوَرْدِین : ایران کا ایک مذہبی فتنہ‌گر، جو عہد بنو امیہ کے اواخر میں — تقریباً ۱۲۹ھ / ۷۴۷ء کے درمیان — نیشاپور کے ضلع میں خَوَاف کے مقام پر ایک نئے نبی ہونے کا مدّعی ہوا۔ اس نے اپنے گرد بہت سے مرید اکھٹے کر لیے۔ ۱۳۱ھ / ۷۴۹ء میں ابو مُسلِم کے حکم سے اسے اور اس کے مریدوں کو قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے وہ سات سال تک چین میں رہا اور وہاں سے واپسی پر اس نے بعض لوگوں کے سامنے ظاہر کیا کہ اسے دوبارہ زندہ کر کے آسمان سے بھیجا گیا ہے۔ ایک کہانی یہ بھی ہے کہ وہ حیلے سے مردہ بن کر ایک سال تک قبر میں رہا جو اس نے خود اپنے واسطے بنائی تھی۔ اس نے اپنے عقائد کی فارسی زبان کے ایک صحیفے میں شرح کی، اور دعوٰی کیا کہ وہ صحیح معنوں میں زرتشتی ہے، مگر آگے چل کر بظاہر اسلامی تعلیم کے اثر سے اس نے بعض شعائر اور محرّمات کو اختیار کر لیا۔ ان میں سے، شراب، غیر شرعی ذبیحہ اور محرمات سے ازدواج کی ممانعت تھی۔ اس نے زمزمہ [رَکْ بان] کو موقوف کر دیا تھا اور سورج کی طرف منہ کر کے دن میں سات نمازیں اور زکوٰۃ کے لازماً ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس مدارات سے بلاشبہہ اس کا مقصد اپنے پرانے مذہب کو نئی زندگی کا پروانہ عطا کرنا تھا لیکن موبدوں نے ابوُمسلم کو اس کے خلاف اکسایا کیونکہ انھیں اپنے مذہب کی یہ اصلاح پسند نہ تھی۔ اس کے علاوہ ابو مسلم نے دیکھا کہ یہ تحریک نو مسلموں کے لیے موجب خطر ہو سکتی ہے۔ اس نے به آفرید کو مجبور کیا کہ وہ اسلام

کی طرف رجوع اور عباسیوں کے مقصد کے حصول میں امداد دے، لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ مدّعی برابر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا رہا اسے آگے چل کر سزاے موت دی گئی ۔ اس کے عقائد کے پیرو، جو دنیا میں اس کے دوبارہ ظہور کا انتظار کرتے رہے، چوتھی صدی ہجری/دسویں عیسوی تک پائے جاتے تھے۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۳۴۴؛ (۲) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۳۸؛ (۳) البغدادی: الفرق، ص ۳۴۷، (۴) الشہرستانی [کتاب الملل و النّحل]، ص ۱۸۷؛ (۵) البیرونی [الآثار الباقیة]، طبع Sachau، ص ۲۱۰، *Chronology* [ص ۱۹۳ تا ۱۹۴]؛ (۶) الثّعالبی: کتابُ الغُرَر؛ (۷) M. Th. Houtsma: *WZKM*، ۳، ۱۸۸۹ء: ۳۰ تا ۳۷؛ (۸) G. H. Sadighi: *Les Mouvements religieux iraniens*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱ تا ۱۳۱؛ (۹) S. Moscati: *Lin.* ۱۹۴۹ء، ص ۳۴۷ ببعد؛ (۱۰) B. Spuler: *Iran in frühislamischer Zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ص ۱۹۶۔

(D. SOURDEL)

⊗ **بَہاءُ اللہ**: اصل نام میرزا حسین علی نوری، بہائی مذہب کا بانی اور مرزا عباس المعروف بہ میرزا بزرگ کا، جو ایران کے قصبۂ نور کا باشندہ تھا، بڑا بیٹا ۔ اس کے پیرو اسے عام طور پر جمال مبارک اور جمال قِدَم کے نام سے یاد کرتے ھیں ۔ بہاءاللہ کا لقب اسے اس کے مقتدا علی محمد باب (رکّ بہ باب) نے دیا تھا ۔ عباس بن بزرگ کی نو بیویاں تھیں، جن سے تیرہ بچے پیدا ھوے ۔ جن میں (۱) میرزا یحیی صبح اَزل، (۲) میرزا حسین علی بہاءاللہ، بھی تھے۔

بہاءاللہ کی پیدائش ۲ محرم ۱۲۳۳ھ / ۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء کو تہران میں ھوئی اور وفات ۲ مئی ۱۸۹۲ء کو عکّہ (فلسطین) میں ۔ اس کی پیدائش کے متعلق ایک روایت یہ ھے کہ قصبۂ نُور میں ھوئی تھی ۔ الزِّرِکْلی نے اسے مستعرب ایرانی، قرار دیا ھے (الأعلام، ۲: ۱۰۲، بار دوم) ۔ اپنے والد کی وفات کے وقت بہاءاللہ کی عمر بائیس سال کی تھی ۔ اس کے بعد ۱۸۴۴ء میں جب علی محمد باب (۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء تا ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء) نے دعویِ الہام و مأموریت کیا تو بہاءاللہ نے اسے ابتدا ھی میں تسلیم کر لیا تھا، لیکن باب کے ابتدائی ماننے والے اٹھارہ چوٹی کے اکابرین میں، جنھیں باب نے حروفِ حی کا نام دیا تھا، بہاءاللہ کا نام شامل نہیں (رکّ بہ باب) ۔ تاھم اس نے جلد ھی بابی تحریک میں اھم مقام حاصل کر لیا ۔ ملا حسین بشرویہ کے ذریعے بہاءاللہ کے پاس باب کی توقیعات پہنچی تھیں ۔

قلعۂ شیخ طَبْرسی کی جنگ میں، جو بابیوں اور حکومت ایران کے فوجی دستوں کے درمیان ھوئی تھی، شرکت کے لیے بہاءاللہ نے اپنے ساتھیوں اور بھائی صبح اَزل کے ساتھ محرم ۱۲۶۵ھ/ دسمبر ۱۸۴۸ء میں بغداد کا رخ کیا، جو اس وقت ترکی کی قلمرو میں شامل تھا ۔ یہ وہ وقت تھا کہ باب کی بیان کردہ ”مَن یُظھِرُہ اللہ“ کی پیشگوئی بابیوں میں پھیل چکی تھی اور ھر شخص مَن یُظْھِرُاللہ ھونے کے خواب دیکھ رھا تھا (نقطة الکاف پر براؤن کی تعلیقات ص P.M) ۔ خود بہاءاللہ کے کان بھی اس سے شناسا تھے ۔ بغداد پہنچنے کے کوئی ایک سال بعد ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں بہاءاللہ اکیلا کردستان کے صحراے سُلیمانیہ کے پہاڑ سرگلو پر چلا گیا اور زندگی کے دو سال وھاں بڑی عسرت اور تنگی میں بسر کیے، چنانچہ وہ خود لکھتا ھے: ”کتنی ھی راتیں ھمیں کھانا نہ ملا اور کتنے ھی دن ھمارے بدن کو آرام میسر نہ ھوا“ (ایقان) ۔ اس عرصے میں اس نے اپنے ساتھیوں سے خط و کتابت جاری رکھی (*Materials for the study*

(of Babi Religion - آخر صبح ازل نے بہاءاللہ کے بہائی موسیٰ کے خسر شیخ سلطانی کو بھجوا کر اسے بغداد واپس بلوا لیا - یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ صبح ازل کی سربراہی میں بابی تحریک گویا مٹ چکی ہے (*The Dawn Breakers*، ص ۵۸۰) - وقت آ چکا تھا کہ بہاءاللہ مَن یُظْہِرہ اللہ ہونے کا دعوٰی کر دے (نقطۃ الکاف پر براؤن کی فارسی زبان میں تعلیقات)، چنانچہ اس نے بابی تحریک کی زمام عملاً اپنے ہاتھ میں لے کر بابی تحریک میں نئے سرے سے جان ڈال دی اور تحریک کے معاملات کو اپنے نہج پر چلانا چاہا جو ایرانی حکومت کے لیے نقصان دہ تھا - اسی زمانے میں برطانوی حکومت کی طرف سے بہاءاللہ کو برطانوی شہری بننے، اپنی امان میں لینے اور ہندوستان بھجوا دینے کی پیش کش ہوئی (بحوالۂ سابق، ص ۱۱) - حالات کو مخدوش ہوتا دیکھ کر ایرانی حکومت کے ایما سے ایرانی قونصل جنرل مقیم بغداد نے ترکی کی حکومت کو لکھا کہ بہاءاللہ کو بغداد سے، جو ایرانی سرحدوں سے قریب ہے، کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے - پروفیسر براؤن نے ایرانی حکومت کا وہ خط مؤرخہ ۱۲ ذوالحجّہ ۱۲۷۸ھ شائع کر دیا ہے - اس میں لکھا ہے کہ میرزا حسین نوری (بہاءاللہ) اپنے زمانۂ قیام بغداد میں خفیہ طور پر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ اور خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا ہے - بعض دفعہ اس نے بغاوت برپا کرنے کی سعی بھی کی ہے اور قتل کی ترغیب و تحریص میں بھی اس کا ہاتھ رہا ہے، چنانچہ ملاّ آقا دربندی پر قاتلانہ حملے میں بھی اس کا ہاتھ تھا (براؤن: Browne : *Materials for the Study of the Babi Religion*، ص ۲۷۹ ببعد)؛ چنانچہ دونوں حکومتوں کے مشورے سے فیصلہ ہوا کہ بہاءاللہ کو بغداد سے قسطنطینیہ منتقل کر دیا جائے - اس فیصلے کے مطابق بہاءاللہ ۲ اپریل ۱۸۶۳ء کو اپنی دونوں بیویوں، تین بچوں (اَغصانِ ثلاثہ: عباس، محمد علی، مہدی) اور کچھ متبعین اور بہائی میرزا موسیٰ کے ساتھ قسطنطینیہ کے لیے روانہ ہو گیا - راستے میں شطّ العرب کو عبور کرکے بغداد کے قریب ہی نجیب پاشا کے ایک باغ میں پہلا پڑاؤ کیا، اور ۲ مئی تک بارہ دن وہاں سکونت رکھی - بقول میرزا جواد انھیں ایام میں بہاءاللہ نے دعوٰی کیا کہ وہ مَن یُظْہِرہ اللہ (بحوالۂ کتاب مذکور، ص ۲۲) اور وہ موعود ہے جس کے ظہور کی باب نے بشارت دی تھی؛ لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مَن یُظْہِرہ اللہ کا دعوٰی بہاءاللہ نے ۱۸۶۷ء میں کیا تھا - پروفیسر براؤن بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے (نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص ۱۱ ببعد) - نبیل کہتا ہے کہ اس دعوے کے وقت بہاءاللہ کی عمر پچاس سال تھی، جب کہ بہاءاللہ کی پیدایش ۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء کو ہوئی تھی، اس طرح اس دعوے کی تاریخ ۱۸۶۷ء ہی بنتی ہے - یہ باغ جس میں بہاءاللہ نے قسطنطینیہ جاتے ہوئے بارہ دن قیام کیا بہائیوں میں باغِ رِضوان کے نام سے مشہور ہے اور یہ ایّام ان کے ہاں ایام عید رِضوان کہلاتے ہیں - اگست میں یہ قافلہ کَرکُوک، مُوصِل اور دیار بکر ہوتا ہوا قسطنطینیہ پہنچا - وہاں چار ماہ قیام رہا - پھر اس قافلے کو ادرنہ بھجوا دیا گیا، جسے بہائی اَرْضِ السِرّ کا نام دیتے ہیں - پروفیسر براؤن نے لکھا ہے: "ادرنہ میں بابیوں کے عارضی قیام کا یہ زمانہ تھا جب بہاءاللہ نے حقیقتِ نفس الامری کے چہرے سے نقاب الٹ دیا اور اپنے وہ مخفی ارادے واشگاف کر دیے جنھیں وہ بلا شبہہ دیر سے دل میں جگہ دیے ہوئے تھا - ضروری سامان جمع کر لینے اور اس راستے کو ہموار کر لینے کے بعد اس نے مَن یُظْہِرہ اللہ ہونے کا دعوٰی کر دیا

اور خصوصاً بابیوں کو دعوت دی کہ اس دعوے کو قبول کر لیں" (نقطة الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص mb).

صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے اس دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا - صبح ازل قدامت پسند تھا، لیکن بہاءاللہ کی روح ترقی پسند تھی - وہ محسوس کرتا تھا کہ باب کی مہدویت سے اب کام نہیں چلے گا - اس کے متّبعین میں وہ پہلا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا ہے - نئی والہیت کے لیے نئے دعووں کی ضرورت ہے - بہر حال یہ وہ وقت تھا کہ بابی تحریک کے دونوں عمائدین کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے - بہائیوں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ باب کا اصلی قائم مقام تو بہاءاللہ ہی تھا لیکن حکومت اور عوام کو دھوکا دینے کے لیے باب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنا نائب بہاء اللہ کے بجائے صبح ازل کو نامزد کر دے تاکہ لوگوں کی توجہ بہاء اللہ سے ہٹ جائے اور وہ محفوظ رہے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۰)۔ یہ اختلافات روز بروز بڑھتے گئے - بابیوں میں باہم قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا - ایک دوسرے کو زہر دینے کی کوششیں کی گئیں اور حالات نے ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی (نقطة الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص mj؛ *Materials for the study of the Babi Religion*، *The Episode of the Bab*، ص ۲۲ بعد؛ ص ۳۰۹؛ هشت بهشت).

جب ترکی حکومت نے دیکھا کہ یہ اختلافات بڑھ کر امن عامّہ کے منافی ہو گئے ہیں تو اس نے صبح ازل کو قبرص اور بہاء اللہ کو عکّہ (فلسطین) منتقل کر دینے کا فیصلہ کر دیا - ۵ اگست ۱۸۶۸ء کو روانہ ہو کر بہاء اللہ اور اس کے بہتّر ساتھی ۳۱ اگست کو عکّہ پہنچ گئے - جہاں قلعۂ عکّہ میں انھیں قید کر دیا گیا پھر ان کے قیام کے لیے متعدد جگھیں بدلی گئیں اور ۱۸۷۷ء تک قید و بند کے شدائد قائم رہے - آخر ۱۸۸۰ء کو بہجی میں ٹھکانا ملا - ۱۰ مئی ۱۸۹۲ء کو بہاء اللہ بیمار ہوا اور ۲۸ مئی کو پچھتر سال کی عمر میں رحلت کی - بہاء اللہ کے آخری ایام بڑی تلخی اور رنج و اندوہ میں گزرے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۶۰).

بہاء اللہ کی دو بیویاں تھیں، جن میں سے ہر ایک سے چھے چھے بچے پیدا ہوے - پہلی شادی اٹھارہ برس کی عمر میں نواب نام ایک عورت سے ہوئی - اس کے بطن سے ذیل کے بچے پیدا ہوے (۱) صادق، جو چار سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۲) عباس افندی عبدالبہاء (۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا - اس کی چار بیٹیاں تھیں؛ کوئی نرینہ اولاد نہ تھی)؛ (۳) بہیّہ خانم، (۴) علی محمد، سات سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۵) مہدی، (۶) علی محمد، دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا.

۱۸۴۹ء میں بہاء اللہ نے اپنی چچا زاد بہن مہد علیا سے شادی کی - اس سے پیدا ہونے والوں بچوں کے نام یہ ہیں: (۷) محمد علی، جو ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا، (۸) صمدیّہ خانم، (۹) علی محمد، جو دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۱۰) ایک لڑکی، جو دو سال کی عمر میں فوت ہو گئی، (۱۱) ضیاءاللہ، (۱۲) بدیع اللہ، پیدائش ۱۸۶۸ء - ان بچوں میں سے پہلی بیوی کے سب سے بڑے بیٹے عباس افندی کو بہاءاللہ نے غصن اعلٰی کا لقب دیا تھا اور دوسری بیوی کے سب سے بڑے بیٹے محمد علی کو غصنِ اکبر کا - دونوں اغصان کے باہمی جھگڑوں نے بہائی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا.

بہاءاللہ کی وفات کے نو دن بعد نو بہائیوں کی موجودگی میں اس کی وصیت کھول کر سنائی گئی، لیکن عبدالبہاء عباس افندی نے اس وصیت

کا ایک حصّہ مخفی رکھا اور جس حصّے میں اس کی جانشینی کا ذکر تھا اسے ظاہر کر دیا (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۵۷) ۔ اس پر محمد علی غصنِ اکبر نے عباس افندی کے مقابلے میں گدی کا دعوٰی کیا اور مطالبہ کیا کہ بہاءاللہ کی وصیت کا جو حصّہ مخفی رکھا گیا ہے اسے ظاہر کیا جائے، لیکن عبدالبہاء عباس افندی نے آخر وقت تک اس مخفی حصے کو ظاہر نہ کیا ۔ ہر چند کہ یہ اختلاف ایک مذہبی مناقشے سے زیادہ خاندانی اقتدار کے لیے تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں بعض دوسرے بہائی عمائد بھی ملوث ہو گئے ۔ میرزا جواد، جس کا مقام بہاءاللہ کی اپنی تحریرات کے مطابق اغصان کے بعد سب سے بڑا تھا اور جو ان نومنتخب بہائیوں میں سے تھا جنھیں بہاءاللہ کی وصیت کو سب سے پہلے دیکھنے کا اعزاز بخشا گیا اور امریکہ میں بہائیت کا سب سے پہلا مبلغ ڈاکٹر جارج خیراللہ، جسے عبدالبہاء نے بہاءاللہ کا پطرس قرار دیا تھا اور جناب خادم اللہ میرزا جانی کاشانی اور آخر میں حاجی عبدالکریم عبدالبہاء، عباس افندی کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے محمد علی کا ساتھ دیا ۔ اس طرح بہائی تحریک بہاءاللہ کی وفات کے بعد دو حصّوں میں منقسم ہو گئی : (۱) عبدالبہاء عباس افندی کے پیرو، جنھیں ان کے مخالف مارقین کہتے ھیں؛ (۲) محمد علی کے پیرو، جنھیں ان کے مخالف ناقضین کہتے ھیں اور وہ اپنے کو موحّدین کہتے ھیں ۔ یہ اختلاف اسی قسم کا تھا جس طرح باب کے بعد اس کی جماعت ازلیوں اور بہائیوں میں منقسم ھوگئی تھی.

غصنِ اعظم اور غصنِ اکبر کے درمیان اختلافات نے جلد ھی ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی کی شکل اختیار کر لی اور عباس افندی نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ محمد علی اور اس کے ساتھیوں کا معاشرتی مقاطعہ کر دیں ۔ اسی طرح اس نے خاندان مقدّس کے لیے جو نذرانے آتے تھے ان سے اپنی سوتیلی والدہ کی اولاد کو محروم کر دیا (*Material for the study of the Babi Religion*، ص ۸۰) ۔ یہ اختلافات اتنے شدید تھے کہ ۱۸۹۸ء میں جب بہاء اللہ کا بیٹا ضیاء اللہ، جو محمد علی کا چھوٹا بھائی تھا، فوت ھوا تو عباس افندی اور اس کے مرید اس کے جنازے میں بھی شریک نہیں ھوے، بلکہ میرزا جاوید نے تو یہاں تک الزام لگایا ھے کہ عباس افندی ضیاء اللہ کی بیوہ کو اغوا بھی کرنا چاھتا تھا، لیکن میرزا جانی کاشانی اور بعض دوسرے لوگوں کی بر وقت مداخلت سے یہ حادثہ ٹل گیا ۔ بعد میں خود عباس افندی نے بہاء اللہ کے عزیز مرید جناب خادم اللہ کو زد و کوب کر کے ننگے پیر گھر سے نکال دیا (کتاب مذکور، ص ۱۰۶) اور اس کے متروکات کو ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھا ۔ مئی ۱۸۹۷ء میں جناب خادم اللہ کے ساتھ بھجی میں جو بدسلوکی ھوئی اور پھر اسے قتل کر دیا گیا اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے واقعۂ ھائلۂ خادم الٰہی در روضۂ مبارکۂ علیا ۔ ڈاکٹر خیر اللہ نے بعض خطوط شائع کر کے عباس افندی پر الزام لگایا ھے کہ اس کے متبعین نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے خفیہ طریقوں اور قتل و غارت سے بھی پرھیز نہیں کیا، چنانچہ جدّے کے مشہور تاجر میرزا یحیٰی کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جاتا ھے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۱۰۷) ۔ میرزا حسن خراسانی نے، جو عباس افندی کا معتقد تھا، صاف لفظوں میں ڈاکٹر خیر اللہ سے کہا کہ اگر عباس افندی مجھے حکم دے تو میں بلا توقف تمھاری آنکھیں نکال دوں اور تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دوں (کتاب مذکور، ص ۱۰۴) ۔

عباس افندی پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ اس نے امن و سلامتی کے جذبات کے بجاے، جن کی تلقین بہاءاللہ نے کی تھی، ذاتی مفاد کے لیے خود اپنی قوم کے اندر تعصب اور دشمنی کی فضا پیدا کر دی اور بہائیوں میں باہم مجلسی مقاطعہ اور معاشرتی عدم تعاون کو رائج کیا (کتاب مذکور، ص ۸۰؛ مجلسی مقاطعے کے لیے نیز دیکھیے، ص ۱۰۰، ۱۰۵ ببعد)، بہاءاللہ نے کتاب اقدس (ص ۶۳) میں باہمی اختلافات کو مٹانے کا جو طریقہ پیش کیا تھا اسے نظر انداز کر دیا، بہائیوں کی وفات پر خوشیاں منائیں (ص ۸۶) اور ڈاکٹر خیر اللہ کی بیٹی بہیّہ کے ذریعے اپنے بعض امریکی مریدوں کو غلط بیانی کی تلقین کی (ص ۱۰۷).

عبدالبہاء نے گدی سنبھالنے کے بعد امریکہ میں اپنے مسیح اور ابن اللہ ہونے کا اعلان کیا اور ہندوستان میں ایک تقریر کرتے ہوے کہا کہ زرتشتی مذہب کا بہرام موعود وہی ہے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۷۷) - اس کے مرید اسے بہاءاللہ کی تحریرات کا مستند شارح، ترجمان، اس کا حقیقی جانشین، میثاق کا مرکز اور بہائی زندگی کا مثالی نمونہ سمجھتے ہیں۔ بہاءاللہ کی وفات کے بعد بھی اس کے خاندان کی نظر بندی قائم رہی۔ آخر ۱۹۰۸ء میں جب ترکان احرار (Young Turks) کی حکومت قائم ہوئی تو عفو عام کا اعلان ہوا اور اس طرح عبدالبہاء نے قید سے رہائی پائی۔ ۱۹۱۰ء میں اس نے اپنے تبلیغی سفروں کا آغاز کیا۔ پہلا سفر مصر کی طرف ۱۹۱۰ء میں، دوسرا پیرس اور لنڈن کی جانب ۱۹۱۱ء میں اور تیسرا امریکہ اور یورپ کی طرف ۱۹۱۲ء میں کیا۔ ۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت نے اسے کے بی ای [Knight of the Order of British Empire] کا خطاب دیا (*Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۵۰ء، ۲ : ۹۲۸)۔ عبدالبہاء نے بہاء اللہ کے بعد انتیس برس تک بہائی دنیا کی قیادت کی اور ۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو حیفہ (فلسطین) میں وفات پائی اور باب کے مقبرے میں اس کی قبر کے پاس دفن ہوا۔ یہ مقبرہ ۱۹۰۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

عبدالبہاء کی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف تین لڑکیاں تھیں؛ چنانچہ اس نے اپنی وصیت میں شوقی افندی کو، جو اس کی بڑی بیٹی کا سب سے بڑا بیٹا تھا، اپنا جانشین اور ولیّ امر اللہ مقرر کیا۔ شوقی نے ۱۹۳۶ء میں ایک امریکی خاتون میری میکسویل Mary Maxwell سے شادی کی۔

مآخذ : بعض مآخذ متن مقالہ میں بیان ہو چکے ہیں - بقیہ مآخذ کے لیے دیکھیے مقالۂ بہائیت.

(عبدالمنان عمر)

بہاءالحقّ : رکّ بہ بہاءالدین زکریّا.

بہاءالدّولۃ : رکّ بہ بُوَیہ (بنو).

بہاءالدین زکریاؒ : عام طور سے بہاءالحق کے نام سے مشہور ہیں؛ سہروردی سلسلے کے ایک درویش ولی۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق آپ ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲-۱۱۸۳ء میں ملتان کے قریب کوٹ کرور کے مقام پر پیدا ہوے۔ آپ شیخ شہاب الدین سہرورودیؒ (رکّ باں) کے نہایت ممتاز خلفا میں سے تھے اور ہندوستان میں سہروردی سلسلے کے بانی ہیں۔ کوٹ کرور میں قرآن مجید کی ساتوں قراءتوں کی تکمیل کے بعد آپ نے مروّجہ علوم کی تکمیل کی غرض سے خراسان، بخارا، مدینۂ منوّرہ اور فلسطین کے بڑے بڑے علمی مرکزوں کا سفر کیا۔ مدینۂ منوّرہ کے قیام کے دوران میں اپنے زمانے کے نہایت ممتاز محدّث شیخ کمال الدین یمنی سے حدیث کی تکمیل کی اور پھر کئی سال حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کے روضۂ مُطہّرہ پر ذکر و فکر میں گزارے۔ فلسطین میں انبیاے بنی اسرائیلؑ کی قبور کی زیارت کے بعد آپ بغداد گئے اور شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے ۔ اس وقت ان کی حالت بقول اپنے مرشد کے ایک چوبِ خشک کی سی تھی جو آگ پکڑنے کے لیے مستعد تھی اور اس لیے صرف سترہ دن کی تربیت کے بعد شیخ نے انہیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا اور ملتان میں ایک سہروردی خانقاہ قائم کرنے کا حکم دیا ۔ آپ ملتان میں نصف صدی سے کچھ زائد عرصے تک کام کرتے رہے ۔ ان کی خانقاہ جو ایک شاندار عمارت ہے اور جس میں مقیمین اور زائرین کے رہنے کے لیے الگ الگ جگہیں ہیں، قرونِ وسطٰی کے ہندوستان میں صوفیانہ تلقین کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی تھی ۔ آپ کا انتقال ۷ صفر ۶۶۱ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو ملتان میں ہوا ۔

شیخ بہاء اللہؒ کے سلسلے کو زیادہ‌تر سندھ اور پنجاب میں فروغ حاصل ہوا، اگرچہ ان کے مریدین ہرات، ہمدان اور بخارا میں بھی تھے ۔ بطور صوفی ان کی شہرت ان کے ”نفسِ گیرا“ (وجدانی ذہانت) کی بنا پر تھی جس سے وہ اپنے مریدوں کے دلوں کو مسخّر کر لیتے تھے ۔ وہ بہت سی باتوں میں اپنے ہم‌عصر چشتی صوفیہ سے مختلف تھے : (۱) وہ ہر طرح کے لوگوں کو اپنے گرد جمع نہیں ہونے دیتے تھے، اور جوالقوں اور قلندروں کی شاذ ہی ان تک رسائی ہوتی تھی؛ چنانچہ ان سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ مجھے عام لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں؛ (۲) وہ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے اور ان کی خانقاہ میں غلّے کے ذخیرے بھی تھے اور مال و دولت بھی؛ (۳) وہ مسلسل روزے رکھنے کے عادی نہ تھے؛ (۴) گو سلسلۂ چشتیہ میں زمین‌بوسی عام تھی، مگر وہ کسی کو اپنے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے؛ (۵) وہ فرمانرواؤں اور ان کے عہدے داروں سے گہرے روابط رکھنے کے قائل تھے؛ (۶) وہ سماع کے قائل نہیں تھے ۔

بہاءالدین زکریاؒ کا قرون وسطٰی کی سیاسیات پر گہرا اثر و رسوخ تھا، چنانچہ ملتان پر اقتدار قائم رکھنے میں انہوں نے اِلتُتمِش (۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تا ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) کو بڑی مدد دی اور اس کا دیا ہوا اعزازی لقب ”شیخ الاسلام“ بھی قبول کیا ۔ ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں جب منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا اور ہرات کا حکمران بھی ان کے ساتھ مل گیا تو شیخ نے اپنے پاس سے حملہ‌آوروں کو ایک لاکھ دینار کی رقم پیش کی اور انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر راضی کر لیا ۔

شیخ ملتان میں ایک بڑے شاندار مقبرے میں مدفون ہیں ۔ اس پر نصف دائرے کی شکل کا گول گنبد ہے، جسے چینی کی خوبصورت کاشی سے مزیّن کیا گیا ہے ۔

مآخذ : سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے متعلّق کوئی سہروردی تذکرۂ احوال نہیں ملتا، تاآنکہ ۱۳۱۱ھ میں شیخ جمالی نے اپنی کتاب سِیَرُ العارفین (دہلی) میں جس قدر احوال انہیں چشتیہ ذرائع سے مل سکے جمع کر دیے ۔ اصلی ذرائع کے لیے دیکھیے (۱) حسن سجزی : فوائدُ الفؤاد، مطبوعۂ نول‌کشور ۱۳۰۲ھ، ص ۵، ۶، ۱۰، ۲۹ ببعد؛ (۲) حمید قلندر : خیرالمجالس، طبع کے ۔ اے نظامی، علیگڑھ ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۱، ۱۳۷، ۲۸۳؛ (۳) میر خورد : سیرالاولیاء، دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۷۷، ۹۱، ۱۵۸؛ (۴) سیف بن محمد : تاریخ نامۂ ہرات [طبع محمد زبیر صدّیقی]، کلکتہ ۱۹۴۳ء، ص ۵۹ تا ۱۵۸؛ (۵) جامی : نفحاتُ الاُنس، نولکشور ۱۹۱۵ء، ص ۵۰۲؛ نیز دیکھیے (۶) عبدالحق محدّث : اَخبار الاَخیار، دہلی ۱۳۰۹ھ، ص ۲۶ تا ۲۷ [اردو ترجمہ از اقبال الدین احمد، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۵۸ ببعد]؛ (۷) غوثی : گلزارِ اَبرار، طبع Ivanow، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ص ۹۸ ببعد؛ ۱۸؛ (۸) عبدالرحمٰن چشتی : مِرآۃ الاَسرار، (مخطوطہ در

ذاتی مجموعہ، ص ۴۹۳ تا ۴۹۷)؛ (۹) غلام معین الدین : معارج الولایة، (ذاتی مجموعہ)، ۱ : ۳۸۹ تا ۳۹۸؛ (۱۰) *Gazetteer of the Multan District* : E.D. Maclagan، لاہور ۱۹۰۲ء، ص ۳۳۹ ببعد؛ [(۱۱) محمد شفیع : مقالات دینی و علمی، لاہور ۱۹۶۰ء، ۱ : ۲۲۹ تا ۲۳۱؛ (۱۲) انوار اصفیا، لاہور، ص ۱۸۷ ببعد؛ (۱۳) مرزا محمد اختر : تذکرۂ اولیائے ہند، دہلی ۱۹۲۸ء ص ۱۳۴ تا ۱۳۸].

(کے - اے - نظامی)

* **بہاءالدّین زُہَیر:** ابوالفضل بن محمد بن علی المُہلّبی الاَزْدی (بالعموم البہاء زہیر کے نام سے معروف ہے) - عہد ایوبی کا مشہور عربی شاعر، جو ۵ ذی الحجّہ ۵۸۱ھ / ۲۷ فروری ۱۱۸۶ء کو مکۂ مکرمہ میں پیدا ہوا - بہت ہی چھوٹی عمر میں وہ مصر چلا گیا جہاں قُوص (بالائی مصر) میں اس نے قرآن کریم اور ادب پڑھا - ۶۲۰ھ/۱۲۲۷ء کے قریب وہ مستقل طور پر مصر میں سکونت پذیر ہوگیا - البہاء زہیر سلطان الکامل کے بیٹے (شاہزادہ) الصّالح کی ملازمت میں رہا اور ۶۲۹ھ / ۱۲۳۱ - ۱۲۳۲ء میں شام اور بالائی عراق عرب کی مہم پر اس کے ساتھ گیا - جب الصّالح اپنے والد کے انتقال کے بعد ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء میں مصر سے واپس آ رہا تھا تو نابُلُس کے مقام پر اس کی فوج نے اس کے ساتھ غدّاری کی اور اسے اس کے چچازاد بھائی ناصر داؤد کے حوالے کر دیا، جس نے اسے قید کر دیا - زُہیر مصیبت کے ان دنوں میں بھی اپنے آقا کا وفادار رہا اور کچھ زمانہ نابُلُس ہی میں گزارا - جب الصّالح مصر کے تخت پر بیٹھا تو اس نے زہیر کو اپنا وزیر مقرر کر لیا اور اس پر انعام و اکرام کی بارش کی - ۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء میں جب بادشاہ المنصورة کے مقام پر ساتویں صلیبی جنگ (سینٹ لوئس) لڑ رہا تھا تو ہم اسے اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو پاتے ہیں - ایک غلط فہمی کی بنا پر وہ بادشاہ کا معتوب ہوا اور اپنے آقا کی موت پر وہ شام چلا گیا - یہاں اس نے دمشق کے بادشاہ الناصر یوسف کی خدمت میں بہترین قصیدے پیش کیے، لیکن اس کا مقصد بر نہ آیا - مایوس ہو کر وہ قاہرہ واپس چلا آیا اور زندگی کے باقی دن عزلت و عُسرت میں گزار دیے - بالآخر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں انتقال کیا.

اس کا دیوان پیرس میں (بخطوطہ، در کتاب خانۂ ملیہ، عدد ۳۱۷۳) اور بعض دوسرے مقامات پر محفوظ ہے اور اسے قاہرہ میں طبع کیا گیا ہے (۱۳۱۴ھ) - پامر Palmer نے انگریزی ترجمے کے ساتھ اس کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کیا ہے - یہ دیوان زہیر کے شاعرانہ خلوص اور اس کی شاعری کی موسیقیت اور ترنّم کا مظہر ہے - الفاظ، ہیئت، بحر اور اسلوب بیان کے معاملے میں، حسن انتخاب اور کلام کے آہنگ و ترنّم میں، ہر جگہ اس کے ذوق کی پختگی نمایاں ہے - باوجودیکہ وہ اپنے عہد کی شاعرانہ رسوم کا پابند ہے اور اس کے کلام میں صنائع بدائع کی کثرت ہے، اس کی شاعری میں کہیں تصنّع کا رنگ پیدا نہیں ہوا.

مآخذ: ابن خلّکان، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۲۳۵؛ (۲) ابن العماد : شذرات، قاہرہ ۱۳۰۱، ۵ : ۲۷۶؛ (۳) السُّیوطی : حسن المحاضرة، قاہرہ ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۳۲۷؛ (۴) المقریزی : سلوک، قاہرہ ۱۹۳۴ء، ص ۳۳۴؛ (۵) *The Diwan of Baha al-Din Zuhayr* : E. H. Palmer، کیمبرج ۱۸۷۶ء؛ (۶) *Le Diwan de Bahā'ad-Din Zoheir, Veriantes au texte arabe* : S. Guyard، پیرس ۱۸۸۳ء؛ (۷) مصطفی السقّا : ترجمة بہاء الدّین زہیر، قاہرہ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۹ء، (۸) مصطفی عبدالرزّاق : البہاء زُہیر، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ (۹) جودت رکابی : *La poésie profane sous les Ayyūbides*، پیرس ۱۹۴۹ء؛ (۱۰) براکلمان Brockelmann، ۱ : ۲۶۴ و تکملہ، ۱ : ۴۶۵.

(جودت رکابی)

* **بہاءالدین العاملی** : رک بہ العاملی.
* **البہائی** : رک بہ العاملی.
* **بہائی محمد افندی** : عثمانی فقیہ اور عالم دین - ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ - ۱۵۹۶ء میں استانبول میں پیدا ہوا - وہ روم‌ایلی کے قاضی عسکر عبدالعزیز افندی کا بیٹا اور سعد الدین مؤرخ کا پوتا تھا - مذہبی درس‌گاہ میں مختلف مدارج ترقی طے کرنے کے بعد وہ مدرس اور ملّا بن گیا اور پہلے سالونیکا میں اور بعد ازاں ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ - ۱۶۳۴ء میں حلب کا قاضی مقرّر ہوا - وہ تمباکو پینے کا بہت زیادہ عادی تھا، چنانچہ بیلر بے احمد پاشا کی شکایت پر، جس کے ساتھ اس کے تعلّقات اچھے نہ تھے، ۱۰۴۴ھ/ ۱۶۳۴ - ۱۶۳۵ء میں اسے موقوف کر کے بطور سزا قبرص میں جلا وطن کر دیا گیا، کیونکہ ان دنوں تمباکو نوشی ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا - ۱۰۴۵ھ کے اواخر (۱۶۳۶ء کے اوائل) میں اس کا قصور معاف ہوا اور محرم ۱۰۴۸ھ / مئی - جون ۱۶۳۸ء میں اسے شام کا ملّا بنا دیا گیا - صفر ۱۰۵۴ھ/ اپریل ۱۶۴۴ء میں اسے ادرنہ میں تبدیل کر دیا گیا - ربیع الاول ۱۰۵۵ھ/مئی ۱۶۴۵ء میں اسے استانبول کا قاضی بنا دیا گیا - اس کے بعد کچھ عرصہ وہ آناطولی اور روم‌ایلی کا قاضی عسکر رہا - اور رجب ۱۰۵۹ھ / جولائی - اگست ۱۶۴۹ء میں پہلی دفعہ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوا - قرا چلبی زادہ اس کا حریف تھا، چنانچہ اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس عہدے پر اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ مسکرات کے کثرتِ استعمال نے اسے بے‌حد ضعیف کر دیا تھا اور وزیر اعظم اور والدہ سلطان کا خیال تھا کہ وہ اس سے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کام نکالتے رہیں گے، لیکن اس کی قوت عمل نے اور وزیر اعظم اور والدہ سلطان کے بعض مطالبات کے سامنے اس کی استقامت اور پختگی نے قرا چلبی زادہ کے متذکرۂ صدر الزام کو غلط ثابت کر دکھایا - اس نے درویشوں کے مولویہ اور خلوتیہ سلسلوں کو جو مراعات دیں ان کی وجہ سے راسخ العقیدہ طبقے کے لوگ اس کے مخالف بن گئے - انھوں نے تمباکو اور قہوے کے استعمال سے شیخ الاسلام کی مسامحت نیز درویشوں کے سماع و رقص کے بارے میں اس کی رواداری پر بھی اعتراضات کیے، لیکن اس کے زوال میں ان کی کوشش کو دخل نہ تھا بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور تھیں - جمادی الاولٰی ۱۰۶۱ھ / اپریل - مئی ۱۶۵۱ء میں جب حلقۂ اختیار کے سوال پر اِزمیر [سمرنا] کے قاضی اور وہاں کے برطانوی قونصل کے درمیان تنازعہ رونما ہوا تو بہائی افندی نے استانبول کے برطانوی سفیر کو اس کے مکان میں نظربند کر دیا - سفارتی مراعات کی اس خلاف ورزی پر اس کی موقوفی عمل میں آئی اور اسے جلاوطن کر کے مِدِلّی بھیج دیا گیا - بہر کیف وہ گیلی پولی اور لمپسجہ میں مقیم رہا، تاآنکہ رمضان ۱۰۶۲ھ/ اگست ۱۶۵۲ء میں اسے اپنے عہدے پر دوبارہ بحال کر دیا گیا، اور اپنی موت تک، جو ۱۳ صفر ۱۰۶۴ھ/ ۳ جنوری ۱۶۵۴ء کو بعارضۂ خناق واقع ہوئی، وہ اسی عہدے پر فائز رہا - اسے قبرستان فاتح میں دفن کیا گیا .

بہائی شاعر اور عالم دونوں حیثیتوں سے معروف ہے - اس نے اپنے پیچھے اپنی نظمیں اور فتاوی چھوڑے ہیں - اس کا مشہورترین فتوٰی وہ ہے جس میں اس نے تمباکو نوشی کو جائز قرار دے کر سترھویں صدی عیسوی کے اوائل کے امتناعی احکام اور سختی کا خاتمہ کر دیا - وہ خود تمباکو کا رسیا تھا - اس کا معاصر حاجی خلیفہ لکھتا ہے کہ اگر وہ اس عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو اس کا شمار ملک کے ممتازترین علما میں کیا جاتا - بہر کیف

حاجی خلیفه کا بیان یه ہے که بهائی نے تمباکو کے جواز کا جو فتوی دیا وہ اس بنا پر نہیں تھا که وہ خود اس کا شکار تھا بلکه اس لیے که یه نه صرف لوگوں کے مناسب حال تھا بلکه اسے یه بھی یقین تھا که شرع اسلام کا بنیادی قانون ''اباحتِ اصلیه'' ہے اور بس .

مآخذ: (۱) نعیما: سال ۱۰۵۹ھ، ۱۰۶۱ھ، ۱۰۶۲ھ، ۱۰۶۴ھ؛ (۲) حاجی خلیفه: میزانُ الحقّ، استانبول ۱۲۹۰ھ، ص ۴۲ تا ۴۳ (= *The Balance of Truth*، ترجمه G.L. Lewis، لنڈن ۱۹۵۷ء، ص ۵۶ تا ۵۷)؛ (۳) احمد رفعت: دوحة المشائخ، استانبول بدون تاریخ، ص ۵۵ تا ۵۷؛ (۴) علمیّه سالنامه سی، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۵۰۸ (اس کی تحریر کے نمونوں کے ساتھ)؛ (۵) عثمانلی مؤلّف لری، ۲ : ۱۰۱؛ (۶) سجّلِ عثمانی، ۲ : ۲۹؛ (۷) Hammer-Purgstall، بمدد اشاریه؛ (۸) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : عثمانلی تاریخی، ج ۳ / حصّهٔ اول، انقره ۱۹۵۱ء، بمدد اشاریه؛ (۹) Gibb : *Ottoman Poetry*، ۳ : ۲۹۳ تا ۲۹۷؛ (۱۰) اس کے متعدد فتاوی عثمانی قوانین شائع شدہ در *MTM*، ج ۱، میں درج ہیں .

(B. Lewis)

⊗ **بہائیت**: اس مذہب کی بنیاد مرزا حسین علی نوری نے رکھی، جسے اس کے مقتدا علی محمد باب (رک به باب) نے بہاءاللہ (رک بآں) کا لقب دیا تھا ۔ باب نے اپنے بعد ایک ایسے شخص کی بعثت کی خبر دی تھی جسے اس نے من یُظْہِرُہُ اللہ کا نام دیا تھا ۔ اور ایک بیان میں اس کا زمانه بہت ہی قریب بتایا تھا ۔ آخر بابیوں میں سے ایک شخص ''جناب دیّان'' مرزا اسد اللہ خوئی نے من یُظْہِرُہُ اللہ کا دعوی کر دیا، لیکن مرزا یحیی (صبح ازل) اور مرزا حسین علی (بہاءاللہ) نے اس کی شدید مخالفت کی ۔ یه شخص سریانی اور عبرانی زبانیں بھی جانتا تھا ۔ آخر یه قتل ہو گیا ۔ اس کے متبع اسدی کہلاتے ہیں ۔ جناب دیّان کے بعد اور بہت سے بابیوں نے بھی من یُظْہِرُہُ اللہ کا مصداق ہونے کا دعوی کیا، جیسے مرزا عبداللہ غوغا، حسین میلانی المعروف حسین جان، حسین ہندیانی، مرزا محمد زرندی ۔ براؤن نے تو یہاں تک لکھا که دعووں کا یه سلسله اتنا بڑھ گیا که جو شخص بھی نیند سے بیدار ہوتا وہ یہی دعوی کرنے لگتا (نقطة الکاف پر براؤن کا دیباچه، ص m) ۔ بہاءاللہ ۱۲۶۵ھ میں جنگ قلعهٔ شیخ طبرسی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے راستے ہی میں گرفتار ہو گیا ۔ حکومت نے مزید تحقیقات کے لیے پورے قافلے کو آمل کی طرف روانه کر دیا ۔ راستے میں موقع پا کر بہاءاللہ نے اپنے ساتھیوں کو، جب وہ ایک دریا کے کنارے پر تھے، اشارہ کیا که ان تمام تحریرات کو جو ان کے پاس ہیں دریا برد کر دیں (*The Dawn Breakers*، ص ۳۶۹) ۔ آمل پہنچ کر بہاءاللہ نے مختلف بیانات دے کر اپنے بعض ساتھیوں کو حکومت کی قید سے رہا کروا لیا ۔ اپنے ایک ساتھی ملّا باقر کے متعلّق کہا که اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں، یه تو اپنے کام سے مشہد جا رہا تھا، اسے بلا وجه ہمارے ساتھ گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ میرزا جانی کاشانی کے متعلق کہا که یه تو محض ایک تاجر ہے اور میرے پاس صرف بطور مہمان قیام پذیر تھا ۔ صبح ازل کو اپنا نوکر ظاہر کیا ۔ تاہم بہاءاللہ خود قید میں رہا ۔ یه اس کی دوسری گرفتاری تھی ۔ اس سے پہلے اسے قرّةُ العین (رک بآں) کے خسر ملا تقی قزوینی کے قاتلوں کی امداد کے سلسلے میں تہران میں گرفتار کیا گیا تھا ۔ تیسری گرفتاری اس وقت ہوئی جب ۲۸ شوال ۱۲۶۸ھ / ۱۵ ۔ اگست ۱۸۵۲ء کو شاہ ایران نصیرالدین شاہ پر چند بابیوں نے قاتلانه حمله کیا ۔ اس موقع پر جن بابیوں کو گرفتار کیا گیا ان میں بہاءاللہ بھی تھا ۔ بہاءاللہ نے خود اس گرفتاری

کا حال لکھا ہے ۔ (لوح ابن ذئب) ۔ یہ قید چار ماہ رہی ۔ اس کے بعد بہاءاللہ نے اکتوبر ۱۸۵۲ء، ۱۸۶۷ء میں یا بقول مشہور بہائی مصنف مرزا جواد ۱۸۶۳ء میں دعوی کیا کہ در اصل وهی من یظہرہ اللہ ہے ۔ صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے اس دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بابیوں کی اکثریت نے بہاءاللہ کے دعوے کو تسلیم کر لیا ۔

بہائیت اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ ایک الگ مذھب ہے اور اس کے ماننے والے، اپنے خیال میں اسے دیگر مذاهب سے بہتر مانتے ہیں ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون ارتقا کا ایک طبعی نتیجہ ہے کہ جو بعد میں آتا ہے پہلے سے بہتر اور افضل ہوتا ہے ۔ بہائی تعلیمات اور معتقدات کا بہت بڑا حصّہ اسمٰعیلی عقائد و تعلیمات سے مماثل ہے ۔

بہاءاللہ کا دعوی کیا تھا؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ۔ باب کے دعوے کی طرح بہاءاللہ کا دعوی بھی خاصا الجھا ہوا ہے اور اسے سمجھنا آسان کام نہیں ۔ بہاءاللہ کے بارے میں بہائی کچھ اسی قسم کا تصور رکھتے ہیں کہ گویا بہاءاللہ خود خدا تھا جو انسانی شکل اور انسانی حوائج کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ۔ بہائی لٹریچر میں پہلے انبیا کو بھی ظہورِ الٰہی قرار دیا گیا ہے، اور خود بہاءاللہ بھی خدا تھا، جس نے انسانیت کا جامہ پہن لیا ۔ بہاءاللہ نے لوح اشراقات میں معصومیت کی بحث کرتے ہوے لکھا ہے کہ دوسری قسم کی معصومیت وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے : لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱ [الانبیاء] : ۲۳) قرآن مجید میں اسے صفاتِ الٰہیہ میں سے قرار دیا گیا ہے اور ان کے خیال میں بہائیوں کے نزدیک یہی معصومیت بہاءاللہ کو حاصل تھی، کیونکہ بہاءاللہ کو من یظہرہ اللہ ہونے کا دعوی تھا اور باب نے من یظہرہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ کا مصداق ہوگا (بیان، ۳ / ۱) ۔ پھر لکھا ہے : وہ زندگی کا میدان ہے (بیان، ۳ / ۱۳)، وہ الٰہ ہے (بیان، ۳ / ۱۳، ۸ / ۱) ۔ پھر لکھا ہے : بیان کا اصل مصنّف وهی من یظہرہ اللہ ہے (بیان، ۶ / ۱) ۔ تمام الٰہی اسماء و صفات کا وہ منبع ہے (بیان، ۵ / ۹)۔ پھر بہاءاللہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود ہی ذاکر اور خود ہی مذکور تھا (الاقدس، ص ۱۷۰) ۔ اسی طرح بہاءاللہ نے خود کو مکلّم طُور (= جو طُور پر بولا) کہا ہے (نعوذ باللہ).

پروفیسر براؤن کی یہی تحقیق ہے کہ بہاءاللہ کا دعوی خدا ہونے کا تھا ۔ ان کے نزدیک بہاءاللہ کا دعوی ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے God in Flesh اور Devine incarnation (دیکھیے نقطة الکاف پر براؤن کی تعلیقات) ۔ بہائیوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس کا یہی مقام مانتی ہے (دیکھیے مشہور بہائی مصنف مرزا محمد جواد قزوینی کی عربی کتاب کا انگریزی ترجمہ از پروفیسر براؤن، در *Materials for the Study of the Babi Religion*، ص ۱۱۱) ۔ امریکہ میں بہائی مذھب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلّغ ڈاکٹر ابراهیم جارج خیراللہ، جسے عبدالبہاء نے بہاءاللہ کا پطرس اور دوسرا کولمبس قرار دیا، (*Materials for the Study of the Babi Movement*، ص ۹۹؛ ڈاکٹر خیراللہ کے بقیہ حالات کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ص ۹۳ ببعد) بہاءاللہ کو بطورِ خدا ھی پیش کرتا تھا ۔ امریکہ میں مس اے ۔ ایچ، جو ڈاکٹر خیراللہ کے امر بہائی کے متعلق خطبات کے ایک پورے سلسلے میں حاضر تھی، پروفیسر براؤن کے نام اپنے خط میں لکھتی ہے : ڈاکٹر خیراللہ کے نزدیک بہاءاللہ خود خدا تھا (Baha was God himself) ۔

ڈاکٹر خیراللہ نے بتایا کہ ''۱۸۵۲ء میں خدائے مجسم، یعنی بہاءاللہ ظاہر ہوا'' (حوالۂ سابق) ۔ امریکہ میں بہائی بننے کے لیے جو بیعت فارم شائع کیا گیا اس کے الفاظ یہ ہیں : ''اے اعظم (یعنی عبدالبہاء) خدا کا نام لے کر میں بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے خالق برتر و توانا خدا کی توحید کا اقرار کرتا ہوں اور خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے پر میرا ایمان ہے In God's name, the Greatest Branch, I humbly confess the oneness and singleness of the Almighty God, my Creator, and I believe in his appearance in the human form... (بحوالۂ سابق) اور بہائی میگزین کا موقف یہ ہے کہ بہاءاللہ کا دعوٰی خدا ہونے کا نہ تھا ۔ بہائی کتابوں میں باقی نبیوں کے زمانے بڑے بڑے ادوار میں مربوط کیے گئے ہیں، لیکن بہائیوں کے نزدیک باب اور بہاءاللہ کی آمد پر بعث انبیاء کا دور جو آدم سے شروع ہوا تھا ختم ہو گیا.

بہائی جملہ انبیا کے ادیان کو اساسًا برحق مانتے ہیں، لیکن ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اب بہائی مذہب بہترین مذہب ہے اور اب گزشتہ شریعتوں پر نہیں بلکہ بہائی شریعت پر عمل سے نجات ملے گی.

بہائیوں میں اگرچہ اجتماعی عبادت کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی، لیکن کتاب الاقدس میں ''مشرق الاذکار'' (= وہ جگہ جہاں صبح صادق کے وقت اسم الٰہی کا ذکر کیا جائے) تعمیر کرنے کی سفارش کی گئی ہے ۔ اس عمارت کو ایک قسم کی عبادت گاہ سمجھنا چاہیے، گو اس سے بعض دوسرے معاشرتی معاملات بھی منسلک کیے گئے ہیں ۔ اس کے نقشے کے بارے میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مدوّر ہو، جس کے اوپر نو حصّوں پر مشتمل ایک بڑا گنبد بنایا جائے ۔ ۱ مئی ۱۹۱۲ء کو عبدالبہاء نے شکاگو کے قریب جھیل مشی گن کے کنارے دلمیا (Illynos) میں ایک ''مشرق الاذکار'' کا سنگ بنیاد رکھا ۔ ۲ جون ۱۹۵۳ء کو ولی امراللہ شوقی افندی کی امریکن بیوی کی موجودگی میں اس کا افتتاح ہوا ۔ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی عشق آباد (روس) میں ایک ''مشرق الاذکار'' تعمیر ہوا تھا.

بہائی شریعت کے معاشرتی مسائل اس طرح ہیں کہ بلا امتیاز مذہب و ملّت بلکہ مشرکین سے بھی شادیاں جائز ہیں، ایک وقت میں دو بیویاں رکھی جا سکتی ہیں ۔ کتاب الاقدس میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے ۔ خود بہاءاللہ کی دو بیویاں تھیں، لیکن اب بہائی تعدد ازدواج کو ناجائز قرار دیتے ہیں ۔ عبدالبہاء نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا ہے ۔ مہر پچانوے مثقال سونے سے زیادہ مقرر کرنا جائز نہیں.

قبلہ عکّہ ہے ۔ روزے انیس جو طلوع شمس سے غروب شمس تک ہوتے ہیں ۔ زکوٰۃ کے نصاب کے ذکر کا کتاب الاقدس میں وعدہ دیا گیا، لیکن اس میں یہ نصاب کہیں نہیں ملا ۔ بہائی شریعت میں بعض تعزیرات بھی ملتی ہیں، مثلاً مکانوں کو نذر آتش کرنے والے کو جلا دیا جائے یا پھر حبس دوام ۔ زنا کی سزا صرف نو مثقال (ایک مثقال = ۶۰ گرین تقریبًا) جرمانہ ہے ۔ دوسری دفعہ اس جرم کے ارتکاب پر اٹھارہ مثقال.

انیس کے عدد کو امر بہائی میں بڑی اہمیت، عظمت اور تقدس حاصل ہے ۔ حروف حیی کو بھی امر بہائی میں بڑا تقدس حاصل ہے ۔ بہائی تعلیمات میں اخفائے راز کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے ۔ ''ذَہبک، ذَہابک و مذہبک''، یعنی اپنی دولت، اپنے سفر کی منزل مقصود اور اپنے مذہب کے چھپانے کی تلقین ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہے.

بہائیوں کی مجالس مقندرہ دو قسم کی ہیں ۔

انتظامی اور ارشادی ـ انتظامی مجالس انتخاب کے ذریعے بنتی ہیں اور ارشادی مجالس ایسے اشخاص اور گروہوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کی نامزدگی مرکز کی طرف سے ہوتی ہے ۔ یہ دونوں قسم کے نظام جماعتی تنظیم کی اعلٰی‌ترین سطح، یعنی ولی‌الامر کی شخصیت میں پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں ۔

ولی امراللہ کا عہدہ موروثی ہے، لیکن باپ کے بعد لازماً اس کے بڑے بیٹے کو اس کا جانشین نہیں بنایا جاتا ۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو اس عہدے کے لیے نامزد کر دیتا ہے ۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ بہائی مذہب کا رئیس اعلٰی ہمیشہ بانی مذہب بہاء اللہ کی اولاد میں سے ہو اور اس خاندان کا اقتدار اعلٰی ہمیشہ قائم رکھا جائے ۔

نظم و نسق کے اس پورے نظام کو بہائی منزّل من اللہ خیال کرتے ہیں ۔ اور ''بیت‌العدل'' کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی حفاظت میں کام کرتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں : ایسے امور میں جو بہائی شریعت میں موجود نہیں اللہ تعالٰی ''بیت العدل'' کو الہام کرے گا ۔ گویا ''بیت‌العدل'' شریعت بھی بنا سکتا ہے اور ضرورت اور اقتضاے وقت پر شریعت میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے ۔

بہائی سال میں پانچ عیدیں مناتے ہیں : (۱) ظہور بہاء اللہ پر عید رضوان؛ (۲) عید بعثت باب؛ (۳) عید میلاد بہاء اللہ؛ (۴) عید میلاد باب؛ (۵) عید نو روز ۔

بہائیوں کو انیس دن کے روزے رکھنے کے لیے کہا گیا ہے، یعنی بابی تقویم کے ماہ اعلٰی میں جو ۲ مارچ سے شروع ہو کر ۲۱ مارچ کو ختم ہو جاتا ہے، جب بہائیوں کی عید نو روز ہوتی ہے ۔

مآخذ : (۱) بہاء اللہ کی تالیفات؛ (۲) باب کی تالیفات؛ (۳) صبح ازل کی تالیفات، مثلاً ذیل بیان، فارسی، مستیقظ، آثار ازلیہ، احکام بیان، الواح ازل، ریاض المہتدین، صحائف ازل، کتاب الحیوۃ، کتاب نور، لمعات الازل، مرآۃ البیان، کتاب الهیاکل؛ (۴) عبدالبہاء عباس افندی کی تالیفات، مثلاً (ا) اسرار الغیبۃ لاسباب المدنیّۃ (فارسی)، بمبئی ۱۸۹۳ء، عربی ترجمہ الرسالۃ المدنیّۃ، قاہرہ ۱۹۱۱ء، انگریزی ترجمہ *The Mysterious Forces of Civilization*، شکاگو ۱۹۱۸ء؛ (ب) الالواح و الوصیۃ، قاہرہ ۱۹۲۴ء، جانشینی کے بارے میں اہم دستاویزات، (ج) النورالابہٰی، عبدالبہاء کے ملفوظات، قاہرہ ۱۹۲۰ء، انگریزی ترجمہ *Some Answered Questions*، لنڈن ۱۹۰۸ء، فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۹۲۹ء؛ (د) الالواح، انگریزی ترجمہ *Tables of Abdul Baha*، نیویارک ۱۹۳۰ء؛ (ہ) مکاتیب عبدالبہاء، قاہرہ ۱۹۱۰ - ۱۹۲۱ء؛ (و) Wilmette : *Selected Writings of Abdul Baha*، ۱۹۴۲ء؛ (۵) *Abdul Baha on Divine Philosophy*، بوسٹن ۱۹۱۸ء؛ (۶) M. H. Phelps : *Life and Teaching of Abbas Effendi*، لنڈن ۱۹۱۲ء، جرمن ترجمہ، شٹٹ گارٹ ۱۹۲۲ء؛ (۷) شوقی افندی کی تالیفات، مثلاً (الف) *God Passes by*، ۱۹۴۰ء؛ (ب) *The Dispensation of Bahaullah*؛ (ج) *Bahai Administration*؛ (د) *The Hidden Word*، لنڈن ۱۹۴۲ء؛ (ہ) لوح قرن، مکتوب جو اس بہائی کی پہلی صد سالہ جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا؛ (و) *Prayers and Meditation*، نیویارک ۱۹۳۸ء؛ (۸) فضل الدین وکیل : بہائی مذہب کی حقیقت، قادیان ۱۹۳۰ء؛ (۹) محمد علی لاہوری : *History and Doctrines of Bahi Movement*، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۱۰) Edward G. Browne : *Materials for the study of the Babi Religion*، کیمبرج ۱۹۱۸ء؛ (۱۱) وہی مصنّف، در *JRAS*، ۱۸۸۹، ۱۸۹۲، ۱۸۹۷ء؛ (۱۲) وہی مصنّف : *Study of Babi Religion*، کیمبرج ۱۹۱۸ء؛ (۱۳) وہی مصنّف : *The Babi's of Persia*؛ (۱۴) وہی مصنّف : *A Year Amongst the Persians*، ۱۸۹۳ء؛ (۱۵) وہی مصنّف : *The Personal Reminis-*

Reminis-cences، ۱۸۸۰ء؛ (۱۶) مقالۂ سیاح، انگریزی ترجمه از براؤن The Traveller's Narrative، مع تعلیقات، کیمبرج ۱۸۹۱ء؛ (۱۷) مرزا جانی کاشانی : نقطة الکاف، انگریزی ترجمه مع تعلیقات از پروفیسر براؤن؛ (۱۸) الفضل الجرباذقانی : کتاب الفوائد، قاهره؛ (۱۹) محمد تقی همدانی : احقاق حق، بدون تاریخ؛ (۲۰) مرزا ابوالفضل : الفوائد، قاهره ۱۳۱۵ھ؛ (۲۱) حسین قلی : منهاج الطالبین، بمبئی ۱۳۲۰ھ؛ (۲۲) نامعلوم ازلی مصنّف : تذکرة الغافلین؛ (۲۳) مرزا محمد مہدی خان : تاریخ البابیة، قاهره ۱۹۰۳ء؛ (۲۴) ابوالفضائل : الحجج البهیّة، قاهره ۱۹۲۵ء، انگریزی ترجمه The Babi Proofs؛ (۲۵) وهی مصنّف : مجموعۂ رسائل، قاهره ۱۹۲۰ء؛ (۲۶) نبیل زرندی : تاریخ نبیل، انگریزی ترجمه از شوقی افندی The Dawn Breakers، نیویارک ۱۹۳۲ء؛ (۲۷) تاریخ جدید، انگریزی ترجمه New History of the Bab، کیمبرج ۱۸۹۳ء؛ (۲۸) محمود زرقانی : بدائع الآثار، بمبئی ۱۹۱۴ - ۱۹۲۱ء؛ (۲۹) نبیل افندی : تاریخ صعود حضرت بهاءالله، قاهره ۱۹۲۴ء؛ (۳۰) القول الفصل، ۱۹۰۲ء (مرزا محمد علی کی تائید میں)؛ (۳۱) جواب پروفیسّر المانی دکتور فورل، قاهره ۱۹۲۲ء؛ (۳۲) مرزا بدیعُ الله (ابن بهاءالله : رسالہ (۷۵ صفحات جس میں اس نے اپنے بھائی محمد سے علیحدگی کے اسباب بیان کیے ھیں)؛ (۳۳) واقعۂ هائلۂ خادم البهی در روضۂ مبارکۂ علیا؛ (۳۴) مرزا جانی کاشانی : رسالہ، مرزا محمد علی کی تائید میں؛ (۳۵) اتیان الدلیل لمن یرید الاقبال الی سواء السبیل، قاهره ۱۹۰۰ء؛ (۳۶) مائدۂ آسمانی، تہران ۱۹۴۷ء؛ (۳۷) الزرکلی : الاعلام، بار دوم، ۲ : ۱۷۲؛ (۳۸) Arthur Pilsbury : Whence, Why, Wither، میساچیوسٹس (امریکه)؛ (۳۹) Hippolyte Dryfus : The Universal Riligion، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۴۰) Charles Mason : The Bahai Movement، واشنگٹن ۱۹۱۳ء؛ (۴۱) Miss Ethel Rosenberg : A Brief Account of Bahai Movement، لنڈن ۱۹۱۱ء؛ (۴۲) Samual Graham Wilson : Bahaism and its Claims، نیویارک ۱۹۱۵ء؛ (۴۳) Lady Blomfield : The Chosen Highways، لنڈن ۱۹۴۰ء؛ (۴۴) M. Hamford Ford : The Oriental Rose، نیویارک ۱۹۱۰ء؛ (۴۵) Ibrahim George Khayrullah : Dab-ed-Din، شکاگو ۱۸۹۷ء؛ (۴۶) وهی مصنّف : Bahaullah، شکاگو ۱۹۰۰ء؛ (۴۷) وهی مصنّف : The Door to True Religion، شکاگو ۱۸۹۷ء؛ (۴۸) وهی مصنّف : Facts for Behaists، شکاگو ۱۹۰۱ء؛ (۴۹) وهی مصنّف : The Three Questions، مقام و تاریخ طبع ندارد؛ (۵۰) Encyclopaedia Religion and Ethics، تحت باب؛ (۵۱) Encyclopaedia Britannica، ۱۹۵۰ء، ۲ : ۹۲۸ ببعد؛ (۵۲) Hastings : Dictionary of Religions؛ (۵۳) مجله Ninetheenth Century and after، فروری ۱۹۱۰ء؛ (۵۴) مجلـه، American Journal of Theology، جنـوری ۱۹۰۲ء؛ (۵۵) مجله Bahi News، جو شکاگو سے ۱۹۱۰ء کو هر انیس دن کے بعد نکلنا شروع هوا۔ ایک دفعه انگریزی میں اور دوسرا فارسی میں جس کا نام پہلے پیامبر باختر اور بعد میں نجم باختر تھا؛ (۵۶) New York Herald، ۱۹۰۰ء؛ (۵۷) The Babai Words، ۱۲ مجلدات از ۱۹۲۵ تا ۱۹۵۷ء؛ (۵۸) احمد کرمانی روحی : هشت بهشت؛ (۵۹) رضا قلی خان : ضمیمۂ روضات الصفا؛ (۶۰) لسان الملک : ناسخ التواریخ؛ (۶۱) دائرة المعارف (عربی) مقالہ از سیّد جمال الدین؛ (۶۲) محمد مہدی خان : مفتاح باب الابواب، قاهره ۱۳۲۱ھ؛ (۶۳) حاجی عبدالرحمٰن : رجم الشیطٰن فی رذائل البیان، نورح ۱۸۹۲ء؛ (۶۴) اخبار کوکب هند کے فائل جو پہلے آگرے اور پھر دهلی سے نکلتا تھا، مدیر محفوظ الحق علمی؛ (۶۵) بہائی میگزین، لاهور، مدیر محفوظ الحق علمی۔

(عبدالمنان عمر)

* **بہادر:** یہ لفظ التائی زبانوں میں عام طور سے مروّج ہے اور ترکی، مغولی اور تُنگُز بولیوں میں بھی اتنا ہی عام ہے ۔ اس کے توصیفی معنی ''شجاع اور بہادر'' کے ہیں، لیکن یہ عام طور پر 'بطل' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ بسا اوقات اس کا استعمال خاندانی لقب یا اعزازی خطاب کے طور پر بھی ہوتا ہے ۔ یہ لفظ سب سے پہلے سُوئی خاندان کی چینی تاریخ میں ملتا ہے، جو ساتویں صدی کے شروع میں لکھی گئی تھی۔

چینی تحریر میں اس کی آواز mo. ho. to کی ہے ۔ جس سے تین جزئی لفظ Bayatur کا سراغ ملتا ہے، جو نویں صدی میں جدید بلغروں میں Bayατοὺρ کی صورت میں لکھا جاتا ہے ۔ ایک اویغور رُونی (runic [قدیم سکنڈے نیوین حروف]) مخطوطے میں، جو آٹھویں سے دسویں صدی تک کا ہو سکتا ہے، باتُر bātur کا لفظ موجود ہے اور یہ دو جزئی صورت ترکی بولیوں میں بہت عام ہے، مثلاً عثمانی ترکی میں باتور (batur)، قازق اور باشکر (Bashkir) میں باتر (batir)، ازبک میں بتیر (botir)، توون میں مادیر، چواش Chuvash میں پتار (Pattar) وغیرہ ۔ بعض ترکی بولیوں میں سہ جزئی صورتیں بھی موجود ہیں، مثلاً کومن میں بایاتور، لیکن قیاس کہتا ہے کہ وہ مغولی بولی سے مستعار لی گئی ہیں ۔ مذکورۂ بالا شکل کے علاوہ ازبک میں بقودر baqgodir کی شکل بھی ملتی ہے ۔

اس لفظ کی توثیق قدیم‌ترین مغولی دستاویزات (تیرھویں صدی) سے ہوتی ہے، جہاں یہ ہمیشہ ایک سہ جزئی لفظ کی صورت میں لکھا جاتا ہے ۔ اگرچہ مغولی عہد کے چینی مآخذ اسے ہمیشہ bādu(r) کے بجائے pa-tu لکھتے ہیں ۔ کلاسیکی مغولی میں اس کی شکل بایاتور bayatur ہے اور اس کی مختلف بدلی ہوئی شکلیں قریب قریب سب بولیوں میں موجود ہیں، مثلاً قلموق میں باتر bātr، جدید ادبی خَلْخَہ میں بَتار Bataar، منگور Monguor میں باتاور Bāt'ur ۔ تنگوزی Tunguz بولیوں میں سے مانچو Manchu میں اس کی شکل baturu ہے، اونکی Evenki میں بہاتِر bahatir اور اوِن Even میں باگتِر bagtir اور بُکاتِر bukatir.

یہ فیصلہ دشوار ہے کہ کونسا لفظ کس نے کس سے مستعار لیا، لیکن قیاس کہتا ہے کہ ترکی یا مغولی سہ جزئی شکلیں اصل تھیں اور تنگوزی شکلیں دراصل مغولی سے مستعار لیے ہوئے الفاظ ہیں ۔ ایک ہی گروہ کی بولیوں میں یہ باہمی لین دین ضرور عام طور سے ہوا ہوگا۔

بہادر کا لفظ بدیہی طور پر تہذیب و تمدن کے عہد کا لفظ ہے ۔ اس نے شمال میں دور تک سفر کیا اور ہمیں یہ سائبیریا اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ملتا ہے، مثلاً اوستیاک Ostiak میں متُر Matur اور ہنگری زبانوں میں be.ar (گیارھویں صدی)۔ یہ اور بعض سلاوی شکلیں، مثلاً روسی کا بوگاتیر bogatir ترکی یا مغولی سے مستعار ہے ۔ فارسی کا ''بہادر'' جو مغولی سے لیا گیا ہے مسلمان حکمران خاندانوں میں خطاب یا عرف کے طور پر کثرت سے استعمال ہوتا تھا، چونکہ یہ لفظ [پاک و ہند کے] عظیم مغلوں کے ہاں بھی رائج تھا اس لیے انگریزی عہد میں بھی آ گیا اور ایسے مغرور اور نمایشی شخص کے معنوں میں بولا جانے لگا جو اپنے عارضی اختیار کو اپنی برتری کے شدید احساس کے ساتھ استعمال کرتا ہو (*Hobson-Jobson* : Yule).

یہ لفظ مغربی یورپی مآخذ میں بھی داخل ہو گیا، چنانچہ وارد Varad کا پادری (canon) راجر Roger، ۱۲۴۳ء، میں لکھتے ہوئے ایک مغول جرنیل کا نام بوختور Bochetor بتاتا ہے جس نے

ہنگری کے خلاف ایک مہم میں حصہ لیا تھا۔ تیمور کے دربار میں حکومت پرتگال کے سفیر کلاویژو Clavijo (۱۴۰۴ء) کے ہاں بہادر کا لفظ ہے۔

(D. SINOR)

* **بہادر خان** : رَکَ بہ [فاروقی (خاندان)] بہادرشاہ۔

* **بہادر شاہ** : رَکَ بہ نظام شاہی۔

* **بہادر شاہ اوّل** : محمد معظّم، اورنگ زیب عالمگیر کا دوسرا بیٹا، یہ اس کی دوسری بیوی رحمت النساء عرف نواب بائی، کے بطن سے تھا، جو راجوڑی (کشمیر) کے والی راجا راجُو کی بیٹی تھی۔ نواب بائی شاہزادۂ محمد سلطان کی بھی ماں تھی، جس کا انتقال ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں قید خانے میں ہوا اور بدرالنساء بیگم (۱۶۴۷ تا ۱۶۷۰ء) کی بھی جو حافظ قرآن تھی، اس کا انتقال ۱۶۹۱ء میں ہوا۔ معظّم ۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ/۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء کو برھان پور (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے پورے القاب یہ تھے: ابوُنَصر سیّد قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر شاہ بادشاہ۔ ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء سے جب کہ اس کا بڑا بھائی اورنگ زیب کے خلاف شاہ شجاع سے جا ملا تھا اسے تخت و تاج کا وارث سمجھا جاتا، اور ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء میں محمد سلطان کی موت پر اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ شعبان ۱۰۸۶ھ/اکتوبر ۱۶۷۵ء میں اسے شاہ عالم کا خطاب ملا۔

۱۶۶۳ء کے بعد اس کے والد نے اسے دکن میں مامور کر دیا اور سلطنت بیجاپور کے خلاف مہم میں اس سے کام لیا۔ ۱۰۹۳ھ/ ۱۶۸۳ - ۱۶۸۴ء میں وہ ایک لشکر کا سردار ہو کر کونکن کے راستے گوا گیا، جس کا مرھٹہ راجا شمبھا جی نے محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن چونکہ اس کا پرتگیزوں سے بگاڑ ہو گیا لہٰذا اس کا سامان رسد وغیرہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اسے نہایت خراب و خستہ حالت میں مراجعت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اسے بیجاپور اور گولکنڈے کے قطب شاہی خاندان کے خلاف مہم پر مامور کیا گیا۔ اورنگ زیب کا دل شاہزادۂ معظّم کی طرف سے صاف نہیں تھا اس لیے کہ اس نے اپنے بیٹے اکبر کی بغاوت پر غم و غُصہ کا اظہار نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے شہزادہ معظّم اور گولکنڈے کے ابوالحسن کے درمیان مصالحت کی کوشش کو اپنے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔ معظّم، جواب شاہ عالم کے نام سے معروف تھا ۴ مارچ ۱۶۸۷ء کو مع اپنے بیٹوں کے گرفتار کر لیا گیا۔ شروع شروع میں تو اس کے ساتھ شدید سختی کی گئی، لیکن یہ سختی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ اپریل ۱۶۹۵ء میں اسے رہا کر کے آگرے کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ ۱۶۹۹ء میں اسے صوبۂ کابل کا والی بنا دیا گیا، اور اس منصب پر وہ اپنے باپ کی وفات تک فائز رہا۔ اس دوران میں اس کے بڑے بیٹے ٹھٹّے اور ملتان کے حاکم رہے۔

۱۸ ذی الحجّہ ۱۱۱۸ھ/۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو اپنے باپ کی وفات کی خبر سن کر شاہزادۂ معظم بڑی تیزی سے دھلی کی طرف روانہ ہوا لاھور کے قریب پہنچ کر اس نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنی بادشاھی کا اعلان کر دیا، باپ کی وصیت کے احترام میں دکن کے صوبے اپنے بھائی اعظم شاہ کے سپرد کر دیے اور ۱۲ جون کو آگرے کے قریب پہنچا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/ ۱۸ جون ۱۷۰۷ء کو اعظم شاہ اور اس کا بیٹا بیدار بخت جاجو کے قریب ایک خونریز لڑائی میں مارے گئے، اور بہادر شاہ پوری مملکت کا واحد مالک ہو گیا۔ اورنگ زیب کے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش نے ۳ ذوالقعدہ ۱۱۲۰ھ/ ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو حیدرآباد دکن کے قریب شکست کھائی اور مارا گیا۔

بہادر شاہ کے مختصر سے عہد حکومت میں

تین مسئلے اس کی الجھن اور پریشانی کا سبب بنے رہے : مرہٹوں کا مسئلہ، راجپوتوں کا مسئلہ اور سکھوں کا مسئلہ ۔ ذوالفقار خان کے مشورے پر شیواجی کے پوتے شاھو کو رھا کر دیا گیا اور اسے ہفت ہزاری کا مغل منصب دے کر مہاراشٹرا واپس بھیج دیا گیا ۔ اس کے وہاں پہنچتے ھی اس کے اور اس کے چچا راجہ رام کی بیوہ تارابائی کے حامیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

۱۷۰۷-۱۷۰۸ء کی سردیوں میں بہادر شاہ نے اکبر کے سلسلۂ جانشینی کو مرتّب و منظّم کر دیا اور جودھ پور کے راجپوت راجہ کو اپنا مطیع بنا لیا ۔ لیکن کام بخش کے خلاف مہم جاری تھی کہ بغاوت کی آگ پھر بھڑک اٹھی ۔ ۱۷۱۰ء میں واپسی پر بادشاہ کو سکھوں کی بغاوت سے دو چار ہونا پڑا، چنانچہ وہ راجپوتوں سے مصالحت کرنے پر مجبور ہو گیا ۔ آخری سکھ گورو، گوبند سنگھ، بہادر شاہ کا معاون تھا، لیکن وہ ۱۷۰۸ء میں دکن میں قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بعد شمال میں بندا نامی ایک شخص نے سکھوں کی بغاوت کو از سر نو زندہ کر دیا ۔ اس نے وزیر خان کو قتل کر کے سرھند پر قبضہ کر لیا اور مشرقی پنجاب میں تہلکہ مچا دیا ۔ بہادر شاہ نے لوہگڑھ پر دھاوا بول دیا اور ۱۷۱۰-۱۷۱۲ء میں بندا کو شکست دی، لیکن اسے گرفتار نہیں کر سکا ۔ زندگی کے آخری چند مہینے لاھور میں گزار کر بالآخر ۲۰ محرم الحرام ۱۱۲۴ھ / ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو اس نے یہیں وفات پائی ۔ اس کے مرتے ھی اس کے چاروں بیٹوں، معزّالدین جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ میں تخت کے لیے لڑائی شروع ہوئی جس میں بالآخر معزالدین کو کامیابی ہوئی ۔

اروِن Irvine بہادر شاہ کے متعلّق لکھتا ہے : ''اگرچہ وہ بہت بڑا بادشاہ نہ تھا . . . لیکن خاصا کامیاب تھا'' ۔ وہ خلیق، عالم و فاضل، پرہیزگار، بہادر اور متحمل مزاج انسان تھا ۔ وہ فیاض بھی تھا اور کسی کی درخواست کو رد کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا ۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ ''بےخبر'' یا بےپروا کہلاتا تھا ۔ بہادر شاہ کی گھریلو زندگی کا زیادہ حال معلوم نہیں، البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کی تین بیویاں تھیں: مہرالنّساء بیگم، جو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ دھلی آئی؛ عزیزالنساء خانم اور نورالنّساء بیگم.

مآخذ : (۱) عبدالحمید لاھوری : پادشاہ نامہ (در Bibliotheca Indica، کلکتہ ۱۸۶۸ء)؛ (۲) محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری (در Bibliotheca Indica، کلکتہ ۱۸۷۱ء)؛ (۳) دانشمند خان علی : جنگ نامہ، مطبوعۂ نولکشور، چاپ سنگی؛ (۴) دانشمند خان : بہادر شاھنامہ، موزۂ بریطانیہ، مخطوطہ، عدد Or. ۲۴؛ (۵) بھیم سین : دلکشا، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۲۳؛ (۶) کام راج : اعظم الحرب، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۱۸۹۹؛ (۷) جگجیونداس : منتخب التّواریخ، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۲۶، ۲۵۳؛ (۸) ارادت خان واضح : Memoirs، در Jonathan Scott : History of the Deccan، جلد دوم، حصۂ چہارم (۱۷۹۴ء)؛ (۹) محمد قاسم لاھوری : عبرت نامہ، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۱۹۳۴؛ (۱۰) کامور خان : تذکرۂ سلاطین چغتائی، جلد دوم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مخطوطہ، عدد ۷۹؛ (۱۱) خافی خان: منتخب اللباب (در Bibliotheca Indica)؛ (۱۲) خوشحال چند : نادر الزمانی (در Königliche Bibliothek)، برلن، مخطوطہ عدد ۴۹۵؛ (۱۳) محمد علی خان : تاریخ مظفری، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۴۶۶؛ (۱۴) وارد، محمد شفیع : مرآت واردات، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Add. ۶۵۷۹؛ (۱۵) W. Irvine : *The Later*

: J. Sarkar (۱۰) ؛ *Mughals*، جلد ۱، کلکتہ ۱۹۲۱ء؛ *History of Aurangzib*، جلد چہارم، بار دوم، کلکتہ ۱۹۲۰ء؛ (۱۶) *The Cambridge History of India*، جلد چہارم، باب نہم، کیمبرج ۱۹۳۱ء۔

(T. G. P. SPEAR)

* **بہادر شاہ ثانی** : ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی، ہندوستان کا آخری تاجدار، ۲۷ شعبان ۱۱۸۹ھ / ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوا اور ۱۳ جمادی الاولی ۱۲۷۹ھ / ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نظر بندی کی حالت میں رنگون میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا ۔ وہ اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تا ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) اور لال بائی کا دوسرا بیٹا تھا ۔ اس کا سلسلۂ نسب گیارھویں پشت میں جا کر شہنشاہ بابر سے ملتا ھے ۔

وہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء کو قلعۂ دہلی میں تخت نشین ہوا اور ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء تک برائے نام بادشاہ رہا ۔ اس زمانے میں اس کی حیثیت در حقیقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ‌خوار کی سی تھی اور اس کا اقتدار محض لال قلعے یا قلعۂ معلّی دہلی کی چار دیواری کے اندر تک محدود تھا ۔ بہادر شاہ کے قبضے میں اس وقت لال قلعے کے علاوہ کچھ خالصہ جاگیریں اور شہر میں چند مکانات تھے، جن کی مجموعی آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ تھی اور ایک لاکھ روپیہ ماہانہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بطور وظیفہ ملتا تھا ۔ انگریز اس مغل اقتدار سے، جس کی بنا پر انھوں نے ۱۷۶۵ء کے بعد سے بنگال پر قبضہ جمائے رکھا، باقاعدہ طور پر کبھی منکر نہیں ہوے، لیکن ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے مقبوضہ علاقوں پر ان کی حکمرانی مسلّم ہو گئی تھی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے ھی سے اپنے سکّے جاری کر رکھے تھے، جن میں بادشاہ کا نام شامل نہ تھا ۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی جانب سے نذروں کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا ۔ ۱۸۵۱ء میں لارڈ ایلنبرا نے ایجنٹ کی جانب سے بھی نذر کی ممانعت کر دی ۔ بادشاہ کے احتجاج پر نذر کے عوض آٹھ سو تینتیس روپے ماہوار ملنے لگے ۔ بہادر شاہ نے اپنے وظیفے میں اضافے کے لیے جد و جہد کی، مگر کمپنی اس شرط پر اضافہ کرنے پر تیار تھی کہ وہ بادشاہ کا لقب ترک کر دے اور قلعے کے باھر ایک وظیفہ خوار شہری کی حیثیت سے رہنے لگے ۔ بادشاہ کا حلقۂ اقتدار گو لال قلعے تک ھی محدود تھا (جس میں شاھی خاندان اور متعلقین و متوسلین آباد تھے اور جن کی مجموعی تعداد ۱۸۴۸ء میں ۲۱۰۴ تھی)، لیکن اس نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا ۔ بایں ھمہ بادشاہ اپنے درباریوں کو خطابات سے سرفراز کیا کرتا تھا ۔

منجملہ اور معاملات کے ولی عہد کے معاملے میں بھی بادشاہ اور انگریزوں کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو گئی ۔ دارابخت اور شاھرخ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاھتا تھا، مگر انگریز پہلے مرزا فخرالدین کو، پھر اس کے انتقال (۱۱ جولائی ۱۸۵۶ء) پر محمد قویش شکوہ کو ولی عہد بنانا چاھتے تھے، اس لیے کہ ان دونوں شہزادوں کو بجاے بادشاہ کے شہزادے کا لقب اختیار کر کے قلعے سے باھر قطب صاحب کے نزدیک بہادر شاہ کے بنوائے ہوے محل میں رھنا منظور تھا ۔ بالآخر انگریزوں نے اس جھگڑے کو بادشاہ کے مرنے تک معرضِ التوا میں رکھنا مناسب سمجھا ۔ اسی سال افواہ اڑی کہ بادشاہ نے پیرزادہ حسن عسکری شیعی کے اثر سے مذھب تبدیل کیا ھے اور شاہ ایران سے مدد کی درخواست کی ھے ۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی جامع مسجد کے دروازے پر لوگوں نے ایک اشتہار چسپاں دیکھا کہ ایرانی فوج اعانت کے لیے پہنچ رھی ھے ۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی ہندوستانی فوج نے، جو انگریزوں کی ملازمت میں تھی، انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے علم آزادی بلند کیا اور حریت پسند اپنے انگریز افسروں کو تہ تیغ کرنے کے بعد دہلی چلے آئے اور بادشاہ کو اپنا سربراہ بنا کر انگریزوں سے معرکہ‌آرا ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بادشاہ انگریزوں کی روزافزوں دست‌درازی سے نالاں تھا اور اسے معلوم تھا کہ شاہ عالم ثانی سے انگریزوں کا جو عہد نامہ اس برائے نام بادشاہت کے لیے ہوا تھا، وہ اس کے انتقال کے بعد کالعدم کر دیا جائےگا؛ چنانچہ تیموری خاندان کی عظمت پارینہ کے احیا اور ہندوستان کو غیر ملکی استیلا سے بچانے کے لیے بہادر شاہ ظفر نے حریت پسندوں کی سرپرستی قبول کر لی اور ہندوستان کے تمام رؤسا اور والیانِ ریاست کو دعوت دی کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں کو ملک بدر کرنے کے لیے متحدہ اقدام کے لیے تیار ہو جائیں اور باہمی اختلافات کا فیصلہ ملک کی آزادی کے حصول تک ملتوی کر دیں۔ بعض زمینداروں اور رئیسوں نے یہ دعوت قبول کر لی، لیکن بعض نے انکار کر دیا اور آزادیِ ہند کی جنگ میں بہادر شاہ ظفر اور اس کے حلیفوں کا ساتھ نہ دیا۔ مؤخرالذکر جماعت میں مشرقی پنجاب کے سکھ والیانِ ریاست، یعنی پٹیالہ، نابھہ اور جیند کے حکمران، بھی شامل تھے، جنھوں نے مغلیہ سلطنت کی آخری نشانی کو ختم کرنے اور ہندوستان کو غیر ملکی استعمار کے حوالے کرنے کے لیے انگریزوں کی ہر ممکن امداد کی۔ اگرچہ بہادر شاہ کی بادشاہت کا دہلی میں اعلان ہو چکا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حریت پسند لشکریوں پر اس کا پورا قابو نہ تھا۔ یہ فوج نوجوان شہزادوں اور بالخصوص مرزا مغل کے زیر اثر تھی؛ چنانچہ دہلی میں انگریزوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کے جو واقعات رونما ہوئے انھیں بادشاہ پسند نہ کرتا تھا۔ دہلی میں حریت پسند فوجوں نے انگریزوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر غداروں کی وطن فروشی کے سبب ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ دہلی کے مسلمان جرنیلوں میں جنرل بخت خان قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص بہادر تھا اور انگریزی فوج کا سابق رکن ہونے کے سبب جدید اسلوبِ حرب سے واقف تھا۔ آخرکار ۲۰ ستمبر کو انگریزی فوج حریت پسندوں کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قابض ہوئی تو بخت خان فرار ہوا، لیکن مرزا الٰہی بخش کے بہکانے پر بہادر شاہ نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ مرزا الٰہی بخش شاہی خاندان کا فرد تھا، لیکن انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اُس نے بادشاہ کو بخت خان کے همراہ جانے سے اس لیے روکا کہ وہ آسانی سے گرفتار کر لیا جائے اور جنگِ آزادی کا جلد خاتمہ ہو جائے، ورنہ بخت خان بادشاہ کے نام پر مدت تک جنگ جاری رکھ سکتا تھا۔ بادشاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ انگریز میجر هڈسن نے اطلاع پا کر مقبرے کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۲ ستمبر کو بادشاہ نے جان بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو هڈسن کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ، اُس کے چہیتے فرزند مرزا جواں‌بخت اور زینت محل کی جان تو بچ گئی، لیکن هڈسن نے باقی شہزادوں کو قتل کر دیا۔

سرجان لارنس نے بادشاہ کو ایک برس تک ذلت و خواری کے ساتھ قید رکھا، بوڑھے بادشاہ کی خدمت کے لیے بجائے دس کے صرف دو ہی ملازموں کی اجازت دی اور اس کے اور زینت محل کے رہنے کے لیے دو کمروں سے زیادہ نہ دیے۔

۱۸۵۸ء میں لارنس نے ناحق بادشاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ الزامات یہ لگائے گئے کہ اُس نے حریت پسند (یا بعض مؤرخوں کے بقول باغی) بخت خان کی اعانت کی، جنگِ آزادی (یا بقول بعض مؤرخین

بغاوت) میں مرزا مغل کی مدد کی، انگریزی حکومت کے خلاف اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور یہ کہ وہ اُنچاس فرنگیوں کے قتل کا ذمّے دار ہے، جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے ۔ الزامات تو غلط تھے ہی، لیکن بالفرض صحیح بھی ہوتے تو بہادر شاہ کی حیثیت بادشاہ کی تھی اور کسی قاعدے یا معاھدے کی رُو سے وہ انگریزی عدالت کے سامنے جواب‌دہ نہ تھا ۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء سے ۷ مارچ ۱۸۵۸ء تک مقدمہ چلتا رہا اور بالآخر ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو اسے قید کرکے رنگون بھجوا دیا گیا ۔ بادشاہ کے ساتھ دو بیویوں، دو بیٹوں مع جواں‌بخت اور چند متعلقین و متوسّلین نے بھی جلا وطنی اختیار کی ۔ شاھزادوں کی اولاد میں کچھ لوگ اب تک وھاں موجود ھیں۔

مؤرّخوں کا بالاتفاق بیان ھے کہ مغل بادشاھوں میں بہادر شاہ نہایت مہذّب، شائستہ اور نیک تھا ۔ ۱۸۳۷ء میں چارلس مٹکاف Metcalf نے، جو اُس وقت دہلی میں ریذیڈنٹ تھا، اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”وہ شہزادوں میں سب سے زیادہ قابلِ احترام اور سب سے زیادہ لائق شہزادہ ھے“ ۔ اس کے دربار کی تہذیب سارے ملک کے لیے نمونہ سمجھی جاتی تھی ۔ بےتعصبی کے سبب وہ ھر قوم و ملّت کے لوگوں میں ھر دلعزیز تھا۔

بہادر شاہ کا قد لمبا اور بدن چھریرا تھا؛ رنگ سانولا اور چھرے کے نقوش انتہائی نمایاں اور تیکھے تھے ۔ اپنے دادا شاہ عالم کی طرح وہ اچھا شاعر تھا اور ظفر تخلّص کرتا تھا ۔ شاعری میں اس کے استاد محمّد ابراھیم ذوق تھے اور میرزا غالب اس کے درباریوں میں سے تھے ۔ اس کی پُر سوز غزلیں مدتوں زبان زدِ خلائق رھیں اور اب تک ھیں ۔ وہ اعلٰی درجے کا خطّاط اور ماہرِ موسیقی بھی تھا اور عمارتوں کی تعمیر اور باغوں کی ترتیب میں اس کا مذاق سلجھا ہوا تھا ۔ دربار کے روز نامچے سے ظاھر ھے کہ اکثر اس کا سارا دن لکھنے پڑھنے اور تلاوت قرآن مجید میں گزرتا تھا ۔ اس کی تصانیف ہیں، شرح گلستان اور اردو کے چار دیوان اب تک مقبول ھیں۔

مآخذ: (۱) Parliamentary Returns، عدد ۱۶۲، متعلقۂ سال ۱۸۵۹ء ایسٹ انڈیا کمپنی (شاہ دہلی)؛ (۲) شہادت، جو شاہ دہلی کے مقدمے کے سلسلے میں اس عدالت میں دی گئی جو اس مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کی گئی تھی، لنڈن ۱۸۵۹ء؛ (۳) J.W. Kaye و G. B. Malleson: *History of the Indian Mutiny*، مرتبۂ ۱۸۹۷ء، جلد ۲ و ۳؛ (۴) M. Garcin de Tassy: *Histoire de la litterature Hindouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۱ء، ۳: ۳۱۷ ببعد؛ (۵) سکسینہ R.B. Saksena: *History of Urdu Literature*، الٰہ آباد ۱۹۲۷ء، ص ۹۶ تا ۹۷؛ (۶) T.G.P. Spear: *Twilight of the Mughuls*، کیمبرج ۱۹۵۱ء؛ (۷) H.L.O Garrett: *The Trial of Muhammad Bahadur Shah*، لاھور ۱۹۳۲ء؛ (۸) امیر احمد علوی: بہادر شاہ ظفر، لکھنؤ ۱۹۰۰ء؛ (۹) عشرت رحمانی: بہادر شاہ ظفر، لاھور ۱۹۰۸ء؛ (۱۰) بہادر شاہ کا مقدمہ (بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی کارروائی کا اردو ترجمہ)، دہلی ۱۹۲۰ء؛ (۱۱) H.G. Keene: *History of India*، ایڈنبرا ۱۹۱۵ء، ۲: ۲۲۹، و بمواضع کثیرہ؛ (۱۲) رئیس احمد جعفری: بہادر شاہ ظفر، لاھور بدون تاریخ؛ (۱۳) وو، بذیل مادّہ بہادر شاہ ثانی؛ (۱۴) J.W. Kaye: *A History of the Sepoy war in India* (۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ء)، ج ۲، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۵) *Two Historic Trials in Red fort*، طبع موتی رام، دہلی ۱۹۴۶ء، ص ۳۸۸ تا ۴۲۲؛ (۱۶) منشی فیض الدین دہلوی: بزمِ آخر، دہلی ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) ایڈورڈ ٹامسن Edward Thomson: *The other side of the Medal*، اردو ترجمہ: انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، از

شیخ حسام الدین؛ (۱۸) سیّد احمد خان: آثار الصنادید، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء؛ (۱۹) عرشِ تیموری: قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، دہلی حدود ۱۹۳۷ء؛ (۲۰) امیر احمد علوی: بہادر شاہ ظفر، لکھنؤ ۱۹۰۰ء؛ (۲۱) سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی: داستانِ غدر، لاہور (۲۲) خواجہ حسن نظامی: دہلی کی جان کنی، دہلی ۱۹۲۳ء؛ (۲۳) وہی مصنّف: غدر کے اخبار، دہلی ۱۹۴۰ء؛ (۲۴) بہادر شاہ کا روز نامچہ، مرتبۂ خواجہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۳۵ء؛ (۲۵) میاں محمد شفیع، ۱۸۰۷ء؛ (۲۶) فغانِ دہلی (= آشوب دہلی (نظموں کا مجموعہ)).

(حسن عسکری و [ادارہ])

* **بہادر شاہ گجراتی**: گجرات کا سلطان (۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تا ۹۴۳ھ / ۱۵۳۷ء) - وہ مظفّر شاہ ثانی (۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء تا ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء) کا دوسرا بیٹا تھا - اپنے بڑے بھائی سکندر سے اس کی لڑائی تھی، اس لیے اس نے ۹۳۱ھ / ۱۵۲۵ء میں گجرات کو خیرباد کہا اور چتوڑ اور میوات سے ہوتا ہوا ابراہیم لودھی کے دربار میں پہنچا اور سلطان دہلی اور بابر کے درمیان پانی پت کی جو لڑائی ہوئی اس میں ایک تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا۔

اپنے باپ کی موت اور سکندر کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملتے ہی بہادر شاہ نے تیزی سے گجرات کا رخ کیا اور جب وہ چتوڑ پہنچا تو اس نے یہ خبر سنی کہ سکندر کو خوش قدم عمادالملک نے قتل کر دیا ہے، اس نے تیزی سے گجرات کے مسلمان سرداروں کی مدد حاصل کر کے ۲۶ رمضان المبارک ۹۳۲ھ/ ۶ جولائی ۱۵۲۶ء کو انہلواڑہ پٹن کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

بہادر شاہ آزاد و خود مختار گجرات کا آخری طاقتور تاجدار تھا - ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں اس نے خاندیش کے محمد ثانی اور برار کے علاءالدین عمادالملک سے مل کر احمدنگر کے بُرہان نظام شاہ پر حملہ کر دیا اور ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء میں احمدنگر پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظام شاہ نے کم از کم ۹۳۸ - ۹۳۹ھ / ۱۵۳۲ء تک گجرات کا تفوق و اقتدار تسلیم کر لیا تھا، لیکن عربی اور فارسی کی تاریخوں کے ان بیانات کی تصدیق برآمد شدہ سکّوں سے نہیں ہوتی کہ وہ گجرات کے سلطان کے نام کا خطبہ پڑھواتا تھا اور اس کے نام کے سکّے جاری کیے تھے۔

۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ - ۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ نے مالوے کے محمود ثانی پر حملہ کر کے مَنڈو پر قبضہ کر لیا - ۹۳۸ھ/ ۱۵۳۱ - ۱۵۳۲ء میں اس نے اجّین، بھیلسا اور رایسین کے راجپوت قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے سردار سلہادی کو گرفتار کر لیا - رمضان المبارک ۹۴۱ھ / مارچ ۱۵۳۵ء میں گجرات کی فوجوں نے دوسرے حملے میں چتوڑ پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران میں، یعنی ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء کے موسم خزاں میں، بہادر شاہ اور مغل بادشاہ ہمایوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی تھی - بہادر شاہ نے لودھی افغانوں اور بابر کے داماد محمد زمان میرزا کو، جو ہمایوں کی اسیری میں سے قلعۂ بیانہ سے فرار ہو گیا تھا، اپنے پاس پناہ دی تھی۔

اسے مَنداسُور اور مَنڈو کے مقامات پر مغلوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور صفر ۹۴۲ھ/ اگست ۱۵۳۵ء میں چمپانیر کی تسخیر کے بعد ہمایوں نے اس کے بہت سے خزانے پر قبضہ کر لیا تو بہادر شاہ نے پرتگیزوں سے مدد مانگی۔

۹۳۷ھ / ۱۵۳۱ء میں پرتگیزی گوا کے گورنر Nuno da Cunha کے زیر قیادت دیو Diw کو فتح کرنے کی کوشش میں شکست کھا چکے تھے - تاہم جمادی الآخرہ ۹۴۱ھ / دسمبر ۱۵۳۴ء میں پرتگیزوں کو مغلوں کے خلاف بہادر شاہ کی

مدد کرنے کے وعدے پر قلعۂ بسین مل گیا اور اکتوبر ۱۵۳۵ء میں انھیں دیو کے اس مقام پر جہاں خود بہادر شاہ نے پناہ لی تھی قلعہ بنانے کی اجازت مل گئی ۔ گجرات کے بادشاہ کو پرتگیزوں سے جو برائے نام اعانت ملی اس کے باوجود ھمایوں نے بہادر شاہ کے دارالسلطنت احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔

۹۴۲ھ / ۱۵۳۶ء میں ھمایوں نے شیر شاہ کے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے گجرات سے مراجعت کی تو بہادر شاہ کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ مغل فوجوں سے، جو اب غیر متحد، منتشر اور غیر مؤثر تھیں، اپنی سلطنت کے اکثر حصّے واپس لے لیے۔

اس کے بعد بہادر شاہ نے اپنی توجہ پرتگیزوں سے ان حقوق کے واپس لینے کی طرف مبذول کی جو وہ انھیں دیو میں دے چکا تھا ۔ ایک ایسی فضا میں جو باھمی بد اعتمادی اور بےوفائی سے معمور تھی بہادر شاہ بلا سوچے سمجھے Nuno da Cunha سے ملنے اس کے جہاز پر چلا گیا ۔ وهاں اس نے غدّاری اور بےوفائی کا رنگ دیکھا تو الٹے پاؤں لوٹا، لیکن پرتگالی فوجوں نے اس کا پیچھا کر کے اس کا خاتمہ کر دیا ۔ اس نے ۳ رمضان ۹۴۳ھ / ۱۳ فروری ۱۵۳۷ء کو وفات پائی۔

مآخذ: (۱) فرشتہ، ۲ : ۲۰۳ تا ۲۱۱، ۲۱۹ تا ۲۱۴، ۲۲۰ تا ۲۲۳؛ (۲) ابوالفضل : اکبر نامہ، ۱ : ۱۲۶ تا ۱۳۶؛ (۳) عبداللہ محمد بن عمر المکّی الآصفی اُلُغ خانی : ظفر الوالہ بمظفّر و آلہ، ۳ جلد، طبع E. D. Ross، لنڈن ۱۹۱۰ - ۱۹۲۸ء، ج ۳ بمدد اشاریہ؛ (۴) سکندر بن محمد منجھو : مرآۃ سکندری، بمبئی (چاپ سنگی) ۱۸۹۰ء، ص ۱۸۸ تا ۲۰۹؛ (۵) میر ابو تُراب ولی : تاریخ گجرات، طبع راس E. D. Ross، کلکتہ ۱۹۰۹ء، ص ۱ تا ۳۰؛ (۶) نظام الدین احمد : طبقات اکبری، ۳، کلکتہ ۱۹۳۰ء : ۱۹۳ تا ۲۲۳؛ (۷) علی بن عزیز اللہ طباطبا : برهان مآثر، حیدر آباد (مطبوعۂ دہلی) ۱۹۳۶ء، ص ۲۷۰ تا ۲۸۱؛ (۸) حاجی خلیفہ : تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، مترجمۂ J. Mitchell، لنڈن ۱۸۳۱ء، ص ۶۵ تا ۶۶؛ (۹) *Lendas da India* : Gaspar Correa، چار جلد، لزبن ۱۸۵۸ - ۱۸۶۳ء، بمدد اشاریہ ۱۰، بذیل Badur (Sultão, rei de Cambaya)؛ (۱۰) Fernão Lopez de Castanheda : *Historia da descombrimento e conquista da India pelos Portuguezes*، لزبن ۱۸۳۳ء، کتاب ۸، ابواب ۹۲ تا ۹۳، ص ۶۹ تا ۸۵، باب ۴۷، ص ۱۸۰، باب ۸۳، ص ۲۰۳، باب ۹۳ تا ۱۰۲، ص ۲۲۵ تا ۲۳۶، باب ۱۲۱، ص ۲۸۵، باب ۱۵۱ - ۱۵۳، ص ۳۴۹ تا ۳۵۷، باب ۱۶۳ تا ۱۶۵، ص ۳۸۳ تا ۳۹۰؛ (۱۱) João de Barros : *Decadas da Sua Asia*، لزبن ۱۷۷۷ - ۱۷۷۸ء، بمدد اشاریہ، بذیل Badur Chan ou Soltão Badur، ص ۲۶؛ (۱۲) Diogo de Couto : *Da Asia*، لزبن ۱۷۷۹ - ۱۷۸۸ء، بمدد اشاریہ، بذیل Badur (Soltão)، ص ۴۷؛ (۱۳) بمبئی گزیٹیر (گجرات) (بمبئی ۱۸۹۶ء، ص ۱/۱ : ۳۴۷ ببعد؛ (۱۴) M. S. Commissariat : *History of Gujarat*، ج ۱، ۱۹۳۸ء ۔ اس کی اس سفارت کے بارے میں جو اس نے ۱۵۳۶ء میں لودھی شہزادہ برھان بیگ کی معیت میں استانبول بھیجی تھی دیکھیے : (۱۵) Hammer-Purgstall، بار دوم، ۲ : ۱۰۶ تا ۱۰۷؛ [(۱۶) S. K. Banerji : *Humāyūn Bādshāh*، ج ۱، لکھنؤ ۱۹۳۸ء، بمدد اشاریہ].

(P. Hardy)

بہار : رک بہ کَیل.

بہار : هندوستان (بھارت) کا ایک صوبہ، جو ۲۳ درجے ۴۸ دقیقے اور ۲۷ درجے ۳۱ دقیقے عرض بلد شمال اور ۸۳ درجے ۲۰ دقیقے اور ۸۸ درجے ۳۲ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے ۔ اس کے مغرب میں اتّر پردیش، شمال میں نیپال، مشرقی میں

بنگال اور مشرقی پاکستان اور جنوب میں اڑیسہ ہے ۔ اس کا رقبہ چوٹا ناگپور کو ملا کر ۶۷۱۶۴ مربع میل اور آبادی تین کروڑ ستاسی لاکھ چوراسی ھزار ہے ۔ ھندو اکثریت کی بولیاں، بھوج پری، میتھلی اور ماگھی ''بہاری'' کے نام سے یاد کی جاتی ھیں ۔ اور وہ بہ نسبت ھندی کے بنگالی سے زیادہ قریب ھیں ۔ [مسلمانوں کی زبان اردو ہے ۔ بہار میں اردو ادب کو بڑی ترقی ہوئی، دیکھیے اختر اُرینوی : بہار میں اردو ادب کا ارتقا] لیکن انتظامی کاروبار اور تعلیم کی سرکاری زبان ھندی ہے ۔ آج کل اس علاقے کی اقتصادی اھمیت بہت بڑھ گئی ہے، اس لیے کہ اس میں کوئلے کی کانیں اور لوھے کے بڑے بڑے صنعتی کارخانے ھیں ۔

[بہار کو دورِ اسلامی میں علمی و ثقافتی لحاظ سے ایک مرکز کی حیثیت حاصل رھی ہے ۔ اس کے علمی مراکز اور مدارس کے لیے دیکھیے : سید سلیمان ندوی : حیاتِ شبلی؛ مناظر احسن گیلانی : ھندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء؛ ابویحییٰ امام خان : علمائے حدیث ھند] ۔

اس صوبے کا نام شہر بہار کے نام سے موسوم ھوا، گو خود یہ شہر، جس کے ارد گرد بدھ مت کی خانقاھیں (سنسکرت Vihāra) تھیں، آج کل کسی اھمیت کا مالک نہیں رھا ۔ یہ سارا صوبہ انگریزوں کے زمانے میں ۱۷۶۵ء سے بنگال کے لفٹیننٹ گورنر کے علاقے میں رھا ۔ اس کے بعد انتظامی حیثیت سے اڑیسہ [رک بآں] سے اس کا الحاق کر دیا گیا ۔ اب ایک الگ مستقل صوبہ ہے ۔ بہار کے صوبے کی حدود اربعہ حال ھی میں نئے سرے سے مقرر کی گئی ھیں ۔ اس کی آزادانہ حیثیت کا فقدان اس کے محلِّ وقوع کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ ھندوستان میں مسلمانوں کے عروج کی ابتدا ھی سے اس کی یہی حالت رھی اور اس کی تاریخ یہاں کے انفرادی صوبے داروں اور شہروں کی تاریخ ہے، جس میں موروثی خانوادوں یا بڑے علاقوں کا ذکر نہیں آتا، مثلاً مونگھیر اختیارالدین محمد ابن بختیار خلجی کی بہار پر تاختوں کے دوران میں ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں فتح کیا گیا اور وہ قطب الدین ایبک سلطانِ دہلی کے زیرِ سیادت اسی اختیارالدین کے قبضے میں رھا ۔ ۷۳۰ھ / ۱۳۳۰ء میں محمد بن تغلق نے اسے دہلی میں شامل کر لیا ۔ ۷۹۹ھ / ۱۳۹۷ء میں یہ جون پور سے ملحق ھوا ۔ ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے حملے کے بعد پھر دہلی میں شامل کر لیا گیا اور کچھ مدت بعد، جب تک کہ بنگال پر مغلوں کا تسلّط نہ ھوا، یہ شاھانِ بنگال کے قبضے میں رھا ۔ ساتویں صدی ھجری / تیرھویں صدی عیسوی میں بہار کے کچھ حصّوں کو انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل رھی ہے (۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں شمس الدین التتمش نے بہار میں ایک صوبے دار مقرر کر دیا تھا) ۔ اکبری عہد میں ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں یہ ایک صوبہ قرار دیا گیا، جس میں آٹھ ''سرکاریں'' تھیں اور یہ صوبۂ بنگال کے ماتحت تھا ۔ اس کا صدر مقام شہر بہار ھی رھا، یہاں تک کہ شیر شاہ نے نویں صدی ھجری / پندرھویں صدی عیسوی میں اس کے بدلے پٹنہ مقرر کیا ۔ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ بننے سے قبل اودھ اور بنگال کے درمیان حدِّ فاصل کا کام دیتا تھا، لیکن جب مغل آئے تو اسے اودھ اور بنگال کے درمیان ذریعۂ مواصلات ھونے کی اھمیت حاصل ھو گئی، جسے مغلیہ نائبانِ شاہ کے بنائے ھوئے بہت سے نفیس پل ثابت کر رہے ھیں ۔

یادگار عمارتیں : ھندوستان کے اسلامی فنِ تعمیر میں کوئی خاص بہاری طرز نہیں ہے ۔ سب سے زیادہ نفیس عمارتوں کا مجموعہ سہسرام میں ہے، جن میں شیر شاہ کا مقبرہ بجا طور پر

شہرۂ آفاق ہے (کتبہ ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء) ۔ یہ ایک عظیم مصنوعی جھیل کے بیچ میں پچاس میٹر بلند کھڑا ہے ۔ اس کا معمار علی وال خان دہلی کے لودھیوں کے عہد حکومت میں بہت بڑا ماہرِ تعمیرات تھا، مگر اس نے جو کاریگری اس مثمن مقبرے کے بنانے میں دکھائی وہ لودیوں کے عمارتی تصوّرات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی ۔ شیر شاہ نے رہتاس گڑھ کا قلعہ اس کے ہندو راجا سے ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں لیا اور جامع مسجد کی تعمیر شیر شاہ سے منسوب کی جاتی ہیں ۔ قلعے کے دوبارہ تعمیر شدہ استحکامات، محلّات، حبش خان کا مقبرہ اور مسجد وغیرہ سب اکبر کے نائب السلطنت راجا مان سنگھ کی عملداری کے زمانے (۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۱۰۰۸ھ / ۱۶۰۰ء) میں تعمیر ہوے ۔ راج محل کے قریب ہدف کی مسجد بھی راجا مان سنگھ سے منسوب ہے ۔ طویل اسطوانی محراب، جو اس قدیم مغلیہ عمارات کے ''لیوان'' کے باہر نکلے ہوے اس کے وسطی دالان میں عرضاً وسطی حصے کو کاٹتی ہوئی جاتی ہے، جونپور [رَکّ بآں] کے طرز کی یاد دلاتی ہے ۔ مونگھیر کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ یہاں کے قلعے کی نسبت مشہور ہے کہ بنگال کے بادشاہوں نے بنایا تھا، لیکن اس کا طرزِ تعمیر مغلوں کا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ معلوم ہے کہ راجا ٹوڈرمل نے اس کے استحکامات کی ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں مرمت کرائی ۔ پالامو کے دونوں قلعے، جو مقامی چیرو Čero راجاؤں نے گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں بنائے تھے، مغل حاکم داؤد خان قریشی نے لے لیے اور ایک مسجد (۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء) اور کچھ اور عمارتیں بھی بنوائیں ۔ نیا قلعہ اپنے شاندار ناگپوری دروازے پر نازاں ہے، جو جہانگیری طرز پر بنایا گیا ہے ۔ مخدوم شاہ دولت کا مزار (چھوٹی درگاہ)، جسے صوبے دار ابراہیم خان نے (۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء تا ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء) میں بنوایا، خاصا لائق تحسین ہے ۔ دیگر عمارات کے لیے دیکھیے ایم ۔ ایچ قریشی کا مضمون جس کا حوالہ ذیل میں دیا گیا ہے ۔

مآخذ: مختلف تاریخی واقعات کے لیے جن کا بہار سے تعلق ہے دیکھیے : (۱) *Cambridge History of India*، ج ۳، (۱۹۲۸ء) اور ج ۴، (۱۹۳۷ء) (مآخذ کی مکمّل فہرست)؛ (۲) نیز *Imperial Gazetteer of India*، ج ۷، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء؛ مقامی تاریخوں کے لیے : (۳) *Bihar and Orissa District Gazetteers*، پٹنہ حدود ۱۹۳۰ء کی متعلقہ جلدیں دیکھیے؛ اس کے بعد کے واقعات کا بیان سابق *Bengal District Gazetteer* کے بیانات سے بعد ترمیم و تنقیح لیا گیا ہے؛ شیر شاہ سوری کے آثار کے لیے دیکھیے : (۴) A. Cunningham : *ASI Report*، ج ۱۱، ۱۸۸۰ء؛ (۵) Percy Brown : *Indian Architecture* (عہد اسلامی)، بمبئی، بدون تاریخ، باب ۱۶؛ (۶) H. Goetz : *The Mausoleum of Sher Shah ht Sasaram*، در *Ars Islamica*، ج ۵، ۱ : ۹۷؛ دیگر آثار کے لیے نیز دیکھیے : (۷) *ASI Annual Report*، ۱۹۲۲ - ۱۹۲۳ء، ص ۳۴ تا ۱۴؛ اور (سب سے اہم جس میں آثار کا پورا بیان اور ان کی تاریخ ہے) (۸) محمد حمید قریشی: *List of Ancient Monuments in Bihar and Orisa*، *ASI*، *NIS*، ۵۱، کلکتہ ۱۹۳۱ء : ۵۴ تا ۵۶، ۱۳۹ تا ۱۴۱، ۱۴۶ تا ۱۹۱، ۱۹۷ تا ۲۰۳، ۲۰۷ تا ۲۱۹ ۔

(I. Burton-Page)

بہار : میرزا محمد تقی ملک الشعراء بہار، ۱۳ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء شہر مشہد میں پیدا ہوا ۔ اس کا باپ ملک الشعراء میرزا محمد کاظم صبوری، خراسان میں اپنے وقت کے فضلا میں شمار ہوتا تھا ۔ بہار نے اپنے آبا و اجداد کے متعلق

لکھا ہے:

یک نیا عابد و عارف مشرب یک نیا لشکری و دیوانی
پدرم شاعر و من زین نسب شاعر و لشکری و روحانی

اس نے ابتدائی عاوم اپنے والد سے پڑھے اور فنِ شعر گوئی میں بھی اسی سے تربیت حاصل کی۔ باپ کی وفات پر میرزا عبدالجواد ادیب نیشاپوری سے اصلاح لیتا رہا۔ اس نے مدرسۂ نواب میں فارسی و عربی علوم کی تکمیل کی اور مشہور فلسفی و ریاضی‌دان مرزا عبدالرحمٰن سے علوم عقلی حاصل کیے۔

بہار نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں اشعار کہنے شروع کر دیے تھے، لیکن اس کے والد نہیں چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا شاعری کا پیشہ اختیار کرے اور وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص مستقبل میں شاعری سے روٹی نہیں کما سکے گا، اس لیے تجارت اور صنعت کی طرف توجہ دینی چاہیے، لیکن بہار اپنے فطری ذوق اور طبع سرشار کی وجہ سے اس طرف مائل نہ ہو سکا۔ بہار نے آہستہ آہستہ شعر گوئی میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ ابتدا میں فضلا یقین نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ باپ کے اشعار اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ آخر لوگوں نے اپنے سامنے شعر کہنے کی فرمائش کی اور ایک مرتبہ کہا کہ ایک رباعی کہو جس میں تسبیح، چراغ، نمک اور چنار آئے، چنانچہ اس نے چند منٹ میں یہ رباعی کہی:

با خرقہ و تسبیح مرا دید چو یار
گفتا ز چراغ زهد ناید انوار
کس شهد ندیده است در کانِ نمک
کس میوه نچیده است از شاخ چنار

ایسے امتحانات کے بعد مخالفین اس کی شاعری کے معترف ہو گئے۔ جب مشہد میں مظفرالدین شاہ کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اپنی زندگی کا پہلا قصیدہ لکھا اور اس میں کہا:

پس از صبوری اینک منم که شعر مرا
برد بهدیه بجای متاع بازرگان
بخردسالی آنسان چکامه بسرایم
که سالخورده سخندان سرودنش نتوان

آصف الدولہ غلام رضا خان شاہسون حاکم خراسان کے توسط سے مظفر الدین شاہ کی جانب سے اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا اور سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔

بہار اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ میں نے علوم جدیدہ حاصل کرنے کے لیے یورپ جانے کا ارادہ کیا، لیکن باپ کی وفات کے بعد ماں، بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کی سرپرستی سر پر آ پڑی اور دو سال بعد، یعنی ۱۳۲۴ھ میں ایران میں انقلاب کی ایسی ہوا چلی جس نے ہر سر میں شورش پیدا کر دی؛ اور میں بھی چپکے چپکے آزادی‌خواہوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے ۱۳۲۴ سے ۱۳۲۶ھ کے درمیان روزنامہ خراسان میں، جو مخفی طور پر چھپتا تھا، سیاسی اور اجتماعی موضوعات پر اشعار لکھنے شروع کیے، جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ ۱۳۲۸ھ میں محمد علی شاہ کے استبداد کے خلاف ڈمکرٹ [= جمہوری] پارٹی تشکیل پذیر ہوئی تو بہار بھی اس کا رکن بنا اور اس نے نوبہار کے عنوان سے اپنا اخبار شائع کیا، جس میں اس نے ایرانی امور میں حکومتِ روس کی دخل‌اندازی کے خلاف تیز و تند مقالات لکھے۔ ایک سال بعد ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں روسیوں کے دباؤ پر پرچہ بند کر دیا گیا۔ بہار نے ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ میں ایک اور ہفت روزہ اخبار تازہ بہار کے نام سے جاری کیا۔ یہ بھی محرم ۱۳۳۰ھ میں بند کر دیا گیا اور بہار کو پارٹی کے چند سرگرم کارکنوں کے ہمراہ تہران میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۳۳۱ھ میں مشہد میں واپسی پر پھر نوبہار

جاری کیا، لیکن نو مہینے کے بعد حکومت کی طرف سے جبراً اس کی اشاعت روک دی گئی۔

پہلی عالمگیر جنگ میں بہار روس اور انگلستان کے خلاف تھا اور جرمن کی فتوحات کے متعلق آب و تاب سے لکھتا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں اس نے لکھا:

قیصر گرفت خطۂ ورشو را
درہم شکست حشمتِ اسلو را

خراسان میں بہار کی رزم‌آرائیوں کا بڑا اثر ہو رہا تھا، چنانچہ وہ درگز، کلات اور سرخس کے حلقے سے تیسری مجلس شورٰی ملّی کے لیے نمائندہ منتخب ہوا۔ ۱۳۳۵ھ میں روسی افواج تہران پر حملہ کرنے والی تھیں۔ بہار نے مہاجرین کے ہمراہ قم کی طرف ہجرت کی، لیکن وہاں اس کا بازو ٹوٹ گیا، اس لیے تہران واپس آنا پڑا۔ اس نے ''دشمن حملہ کرد'' کے عنوان سے مظالم روس کے خلاف ایک زبردست مقالہ لکھا، جس کی وجہ سے عمّالِ روس کے اشارے پر اسے بجنورد میں نظربند کر دیا گیا۔ اہلِ شہر کے مصائب میں اس کی ہمدردیوں کی وجہ سے وہ اسی شہر سے چوتھی مجلس کا نمائندہ منتخب ہوا اور تہران میں پھر سے روزنامہ نوبہار جاری کیا، جو محرم ۱۳۳۳ھ میں بند کر دیا گیا۔ ۱۳۳۵ھ میں اس نے زبان آزاد کے نام سے ایک روزنامہ شائع کیا، جو نوبہار کے خریداروں کے نام بھیجا جاتا تھا۔

۱۳۳۶ھ میں اس نے انجمن ادبی دانشکدہ کی بنیاد رکھی اور دانشکدہ کے نام سے ایک ادبی و اجتماعی مجلّہ جاری کیا۔ اس میں دانشگاہ کے استاد اور دوسرے ادیب تحقیقی مقالات لکھتے رہے اور اسی میں یورپی زبانوں کی نگارشات کے ترجمے بھی شایع ہوتے رہے۔

بہار پانچویں مجلس میں ترشیز سے اور چھٹی مجلس میں تہران سے نمائندہ منتخب ہوا۔ بہار کی پارٹی اقلیت میں تھی، اس لیے سیاسی مسائل پر حکومت سے سخت تصادم ہوتا رہا۔ اس دوران میں بہار کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ وہ لکھتا ہے: وہ حزب اقلیت کے تمام اخبارات کو چلاتا تھا۔ ادبی مقالات کے علاوہ اسے ایک رات میں سات سات اداریے لکھنے پڑتے تھے۔

چھٹی مجلس کے اختتام پر بہار نے عملی سیاست سے کنارہ‌کشی اختیار کر لی، رضا شاہ کبیر کے اصرار پر علمی و ادبی خدمات پر مامور ہو گیا اور تاریخ ادبیات ایران پر درس دیتا رہا۔ ایک سال تک دارالمعلمین عالی میں درس و تدریس میں مشغول رہا اور تصنیف کا کام بھی جاری رکھا۔ دانشگاہ تہران میں سبک شناسی کا ایک نیا موضوع داخل نصاب کیا اور اس کی تدریس کو رواج دیا۔ اسی عرصے میں اتّہامات کی بنا پر وہ چودہ ماہ تک اصفہان میں نظربند رہا۔ اس قید و بند کی مدت میں اس نے بلند پایہ نظمیں لکھیں۔

سترہ سال کی سیاسی علیٰحدگی کے بعد شہریور ۱۳۲۰ ہش کے واقعات پیش آئے۔ اس نے ڈمکرٹ [= جمہوری] پارٹی کی تجدید حیات کے لیے مقالات لکھے اور نوبہار کو از سر نو شائع کیا۔

۱۳۲۴ ہش میں وہ احمد قوام کی کابینہ میں وزیرِ تعلیم مقرر ہوا، لیکن چند مہینوں سے زیادہ یہ منصب نہ چل سکا، چنانچہ اس نے اس روحانی عذاب سے نجات کے لیے استعفٰی دے دیا۔

بہار اگرچہ پندرھویں مجلس میں تہران سے نمائندہ منتخب ہوا لیکن بیماری اور باہمی اختلافات کے سبب اس سے خاص کام نہ ہو سکا۔ اب اس کی صحت گر رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ تپ دق کا گھن لگ گیا ہے۔ وہ ۱۳۲۶ ہش میں علاج کے لیے سوئیٹزرلینڈ گیا، لیکن کچھ زیادہ

افاقہ نہ ہوا۔ ۱۳۲۸ھش میں ایران واپس آ گیا۔ اس کی آخری اجتماعی سرگرمی انجمن حامیانِ صلح کی صدارت تھی۔ اس کا قول تھا کہ امن کا مطالبۂ انسان کی حقیقی آرزو ہے۔ ایک سال کے بعد مرض کا شدت سے حملہ ہوا اور وہ یکم اردی بہشت ۱۳۳۰ ھش/۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وفات پا گیا۔

بہار بڑا مہمان نواز تھا اور اس کا دسترخوان ہمیشہ دوستوں کے لیے کھلا رہتا تھا۔ تندی طبع کے باوجود لطیفہ گو، خوش‌بیان اور خندہ‌جبین تھا۔ عمدہ نفیس لباس پہنتا تھا، گفتگو اور بحث میں استدلال سے کام لیتا تھا، لیکن مغالطہ اور قیاسِ باطل سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ دوستوں کی مجالس میں تو اس کی گفتگو نرم و شیریں ہوتی، لیکن اس کی سیاسی تقریریں بڑی تند و تلخ ہوتیں۔ اس کا حافظہ قوی تھا اور اسے بے شمار اشعار، حکایات اور واقعات یاد تھے۔

اسے پھولوں سے محبت تھی، وہ فرصت کے اوقات پھولوں کی آبیاری و پرورش میں گزارتا؛ اسے کبوتروں سے بہت انس تھا اور اس کے مکان میں رنگا رنگ کے کبوتر خاصی تعداد میں موجود رہتے تھے۔

بہار نہ صرف ایک بلندفکر شاعر، قابل اخبارنویس اور عمدہ نثرنگار تھا بلکہ وہ ایک فداکار انقلابی بھی تھا، جس نے اپنے قلم اور زبان سے اپنے وطن کی ترقی اور برادرانِ وطن کی آگاھی اور بیداری کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں اور تکالیف برداشت کیں۔

بہار ایک جامع کمالات شاعر تھا۔ بہار نے سبک خراسانی کا تتبع کیا ہے۔ متانت اور جزالت کے اعتبار سے اس کے قصائد متقدمین اساتذہ کے برابر رکھے جا سکتے ہیں۔ سیاسی و اجتماعی مضامین کی رعایت سے اس نے سبک معاصر سے بھی کام لیا، چنانچہ مستزادوں، مسمّطوں، قطعات، رباعیات اور عوام‌پسند غزلیات میں موضوع کے مطابق ہر سبک کو اپنایا ہے۔ ترانہ‌ھاے ملّی اور تصانیف میں کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی نظمیں دقّتِ نظر، لُطفِ تخیّل اور حسنِ اسلوب کی وجہ سے بلندپایہ شمار ہوتی ہیں۔

تالیف و تصانیف

الف۔ تصانیف تحقیقی: ۱۔ تاریخ مختصر احزاب سیاسی یا انقراض قاجاریہ؛ ۲۔ رسالہ در احوال مانی؛ ۳۔ رسالہ در شرح حالِ حکیم ابو القاسم فردوسی؛ ۴۔ رسالہ در ترجمہ و احوال محمد بن جریر طبری؛ ۵۔ سبک شناسی یا تطور نثر فارسی، سہ جلد؛ ۶۔ تاریخ تطور نظم۔

ب۔ ادبی: رمان نیرنگ سیاہ یا کنیزان سفید۔

ج۔ مقالات تحقیقی و علمی: ۱۔ نقاشی و تذہیب‌کاری در ایران؛ ۲۔ خط و زبانِ پہلوی در عصرِ فردوسی؛ ۳۔ ادبیات ہند؛ ۴۔ بازگشت ادبی۔

ان کے علاوہ متعدّد ادبی، علمی، سیاسی اور اجتماعی مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

د۔ مندرجۂ ذیل کتابیں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیں: ۱۔ مجمل التواریخ و القصص؛ ۲۔ جوامع الحکایات و لوامع الروایات؛ ۳۔ تاریخ سیستان؛ ۴۔ رسالۃ النفس ارسطاطالیس، مترجمۂ بابا افضل الدین؛ ۵۔ ترجمۂ تاریخ طبری؛ ۶۔ دستور زبانِ فارسی بمشارکت استادان دیگر۔

ہ۔ بہار نے تین سال تک پروفیسر Hertzfeld کے پاس فارسی قدیم اور پہلوی کا مطالعہ کیا اور خطوط مخی، آرامی اور پہلوی سیکھی اور مندرجۂ ذیل پہلوی کتابوں کے ترجمے فارسی میں شایع کیے: ۱۔ یادگار زریران؛ ۲۔ اندرز آذر بد مار سپندان؛ ۳۔ رسالہ مادیگان شترنگ (و چارشن چترنگ)؛ ۴۔ شہ وھرام ورجاوند (قصیدۂ دوازدہ ہجائی)؛ ۵۔ قطعہ

داروک خرسندیہ؛ ۶ - رسالہ ماتیکان ہیت اسپر سپنت۔

و - دیوان، جو قصیدہ، غزل، مثنوی، ترکیب بند وغیرہ پر مشتمل ہے - کل اشعار کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) براؤن E. G. Browne: *Press and Poetry of Modern Persia*، کیمبرج ۱۹۱۴ء؛ (۲) جلال همائی: رسالہ ملک الشعراء بہار، انتشارات دانشگاہ تہران؛ (۳) بہار، محمد تقی: تاریخ احزاب سیاسی، تہران، ۱۳۲۱ هش؛ (۴) نیکو همت: زندگی و آثار بہار، ۲ جلد، کرمان ۱۳۳۴ هش؛ (۵) عبدالحمید عرفانی: شرح احوال و آثار ملک الشعراء محمد تقی بہار، تہران ۱۳۳۵ هش؛ (۶) ناظم الاسلام کرمانی: تاریخ بیداری ایران، تہران؛ (۷) احمد کسروی: تاریخ مشروطۂ ایران، تہران ۱۳۳۰ هش؛ (۸) براؤن، ایڈورڈ: انقلاب ایران، ترجمہ و حواشی از احمد پژوہ، تہران؛ (۹) یحیٰی دولت آبادی: تاریخ معاصر، تہران؛ (۱۰) حسین مکی: تاریخ بیست سالۂ ایران، جلد سوم، ۱۳۳۵ هش۔

(ظہور الدین احمد)

⊗ **بہار بانو بیگم**: شاہنشاہ جہانگیر (رک بآں) کی بیٹی، ستمبر ۱۵۹۰ء میں پیدا ہوئی - وہ شاہزادۂ پرویز سے چھوٹی اور شاہزادۂ خرم سے بڑی تھی - اس کی ماں کرمسی عہد اکبری و جہانگیری کے ایک وفادار راجپوت سردار راجا کیشوداس راٹھور (تزوک جہانگیری میں کیشوداس مارو) کی بیٹی تھی - بہار بانو اپنے چچا شاہزادۂ دانیال کے بیٹے طہمورث سے بیاہی گئی، جو ۲۳ جنوری ۱۶۲۸ء کو شاہ جہاں (رک بآں) کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا - بہار بانو کا سال وفات معلوم نہیں۔

بیل Beale نے لکھا ہے کہ جہانگیر کی دو اور بیٹیوں، دولت النسا اور بیگم سلطان، کا لقب بھی بہار بانو تھا، لیکن وہ صغر سنی ہی میں وفات پا گئیں۔

مآخذ: (۱) تزوک جہانگیری، مترجمۂ Rogers، لنڈن ۱۹۰۹ء، ص ۱۹؛ (۲) Beale: *An Oriental Biographical Dictionary*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۹۵، ۹۶، ۲۱۰؛ (۳) بینی پرشاد: *History of Jahangir*، بار سوم، الہ آباد ۱۹۴۰ء، ص ۲۷، ۳۴۲۔

(سیّد امجد الطاف)

* **بہار دانش**: رک بہ عنایت اللہ کنبو۔

* **بہارستان**: رک بہ جامی۔

* **بہارلو**: ایران کے ایک ترک قبیلے کا نام - اس نام کا اطلاق خاص طور پر ترکمان قبائل کے وفاق قرا قویونلو کے حکمران خاندان پر ہوتا ہے (یہ خاندان بارانی کے نام سے بھی معروف ہے) - گمان غالب یہ ہے کہ یہ نام (معنی "بہار والے") موضع بہار (ابن الاثیر، ۱۰ : ۲۹۰، "وھاں" کو وھار پڑھیے) سے تعلق رکھتا ہو، جو ہمدان سے تیرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے - حمداللہ مستوفی: نزہۃ، ص ۱۰۷ (انگریزی ترجمہ، ص ۱۰۶) کے بیان کے مطابق بہار کا قلعہ سلیمٰن شاہ بن پرچم ایوائی کا مسکن تھا، جو بعد ازاں خلیفہ المستعصم کے تین وزراے اعظم میں سے ایک وزیر بنا اور ہلاکو خان کے مغول کے ہاتھ سے مارا گیا (۲ صفر ۶۵۶ھ / ۸ فروری ۱۲۵۸ء)؛ قب الجوینی (تکملہ)، ۳ : ۱۹۰، نیز محمد قزوینی: وہی کتاب، ۳ : ۴۵۳ تا ۴۶۴ میں سلیمٰن شاہ کے خاندان کے متعلق مفصل بحث خاص طور سے دیکھیے - ایوائی کی نسبت واضح طور پر اوغز کے ایک بنیادی قبیلے اوا (یا ایوا) کے ساتھ سلیمٰن شاہ کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے، دیکھیے محمود کاشغری: دیوان لغت الترک، ۱ : ۵۶ - ہمیں وہ اسباب معلوم نہیں جن کی بنا پر سلیمٰن شکوہ نے بہار کی ریاست سے بغداد کی طرف نقل مکانی کی، لیکن اس بات کے قطعی اظہارات موجود ہیں کہ مغول کی آمد سے بھی پہلے ایوا قبیلے کے لوگ شمال

میں اربل اور مراغہ کی طرف پھیل چکے تھے۔ جلال الدین خوارزم شاہ [رک بآن] کو تبریز کو جانے والے راستوں پر ان لوگوں کی ترکتاز کی سرکوبی کرنا پڑی تھی (۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء کا موسم سرما)، دیکھیے ابن الأثیر، ۱۲ : ۳۰۲؛ نسوی، ص ۱۲۶ - ایک ایوائی قبیلے کی موجودگی کا تذکرہ خلاط میں بھی ملتا ہے (۶۲۷ھ / ۱۲۳۰ء) - یہ مراحل ہمیں اس علاقے کی طرف لے جاتے ہیں جہاں قبائل کا وفاق قرا قویونلو معرض وجود میں آیا - قرا قویونلو کے بعض سکوں پر کندہ علامتی نشان بھی ایوا کے ایک قبائلی تمغے کی یاد دلاتے ہیں - دوسری جانب ہمدان کے ساتھ قرا قویونلو حکمرانوں کے تعلق کی تصدیق ان بچے کھچے لوگوں سے ہوتی ہے جو اس قبیلے کے اسلاف میں سے ان اقطاع میں باقی رہ گئے - ہمدان کا علاقہ ایک طویل عرصے تک قرا قویونلو کے ایک اہم امیر کے نام پر قلمرو علی شکر کہلاتا رہا۔

ان دنوں بہارلو قبیلے کے افراد منتشر صورت میں سارے جنوبی ایران میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں، دیکھیے Sykes : *Ten thousand miles*، ص ۸۱، ۳۰۲۔

مآخذ : (۱) V. Minorsky : *The clans of the Qara-qoyunlu rulers*، در *Mélanges F. Köprülü*، ۱۹۵۳ء، ص ۳۹۱ تا ۳۹۵؛ (۲) *BSOAS*، ۱۹۵۵ء، ج ۱۷، حصّۂ اول : ص ۶۹ تا ۷۱۔

(V. MINORSKY)

⊗ **بہاری :** (ملّا) غلام یحیی بن نجم الدین البارھوی البہاری صوبۂ بہار کے ایک گاؤں ''بارہ'' میں پیدا ہوے - تاریخ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا - البتہ ان کی کتاب لواء الھدٰی فی اللّیل والدجی میں ۱۰۶۰ھ کے قریب تاریخ ولادت کا اندازہ لگایا گیا ہے - ابتدائی کتب درسیہ مختلف مدارس میں پڑھیں اور [مدرسۂ منصوریہ میں مولانا بابالله جونپوری سے تکمیل علوم کی اور قرآن مجید حفظ کیا - شیخ بدرالعالم ساداموی سے طریقت حاصل کی - مدرسۂ لکھنؤ میں درس دینا شروع کیا اور مدتوں پڑھاتے رہے - پھر دہلی جا کر میرزا مظہر جانجاناں سے نقشبندی طریقہ اخذ کیا، پانچ سال تک ان کی خدمت میں رہے اور خلافت پائی - پھر لکھنؤ واپس آ کر شیخ پیر محمد لکھنوی کے زاویے میں، جو مسجد شیخ محمود قلندر کے قریب ہے، مقیم ہوے اور تدریس علم ظاہر ترک کر دی، بلکہ علوم عقلیہ کو بھول ہی گئے (نزھة الخواطر اور رسالہ شاہ غلام علی) - ان کی تصانیف میں سے دو رسالے بہت مشہور ہیں اور درس نظامیہ کے نصاب میں داخل ہیں - اپنے مرشد جناب میرزا صاحب کی زندگی ہی میں وفات پائی - سنہ وفات ۱۱۲۸ھ [از روے نزھة الخواطر ۱۱۸۰ھ (۶ : ۲۱۶)] ہے - رحمٰن علی اور اس کے متبعین نے ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء دیا ہے (رحمٰن علی، محلّ مذکور)- مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے احاطے میں دفن ہوے - ان کی تصانیف یہ ہیں :-

(۱) حاشیۂ شرح سلّم العلوم، ملّا احمد علی سندیلوی کی شرح کا حاشیہ۔

(۲) لواء الھدٰی فی اللّیل والدّجی، یعنی محمد زاھد الھروی کی شرح الرسالة القطبیة پر حاشیہ - لواء الھدٰی کے لیے دیکھیے فہرست ایلس (Ellis)، عمود ۵۷۸ و فہرست رامپور، ۱ : ۴۴۳ ببعد، جہاں اس کتاب کے متعدّد قلمی نسخے درج ہیں، جن میں سے ایک ۱۱۹۶ھ میں نقل ہوا ہے - [چاپ سنگ، کانپور ۱۲۸۷ھ]؛ [(۳) کلمة الحق، جس میں وحدة الوجود اور وحدة الشھود کے مبحث میں شاہ ولی اللهؒ کی تطبیق پر اعتراض کیا گیا ہے]۔

مآخذ : (۱) شاہ غلام علی : رسالہ، در بیان حالات و مقامات حضرت مرزا مظہر جانجاناں، مطبع احمدی (دہلی؟) ۱۲۶۹ھ، ص ۹۳؛ (۲) عبدالحی : نزھة الخواطر، ترن

دوازدہم، ۶ : ۲۱۵ تا ۲۱۶؛ (۳) رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء؛ (۴) *Oriental* : J. W. Beale *Biographical Dictionary*، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۹۷؛ (۵) براکلمان : تکملہ، ۲ : ۲۹۳؛ (۶) معجم المطبوعات، عمود ۹۳؛ (۷) *Cat. of Arabic Books* : A. G. Ellis، در موزۂ بریطانیہ، لندن ۱۸۹۴ء، عمود ۷۷۵ ببعد؛ (۸) محمد حسین آزاد : آب حیات، لاہور ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۴ ببعد (مرزا مظہر جان جاناں سے بیعت ہونے کا قصہ)؛ (۹) زبید احمد : *The Contribution of India to Arabic Literature*، الٰہ آباد، ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۱ و ۳۰۴، [بار دوم، لاہور ۱۹۶۸ء، بمدد اشاریہ].

(فصیح الدین بلخی)

* **البہاری** : مُحِبّ اللہ بن عبدالشکور العثمانی الصدیقی الحنفی موضع کَڑا میں پیدا ہوے، جو بھارت کے صوبۂ بہار میں مُحِبّ علی پور کے قریب واقع ہے ۔ یہ مُلک برادری سے تھے ۔ یہ لوگ باہر سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کی اصل و نسل کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا ۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم قطب الدین انصاری سہالوی سے حاصل کی اور کچھ کتابیں قطب الدین الحسینی شمس آبادی سے پڑھیں ۔ درس کی تکمیل کے بعد وہ دکن چلے گئے، جہاں اس وقت اورنگ زیب مقامی حکمرانوں کے مقابلے میں معرکہ آرائی میں مصروف تھا ۔ اورنگ زیب نے آن کی علمی لیاقت بالخصوص فقہ کی مہارت سے متأثر ہو کر انھیں لکھنؤ کا قاضی مقرر کر دیا ۔ ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ - ۱۶۸۷ء میں، جب اورنگ زیب کے ہاتھوں ابوالحسن تانا شاہ والی گولکنڈہ کو شکست ہوئی، مُحِبّ اللہ البہاری کو حیدر آباد میں متعین کر دیا گیا، پھر بعد میں انھیں شاہ عالم بن اورنگ زیب کے لڑکے رفیع القدر کا اتالیق مقرر کیا گیا ۔ ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں جب شاہ عالم کو صوبۂ کابل کا صوبہ دار بنا دیا گیا تو مُحِبّ اللہ البہاری بھی اپنے شاگرد کے ساتھ کابل چلے گئے ۔ ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ - ۱۷۰۷ء میں شاہ عالم بہادر شاہ اوّل نے تخت نشین ہونے کے بعد انھیں اپنی مملکت کا قاضی القضاۃ بنا دیا اور ''فاضل خان'' کا خطاب عطا کیا ۔ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء میں مُحِبّ اللہ موصوف نے وفات پائی ۔ وہ حسب ذیل کتابوں کے مصنّف ہیں : (۱) سُلّم العلوم، جو منطق کی ایک مشہور درسی کتاب ہے؛ (۲) مُسَلَّم الثبوت، جو اصول فقہ کی ایک مستند کتاب ہے؛ (۳) الجوہر الفرد، الجزء الذی لایتجزی پر ایک علمی مقالہ ہے ۔ یہ تینوں کتابیں پاکستان و ہند کے دینی مدارس میں داخل نصاب ہیں اور ان کی شروح و حواشی اور حواشی الحواشی بہ کثرت لکھے گئے ہیں؛ (۴) رسالۃ المغالطۃ العامۃ الورود؛ اور (۵) رسالۃ فی اثبات اَنّ مذہب الحنفیۃ ابعد عن الرای من مذہب الشافعیۃ.

مآخذ : (۱) آزاد بلگرامی : مآثر الکرام، حیدرآباد دکن ۱۹۱۰ء، ۲۱۱؛ (۲) وہی مصنّف : سُبحۃ المَرجان فی آثار ہندوستان، بمبئی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء، ص ۷۶؛ (۳) صدیق حسن خان قنّوجی : اَبجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء، ص ۹۰۵؛ (۴) رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ہند، لکھنؤ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء، ص ۱۷۰؛ (۵) براکلمان، ۲ : ۴۲۰؛ تکملہ، ص ۶۲۲ تا ۶۲۴؛ (۶) *JASB* (۱۹۱۳ء)، ص ۱۹۰ ببعد؛ (۷) زبید احمد : *Contribution of India to Arabic*، جالندھر ۱۹۴۶ء، ص ۵۶ تا ۵۹، ۱۲۶ تا ۱۳۰ [بار دوم، لاہور ۱۹۶۸ء بمدد اشاریہ]؛ (۸) عبدالحی : نُزہۃ الخواطر، حیدر آباد دکن ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ۶ : ۲۵۰ تا ۲۵۲؛ (۹) فقیر محمد : حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء، ص ۴۳۱؛ (۱۰) فضل امام خیر آبادی : تراجم الفضلاء (انگریزی ترجمہ بزمی انصاری)، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۴۸ تا ۵۳ .

(بزمی انصاری)

* **بہاول پور** : مغربی پاکستان کا ایک شہر جس کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے - یہ شہر دریاے ستلج کے بائیں کنارے کے قریب کراچی سے کوئی پانچ سو میل جانب شمال واقع اور ریلوے کے ذریعے اس سے ملا ہوا ہے - اس شہر میں ایک عجائب گھر، ایک کتب خانہ اور متعدد تعلیمی ادارے موجود ہیں اور یہ شہر اپنے علاقے کا انتظامی، تجارتی اور تعلیمی مرکز ہے۔

پہلے یہ شہر ریاست بہاول پور کا صدر مقام تھا، جس کی بنیاد سندھ کے داؤد پوتا خاندان نے رکھی تھی - خود اس شہر کی بنیاد اس خاندان کے دوسرے حکمران محمّد بہاول خان نے ۱۷۴۸ء میں رکھی تھی - حکمران خاندان کو بعض اوقات ایک مقامی مورثِ اعلٰی عباس کی نسبت سے عبّاسیہ بھی کہا جاتا ہے - اس نام کا بغداد یا مصر کے عبّاسیوں سے کوئی تعلق نہیں - یہ حکمران خاندان اٹھارھویں صدی کے اواخر میں افغان بادشاہوں کی سیادت سے آزاد ہو گیا اور اس نے ۱۸۳۸ء میں انگریزوں سے معاهده کر لیا - اس ریاست کا رقبہ پندرہ ہزار نو سو اٹھارہ مربع میل تھا، جو دریاے ستلج، پنج ند اور سندھ کے بائیں کنارے پر تین سو میل تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا عرض اوسطًا چالیس میل تک صحرا میں پھیلا ہوا تھا - اس ریاست کی اہم فصلیں گندم، چاول، کپاس اور باجرا تھیں اور اب بھی یہی ہیں - ان فصلوں کا انحصار اس کے سرحدی دریاؤں سے آبپاشی کے انتظام پر ہے - ۱۹۴۱ء کی سر شماری کے مطابق اس ریاست کی کل آبادی تیرہ لاکھ اکتالیس ہزار دو سو نو تھی اور باشندوں کی اکثریت جاٹ، راجپوت اور بلوچ اقوام کے مسلمانوں پر مشتمل تھی - ریاست بہاول پور کا جداگانہ سیاسی وجود ۱۹۵۵ء میں ختم ہو گیا، جب کہ اسے مغربی پاکستان میں مدغم کر لیا گیا۔

مآخذ : (۱) شہامت علی : The History of Bahāwalpūr، لنڈن ۱۸۴۸ء؛ (۲) Panjab States Gazetteers، Bahawalpur State، ج ۴۵)، لاہور ۱۹۳۵ء؛ (۳) دولت رام : مرأة دولت عباسیه، امرتسر ۱۸۵۱ء؛ (۴) م - عزیز الرحمٰن : صبح صادق، بار دوم ۱۹۴۳ء؛ (۵) م - اعظم ہاشمی : جواہر عباسیہ؛ (فارسی - تاحال بصورت مخطوطہ)؛ (۶) ایچیسن C. H. Aitchison: Collection of Treaties, Engagements and Sandas relating to India، ج ۹، کلکتہ ۱۸۹۲ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

بہجت مصطفٰی اِفندی : عہدِ آلِ عثمان کا عالم اور طبیب، وزیر اعظم خیراللہ افندی کا پوتا اور خواجہ محمد امین شکوهی کا بیٹا، ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں پیدا ہوا - وہ دینی درسگاہوں میں تعلیم پا کر ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱-۱۷۹۲ء میں مدرّس بنا - اس نے علمِ طب میں خصوصی مہارت حاصل کی اور بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے لگا - چنانچہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وہ سلطان کا اعلٰی طبیب (حکیم باشی یا بہ القاب رسمی رئیسِ اِطبّاے سلطانی) بن گیا - ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں وہ اپنے منصب سے معزول کر دیا گیا، لیکن ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں اس کا تقرر دوبارہ ہو گیا - ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء میں وہ معتوب ہوا اور جلا وطن کر دیا گیا - لیکن اسی سال پھر اسی منصب پر فائز ہوا - ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵-۱۸۲۶ء میں ینی چریوں کی تباہی کے بعد وہ مجلسِ محلّاتِ سلطانی کا رکن بنا، جس کا صدر محمود ثانی تھا - اس کے علاوہ وہ متعدّد اہم مذہبی اور قانونی منصبوں پر مامور ہوا، مثلاً ملّاے ازمیر (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء)، ملّاے مصر (۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰-۱۸۲۱ء)، قاضی عسکرِ آناطولی (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) اور قاضی عسکرِ روم ایلی (۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱-۱۸۳۲ء) - اس نے ذوالقعدہ ۱۲۴۹ھ/مارچ - اپریل ۱۸۳۴ء میں وفات

پائی اور اسکو دار [رَكَ بان] میں دفن ہوا۔

بہجت افندی طب قدیم کے دبستان کے آخری اطبا میں سے تھا، جس میں طب کا مطالعہ دینیات اور فقہ و قانون کے مطالعے سے مربوط کیا جاتا تھا اور طبیب کے لیے علمی زندگی اختیار کرنا بھی ضروری متصور ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ھی وہ ترکی میں یورپی طرز کی طب جدید کے پیشرووں میں سے بھی تھا۔ اس کی اور اس کے بھائی حکیم باشی عبدالحق ملّا کی نگرانی میں ایک جدید ہسپتال بنایا گیا اور نیا میڈیکل سکول کھولا گیا، جس میں یورپی اساتذہ باہر سے بلوا کر مقرر کیے گئے۔ بیان کیا جاتا ھے کہ اس نے حکومت کے ترجمان اعلٰی یحیٰی افندی کے زیر نگرانی یورپی زبانیں بھی سیکھیں، اگرچہ اس کی اپنی تصانیف، جن کی ایک مثال هزار اسرار ھے، زیادہ تر روایتی رهیں۔ تاهم اس نے مغرب کی طبّی اور سائنسی کتابوں کے متعدد اہم تراجم کیے، جن میں چیچک کا ٹیکہ لگانے پر جینّر Jenner کا کتابچہ، بفّون Buffon کی تاریخ طبیعی، اور ہیضہ، آتشک اور خارش کی موضوعات پر کتابیں شامل ھیں۔ مغرب سے اس کی دلچسپی اس بات سے بھی ظاہر ھے کہ اس نے مصر پر فرانس کے قبضے کی تاریخ الجبرتی: مظهر التقديس بذهاب دولة الفرنسيس [رَكَ به الجبرتی] کا ترکی میں ترجمہ [بعنوان تاریخ مصر، استانبول ۱۲۸۲ھ] کیا۔

مآخذ: (۱) سجلّ عثمانی، ۲: ۳۱؛ (۲) عثمانلی مؤلف لری، ۳: ۲۰۹ ببعد؛ (۳) فطین: تذکرہ، ص ۲۹ ببعد؛ (۴) سهیل انور: عثمانلی طبابتی و تنظیمات هکینده یکی نوتلر، در تنظیمات، ۱، استانبول ۱۹۴۰ء: ۹۳۶ تا ۹۳۹؛ (۵) عدنان ادیور: عثمانلی ترک لرنده علم، استانبول ۱۹۴۳ء، ص ۱۹۳ تا ۱۹۵؛ (۶) عثمان ارگن: ترکیه معارف تاریخی، ۲، استانبول ۱۹۴۰ء: ۲۸۰ ببعد۔ معاصرین کے تأثرات کے لیے دیکھیے: (۷) *Record of Travels in Turkey* etc. : Adolphus Slade، ۱، لنڈن ۱۸۳۲ء: ۳۳۲ تا ۳۳۳۔

(B. Lewis)

بہدینان: (= بادینان) کُردی علاقہ، جو موصل کے میدان سے شمال اور شمال مشرق کی طرف واقع ھے۔ عبّاسی خلافت کے آخری برسوں یعنی تقریباً چھٹی صدی هجری/بارھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی هجری / انیسویں صدی عیسوی تک اس رقبے کو ایک امارت کی حیثیت حاصل رهی، جس کا صدر مقام عمّادیہ [رَكَ بان] (کُردی زبان میں آمیدی) تھا۔ اس میں مشرق کی طرف عقرہ (کردی میں آکرے)، شوش اور دریاے زاب کلاں پر کی اراضی موسومہ زیباری اور مغرب میں دہوک اور وقتاً فوقتاً زاخو کے علاقے شامل تھے۔ اس کی شمالی سرحد پر بوهتان حکاری کی امارتیں اور جنوب میں سوران کی اور امارت واقع تھی۔

اس امارت کا مسمّی بہ خاندان بہاءالدین اصلاً شمس الدینان (کردی: شمدینان [رَكَ بان] سے آیا تھا۔ شرف الدین بتلیسی: شرف نامہ، ۱: ۱۰۶ بعد میں اس امارت کی شاہ رخ تیموری کے عہد سے لے کر ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء تک دو صد سالہ تاریخ بیان کی گئی ھے۔ امیر حسن نے شاہ اسمٰعیل صفوی کے زیر حمایت اپنے حلقۂ اقتدار کو زاخو کے شمال میں دہوک اور سندی کے رقبے تک وسیع کر لیا۔ اس کے بیٹے سلطان حسین کے اقتدار کے جواز پر ترکی سلطان سلیمٰن پُرشکوہ نے مُہر تصدیق ثبت کر دی۔ حسین کے بیٹے قباد کو مزوری قبیلے کے ایک لشکر نے معزول/کر دیا اور مار ڈالا، لیکن اس کے بیٹے سیدی خان نے ترکوں کی مدد سے پھر حکومت حاصل کر لی۔ گیارھویں صدی هجری / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اردلان کے والی نے، جو شاہ عباس (صفوی) کے ماتحت تھا، کچھ مدت کے لیے

عمادیہ میں اپنا حاکم مقرر کر دیا ۔ اس کے بعد سو سال تک پھر اس ریاست کے بارے میں کوئی تحریر نہیں ملتی ۔ عثمانیوں کے زیرِ سیادت یہ خاندان پاشاے اعظم بہرام کے دورِ حکومت (۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء تا ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء) میں بامِ عروج تک پہنچ گیا ۔ بہرام کے بیٹے اسمٰعیل پاشا (۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء تا ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء) کو اپنے باغی بھائیوں کی سرکشی سے عہدہ برآ ہونا پڑا، جنھوں نے مختلف اوقات میں زاخو اور عقرہ میں قدم جما لیے تھے ۔ اسمٰعیل کے بیٹے مراد خان کو اس کے عم‌زاد بھائی قباد نے سلیمانیہ کے بابان پاشا کی مدد سے عمادیہ سے نکال دیا ۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں مِزوری قبیلے نے قباد کا اقتدار ختم کرنے کے لیے علَمِ بغاوت بلند کیا اور موصل کے جلالی پاشا نے اسمٰعیل کے بیٹے عادل پاشا کی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر دیں ۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں اس کا بھائی زُبیر اس کا جانشین بنا ۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں رواندز کے محمد پاشا کورہ (نابینا پاشا) نے عقرہ اور عمادیہ پر قبضہ جما لیا اور امیر سعید پاشا کو معزول کر کے زاخو کی طرف پیشقدمی کی ۔ اس کی حکومت اگرچہ چند ہی سال قائم رہی لیکن بہدینان کا اقتدار پوری طرح پھر کبھی قائم نہ ہو سکا ۔ بالآخر ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں یہ علاقہ موصول کے سنجاق میں شامل کر لیا گیا ۔

بہدینان کا نام اب بھی اس علاقے کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں کردوں کے حسب ذیل بڑے قبیلے آباد ہیں : برواری، دوسکی، گُلّی، مِزوری، ریکانی، سلیوانی، سِندی اور زیباری ۔

مآخذ : (۱) S. H. Longrigg : *Four Centuries of Modern Iraq*، آوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲) صدّیق الدّملوجی : امارت بہدینان الکردیّہ، موصل ۱۹۵۲ء ۔

(D. N. MACKENZIE)

بَہْراء : (نسبت بہرانی)، قبائل قُضاعہ میں سے ایک قبیلہ، جسے کبھی کبھی قبیلۂ جُذام کا ایک حصّہ سمجھا گیا ہے، جس نے پہلے شمال کی جانب دریاے فُرات کی طرف کوچ کیا اور وہاں سے حِمْص کے میدان میں آیا ۔ اپنے فُراتی ہمسایوں تَغْلِب اور تَنُوخ کی طرح یہ قبیلہ بھی عیسائی ہو گیا، لیکن انھوں نے تغلب کے بعد غالباً ۵۸۰ء کے لگ بھگ عیسائیت قبول کی ۔ ۹ھ/ ۶۳۰ء میں ان کا ایک وفد مدینۂ منوّرہ آ کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا ۔ ۸ھ / ۶۲۹ء میں بہراء ان عربوں میں شامل تھے جنھوں نے ہرقل کے ساتھ مل کر غزوۂ مُؤتہ میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا ۔ ۱۲ھ / ۶۳۳ء میں خالد بن ولید رضی کے حملے کے وقت انھیں دُومۃ الجَنْدَل کے لوگوں کی مدد کے لیے بلایا گیا ۔ یہ لوگ ۱۳ھ / ۶۳۴ء میں کَلْب، سَلِیح، تَنُوخ، لَخْم، جُذام اور غسّان کے ساتھ بوزنطی فوجی وفاق میں بھی شامل تھے، لیکن جب شام فتح ہو گیا تو وہ سب مسلمان ہو گئے ۔

مآخذ : الهَمْدانی، ص ۱۳۲؛ (۲) المُفَضَّلِیّات، ص ۱۴۷، ۳۲۷؛ (۳) الطبری، ۱ : ۱۶۱۱، ۲۰۶۰، ۲۰۸۱، ۲۱۱۳، ۲۱۲۲؛ (۴) Wellhausen : *Skizzen*، جلد ۴، عہد نامہ عدد ۱۱۵؛ (۵) الواقدی (طبع ولہاوزن)، ص ۳۰۵، ۳۱۱؛ (۶) ابن خلّکان، عدد ۳۶؛ (۷) R. Dussaud : *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۳۶؛ [(۸) ابن حزم : جمهرة انساب العرب، بمدد اشاریہ؛ (۹) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، ۱ : ۱۱۰] ۔

(C. E. BOSWORTH)

بہرام : (پہلوی کے لفظ ورہران Varahrān سے مأخوذ ہے، جو خود اوستا کے لفظ ویرِثْرگْنا Vere<u>th</u>ragna

سے نکلا ہے) زردشتیوں میں فتح و ظفر کے دیوتا کا نام ہے (قب Benveniste و Renou : *Vrtra et Vroragna*، باب ۱، بالخصوص ۶ و ۲۲)، ایران کے بڑے آتشکدوں میں سے ایک آتشکدے کا نام ورہران Varhrān یا (زیادہ تر قریب کے زمانے میں) وہرام Vahrām اسی دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے (وہی کتاب، ص ۴۷) - یہ دیوتا اپنے نام کے شمسی مہینے کے بیسویں دن پر حکومت کرتا ہے اور البیرونی کی رقم کردہ تقویم ایران میں اس کی یہی حیثیت قائم رکھی گئی ہے (وہی کتاب، ص ۸۳؛ البیرونی : *Cronol*، ص ۵۳).

ساسانی خاندان میں بہرام یا وہرام نام کے پانچ حکمران گزرے ہیں (چوتھا، پانچواں، چھٹا، بارھواں اور چودھواں) - وہرام اول (۲۷۳ تا ۲۷۶ء) کے عہد حکومت کا بہت کم حال معلوم ہے - اس نے زردشتی مذہب کے پیشواؤں کو مانی کے خلاف کلی اختیار دے دیا، جسے موت کی سزا دے کر ۲۷۶ء میں قتل کر دیا گیا - شاپور کے ایک ابھرواں نقش میں وہرام کی تخت نشینی کا نقشہ کھینچا گیا ہے (A. Christensen : *L'Iran sous les Sassanides*، بار دوم، ص ۲۲۶ تا ۲۲۷) - اس کے بیٹے اور جانشین وہرام دوم (۲۷۶ تا ۲۹۳ء) کے عہد میں روم اور ایران کے درمیان پھر لڑائی ہوئی، لیکن قیصر کیرس Carus کی اچانک موت نے، جو مدائن تک پہنچ گیا تھا، رومیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا - اس کے باوجود وہرام نے ارمینیہ اور عراق انھیں دے دیے (۲۸۳ء) تاکہ صلح ہو جائے اور وہ اس سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کی بغاوت کو فرو کرے، جو خراسان کا گورنر (کشان شاہ) تھا اور اپنے لیے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا - وہرام دوم کا عکس کئی ابھرواں تصویروں میں ملتا ہے (Christensen، وہی کتاب ص ۲۲۸ ببعد) - اس کے فرزند اور جانشین وہرام سوم کو اس کی چار مہینے کی حکومت کے دوران میں اس کے تایا نے شکست دی (۲۹۳ء) - وہرام چہارم (۳۸۸ تا ۳۹۹)، جو شاپور اعظم ثانی کا بیٹا تھا، اپنے چچا اور بڑے بھائی کی طرح، جو اس کے پیش رو تھے، کمزور حکمران تھا - جاگیردار امرا نے پھر وہی اقتدار حاصل کر لیا جس سے شاہ پور ثانی نے انھیں محروم کر دیا تھا - وہرام چہارم کے عہد میں ارمینیہ کو روم اور ایران کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور بڑا حصہ ایران کے قبضے میں آیا - وہرام پنجم (۴۲۰ تا ۴۳۸ء) نے، جس کا لقب اس کی جسمانی قوت کی وجہ سے گور (حمار وحشی) تھا، جس نے حیرہ کے لخمی عرب بادشاہ المنذر اول کے زیر سایہ تربیت حاصل کی تھی اسی بادشاہ کی مدد سے ان امرا سے ایران کا تخت واپس لیا جنھوں نے اس کے بڑے بھائی کو قتل کر کے خاندان کے کسی دور کے رشتے دار کو تخت پر بٹھا دیا تھا - بہرام گور نے اپنی فیاضی اور محصولوں کی تخفیف، شجاعت و مردانگی، عشق و محبت کی زندگی اور سیر و شکار کے کارناموں کی بدولت (جنھیں شاعروں اور مخطوطات کے مطلاکاروں نے یادگار بنا دیا) بڑی ہر دلعزیزی حاصل کی - اس نے مملکت کے انتظامی امور زیادہ تر بڑے بڑے معزز رئیسوں (خصوصاً مہر - نرسا) کے ہاتھ میں رکھے - مرو کے علاقے کے وحشی لوگوں کے خلاف ایک مہم کی قیادت اس نے خود کی - اس ظلم و ستم کی وجہ سے بہت سے عیسائیوں نے ترک وطن کر کے بوزنطی سلطنت میں پناہ لی - اس بنا پر ایران اور بوزنطی سلطنت کے درمیان ایک مختصر جنگ ہوئی، جس میں ایران نے شکست کھائی، چنانچہ عہد نامۂ صلح (۴۲۲ء) کی رو سے ایران میں عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی مل گئی - یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بہرام گور

قدرتی موت مرا یا شکار کا کوئی حادثہ اس کی وفات کا سبب بنا۔

ان پانچ بادشاھوں کے علاوہ ایک غاصب بھی گزرا ہے، جس کا نام وھرام چوبین تھا۔ یہ اپنے آپ کو اشکانی حکمرانوں کی اولاد سے بتاتا تھا اور ۵۸۹ء میں ھرمزد چہارم کے عہد حکومت میں ایک بڑی بغاوت کا سرغنہ بنا۔ ھرمزد ایک ممتاز حکمران تھا، جو مذھبی معاملات میں تو حد درجہ روادار تھا، لیکن اس نے جاگیردار امراء کو اس لیے اپنا مخالف بنا لیا تھا کہ ان کے مقابلے میں اس نے پوری قوت سے اپنے حقوق شاھی کی حفاظت کی۔ بہرام چوبین ایران کے شمال اور مغرب کے لوگوں کے مقابلے میں جنگی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا، لیکن بوزنطیوں نے اسے شکست دی اور اسے فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ چنانچہ اس نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو قتل کر کے اقتدار حاصل کر لیا۔ ھرمزد کے فرزند نے بوزنطیوں، ارمنیوں اور ایران کے کچھ لوگوں کی مدد سے بہرام کی طول و طویل مقاومت کو توڑا۔ بہرام نے بھاگ کر ترکوں میں پناہ لی، لیکن تھوڑے ھی دن کے بعد مار ڈالا گیا۔ اس کی پر زور اور توانا شخصیت نے اس کی شہرت کو دوام بخشا۔ پہلوی زبان کے ایک عوامی رومان میں اسلامی مؤرخین اور شعرا سے پہلے ھی اس کے شجاعت کے کارنامے بیان ھو چکے تھے (دیکھیے A. Christensen : *Romanen om Bahrâm Tschôbîn, Et Rekonstruktions-forsog*، کوپن ھیگن ۱۹۰۷ء)۔ بہرام نام کی اور بھی کچھ شخصیتیں گزری ھیں (Christensen : *Sassanides*، اشاریہ، بذیل مادہ Vahrām)۔

مآخذ: (۱) Christensen کی کتاب اس سے پہلی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، جن سے وہ اپنے حاشیوں کے لکھنے میں کام لیتا ہے اور ان سے نقل کرتا ہے۔ نظم میں تاریخ بہرام گور کے لیے دیکھیے: (۲) فردوسی: *Le Livre des Rois*، ترجمہ J. Mohl، ۱۸۷۸ء، ۵ : ۳۴۳ تا ۵۵۸؛ ۶ : ۱ - ۶۳؛ (۳) نظامی: هفت پیکر، ترجمہ C.E. Wilson، لنڈن ۱۹۲۴ء، بہرام چوبین پر دیکھیے: (۴) فردوسی: وھی کتاب، ۶ : ۶۰۴تا۵۶۸، ۶ : ۱۱۹۰؛ (۵) ابھروان تصاویر کے عکس، در Dieulafoy : *L'art antique de la Perse*، پیرس ۱۸۸۳ء، جلد ۵ : (۶) *Survey of Persian Art*، ۴، لوحہ ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۲؛ (۷) [الدینوری: الاخبار الطوال، بمدد اشاریہ بذیل مادہ]۔

([H. Massé و] Cl. Huart)

بہرام: ایک ارمنی عیسائی سپہ سالار، جو مصر میں فاطمیوں کا ملازم تھا اور ۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء تا ۵۳۱ھ/۱۱۳۷ء سے خلیفہ الحافظ (۵۲۵ھ/۱۱۳۰ء تا ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء) کا وزیر السیف رہا۔

اس بات کا علم نہیں کہ وہ فاطمیوں کی ملازمت میں کن حالات میں اور کب داخل ھوا۔ پانچویں صدی ھجری/گیارھویں صدی عیسوی میں بہت سے ارمنی اس بنا پر مصر چلے گئے کہ یہاں کی وزارت کئی بار ارمنی الاصل وزیروں کے ھاتھ میں رھی، مثلاً بدرالجمالی (۴۶۶ھ/۱۰۷۴ء تا ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء)، اس کا بیٹا الفضل (۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء تا ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)، الفضل کا بیٹا (۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء) اور اس کا بیٹا یانس (۵۲۶ھ/۱۱۳۱-۱۱۳۲ء)۔ ھو سکتا ہے کہ انھیں حالات کے تحت بہرام بھی مصر آیا ھو۔ روایت کی رو سے اس کا تعلق ایک ایسے علاقے سے تھا جہاں حلب کے شمال مشرق میں تل باشر نام کی ایک مشہور ارمنی نوآبادی قائم ھو چکی تھی۔ وہ خود تل باشر کا ایک رئیس تھا اور ایک انقلاب برپا ھو جانے کی وجہ سے اسے ملک چھوڑ کر باھر جانا پڑا۔ معلوم ھوتا ہے کہ وہ کسی شریف ارمنی خاندان سے تھا، جو اپنا سلسلۂ نسب پہلوونی Pahlavuni خاندان سے ملاتا تھا اور یہ کہ وہ

مصر کے ارمنی کیتھولک گریگوری کا بھائی تھا، جو مصر آ گیا تھا اور وہاں ۱۰۷۷ یا ۱۰۷۸ء میں ایک مذہبی عہدےدار ہو گیا تھا ۔ مختصر یہ کہ بہرام نے فوجی زندگی اختیار کی اور پہلے ایک ارمنی دستے کا کمانڈر اور اس کے بعد نیل کے ڈیلٹا کے مغربی صوبے الغربیہ کا گورنر مقرر ہوا .

خلیفہ کے بیٹوں حیدر اور حسن میں رقابت پیدا ہو گئی اور حسن نے وزیر کی حیثیت سے اقتدار حاصل کر لیا، تو ایک فوجی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ حسن اسے دبا نہیں سکا، اس لیے اس نے بہرام کو اپنی مدد کے لیے بلایا، لیکن جب بہرام اپنی ارمنی فوج لے کر پہنچا تو حسن قتل ہو چکا تھا ۔ اس کے باوجود کہ بہرام عیسائی تھا خلیفہ نے وزارت اس کے سپرد کر دی (جمادی الآخرہ ۵۲۹ھ/ مارچ ۱۱۳۵ء). یہ اہم بات ہے کہ ایک عیسائی وزیر السیف اور پورے قاہرہ کا واحد مالک ہو، اور سیف الاسلام اور تاج الدولہ اس کے القاب ہوں۔ بہرام کی اس جانب‌دارانہ روش کا ردّ عمل کہ اس نے اپنے ہم وطنوں کو آزادی سے مصر میں آ کر بسنے کا موقع دیا اور انھیں اعلٰی عہدوں پر فائز کیا عوام پر اچھا نہیں ہوا اور الغَربیہ کے گورنر رضوان کے تحت ایک فوجی بغاوت شروع ہو گئی۔ بہرام کی فوج کے مسلمان سپاھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور بہرام کو قاہرہ سے بھاگنا پڑا (جمادی الاولٰی ۵۳۱ھ / فروری ۱۱۳۷ء) ۔ وہ وہاں سے قوص چلا گیا، جہاں اس کا بھائی واسک Vasak گورنر تھا، لیکن وہاں کے باشندے واسک کو پہلے ہی قتل کر چکے تھے ۔ بہرام نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوگوں سے بڑی بے دردی سے لیا اور قوص چھوڑ کر چل دیا ۔ رضوان نے، جو اس دوران میں وزیر ہو چکا تھا، ایک فوج اس کے تعاقب میں بھیجی، لیکن کچھ ایسا انتظام ہو گیا جس سے بلاشبہہ خلیفہ بھی بے خبر نہ تھا؛ بہرام کو اِخْمِیم کے قریب ایک خانقاہ میں عزلت‌گزیں ہونے کی اجازت دے دی گئی اور وہ ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸-۱۱۳۹ء تک وہاں رہا ۔ چونکہ خلیفہ رضوان سے ناراض تھا اس لیے اس نے بہرام کو، جو اس وقت بیمار تھا، دوبارہ قاہرہ بلایا اور اسے رضوان کی جگہ دے دی ۔ اس سے برابر مشورے لیتا تھا، لیکن اس مرتبہ اس نے اسے وزیر کا لقب نہیں دیا ۔ رضوان بھاگ جانے پر مجبور ہوا .

بہرام نے قصر شاہی میں ۲۴ ربیع الآخر ۵۳۵ھ / ۷ دسمبر ۱۱۴۰ء کو وفات پائی ۔ خلیفہ الحافظ کو اس کے مرنے کا بہت رنج ہوا اور وہ اس کے جنازے کے ساتھ ڈچ Ditch کی خانقاہ تک گیا، جو قاہرہ سے باہر تھی ۔ بہرام کو یہیں دفن کیا گیا.

مآخذ : (۱) ابن مُیَسّر : *Ann. d'Egypte*، ص ۷۸ تا ۸۰، ۸۲ تا ۸۴؛ (۲) ابن القلانسی : تاریخ دمشق، ص ۲۶۲؛ (۳) ابن الأثیر، x. s. a.، ص ۳۰۱؛ (۴) ابوصالح : *Churches and Monasteries*، طبع و ترجمه Evetts، ص ۶ الف، ۳۸ الف؛ (۵) ابن خلدون : کتاب العبر، ۴ : ۷۲ تا ۷۳؛ (۶) ابن تغری‌بردی، قاہرہ، ۵ : ۲۳۹ تا ۲۴۰-۲۴۱ تا ۲۴۲؛ (۷) المقریزی، ۱ : ۲۰۵، ۳۰۷، ۲ : ۲۰۵؛ (۸) القلقشندی : صُبح الاعشٰی، ۶ : ۴۰۷ تا ۴۶۳، ۸ : ۲۶۰ تا ۲۶۲، ۱۳ : ۳۲۵ تا ۳۲۶؛ (۹) السیوطی : حُسن المُحاضرة، مطبوعه ۱۳۲۱ھ، ۲ : ۱۳۱؛ (۱۰) *Michael the Syrian*، فرانسیسی ترجمه از Chabot، ۳ : ۲۳۰؛ (۱۱) Renaudot : *Historie des Patriarches d'Alexandrie*، ص ۵۰۵ تا ۵۰۷، ۵۰۹؛ (۱۲) Wüstenfeld : *Geschichte der Fatimiden-Chalifen*، ص ۳۰۷؛ (۱۳) S. Lane-Poole : *A History of Egypt in the Middle Ages*، ص ۱۶۸ تا ۱۶۹؛

(۱۴) G. Wiet : *Précis de l'Hist. d'Egypte*، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳، ۲۲۷؛ (۱۵) وہی مصنّف : *L'Egypte arabe (Hist. de la nation égyptienne)*، ۴ : ۲۴۳ تا ۲۷۵؛ (۱۶) De Lacy O'Leary : *A short history of the Fatimid Khalifate*، ص ۲۲۳؛ (۱۷) حسن ابراہیم حسن : الفاطمیّون فی مصر، ص ۲۱۲ تا ۲۱۷، ۲۹۳؛ (۱۸) M. Canard : *Un vizir chrétien à l'époque fatimite, l'Arménien Bahrām*، در *AIEO*، الجزائر ۱۹۳۵ء، ۱۲ : ۸۴ تا ۱۱۳؛ (۱۹) وہی مصنّف : *Une lettre du calife fātimite al Hafiz . . . à Roger II, Atti del Convegno Internazionale di Studi Ruggeriani*، Palermo ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۶ ببعد؛ (۲۰) وہی مصنّف : *Notes sur les Arméniens en Egypte à l'époque fātimite*، در *AIEO Algiers*، ۱۳ (۱۹۵۵ء) : ۱۴۳ تا ۱۵۷ .

(M. CANARD)

* **بہرام شاہ** : ابن طغرل شاہ سلجوقی کو اتابک مؤیّد الدین ریحان نے کرمان میں تخت پر بٹھایا، جو اس کے باپ کی وفات (۵۶۵ھ / ۱۱۷۰ء) کے بعد خالی ہو گیا تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں اسے اپنے بڑے بھائی ارسلان شاہ [رک باں] کے حق میں تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے کو فتح حاصل ہوتی رہی، یہاں تک کہ بہرام شاہ نے ۵۷۰ھ / ۱۱۷۴ - ۱۱۷۵ء میں وفات پائی۔

مآخذ : (۱) افضل الدین کرمانی : بدائع الأزمان فی وقائع کرمان، طبع محمّد مہدی بلزانی، تہران ۱۹۴۷ء، ص ۵ ببعد؛ (۲) Houtsma : *Receuil*، ۱ : ۳۰ ببعد؛ (۳) *ZDMG*، ۳۹ : ۳۷۸ ببعد .

(ادارہ)

⊗ **بہرام شاہ غزنوی** : یہ سلطان مسعود سوم (م ۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ - ۱۱۱۵ء) کا بیٹا اور ملک ارسلان [رک باں] کا بھائی تھا۔ طبقات ناصری (کلکتہ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲) میں اور عباس پرویز : از طاہریان تا مغول (۱ : ۵۰۹) میں اسے ملک ارسلان کا چچا لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ مؤخّر الذکر کی ولدیت عثمان مختاری (م ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء) نے یوں لکھی ہے :

ابوالملوک ملک ارسلان بن مسعود
طرازِ ملکِ جہاں پادشاہِ مُلک طراز

(مخطوطۂ بانکی پور، ق ۷ ب)

اور بہرام شاہ کی ولدیت سنائی (م ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء) نے یوں لکھی ہے :

شاہ بہرام شاہ بن مسعود
کہ بنازد بہ عدل او محمود

(حدیقہ، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۶۲۵)

متعدد تاریخوں (مثلاً روضۃ الصفا، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ۴ : ۹۹) میں بہرام شاہ کی والدہ کا نام مہد عراق (بنت چغری بیگ داؤد، م ۴۵۰ھ) لکھا ہے، جو غالباً صحیح نہیں ہے۔ وہ ملک ارسلان کی والدہ ضرور تھی جیسا کہ مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) نے اس کی مدح میں لکھا ہے :

توئی ز گوہرِ محمود و گوہرِ داؤد
کدام شاہ نسب دارد از چنین دو نژاد

(دیوان مسعود، تہران، ص ۱۱۳)

لیکن اسی شاعر نے بہرام شاہ کے متعلق صرف محمودی نسب ظاہر کیا ہے :

گویند ہفت کشور زیر نگین کند
شاہے ز اصل و نسل یمینی و این توئی۔

(وہی کتاب، ص ۵۶۰)

اسی لیے جب بہرام شاہ نے سلطان سنجر سے امداد چاہی تو پہلے اسے ''بیگانہ'' ہی کہا گیا۔ آداب الحرب (مطبوعۂ لاہور، ص ۳۲)

میں ہے: ''امّا سلطان (سنجر) می اندیشید کہ اگر او (بہرام شاہ) را یاری دہد و سلطان ملک ارسلان را از تخت ملک بر کند مردمان زبان دراز کنند و گویند کہ بیگانہ را معونت فرمود و خویش و نزدیک را از مملکت دور کرد'' ۔ تاریخ فرشتہ (مطبوعۂ لکھنؤ ص ۴۸) میں ہے کہ سلطان ابراہیم نے مہد عراق کے ساتھ مسعود سوم کی شادی کے بعد ہندوستان کی طرف توجہ کی اور قلعہ اجودھن (پاک پٹن) فتح کیا ۔ ابن الأثیر نے اس فتح کی تاریخ ۲۰ صفر ۴۷۶ھ / ۹ جولائی ۱۰۸۳ء لکھی ہے، یعنی اس سنہ سے پہلے وہ شادی ہوئی ہوگی ۔ ابن خلدون (۴ : ۴۱، اردو ترجمۂ احمد حسین) میں ہے کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کی ایک بیٹی کی شادی ۴۷۴ھ میں ہوئی تھی، چنانچہ خیال ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم کا سفیر مہتر رشید جو ملک شاہ کے یہاں مسعود سوم کی شادی کے سلسلے میں گیا ہوا تھا اس سے اس سنہ کے بعد ہی ملک شاہ نے کہا ہوگا کہ ''من دختر ندارم امّا عمتے ہست مرا بہ عراق دختر چغربیگ داؤد'' (آداب الحرب، ق ۴۶ الف) ۔ اس لیے وہ شادی ۴۷۴ھ کے بعد اور ۴۷۶ھ سے پہلے، یعنی ۴۷۵ھ میں ہوئی ہوگی اور اس کے بعد ملک ارسلان پیدا ہوا ہوگا اور بہرام شاہ چونکہ اس سے چھوٹا تھا (گو کہ دوسری ماں سے تھا) اس لیے وہ اس کے بھی بعد پیدا ہوا ہوگا.

مسعود سوم کے انتقال (شوال ۵۰۸ھ / مارچ ۱۱۱۵ء) پر اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا شیرزاد تخت نشین ہوا، لیکن اس کے بھائیوں نے خانہ‌جنگیاں شروع کر دیں، اس لیے وہ خود تو اسپہبد علاءالدولہ علی بن شہریار بن قارن باوندی کے پاس طبرستان چلا گیا اور اس کی اعانت سے حج کے لیے روانہ ہوگیا (ابن اسفندیار، ترجمۂ براؤن، ص ۵۸ تا ۵۹)، لیکن واپسی پر جب غزنہ پہنچا تو ملک ارسلان نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت نشین ہوگیا (طبقات ناصری، راورٹی، ص ۱۰۸) ۔ بہرام شاہ اس وقت تکین آباد میں تھا ۔ ملک ارسلان کی تخت نشینی (چہار شنبہ ۶ شوال ۵۰۹ھ / ۲۲ فروری ۱۱۱۶ء) پر مسعود سعد سلمان (دیوان، ص ۳۱۷ تا ۳۱۸) نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے :

بہ عون ایزد شش روز رفتہ از شوّال
بر آمد از فلک دولت آفتاب کمال

بہرام شاہ تکین سے کرمان گیا ۔ وہاں ارسلان شاہ بن کرمان شاہ بن قاورد بن چغری بیگ داؤد نے (محمد بن ابراہیم : تواریخ آل سلجوق کرمان، ص ۲۰ تا ۲۲، مطبوعۂ برلن) اس کی بڑی قدر کی اور سنجر سے فوجی امداد کے لیے سفارش کی ۔ بہرام شاہ نے سنجر کو اپنے محاسن اخلاق و شجاعت سے بہت متاثر کیا ۔ آداب الحرب (ص ۳۳ تا ۳۴) کے بیان کے مطابق اس نے ایک مرتبہ ایک ہی تیر سے دو پرندوں کا شکار کیا جو اوپر نیچے اڑ رہے تھے ۔ سنجر نے اسے خلعت بخشا اور ایک لشکر جرّار کے ساتھ ۵۱۰ھ میں بہرام شاہ کو لے کر خود بھی غزنین کو روانہ ہوا ۔ بُست کے مقام پر سیستان کا حاکم تاج الدین اور اس کا بھائی فخرالدین بھی ساتھ ہو گیا ۔ اس طرح خراسان اور سیستان کی فوجوں نے ملک ارسلان کی فوجوں کو شکست دی ۔ تاریخ ابوالخیر خانی (بانکی‌پور، ق ۱۳۶ الف) میں تاج الدین کے درباری شاعر خواجہ صاعد ستوفی کی ایک مثنوی اس واقعے کی یادگار ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

گفتی از صف کشیدہ پیل و گروہ
کوہ صحرا شدہ‌است و صحرا کوہ

عبدالواسع جبلی (م ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) نے ایک طویل قصیدہ اس موقع پر لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے :

چہ جرم است این برآوردہ سر از دریاے موج افگن

به کوه اندر دمان آتش به بحر اندر کشان دامن

ابن الاثیر (۱۰ : ۱۷۸، مصر ۱۳۰۳ھ) میں ہے کہ (یک شنبہ) ۲۰ شوال ۵۱۰ھ / ۲۵ فروری ۱۱۱۷ء) کو سنجر غزنہ میں داخل ہوا اور بہرام شاہ کو تخت نشین کرا دیا ۔ غزنوی سلاطین کے تمام خزانے سنجر نے حاصل کر لیے اور بہرام شاہ پر ایک ہزار دینار یومیہ خراج مقرر کیا ۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۱۰۹) میں ہے کہ سیّد حسن غزنوی نے ایک قصیدہ سنجر کی موجودگی میں پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے:

منادی برآمد ز هفت آسمان
که بهرام شاه‌است شاهِ جهان

طبقات کے مترجم راورٹی (ص ۱۱۰، حاشیہ ۴) نے لکھا ہے کہ یہی شعر بہرام شاہ کے بعض سکّوں پر نقش تھا، جن میں ۵۱۴ھ کو اس کا پانچواں سال جلوس کہا گیا ہے ۔

سنجر کی واپسی پر ملک ارسلان نے ہندوستان کی فوجوں کے ساتھ بہرام شاہ پر حملہ کیا اور وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعۂ بامیان میں چھپ گیا ۔ پھر سنجر نے ۵۱۱ھ میں بلخ سے اس کی مدد کے لیے فوج بھیجی، جس نے ملک ارسلان کو قید کر لیا ۔ بہرام شاہ نے کچھ عرصے کے بعد اسے رہا کر دیا، لیکن پھر بغاوت کے آثار دیکھ کر اسے قتل کر دیا ۔ مسعود سعد سلمان (ص ۷۰ تا ۷۱) اور سنائی (حدیقہ، لکھنؤ، ص ۶۶۳ تا ۶۶۶) نے ان واقعات کو نقل کیا ہے ۔ سیّد حسن (مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۴۵۱۴، ق ۱۲۴ ب - ۱۲۵ الف) کے اشعار میں بہرام شاہ کی "کنیت" اور "القاب" اس طرح آتے ہیں:

سلطان ابوالمظفر بہرام شہ علاء دنیی و دین خسرو زمین و زمان اور یمین دولت و دین و امین ملت و ملک.

سنائی اور سیّد حسن کے بیان کے مطابق بہرام شاہ کا علَم اپنے بزرگوں کی طرح اور عبّاسیوں کی تقلید میں سیاہ تھا (مخطوطۂ انڈیا آفس عدد ۹۳۱، ق ۱۱۰ ب)، (حدیقہ، مطبوعۂ بمبئی، ص ۳۴۰) ۔ علَم میں شیر کی تصویر تھی اور ہلال بھی بنا ہوا تھا ۔ بہرام شاہ کا چتر سیاہ تھا اور تاج سفید ۔ مسعود سوم کی طرح (آداب الحرب، ص ۹) بہرام شاہ کے چتر میں باز کی تصویر تھی ۔

بہرام شاہ کی تخت نشینی پر ملک ارسلان کا والیِ پنجاب محمد ابو حلیم باغی ہو گیا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ بہرام شاہ نے فوج کشی کی اور لاہور میں اسے ۲۷ رمضان ۵۱۲ھ / ۱۱ مئی ۱۱۱۹ء) کو گرفتار کر لیا (فرشتہ، ۵۰)، لیکن اس کی دانائی اور تجربہ کاری کی وجہ سے معاف کر دیا اور غزنہ کو واپس چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد محمد ابوحلیم نے ناگور (سوالک، پنجاب) میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور مختلف سرکش راجاؤں کو مطیع بنایا ۔ اس وجہ سے غرور پیدا ہو گیا اور بہرام شاہ کے خلاف پھر اعلانِ بغاوت کر دیا ۔ بہرام شاہ دوبارہ حملہ‌آور ہوا اور طولانی کشتیوں میں دریاے سیحون (سندھ) وغیرہ کو عبور کیا، جیسا کہ سنائی نے (حدیقہ، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۶۵۶ تا ۶۵۹) کہا ہے:

بر کرانِ آبها از آسمان سیماے او
بسته کشتیهاے طولانی ز راهِ کهکشان

آداب الحرب (ص ۴۵ تا ۴۷) میں اس جنگ کی پوری تفصیل ہے ۔ غالباً بیاس اور ستلج کے مخلوط چشمے "نورنی" یا اُچ [رکَ بآں] کے قریب میدانِ کارزار تھا ۔ محمد ابوحلیم اور اس کے بیٹے مارے گئے ۔ ۵۱۳ھ کی خزاں (۲۱ ستمبر ۱۱۱۹ تا ۲۰ دسمبر ۱۱۱۹ء) میں یہ فتح حاصل ہوئی ۔ پھر حسین ابن ابراہیم علوی پنجاب کا والی مقرر ہوا ۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بہرام شاہ کی تخت نشینی پر سنجر نے ایک ہزار دینار

یومیہ خراج مقرر کیا تھا، چونکہ یہ بہت زیادہ تھا لہٰذا ۵۲۹ھ/ ۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ء) میں اس نے بند کر دیا ۔ سنجر کو معلوم ہوا تو عازم غزنہ ہوا ۔ بہرام شاہ بھاگ کھڑا ہوا ۔ پھر بمشکل معافی ہوئی اور ۵۳۰ھ میں سنجر نے دوبارہ غزنہ اس کے سپرد کر دیا (ابن الاثیر، ۱۱ : ۱۱) ۔ اس کے بعد غوریوں سے بہرام شاہ کی جنگیں چھڑیں ۔ عزّالدین حسین غوری، جسے مسعود سوم (غزنوی) نے غور کی گورنری دی تھی، اس کے بیٹوں میں سے قطب الدین محمد، جو ''ملک الجبال'' کے لقب سے مشہور ہوا، ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں غزنہ آیا ۔ بہرام شاہ نے اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی تو وہ تخت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا، چنانچہ ایک دن اسے زہر دے دیا گیا ۔ اس کا بھائی سیف الدین سوری، جو اس کے ساتھ ہی ٹھیرا ہوا تھا، بھاگ کر فیروز کوہ (دارالحکومتِ غور) گیا اور اپنے دو بھائیوں (بہاءالدین سام اور علاءالدین حسین) کو لے کر غزنہ پر حملہ کر دیا ۔ بہرام شاہ بھاگ کھڑا ہوا ۔ سوری نے (ابن الاثیر، ۱۱ : ۵۱) جمادی الاولٰی ۵۴۳ھ/ستمبر ۱۱۴۸ء میں غزنہ پر قبضہ کر کے سلطان کا لقب اختیار کر لیا ۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس کے دونوں بھائی اور غوریوں کی فوج واپس ہو گئی اور برف‌باری کا زمانہ آ گیا اور غور کی طرف کے راستے بند ہو گئے تو اہلِ غزنہ نے بہرام شاہ کو بلا بھیجا ۔ وہ یکایک ایک رات حملہ‌آور ہوا اور نہ صرف سوری کو بلکہ اس کے وزیر کو بھی گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا ۔ سیّد حسن غزنوی نے اس موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا ۔ یہ فتح ۲ محرم ۵۴۴ھ/ ۱۲ مئی ۱۱۴۹ء کو ہوئی، لیکن سوری کا بھائی علاءالدین حسین جب غور کا حاکم ہوا تو جلد ہی وہ ایک بڑی فوج لے کر حملہ‌آور ہوا اور بہرام شاہ کو شکستِ فاش دی ۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۳۵۰ تا ۳۵۶) وغیرہ میں اس جنگ کی اور غزنہ کی تباہی و بربادی کی تفصیل ملتی ہے ۔ یہیں سے علاءالدین حسین کو ''جہاں سوز'' کا عُرف ملا ۔ یہ جنگ ۵۴۶ھ کے موسم سرما میں ہوئی ہوگی، جیسا کہ آداب الحرب (ص ۴۸ تا ۵۰) سے ظاہر ہوتا ہے ۔ راحت الصدور (ص ۱۷۶) میں ہے کہ اس کے بعد علاءالدین حسین نے سنجر سے بدلہ لینے کا عزم کیا کیوں کہ اس نے بہرام شاہ کی مدد کی تھی ۔ سنجر سے ہرات کے قریب اوبہ میں جنگ ہوئی اور علاءالدین گرفتار کر لیا گیا ۔ آخر کار جب غُز ترکوں سے سنجر کی جنگ ہوئی (۵۴۸ھ) تو اس سے کچھ پہلے وہ رہا کر دیا گیا ۔ علاءالدین کی گرفتاری کے زمانے میں تقریباً ایک سال کے بعد ۵۴۷ھ میں بہرام شاہ پھر غزنہ واپس آیا ۔

بانکی‌پور کی بعض قلمی تاریخوں میں، مثلاً تاریخ صدر جہاں (ق ۲۸۱ ب)، جنات الفردوس (۶۴ الف)، روضۃ الطاہرین (۱۶۳ الف)، لب التواریخ وغیرہ میں بہرام شاہ کی تاریخ وفات ۵۴۴ھ ہے، لیکن وہ غلط ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء میں اس نے پھر ایک مرتبہ غزنہ پر قبضہ کیا تھا ۔ حدیقۂ سنائی کے مقدمے میں (جو سنائی کے شاگرد محمد بن علی الرفا نے لکھا تھا) بہرام شاہ کے متعلّق دعائیہ کلمات ''خلّد اللہ مُلکہٗ'' آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت وہ زندہ تھا، لیکن اسی مقدمے میں امام برہان الدین علی غزنوی کو، جو بغداد میں تھے اور جن کے پاس سنائی نے حدیقہ بھیجا تھا، ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہا گیا ہے ۔ ان کا ذکر سید حسن کے اس ترجیع بند میں بھی آتا ہے (راحت الصدور، ص ۲۰۱ ببعد)، جو ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ کی تخت نشینی (۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء) پر لکھا گیا تھا :

بر درِ بغداد گفتم خواجۂ برہانِ دین
کاے ملک تا پنج مہ سلطان شوی اینک شود

بہر حال ۵۴۷ھ کے بعد بہرام شاہ ۵۵۲ھ تک زندہ رہا ۔ راورٹی (ترجمۂ طبقات ناصری، ص ۱۱۴) نے بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کے ایک سکّے کا ذکر کیا ہے جو ۵۵۲ھ کا ہے اور اس سنہ میں خسرو شاہ کا پہلا سال جلوس دکھایا گیا ہے۔

بہرام شاہ کے دربار میں بڑے بڑے شعرا اور اہلِ قلم جمع تھے : (۱) سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ / ۱۱۶۰ - ۱۱۶۱ء؛ (۲) سنائی (م ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء)؛ (۳) مسعودِ سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء)؛ (۴) ابوالمعالی نصراللہ (مترجم کلیہ و دمنہ)؛ (۵) سید الشعراء ابوبکر بن محمد بن علی روحانی؛ (۶) محمد ابن ناصر علوی؛ (۷) حسن بن ناصر علوی؛ (۸) علی ابورجاغزنوی (م ۵۸۶ھ)؛ (۹) فخر الدین محمد بن محمود بن احمد نیشاپوری؛ (۱۰) محمد بن عثمان؛ (۱۱) سعد الدین مسعود؛ (۱۲) شمس الدین مبارک شاہ (لباب الالباب، ۲ : ۲۸۶، ۲۹۱ تا ۳۴۸) ۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۱۱۱) میں بہرام شاہ کے دس بیٹوں کے نام ملتے ہیں ۔ وزرا میں ایک ابو محمد حسن بن ابو (نصر) منصور قائنی تھا (حبیب السیر، جلد ۲، حصّہ ۴ : ص ۳۳)، جس کے متعلّق سیّد حسن کے مختلف اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابو محمد حسن بن ابو نصر منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی تھا ۔ ۵۲۴ھ میں جب حدیقہ لکھا گیا تو اس میں (ص ۴۷، مطبوعہ لکھنؤ) اسے ''نائب دستور'' کہا گیا ہے ۔ غالبًا اس (حسین بن ابراہیم علوی) کے بعد وہ ہندوستان میں رہا، کیونکہ سیّد حسن نے اس کی مدح میں ابتدا اس طرح کی ہے :

عمرے مرا ہواے لہاوور بودہ بود
ہمت برآن سعادت مقصور بودہ بود

(مخطوطہ، انڈیا آفس، عدد ۹۳۱، ق ۱۳۹ الف)

وزرا میں عبدالحمید (بن احمد بن عبدالصمد) کے بعد احمد اور پھر غالبًا اسی احمد کا بیٹا قوام الدین حسن بن احمد بن حسین وزیر ہوا، جو ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء) تک اس عہدے پر فائز رہا کیونکہ اس سال جب بہرام شاہ نے سیف الدین سوری سے غزنہ کا تخت واپس لیا تھا تو اس وزیر کی مدح میں سید حسن نے قصیدہ لکھا تھا، جس میں ایک شعر یہ تھا :

بس چشم شور و روے ترش بود منتظر
تا چشم شان سپید شد و روے شان سیاہ

(وہی مخطوطہ، ق ۴۷ ب)

حسن بن احمد کے بعد اس کا بیٹا حسین وزیر ہوا ۔ اسی شاعر نے کہا :

فرزانہ حسینِ حسنِ احمدِ خاصہ
آن کردہ خدایش ز ہمہ خلق خلاصہ

(وہی مخطوطہ، ق ۳۳ الف)

روحانی کے سوگندنامہ (مونس الاحرار، ص ۲۱۰ تا ۲۱۵، کتبخانہ حبیب گنج) میں بھی اسی وزیر کا ذکر آتا ہے اور غالبًا یہ آخری وزیر تھا۔

مآخذ : (۱) سنائی : حدیقہ، لکھنؤ ۱۳۰۴ھ، ص ۶۲۵، ۶۲۶ تا ۶۲۸، ۶۳۸ تا ۶۴۱، ۶۵۶، ۶۵۹ تا ۶۶۳ تا ۶۶۶؛ (۲) طبقات ناصری، کلکتہ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲ تا ۲۴؛ (۳) طبقات ناصری، (ترجمۂ راورٹی، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۴۸، ۳۴۷ تا ۳۵۰، ۳۵۸ تا ۳۶۱، ۳۲۴ تا ۳۲۸؛ (۴) عباس پرویز: از طاہریان تا مغول، تہران، ۱ : ۵۰۹؛ (۵) تاریخ فرشتہ، لکھنؤ ۱۲۸۱ھ، ص ۴۹ تا ۵۰، ۵۵؛ (۶) ابن الاثیر (قاہرہ ۱۳۰۳ھ)، ۱۰ : ۳۶، ۵۱، ۵۷، ۱۷۷، ۱۷۸ تا ۱۷۹، ۱۱ : ۵۱، ۵۷، ۶۲؛ (۷) فخر مدبّر : آداب الحرب، در ضمیمۂ اوریئنٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۷، ۸، ۲۴، ۳۱ تا ۳۴، ۴۵ تا ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۵۸؛ (۸) راوندی : راحت الصدور، (گب میموریل)، لنڈن

۱۹۲۱ء، ص ۱۶۸، ۱۷۵، ۲۰۱؛ (۹) حبیب السیر، بمبئی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء، جلد ۲، جزء ۴ : ص ۳۳؛ (۱۰) سید حسن غزنوی : دیوان (مخطوطۂ انڈیا آفس، عدد ۹۳۱)، اوراق : ۸ ب، ۲۰ ب، ۲۱ ب، ۲۲ الف، ۲۸ب، ۳۶الف، ۴۳ الف تا ۴۴ الف، ۴۸الف، ۵۳الف، ۶۹ب تا ۷۰الف، ۷۲الف تا ۷۵الف، ۸۱ الف، ۸۳ الف، ۸۸ب، ۹۵الف، ۱۰۰ب، ۱۱۱ب، ۱۱۲ الف، ۱۱۴الف، ۱۱۵ ب تا ۱۱۶ الف، ۱۱۷ الف، ۱۲۸ب، ۱۴۳الف، ۱۵۸الف ـ ب؛ (۱۱) احمد بن محمد کلاتی: مونس الاحرار (مخطوطۂ کتبخانہ حبیب گنج)، ص ۲۱۰ تا ۲۱۵، ۲۷۹، ۲۸۰، ۶۹۱، ۷۳۰ تا ۷۳۳؛ (۱۲) فیض اللہ بنبانی : تاریخ صدر جہاں (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور) ق ۱۸۲ ب؛ (۱۳) طاہر محمد ابن عماد الدین حسن : روضۃ الطاہرین (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور) ق ۱۶۲ب، ۱۶۳الف؛ (۱۴) محمد یوسف کنعانی : منتخب التواریخ (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور)، ق ۳۱۶ الف، ۳۱۸ب؛ (۱۵) یحیٰی قزوینی : لب التواریخ (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور).

(غلام مصطفٰی)

• **بہرام شاہ: المَلِک الامجد [مجدالدین] بن فرُّخ** [=فرّوخ] شاہ بن شاہنشاہ بن ایّوب، [سلطان] صلاح الدین کے بھانجے یا بھتیجے کا بیٹا، صلاح الدین نے اس کے والد کی وفات کے بعد اسے ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲ء میں بعلبک میں اس کا جانشین بنایا (عمادالدین الاصفہانی : البرق الشامی، مخطوطۂ بوڈلین، مجموعۂ مارش، عدد ۴۲۵، ورق ۳۶ راست، جس کا ابو شامہ : روضتین، بار اول، قاہرہ، ص ۳۳ تا ۳۴ نے اتباع کیا ہے) ـ صلاح الدین ایّوبی کی وفات کے بعد جب اس کی مملکت تقسیم ہوئی تو بعلبک بہرام شاہ ہی کے پاس رہا ـ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سے برابر وہ دمشق کی ایّوبی سلطنت کا وفادار باج گزار رہا (ابن واصل : مفرّج [الکروب]، سال ۵۹۹، ۶۰۳، ۶۰۶، ۶۱۸، ۶۲۳)، لیکن آخری عمر میں اسے بعض دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا، جنھیں بانیاس کے الملک العزیز عثمان بن الملک العادل کی جاہ طلبی نے اُبھارا تھا ـ دمشق کے الناصر داؤد نے ان دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی، مگر جب الملک الکامل اور الملک الاشرف نے داؤد سے دمشق چھین لینے کی خاطر اپنے جھگڑے طے کر لیے تو اس کا خمیازہ بہرام شاہ کو بھگتنا پڑا ـ دس مہینے تک بعلبک کا محاصرہ کرنے کے بعد الاشرف نے اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور بہرام شاہ دمشق چلا گیا (۶۲۶ھ / ۱۲۲۸ - ۱۲۲۹ء) ـ اس سے اگلے سال ایک غلام نے، جو اس سے عناد رکھتا تھا، اسے قتل کر دیا (ابن واصل : ۶۲۵ھ تا ۶۲۷ھ، سِبْط ابن الجوزی : مرآۃ الزمان، طبع Jewett، ص ۴۴۴)، [نیز قب فوات الوفیات، ۱ : ۱۵۰؛ البدایۃ و النہایۃ، ۱۳ : ۱۳۱].

اپنے ہم عصروں میں بہرام شاہ اپنے بادشاہ ہونے کی وجہ سے اتنا مشہور نہیں تھا جتنا ایوبیوں میں ایک ممتاز ادیب اور عالم ہونے کی حیثیت سے ـ اس نے عالموں فاضلوں کی ایک چھوٹی سی مجلس قائم کر رکھی تھی اور صاحبِ دیوان شاعر تھا ـ یہ دیوان محفوظ ہے، لیکن شائع نہیں ہوا (J. Rikabi : *La poésie profane sous les Ayyubides*، ص ۲۲۱ اور حاشیہ ۳) [ابن کثیر اور ابن شاکر نے شعروں کے نمونے درج کیے ہیں].

مآخذ : [(۱) ابن شاکر : فوات الوفیات (طبع محمد محی‌الدین عبدالحمید)، مصر، ۱ : ۱۵۰؛ (۲) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ، مکتبۃ المعارف، بیروت ۱۹۶۶ء، ۱۳ : ۱۳۱؛ (۳) ابن العماد : شذرات الذھب، ۵ : ۱۲۶؛] (۴) ثانوی مآخذ کے لیے قب مقالہ ایوبیہ (= بنو ایوب) جدید تصانیف؛ (۵) H. Gottschalk : الملک الکامل، ۳ : ۱۲۹ تا ۱۳۰ مع حواشی .

(Cl. Cahen [و ادارہ])

* **بہر سیر** : [= بہ اَردشِیر] رک بہ المدائن.

* **بہروز** : (امیر)، امیر رستم کا فرزند اور اسی کی طرح دُنبُلی Donboli کا امیر تھا ۔ اُس نے صفویہ کے وفادار حلیف کی حیثیت سے شاہ طہماسپ اور سلطان سُلیمٰن قانونی کے درمیان ۹۴۰ھ / ۱۰۳۸ء کی جنگ میں حصہ لیا ۔ اس کی وفات نوّے سال کی عمر میں ۹۸۵ھ / ۱۰۷۷ء میں ہوئی ۔ وہ پچاس سال بر سرِ اقتدار رہا ۔ اس کا لقب سُلیمٰن خلیفہ تھا ۔

(B. NIKITINE)

* **بہروز خان** : بن شہنشاہ خان، امیر دُنبُلی ۔ وہ سلیمٰن خان الثانی کے نام سے معروف تھا ۔ سلطان مراد کے آذربیجان پر حملے کے وقت اس نے شاہ صفی کی فوج میں نام پیدا کیا ۔ وہ ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۱ - ۱۶۳۲ء میں فوت ہوا ۔

مآخذ : (۱) زکی M. E. Zaki : مشاہیر الکُرد و کُردستان، ص ۴۴ ؛ (۲) تاریخ الدُّوَل وَ الْاِمارۃ الکُردیۃ، ص ۳۸۶، ۳۸۷ .

(B. NIKITINE)

* **بہزاد** : استاد کمال الدین بہزاد، ایران کا سب سے مشہور میناتوری مصوّر.

بہزاد کی ان فنی تخلیقات کی بنا پر جو اس وقت موجود ہیں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی پیدائش ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء اور ۸۶۵ھ / ۱۴۶۰ء کے درمیان ہوئی تھی [سال پیدائش کی مزید بحث کے لیے اس مقالے کا تعلیقہ دیکھیے جو آگے آ رہا ہے] ۔ میرزا محمد حیدر دوغلات [: تاریخ رشیدی]، دوست محمد [: حالات ہنروران] اور قاضی احمد [: گلستان ہنر] اسے امیر روح اللہ المعروف میرک نقّاش ہراتی کا شاگرد بتاتے ہیں، جو سلطان حسین بایقرا کا کتاب دار تھا ۔ میرک نے اس کی بحالت یتیمی پرورش کی تھی، مگر فنون میں، ترک مؤرخ مصطفٰی عالی کہتا ہے کہ، اس کا استاد پیر سیّد احمد تبریزی تھا [نیز دیکھیے تعلیقہ] ۔ پھر جہانگیر لکھتا ہے کہ بہزاد نے ایک فنکار خلیل میرزا [شاہرخی] کی طرز میں مصوّری کی (توزک جہانگیری [طبع سیّد احمد خان، ص ۲۸۵] ترجمہ از Rogers و Beveridge، ۲ : ۱۱۶) ۔ بہزاد کی ہنروری کا اعتراف قدر شناسوں نے بہت جلد کیا اور اپنے پہلے سرپرست میر علی شیرنوائی اور ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء سے کچھ پہلے سے لے کر بعد کے زمانے تک تیموری سلطان حسین بایقرا کی عنایت سے اسے تخلیقی صلاحیت کے بہت زیادہ مواقع میسّر آئے ۔ سلطان حسین کا دربار، جو ہرات میں تھا، اس زمانے کے منتخب روزگار علما و فضلا اور فنکاروں سے معمور تھا اور نوائی، جامی اور خواند امیر اس بزم کے گویا صدر نشین تھے ۔ محمّد خان شیبانی کے ہاتھوں اس خاندان کی تباہی (۱۵۰۷ء) کے بعد بھی بہزاد ہرات ہی میں مقیم رہا ۔ [اس سلطان کے بارے میں، مذمت کے انداز میں] بابر کہتا ہے کہ یہ سلطان قلم لے کر اپنے زعم میں بہزاد کی تصویروں کی اصلاح کرتا ۔ بعد میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے جب ہرات کو فتح کر لیا تو بہزاد اس کے ساتھ تبریز چلا گیا، جو صفویوں کا دارالحکومت تھا ۔ شاہ اسمٰعیل بہزاد پر بڑا لطف و کرم کرتا تھا، اس کا ثبوت عالی مصطفٰی کی اس روایت سے ملتا ہے جو اس نے شاہ اسمٰعیل کے متعلّق بیان کی ہے ۔ روایت یہ ہے کہ سلطان سلیم اول کے خلاف ۱۵۱۴ء کی مہم میں [جنگ چالداران کے موقع پر) شاہ کو بہزاد کے متعلّق بڑی تشویش رہی ۔ مزید ثبوت یہ ہے کہ ۲۷ جمادی الاولٰی ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء کو اسے شاہی کتابخانے کے کتاب دار [کلانتر] کا منصب عطا ہوا [نامۂ نامی، مخطوطۂ جامعہ پنجاب میں فرمان کی تاریخ ۹۲۷ھ ہے] اور ساتھ ہی کتابخانۂ شاہی کے ملازموں اور ممالک محروسہ کے تمام کاتبوں، نقاشوں، مذہّبوں،

جدول کشوں، حل کاروں، زرکوبوں اور لاجوردشویوں وغیرہ کی کلانتری بھی اسی کے سپرد کر دی گئی، یہ دستاویز قاضی احمد کے اس بیان کی تردید کرتی ہے کہ بہزاد شاہ طہماسپ (۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء) کے اوائل حکومت تک ہرات ہی میں مقیم رہا - شاہ طہماسپ کے عہد میں بھی بہزاد کو بہت سے اعزاز ملے، وہ سلطان محمد اور آقا میرک کے ساتھ شاہی کتب خانے میں کام کرتا رہا - سلطان محمد (فخری بن امیری) : لطائف نامہ، تقریباً ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰ء، نسخۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Add. ۷۶۶۹، ورق ۹۸ [نیز طبع اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۲ء، ص ۲۰۵] میں ایک قصہ مذکور ہے، جس سے بڑھاپے میں بہزاد کے فنی طریق کار کا حال معلوم ہوتا ہے : اس نے درویش محمد نقاش خراسانی کو، جو ترک تھا [قب مجالس النفائس، طبع علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۲۳ ھش، ص ۱۰۴]، جو ''ترکیبت'' بھی رکھتا تھا] اور اس کے لیے رنگ تیار کیا کرتا تھا، اپنا شاگرد بنا لیا اور اس کی تربیت کی اور آخر اپنے کام اس کے سپرد کرنے لگا [مذکورہ نسخۂ حکمت : ''و در اندک فرصتے کامل شد''، ''حالا استاد، کار خود باو رجوع می کند''] - حیدر میرزا [: تاریخ رشیدی] اس کے دوسرے شاگردوں، یعنی شبیہ نگار قاسم علی، مقصود اور ملّا یوسف کا ذکر کرتا ہے، اسی طرح مصطفی عالی نے [مناقب ہنروران] شیخ زادۂ خراسانی اور آقا میرک کا ذکر کیا ہے - مزید براں قاضی احمد [گلستان ہنر] نے دوست دیوانہ اور مصور مظفر علی کے والد کا تذکرہ کیا ہے اور بہزاد کو یاری [محمد] مُذَہّب ہراتی کا ہمعصر بتایا ہے اور اس کی تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ ان دونوں نے مل کر ۸۹۳ھ کے نسخۂ بوستان پر، جو قاہرہ میں ہے، کام کیا تھا (دیکھیے نیچے) - قاضی احمد [: گلستانِ ہنر] نے درویش اور قاسم علی کا زمانہ بہزاد سے ذرا پہلے مقرر کیا ہے، جس سے استادی و شاگردی کا تعلق مشکوک ہو جاتا ہے - اخیر میں اسکندر منشی (عالم آرای، ص ۱۲۷) کہتا ہے کہ مظفر علی اس کے شاگردوں میں سے تھا - امیر دوست محمد ہاشمی کے بیان کردہ مادّۂ تاریخ [''خاکِ قبرِ بہزاد''] کی رُو سے بہزاد کا سنہ وفات ۹۴۲ھ/۱۰۳۵-۱۰۳۶ء ہے (مقدمۂ دوست محمد [حالاتِ ہنروران] بر مرقع بہرام میرزا) اور وہ تبریز میں [فارسی کے معروف] شاعر شیخ کمال خُجندی کے پہلو میں مدفون ہوا - دوسری روایت کے مطابق وہ اس سے ایک دو سال پہلے ۹۴۰ھ/۱۰۳۳-۱۰۳۴ء میں فوت ہوا - ایک اَور روایت کی رُو سے، جو قاضی احمد [: گلستانِ ہنر] سے مروی ہے، بہزاد ہرات میں فوت ہوا اور اسے کوہ مختار کے قرب و جوار میں تصاویر اور نقش و نگار سے آراستہ ایک احاطے میں دفن کیا گیا - استانبول کے کتاب خانۂ یلدز میں اس کی میناتوری شبیہ [جو شاید خیالی ہے] موجود ہے، جس میں سن رسیدہ بہزاد کو صفوی لباس میں سادہ اور بظاہر ایک شرمیلا سا آدمی دکھایا گیا ہے (*La miniature persane* : A. Sakisian، پیرس و برسلز ۱۹۲۹ء، شکل ۱۳۰).

فن کار کی حیثیت سے بہزاد کے متعلق ہماری آگاہی کے لیے قدیم‌تر مآخذ بہت کم معلومات بہم پہنچاتے ہیں - تاہم وہ اسے اپنے عہد کا عظیم‌ترین فنکار سمجھتے اور بے حد تعریف کرتے ہیں، مثلاً خواند امیر اپنی مبالغہ آمیز زبان میں اس کی انتہائی نفاست، کمال راسخ، اور جیتی جاگتی شبیہ بنانے کی قوت پر بہت زور دیتا ہے - حیدر میرزا اس کا موازنہ اوّل تو اس کے استاد میرک سے کرتا ہے، جس کے فن میں پختگی تو زیادہ مگر نفاست نسبۃً کم ہے، اور پھر شاہ مظفر سے مقابلہ کرتا ہے، جس کی [بہ حیثیت فن کار] عزت و تکریم اس کے برابر برابر

تھی اور بہزاد کو اس پر قلم کی گرفت، خاکہ کشی اور صورتگری میں فوقیت حاصل تھی، اگرچہ وہ اس کی سی نفاست و نزاکت حاصل نہ کر سکا۔ قاضی احمد اس کے احساس تناسب پر زور دیتا ہے اور پرندوں کی تصویر بنانے میں اس کے کمال کا ذکر کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ کوئلے سے خاکہ کشی میں بڑا مشّاق تھا۔ بابر اس کے فن کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ بڑا ہی 'نازک قلم' ہے، اور خصوصاً اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس نے با ریش چہروں کی تصویریں تو قابلِ تحسین بنائی ہیں مگر اس کی بے ریش تصویریں اتنی اچھی نہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے غبغب کی لمبائی میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ بابر کے جانشین بھی اس کے مدّاحوں میں سے تھے اور اپنے کتب خانوں کے لیے اس کے فن پاروں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ وہ عموماً ان قیمتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے [مختلف فن پاروں کے سلسلے میں] ادا کیں (تین ہزار سے پانچ ہزار روپے تک)۔ لیکن بہزاد کے فن پاروں کی بڑی تعداد پہلے ہی جمع ہو چکی تھی اور اس کی کچھ تصویریں صفوی امیر سلطان ابراہیم میرزا (م ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶-۱۵۷۷ء) کے مرقّع (البم) میں شامل ہو چکی تھیں۔ جہانگیر پہلا ہنرشناس تھا جس نے یہ کہا (جیسا کہ کسی اور موقع پر بھی ذکر آیا ہے) کہ بہزاد جنگی مناظر کی تصویر کشی میں خاص طور پر ممتاز تھا۔ بہزاد کو جو عظمت حاصل تھی اس کی وجہ سے اس کا نام انجام کار ضرب المثل بن گیا۔ خواند امیر کی رائے میں اسے مانی کی صف میں رکھنا چاہیے جس کے شاہ کار بے عدیل ہیں۔ قاضی احمد مزید غلو سے کام لیتے ہوے کہتا ہے: ''اگر مانی بہزاد کے زمانے میں ہوتا تو وہ بھی اس کی نقالی کرتا''۔ لیکن [مصطفٰی] عالی اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ بہزاد کی کامیابی کسی حد تک اس کے سرپرستوں کے اثر و رسوخ کی رہینِ منّت تھی؛ مگر یہ بھی واضح ہے کہ اس کے خلاف کچھ رقابتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ صفوی سلطان سام میرزا نے تحفۂ سامی میں ایرانی نقّاشوں اور کاتبوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں بہزاد کو اس کے شایانِ شان مقام نہیں دیا گیا (ایم۔ محفوظ الحق: *Persian Painters, illuminators and Calligraphers, etc. in the 16th century, A. D.*، در *Journal and Proceedings, Asiatic Society of Bengal, New Series*، جلد ۳۸، ۱۹۳۲ء، ص ۲۳۹ تا ۲۴۲).

جدید تحقیق زیادہ تر بہزاد کے اصلی فن پاروں کی شناخت ہی سے سروکار رکھتی ہے اور اسے ایک حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے، بالخصوص ۱۹۳۱ء سے، جب لنڈن میں ایرانی فن کی نمائش منعقد ہوئی، جس میں ان تصاویر کی اچھی خاصی تعداد جمع کر دی گئی تھی جو بہزاد سے منسوب کی جاتی ہیں۔ تاہم بہزاد کی فنکارانہ عظمت اور اس کے فن کے امتیازی اوصاف کا قطعی طور پر تعین اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ابھی فن پاروں کی خاصی بڑی تعداد کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ان میں سے کتنے اس کے ہیں اور کتنے اس کے پیشروؤں اور معاصرین کے ہیں۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ اُلجھ گیا ہے کہ بہزاد کی [غیر معمولی] شہرت کی بنا پر اس کے دستخطوں کو صدیوں تک جعلی طور پر میناتوری تصاویر (miniatures) پر ثبت کر دیا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا مالی منفعت کی خاطر کیا جاتا ہو یا کسی جمع کنندہ کے لیے ایک مشہور مصوّر کی طرف منسوب کوئی ورق مہیا کرنے کی غرض سے ہو، یا پھر اس کے فن پاروں کی اس کے دستخطوں سمیت کلّی یا جزوی طور پر نقل

اتار لی گئی ہو یا اس کی وفات کے بعد ان کی تکمیل یا تجدید کی گئی ہو۔

بہزاد کے فن کے متعلق ہماری قطعی معلومات کی اساس اس مخطوطۂ بوستان کی تصاویر پر ہے جو ہرات میں رجب ۸۹۳ھ/جون ۱۴۸۸ء میں مکمل ہوا، اور مصری کتب خانۂ قومی قاہرہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ سلطان علی الکاتب نے سلطان حسین بایقرا کے لیے لکھا تھا، اس کی تذہیب یاری [محمد] نے کی تھی اور اس میں سرورق پر دو صفحوں کی ایک تصویر (جس پر اب دستخط مٹ چکے ہیں) اور [اندر] چار یک صفحی تصاویر ہیں، جن پر ۸۹۳ اور ۸۹۴ھ کی تاریخیں مرقوم ہیں۔ ان میں سے آخری دو تصویروں میں بہزاد کا نام عمارتی آرائش میں موجود ہے۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ وہ اضافہ بعد کا ہو اور دوسرے دو دستخط اتنے غیر واضح مقام پر اور اتنے سادہ انداز میں ہیں کہ وہ بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تمام تصویریں چونکہ ایک ہی طرز اور یکساں صفات کی حامل ہیں، لہٰذا انہیں قریب قریب متفقہ طور پر اس استاد کی مستند تخلیقات تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ تیموری طرز کے کمال کا اظہار کرتی ہیں، یہ تصویریں بڑی ہنرمندی سے اور ہم آہنگ انداز میں بنائی گئی ہیں، جس میں متن کی ان عبارتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جو بیچ بیچ میں آ گئی ہیں۔ اشخاص کی شبیہوں کو جو زیادہ بڑی نہیں ہیں، حدود تصویر کے اندر اس زمانے کے تخیلات کے مطابق مناسب و موزوں تعداد میں خوبی کے ساتھ ادھر ادھر پھیلا دیا گیا ہے۔ خوش نما رنگوں کا بڑا تنوع ہے اور انہیں بہت ترقی یافتہ الوانی حس کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ ان تصویروں سے منکشف ہوتا ہے کہ بہزاد بظاہر مجموعی طور پر ٹھنڈے رنگوں، مثلاً نیلے اور سبز کو ترجیح دیتا تھا، خصوصاً اندرونی مناظر میں، لیکن ان کا توازن ہمیشہ ان کے جوڑ کے گرم رنگوں خصوصاً شوخ نارنجی رنگ سے کیا گیا ہے۔ خاکے کی تمام وحدتیں مجموعی تصویر پر بڑے حسین انداز سے موزوں بیٹھتی ہیں، جس کی تکمیل بڑے کمال کے ساتھ کی گئی ہے۔ درختوں کی شگوفہ دار شاخوں پر نقش و نگار، کاشی کے نہایت مرصّع نمونوں اور قالینوں کے نقشوں سے فنکار کی تزئینی حسّ اور لطافت ہنر کا خاص طور سے پتا چلتا ہے۔ تاہم ان کی واقعیت نگاری انہیں عہد ماضی کی تصاویر سے ممیّز کرتی ہے۔ یہ بات اس صورت گری سے واضح ہو جاتی ہے جو خالصةً درباری طرز کی نہیں اور نہ اساسی طور پر بادشاہوں کے شجاعانہ کارناموں اور ان کے عشق و محبت ہی کے لیے مخصوص ہے، بلکہ اس میں روز مرّہ کے واقعات کو بھی اسی سطح پر دکھایا گیا ہے (مثلاً کسی بےخوار بادشاہ کی عجیب و غریب حرکات، مسجد میں وضو، اور چراگاہ میں گھوڑیوں کا اپنے بچھیروں کو دودھ پلانا وغیرہ)، نیز اس میں معاشرتی لحاظ سے کمتر درجے کے اشخاص کے افعال کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے (مثلاً دربان گھر میں داخل ہونے والے کسی غیر شخص کو سزا دیتے ہوے یا ملازم کھانا لاتے ہوے یا کسان کام کاج کرتے ہوے وغیرہ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ یہ تصویریں محض مثالی نمونے اور مصنوعی چہروں والی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں بلکہ ان میں انفرادیت پیدا کر دی گئی ہے اور انہیں بالعموم اضطراری حرکت سے معمور یا ڈرامائی چیزوں کے احساس کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ انہیں جب سکون کی حالت میں دکھایا گیا ہے تب بھی ان کا رویہ فطری ہے۔

چونکہ بہزاد سے منسوب کسی دوسرے فن پارے میں قابل اعتماد دستخط نہیں ہیں [لیکن دیکھیے تعلیقہ] گو ان میں سے بعض کو سولھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل سے اس کی طرف منسوب

کیا جاتا رہا ہے، اس لیے صرف ان کا طرز ہی (یعنی تزئینی اور حقیقت پسندانہ صفات کا بےعیب امتزاج) اس کی دوسری اصلی تصاویر کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتا ہے ۔ اس کام میں کسی قدر مزید مدد اس سے مل جاتی ہے کہ اس عہد میں لوح نقش ساز (stencil) سے نقاشی کرنے کا رواج تھا، اور اس طرح بعض ان شکلوں کا چربہ جو بہزاد کی کسی مستند تصویر کی سمجھی جاتی تھیں دوسری نسبةً زیادہ مشکوک تصویروں میں اتار لیا جاتا تھا اگرچہ یہ عمل ایک طالب علم بھی کر سکتا تھا ۔ بدقسمتی سے ہمیں چونکہ بہزاد کی ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء سے پہلے اور ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء کے بعد کی تصاویر کے متعلق فی الحال کچھ علم نہیں ہے، [لیکن دیکھیے تعلیقه]، لہٰذا ہم اس استاد کے زمانۂ شباب و پیری کے تخلیقی عمل کے بارے میں بھی شک میں ہیں ۔ اتنے شبہات کے ہوتے ہوے علما کا بعض انتسابات کے متعلق اتفاق رائے نہ رکھنا فطری امر ہے، لیکن اس کے باوجود اگر مفصلۂ ذیل فن پارے سب کے سب خود اس استاد کے نہ بھی ہوں تب بھی کم از کم وہ اس کے دبستان کے ضرور ہیں۔

(۱) میر علی شیرنوائی : خمسه، مؤرخه ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء، مرقومه برائے بدیع الزمان بن سلطان حسین بایقرا، ۴ جلدوں میں، در کتاب خانۂ Bodleian (مخطوطات ایلیٹ Elloit عدد ۲۸۷، ۳۰۸، ۳۱۷، ۳۳۹) اور ایک جلد در کتب خانۂ John Rylands، مانچسٹر (ترکی مخطوطه ۳) ۔ (۲) امیر خسرو دهلوی : خمسه، جسے محمد بن اظهر نے ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء میں لکھا [اس میں] چار تصویریں بہزاد کی طرز سے بہت ملتی جلتی ہیں (مارٹن F. R. Martin : *Les miniatures de Behzad dans un manuscrit persan, date 1485*، میونخ ۱۹۱۲ء، لوح ۹، ۱۶، ۱۸ و ۲۱) ۔

(۳) گلستان، تحریر سلطان علی کاتب، محرم ۸۹۱ھ/جنوری ۱۴۸۶ء، *M. De Rothschild Collection*، پیرس ۔ ایک تصویر (''سعدی و جوان کاشغر'') غالباً بہزاد کی ہے ۔ ۱۴۸۵ تا ۱۴۸۶ء کے ان تین مخطوطات کی تصاویر اگر واقعی بہزاد کی ہیں تو وہ جوانی کے زمانے کا نمونه سمجھی جائیں گی جن میں وہ بات پیدا نہیں ہوئی جو قاہرہ کے مخطوطۂ بوستان کی تصاویر میں پائی جاتی ہے ۔

(۴) دہری تصویر : ''سلطان حسین بیقرا، باغ میں اپنے حرم و خدم و حشم کے ساتھ''، تقریباً ۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء تا ۹۰۰ھ/۱۴۹۰-۱۴۹۵ء، تہران، کتب خانۂ قصر گلستان ۔ بہزاد کے اسلوب سے بہت ہی مشابہت رکھتی ہے اور کم از کم جزوی طور پر تو اس تک ضرور پہنچتی ہے ۔

(۵) نظامی : خمسه، متن مؤرخه ۸۴۶ھ/ ۱۴۴۲ء، موزۂ بریطانیه، شماره ۲۵۹۰۰ [۲ : ۵۷۰]- بعد کے زمانے کی ۱۹ [۲۰] تصاویر، جن میں سے ایک پر تاریخ ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء مرقوم ہے، جو بہزاد کی طرز کی چار تصاویر کی تخمینی تاریخ ہے ۔ ان میں سے تین تصویروں پر چھوٹے حروف میں بہزاد کا نام ہے، جو غالباً اصلی ہے (اوراق ۱۲۱ Vᵒ، ۱۶۱ rᵒ، ۲۳۱ Vᵒ) [لیکن دیکھیے ریو : فہرست مخطوطات فارسی موزۂ بریطانیه : جہاں اوراق مختلف ہیں] اور چوتھی جو ورق ۱۱۴ rᵒ پر ہے (''مجنون کعبے کے سامنے'') اور جس پر کوئی دستخط نہیں ہیں، اتنی بلند پایه ہے که وہ بھی بہزاد کی ہو سکتی ہے ۔

(۶) نظامی : خمسه، جو امیر علی فارسی برلاس کے لیے لکھا گیا، ایک تصویر مؤرخه ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴-۱۴۹۵ء، موزۂ بریطانیه نمبر .Or ۶۸۱۰ - سوله تصاویر جنہیں جہانگیر نے بہزاد کی طرف منسوب کیا ہے اور غالباً یا تو وہ اسی کی ہیں (اوراق ۳۷ Vᵒ، ۱۳۰ Vᵒ، ۱۹۰ rᵒ، ۲۱۴ rᵒ، ۲۲۵ Vᵒ،

۲۳۳V°)، یا اس کے شاگردوں کی (اوراق، ۲۷V°، ۴۲V°، ۹۳r°، ۱۰۶V، ۱۲۸V°، ۱۳۷r°، ۱۴۴V°، ۱۵۴V°، ۱۵۷r°، ۱۷۵r°).

(۷) شرف الدین علی یزدی: ظفر نامہ، غالباً سلطان حسین بایقرا کے لیے لکھا گیا، ایک بعد کی عبارت کی رو سے ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں شیر علی نے مکمل کیا، لیکن چھے دھرے صفحے کی تصاویر ۱۴۹۰ تا ۱۵۰۰ء کی ہیں۔ Johns Hopkins University Library, Baltimore (مجموعۂ R. Garret) ۔ آٹھ (کذا) میناتوری تصاویر جنھیں جہانگیر بہزاد کے ابتدائی عہد سے منسوب کرتا ہے۔ تمام تصویریں بہزاد ھی کی ھیں، گو ممکن ھے کہ ان کے بعض حصے اس کی اور اس کے شاگردوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوں، بعض سے ظاہر ھوتا ھے کہ ان میں ترمیم و اصلاح بھی کی گئی ھے، غالباً مغل نقاشوں کی طرف سے۔

(۸) مدوّر میناتوری تصویر ''پیر و برنا بڑی منظر میں'' ایک بیاض اشعار مؤرخہ ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء میں، جو وزیر خواجہ ملک احمد کے لیے لکھی گئی تھی، واشنگٹن Freer Gallery of Art، شمارہ ۴۴، ۴۸۔ یہ تصویر جو ھو سکتا ھے کہ مخطوطے سے زیادہ پرانی ہو، نمبر ۲ [خمسۂ امیر خسرو] کی ایک تصویر کی ھو بہو نقل معلوم ھوتی ھے۔ اس کتاب کے مقدمے کی رو سے اس تصویر کا مالک، جو صفوی دربار کا ایک بلند مرتبت عہدے دار تھا، اس وقت جب کہ بہزاد زندہ تھا اور شاھی کتب خانے سے منسلک تھا، اسے اصلی فن پارہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ استاد کے عہد پیری کا کارنامہ ھے اور یہی امر اس تکرار و کمزوری کی توجیہ بھی کرتا ھے جو اس تصویر میں پائی جاتی ھے۔ بصورت دیگر یہ بہزاد کی نگرانی میں کسی شاگرد کی اتاری ھوئی نقل ھو سکتی ھے اور اسی لیے اسے بہزاد کا اپنا ذاتی کارنامہ سمجھ لیا گیا۔

(۹) اکیلی تصویر ''دو اونٹوں کی لڑائی اور تماشائی'' تہران، کتب خانۂ قصر گلستان۔ اس پر مندرجہ عبارت کی رو سے یہ تصویر بہزاد نے بنائی تھی جب وہ ستّر برس کا تھا۔ ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء میں جہانگیر نے اسے ایک مستند تصویر سمجھا۔ اسی موضوع کی ایک پندرھویں صدی کے وسط کی تصویر سے اندازہ ھوتا ھے کہ یہ اپنی اصل سے معیار میں بہت کم تر درجے کی ھے (R. Ettinghausen: *Some paintings in four Istanbul albums*، در *Ars Orientalis*، عدد ۱، ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۲، اشکال ۳ و ۳۶)۔ لہٰذا ۸ اور ۹ نمبر کی تصویروں کو بہزاد کے زمانۂ انحطاط کا کارنامہ تصور کرنا ممکن ھے۔

وہ تصویریں جن کا ذکر کتابوں میں تو آتا ھے، مگر اب ملتی نہیں، یہ ھیں: خمسۂ نظامی، جسے مولانا محمود نیشاپوری نے شاہ طہماسپ کے لیے لکھا تھا؛ تیمور نامہ، مصنّفۂ سلطان علی مشہدی اور وہ تصاویر جو چھوٹی تصویروں کے مرقّع میں ھیں، جن کے لیے خواند امیر نے دیباچہ لکھا اور اس مرقع میں جو سلطان ابراھیم میرزا کی ملکیت تھا۔

بہزاد کا اثر سب سے پہلے اس کے شاگردوں میں نظر آتا ھے، جن میں سے بعض مثلاً قاسم علی اور آقا میرک تقریباً اپنے استاد کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ صفویوں کے عہد میں بہت جلد طرز نقاشی میں ایک اور تغیر رونما ھو گیا تھا، دسویں صدی ھجری/ سولھویں صدی عیسوی کے پہلے تیس برسوں میں ایک ایسا عبوری اسلوب رائج رہا جس میں بہزاد کے فن کی بہت سی خصوصیات نمایاں ھیں۔ اس کی ایک مخصوص مثال علی شیر نوائی کا ۱۵۲۶ء کا مخطوطہ ھے (Bibl. Nat. Suppl. turc، ص ۳۱۶)۔ ھرات کے مصوّر بہزاد کی طرز کو بخارا لے گئے، جسے وھاں

شیبانی دربار میں اپنا لیا گیا۔ عصّار کی مہر و مشتری کا ایک مخطوطہ، جسے ۹۲۹ھ / ۱۵۲۳ء میں بخارا کے مقام پر نقل کیا گیا تھا، اس بات کی ایک عمدہ مثال ہے کہ وہاں بہزاد کی طرز بہ نسبت تبریز کے بہت زیادہ اصلی حالت میں محفوظ تھی (Freer Gallery of Art، عدد ۳۲، ۵ - ۳۲ - ۸) - یہاں بہزاد اور ہرات کے دبستان کی روایت سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد تک باقی رہی۔ ان مرکزوں سے، جو زیادہ تر بہزاد کے اثر و رسوخ کے تحت تھے، فنکاروں کے نقل مکان کی وجہ سے ہرات کی طرز اور بہزاد کی روایت برّصغیر پاکستان و ہند میں بھی پہنچ گئی۔

اسلوب کی عمومی ترقی سے قطع نظر کرتے ہوے ہم دیکھتے ہیں کہ بہزاد کی تصویروں اور ان کے موضوعات کی کم و بیش ہو بہو نقل سترھویں صدی تک ہوتی رہی، مثلاً ''دارا و اسپان'' کی تصویر، جو بوستان کے نسخۂ قاہرہ میں ہے، بوستان کے مخطوطات مؤرخہ ۱۵۳۰ء (Cartier collection پیرس) اور ۱۵۵۶ء (Bibl. Nat. Suppl. Pers. عدد ۱۱۸۷) وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے - ''لڑتے ہوے اونٹ'' پاکستان و ہند کی متعدّد چھوٹی تصاویر میں بار بار نظر آتے ہیں اور ایک ایرانی قالین پر، جس میں مختلف جانوروں کے نمونے کی تصاویر ہیں (برلن، سابقاً Schloss-Museum) اور تقریباً سولھویں صدی کی ایک سبز روغنی بوتل پر بھی یہ تصویر موجود ہے (لنڈن، وکٹوریا اور البرٹ میوزیم) جبکہ ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء اور ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء ایسے مؤخر زمانے میں رضای عباسی ایسے نمونوں کی نقل کرتا ہے جو بہزاد کی تخلیق سمجھے جاتے ہیں (پیرس Vignier collection و کتبخانۂ قصر گلستان ایران)۔

مآخذ: [اس کی زندگی کے بڑے بڑے ماخذ یہ ہیں: (۱) خواند امیر: حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳: ۳۵۰؛ (۲) وہی مصنّف: نامۂ نامی (Bibl. Nat. Ms. Suppl. Pers. *1842*، نیز مخطوطۂ جامعۂ پنجاب) کی دو دستاویزیں، یعنی بہزاد کے ترتیب دیے ہوے خطّاطی اور کتابی تصاویر کے مرقع پر دیباچہ، اور اس کے کتاب خانۂ شاہی کا کلاںتر بنائے جانے کا فرمان؛ (۳) محمد قزوینی و L. Bouvat: *Deux documents inedits relatifs a behzad*، در *RMM*، ۱۹۱۴ء، ۲۶: ۱۴۶ تا ۱۶۱؛ (۴) بست مقالہ، تہران ۱۳۱۳ ھش، ص ۲۰۵ ببعد؛ (۵) بابرنامہ، طبع Beveridge، لنڈن ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۲، ۲۹۱، ۳۲۹؛ (۶) میرزا محمد حیدر دوغلات: تاریخ رشیدی (آرنلڈ T.W. Arnold، در *BSOS*، ۵، ۱۹۳۰ء: ۶۷۲ تا ۶۷۳ [نیز دیکھیے مخطوطۂ جامعۂ پنجاب]؛ (۷) دوست محمد بن سلیمٰن ہراتی: [حالات ہنروران، طبع عبداللہ چغتائی ۱۹۳۶ء] *Account of past and present painters of the Year 951/1544-[? 953]*، در مرقع بہرام میرزا، کتابخانۂ طوپ قپو سرائے، استانبول، نیز Binyon-Wilkinson-Gray: *Persian Miniature Painting*، آوکسفرڈ ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۶؛ (۸) مصطفٰی عالی: مناقب ہنروران (۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء)، استانبول ۱۹۲۶ء، ص ۳۷، ۶۳ تا ۶۵، ۶۷؛ (۹) قاضی احمد بن میر منشی: گلستان ہنر (۱۰۰۵ھ/۱۶۰۶ء) (Calligraphers and painters...)، ترجمہ از منورسکی V. Minorsky، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۹، ۱۷۹ تا ۱۸۰، ۱۸۳)؛ (۱۰) اسکندر منشی: تاریخ عالم آرای عبّاسی، (نیز آرنلڈ: *Painting in Islam*، ص ۱۴۱)؛ (۱۱) Cl. Huart: *Les calligraphes et les miniaturistes de l'orient musulman*، ۱۹۰۸ء، ص ۲۲۲، ۲۳۹، ۳۳۰ ببعد؛ (۱۲) مارٹن F. R. Martin: *The miniature painting and painters of Persia, India and Turkey*، ۱۹۱۲ء، ص ۴۰ ببعد، شکل ۳۹، لوح ۶۷ تا ۹۳؛ (۱۳) وہی مصنّف: *Les miniatures de Bihzad dans un*

Ms. persan daté de 1485، ۱۹۱۲ء؛ (۱۴) وهی
مصنف اور آرنلڈ T. W. Arnold : *The Nizami-Ms. in
the British Museum*، عدد Or. ۶۸۱، ۱۹۲۶ء؛ (۱۵)
G. Marteau-H. Vever : *Miniatures persanes*،
۱۹۱۳ء، شکل ۲۱۹؛ (۱۶) E. Blochet : *Les
peintures des manuscrits orientaux de la Biblio-
thèque Nationale*، ۱۹۱۴ تا ۱۹۲۰ء، ص ۱۷۵، ۱۸۷
ببعد، ۲۷۷ تا ۲۸۸، لوح ۳۴ تا ۳۹؛ (۱۷) وهی مصنف :
*Les enluminures des manuscrits orientauxt—urcs,
arabes, persans—de la Bibliotheque Nationale*،
۱۹۲۶ء، ص ۸۹ ببعد ۹۶، ۱۰۰، لوح ۴۲، ۴۸؛ (۱۸)
وهی مصنف، در *Bulletin de la Société Française de
reproductions de manuscrits a peintures*، ۱۰،
۱۹۲۶ء : ۸ تا ۹ اور ۱۲، ۱۹۲۸ء : ۶۸،
۸۵ ببعد؛ (ان تمام عبارات کا اشاریه جو Blochet
کی تصانیف میں مندرج هیں)؛ (۱۹) E. Kühnel :
Miniaturmalerei im islamischen Orient، ۱۹۲۳ء،
ص ۲۷ تا ۲۹، ۵۷، لوح ۴۸ تا ۵۴؛ (۲۰) وهی مصنف :
History of miniature painting and drawing، در
A Survey of Persian Art، طبع پوپ A. U. Pope،
لنڈن - نیویارک ۱۹۳۹ء، جلد ۳، ۱۸۵۸ تا ۱۸۷۲ء،
جلد ۵، لوح ۸۸۵ تا ۸۹۱؛ (۲۱) وهی مصنف :
''بہزاد''، در *Mémoires, IIIe Congrès Internat.
d' Art et Archéologie Iraniens*، ۱۹۳۵ء، ماسکو-
لینن گراڈ ۱۹۳۹ء، ص ۱۱۴ تا ۱۱۸، لوح ۵۳؛ (۲۲)
آرنلڈ T. W. Arnold : *Painting in Islam*، ۱۹۲۸ء،
ص ۳۳، ۳۴ ببعد، ۴۹ ببعد، ۷۱، ۷۷، ۱۲۹،
۱۵۰ ببعد؛ (۲۳) وهی مصنف : *Bihzād and his paintings
in the Zafar-Nāmah Ms.*، ۱۹۳۰ء؛ (۲۴) A.
Sakisian : *La miniature persane*، ۱۹۲۹ء، ص ۴۷
تا ۵۰، ۶۲ تا ۸۰، ۸۵ تا ۸۷، ۱۰۳ تا ۱۰۵، لوح
۲، ۳۷، ۴۶ تا ۵۶، ۶۵ تا ۶۷، ۷۴ تا ۷۵؛ (۲۵) وهی
مصنف : *La miniature à l'exposition d'art persan de
Burlington House*، در *Syria*، ۱۲، ۱۹۳۱ء :
۱۶۹ تا ۱۷۱؛ (۲۶) A. K. Coomaraswamy :
*Les miniatures orientales de la collection
Goloubew au Museum of Fine Arts de Boston*،
۱۹۲۹ء، شماره ۲۶ تا ۳۴، ۷۱؛ (۲۷)
M. S. Dimand : *A Handbook of Mohammedan
decorative Arts*، ۱۹۳۰ء، ص ۳۲ تا ۳۶، شکل ۱۱؛
(۲۸) وهی مصنف : *A guide to an exhibition of
Islamic Miniature painting and book illumination in
the Metrop. Museum of Arts*، ۱۹۳۳ء، ج ۲۹ تا
۳۴، شماره ۱۸ تا ۲۰، ۳۱؛ (۲۹) B. Gray :
Persian Painting، ۱۹۳۰ء، ص ۵۷ تا ۶۶، لوح ۷؛
(۳۰) وهی مصنف : *Persian Painting from minia-
tures of the XIII-XVI centuries*، نیویارک - ٹورنٹو
۱۹۴۰ء، ص ۱۲، لوح ۸؛ (۳۱) J. V. S.
Wilkinson : *Fresh light on the Herat painters*، در
Burlington Magazine، فروری ۱۹۳۱ء، ص ۶۲ تا ۶۷؛
(۳۲) منورسکی V. Minorsky : *Two unknown Persian
manuscripts*، در *Apollo*، فروری ۱۹۳۱ء؛ (۳۳)
I. Stchoukine : *Les miniatures persanes au Louvre*،
۱۹۳۲ء، ص ۴۱ ببعد و لوح ۹؛ (۳۴) وهی مصنف :
*Un Gulistān de Sa'dī illustré par les artistes tīmurī-
des*، در *Revue des Arts Asiatiques*، ۱۰، ۱۹۳۶ء :
۹۲ تا ۹۶، لوح ۳۴، ۳۵؛ (۳۵) وهی مصنف : *Les
peintures de la Khamseh de Nizami du British
Museum*، عدد Or. ۶۸۱۰ در *Syria*، ۲۷، ۱۹۵۰ء :
۳۰۱ تا ۳۱۳؛ (۳۶) وهی مصنف : *Les peintures
des manuscrits tîmûrides*، پیرس ۱۹۵۴ء، ص ۲۱ تا
۲۵، ۶۸ تا ۸۶، ۹۵، ۱۰۱ تا ۱۰۴، ۱۱۰ تا ۱۱۱،
۱۲۰ تا ۱۴۱، لوح ۲۷ تا ۸۸ (یه جامع ترین اور
بہترین تنقیدی بیان هے، جس میں اس سے

پہلے کی بڑی بڑی مطبوعات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے)؛ (۳۷) L. Binyon و J. V. S. Wilkinson و B. Gray: *Persian Miniature Painting*، ۱۹۳۳ء، باب ۴ و ۵، لوح ۶۲ تا ۴۷، ۷۸ تا ۸۱، ۸۶ ببعد، ۸۹؛ (۳۸) G. Wiet: *L'exposition persane de 1931*، ۱۹۳۳ء، ص ۴۷ تا ۷۸، لوح E ۳۴ تا ۳۶؛ (۳۹) E. Kühnel و H. Goetz: *Indische Buchmalerei, aus dem Jahāngir Album der Staatsbibl, zu Berlin*، ۱۹۲۴ء، ص ۴۴، لوح ۳، ۳۱، ۳۳؛ (۴۰) E. de Lorey: *Behzād le Gulistān Rothschild*، در *Ars Islamica*، جلد ۴، ۱۹۳۷ء، ص ۱۲۲ تا ۱۴۳؛ (۴۱) وهی مصنّف: *Behzad*، در *Gazette des Beaux-Arts*، ۲۰، ۱۹۳۸ء: ۲۵ تا ۴۴؛ (۴۲) E. Schroeder: *The Persian Exhibition and the Bihzad problem*، در *Bull. Fogg. Museum of Art*، ۷، ۱۹۳۷ء: ۳ تا ۱۴؛ (۴۳) R. Ettinghausen: "*Six thousand years of Persian art*". *The exhibition of Iranian Art*، نیویارک ۱۹۴۰ء، در *Ars Islamica*، ۷، ۱۹۴۰ء: ۱۱۱، شکل ۶؛ (۴۴) B.W. Robinson: *A descriptive catalogue of the Persian paintings in the Bodleian Library*، آوکسفرڈ ۱۹۵۸ء، ص ۶۵ تا ۶۷؛ (۴۵) R. H. Pinder-Wilson: *Persian painting of the fifteenth century*، لنڈن ۱۹۵۸ء، ص ۵، ۴۲، لوح ۷ تا ۹.

(R. ETTINGHAUSEN)

[تعلیقہ:

بہزاد: سوانح: سالِ پیدائش کی قطعی تعیین نہیں ہو سکی، لیکن دوست محمد نے حالات ہنروران میں بہزاد کا سالِ وفات ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سو سال زندہ رہا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۸۴۲ھ / ۱۴۳۸-۱۴۳۹ء کے قریب کے زمانے میں پیدا ہوا ہوگا۔ بہزاد کے خاندان یا اس کے آبا و اجداد کے حالات کا کہیں پتا نہیں چلتا؛ قاضی احمد نے گلستانِ ہنر میں اتنا بیان کیا ہے کہ بہزاد ہرات کا باشندہ تھا اور اپنے والدین سے بچپن ہی میں محروم ہو گیا تھا؛ استاد میرک نقّاش نے اس کی پرورش کی تھی۔ اس کے ایک خواہر زادہ مولانا رستم علی خراسانی (م ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲-۱۵۶۳ء) خطّاط کا ذکر بھی ملتا ہے، جو سلطان علی مشہدی کا تلمیذ تھا اور بہرام میرزا اور پھر اس کے بیٹے ابوالفتح سلطان ابراہیم میرزا (ولادت ۱۵۴۳-۱۵۴۴ء) کے کتاب خانے میں ایّامِ پیری میں بھی ملازم تھا (منورسکی V. Minorsky: *Caligraphers and Painters*، واشنگٹن ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۷)۔ یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے ماموں بہزاد کے ہمراہ تبریز میں رہتا تھا۔ اسی طرح رستم علی کا ایک بھانجا مظفر علی تھا، جس کا والد بہزاد کا شاگرد تھا اور اہلِ نظر اسے فن میں بہزاد کے برابر تصّور کرتے تھے، وہ نستعلیق میں بڑی مہارت رکھتا تھا، نیز بہزاد کے چند ان عزیزوں کا حال بھی ملتا ہے جو خود بھی فن کار تھے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد نے سلطان ابوسعید گورگان کا زمانہ بھی دیکھا۔ اس کے بعد اُسے سلطان بایقرا کی سر پرستی نصیب ہوئی۔ پھر جب شیبانی خان کا ہرات پر قبضہ ہو گیا تو اس نے بھی بہزاد کی قدر کی۔ اس کے قتل کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی اسے تبریز لے گیا۔ پھر شاہ اسماعیل کی وفات پر اس نے اس کے فرزند شاہ طہماسپ کا دور بھی دیکھا.

بہزاد کے اساتذہ: بعض کتابوں میں بہزاد کے استادوں کا ذکر آیا ہے۔ دوست محمّد نے حالات ہنروران میں روح اللہ میرک نقّاش کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بہزاد کا استاد تھا۔ تاریخ رشیدی میں حیدر دوغلات نے بھی اس کا ذکر کیا

ہے - قاضی احمد نے بھی گلستانِ ہنر (استانبول ۱۹۲۶ء، ص ۶۳ تا ۶۵) میں یہی لکھا ہے، مصطفی عالی افندی نے اپنی ترکی تالیف مناقبِ ہنروران میں کچھ اشارے کیے ہیں - اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بہزاد نے استاد روح اللہ میرک اور استاد سیّد احمد سے فنِ مصوّری کی تربیت پائی، اور بہزاد کے والدین کے فوت ہو جانے کے بعد اوّل الذکر ہی نے اس کی پرورش کی - ان اساتذہ کے توسط سے بہزاد وسط ایشیائی اور عراقی روایاتِ فن مصوّری سے مستفید ہوا.

اتفاق سے استانبول کے کتاب خانۂ طوپ قپو سرائے میں تین چار قدیم مرقعات موجود ہیں جن میں خطّاطی اور مصوّری کے اہم اور قدیم نمونوں کو بالکل بے ترتیب طور پر جمع کر دیا گیا ہے، ان میں بہت سے ایسے شاہکار ہیں جن پر بہزاد کا نام یا قریبی حوالے ملتے ہیں، چنانچہ مرقع عدد ۲۱۵۴ (ورق ۳۱ / ۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد نے ریشم پر شاہین کی ایک تصویر بنائی، جو فن کا اعلٰی نمونہ ہے - اس پر لکھا ہے : ''این بازکارِ استاد بہزاد است'' (ورق ۵۵/۲) پر مرقوم ہے : ''قلم سیاهی نـادر العصر استاد بہزاد''، نیز ایک اور خاکے پر لکھا ہے : ''این قلم سیاهی استاد میرک استاد بہزاد است''، جس سے واضح ہے کہ یہ بہزاد کے استاد میرک کے قلم کا خاکہ ہے - سیکسیاں Sakisian نے ایرانی مصوّری سے متعلق اپنی تالیف میں اسی مجموعے سے ایک چھوٹا سا خاکہ چھاپا ہے - یہ خرگوش اور پھولوں کا منظر ہے - جس کے اوپر دائیں کنارے پر نستعلیق میں مندرجۂ ذیل عبارت لکھی ہے :

''نقل از کار مولانا ولی صوّره العبد بہزاد''

(دیکھیے *Le Miniature Persane*: Armeng Bey Sakisian *de XII au XVII*، پیرس ۱۹۲۹ء، شکل ۳۴)، اور یہ ''مولانا ولی'' یا ''ولی اللہ'' مصوّر وہی شخص ہے جس کا ذکر دوست محمّد نے روح اللہ میرک کے استاد کے طور پر کیا ہے - استاد ولی کے دیگر فنی کارنامے بھی طوپ قپوسرائے استانبول میں موجود ہیں - عجائب خانۂ طوپ قپوسرائے استانبول میں خمسۂ نظامی کا ایک نسخہ ہے، جس کا بہت اہم ترقیمہ یہاں ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

''این خمسۂ مبارکه بخط مولانا سلطان علی مشهدی که کتابت شدهٔ . . ۹ ه در اوانے که شاه جم جاه عالیشان خسرو خسروان صاحب قران شاه اسمٰعیل بہادر خان خلدت خلافته از خزانۂ شایبک گرفته بفرید عصر مولانا یاری تذهیب ۹۱۶ ه، بنادرالعصر استاد بہزاد، تصویر ۹۱۸ ه، رجوع شده اتمام یافت'' (عدد G ۲۸۸ و کے H کے).

میں نے اس اہم نسخۂ خمسہ کا خود مطالعہ کیا ہے - اس سے واضح ہے کہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے اسے شیبانی خان کے اموال سے حاصل کیا تھا اور ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء میں تصویر کے لیے بہزاد کے سپرد کیا، جس نے اسے مکمل کیا - اس نسخے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہزاد شیبانی خان کی جنگ اور قبضۂ ہرات کے فوراً بعد شاہ اسمٰعیل صفوی کی ملازمت میں داخل ہو کر تبریز میں آ گیا تھا - اس نسخے میں جو تصاویر ہیں ان میں صفوی عنصر بالکل واضح ہے.

ایران اور ترکیہ کے درمیان جنگ چالدران ایک پریشان کن واقعہ تھا - یہ جنگ ۹۲۰ھ / اگست ۱۵۱۴ء میں تبریز کے باہر چالدران نامی مقام پر لڑی گئی - روایت ہے کہ جب اس جنگ کے خطرات بڑھ گئے تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے بطریق دور اندیشی کمال الدین بہزاد مصوّر اور شاہ محمود نیشاپوری کاتب کو ایک گڑھے میں چھپا دیا تاکہ وہ محفوظ رہیں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل بہزاد کو بے حد عزیز رکھتا تھا.

جنگ چالدران کے بعد شاہ اسمعیل نے کئی بار خراسان پر فوج کشی کی اور ازبکوں کے خلاف اسے فتح بھی نصیب ہوئی۔ ۲۷ جمادی الاولی ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء [نامۂ نامی، مخطوطۂ جامعہ پنجاب کی رو سے ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء] میں اس نے بہزاد کے نام ایک فرمان (منشور کلانتری کتاب خانہ) جاری کیا، جو نامۂ نامی (خواند امیر) میں محفوظ ہے، جس کی رو سے اس کے سپرد خدمت کتابداری ہوئی۔ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے یہ فرمان شائع کر دیا ہے، جس کا عنوان یہ ہے: ''نشان کلانتری کتاب خانۂ ہمایوں باسم کمال الدین بہزاد نوشت'' ۔ اس فرمان میں اس کے فرائض کتابداری کی تفصیل اور دیگر امور مذکور ہیں (مرزا محمد قزوینی: *Deux Documents inedits Relatifs a Behzad*، در *RMM*، ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۶ تا ۱۶۱)۔

بہزاد ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵-۱۵۳۶ء میں تبریز میں بعہد شاہ طہماسپ فوت ہوا، جیسا کہ اس کی تاریخ وفات ''بخاک قبر بہزاد'' سے ثابت ہے۔ اسے باغ شیخ کمال تبریز کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اعتماد السلطنۃ نے منتظم ناصری میں دوست ہاشمی کا قطعۂ ذیل دیا ہے، جو اس کے مزار کے سنگ لوح پر کندہ ہے:

وحید عصر بہزاد آن کہ چون او
ز بطن مادر ایّام کم زاد
اجل چون صورت عمرش بپرداخت
قضا خاک وجودش داد برباد
ز من صورتگری تاریخ پرسید
بدو گفتم جواب از جان ناشاد
اگر خواہی کہ تاریخش بدانی
نظر افگن بہ (خاک قبر بہزاد)

۹۴۲ھ

(دیکھیے مجلّۂ ارمغان، تہران ۱۲۹۸ ھش، شمارہ ۴: ص ۲۵۸)۔

اس کے برعکس قاضی احمد نے لکھا ہے کہ بہزاد کا انتقال ہرات میں ہوا، اور اسے کوہ مختار کے قرب و جوار میں ایک منقّش احاطے میں دفن کیا گیا (منورسکی: *Calligraphers and Painters*، ص ۱۸۰)۔ میرے خیال میں بہزاد اپنے آخری ایّام زندگی میں تبریز ھی میں مقیم تھا اور وھیں اس کا انتقال ہوا، اور وھیں اسے دفن کیا گیا، واللہ اعلم بالصواب۔

فنّی ارتقا (تصویری نمونوں کے حوالے سے): بہزاد نے اپنی ساری عمر معاصر سلاطین کے درباروں میں گزاری۔ اس کا سب سے اوّل دریافت شدہ کارنامہ ظفر نامۂ تیموری کا مصوّر نسخہ ہے، جو ۸۷۲ھ / ۱۳۶۷ - ۱۳۶۸ء میں لکھا گیا۔ ہرات کی تاریخ میں یہ سال بہت اہم ہے۔ اس سال سلطان ابو سعید قتل ہوا اور اس کے فوراً بعد اسی سال سلطان حسین میرزا بایقرا تخت نشین ہوا۔ بظاہر یہ مصوّر نسخہ سلطان حسین میرزا کے لیے تیار ہوا، مگر قیاس یہ ہے کہ یہ نسخہ جب تیار ہو رہا تھا اس وقت سلطان ابو سعید زندہ تھا اور بہزاد اس کے دربار سے منسلک تھا، پھر وہ سلطان حسین میرزا کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ بہر حال اسے بہزاد کے فنی ارتقا کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔

دبستانِ ہرات: ہرات اس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اسی سے ایک نیا ماحول پیدا ہوا، اور مصوری بھی اس سے متأثر ہوئی۔ اس ماحول میں اس فن نے جو انداز پیدا کیے، اور وہ اسی مرکز سے مخصوص تھے، ان سب کو دبستانِ ہرات کا نام دیا جاتا ہے۔ دبستان ہرات کے خصائص پر مفصّل بحث کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ چند اشارے ممکن ہیں۔ بہزاد اس دبستان سے اس

قدر متأثر ہوا کہ اس کی تقلید کرنے لگا، چنانچہ جب جہانگیر نے شاہِ ایران کی سوغات کے طور پر بھیجی ہوئی خلیل میرزا شاہرخی کی تصاویر دیکھیں تو اسے ان پر بہزاد کی تصاویر کا گمان ہوا، جس کا اظہار اس نے توزکِ جہانگیری (مطبوعۂ نولکشور، لکھنؤ، ص ۲۸۷ تا ۲۸۸) میں کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں طرز ہرات مشخّص ہو چکی تھی اور بہزاد ہی کو اس طرز کا نمائندۂ اعظم سمجھا جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تصاویر بہزاد کی نہیں بلکہ خلیل میرزا شاہ رخی کی بنائی ہوئی تھیں، جن پر اس کے اپنے دستخط بھی ثبت تھے، اور ظاہر ہے کہ فن کار میر خلیل شاہ رخ کے زمانے کا آدمی تھا، اور اس کی تربیت بھی شاہ رخ میرزا ہی کے زمانے میں ہوئی تھی، اور اسی لیے توزک میں اسے ''شاہ رخی'' لکھا گیا ہے، لیکن جہانگیر نے بہزاد کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ خلیل شاہ رخی اور بہزاد دونوں کو دبستانِ ہرات کا نمائندہ خیال کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرات میں ان ماہرین نے جن میں سابقاً خلیل شاہ رخی بھی شامل تھا، ایک خاص طرز پیدا کر لی تھی جو مشہور زمانہ ہو چکی تھی اور بہزاد کو اس طرز کا نقطۂ عروج سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے جہانگیر نے ان شاہکاروں کے سلسلے میں بہزاد کا نام لیا۔ جہانگیر سے پہلے بابر بھی اپنی توزک (۹۳۰ھ) میں طرزِ ہرات کے خصائص کی گفتگو کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: استاد بہزاد اور مظفر مصوّری میں علی شیر بیگ ہی کی توجہ سے اتنے مشہور و معروف ہوے۔ بہزاد بڑی باریک مصوّری کرتا تھا، مگر مرد کا چہرہ بغیر ریش اچھا نہ بناتا تھا، زنخدان کو بہت بڑھا دیتا تھا۔ شاہ مظفر بہت عمدہ مصوّر تھا، اس کی عمر نے وفا نہ کی، ابھی ترقی کر رہا تھا کہ چوبیس ہی سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ وہ خاص کر سیاہ قلم، یعنی خاکہ بنانے میں سلطان ابو سعید میرزا کے عہد کا بہترین مصور شمار ہوتا ہے (اس کے فن کا ایک نمونہ ۱۹۳۱ء میں ایرانی فن کی بین‌الاقوامی نمائش لنڈن میں آیا تھا، اس سیاہ قلم نمونے میں براق کی تصویر بنائی گئی ہے).

بہر حال تیموری شہزادوں کی ہنرپروری و علم شناسی کے طفیل جو دبستان مصوّری قائم ہوا اسے عام طور پر اپنے خاص اوصاف کی وجہ سے دبستانِ ہرات کا نام دیتے ہیں، جسے بہزاد نے بامِ عروج پر پہنچا دیا.

بہزاد کے فنی کارنامے (کتابوں کے مصوّر کی حیثیت سے): بہزاد کی ایک تصویر اور اسی تصویر کی ایک نقل جہانگیر کے فرمان سے اس کے دربار کے ایک مصوّر مسمی نانہا نے ۱۰۱۷ھ / ۱۶۰۸ء میں بنائی تھی۔ یہ دونوں تصویریں ۱۹۳۱ء میں ایرانی فن کی بین الاقوامی نمائش لنڈن میں تہران کے عجائب گھر قصرِ گلستان سے آئی تھیں اور اس نمائش کی فہرست میں طبع بھی ہو چکی ہیں۔ بہزاد کی اصل تصویر پر اوپر دائیں کونے میں مندرجۂ ذیل تحریر ثبت ہے: ''این رقمیست بدیع مشعر از مضمون ''اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ'' که شکسته نهاد فقیر نامراد بهزاد بعد از وصول عمر بدرجهٔ هفتاد و تجربهٔ قوی در این امر افتاد۔ و المسلمون من الله العفو فی المعاد''۔ اس تصویر کا موضوع یہ ہے کہ اس میں دو اونٹوں کو ان کے ساربان ان کی نکیلوں کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالے آپس میں لڑا رہے ہیں، اور یہ نظارہ بڑا دلکش ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ بہزاد نے یہ تصویر اپنی عمر کے سترویں سال میں بنائی تھی، اس پر تکمیل تصویر کی تاریخ درج نہیں ورنہ ہم اس سے اس کا سال پیدائش یقینی طور پر معلوم کر لیتے، اگرچہ بعض

محققین کے نزدیک یہ تصویر اس زمانے میں جب وہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں تبریز میں آچکا تھا بنائی تھی، مگر قرائن سے یہ تصویر اس سے بہت پہلے کی معلوم ہوتی ہے ۔ بہر حال اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ تصویر بہزاد کے سترویں سال کی ہے اور ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء ہی میں بنی ہے تو اس حساب سے اس کا ابتدائی کام زیادہ سے زیادہ ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء کے لگ بھگ ظہور میں آنا چاہیے، اس اعتبار سے اس کا سال پیدائش ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء ہوگا، اگرچہ اس سلسلے میں یقینی طور پر بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ بہر حال بہزاد کی محوّلۂ بالا تصویر اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے ۔

شبیہات : بہزاد کے کارناموں میں کتابی تصویروں کی طرح بعض اہم معاصر اشخاص کی شبیہات بھی ہیں، اور یہ فن پارے مصوّری کی تاریخ میں اہم ہیں ۔ اس سلسلے میں چند شبیہات کا ذکر کیا جاتا ہے :

(۱) سلطان حسین میرزا بایقرا کی اکثر شبیہات بہزاد کی مصور کی ہوئی بعض کتابوں میں ملتی ہیں؛ (۲) شیبانی خان کی شبیہ (*Catalogue, International Exhibition of Persian Art*، لنڈن ۱۹۳۱ء، ص ۴۸، ۷۷، ۹۵)؛ (۳) شہزادۂ غریب میرزا بن سلطان حسین میرزا کی تصویر (کتاب خانۂ یلدیز، استانبول)؛ (۴) مولانا عبداللہ ہاتفی کی تصویر (کتاب خانۂ سلطنتی، تہران)؛ (۵) شبیۂ بہزادِ خود (یہ تصویر استانبول یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے)؛ (۶) ایک درویش کی تصویر، طبع ڈاکٹر مارٹن (F. R. Martin : *Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey*، لنڈن ۱۹۱۲ء، لوحہ ۸۵)؛ (۷) قیدی کی تصویر (طبع Bunyan : *Catalogue, International Exhibition of Persian Art*، لنڈن ۱۹۳۱ء، عدد ۸۲)؛ (۸) ایک امیر، یعنی سلطان محمد ثانی (ترکی) کی تصویر طبع مارٹن (: وہی کتاب، لوحہ ۱۱۳)؛ (۹) درویش بغداد کی تصویر طبع مارٹن (: وہی کتاب، لوحہ ۳۸۶)۔

بہزاد تعمیراتی نقاش کی حیثیت سے: میرزا طاہر زادہ ایرانی نے سر آمدانِ ہنر میں لکھا ہے کہ بہزاد اعلٰی نقشہ نویسِ عمارات تھا ۔ اس نے مسجدِ سمرقند کا نقشہ خود تیار کیا تھا (دیکھیے عبداللہ چغتائی : ''کمال الدین بہزاد''، در کاروان، لاہور ۱۹۳۳ء) ۔ اس کے زمانے کی طرزِ عمارت کا اندازہ لگانے کے لیے اس مسجد کا مشاہدہ کافی ہے ۔ اس کے علاوہ بہزاد جس طرح اپنی تصاویر میں عموماً کاشی کاری اور نقش و نگار کا استعمال کرتا ہے اسی طرح وہ عمارتی نقشوں میں اس ہنر کا مظاہرہ کرتا ہے (دیکھیے مجلّۂ کابل، سالِ اوّل، شمارہ ۶ و ۷) ۔ بہزاد نے ہرات کے باغِ بہشت کے گنبد کے دور کا حاشیہ کھینچا تھا ۔ اس ضمن میں مصوّر نسخۂ خمسۂ نظامی (موزۂ بریطانیہ، عدد Or . ۶۸۱) میں بہزاد کی ایک تصویر ملتی ہے، جس میں ایک مسجد زیرِ تعمیر ہے، اس میں محراب کا حصّہ خصوصی طور پر دکھایا گیا ہے؛ اسے قالب کیا ہوا ہے اور معمار اسے بنا رہے ہیں، اس محراب میں پاڑ برابر تین حصّوں میں لگی ہوئی ہے؛ مصالحہ الگ تیار ہو رہا ہے اور اسے سیڑھی کے ذریعے مزدور اوپر پہنچا رہے ہیں ۔ یہ غیر معمولی تصویر عملی فنِ تعمیر کا مکمّل منظر پیش کرتی ہے اور یہ منظر فقط ایک عملی مہندس ہی دکھا سکتا ہے ۔ ساتھ ہی وہ مہندس خود بھی اس تصویر میں ہدایات دیتا دکھایا گیا ہے ۔ بہزاد کی یہ تصویر عملی طور پر اس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی کہ جہانگیر نے اسے پسند کیا اور اس کے دربار کی ایک مصوّرہ شفیعا بانو نے اس کی ایک نقل تیار کی ۔ اس تصویر کے اوپر بائیں جانب کے دریچے کو بہزاد نے اشعار سے مزّین کیا ہے ۔

بہزاد کے دستخط : مصوّر عام طور پر اپنے فنی کارناموں پر اپنا نام لفظ ''عمل'' سے ترکیب دے کر لکھا کرتے تھے اور یہ رواج ابتدائی زمانے ہی سے ہو گیا تھا ۔ بہزاد کے زمانے میں بھی یہی سلسلہ تھا، مگر بعض اوقات ان پر جعلی دستخط بھی کر دیے جاتے تھے اور غلط انتساب ہو جاتا تھا ۔ گو بعض مصوروں نے دستخط کی ضرورت محسوس نہیں کی، پھر بھی ان کے کارنامے عموماً انھیں سے منسوب ہوے، لیکن اس کی وجہ سے غلط انتساب بھی ہو جاتے تھے ۔ شاہی دربار میں انتساب کو صحیح رکھنے کے لیے عموماً مستقل اہلکار ہوتے تھے جو مصوّر یا خطّاط کا نام فوراً لکھ دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بہزاد کے فنی کارناموں پر اس کا نام اکثر مل جاتا ہے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یا تو وہ خود اپنے نام کا التزام کرتا تھا یا کوئی ایسا شخص لکھتا تھا جو اس کام پر متعیّن ہوتا تھا، اور وہ بہزاد کا نام بڑے احترام سے لکھتا تھا، اور نام کے ساتھ بعض عزت و تکریم کے الفاظ بھی لکھ دیتا تھا، چنانچہ ذیل میں ہم بہزاد کے دستخط کی مختلف صورتیں درج کرتے ہیں:

(۱) العمل حضرت بہزاد (در A.B. Sakisian: *Le Miniatures Persane de XII au XVII Seicle*، پیرس ۱۹۲۹ء، شکل ۱۳۴)؛ (۲) کارِ اعلٰی استاد بہزاد (کتاب مذکور، لوحہ ۵۷، شکل ۸۴)؛ (۳) عملِ استاد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۱۰)؛ (۴) صوّرہ العبد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۸۶)؛ (۵) العبد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۶)؛ (۶) فقیر نامراد بہزاد (طوپ قپوسرا ے، استانبول، مرقع ۲۱۵۴، ورق ۵۴/۲)؛ (۷) کمترین بہزاد (طوپ قپوسرا ے، استانبول، مرقع ۲۱۵۴، ورق ۱/۵۰)؛ (۸) بہزاد (موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۶۸۱۰)؛ (۹) مصوّر بہزاد (طوپ قپو سرا ے، استانبول، عدد H ۸۱۱)؛ (۱۰) استاد بہزاد (طوپ قپو سرا ے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۵/۲)؛ (۱۱) قلم سیاہی نادرالعصر استاد بہزاد (طوپ قپو سرا ے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۵/۲)؛ (۱۲) پیر غلام بہزاد (عجائب گھر لوور Louvre، پیرس)؛ (۱۳) عمل العبد بہزاد *Persian Miniature*، طبع C.L. Binyon، لوحہ ۷۰؛ (۱۴) صوّرہ العبد بہزاد المذنب اصلح اللہ (در *Le Peintures de la Collection Pozzi* : E. Blochet، پیرس ۱۹۲۸ء، لوحہ ۶۸).

بہزادقلم : بیان ہوچکا ہے کہ بہزاد کی وجہ سے ہرات کا دبستانِ مصوّری مشہور ہو چکا تھا اور اس کی طرز خاص کو کبھی کبھی ''بہزادقلم'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں داستانِ امیر حمزہ کے مصوّر نسخے کے ضمن میں، جو اکبر کے دربار میں تیار ہوا تھا، بہزاد کے دبستان مصوّری کو ''بہزادقلم'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ اسی طرح ترکیہ میں کتابی مصوری کا جو دبستان قائم ہوا اس کے بعض شاہکاروں کو ''بہزاد قلم'' کہا گیا ہے .

بہزاد کے تلامذہ اور مقلّد : بہزاد کی طویل عمر اور اس کے علاوہ اس کا مختلف درباروں سے منسلک ہونا اور اس دوران میں مختلف قسم کے اشخاص اور ماحول سے واسطہ پڑنا، یہ سب واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا، اور اس لحاظ سے اسے ہر جگہ اور ہر ماحول میں ایسے تلامذہ بھی میسّر آئے جو اس کی روایاتِ فن کی ترویج کرتے رہے ۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں درویش محمد کا ذکر (بحوالۂ مجالس النفائس) ملتا ہے ۔ اسی زمانے میں بخارا میں میر علی ہروی الکاتب اور محمود مذہّب کی مساعی سے ایک دبستانِ فن قائم ہوا، جو ایک طرح سے بہزاد ہی کی روایات کا فروغ تھا؛ اور جب میرزا بدیع الزمان ترکیہ گیا تو بہزادقلم فن‌کاروں کو اپنے ہمراہ لے

گیا جن کے ذریعے بہزاد کے اثرات ترکیہ میں پہنچے۔ علٰی ھٰذا جب ھمایوں تبریز سے چند مصوّر اور کاتب اپنے ہمراہ ہندوستان لے گیا اور ان کے ساتھ چند مصور کتابیں بھی تھیں تو اس طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی بہزادقلم پہنچا، جیسا کہ ابوالفضل نے خود بھی آئین اکبری میں لکھا ہے۔

بہزاد کے نقّاد: بہزاد کے فن پر بہت سے یورپی محقّقین نے تنقید کی ہے، جن میں سے مندرجۂ ذیل خاص کر قابلِ ذکر ہیں: (۱) I. Stchoukine: *Les Peintures des Manuscrites Timûrides*، پیرس ۱۹۵۴ء، ص ۶۹ تا ۷۰؛ (۲) E. Blochet: *Les Enluminures des Manuscrites Orientaux—turcs, arabes, persanes—de la Bibliothèque Nationale*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۳) A. Sakisian: *L' ecole de minature de Herat au XVe Siecle*، در *La Renaissance*، اپریل و جون ۱۹۲۱ء؛ (۴) L. Binyon اور J.V.S. Wilkinson اور B. Gray: *Persian Miniature Paintings*، لنڈن ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۹؛ اور (۵) M. Eustache de Lorey: *Behazad*، در *Gazette des Beaux—Arts*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۲۵ تا ۴۴۔

دیگر کوائف: یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بہزاد نے عمارتوں کے کتبات بھی لکھے، جن میں موقع و محل کے لحاظ سے موزوں آیاتِ قرآنی کا استعمال کیا ہے، ان کا خط عموماً نسخ ہے۔ وہ مُو قلم سے نازک اور باریک خطوط میں مکمل تصویر پیدا کر دیتا ہے، خاص کر لباس کے انداز اور جسم کی پھرتی اور چستی کو خوب ظاہر کرتا ہے۔ وہ مناظر و مرایا کی تصاویر کو بھی صحیح پیش کرنے میں یدِ طولٰی رکھتا ہے۔

میناتوری مصوّری: بہزاد کی بیشتر فنّی سرگرمی کتابی مصوّری سے متعلق ہے، جسے اس زمانے کی بہترین مصوّری کہا جا سکتا ہے۔ عہدِ اسلام کی اس مشرقی صنفِ مصوّری کو میناتوری [رکّ بآں] (چھوٹی کتابی تصاویر) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہزاد نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا۔

مآخذ: متن میں مذکور ہیں۔

(عبداللہ چغتائی)

* **بِہِسْتُون:** رکّ بہ بیستُون.

* **بِہِسنی:** رکّ بہ بِسنی.

* **بِہِشْت:** رکّ بہ جنّہ.

* **بِہِشْتی:** ایک عثمانی (ترکی) شاعر اور مؤرّخ کا تخلّص، جس کا نام احمد تھا۔ وہ ۸۷۱ھ / ۱۴۶۶-۱۴۶۷ء کے قریب پیدا ہوا، اور سلیمٰن بے نامی ایک شخص کا بیٹا تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں بایزید کی ملازمت میں ایک خدمتگار کی حیثیت سے داخل ہوا، لیکن کسی قصور کی بنا پر دربار سے نکالا گیا اور بھاگ کر ہرات چلا گیا۔ اسے بعد میں معاف کر دیا گیا، لیکن دوبارہ شاہی سرپرستی میں نہیں لیا گیا۔ بایزید کی حکومت کے آخری سال (۹۱۷ھ / ۱۵۱۱-۱۵۱۲ء) میں وہ اپنی تاریخ لکھ رہا تھا اور غالباً اسی سال اس کی وفات ہو گئی۔

بہشتی کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے عثمانی ترکی میں پہلا خمسہ (رکّ بآں) لکھا۔ اس کی مثنویوں میں سے مندرجۂ ذیل محفوظ ہیں: لیلٰی و مجنون، مخزن الاسرار، مہر و مشتری، اسکندر نامہ اور ہفت پیکر۔ اس کی تاریخ، جس کے اسلوب بیان میں قدرے لفاظی سے کام لیا گیا ہے، اصل میں ''آٹھ کتب'' (حصّوں) پر مشتمل تھی اور عثمان سے لے کر بایزید دوم تک ہر سلطان کے حالات میں ایک ''کتاب'' تھی۔ موزۂ بریطانیہ میں شمارہ Add. ۷۸۶۹ اور Revan Köşkü میں شمارہ ۱۲۷۰ میں اسی مخطوطے کے دو حصّوں میں ۷۹۱ سے ۹۰۸ھ تک کے سارے سال آ گئے ہیں۔ Add. ۲۴،۹۹۵ موزۂ بریطانیہ میں بعد کے زمانے کی ایک

تالیف زیادہ‌تر بہشتی کی تاریخ پر مبنی ہے، جس میں غالبًا پہلی تین جلدوں کا جن کے اصل متن مکمل دستیاب نہیں ہوے، مواد آ گیا ہے ۔ یہ تاریخ جس میں ادریس بِدلیسی (رک بآن) کی ہشت بہشت کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے، نہ تو اتنی قدیم ہے اور نہ اتنی اہم ہی ہے جتنی پہلے خیال کی جاتی تھی۔

مآخذ: (۱) Babinger، ص ۳۴ اور وہ مآخذ جن کا وہاں ذکر ہے، خصوصًا Rieu : *C.T.M.*، ص ۴۴ و ۷۴؛ (۲) S. Nüzhet Ergun : *Türk Şairleri*، بذیل مادّہ؛ (۳) R. İlter : *Bihişti ve Leylî vü mecnun'u*، غیر مطبوعہ مقالۂ امتحانی، عدد ۳۸۶، در *Türikyat Enstitüsü Library* (استانبول یونیورسٹی لائبریری میں ترکی مخطوطہ ۵۵۹۱ کا ایک مطالعہ)؛ (۴) ایک مخطوطہ ڈرہم Durham کے Ushaw College میں ہے؛ اس میں متذکرۂ بالا پانچوں نظمیں موجود ہیں۔

(V. L. MÉNAGE)

* **بِہ قُباذ:** خلفاے عبّاسیہ کے زمانے میں صوبۂ عراق کے تین اضلاع (اُستان، عربی کُورہ) کے مجموعے کا نام (جو سا سانی ایرانیوں کی انتظامیہ کو اختیار کرنے کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا)، یہ سب ضلعے دریاے فرات کی مشرقی شاخ پر (جو آج کل حلّہ کہلاتی ہے) واقع تھے ۔ اس نام کے معنی ہیں ''قباذ کی خوبی'' (یا اچھی اراضی؟) ۔ قباذ ایک ساسانی بادشاہ کا نام ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں حکومت کرتا تھا ۔ یہ اضلاع جنوب کی جانب کوفے کے ضلع سے اور فرات کے زیرین حصّے کی بڑی دلدل سے ملے ہوے تھے ۔ یہ تین ضلعے بالائی، وسطی اور زیرین بہ قباذ تھے، جنھیں کبھی کبھی مجموعی طور پر ''بہ قباذات'' کہا جاتا تھا ۔ بالائی ضلع میں ۶ تحصیلیں یا پرگنے (طَسُّوج) شامل تھے، جن میں سے ایک تو موضع بابل اور اس کے کھنڈروں کا پرگنہ تھا اور باقی خُطَرْنیہ، بالائی اور زیرین التَّلُّوجہ، [= الفَلُّوجَۃ؟] عین التَّمْر اور ایک اور پرگنہ تھے ۔ وسطی بہ قباذ میں نہر البَداۃ، سُوْرا و بَرِیْسَمْا، بارُوسما اور نہر المَلِک چار پرگنے تھے ۔ زیرین بہ‌قباذ کی پانچ تحصیلوں میں البداۃ [کوفہ]، فُرات بدھلہ [= بادَقْلی؟] اور نِسْتَر شامل تھے۔

مآخذ: (۱) *BGA*، مواضع کثیرہ، خصوصًا ۳: ۱۳۳؛ ۶: ۷، ۲۳۶؛ (۲) یاقوت، ۱: ۷۷۰؛ (۳) مَراصد الاطلاع (طبع Juynboll)، ۱: ۵۷، ۱۸۳؛ ۳: ۹۸، ۳۱۲ ببعد؛ (۴) البلاذری: فتوح، ص ۲۷۱، ۳۶۴؛ (۵) M. Streck : *Babylonien nach den arab. Geographen* (۱۹۰۰ء)، ۱: ۱۶، ۲۰؛ (۶) J. Marquart : ایرانشہر = *Abh. G. W. Gött.*، سلسلۂ جدید، جلد ۳، عدد ۲ (۱۹۱۰ء)، ص ۱۳۲، ۱۶۳ ببعد؛ (۷) Le Strange، ص ۷۰، ۸۱۔

(S.H. LONGRIGG و M. STRECK)

بُہْلُول (امیر): M. E. Zakī (مشاہیر، ص ۱۴۴) کے بیان کے مطابق تین نہایت معروف و مشہور کُردی شخصیتوں کا نام: (۱) سُلیمانیہ خاندان کا ایک رُکن، مَیّافارِقِین شاخ کا امیر، الوند بے بن شیخ احمد کا فرزند ۔ وہ ایک طویل مدّت تک دیار بکر کے والی اسکندر پاشا کی ملازمت میں رہا ۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ الاسکندریہ کے قلعے (الحلّہ اور بغداد کے مابین) کا حاکم رہا اور اس کے بعد سلطان یاوُز سلیم نے میّافارِقِین کا قلعہ اس کی تحویل میں دے دیا ۔ یہ بہلول بڑا بہادر اور جری تھا اور شاہسوار بے کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا؛ (۲) دنبولی قوم کے رئیس امیر جمشید کا بیٹا اور طورس کا باشندہ، ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء میں وفات پائی؛ (۳) امیر فریدون کا صاحبزادہ، نیز دنبولی کا رئیس اور طبرستان اور داغستان کا حاکم؛ شیخ حیدر صفوی کا ہم عصر اور اس کا نہایت با وفا ممد و معاون، شیخ خلیل

آق قویونلو اور حیدر کی باہمی لڑائی (۸۸۰ھ/۱۴۷۵-۱۴۷۶ء) میں کام آیا ۔ ان کے علاوہ ایک بہلول پاشا بھی گزرا ہے، جو ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۰-۱۸۲۱ء تک ترکوں کی طرف سے بایزید کا گورنر رہا ۔ اسی سال اسے ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا اور اس کے چار سال بعد اس کا انتقال ہو گیا ۔ ویگنر Wagner (۲ : ۲۹۷ ببعد) نے اس کی مدح و ستائش کے لیے کئی صفحے وقف کیے ہیں .

مآخذ : (۱) زکی M. E. Zaki : مشاہیر الکرد و کردستان، بغداد ۱۹۴۵ء؛ (۲) M. Wagner : *Reise nach Persien und dem Lande der Kurden*، لائپزگ ۱۸۵۲ء.

(B. NIKITINE)

⊗ **بُہلُول لُودھی** : سلطنت دہلی کا ایک فرمانروا (۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء تا ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء) لودھی خاندان شاہی کا بانی ۔ (لودھی افغانوں کے قبیلے کے لیے رک بہ مادّہ) ۔ اس خاندان کے لوگ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں، افواج شاہی میں بکثرت بھرتی ہو کر ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے۔ بہلول کے دادا نے تجارت میں حیثیت پیدا کی اور سپاہ کے علاوہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوا ۔ بہلول، ملک کالا کا بیٹا (دیکھیے فرشتہ، ۱ : ۳۱۶)، سلطان شاہ لودھی (جو سرھند کا گورنر بھی ہوا) کا بھتیجا تھا ۔ سلطان شاہ، بہلول کی قابلیت سے اتنا متأثر تھا کہ اس نے اپنے بعد اسے اپنا جانشین بنایا، چنانچہ اس کے بعد وہی سرھند کا گورنر مقرر ہوا ۔ اسلام خان نے اپنی بیٹی کی شادی بھی اسی سے کر دی اور اسے اپنا وارث قرار دیا ۔ بہر حال بہلول اپنی قابلیت اور فہم و فراست اور تدبر و شجاعت کے طفیل سادات سلاطین کے ہاں کافی رسوخ پیدا کر چکا تھا ۔ خاندانِ سادات کے سلطان محمد شاہ (بن فرید خان بن خضر خان) کے زمانے میں بہلول نے خدمات شائستہ انجام دیں ۔ محمد شاہ کے زمانے میں مالوے کے محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا، لیکن جلد پسپا ہوا ۔ بہلول لاھور اور سرھند کا گورنر تھا، وہ دہلی کو بچانے کے لیے آگے بڑھا اور مالوے تک حملہ‌آور کا تعاقب کیا ۔ محمد شاہ نے خوش ہو کر اسے خان خاناں کا خطاب دیا اور بےحد عزت و تکریم کی.

اس اثنا میں جسرتھ کھوکھر (گکھڑ) کی ریشہ دوانیوں کے باعث بہلول کی نیت بدل گئی، چنانچہ چند افغان امرا کو ساتھ ملا کر اس نے دہلی پر حملہ کر دیا، مگر پسپا ہونا پڑا.

۸۴۹-۸۵۰ھ/۱۴۴۵ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا ۔ امرا نے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو علاءالدین عالم شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا ۔ بہلول نے اس بادشاہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا ۔ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں عالم شاہ نے امرا کے مشورے کے برعکس دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو (جسے وہ اپنی صحت کے زیادہ موافق سمجھتا تھا یا اسے زیادہ محفوظ مقام خیال کرتا تھا) مستقر بنا لیا ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بہلول نے دہلی پر قبضہ جما لیا ۔ علاءالدین عالم شاہ نے بھی تن بہ‌تقدیر سلطنت بہلول کے حوالے کر دی اور ۱۴۷۸ء تک بدایوں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے اسی سن میں وفات پا گیا.

بہلول نے (حمید خان وزیر کی مدد سے) سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ۔ بعد میں حمید خان کو ایک منصوبے سے اپنے راستے سے ہٹا دیا ۔ اس کے باوجود، بعض عناصر بہلول کے خلاف کام کرتے رہے؛ انھوں نے علاءالدین عالم شاہ کو بھی اکسایا، مگر وہ آمادہ نہ ہوا ۔ پھر محمود شاہ شرقی کو بلایا جس نے دہلی پر چڑھائی کی، مگر شکست کھائی ۔ اس کے بعد بھی

جون پور کے شرقی فرمانرواؤں سے مقابلہ ہوتا رہا، تاآنکہ آخری فرمانروا سلطان حسین شرقی نے شکست کھانے کے بعد بنگالے کا رخ کیا اور اس طرح بہار تک بہلول کی حکومت قائم ہو گئی (۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء) - ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ - ۱۴۸۹ء میں جبکہ وہ گوالیار کے سرکش راجا کے خلاف مہم سے واپس آ رہا تھا راستے میں هداولی کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نظام خان سکندر لودھی (رک بآں) کے لقب سے تخت نشین ہوا.

جملہ معاصر مؤرخین بہلول کی شجاعت و تدبیر کے علاوہ اس کی سادگی، انصاف پسندی اور علم پروری کی تعریف کرتے ہیں، بہلول نے ایک مرتبہ پھر سلطنت دہلی کی مرکزیت بحال کی اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوشش کی.

مآخذ: (۱) بداؤنی: منتخب التواریخ، اصل فارسی سے ترجمہ و طبع Ranking و Haig و Lowe، ۳ جلد، کلکتہ ۱۸۹۸ء؛ (۲) John Briggs: *History of the rise of the Mohamedan Power in India till the Year A.D. 1612.*، اصل فارسی تصنیف از محمد قاسم فرشتہ سے ترجمہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۹۱۰ء؛ (۳) Dorn: *History of the Afghans*، مخزن افغانی کا ترجمہ، لنڈن ۱۸۲۹ء؛ (۴) Elliot and Dowson: *The History of India as told by its own Historians*، طبع John Dowson، ۸ جلد، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۵) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ، لکھنؤ؛ (۶) Stanley Lane Poole: *Mediaeval India under Muhammadan rule*، (سلسلہ *The Story of the Nations*)، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۷) نظام الدین احمد: طبقات اکبری (طبع Bibliotheca Indica)، کلکتہ ۱۹۱۳ء؛ (۸) تاریخ داؤدی، مخطوطۂ بانکی پور پٹنہ و دیگر مقامات؛ (۹) تاریخ مبارک شاہی، مخطوطۂ مملوکۂ پروفیسر سر جادو ناتھ سرکار [و مطبوعۂ کلکتہ ۱۹۳۱ء]؛ (۱۰) ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، ج ۲؛ (۱۱) سید ہاشمی فریدآبادی: تاریخ پاکستان و بھارت، کراچی، ج ۱؛ (۱۲) ایشوری پرشاد: *History of Medieaval India*، الہ آباد، ۱۹۲۵ء.

[ادارہ]

بُہلول: المجنون الکوفی، کوفہ کے ایک مجذوب کا نام؛ ہمیں اس کا ذکر سب سے پہلے الجاحظ کی البیان میں ملتا ہے (طبع ہارون، ۲: ۲۳۰ تا ۲۳۱) جہاں وہ اس کا یہ نقشہ کھینچتا ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص، راستہ چلنے والوں کے سوقیانہ تمسخر کا ہدف تھا اور اسے قطعی شیعی فرقے سے بتاتا ہے (یتشیّع) - ممکن ہے بہلول ۱۸۸ھ/ ۸۰۴ء میں ہارون الرشید سے کوفے میں ملا ہو جیسا کہ ابن الجوزی سے مروی ہے (الاذکیاء، طبع ۱۲۷۷ء، ص ۱۸۰ ببعد؛ دیکھیے *JRAS*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۵)، اور شاید اس نے [خلیفہ] ہارون کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں (الشعرانی: طبقات، ص ۵۸)، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی سے یا ہو سکتا ہے اس سے بھی پہلے سے افسانہ گویوں نے اس کے نام پر قبضہ کر کے اس کو ایسے لوگوں کا نمونۂ اوّلین قرار دے دیا جنھیں دانش مند دیوانے (العقلاء المجانین) کہا جاتا ہے اور اس سے بعض ناصحانہ اشعار کے علاوہ طرح طرح کے محاضرات، سبق آموز اور مذہبی حکایات منسوب کر دیں (دیکھیے Chauvin: *Bibl ar.*، ۷: ۱۲۶ ببعد، مخطوطۂ برلن، مواضع کثیرہ؛ کتاب خانۂ ملّی، پیرس، ص ۶۲۳، عدد ۳۶۵۳) - اسی طرح دعوی کیا گیا ہے کہ اس نے کچھ حدیثیں بھی روایت کیں (الذہبی، ابن تغری بردی)، مگر غالب گمان یہ ہے کہ اسے بعض اور اشخاص کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے، جن کا نام بھی بہلول تھا اور جن میں بعض واقعی محدّث بھی پائے جاتے ہیں (دیکھیے خصوصاً ابن حجر: لسان المیزان،

بذیل مادّہ) ۔ انھیں میں سے ایک البہلول بن راشد ولایتِ افریقیہ کے باشندے تھے اور ان کی وفات ۱۸۳ھ/ ۷۹۹ء میں ہوئی ۔ اسی سے شاید اس متواتر روایت کی بھی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے (دیکھیے ابن تغری بردی، ۱ : ۵۱۸؛ ZDMG، ۴۳ : ۱۱۵)، جس میں بہلول اور ہارون الرشید کے افسانوی فرزند السبتی کو ایک ہی شخص بتایا گیا ہے (دیکھیے Chauvin : *Bibl. ar.*، ۶ : ۱۹۳ اور مآخذ جن کا حوالہ دیا گیا ہے).

بغداد میں بہلول کی قبر کا بیان Niehuhr (*Reisebesch*، ۲ : ۳۰۱ ببعد؛ Le Strange : بغداد ص ۳۰۰) نے کیا ہے اور کتبہ مؤرّخہ ۵۰۱ھ/ ۱۱۰۷-۱۱۰۸ء اسے ''مجذوبوں کا سلطان'' قرار دیتا اور ایک ''نفس مطّمسہ'' یعنی مبہم دھندلی روح بتاتا ہے ۔ لوگ عام طور پر اسے ''بہلول دانا'' (ھشیار دیوانہ) کہتے تھے اور اسے وہ الرشید کا ایک رشتہ‌دار اور اس کا مسخرہ بتاتے اور قہوہ‌خانوں میں اس کی ظرافت اور نکتہ سنجی کی حکایات بیان کرتے رہتے تھے ۔ بہلول کے افسانے کا ارتقا نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچا جب اسے عشقیہ کہانیوں کا ہیرو قرار دیا گیا، جیسے النفزاوی (آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی) کی الروض العاطر (مطبوعہ ۱۳۰۵ء، ص ۹) میں، جس میں اسے المامون کا ہم‌عصر ٹھیرایا گیا ہے (نیز دیکھیے Meissner : *Neurab. Geschichten*، ۵ : ۷۳ تا ۸۳).

عربی لغات میں ''بُہلُول'' کے معنی ''ھنسوڑ''، ''خوش طبع'' (عربی : ضحّاک) اور ''السید الجامع لکل خیر'' دیے گئے ہیں اور اب تک بھی Redhouse (ترکی ۔ انگریزی لغت، ص ۱۶۴ الف) اور ڈوزی Dozy (Bocthor کا تتبع کرتے ہوے) اس کے یہی معنی دیتے ہیں، اگرچہ ڈوزی ''گوُدی'' اور ''احمق'' وغیرہ معنی کی طرف توجہ دلانے سے نہیں چوکا اور یہ معنی ابن بطوطہ (۲ : ۸۹) اور ابن خلدون (مقدمہ، طبع Quatremère، ۱ : ۲۰۱ ببعد) کے ہاں پہلے ھی موجود ھیں ۔ آج کل اور خصوصاً شمالی افریقہ میں اس کے معنی عام طور پر ''سادہ لوح'' ''ننھا بچہ'' وغیرہ کے لیے جاتے ھیں اور H. Wehr : *Wörterbuch* اس کے معنی ''دل لگی باز، نقال، مسخرہ'' دیتا ھے ۔ اس حقیقت سے کہ لفظ بہالیل، بہلولات ابھی تک بعض اوقات انتہائی سرور و بہجت (دیکھیے Doutté : *Marabouts*) پر دلالت کرتے ھیں D.B. Macdonald (وآ، لائڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ) یہ نتیجہ اخذ کرتا ھے کہ اس لفظ کا موجودہ استعمال اس کے لفظی مفہوم پر بھی مبنی ھے، اس پر نہیں کہ کوئی شخص بہلول نامی واقعی گزرا ھے ۔ بلاشبہہ یہ ممکن ھے کہ الفاظ ''ھُبالی / بُہالی'' کے ساتھ جو اس معنی میں مستعمل ھیں کچھ التباس ھو گیا ھو، لیکن غالب یہی ھے کہ موجودہ معنی اسمِ علم (بہلول) ھی سے مأخوذ ھوے ھیں ۔

مآخذ : متن مقالہ میں جو مآخذ دیے گئے ھیں ان میں (۱) بر اکلمان : تکملہ، ۱ : ۳۵۰؛ [(۲) فوات الوفیات، ۱ : ۸۲؛ (۳) نزھۃ الجلیس، ۱ : ۳۸۰] کا اضافہ کیا جائے.

(ادارہ)

بَہمَن : رَكَ بہ تاریخ.

بہمنی سلطنت : سلطان محمد بن تغلق کے عدم تدبّر، عجلت اور دکن کے امیرانِ صدہ میں اس سے پیدا ھونے والی بے چینی کی وجہ سے وھاں ایک آزاد ریاست کا قیام ھوا، جس کے پہلے حکمران اسمٰعیل مُخ کو سلطان ناصر، یعنی اسمٰعیل شاہ کے لقب سے ۱۳۴۵ء میں منتخب کر لیا گیا، لیکن اسمٰعیل اس منصب سے عہدہ برا نہ ھو سکا اور بہت جلد اسے جری شجاع حسن گنگو کے لیے جگہ خالی

کرنی پڑی - حسن کو دولت آباد میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی تعمیر کردہ مسجد میں تاج خسروی پہنایا گیا اور اس نے سلطان علاءالدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے عنانِ حکومت سنبھالی - یہ واقعہ ۲۴ ربیع الآخر ۷۴۸ھ / ۳ اگست ۱۳۴۷ء کا ہے - بہمنی سلاطین کے جلوس کی تاریخ وار جدول درج ذیل ہے :

(الف) سلاطین جن کا مستقر احسن آباد، گلبرگہ تھا :

(۱) علاءالدین حسن بہمن شاہ، ۲۴ ربیع الآخر ۷۴۸ھ / ۳ اگست ۱۳۴۷ء.

(۲) محمد شاہِ اوّل، ۳ ربیع الاوّل ۷۵۹ھ / ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء*.

(۳) علاؤالدین مجاهد شاہ، ۱۹ ذوالقعدہ ۷۷۶ھ/ ۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء.

(۴) داؤد شاہِ اوّل، ۱۷ ذوالحجّہ ۷۷۹ھ / ۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء.

(۵) محمد شاہ ثانی، ۲۲ محرّم ۷۸۰ھ / ۲۱ مئی ۱۳۷۸ء [قبّ لین پول : The Mohammadan Dynasties، ص ۳۱۸، محمود شاہ اول].

(۶) غیاث الدین تہمتن شاہ، ۲۱ رجب ۷۹۹ھ / ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء.

(۷) شمس الدین داؤد شاہ ثانی، ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ / ۱۴ جون ۱۳۹۷ء.

(۸) تاج الدین فیروز شاہ، ۲۴ صفر ۸۰۰ھ / ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء.

(ب) سلاطین جن کا دارالحکومت محمد آباد، بیدر تھا :

(۹) شهاب الدین احمد شاہ اول، ۵ شوال ۸۲۵ھ / ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء .

(۱۰) علاءالدین احمد شاہ ثانی، ۲۹ رمضان ۸۳۹ھ / ۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء.

(۱۱) علاءالدین همایون شاہ، ۲۲ جمادی الآخرہ ۸۶۲ھ / ۷ مئی ۱۴۵۸ء.

(۱۲) نظام الدین احمد شاہ ثالث، ۲۸ ذوالقعدہ ۸۶۵ھ / ۴ ستمبر ۱۴۶۱ء.

(۱۳) شمس الدین محمد شاہ ثالث لشکری، ۱۳ ذوالقعدہ ۸۶۷ھ / ۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء.

(۱۴) شهاب الدین محمود شاہ، ۵ صفر ۸۸۷ھ / ۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء.

(۱۵) احمد شاہ رابع، ۴ ذوالحجّہ ۹۲۴ھ / ۷ دسمبر ۱۵۱۸ء.

(۱۶) علاؤالدین شاہ، ۱۷ محرم ۹۲۷ھ / ۲۸ دسمبر ۱۵۲۰ء.

(۱۷) ولی اللہ شاہ، ۱۷ ربیع الآخر ۹۲۹ھ / ۴ مارچ ۱۵۲۳ء.

(۱۸) کلیم اللہ شاہ، ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵-۱۵۲۶ء.

بہمن شاہ ایک اولوالعزم حکمران تھا اور اس کی نیّت یہ تھی کہ دہلی سمیت تغلقوں کی سلطنت کو اپنے زیرِ نگین کرے، لیکن اس لاحاصل جرأت آزمائی سے اسے وزیر اعظم ملک سیف الدین غوری نے باز رکھا اور اسے مشورہ دیا کہ پہلے دکن پر اپنا قبضہ جمائے - تھوڑے عرصے میں قندہار، کوٹ گر، مرام اور اکل کوٹ فتح کر لیے گئے اور کلیانی یا کلیان بھی، جو چلوکیوں کی قدیم سلطنت کا دارالحکومت تھا، سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اس کا نام دارالامان رکھا گیا - مالکھر پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور اس کے باشندوں کو جان اور عزت کی پوری امان دی گئی - گلبرگہ، جو بعد میں

* اس تاریخ کا تعیّن اپنے هاں کے وقائع سے لیا گیا ھے، لیکن JASB، ۱۹۳۰ء، ص ۴۶۷ پر بہمن شاہ کے ایک سکّے پر ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء کا حوالہ ملتا ھے اور اس حساب سے محمد شاہ کا سنِ جلوس ایک سال آگے ھونا چاھیے۔

دارالسلطنت قرار پایا، فتح کر لیا گیا اور مدھول کی فتح کے بعد وہ اس کے حکمران نرائن کو واپس کر دیا گیا، جو بعد میں سلطان کا دستِ راست بن گیا۔ بہمن شاہ نے گوا پر بھی چڑھائی کی اور کامیاب رہا، لیکن جنوب مشرق میں نیلور کی مہم اتنی کامیاب نہ رہی، وہاں راجا آنڈا وڈو نے اسے شکست دے دی تھی، اسی لیے اسے تلنگانہ کے صرف ایک ہی حصّے پر قناعت کرنا پڑی۔ اس کا انتقال سڑسٹھ سال کی عمر میں ۳ ربیع الاوّل ۷۵۹ھ / ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء کو ہوا اور اس کا بیٹا محمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔

تنظیم ریاست: یہ سعادت محمد شاہ اوّل کو ارزانی ہوئی تھی کہ وہ ریاست کو ایک واقعی منظّم کل کی شکل میں مربوط کرے۔ جب اس کی والدہ ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں حج کے لیے گئی تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خلیفۂ مصر المعتضد باللہ سے اس امر کی رسمی سند حاصل کر لی کہ وہ اپنے نام کا سکّہ جاری کرے اور خطبۂ جمعہ میں اس کا نام لیا جایا کرے۔ وہ بالالتزام شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اپنے روزمرہ کے دربار کا تزک و احتشام ایک عظیم الشان سلطنت کے حکمران کی حیثیت کے مطابق قائم رکھتا تھا۔ اپنے عہدِ حکومت کی ابتدا میں تو وہ صرف اسی نقرئی تخت پر قانع رہا جو اس کے والد سے اسے ترکے میں ملا تھا، لیکن مارچ ۱۳۶۳ء میں اس کی جگہ شاندار تخت فیروزہ نے لے لی، جو راجہ تلنگانہ نے اسے تحفۃً بھیجا تھا۔ اس خاندان کے اختتام تک یہی تخت سلاطین بہمنی کی نشستگاہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے وزیر اعظم نے، جو اس کا خُسر بھی تھا، ایک رسالہ موسوم بہ نصائح الملوک تصنیف کیا تھا، جس میں نظامِ حکومت کے احوال بیان کیے گئے تھے؛ مرکزی حکومت تین محکموں پر منقسم تھی: ملکی (سول)، فوجی اور عدالتی۔ ملکی محکمے کی مرکزی شخصیت وکیلِ سلطنت یا وزیر اعظم تھا، جس کی امداد کے لیے وزیر اور دبیر (سکرٹری) تھے۔ اسی طرح عدالتی محکمہ قاضیوں اور مفتیوں پر مشتمل تھا۔ شہروں میں امنِ عامّہ کے قیام اور حفاظت کی ذمّےداری کوتوال (کمشنر پولیس) اور محتسب (ناظرِ اخلاقِ عامّہ) سے متعلق تھی۔ فوجی حصّے میں سپہسالار کے ماتحت مستقرِ حکومت میں متعدد ماتحت عہدیدار ہوتے تھے، مثلاً (۱) بار برداری کا افسرِ اعلٰی۔ ان بار برداروں کا کام یہ تھا کہ فوری ضرورت کے وقت بے قاعدہ افواج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائیں؛ (۲) بخشی (یا مامور پرداخت Paymaster)؛ (۳) خاصہخیل یا سلطان کی حفاظتی فوج (باڈی گارڈ) کے افسر۔ یہ گارڈ مکمل طور پر اسلحہبند اور تربیتیافتہ چار ہزار فوج کا ایک دستہ ہوتا تھا؛ اور (۴) دو سو یکّہ جوانان یا سلحداروں کا افسرِ اعلٰی۔ یہ جماعت سلطان کے ذاتی اسلحہ کی ذمّےدار تھی۔ بادشاہ کے متعلق اسی رسالے میں لکھا ہے کہ اسے اخلاق عالیہ کا مالک ہونا چاہیے۔ اس میں اس بات کا ملکہ ہونا چاہیے کہ وہ مختلف کاموں کے لیے صحیح اشخاص کا انتخاب کرے، سہلانگار اور تعیّشپسند افراد کی صحبت سے احتراز کرے اور علما اور اربابِ فہم و ذوق کے مشورے قبول کرنے کے لیے تیار رہے۔

تمام ملک کو چار اطراف یا صوبہجات میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر طرف یا صوبہ ایک طرفدار یا گورنر کے ماتحت تھا۔ طرفدار شروع میں اپنے صوبے کے ملکی اور فوجی دونوں طرح کے معاملات کے لیے ذمےدار تھا اور قلعہدار یا قلعوں کے کمانڈر اس کے ماتحت تھے۔ ان چار صوبوں کے مرکز دولتآباد، برار، احسنآباد گلبرگہ، اور محمدآباد بیدر تھے۔ بیدر میں تلنگانہ کا وہ حصّہ بھی

تھا جو ابتداءً بہمنی سلطنت میں شامل تھا ۔ ان میں سے گلبرگہ کا صوبہ، جس میں دارالحکومت واقع تھا، قدرتی طور پر سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اور اس کا طرفدار عموماً وہ شخص ہوتا تھا جسے حکمران کا پورا اعتماد حاصل ہو ۔

بارود [رَکَ بآں] کی دریافت کے بعد مدافعت کے طریق کار میں بہت بڑا تغیّر واقع ہوا ۔ اس بھک سے اڑ جانے والے مادّے کا ذکر ہماری تاریخوں میں سب سے پہلے ۷۶۷ھ / ۱۳۶۵-۱۳۶۶ء میں محاصرۂ ادونی کے سلسلے میں آتا ہے ۔ بیضا واقع ہسپانیہ میں ۱۳۲۵ء میں بارود کا اوّلین استعمال ہوا تھا؛ محاصرۂ ادونی اس سے بمشکل چالیس سال بعد کا واقعہ ہے اور اس کی تاریخ تقریباً اکتالیس سال اس تاریخ سے پہلے جب چینی سیّاح Ma-Haun ۱۴۰۶ء میں بنگال میں فنِ آتش‌بازی کے وجود کا ذکر کرتا ہے ۔ بارود کی دریافت کے ساتھ ہی مدافعتی آلات کے تخیّل میں بنیادی تبدیلی رونما ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ بھدّی دیواروں کے قلعوں کی جگہ عظیم‌الشان قلعے تعمیر ہوے، جن کی دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان میں فصیلوں کے بُرجوں کے درمیان مضبوط دیواریں (curtains) قائم کی گئی تھیں، جن میں سوراخ، بُرج اور بارو تھے ۔ اس قسم کے جو قلعے پہلے پہل تعمیر کیے گئے ان میں سے ایک کا نام ''پناہِ اسلام'' تھا ۔ یہ مقام بھنگر میں واقع تھا اور ۷۷۶ھ/۱۳۷۴-۱۳۷۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا ۔

سطح مرتفع دکن کے مخصوص وسطی محلِّ وقوع کا اقتضا ہے کہ وہ مختلف تہذیبوں کی جائے اتصال ہو ۔ بہمنی سلاطین تغلقوں کی روایت کے موروثی حامل تھے، جو شمال سے آئی تھیں، مگر دکن کے توطّن کے بعد وہ دہلی کی سلطنت سے منقطع ہو گئے، کچھ تو اس لیے کہ اس نئی ریاست کی بنا ہی شمال کے ساتھ اختلاف پر ڈالی گئی تھی، کچھ اس لیے بھی کہ حکومت دہلی کے ساتھ کوئی مشترک سرحد نہ تھی، بلکہ نئی ریاستیں، مثلاً خاندیش، مالوہ اور اڑیسہ دونوں کے درمیان حائل تھیں ۔ ان حالات میں بیرونی اثر اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ قریب کے مشرقی ممالک کے تارکینِ وطن ہی کا ہو سکتا تھا ۔ تغلقوں کے اثر کا سب سے نمایاں مظہر بہمنی دور کے ابتدائی سکّے اور ان کی عمارات ہیں ۔ گلبرگہ کی بغایت اختصاصی عمارت، یعنی قلعے کی عظیم الشان جامع مسجد کے علاوہ دو اور بہمنی یادگاریں ایسی ہیں جنھیں مثالی کہا جا سکتا ہے، یعنی مسجد شاہ بازار کا ایوان اور پہلے دو بہمنی سلاطین کے مقبرے؛ ان میں اسی قسم کی دو مخروطی دیواریں، چاروں کونوں پر پتھر کے گلدستے اور چپٹے گنبد نظر آتے ہیں، جن سے دہلی کی ان تاریخی عمارات کی یاد تازہ ہوتی ہے جو تغلقوں کے عہد کی یادگار ہیں ۔ جامع مسجد بجائے خود ایک مخصوص صنف کا درجہ رکھتی ہے ۔ اس کی تعمیر ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء میں ہوئی ۔ یہ رفیع بن شمس قزوینی کے تیار کردہ نقشے کے مطابق تیار کی گئی، شرقاً جنوباً یہ دو سو سولہ فٹ ہے اور شمالاً جنوباً ایک سو چھہتر فٹ ۔ یہ امر بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اس عمارت ہی سے مترشح ہوتا ہے کہ عہدِ تغلق کی روایات کو خیر باد کہہ دیا گیا ہے ۔ ہندوستان کی دوسری مساجد کے برعکس یہ تمام کی تمام مسقّف ہے، اور بلاشبہہ جس فن کار نے اس کی تعمیر کی ہے اس کا طرز اندلسی روایات کا منّت پذیر تھا، جہاں مساجد تقریباً سر بسر مسقّف ہوتی تھیں ۔ اس مسجد میں دیواریں عمودی ہیں اور گنبد خاصی بلند سطح پر تعمیر کیے گئے ہیں ۔ اس عمارت کی ایک اور خصوصیّت یہ ہے کہ جن ستونوں پر عظیم الشان چھت کھڑی ہے ان کی اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ جماعت کا ہر نمازی خواہ وہ مسجد

کے کسی حصّے میں ہو، امام کو منبر پر اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے، نیز چونکہ مسجد میں کھڑکیاں نہیں ہیں اور وہ چاروں طرف سے بالکل کھلی ہے، سال کے بارہ مہینے ہر طرف سے کھلی ہوا کے جھونکے اندر آتے رہتے ہیں۔

سلطان محمد کو جنوب میں وجیانگر اور مشرق میں تلنگانہ کی حکومتوں سے نبردآزما ہونا پڑا ۔ اس خاندان کی حکومت اپنی ابتدا ہی سے وجیانگر کے ''رایان'' (rāyas) سے بر سرِ پیکار رہی ۔ ان کا نزاع کچھ تو اس لیے تھا کہ کرشن تُنگ بھدر کے شاداب دوآبے پر کون قابض ہو، لیکن زیادہ تر اس بنا پر کہ دکن میں ان دونوں طاقتوں میں سے کس کی بالا دستی مسلّم ہو ۔ ان دونوں ریاستوں کی بنیاد تقریباً ایک ہی وقت میں رکھی گئی تھی، اور یہ نزاع، جس کی ابتدا سلطان محمد اوّل کے عہد میں ہوئی، تقریباً پورے بہمنی دور میں جاری رہا ۔ بہمنی حکومت کا مطالبہ تھا کہ ریاست وجیانگر اسے خراج ادا کرے اور اس مطالبے کو تسلیم کرانے کے لیے اسے عسکری طاقت کو کام میں لانا پڑا، لیکن اس کا جواب وجیانگر نے بارہا دوآبے پر جوابی حملے سے دیا اور اب بُکّا نے دوآبے پر اپنا حق جتایا ۔ مشرق کی جانب ونایک راؤ حاکم تلنگانہ نے کولاس پر چڑھائی کر دی، لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا؛ پھر چونکہ بادشاہ کے خلاف اس نے نازیبا کلمات استعمال کیے لہٰذا بعد میں اسے قتل کر دیا گیا ۔ ونایک کے باپ کرشن نے صلح کی درخواست کی اور اسے گولکنڈہ بہمنی سلطنت کے حوالے کرنا پڑا ۔ اسی موقع پر تختِ فیروزہ سلطان محمد کی نذر کیا گیا ۔ جنوبی سرحد پر ایک دلچسپ واقعے نے وجیانگر سے مخاصمت کا آغاز کیا ۔ سلطان محمد دوآبے پر رائے کے مطالبے سے پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا؛ اس نے اطمینان سے وجیانگر کے خزانے کے نام ایک ہنڈی بھیجی جس کی ادائی ان قوّالوں کو ہونی تھی جو دہلی سے گلبرگہ کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے تھے ۔ ہنڈی ادا تو کون کرتا، الٹا ان گویّوں کو جنوبی حکومت کے دارالسلطنت میں گدھوں پر سوار کر کے تشہیر کیا گیا ۔ اس پر جنگ ہوئی، اس طرح کہ ایک محاذ پر ایک فریق جیتا تو دوسرے پر دوسرا، لیکن بالآخر میدان بہمنی فوج کے ہاتھ رہا ۔ یہ مہم اس لحاظ سے مشہور ہے کہ اس کے دوران میں ہم پہلی دفعہ بہمنی توپخانے کے سپاہیوں میں رومیوں اور فرنگیوں کو موجود پاتے ہیں؛ اور بظاہر یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ہندوستانی والی ریاست نے یورپ کے باشندوں کو اپنی ملازمت میں لیا ۔

جانشینی کے جھگڑے : سلطان محمد اوّل کی وفات اور تاج الدین فیروز کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا درمیانی عرصہ فترت کا زمانہ ہے ، جس میں سلطان محمد ثانی کے طویل اور پُر امن عہد کے سوا باقی تمام زمانہ حصول تخت کے لیے ایک طویل کشمکش کا دور ہے، جو قتل و غارت سے پُر ہے ۔ اس کے برعکس سلطان محمد ثانی کا عہد اس کی نمایاں قابلیت، امن پسندی اور ثقافت دوستی کا آئینہ دار ہے ۔ وہ بہمنی خاندان کے قابل ترین سلاطین میں سے تھا، جس نے دکن کو علوم و فنون کا مرکز بنانے کی پوری سعی کی ۔ اس نے شیراز کے مشہور عالم شاعر خواجہ شمس الدین حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی اور اگر خواجہ حافظ بحری سفر کرنے سے متنفّر نہ ہوتے تو وہ آتے اور دکن کو اپنا وطن مالوف بنا لیتے ۔ حافظ کی مشہور غزل کا مندرجۂ ذیل شعر فارسی ادب کے طالب علم کو ہمیشہ اس دعوت کی یاد دلاتا رہے گا جو سلطان محمد ثانی نے اسے دکن آنے کے لیے دی تھی :

بس آساں می نمود اول غم دریا ببوے سود
غلط گفتم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد

سلطان محمد ثانی کا عہد اس لحاظ سے یادگار ہے کہ اس میں ماوراء النہر کے وسطی ایشیا، ایران اور ملک عرب کے جری اور تنومند انسانوں کی ایک رَو آئی، جن کے نصیب میں تھا کہ بالآخر اس سرزمین کی آبادی کا ایک ممتاز عنصر بن جائیں؛ ادیب، علما، دستکار، تاجر، سپاہی اور ماہرینِ فنِ تعمیر سب کے سب دکن کی طرف کھچے چلے آ رہے تھے؛ انھیں غریب الدیار یا آفاقی کہا جاتا تھا (ان دونوں ناموں سے طنز کی بو آتی ہے) ۔ دکن میں ان کی موجودگی مستقبل قریب میں ایک اہم سیاسی مسئلہ بن جانے والی تھی، خصوصاً اس لیے کہ اپنے تازہ خون اور جرأت مندانہ اندازِ طبع کے باعث وہ زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم حصّہ لینے لگے تھے ۔ ان نو واردوں کا اثر زیادہ‌تر ایرانی خصائص کا حامل تھا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے پہلو بہ پہلو مقامی ہندو تہذیب بھی اب دخیل ہونے لگی تھی ۔ اس خانوادے کے تیسرے سلطان علاءالدین مجاہد کو ان کی رعایا ”بلونت“ کے خاص ہندوانہ خطاب سے یاد کیا کرتی تھی، اور یہ اثر مسلمانوں کے اکثر متبرک مقامات، مثلاً مقابر اور مساجد کے فنِ تعمیر میں بھی نمایاں ہے رکّ بہ بیدر (= محمّد آباد) .

حکومت گلبرگہ کا یہ دور، جسے زمانۂ فترت کہہ سکتے ہیں، دو بھائیوں فیروز اور احمد کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا ۔ یہ دونوں بہمن شاہ کے پوتے اور سلطان محمد ثانی کے داماد تھے ۔ سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد فساد کی جڑ ”تغلچین“ تھا، جس نے سلطان موصوف کے جانشین غیاث‌الدین تہمتن کی آنکھیں نکال دی تھیں اور خود آمرانہ اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم کا منصب سنبھال لیا تھا ۔ فیروز نے موقع ملتے ہی دارالحکومت پر دھاوا بول دیا ۔ تغلچین کے آوردہ داؤد ثانی کو تخت سے اتار کر خود تاج الدین فیروز شاہ کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا .

مختلف ثقافتوں کا امتزاج : یوں تو سلطان فیروز کا پورا عہد حکومت وجیانگر کے راے اور اس کے اتحادی سردارانِ راجمندری اور کھیڑلا سے نبرد آزمائی میں صرف ہوا لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس عہد کی ایک خصوصیّت مختلف ثقافتوں کا امتزاج تھی ۔ وجیانگر سے آویزش کا نتیجہ دو دلچسپ واقعات تھے، جن کے اثرات لازماً دکن کی ثقافت پر مرتب ہوے ہوں گے ۔ ایک تو سلطان کی اپنی شادی وجیانگر کی شہزادی کے ساتھ ہوئی، جو نہایت دھوم دھام کے ساتھ رچائی گئی اور دوسرے شہزادہ حسن خان کا بیاہ پرتھال کے ساتھ ہوا ۔ پرتھال بہمنی مملکت کے ایک علاقے مدگل کے رہنے والے ایک زرگر کی بیٹی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک نامور مغنیہ ہی نہ تھی بلکہ اپنی خوش‌گفتاری کے لیے بھی شہرت رکھتی تھی .

فیروز شاہ کی دلی خواہش تھی کہ وہ مغربی اسلامی ممالک سے بہترین اشخاص کو اپنے ہاں بلوائے ۔ چنانچہ اس غرض کے لیے اس نے مصطفی آباد، دابل اور چول کی بندرگاہوں سے بہمنی جہاز روانہ کیے تاکہ علما کو ملک دکن میں لائیں اور اس طرح اس حکمران نے اپنے خُسر کی روش کو جاری رکھا ۔ ان نئے غیر ملکی آبادکاروں کے اثر کو خالص ہندوانہ اثر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا، اور دکنی تہذیب کی شاندار عمارت انھیں دو ثقافتوں کے امتزاج سے بنی، جو اس ملک کی تاریخ میں قطب شاہی اور آصف شاہی دور میں بھی قائم رہی ۔ فیروز خود بھی ایک نہایت اچھا خوش‌نویس تھا اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبیعیات اور اصطلاحاتِ تصوّف پر اسے پورا عبور حاصل تھا ۔ ان علوم میں

اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر ہفتے وقت نکال کر منتخب طلبہ کو چند گھنٹے درس دیا کرتا تھا - وہ شعر بھی اچھا کہہ لیتا تھا اور فیروزی اور عروجی تخلّص کرتا تھا - اس کا تحصیلِ السنہ کا ملکہ بیحد قوی تھا - کہتے ہیں کہ وہ تلیگو، کنڑی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور کئی اور زبانوں کا ماہر تھا، اور ساکنانِ محل کے ساتھ، جن کی یہ مادری زبانیں تھیں، ان زبانوں میں بے تکلّف گفتگو کیا کرتا تھا - اس کے رفاہ عامّہ کے کاموں میں سے ایک یہ تھا کہ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں اس نے اورنگ آباد کے قریب کے سلسلۂ کوہ پر ایک رصد گاہ بنانے کا تہیہ کیا - اس کی تعمیر سید محمود گازرونی اور حکیم حسن گیلانی کے زیرِ اہتمام شروع ہوئی، لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ یہ عمارت حکیم گیلانی کی موت کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی - اس کے علاوہ وہ عمارات کی تاسیس کا بھی بے حد شائق تھا - احسن آباد گلبرگہ میں اس کا اپنا مقبرہ اور دریائے بھیما کے کنارے فیروز آباد میں اس کے قلعے والے محل کا جو حصّہ ابھی باقی ہے اس کے اس ذوق و شوق پر شاہد ہیں - ان عمارات کا امتیازی نشان یہ ہے کہ ان میں ایرانی اور دکنی خصوصیّات کو بڑی قابلیت سے سمویا گیا ہے اور یہی امتزاج دکن میں بہمنی فنِ تعمیر کا طُغرائے امتیاز ہے - یہ خصوصیّت اس عہد کی مشہور عمارات میں سے دو میں بہت نمایاں ہے: یعنی مقبرۂ فیروز شاہ اور مزار خواجہ گیسودراز میں - مقبرۂ فیروز شاہ کی بہمنی محرابیں خالص ہندو طرز کے بازووں پر استادہ ہیں - اسی طرح چھجے کو سہارا دینے والی بریکٹیں (brackets) خالص ہندوآنہ طرز کی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی اس مقبرے کے دو گنبدوں میں سے ایک کے جوف کے اندر نقش و نگار اور کتبات کی پیچیدہ پٹیاں قطب مینار دہلی کے بیرونی حصّے کی یاد کو تازہ کرتی ہیں.

بادشاہ کے عہد کے آخری ایّام دکن کی ایک نہایت واجب الاحترام ہستی حضرت محمد الحُسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو دراز سے مناقشت میں بسر ہوے - یہ بزرگ ۱۳۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوے اور ۱۴۱۳ء میں جب وہ دکن پہنچے تو ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی - یہاں وہ خوش منظر خانقاہ میں فروکش ہوے، جو قلعۂ گلبرگہ کے نواح میں واقع ہے - شروع شروع میں سلطان نے آپ کی رعایت ملحوظ رکھی، لیکن جلد ہی شکوک و شبہات کا دور شروع ہو گیا؛ کشیدگی بڑھتی گئی اور سلطان نے آپ کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی اور جگہ جا کر فروکش ہوں، کیونکہ ان کے معتقدین کا شور و غل ذاتِ شاہی کے کانوں پر گراں گزرتا ہے؛ مگر سلطان کے برعکس اس کے بھائی احمد کو اس بزرگ ہستی کے کمالاتِ روحانی و اخلاقی پر بہت اعتقاد تھا اور وہ ان کے ساتھ پوری طرح سے وابستہ رہا - نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز کے پاؤں تلے سے زمیں آہستہ آہستہ نکلتی گئی اور بالآخر اسے اپنے بھائی سے نبرد آزما ہونا پڑا - اس کے بھائی نے اسے شکست دی اور شہاب الدین احمد اوّل کے نام سے وارثِ تخت و تاج بنا.

دارالحکومت کی تبدیلی: غالباً سب سے پہلا کام جو نئے سلطان نے کیا وہ یہ تھا کہ دکن کا دارالحکومت بیدر میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام محمّد آباد رکھا - گلبرگہ کی سیاسی فضا میں شاہ کُشی اور خونریزی کی وجہ سے فضا مکدر ہو گئی تھی اور دارالحکومت میں متعدّد ایسے اشخاص تھے جو نئے حکمران کو غاصب تصوّر کرتے تھے - اس کے ساتھ ہی سلطان احمد کے مُرشد خواجۂ گیسودراز کے انتقال کا اثر بھی بادشاہ کے دل پر ہوا ہو گا، اور دارالسلطنت کی تبدیلی کی وجوہ میں سے یہ بھی

ایک ضرور ہوگی (مزید تفصیل کے لیے رک بہ بیدر [= محمد آباد]).

بیدر کا قلعہ سلطان احمد شاہ اوّل کی غیر معمولی ذکاوت کی زندہ یادگار ہے - اس کی بنیادیں ایک قدیمی قلعے کے مقام پر اٹھائی گئی ہیں - چار ہزار پانچ سو گز کی دیوار اس کا احاطہ کیے ہوے ہے اور یہ سطح مرتفع بیدر کے کنارے پندرہ سو فٹ کے عمودی نشیب پر واقع ہے - قلعے کی سب سے قدیم عمارت سولہ کومب مسجد ہے، جو اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کی چھت پر ایک ذخیرۂ آب ہے، جس سے مسجد اور ارد گرد کے محلّات کو پانی مہیا کیا جاتا تھا - ایوانِ بارِ عام اور ایوانِ بارِ خاص، جس کے ستونوں اور دیواروں کے بقایا ابھی تک موجود ہیں، اور شاندار تخت محل (شاہی تخت گاہ)، ان تمام کا مجموعی اثر نہایت دلکش ہوتا ہو گا - ان عمارات میں ایرانی اثر صاف نظر آتا ہے - چنانچہ تخت محل کی کاشی اینٹوں (tiles) اور محرابوں میں اور پچی‌کاری کی ہوئی شیر و طلوعِ آفتاب کی تصویر میں، جو آج بھی دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے - قلعے سے دو میل کے فاصلے پر سلاطینِ بہمنیہ کے مقبرے ہیں، جن میں سب سے شاندار مقبرہ احمد شاہ کا ہے، جسے مسلم اور غیر مسلم یکساں طور پر ولی مانتے تھے - اس مقبرے کی تعمیر گلبرگہ میں فیروز شاہ کے مقبرے کی تعمیر سے محض بارہ سال بعد عمل میں آئی، لیکن اس کا طرزِ تعمیر مقبرۂ فیروز شاہ سے بالکل مختلف ہے اور اس میں ایرانی اثر اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے - بیضوی گنبد کی اندرونی جانب جو کتبات ہیں وہ تقریباً ان جملہ طرزہاے خطّاطی کے نمونے ہیں جو مشرق اوسط میں مروّج ہیں - اگرچہ بہمنی سلاطین سنّی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضؓ کا اسم مبارک مختلف طرزہاے نگارش میں گنبد کے گرداً گرد نہایت دلکش حروف میں مرقوم ہے - یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ وجیانگر کی حکومت بھی، جو بہمنیوں سے ساتھ ہمیشہ بر سرِ پیکار رہی، فنِ تعمیر میں ان کا تتّبع کیے بغیر نہ رہ سکی اور اب بھی تہمتنی کے کھنڈروں میں دیکھنے والے کو ان عمارات میں خالص ایرانی - بہمنی محراب کی موجودگی ورطۂ تحیّر میں ڈال دیتی ہے، مثلاً زنانہ احاطے کے دیدبان، دنائک کا احاطہ، پہرہ داروں کی اقامت گاہیں، فیل خانے، تلاری گٹو کی شاہراہ کا دروازہ، کنول محل اور چند دیگر اہم عمارات.

فیروز شاہ کے عہد حکومت کے اواخر میں بہمنی فوجوں کو وجیانگر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی - اب احمد شاہ نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے جنوب کی طرف فوج کشی کی - بے ترتیب جھڑپوں اور طویل چھاپہ مار جنگ سے بہمنی فوج کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے ہی والا تھا کہ احمد شاہ نے تنگابھدرا کے جنوب کی جانب ایک دم مکمّل فوج کشی کا حکم دے دیا - ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ سلطان اپنی فوج سے بچھڑ گیا اور غنیم کی فوج کے ایک دستے کے ہتّے چڑھ گیا اور صرف ایک چال کے ذریعے بھیس بدل کر ایک کسان کے غلّے کی کوٹھی کے اندر پناہ لینے میں کامیاب ہوا - صورت حال ایسی نازک تھی کہ اگر فوج کے مستقر سے بر وقت امداد نہ پہنچتی تو وہ قتل کر دیا جاتا - اس موقع پر جس بات نے شاہ کو سب سے زیادہ متأثر کیا وہ یہ تھی کہ اس کے جان بچانے والوں میں اکثریت ''آفاقی'' افسروں اور سپاہیوں کی تھی - اس بنا پر اس نے احکام جاری کر دیے کہ اس کی ذاتی محافظ فوجی دستے میں صرف وہ سپاہی لیے جائیں جنھیں سمندر پار سے فوج میں بھرتی کیا گیا ہو اور اپنے

ندیم خاص خلف حسن بصری کو، جو خود ایک آفاقی تھا، ملک التجار کا منصب عطا کیا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے وجیانگر کی افواج کا بہت جلد خاتمہ کر دیا اور دارالحکومت کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور "رائے" کو اس رقم کے ادا کرنے پر مجبور کیا جو سلطان کے نزدیک خراج کی بقایا اس کے ذمے تھی۔ مشرقی محاذ پر بہمنی افواج نے امّا پوتے دیما کو، جو وجیانگر کا طرفدار تھا، شکست دی اور وہ مظفر و منصور ورنگل میں داخل ہو گئیں۔

اسی عہد میں مالوے اور گجرات میں بھی پہلی دفعہ میدانِ کارزار گرم ہوا۔ مالوے کا حکمران اس زمانے میں ہوشنگ غوری (۱۴۰۶ تا ۱۴۳۵ء) تھا اور اس کا دارالحکومت منڈو یا منڈوگڑھ میں تھا، جس کا مشہور نام شادی آباد تھا۔ ہوشنگ کھیڑلا کی سرحدی چوکی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کا سردار نرسنگھ دو رخی چال چل رہا تھا۔ کبھی تو وہ احمد شاہ سے طالبِ امداد ہوتا تھا اور کبھی سلطان مالوہ سے ربط و ضبط بڑھاتا تھا۔ شروع شروع میں ہوشنگ کامیاب رہا، یہاں تک کہ سرحد عبور کر گیا؛ لیکن بالآخر ایک معرکے کی لڑائی میں، جو بہمنی علاقے کے اندر لڑی گئی، اسے شکست کھا کر واپس جانا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی نے احمد شاہ کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے ٹھان لی کہ اس وقت گجرات سے بھی دو دو ہاتھ ہو جانے چاہییں۔ گجرات کا حکمران اس وقت ایک نہایت ہوشیار شخص نصیرالدین احمد شاہ بانیِ احمد آباد (۱۴۱۱ تا ۱۴۴۲ء) تھا۔ جب راجا جھلاور نے گجرات کی قیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو بہمنی سلطان کو بہانہ مل گیا اور اس نے راجا کی اعانت کے لیے فوج بھیج دی، لیکن اسے بندر بار پر شکست ہوئی۔ اور جب بہمنی افواج کے سردار خلف حسن بصری نے جزیرۂ مہائم (ماہم) پر قبضہ کیا تو گجراتیوں نے پلٹ کر بہمنیوں کے قلعۂ تھانہ میں قدم جما لیے اور ملک التجار کو جزیرۂ بمبئی کی جانب پسپائی پر مجبور کر دیا۔ بہمنیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطانِ گجرات نے ایک عہدنامے پر دستخط کر دیے، جس کی رو سے فریقین موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر متفق ہو گئے۔ اپنی فائدہ رسانی کے علاوہ یہ عہدنامہ تاریخ دکن میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ آئندہ یہ طویل مدت تک فریقین کے لیے ان کے مستحکم عقیدے کا ایک جُز بنا رہا۔

معرکۂ ماہم اختلاف کی اس خلیج کے اور زیادہ وسیع ہونے کا باعث بن گیا جو دکن کے دو بڑے گروہوں، یعنی دکنی اور آفاقی کے درمیان پہلے ہی موجود تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ اس معرکے میں جب آخری دفعہ فریقین کا جم کر مقابلہ ہو رہا تھا تو دکنی جان بوجھ کر پیچھے ہٹ گئے اور فوج کے باقی ماندہ پچھلے حصے کو گجراتیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس افواہ نے باہمی اختلاف کو اور ہوا دی جس کے نتائج آئندہ عہد میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوئے۔

دکن میں ایک ملی جُلی ثقافت کی ترویج و ترقی دینے میں احمد شاہ نے اپنے پیش رو کی تقلید کی۔ اس ملی جُلی ثقافت کی ایک واضح مثال وہ طور و طریق ہے جس سے سلطان کا، جسے دکن میں ولی کا رتبہ حاصل ہے، عُرس منایا جاتا ہے۔ عُرس کی ابتدا تقویم ہجری کے مطابق نہیں بلکہ ہندو جنتری کے حساب سے ہوتی ہے؛ چنانچہ جس قمری مہینے میں ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے اس کی بیس تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ رسومِ عُرس کا افتتاح جنگم یا لنگایت فرقے کا سردار

ضلع گلبرگہ کے ایک گاؤں میں کرتا ہے اور پھر یہی سردار وہاں سے اپنے تین سو ساتھیوں کی معیت میں واردِ بیدر ہوتا ہے اور یہی جنگم سبْ سے پہلے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ مقبرے میں داخل ہوتا ہے، سنکھ بجاتا ہے اور خالص ہندوانہ انداز میں ناریل توڑتا اور اس کا پانی پیتا ہے۔ یہ عرس اس مہینے کی ۲۹ تاریخ تک جاری رہتا ہے اور عوام کے تمام طبقے بلا امتیازِ فرقہ و ملّت، اس سلطان کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں جو چار سو سال پہلے ان پر حکمران تھا۔

زندگی کے ہمہ گیر اور روادارانہ تصوّر کی جھلک اس وصیّت میں بھی نظر آتی ہے جو سلطان نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ، جو علم کے خزانہ‌دار ہیں، عہدہ‌دارانِ سلطنت کے ساتھ، جنھیں عوام کے ساتھ، بھلائی کرنے کی قدرت حاصل ہے، شاہی مشیروں کے ساتھ، جو سلطنت کی حکمت عملی کے مؤسّس ہوتے ہیں، اور کاشتکاروں کے ساتھ، جو سب کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں، مہر و ملاطفت کا برتاؤ کریں۔

رعایا کی جسمانی تربیت کی طرف بھی پوری توجہ کی جاتی تھی اور دارالحکومت کو اسی مقصد کے لیے چار ''تعلیمات'' یا جسمانی تربیت گاہ کے چار مساوی اکھاڑوں پر تقسیم کیا گیا تھا، جن میں سے ہر اکھاڑا ہندوؤں کی ایک قدیم تاریخی عمارت سے، جو عین شہر کے وسط میں واقع تھی، شروع ہو کر پھیلتا تھا۔ ہر ''تعلیم'' (اکھاڑے) کی اپنی ایک ورزش‌گاہ تھی اور ہر ایک میں کم سے کم ایک مدرسہ ہوتا تھا اور ایک مسجد، جہاں متعلّقہ اکھاڑے کے نوجوان ''تعلیم'' کی مجلسِ منتظمہ کے زیرِ نگرانی جسمانی تربیت اور دنیوی و دینی درس حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ ان ''تعلیمات'' (اکھاڑوں) کو عزاداریِ محرّم کے ساتھ خاص نسبت تھی) لیکن ان کے دروازے بلا امتیاز رعایا کے ہر مرد کے لیے کھلے رہتے تھے اور اپنی تنظیم میں یہ اکھاڑے مکمّل طور پر جمہوری انداز کے علمبردار تھے۔

احمد شاہ اوّل ہی کے عہدِ حکومت میں مصر کے مشہور نحوی محمّد بن ابوبکر المخزومی الدمامینی نے علمِ نحو پر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف موسوم بہ المنہل الصافی فی شرح الوافی پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ یہ عالمِ نحو اسکندریہ میں ۷۶۳ھ / ۱۳۶۲ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے گلبرگہ میں ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

گروہوں کا باہمی نزاع : علاءالدین احمد کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلاف کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ اس نے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا ہی میں آفاقیوں کی جنبہ‌داری شروع کر دی اور یہ ایک فطری بات تھی کیونکہ اس کی تین بہنیں آفاقیوں سے بیاہی جا چکی تھیں۔ وجیانگر پر مبیّنہ خراج کی عدم ادائی کی پاداش میں دو مختصر فوجی حملوں میں، نیز راجا سنگم ایشور [=سنگیسر؟] پر ایک حملے میں بہمنی افواج فتحیاب ہوئیں۔ وجیانگر کا معرکہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر وجیانگر کی افواج میں مسلمان سپاہی بھی بھرتی ہونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ دیو رائے نے اپنے مشیروں سے افواج وجیانگر کی پے در پے شکستوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ ان میں سے بعض کے منہ سے یہ نکلا کہ خدائے برتر نے تیس ہزار سال تک مسلمانوں کی ہندووں پر برتری کا فیصلہ کر دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ مسلمان شہسواری اور تیراندازی میں ہندووں پر قطعاً فائق ہیں۔ ان آرا کو سن کر دیو رائے نے

احکام جاری کر دیے کہ مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ افواج میں بھرتی کیا جائے ۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ دارالحکومت میں ایک مسجد تعمیر کی بلکہ مسلمان افواج کے مصارف کے لیے انھیں بڑی بڑی جاگیریں بھی عنایت کیں۔ اس نے حکم دیا کہ قرآن حکیم کا ایک نسخہ ایک بخوبی آراستہ کرسی پر ٹھیک اس کے سامنے رکھا جائے تا کہ مسلمان رسوم کورنش اصولِ اسلام کی خلاف ورزی کیے بغیر ادا کر سکیں۔

لیکن اس جدید نمونے کی فوج کے باوجود دیو رائے کو بہمنیوں کے مقابلے میں کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔ گو وہ دوآبہ تک پہنچ گیا اور اس نے مدگل کو بھی تسخیر کر لیا، لیکن جلد ھی اسے دوآبہ خالی کرنا پڑا اور خراج کی بقایا رقم ادا کرنی پڑی۔

بہر حال مہاراشٹر کی منحوس مہم میں بہمنی افواج کو غداری اور سازش کے ہاتھوں روزِ بد دیکھنا پڑا ۔ ۱۴۴۷ء میں سلطان نے خلف حسن بصری کو شورہ‌پشت مرہٹہ سرداروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا ۔ ان سرداروں نے مغربی گھاٹ کی تنگ گھاٹیوں کو اپنی جولانگاہ بنا رکھا تھا ۔ ان میں سے ایک سردار شنکر راؤ شرکے نے ظاہر کیا کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکا ھے، اور حملہ آور فوج کو ایک گھنے جنگل میں لے گیا، لیکن ساتھ ھی راجا سنگم ایشور کو خفیہ پیغام بیجا کہ اچانک حملے کے لیے یہ وقت نہایت موزوں ھے ۔ راجا نے اس پیغام کے پہنچتے ھی ایک مضبوط لشکر روانہ کیا، جس نے بہمنی افواج کو گھیر لیا اور جہاں تک اس سے ہو سکا جنگی سپاہ کو بے‌دردی سے تہ تیغ کیا ۔ انھیں میں بہادر خلف حسن بصری بھی تھا، جو اس وقت پیچش کی بیماری میں گرفتار تھا ۔ بہمنی فوج کے بقیۃ السیف سپاھی سراسیمگی کے عالم میں چاکن کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

ان پریشان‌کن حالات میں بھی دکنیوں اور آفاقیوں کی عداوت ایک نئے روپ میں ظاہر ہوئی اور ایک انتہائی خفیہ چال سے تقریباً تمام آفاقی مرد و زن کو بے دردانہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ھے کہ نسلی عداوت کا سرطان سلطنت کے سیاسی جسم کو اندر ھی اندر کھائے جا رہا تھا اور اگر محمود گاواں اس وقت منصۂ شہود پر آ کر فرقہ‌دارانہ توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش نہ کرتا تو اپنے وقت سے پہلے یہ سلطنت معدوم ہو چکی ہوتی۔

محمود گاواں کا اثر : اس عظیم جرنیل، منتظم اور مدبّر کی زندگی کا ایک خاکہ کسی دوسری جگہ دیا گیا ھے [رک بہ محمود گاواں] ۔ علاء الدین ھمایوں شاہ کے عہدِ حکومت ھی میں اس کی شہرت کی ابتدا ہو چکی تھی ۔ فرشتہ نے ھمایوں کو بے رحم کے لقب سے یاد کیا ھے، لیکن اس کی موت سے قبل کے چند مہینوں کے سوا اس کا تمام دورِ حکومت عفو و ترحم کا آئینہ دار ھے، اور یہ صورتِ حال اس خود مختار فرمانروا کی خودسری اور خودرائی دیکھتے ہوئے یقیناً تعجب انگیز ھے ۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے مشیر علی‌الدوام اس کی فرزانہ بیوی مخدومۂ جہاں نرگس بیگم اور محمود گاواں تھے ۔ اس کا بیٹا، جو نظام الدین احمد ثانی کے نام سے سریرآرائے سلطنت ہوا، اپنی تخت نشینی کے وقت صرف آٹھ سال کا تھا اور اس کے پورے دورِ حکومت میں انتظام مملکت مجلسِ ارکانِ ثلاثہ مشتمل بر خواجۂ جہاں ترک، محمود گاواں اور ملکہ کے ہاتھ میں رہا ۔ حقیقت میں مجلس کی صدارت خود ملکہ کرتی تھیں اور وھی امورِ سلطنت کی سر انجام دہی کا اپنی ایک رازدار عورت ماہ بانو کے توسّط سے اہتمام کرتی تھیں ۔ اور یہ مجلس نظام الدین کے

بہمنی سلطنت

جانشین شمس الدین محمد ثالث کی حکومت کے پہلے تین سال میں بھی قائم رہی۔

اس سے پیشتر کہ ہم آگے کے حالات بیان کریں اس امر کا تذکرہ بےجا نہ ہوگا کہ آفاقی ایرانیوں کو خواہ کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی اس میں شک نہیں کہ ان کا اثر دکن کی فنّی اور عام ثقافتی زندگی پر بہت قوی تھا۔ بیدر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک خوبصورت ہشت پہل بےگنبد مقبرے میں مشہور ولی شاہ نعمت اللہ کرمانی کے فرزند شاہ خلیل اللہ مدفون ہیں۔ یوں تو اس مقبرے کی عمارت کئی لحاظ سے بےنظیر ہے لیکن اس کی سب سے نمایاں خصوصیّت شاید مغیث شیرازی کا وہ خوشنما کتبہ ہے جو ہندوستان کے اندر خط ''ثلث'' میں لکھا ہوا غالباً سب سے پہلا کتبہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتبے کی ایک اَور بےعدیل خصوصیّت یہ ہے کہ اس کے ہر حرف کا طول گو پندرہ انچ تک پہنچتا ہے، لیکن وہ ہر طرح سے پورے پورے متوازن اور متناسب ہیں۔ ایرانی اثر اس بلند مینار میں بھی نمایاں ہے جو اس پہاڑی کے دامن میں ہے، جس پر دولت آباد واقع ہے۔ ایسے ہی بیدر کے اندر مدرسۂ محمود گاواں کے اس بچے کھچے تنہا مینار میں یہ اثر ظاہر ہے۔

سیاسی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت کی تقریباً تمام سرحدوں پر پورے دس سال سے بدامنی کا دور دورہ قائم تھا۔ اڑیسہ کا والی اس وقت کپل ایشور تھا (۱۴۳۵ تا ۱۴۷۰ء)، جو گج پتی خاندان شاہی کا ایک نہایت حوصلہ مند حکمران تھا؛ بار بار لشکر کشی کے بعد کپل ایشور بڑی دلیری سے تلنگانہ میں گھس آیا اور مارچ ۱۴۶۰ء میں سچ مچ ورنگل پر قبضہ جما بیٹھا اور اسی زمانے میں اس کے حلیف دیو کنڈہ کے راجا لنگا نے راج چل ھتیا لیا۔ ورنگل ایک سال سے زائد مدت تک کپل ایشور کے قبضے میں رہا، لیکن احمد شاہ ثالث کے عہد میں اسے ہزیمت و پسپائی ہوئی اور تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ نوجوان سلطان نے کپل ایشور کو اس موقع پر تحریر بھیجی تھی کہ اچھا ہوا کہ تو خود ہی دکن آگیا، ورنہ لا محالہ بہمنی فوج کو لے کر خود مجھے اڑیسہ پر تحصیل خراج کی غرض سے چڑھائی کرنی پڑتی۔ اس کے تھوڑی ہی مدّت بعد محمود خلجی والیِ مالوہ نے احمد شاہ ثالث کی نوعمری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ - ۱۴۶۲ء میں اڑیسہ اور خاندیش کی عملی امداد حاصل کر کے دکن پر حملہ کر دیا اور بغیر کسی اہم مزاحمت کے بڑھتا چلا آیا، حتّٰی کہ دارالحکومت بیدر سے صرف بتیس میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ نوجوان سلطان احمد شاہ ثالث، محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک کی معیت میں چیدہ بہمنی افواج کے لاؤ لشکر کے ساتھ مقابلے کے لیے بڑھا اور مقام قندھار پر دشمن سے نبرد آزما ہوا۔ بہمنی افواج فتح سے ہمکنار ہونے ہی کو تھیں کہ ان کا ایک ہاتھی پیچھے کو مڑا اور اس نے ہڑبڑاہٹ ڈال دی۔ سلطان کی جان کو خطرے میں پا کر ایک بہمنی فوجی افسر نے اسے گھوڑے سے اتارا اور اسے لے کر دارالحکومت کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ محمود خلجی فاتحانہ بیدر کی طرف بڑھا، اور بیدر، بیڑ اور دولت آباد پر قابض ہو گیا۔ بیوہ ملکہ دارالحکومت کو خیر باد کہہ کے اپنے بیٹے سلطان کو لے کر فیروزآباد چلی گئی۔ محمود گاواں نے اب اس عہد نامے کی پناہ لی، جو سلطان احمد اوّل کے عہد میں والیِ گجرات سے کیا گیا تھا، اور اس نے محمود شاہ بیگڑہ والیِ گجرات (۱۴۵۸ء تا ۱۵۱۱ء) کو احمد شاہ ثالث کا ایک دستخطی خط امداد کی درخواست کے ساتھ بھیجا۔ سلطانِ گجرات نے اس درخواست کا

خاطر خواہ جواب دیا اور خود ایک بڑی فوج لے کر بہمنی سرحد کی طرف روانہ ہوا - محمود خلجی اب چاروں طرف سے گھر گیا تھا - آخر کار اسے گونڈوانہ کے جنگلوں کو چیرتے ہوئے اپنے وطن کی راہ لینی پڑی۔

اس طرح مجلس ارکانِ ثلاثہ نے، جو ہمایوں کی وفات پر قائم کی گئی تھی، اپنا فرض ادا کیا اور جب ۱۴۶۶ء میں خواجہ جہاں ترک کے قتل کے بعد محمود گاواں وزیر اعظم بنا تو اس نے اس مجلس کا کام جاری رکھا - اس کی وزارت کے زمانے میں بہمنی سلطنت کو وہ عروج حاصل ہوا جو اسے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا - اس نے مشرقی محاذ پر اپنی شاندار معرکہ آرائی سے، جس میں اس نے تمام ساحلی عقبی علاقہ کونکن سے لے کر گوا تک فتح کر لیا، یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہت بڑا سپہ سالار اور دکن کے عظیم ترین فوجی قائدین میں سے ہے - رنیگنہ کا قلعہ اس نے ۲۰ محرم ۸۷۵ھ/ ۱۹ جولائی ۱۴۷۰ء، سنگم‌ایشور ۲۰ جمادی الآخرہ ۸۷۶ھ / ۱۳ دسمبر ۱۴۷۱ء اور ہندوستانی جزیروں اور قلعوں کا باعثِ رشک مقام گوآ ۲۰ شعبان ۸۷۶ھ / یکم فروری ۱۴۷۲ء کو فتح کیا - محمد ثالث کے عہد میں خاندانِ بہمنی کے متعلق اس کے وہ خواب بھی پورے ہوئے جو وہ مشرق کی بابت دیکھا کرتا تھا، یعنی سواحلِ خلیج بنگال تک سمندر کے کنارے کنارے کے تمام علاقے کا سلطنت بہمنی کے ساتھ الحاق ہو گیا - اس کا موقع دو بغاوتوں کی وجہ سے میسّر ہوا، جن میں سے پہلی ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷-۱۴۷۸ء میں ہوئی اور دوسری مقام راموں پر ۸۸۵ھ / اکتوبر - نومبر ۱۴۸۰ء میں؛ ان دونوں موقعوں پر فوجوں کی قیادت سلطان کے اپنے ہاتھ میں تھی اور محمود اس کا دستِ راست تھا - چونکہ باغیوں نے اڑیسہ سے امداد حاصل کی تھی اس لیے بہمنی افواج اڑیسہ کے علاقے میں بھی گھس گئیں - نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام علاقہ جو بہمنی علاقے کے متصل تھا راجمندری تک ملحق کر لیا گیا - دوسری بغاوت میں باغیوں نے وجیانگر سے امداد حاصل کی تھی اور بنا بریں سلطان نے نہ صرف دریاے کرشنا کے مثلث دہانے کا الحاق کر لیا بلکہ جنوب کی طرف کنجی یا کنجی پورم تک کا علاقہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا، جہاں وہ ۱۱ محرم ۸۸۶ھ/۱۲ مارچ ۱۴۸۱ء کو پہنچا - یہ امر قابلِ التفات ہے کہ جب سلطان کنجی پورم میں تھا اس کی غیر حاضری میں محمود گاواں کے خلاف ایک سازش ہوئی، نتیجۃً وہ ۸۸۶ھ / ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو قتل کر دیا گیا - اڑیسہ اور وجیانگر دونوں نے اس تبدیل شدہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا جو بساطِ سیاست پر اس بطل عظیم کے موجود نہ رہنے سے پیدا ہو گئی تھی؛ اور اگر اس وقت تلنگانہ کے نئے والی سلطان قلی قطب الملک ہمدانی کی ہوشیاری آڑے نہ آتی تو پورا تلنگانہ ہاتھ سے نکل گیا ہوتا - اس سلطان قلی نے بعد میں قطب شاہی خاندان [رَكَ بآں] کی بنیاد رکھی۔

اندرونی معاملات میں محمود گاواں نے نہ صرف دکنیوں اور آفاقیوں میں توازن بر قرار رکھنے بلکہ ہندو آبادی کے قلوب کو مسخّر کرنے کی بھی پوری کوشش کی - سلطان شمس الدین محمود کو اس کا یہ مشورہ کہ وہ بلگام کے ''پرکیتہ'' Parketa کے ناشائستہ افعال پر قلمِ عفو کھینچ دے نہایت مناسب تھا اور ضرور اسی وجہ سے مرہٹی قوم سے مصالحت کی راہ ہموار ہوئی، جس کے وافر ثمرات مغربی اضلاع پر بیجاپور کی قیادت کے زمانے میں حاصل ہوئے - ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا ایک اور ثبوت ''مدھول'' کے سردار کے ان کارناموں سے بھی ملتا ہے جو اس سے مغربی مہمات

کے دوران میں ظاہر ہوے - ۱۴۷۰ء کی برسات میں جب محمود گاواں کولھاپور میں تھا تو مدھول کے کرن سنگھ نے اس کی امداد کے لیے گھاٹوں پر کچھ محافظ مقرر کیے کہ وہ وہاں پٹڑا گوھوں (فارسی سوسمار یا ھندی گھوڑ پھوڑ) کی تاک میں رہیں اور جتنی ھاتھ آئیں پکڑ لیں - جب گوھیں مہیا ہو گئیں تو اس نے ان کی کمر کے گرد رسیاں باندھ کر آدھی رات کے وقت ان کو ''کھیلنا'' کی فصیلوں پر چڑھا دیا، جن پر چڑھنا اور ذرائع سے ناممکن تھا، ان پٹڑا گوھوں نے قلعے کی دیواروں پر اس مضبوطی سے قدم جمائے کہ کرن سنگھ کا لڑکا بھیم سنگھ اور اس کی مرہٹی افواج ان رسیوں کے ذریعے جو ان کی کمر سے بندھی تھیں فصیل پر چڑھ گئے اور محافظانِ قلعہ کو تہ تیغ کر دیا۔

سلطان محمد شاہ اول نے ایک صدی پہلے جو نظامِ حکومت قائم کیا تھا وہ کم و بیش ایک جاگیردارانہ تنظیم تھی، کیونکہ ملکی اور عسکری عہدیداروں کی تنخواہیں جاگیروں اور منصبوں کی آمدنی سے ادا کی جاتی تھیں، جو طرف داروں اور قلعہ داروں کو عطا کیے گئے تھے - اس خاندان کی حکومت کے قیام کے سو سال بعد سلطنت میں بہت توسیع ہوئی اور یہ بالآخر ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیل گئی، چنانچہ محمود گاواں نے، جو وزیر اعظم تھا، نہ صرف مملکت کی دوبارہ تقسیم کی بلکہ تمام صوبجاتی نظام کی اصلاح پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی - اولاً اس نے تمام مملکت کو بجائے چار کے آٹھ اطراف میں تقسیم کیا - برار کی دو نظامتیں قائم کیں، یعنی گاول اور ماھور - جنار [=جنیر] کے ارد گرد کے کچھ علاقے کو صوبۂ دولت آباد سے علیحدہ کر کے ایک نئی ''طرف'' کی بنیاد رکھی - راجمندری کو تلنگانہ کے باقی حصے سے علیحدہ کر کے ایک نیا صوبہ بنایا اور قدیمی صوبۂ گلبرگہ میں سے بیجا پور کو نکال کر ایک مستقل حیثیت دے دی - طرف داروں کے اختیارات میں بھی نمایاں کمی کی گئی - اس سے قبل طرفدار اپنے صوبے کے ملکی اور عسکری دونوں امور کا نگرانِ اعلی ہوتا تھا اور اسے نہ صرف قلعہ داروں کی تقرری کے اختیارات حاصل تھے بلکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق مستقل فوجی سپاہیوں کی تعداد گھٹا بڑھا بھی سکتا تھا اور اس طرح اس جاگیر کی آمدنی میں جو عسکری اخراجات کے لیے مخصوص تھی جتنا جی چاہے خرچ کر سکتا یا بچا سکتا تھا - محمود گاواں نے طرف داروں کے اختیارات بڑی حد تک کم کر دیے - اس نے حکم جاری کیا کہ آئندہ قلعہ داروں کا تقرر مرکزی حکومت کیا کرے گی اور ایک طرف دار کا صرف ایک قلعے پر بلا واسطہ تسلط رہے گا - علاوہ بریں ہر وہ شخص جس کے ذمے سپاہ کی تنخواہ کا بانٹنا ڈالا گیا ہو اس روپے کے حساب کا ذمے دار ہوگا جو اس نے جاگیر یا منصب سے اس غرض کے لیے لیا ہوگا - غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ جاگیرداروں کو بادشاہ کے سامنے حسابات کے لیے جوابدہ بنایا گیا - ایک اور طریقہ جس سے سلطان کو صوبجاتی امور کے ساتھ بلا واسطہ منسلک کر دیا یہ تھا کہ ہر صوبے میں ایک قطعۂ زمین ''شاھی املاک'' کے نام سے علیحدہ کر لیا گیا - اراضی کی باضابطہ پیمائش، ممالکِ محروسہ کی حد بندی، فردِ حقیت کی تیاری اور محاصل کی تعیین کے لیے بھی احکام نافذ کیے گئے - یہ اصلاحات مغل شہنشاہ اکبر [رک بآں] کی اصطلاحات سے دو سو سال پہلے نافذ ہو چکی تھیں، لیکن محمود گاواں کے قتل کے ساتھ ہی ان تمام منصوبوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ترقی کی رفتار کا رخ پیچھے کی طرف پھر گیا - اس سے تیس سال بعد، یعنی ۹۰۱ھ/ ۱۴۹۵-۱۴۹۶ء میں وزیر قاسم برید نے، جو بیدر کے

برید شاہی [رکؔ باآں] خاندان کا مورث اعلیٰ تھا، اسی نہج پر ایک اور سعی کی۔ ان اصلاحات کی بنا پر چھوٹے منصب‌داروں کو ذاتی شاہی محافظ فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا، اس کے بعد سے ان کا لقب ''سر کردہ'' یا ''حوالدار'' ہو گیا۔ یہ اقدام بے دلی سے کیا گیا تھا، لہٰذا اس کا اثر چھوٹے جاگیرداروں اور منصب‌داروں سے آگے نہیں بڑھا اور مقتدر امرا اس کی زد سے کلیۃً محفوظ و مصئون تھے۔ انحلالِ سلطنت اور اس کی جگہ بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، برار اور بیدر [رکؔ باآں] کی پانچ ریاستوں کا قیام جن اسباب کی بنا پر وجود میں آیا ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ سابقہ اصلاحات کے کالعدم ہو جانے کی وجہ سے طرفدار اپنی عظیم قوت و اقتدار سے برابر متمتع ہوتے رہے۔

یہ عہد محمد آباد۔ بیدر (دکن کے دارالحکومت) کا دور عروج و شباب تھا اور روسی سیاح نکیٹن Athana sius Nickiten، جو مشرق میں خواجہ یوسف خراسانی نام اختیار کر کے سفر کرتا رہا، اس کا حال ''اسلامی ہندوستان کے سب سے بڑے شہر'' کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ شہر پندرہ میل مربع میں پھیلا ہوا تھا اور گھوڑے، کپڑے، ریشم، سیاہ مرچ اور دوسری اشیاے تجارت کی اس میں فراوانی تھی۔ وہ عظیم الشان مدرسہ جس کی بنیاد ۱۴۷۲ء میں رکھی گئی تھی آج بھی اس عظیم دارالحکومت کی اندوہ‌انگیز یادگاروں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سہ منزلہ عمارت، اس کی پیشانی جو ہزارہا رنگ کی ٹائلوں سے مزیّن تھی، اس کے کشادہ کمرے، اس کی بھاری بھاری دیواریں، اس کے اساتذہ کا عملہ، جس میں ہندوستان اور ماوراءالبحر کے مستند علما شامل تھے، ان چیزوں نے یقیناً اسے ان تشنگانِ علم و دانش کا ملجا و ماوٰی بنا دیا ہوگا جو یہاں جاری کردہ سرچشمۂ علم سے سیراب ہونا چاہتے ہونگے۔

منجملہ ان نامور علما کے جن سے محمود گاواں کا سلسلہ مراسلت قائم تھا ذیل کے مشاہیر بھی تھے: مولانا جامی، امیر تیمور کا سیرت نگار علی الیزدی اور مقدّس صوفی حضرت عبیداللہ الاحرار۔ علاوہ بریں نامور ماہرینِ سیاستِ اسلام جیسے فاتح قسطنطنیہ محمد ثانی اور سلاطینِ گیلان، عراق اور مصر سے بھی اس کی خط و کتابت رہتی تھی۔

۵ صفر ۸۸۶ھ/۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو یہ وزیر قتل ہوا تو اس کے ساتھ ھی اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ خواجہ کے قتل کے بعد ایسا کوئی نہ تھا جو اس قوت نو پر قابو رکھ سکتا جو توازنِ اقتدار کی حالیہ حکمتِ عملی کے سبب معرض وجود میں آئی تھی۔ خواجہ کے قتل کے ٹھیک ایک سال بعد محمد ثالث کی وفات ہوئی اور اس کے جانشین شہاب الدین محمود شاہ کی سستی اور کاہلی نے مرکز سے علٰیحدہ ہو جانے والی قوتوں کو کھلی چھٹی دے دی، نتیجۃً سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ بیدر میں ملک حسن نظام الملک ھی فقط ایک ممتاز قائد باقی رہ گیا تھا، جس کی بات پر لوگ کان دھرتے تھے، اس کی آنکھ بند ہوتے ھی فی‌الواقع تمام باقی‌ماندہ قابل امرا دارالحکومت چھوڑ کر چلتے بنے تا کہ اپنی اپنی عملداریاں علٰیحدہ علٰیحدہ قائم کریں اور بے چارے سلطان کو تن تنہا بےاصول قاسم برید ترک کے چنگل میں چھوڑ گئے۔ ان لامتناہی معرکوں نے، جو سالہا سال تک بیجا پور، احمد نگر، برار، گلبرگہ اور تلنگانہ (گولکنڈہ) کے صوبہ‌داروں کے مابین جاری رہے، بہمنی مرکز کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ ان جاگیرداروں کی قانونی حیثیت جو کچھ بھی ہو وہ سلطان کی براے نام سیادت کو تسلیم کرتے ہوے اپنے اپنے علاقوں میں عملاً خود مختار تھے۔

مگر جنوب میں ذرا فاصلے پر ایک ایسا واقعہ

پیش آ رہا تھا جس کے سامنے ان تمام مقامی طوفانوں کا مانند پڑ جانا مقدّر ہو چکا تھا اور جس سے بالآخر ہندوستان کی صورت ہی کچھ اور ہو جانے والی تھی ۔ یہ واقعہ بہمنی سلطنت کے مغربی ساحل پر پرتگالیوں کا ورود تھا ۔ جیسا کہ اچھی طرح معلوم ہے ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکو ڈ گاما راس امید (Good Hope) کا چکر کاٹ کر مشہور جانباز مسلم جہازراں حسین بن شیخ ماجد [رکّ بہ ابن ماجد] کی مدد سے کالی کٹ کی بندرگاہ پر پہنچا ۔ اس مہم کے شروع میں پرتگالیوں نے بہمنی ریاست سے کوئی تعرض نہ کیا اور اس سے آگے گزر کر کالی کٹ کے حکمران زمورن اور راجا کوچین سے مراسم محبت استوار کرنے کی کوشش کی، لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ کارخانے بدل کر قلعے ہو گئے اور محبت نے عداوت کی شکل اختیار کر لی ۔ دکن سے پہلی آویزش اس وقت ہوئی جب مصر اور گجرات کے متحدہ بیڑے نے امیر البحر امیر حسن کے زیر کمان فروری ۱۵۰۹ء میں بہمنی بندرگاہ چول سے کچھ فاصلے پر پرتگالیوں کو شکست دی، لیکن بیرونی حملہآوروں (پرتگالیوں) نے خفیہ ترکیبوں سے ۲۵ نومبر ۱۵۱۰ء کو بندرگاہِ گوآ پر قبضہ کر لینے کے بعد ہزارہا زن و مرد اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیے پھر عدالتِ استیصالِ الحاد (Inquisition) کا قیام عمل میں آیا، جس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بکثرت رومن کیتھولک مذہب کا پابند بنایا گیا ۔

احمدنگر اور بیجاپور میں ایک اَور ثقافتی انقلاب رونما ہو رہا تھا اور یہ ایران سے شیعہ عقائد کی دکن میں ریل پیل تھی ۔ اس امر کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مدت دراز سے دکن میں ایرانیوں نے آ آ کر بسنا شروع کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شیعہ عقائد کے اثرات عوام میں اور نیز دربار شاہی میں نفوذ کرتے جا رہے تھے ۔ جون ۱۵۰۳ء میں عادل شاہی خاندان کے سب سے پہلے حکمران یوسف عادل نے خود شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اس کے تین سال بعد حکم دیا کہ جامع مسجد بیجاپور کے منبر سے شیعہ خطبہ پڑھا جائے اور جیسے کہ توقع کی جا سکتی تھی اس رجحان کی پشتیبانی اسمٰعیل صفوی اوّل [رکّ بآں]، شاہِ ایران (۱۴۹۹ء تا ۱۵۲۴ء) نے کی، چنانچہ اس نے یوسف کے جانشین اسمٰعیل عادل کے پاس بتیس تحائف دے کر اپنا خاص ایلچی بھیجا اور اسے شاہ کا خطاب عطا کیا، لیکن واقعہ یہ تھا کہ اس سے قبل ہی مرکزِ اقتدار بیدر سے صوبجاتی دارالحکومتوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا، اور خاندان بہمنی کے کلیۃً معدوم ہونے سے بہت پہلے بہمنی سلاطین کا اثر عوام پر سے زائل ہو چکا تھا ۔ بہمنی ثقافت کی قائم مقام ثقافتیں مختلف المراکز تھیں اور بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کی ثقافتوں میں نمایاں اختلافات پائے جاتے تھے، لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ اس کے بجائے کہ ان پر ایرانی اثر بڑی حد تک غلبہ پذیر ہو ان کی آئندہ تاریخ میں یہ بات درج ہونےوالی تھی کہ ان میں خالص ہندو عنصر کی بلا واسطہ آمیزش کے اصول کی اَور زیادہ ترقی ہو گی اور جو کام فیروز شاہ بہمنی نے پندرھویں صدی کے اوائل میں شروع کیا تھا اب وہ پروان چڑھے گا ۔

مآخذ : (۱) Briggs : *History for the Rise of the Mahomeden Power in India*؛ (۲) King : *History of the Bahmani Dynasty*؛ (۳) Sherwani : *The Bahmanīs of the Deccan, an Objective Study*؛ (۴) فرشتہ : گلشنِ ابراهیمی؛ (۵) طباطبائی : برهانِ مآثر؛ (٦) E.E. Speight : *Coins of the Bahmanī Kings of the*

Deccan ، در *Islamic Culture*، حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۵ء، ۹ : ۱۶۸؛ نیز رک بہ احسن آباد، گلبرگہ، محمد آباد بیدر اور محمود گاواں.

(ہارون خاں شیروانی)

⊗ **بَہْمَنْیار** : ابن المَرْزُبان، ابوالحَسَن، کیارئیس (م ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء)، ابن سینا کا ایک نامور شاگرد۔ ابن سینا کی کتاب المباحثات بیشتر ان فلسفیانہ مسائل کی بحث پر مشتمل ہے جو بہمنیار نے اٹھائے تھے ۔ وہ آذربیجانی الاصل اور مجوسی الملّت تھا ۔ اس کی عربی دانی اعلٰی پائے کی نہ تھی ۔ بہمنیار نے ابن سینا کے فلسفے کی ایک جامع تفسیر، جو دانش نامۂ علائی پر مبنی ہے، تین حصوں میں لکھی ہے (۱ ۔ منطق، ۲ ۔ ما بعد الطبیعۃ، ۳ ۔ فی الموجودات)۔ اس کا نام کتاب التحصیل (یا کتاب التحصیلات) ہے۔ [یہ کتاب اس نے اپنے ماموں ابو منصور بن بہرام بن خورشید بن بردبار المجوسی کے لیے تألیف کی تھی ۔ خوانساری] ۔ یہ کتاب ۱۳۲۹ھ میں قاہرہ میں چھپ چکی ہے (اس کے قلمی نسخوں کے لیے دیکھیے براکلمان : تکملۃ، ۱ : ۸۲۸) ۔ بہمنیار نے ایک اور کتاب نفوس اور عقول فعّالہ پر لکھی تھی، جس میں سے صرف ایک فصل موجود ہے (دیکھیے براکلمان : تکملۃ، محلّ مذکور) ۔ بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ، مطبوعۂ لاہور ۱۹۳۵ء میں اس کی ایک کتاب الزینۃ کا ذکر کیا ہے، جو منطق پر تھی ۔ بیہقی ھی نے لکھا ہے کہ بہمنیار نے ایک کتاب بہجت و سعادت پر اور ایک موسیقی پر لکھی اور اس کے علاوہ کئی رسائل قلم‌بند کیے تھے ۔ ان میں سے رسالتان فی ما بعد الطبیعۃ (یعنی ۱۔ رسالۃ فی مراتب الموجودات؛ ۲۔ رسالۃ فی موضوع العلم المعروف فیما بعد الطبیعۃ) لائپزگ میں ۱۸۵۱ء اور قاہرہ میں ۱۳۲۹ھ میں یکجا طبع ہوے ۔ ان رسالوں کا المانی زبان میں S. Popper ترجمہ از اسی طباعت کے ہمراہ موجود ہے [براکلمان، ۱ : ۸۵۸؛ معجم المطبوعات، عمود ۵۹۸ ۔ ایک مختصر سا شخصی رسالہ جو ابن سینا نے اس کے نام لکھا، برلن میں موجود ہے (قنواتی : مؤلفات ابن سینا، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ص ۳۱۰) ۔ بہمنیار ابوالعباس اللوکری کا استاد تھا، جس کے ذریعے علوم حکمت کی خراسان میں اشاعت ہوئی (تتمہ، ص ۱۲۰)].

مآخذ : مذکورۂ بالا کتب کے علاوہ دیکھیے :

(۱) نظامی عروضی : چہار مقالہ، طبع قزوینی، ص ۲۰۲؛ (۲) ابن ابی اُصَیْبِعَہ : عیون الأنْباء (بامداد اشاریہ)؛ [(۳) خوانساری، ص ۱۳۹].

(فضل الرحمٰن [و ادارہ])

* **اَلْبَہْنَسَا** : قرون وسطٰی میں وسطی مصر کا ایک مشہور شہر، جو بحر یوسف اور کوہستان لیبیا کی زیرین پہاڑیوں کے مابین بنی مزار سے پندرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور قاہرہ کے جنوب میں ایک سو اٹھانوے کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک ریلوے سٹیشن ہے ۔ قبطی میں اس کا نام Oxyrhynchus ہے ۔ بوزنطی عہد میں یہ ایک نہایت بارونق شہر تھا اور اپنے گرجوں اور اپنی خانقاھوں کے لیے مشہور تھا ۔ قبطی روایت کے مطابق جب حضرت مریم[ع] اور ان کے بیٹے حضرت مسیح[ع] مصر سے واپس آئے تو انھوں نے اسی شہر میں قیام کیا تھا . . .

عرب حملوں کے وقت یہ ایک نہایت مستحکم جگہ تھی ۔ اس کے چاروں طرف موٹی موٹی دیواریں تھیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی محصورین نے دفاع میں نہایت زبردست مزاحمت کی، جس کی یاد مدتوں تازہ رہی اور اس نے ایک دلچسپ رومان کی صورت اختیار کر لی، جس کا نام ''فتح بَہْنَسا'' تھا.

ابتداءً قرون وسطٰی میں بحیثیت ایک بستی کے مرکز کے اس شہر کو بےحد خوشحالی حاصل تھی ۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے

اواخر میں اس کے نظم و نسق کو از سرِ نو مرتب کرتے وقت فاطمی وزیر بدر الجمالی کے حکم سے اس صوبے کا نام بہنسا قرار پایا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق یہ ایک بڑا شہر تھا، جو چاروں طرف سے بے شمار باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ خلیل ظاہری اپنے وقت میں بھی اسے شہر بتاتا ہے، لیکن یہ بات حد درجہ غور طلب ہے کہ ابن الجیعان، جو پورے صوبے سے واقف تھا، اس شہر کا قطعی ذکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد سے اس کی حیثیت کبھی ایک معمولی شہر سے زیادہ نہیں ہوئی اور اسے پہلے بنیّہ اور اس کے بعد انیسویں صدی میں بنی سُویف کے صوبے میں شامل کر دیا گیا۔ یہ شہر ریت کے تودوں میں دب چکا تھا۔ تقریباً ۱۸۹۰ء میں ہر قسم کا کوڑا کرکٹ، سرخ پتھر کے ستون، ستونوں کے بالائی حصّوں کے مجسّموں، برتنوں اور اینٹوں وغیرہ کے ٹکڑے وہاں بکھرے پڑے تھے۔ حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے بیان کے مطابق یہ کھنڈروں کے ایک بے ترتیب اور بڑے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ افسوسناک صورت حال بظاہر اس علاقے میں جنگلات کے بتدریج تباہ ہوتے چلے جانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ فاطمیوں اور ایوبیوں کے دورِ حکومت میں جنگلات ریاست کی باقاعدہ جاگیر سمجھے جاتے تھے اور ملک کی انتظامیہ ان سے بحری تعمیرات کے لیے لکڑی حاصل کرتی تھی۔ المقریزی یہاں ابن مماتی کے بیان کو قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے مگر یہ اضافہ کرتا ہے: ''یہ نظام اس وقت کامل طور پر مفقود ہو چکا ہے اور اب کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ لوگوں نے نجی طور پر جنگلات کے درخت کٹوا لیے ہیں''۔

ان سب چیزوں سے زیادہ شہر کی خوشحالی پارچہ بافی کی صنعت کی وجہ سے تھی۔ وہاں ہر قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ نہایت بیش قیمت ریشمی کپڑے سے لے کر، جن پر سنہری تصاویر ہوتی تھیں، نہایت معمولی کپڑوں تک، مثلاً پردے، خیموں کے کپڑے، جہازوں کے بادبان، بڑے عرض کے کپڑے، اون، کتان اور روئی سے تیار کیے جاتے تھے، جن پر پکے رنگوں سے تصاویر بنائی جاتی تھیں اور ان میں ''کیڑے سے لے کر ہاتھی تک'' ہر قسم کے جانور شامل ہوتے تھے۔ الادریسی کہتا ہے کہ بہنسا میں جو کپڑے تیار ہوتے تھے ان پر اس کا نام بنا ہوتا تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ قاہرہ میں مسلم فنون کے عجائب‌خانے میں اس وقت بھی بے شمار رنگوں کا اونی کپڑا موجود ہے، جس پر چھوٹے چھوٹے خرگوشوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن کے سر انسانوں جیسے ہیں، جن پر بہنسا کا نام اب بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں بھی اس کے نہایت عمدہ کپڑوں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

مآخذ: (۱) Wiet اور J. Maspero: *Matériaux pour servir à la gèographie de l' Égypte*، ص ۵۱، ۱۷۳ تا ۱۹۱، میں جن مصنّفوں کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ دیکھیے: (۲) ابن حوقل، بار دوم، ص ۱۵۹؛ (۳) الادریسی: المَغْرِب، ص ۵۰ تا ۵۱؛ (۴) ابن المّماتی، ص ۸۱، ۴۴۴ تا ۴۴۳ تا ۳۴۵؛ (۵) الیعقوبی، ترجمہ Wiet، ص ۱۸۶؛ (۶) المقریزی، طبع Wiet، ۱: ۹۲ تا ۹۳، ۳۰۷، ۳۱۰، ۳۱۲؛ ۲: ۱۰۳، ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ ۴: ۱۱۶؛ (۷) Jean Maspero: *Histoire des patriarches d' Alexandrie*، ص ۵۵؛ (۸) مصنّف مذکور: *Organisation militaire de l' Egypte byzantine*، ص ۴۰، ۱۴۰؛ (۹) الھَرَوی: زیارات، ۲: ۴۳، ۴۳، ترجمہ Sourdel-Thomine، ص ۲۶، ۱۰۱؛ (۱۰) القلقشندی، ۳: ۳۸۱ تا ۳۹۷؛ (۱۱) الظاہری، ص ۳۲، ترجمہ،

ص ۵۰؛ (۱۲) Isambert : *Itinéraire de l 'Orient*، *Egypte*، ص ۳٦۷؛ (۱۳) Baedeker Guidebook، فرانسیسی اڈیشن ۱۹۰۸ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۰؛ (۱۴) علی پاشا مبارک، ۱۰ : ۲ تا ۵؛ (۱۵) وآی، بار اوّل، فرانسیسی اڈیشن، تکملہ ص ۲٦۷؛ (۱٦) *RCEA*، جلد ۳، عدد ۹۳۹ .

(G. WIET)

* بَہْو : (ع) اس کے معنی ہیں وہ وسیع خالی جگہ جو دو چیزوں کے درمیان حد بندی کرے، [گھوروں اور خیموں کے سامنے وہ جگہ جو مہمانوں کی فرودگاہ ہو، لسان]؛ مگر اس نے مغربی اسلامی دنیا کی عمارات میں کسی قدر مختلف معانی اختیار کر لیے ہیں، اگرچہ وہ اس کے اصلی بنیادی معنوں سے نسبت ضرور رکھتے ہیں [اور یہ لفظ کمرۂ ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع ہے اَبْہاء، بہو اور بُہِیّ].

بہو اس خیمے یا کوشک خانے کو بھی کہتے ہیں جو اوروں سے الگ واقع ہو اور اپنے سے پہلے خیمے سے محل وقوع، وسعت اور بلندی میں مختلف ہو.

اس لفظ کے استعمال کی ایک مثال، اس بیان میں ملتی ہے جو البکری نے قیروان کی جامع مسجد کے متعلق تحریر کیا ہے ۔ اس نے ''قُبّۃ باب البہو'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جس کا de Slane ''کوشک کے دروازے کی چھتری'' ترجمہ کرتا ہے ۔ ہمیں اس چھتری کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ وہی گنبدی ہے جو مقصورے کی غلام گردش کے وسطی رواق پر بنی ہوئی ہے ۔ یہ رواق ستون دار ہے اور صحن کی طرف کھلا ہوا ہے، لیکن اس کا یوں ترجمہ کرنا زیادہ موزوں و مناسب ہوتا کہ ''وہ قبہ جو وسطی دالان کے داخلے پر بنا ہوا ہے''، اور اس طرح لفظ ''بہو'' کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا کہ اس سے عرضاً وسطی دالان مراد لیا گیا ہے جو محراب مسجد کو جاتا ہے ۔ یہ فراخی میں دوسرے دالانوں سے صریحاً ممتاز ہے اور اس کی حد پر سب سے بڑا دروازہ ہے اور شروع میں قبّہ یا چھتری بنی ہوئی ہے . . . .

یہ اصطلاح اب بھی تونس میں مستعمل ہے اور اس سے مراد جامع مسجد کا مرکزی دالان ہی ہے جو عرضاً بنا ہوا ہے ۔ اس دالان سے پہلے جو دروازہ ہے اسے ''باب البحور'' کہتے ہیں، جو غالباً اسی اصل اصطلاح کی مسخ شدہ صورت ہے .

معلوم ہوتا ہے اَنْدَلُس میں ''بہو'' کا استعمال اس قدر محدود معنی میں نہیں رہا ۔ یہ لفظ المقّری کے اموی محل کے بیان میں ملتا ہے جو عبدالرحمٰن ثالث نے مدینۃ الزّہراء میں تعمیر کیا تھا ۔ محل کی اصلی عمارت پانچ وسیع دالانوں پر مشتمل تھی، جو طولاً تعمیر کیے گئے تھے ۔ ان میں وسطی دالان چاروں سے بڑا تھا اور ایک دروازے پر ختم ہوتا تھا جسے ''باب البہو'' کہتے تھے ۔ اسی دالان کے سرے پر شاہی تخت تھا اور اسی جگہ بادشاہ باریابی دیتے تھے ۔ یہیں خلیفہ الحکم ثانی نے شاہ آرڈونو چہارم (Ordono IV) کو شرف باریابی بخشا تھا اور اسے اپنے سامنے بٹھایا تھا ۔ بہر حال ساتھ کے دالانوں کو بھی، جو اس بڑے درباری دالان میں شامل سمجھے جاتے تھے، بظاہر شہ‌نشین والے دالان سے ملتبس کر دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی انھیں بھی اسی لفظ ''بہو'' سے یاد کرتے تھے .

یہ التباس ابن بَشْکُوال کے ہاں بہت نمایاں ہو گیا ہے، جس کے جامع قرطبہ کے متعلق بیان کا المقّری نے اقتباس دیا ہے ۔ ابن بشکوال لفظ ''بہو'' کا اس عظیم مسجد کے جملہ انیس دالانوں پر بطور استثنٰی اطلاق کرتا ہے، اگرچہ اس نے احتیاطاً صراحت کر دی ہے کہ انھیں معمولاً ''بَلاط'' کہتے ہیں؛ اور فی‌الواقع مسجد کے دالان کے

واسطے عموماً ''بلاط'' ھی بولا جاتا ہے ۔ المقری نے اقلیش Ucles [دیکھیے عنایت اللہ : اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۰ تا ۱۱۱] کی مسجد کے ذکر میں وسطی دالان کے لیے ''البَلاط الاوسط'' ھی کا لفظ استعمال کیا ہے ۔

دالان کا یہ تخیّل کہ وہ طولاً بنایا جائے اور اس سے درباری دیوان کا کام لیا جائے، جیسا کہ اموی محل کے تذکرے سے مترشح ھوتا ہے، اس بات کی توجیہ ہے کہ ''بہو'' کی اصطلاح میں دیوانِ شاھی یا درباری کے معنی کس طرح پیدا ھوے ۔ قرطبہ کے محل میں بھی ایسے دو رواق یا شہ‌نشین تھے جن کے لیے ابن الخطیب یہی لفظ استعمال کرتا ہے ۔ التیجانی کے بیان کے مطابق قابس Gabès میں ابن مکّی نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا اس میں دیوانِ عام کے ساتھ ایک بہو بھی تھا، جس میں محل کا مالک متمکّن ھوتا تھا ۔ قدرتی طور پر ھم اس عزت کے مقام کو وہ وسطی القبّہ قرار دے سکتے ھیں جو عراق میں ایجاد ھوا اور ''ایوان'' کہلاتا تھا ۔ طولونی عہد میں فُسطاط کے مکانوں میں بھی بہو پایا جاتا ہے اور مشرقی ولایات بربر میں بھی چوتھی صدی ھجری/ دسویں صدی عیسوی میں متعارف تھا ۔ بڑے کمرے کی عقبی دیوار میں اندر کے رخ ایک وسیع شاہ نشین یا القبّہ تونس اور الجزائر کے مکانوں میں اب بھی پایا جاتا ہے ۔ تونس میں اسے ''قبو'' بولتے ھیں، مگر الجزائر میں بہو کا لفظ آج بھی غیر معروف نہیں۔

مآخذ : خاص طور سے دیکھیے : (۱) A. Dessus *Étude sur le bahwu, organe d'architecture* : Lamare *musulmane*، در *JA*، ۱۹۳٦ء، ۲ : ۵۲۹ تا ۵٤۷، جو ایک مکمّل و جامع تصنیف ہے؛ اصلی اہم مآخذ : (۲) البکری : *Description de l' Afrique septentrionale*، طبع و ترجمۂ de Slane، ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء؛ (۳) المقری : *Analectes*، طبع Dozy، Dugat، Krehl و Wright، ۱ : ۱۲۵۱ ببعد؛ (٤) ابن الخطیب : الاحاطة، قاھرہ ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ - ۱۹۰۲ء ۔

(G. MARÇAIS)

* البُہُوتی : شیخ منصور بن یُونُس البُہُوتی، جسے اکثر اوقات البُہوتی المِصْری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عموماً گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کے نامور ترین حنبلی علما میں شمار ھوتا اور مصر میں حنبلی مذھب کا آخری زبردست نمائندہ سمجھا جاتا ہے ۔ یہ مُدِیریۂ غربیہ میں ایک گاؤں بہوت کا باشندہ اور اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جس نے چند اور ایسے حنبلی علما بھی پیدا کیے . . . ۔ اس کے معروف ترین اساتذہ میں سے مندرجۂ ذیل کا ذکر ملتا ہے : محمّد المَرْداوی (م ۱۰۲٦ھ / ۱٦۱۷ء، مختصر، ص ۹٦)، یہ بھی مصر کے ایک حنبلی تھے، اور محدّث اور فقیہ؛ عبدالرّحمٰن البُہوتی (مختصر، ص ۱۰۳)، جو چاروں بڑے مذاھبِ فقہ میں ماھر ھونے کی شہرت رکھتے تھے ۔ منصور البُہوتی ایک شافعی عالم عبداللہ الدَّنُوشری کو بھی اپنے اساتذہ میں شمار کرتا تھا ۔ اس کی زندگی کے حالات کم معلوم ھیں ۔ وہ قاھرہ میں فقہ کی تعلیم دینے میں منہمک رھا اور اس نے کثیر تعداد میں شرعی فتوے دیے ۔ اس کے سوانح نویس اس کے زھد و تقوی اور کریمانہ اخلاق کی بڑی تعریف کرتے ھیں ۔ معلوم ھوتا ہے کہ اس کا اسلوب تعلیم بہت مقبول تھا، چنانچہ نہ صرف مصر بلکہ شام و فلسطین سے بھی بے شمار تلامذہ اس سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے آتے تھے ۔ اس کے بڑے تلامذہ میں سے خود اس کے خاندان کے دو افراد محمّد البُہوتی اور محمد ابن ابی السُّرور البُہوتی اور شام کے ابوبکر بن ابراھیم الصّالحی کے نام لیے جاتے ھیں ۔ شیخ منصور نے ربیع الآخر ۱۰۵۰ھ/جولائی ۱٦٤۰ء میں بمقام قاھرہ

بظاہر خاصی بڑی عمر میں وفات پائی اور مجاوروں کی تربۃ (قبرستان) میں دفن ہوا۔

منصور البہوتی کی کتاب ابھی تک مصر میں فقہ حنبلی کے نصاب درس میں شامل ہے ۔ فقہ حنبلی کی تاریخ میں اسے موسی الحجاوی (م ۹۶۸ھ / ۱۵۶۰ء) کی (قب براکلمان، ۲، ۳۲۵ اور تکملہ، ۲ : ۴۴۷) اور شیخ تقی الدین الفتوحی المعروف بہ ابن النجار (م ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء، قب براکلمان : تکملہ، ۲ : ۴۴۷) کی تصنیف کے تکملے کا مرتبہ حاصل ہے ۔ الحجاوی فلسطینی نے، جو دمشق میں مفتی تھا جہاں وہ عمریۃ اور جامع امویۃ میں درس دیتا رہا، موفق الدین بن قدامہ (م ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء) کی کتاب المقنع کا خلاصہ زاد [= المستقنع] کے نام سے تیار کیا تھا، نیز الاقناع کے نام سے ایک شرعی دستور العمل لکھا تھا، جو آخر زمانے کے حنابلہ کے ہاں ایک مستند اور مسلم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے ۔ محمد [صحیح منصور] البہوتی نے ان میں سے اول الذکر کتاب کی الروض المربع بشرح زاد المستقنع [المختصر من المقنع] کے نام سے شرح لکھی (قاہرہ ۱۳۵۲ھ، دو جلد) ۔ اس نے الاقناع کی ایک شرح [کشاف القناع عن الاقناع] بھی پیچھے چھوڑی ہے (جو قاہرہ سے تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے) ۔ شیخ تاج الدین الفتوحی نے، جس نے قاہرہ میں تربیت پائی تھی، الموفق بن قدامہ کی المقنع اور حسن المرداوی (م ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ - ۱۵۰۵ء، مختصر، ص ۷۷ - ۷۸) کی کتاب التنقیح کو منتہی کے نام سے ایک واحد دستور العمل میں جمع کر دیا، جسے بہت جلد خاصی قبولیت حاصل ہوگئی ۔ اس کتاب (: المنتہی) پر ایک شرح (قاہرہ، تین جزء) اور اسی کے متن پر ایک حاشیے کے لیے بھی ہم منصور البہوتی کے ممنون احسان ہیں۔

اس نے محمد بن علی المقدسی (م ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء، مختصر، ص ۶۵) کی المفردات کی شرح بھی لکھی ۔ یہ ایک طویل نظم ہے، جس میں فقہ حنبلی کے مخصوص عقائد کی وضاحت کی گئی ہے ۔ اس شرح کو ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں قاہرہ کے مطبع سلفیہ نے شائع کیا (اور اصل متن کو انھیں ناشروں نے اگلے سال البہوتی کی شرح سے مختصر حواشی لے کے دوبارہ طبع کیا) ۔ آخر میں المقنع کی ایک شرح بھی البہوتی سے منسوب کی جاتی ہے (قب *RAAD*، ۱۲ : ۶۳) ۔

مآخذ : متن مقالہ میں جن مآخذ کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ (۱) المحبی : خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر، بولاق تاریخ ندارد، ۴ : ۴۲۶؛ (۲) جمیل الشطی : مختصر طبقات الحنابلۃ، دمشق ۱۳۳۹ھ، ۱۰۴ تا ۱۰۶؛ (۳) براکلمان [۲ : ۴۴۳، تکملہ ۲ : ۴۴۷؛ (۴) *Le Précis de droit d'Ibn Qudāma* : H. Laoust، بیروت ۱۹۵۰ء، ص liii؛ [(۵) سرکیس : معجم المطبوعات، عمود ۵۹۹؛ (۶) الزرکلی : الاعلام، ۸ : ۲۴۹] ۔

(H. Laoust)

بے : رک بہ بیگ ۔

بے اوغلو : رک بہ استانبول ۔

بے لک : (بیگ لک) ایک کلمہ، جو وصفی اور اضافی لاحقہ لک کو بے (بیک، بیگ) سے ملا کر بنایا گیا ہے ۔ بے ایک قدیم ترکی لقب تھا (رک بہ بیگ) ۔ بے کو عربی امیر کے مترادف مانا جاتا ہے اور بے لک کو امارۃ کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے، اس طرح لفظ بے لک بے کا لقب عہدہ یا فرض منصبی بھی ظاہر کرتا ہے اور بے کے ماتحت علاقے کو بھی بے لک کہتے ہیں ۔ بعد میں اس کے معنی وسیع ہوگئے اور یہ ریاست اور حکومت کے معنی بھی ظاہر کرنے لگا اور اسی کے ساتھ ایسی سیاسی یا انتظامی وحدت جو بعض اوقات کسی قدر خودمختاری بھی رکھتی تھی ۔ جب عثمانی سلطنت قائم ہوئی تھی تو اس خانوادے کے بانی عثمان بے کو

سلجوقی سلطنت کا سلطان بے کہہ کر خطاب کرتا تھا ۔ اسی طرح جو علاقے اس نے بوزنطی سلطنت سے فتح کیے تھے وہ بطور بے لک یا امارۃ اس کے نام منظور کر لیے گئے تھے ۔ آٹھویں صدی ھجری / چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایشیاے کوچک میں جو ترکی ریاستیں (ملوک طوائف) تھیں انھیں بھی عموماً بے لک ہی کہتے تھے ۔ آگے چل کر جب ترکی سلطنت زیادہ وسیع ہو گئی تو ملک کو ''سنجاق بے لک'' نام کے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، جو سب سے بڑی فوجی اور انتظامی وحدت تھی ۔ ان وحدتوں کو دوبارہ جاے وقوع کے لحاظ سے ملا کر ایک ضلع یا صوبہ بنایا جاتا تھا جو کسی بیلر بے کے زیرِ حکومت ہوتا تھا ۔ نویں صدی ھجری / پندرھویں صدی عیسوی سے بلقان کے وہ ممالک جو عثمانی سلطنت کی فوجی اور سیاسی سیادت تسلیم کرتے تھے لیکن پوری اندرونی خود مختاری سے بہرہ اندوز تھے بےلک کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، مثلاً ڈینیوب Danube کی بےلک، افلاق Eflak بےلک، بوغدان Bogdan بےلک، اردل Erdel بےلک ۔ کچھ آگے چل کر وہ ممالک بھی جنھوں نے عثمانی سلطنت سے کچھ خاص حقوق حاصل کر لیے اور ایک حد تک خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے بےلک ہی سمجھے جاتے تھے، مثلاً بےلک سیسام (= ساموس)، بےلک بلغارستان (بلغاریا) ۔ پھر اس اصطلاح کے معنی میں مزید وسعت کی نوبت آئی اور اسے اسم صفت کی طرح استعمال کیا جانے لگا جس سے حکومت کی مقبوضہ جگھیں اور اشیا مراد ہوتی تھیں، مثلاً بےلک اراضی (میری اراضی)، اراضی شاملۂ بےلک (املاک بےلک)، بےلک قشلا [ق] (بےلک کا سرمائی مقام)، بےلک چشمہ (بےلک کا چشمہ)، بےلک آخور (بےلک کا اصطبل)

بے لک گمی (بے لک کا جہاز) وغیرہ ۔ ترکی کی کچھ ضرب‌الامثال بھی ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً ''ایک دن کی بے لکی بھی بے لک ہے'' (بر گونک بیلغی بیلکدر) ۔ سلطنت کے مرکزی نظام کے ایک عہدےدار کا نام اسی لفظ سے مشتق کیا گیا تھا، یعنی بےلک جی (بیگ لک جی Beglikdji) ۔ یہ محکمۂ ''دیوان همایون'' [رک بآں] کا صدر ہوتا تھا.

(M. Tayyib Gökbilgin)

II ۔ (ب) ۔ یہ لفظ شمالی افریقہ میں المغرب کے ان علاقوں میں استعمال کیا جاتا ہے جن پر پہلے ترکوں کا قبضہ تھا، مگر مراکش اور صحرا میں جہاں ترکی حکومت کا اثر کبھی محسوس نہیں کیا گیا یہ لفظ مستعمل نہیں ۔ جیسے مراکش میں مَخزن کا لفظ مستعمل ہے ۔ اسی طرح بےلک بھی حکومت اور انتظامی اختیارات کے ہر درجے میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کا استعمال اسی وقت سے شروع ہوا ہوگا جب سے ترکی کا قبضہ اور بیلربیوں (Beyler beys) کی حکومت کا وہاں آغاز ہوا، یا ممکن ہے کہ اس کے کسی قدر بعد کے زمانے سے شروع ہوا ہو ۔ اگر یہ مانا جائے کہ بعد کے زمانے میں شروع ہوا تو پھر بلاشک اس سے اس رسوخ کی یاد تازہ ہوتی ہے جو قسنطینہ، ٹِٹری Titeri اور المغرب کے مقامی بیوں نے حاصل کر لیا تھا، کم از کم اتنی ہی جس قدر کہ شہر الجزائر کے بڑے بے کے رسوخ کی ۔ علاوہ بریں ۱۶۷۱ء کے بعد تو آخر الذکر کی جگہ ایک دوسرے لقب کے حاکم داے Dey نے سنبھال لی تھی ۔ ہماری اطلاعات اس قدر کم ہیں کہ ان سے کوئی نتائج اخذ نہیں کر سکتے .

طرابلس‌الغرب، تونس اور الجزائر مین بے لک کے لفظ سے جو طریق نظم و نسق ظاہر ہوتا ہے

وہ عملاً وہی تھا، البتہ یہ کہ تونس میں حکومت کے عہدے بہت جلد موروثی ہو جانے کا رجحان رکھتے تھے۔ یہ حالت کہیں اور نہیں تھی۔

چونکہ ہر مقام میں حکومت کی شکل عثمانی تھی اور اس کی وضع میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو محض برائے نام، لہٰذا اکثر حالات میں جو الفاظ سرکاری عہدوں کے لیے مستعمل تھے وہ ترکی زبان ہی کے تھے، لیکن شمالی افریقہ میں ترکی اداروں کی جڑیں زیادہ مضبوط نہ ہو سکیں اور وہ صوبائی سطح سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت عملاً بتمامہ ترکی تھی اور صوبائی حکومت کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ان معنوں میں کہ ہر ایک صوبہ کسی ترکی والی کے زیرِ اقتدار تھا یا ترکی نظام حکومت سے وابستہ تھا اور تمام اہم شہر، یعنی چھاؤنی والے شہر، بھی انھیں عمّال کے زیرِ حکومت تھے جنھیں مرکزی یا صوبائی حکومت مقرر کرتی تھی۔ بے لک کا اختیار اس کے آگے نہ جاتا تھا۔ چھوٹے شہر جہاں فوج متعیّن نہ ہوتی، نیز دیہات اور قبائل کا انتظام ان کے اپنے عمال کے ہاتھ میں تھا۔ مرکزی یا صوبائی حکومت انھیں تسلیم کر لیتی تھی اور وہ والی اور عوام کے درمیان معاملات طے کرنے کا واسطہ اور انھیں باہم جوڑنے والی کڑی تھے۔

ایک با اثر مرکزی قوت ہونے کی حیثیت سے بے لک عوام کے دلوں میں مختلف جذبات پیدا کرتی تھی، یعنی خوف اور شبہہ، جن کا نتیجہ عام مخاصمت اور مخالفت ہوتا تھا، لیکن ساتھ ہی مصیبت اور ذاتی پریشانی کے وقت لوگ اس پر اعتماد بھی بے حد کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر بے لک اگر چاہتی تو پروردگار کی نیابت بھی کر سکتی تھی۔

مآخذ: اس مبحث سے متعلق کوئی خاص تصنیف موجود نہیں، مگر بے لک کے نظام کے مختلف پہلوؤں کی بابت اطلاعات متعدد تصانیف میں مل سکتی ہیں، مثال کے طور پر ذیل کی کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے: (۱) R. P. Dan: *Histoire de Barbarie et de ses corsaires*، پیرس ۱۶۳۷ء؛ (۲) Venture de Paradis: *Alger au XVIIIe siecle*، طبع Fagnan، الجزائر ۱۸۹۸ء؛ (۳) H. de Grammont: *Histoire d'Alger sous la domination turque*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۴) Ch. A. Julien: *Histoire de l'Afrique du Nord*، بار دوم، ج ۲ (به نظر ثانی و تکمیل تا زمانۂ حال از R. Le Tourneau)، پیرس ۱۹۵۲ء۔

(R. LE TOURNEAU)

* **بیابانک**: وسط ایران کے صحرا (دشتِ کویر [کبیر]) کے ایک حصّے کا نام، جس میں تقریباً بارہ نخلستان ہیں۔ یہ علاقہ ذیل کی حدود کے اندر ہے: طول بلد مشرقی (گرینچ) ۵۴ درجے ۱۵ دقیقے و ۵۵ درجے ۱۵ دقیقے اور عرض بلد شمالی ۳۳ درجے ۵ دقیقے و ۳۴ درجے ۱۰ دقیقے۔ کھجور کے درختوں اور زمین دوز چشموں نے، جن میں کچھ گرم ہیں، مگر سب کے سب شور ہیں، اسے اس قابل کر دیا ہے کہ باقی ایران سے الگ تھلگ رہ کر بھی خوشحال رہ سکے۔ یہ نام غالباً اسم تصغیر ہے، جس کے معنی ہیں ''چھوٹا سا بیابان''، لیکن سولھویں صدی (Tavernier) سے پہلے یہ کہیں مذکور نہیں ہے۔

اسلام سے پہلے اس علاقے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، اگرچہ مقامی روایت میں دعوٰی کیا گیا ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں یہاں ان مجرموں کو بھیجا جاتا تھا جنھیں جلا وطنی کی سزا دی جاتی تھی۔ اس علاقے کے مختلف مقامات کے نام، مثلاً آتشکدہ (مِہرجان کے نخلستان سے جنوب کی جانب چھے کیلومیٹر کے فاصلے پر)، اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام سے پہلے یہ جگہ آباد تھی۔

یزد کی ایک تاریخ (دیکھیے نیچے) میں دعوٰی کیا گیا ہے کہ عرب یزد جِرد کا تعاقب کرتے ہوے مرکزی صحرا کے علاقے میں سے گزرے تھے اور وہاں کے مقامی باشندوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن یہ قول صرف طَبَّس پر منطبق ہو سکتا ہے کیونکہ مقامی روایتوں میں تصریح موجود ہے کہ بیابانک میں اسلام کہیں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں امام علی الرِّضا کے زمانے میں جا کر پھیلا ۔ ابن حَوْقَل نے لکھا ہے کہ نائین سے تین منزل کے فاصلے پر تین گاؤں اس سڑک پر واقع ہیں جو صحرا سے خراسان کو جاتی ہے ۔ ان گاؤوں کے نام بیادَق، جَرْمَق اور آرابہ ہیں اور یہ اتنے قریب قریب ہیں کہ ایک گاؤں سے دوسرا گاؤں دکھائی دیتا ہے ۔ اس جگہ کھجوروں کے درخت بالخصوص جاذب توجہ ہیں ۔ ناصر خسرو ایک گاؤں کَرْمَہ کا ذکر کرتا ہے جو نائین سے تینتالیس فرسخ کے فاصلے پر تھا اور لکھتا ہے کہ پہلے اس علاقے میں کوفیجان (قُفص) کا ہجوم تھا، لیکن اس کے زمانے (پانچویں صدی ہجری / گیارھویں عیسوی) میں طَبَّس کے امیر گِیْلکی نے اس علاقے کو ان کے وجود سے پاک کر دیا تھا ۔ اس کے کچھ مدت بعد ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان یہ علاقہ بلوچوں کے حملوں سے نقصان اٹھاتا رہا ۔ بظاہر خوزستان کے عرب قبائل بھی اس علاقے پر حملے کرتے رہے کیونکہ گزشتہ صدی کے مغربی سیّاح اطلاع دیتے ہیں کہ وہاں عرب بھی رہتے ہیں، اور مقامی روایات میں بھی موجود ہے کہ ایک عربی قبیلے، ایل بَسِیْری نے قاچاروں کے زمانے میں اس علاقے میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا.

آج کل ان نخلستانوں میں غالبًا دس ہزار نفوس آباد ہیں ۔ ان میں سے نو بڑے بڑے نخلستانوں کے نام حسب ذیل ہیں : جَنْدَق، فَرُّخی، جَرْمَق، اَردیب، اِیرَج، بِہرجان، بَیازَہ، چُوپانان اور انتظامی صدر مقام خُور ۔ ہر ایک نخلستان کی اپنی اپنی الگ بولی ہے، البتہ جَنْدَق میں فارسی بولی جاتی ہے ۔ ان نخلستانوں کے باشندوں کا گزارہ زیادہ‌تر کھجور کے باغات پر ہے.

مآخذ: (۱) I. B. Tavernier: *Voyages*، پیرس ۱۷۲۴ء، ۲: ۳۳۹؛ (۲) C. M. MacGregor: *Narrative of a Journey through Khorassan*، لنڈن ۱۸۷۹ء، ۱: ۹۱؛ (۳) W. Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Persien II*، در *SBAk. Wien.*، عدد ۱۰۸ (۱۸۸۵ء)، ص ۶۱۶ تا ۶۲۲؛ (۴) عبدالحسین آیتی: آتشکدۂ یزد، یزد ۱۹۳۹ء، ص ۶۷؛ (۵) A. Gabriel: *Die Erforschung Persiens*، وی انا ۱۹۵۲ء، بذیل مادّہ Bijabanak؛ (۶) ابن حَوْقَل، ۲: ۳۰۵؛ (۷) Frye: *Biyabanak, The Oases of Central Iran*، در *Central Asian Journal*، ۳، ۱۹۶۰ء؛ (۸) حبیب یغمائی: شرح حال یغما، تہران ۱۹۲۵ء، ص ۸ تا ۱۲؛ (۹) رزم آرا: فرہنگ جغرافیائی ایران، تہران ۱۹۵۳ء، جلد ۱۰.

(R. N. FRYE)

* **بیاتلی یحیٰی کمال:** رکّ بہ یحیٰی کمال بیاتلی.

* **بَیان**، عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں وضاحت اور ابانت، یعنی وہ وسائل جن کے ذریعے وضاحت پیدا کی جائے، لہٰذا کلام یا تعبیر کا واضح ہونا اور وہ ملکہ جس سے یہ وضوح میسّر ہو اصطلاحًا بیان، بلاغت سے جو (تقریبًا) اس کا مترادف ہے ترقی کر کے اس کی ایک خاص شاخ بن گیا، چنانچہ علم البلاغۃ میں علم البیان ایک شاخ کے طور پر شامل ہے ۔ تاہم بیان عام استعمال میں مختلف اور وسیع تر معانی میں بھی بولا جاتا رہا ہے (قبّ نیز اس قسم کے جملے جیسے باب بیان . . . اور در بیان . . . جن میں بیان کا مفہوم ''فی'' یا ''در'' سے زیادہ کچھ

نہیں ہوتا) - کبھی کبھی تبیان کا لفظ مفہوم میں کسی فرق کے بغیر بیان کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً الخطابی (م ۹۹۶ یا ۹۹۸ھ) : کتاب بیان اعجاز القرآن، مخطوطۂ لائڈن، عدد ۱۶۵۴ (Cod. Warner 655)، ورق ۵ (ب) تا ۶ (الف) : کلام کی مختلف اصناف کا مرتبہ اس کے 'تبیان' کے لحاظ سے الگ الگ ہوتا ہے؛ وہی کتاب، ورق ۸ (ب) : لوگ تقریباً مترادف الفاظ کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے وہ 'بیان' جسے عبارت میں ادا کرنا مقصود ہو یکساں طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔

"بیان" کی ماہیت کے بارے میں قدیم ترین قسم کے بیانات بظاہر توصیفی کہاوتوں کا درجہ رکھتے ہیں - انھیں بیان کی تعریفیں نہیں کہا جا سکتا، [مثلاً] "عقل روح کی رہنما ہے، علم عقل کا رہ نما ہے اور بیان علم کا ترجمان ہے" (سہل بن ہارون، مشہور شعوبی (م ۲۱۵ھ / ۸۳۰ - ۸۳۱ء) منقول در ابن عبد ربّہ : العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء، ۱ : ۲۲۱؛ نیز ابو ہلال العسکری : دیوان المعانی، قاہرہ ۱۳۵۲ھ، ۱ : ۱۳۱؛ اسی طرح الحُصری القیروانی : زہرالآداب، بر حاشیۂ العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۱ : ۱۳۴) - ابن المعتز (م ۹۰۸ھ) : آداب، طبع I.J. Kratchkovsky : *M.O.*، ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۱، نے بیان کی مدح میں ایک طویل عبارت رقم کی ہے اور کہا ہے بیان "قلب کا ترجمان" ہے (یہاں زہرالآداب، ۱ : ۱۱۳ کی عبارت نقل کی گئی ہے)، "صیقل ذہن" ہے، اور "دافع شک" ہے، اسی قسم کا ایک قول العقد الفرید، ۱ : ۲۲۱، میں درج ہے : "بدن کا ستون روح ہے، روح کا ستون علم ہے اور علم کا ستون بیان ہے" - اسے دوسروں نے بھی دہرایا ہے، مثلاً ابن رشیق نے (العمدۃ، قاہرہ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء، ۱ : ۲۱۳).

بعض مواقع پر بیان کا اوّلین تعلق فصاحت سے بتایا گیا ہے، جیسے الجاحظ [رک بآں] : کتاب البیان و التبیین، طبع السندوبی، بار دوم، قاہرہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ۱ : ۳۲۲، جس میں کہا گیا ہے کہ حسن البلاغۃ کا مطلب تلفظ کی صحت و روانی ہے؛ ابو ہلال العسکری : کتاب الصناعتین، قسطنطنیہ ۱۳۲۰ھ، ص ۷ س ۳، جہاں فصاحت کو بیان کا کامل آلہ (وسیلہ) قرار دیا گیا ہے؛ ابن الاثیر : المثل السائر، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۶۵ : "فصاحت کے معنی ہیں واضح کر دینا، صفائی کے ساتھ تشریح کر دینا، یعنی بیان نہ کہ ابہام و اخفاء" - تاہم بالعموم بیان کا تصور بلاغۃ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے - النویری، نہایۃ الأرب قاہرہ ۱۳۲۲ھ ببعد، ۷ : ۱۰ نے سہل بن ہارون کے قول کی ایک زیادہ مفصل روایت نقل کی ہے - "بیان فکر کا ترجمان اور قلب کی تربیت ہے؛ اور بلاغت وہ ہے کہ [مطالب کو] عوام سمجھ جائیں اور خواص مطمئن ہو جائیں . . ." - ابن رشیق : العمدۃ، ۱ : ۲۱۵ تا ۲۱۶، بلاغت کی دو تعریفیں بتاتا ہے جن میں سے ایک کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ اس قوت بیان اور واضح تشریح کا نام ہے جو خوش اسلوبی کے ساتھ مربوط ہو" اور دوسری تعریف کہ "بلاغت عِیّ کی ضد ہے اور عِیّ قدرتِ بیان (یعنی اپنا مطلب صاف طور پر سمجھا دینے) کے فقدان [عجز] کو کہتے ہیں" - التوحیدی (م ۱۰۲۳ھ) تکلّف یعنی آورد سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے رسالۃ فی العلوم (در رسالتان، قسطنطنیہ ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء، ص ۲۰۶) میں بیان کو عملاً بلاغت کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے - الجاحظ : کتاب البیان، ۱ : ۹۵ بلغاء، خطباء اور ابیناء (جمع کثرت بیّن) سب کو ایک ہی سطح پر رکھتا ہے یعنی وہ لوگ جن کی تقریر شستہ اور استادانہ ہو - تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا مالکی

فقیہ اور شاعر احمد بن المُعَذَّل کی بابت اس رائے سے
کہ وہ عربی لغۃ، بیان، ادب اور حلاوۃ (بذلہ سنجی)
میں یکساں مہارت رکھتا تھا (زَهْرُ الآداب،
۲ : ۲۷۶) ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کا مفہوم بلاغت
سے کس قدر قریب ہے؛ قَبْ نیز وہ تعریف جو
الحَسَن بن وَهْب (م تقریباً ۸۶۰ھ) نے ابو تمّام کی
بر بنائے بیانِ ''نظام'' نگارش کی ہے (وہی
کتاب، ص ۱۰۴) ۔ غیر اصطلاحی معنی میں لفظ
بیان کے بعد کے زمانے میں استعمال کا ایک نمونہ
ابن قَیِّم الجَوْزِیَّہ [رَكَ بآں] : کتاب الفوائد،
قاہرہ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء، ص ۵ میں دیکھا جا
سکتا ہے جہاں فصاحۃ، جزالۃ (ادبی شان)، بیان،
غَوامِضُ اللّسان (زبان کی باریکیاں) اور حسنِ کلام
سب کا ایک ہی جگہ ذکر کر کے کہا ہے کہ
اللہ عزّو جل نے یہ امتیازی صفات قرآن مجید میں
جمع کر دی ہیں.

مخصوص معنی میں بیان کی تعریف العِقد، ۱ :
۲۲۱ میں دی گئی ہے اور ابو طاہر البغدادی
(م ۱۱۲۳ء) نے قانون البلاغۃ (در رسائل البُلَغاء، طبع
محمد کُرد علی، بار سوم، قاہرہ ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۲)
میں خفیف تغیّر کے ساتھ یہی کہا ہے کہ ''جو
چیز ایک مستور خیال (=معنی) کے چہرے سے
اس طرح نقاب اٹھا دے کہ ذہن (عقل) اسے اچھی
طرح سمجھ کر قبول کر لے وہی بیان ہے'' ۔
تشریح کا یہی راستہ بیان کی اس زیادہ مبسوط
تعریف میں جو جَعْفر البَرْمَکی (م ۸۰۳ء) سے منسوب
ہے اختیار کیا گیا ہے، البیان ۱ : ۱۱۸ (نیز ابن
قُتَیبہ : عُیُون الاَخْبار، قاہرہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء -
۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء، ۲ : ۱۷۳؛ زَہر الآداب، ۱ : ۱۲۶) :
''بیان سے مراد یہ ہے کہ لفظ (اسم، جسے بعد
کے زمانے میں کلام کہا گیا ہے) تمھارے (مخاطب
کے) خیال کا پورے طور پر احاطہ کر لے اور مقصد کو
(مکمل طور پر) ادا کر دے، اور اسے ابہام (شِرْکۃ)
سے اس طرح الگ کر دے کہ کسی کو (اصل
منشا سمجھنے کے لیے) تأمّل اور سوچ بچار کی ضرورت
نہ پڑے ۔ بیان، تکلف یعنی آورد سے خالی اور
صَنْعَۃ (تصنّع) سے دور ہونا چاہیے ۔ اس میں کوئی
الجھن (تعقید) نہ ہونی چاہیے، اور بغیر تأویل آسانی
سے سمجھ میں آ جانا چاہیے'' (ترجمہ از عُیُون اور
زَہر بیان سے متعلق عبارت کسی قدر طویل ہے ۔
العِمدۃ، ۱ : ۲۲۵ میں بھی بیان کی اسی قسم کی
تعریف درج ہے جس کا مفہوم یہی ہے لیکن
عبارت مختلف ہے).

فنِّ خطابت کے نظام میں بیان کی مناسب جگہ
مقرر کرنے کی پہلی کوشش، جہاں تک مجھے معلوم
ہے، ابن القِرِّیَّہ (م ۸۴ھ / ۷۰۳ء) کی تحریر میں
محفوظ ہے، جو اس نے حرف، کلمہ اور کلام پر
لکھی تھی ۔ اس میں کلام کو دس ''ابواب'' میں
منقسم کیا گیا ہے، جن میں سے سات باب فواتح
(ابتدائیات) اور تین باب جوامع پر مشتمل ہیں ۔
اس فہرست میں بیانُ الکلام فواتح میں چوتھا
باب ہے اور اس کے لوازم جیسے ''بولنے کی جرأت''،
''کھنکھارنے اور گھلا صاف کرنے سے پرہیز'' اور
بات کو مرضی کے مطابق شروع اور ختم کرنے کے
قابل ہونا ابتدائیہ میں شامل ہیں (منقول از قانون
البلاغۃ، ص ۳۳۴).

الجاحظ : کتاب الحَیَوان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ/
۱۹۰۷ء، ۱ : ۱۷، میں لکھتا ہے کہ انسان اور
دوسرے ذی حیات ''قوت دلالت'' یعنی
مافی الضمیر کے اظہار کی قابلیت رکھتے ہیں،
مگر قوتِ استدلال فقط انسان ہی میں ہے،
جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دلالت کے ساتھ سوچ
کر نتیجے نکالنے کی قوت بھی رکھتا ہے، مگر
الجاحظ کی رائے میں بیان کا لفظ دونوں قسم

کی دلالت پر حاوی ہے ۔ اب انسانی دلالت یا بیان کی پانچ صورتیں ہیں : (۱) لفظ، (۲) کتابت، (۳) انگلیوں یا ان کے جوڑوں پر شُمار (عَقد، یہ لفظ عَقد نہیں ہے جیسا کہ السَّندُوبی نے بیان، ۱ : ۷۶ میں سہوًا ضبط کیا ہے)، (۴) اشارۃ اور (۵) نِصبہ یعنی پینترا یا رویّہ (یہ لفظ نُصْبة نہیں ہے جیسا کہ کتاب مذکور، ص ۱۱ میں سہوًا ضبط کیا گیا ہے)، نِصْبَة کی بابت دیکھیے Nallino، در *RSO*، ۱۹۱۹ تا ۱۹۲۱ء، ص ۶۳۷ تا ۶۳۹، جس نے ص ۶۴۰ تا ۶۴۱ پر ان متأخر نحویوں کی فہرست دی ہے جنھوں نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے ۔ بیان کی پانچ قسموں کا یہ ضابطہ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان، ۱ : ۳۳ میں اور پھر البیان، ۱ : ۷۶ میں دہرایا ہے ۔ ابن المُدَبّر (م ۸۹۲ء) : رسالۃ العَذْراء، طبع زکی مبارک، قاہرہ ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ء، ص ۴۰ الجاحظ کی انواعِ خمسۂ بیان کو نقل کرتا ہے اور اس پر اپنا یہ قولِ فیصل اضافہ کرتا ہے کہ نِصْبَة کا تصور ارسطاطالیس تک جاتا ہے (جس کا ساتواں "مقولہ" τὸ κεῖσθαι ہے) الحُصْری (م ۱۰۶۱ء) : زَہر، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵، الجاحظ کی رائے پر بحث کرتا ہے، لیکن اس کے ممکن مأخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا ۔ ابوطاہر : قانون، ص ۴۲، محض الجاحظ کے قول کی بالاختصار تکرار پر اکتفا کرتا ہے ۔ الرُّمّانی (م ۹۹۴ء) : کتاب النُّکت فی اِعجاز القرآن، طبع عبدالعلیم، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۲۶، جس نے بیان کی تقسیم کلام، حال، اشارہ اور علامۃ میں کی ہے، الجاحظ ہی کے سابقہ قول کا پیرو معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی اصل ابھی تک واضح نہیں کی گئی ۔ بعد کے زمانے میں الجاحظ کے نظریے کا اور کوئی حوالہ میرے علم میں نہیں آیا ۔

اسحٰق بن ابراہیم بن وَہْب نے ۳۳۵ھ / ۹۴۶ - ۹۴۷ء کے بعد اپنی کتاب البُرہان فی وجوہ البیان لکھی (یعنی بیان کے مختلف طریقوں کی توضیح) ۔ (یہ کتاب حال کے زمانے تک غلطی سے قُدامہ بن جعفر کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہے اور اسی کے نام سے اس کتاب کو نقد النَّثر نام دے کر طٰہٰ حسین اور العبّادی نے طبع کیا ہے) ۔ اسحٰق کی غرض اس کتاب کی تصنیف سے ان خامیوں کو دور کرنا ہے جو اس موضوع کو بیان کرنے میں الجاحِظ سے ہو گئی تھیں ۔ اسحٰق بن ابراہیم اظہار کے چار جداگانہ طریقے بتاتا ہے : (۱) چیزیں اپنی اصل (ذوات) ہی سے سمجھ میں آ جائیں (یعنی ان کا ایسا ہونا ہی جیسی کہ وہ ہیں انھیں قابلِ فہم بنا دے)، خواہ وہ الفاظ بھی جو عام طور پر انہیں ظاہر کرتے ہیں استعمال نہ کیے جائیں؛ (۲) عقل و فکر کے ذریعے ذہن میں ان کا مفہوم آ جائے (غالبًا اسی کو الجاحظ استدلال کہتا ہے)؛ (۳) زبان کی آوازوں کو جوڑ کر ملفوظ کرنے سے معنی سمجھ میں آئیں؛ اور اخیرًا (۴) بذریعۂ کتابت، جس سے فاصلے پر موجود لوگوں کو یا انھیں جو (ابھی) پیدا نہیں ہوے (اور بعد میں آنے والے ہیں) سمجھایا جا سکے (قُدامہ بن جعفر الکاتب البَغدادی کی کتاب نقد الشِّعر کا ترجمہ از S.A. Bonebakker، لائڈن ۱۹۵۶ء، ص ۱۶؛ قوسین میں جو لفظ یا عبارت ہے وہ کاتب مقالہ کی ہے) ۔ یہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ اسحٰق کا تصورِ بیان اس تصور سے جو الجاحِظ نے متعیّن کرنے کی کوشش کی تھی بہت مختلف ہے اور ایک لحاظ سے اس سے وسیع تر اور ایک دوسرے لحاظ سے اس سے تنگ تر ہے ۔ جس طرز سے اسحٰق اپنے تصوّرِ بیان کا اپنے موضوع پر اطلاق کرتا ہے اسے سمجھنے کے لیے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ (۳) کی بحث کے تحت (از ص ۴۰ تا ۶۴) وہ سولہ "اقسام العبارۃ" (یعنی

الفاظ میں اظہار کی اقسام) کی فہرست دیتا ہے جن میں بغیر مزید تقسیم کے اصناف ذیل شامل ہیں : صنعت اشتقاق (*Figura etymologica*)، تشبیہ، رمز، استعارہ، تمثیل، لُغز اور تقلیب.

الرُّمانی نے جو بلاغۃ کی تقسیم دس قسموں میں کی ہے وہ ایک بالکل جداگانہ سلسلۂ فکر پر مبنی ہے: ایجاز، تشبیہ، استعارہ وغیرہ اور ان سب کے آخر کی یعنی دسویں قسم ''حسن البیان'' (= خاطر خواہ مطلب واضح کرنا) ہے ۔ اسی سلسلۂ فکر کے مطابق ابن رَشیق [م ۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء] نے العمدۃ، ۱ : ۲۲۵ تا ۲۲۸ میں بیان پر ایک باب مرتب کیا ہے (اور موقع کے مطابق الرُّمانی سے دو مفید مطلب اقتباس بھی دیے ہیں) اور کہنا چاہیے کہ قسم بندی کی اسی سطح کے متوازی بلاغت، ایجاز، نظم، مجاز (بدلے ہوے معنی)، استعارہ، المُخْتَرع والبدیع (ایجاد و جدّت) وغیرہ پر ابواب تحریر کیے ہیں ۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں ''بیان'' کے ساتھ، خصوصاً ''بدیع'' کے مقابلے میں، اس طرح کے معاملے کا اشارہ نہیں پایا جاتا جو زمانۂ ما بعد میں غالب نظریہ بننے والا تھا ۔ الآمدی [رک بآں] نے اپنی کتاب المُوازنۃ بین ابی تمّام و البُحْتُری، قسطنطینیہ ۱۲۸۷ھ، ص ۶ میں بدیع کی قسمیں حسب ذیل قرار دی ہیں : استعارہ، تجنیس اور طباق (صنعت تضاد) ۔ ابو ہلال العَسْکری (م ۱۰۰۵ء) اپنی کتاب صناعتین (مثلاً ص ۲۰۵ اور ۲۹۰) میں استعارہ اور کنایہ کو دیگر جملہ صنائع کے برابر جگہ دیتا ہے ۔ ایسے ہی الباقلّانی [رک بآں]، الخَفاجی [رک بآں] اور ابو طاہر اپنے زمانے تک استعارہ اور کنایہ کو ''بدیع'' کے تحت میں لاتا ہے ۔ قانون، ص ۳۴۵ تا ۴۰۹ (خصوصیت کے ساتھ صنائع کلام کی بیالیس اصناف، ص ۳۴۶)، لیکن ان میں سے کسی نے بھی علم البلاغہ یا '' علم البیان '' کی، جیسا کہ عبدالقاہر الجُرجانی [رک بآں] (دلائل الاعجاز، قاہرہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء، ص ۴) اپنے وقت تک کہنا زیادہ پسند کرتا تھا اور اسے تمام علوم سے بزرگ تر قرار دیتا تھا، اساسی ترتیب کے ارتقا میں کوئی حصّہ نہیں لیا ۔ الجُرجانی، جس کے اور باتوں کے علاوہ ہم اس لیے بھی مرہون منت ہیں کہ اس نے معنًا استعارہ کا جمالیاتی نقطۂ نظر سے بہت ہی مؤثر تجزیہ کیا ہے، دلائل الاعجاز، ص ۳۴۹ تا ۳۵۰ میں لکھتا ہے کہ علم الفصاحہ و البیان کا ارتقا دوسرے علوم کے ارتقا سے دو باتوں میں مختلف ہے : (۱) اس علم کے قدیم ماہرین نے اس کے بجاے کہ انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ صراحۃً براہ راست کہتے اس سے متعلق اپنے خیالات کو اشارات و استعارات کے پردے میں ظاہر کیا؛ (۲) علاوہ بریں قدما کی آرا پر دوسرے علوم کے مقابلے میں بہت کم نقد و جرح کی اور اس علم کی معلومات کو نقل در نقل کرتے چلے گئے ۔ الجُرجانی بیان کے نظریات سے دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ اس کی جدّت طرازی ادب کے تجزیے کی ایک اور سطح سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ حقیقت فخر الدین الرّازی (م ۱۲۰۹ء) کی کتاب نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز، قاہرہ ۱۳۱۷ھ سے بھی عیاں ہے ۔ اس کتاب کو خود الرّازی نے (ص ۳ تا ۵ پر) الجُرجانی کی دلائل اور اسرار البلاغۃ کو مربوط کرنے کی کوشش بتایا ہے (طبع H. Ritter، استانبول ۱۹۵۴ء، جرمن ترجمہ Wiesbaden، ۱۹۵۹ء) مگر اس میں ''بیان'' پر صراحۃً کوئی بحث ہی نہیں ملتی.

جب ابن الاثیر [رک بآں] نے المَثَل السّائر فی ادب الکاتب و الشّاعر لکھی تو اس وقت سے ''بیان'' کے متعلق افکار میں ایک تبدیلی نظر آتی ہے ۔ خود ابن الاثیر کا اس تبدیلی میں کس قدر

حصّه ہے، اس کے متعلق قطعی راے قائم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ۔ ابن الآثیر نے (ص ۲) علم البیان کا انشاے نظم و نثر سے وہی تعلق قائم کیا ہے جو علم اصول الفقه کو انفرادی احکام یا فقہی قوانین سے ہے (ص ۱۱۳ پر وہ اس علم کے نمائندوں کو علماء البیان کا لقب دیتا ہے) ۔ اس نے اپنی کتاب کے تین حصّے کیے ہیں : ایک مقدمه، جس میں اصول علم البیان، یعنی اس علم کے بنیادی امور سے بحث کی ہے ۔ باقی کے دو حصّوں میں سے ایک میں الفاظ سے کام لینے (الصناعة اللفظیة) کی اور دوسرے میں معنوی خوبیوں (الصنّاعة المعنویة) کی تفصیل ہے ۔ علم البیان کا موضوع فصاحت اور بلاغت قرار دیا ہے، اپنی کتاب میں لفظی اور معنوی اعتبار سے وہ انھیں دونوں کے اجزاے ترکیبی سے بحث کرتا ہے ۔ الفاظ کس کس طور سے معنی ادا کرتے ہیں، وہ اس کا خاص لحاظ رکھنے میں نحویوں کا ہم نوا ہے، لیکن نحویوں کا مقصد یہیں تک ہے اور ہمارا مصنّف آگے بڑھ کر اداے مطالب کے مختلف طریقوں میں حسن و خوبی کے اوصاف بھی تلاش کرتا ہے ۔ اس کا ناقد ابن الحدید (م ۱۲۵۷ء) : الفلک الدّائر علی المثل السّائر، بمبئی ۱۳۰۸، ص ۱۳ تا ۲۳ (المثل، ص ۲۸ س ۶۲ تا ص ۲۹ س ۸) میں اس کی بابت اپنی راے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے : ''ابن الاثیر کا علم البیان بنیادی طور پر ایک علم معقول (علم عقلی) ہے جو اصول عامه سے بذریعۂ علم و ذوق استدلال کرتا ہے ۔ اس کے فیصلوں کی بنیاد ادبِ عربی سے استقرا (''بالاستقراء من اشعار العرب'') پر نہیں ہے ۔ (''ذوق'' کی بابت نیز قبّ ابن خلدون : مقدمة، طبع Quatremère، پیرس ۱۸۵۸ء، ۳ : ۳۱۲ تا ۳۱۷، ۳۳۹ تا ۳۰۰؛ ترجمه از F. Rosenthal، نیویارک ۱۹۵۸ء، ۳ : ۳۵۸ تا ۳۶۲، ۳۹۶ تا ۳۹۸) ۔

ابن الاثیر کے نزدیک علم البیان کی جان، حقیقت اور مجاز کا مسئله ہے، یعنی لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہے یا کسی متبدّل معنی میں (ص ۲۳) ۔ اس کی طرز بحث کا طبعی تقاضا یه ہوا که وہ تشبیه، استعاره اور مجازِ مُرسَل اور دیگر صنائع بدائع کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا ۔ حالانکه یہی فرق محاسن کلام عربی کے اس نظام کی جو ابن الاثیر کے وقت سے رائج ہوا نمایاں خصوصیت بننے والا تھا .

اس مذہب کی ابتدا ابن الاثیر کے ہمعصر السّکّاکی (م ۱۲۲۹ء) سے ہوئی، جو اپنی کتاب مِفتاح العُلوم، قاہره بلا تاریخ (تقریباً ۱۸۹۸ء)، ص ۲ تا ۳ میں لکھتا ہے که اس کتاب سے اس کا مقصد تمام انواع ادب، یعنی علم ادب کی جمله اقسام یا عناصر سے به استثناے علم اللّغة، بحث کرنا ہے ۔ یه انواع حسب ذیل ہیں : (الف) علم الصّرف (تغییر اشکالِ الفاظ)؛ (ب) علم النّحو (ترکیب کلام کے اصل قواعد) جس کی تعریف میں اس نے ذیل کے علوم شامل کیے ہیں : (۱) علم المعانی (جملے کے اقسام اور ان کا محل استعمال) اور اسی کے ساتھ ''تعریف'' اور ''استنباط'' کو بھی ضم کر دیا ہے ۔ (۲) علم البیان، یعنی فصیح و بلیغ اظہار کا فن، جس کے لیے ضمنی شاخوں کے طور پر عروض و قوافی کا علم ضروری ہے ۔ علم البیان کے بنیادی مباحث تین ہیں : تشبیه، مجاز (و حقیقت) اور کنایه ۔ بقیه محاسنِ کلام کو کتاب کے آخر میں (ص ۲۲۴ تا ۲۲۹) رکھ دیا ہے اور اس حصّے کا عنوان ''البدیع'' رکھا ہے .

قیاس یه ہے که السّکّاکی کے اس اصولِ بلاغت کی جسے آج تک مستند سمجھا جاتا ہے پوری طرح باقاعده تبویب و ترتیب اس کے شارح القزوینی (م ۱۳۳۸ء) اور القزوینی کے شارح التفتازانی (م ۱۳۸۹ء) کی بدولت ہوئی ۔ القزوینی عام ادب سے

بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا ۔ اس کے نزدیک خطابت کے لیے بحیثیت مجموعی بلاغت موزوں نام ہے ۔ اس علم کو (محاسنِ کلام کے اصول کی حیثیت سے) وہ تین قسموں میں منقسم کرتا ہے : علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع (رک بہ مادّۂ بلاغۃ) ۔ اب علم البیان سے مراد اس سے زیادہ نہیں نہ اس سے کم کہ وہ ایک علم ہے جو ایک ہی مطلب کے ادا کرنے کے ممکن طریقوں سے بحث کرتا ہے کہ ان میں سے کون کون کس حد تک صفائی کے ساتھ اور برمحل یہ کام انجام دے سکتے ہیں ۔ چونکہ جو لفظ بھی استعمال کیا جائے وہ یا تو پورے معنی ادا کرے گا یا جزوی طور پر، اور یا پھر معنی مراد کو کسی ایسے بیرونی لفظ کی مدد سے ادا کیا جائے گا جس کی دلالت سے مخاطَب آگاہ ہے، پس متکلم کو ادائے مطلب کے لیے متعدد پیرائے دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ لفظ اور معنی کے باہمی تعلق کی اساسی صورتیں یہی تین ہیں: ان کے جواب میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مُرسل ہیں، جو اپنی قوتِ بیانیہ سے انہیں ادا کرنے کا فرض پورا کرتے ہیں ۔ اسی لیے انہیں دیگر عام محاسنِ کلام سے، جن سے علم بدیع میں بحث کی گئی ہے، علیحدہ رکھا گیا ہے (القزوینی کی یہ توجیہ جزئی طور پر اس کی کتاب تلخیص المفتاح، قاہرہ ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء، ۳ : ۲۵۶ تا ۲۹۱، سے اخذ کرکے پیش کی گئی ہے؛ نیز در A.F. Mehren : *Die Rhetorik der Araber*، کوپن ہاگن اور وی‌انا ۱۸۵۳ء، متن عربی، ص ۶ تا ۷؛ جرمن عبارت کا ترجمہ، ص ۳۵ تا ۴۵؛ اور جزئی طور پر کتاب تلخیص کے مجموعی سیاق سے ملخّصا لی گئی ہے ۔ قزوینی کے تصور بیان کے اس سے مفصّل تر خلاصے کے لیے دیکھیے : وہی کتاب، ص ۲۰ تا ۴۲).

النُّوَیری (م ۱۳۳۲ء) : نہایۃ، ۷ : ۳۵، البلاغۃ کی تین قسموں : علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع کو تو پہلے مان لیتا ہے، لیکن محاسن کلام کو اس تقسیم کے مطابق مرتب نہیں کرتا ۔ اس کے مقابلے میں ابن قیّم الجَوزیّہ : فوائد میں جس کا مقصد قرآن مجید کے اعجاز یعنی اس کے لاثانی اور مطلقاً بےنظیر ہونے کی تحقیق ہے، علم البیان کو بلاغت کے مجموعی معنی ہی میں استعمال کرتا ہے، اور اس کی شرح احوال کو فصلوں میں تقسیم کرکے پیش کرتا ہے : (الف) فصاحۃ، بلاغۃ، حقیقت اور مجاز، استعارہ، تشبیہ، تمثیل (مثالوں کے ذریعے مطلب ادا کرنا، اِنطباق)، ایجاز اور تقلیبِ الفاظ، (ب) اصل علم البیان جسے وہ (الف) ۴۸ صنائع کبیرہ میں تقسیم کرتا ہے (جن میں سترھویں صفت مجاز مرسل ہے) اور (ب) ان کے علاوہ چوبیس دیگر صنائع ان کے ساتھ ضم کرتا ہے ۔ وہ (ص ۲۱۸ پر) لکھتا ہے کہ حصہ (ب) کے ان آخری چوبیس صنائع کو البدیع بھی کہتے ہیں ۔ ابن قیّم کی طرح ابن خَلْدون (م ۱۴۰۶ء) کی راے میں بھی علم البیان اسی بنا پر قابلِ قدر ہے کہ وہ اعجاز القرآن کے سمجھنے میں رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ بھی علم البیان کو، جو اس ذیلی شعبے کا نام ہے جسے عرب ناقدین نے پہلے پہل منکشف کیا، اظہار مطالب کے مجموعی علم کا اصطلاحی نام دیتا ہے، مگر اس نے اس علم کا نظام قائم کرنے میں جو سختی برتی ہے وہ اسے ابن قیّم سے ممیّز کر دیتی ہے ۔ بیان، یعنی اظہارِ خیال، یا تو بذریعۂ زبان ہوتا ہے یا بذریعۂ کتابت (مقدّمۃ، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۴۳؛ ترجمۂ دیسلان، پیرس ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۸ء، ۳ : ۲۶۴ تا ۲۶۵ ترجمہ از Rosenthal، ۳ : ۲۸۱ تا ۲۸۲) ۔ علم البیان میں بلاغۃ کے تین علم شامل ہیں اور ابن خلدون کی تشریح کے مطابق ان تین، یعنی علم معانی، بیان اور بدیع کے ساتھ علم صرف و نحو بھی علم البیان کا ایک حصّہ ہے ۔ ابن خَلدون یہ بھی کہتا ہے کہ مشرق کے لوگ بیان کی طرف

خاص توجہ کرتے ہیں اور مغرب (اسلامی مغرب) کے بدیع میں خاص دلچسپی لیتے ہیں (مقدمة، ۳ : ۲۸۹ تا ۲۹۳؛ ترجمۂ ڈیسلان ۳ : ۳۲۴ ببعد؛ Rosenthal، ۳ : ۳۳۲ تا ۳۳۹) - ابن خلدون، السکّاکی اور القزوینی کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے جن کی تصانیف سے وہ بخوبی واقف ہے اور جن کا مستند اور ثقہ ہونا اس وقت تک اتنا مسلّم ہو چکا تھا کہ اس میں کسی کو چون و چرا کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

مآخذ : مقالے کے متن میں آ گئے ہیں ۔

(G.E. VON GRUNEBAUM)

* **بَیان بن سَمْعان التَّمِیْمِی** : کوفے کا شیعی رهنما (اکثر غلطی سے بنان لکھ دیا جاتا ہے جو درست نہیں؛ النوبختی کے نزدیک النہدی) - وہ بھوسے کی تجارت کرتا تھا۔ النوبختی کے بیان کے مطابق وہ ابن کَرِب کے تلمیذ حمزة بن عمارة کا شاگرد تھا۔ یہ لوگ محمدؒ بن الحنفیه کی امامت کے متعلق غلو آمیز نظریات رکھنے میں مشہور تھے۔ اس نے محمد کے بیٹے ابو ہاشم (م تقریباً ۹۹ھ/ ۷۱۷ء) [رک بآن] کی امامت قبول کی اور امام محمد الباقرؒ کا مخالف ہو گیا۔ وہ قرآن پاک کے لفظی تشبیهی (یا تجسیمی) معنی سکھایا کرتا تھا، مثلاً خدا ایک نورانی ذات ہے، چہرے کے سوا جس کے تمام اعضاء و جوارح بالآخر معدوم ہو جائیں گے (قرآن ۲۸ [القصص] : ۸۸، کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَهٗ) - جب امام محمد الباقرؒ کی وفات پر المغیرة بن سعید [رک بآن] نے ان کی جماعت کو چھوڑ دیا تو وہ اور بیان بظاہر متفق ہو گئے۔ پھر ایک واقعے کے بعد، جو ممکن ہے جبری اور قبل از وقت شورش ہو، یہ دونوں مٹھی بھر متبعین سمیت گرفتار کر لیے گئے اور ۱۱۹ھ/ ۷۳۷ء میں ہشام کے والی خالد القسری نے انھیں جلا دیا (ان کی موت کے متعلق کئی ایک قیاسی، مگر باہم متضاد بیانات ہیں) - الاصفہانی نے الاغانی میں قرائن کے بالکل خلاف اس خروج کو امام جعفر الصادقؒ سے منسوب کیا ہے (۱۵ : ۱۲۱؛ لیکن قب ۹ : ۱۵۸) - الواقدی اس بغاوت کو محمد بن عبداللہ کی طرف منسوب کرتا ہے، جس نے چھبیس سال بعد المنصور کے خلاف خروج کیا تھا۔ اور یہ بھی امکان ہے (قب الطبری و ابن حزم) کہ اس کا تعلق عباسیوں سے ہو جو جملہ اهلِ بیت کے نام پر کوفے میں ابو ہاشم کی جماعت کے وارث ہو گئے تھے۔

بیان کے معتقدین نے بظاہر ایک جماعت بیانیّه (یا بنانیّه یا سمعانیة) تشکیل کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اماموں کی نبوّت کو نورِ ربّانی کے ایک ذرۂ باطنی سے منسوب کرتے تھے، موت کے بعد بہت سے مذہبی بزرگوں کی بازگشت کا اعتقاد رکھتے تھے اور خداے تعالٰی کے ''اسم اعظم'' پر بحث کرتے تھے [الفرق بین الفرق، ص ۲۲۷ : ''اسم اعظم'' جاننے کا دعوٰی کرتے تھے] - کہتے ہیں بعض لوگ بیان کو (۳ [آل عمران] : ۱۳۸، ھذا بَیَانٌ لِلنَّاسِ . . . الآیة) کی سند پر امام سمجھتے تھے۔ دوسرے شیعی گروہوں کی طرح یہ بھی، کم از کم عباسیوں کی فتح و کامرانی کے بعد، محمد بن عبداللہ کے طرف دار ہو گئے تھے۔

مآخذ : (۱) الاغانی، حوالۂ بالا؛ (۲) النوبختی : فرق الشیعة، نجف ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء، ص ۲۸، ۳۴؛ (۳) الواقدی، کتاب العیون و الحدائق، طبع M. J. de Goeje و P. de Jong *Fragmenta Historicorum Arabicorum*، ج ۱، لائڈن ۱۸۶۹ء، ص ۲۳۰ تا ۲۳۱؛ (۴) ابن قتیبه : عیون الاخبار، قاهره ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء، ۲ : ۱۴۸؛ (۵) الکشّی : معرفة اخبار الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء، بذیل مادۂ ابوالخطّاب، بالخصوص ص ۱۹۶؛ (۶) الطبری، ۲ : ۱۶۱۹ ببعد؛ (۷) الاشعری : مقالات الاسلامیین، قاهره ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء، ۱ : ۶۶؛ (۸)

البغدادی: الفرق بین الفرق، قاہرہ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء، ص ۲۷، ۱۳۸، ۱۳۵؛ (۹) الشہرستانی [الملل و النحل]، ص ۱۱۳؛ (۱۰) ابن حزم، در I. Friedländer : *JAOS*، ۲۸ (۱۹۰۷ء): ۶۰ تا ۶۱، ۲۹ (۱۹۰۸ء): ۸۸ .

(M.G.S. HODGSON)

* **بیئندر** : [= بایندر] اوغوز (ترکمان) قبائل میں سے ایک قبیلہ ۔ آق قویونلو [رک بآں] جو اسی نام کے خاندانِ شاہی کے بانی تھے، اسی بیئندر قبیلے کی ایک شاخ تھے، چنانچہ بعض تاریخ نویس خاندان آق قویونلو کا نام بایندر خان اوغلانلری یا آل بایندریہ لکھتے ہیں، اور آق قویونلو کی ریاست کو دولت بایندریہ کہتے ہیں ۔ اس بات کا امکان ہے کہ بیئندر قبیلے نے سلجوقوں کی فتح آناطولی [رک بآں] میں حصہ لیا ہو ۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں وسطی اور مغربی ترکی میں بہت سے مقامات ان کے نام سے منسوب تھے ۔ کوئی شک نہیں کہ ان سے اکثر مقام بیئندر کے قبضے میں آ گئے تھے، جنھوں نے آناطولی کی فتح میں حصہ لیا تھا ۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں ہم بیئندر کو شام کے ترکمانوں میں بھی پاتے ہیں ۔ اس قبیلے کی شاخ آق قویونلو اسی صدی میں دیار بکر میں سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھی ۔ بیئندر کی سب سے ممتاز شاخ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں علاقۂ طرسوس میں تھی اور اس کا شغل زراعت تھا ۔ طرابلسِ شام اور حلب کے علاقوں میں نیز سیواس کے جنوب میں ینی ایل میں بیئندر کی دوسری شاخیں تھیں ۔ حلب کے بیئندر کو سلطنت عثمانیہ نے آسٹریا پر ۱۶۹۰ء کی فوج کشی میں شریک ہونے کے لیے بلوایا تھا ۔ استراباد [رک بآں] کے علاقے میں بھی بیئندر کی ایک شاخ گوکیلی (Göklen) ترکمانوں کے درمیان آباد تھی ۔ آق قویونلو خانوادے کے افراد یقین رکھتے تھے کہ وہ بیئندر کی اولاد ہیں جو بیئندر قبیلے کا مورثِ اعلیٰ تھا، اور اس کا نشان اپنے سکّوں، یادگار عمارتوں اور فرامین پر بھی ثبت کیا کرتے تھے ۔ گزشتہ زمانے میں ایران اور ترکی میں بیئندر ایک شخصی نام کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا ۔

مآخذ : فاروق سومر Farük Sümer : بایندر، پیچنک ویورگرلر، در دل و تاریخ ـ جغرافیه فاکولته سی درگیسی، ج ۱۱، عدد ۲ تا ۴ : ص ۳۱۷ تا ۳۲۲ .

(FARÜK SÜMER)

* **بیبان** : (دروازے) Tellian Atlas (= "تلّی اطلس" یعنی کوھستان اطلس کے پست پہاڑیوں والے حصّے) کے ایک سلسلۂ کوہ میں سے گزرنے کے درّے ۔ یہ پہاڑیاں جرجرہ کے متوازی واقع ہیں جو وادی سہل کے نشیبی میدان کے جنوب میں ہے ۔ فرانسیسیوں نے ان درّوں کا ترکی نام دَمیر قپو (= آہنی دروازے) باقی رکھا ہے ۔ شہر الجزائر سے قسنطینہ تک سڑک اور ریل کا راستہ دونوں بڑے دروازے [درّے] الباب الکبیر سے گزرتے ہیں جو شبّہ (Chebba) ندی نے پہاڑیوں کو کھود کر بنا دیا ہے ۔ چھوٹے دروازے الباب الصغیر کے جو ۳۰۰ کیلومیٹر مشرق کی جانب ہے، آر پار بوکتون ندی گزرتی ہے ۔ یہ دونوں درّوں میں زیادہ تنگ ہے ۔ یہ "دروازے" قدیم رومیوں کی سڑکوں کے جال اور عربوں کے راستوں میں شامل نہیں تھے بلکہ انھیں سولھویں صدی عیسوی سے ترکی فوجوں نے شہر الجزائر سے قسنطینہ کی طرف سفر کرنے کے لیے استعمال کیا ۔ تاہم ان فوجوں کو اس علاقے کے تندخو باشندوں کو کچھ نہ کچھ روپیہ دینا پڑتا تھا تا کہ وہ انھیں اس علاقے سے بلا گزند گزرنے دیں ۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۹ء کو آٹھ ہزار فرانسیسی سپاہیوں کا ایک لشکر، جس کا سپہ سالار مارشل Marshal والی

(Valée) الجزائر کا گورنر جنرل تھا اور جس کے ہمراہ ڈیوک آف اورلینز بھی تھا، الباب الصغیر کے درّے سے بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے گزر گیا، کیونکہ اس علاقے کے پہاڑی قبائلیوں نے اپنا مقررہ نذرانہ مجّانۃ کے باش آغا مُکرّانی کے حسنِ وساطت سے پہلے ہی وصول کر لیا تھا جسے فرانسیسیوں کا طرف دار بنا لیا گیا تھا ۔ یہ فوجی مہم، جسے آھنی دروازوں کی مہم کہا جاتا ہے، ایک درخشاں جنگی کارنامہ اور تحسین و آفرین کی سزاوار ہے لیکن یہی فرانسیسیوں اور عبدالقادر کے درمیان قطع تعلق کا آخری سبب ہوئی کیونکہ اس فعل کو امیر موصوف نے عہدنامۂ تَفنَہ (Tafna) کی خلاف ورزی قرار دیا ۔

جغرافیہ نویسوں نے لفظ بِیبان کو وسعت دے کر اس میں اس سارے مخالف سمت میں ڈھلوان (anticlinal) سلسلۂ کوہ کو شامل کر دیا ہے جو درّہ ھاے آھنی کو قطع کرتے ہیں، ایک ہزار سے چودہ سو میٹر سے زائد تک بلند ہیں اور اُومیلہ Aumale سے گوئر گور (Lafayette) Guergour تک پھیلے ہوے ہیں ۔ اس طرح یہ پہاڑ وادی ساحل اور زیرین بوسلّام کی معاون ندیوں کے نشیبی علاقے کو اونوغا (Ouennougha)، مزیتہ Mzita اور متنن Metnen کی مخلوط بناوٹ کے پہاڑوں سے اور برج بو اُرّیج Bordj bou Arreridj کے طاس سے جدا کرتے ہیں ۔ یہ پہاڑ جن کی زمین چونے، کھتیلی (marle) اور پرتیلی (schistose) مٹی کی ہے کچھ بہت زیادہ زرخیز نہیں ہیں ۔ بِیبان کے سلسلۂ کوہ کے کچھ حصّے میں حلبی صنوبر کے درختوں کا جنگل ہے ۔ اس کے مغرب میں عرب اور وسط میں قبائلی بربر Kabyle Berbers آباد ہیں اور یہ پہاڑی خطّہ مشرق کی جانب اس علاقے کی جنوبی سرحد بناتا ہے جس میں قبائلی بربر بولیاں بولی جاتی ہیں (رَكَ بہ عبدالقادر، الجزائر، اطلس، قبائلیہ Kabylia) ۔

(G. Yver-(J. Despois))

* **بیبرس : (سیرت)**، عوامی کہانیوں کی ایک ضخیم عربی کتاب جسے مملوک سلطان بیبرس اوّل (۱۲۶۰ تا ۱۲۷۷ء) کی سوانح حیات بتایا جاتا ہے ۔ اس سیرت میں بہت سے اشخاص اور واقعات تاریخی ہیں، لیکن اس کا مجموعی کردار اور اکثر جزئی بیانات افسانوی ہیں ۔ اس کی تاریخی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ قرونِ وسطٰی کے اواخر اور بعد کی صدیوں میں قاہرہ کی مسلم آبادی کے اکثر حصّے کس قسم کی ذہنی غذا قبول کرتے تھے ۔ اس کی حقیقی دلچسپی زیادہ‌تر علم معاشرت، عوامی ادب اور تاریخ ادب کے میدانوں سے متعلق ہے ۔

اس قصے کی ابتدا ایّوبی عہد کے خاتمے کے اور مملوک عہد کے آغاز کے ذکر سے ہوتی ہے جو بَیبَرس کی تخت‌نشینی تک آتا ہے ۔ بعد کے ابواب میں اس بطل کے بہادرانہ کارھاے نمایاں بیان کیے گئے ہیں بالخصوص اس کی وہ لڑائیاں جو عیسائیوں (بوزنطی اور صلیبیوں) اور ایرانیوں (منگولوں) سے ہوئیں ۔ خاتمے کے قریب آ کر یہ قصہ قسمت آزمائی، جادوگری اور حیلہ و فن کی ایک اَور بھی زیادہ عجیب و غریب داستان بنتا جاتا ہے ۔ اس میں بعض روایتی حکایات اور موضوعات سے کام لیا گیا ہے جو اس قسم کی دیگر عربی کتابوں، مثلاً الف لیلۃ و لیلۃ میں پائی جاتی ہیں (اور بعض ایسی بھی جو ایرانی میں موجود ہیں) ۔ بیبرس کا مکار مگر دل سے وفادار خادم عثمان جو آدھا سائیس اور گرہ کٹ اور آدھا ولی تھا اور (قصے کے آخری حصّے میں) ایک ہشیار اسمٰعیلی بہروپیا شِیحہ نامی بھی بہت کچھ حصہ لیتے ہیں ۔ شِیحہ ہر وقت گھومتا اور ٹوہ لگاتا پھرتا ہے، مسلمان قیدیوں کو رہا کرتا ہے، اور اپنے حیلہ و تدبیر سے دشمنوں کو زک پہنچاتا یا کم سے کم انہیں سراسیمہ کرتا رہتا ہے ۔ عیسائیوں کی طرف

اس کا مدّ مقابل خطرناک گُوان Guwān اس کا اصل نام گرگیس (= جرجیس) دیا گیا ہے جو اسلام کا جانی دشمن ہے ۔ مملوکوں کے علاوہ شام کے اسمٰعیلی (یعنی حشیشین Assassins اگرچہ کتاب میں ان کا یہ نام کہیں نہیں لیا گیا) بھی ہیں، جو لڑائیوں میں حصّہ لیتے ہیں ۔ اس سیرت کے مطبوعہ نسخوں کے خاتمے پر عہدِ ممالیک سے لے کر آج تک مصر کی مختصر تاریخ بھی دی گئی ہے؛ یہ بعد کا اضافہ ہے جسے اصل قصّے سے کوئی تعلق نہیں ۔

تاریخی واقعات اسی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں جیسے کہ وہ متوسط طبقے کے نقطۂ نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ان سوداگروں یا کاریگروں کا خاص ہمدردی سے ذکر کیا گیا ہے جو مفلس اور قلّاش ہوگئے تھے ۔ قاہرہ کے کوچہ و بازار کی زندگی کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ جاذبِ توجہ ہیں ۔ مملوک فوج کے درمیان . . . بیبرس ایک عادل بادشاہ کی حیثیت سے نظر آتا ہے جو اپنی رعایا کا محافظ اور اخلاقی خرابیوں سے بر سرِ جنگ ہے ۔ کتاب میں بھونڈے لطیفے، پھبتیاں اور ایسے مضحکہ‌خیز مناظر پیش کیے ہیں جو عام مذاق کے نہایت مناسب ہیں (غالبًا سیرت کی عبارتوں کو ایک مخصوص لحن کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا محض پڑھ کر نہیں سنایا جاتا تھا) ۔ مذہبی جوش ہر جگہ مضمر ہے ۔ ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے نہایت سخت برتاؤ کرتے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں شریفانہ کارناموں کی تحسین و آفرین بھی جیسی چاہیے، کی گئی ہے ۔ شراب سے پرہیز کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے، بدکاری کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اولیاء اللہ کا اکثر ذکر آتا ہے ۔ بیبرس کے ابتداے جوانی کے حالات میں احمد البَدَوی کا بھی ذکر ہے ۔ سیرت کے آخری حصّوں میں سب سے زیادہ نمایاں ولی سیدی عبداللہ المغْزاوی ہیں ۔ یہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں، خصوصًا سمندر پار کے سفروں میں (Wangelin، ص ۳٦۰ تا ۳٦۲).

سیرت بیبرس کا اسلوبِ بیان اسی نمونے کا ہے جیسے اور عوام عربی افسانوں کا ۔ منثور قصے کے بیچ بیچ میں مقفّی اور مسجّع جملے داخل کر کے اسے دلچسپ بنایا گیا ہے اور جابجا اشعار بھی آ گئے ہیں، لیکن یہ اشعار (جن میں سے کچھ تو منقول ہیں اور کچھ معیاری بحروں میں یا دو بولوں (strophic) کی صورت میں کتاب کے لیے موزوں کیے گئے ہیں) کہیں کم اور کہیں زیادہ ہیں، ان کا ابھی تک بغور مطالعہ نہیں ہوا (قبّ Wangelin، ص ۷۰۳) ۔ زبان، خصوصًا قلمی نسخوں میں، ایک حد تک عام بول چال کی ہے ۔

سیرت بیبرس کا ذکر ادب میں پہلی مرتبہ، اگرچہ ضمنی طور پر، ابن ایاس [رکّ بآں] کے ایک حاشیے میں آیا ہے جو اس نے سولھویں صدی کے شروع میں لکھا تھا (Wangelin، ص ۷۰۳) ۔ U. J. Seetzen، E. W. Lane اور J. G. Wetzstien کے کہنے کے مطابق دمشق و قاہرہ میں انیسویں صدی میں سیرتِ بیبرس کا مجمعِ عام میں پڑھا جانا بہت مقبول تھا ۔ طٰہٰ حسین اپنے ایامِ شباب کے تذکرے (الایّام، قاہرہ ۱۹۲۹ء، ص ۲۱ اور ۸۳) میں ایسے انشادات اور مصری فلّاحین (کسانوں) میں سیرت کے مطبوعہ نسخوں کی (یا اس کے کچھ حصّوں کی) فروخت کا ذکر کرتا ہے ۔ لین E. W. Lane نے اپنی کتاب *The Manners and Customs of the Modern Egyptians* میں اس قصے کے کچھ حصّوں کا ترجمہ دیا ہے ۔ ایسے ہی کچھ ترجمہ G. Weil کے *The Thousand and One Nights* کے ترجمے کی طبع اوّل میں بھی دیا گیا ہے ۔

W. Ahlwardt نے سیرت کے برلن کے بعض مخطوطات کا تفصیلی بیان دیا ہے؛ Helmut Wangelin نے اس قصے پر پہلا مکمل مقالہ لکھا ہے جس میں اس کے مضامین کی ایک طویل فہرست دی ہے جو ۱۹۰۸ - ۱۹۰۹ء کے پہلے مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے۔

سیرت کے مخطوطات نسبةً قریب زمانے کے لکھے ہوئے ہیں - Levi Della Vida نے Biblioteca Vaticana میں اس کے ایک نسخے کی کیفیت لکھی ہے، جس کی تاریخ کتابت دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی ہے اور جس میں دوسرے نسخوں کے برخلاف تقریباً ۵۰۰ صفحات ہیں - ممکن ہے کہ یہ نسخہ قصے کی تدریجی تکمیل کا کوئی ابتدائی مرحلہ دکھاتا ہو - اس کے برعکس Ahlwardt نے عدد ۹۱۶۳ اور ۹۱۶۴ کے تحت جن دو نسخوں سے اقتباسات دیے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کے اور زیادہ مختصر نسخے ہیں - اس بیان کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں سے وہ گیت سرے سے غائب ہیں جو متداول نسخے میں جا بجا داخل کر دیے گئے ہیں - سیرت کے ارتقا اور تکمیل کی تاریخ غالبًا اس وقت زیادہ صاف اور واضح ہو سکتی ہے جب مختلف مخطوطات کی قسم‌بندی کر کے ان کا بالتفصیل باہم مقابلہ کیا جائے۔

مآخذ: (۱) W. Ahlwardt: *Verzeichnis der arabischen Handschriften*، ج ۸ (=Handschriften-verzeichnisse der Kgl. Bibliothek zu Berlin، ج ۲۰)، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۳۱۱ تا ۳۳۱ (عدد ۹۱۵۵ تا ۹۱۶۴)؛ (۲) Ch. Rieu: *Supplement to the Catalogue of the Arabic Manuscripts in the British Museum*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۵۰۷ تا ۵۰۹ (عدد ۱۱۸۶ تا ۱۱۹۶)؛ (۳) W. Pertsch: *Die arab Hss. der Hzgl. Bibl. zu Gotha*، ج ۴، Gotha ۱۸۸۳ء، ص ۳۸۷ تا ۳۹۳ (عدد ۲۶۰۰ تا ۲۶۲۹)؛ (۴) Mac Guckin de Slane: *Catalogue des manuscrits arabes* (Bibliothèque Nationale)، پیرس ۱۸۸۳-۱۸۹۵ء، ص ۶۳۷ ببعد (عدد ۳۹۰۸ تا ۳۹۲۰)؛ (۵) G. Levi Della Vida: *Elenco dei Manoscritti Arabi Islamici della Biblioteca Vaticana* (=*Studi e Testi*، ص ۶۷)، The Vatican ۱۹۳۵ء، ص ۲۴۰ (Codici Barberiniani Orienali، ص ۱۵)؛ (۶) مطبوعہ متون (۵۰ حصے، در ۱۰ جلد) قاہرہ ۱۳۲۶ - ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۸ - ۱۹۰۹ء، ۱۳۴۱ - ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۳ - ۱۹۲۶ء؛ (۷) E. W. Lane: *Manners and Customs of the Modern Egyptians*، بار سوم، لنڈن ۱۸۶۰ء، ص ۴۰۰ تا ۴۱۳ (باب ۲۲)؛ (۸) G. Weil: *1001 Nacht, arab. Erzählungen zum ersten Male aus dem Urtext treu übersetzt*، ج ۴، Pforzheim ۱۸۴۱ء، ص ۴۳۷ تا ۹۳۳؛ (۹) D. B. Macdonald: *The Baibars, Romance of*، در ۱، انگریزی طبع اوّل؛ (۱۰) Helmut Wangelin: *Das arabische Voksbuch vom König azzâhir Baibars*، Stuttgart ۱۹۳۶ء (= Bonner *Orientalistische Studien,*، ص ۱۷)۔

(R. Paret)

بیبرس الاول: الملک الظّاہر رکن الدّین الصّالحی، مملوک دولت البحریۃ [رک بآں] کا چوتھا سلطان؛ کہا جاتا ہے کہ وہ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں پیدا ہوا تھا اور ان قپچاق ترک غلاموں کی جماعت میں سے تھا جنھیں ایوبی سلطان الملک الصّالح نے خریدا تھا - اس کا پہلا آقا [امیر علاءالدین] ایدکین بُنْدُقدار تھا اور اسی لیے اس کا لقب بُنْدُقداری ہو گیا اور اسی سے مارکو پولو Marco Polo کی تصنیف (طبع Hambis، جلد ۲) میں مندرج عبارت : بندقداری Bondocdaire، سلطان بابل کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے - تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ۶۳۶ھ / ۱۲۳۹ء میں اپنے

آقا الملک الصالح کے ساتھ کرک میں ایک قیدی کی حیثیت سے آتا ہے ۔ کئی مہینے بعد وہ سلطانِ مصر کی طرف سے شام میں مصروفِ پیکار نظر آتا ہے، جہاں علاوہ ایوبی شاہزادوں کی ان ریشہ دوانیوں کے جو اس کے تصور کے لیے ایک تاریک مثال پیش کرتی تھیں، اسے سخت فوجی تربیت کا زمانہ گزارنا پڑا ۔ اس کا پہلا جنگی کارنامہ منصورہ کے میدانِ جنگ میں مصری فوج کی قیادت سنبھالنا تھا، جو فارسکور کی فیصلہ کن فتح اور فرانس کے بادشاہ لوئی Louis نہم کی گرفتاری پر منتہی ہوئی ۔ اسی موقع پر اس کی شہ سے ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء میں توران شاہ کا قتل عمل میں آیا اور اس قتل کی سازش کو دشمن کے خلاف مزاحمت کے رنگ میں پیش کیا گیا ۔

اس قتل سے کسی بات کا فیصلہ نہ ہوا ۔ کمزوری عام تھی ۔ اس کی ذمے داری بلا شبہہ بیبرس کے سر رہی اور اسی کمزوری کی حالت میں مملوک سلطنت کا آغاز ہوا ۔ شروع کا زمانہ خونریزی میں گزرا اور جب سلطان قُطُز نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو شام کے ملک پر مغول لشکروں کی یلغار شروع ہو چکی تھی، فلسطین میں عین جالوت [رك بآں] کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطان قُطُز اور مغول سپہ سالار (جو مارا گیا) دونوں نے نہایت بہادری دکھائی ۔ مصریوں کی کامیابی نمایاں تھی، کیونکہ نامساعد حالات کے باوجود سلطان ایک بڑی فوج میدانِ جنگ میں لے آیا تھا ۔ اس موقع پر بیبرس اوّل ہراول دستے میں لڑ رہا تھا ۔

ہمیں ان واقعات کے تسلسل کا کوئی علم نہیں جن کی بدولت [الملک المظفر] قُطُز کو اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا اور بیبرس ''الملک الظاہر'' کا لقب اختیار کر کے تخت مصر پر جلوہ افروز ہوا (۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء)۔

[سلطان بیبرس بڑا بہادر، جرأت‌مند اور اولوالعزم حکمران تھا اور جنگوں میں بنفس نفیس شرکت کرتا تھا] ۔ اس کے عہدِ حکومت سے [سلطان] صلاح الدین [ایوبی] کے عہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ [سلطان] بیبرس نے ایک طرف تو عالم اسلامی کو متحدہ قیادت عطا کی اور دوسری جانب فرنگیوں کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑی ۔ اس نے جاگیردارانہ نظامِ حکومت کی بیخ کنی کی ۔ بیبرس کے حملے بھرپور، تیز اور غیرمتوقع ہوتے تھے اور وہ مفتوحہ علاقے کے ایک ایک چپّے کو فوراً دفاع کے قابل بنا دیتا تھا ۔

اندرونی طور پر ملک کی از سرِ نو تنظیم میں غیرمعمولی ہم آہنگی اور توازن پایا جاتا ہے ۔ اپنے ان کارناموں کے علاوہ جن کی تصدیق اس کے کاموں اور واقعات کی تاریخوں سے ہو سکتی ہے، بیبرس ایک ایسا انسان معلوم ہوتا ہے جو تمام واقعات پر ایک غیر متزلزل رجائیت کے ساتھ غالب آجاتا ہے ۔

۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء سے نئے سلطان نے اپنی آئندہ جارحانہ کارروائیوں کے کلیدی مقامات کو مستحکم کرنا شروع کر دیا ۔ چنانچہ حِمص سے لے کر حوران تک ہر اس قلعے کو جسے منگولوں نے تباہ کر دیا تھا مرمت کر کے قابل استعمال بنا لیا اور اسے سامانِ رسد اور اسلحہ مہیا کیا گیا ۔

اس کی نظر میں یہ فوجی پیش‌بندیاں بھی ناکافی تھیں ۔ اسے اصرار تھا کہ ہر قسم کی اطلاعات اس کے پاس جلد از جلد پہنچیں اور وہ خود بھی اسی تیزی و سرعت سے اپنے احکام بھیج سکے ۔ چنانچہ [سلطان] بیبرس نے ڈاک کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا اور سلطنت کے ہر حصّے سے اسے ہفتے میں دو مرتبہ اطلاعات ملتی رہتی تھیں ۔ معمولی حالات میں کسی مراسلے کو قاہرہ سے دمشق جانے میں چار دن لگتے تھے ۔ زیادہ عجلت طلب خبریں

کبوتروں کے ذریعے بھیجی جاتی تھیں اور بلا تاخیر سلطان تک پہنچا دی جاتی تھیں، بلکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ سلطان بیبرس غسل‌خانے میں خبریں وصول کرتا تھا۔ اس ماحول کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کے عمال کی مستعدی اور تن‌دہی اور بڑھ جاتی تھی۔

اس نے اسلحہ‌خانوں کو نئے سرے سے تعمیر کیا اور جنگی اور باربردار جہاز بنوائے۔

سلطان نے ایوبی شاہزادوں کے مقبوضات کی قطع و برید سے آغازِ کار کیا؛ شہر شَوبَک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے عامل مقرر کر دیا اور یہ کام بغیر لڑے بھڑے ہوگیا۔ سلطان خود حلب گیا، انطاکیہ کے نواح میں فرنگیوں کی ٹوہ لی اور دمشق میں اس مہم کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ قاہرہ میں ایک سال گزارنے کے بعد ۶۶۱ھ/ ۱۲۶۳ء میں سلطان نے عکّا کے سنیٹ جین Saint Jean d' Acre کو تنبیہ کرنے کے بعد کرک کا رُخ کیا اور اس طرح ایک ایوبی ریاست کو ختم کر کے دمشق واپس چلا گیا۔ یہاں سے وہ آخر کار مصر میں داخل ہوا اور شہر اسکندریہ کا معائنہ کیا۔ ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء میں سلطان نے حمص کے علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا کیونکہ یہاں کا حکمران بغیر کوئی جانشین چھوڑے فوت ہوگیا تھا۔ اب اس نے زور شور سے فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک لشکرِ جرّار میدانِ جنگ میں لے آیا۔

یکم ربیع الآخر ۶۶۳ھ/ ۲۱ جنوری ۱۲۶۵ء کو یہ زبردست فوج سلطان کے زیرِ قیادت قاہرہ سے فرنگیوں کے خلاف جنگ کے پہلے مرحلے کے لیے روانہ ہوئی، جو ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۱ء سے پہلے ختم نہ ہو سکا۔ ان کے مستحکم مقامات کو ایک ایک کر کے فتح کر لیا گیا۔ ۶۶۳ھ/ ۱۲۶۵ء میں بندرگاہ قیساریہ کی فتح سے فرنگیوں کے جنوبی مقبوضات ایک دوسرے سے منقطع ہوگئے اور یافہ گھر کر رہ گیا۔ زیادہ شمال کی جانب عثلیث اور حَیْفَہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان شہروں کو تباہ کر دیا گیا تا کہ ہزیمت کی صورت میں وہ دشمن کے لیے باعثِ تقویت نہ بن سکیں۔ پھر فوج جنوب کی سمت بڑھی اور اس نے ارسوف کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء میں محاذِ جنگ پر بیک وقت کئی حملے کیے گئے، لیکن بڑے حملے کا رخ صَفَد کی جانب تھا، جو جھیل طبریہ کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ اس مقام کو زبردست محاصرے کے بعد سر کر لیا گیا۔ ۶۶۶ھ/ ۱۲۶۸ء میں سلطان بیبرس یافہ کے اس علاقے کی جانب متوجہ ہوا جو مملکت غیر سے گھرا ہوا تھا اور وہ ایک دن بھی مقابلہ نہ کر سکا۔ فلسطین میں رملہ کی جامع مسجد کے صدر دروازے پر اس کارنامے کا حال ابھی تک کندہ ہے اور اسے پڑھا جا سکتا ہے: ”اس نے یافہ کو طلوع آفتاب کے وقت محاصرے میں لیا اور خدائے تعالٰی کے حکم سے اسی روز تین گھڑی دن گزرے اسے سر کر لیا“۔ چند ہفتوں کے بعد ایک نئے خطِّ دفاع کو بھی توڑ دیا گیا، یعنی دریائے لتانی Litani اور Beaufort کے قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا جو صور (Tyre) کے بالمقابل واقع تھا۔ مسلمان فوجیں اب اچانک لاطینی سلطنت کے شمالی سرے کے پاس نمودار ہو گئیں اور انطاکیہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس فتح کی صدائے بازگشت بہت دور رس ثابت ہوئی، شاید اس سے بھی زیادہ جتنی کہ سلطان صلاح الدین کی فتح بیت المقدس کی۔ صلیبی جنگوں کے آغاز سے لے کر اب تک انطاکیہ ایک دفعہ بھی فرنگیوں کے ہاتھ سے نہ نکلا تھا۔ اب قرب و جوار کے قلعے بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے اور سلطان نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ارمینیۂ صغرٰی کے بادشاہ سے معاہدۂ صلح طے کر لیا، جسے مجبوراً اپنی مملکت کا ایک حصّہ سلطان کو نذر کرنا پڑا۔ ایک

آخری پیش‌قدمی کی بدولت جو حمص سے شروع ہوئی طرابلس کے دور افتادہ استحکامات منقطع ہو گئے، صَفیثَہ کے مستحکم مقامات اور کرک اور عکّار کے قلعے ۶۶۹ھ/ ۱۲۷۱ء کے دوران دو مہینے کے عرصے میں فتح کر لیے گئے۔

اس اثنا میں سلطان، جو معمولاً کبھی قاہرہ میں اور کبھی دمشق میں وقت بسر کرتا تھا، ۶۶۷ھ/ ۱۲۶۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکا تھا۔ ۶۶۸ھ/ ۱۲۷۰ء میں گفت و شنید کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسمٰعیلی قلعوں کے حکمران نے سلطان کو خراج دینا منظور کر لیا۔ سلطان اس زمانے میں سینٹ لوئی Saint Louis کی تونس کی مہم کے بارے میں متفکر تھا اور کچھ عرصے تک مسلمان مغربیوں کی امداد کے لیے جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ اسمٰعیلی قلعوں کی تسخیر کی غرض سے دوبارہ روانہ ہوا، بعد ازاں قاہرہ لوٹ گیا۔ ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۲ء کا سال ملک شام کے ایک عام معاینے میں صرف ہوا۔ مؤرخین اپنے بیانات میں اس پر متفق ہیں کہ سلطان کہیں غیر متوقع طور پر پہنچ جاتا تھا اور اثنائے راہ میں اپنا رخ بدل لیتا تھا تاکہ کسی کو پہلے سے یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں کہاں جانا چاہتا ہے۔ ۶۷۱ھ/ ۱۲۷۳ء میں دمشق سے وہ بیرہ جک روانہ ہوا اور اس کے قریب ایک مغول دستۂ فوج کو مغلوب کیا۔ مصری فوج کے اَور دستے نوبہ، برقہ کے علاقے اور ارمینیہ میں مصروفِ پیکار تھے اور اس طرح آخر کار فرنگیوں کو ذرا دیر کی مہلت مل گئی تھی۔ ایک سال کی خاموشی کے بعد ۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء میں بیبرس پھر ارمینیہ پہنچ گیا اور سِیْس اور آیاس دو شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ۶۷۴ھ کا نمایاں واقعہ نوبہ کی مہم تھی، جس کی قیادت سلطان کے فوجی افسروں نے کی۔ ۶۷۵/۱۲۷۶ء میں سلطان بیبرس ایشیائے کوچک میں تھا، جہاں سلجوقیوں اور ان کے مغول حلیفوں کو شکست دینے کے بعد اس نے قاپادوکیہ Cappadocia کے شہر قیساریہ کو سر کر لیا۔ بعد ازاں وہ دمشق واپس آیا، جہاں اس نے خاصی عمر کو پہنچ کر ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء کے شروع میں وفات پائی۔

صلیبیوں نے پھر کبھی سنبھالا نہ لیا۔ سلطان بیبرس کے انتقال کے وقت فرنگی سلطنت کے علاقائی نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: انطاکیہ کی ریاست اب حقیقۃً باقی نہ رہی تھی؛ جنوب کی سمت اس کی سرحد سمٹ کر یافہ سے عکّا پہنچ گئی تھی۔ بحیثیت مجموعی صلیبیوں کے پاس ساحل کی محض ایک تنگ پٹی رہ گئی تھی، بحالیکہ تمام پہاڑی چوٹیاں سلطان بیبرس کے قبضے میں تھیں۔

سلطان بیبرس کے سترہ سالہ عہدِ حکومت میں مجموعی طور پر شام میں اڑتیس دفعہ فوج کشی کی گئی۔ مغولوں سے جو نو لڑائیاں ہوئیں اس میں سے صرف آخری کی ابتدا سلطان کی جانب سے ہوئی اور باقی آٹھوں کی نوعیت جوابی حملوں کی سی خیال کی جاتی ہے۔ ارمینیۂ صغریٰ سے پانچ اہم آویزشیں ہوئیں۔ اسمٰعیلی بدعتوں، یعنی حشیشیین (Assassins) کو پانچ حملوں سے سابقہ ہوا۔ فرنگیوں کو، جو سب سے زیادہ موردِ عتاب تھے، مصری فوجوں نے اکیس شکستیں دیں۔

سلطان کی فوجی سرگرمی صرف ان احکام کا نتیجہ نہ تھی جو وہ جاری کرتا رہتا تھا، بلکہ پندرہ جنگوں میں اس نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی اور اگر ضرورت پڑی تو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ چند اعداد سے سلطان بیبرس کے مختلف سمتوں میں سفر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہدِ حکومت کا نصف سے زائد عرصہ اپنے دارالسلطنت قاہرہ میں نہیں

گزارا؛ وہ وہاں سے چھبیس دفعہ باہر گیا اور اس نے یقیناً چالیس ہزار کیلومیٹر سے زیادہ کا سفر کیا۔

سلطان بیبرس کے عہد حکومت میں ہمیں مستعدی کی ایک شاندار مثال نظر آتی ہے، جس سے ایک غیر متوقع سیاسی بحالیِ اقتدار ظہور میں آئی۔ اس غیر معمولی قائد کی تحریک سے مصر نے، جو ذرا دیر پہلے ایک اندرونی انقلاب سے دو چار ہو چکا تھا اور زبردست دشمنوں — صلیبیوں، مغول اور اسمٰعیلیوں — کی آماجگاہ رہا تھا، اچانک مشرقی ممالک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ بغداد میں خلافت عباسی کے سقوط سے جو انتشار پیدا ہوا، صلیبیوں اور مغول میں باہمی اتحاد کے اشارات، معزول و بے دخل شدہ ایّوبی شہزادوں کی زبردست ریشہ‌دوانیاں اور بلند مرتبہ مملوک امرا کی ذاتی امنگیں، یہ سب اس افسوسناک اجتماعی صورت حال کے ایسے عناصر ہیں جن سے بیبرس کی کامیابی اس قدر غیر معمولی بن جاتی ہے۔ اس نے بہت عقل مندی کا ایک کام یہ کیا کہ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں مغول کے تباہ کن حملے کے بعد عبّاسی خاندان کے ایک پناہ گزین کا خیر مقدم کیا اور اسے قاہرہ میں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ سلطان کے پیش نظر بعض فوری اور مادّی نتائج بھی تھے، یعنی حجاز کے مقامات مقدسہ پر سیّادت کا حق، کیونکہ اس کے بعد سے بالآخر مصری حکومت اپنے آپ کو ''سلطنتِ اسلامی'' کہنے کی مستحق ہو گئی۔

اس فوق العادت دلیر سپاہی کے کارناموں نے اسے اس کی زندگی ہی میں ایک داستان بنا دیا تھا، بلکہ بیبرس کی داستان اس کی حقیقی سیرت سے بہت کمتر ہے۔ اس کی زندگی درحقیقت قسمت آزمائی کی ایک کہانی ہے : اور بطل کا زہر کے اس پیالے کو پی جانا جو کسی اور نے تیار کیا تھا اس مکمل قصے کا محض ایک حصہ ہے۔

مآخذ : بیبرس کی زندگی کے بارے میں دو بڑے ابتدائی مآخذ ابن عبد الظاہر اور ابن شدّاد کے سوانح ہیں جو دونوں ہی مکمل شکل میں موجود نہیں ہیں۔ (۱) ابن عبدالظاہر کی سیرت کے ایک نسخے کے مخطوطے کو جو موزۂ بریطانیہ میں ہے اور جس میں ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء کے آغاز تک کے زمانے کے حالات ہیں، مسز ایس۔ ایف۔ صادق نے بعنوان *Baybers I of Egypt*، مع انگریزی ترجمے کے ۱۹۵۶ء میں ڈھاکے سے شائع کیا تھا؛ (۲) اسی نسخے کے ایک زیادہ مکمّل مخطوطے کو جو کتاب خانۂ فاتح میں موجود ہے، مسٹر اے۔ اے۔ خویطر Khowaitir طبع کر رہے ہیں؛ دیکھیے نیز (۳) B. Lewis، در *Speculum*، ۲۷، ۱۹۵۲ء : ۳۸۸؛ (۴) Cl. Cahen، در *Arabica*، ۵، ۱۹۵۸ء : ۲۱۱ تا ۲۱۲؛ (۵) P. M. Holt، در *BSOAS*، ۲۲، ۱۹۵۹ء : ۱۴۳ تا ۱۴۵؛ (۶) ابن شدّاد کی سیرت بیبرس کا ایک یگانہ مگر ناقص نسخہ، جو ۶۷۰ھ/۱۲۷۲ء تا ۶۷۶ھ/۱۲۷۸ء کے واقعات پر مشتمل ہے، یلتقایا S. Yeltkaya کو ادرنہ میں ملا تھا اور اس نے اس کا ایک مختصر ترکی ترجمہ شائع کیا تھا (بیبرس تاریخی، استانبول ۱۹۴۱ء)، لیکن اس کے ساتھ اصل عربی متن نہ تھا۔ مزید معلومات عام تاریخی مآخذ (۷) المقریزی [: السلوک، ۱ : ۴۳۶ تا ۶۴۱]؛ (۸) الذہبی [: دول الاسلام، حیدر آباد دکن ۱۳۶۵ھ، ۲ : ۱۲۳ تا ۱۳۴]؛ (۹) ابن تغری‌بردی، [: النجوم الزاہرۃ، ۷ : ۹۴ ببعد] وغیرہ میں مل سکیں گی۔ دیکھیے نیز (۱۰) E. Quatremére : *Sultans Mamlouks*، ص ۱ ببعد؛ (۱۱) محمد فؤاد کوپرولو: ''بیبرس''، در آ آ ت؛ (۱۲) [محمد جمال الدین] سرور: الظاہر بیبرس، قاہرہ ۱۹۳۸ء اور؛ (۱۳) G. Wiet کی تصنیف کردہ قرونِ وسطٰی کے مصر کی عام تواریخ (*Histoire de la Nation égyptienne*)، ۴، پیرس، بدون تاریخ : ۳۶۷ تا ۳۸۲، ۴۰۳ تا ۴۳۸)؛

نیز (۱۴) لین پول S. Lane-Poole : *A History of Egypt in the Middle Ages*، بار دوم، لنڈن ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ؛ [(۱۵) ابن شاکر: فوات الوفیات، ۱ : ۸۵ ببعد؛ (۱۶) ابن ایاس : تاریخ مصر، ۱ : ۹۸ ببعد؛] (۱۷) کتبات کے لیے دیکھیے *RCEA*، ج ۱۱، عدد ۱۲۲۱، ۴۴۴۴؛ ج ۱۲، عدد ۴۴۷۶ تا ۴۴۷۸، ۴۴۸۵، ۴۵۰۱، ۴۵۲۸، ۴۵۵۲، ۴۵۵۳، ۴۵۵۶، ۴۵۵۷، ۴۵۶۲، ۴۵۶۵، ۴۵۸۶، ۴۵۸۸، ۴۵۸۹، ۴۵۹۳، ۴۶۰۰، ۴۶۰۸، ۴۶۱۱، ۴۶۱۲، ۴۶۲۳ تا ۴۶۲۶، ۴۶۳۸، ۴۶۶۰، ۴۶۶۲ تا ۴۶۶۴، ۴۶۷۳، ۴۶۸۶، ۴۶۹۰، ۴۶۹۲، ۴۷۱۴، ۴۷۲۳، ۴۷۲۴، ۴۷۲۶ تا ۴۷۲۸، ۴۷۳۰، ۴۷۳۲ تا ۴۷۳۵، ۴۷۳۷، ۴۷۴۰ تا ۴۷۴۶، ۴۷۵۰ مکرر، ۴۷۵۱، ۴۷۵۲ - مزید مآخذ G. Wiet : *Les Biographies du Manhal Safi*، عدد ۷۰۸ میں ملیں گے۔

(G. WIET)

* بَیبَرس ثانی: الملک المُظفّر رُکن الدّین المنصوری جاشنکیر [چاشنیگیر]، مصر کا مملوک سلطان جو شاید چرکسی نسل کا تھا اور جس کا تعلق سلطان [المنصور] قلاوون کے مملوکوں سے تھا ۔ سلطان محمد بن قلاوون کے پہلے عہد حکومت (۶۹۳ھ/۱۲۹۳ء تا ۶۹۴ھ/ ۱۲۹۴ء) میں اس کا تقرر استادار [استاددار، داورغۂ خانہ] کی حیثیت سے ہوا ۔ سلطان کتبغا نے ترقی دے کر اسے ایک هزار سواروں کا سپہ سالار بنا دیا اور یوں اس کی طاقت میں اضافہ ہوا، لیکن ساتھ ھی ساتھ اس کے حریف سالار کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا، چنانچہ جب ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ء میں سلطان لاجین قتل ہوا تو یہ دونوں یکساں طور پر زمام حکومت سنبھالنے کے لیے تیار تھے۔

انھوں نے دوسری مرتبہ نوجوان محمّد بن قلاوون کو تخت پر بٹھا دیا ۔ ان دونوں میں کسی قسم کے گہرے دوستانہ مراسم ہرگز نہیں تھے، لیکن وہ ایک دوسرے سے اس قدر خائف تھے کہ اپنے باھمی اختلافات کو طول نہیں دینا چاھتے تھے، چنانچہ ان دونوں نے اس پر قناعت کی کہ بادشاہ کے نام پر جو صرف چودہ سال کا تھا مشترکہ حکومت کرتے رھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جو بھی اہم اقدام ہوا اس کا ذکر کرتے ہوے عرب مؤرخین اسے ان دونوں امیروں کی جانب منسوب کرتے ھیں، مثلاً وہ سخت احکام جو ۷۰۰ھ/ ۱۳۰۱ء میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف صادر ہوے ۔ یہ دونوں امیر مغول غازان کے حملے کی زبردست مزاحمت کرنے میں کامیاب ہوے ۔ انھوں نے بالائی مصر کے عرب قبیلوں کی، جنھوں نے اپنے دو سرداروں کو بیبرس اور سلار کے لقب دے کر اپنا امیر منتخب کر لیا تھا، ایک بغاوت کو بے مثل سختی سے کچل ڈالا ۔ دس برس بعد محمد ان کی سر پرستی سے تنگ آ کر تخت سے دستبردار ہوگیا۔

بیبرس کے پاس چونکہ سلار کے مقابلے میں زیادہ مملوک تھے اس لیے وہ شوال ۷۰۸ھ/ اپریل ۱۳۰۹ء میں اکیلا ھی سلطنت کا وارث بننے میں کامیاب ہو گیا اور جبھی اس کی اصل کمزوری ظاھر ہوئی ۔ ہوا یہ کہ سلطان محمد نے کَرَک کے قلعے سے، جہاں وہ پناہ گزین ہو گیا تھا، ایک فوج تیار کر لی اور اگلے ھی سال [۷۰۹ھ] کے رمضان/فروری ۱۳۱۰ء میں وہ تیسری بار تخت حکومت پر قابض ہو گیا ۔ بیبرس فرار ہوگیا تھا، لیکن اسے گرفتار کر کے قاہرہ لایا گیا اور ۱۵ ذوالقعدہ ۷۰۹ھ/ ۱۶ اپریل ۱۳۱۰ء کو اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) ابن تغری بردی : [النّجوم الزّاهرة] قاهره، ۸ : ۲۳۲ تا ۲۸۲؛ (۲) المنهل الصافی، شماره ۷۰۹؛ (۳) Hautecoeur et Wiet : *Les Mosquees du Caire*، ص ۵۳ تا ۵۵؛ (۴) Wiet : *Histoire de la nation égyptienne*، ۴ : ۴۶۸ تا ۴۷۷؛ [(۵) المقریزی:

السلوک، ۲: ۵۴ تا ۷۱، ۸۰؛ (۶) الذہبی: دول الاسلام، ۲: ۱۶۲ تا ۱۶۳].

(G. WIET)

بَیْبَرس المَنْصُوری: مملوک سپہسالار اور مؤرخ، جس نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا الملک المنصور قلاؤون کے غلام کی حیثیت سے کی (اسی بنا پر اس کی نسبت المنصوری ہے)۔ بیبرس نے قلاؤون کی فوج کے ساتھ ۶۶۳ھ / ۱۲۶۴ - ۱۲۶۵ء میں شامی فرنگیوں کے خلاف بیبرس اوّل کی مہم میں، ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ء میں شام اور کیلیکیا = سلیشیا کی مہموں میں، ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ - ۱۲۶۸ء میں انطاکیہ کے محاصرے میں اور ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ء میں کیلیکیا کی ایک اور مہم میں حصّہ لیا۔ قلاؤون نے، جو مصر و شام کا سلطان ہو گیا تھا، ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں بیبرس کو الکَرَک کے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے بیٹے اور جانشین الملک الاشرف خلیل نے ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء میں بیبرس کو اس عہدے سے بر طرف کر دیا۔ اس کے بعد وہ مصر لوٹ آیا اور اس نے عکّا اور ایشیائے کوچک میں قَلْعَة الرُّوم کے محاصروں، نیز اگلے برس مغولوں کے خلاف دو مہموں میں حصّہ لیا۔ جب محرم ۶۹۳ھ/دسمبر ۱۲۹۳ء میں الملک النّاصر محمّد سلطان منتخب ہوا تو اس نے بیْبَرس کو سپہسالار (مُقَدَّم اَلف = یک ہزاری) مقرر کر دیا اور "دَوادار" [= الدویدار؛ دواتدار] (رئیسِ عدالت) کا اعلیٰ عہدہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے بیبرس کی زندگی اس فرمانروا کے ساتھ وابستہ ہو گئی جو دو بار معزول اور بحال ہوا۔ جب ملک النّاصر محمّد کے بجائے الملک المنصور لاجین سلطان ہوا تو اس نے بیْبَرس کو اس عہدے سے ہٹا دیا، لیکن ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ء میں جب الملک النّاصر دوبارہ تخت پر بیٹھا تو بیبرس کو اس کے منصب پر بحال کر دیا۔ اس کے بعد وہ کئی برس تک عسکری اور انتظامی خدمات انجام دیتا رہا، یہاں تک کہ ۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء میں اسے اس "دوادار" کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس اثنا میں الملک النّاصر محمد [بن قلاوون] کا حکومت پر کوئی اقتدار باقی نہیں رہا تھا اور وہ دو طاقتور سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ آخر کار وہ خود ہی تخت سے دستبردار ہو گیا۔ بیْبَرس المَنْصُوری اس شہزادے کا بڑا ہی پرجوش حمایتی تھا، چنانچہ اس نے اسے بحال کرانے کے لیے سخت جد و جہد کی اور جب ۷۰۹ھ / ۱۳۱۰ء میں شہزادہ پھر تخت پر متمکن ہوا تو اس نے بہت سے انتظامی امور بیبرس کے سپرد کر دیے۔ ۱۷ جُمادی الاُولٰی ۷۱۱ھ / یکم اکتوبر ۱۳۱۱ء کو اسے مصر میں نائب السّلطنت بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ سلطان کے بعد سب سے اہم تھا۔ بیبرس اس عہدے پر ایک سال سے کم مدت تک فائز رہا۔ ربیع الآخر ۷۱۲ھ / اگست ۱۳۱۲ء میں اسے معزول کر کے اسکندریہ کے سرکاری قیدخانے میں بھیج دیا گیا، جہاں وہ پانچ برس رہا۔ اس نے ۲۰ رمضان ۷۲۵ھ / ۴ ستمبر ۱۳۲۵ء کو تقریباً اسّی برس کی عمر میں وفات پائی۔

بیبرس ایک متّقی مسلمان تھا اور اسے کتبِ دینی کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے عسکری اور سیاسی مشاغل کے علاوہ وہ تاریخی کتابیں لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء تک کی ایک عام تاریخِ اسلام ہے جس کا نام زُبْدَةُ الفِکْرة فِی تاریخ الهِجْرة ہے۔ یہ ضخیم تألیف [گیارہ جلدوں میں ہے] جسے مؤلف نے صدی‌وار مرتب کیا ہے۔ اس کے ابتدائی حصّے ابن الاثیر کی الکامل پر مبنی ہیں، لیکن اس کا آخری حصّہ ممالیک بحریہ کی تاریخ کا ایک اہم مأخذ ہے، اس لیے کہ مؤلف

نے اس حصّے میں ان مہمّات اور سیاسی واقعات کا حال بیان کیا ہے جن میں وہ خود شریک تھا ۔ بیبرس المنصوری کے ذاتی تأثّرات کا رنگ زُبدة الفکرة کے اس حصّے میں خاص طور سے نمایاں ہے جس میں اس نے مصر کی تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع کی سیاسی تاریخ لکھی ہے اور جہاں اس نے الملک النّاصر محمد [بن قلاوون] کے حق میں اپنے شدید میلان کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی ۔ اس کی تألیف سے دوسرے مؤرخین نے بہت استفادہ کیا ہے، جن میں العینی کا نام خاص طور پر لینا چاہیے ۔ بعد کے ایک مؤلف نے اس تاریخ کی تلخیص کی اور اس کے سلسلے کو جاری رکھا اور اس کی یہ کتاب مخطوطے کی شکل میں کتاب خانۂ بوڈلین [آوکسفرڈ] (۱ : ۷۰۴) میں محفوظ ہے ۔ بیبرس المنصوری نے خود بھی ممالیک بحریہ کی ایک مختصر تاریخ لکھی اور اس کا نام التحفة المملوکیّة فی الدّولة التّرکیّة رکھا ۔ یہ کتاب، جو جزوی طور پر مقفّٰی نثر میں لکھی گئی ہے، مملوکوں کی ۷۱۱ھ/۱۳۱۱-۱۳۱۲ء تک کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے ۔ السّخاوی تاریخ خلفاء پر بھی اس کی ایک تالیف کا ذکر کرتا ہے، جس کا نام اللطائف فی اخبار الخلائف تھا ۔

مآخذ : (۱) براکلمان ۲ : ۴۴ و تکملہ، ۲ : ۴۳؛ (۲) Rosenthal : *History of Muslim Historio-graphy*، ص ۷۵، ۱۲۷، ۳۳۵، ۴۱۸ ۔

(E. ASHTOR)

* **بَبِیلُون** : رک بہ بابل و بابلیون ۔

* **بی بی** : مشرقی ترکی زبان کا لفظ، جس کے معنی ''چھوٹی بوڑھی ماں''، دادی، نانی، اونچے درجے کی خاتون اور معزز عورت ہیں ۔ عثمانی ترکی کی قاموس لغت دیشیشی (*Lughat-i-Deshishi*) میں جو ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰-۱۵۸۱ء میں تألیف کی گئی تھی، اسے ''خاتون'' سے تعبیر کیا ہے، جس میں ''مرتبہ رکھنے والی عورت'' کا مفہوم ملحوظ ہے ۔ آناطولی ترکی میں بی بی کے معنی ''پھپی'' کے بھی ھیں ۔ فارسی میں یہ لفظ خاصے قدیم زمانے سے مستعمل ہے اور اس سے کد بانوی خانہ، خاتون یا [نیک و پارسا عورت] مراد لیتے ھیں ۔ یہ لفظ انوری (بارھویں صدی عیسوی) کے ایک شعر میں، جسے فرہنگ ناصری میں سنداً نقل کیا گیا ہے، مل سکتا ہے : [ع در حضر خاتون و بی بی، در سفر اسفندیار] ۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یہ لفظ خراسان میں معزز و ممتاز عورتوں کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا تھا، مثلاً ایشیاے کوچک کے مصنّف تاریخ سلاجقہ الحسین بن محمد بن علی الجعفری الرُّغدی کو ابن بی بی [رك بآن؛ نیز وھاں ابن بی بی کا نام ناصر الدین یحیٰی بن مجد الدین محمد غلط لکھا گیا ہے ۔ اس کی تصحیح کر لی جائے] المُنَجِّمة (= معزز خاتون ماھرۂ علم ھیئت کا فرزند) کہتے تھے ۔ شیخ صفی (قبّ : صفی الدّین) کی دو بیویوں میں سے ایک کا نام بی بی فاطمہ تھا ۔ آخری ساسانی بادشاہ یزد جرد سوم کی دختر کا مقبرہ، جو تہران کے نزدیک واقع ہے، بی بی شہر بانو کے نام سے مشہور ہے ۔

مآخذ : (۱) شیخ سلیمان بخاری : لغة چغتائی و ترکی عثمانی، استانبول ۱۲۹۸ء، ص ۸۸؛ (۲) تانیکلری ایلہ ترمہ سوز لغو، انقرہ ۱۹۵۴ء، ۳ : ۱۰، ۹۰؛ (۳) ترمہ درگیسی، استانبول ۱۹۳۴ء، ۲ : ۹۰۹؛ (۴) برہان قاطع بہ ذیل مادّہ؛ (۵) H. W. Duda : *Die Seltschukengeschichte des Ibn Bibi*، کوپن ھیگن ۱۹۵۹ء؛ (۶) Browne، ۱ : ۴۳۰ و ۱۳۰ : ۴۲؛ (۷) الیعقوبی، ۲ : ۲۹۳ ۔

(H. W. DUDA)

* **بَیّت** : ایک اوغوز (ترکمانی) قبیلہ ۔ بیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سلجوقیوں کی فتح آناطولی میں حصّہ لیا تھا ۔ ۵۱۲ھ-

۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء میں سلجوقی فرمانروا آق سُنقُر اَلبُخاری کا بصرے میں جو نمائندہ متعین تھا اسے سُنقر اَلبَیاتی کے عرفی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کا اسے بھی اس قبیلے سے کوئی مناسبت تھی۔ نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اورسولھویں صدی عیسوی) میں وسطی اور مغربی ترکی میں بہت سے مقامات بَیَت [بیات] یا بَیَد [بیاد] کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت کم آج باقی ھیں۔ ان مقامات کے اکثر نام بلاشبہہ قبیلۂ بیت ھی سے تعلق رکھتے تھے، جس نے آناطولی کی فتح میں شرکت کی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں شمالی شام میں ترکمانوں کے اندر بھی بیت موجود تھے۔ ان کا ایک اہم اور ممتاز گروہ تھا جو ''شام بَیدی'' کے نام سے موسوم تھا اور دوسرے ترکمان قبائل کی طرح موسم گرما میں سیواس اور بزک Bozok (یوزغاد Yozgot) کے علاقوں میں چلا جاتا تھا۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے آق قویونلو کی سرگرمیوں میں شمالی شام کے بیت کا نام آنا شروع ھوا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں حلب اور یوزغاد (= شام بیدی) کے قرب و جوار کے علاوہ دیار بکر، کوتاھیہ اور طرابلس الشام کی ولایات میں بیت قبیلے کی چھوٹی چھوٹی برادریاں موجود تھیں۔ اسی صدی کے اندر وہ ایران میں بھی، بالخصوص ھمدان کے جنوب میں دَرّاز اور کرہ رود میں بھی موجود ھیں۔ ان کی تعداد تقریباً دس ہزار خیمے تھی اور شاید زیادہ قریبی زمانے میں، اور غالباً ملک کے باقی بیت سے ممیز کرنے کے لیے، ''آق بَیت'' کہلاتے تھے۔ آق بَیت بہت ھی اعلٰی قسم کے گھوڑے پالتے تھے، جو انھیں کے نام پر ''بیتی نژاد'' کہلاتے تھے۔ شاہ عباس ان گھوڑوں کو تحفۃً ھندوستان کے فرمانروا کو بھیجا کرتا تھا۔ بیاتی سُر (مَقام) جو ترکی یا ایران کے پکّے راگ میں نظر آتا ھے، اس کی اصل اسی قبیلے کے گیت ھیں۔ اغلب یہ ھے کہ آق قویونلو کی فتح کے وقت یہ بیت شام سے ایران چلے آئے تھے۔ بیت کے بعض ایرانی قبائل خراسان میں اقامت پذیر ھیں اور یہ باقی ماندہ قبائل سے متمیّز کرنے کے لیے قرَہ بَیَت کہلاتے ھیں۔ مشہور و معروف قاچار قوم کا ایک قبیلہ شام سے تعلق رکھتا تھا۔ اس واقعہ یہ ھے، جیسا اس کے قبائل کے ناموں سے ظاھر ھے کہ قاچار قوم ترکی الاصل ھے۔ کچھ بیت عراق میں بھی ملتے ھیں، بالخصوص کَرکُوک کی نواح میں۔ بغداد کے جنوب میں جو قلعہ بیت کہلاتا ھے، اغلب یہی ھے کہ انھیں کے نام پر ھوگا۔ اس قبیلے میں بعض مشہور آدمی بھی پیدا ھوے۔ دِدہ قُور قُود اور فضولی اسی قبیلے سے تھے۔ حسن بن محمود بیاتی، مصنّف جام جَم آئین، جو عثمانی شہزادہ جم سے معنون ھے، اسی بیت قبیلے سے تھا، جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاھر ھے۔

مآخذ: (۱) فاروق سمَر Faruk Sumer: *Bayatlar*، در *Türk Dili ve Edebiyati Dergisi*، استانبول ۱۹۵۲ء، ۴/۴: ۳۷۳ تا ۳۹۸۔

(Faruk Sumer)

* **بَیْت**: جاے رھائش کے لیے عام [عربی] لفظ، جو خانہ‌بدوشوں کے خیمے کے لیے بھی استعمال ھوتا ھے اور مستقل مکینوں کے (پتھر، لکڑی یا اینٹ کے) مکانوں کے لیے بھی۔ بعض اوقات یہ مقدس مقام یا حرم کے لیے بھی استعمال ھوتا ھے، چنانچہ عربی میں الف لام کے اضافے کے ساتھ (البیت) اس کا اطلاق مکّۂ معظّمہ کے بیت‌اللہ کے لیے بھی ھوتا ھے، جسے احترام کے طور پر البیت الحرام (مقدس گھر) یا البیت العتیق (قدیم اور مقدس گھر) بھی

کہتے ہیں ۔ ایسے جغرافیائی نام بھی عام ہیں جن کے شروع میں بیت آتا ہے ۔ شامی فلسطینی ناموں میں ''بیت'' کے سابقے کو محض ''ب'' تک محدود کر دیا گیا ہے، جو آرامی (شامی) ''بی'' (Bē) سے مشتق ہے، لیکن انجیلی عبرانی میں اس کی جو متعدد مثالیں (''بیشان'' Bē-Shān وغیرہ) ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کنعانی زبان سے بھی مشتق ہو سکتا ہے ۔

عرب علمائے لغت نے جو تعریفات کی ہیں ان میں اس اصطلاح کو ہمیشہ اوسط رقبے کے ایسے گھر کے لیے مخصوص سمجھا گیا ہے جو ایک خاندان کے لیے موزوں ہو ۔ اس لفظ میں ''خاندان'' کا مفہوم تمام سامی زبانوں میں واضح طور پر ملتا ہے ۔ [خاندان نبوی کی بحث کے لیے رک بہ اھل البیت ۔ بیت کا لفظ قبیلے کے لیے استعمال نہیں ہوتا ۔ بیت کی جمع بیوت اور جمع الجمع بیوتات ہے ۔ بیوتات بالخصوص بہت معزز گھرانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے] ۔

(J. LECERF)

* **بَیْت** : رک بہ عروض .

⊗ **بیت اللہ** : رک بہ کعبہ .

* **بَیْت جِبْرِیْن** : (جسے بعض اوقات بیت جبریل بھی کہا جاتا ہے) شفلۃ کا ایک بڑا فلسطینی گاؤں، جو یہوذیہ کے چونے کے پہاڑوں اور ساحلی میدان کی سرحدوں پر بیت المقدس کے جنوب مغرب میں ۲۸۷ میٹر کی بلندی پر ایک ایسے خطے میں واقع ہے جہاں شکار اور آثار قدیمہ بکثرت ہیں اور اس لیے یہ ہمیشہ عرب مصنفین کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے ۔ جوزیفس Josephus نے اسے ادومیہ Idumaea کا ایک گاؤں قرار دیتے ہوئے اس کا ذکر بیغبری Begabri کے نام سے کیا ہے ۔ بطلمیوس [رک باں] اور *Tabula Peutingeriana* نے اسے بیتوغبری Betogabri [= بیت جبری] کے نام سے موسوم کیا اور اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ شہر مریشہ (مَرِسَّہ) کا قائم مقام ہے، جس کا ذکر عہد نامۂ عتیق میں اکثر ملتا ہے، جو پارتھیوں کے ہاتھوں ۴۰ ق ۔ م میں برباد ہو گیا تھا اور جس کے محل وقوع کی تصدیق آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے ہو گئی ہے ۔ اس کا دوسرا نام ''مدینۃ اصحاب الکہف'' ہے، جو اس کے اصلی باشندوں حریتوں (Hurrites) کا دیا ہوا ہے، جو ادوم سے پسپا ہونے سے پہلے اس خطے پر قابض تھے اور جن کا نام قریب قریب ''اصحاب الکہف'' کے مترادف تھا ۔ Septimus Severus نے ۲۰۰ء میں جب اس علاقے کی صحیح نشاندہی کی تو الفاظ کے ہیر پھیر سے یونانی زبان میں اس شہر کے نام کا ترجمہ مدینۃ الاحرار کیا گیا ۔ ازمنۂ وسطٰی میں اسے اس کا اصلی نام دوبارہ ملا جو تالمودی تحریرات میں بیت جُبرُن (Beth Gubrin) کی صورت میں ملتا ہے اور جسے صلیبی مبارزوں نے توڑ مڑوڑ کر بتھ گبرم، بتھگبلن یا گبلن بنا دیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عربی ''جبرین'' (جبّارین) کے لفظوں میں ابہام پیدا کر کے اسے اور ''مدینۃ الجنّۃ'' کو ایک سمجھ لیا گیا ۔ ایک حدیث کی رو سے، جسے الھروی نے روایت کیا ہے، (حضرت) موسیٰؑ کے اس قصے کی جائے وقوع اسی مقام کو بتایا گیا ہے جو قرآن مجید (۵ [المائدۃ] : ۲۱ تا ۲۶) میں بیان ہوا ہے ۔

مدینۃ الاحرار، جس کا اپنا سکّہ تھا اور جس کا ایک بڑے وسیع خطے پر تسلّط تھا، قدیم زمانے میں بڑا ہی خوش حال علاقہ تھا، جیسا کہ رومی اور بوزنطی مرصّع مرقعوں (Mosaics) سے، جو حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں، ثابت ہو چکا ہے ۔ باوجودیکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں عمرو بن العاص کی فتح کے بعد

بھی یہ شہر بدستور اَجناد فلسطین کے اندر ایک ضلع کا دارالحکومت اور بیت المقدس و غزّہ کی درمیانی شاہراہ پر ایک تجارتی مقام بنا رہا۔ عربوں کے زمانے میں اس کی اہمیت کم ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خطّے میں جہاں الیعقوبی کی رُو سے زیادہ‌تر قبیلۂ جذام کے لوگ [رک بآں] ھی آباد تھے ایک شدید لڑائی ہوئی تھی اور مارسابا کے ایک راہب سٹیفن Stephen کے بیان کے مطابق مدینۃ الاحرار ۷۹۶ء میں عرب قبائل کی ایک باھمی جنگ میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا تھا (Fr. Buhl)۔ یہ روایت ایسی ہے کہ اسے تسلیم تو ضرور کر لینا چاھیے، لیکن قدرے احتیاط کے ساتھ۔ اس کے کچھ ھی مدّت بعد اَلْمَقْدِسی بیت جبرین کا ذکر ضلع داروم [رک بآں] کے ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس کے محل وقوع کی عسکری اھمیت پر زور دیتا ہے جو صلیبی مبارزوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ ۱۱۳۴ء کے قریب صلیبی مبارزوں نے پہلے تو اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا اور پھر وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا جو عسکری راھبوں (Knights Hospitallers) کی نگرانی میں دے دیا گیا تاکہ مصر کی جانب مملکت بیت المقدس کی سرحد کی حفاظت اور مسلمانوں کے ان حملوں کی روک تھام ہو سکے جو زیادہ‌تر عسقلان [رک بآں] کی سمت سے ہوا کرتے تھے۔ جب سلطان صلاح الدین نے ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اسے دوبارہ فتح کیا تو کچھ نقصانات کے باوجود بھی یہ عہد مملوک میں قلعہ‌بند قصبہ تھا اور براہ‌راست صوبۂ دمشق کے ساحلی سرحدی علاقے میں ضلع غزہ کے نائب کے تابع تھا۔

مآخذ: (۱) F. M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء، خصوصاً ۲: ۲۷۲ (بذیل مادّۂ Beth Gubrin) اور ۳۷۹ (بذیل مادّۂ مریشہ)؛ (۲) Stephanus: *Acta Sanctorum Martyrum*، ۳: ۱۶۷۹؛ (۳) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۱۲؛ (۴) A. S. Marmardji: *Textes Géographiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ۲۲ تا ۲۳؛ (۵) Caetani: *Annali*، بامداد اشاریہ (۲: ۱۲۸۹ و ۳: ۴۳)؛ (۶) البلاذری: فتوح، ص ۱۳۸؛ (۷) طبری، بامداد اشاریہ؛ (۸) ابن الاثیر، خصوصاً ۹: ۳۶۱؛ (۹) *Hist. Or. Cr.*، بامداد اشاریہ؛ (۱۰) *BGA*، بامداد اشاریہ؛ (۱۱) الھروی: کتاب الزیارات، مرتبۂ Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۳۲ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۷۴ تا ۷۵)؛ (۱۲) یاقوت، ۱: ۷۷۶؛ (۱۳) R. Grousset: *Hist. des Croisades*، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بامداد اشاریہ، خصوصاً ۲: ۱۵۷ تا ۱۵۸؛ (۱۴) M. Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie a l' epoque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۵۰۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بیتُ الجَوزۃ: رک بہ علم نجوم۔

البیتُ الحرام: رک بہ مسجد و المسجد الحرام۔

بیتُ الحکمۃ: ایک علمی ادارہ، جس کی بنیاد خلیفہ المامون نے جندے سابور کی قدیم درسگاہ کی طرز پر بغداد میں رکھی تھی۔ اس کا بنیادی کام یہ تھا کہ ان فلسفیانہ اور علمی تصانیف کا یونانی سے ترجمہ کیا جائے جنھیں ایک روایت کی رو سے خلیفہ کا بھیجا ہوا ایک وفد مُلک روم سے لایا تھا۔ اس ادارے کے ناظم سھل بن ھارون اور سَلْم تھے اور سعید بن ھارون ان کا معاون تھا۔ ان کے علاوہ یہاں کا عملہ مترجمین کی ایک اھم جماعت، جن میں مشھورترین بنوالمنجم تھے؛ نیز خوشنویسوں اور جلدسازوں پر مشتمل تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کتب خانے، جنھیں اکثر خزینۃ الحکمۃ بھی کہتے تھے، قبل ازیں ھارون الرشید اور برامکہ [رک بآں] کے زمانے میں بھی

موجود تھے جنھوں نے یونانی علوم کا ترجمہ شروع کیا تھا ۔ مامون نے محض اس تحریک میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کی جس کا مقصد اسلامی فکریات کا فروغ تھا (رک به غربیه مادہ ب سوم ۱) .

اس ادارے سے فلکیات کی رصدگاہیں (مراصد) بھی ملحق تھیں، ان میں سے ایک بغداد میں اور دوسری دمشق میں قائم کی گئی، جہاں مسلم علما نے بطلمیوس [رک بآں] کی تیار کردہ قدیم تقویم کی تصحیح کی اور خاص طور پر نئی تقاویم (= زیج [رک بآں]) ایجاد کیں.

المتوکّل کے زمانے میں جو نیا ردِّ عمل ہوا تھا اس کی وجہ سے بیت الحکمة کے وجود کی اصلی صورت باقی نہ رہی، اگرچہ بعد ازاں عراق میں تیسری صدی ھجری/نویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سے علمی کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے جو مختلف افراد کی ذاتی کوششوں کے مرھونِ منّت تھے ۔ علاوہ ازیں اس امر کا بھی پتا چلتا ہے کہ المعتضد نے ایسے کئی علما کے کام کی ھمت افزائی کی جنھیں اس نے اپنے محل میں مقرر کر رکھا تھا ۔ آگے چل کر صرف فاطمیوں نے اس قسم کے سرکاری اداروں کی بنیاد رکھی جن میں سے اھم‌ترین وہ دارالحکمة تھا جسے الحاکم نے ۳۹۵ھ / ۱۰۰۵ء میں قائم کیا تھا.

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۵، ۱۰، ۲۱، ۱۲۰، ۱۳۳، ۲۳۳، ۲۷۳؛ (۲) یاقوت: ارشاد، ۳: ۲۵۸ تا ۲۵۹، ۵: ۶۶ تا ۶۸؛ (۳) القفطی، طبع Lippert، ص ۲۹ تا ۳۰، ۹۷ تا ۹۸؛ (۴) ا ۔ ف الرّفاعی: عصرالمأمون، قاھرہ ۱۹۲۸ء، ۱: ۳۷۵ تا ۳۷۶؛ (۵) O. Pinto: *Le biblioteche degli Arabi nell, eta degli Abbassidi*، فلورنس ۱۹۲۸ء، ص ۱۲ تا ۱۳؛ (۶) ک ۔ عوّاد: خزائن کتب العراق العامّة، در سمر، ج ۲ / ۲، ۱۹۳۶ء: ص ۲۱۳ تا ۲۱۸؛ [(۷) R. Briffault: *The Making of Humanity*، لنڈن ۱۹۱۹ء، باب ۵، Dar Al-Hikmet (دارالحکمة): ص ۱۸۳ تا ۲۰۲].

(D. Sourdel)

بیتُ الدِّین: رک به بِتِدِّین.

بَیْت رَاس: مشرق اردن میں ایک گاؤں، جس کا ذکر عرب جغرافیہ دانوں نے بھی کیا ہے ۔ یہ گاؤں عجلون [رک بآں] کے ضلع میں اربد سے تقریباً تین کیلومیٹر شمال میں پانچ سو نواسی میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور چاروں طرف سے ان کھنڈروں سے گھرا ھوا ہے جو قدیم کیپی‌تولیا Capitolia کے ویران شدہ محلِّ وقوع کی نشان دھی کرتے ھیں ۔ ڈیکاپولس Decapolis کا یہ شہر، جس کا نام اس کے عربی نام سے ملتا ہے، جو اس کے بعد بھی قائم ہے اور بلاشبہہ کم پہاڑی علاقے میں اس کی نہایت نمایاں حیثیت کو ظاھر کرتا ہے ۔ قدیم سفرناموں میں اس کا ذکر اَذْرِعات (ذرع)، آبله (تلّ ابل) اور گدرا (امّ کایه) کے مقامات کے ساتھ آیا ہے، جو اس کے آس پاس آباد تھے ۔ پہلے یہ گاؤں نبطیوں کے قبضے میں تھا ۔ رومنوں کے عہد میں اس کی اھمیت بہت بڑھ گئی ۔ عرب فتوحات کے آغاز میں شرحبیل بن حسنه نے اس پر قبضہ کر کے اسے اجناد اردن میں شامل کر لیا ۔ بنو امیّه کے دورِ حکومت میں بھی اسے خاص شہرت حاصل تھی اور اس کی تصدیق شاعروں اورسوانح نگاروں کے بہت سے تذکروں سے ھوتی ہے ۔ بعض شاعروں نے یہاں کی شراب کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے، قبّ یاقوت، بذیل مادّہ ۔ جب اُموی فرمانرواؤں نے البلقاء [رک بآں] کے علاقے میں رھنا شروع کر دیا، جہاں آثار قدیمه کی کثرت ہے اور جنھیں انھیں فرمانرواؤں سے منسوب کیا گیا ہے تو اس کی شہرت میں نہایت تیزی سے کمی آنی شروع ھو گئی، اور جگہ بالکل خالی اور ویران ھوگئی؛ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کھنڈروں کو جو اس وقت تک موجود ھیں، اور جن کا سیّاحوں نے ذکر بھی کیا ہے کبھی سنجیدگی

سے تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا کہ اس کی قدیم عمارتوں کے درمیان بنو امیّہ کے کسی مستقر کے نشانات کا سراغ مل سکتا۔

مآخذ: (۱) F. M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ - ۱۹۳۸ء، ۲: ۲۹۴ تا ۲۹۵ (بذیل مادّۂ Capitolias)؛ (۲) G. Schumacher: *Northern ʿAjlun*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۱۵۴ تا ۱۶۸؛ (۳) G. Schumacher و G. Steuernagel: *Der ʿAdschlun*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ۴۷۸ ببعد؛ (۴) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ۳۲، ۴۱۵؛ (۵) A. S. Marmardji: *Textes géographiques arabes sur la Palestine*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۴، ۱۶، ۲۳؛ (۶) Caetani: *Annali*، ۲: ۱۱۲۶ (سال ۱۲ ہجری)، ۳: ۳۹۶ (سال ۱۵ ہجری)؛ (۷) H. Lammens: *Études sur la siecle des Omeyyades*، بیروت ۱۹۳۰ء، ۱۷۱، ۲۱۳، ۲۵۳؛ (۸) النابغة الذبیانی: دیوان، مرتّبۂ Dérenbourg، ص ۲۶، ۱۶۵ تا ۱۶۶؛ (۹) البلاذری: فتوح، ص ۱۱۶؛ (۱۰) ابن خُرْدَاذبہ، ص ۷۸؛ (۱۱) البکری [: معجم ما استعجم]، ۱: ۱۸۹؛ (۱۲) یاقوت، ۱: ۲۰۰، ۷۷۶ تا ۷۷۷۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

* **بَیْتُ الْفَقِیْہ**: (یعنی فقیہ کا گھر)، دس ہزار آبادی کا ایک شہر، جو تِہامۃ الیمن میں ۱۴ درجے ۳۰ ثانیے شمال، ۴۳ درجے، ۱۶ ثانیے مشرق میں واقع ہے۔ اس شہر کو بیت الفقیہ ابن عُجَیل سے، جو ایک فقیہ کے نام سے موسوم ہے اور جس کے مقبرے کے گرد یہ شہر آباد ہے، زیدیّہ یا بیت الفقیہ الکبیر سے، جو شمال میں باجِل کے قریب واقع ہے، ممیّز کرنے کے لیے بیت الفقیہ الصغیر بھی کہا جاتا ہے۔ نیز مشہور ولی الفقیہ ابن عجیل [م ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء] کی نسبت سے، جس کے مقبرے کے گرد یہ شہر آباد ہے، اسے بیت الفقیہ ابن عجیل کہتے ہیں۔ یہ شہر ۱۹۴۳ء میں بیت الفقیہ کی قضا (دائرۂ اختیارات عدالتی) کا صدر مقام تھا، جو الحُدَیدہ کے صوبے (لواء) میں چار ضلعوں (ناحیات) پر مشتمل تھا اور وہ چار ضلعے یا ناحیات یہ ہیں: ناحیّۃ لِجان، ناحیۃ الحسینیّہ، ناحیۃ بنی سعید اور ناحیۃ بیت الفقیہ۔ ان میں سے ہر ایک پر ایک عامل حکومت کرتا تھا جو اگر سیّد نہ ہوتا تو اسے ''قاضی'' کے رسمی لقب سے یاد کرتے تھے۔ الحدیدۃ کا صوبہ کسی شہزادے کے زیرنگیں ہوتا تھا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے کی تاریخ میں شہر بیت الفقیہ کا تاریخی ربط قبیلۂ اَزْد کی اس ہجرت سے وابستہ کیا جا سکتا ہے جو مارِب کا بند ٹوٹنے کے بعد پیش آئی تھی۔ ایک روایت سے پتا چلتا ہے کہ قبیلۂ [ازد] چشمۂ غسّان کے قریب، جو غالباً وادی رِمع اور وادی زَبِید کے درمیان واقع ہے، عارضی طور پر آباد ہو گیا تھا۔ بعد ازاں قبیلۂ ازد کا ایک گروہ شامی سرحدوں کی طرف کوچ کر گیا اور وہاں ریاست غسّان قائم کی۔ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطّوطہ مقبرۂ ابن عُجَیل کے قریب غسّانہ نام کے ایک گاؤں کا ذکر کرتا ہے، لیکن آج کل وہاں اس نام کا کوئی گاؤں موجود نہیں۔ قدیم عرب جغرافیہ‌نگار نہ غسّانہ کا ذکر کرتے ہیں نہ بیت الفقیہ کا، [البتہ عین (= چشمۂ) غسّان کا ذکر موجود ہے]۔ بیت الفقیہ کا موجودہ گاؤں، فقیہ ابوالعبّاس احمد بن موسٰی بن علی بن عمر بن عُجَیل کی وفات (۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء) کے فوراً بعد ہی اس کی قبر کے زائرین اور کرامات کی وجہ سے وجود میں آیا ہو، جو ان کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں بندرگاہ موشہ کے لیے قہوے کا مرکز ہونے کے باعث اس شہر کی خوش‌حالی زیادہ ہو گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک گماشتے رونگٹن Revington نے ۱۶۵۹ء میں وہاں ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران میں امام یمن موشہ اور بیت الفقیہ سے مجموعی طور پر ڈیڑھ ہزار پونڈ ماہوار مالیہ لیا کرتے تھے اور یہ رقم ہندوستانی جہازرانی کے مہینوں میں بڑھ جاتی تھی - ہملٹن کا اندازہ ہے کہ بیت الفقیہ میں قہوے کی سالانہ فروخت بائیس ہزار ٹن تھی، لیکن اسی زمانے میں لنکا اور نصف کرۂ مغربی میں قہوے کی کاشت کی ترقی کے سبب یمنی تجارت میں زوال آیا اور بیت الفقیہ نے جنوبی عرب میں پر آشوب سیاسی حالات کے دوران میں پھر اپنی صوبائی علمی زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز کیا.

اس خطّے کی غیر مستقل اور بدلتی ہوئی حالت کی ذمّےداری زیادہتر قبیلۂ الزرانق کی وہ جزوی آزادی ہے جس کا مرکز بیت الفقیہ ہے - اپنی دس ہزار کی جنگی قوت کے باعث اس قبیلے نے ایک مدت تک کسی حکومت کے نظم و ضبط کی پابندی قبول نہیں کی - یہاں تک کہ ۱۹۰۳ء میں اس کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ اس نے عثمانی پیدل فوج سے راہ عبور کرنے کا محصول وصول کیا اور ۱۹۲۷ء میں اس نے امام کی بھیجی ہوئی ایک تعزیری فوج کے ایک ایک آدمی کو تہ تیغ کر دیا.

مآخذ: (۱) الہمدانی؛ (۲) ابن بطوطہ: *Voyages d'Ibn Batoutah*، ترتیب و ترجمہ از Defrémery و Sanguinetti، پیرس ۱۸۹۳ء؛ (۳) الخزرجی: *History of the Resuli Dynasty of Yemen*، طبع و ترجمہ از J.W. Redhouse، لائڈن و لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۴) عمارۃ: *Yaman, its early mediaeval history*، طبع و ترجمہ H. C. Kay، لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۵) یاقوت؛ (۶) *Western Arabia and the Red Sea* : Admiralty، آوکسفرڈ ۱۹۴۶ء؛ (۷) *Arabia Infelix*: G. W. Bury، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۸) *The English Factories in India, 1655-1660*: W. Foster، آوکسفرڈ ۱۹۲۱ء؛ (۹) *A New Account of the East Indies* : A. Hamilton، ایڈنبرا ۱۷۲۷ء؛ (۱۰) *A Journey Through the Yemen* : W. B. Harris، ایڈنبرا و لنڈن ۱۸۹۳ء؛ (۱۱) G. Heyworth-Dunne : الیمن، قاہرہ ۱۹۵۲ء.

(R. L. HEADLEY)

* **بَیْتُ لَحْم**: فلسطین کا ایک بہت بڑا گاؤں اور مشہور و معروف زیارتگاہ، جو جودیہ کے چونے والے پہاڑوں کے درمیان بیتُ المَقْدِس سے تقریباً دس کیلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے آٹھ سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور بائیبل کے قدیم بیث لحم Bethlehem سے مطابقت رکھتا ہے - چوتھی صدی عیسوی سے برابر وہ مسیحیوں کی زیارتگاہ ہے اور آگے چل کر یہ جگہ حضرت عیسی بن مریمؑ [رک بآں] کا مولد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی نظر میں بھی مقدس اور محترم بن گئی - عرب جغرافیہنویسوں نے بھی اس واقعے کا ذکر بلا استثنا کیا ہے اور اکثر اس بوزنطینی محل (جو قسطنطین نے ۳۲۵ء میں تعمیر کیا اور ۵۲۵ء میں جستینین نے اسے از سر نو درست کرایا) کی جو وہاں تعمیر کیا گیا تھا، نہایت تعریف کی ہے - انھوں نے کھجور کے درخت کا، جس کا ذکر قرآن پاک (۱۹ [مریم]: ۲۳، ۲۵) میں آیا ہے، نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی ان قبور کا بھی برابر ذکر کیا ہے جن کی نشان دہی عیسائی روایت حضرت مسیح علیہ السلام کے غار میں کر چکے تھے اور امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ کی محراب کا بھی جو روایت کے مطابق وہ مقام ہے جہاں خلیفۂ ثانیؓ نے فتح فلسطین کے بعد، اس طرف سے گزرتے وقت نمازا ادا کی تھی، لیکن بیت لحم کو مذہبی نقطۂ نظر سے جو شہرت حاصل ہے اس کے با جود بھی وہ اتنی اہمیت حاصل نہ کر سکا -

اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المقدس کے بہت قریب ہے ۔ پہلی صلیبی جنگوں میں جرمنوں نے اس کے الحاق کے بعد اس کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی اور ۴۹۳ھ / ۱۰۹۹ء میں یہاں ایک قلعہ بنایا اور پھر ۱۱۱۰ء میں یہاں ایک مسیحی مرکز بنانے کی اجازت حاصل کی ۔ اس زمانے میں اس گاؤں میں زندگی کی ایک ھلکی سی لہر پیدا ہوئی اور ختم ہو گئی ۔ ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں [سلطان] صلاح الدین [ایوبی؟] نے فلسطین کو از سرِ نو فتح کرنے کے بعد اس گاؤں پر قبضہ کر لیا ۔ اس وقت یہ گاؤں یافا کی ھنگامی واپسی کے اس معاھدے میں شامل تھا جو الملک الکامل اور فریڈرک دوم کے درمیان ھوا تھا ۔ اس وقت سے برابر اس شہر پر مردنی سی چھائی رھی، لیکن یہاں کی عیسائی آبادی اور مغرب کے باھمی روابط و تعلقات کے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جانے کی وجہ سے اسے وہ حیثیت حاصل ہوگئی جو آج کل ھے، یعنی یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ھے جس میں مسلمانوں کی ایک بے اثر اقلیت رھتی ھے ۔ ۱۸۳۴ء میں ابراھیم پاشا [رک باں] کے خلاف بغاوت کرنے کے بعد مسلمان جس قدر جور و تشدد کا ھدف رھے اس کے بعد سے ان کی حالت پھر کبھی نہیں سنبھلی ۔ یہاں مذھبی ادارے اور جدید قسم کے مکانات کثرت سے ھیں، جو مشہور قلعے کے گرد ایک نصف دائرے کی شکل میں پہاڑی کی ایک جانب بلندی پر ایک خاص ترتیب سے بنے ہوئے ھیں ۔ اس جگہ کی اثری اھمیت کا ذکر ھم ابھی کر چکے ھیں، چنانچہ اسی بنا پر اصلاح اور تجدید کے نقطۂ نظر سے یہ توجہ کا مرکز رھا ھے، یہاں تک کہ صرف مرکزی حصّے کی قدیم نظم و ترتیب اور ستونوں کی چار قطاریں تو جوں کی توں باقی رہ گئی ھیں لیکن باقی حصّوں میں خاصی تبدیلی پیدا ہوگئی ھے، خصوصاً نقش و نگار اور آرائش و زیبائش میں جس سے اس سلسلے میں بڑی بیش قیمت شہادت ملتی ھے کہ پچی کاری اور میناکاری کے فن نے قرونِ وسطٰی میں کس طرح ارتقائی منزلیں طے کیں.

مآخذ: F. M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء، بالخصوص ۲: ۲۷۶ (بذیل مادۂ Bethléem)؛ (۲) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۲۹۸ تا ۳۰۰؛ (۳) A. S. Marmardji: *Textes Géographiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۲۴ تا ۲۶؛ (۴) Caetani: *Annali*، بامداد اشاریہ (۶: ۳۲)؛ (۵) *BGA*، بامداد اشاریہ؛ (۶) الهروی [: کتاب الزّیارات]، طبع Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۲۹ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ۶۹ تا ۷۰)؛ (۷) یاقوت، ۱: ۷۷۹؛ (۸) ابن الاثیر، بالخصوص ۱۱: ۳۶۱؛ (۹) R. Grousset: *Hist. des Croisades*، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بامداد اشاریہ؛ (۱۰) Vincent اور Abel: *Le Sanctuaire de la Nativité*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۱۱) H. Stern: *Les représentations des conciles dans l'église de la Nativité a Bethléem*، در *Byzantion*، ۱۱ (۱۹۳۶ء): ۱۰۱ تا ۱۵۲، ۱۳ (۱۹۳۸ء): ۴۱۷ تا ۴۵۹ اور *Nouvelles recherches sur les représentations*، در *Cahiers archéologiques*، ۳ (۱۹۴۸ء): ۸۲ تا ۱۰۵ ۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بیتُ المال: (لغوی معنی مال یا دولت کا گھر)، مگر شرعی اصطلاح میں اس کے معنی کسی مسلم ریاست کے ''خزانے'' کے ھیں ۔

۱ - **قانونی حیثیت:** [آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کے زمانے سے بیت المال کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا، یعنی جب اور جتنا مال غنیمت، چندے یا صدقات وغیرہ آتے آپؐ اپنے صحابہؓ کرام میں تقسیم فرما دیتے ۔ عہدِ نبوی میں مال جمع کرنے کی نوبت ھی نہ آتی تھی، لہٰذا اس کے لیے کوئی الگ

مکان نہ بنایا گیا، بلکہ سب کچھ مسجد نبوی میں ڈھیر کر دیا جاتا اور مستحق لوگوں کو دے دیا جاتا؛ یہی صورت عہد صدیقی میں رہی۔ باضابطہ بیت المال حضرت عمرؓ کے زمانے میں وجود میں آیا۔] حضرت بلالؓ اور ان کے رفقا نے حضرت عمرؓ ابن الخطاب سے کہا کہ عراق اور شام سے آئے ہوئے مال غنیمت کو تقسیم فرما دیجیے جس طرح دوسرا مال غنیمت تقسیم ہوتا ہے، بالکل اسی طرح زمینیں ان لوگوں کو دے دیجیے جنھوں نے انھیں فتح کیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالٰی نے ان کی زمینوں میں ان لوگوں کا حصہ بھی رکھا ہے جو ان فاتحین کے بعد آئیں گے (کتاب الخراج، ص ۲۳؛ *Le Livre de l'Import Foncier*، ص ۳۷)۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے میں یہ حقیقت پوشیدہ تھی کہ عمومی ملکیت اور انفرادی ملکیت دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں، اور اموال اور جاگیروں کا مقصد بحیثیت مجموعی قومی مفاد کا تحفظ ہے۔ جب بیس ہجری میں ''دیوان'' [رک بآں] کا ادارہ یا محکمہ بھی اس میں شامل ہو گیا تو اس سے بیت المال کا ایک نیا مفہوم، یعنی سرکاری خزانے کا تصور پیدا ہوا۔ قبل ازیں بیت المال کا لفظ اس محفوظ جگہ یا مقام کے لیے بولا جاتا تھا جہاں اموال یا اسباب کو انفرادی مالکوں یا حقداروں کے درمیان تقسیم کرنے سے پہلے عارضی طور پر رکھا جاتا تھا (دیکھیے Tyan : *Institutions du Droit Public Musulman*، ۱ : ۲۱۶)۔

نظم و نسق: تمام سرکاری عہدےداروں کو ان کے اختیارات امام (جو ''بیت المال'' کا رئیس بھی ہوتا تھا) کی طرف سے تفویض ہوتے تھے۔ اہل السنۃ و الجماعۃ کے نزدیک امام کے یہ اختیارات بحیثیت امام جماعت کے ہوتے ہیں، کسی ذاتی [ترجیحی] یا شخصی اقتدار و اختیار [کا نتیجہ نہیں ہوتے اور ان دونوں کے] درمیان واضح اور سخت حدّ فاصل قائم ہے (دیکھیے Tyan، کتاب مذکور، ۱ : ۳۹۱ ببعد و ۲ : ۱۹۵؛ نیز عملی حیثیت کے لیے Mez : *Renaissance*، ص ۱۱۳ تا ۱۱۶؛ انگریزی ترجمہ، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲)۔ یہ امتیاز شیعہ قانون میں اس حد تک موجود نہیں؛ بعض قسم کی جاگیروں کا حق ملکیت جو اہل السنت کے نزدیک پوری قوم کے لیے مخصوص ہے [شیعہ کے نزدیک] مُلہَم من اللہ ہونے کی حیثیت سے امام کو حاصل ہوتا ہے (دیکھیے Querry : *Droit Musulman*، ۱ : ۱۷۸، ۳۳۷؛ Baillie : *Imameea Code*، ص ۱۶۲)۔

ریاست کے محاصل کی وصولی اور تقسیم کا ذمّےدار ''صاحب بیت المال'' ہوتا تھا، جو ان تمام عہدےداروں کا سربراہ اور نگران ہوتا تھا جن کے سپرد ریاست کے مداخل کے ان مختلف صیغوں کی ذمّےداری ہوتی تھی جن کی تفصیل نیچے دی گئی ہے۔ اس قسم کے تقررات کے لیے مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عادل ہونا [رک بہ عدل] اور قابل ہونا ضروری شرائط ہیں۔ مزید برآں ان عہدوں کے لیے جہاں عہدےدار کو لگان کی تشخیص یا مصارف کے اختیارات تمیزی حاصل ہوں وہاں اجتہاد [رک بآں] کا وصف بھی ناگزیر ہے۔ ماتحت اہلکار جو وصولی یا حوالگی پر مامور کیے جائیں غلام یا ذمّی بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا معاملہ اپنے ہی ہم مذہبوں کے ساتھ ہو۔ بیت المال کے کاغذات اور حساب کتاب کے کھاتے ایک خاص انتظامی صیغے کی تحویل میں ہوتے تھے جو ''کاتب الدیوان'' کے زیر نگرانی کام کرتا تھا۔ اس منصب پر کام کرنے والے کے لیے عدالت اور پیشہ ورانہ مہارت دو ضروری اوصاف تھے۔

اس ڈھانچے کے اندر رہ کر مختلف عہدوں

کی نوعیت اور ان کے کام کی حدود کا فیصلہ امام کے ذاتی اختیار اور صوابدید پر منحصر تھا۔ شریعت نے عام نوعیت کے عہدوں اور مخصوص منصبوں [پر تقرر یا ان کے لیے ضروری اوصاف کے بارے] میں [تفصیلی] تشریح نہیں کی (ابن فرحون: تبصرة الحکّام، ۲: ۱۴۱، ۱۵۸).

محاصل کے ذرائع: ریاست کے تمام محاصل خزانۂ عامرہ کی املاک (یا حقوق بیت المال) نہیں ہوتے۔ اس مؤخرالذکر کے ضمن میں وہ اموال آتے ہیں جو بحیثیت مجموعی تمام امت کی ملکیت ہوں۔ انھیں کسی مقصد پر صرف کرنے کا اختیار بھی امام یا اس کے مقرر کیے ہوے نمائندے کو حاصل تھا.

یوں گویا [مال] غنیمت [رک بآں] کا وہ حصّہ جو بیت المال کے حصّوں میں سے ایک ہے ''خُمس'' ہے (اس اصطلاح کے ضمن میں کانوں سے نکلا ہوا مال و اسباب اور دفائن اراضی پر لگان یا محصول شامل ہے)، جو اللہ اور اس کے رسول کا حصّہ ہے اور جو تمام امت کے مجموعی مفاد کی خاطر صرف کیا جائے گا۔ اس خُمس کے بقیہ حصّے کے لیے خاص گروہ مخصوص ہیں۔ آلِ رسول[؟]، یتامٰی، مساکین اور مسافر اور یہ اس لحاظ سے گویا امام کی مرضی یا صوابدید پر موقوف نہیں۔ اسی طرح صدقہ یا زکوٰة [رک بآں] سے وصول شدہ رقوم امت کے خاص خاص گروہوں کے لیے مخصوص ہیں اور اگرچہ مالِ غنیمت کی طرح یہ اموال بھی خزانے کے عہدےداروں کی نگرانی میں رکھے جا سکتے ہیں یا خزانے کی عمارت میں اس وقت تک بغرض حفاظت رکھے جا سکتے ہیں جب تک ان اموال کے مخصوص حقداروں (حصہ داروں) کا تعیّن نہ ہو جائے۔ ان اموال کے مالک ان کی ادائی کے وقت سے وهی لوگ ہوتے ہیں جو اس کے مستحق لینے والے ہیں، بیت المال اس کا مالک نہیں۔ حنفی فقہا بھی، جن کے نزدیک امام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے صدقے کی رقم محض کسی ایک یا اس سے زیادہ گروہوں میں تقسیم کر دے اور دوسروں کو اس میں سے کچھ نہ دے، مال الصدقہ اور مال المسلمین میں واضح امتیاز اور فرق کرتے ہیں (دیکھیے کتاب الخراج، ص ۸۰، ۱۴۹، ۱۸۷)۔ بیت المال کے ابتدائی ذرائع آمدنی گویا صرف وہ محاصل ٹھیرے جنھیں مجموعی طور پر فَیْء کہا جاتا ہے، یعنی خراج [رک بآں]، اور جزیہ [رک بآں]۔ عُشر [رک بآں] کے محصول کی کیفیت کچھ مبہم سی ہے۔ بعض فقہا اسے فَیْء ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے اسے ''صَدَقہ'' کہتے ہیں، اور ایک اَور گروہ کے نزدیک اگر اس کے ادا کنندگان مسلمان ہوں تو اسے ''صَدَقہ'' کہا جائے گا اور اگر یہ غیر مسلموں سے ملے تو اسے ''فَیْء'' کہیں گے.

آمدنی کے دوسرے ضمنی ذرائع میں مندرجۂ ذیل مدّات شامل ہیں:

۱۔ ایسی جائداد جس کے مالک کا علم نہ ہو، مثلاً مفرور غلام جب وہ پکڑ لیے جائیں یا وہ مال جو گرفتار شدہ قزّاقوں اور چوروں کے پاس سے نکلے۔ اگر جائداد منقولہ ہو تو اس کی فروخت سے وصول شدہ رقم اور اگر غیر منقولہ ہو تو اس سے حاصل کیا ہوا نفع یا آمدنی بیت المال میں جائے گی.

۲۔ مُرتدّین کی جائداد: اگرچہ فقہا کی بہت بڑی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ مُرتدّین سے حاصل کی ہوئی جملہ جائداد بیت المال کا حصّہ ہے لیکن حنفی فقہا نے اس مسئلے کے متعلق جو آرا ظاہر کی ہیں ان میں اختلاف نمایاں ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس جائداد کا کوئی حصّہ بھی بیت المال میں نہیں جا سکتا اور دوسرے

گروہ کے نزدیک جائداد کا صرف وہ حصّہ بیت المال میں جانا چاہیے جو مرتد نے ارتداد کے بعد پیدا کیا ہے۔

۳ - مرنے والوں کی جائداد ہیں [ترکہ بہ میراث] : مالکی فقہ کی رو سے بیت المال اسی صورت میں مرنے والے کا جائز وارث قرار پائے گا جب اس کے جائز عَصَبہ یا قرآن مجید کی رو سے ایسے وارث باقی نہ رہیں جو اپنے حصص سے متوفّی کی پوری جائداد کو اپنے قبضے میں نہ لے لیں - جب کسی قسم کا کوئی وارث باقی نہ رہے تو جائداد کا کم سے کم دو تہائی سرکاری خزانے میں چلا جائے گا - میّت کی وصیتوں کی مجموعی تعداد جائداد کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہو سکتی - دوسرے مکاتب فقہ کی رائے میں قرآن مجید کی رو سے کسی وارث یا خون کے رشتے کی موجودگی میں سرکاری خزانے کا کوئی حصّہ نہیں ہوگا - حنفی فقہ کی رو سے ایسے وارثوں کی عدم موجودگی کی صورت میں پوری جائداد وصیّت کے ذریعے ہبہ کی جا سکتی ہے - اس صورت میں لاوارث کے مال پر خزانۂ عامرہ کا قبضہ ناجائز اور جابرانہ ہوگا۔

مخارج : الماوردی کے بیان (الاحکام السّلطانیّة، ص ۳۶۷ ببعد) کے مطابق بیت المال پر جو مطالبات واجب ہیں انھیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

۱ - وہ مدّات جن کے متعلق بیت المال کی ذمے داری قطعی اور حتمی ہے - یہ مدّات یا تو ان خدمات کے صلے میں ہیں جو کسی نے ریاست کے لیے انجام دی ہوں، مثلاً شاہی افواج کے وظائف، سلطنت کے عہدے داروں کے مشاہرے، خرید کردہ ساز و سامان کی قیمت، یا وہ اخراجات جن کا برداشت کرنا ریاست کے مخصوص فرائض میں داخل ہے، مثلاً اپنے قیدیوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال - ان مطالبات کی مکمل ادائی بیت المال کے اولین فرائض میں سے ہے اور ان کی ادائی میں تعویق و تاخیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ خزانہ دیوالیہ ہو جائے (جیسے ایک عام مقروض کی صورت میں) - صاحب بیت المال کی صوابدید پر ان مطالبات کی ادائی کے لیے قرضے بھی لیے جا سکتے ہیں۔

۲ - وہ مطالبات جن کی ادائی کی ذمے داری بیت المال پر اس صورت میں عائد ہوتی ہے کہ اس میں پہلی قسم کے اخراجات کے ادا کرنے کے بعد اس میں کافی روپیہ ہو جس سے یہ مطالبات ادا ہو سکیں - یہاں (اس مدّ میں) اخراجات کا تعلق فلاح و بہبود یا مفادِ عامّہ سے ہوتا ہے، مثلاً سڑکوں کی تعمیر و مرمت، پانی کی بہم رسانی، ''خراج'' اراضی کے نقصانات کی تلافی۔

تمام اہم ادائیوں سے فارغ ہو جانے کے بعد جو رقم خزانے میں بچ جائے اس کے متعلق حنفی فقہا کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اسے مستقبل میں پیدا ہونے والی اتفاقی ضروریات کے لیے محفوظ کر لیا جائے جب کہ شافعی فقہا کا موقف یہ ہے کہ اسے بھی عوام کے مفاد کی خاطر فوراً خرچ کر دیا جائے - شریعت عام اصول و قواعد پیش کر دینے کے بعد مفاد عامّہ کی تفصیلی تعیین کے معاملے کو امام کی صوابدید پر چھوڑتی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بیت المال کی رقم کسی ایسے مصرف میں صرف نہیں کی جا سکتی جو شرعاً ناجائز یا حرام ہو، مثلاً جوا، گانا بجانا وغیرہ۔

طریقِ کار: ''دیوان'' کے نظم و نسق کے سلسلے میں (جس کا تجزیہ الماوردی نے کیا ہے الاحکام السّلطانیّة، ص ۳۷۰ تا ۳۷۵) تین اہم قانونی سوال پیدا ہوتے ہیں :

(۱) قانونی ثبوت : اگرچہ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عموماً محض تحریری شہادت کافی نہیں لیکن خزانے کے محکمے میں یہی دستور

ہے کہ سرکاری دستاویزوں اور رجسٹروں کو فیصلے اور تحکیم کی کافی بنیاد سمجھا جاتا ہے ۔ شافعی فقہ تو خاص حقوق (الحقوق الخاصّہ) اور عام حقوق (الحقوق العامّہ) میں واضح امتیاز کرتی ہے اور اس طریق عمل کو صحیح قرار دیتی ہے، لیکن حنفی فقہ کے نزدیک خزانے کی دستاویزات کو صرف اسی صورت میں عمل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے کہ ان کی صحت کی تصدیق زبانی شہادت سے بھی ہو جائے ۔ اسی طرح محاصل کے داخلے یا ادائی کے ثبوت کے لیے مُحصِّل کی تحریری رسید کافی ہے، لیکن قانونی ضابطے کی رو سے یہ ضروری ہے کہ مُحصِّل زبانی اس بات کی شہادت دے کہ یہ دستخط اسی کے ہیں؛ مزید برآں یہ کہ حنفی فقہ کی رُو سے اس قسم کی مصدقہ تحریری رسید کے ساتھ ساتھ زبانی تصدیق بھی ہونی چاہیے ۔ آخری بات یہ کہ خزانے سے رقم وصول کرنے کے لیے تحریری اختیار نامے خزانے کے حساب و کتاب کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں، تاہم فقہا کے نزدیک مستحسن صورت یہ ہے کہ اصلی رسید کے ساتھ ساتھ وصول کنندہ زبانی طور پر بھی اس کا اقرار کرے۔

تنازعات کی صورت میں طریق کار: فریقین کو مدعی اور مدعٰی علیہ کی حیثیت دینے کے اہم اور بنیادی مسئلے میں شریعت کے عملی اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے ۔ مدعی پر قانون کی رو سے ثبوت کی فراہمی کا بار ہے اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو فیصلے کا دارو مدار مدعٰی علیہ کے حلف انکار پر ہوگا، مدعی وہ فریق ہے جس کا دعوٰی قانون کے اس ابتدائی قیاس کے خلاف جاتا ہے جو دعوے سے متعلق ہے ۔ گویا ان تمام مقدمات میں جو دیوان کے عہدےداروں کے سرکاری حسابات کے معائنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں (ان افسروں کے لیے جن کا تعلق محاصلِ فَیْء کی تحصیل و تقسیم سے ہے لازم ہے کہ وہ اپنے حسابات دیوان کے سامنے پیش کریں) ۔ ''دیوان'' کے محاسب کی حیثیت مدعی کی ہوتی ہے بشرطیکہ تنازع خزانے کی آمدنی سے متعلق ہو اور اگر مقدمہ خرچ سے متعلق ہے تو اس کی حیثیت مدعٰی علیہ کی ہوتی ہے ۔

اختیارِ سماعت: عام شہریوں اور افسرانِ خزانہ کے مابین تنازعات کا اختیارِ سماعت ''صاحب الدیوان'' کو حاصل ہے، بشرطیکہ اس کی تقرری کے شرائط میں اسے واضح طور پر اس اختیار سے محروم نہ کر دیا گیا ہو ۔ ایسی عدالتی صلاحیت قدرتی طور پر اسی منصب یا عہدے کو حاصل ہو سکتی ہے جس کا بڑا فرض یہ دیکھنا ہے کہ مالیات کے قوانین و قواعد کا صحیح اطلاق و اجرا ہو رہا ہے ۔ افسران خزانہ اور دیوان کے عہدےداروں کے مابین تنازع کی صورت میں، جہاں حقیقةً ''صاحب الدیوان'' خود ایک فریق ہو، یہ اصول کام کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مقدمے میں خود منصف اور قاضی نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں اختیارِ سماعت عام عدالتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔

بنیادی طور پر شریعت کا تعلق انسان اور اس کے خالق کے باہمی رشتے سے ہے، اس لیے وہ انسان اور ریاست کے باہمی تعلق کے معاملے میں محض ایک عام انداز میں دخل دیتی ہے، وہ اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ وہ دونوں فریقوں سے بعض متعلقہ اصولوں کی پابندی کی توقع اور مطالبہ کرے ۔ شریعت کا یہ رویّہ فوجداری قانون کے میدان میں خاص طور پر نمایاں ہے، جہاں ان جرائم کے علاوہ جو حدّ کے جرائم کہلاتے ہیں (اور جن میں انسان کے اللہ تعالٰی کے حضور میں جوابدہی کا تصوّر غالب ہے)، جرم کا تشخّص اور اس کی سزا کی تعین حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے ۔ مالیات کے قانون کے متعلق بھی یہی صورت ہے . . . .

مآخذ : قانونِ شریعت پر مختلف فقہی مکاتب کی مستند کتابیں : (۱) امام ابو یوسف : کتاب الخراج، قاہرہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۳ - ۱۸۸۵ء، مترجمہ و محشی از E. Fagnan : Le Livre de l'Impot Foncier، پیرس ۱۹۲۱ء؛ (۲) الماوردی : الاحکام السّلطانیة، طبع M. Enger، ۱۸۵۳ء؛ (۳) امام ابن تیمیه : السیاسة الشرعیة (ترجمه H. Laoust : Le Traité du Droit Public d'Ibn Taimiyya، بیروت ۱۹۴۸ء)؛ (۴) N. P. Aghnides : Mohammedan Theories of Finance، ۱۹۱۶ء؛ (۵) R. Levy : The Social Structure of Islam، کیمبرج ۱۹۵۷ء؛ (۶) A. Mez : Renaissance، انگریزی ترجمه از خدابخش و Margoliouth؛ (۷) D. Santillana : Istituzioni di Diritto Musulmano، ۲ جلد، روم ۱۹۲۶ء و ۱۹۳۸ء؛ (۸) E. Tyan : Institutions du Droit Public Musulman، ۲ جلد، پیرس ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۷ء؛ [(۹) ابویعلٰی : الاحکام السلطانیة، ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) ابو عبید القاسم بن سلام : الاموال، قاہرہ ۱۳۵۳ھ؛ (۱۱) ابن القیم : احکام اهل الذمة، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) محمد ضیاءالدین الریس : الخراج و النظم المالیة، قاہرہ ۱۹۶۱]۔

(N. J. COULSON)

۲ - تاریخ : بیت المال کی موجودگی کا پتا تو خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کے عہدِ مبارک میں بھی ملتا ہے، اس لیے کہ آپ کے زمانے میں بھی ملّت کے خزانے کا کچھ نہ کچھ تصوّر بہر حال موجود تھا، جس میں مختلف ذرائع سے روپیہ آتا اور جمع ہوتا تھا، لیکن اس کی باضابطہ بنیاد اس وقت پڑی جب ایک سلطنت کے فاتح کی حیثیت سے ملّت کے سامنے نئی نئی ضروریات آئیں اور سابقہ ان مالیاتی اداروں سے آن پڑا جو مفتوحہ ریاستوں میں پہلے سے موجود تھے - یہ روایت کہ اس سلسلے کے بہت سے ضروری اور ابتدائی اقدامات امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائے بالکل صحیح ہے - حضرت عمرؓ کے سامنے فوری مسئلہ عطیات [ارک بہ عطایا] کے نظام اور بحیثیت مجموعی خود مالی نظام کو منظّم و مرتب کرنے اور محاصل کی وصولی کا تھا، جو اس وقت پوری طرح مقامی آبادی کے ہاتھوں میں تھا - آگے چل کر جب ایک دستوری اور مرکزی ریاست وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ اس کی ترقی شروع ہوئی تو محاصل کے ایک مخصوص نظام اور اس کے مختلف اجزا و عناصر کی تشکیل و تنظیم کی ضرورت پیش آئی - ہمارے لیے اس جگہ بیت المال کی مکمل تاریخ پیش کرنا ممکن نہیں؛ خصوصًا اس وقت کے بعد سے جب کہ اسلامی دنیا مختلف اور علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بٹ گئی اور باہمی اختلافات روز بروز زیادہ تیز اور نمایاں ہوتے چلے گئے - اس لیے ہم چند ایسے عام نوعیت کے اشارات کرنے پر ہی اکتفا کریں گے جن کی صحت و صداقت عام طور پر مسلّم ہے اور جن سے تحقیق و جستجو کی مناسب راہیں بھی کھل سکتی ہیں .

ابتدائی دور میں مسلمانوں کے سیدھے سادے محاصل اپنی نظری بنیادوں کے لحاظ سے مذہبی، لیکن بہ حیثیت مجموعی اور عملی نقطۂ نظر سے ان ریاستوں کے زیادہ پیچیدہ قسم کے محاصل کے مشابہ، قرار دیے جا سکتے تھے جو مسلمانوں کے قبضے میں آئیں اور جن کے صیغۂ مال کی ساخت اور انتظام کا عربوں نے بھی دوسری فاتح قوموں کی طرح احترام کیا - اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں سابق بوزنطی علاقے (جو باہم دگر مختلف تھے) اور سابق ساسانی علاقے (مغرب کو چھوڑ کر) مالیاتی نظم و نسق کے اعتبار سے واضح طور پر الگ تھلگ رہے - اس کے علاوہ بالکل شروع ہی سے ان شہروں کے درمیان جو بزورِ شمشیر فتح کیے گئے تھے اور براہ راست اسلامی محاصل اور مسلم اہلکارانِ محاصل کے

ماتحت تھے، اور ان بلادِ ''عہد'' کے درمیان، جو خراج کی مقررہ مقدار ادا کرتے اور آزادانہ خود ھی فراھم کر لیتے تھے ایک واضح امتیاز موجود تھا ۔ پھر ان دو باھم مختلف طریقوں کے درمیان بلادِ ''صلح'' تھے، جہاں محاصل تو اسلامی ھی تھے لیکن ان کی وصولی مقامی انتظامیہ کرتی تھی ۔ تقریباً ایک صدی کے دو تہائی عرصے تک تمام مالی حساب کتاب مقامی زبانوں میں لکھے جاتے تھے، لیکن بالآخر [خلیفہ] عبدالملک (۶۸۵ تا ۷۰۵ء) نے حکم جاری کیا کہ تمام اساسی دستاویزات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے (مصری کاغذ کے نمونے سے پتا چلتا ھے کہ نیچے کی سطح کے نظم و نسق میں عربی زبان نے بڑی آہستہ رفتار سے رواج پایا) ۔

عمل اور قیاس دونوں کی بنا پر بہت جلدی مندرجۂ ذیل محاصل اور ان کے ذرائع سامنے آ گئے ۔

بنیادی محصول تو زمین کا لگان، یعنی خراج تھا، جو شروع میں تو غیر مسلم ملکی باشندوں کی تمام زمینوں سے وصول کیا جاتا تھا لیکن جب اصلی باشندوں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مذھب تبدیل کر کے مسلمان ھوگیا تو بعض شکوک و شبہات کے باوجود خزانے کو تباھی سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ ناگزیر ھوگیا کہ مالک کے مذھب کی تبدیلی سے اراضی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان پر پہلے کی طرح خراج قائم رھے گا ۔ اسلامی احکام کی رُو سے خراج کی حیثیت ایک مستقل کرائے (لگان) کی ھے، جو اُمّت مسلمہ کے فائدے کے لیے، جو در اصل زمین کی مالک اعلٰی تھی، وصول کیا جاتا تھا ۔ یہ حکم ''فَیء'' کا تھا، جس میں وہ تمام غیر منقولہ جائدادیں شامل تھیں جو بذریعۂ فتح حاصل کی گئی تھیں، اور جو اُمّت کی آنے والی نسلوں کی منفعت کے لیے ایک دوامی بنیاد تھی ۔ اس کے برعکس منقولہ (مالِ غنیمت) اموال فتح کے بعد فوراً تقسیم کر دیے جاتے تھے ۔ ملک کی اصل آبادی کے نقطۂ نظر سے خراج قبل از اسلام کا لگان تھا جو جاری رکھا گیا ۔ خراج کے علاوہ غیر مسلم کے لیے ایک حفاظتی محصول بھی واجب الادا تھا جسے جزیہ [رَأْسٌ بأن] کہتے تھے اور جو اس کے قبول اسلام کے بعد اس سے نہیں لیا جاتا تھا ۔ خراج اور جزیے کا باھمی فرق نظری طور پر تو بہت نمایاں معلوم ھوتا ھے لیکن اصطلاحی لحاظ سے یا عملی طور پر ھمیشہ ایسا نہیں رہا ۔

علاوہ ازیں رضاکارانہ خیرات، زکوٰۃ جو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص تھی یا صدقہ تھا، جو منقولہ اور غیر منقولہ دونوں طرح کی جائدادوں سے وصول کیا جاتا تھا ۔ جہاں تک زمینی جائداد کا تعلق تھا اس میں ایک طرف تو عربوں کی جائدادیں (بالخصوص سر زمینِ عرب میں) شامل تھیں اور دوسری طرف وہ اراضی (اِقْطاع) جو حکومت کی ملکیت تھیں اور عرب سرداروں کو ریاست کی طرف سے دی جاتی تھیں اور آگے چل کر ہر قوم و نسل کے فوجی سرداروں کو عطا کی جاتی تھیں . . . .

ان محاصل کے علاوہ خزانے کے لیے مندرجۂ ذیل محاصل کا بھی اضافہ کر دیا گیا : (۱) مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خُمُس)؛ (۲) کانوں سے یا سمندر سے نکلی ھوئی معدنیات؛ (۳) ''مَوارِثِ حَشْرِیّہ''، یعنی ایسے لوگوں کا ورثہ جن کی موت کے بعد ان کا کوئی قانونی وارث نہ ھو ۔

اس کے علاوہ ان سرکاری زمینوں (صوافی) سے بھی، جو بطور ''اقطاع'' نہ دی گئی ھوں اور ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ھو، محاصل اسی طرح وصول ھوتے تھے جیسے نجی زمینوں سے؛ علاوہ بریں ریاست ان رقموں کو بھی کام میں لاتی تھی جو عدالتی جرمانوں سے وصول ھوتی تھیں ۔

نظری طور پر صرف وھی محاصل قانوناً جائز

سمجھے جاتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، لیکن عملاً متعدد دوسرے محاصل یا تو پیدا کیے گئے یا خود بخود پیدا ہو گئے ۔ ان میں سے بعض محاصل وہ اضافی تھے جو اخراجات کی ادائی یا کسی دوسری غرض کے لیے متداول محاصل پر لیے جاتے تھے (''اصل'' محصول کے مقابلے میں ''فروع''، ''توابع'') ۔ بعض دوسرے محاصل تجارتی سرگرمیوں کی متعدد اور متنوع صورتوں پر عائد کیے جاتے تھے (''ضَرَائب''، ''رسُوم'') ۔ ان محاصل کے بارے میں فقہا نے اختلاف کیا ہے جو اکثر اوقات تجارتی اداروں سے وابستہ تھے اور مُکُوس کہلاتے تھے ۔ بعض نیک دل فرمانرواؤں نے انھیں منسوخ کرنے کی کوشش بھی کی، گو یہ منسوخی کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی ۔ پولیس اکثر اوقات ایک خاص قسم کی ''حِمایَہ'' کی ادائی کا مطالبہ کرتی تھی اور پھر حکومت اکثر اوقات بڑے بڑے عہدےداروں کو، جو ضبطیوں (مُصَادَرَةْ) کے ذریعے دولت کماتے تھے، سزائیں دیا کرتی تھی۔

ہر ٹیکس (محصول) کی تشخیص اور اس کی وصولی کی خصوصیات کا حال ان کے مخصوص عنوانوں کے ضمن میں بیان کیا جائے گا، لہٰذا اس سلسلے میں یہاں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

عام طور سے محاصل کی وصولی یا تو براہِ راست انتظامیہ (= عامل) کے ذریعے کی جا سکتی ہے، یا ٹھیکے (ضَمان) کے ذریعے ۔ محاصل کو ٹھیکے کے ذریعے وصول کرنے کا طریق بھی قدیم ایّام سے بالکل اسی طرح مروّج تھا جس طرح ان کی براہ راست وصولی کا، لیکن جوں جوں خلافتِ عباسیہ رو بہ تنزل ہوتی گئی یہ طریقہ [ضَمان] زیادہ رائج ہوتا چلا گیا، لیکن اس حد تک کبھی عمل درآمد نہیں ہوا جتنا ان لوگوں کا خیال ہے جو ''ضَمان''، ''قَبَالَہ'' اور ''جَہْبَذَہ'' میں امتیاز نہیں کر سکے، جو اس کے باوجود کہ ان کا استعمال غلط طریقوں سے ہوتا رہا ہے ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں ۔ ''قبالہ'' صرف وہاں عمل میں آتا ہے جہاں محصول دینے والوں کی ایک جماعت اجتماعی طور پر محصول کی ادائی کی ذمّےدار ہو ۔ اس جماعت اور بیت المال کے نمائندے کے درمیان باہمی گفتگو سے یہ فیصلہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ سلطنتِ روم کے آخری ایّام میں ہوتا تھا کہ محاصل کوئی ایک فرد یا چند با حیثیت افراد مل کر ادا کر دیا کرتے اور بعد کو دوسروں سے یہ رقم تھوڑے سے اضافے کے ساتھ وصول کر لیا کرتے، لہٰذا ''قبالہ'' نہ تو محصول کی اس رقم میں کوئی تبدیلی کرتا ہے جو ریاست کسی جماعت سے وصول کرتی ہے اور نہ اس بات میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا ہے کہ حکومت کے نمائندے اس جماعت سے براہ راست محاصل وصول کر لیں ۔ اس کے برعکس محاصل کا ٹھیکیدار (ضامن) وہ فرد واحد ہوتا ہے جو ایک ہی وقت میں ایک یا ایک سے زائد صوبوں کی طرف سے چند مقررہ سالوں تک ایک طے شدہ رقم ریاست کو سالانہ ادا کرتا ہے جو تشخیص کردہ لگان سے کم ہوتی ہے اور پھر بجاے خود اس رقم کی وصولی کا انتظام اپنے ذمے لیتا ہے اور اس کی رقم مع منافع اسے واپس مل جاتی ہے ۔ اس طریقے کے اختیار کرنے میں گو ریاست کا یہ فائدہ ہے کہ اسے چند دولت‌مند آدمیوں سے فوری طور پر یک مشت پوری رقم مل جاتی ہے، لیکن اس طریقے میں ریاست کا ایک نقصان یہ ہے کہ جو رقم اصل محصول دینے والوں سے وصول ہوتی ہے اس کا صرف کچھ حصّہ اس کے ہاتھ میں آتا ہے اور دوسرا نقصان یہ کہ ٹھیکے کی مدت میں ریاست اور رعایا کے درمیان براہ راست تعلق قائم نہیں رہتا ۔ جہاں تک ''جَہْبَذَہ'' کا تعلق ہے تو وہ ''ضامن'' بھی ہو سکتا ہے، لیکن اسے بیک وقت

سرکاری افسرِ زرمبادلہ اور ضامن کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ وہ بذریعۂ مبادلہ ان کھوٹے اور کورے سکّوں کی صحت کی تصدیق بھی کرتا ہے جو بطور لگان ادا کنندہ ادا کرتا ہے اور انھیں ایک معیار پر بھی لاتا ہے اور اس کام کے لیے اسے محاصل کی کچھ فی صد رقم ملتی ہے، جو محاصل ادا کرنے والوں سے بطور اضافی محصول کے وصول کی جاتی ہے.

مزید برآں ان علاقوں کے باہر جن پر معمولی لگان عائد تھے، خواہ وہ براہ راست وصول کیے جاتے تھے یا ٹھیکے کے ذریعے، کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں حکومت نے اپنے بنیادی حقوق میں سے کچھ چیزیں چھوڑ بھی رکھی تھیں - بعض علاقوں (اِغار) میں ریاست اپنے محصّل نہیں بھیجتی تھی اور وہاں کی تحصیل فوجی سالار پر چھوڑ دی جاتی تھی تا کہ وہ اس سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کر سکے - دوسرے علاقوں (مُقاطَعہ؛ یاد رہے کہ یہ ''اقطاع'' [رک بآں] سے بالکل علیحدہ چیز ہے) میں ریاست صرف اسی محصول پر اکتفا کرتی تھی جس کا باہمی تصفیہ ہو جاتا اور محاصل کے نظری اصولوں کو نظر انداز کر دیتی تھی - یہ صورت حال دورِ قدیم کے ''عہد'' کے مطابق تھی اور اس کا اطلاق خصوصیت سے ان علاقوں کے باجگزار فرمانرواؤں پر ہوتا تھا جو پورے طور سے مطیع نہیں ہوتے تھے - اقطاع کی حیثیت کسی مالی نظام کی نہیں تھی، بلکہ اپنی اصلی شکل میں سرکاری اراضی پر ایک قسم کی رعایت تھی جو عُشر کی ادائی کے تابع ہوتی تھی، لیکن آگے چل کر ''خراج'' والے اضلاع میں ریاست کے مالی حقوق فوجی افسروں کے نام منتقل کر دیے گئے جو ان کے مشاہروں کے برابر تھے - شروع میں حقوق کی یہ منتقلی اس شرط پر تھی کہ یہ لوگ ''عُشر'' ادا کریں گے لیکن بعد میں اس کے لیے فوجی ملازم ہونے کے علاوہ ہر شرط اٹھا لی گئی (دیکھیے Cl. Cahen : *'L'évolution de l'iqtâ'* در *Annales ESC*، ۱۹۵۳ء) - سرکاری مالگزاری کے انتقال کے ان مختلف طریقوں کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ کہ خزانے کے مداخل میں کمی آ گئی، لیکن آمدنی کی کمی کے ساتھ ساتھ اخراجات میں بھی اتنی تخفیف ہو جاتی تھی کہ مجموعی طور پر صورت حال سابق سے کچھ مختلف نہیں ہوتی تھی، اس لیے کہ بہر صورت کسی صوبے کے وصول شدہ محاصل صوبے کے مقامی اخراجات منہا کیے بغیر بیت المال کو نہیں بھیجے جاتے تھے - ریاست کو اس سے یہ نقصان پہنچتا تھا کہ مختلف علاقوں میں انتقال مالگزاری کے ان مختلف طریقوں پر جس حد تک عملدرآمد ہوتا اسی حد تک مالیاتی اعتبار سے اس کا اثر اور اقتدار وہاں کم ہوتا جاتا اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں رہتا تھا کہ کسی علاقے کی آمدنی کے وسائل میں کیا اضافہ ہوگیا ہے.

لیکن ریاست اس نقصان اور خطرے سے بچنے کی معقول تدبیریں کرتی تھی - وسائل کے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ اوّل تو مجموعی میزانیہ سے ہو جاتا تھا اور دوسرے روز مرّہ کے ان اجتماعات میں جہاں قدیم رواج کے مطابق زمینوں کی تفصیلی تشخیص، مالگزاری اور ان کی مالیت سے بحث کی جاتی تھی - یہی صورت جزیہ اور غالبًا زکوٰۃ کے ادا کرنے والوں کے معاملے میں بھی پیش آتی تھی - اس سلسلے میں ہمارے پاس جو بہترین مثال محفوظ ہے وہ ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں ''فَیُّوم'' کی ہے (*Arabica*، ۱۹۵۶ء)، لیکن ہمیں مجموعی طور پر ایران میں صوبۂ قُمّ کے ''عراقی سواد'' کے متعلق اور اس کے نظم و نسق کے طریقوں کے متعلق جو کچھ معلوم ہے اسے دیکھ کر کسی قسم کا شک و شبہہ باقی نہیں رہ جاتا کہ عبّاسی دور میں ہر جگہ انہیں کے متوازی انتظامات

موجود تھے - ہر مالی وحدت کی قیمت پر نظر رکھی جاتی اور اس کی تشخیص (''عِبْرَہ'') ہوتی تھی جو نظر ثانی ہونے تک سند کا کام دیتی تھی، اگرچہ قدرتی طور پر نظم و نسق کو بھی سال بہ سال ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا پڑتی تھی - مختلف تصانیف مثلاً مفاتیح العلوم اور مصری اوراقِ بردی سے ایک بالکل دوسرے طریق پر ہمیں ان محاصل کی جو روزانہ واپس کیے جاتے تھے اور ان مراعات کی جو محاصل ادا کرنے والوں کی دیّ جاتی تھیں صحت کا پتا چلتا ہے - بقایا پوری احتیاط کے ساتھ رجسٹروں میں درج کیے جاتے اور انہیں آئندہ سالوں میں وصول کیا جاتا، حالانکہ عملی طور پر یہ بھی ہوتا تھا اور ایسا ہونا ضروری تھا کہ جب بقایا کی رقم بہت زیادہ ہو جاتی تو اس کا تصفیہ باھمی سمجھوتے سے کر لیا جاتا.

محاصل کی وصولی کے لیے دو مختلف قسم کی تقویموں میں امتیاز ضروری سمجھا گیا تھا اس لیے کہ صرف شخصی محاصل یا ٹھیکے سے تعلق رکھنے والی ادائیاں تو قانونی طور پر قمری تقویموں کے مطابق ہو سکتی تھیں، لیکن زمین اور اس کی پیداوار پر عائد شدہ محاصل لازماً ایرانی یا مصری شمسی تقاویم کے مطابق وصول کیے جاتے تھے.

ان طریقوں کی وجہ سے جو کُتّاب اور حُسّاب کے لیے باعث فخر تھے خلافت عباسیہ کو چوتھی صدی ھجری/دسویں صدی عیسوی کے شروع تک، اور بعض علاقائی فرمانرواؤں کو اس تاریخ کے بعد بھی، یہ آسانی تھی کہ وہ کم از کم وصولیوں کا صحیح اور مکمل میزانیہ تیار کر سکیں (بعض فرمانروایانِ وقت خرچ کے سلسلے میں اتنے بے اصولے اور مُسرف تھے کہ تخمینہ قائم کرنا ناممکن ہو جاتا تھا) - چار عباسی میزانیے خاص طور سے اب بھی محفوظ ھیں جو بلا شبہہ نہایت محفوظ سرکاری دستاویزات پر مبنی ھیں - ان میں باھمی توافق یہ ثابت کرتا ھے کہ تمام تفصیلات میں نہ سہی لیکن اکثر ضروری چیزوں میں ان کی صحت اور درستی پر یقین کیا جا سکتا ھے - ان میزانیوں سے خلافت کی جملہ وصولی کا پتا نہیں چلتا، اس لیے کہ جزیہ، زکوٰۃ اور مُکُوس کا ذکر ان میں صرف کہیں کہیں کیا گیا ھے (کیونکہ ایک تو ان کی حیثیت میں خاصا اختلاف ھے دوسرے وہ بظاھر ایک شعبے سے جاری نہیں کیے گئے) -.میزانیے جس صورت میں ھم تک پہنچے ھیں ان سے پتا چلتا ھے کہ دوسری صدی ھجری/آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کل آمدنی چالیس کروڑ درھم سے زیادہ تھی، جو آئندہ صدی کے شروع میں کم ھو کر تیس کروڑ درھم رہ گئی؛ چوتھی صدی ھجری/ دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہ ایک کروڑ پینتالیس لاکھ دینار تھی، جو قریب قریب اکیس کروڑ درھم کے برابر ھوتی ھے - محاصل کی وصولی میں یہ کمی اس لیے نظر آتی ھے کہ علاقے برابر خلافت کے ھاتھ سے نکلتے رھے - یہ کمی، بہ استثناے بعض بحرانی حالات، صوبوں میں سرکاری مالگزاری میں کمی آ جانے کی وجہ سے نہیں تھی؛ لہٰذا خلافت کی بڑھتی ھوئی مالی مشکلات کسی عظیم اقتصادی حادثے کا نتیجہ نہیں تھیں - ھمارے علم میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ھم اس مفروضے کی بنیاد بنا سکیں - اس کی وجہ مقابلۃً ضروری اخراجات اور خاص کر فوجی اخراجات میں اضافہ تھا، جنھیں صوبائی آمدنی کی کمی کے تناسب کے لحاظ سے کم کرنا ناممکن تھا - یہاں ھم خلافت کے فوجی نظام کی تمام تفصیلات دیے بغیر اس اقتصادی بوجھ کی طرف اشارہ کریں گے جو فوج کی خاطر اسے برداشت کرنا پڑا - عام طور سے ایک پیادہ سپاھی کی تنخواہ ایک ہزار درھم سالانہ تھی - سوار کی اس سے دو چند

تھی - یوں گویا پچاس ہزار فوجیوں کی صرف تنخواہ ہی تنخواہ ساڑھے سات کروڑ درہم سالانہ بنتی تھی - اس رقم میں فوجی افسروں کے غیر معمولی مشاہروں، عطایا و انعامات، فوج کو ساز و سامان سے مسلح رکھنے اور کھانے پینے اور قلعہ‌بندی کے مصارف بھی شامل کر لیجیے - ایک مصنّف کا کہنا ہے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے وسط میں افواج کا خرچ بیس کروڑ درہم تھا - اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت تمام شہری اخراجات کے لیے اس رقم کا صرف نصف بچتا ہو گا (ان میں وہ محاصل شامل نہیں جن کا میزانیے میں ذکر نہیں ملتا) - یہ خرچ کتنا تھا، اس کا پتا چلانا مشکل ہے، اگرچہ ہمیں عباسی اور فاطمی حکومتوں اور عدلیہ کے بڑے مشاہرہ کا علم ہے (دیکھیے بالخصوص ہلال الصابی : الوزراء؛ المقریزی : خطط، ۲، ۳۰۱).

مرکزی نظامِ مالیات کے متعدد شعبوں کی تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ ان کے ذکر میں اکثر اوقات مختلف اصطلاحوں کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت مختلف چیزوں کے ذکر نے انہیں آپس میں خلط ملط کر دیا ہے - مالیاتی نظم و نسق بنیادی طور پر "دیوان" کا فریضہ تھا اور بعد میں جب وزارت نے ایک منظّم اور واضح صورت اختیار کر لی تو عام طور سے یہ کام اس کے ذمّے ہو گیا؛ لیکن کسی ایک محکمے یا شعبے کے لیے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو طرح کے کاموں سے عہدہ برآ ہو سکے اور تشخیص و تحصیل کے بنیادی قواعد (اصل) اور آمد و خرچ کے روزمرہ حسابات صحیح طرح رکھ سکے - گو اس معاملے میں اختلاف ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ "دیوان الزّمام" کا ادارہ، جسے آئندہ چل کر مشرق میں "اِستیفاء" کا نام ملا (اس کا سربراہ "مستوفی" کہلاتا تھا)، دفترِ محاسبہ سے مطابقت رکھتا ہے - المہدی کے عہد سے وہ نہ صرف ان تمام احتسابی خدمات کا نگران ہوا کرتا تھا جو ہر "دیوان" سے متعلق اور وابستہ تھیں بلکہ ان خدمات کا بھی جو صوبائی نظم سے متعلق تھیں - اخراجات ایک الگ دیوان کا دائرۂ عمل تھا، جو "دِیْوَانُ النَّفَقَات" کہلاتا تھا - فوج سے تعلق رکھنے والے اخراجات "دِیْوَانُ الْجَیْش" کی تحویل میں تھے - مالی "اقطاع" کے نظام کے اجرا کے ساتھ اس مؤخر الذکر دیوان کے پاس محاصل کی وصولی کی رسیدوں کے مثنّے بھی رہتے تھے - "بیت المال" کو یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ تمام آمدنی اس کے سپرد کی جاتی تھی اور جس میں سے تمام اخراجات کے لیے روپیہ حاصل کیا جاتا تھا - ان دفتروں میں کارکنوں کی بہت بڑی تعداد کام کرتی تھی، جنھیں "کُتّاب" اور "حُسّاب" کہتے تھے - ان میں سے بعض دوسروں کے زیرِ نگرانی کام کرتے تھے اور فنِ احتساب کی وہ تمام مصطلحات استعمال کرتے تھے جو بنو بُوَیہ کے عہد کے عالمانہ رسائل کے ذریعے ہمارے علم میں آئی ہیں - اعداد و شمار کے بجائے یہ لوگ وہ حروف استعمال کرتے تھے جو "دیوانی رسم الخط" کے نام سے موسوم تھے - یہ رسم الخط حروف اور بعض مخصوص علامتوں سے مرکب تھا جو اعداد کے ناموں کو مختصر کر کے بنائی گئی تھیں اور جو عربی اعداد کے بجائے آج بھی بعض ممالک میں مستعمل ہیں [مثلاً عـــــ = عشرہ = دس].

خدمات اس کے علاوہ بھی مختلف شاخوں میں منقسم تھیں، خصوصاً جہاں تک زمینوں کے محاصل وصول کرنے کا تعلق تھا؛ مثلاً ملازموں کی ایک قسم وہ تھی جو "خراج" کے لیے مخصوص تھی اور دوسری وہ جو "ضِیاع" کے لیے مخصوص تھی - اس کے

علاوہ ایک علاقہ‌وار تقسیم بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی مثال ہمیں ''دیوان سَواد'' (بغداد کا صوبہ) کی صورت میں ملتی ہے اور یہ بھی مشرق اور مغرب کے عرب علاقوں میں منقسم ہے ۔ ضبط شدہ جائدادوں کا انتظام ایک الگ محکمہ کرتا تھا ۔ ان جائدادوں میں سے بعض واپس کر دی جاتی تھیں اور بعض تقسیم کر دی جاتی تھیں ۔ مزید برآں جو ادائیاں جنس کی شکل میں کی جاتی تھیں، جو تحائف اور عطایا وصول ہوتے تھے، طراز وغیرہ کی بیش قیمت پیداواریں، خزائن یا مخازن میں جمع کی جاتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے بعد کے نظم و نسق میں ''مَخْزَن'' کی عمومی اصطلاح نے ''بیت المال'' کی جگہ لے لی تھی ۔ نام کی یہ تبدیلی بلاشبہہ واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ نقدی کی شکل میں مالی وصولی میں کمی آ گئی تھی اور اسی نسبت سے اجناس کی شکل میں وصولی بڑھ گئی تھی۔

بہر کیف مسلم ریاست میں یہ امتیاز قائم رہا کہ خلیفہ یا سلطان کے شخصی خزانے کو ''بیت مال الخاصہ'' اور خزانۂ عامرہ کو ''بیت مال المسلمین''، یا صرف ''بیت المال'' کہا جاتا تھا؛ لیکن یہ امتیاز بہت زیادہ سخت نہ تھا، کیونکہ شخصی خزانے میں فرمانروائے وقت کی ذاتی جائدادوں سے وصولی ہونے والی رقموں کے علاوہ بعض عمومی محاصل بھی داخل کر دیے جاتے تھے، مثلاً جرمانے، ضبطیاں، اور انفرادی محاصل اور وہ محاصل جو جنوبی ایران کے بعض صوبوں سے وصول ہوتے تھے ۔ یہ بات اول تو اس لیے کی جاتی تھی کہ ضروریات دربار اور کارہائے خیر کے لیے، جو خلیفہ یا اس کے جانشینوں کو سر انجام دینے ہوتے تھے، روپے کی ضرورت ہوتی تھی ۔ خلیفہ کی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو، عملاً اس کا ذاتی یا خاصّہ کا روپیہ خزانۂ عامرہ کے لیے ایک طرح کے محفوظ سرمائے کا کام دیتا تھا، جس میں سے پیشگیاں نکالی جاتی تھیں، خواہ وہ بعد میں ادا کی جائیں یا نہ کی جائیں (W. Fischel : *Le Bayt Māl al-Khaṣṣa*، در *Actes du 19e Congrès des Orientalistes*، ۱۹۳۸ء، ص ۵۳۸ تا ۵۴۱).

چھوٹے پیمانے پر ہر صوبے کا ایک علٰیحدہ نظام تھا، جس کا ڈھانچا مرکزی حکومت کے نظام کے مطابق ہوتا تھا ۔ صوبے اپنی ساری کی ساری آمدنی مرکز کو نہیں بھیجتے تھے بلکہ مقامی ضروریات تسلی بخش طور پر پوری کرنے کے بعد جو رقم بچ نکلتی بھیج دی جاتی تھی ۔ دوسرے یہ کہ صوبے یہ بقایا رقم بھی وصولی کے ساتھ ساتھ مرکز کو نہیں بھیجتے رہتے تھے بلکہ جب بہت سی جمع ہو جاتی تو بھیج دیتے تھے اور جب ریاست کو کوئی فوری اور شدید ضرورت پیش آ جاتی تو ''عامل'' ہنڈیاں بھیج دیتا اور رقوم موصولہ کی ادائی کا ضامن ہوتا اور ''دیوان'' ان ہنڈیوں کی بنیاد پر اپنے قرض‌خواہوں سے تصفیہ کر لیتا ۔ صوبائی مالی انتظام کی مکمل آزادی ان اسباب میں سے ایک ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ خودمختار حکومتیں مختلف علاقوں میں کیونکر بغیر کسی دقت اور پیچیدگی کے اپنے آپ کو مضبوط بنیادوں پر قائم و استوار کر لیتی تھیں۔

ریاست، ماتحت حکمرانوں اور محصول ادا کرنے والوں کے مفادات کی بنا پر مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں نقد ادائیوں اور ان ادائیوں کے تناسب میں جو جنس کی صورت میں ادا کی جاتی تھیں فرق واقع ہوتا رہا ۔ مزید برآں بلادِ مشرق تو اپنے محاصل چاندی کی شکل میں ادا کرتے تھے اور بحیرۂ روم کے کنارے کے علاقے سونے کی شکل میں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالیاتی دفاتر کی ابتدائی حساب داری

دو مختلف شکلوں میں رکھی جاتی تھی ۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر میں سونے کے معیار کی بنیاد پر ایک متحدہ حساب داری کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور قانونی طور پر درہم کے مبادلے کی شرح بھی مقرر کر دی گئی اور مختلف اجناس کی قیمتوں کی فہرست بھی مرتب ہوئی ۔ اس طرح میزانیے کے تخمینے زیادہ صحت کے ساتھ تیار کیے جا سکتے تھے ۔

چونکہ تشخیصِ محاصل کے اصول کی بنیاد تحصیل محاصل کے وہ طریقے تھے جو اُمّت مسلمہ کے ابتدائی زمانے میں رائج تھے اس لیے نظری طور پر کبھی یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا کہ مالیے کی تمام کی تمام رقم بلا امتیاز ہر قسم کے اخراجات پر خرچ کی جا سکتی ہے؛ مثلاً اسی نظریے کی رو سے زکوٰۃ، جو ایک خالص اسلامی ٹیکس تھا، صرف قرآن مجید کی بیان کردہ مدات پر، جیسے خیرات، جہاد، مسلمان غلاموں کے آزاد کرانے اور مساکین اور مسافروں کو سہولتیں بہم پہنچانے پر خرچ ہونی چاہیے ۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس تفریق یا امتیاز کو عملاً کس حد تک قائم رکھا جاتا تھا اور ایسے حالات میں کہ ملک و ملّت کسی نازک صورت حال سے دو چار ہو ان کے قائم رکھنے کی کیا صورت ہوتی تھی ۔ آمدنی کے جن ذرائع کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شریعت یا قانون کے احکام کے مطابق خرچ کیے جاتے تھے وہ ''اوقاف'' اور ''حبوس'' وغیرہ تھے، جن کی حیثیت عطیات کی تھی ۔ گو ان مدّات کا تعلق خزانۂ عامرہ کے محاصل سے نہ تھا لیکن حکومت ان پر کڑی نگرانی رکھتی تھی اور اس سلسلے میں قاضی کا توسط اختیار کیا جاتا تھا تا کہ ان کا غلط یا بےجا استعمال نہ ہو ۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی سے مالی ''اقطاع'' کے نظام میں پھیلاؤ پیدا ہونا شروع ہوا تو مالی نظام کی اہمیت میں کمی آتی گئی ۔ اس سے ریاست کے براہِ راست ذرائع آمدنی کو بھی بہت نقصان پہنچا ۔ یہاں ان مسلم آزاد ریاستوں کی تاریخ بیان کرنا بے محل ہے جو خلافت عباسیہ کے بعد وجود میں آئیں ۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ عہدِ حاضر تک ان تمام ممالک میں جو مغول کے حملے سے متأثر نہیں ہوے محصول دینے کا طریقہ اور نظام قریب قریب وہی رہا اور ریاست کے حقوق میں صرف جزوی طور پر تبدیلی ہوئی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تشخیص اور میزانیے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور قائم اور باقی رہا ۔ جو ممالک ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں مغل سلطنت میں شامل ہو گئے (حکومت میں بعد کو جو تبدیلیاں ہوتی رہیں ان کو چھوڑ کر) وہاں مالیاتی نظم و نسق کا ایک ایسا نظام رائج ہوا جو مسلمانوں کی روایات اور ان جدید نظریات کا مرکب تھا جو فاتحین سے ان ملکوں کو ملے ۔ اسی قسم کے نظریات کا رواج ایشیاے کوچک میں بھی ہوا، جہاں اس کے علاوہ اب تک کچھ بوزنطی روایات بھی موجود تھیں جو سلجوقیوں کے مقامی قوانین و ضوابط میں شیر و شکر ہو گئی تھیں؛ ان تینوں چیزوں نے مل کر مستقبل کے عثمانی اداروں کی ترکیب یا ساخت پر اثر ڈالا، گو یہ اثر ایک ایسے انداز سے پڑا کہ اس کا پتا چلانا آسان نہیں ۔ ان سے مالی مداخل کی کمی اور اس سے پیدا ہونے والے اقتصادی انحطاط کا اندازہ لگایا گیا ہے، لیکن ان اعداد و شمار سے واضح طور پر جو نتیجے نکلتے ہیں وہ یہ ہیں : اولاً براہ راست ریاست کو وصول ہونے والے محاصل اور مختلف افراد کے نام منتقل کیے گئے محاصل

میں باہمی تناسب کیا تھا اور دوسرے رائج الوقت سکے کی قیمت اور اشیا کے بازاری نرخ کیا تھے ؟ لیکن مناسب یہی ہے کہ اس موقع پر کوئی مثبت نتیجہ نکالنے کے بجائے سکوت اختیار کیا جائے.

مآخذ: یہاں ہم قدرتی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ بعض ایسے مآخذ کا ذکر کر دیں جو خاص اہمیت رکھتے ہوں ۔ مآخذ کے لیے حوالجات Caetani کی *Annali*، ۳ : ۳۶۸ تا ۴۱۷ میں ملیں گے؛ نیز ابو عُبَید بن سلّام کی کتاب الاموال میں (دیکھیے عطاء) ۔ ان حوالوں میں سے بیشتر ''خراج'' پر لکھی ہوئی تصانیف سے لیے گئے ہیں، جو عباسی دور کی پہلی صدی میں ابو یوسف اور یحیٰی بن آدم نے تألیف کی تھیں (جن کا انگریزی میں موشّح ترجمہ از A. Ben Shemesh، ۱۹۵۸ء میں لائڈن سے شائع ہوا)، اور بعد میں بلاذری کی کتاب الفتوح سے؛ قُدامة کی کتاب الخراج سے (جو تمام کی تمام محفوظ نہیں)، طبع A. Makki؛ ایک ٹائپ شدہ مقالہ، Sorbonne پیرس اور قزوینی کی مفاتیح العلوم میں منتشر معلومات چوتھی / دسویں صدی سے بعد کی، اور ماوردی کی الاحکام السلطانیة، پانچویں / گیارھویں صدی کے بعد کی ۔ میزانیے، جن کا A.V. Kremer نے اپنی *Kulturgeschichte des Orients*، ج ۱ باب ۷ اور *Das Einnahmebudget . . . vom Jahre 306* (*Denkschr. d. k. Akad. d. W. Wien, Ph.-Hist. Kl.*، ۱۸۸۸ء) (قدیم ترین اب الجَہْشِیاری *Djahshiyari* کی کتاب الوزراء، طبع Mzik، ص ۱۷۹ تا ۱۸۲ یا قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۱ تا ۲۸۸ میں مل سکتے ہیں) مطالعہ کیا ہے، معدد سرگزشتوں یا تواریخ سے حاصل کیے گئے ہیں ۔ بنو بُوَیْه کے عہد سے متعلق بُوزجانی کے مالیاتی ریاضی پر عالمانہ رسائل ہیں (یہ صالح العلی، بغداد کے زیر تصنیف و تحقیق ہیں) اور کتاب الحاوی کا جس کا مصنّف نا معلوم ہے (اس کا تجزیہ اور تحشیہ میں نے *AEIO*، جلد ۱۰، ۱۹۵۲ء میں کیا ہے) ۔ مصری کاغذات، طبع A. Grohmann سے خاصی معلومات مل سکتی ہیں، دیکھیے: *Archiv Orientalny*، جلد ۵ تا ۶، ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ء میں مقالات پر اس کے حواشی اور تبصرے اور *ZDMG* میں C. Leyerer کے حواشی ۔ تاریخی سوانح اور تصانیف میں سب سے زیادہ بیش قیمت ابن مسکویہ : تجارب الامم، مع ضمیمہ از روذروری Rudhrawari؛ ہلال الصّابی : کتاب الوزراء اور حسن بن محمد قُمّی : تاریخ قُم، جن سے A.K.S. Lambton نے اپنی کتاب *Landlord and Peasant in Persia*، آوکسفرڈ ۱۹۵۳ء میں بہت استفادہ کیا ہے، بالخصوص باب دوم میں ۔ بعض سرکاری رسائل، جیسے بویہی وزیر ابن عبّاد کے رسائل، طبع عبدالوهاب عزّام و شکری ضَیف، ۱۹۴۷ء کا مطالعہ خاصہ منفعت بخش رہے گا ۔ اس سے بعد کے دَور کے لیے جدید تصنیفات کافی ہوں گی ۔ ایوّبی عہد کے لیے ابن مَمّاطی : قوانین الدواوین (طبع عطیہ، ۱۹۴۳ء) کے علاوہ عثمان ابراهیم النّابُلُسی کی چھوٹی چھوٹی تصانیف *Description of Fayyum*، دیکھیے میرا تجزیہ، در *Arabica*، ۱۹۵۶ء، اور لُمَع القوانین، جس کا اڈیشن میں نے ہی تیار کیا ہے)، مغول کے لیے عبداللہ بن کیا المازَنْدَرانی : ''رسالۂ فلکیة، طبع S.W. Hinz، اور اس کا جائزہ وہی مصنف، در *Der Islam*، جلد ۲۹، ۱۹۴۹ء؛ یمن کے لیے R.B. Serjeant اور راقم مقالہ مل کر نویں/پندرھویں صدی کی ایک بیش قیمت کتاب مُلخص الفتن شائع کریں گے (قب *Arabica*، ۱۹۵۷ء، ۴ : ۲۳ ببعد) ۔ مصر کے لیے بالعموم اور مملوکوں کے عہد کے لیے بالخصوص مقریزی : خِطَط اور قلقشندی : صبح الاعشٰی پر زور دینے کی ضرورت نہیں.

اسلامی دنیا کی کوئی مالیاتی تاریخ موجود نہیں ہے؛ لیکن جزوی مطالعے کی چیزیں ضرور موجود ہیں ۔ اصول کے عہد کے لیے خاص طور پر دیکھیے: *Conversion and the Poll-Tax in* : D. C. Dennett *early Islam*، ۱۹۵۱ء؛ جملہ کلاسیکی عہد کے لیے

دیکھیے : Fr. Lokkegaard کی Islamic Taxation in the classic Period، ۱۹۵۱ء (ایک عظیم دستاویزی اور فنّی کوشش لیکن سب کی سب یکساں قابل اعتماد نہیں) ان کے ان کاموں کا ذکر کرتی ہے جو ان کے وقت میں تو ضرور اہم تھے لیکن اب متروک ہو چکے ہیں؛ C. Becker وغیرہ کی اور Mez کی باب ۸ (قب ۶)، در Renaissance؛ D. Sourdel کا ساربون یونیورسٹی میں Le vizirat ʻabbaside پر مقالہ جب وہ شائع ہو جائے تو مفید معلومات حاصل ہونگی ۔ مزید مخصوص علمی چیزوں میں علاوہ ان کے جن کا ذکر اس مقالے کے دوران میں آ چکا ہے دیکھیے : W. Fischel : Origin of Banking in Medieval Islam، در JRAS، ۱۹۳۳ء اور H. Gottschalk : Die Madarāiyyūn ۔ کلاسیکی اصول کی شرح مثلاً S. A. Siddiqi : Public Finance in Islam، کراچی ۱۹۴۸ء، سے معلوم کی جا سکتی ہے [نیز اردو میں سیّد یعقوب شاہ : اسلام کا مالیاتی نظام، لاہور] ۔

سلطنت عثمانیہ میں سلطان کے ذاتی خزانے (''خزانۂ اندرون'' یا اِچ خزانہ) اور حکومت کے خزانے (''خزانۂ امیریّہ''، ''خزانۂ دولت''، ''خزانۂ عامرہ'' وغیرہ) کے درمیان بڑی احتیاط سے امتیاز قائم رکھا جاتا ہے ۔ عثمانی خزانے اور مالیات کے متعلق رک بہ دفتردار خزانہ اور مالیہ ۔ خزانۂ عامرہ کے لیے عام طور سے '' میری '' کی اصطلاح (''امیری'' سے) استعمال کی جاتی تھی، جو زیادہ وسیع معنوں میں سرکاری جائداد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی (قب بیلک Beylik) ۔ عثمانی نظم و نسق سے تعلق رکھنے والی دستاویزات میں خزانے کو عام طور سے ''بیلک المال'' نہیں کہا جاتا اگرچہ یہی اصطلاح عام طور سے ''بیت المال مسلمین'' یا ''بیت المال عامّہ'' کی شکل میں ملتی ہے (مثلاً ابو السّعود کے قانونی فیصلوں میں، جنھیں عمر لطفی برکن نے تنظیمات، استانبول ۱۹۴۰ء، ص ۳۳۳، ۳۳۶، ۳۴۳ میں نقل کیا ہے، اور بعض قانون ناموں میں جو برکن Barkan : Kanunlar، ص ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۲۶ میں شائع ہوے ہیں ۔ ان سب موقعوں پر زمین کی دوسری اقسام مثلاً ''ارضِ میری'' یا ''ارضِ مملکت'' کے مقابلے میں ''بیت المال'' کے حقوق کا ذکر آیا ہے ۔ عام عثمانی استعمال میں ''بیت المال'' کی اصطلاح محاصل کی صرف بعض قسموں کے لیے مستعمل تھی، جو قانوناً خزانۂ عامرہ کی ملکیت ہوتے تھے ۔ اس میں ضبط شدہ جائدادیں، لاوارث جائدادیں اور ایسی جائدادیں شامل تھیں جن کا کوئی دعویدار نہ ہو ۔ جائداد کی ان قسموں کا ذکر اور تفصیل بہت سی سرکاری دستاویزات میں ملتی ہے ۔ ان میں زیادہ اہم مفقود الخبر اور غائب لوگوں کی جائدادیں تھیں (''مالِ غائب'' اور ''مالِ مفقود'') یا ایسی جائدادیں جن کا کوئی دعویدار اور وارث نہ ہو (''مخلّفات''، ''متروکات'')؛ مفرور غلام یا بھٹکے ہوے مویشی (''عبدِ آبق''، ''کچکون''، ''یاوہ'') بھی اسی ضمن میں آتے تھے ۔ ان جائدادوں کی نگہداشت اور ان کی آمدنی کا جمع کرنا ایک خاص افسر کے سپرد ہوتا تھا جو ''امین بیت المال'' یا ''بیت المالجی'' کہلاتا تھا ۔ بیشتر قانونی مآخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسے ورثے جن کا کوئی دعویدار نہ ہو ایک وقت خاص تک محفوظ رکھے جائیں گے ۔ وہ مختلف ناموں سے امانت متصوّر ہوں گے تاکہ ورثہ کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنا حقِ وراثت ظاہر اور ثابت کریں ۔ صرف حق ثابت نہ کر سکنے کی صورت میں نقدی یا جائداد خزانے کی ملکیّت متصوّر ہوگی ۔ اس طرح کی اکثر شکایات موجود ہیں کہ ان قواعد کی پابندی نہیں ہوتی تھی اور جائداد پر بہت جلد اور بلا تفتیش و تحقیق قبضہ کر لیا جاتا تھا (مثلاً لطفی

پاشا : آصاف نامہ، طبع و ترجمہ R. Tschudi، برلن ۱۹۱۰ء، متن ص ۱۱، ترجمہ ص ۱۲؛ قب سری محمد پاشا : نصائح الوزراء، طبع و ترجمہ W. L. Wright، پرنسٹن ۱۹۳۵ء، ص ۷۱۔

عثمانی قانون ناموں میں ان جائدادوں کا دعوٰی کرنے اور ان سے حاصل شدہ منافع کو قانونی طور پر کسی کے نام منتقل کرنے کے متعلق نہایت واضح اور مفصل ھدایات موجود ھیں ۔ جن جائدادوں کے متعاق بیت المال کی طرف سے دعوٰی کیا جاتا تھا وہ اکثر اوقات ''عاملوں''، ''سنجاق بیگوں'' اور ''سپاھیوں'' تک کے نام پر منتقل کر دی جاتی تھیں ۔ محمد ثانی کا ایک فرمان مورخہ ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۹ء موجود ھے، جس میں دس ھزار اسپروں (Aspers) سے کم قیمت کی جائدادوں اور دس ھزار سے زائد قیمت کی جائدادوں کے انتقالات میں فرق کیا گیا ھے ۔ پہلی قسم کی جائدادیں عاملوں یا محاصل کے افسروں کو دی جاتی تھیں اور مؤخر الذکر شاھی خزانے (بیلک Beylik) کے لیے مخصوص کر دی جاتی تھیں (Fatih : Halil Inalcik "Sultan Mehmed" in Fermanlari Bell، عدد ۴۴، ۱۹۴۷ء : ص ۶۹۹ تا ۷۰۰) ۔ اسی طرح کا ایک امتیاز پندرھویں صدی کے آخر کے قانون نامے میں بھی ملحوظ رکھا گیا ھے (Anhegger-Inalcik، ص ۷۰ تا ۷۱) اور سولھویں صدی سے بعد کے قانون‌ناموں اور رجسٹروں میں عام طور پر ملتے ھیں ۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ اس قسم کی جائدادیں یا واجب‌الادا فیسیں اگر ان کے صحیح دعویدار پیدا ھو جاتے تو خزانۂ عامرہ کی ملکیّت سمجھی جاتی تھیں ۔ فی الواقع خزانے کا حصّہ یا تو ان مدّات تک محدود تھا جو دس ھزار اسپر یا اس سے زائد مالیّت کی تھیں اور یا اس جائداد تک جو سلطان کے سپاھیوں اور دوسرے ملازمین سلطان کا ترکہ ھوتی تھیں ۔ اس سے پہلے کے زمانے میں اس فہرست میں ینی چری (Janissaries) بھی شامل تھے ۔ بقیہ جائدادیں سنجاق بیگ کے ''خاص'' کا حصہ سمجھی جاتی تھیں ۔ اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی تھیں ۔ ''آزاد تیماروں'' (serbest tımār) میں بیت المال کے مداخل تیمار دار کے لیے مخصوص ھو جاتے تھے اور عام تیماروں کی طرح سلطان یا گورنر کے خاص کے لیے مخصوص نہیں ھوتے تھے ۔ وقف کی بعض زمینیں، بالخصوص جو حرمین کے حق میں ھوتی تھیں، وقف کی آمدنیوں میں داخل کی جاتی تھیں ۔ سولھویں صدی کے بعد سے تو ینی چریوں کا اپنا ایک خاص افسر ھوتا تھا جو اوجاق بیت المالجیسی Odjak Bayt al-māldjīsī، کہلاتا تھا ۔ یہ گویا ایک طرح کا فوجی خازن ھوتا تھا، جس کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ لاوارث ینی‌چریوں (عجمی اوغلان) کے ''مخلّفات'' کی تشخیص اور تحصیل کرے ۔ یہ تحصیلات اور اسی طرح کی دوسری رقمیں فوجی صندوق میں رکھی جاتی تھیں (Ismail Hakkı Uzunçarsılı : Osmanlı Devleti teşkilâtın dan Kapukulu Ocakları، انقرہ ۱۹۴۳ء، ص ۳۱۱ تا ۳۲۰) ۔ اجتماعی استحقاق کی ایک اور دلچسپ مثال بیت المقدس میں ملتی ھے، جہاں مغربی مجاوروں کے زاویے کو اجتماعی طور پر یہ استحقاق حاصل تھا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایسے شخص کی مخلّفات (متروکات) کو جو لاوارث مر جائے اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے ۔ یہ حق انھیں سلطان صلاح الدین نے دیا تھا اور مملوک اور عثمانی سلاطین نے اس کی توثیق کی تھی (Başvekalet Arşivi, tapu register No. 427 of 932؛ قب A. S. Trition کی Materials on Muslim Education in the Middle ages، لنڈن ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۳) ۔ اسی طرح کی رعایت غالبًا ماؤنٹ ایتھاس

Mount Athos کے راہبوں کو بھی حاصل تھی (P. Lemerle و P. Wittek : *Recherches sur l'histoire et le statut des monastères athonites sous la domination turque, Archives du droit oriental*، ۱۹۴۸ء، ۳ : ۳۳۳، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۶۵)۔

مآخذ : (۱) *Kānūnname-i Sulṭanī ber Mūsceb-i ʿOsmānī*، طبع R. Anhegger و Halil Inalcik، انقرہ ۱۹۵۶ء، ص ۷۰ تا ۷۱؛ (۲) قانون نامۂ علی عثمان، در *TOEM*، تکملہ، ۱۳۲۹ھ، ص ۲۱، ۵۸، ۷۰ تا ۷۱؛ (۳) عثمانلی قانون ناملری، در *MTM*، ۱ : ۷۵، ۹۱، ۳۲۱، ۳۳۳؛ (۴) احمد رفیق : عصرِ ہجریدے استانبول حیاتی، استانبول ۱۳۳۳ھ، ص ۹۱، ۲۱۰ تا ۲۱۱؛ (۵) Omer Lutfi Barkan : *Kanunlar*، بمدد اشاریہ؛ (۶) عبدالرحمان وفیق : تکالیف قواعدی، استانبول ۱۳۲۸ھ، ۱ : ۶۶ تا ۶۸؛ (۷) D' Ohsson : *Tableau de l'Empire Ottoman*، ۷ : ۱۳۳، ۲۳۰، ۲۶۰، ۳۱۸؛ (۸) Hammer : *Des osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*، وی انا ۱۸۱۵ء، ۱ : ۲۸۹ و بمدد اشاریہ؛ (۹) L. Fekete : *Die Siyaqat-Schrift*، جلد ۱، بوڈاپسٹ ۱۹۵۵ء، بمدد اشاریہ۔

(B. Lewis)

المغرب : جب تک المغرب اور الاندلس براہِ راست بنو امیّہ اور خلفاے عباسیّہ کے نظم و نسق کے ماتحت رہے وہاں مالی نظم و نسق سے متعلق کسی طرح کے مسائل پیدا نہیں ہوے۔ مقامی بیت المال کی حیثیت دمشق یا بغداد کے مرکزی بیت المال کی ایک شاخ کی تھی؛ لیکن جب مسلم مغرب کا کوئی حصّہ مشرقی خلافت کے قبضے اور اقتدار سے باہر نکل جاتا تو وہاں جداگانہ نظم و نسق قائم ہو جاتا۔

مقدّمۂ ابن خلدون کے چند ابواب کے سوا، جو صرف نظم و نسق کے لیے مخصوص ہیں (مقدمہ، مطبوعۂ قاہرہ، ص ۲۶۹)، کسی ایسے علمی رسالے کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی جس میں مالیاتِ عامّہ کے نظم و نسق یا کسی خاص وقت یا کسی خاص مقام کی مالی حالت کو پوری باقاعدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تاریخی سرگزشتوں اور منتشر دستاویزات میں جو معلومات ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں ان کی بنا پر ایک ہلکا سا تصور یا خاکہ پیش کریں۔

۱- الاندلس: لیوی پرووانسال E. Lévi-Provençal کی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی اندلس میں ''بیت المال'' کا لفظ ہمیشہ نہایت محدود معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس اصطلاح سے، جو حقیقت میں بیتُ مالِ المُسلمین کی شکل میں ملتی ہے، وہ خزانہ مراد ہے جس میں اوقاف کی آمدنی داخل ہوتی ہے اور یہ خزانہ حقیقت میں اس خزانۂ عامرہ سے بالکل الگ ہے جسے عام طور سے خزانۃ المال اور بہت ہی کم بیت المال بھی کہا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر مقدّس اداروں (اوقاف) کی آمدنی قاضی کے زیر نگرانی ہوتی تھی، جو اس کے نظم و نسق کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ خزانہ کسی مذہبی عمارت میں رکھا جاتا تھا، مثلاً قُرطُبہ میں اس کی جگہ جامع مسجد کا ''مقصورہ'' تھا (ابن عذاری : البیان، ۳ : ۹۸)۔ اس میں جو رقوم داخل ہوتی تھیں وہ زیادہ تر ان مقدّس اداروں (اوقاف) سے وصول ہوتی تھیں جو مقررہ اخراجات کے لیے مخصوص ہوتے تھے، لیکن اس میں بعض وہ بے ضابطہ آمدنیاں بھی رکھی جاتی تھیں جنھیں ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا تھا، بالخصوص غائب لوگوں کا مال، یعنی ایسے مسلمانوں کا مال جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اموال چھوڑ گئے ہوں، لیکن ان کے انتظام وغیرہ سے متعلق کسی قسم کی کوئی قانونی یادداشت نہ چھوڑی ہو۔

صوبوں میں قاضی کی مدد کے لیے ناظر الاوقاف (انسپکٹر) متعین تھے - قاضی صرف اخراجات کے جواز کا فیصلہ کرتا تھا - یہ روپیہ صرف ان مقاصد میں صرف کیا جا سکتا تھا جو ان کے مُعْطِیوں نے بتلائے ہوں، لیکن اگر مقاصد مبہم یا غیر واضح الفاظ میں بیان کیے گئے ہوں تو یہ روپیہ رفاہ عامّہ یا مذہبی کاموں میں صرف ہوتا تھا، جیسے قلاّش یا فلاکت‌زدہ لوگوں کی اعانت، مساجد کی نگہداشت اور انتظام، اور ان کے عملے کو مشاہروں کی ادائی، تعلیمی درسگاہوں کی تعمیر اور اساتذہ کے مشاہرے وغیرہ - قاضی کو اختیار حاصل تھا کہ وہ نیک کاموں کے لیے خزانۂ عامرہ سے پیشگی رقمیں نکلوائے، مثلاً کفار کے خلاف کسی فوجی مہم کی تیاری یا دارالسلام کی سرحدوں پر فوجی دفاع کی بحالی کے لیے.

یہ نظام جیسا کہ "حِسْبَہ" پر ابن عَبْدون کے کُتَیبے (طبع و ترجمہ E. Lévi-Provençal) سے ظاہر ہے چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے آغاز، یعنی المرابطون کے قبضے کے زمانے تک جاری تھا (دیکھیے مآخذ).

۲ - المغرب : کسی بھی بنا پر یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ المغرب میں بیت المال کی اصطلاح اس محدود مفہوم میں استعمال ہوتی تھی - معلوم ہوتا ہے کہ ایسے خزانۂ عامرہ کے وسیع‌تر معانی میں استعمال کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی یہ مالیاتِ عامّہ کے نظم و نسق کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی.

اب تک مسلم مغرب کی مختلف ریاستوں کے مالی نظام کو باقاعدہ مطالعے کا موضوع نہیں بنایا گیا - یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جو معلومات عربی سوانح اور سرگزشتوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت کم ہیں اور ہمارے لیے کارآمد بھی نہیں؛ اس لیے ہم مجبوراً اس موضوع کے متعلق عام اندازکی باتیں بیان کرنے پر اکتفا کریں گے.

اَلْقَیْرَوان کے بنو اغلب نے اس معاملے میں بظاہر کسی طرح جدّت سے کام نہیں لیا - معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد (۱۸۴ھ / ۸۰۰ء) انہیں جو نظام ملا انھوں نے اسی کو اپنا لیا.

اگرچہ فاطمیوں نے محاصل کے نظم و نسق اور ان کے تسمیہ کے سلسلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی، لیکن ابن حوقل کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق (مرتبۂ ڈ خویہ، ص ۶۹) انھوں نے محاصل میں حیرت انگیز اضافہ کیا اور اس مدّ سے ان کی سالانہ آمدنی ستّر سے اسّی لاکھ دینار تک پہنچ گئی - زِیریوں نے اپنے پیشروؤں کے قائم کیے ہوئے اعلٰی نظام کو برقرار رکھا، مگر اسے کوئی ترقی نہ دے سکے.

ہمیں المرابطون کے مالی نظام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں اس کے سوا کہ ان کے پہلے فرمانروا یوسف بن تاشفین کو محض "قانونی محاصل پر اکتفا کرنی پڑی" - اس کے جانشین اس کی روش پر قائم نہیں رہ سکے - اور اندلس میں انھوں نے وہی نظام بحال رکھا جو انھوں نے وہاں رائج پایا.

الموحدون سے متعلق ہمیں جو واضح اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ عبدالمؤمن نے ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء میں ایک قسم کا مالگزاری نظام مقرر کیا تھا، جس کا اطلاق پورے مغرب پر ہوتا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ زمینی محصول (خراج) کی تشخیص میں ممدّ و معاون ہو (روض القرطاس، طبع Tornberg، ص ۱۲۶، ۱۲۷).

بنو حفص کے متعلق R. Brunschvig's نے جو علمی تحقیقات کی ہیں ان میں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی سے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان مغربی ممالک کے مالگزاری نظام کے متعلق تمام تفصیلات (اور

مقابلةً بہت تھوڑی ہیں) موجود ہیں ۔ اس کام کی نگرانی کرنے والا افسر ''صاحب الأشغال'' کہلاتا تھا، اور یہ اصطلاح ابن خلدون (موضع مذکور) نے بھی استعمال کی ہے ۔ آگے چل کر اس کے لیے ''بَنِقْذ'' کا لفظ استعمال ہونے لگا ۔ اس نظام کے کامیاب ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ حفصی خزانہ قریب قریب ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔

بنو عبدالواد کے متعلق صحیح معلومات موجود نہیں ہیں ۔ ممکن ہے کہ M. Mougin جو مقالہ مرتب کر رہا ہے اس سے اس موضوع پر کچھ روشنی پڑے۔

مَرِینیوں کے مالی نظم و نسق کے متعلق تھوڑی سی اور منتشر معلومات ابن فضل اللہ العمری: مسالک الابصار (ترجمہ M. Gaudefroy-Demombynes، در BGA، جلد ۲، پیرس ۱۹۲۷ء) اور ابن مرزوق: مسند (طبع و ترجمۂ E. Lévi-Provençal، در Hesp.، ۱۹۲۵ء) میں موجود ہیں ۔ یہ سب معلومات ابوالحسن کے دورِ حکومت (چودھویں صدی عیسوی کے وسط) سے متعلق ہیں ۔

الافرینی (: نزهة الحادی، طبع Houdas، ص ۳۸ تا ۴۰، ترجمہ ص ۷۰ تا ۷۵) کے متن میں سعدی دور کے آغاز کے مالی معاملات اور ایک جدید محصول کے نفاذ کے متعلق، جس کا نام ''نائبیہ'' تھا، نہایت دلچسپ معلومات ملتی ہیں ۔ آخر میں E. Michaux-Bellaire کی کتاب میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں علوی خاندان کے مالی نظام کی بالکل صاف اور واضح تصویر ملتی ہے ۔

توقع کی جا سکتی ہے کہ ان ترکی دستاویزات میں جو تونس اور الجزائر میں محفوظ ہیں المغرب میں ترکی کی مالی حکمت عملی کے متعلق یا کم از کم اٹھارھویں صدی عیسوی کے بعد کے دور کے متعلق وافر مواد موجود ہوگا ۔ [اسلامی ہندوستان کے سلسلے میں دیکھیے تعلیقہ].

مآخذ: (۱) E. Lévi-Provençal: *Hist. Esp. mus.*، ۳: ۱۳ تا ۱۳۳؛ (۲) وهی مصنّف: *Séville mus. au XIIe siècle*، ص ۱ تا ۳؛ (۳) M. Vonderheyden: *La Berbérie or. sous la dynastie des Benoû, l-Arlab*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۰ تا ۱۷۱؛ (۴) H. Terrasse: *Hist. du Maroc*، ۲ جلد، کاسابلانکا ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۰ء، مواضع کثیرہ؛ (۵) R. Brunschvig: *La Berbérie or. sous les Hafṣides*، ۲، پیرس ۱۹۴۷ء: ۶۸ تا ۶۹؛ (۶) E. Michaux-Bellaire: *Les impots marocains*، در *AM*، ۱: ۵۶ تا ۹۶؛ (۷) وهی مصنّف: *L' organisation des finances au Maroc*، در *AM*، ۱۱: ۱۷۱ تا ۲۰۱؛ (۸) J. F. P. Hopkins: *Medieval Muslim Government in Barbary*، لنڈن ۱۹۵۸ء.

(R. LE TOURNEAU)

[تعلیقہ: اسلامی ہندوستان کے نظام حکومت میں دو مختلف سلسلے مل جل کر سامنے آتے ہیں: (۱) مسلمان فاتحین اپنے ہمراہ عرب اور ایران و توران سے اسلامی تصوّرات کے زیرِ اثر تمدّنی تجربات لائے، اور (۲) مقامی دستور اور قاعدے جنھیں مسلمان حکومتوں نے اپنا لیا ۔ اسلامی ہندوستان سے متعلق مختلف مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بیت المال کی اصطلاح کا زیادہ رواج نہیں ہوا ۔ اس کے بجائے خزانہ یا خزانۂ عامرہ کا لفظ استعمال ہوا۔

البتہ اسلامی ہندوستان کے سرکاری کاغذات میں مال کا لفظ موجود ہے اور اس کے معنی عموماً سرکاری محاصل اور ذرائع آمدنی، مثلاً خراج اور جزیہ (مطالبات) وغیرہ لیے جاتے ہیں ۔ عسکری کاغذات میں اس سے مراد مالِ غنیمت بھی ہے، لیکن اس کا اطلاق عموماً سرکاری آمدنی کی مختلف مدّات ہی پر ہوتا تھا ۔ ''مال واجبی'' سے مراد

"مطالبہ" اور مال گزاری سے مراد مطالبے کی ادائی ہے [نیز رک بہ مال : مالیات]۔ اس سلسلے کی چند اور اصطلاحیں یہ ہیں : بازخواست، بازیافت، محصول، حاصل، جمع، جمع دامی، جمع مملکت، جمع پرگنات، جمع ولایت، جمع قصبات و قریات، اقطاع، مُقطع وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھیے : *The Agrarian System of Moslem India* : W.H. Moreland، کیمبرج ۱۹۲۹ء).

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے زمانے میں وزیر اور دیوان دو عہدے، کبھی مختلف اور کبھی ایک ھی معنی میں، نظر آتے ھیں۔ اس عہدےدار کا کام مالیات کا انصرام تھا اور خزانے کا انتظام بھی کرتا تھا۔ وہ مدّات جن سے خزانۂ شاھی تکمیل پاتا تھا بہت سی تھیں؛ ان میں مالیہ، لگان وغیرہ کے علاوہ زکوٰۃ بھی شامل تھی۔ بقول جادوناتھ سرکار شاھانِ وقت مسلمانوں سے زکوٰۃ لے کر، دینی رفاھی کاموں میں خرچ کرتے تھے، مثلاً مسجدیں تعمیر کرنا، اولیا و علما و صلحا کو وظائف دینا، ان کے مزارات و مقابر پر خرچ کرنا، نادار مسلمان لڑکیوں کے لیے جہیز فراھم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ زکوٰۃ زمین کے مالیے کی طرح ھی خزانے میں چلی جاتی تھی اگرچہ بعد کے زمانے میں زکوٰۃ کے خرچ میں بے اعتدالی ہونے لگی؛ چنانچہ بادشاھوں کے ذاتی یا عام انتظام پر بھی خرچ ھو جاتی تھی۔ بہر حال وزیر کا عہدہ سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا اور مالیاتی امور عموماً اسی کے سپرد ھوتے تھے، لیکن یہ اس وجہ سے کہ دیوان یعنی خزانے کا مہتمم اعلیٰ بھی وھی ھوتا تھا [اس منصب کے فرائض اور طریق کار کے لیے دیکھیے جادو ناتھ سرکار : *Mughal Administration*، کلکتہ ۱۹۲۰ء، ص ۳۱ ببعد]۔ بعض ایسے وزیر بھی ملتے ھیں جو دیوان نہ تھے لہٰذا خزانے کا اہتمام ان کے سپرد نہ ھوتا تھا، ایک اور عہدےدار ھوتا تھا جسے بخشی کہا جاتا تھا۔ بخشی فوج کے حسابات کا مہتمم اعلیٰ ھوتا تھا اور اس کے ماتحت کبھی کبھی دو تین بخشی اور بھی ھوتے تھے (بحوالۂ مصنّف مذکور).

مالیہ لگانے والے اور وصول کرنے والے اور اس کا حساب رکھنے والے محکمے میں دوسرے اور تیسرے درجے کے عہدے دار بھی ھوتے تھے، مثلاً امین، کروڑی، قانون گو، سیاھەنویس وغیرہ وغیرہ (دیکھیے وھی کتاب و نیز Ibn-i-Hasan : *Central Structure of the Mughal Empire*، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۶ء؛ رنچھوڑداس : دقائق الانشا (مخطوطۂ دانش‌گاہ پنجاب)؛ عبدالعزیز : *Mansabdari System of the Mughals*، لاھور؛ Ed. Thomas : *Revenue resources of the Moghal Empire*، کیمبرج؛ ابوالفضل : آئین اکبری اور دستور العمل نام کی کتابیں بھی ملاحظہ ھوں۔ مغلوں سے پہلے کے نظام سلطنت اور خزانے کے لیے دیکھیے القلقشندی : صبح الاعشٰی؛ ضیابرنی : تاریخ فیروز شاھی؛ ابن بطّوطہ: عجائب الاسفار وغیرہ].

[ادارہ]

بیتُ المِدْراس : یا بیت المدراش، دَرْس کے لغوی معنی ھیں نشان (المفردات، بذیل مادۂ درس)، اور درس مخفی اور مٹے ھوئے راستے کو بھی کہتے ھیں (لسان) اور دَرْس کے معنی ھیں پیسا۔ اسی سے دَرَسْتُ الکتاب ہے جس کے معنی ھیں : میں نے بار بار پڑھنے کی وجہ سے کتاب ازبر کر لی۔ کہتے ھیں حضرت ادریس[۳] کا یہ نام اس وجہ سے تھا کہ آپ[۴] کتاب اللہ کی بکثرت تلاوت کرتے تھے۔ مُدَرِّس یا مِدراس، معلّم اور پڑھنے والے کو کہتے ھیں۔ مِدراس الیہود، کے معنی ھیں : بیت تُدرس فیہ التوراۃ، یعنی وہ جگہ جہاں تورات کی تعلیم دی جاتی ہے (لسان، بذیل مادہ).

بیت المدراس کے الفاظ حدیث میں بھی آتے ہیں(البخاری، کتاب الجزیة، باب ۶؛ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب ۱۸؛ کتاب الاکراہ، باب ۲؛ کتاب الیہود، باب ۲؛ احمد بن حنبل : مسند، ۲ : ۴۵۱) اور اس کی تشریح میں ابن الاثیر اور صاحب لسان نے لکھا ہے : ھوالبیت الذی یدرسون فیه (نہایة؛ لسان، بذیل مادہ)، یعنی (مدینۂ منورہ میں) ان کے درس و تدریس کی جگہ تھی۔

بیت المدراس کا ابتدائی مفہوم خصوصاً یہ تھا کہ وہ جگہ جہاں مقدس صحیفوں کی تفسیر و تشریح اور ان کے گہرے مطالب کی تلاش و تحقیق کا کام ہوتا ہے ۔ اس طرح اس سے مراد ہے عہدنامۂ عتیق کا دارالمطالعه اور تحقیق گاہ ۔ مدراس یا مدرس کا لفظ بائبل میں بھی موجود ہے (۲ ۔ اخبار الایام، ۱۳ : ۲۲؛ ۲۴ : ۲۷)، لیکن شاید وہاں اس کا مفہوم اس سے کچھ مختلف ہے جو اس لفظ نے بعد میں اختیار کر لیا ۔ عہد نامۂ عتیق کے اردو تراجم میں 'مدرس' کے لفظ کو چھوڑ کر ایک مقام پر اس کی جگہ 'تفسیر کی کتاب' کے الفاظ لکھے ہیں (۲ ۔ تواریخ، ۱۳ : ۲۲) اور دوسری جگہ اس کا ترجمہ کیا ہے : "تواریخی دفتر" (۲ ۔ تواریخ، ۲۴ : ۲۷).

مآخذ : متن میں آ گئے ہیں ۔

(عبدالمنان عمر)

* **بیت المقدس :** رک به القدس.
* **بیتاب :** رک به ڈراما (اردو).
* **بیت لحم :** رک به بیت لحم.
* **بیچ :** (بیچ) ترکوں کے ہاں شہر وی انا کا نام ۔ سرب اور کروٹ قوموں کی طرح ترکوں نے بھی یہ لفظ ہنگری زبان سے لیا ہے، جہاں اس کے معنی "نواح شہر" یا "شہر کی بیرونی آبادی" اور مضافات کے ہیں (ہنگری میں külváros ؛ اسی وجه سے اولیا چلبی، ۷ : ۲۰۱ نے اس کی تشریح külwar سے کی ہے) جہاں یہ لفظ غالبًا باعتبار اصل کومان پیچنک Kuman-Pečenek (شاید اوار Avar بھی) beč کی طرف راجع ہوتا ہے (Gombocz-Melich : *Magyar Etymologiai Szótár*، Budapest ۱۹۱۴ء، بذیل مادہ) ۔ ترکوں کی جغرافیائی تصنیفات اور سفیروں کی رودادوں میں اس شہر کی بابت اطلاعات محض قلیل اور سطحی ہیں(قب Hammer-Purgstall کا ترجمہ ابوبکر بن بہرام سے در *Archiv f. Geographie, Historie, Staats und Kriegskunst*، ۱۸۲۲ء، ص ۲۸ ببعد؛ نیز Hammer-Purgstall، ۷ : ۲۱۵؛ Fr. Kraelitz : *Bericht über den Zug des Grossbotschafters Ibrahim Pascha nach Wien im Jahre 1719*، در *SBA Wien*، ۱۹۰۷ء)، اگرچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں وی انا پر سلطان سلیمان اعظم اور صدر اعظم قرا مصطفٰی پاشا کی زیر قیادت دو شدید حملے کیے گئے (قب Sturminger : *Bibliographie und Ikonographie der beiden Türkenbelagerungen Wiens 1529 und 1683*، وی انا ۱۹۵۵ء؛ اس کی شرح و تفسیر در *WZKM*، ص ۵۲؛ اور R. Kreutel : *Kara Mustafa vor Wien*، Graz ۱۹۵۵ء) ۔ اولیا چلبی کا دلچسپ بیان ان سب سے الگ ہے ۔ وہ ۱۶۶۵ء میں سفیر قرا محمد پاشا کے مصاحبین کے ہمراہ وی انا جانے کا دعوٰی کرتا ہے (قب *WZKM*، ص ۵۱، ۱۸۸ ببعد) ۔ اس نے اس شہر کا جو طویل بیان دیا ہے (سیاحت نامه، ۷ : ۲۴۷ تا ۳۲۹؛ ترجمه R. Kreutel : *Im Reiche des Goldenen Apfels*، Graz ۱۹۵۷ء) اس میں بہت سی سخیف اور بےکار باتیں ہیں مگر ان کے ساتھ ہی متعدد صحیح ملاحظات بھی ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول (عہد تنظیمات) میں ترکی مصنفات میں بیچ (Beč) کی جگہ وی انا کا نام ملتا ہے؛ اور آج کل شہر کے نام کی یہی صورت بالعموم مروج ہے ۔

(R. F. KREUTEL)

* **بیجاپور** : بھارت میں ریاست (=صوبہ) میسور کے ضلع بیجاپور کا صدر مقام اور شہر، جو ۱۶ درجے ۴۹ دقیقے شمال اور ۷۵ درجے ۴۴ دقیقے مشرق میں بمبئی سے ساڑھے تین سو میل جنوب میں واقع ہے ۔ ۱۹۵۱ء میں یہاں کی آبادی پینسٹھ ہزار سات سو چونتیس تھی - ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء تا ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء تقریبًا ایک صدی سے زائد مدت تک یہ شہر یادوا Yādava راجاؤں کا صدر مقام رہا تا آنکہ ۶۹۳ھ / ۱۲۹۴ء میں اسے علاء الدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی [رك بآن] بادشاہ دہلی کے لیے فتح کیا - ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ - ۱۴۸۶ء میں ایک شخص یوسف نام نے، جو ترک سلطان مراد ثانی کا بیٹا سمجھا جاتا ہے، بیجاپور کی مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور قلعہ تعمیر کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف اپنے بھائی محمّد ثانی کی تخت نشینی کے وقت اپنی والدہ کی ایک تدبیر کے ذریعے موت سے بچ گیا تھا [قبّ فرشتہ، ۲ : ۲] (لیکن ترک مؤرخوں کو اس قصّے کا علم نہیں ہے، قبّ خلیل ادھم : دولت اسلامیہ، ص ۹۵ م).

ترک مؤرّخ منجّم باشی نے (جس نے اپنی کتاب جامع الدوَل میں عادل شاہیوں کے حالات شامل کیے ہیں) یوسف کو ترکمانی الاصل قرار دیا ہے (اس مبحث کے لیے مزید دیکھیے اسماعیل حکمت ارتای لان Ertaylan : عادل شاہی لر، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۳ ببعد [اور فرشتہ، ۲ : ۲] - یوسف نے گوا پر بھی قبضہ کیا اور اسے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا ۔ اس نے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا جو خاندانی لقب بن گیا اور یہ خاندان بیجاپور کا عادل شاہی خاندان کہلایا ۔ اس کے بعد اس کے تین جانشین اس کی طرح دانا نہ تھے ۔ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء میں علی عادل شاہ تخت نشین ہوا ۔ اس نے بیجاپور کی شہر پناہ، جامع مسجد اور پختہ کاریزیں (نہر آب) تعمیر کرائیں اور رفاہ عامّہ کے دوسرے کام کیے - ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء میں بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے متحدہ فوجی دستوں نے تالی کوٹہ کی لڑائی میں وجیانگر کی فوجوں کو شکست دی ۔ علی عادل شاہ نے ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء میں انتقال کیا ۔ اس کی وفات پر اس کا کم سن بھتیجا ابراہیم عادل شاہ مشہور و معروف خاتون چاند بی بی کی زیرِ نگرانی تخت نشین ہوا اور سینتالیس سال تک خود مختار حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء میں فوت ہوا ۔ اس کا جانشین محمد عادل شاہ ہوا ۔ اس کے عہدِ حکومت میں مرہٹوں کے قائد شیواجی نے زور پکڑا ۔ شیواجی کا باپ شاہ جی بھونسلے، سلطان بیجاپور کا ایک معمولی عہدیدار تھا ۔ شیواجی نے بیجاپور ہی کے نمک پر پرورش پانے کے بعد حق نمک یوں ادا کیا کہ بیجاپور کے علاقے پر حملہ کر دیا اور ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء اور ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء کے مابین بہت سے اہم قلعوں پر قبضہ جما لیا ۔ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ - ۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب نے شہزادگی ہی کے زمانے میں بیجاپور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا ۔ لیکن شاہجہان کی شدید علالت کی خبر سن کر اسے محاصرہ اٹھا کر آگرے جانا پڑا ۔ تیس سال بعد ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں خاندان عادل شاہی کے آخری فرماں روا سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵-۱۶۸۶ء) کے زمانے میں اورنگ زیب بیجاپور کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا ۔ سکندر عادل شاہ قید ہوا اور اورنگ زیب نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا ۔ اس نے ۱۱۱۱ھ / ۱۶۹۹ - ۱۷۰۰ء میں وفات پائی ۔ ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء میں زہریلے قسم کی گلٹی دار طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، اورنگ زیب کی ایک حرم اورنگ آبادی محل سمیت ایک لاکھ پچاس ہزار نفوس اس وبا کی نذر ہوگئے اور ا

وبا میں اورنگ زیب کے ایک بڑے امیر غازی‌الدین فیروز جنگ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے آخری زمانے میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کو بیجاپور کی حکومت پر متعیّن کیا۔ اورنگ زیب کی وفات پر کام بخش نے بیجاپور میں ''دین پناہ'' کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں بیجاپور نظام حیدر آباد کی قلمرو میں شامل تھا، لیکن ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء میں ساٹھ لاکھ روپے کے عوض مرہٹوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں پیشوا کی معزولی پر انگریزوں نے بیجاپور پر قبضہ کر کے یہ علاقہ راجا ستارہ کو سونپ دیا۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۸ء تک یہ علاقہ اسی کے قبضے میں رہا۔ پور ریاست کے ختم ہو جانے پر بیجاپور برطانوی مقبوضات کا حصّہ بن گیا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں بیجا پور ایک الگ ضلع قرار پایا، بہت سے پرانے محلّات میں سرکاری دفاتر قائم کیے گئے جو بعد میں دوسری جگھوں پر منتقل ہوے۔

عادل شاہی سلاطین فن اور علم و ادب کے بڑے سر پرست تھے۔ ملک قمّی شاعر اور دو فارسی کلاسیکی کتابوں، سہ نثر اور مینا بازار کا مانا ہوا مصنّف ظہوری [مینا بازار کا ظہوری سے انتساب مشکوک ہے] ایک مدت تک ابراہیم عادل شاہ [ثانی] کے درباری شاعر رہے۔ ابراہیم عادل شاہ خود بھی شاعر تھا اور دکنی اُردو میں شعر کہتا تھا۔

۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء کی طاعون کی متعدی وبا کے علاوہ بیجاپور میں دو خوفناک قحط بھی پڑے۔ پہلا قحط ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷-۱۷۱۸ء میں پڑا اور برابر چھے سال تک شہر کی آبادی کو فنا کرتا رہا۔ اس قحط کو آج تک کھوپریوں کے قحط کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس قحط میں غیر مدفون لاشوں کے سروں سے زمین اٹ گئی تھی۔ دوسرا قحط ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸-۱۸۱۹ء میں ہوا، جس نے ایک اچھے خاصے بستے ہوے شہر کی آبادی گھٹا کر اسے چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک معمولی سے قصبے میں بدل دیا۔ اس وقت سے اب تک یہ شہر غیر آباد محلّات اور تاریخی کھنڈروں کا ایک شہر ہے۔ شدید قحط سالی کے دوسرے ادوار یہ تھے: ۱۲۳۰ھ/۱۸۲۴-۱۸۲۵ء، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲-۱۸۳۳ء، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۱۸۵۴ء، ۱۲۶۰ھ/۱۸۶۳-۱۸۶۴ء اور ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶-۱۸۶۷ء۔

مآخذ: (۱) بشیرالدین احمد: واقعاتِ مملکتِ بیجاپور (اُردو میں)، ۳ جلدیں، حیدر آباد ۱۹۱۴ء (کتاب کے دیباچے میں مصنّف اردو، فارسی اور انگریزی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مفصل مآخذ دیتا ہے)؛ (۲) وہی مصنّف: تاریخ بیجانگر، ۱۹۱۱ء؛ (۳) غلام مرتضٰی المعروف بہ صاحب حضرت: بساتین السّلاطین، حیدر آباد بدون تاریخ طباعت؛ (۴) محمد ابراہیم: روضۃ الاولیاء، بیجا پور (مطبوعۂ سید روشن علی)، حیدر آباد ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء؛ (۵) Storey، ۱/۱: ص ۷۳۲ تا ۷۳۶؛ ۱/۲، ص ۱۰۶ (۶۶)، ۱۳۳۱ھ؛ (۶) A History of the Freedom Movement، ج ۱، کراچی ۱۹۵۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) Imp. Gazetteer of India، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۱۷۱ تا ۱۸۸؛ (۸) Henry Cousens: Guide to Bijapur، بمبئی ۱۹۰۵ء؛ (۹) محمد ساقی مستعد خان: مآثرِ عالمگیری (Bibliotheca Indica)، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) خوافی خان: منتخب اللّباب (Bibliotheca Indica)، ۲: ۸۰۷ ببعد؛ (۱۱) جادو ناتھ سرکار: A History of Aurangzib، ۵ جلدیں، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) ہارون خان شروانی: The Battle of Tālīkōtā، در Journal of the Pakistan Historical Society، کراچی ۵/۳ (جولائی ۱۹۵۷ء)؛ (۱۳) معارف (اعظم گڑھ)، ۳/۷۳ و ۵/۷۳؛ [(۱۴) فرشتہ: تاریخ (کانپور

۱۸۸۳ء) ۲ :۳ تا ۹۲].

(بزمی انصاری)

یادگار عمارات : عادل شاہیوں نے فنِ تعمیر کو [دکن کے] دوسرے تمام حکمرانوں سے زیادہ ترقی دی ۔ ان کا فنِ عمارت ساخت اور جمالیاتی اعتبار سے تمام دکنی فنونِ تعمیر میں سب سے زیادہ خوش آئند ہے ۔ اسی لیے دہلی کے سوا ہندوستان کے ہر شہر کے مقابلے میں ان کے دارالحکومت بیجا پور کی نہایت عالیشان اور نمایاں عمارات عجب آب و تاب کا مظاہرہ کرتی ہیں ۔ بیجاپور کا طرزِ تعمیر بذاتِ خود جامع ہے اور اس کے دو بڑے ادوار میں تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے ۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہاں کی دلآویز کروی ساخت کی گنبدسازی ہے، جس میں آرائش کے طور پر غایت درجہ اعلٰی قسم کی مینا کاری و گلدستہ‌کاری پائی جاتی ہے ۔ بالخصوص یہاں کی تعمیر کے پہلے دور میں نمایاں چیز کنگنی‌دار کارنسی چھجے اور نہایت مضبوط و مستحکم مسالے کا استعمال ہے ۔ اس میں جو مسالا برتا گیا ہے وہ کنکری پلستر کاری یا گچ پر مشتمل ہے ۔ عمارت میں مقامی پتھر استعمال ہوا ہے، جو سیاہ رنگ کا بےلوچ اور سخت (دیول پتھر) ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معمار شمالی ہند سے بلائے گئے تھے اور مقامی ہندو کاریگروں سے بھی بہت کام لیا گیا تھا ۔

عادل شاہیوں سے پہلے کے چند عمارتی کام یہ ہیں : (۱) مکہ مسجد میں سادہ مینار (مقالۂ مینار) جس میں چوبی غلام گردش بنی ہوئی تھی؛ (۲) مسجد کریم الدین (کتبہ ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء) ۔ یہ ستون کڑی دار عمارت کی پنجرہ دار دیوار کی طرح درمیان سے ابھری ہوئی کڑیوں کے بنے ہوئے ہیں، اسے دیکھ کر گجرات کی [مسجد] [رک بان] کی یاد تازہ ہوتی ہے؛ (۳) بہمنی وزیر خواجہ جہاں کی مسجد (نواح ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ء) بھی ایسی ہی ہے لیکن اس میں روزنی پنجرہ دار دیوار نہیں ہے ۔

عادل شاہیوں کے زمانے کی کوئی بھی عمارت یقینی طور پر یوسف کے دورِ حکومت سے منسوب نہیں کی جا سکتی ۔ سب سے قدیم عمارت میں، جس کا سنۂ تعمیر معلوم ہے اور جو جامع مسجد یوسفی کہلاتی ہے، مابعد کے اونچے گول قبے پر تعمیر شدہ نصف کروی مینار کی جھلک صاف طور پر پائی جاتی ہے ۔ اس مینار کی بنیاد عمودی گلکاری کے ایک حلقے میں گھری ہوئی ہے ۔ یوں یہ پورا مینار پتیوں والے غنچۂ گل سے مشابہ نظر آتا ہے ۔ سامنے کی محرابیں دو مرکزوں سے ٹکراتی ہیں؛ (محرابوں کے) یہ خم تاج سے کچھ فاصلے پر رکنے کے بعد خم کے مماس سے گزرتے ہوئے چوٹی تک چلے جاتے ہیں ۔ (اس عمارت کے) ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲-۱۵۱۳ء کے کتبے سے پتا چلتا ہے کہ سلطان محمود شاہ ابن محمد شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں خواجہ سنْبُل نے اسے نصب کیا تھا ۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ عادل شاہیوں کی علٰیحدگی کے بعد بھی کچھ مدت تک بہمنی سیادت تسلیم کی جاتی تھی ۔ ابراہیم کے دور حکومت کی یادگار وسیع دکنی عیدگاہ (جو اب شہر پناہ کے اندر واقع ہے) اور متعدد چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں، جن میں سے ایک مسجد (مسجد اخلاص خاں) میں محراب کے سروں اور چوکھٹے کے درمیانی حصے کو تمغہ نما الواح سے بھر دیا ہے، جو قوسی شکل کی تکنیک کے سہارے استادہ ہیں ۔ بعد میں یہ نمونہ ایک عام آرائشی چیز بن گیا ۔ اس دور کی صرف ایک مسجد (ابراہیم ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵-۱۵۲۶ء) گنبد والی مسجد ہے ۔

علی اول کے طویل دورِ حکومت میں تعمیری کام بڑی مستعدی اور تیزی سے ہوتے رہے حصار شہر خصائص کے اعتبار سے غیر متوازن ہے کیونکہ اس کے ہر حصے کی تعمیر کا ذمےدار ایک

علیحدہ سردار تھا ۔ اس کی تکمیل ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں ہوئی ۔ اس میں پانچ بڑے دروازے تھے، جن کے اوپر ایک جانب بنے برجوں میں سوراخ کیے ہوئے تھے؛ ان برجوں تک خندق کے اوپر سے متحرک پلوں کے ذریعے سے آ جا سکتے تھے ۔ اس کے پیچھے باہر کی طرف والا پشتہ اور ایک خفیہ راستہ ہے (بہت سے برجوں میں ترمیم کر دی گئی ہے تاکہ بھاری توپوں کے متحمل ہو سکیں؛ کتبات محمد و علی ثانی) ۔ گگن (آسمان) محل ایک ایوانِ مجلس ہے، جس میں چوبی منبت کاری کا بہت سا کام کیا گیا ہے ۔ سید علی شہید پیر کی ایک یادگاری مسجد، جو رقبے میں چھوٹی (۱۰۰۸ میٹر مربع) ہے، لیکن اس کا دو تہائی سے زیادہ حصّہ پلستر کے ٹکڑوں (Cut-Plaster) سے مزیّن کیا گیا ہے ۔ عمارت کے روکار کے متوازی ڈھلواں اسطوانی شکل کی قوسی چھتیں ہیں اور محراب کے اوپر تنگ دُودکش کی طرح کا گنبد بنا ہوا ہے، جس سے باہر آنے کے لیے ایک دروازہ بنی ہے .

شاہ پور کے نواحی علاقے : بیجا پور سے باہر شاہ درگ (۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء)، دھارواڑ (۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء)، شاہ نور اور بانکپور (۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) کے قلعے، علی کا اپنا نہایت سادہ مقبرہ اور اس کی جامع مسجد ہے، جس کی تعمیر بالعموم ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء بتائی جاتی ہے ۔ یہ مسجد ایک عمدہ وسیع (۱۳ء۷۲ در ۸۲ء۰۳ میٹر) عمارت ہے، جو پوری طرح سے مکمل نہیں ہے (صرف پشتہ‌بندی موجود ہے جس پر بلند مینار ابھی تعمیر ہونے باقی تھے ۔ سامنے والے حصّے پر کوئی کنگرہ نہیں)؛ اس کی بہت کم زیبائش و آرائش کی گئی ہے ۔ ایوان کے سامنے کے حصّے کی سات محرابوں میں سے صرف درمیانی محراب ہلال نما ہے ۔ اس محراب کے سروں اور چوکھٹوں کے درمیانی حصّے کو کشیدہ تمغوں سے مزین کیا گیا ہے ۔ مربع شکل کی مسقّف غلام گردش کے اوپر ایک بڑا نصف کروی گنبد ہے، جس پر ہلال کا نشان ہے ۔ یہ نشان دکنی حکمران خاندانوں میں صرف عادل شاہیوں کے ہاں مروج تھا [جو ان کے ترک سلاطین کی نسل سے ہونے کا ایک ثبوت ہے] ۔ کارنسی چھجّا سابق کاموں پر ایک اچھا اضافہ ہے، جس میں ہر پشتے میں ایک یکساں قطار کے بدلے قدرے زیادہ گہری قوسیں نمایاں ہوتی ہیں ۔ گنبدنما طرز تعمیر کا انحصار متقاطع محرابوں پر ہوتا ہے ۔ محرابوں کے دو متقاطع مربعے گنبد کے نیچے سے پشتوں کے درمیان ایوان کے آر پار جاتے ہیں، جن کے ملنے سے ایک مثمّن شکل بنتی ہے؛ اسی پر گنبد قائم ہے ۔ اس طرح سے یہ گول مثلثیں ہال کے اوپر معلّق ہیں اور گنبد کو کسی ایک طرف جھک جانے سے روکتی ہیں ۔ بیرونی دیواریں سادہ محرابوں والی زیریں منزل کے راستے پر ختم ہوتی ہیں ۔ اس راستے پر کھلی محرابوں کا ایک چھتا ہے .

ابراہیم ثانی کے عہد حکومت میں عمدہ سنگ‌تراشی نے سابقہ کنکری پلستر کاری کی جگہ لے لی ۔ محل کے مختلف حصوں (سات منزلہ اناج کا گودام، چینی محل) میں ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کی تاریخیں ملتی ہیں ۔ سنگ تراشی سے بنی ہوئی پہلی عمارت (۹۹۴ھ/۱۵۸۵-۱۵۸۶ء) ملکۂ جہاں کی مسجد ہے، جس سے ایک نئی شکل ایجاد ہوتی ہے؛ وہ یوں کہ گل‌کاری سے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے جو تین چوتھائی دائرے کی شکل کا ہے ۔ بخاری مسجد اور نواحِ شاہ پور کی تین اور مسجدیں ایک سی ہیں ۔ عادل‌شاہیوں کی غالبًا سب سے بڑی عمارت ابراہیم روضہ ہے (جہاں ابراہیم ثانی اور اس کے کنبے کے مزار ہیں) ۔ اس میں بھی سنگ‌تراشی کا کام کیا گیا ہے ۔ ۱۳۷۰۲ میٹر مربع کے احاطۂ باغ میں عام سطح پر ایک مقبرہ اور مسجد واقع

ہیں ۔ مقبرے کے (جو کتبات کی تحریر کے مطابق خاص ملکۂ تاج سلطانہ کے لیے بنایا گیا تھا) ستون اور دوسرے آثار ناہموار ہیں ۔ تعویذ قبر ہندسی اور خطّاطی کے نمونوں سے مزیّن ہے ۔ مشہور ہے کہ قرآن حکیم کا پورا متن اس پر درج ہے ۔ مسجد کے ستون ترتیب سے ہیں ۔ مسجد کی پوری ساخت میں ایک کامل تناسب ہے اور تعمیر سے قبل اس کے نقشے کو نہایت غور و فکر سے بنایا گیا ہے ۔ ایک کتبے سے بحساب ابجد اس کی تاریخ بنا ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۶ء نکلتی ہے ۔ اس عہد کے محلات میں آنند محل، جو عیش و تفریح کے لیے تعمیر کیا گیا تھا (بساتین السلاطین) اور آثار محل (۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء) بھی شامل ہیں ۔ آثار محل کو چوبکاری سے مزیّن کیا گیا ہے ۔ اس میں کچھ چوبی تصویر کشی کا کام بھی ہے، جسے اطالوی کاریگروں کا کام خیال کیا جاتا ہے ۔ انڈا مسجد (۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء) اوپر کی منزل میں واقع ہے ۔ یہ غالبًا مستورات کے لیے مخصوص تھی ۔ اس کے نیچے ایک سراے ہے ۔ تعمیر کا کام نہایت صاف ستھرا اور جوڑدار ہے اور اس کے اوپر ایک ڈاٹ دار گنبد ہے ۔ ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء میں ابراہیم نے بیجاپور سے کوئی پانچ کیلومیٹر مغرب کی طرف صدر مقام بدلنا تجویز کیا تھا ۔ اس جگہ آب رسانی کا انتظام نسبۃً بہتر تھا؛ لیکن نیا شہر نورس پور ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء میں مکمل ہونے سے پہلے ہی ملک عنبر کے ہاتھوں تاراج ہو گیا اور اب کچھ باقی نہیں ہے ۔ دوسرے آثار میں نوگنبد نامی مسجد بھی شامل ہے ۔ یہ بیجاپور کی واحد مسجد ہے جس میں بہت سے گنبد ہیں ۔ حمید اور لطیف اللہ قادری (م ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء و ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء) پیر بھائیوں کا عمدہ لیکن نا مکمل مزار بھی اسی دور کی یادگار ہے ۔ اس دور کی آخری تعمیرات کا اعلٰی نمونہ مہتر محل ہے جو دراصل شہر کی ایک مسجد کے اندرونی صحن میں جانے کا صدر دروازہ ہے ۔ اس کا سامنے کا تنگ حصّہ ایک دُہرے عمودی مربع پر بنا ہوا ہے ۔ اس پر پتھر کی ماہی پشت نقاشی خوب کی گئی ہے ۔ اس پر ایک جھروکہ بنا ہوا ہے، جس کے سہارے کے لیے نقش و نگار والے پتھروں کی لمبی لمبی آڑیں بنی ہوئی ہیں ۔ ان کا آرائشی کام چوبکاری کے نمونوں سے ملتا جلتا ہے بلکہ فی الحقیقت اس سے بھی زیادہ موزوں ہے ۔ اندر کو عمدہ چوبی تختوں کی چھتیں ہیں اور باہر کی طرف کارنسی چھجے اور کامل مینار ہیں جن پر کثرت سے نقاشی کا کام کیا ہوا ہے ۔

کتبات اور تاریخی معلومات نہ ہونے کے سبب محمد کے دورِ حکومت کے تعمیراتی کاموں کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے ۔ مصطفٰی خان کی مسجد سادہ ہے ۔ اس کے رُوکار کی درمیانی محراب پہلو کی محرابوں سے زیادہ چوڑی ہے ۔ اس کی تعمیر میں بہت سے پرانے محلات کے نمونوں کا اتباع کیا گیا ہے؛ مصطفٰی خاں کی سراے (کتبہ ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰-۱۶۴۱ء)، عین پور کے مقام پر ایک محل؛ وزیر نواز خاں (م ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) کے مقبرے اور کئی دوسرے پیروں کے مزارات میں دوسری منزل بنا دینے اور عمارتوں کے مقابلے میں گنبد چھوٹے رکھنے کے باعث فن تعمیر کا روبہ زوال ہونا ظاہر ہوتا ہے ۔ افضل خان کے مزار اور مسجد کی دوسری منزل کی بلندی ناکافی ہے ۔ بیجاپور میں صرف یہی ایک دو منزلہ مسجد ہے ۔ بالائی ”ایوان“ [دالان] بھی ایک منبر کے سوا زیریں منزل کا مثنٰی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ حصّہ افضل خان کے زنانخانے (= زنانہ) کے لیے ہو، جس کے ۶۳ افراد کے مزارات ایک کیلومیٹر رقبے میں جنوب کی طرف واقع ہیں (کتبۂ مزار: ۱۰۴۴ھ/ ۱۶۳۴-۱۶۳۵ء) ۔ اس دور کا اہم اور بڑا تعمیری کام محمد کا اپنا مزار گول گنبد ہے، جو

ساخت کے اعتبار سے فن تعمیر میں مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ اس کے گنبد کی تعمیر مع مقبرے کے اجزا کے بظاہر سادہ ہے ۔ نصف کروی گنبد، جس کا بیرونی قطر ۴۳٫۹ میٹر ہے، تقریباً ۴۷٫۴ میٹر مربع مکعب تودے پر کھڑا ہے اور جس کے ہر زاویے پر ایک مثمن بنا ہوا ہے ۔ ایک ہی گنبد سے چھتا ہوا ۱۶۹۳ مربع میٹر کا یہ رقبہ دنیا بھر کے مسقف رقبوں میں سب سے بڑا ہے ۔ باہر کی طرف کی آرائش سادہ ہے، جو ۳٫۵ میٹر چوڑی چار دیوارگیریوں پر استادہ بڑے چھجے، گوشوں پر بنی ہوئی برجیوں کے موکھوں، روزنوں کے درمیان واقع فصیل کے حصے اور میناروں تک محدود ہے ۔ گنبد جامع مسجد کی طرح اندر کی طرف سے محرابوں کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے مربعوں پر کھڑا ہے ۔ جنوبی دروازے کے کتبے سے محمد کی تاریخ وفات بحساب ابجد ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶ء نکلتی ہے ۔ اس وقت پر شاید تعمیر کا کام رک گیا تھا کیونکہ پلستر کا کام نامکمل ہی رہ گیا ہے ۔ عین پور میں اس کی حرم جہاں بیگم کا مقبرہ بھی نا مکمل ہے ۔ اس کی بنیادیں، پشتے اور مثمن برج، گول گنبد کے معروف و متعارف پیمانے کے مطابق ہیں، لیکن یہاں گنبد کو درمیانی ایوان پر بنانے کی تجویز تھی۔

علی ثانی کے دور حکومت کے حصار قلعہ کے شہ نشین (جسے پانی محل کہتے تھے) اور مکہ مسجد، دونوں کی تعمیر کا کام نہایت عمدہ ہے ۔ ان پر نہایت عمدہ قسم کی نقاشی کی گئی ہے؛ یاقوت دابلی کے مقبرے کی عمارات میں مسجد غیر معمولی طور پر مقبرے سے زیادہ بڑی ہے ۔ علی کے اپنے نا مکمل مزار میں بیجا پور کی مخصوص محراب کے بجائے چار مرکزوں سے ٹکراتی ہوئی محرابیں ہیں ۔ جامع مسجد میں اورنگ زیب کے بنائے ہوئے مشرقی دروازے کے سوا بعد کی دوسری عمارتیں معمولی قسم کی ہیں ۔ عادل شاہیوں کے عمارتی جوش و خروش کا خاتمہ خورد سال شہزادہ سکندر کے مقبرے پر ہوتا ہے، جو کھلی فضا میں محض ایک (معمولی سی) قبر کی صورت میں ہے۔

مآخذ: بنیادی مصادر کے علاوہ بالخصوص دیکھیے: (۱) تاریخ فرشتہ اور (۲) ابراہیم زبیری: بساتین السلاطین؛ (۳) J. Fergusson و P.D. Hart : *Architectural illustrations of the principal Mahomedan buildings at Beejapore*، ۱۸۰۹ء؛ (۴) Fergusson و Meadows Taylor : *The architecture at Beejapoor*، ۱۸۶۶ء؛ ان دونوں سے پہلے (۵) H. Cousens : *Bījāpūr and its architectural remains* (= *NIS ‘ASI*، ج ۳۷)، بمبئی ۱۹۱۶ء؛ نیز (۶) Fergusson : *The great dome of Sultan Mohammed*، در *Trans. RIBA*، سلسلۂ اوّل، ج ۵، ۱۸۵۴-۱۸۵۵ء۔ کتبات کے لیے: (۷) M. Nazim : *Bijapur in Inscriptions* (= *MASI*، ج ۴۹)، دہلی ۱۹۳۶ء۔ عام طرز تعمیر کے لیے: (۸) Percy Brown : *Indian Architecture* (اسلامی دور)، بمبئی بدون تاریخ طباعت، لیکن پیمانے صحیح نہیں دیے ہیں؛ استحکامات کے لیے: (۹) Sidney Toy : *The stronghold of India*، لنڈن ۱۹۰۷ء (اس میں تاریخی معلومات غیر معتبر ہیں)؛ (۱۰) کچھ تفصیلی خاکے اور نقشے، در C. Batley : *The design development of Indian architecture*، لنڈن ۱۹۰۴ء۔

(J. BURTON-PAGE)

بیجان، احمد: صلاح الدین الکاتب کا بیٹا (لہٰذا المعروف بہ یازیجی اوغلو احمد) اور مشہور یازیجی اوغلو محمد کا چھوٹا بھائی، جو ایک ترکی صوفی مصنف اور ”مشہور معلم“ گزرا ہے ۔ اس نے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں زندگی پائی ۔ انقرہ کے حاجی بیرم (رک بآں) کی

زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تمام بھائیوں نے گیلی پولی میں فراغت کی زندگی بسر کی۔ احمد نے اتنی ریاضت و عبادت کی اور وہ اس قدر دبلا پتلا ہو گیا تھا کہ لوگ اسے "بے جان" یعنی مریل کہا کرتے تھے اور وہ خود بھی اپنی کتابوں میں اپنے آپ کو اس لقب سے یاد کرتا ہے۔ منتہی (دیکھیے نیچے) کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد یقیناً ۸۷۰ھ / ۱۴۶۵-۱۴۶۶ء تک زندہ رہا ہوگا۔ وہ گیلی پولی میں اپنے بھائی کے قریب ہی دفن ہوا، جہاں ان کی تربت ایک مقبول عوام زیارت گاہ تھی (قب اولیاچلبی، ۵ : ۳۲۰ و ۳ : ۳۰۱، جہاں اولیاچلبی یہ بھی لکھتا ہے کہ احمد کچھ عرصے صوفیہ میں بھی رہا)۔

اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں : (۱) انوار العاشقین (حاجی خلیفہ، طبع فلوگل، عدد ۱۳۱۱) : یہ کتاب احمد کے بھائی کی ایک عربی تصنیف مغارب الزمان کا ترکی زبان میں منثور ترجمہ ہے (حاجی خلیفہ عدد ۱۲۳۶۲)۔ اس کتاب کو اس نے محرم ۸۵۵ھ / فروری ۱۴۵۱ء میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ تصوف کی ایک معیاری کتاب ہے (اس کے مضامین کو Hammer نے *S.B. Ak. Wien. Phil.-Hist. Kl.*، ۳ : ۱۲۹ ببعد، میں بیان کیا ہے)، جسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ فہمی قرہ‌تای : استانبول یونیورسٹی کتب خانہ، ترکچہ باصمہ لر (*Ist. Ün. Küt. Turkče Basmalar*)، ۱۹۵۶ء، میں اس کی بارہ مطبوعہ اشاعتوں کا ذکر ہے۔

(۲) درِ مکنون (حاجی خلیفہ، عدد ۴۸۷۳) : اس کتاب کا موضوع احوالِ عالم اور مدعاے تصنیف قدرتِ الٰہی کا بیان ہے۔ یہ کتاب بھی مغارب الزمان پر مبنی ہے۔ (۳) عجائب المخلوقات (حاجی خلیفہ عدد ۸۰۷۰) : یہ کتاب قزوینی کی تصنیف کا خلاصہ ہے (قب Rieu : *CTM*، ص ۱۰۶)، ۸۵۷ھ / ۱۴۵۳ء میں تکمیل کو پہنچی (مطبوعۂ قازان ۱۸۸۸ء)۔ ان تینوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے بھی پائے جاتے ہیں۔ (۴) منتہی : عقیدہ و عمل کی بہترین تصنیف ہے۔ اس میں تفسیر آیات قرآن، سیر انبیا اور اقوال صلحا وغیرہ بھی شامل ہیں (اس کتاب کا قلمی نسخہ استانبول یونیورسٹی لائبریری (خالص افندی)، عدد Ty (ترکیات) ۳۳۲۴، میں ہے)۔ یہ کتاب گیلی پولی میں ۸۷۰ھ / ۱۴۶۵-۱۴۶۶ء میں لکھی گئی تھی (ورق ۲ ب)۔ موصوف کی تمام تصانیف سادہ واعظانہ رنگ میں ہیں اور ان کا لب و لہجہ انکسار و خلوص کی پاکیزگی پر مبنی ہے۔

تصنیف احمدیہ، جو اب تک مقبول عام ہے اور بعض اوقات احمد بیجان سے منسوب کی جاتی ہے، در حقیقت احمد مُرشدی کی تصنیف ہے (اس کے لیے دیکھیے *OM*، ۱ : ۳۳)۔

مآخذ : (۱) لطیفی، ص ۹۵؛ (۲) سَعْدُ الدّین، ۲ : ۶۰؛ (۳) عالی : کنہ، ۵ : ۲۳۷؛ (۴) (مجدی) : شقائق، ص ۱۲۸؛ (۵) Hammer-Purgstall، ۱ : ۱۹۷، ۶۰۱؛ (۶) وہی مصنف : *GOD*، ۱ : ۱۲۷ ببعد؛ (۷) Rieu : *CTM*، ۱۷ ب و ۱۰۵ ب و ۱۰۶ الف اور اس میں مندرج حوالہ جات؛ (۸) Gibb : *Ottoman Poetry*، ۱ : ۳۸۹ ببعد؛ (۹) *OM*، ۱ : ۱۶ و ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۱۰) وو۔ انگریزی، طبع اوّل، بذیل مادہ بیجان (بلانام مصنف = احمد بیجان Ahmad Bican، در وو۔ ترکی) و بازیجی اوغلو (از Fr. Babinger)؛ (۱۱) Fr. Taeschner : *Die geog. Lit. der Osmanen*، در *ZDMG*، ۷۳ (۱۹۲۳ء) : ۳۶ ببعد؛ (۱۲) E. Rossi : *Elenco dei Manoscritti Turchi della Bibl. Vaticana*، ۱۹۵۳ء، نیز اس میں مندرجہ دوسری فہارس کتب کے حوالہ جات۔

(V.L. MÉNAGE)

* **بیجا نگر** : رک بہ وجیا نگر.

⊗ **بیجر** : [= باجر]، پورا نام جارج پرسی بیجر George Percy Badger، ایک انگریز مستشرق جو ۱۸۱۵ء میں چیمز فورڈ میں پیدا ہوا اور جس نے مالٹا [= مالطه] اور ارض شام میں تعلیم پائی ۔ وہ مالٹی (= مالطی) اور عربی زبانوں کا ماہر تھا اور ۱۸۴۱ء میں کلیسائے انگلستان میں شامل ہوا ۔ وہ بہت عرصے تک انگریزی حکومت کی ملازمت کرتا رہا ۔ اس کی ملازمت کا زیادہ‌تر زمانہ ہندوستان، مغربی ایشیا اور مشرقی افریقہ میں گزرا - *The Nestorians and their Rituals*، ۱۸۵۲ء؛ *History of Imāms and Sayyids of Omān*، ۱۸۷۱ء اور انگریزی عربی لغت (*English-Arabic Lexicon*)، ۱۸۸۱ء [بار دوم، بیروت ۱۹۶۷ء] اس کی مشہور تصانیف ہیں ۔ بیجر کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا.

مآخذ : (۱) Joseph Thomas : *Universal Pronouncing Dictionary of Biography and Mythology*، فیلاڈلفیا و لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۲) *New Century Cyclopedia of Names*، نیویارک.

(سید نذیر نیازی)

* **بیجوان** : رک بہ باجلان.

⊗ **بیجه** : [= بجه]؛ رک بہ باجه.

* **بیحان** : (بَیحان) جنوبی عرب [یمن] میں ایک وادی [ندی] اور ایک علاقہ جو وادی حریب (رک بآں) کے جو اس کی مغربی جانب ہے اور وادی مرخہ کے (جس میں نسیین کی سطح مرتفع بھی ہے) جو اس کے مشرق میں ہے، درمیان واقع ہے (قب مقالۂ عَولَقی) ۔ یہ طویل وادی جو نور عوذلۃ (قب مقالۂ عَوذَلی) سے تخمیناً ۱۰۰ کیلومیٹر (۶۰ میل) شمال کی جانب چلی گئی ہے یہاں تک کہ اس کا خشک ''مثلثی دہانہ (delta) رملۃ سبتین کے ریگستان میں گم ہو جاتا ہے کسی زمانے میں عہد قدیم کی ریاست قتبان (رک بآں) کا مرکز تھی ۔ امریکہ سے ۱۹۵۰ء میں جو تحقیقی جمعیت آئی اس کی بدولت بیحان اس وقت جنوبی عرب کے تمام اضلاع میں سب سے زیادہ جانا پہنچانا ضلع ہے ۔

قتبانی کتبوں میں ''ب ی ح ن'' فقط ایک قبیلے (ذوبیحان) یا ایک معبد کے معنی رکھتا ہے۔ یہ حقیقت اشتقاق سے مطابقت نہیں رکھتی جو لینڈ برگ Landberg نے لکھا ہے (*Arabica* ۵ : ۳) جس کی رو سے اس لفظ کے معنی (حمی کے خلاف) ''مشترک چراگاہ'' کے ہیں ۔ سبائی متون سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک اور بیحان بھی ہے جو علاقۂ جوف کے اندر ایک مقام ہے (Ryckmans ۱ : ۳۲۳، Grohmann ۱ : ۱۷۳؛ دیکھیے Wissmann و Hofner ۱۵ : ۷۷) ۔ الہمدانی : صفۃ جزیرۃ العرب کے مطابق بیحان کی آبپاشی ردمان اور حصی سے ہوتی تھی لیکن پینے کا پانی وادی صدارۃ سے حاصل ہوتا تھا ۔ آبادی کا اکثر حصہ بنو مراد میں سے تھا جن میں آل مکرمان کا سردار قبیلۂ مذحج میں بڑی شہرت رکھتا تھا ۔ یاقوت نے بیحان کو جنوبی عرب [یمن] کے اضلاع (مخلاف) کی اپنی دی ہوئی فہرست میں شامل کیا ہے ۔

بیحانی اضلاع بھی تین ہیں جن میں باہم فرق کرنا چاہیے : (۱) بیحان الدولۃ (بیحان الأعلی)، اس وادی کا تنگ، بنجر اور کہیں کہیں آباد وہ بالائی حصہ ہے جو وادی کے شروع سے لے کر بیحان القصاب کی سرحد پر واقع ناطع تک چلا گیا ہے ۔ علاقۂ بنیر [رک بآں] کی طرح یہ بھی پہلے سلطنت رصاص کا ایک حصہ تھا لیکن اس وقت مملکت یمن میں شامل ہے ۔ آب و ہوا مضر صحت ہے اور اس کی وجہ غیل کا ساکن و متعفن پانی ہے ۔ اس ضلع کا صدر مقام البیضاء (رک بآں) جنوب میں ہے ۔ (۲) بیحان القصاب جو وادی کے بیچ کا

سرسبز اور زرخیز خطّہ ہے ۔ (دیکھیے مقالہ آئندہ) ۔ (۳) بیحان الاسفل وادی کا بقیہ شمالی حصہ، کہیں کہیں سے آباد میدان ہے جو رفتہ رفتہ آگے چل کر چوڑا بن جاتا ہے ۔ اس کے چار اقطاع (حنو الشطّ، حقبہ، عسیلان) میں اولادِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کا غلبہ رہا، پہلے دو میں سادات کا اور آخری دو میں اشراف کا، اسی لیے اس پورے علاقے کا لقب ''بلاد السادة / الاشراف'' پڑ گیا ۔ اس کا صدر مقام نُقُوب ہے جہاں ہوائی جہازوں کے اترنے کا میدان ہے ۔ یہاں بہت سے بدوی بھی رہتے ہیں جن میں سے اکثر بلحارث [بنو الحارث] ہیں ۔ اسی قبیلے کے قبضے میں ایادیم کی نمک کی کانیں ہیں جو صحرا کے اندر دور جا کر واقع ہیں اور بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

کاریزوں کے موجود ہونے کی بدولت قدیم زمانے میں یہ علاقہ کثرت سے زیر کاشت تھا ۔ صدیوں تک قتبان کی شاہی حکومت نے یہاں اپنا مرکز شبوۃ (رَكَ بآن) اور مارب (رَكَ بآن) کے درمیان شاہراہ بخور (incense road) کے کنارے رکھا تھا ۔ خاص توجہ کی جگہ تلّ حَجَر کحلان ہے جو عسیلان کے تھوڑا سا جنوب مغرب میں ہے ۔ یہاں کے کتبات کی مدد سے Rhodokanakis پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں تِمنع یا تُمنع (Thomna : Pling) قتبان کا دارالسلطنت واقع تھا، ۱۹۵۰ء میں یہاں جو چیزیں دریافت ہوئیں خصوصاً رومن اریٹائن Roman Arretine ظروف ان سے شہر کی آتش زدگی سے بربادی کی تخمینی تاریخ ۱۰ء مقرر کی جا سکتی ہے ۔ ی ف ش (یفش) اور ح د ث (حدث) نام کے دو محلوں کی کھدائیوں میں ڈھیروں کتبے نکلے ۔ شہزادی ب ر ءت کا کانسی کا مجسمہ اور دو یونانی نمونے کے نفیس برنجی شیر بھی یہاں سے نکلے ہیں جن پر بچے سوار ہیں ۔ حَید بن عَقیل میں تمنع کا قبرستان ملا اور اس کے کچھ حصّے کا تفحّص بھی کر لیا گیا ۔ جنوب کی جانب آگے بڑھ کر حِصْنُ الحَجَر اور حَجَر بن حُمَید میں بھی قدیم کھنڈر ملے ۔ یہاں وادی بیحان اور وادی مَبلقہ کے مقام اتّصال پر ایک طبق بر طبق شدہ ٹیکرے کو وارپار بہت دور تک گہرا کھودا گیا اور اس سے یہ رائے قائم کرنے کی گنجائش نکل آئی کہ یہاں قدیم سے کوزہ گری ہوتی تھی ۔ جس کی ابتدا کا سراغ تقریباً ۱۰۰۰ ق ۔ م تک چلا جاتا ہے، جب کہ اس شہر میں سب سے پہلے مکانات بنائے گئے تھے ۔ پھر بارہ سو سال کے زمانے میں یعنی اس وقت تک کہ آب پاشی کا نظام متروک ہوا ۔ میدان کی سطح تقریباً آٹھ میٹر بلند ہو گئی (یعنی ہر ڈیڑھ سال میں ایک سنٹی میٹر کے حساب سے) ۔ حَجَر بن حُمَید کے مقام کی کھدائیوں میں سب سے اونچی جگہ وہ ہے جہاں چنائی کے بارہ دروں کی بنی ہوئی ایک عمارت تھی جو غالباً پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی ۔

مآخذ: (۱) الهمدانی: صِفَة، طبع Müller ص ۹۸، و مواضع کثیرہ؛ ترجمہ از Forrer ص ۱۰۸؛ (۲) یاقوت ۱ : ۷۸۲، ۳ : ۳۳۳؛ (۳) عُمارة [: اخبار الیمن]، ۵ بعد، ۱۰۱، ۱۲۳؛ (۴) ابن المُجَاور: تاریخ المُستَبصر (طبع مقالہ نگار)، ص ۶۷ بعد، ۱۹۹، ۲۰۲، ۲۰۹؛ (۵) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، مواضع کثیرہ؛ (٦) G. Ryckmans : *Les noms propres sud-sémitiques*، ۱ : ۲۸٦، ۳۲۳، ۲ : ۳۷؛ (۷) A. Sprenger : *Die alte Geographie Arabiens*، ص ۱۸۸ ببعد، ۲۵۳؛ (۸) C. Landberg : *Arabica*، ۵ : ۱ تا ۷۸؛ (۹) H. v. Wissmann و M. Höfner : *Beiträge zur histor. Geographie des vorislam. Südarabien* (1952)، ص ۱۵، ۴۳ تا ۵۰، ۷۷؛ (۱۰) W. Phillips : *Qataban and Sheba* (1955)، ص ۳۱ تا

۱۳۰، ۱۳۱ تا ۱۷۷، ۲۰۹ تا ۲۱۸؛ (۱۱) D. Ingrams: *Survey of social and economic conditions in the Aden protectorate (1949)*، ص ۳۳، ۴۲، ۱۲۶ ببعد؛ (۱۲) R. Le Baron Bowen و ۱۴۲، ۱۴۸؛ *Archaeological Discoveries in* : F. P. Albright، *South Arabia (1958)*، حصہ ۱ (ص ۱ تا ۲۱۲)، مع نقشہ جات)؛ عام نقشہ : v. Wissmann : جنوبی عرب، لوح ۱ (۱۹۵۷ء، پیمانہ ۱ : ۵۰۰،۰۰۰)۔

(O. LÖFGREN)

بَیْحان القَصاب : وادی بَیْحان کا درمیانی حصّہ (دیکھیے مقالۂ بالا) بَیحان الدولۃ (جنوب) اور بَیحان الاَسْفل (شمال) کے درمیان واقع ہے ۔ اسی میں وادی الخِرّ بھی شامل ہے جو جنوب میں شروع ہو کر وادی بیحان کے مغرب کی طرف گئی ہے یہاں تک کہ شہر القصاب کے قریب آخر الذّکر میں سے آ ملتی ہے ۔ بَیحان القَصاب اور بَیحان الاَسْفل دونوں مل کر آج کل خود مختار مملکت بیحان بن گئے ہیں جو مغربی عدن کے علاقے میں شامل ہے ۔ اس مملکت کی جنوب مغربی اور شمال مغربی سرحدیں اسی خط کا ایک حصّہ ہیں جو ۱۹۳۴ء میں یمن اور علاقۂ زیر حمایت کے درمیان بدستور رہنے دیا گیا ۔ باقی سرحدیں یہ ہیں، مشرق میں کوہستان عَولَقی کا بالائی حصّہ، شمال مشرق میں قبائل کَرَب اور الرُّبع الخالی (غیر آباد خطّے) کے کنارے۔

بیحان القصاب (آبادی تقریباً ۸۰۰۰) میں زیر زمین پانی کی افراط ہے اور اکثر چند گز زمین کھودنے ہی سے پانی نکل آتا ہے ۔ دو سو سے خاصے زیادہ کنویں چلتے ہیں اور آب‌پاشی کا کافی انتظام ہے ۔ بارش باقاعدہ نہیں ہوتی ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں بارش نہیں ہوتی ۔ اس سر زمین میں کھجور اور عِلب (ایک قسم کی سخت جنگلی لکڑی کا درخت) کے درختوں کے جھنڈ اور دیگر سبزیوں کی کثرت ہے ۔ بڑی پیداوار اور فصلیں یہ ہیں : کھجور، نَبق (ایک میٹھی پھلی)، انجیر، انگور، گندم، جو، باجرا، جوار، دخن (مکئی)، تل، نیل اور کپاس ۔ بھیڑ بکریوں کے لیے بہت اچھی چراگاہیں ہیں اور یہ سر زمین اونٹوں کی ایک خاص نسل کی پرورش کے لیے مشہور ہے ۔ آبادی قبیلہ المُصْعَبین پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے اس کی دو بڑی شاخیں ہیں : آل احمد اور آل عُرَیف ۔ یہ لوگ بہت سے دیہات میں آباد ہیں ۔ بڑا شہر قصاب ہے جسے حِصن عبداللہ بھی کہتے ہیں ۔ یہ اس علاقے کا بڑا تجارتی مرکز اور نظم و نسق کا ایک اہم مقام ہے ۔ القصاب میں ہوائی اڈا اور لاسلکی کا ایک مرکز بھی ہے ۔

اشراف اور سادات کا کوئی الگ قبیلہ نہیں ہے ۔ جب شریف احمد بن محسن نے برطانیہ سے ۱۹۰۳ء میں معاہدہ کیا تو انھیں بیحان الاَسْفل کے بلحارث اور المُصْعَبین کے ایک گروہ آل احمد کی تائید برابر حاصل تھی ۔ بعد میں جب ملک میں اندرونی حالات بدلنا شروع ہوے اور اس علاقے پر یمن نے اپنا حق ظاہر کیا اور یہاں کے باشندوں سے اپنی اطاعت کرانا چاہی تو حفاظتی مصالح کا تقاضا ہوا کہ زیر حفاظت علاقے کے مقامی برطانوی عمّال کی مدد سے سارے علاقے اور مغربی بیحان پر تسلّط کے لیے ''رئیسِ مُعاہد'' (Treaty Chief) کی قوت مضبوط کی جائے ۔ ۱۹۴۴ء میں بیحان کے صغیرالسّن شریف کے اتالیق نے برطانیہ سے ایک اور معاہدہ کیا، جس کی رو سے اس نے اپنے ملک کے انتظام میں اور مالیات کے اخراجات میں برطانیہ کے مشورے کے مطابق چلنے کا اقرار کیا ۔ شریف کا دارالحکومت النُّقُوب میں ہے، جہاں

طیّارے اترنے کا ایک میدان ہے ۔ حال ہی میں المصعبین کو نیم خود مختار مان لیا گیا ہے اور ان سے ایک چھوٹا سا معاہدہ ہو گیا ہے کہ وہ ایک ہوائی اڈے کی حفاظت کریں گے ۔ یہاں ایک شرعی اور ایک قانون عام (عرف) کی عدالت ہے، اور یحان میں لڑکیوں کے دو ابتدائی مدرسے ہیں۔

مآخذ : (۱) C. Landberg : *Arabica*، ۵ : ۱ تا ۶۳؛ (۲) A. Hamilton : *The Kingdom of Melchoir*، لنڈن ۱۹۴۹ء، مواضع کثیرہ؛ (۳) D. Ingrams : *A Survey of Social and Economic Conditions in the Aden Protectorate*، ۱۹۴۹، مواضع کثیرہ (مع نقشہ)؛ (۴) F. Balsan : *A Travers l'Arabie Inconnue*، ۱۹۵۴ء، مواضع کثیرہ؛ (۵) W. Phillips : *Qataban and Sheba*، ۱۹۵۵ء، مواضع کثیرہ.

(M.A. GHUL)

* **بید پای** : رک بہ کلیلہ و دمنہ.

⊗ **بیدر (محمد آباد)** : کا محلّ وقوع عرض البلد ۱۷° ۵۵'' شمال اور طول البلد ۷۷° ۳۰'' مشرق میں ہے ۔ یہ آج کل ریاست حیدر آباد (دکن) کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے اور کسی زمانے میں بہمنی اور بریدی سلاطین کا پایۂ تخت رہا ہے ۔ تاریخی آثار سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے قبضے سے پہلے بھی یہ شہر کافی اہمیت کا حامل تھا، لیکن اس کے صحیح اور مسلسل حالات کسی جگہ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتے ۔ ۱۳۲۲ء میں اُلُغ خان نے اس پر قبضہ کیا اور سلطنتِ دہلی سے اس کا الحاق ہو گیا ۔ الغ خان اس واقعے کے تین سال بعد محمد بن تغلق شاہ کے خطاب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا اور تقریباً تمام جزیرہ‌نمائے ہند کا فرمانروا بن گیا ۔ لیکن دکن کی فتح محمد بن تغلق کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوئی اور اسے پے در پے بغاوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا، جن میں سے اہم امیرانِ صدہ کی بغاوت تھی ۔ آخر کار ستمبر ۱۳۴۶ء میں دکنی سرداروں نے امیر اسمٰعیل مُخ کو سلطان ناصر الدین اسمٰعیل شاہ کا خطاب دے کر اپنا فرمانروا منتخب کیا اور دولت آباد میں اسے تخت پر بٹھایا، لیکن بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ ایک اور امیر صدہ یعنی 'حسن گنگو' جسے محمد بن تغلق نے ظفر خان کا خطاب دیا تھا، قابلیت اور جنگی اہلیت میں ناصر الدین اسمٰعیل سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، اور جب ظفر خان نے دشمن کو بیدر کے مقام پر شکست فاش دی تو اس کا دکن کی سلطنت پر ایک طرح کا حق پیدا ہو گیا، چنانچہ واقعات اور حالات سے مجبور ہو کر اسمٰعیل شاہ نے اگست ۱۳۴۷ء میں تخت سے دستبرداری دے دی اور اس کی جگہ حسن گنگو سکندر ثانی علاء الدنیا والدین ابوالمظفر بہمن شاہ کے لقب سے بادشاہ منتخب ہوا۔

اس واقعے سے ٹھیک پچھتر سال بعد یعنی ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء شہاب الدین احمد شاہ اول نے بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت احسن آباد گلبرگہ [رک بآں] سے بیدر منتقل کر دیا اور اپنے بیٹے شاہزادۂ محمد کے نام پر بیدر کا نام محمد آباد رکھ دیا ۔ کہتے ہیں کہ احمد شاہ ایک روز شکار کھیل رہا تھا کہ اسے ایک لومڑی ایک کتے کا تعاقب کرتی نظر آئی ۔ اسے یہ بڑا اچنبھا معلوم ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون سا مقام ہے کہ اس کی آب و ہوا کے اثر سے لومڑیاں کتوں کے پیچھے بھاگتی ہیں ۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ بیدر کا علاقہ ہے تو اس نے سوچا کہ جب جانوروں کی یہ حالت ہے تو انسانوں کی توانائی اور چستی پر یہاں کے پانی کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا اور اسی خیال سے اس نے اپنے پایۂ تخت کو بیدر منتقل کر دیا، لیکن تقریباً اسی قسم کی روایتیں بعض دوسرے مقامات کے متعلق بھی پڑھنے

میں آتی ہیں اور سن گھڑت معلوم ہوتی ہیں ۔ یوں تو بیدر صدیوں پرانا شہر تھا مگر بہمنی دور کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ کافی اہمیت لیے ہوے تھا ۔ چونکہ یہ سطح سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ بلند سطح مرتفع پر واقع ہے، اس لیے فوجی اعتبار سے اس کا محل وقوع ہمیشہ سے اہم رہا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ احمد شاہ کو اس کی عمدہ آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ گلبرگہ کے جھگڑوں اور خانہ جنگیوں سے اپنے آپ کو نکال لینا چاہتا تھا، اپنی تخت نشینی کے بعد ہی سے یہ خیال ہو گیا تھا کہ بیدر ہی کو بہمنی سلطنت کا پاے تخت بناے اور بظاہر اس فیصلے میں کسی لومڑی اور کتے کے تعاقب کا کوئی اثر نہ پڑا ہو گا.

بیدر (محمد آباد) میں آٹھ بہمنی سلاطین نے حکومت کی، لیکن اس شہر کو علما و فضلا کا مرکز بنانے اور بقول ایک روسی سیاح کے، جس نے اس زمانے میں ہندوستان کا سفر کیا تھا، اسلامی ہند کا سب سے بڑا مرکز بنانے میں شمس الدین محمد شاہ سوم کے وزیر با تدبیر خواجہ عماد الدین محمود گاواں کا نام نہایت ممتاز ہے ۔ محمود گاواں سلطنت کی فرقہ بندیوں اور ذاتی عناد کی قربان گاہ پر ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء میں بھینٹ چڑھ گیا اور اس واقعۂ ہائلہ کے بعد سلطنت میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جو مرکز گریز قوتوں سے اسے بچا سکے ۔ بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور برار کے طرندار (صوبہ‌دار) اپنے اپنے صوبے میں خود مختار بن بیٹھے اور خاص پاے تخت محمد آباد بیدر میں برید الممالک محمد قاسم برید سلطان محمود شاہ بہمنی پر اتنا حاوی ہو گیا کہ خود اپنا ہی ''کوس لِمَنِ المُلک'' بجانے لگا؛ لیکن بہمنی خاندان کے کارناموں کا لوگوں پر اتنا رعب تھا کہ کسی صوبے دار کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنی آزادی کا اعلان کر دے، چنانچہ بیدر میں بھی قاسم برید کا پوتا علی برید پہلا بریدی فرمانروا تھا جس نے (شاید آخری بہمنی فرمانروا کلیم اللہ کے انتقال کے بعد) اپنی سلطنت کا اعلان کیا ۔ بیدر پر بریدی بادشاہ [رک بہ برید شاہی] ۱۶۱۹ء تک حکومت کرتے رہے ۔ اس سال ابراہیم عادل شاہ نے بیدر پر قبضہ کر لیا اور یہ ۱۶۵۶ء تک سلطنت بیجا پور کا جزو بنا رہا ۔ ۱۶۵۶ء میں اس کا سلطنت مغلیہ سے الحاق ہو گیا اور جب نظام الملک آصف جاہ اول نے ۱۷۲۴ء میں مبارزخان کو شکر کھیڑے کے مقام پر شکست دے کر اپنا پرچم دکن کے صوبوں پر اڑایا تو بیدر بھی آصف جاہی عملداری میں آ گیا.

بہمنی بادشاہوں کا ذکر دوسری جگہ کیا گیا ہے [رک بہ بہمنی سلطنت]؛ یہاں بریدی فرمانرواؤں کی فہرست دی جاتی ہے :

۱ ۔ قاسم برید الملک، وزیر اعظم ۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء.

۲ ۔ امیر برید، وزیر اعظم ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء.

۳ ۔ علی برید شاہ، تخت نشینی ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء.

۴ ۔ ابراہیم برید شاہ، تخت نشینی ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء.

۵ ۔ قاسم برید شاہ، تخت نشینی ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء.

۶ ۔ امیر برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء.

۷ ۔ میرزا علی برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء.

۸ ۔ میرزا امیر برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء (واضح ہو کہ آخری تین فرمانرواؤں کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں بلکہ یہ بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے پہلے کون گدی پر بیٹھا اور کون اس کے بعد).

چونکہ بیدر (محمد آباد) میں یکے بعد دیگرے بہمنیوں، بریدیوں، مغلوں اور آصف جاهیوں کے پرچم لہرائے، اس لیے ایک اعتبار سے یہ شہر دکن کے مختلف تمدّنوں کا گہوارہ رہا ہے اور اس میں تینوں چاروں ادوار کی عمارتیں ملتی ہیں - سب سے پہلے تو قلعے کو لیجیے جس کے داخلے کے دروازوں میں پہلا اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کا، دوسرا غالبًا سلطان محمود شاہ بہمنی (۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) کے زمانے کا اور تیسرا شہاب الدین احمد شاہ اول (۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۶ء) کے عہد کا ہے ۔ دوسرے دروازے کو شرزہ دروازہ کہتے ہیں اور اس کی محراب پر خود سلطان محمود شاہ بہمنی کے ہاتھ کی تحریر ہے - ذرا آگے بڑھ کر بائیں جانب چند بریدی ایوان نظر آتے ہیں، جن میں شاید سب سے ممتاز رنگین محل ہے - اس محل کے برآمدے کی چوب لکڑی کے خوبصورت پیل پایوں پر استادہ ہے جن سے قدیم چالوکی مندروں کے پیل پایوں کی یاد تازہ ہوتی ہے - رنگین محل کا بیشتر حصّہ علی برید شاہ نے تعمیر اور مزیّن کیا تھا - اس فرمانروا کو فنِ تعمیر سے خاص شغف تھا، چنانچہ اس نے اپنے شہ نشین کو سیپ کے کام کے نہایت خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ کیا اور یہ اپنے زمانے کے فن کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں - چند اشعار ملاحظہ ہوں :

شہ نشین کے اندرونی دروازے پر :

هر دُرِّ ثمین کہ در صدف دارد عشق
از بہر نثار درگہت دارد عشق
عاشق شود آنکس کہ درآید ز درت
گویا ز در و باغ تو می‌یابد عشق

کھڑکی پر :

اے منظر دیدہ از جمالت روشن
وے کردہ چو دُر در صدفِ سینہ وطن
بخرام بشہ‌نشینِ خلوت کہ دل
کز بہر تو آراستہ شد ایں گلشن

یہاں سے ذرا آگے بائیں ہاتھ کی طرف سولہ کھمبا مسجد ملتی ہے، جس پر ۸۲۷ھ / ۱۳۲۶ء کا کتبہ لگا ہوا ہے - اس مسجد کی چھت پر ایک بہت بڑا ذخیرۂ آب ہے، جو نہ صرف مسجد کے لیے بلکہ اکثر محلّات کے لیے بھی پانی فراهم کرتا تھا - یہاں سے کچھ ہی دور ایوان بارِ عام اور ایوان بارِ خاص کے کھنڈر ہیں اور ان سے ملا ہوا تخت محل ہے، جس کی بیرونی روکار پر شیر و خورشید کی شبیہیں اس کا ثبوت دیتی ہیں کہ ان ایوانوں کے مکینوں پر ایرانی تمدّن کا کتنا اثر تھا .

لیکن بیدر (محمد آباد) کی عمارتوں کا سرتاج قلعہ نہیں بلکہ خواجہ عماد الدین محمود گاواں کا مدرسہ ہے، جسے اس نے ۸۷۶ھ / ۱۴۷۱ - ۱۴۷۲ء میں تعمیر کیا تھا - یہ مدرسہ سہ منزلہ ہے اور اس میں بیسیوں وسیع ہال اور چھوٹے بڑے کمرے اب بھی موجود ہیں - مدرسے کی بیرونی روکار پر چینی کی پچی کاری میں قرآن مجید کی آیت سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ (۳۹ [الزُمَر] : ۷۳) آج بھی معلّمین و متعلّمین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے - اس مدرسے کے دونوں طرف اونچے اونچے ایرانی نمونے کے دو مینار تھے، جن میں سے ایک مینار اور مدرسے کی ایک پوری سمت بارود کے دھماکے سے ۱۱۰۷ھ / ۱۶۹۶ء میں اڑ گئی؛ چنانچہ صرف ایک مینار باقی ہے .

بیدر کے مغرب میں اشٹور نامی گاؤں میں بہمنی بادشاہوں کے اور مشرق میں بریدی فرمانرواؤں کے مقبرے ہیں - بہمنی مقبروں میں سب سے حسین مقبرہ شہاب الدین احمد شاہ ولی کا ہے - اس مقبرے کے اندر نیچے سے اوپر تک گوناگوں اور بوقلموں رنگ آمیزی، طغرے، ثلث، نسخ اور نستعلیق کتبات بھرے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانیؒ کے

اشعار نظر آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر دو تین اشعار درج کیے جاتے ہیں :

تا محیطِ دیدہ بر زد موجِ عشق
هفت دریا را چو سیلے دیدہ‌ام
نعمت اللہ یافتم در هر وجود
با همه عشقی و میلی دیدہ‌ام
نعمت اللہ در همه عالم یکیست
لا تجِدْ مِثلی و مِثْلی لا تجد

اس قسم کے صوفیانہ اشعار کے علاوہ جگہ جگہ آیات قرآنی، حمد و نعت اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور حضرت علیؓ کے اسماے مبارک طرح طرح سے لکھے ہوے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی ازمنۂ وسطٰی کے فن تعمیر میں احمد شاہ ولی کے مقبرے کا بہت اونچا مقام ہے ۔

برید شاہی مقبروں میں سب سے نمایاں مقبرہ علی برید شاہ کا ہے، جسے خود صاحبِ مقبرہ نے ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں بنوایا تھا ۔ اس مقبرے سے نظر کو بڑا دھوکا ہوتا ہے ۔ گو اس کی کرسی سات فٹ بلند ہے اور ہر سمت ۷۵، ۷۵ فٹ طویل ہے اور گنبد کا بالا ترین حصّہ سطح زمین سے ۱۰۶ فٹ بلند ہے، تاہم ہر حصہ اس قدر متناسب ہے کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا ۔ مقبرہ چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے اور اندرونی روکار قرآن مجید کی آیتوں اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے اشعار سے مزیّن ہے ۔ مقبرے کی تاریخ ان اشعار سے نکلتی ہے :

بانیِ ایں گنبدِ گردوں مثال
شاہ فرخندہ بریدِ نیک خو
مصرعِ آخر کہ تاریخ بناست
''نام گنبد قبّۃ الانوار گو''

۹۸۴ھ

آخر میں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کا نام کئی مرتبہ بدلا گیا ہے ۔ احمد شاہ ولی نے جب اسے اپنا پاے تخت بنایا اس کا نام محمد آباد رکھا، اورنگ زیب عالمگیر نے اسے ظفر آباد نام دیا اور اب اسے محمد آباد بیدر یا صرف بیدر کہتے ہیں اور احمد شاہ ولی کی نسبت سے بعض مرتبہ اسے بیدر شریف بھی کہا جاتا ہے ۔

مآخذ : (۱) بشیر الدین احمد : تاریخ مملکت بیجاپور، حصۂ سوم؛ (۲) عزیز مرزا : سیرۃ المحمود؛ (۳) *Cambridge History of India. Vol. III*؛ (۴) غلام یزدانی : *Antiquities of Bidar*؛ (۵) وہی مصنف : *Bidar : its History and Monuments*؛ (۶) ہارون خاں شروانی : *Mahmud Gawan, the great Bahmani Wazir*؛ (۷) وہی مصنف : *The Bahmanis of the Deccan—an objective study*؛ (۸) Major : *India in the fifteenth Century*؛ (۹) [فرشتہ : تاریخ، ۲ : ۱۷۶ - ۱۷۷؛ (۱۰) وو، لائڈن، بذیل مادہ].

(ہارون خان شروانی)

بَیذَق : رکّ بہ شطْرَنج .

بیدل : میرزا عبدالقادر نام، ابوالمعانی لقب، عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی گو شاعر، عارفِ کامل اور عظیم مفکر؛ تورانی الاصل، قبیلہ چغتائی ارلاس [یا برلاس]؛ پیدائش : ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء، بمقام پٹنہ؛ وفات : ۴ صفر ۱۱۳۳ھ / ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء، بمقام دہلی ۔ آبا و اجداد کا پیشہ سپہگری تھا ۔ والد میرزا عبدالخالق اوائل عمر سے ترک ماسوا کر کے گوشہ‌نشین ہو گئے اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ شیخ کمال سے نسبت رکھتے تھے ۔ خود بھی صاحبِ ارشاد تھے ۔ بیدل کی تربیت میں اور بزرگوں کے علاوہ شیخ کمال کا بڑا حصّہ ہے ۔ بیدل کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے ۔ ان کے چچا میرزا قلندر [م ۱۰۷۶/ ۱۶۶۵ء] نے ان کی پرورش کی ۔ میرزا قلندر اگرچہ اُمّی محض تھے مگر پاکیزہ علمی اور ادبی ذوق

رکھتے تھے ۔ بیدل بھی جوان ہو کر چچا کی طرح شجاع بنے اور ساتھ ہی تصوف اور شاعری میں کمال حاصل کیا ۔ کچھ عرصہ بیدل اپنے ماموں میرزا ظریف، ماہر تفسیر و حدیث، کے زیر اثر بھی رہے اور ان سے تفسیر کے کچھ اسباق پڑھے ۔ ۱۰۷۵ھ/ ۱۶۶۴ء میں ماموں نے وفات پائی ۔ چچا پہلے بنگالہ جا چکے تھے ۔ تنہائی اور بیکسی سے گھبرا کر بیدل دہلی چلے گئے۔ وہاں مشاعروں میں حصہ لیا اور بلندی فطرت اور ذوق سلیم کی بنا پر بہت جلد عاقل خان رازی سے راہ و رسم پیدا ہو گئی، جو نواب موصوف کی زندگی تک برابر قائم رہی ۔ نواب عاقل خان رازی کے داماد نواب شکر اللہ خان [خاکسار] بھی بڑے سخن فہم اور سخن سنج تھے ۔ بیدل کے ان سے بھی گہرے روابط پیدا ہو گئے ۔ نواب شکر اللہ خان کے تینوں فرزند نواب لطف اللہ، نواب عنایت اللہ شاکر خان اور نواب کرم اللہ عاقل خان بھی بیدل کے نیاز مند تھے ۔ عاقل خان رازی اور شکر اللہ خان دونوں علم تصوف میں بڑی دسترس رکھتے تھے، اس لیے تصوف کے کئی اسرار و رموز ان کی وجہ سے بیدل پر منکشف ہوے ۔ سادات خواف سے ان گہرے مراسم کے باوجود بیدل دہلی میں اقامت گزین نہ ہوے، بلکہ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء تک شاہجہان آباد، اکبر آباد، اور اسلام آباد متھرا میں آتے جاتے گزارے ۔ ایک بار سیر و سیاحت کی غرض سے سراے نکودر سے گزرتے ہوے لاہور اور حسن ابدال بھی گئے ۔ ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۹ء میں شادی کی۔ شادی کے بعد شاہزادۂ اعظم شاہ کی فوج میں ملازم ہو گئے اور پنج صدی عہدہ ملا، مگر جب قصیدہ کہنے کی فرمائش ہوئی تو مستعفی ہو گئے ۔ جن دنوں فوج میں ملازم تھے مولانا عبدالعزیز عزّت سے اصلاح لیا کرتے تھے، جو علوم معقول و منقول میں ماہر ہونے کے علاوہ فن انشا و شعر گوئی میں بھی

اپنی نظیر آپ تھے ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دکن میں مصروف ہونے کی بنا پر جب اکبر آباد اور متھرا کے نواح میں جاٹوں نے فسادات شروع کیے تو بدامنی سے تنگ آ کر بیدل مستقل طور پر دہلی چلے آئے ۔ وہاں رہتے ہوے ایک بار نواب شکر اللہ خان کے ساتھ بیراٹ کے کوہستانی علاقے میں بھی گئے ۔ برسات کا موسم وہیں گزارا اور وہاں کے قدرتی مناظر کی تعریف میں اپنی بے نظیر مثنوی طورِ معرفت لکھی ۔ دہلی میں مستقل اقامت کا زمانہ بیدل کے عروج کا زمانہ ہے ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے دیوان کا مطالعہ کیا اور ان کے اشعار اپنے رقعات میں درج کیے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ نے نظم و نثر میں ان کی تعریف کی ۔ نظام الملک آصف جاہ اور امیر الامرا حسین علی خان کے علاوہ ہر طبقے کے بے شمار ہندو اور مسلم ان کے شاگرد تھے ۔ نواب ذوالفقار خان، قطب الملک نواب حسن علی خان اور کئی اور ہفت ہزاری اور پنج ہزاری امرا ارادت مند تھے ۔ شاہ عالم بہادر شاہ [رک بآں] اور شہنشاہ فرخ سیر نے اپنے اپنے عہد میں ان کی قدردانی کی ۔ جب امیرالامرا حسین علی خان اور قطب الملک حسن علی خان سادات بارھہ [رک بہ بارہ سیّد] نے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں شہنشاہ فرخ سیر کو بڑے عذاب دے کر قتل کرا دیا تو ان سے مخلصانہ مراسم کے باوجود بیدل نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند
صد جور و جفا ز راہِ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود
''سادات بوے نمکحرامی کردند''

۱۱۳۱ھ

سادات بارھہ نے انتقام لینا چاہا تو میرزا بیدل متوحّش ہو کر لاہور میں نواب عبدالصمد خان کے پاس چلے آئے ۔ جب سادات کے اقتدار کا خاتمہ

ہوا تو دہلی آئے اور وفات پائی ۔ پرانے قلعے کے سامنے حضرت یار پرّان کے مزار کے قریب اپنی حویلی کے صحن میں دفن ہوئے ۔ اور شعرائے دہلی کوئی پون صدی تک ان کا عرس باقاعدگی اور اہتمام سے مناتے رہے۔

بیدل کی تصنیفات نظم و نثر پر مشتمل ہیں ۔ ان کے اشعار کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ ہے ۔ غزلیات کے ساٹھ ہزار سے زائد اشعار ہیں ۔ ان کی چھے مثنویاں موجود ہیں : محیط اعظم، طلسم حیرت، طور معرفت، عرفان، تنبیہ المہوسین اور ایک بیانیہ مثنوی ۔ ان مثنویوں کے اشعار کی تعداد تئیس ہزار کے لگ بھگ ہے ۔ نواب شکر اللہ خان کے نام ایک رقعے میں وہ ایک اور مثنوی گلِ زرد کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اب نایاب ہے ۔ ان کے قصائد کی تعداد اُنیس ہے جن میں دو ہزار اشعار ہیں ۔ قصائد تقریباً تمام کے تمام حضور سرور کائنات صلّی اللہ علیہ و سلّم اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی تعریف میں ہیں۔ کتاب خانۂ معارف، کابل میں غلام حسین کابلی کی لکھی ہوئی جو کلّیات بیدل موجود ہے اس میں صفحہ ۱۰۰۱ پر بیدل کا ۶۶ شعروں کا ایک قصیدہ ترکی زبان میں بھی درج ہے ۔ وہ مشہور رباعی گو بھی تھے، چنانچہ ان کی رباعیات کے سات ہزار سے زائد بیت ہیں ۔ علاوہ بریں انھوں نے کوئی پینتالیس کے قریب مخمّسات، ایک ترکیب بند، ایک ترجیع بند اور متعدد قطعات لکھے اور بہت سی پہیلیاں کہیں۔

نثر میں چہار عنصر اور رقعات ان کی دو مشہور تصانیف ہیں ۔ کلّیات صفدری کے دیباچۂ رقعات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے نثر میں فن رمل پر ایک رسالہ تالیف الاحکام بھی لکھا تھا، مگر وہ گم ہو چکا ہے ۔ دیباچۂ رقعات کی طرح بیدل نے اپنی چند ایک اور تصنیفات، مثلاً دیوانِ قدیم، محیط اعظم اور تالیف الاحکام کے پیش لفظ بھی نثر میں تحریر کیے ۔ علاوہ ازیں موزۂ بریطانیہ، لنڈن میں ان کی ایک بیاض موجود ہے جس میں متقدمین اور معاصرین کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے ۔ نیز انھوں نے اپنی نثری تصنیف چہار عنصر کے پرمغز حصوں کو یکجا کیا اور انھیں نکات کے نام سے موسوم کیا اور ان نکات سے متعلق اپنی مثنویات کے بعض حصے منتخب کیے اور ان کا نام اشارات و حکایات رکھا۔

ان کی تصنیفات کے قلمی نسخے وسط ایشیا، برّصغیر پاک و ہند اور یورپ میں ملتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آو اسلام (لائڈن) اور ڈاکٹر ایتھے Dr. Ethe کے بیان کے مطابق کلّیات بیدل کا ایک ایڈیشن لکھنؤ میں ۱۲۸۷ھ میں چھپا، مگر جیسا کہ خود ڈاکٹر ایتھے کہتے ہیں وہ کلّیات در اصل بیدل کا دیوانِ قدیم ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے کوئی تیس برس پہلے مرتب کیا تھا اور مطبع والوں نے اس میں نکات، رقعات، اور چہار عنصر کو شامل کر لیا ہے ۔ کلّیات بیدل حقیقی معنوں میں ۱۲۹۹ھ میں مطبع صفدری بمبئی میں طبع ہوا جو بیدل کی نظم و نثر کا بینظیر مجموعہ ہے ۔ رقعات، چہار عنصر، اور غزلیات کو علیحدہ علیحدہ بھی پاک و ہند اور وسط ایشیا کے مختلف مطابع نے شائع کیا، مگر بیدل کا جو دیوانِ غزلیات ردیف د تک کابل میں امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں چھپا تھا وہ مطبع صفدری کی کلّیات بیدل کی طرح صحت الفاظ، تعداد اشعار و غزلیات، حسن ترتیب و طباعت کے لحاظ سے بےمثال ہے۔

میرزا بیدل مزاج کے مستغنی، بلندحوصلہ اور درویش‌منش تھے ۔ ان کے ہزاروں قدردان اور عقیدت مند تھے، مگر ان تمام کے جذبۂ نیاز مندی کا جواب پر خلوص تعلقات کی صورت میں دینے کے

باوجود انھوں نے بےنیازی کی زندگی بسر کی، اپنے جذبۂ عشق کی پرورش کی اور اسے دلپذیر حکیمانہ انداز میں نظم و نثر میں بیان کیا ۔ ان کا فن ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے ۔ اس میں بھی وہی خلوص، وہی حُسن اور اسی طرح کی گہرائی اور عظمت موجود ہے جو ان کی جامع شخصیت کا خاصہ ہے ۔ ان کی تعلیمات انھیں اصولوں کا تذکرہ ہیں جن پر وہ عمر بھر عمل پیرا رہے ۔ وہ تصوف کو بہترین لائحۂ حیات سمجھتے تھے، اس لیے ان کے کلام میں صوفیوں کے احوال و مقامات اور ان کے اخلاق حسنہ کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ باتیں خود بخود دل میں گھر کر جاتی ہیں ۔ وہ فقر کے بنیادی اصولِ ترکؔ پر پوری طرح عامل ہونے کے باوجود تصوف کے اس مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے تھے جو جد و جہد، عزم و ہمت اور اثبات ذات کا قائل ہے، اس لیے ان کی تعلیمات حرکی عناصر سے لبریز ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام ائمۂ تصوّف سے متأثر ہوے، مگر ان کا علم تصوّف زیادہ تر ابن العربی کا مرہونِ منّت ہے ۔ ابن العربی کے فلسفۂ تنزّلات کو وہ بڑی فکری گہرائی اور زورِ بیان اور پوری خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ اور انسان کو "کونِ جامع" کا خطاب دیتے ہیں ۔ بیدل کے کلام میں انسان کی عظمت، اس کے بےپایاں امکانات، اور اس کے جمال و جلال کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ فارسی ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے ۔ بیدل کے سارے زورِ فصاحت اور ان کی تمام فلسفیانہ معلومات کا مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کی عظمت کو ثابت کیا جائے ۔ انھیں ذات الٰہی سے بے پناہ محبت ہے ۔ اس کے بغیر وہ سب کچھ بیکار سمجھتے ہیں، مگر ان کے نزدیک یہ جذبۂ محبت بھی انسان کے ارتقاے ذات کا سبب ہے ۔

فارسی کے تمام اساتذہ کا کلام بیدل کی نگاہ سے گزرا ۔ قدما میں سے بالخصوص سعدی، حافظ اور رومی کے بڑے مدّاح تھے ۔ [وہ طرز جسے سبک ھندی کہا جاتا ہے بیدل نے اس میں خاص رنگ پیدا کیا ۔ ان کے فلسفیانہ فکر کی وجہ سے ان کی غزلیات میں دقیق اشعار بھی موجود ہیں، جن کی علامہ اقبال نے کئی موقعوں پر تعریف کی ہے]، مگر ان کے صاف اشعار حسنِ بیان اور علوّ خیال کا شاہکار ہیں.

نثر بیدل نثر ظہوری کے انداز پر ہے اگرچہ دونوں کے اپنے اپنے خصائص بھی ہیں ۔ کابل، وسط ایشیا اور ہندوستان میں بے شمار شعرا نے ان کا اتباع کیا ۔ اردو میں ان کے اشعار صرف چار مل سکے ہیں، مگر ان کے شاگردوں میں سے اوروں کے علاوہ خان آرزو اور آنندرام مخلص اردوگو شاعر بھی تھے ۔ جب تک دہلی میں بیدل کا عرس منایا جاتا رہا اس میں اردو کے شعرا بھی شامل ہوتے رہے ۔ غالب اور اقبال دونوں کے بیان میں بیدل کے بیّن اثرات ملتے ہیں [اور غالب نے ان کا واضح اعتراف کیا ہے]، اس لیے بالواسطہ ادب اردو کی تاسیس و تشکیل اور تزئین میں بیدل کا بہت بڑا حصّہ ہے ۔ [بیدل کی بُحور بڑی مترنّم، پُرجوش اور رواں دواں ہوتی ہیں ۔ ان کی تراکیب کچھ تو اپنی اختراع کردہ ہیں، مگر بہت سی ایسی بھی ہیں جو متأخرین کے ہاں موجود تھیں ۔ ان کا شعری اسلوب پُرشکوہ اور پُرشوکت ہے ۔ ان کے کلام میں ابہام و اغلاق بھی ہے اور مروج صوفیانہ علامتوں، مثلاً بحر، موج، قطرہ، دریا، وغیرہ میں نئے معانی پیدا کیے ہیں ۔ طلسم اور آئینہ بھی ان کے خاص استعارات میں ہیں ۔ وہ افغانستان اور ماوراء النہر میں بہت مقبول ہوے اگرچہ برصغیر ہند و پاکستان میں بھی ان کا بہت اعتراف ہوا ہے].

مآخذ: (۱) چہار عنصر بیدل (کلیات بیدل)، مطبع

صفدری، بمبئی ۱۲۹۹ھ؛ (۲) رقعات بیدل، مطبع صفدری، بمبئی ۱۲۹۹ھ؛ (۳) غلام علی آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ، کانپور ۱۸۷۱ء؛ (۴) وہی مصنف : سرو آزاد، حیدر آباد ۱۹۱۳ء؛ (۵) درگاہ قلی خان : مرقع دہلی، مطبوعۂ دکن؛ (۶) میر تقی میر : نکات الشعراء، بدایوں؛ (۷) محمد افضل سرخوش : کلمات الشعراء، لاہور؛ (۸) شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال، کلکتہ ۱۸۳۱ء؛ (۹) سیّد علی محمد شاد : نوائے وطن، عظیم آباد ۱۸۸۵ء؛ (۱۰) فہرست عربی و فارسی مخطوطات اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، جلد سوم، مطبوعۂ کلکتہ ۱۹۱۲ء، مخطوطہ نمبر ۳۸۱؛ (۱۱) فہرست عربی، فارسی مخطوطات موزۂ بریطانیہ، لنڈن، ۱۸۸۱ء، ص ۷۰۶ الف تا ۷۰۷ الف، ۷۳۷ الف تا ۷۳۸ ب؛ (۱۲) مجلّۂ معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۳۲ء، جولائی ۱۹۳۲ء و اگست ۱۹۳۶ء (ذکر سفینۂ خوشگو ولد بیدل)؛ (۱۳) عبد الغنی : *Life and Works of Bidil*، مخطوطۂ کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب؛ (۱۴) عبدالغنی : تذکرۂ بیدل، در اورینٹل کالج میگزین ۱۹۰۳ء؛ (۱۵) یٰس خان نیازی : میرزا بیدل، در اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳۲ - ۱۹۳۳ء؛ (۱۶) ۱۹۱ٔ، لائڈن بذیل مادہ؛ (۱۷) فہرست فارسی مخطوطات انڈیا آفس لائبریری، جلد اول، مطبوعۂ آوکسفرڈ ۱۹۰۳ء، ذکر مخطوطہ نمبر ۱۶۷۶؛ (۱۸) کلّیات بیدل، مخطوطہ نمبر ۳۰۵، و کاتب غلام حسین کابلی، مقبوضۂ کتابخانۂ معارف کابل - محرّرۂ ۱۳۰۹ھ؛[(۱۹) عبدالوہّاب افتخار : تذکرۂ بینظیر، الٰہ آباد ۱۹۴۰ء؛ (۲۰) علی قلی والہ داغستانی : ریاض الشعراء، مخطوطۂ کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب، عدد ۱۳۸۳]؛ (۲۱) عبّاد اللہ اختر : بیدل، لاہور ۱۹۵۲ء؛ (۲۲) عبدالغنی : *Life and Works of Abdul Qadir Bedil, Lahore, 1960*؛ (۲۳) عبدالغنی : روح بیدل، لاہور ۱۹۶۸ء.

(عبدالغنی)

* **بَیدو** : [= بائیدو، بائدو، بایدو]، ایران کے مغل ایلخانیوں میں [چھٹا] فرمانروا، جو اس خاندان کے بانی ہلاکو کا پوتا تھا ۔ اس کو فقط چند ماہ سلطنت کرنا نصیب ہوئی کیونکہ اس کا پیشرو گیخاتو بروز پنجشنبہ ۶ جمادی الآخرۃ [۶۹۴ھ]/۲۱ اپریل ۱۲۹۵ء کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا اور اسی سال بروز چہار شنبہ ۲۳ ذوالقعدۃ/۵ اکتوبر کو خود وہ (یعنی بیدو) قتل کر دیا گیا ۔ چونکہ گیخاتو نے اس کی اہانت کی تھی لہٰذا بیدو جو بظاہر ایک بے وقعت سا نوجوان شہزادہ تھا اس باغیانہ سازش میں ملّوث ہو گیا جو مغل امرا نے ایلخان موصوف کے خلاف برپا کی اور اس کے نتیجے میں گیخاتو تخت سے اتار دیا اور قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بعد باغیوں نے بیدو کو تخت نشینی کی دعوت دی ۔ مگر اس کا دوسرا چچیرا بھائی غازان (رکّ باآں) جو ایلخان ارغون کا بیٹا اور گیخاتو کا بھتیجا تھا بلا تاخیر اس نئے ایل خان کی مخالفت میں خراسان سے لشکر لے کر چڑھ دوڑا تاکہ اپنے چچا کا انتقام لے ۔ اگرچہ ان چچیرے بھائیوں میں ناقابل اطمینان سی عارضی صلح ہو گئی تھی، لیکن کچھ دن بعد جب دوبارہ جنگ شروع ہوئی تو خوش قسمتی سے اس قضیے کا فیصلہ غازان کے حق میں ہو گیا اور خونریزی کی نوبت نہ آنے پائی ۔ اس کامیابی کا سہرا غازان کے سپہ سالار نوروز کے سیاسی تدبر اور موقع شناسی کے سر رہا اور سب سے بڑھکر یہ تدبیر کارگر ہوئی کہ غازان نے نوروز کی تحریک سے اسلام قبول کر لیا جس سے اسے مسلمانوں کی اعانت حاصل ہو گئی ۔ بیدو کے طرفداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور نَخْچِیْوان (آج کل "نخیچیوان" جو آذربیجان کی اشتمالی ریاست میں ہے) میں جب وہ جان بچا کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا اس کا کام تمام کر دیا گیا ۔ کہتے ہیں کہ اپنے مختصر زمانۂ حکومت کے اندر اس نے

عیسائیوں پر خصوصیت کے ساتھ عنایت کی نظر رکھی، جس سے مسلمانوں کو ناراض کر لیا ۔ اگرچہ ابن العبری (Bar Hebraeus) نے لکھا ہے کہ بیدو نے دین اسلام اختیار کر لیا تھا ۔

مآخذ : (۱) C. d'Ohsson: *Histoire des Mongols depuis Tchinguiz-Khan jusqu'a Timour Bey ou Tamerlan* (بار دوم)، ج ۴، ہیگ اور ایمسٹرڈم ۱۸۳۵ء، [ص ۱۱۰ تا ۱۱۶]؛ (۲) B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*، (بار دوم)، برلن ۱۹۵۵ء.

([J.A.BOYLE] W. BARTHOLD)

* **البَیْذَق** : ابوبکر بن علی الصَّنْہاجی، تاریخ الموحّدین کے وقائع ابتدائیہ کا مصنّف ۔ اس کا نام فقط ان اقتباسات کے ذریعے معلوم ہوا جو ابن خلدون نے اپنی کتاب العبر میں اور ایک مجہول الاسم مصنّف نے اپنی کتاب الحُلَل المَوْشِیّة [تونس ۱۹۱۱ء، رباط ۱۹۳۶ء] میں دیے ہیں، نیز ان مختلف عبارات سے جو ابن القطّان مصنّف نَظْمُ الجُمان نے البیذق سے لے کر اپنی کتاب میں نقل کی ہیں ۔ اسکوریال کے کتاب خانے میں کاغذوں کا ایک بنڈل E. Lévi-Provençal (عدد ۱۹۱۹) کے ہاتھ لگ گیا جو بعد میں *Documents inédits d'histoire almohade* کے اندر چھپا، اس طرح البیذق کا نام جو قعر گمنامی میں پڑا ہوا تھا گویا چور دروازے سے نکل کر روشنی میں آیا ۔ اس کی کتاب میں ہم ''ایک ایسے شخص کے آنکھوں دیکھے واقعات کی یادداشتیں پاتے ہیں جن میں لکھنے والے نے خود عملی حصہ لیا اور جو بالکل ابتدا ہی سے الموحّدون میں شامل معلوم ہوتا ہے ۔ پہلی ہی نظر بتا دیتی ہے کہ یہ وقائع معمولی قسم یا شکل کے نہیں ہیں ۔ ہر صفحے پر نئی معلومات اور ان کی مستند نوعیت تقریباً ہمیشہ ہمیں شمالی افریقہ کے الموحّدون کی بابت اپنے علم کو جو اب تک تشنہ رہا تھا عجیب طرح مکمل کرنے کے قابل بنا دیتی ہیں ۔ مخطوطے کے ۳۶ صفحوں میں متن کے اندر تو کوئی بیاض نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ ابتدائی حصّہ غائب ہو گیا اور کتاب کا نام بھی کچھ نہیں دیا گیا ہے ۔ خود البیذق کے حالات جو ہمیں معلوم ہوے وہ فقط اس قدر ہیں جتنے اس نے اپنی تصنیف میں دیے ہیں، مگر وہ اس قدر مبہم ہیں کہ اس کی پوری سوانح کی بنیاد نہیں بن سکتے ۔ ہم اسے المَہْدی کے متبعین میں دیکھتے ہیں جس وقت کہ المہدی تونس پہنچا ۔ اسی طرح وہ عبدالمؤمن کے ساتھ رہا اور ان دونوں کی قربت اسے حاصل تھی اور وہ ان دونوں کے خادم کی حیثیت سے کام کرتا تھا ۔ اسی حیثیت میں وہ صرف ان واقعات کو قلمبند کرتا ہے جو در حقیقت اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے ۔ یہ جوشیلا نیا مرید ان واقعات کے ساتھ جو اس نے قلمبند کیے ہیں ایسے خارق عادت قسم کے سب حوادث بھی بیان کرتا ہے جن سے اس کی تصدیق ہو کہ ابن تُومَرت [رکّ باں] ایک مقدس خدمت انجام دینے کے لیے اللہ کی طرف سے مامور تھا اور عبدالمؤمن [رکّ باں] کو قضا و قدر نے پہلے ہی اس منصب کے لیے منتخب کر لیا تھا ۔ بہر حال بیذق کا لفظ جو فارسی سے عربی میں آیا آج تک بھی جنوبی بربروں میں شطرنج کے پیادے کے معنی میں مستعمل ہے ۔ یہ بات تو وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ البیذق کی مادری زبان ''بربر'' تھی اور وہ عربی اچھی طرح نہ جانتا تھا ۔ یہ بات اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اپنے تذکرے میں وہ روزمرہ بہ کثرت استعمال کرتا ہے اور اس کے بیان میں بربری فقرے آ جاتے ہیں ۔ اس نے اپنی پوری عمر گمنامی میں ایک وفادار اور جان نثار خادم کی حیثیت سے بسر کی، کسی بڑے سرکاری عہدے کی تمنا نہ کی، المہدی اور عبدالمؤمن کا خدمت گزار رہا بلکہ

یوسف اول کی بھی خدمت گزاری کی، جس کے عہد تک کے بعض جستہ جستہ حالات ان وقائع میں ملتے ھیں جو اس نے قلمبند کیے تھے ۔ اس کے بعد وہ الموحدون کی محفل سے اسی طرح چپ چاپ نام پائے بغیر اچانک غائب ھو گیا جیسے اچانک ظاھر ھوا تھا۔

مآخذ : (۱) E. Lévi-Provençal : *Documents inédits d'histoire almohade*، ج ۹ تا ۱۱؛ (۲) G. Marcy در *Hesperis*، ۱۹۳۲ء، ص ۶۱ ببعد۔

(A. Huici Miranda)

* بِئْر : (جدید اور کچھ قدیم بولیوں میں اس کا تلفظ بِیْر بھی ھے ۔ اس کی جمع : بِئَار، آبْئُر اور آبار) کنویں کے لیے عربی زبان میں سب سے جامع لفظ ھے ۔ جو (قَلِیب، رَکِیّہ اور ایسے ھی دوسرے) متعدد مترادف الفاظ کے لیے اسم جنس کی حیثیت سے استعمال ھوتا ھے اور اس کی مختلف صفات کی اچھی خاصی تعداد ھے۔

یہ لفظ دوسری سامی زبانوں میں بھی استعمال ھوتا ھے، مثلاً اکدی زبان میں بیرو bēru، عبرانی زبان میں بیر beēr، آرامی زبان میں بیرا bēra ۔ دوسری سامی زبانوں کی طرح عربی میں بھی یہ لفظ مؤنث مستعمل ھے (البتہ بعض جدید عربی بولیاں اس سے مستثنی ھیں ۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ھو Fleischer: *Kl. Schriften*، ۱ : ۲۶۵؛ Bräunlich : *Well*، ص ۱۳۲، بار دوم)؛ تاھم لفظ بئر میں عام طور پر انگریزی زبان کے لفظ Well سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم موجود ھے ۔ بئر کے معنوں میں حوض یا ذخیرۂ آب بھی شامل ھو سکتا ھے (قب عبرانی *Bōr*)، کوئی گڑھا یا سوراخ بھی مراد ھو سکتا ھے، جو زمین میں کھودا گیا ھو، خواہ اس میں پانی ھو یا نہ ھو، مثلاً ابن ھشام : سیرت، ص ۷۶، س ۷ میں مذکور ھے کہ زمانۂ قبل اسلام میں خانۂ کعبہ کے تحائف جمع رکھنے کے لیے گڑھے کو بئر کہتے تھے ۔ الاغانی (بار اول، ۴ : ۴۹، س ۴) اور عریب [القرطبی : صلة تاریخ الطبری] (طبع ڈخویه) ص ۵، س ۶، میں اس لفظ کے معنی، مردے دفن کرنے کے لیے ایک وسیع گڑھ، بتائے گئے ھیں ۔ کریمر (*Beitr. zur arab. Lexikogr*، ۱ (۱۸۸۳ء) : ۱۹۲) اس لفظ کا ایک ایسی بھٹی کے معنی میں ذکر کرتا ھے جس میں گوشت بھونا جاتا ھے، مگر اس مضمون میں بئر سے صرف "کنواں" ھی مراد ھے۔

(۱) قدیم عرب

چونکہ جزیرۂ عرب میں نہ تو تمام سال بہنے والے دریا ھیں اور نہ بڑی بڑی مستقل جھیلیں، لہٰذا یہاں کے باشندوں، بالخصوص اھل بادیہ کا انحصار جزیرہ‌نما کے زیر زمین آبی ذخیروں پر ھے ۔ یہ زیر زمین آبی ذخائر ارضیاتی کیفیت کے مطابق کہیں تو پہلے سے موجود اور بالائی طبقۂ ریگ سے چند فٹ نیچے نکل آئے ھیں اور یا ستر میٹر یا اس سے زیادہ گہرائی پر جا کر ملتے ھیں ۔ ان تک پہنچنے کے لیے کنویں کھودنے والوں کو زمین گودم یا بیلن (کے پیٹے) کی شکل میں کھودنی پڑتی ھے (قصبۂ جراب)، جس کے پہلوؤں کو عام طور پر کہگل یا سنگریزے سے، جنھیں طیّ کہتے ھیں، لیپ کر مضبوط کیا جاتا ھے (قب بخاری، ۱ : ۲۸۳، س ۱۷ = ۲ : ۳۴۳، س ۵ جہاں دوزخ کو "مطویّة کطی البئر" کہا گیا ھے) ۔ پانی اس گڑھے کی تہ میں جمع ھوتا ھے اور گولے کی دیواروں سے بھی رستا رھتا ھے ۔ کنویں کے منہ (فم یا راس البئر) تک پانی کو چمڑے کے چرسوں یا خاصے بڑے بڑے ڈولوں (غرب، دَلْو) کے ذریعے اوپر کھینچتے ھیں ۔ کہا جاتا ھے کہ یہ چرسے زیادہ تر دو (بظاھر جوان) اونٹوں کی کھال سے بنائے جاتے ھیں ۔ (اس صورت میں ڈول کو "ابن آدیمین" بھی کہہ سکتے ھیں) ۔ ڈول یا چرسے

کھینچنے کی رسیاں (اَرْشیہ، واحد رِشاء، یا اَشْطان، واحد شَطَن) ابتدا میں پتلے چوڑے کے تسموں کی ہوتی تھیں، جنھیں بٹ لیا جاتا تھا لیکن یہ پانی میں رہنے سے جلد گل جاتی تھیں (قب لبید، طبع خالدی، ۱۳۹، شعر ۴) اس لیے کوئی زیادہ پائدار چیز، عام طور پر کھجور کی چھال (خُاب) بٹ کر، کم سے کم رسی کے نچلے حصے میں، جوڑی جاتی ہے ۔ بھاری بھاری ڈول کھینچنے کے تھکا دینے والے کام میں آسانی پیدا کرنے کی خاطر عام طور پر آب کشی کا ایک آلہ (= عَاَق) جو ایک حد تک بدویت کی یادگار ہے، کنوئیں کے دہانے پر نصب کیا جاتا ہے ۔ یہ آلہ جو ڈول اور رسیوں کی طرح قافلے والے اپنے ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں (ورنہ ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے) یا تو کڑی پر آڑی کڑی (نعامہ) ہوتا ہے یا ذرا زیادہ ترقی یافتہ صورت میں چوبی چرخی (محور) جسے کھوکھلی گول لکڑی (مَحالہ، بَکْرہ نیز قامہ) میں جڑ دیا جاتا ہے ۔ اس کے اوپر رسی ایک نالی (مَحزّ، قَبّ) میں چلتی ہے ۔ ساری چرخی اور دہرا شہتیر یا پتھر یا مٹی کے چنے ہوے دو سہاروں (قرنان، زُرنُوقان، دِعامتان، عمودان) پر یا پھر ایک تنہا دو شاخہ ڈنڈے (قامہ جمع [قِیَم]، قب اخطل (طبع صالحانی)، ۱۷، ۳؛ یاقوت، ۴ : ۲۱، س ۱۲) پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ پھر ڈول ہاتھ سے اوپر کھینچا جاتا ہے ۔ یہ سخت کام جانوروں زیادہ تر اونٹوں سے (سوانِ، واحد سانِیَہ) سے بھی لیا جا سکتا ہے ۔ ان کے ساتھ ایک ہانکنے والا (سائق) ہوتا ہے ۔ یہ کنوئیں کے آگے پھر واپس دہانے تک تھکا دینے والا چکر لگاتے رہتے ہیں (قب *Arabum Proverbia* [= المیدانی: امثال العرب]، طبع Freytag، ۱: ۶۲۴، عدد ۶۳، سَیرُ السَّوانی سَفَرٌ لَا یَنْقَطِعُ، یعنی کنوئیں کا پانی نکالتے ہوے چکر لگانے والے اونٹ کا سفر ختم نہیں ہوتا) ۔ کنوئیں سے آگے مویشیوں کے پینے کی کنڈالیوں (حِیضان، واحد حَوض) وغیرہ میں پانی گرتا ہے ۔ ٹوٹی ہوئی کنڈالیوں کا اکثر عربی اشعار میں نقشہ دکھایا گیا ہے (دیکھیے Nöldeke، معلّقۂ زہیر، ۵) ۔ قدیم زمانے میں چکر کھونی یا زیادہ پیچیدہ آبی آلات کے ذریعے پانی کے رہٹ چلانے کے طریقے لوگوں کو معلوم نہ تھے ۔ بیک وقت اترنے اور چڑھنے والے دوہرے ڈول کا طریقہ (جسے الحماسۃ (طبع Freytag)، ص ۳۹۴، شعر ۵ میں سوار کی دو رکابوں سے تشبیہ دی گئی ہے) دیسی نہ تھا اور یقینًا بہت کمیاب ہوگا۔

عربوں کی زندگی میں کنوئیں کو جو خاص اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان کثیر التعداد اقوال، مختلف القاب یا اوصاف یا چرخی، دہرے اور ڈول وغیرہ سے پیدا ہونے والی آوازوں کے اسماء (دیکھیے Bräunlich : *Well*، اشاریہ، ص ۵۱۹ تا ۲۶) سے لگایا جا سکتا ہے جو کنوئیں کے متعلق ملتے ہیں ۔ اسی طرح کنوئیں کے اجزا اور اغراض سے متعلق کثیر الاستعمال تشبیہات، تمثیلات اور استعارات بھی خاصی مفید معلومات مہیا کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر نیزوں کو اکثر کنوئیں کی تنی ہوئی رسیوں سے تشبیہ دی گئی ہے (قب Nöldeke، عنترہ، معلّقہ ۶۶ و *Delectus*، ص ۵۴، س ۶، ص ۷۰، س ۲) سوار کے تیر چلانے کو ان مزدوروں سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جو کنوئیں ... پانی کھینچنے والی رسی کے ٹوٹ جانے پر بے تحاشا آ... کی طرف بھاگتے ہیں (دیوان ہذیل (طبع Kosegarten ۹۳، ۳۶) ۔ مردے کا قبر میں اتارا جانا ایسا ہے جیسے ڈول کنوئیں میں جاتا ہے (ابو ذؤیب [الہذلی] قصیدہ ۴۲، شعر ۱۱ ببعد؛ الحماسۃ، ص ۳۹۴، شعر ۴ الحطیئۃ، ص ۵۳، س ۳) ''قَلِقَتْ مَحاوِرہ'' ''اس کے دھرے پیندے سے ہل گئے'' کا مطلب ہے اس کا معاملہ بگڑ گیا (Lane، ص ۶۶۷ الف) ۔ آخری مثال یہ ... اپنی بات کے سچے اور دھن کے پکے آدمی کی ای... مرثیے میں یوں تعریف کی گئی ہے کہ ''ایسا آد...

کہ جب کبھی بات منہ سے نکالتا ہے تو (چاہ کن کی طرح) تحت الثری سے پانی نکال لاتا ہے (الحماسۃ، ص ۳۸٦، شعر ۲).

مآخذ: (۱) E. Bräunlich : *The Well in Ancient Arabia*، در *Islamica*، ۱ : ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۵ء، ص ۴۱ تا ٤٦، ۲۸۸ تا ۳۴۳، ۴۵۴ تا ۵۲۸ (ایک جامع مقالہ جو اس تمام لغوی و ادبی مواد پر مبنی ہے جو اس سلسلے میں دستیاب ہے - موجودہ مقالہ بھی بڑی حد تک اسی کا مرہونِ منّت ہے)؛ (۲) W. Wiedemann : *Beiträge zur Geschichte der Naturwissenschaften*، ۱۰، Erlangen ۱۹۰٦ء، ص ۳۱۵، ۳۳۵ تا ۳۳۷ (تفاصیل ازمنۂ وسطٰی سے لی گئی ہیں)؛ (۳) H. G. Guthe : *Kurzes Bebel-wörterbuch*، ۱۹۰۳ء، ص ۲۸٦، بذیل مادّہ Jakobs-brunnen و J. J. Hess، در *Der Islam*، ۴ : ۱۹۱۳ء، ص ۳۱۷ ببعد (پر از معلومات؛ نیز دیکھیے یورپی سیّاحوں، مثلاً Doughty، Euting، Musil وغیرہ کی کتابیں)؛ (۴) مشہور ماہر لسانیات ابن العربی (م ۲۳۱ھ/۸۴۴ء) کی ایک تصنیف کتاب البئر قاہرہ میں محفوظ ہے، جس کا عرب مآخذ نویسوں کے ہاں تذکرہ نہیں ملتا (دیکھیے براکلمان : تکملہ، ۱ : ۱۸۰).

(J. KRAEMER)

(۲) جدید عرب

مشرقی عرب کے خطوں، میں، جہاں معدودے چند دریا ہیں یا سرے سے ہیں ہی نہیں، لوگوں کا دار و مدار چشموں اور کنوؤں پر ہوتا ہے - (پنگھٹ (مَوْرِد یا محض لفظ ماء، جمع مِیاہ) اور اس کی متعدد مقامی اشکال جیسے جنوبی عرب میں بی) کا وجود اور نوعیت حضری اور بدوی زندگی کی تعیین میں بہت مدد دیتے ہیں - چشموں (عین جمع عُیون) کا رواں پانی، عام طور پر نخلستان کی آبادیوں کی گزر اوقات کے لیے کافی ہو جاتا ہے - کنوؤں (بئر مقامی بولی میں بیر جمع ابیار، جس کا عرب میں زیادہ استعمال ہے یا قلیب جمع قُلبان) کا پانی جو کھینچ کر نکالا جاتا ہے، چشموں کے پانی کی کمی کو پورا کرتا ہے اور کئی موقعوں پر تو بڑے بڑے قصبوں کے لیے بھی کافی ہو جاتا ہے (یہاں تک کہ سعودی عرب کے دارالحکومت الرّیاض کی ضرورت کا قریب قریب سارا پانی تھوڑی مدت پیشتر تک کنوؤں ہی سے کھینچا جاتا تھا) - کئی ایک مثالیں ایسی بھی ہیں کہ جہاں ریگستانی علاقوں میں دور دور تک پھیلے ہوے کنوؤں سے پانی لایا جاتا ہے - اگر کہیں ریگستانی کنویں ناپائدار ذرائع، جیسے نمی یا چٹانوں میں پانی کے ذخائر، کے مقابلے میں زیادہ پائدار بھی ہوں تو بھی آبپاشی کے لیے بمشکل ہی گنجائش نکل سکتی ہے اور کنوؤں پر وارد ہونے والے زیادہ‌تر خانہ‌بدوش یا راہ‌گیر ہوتے ہیں - مستقل آباد کار نہیں ہوتے۔

نخلستانوں میں کنوؤں کا انفرادی ملکیت ہو جانا دستور سا بن گیا ہے - مالک زمین یا مزارع اپنی فصلوں کی آبیاری اسی پانی سے کرتے ہیں جو کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے - البتہ بڑے بڑے کنویں شاملات یا مشترکہ ملکیت ہو سکتے ہیں - مثال کے طور پر فلبی Philby علاقۂ تیماء میں الحدّاج کے ایک خاص کنویں میں تقریباً تیس حصوں کا اندازہ لگاتا ہے، جس سے اونٹوں کے ذریعے پانی کھینچنے کے لیے ہر حصے میں کم و بیش تین چرخیاں موجود تھیں .

صحرا میں ایک خانہ بدوش کو سب سے پہلے پانی کی فکر ہوتی ہے اور دوسرے درجے پر اس پانی کی قابل دسترس ہونے کی اور پھر اس پانی کے پینے کے قابل ہونے کی - ڈاوٹی Daughty نے شہر کے ذہین اور ہوشیار پیشہ‌ور کنویں کھودنے والوں کی تفصیل دی ہے، مگر بدو کو تو پانی تلاش کرنے اور کنویں کھودنے کے بغیر چارۂ کار ہی نہیں۔

انھیں قدرت نے بڑی حیرت انگیز فراست ودیعت کی ہے کہ وہ ایسی جگھوں میں بھی پانی کے سرچشمے کا کھوج لگا لیتے ہیں جہاں کسی ناواقف کو پانی کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا ۔ پانی نکالنے کا محل وقوع بالکل نیا ہونا چاہیے (ایسے کنویں کو اکثر بَدِع جمع بُدوع یا بَدِیع جمع بَدائع کہتے ہیں) یا کوئی دبا ہوا پرانا کنواں (مُندفِنہ)[نیز مُعطَّلہ] مردہ (میّتہ) کنواں بھی ہو سکتا ہے ۔ پانی سطح سے قریب یا کبھی بہت گہرا نکلتا ہے ۔ بدو کبھی کبھی ایک سو میٹر یا اس سے بھی زیادہ گہرا کھودتے ہیں ۔ گہرائی عربی پیمانے (باع، یعنی انسان کے کھلے بازووں کی لمبائی سے، یا قامہ، یعنی قد آدم : تقریب پانچ فٹ چھ انچ بلندی کے حساب سے ناپی جاتی ہے ۔ کئی بلّی گہرا کنواں بجائے عَمیقہ کے طَوِیلہ (جمع طِوال) کہلاتا ہے ۔ اب مشینی برمے الربع الخالی جیسے خشک ترین ریگستانی علاقوں میں بھی خاصی زیادہ گہرائی تک پہنچتے ہیں (ایسے کنووں کو قَلَمہ عام بولی میں قلم کہتے ہیں) زیادہ مستعمل کنویں یا جن کنووں کے کنارے اندر دب جانے کا اندیشہ ہو ان کی دیواروں کو پتھر یا کسی دوسرے مسالے سے پختہ کرتے ہیں (ایسے استر کے کنویں کو مَطْوِیّہ کہتے ہیں اور جس کی گولائی پتھر سے بنی ہو اسے مرصوصہ کہتے ہیں) ۔ پانی میں معدنیات کے تناسب سے اس امر کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ آیا پانی میٹھا (حلو) ہے یا کھاری (ملیح) ۔ اگرچہ بدوی دوسرے لوگوں کی نسبت معدنی اجزا زیادہ برداشت کر لیتے ہیں لیکن وہ ریگستان کے بعض [کھاری] کنووں (خُور، جمع خِیران) کا پانی نہیں پی سکتے ۔ ایسی صورتوں میں ان کا مستقل ساتھی اونٹ شورہ پی جاتا ہے اور ایسا دودھ دیتا ہے جس سے نمک چھن کر نکل جاتا ہے۔

صحرائی کنووں کے کاملاً ذاتی ملکیت میں ہونے کا رواج نہیں ۔ اگرچہ کنویں کے ساتھ کسی آدمی کا نام شامل ہو جیسے الربع الخالی میں بئر ہادی (مرحوم ہادی بن سلطان المرّی سے منسوب ہے) تو یہ عام طور پر کنواں پہلی بار یا دوبارہ کھودنے والے کا نام ہوتا ہے جسے کام کی وجہ سے کنویں پر کچھ نہ کچھ حق بھی حاصل ہو جاتا ہے ۔ کسی قبیلے کے علاقے (دیرہ) میں کنواں واقع ہو تو وہ اس قبیلے کی ملکیت تصور ہو سکتا ہے ۔ لیکن پانی پھر بھی دوسرے قبیلوں کے (جن کی کنویں کے مالکوں سے جنگ نہ ہو) بدویوں کو لینے کی آزادی ہوتی ہے ۔ غیر آباد ریگستان میں پانی اس قدر قیمتی چیز ہے کہ اس کا کوئی مول نہیں ہو سکتا۔

موسم گرما میں جب ریوڑوں کے لیے صحرا کی چراگاہوں میں کوئی سبزہ وغیرہ نہیں ہوتا تو خانہ بدوش بدو ہفتوں یا مہینوں اپنے دلپسند کنووں پر ڈیرے ڈالے پڑے رہتے ہیں اور بعض اوقات سینکڑوں خیمے اکٹھے ڈال کے رہتے ہیں ۔ کنویں چونکہ گرمی اور بعض اوقات سردی کے موسم میں بھی اکٹھے ہونے کی جگہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے بارہا ان کنووں کو اچانک حملوں اور قبائلی جنگوں کا میدان بننا پڑا۔

مآخذ : (۱) C. Doughty : *Arabia Deserta*، نیویارک بدون تاریخ؛ (۲) H. Philby : *The Land of Midian*، لنڈن ۱۹۵۷ء، عربی اور مغربی زبانوں کے اکثر سفرناموں میں کنووں سے متعلق تفصیلات دی ہوئی ہیں؛ (۳) E. Bräunlich : *The Well in Ancient Arabia*، لائپزگ ۱۹۲۵ء، جدید و قدیم معلومات کے حوالے دیتا ہے۔

(G. Rentz)

(۳) مغرب

مختلف قسم کے کنووں کو بئر کے عام نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ استرکاری والے کنووں کو ہمیشہ تو نہیں لیکن عام طور پر یہ نام دیا جاتا ہے (ان کنووں کی اندر کی چنائی بہت کم پتھر سے ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات چونے گچ کے بغیر جما دیے جاتے ہیں ۔ صحرا کے خاص خاص علاقوں میں کھجور کے تنوں کا استر دیا جاتا ہے، جس کے باعث یہ کنویں بعض اوقات مربع شکل میں ہوتے ہیں) ۔ بئر کے نام سے ان کنووں کو بھی موسوم کر سکتے ہیں جن میں استرکاری نہ کی گئی ہو ۔ اس طرز کے کنویں صحرا میں عام پائے جاتے ہیں، جہاں زمین صرف نرم کر کے طاس کی شکل میں کھود لی جاتی ہے جس کی تہ میں پانی کی سطح نکل آتی ہے (فزّان) ۔ لیکن بئر کے علاوہ دوسری اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں ۔ حاسی (جمع حسْیان) کا لفظ اکثر اوقات مخصوص اصطلاح کے طور پر صحرا کے انھیں کنووں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو زیادہ تر کسی چنائی یا دہانے کی منڈیر کے بغیر بنے ہوتے ہیں، مگر دوسرے مقامات پر اس اصطلاح کے معنی محض ایک بل یا گڑھا ہے جو (تونس اور طرابلس کے نیم صحرائی علاقوں میں) وادی میں کھودا گیا ہو ۔ لفظ ''عُگلہ'' (عُقلہ) صحرا میں کسی وادی کے ساتھ ایک عارضی جوہڑ کو کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ غدِیر کے مترادف ہے ۔ تونس کے نیم صحرائی علاقے میں اس لفظ کے معنی ایسا کنواں بھی ہو سکتے ہیں جو کئی میٹر گہرا ہو اور اس میں کوئی استرکاری یا کنارے نہ ہوں اور جو کسی نشیب کی تلیٹی میں کھودا گیا ہو، جہاں زیرِ زمین پانی سطح کے قریب ہوتا ہے ۔ اسی طرح کے کنویں بعض اوقات صحرا (تنْدُوف) میں پائے جاتے ہیں، جہاں وادیوں کے پیٹے میں عُقلے واقع ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور صحراے اعظم، کم از کم مصر کے مغرب کے علاقے میں واقع کنویں تین بڑی قسموں میں شامل کیے جا سکتے ہیں: (۱) وہ کنویں جو انسانوں کے استعمال اور جانوروں کو پانی پلانے کے لیے ہیں، ان میں چنائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو ۔ بعض اوقات ان کے دہانے کے متصل کنڈالی تو بنی ہوتی ہے مگر اور کوئی بالائی عمارت نہیں ہوتی، یا زیادہ سے زیادہ تین شاخیں ہوتی ہیں جن پر لکڑی یا لوہے کی چرخی رکھی جا سکے ۔ پانی ہاتھ سے کسی مشک یا چمڑے کے ڈول کے ذریعے، جو رسی کے ایک سرے پر لٹکا رہتا ہے، نکالا جاتا ہے؛ (۲) ایسے کنویں مختلف قسم کے ہوتے ہیں، جن میں پانی کھینچنے کا کسی قسم کا آلہ بھی ہوتا ہے جو باغات اور نخلستانوں کی آبیاری کا کام دے؛ (۳) چشموں والے کنویں، جو بالخصوص گزشتہ زمانوں میں نہایت محدود قطعۂ زمین میں واقع تھے اور لازمًا آبپاشی کے لیے استعمال ہوتے تھے، چونکہ ان کا پانی خود ابلتا ہے اس لیے ان پر کوئی بالائی عمارت بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

آلات آبکشی والے کنووں میں سب سے زیادہ عام وہ ہیں جن میں جانور پانی کھینچتے ہیں اور چرخی لگی ہوتی ہے ۔ انھیں بعض اوقات سانیہ کہتے ہیں ۔ پانی ایسے چرس کے ذریعے نکالا جاتا ہے جو بیل یا بکری کے چمڑے کا بنا ہوتا ہے اور جس میں پندرہ سے پینتیس سیر تک پانی آتا ہے ۔ اس کے نیچے ایک لچکدار نالی بھی ہوتی ہے، جو پانی نکالتے وقت پیچھے کو لپیٹ دی جاتی ہے ۔ ڈول اوپر لا کر اسے کھولتے یا سیدھا کر دیتے ہیں تا کہ پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں داخل ہو جائے، جہاں سے وہ نالیوں (ساقیہ) میں چلا جاتا ہے ۔ سہارے، جن

پر چرخی کا محور ہوتا ہے، بعض اوقات پتھر یا مٹی کے لیکن زیادہ‌تر لکڑی کے تنے سے بنے ہوتے ہیں ۔ کھینچنے کا کام بیل یا گدھے اور بعض اوقات (تونس میں) اونٹ سے لیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی (ساحل تونس میں) یہ کام خچر سے بھی لیا جاتا ہے ۔ اوپر سے آنے اور پھر جانے کا راستہ ڈھلواں ہوتا ہے جس پر کوئی بڑا آدمی یا بچہ اس جانور کو ہانکتا ہوا لے چلتا ہے اور ساتھ ہی اس ڈوری سے کام لیتا ہے جو ڈول یا چرسے کو خالی کرنے کے لیے کھلتی اور پھر بند ہوتی ہے ۔ کنویں اور ان کے اوپر کی عمارت مشترکہ ملکیت بھی ہو سکتی ہے، لیکن ہر ایک کے پاس پانی نکالنے کے لیے رسہ، ڈوری اور ڈول یا چرس اپنا ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے جانور سے پانی کھینچتا ہے ۔ جانوروں کے ذریعے چلائے جانے والے ایسے کنویں ہندوستان سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور مشرقی تونس میں، خاص طور پر بنزرت (= بیزرت) [رَكْ بآن] سے جربہ تک، ساحل طرابلس پر، مراکش کے علاقے ہوز میں، شمال مغربی صحرا (تافیلالت، مزاب) میں، طوارق کے دیہاتی علاقے میں، پھر جنوبی سرِنیکا (= برقہ [رَكْ بآں]) کے نخلستانوں میں، جنوبی صحرا کے حصے میں، بالخصوص زیریں موریتانیا اور مغربی سوڈان کے سرحدی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

مصری شادوف کی طرح کے ڈھینکلی والے کنووں کے مختلف نام ہیں : خطّارہ (جمع خطّاطیر) فزّان اور سوف میں اور غُرغَز زیبان اور قُرارہ کے علاقوں میں ۔ ڈھینکلی پتلی بلّی کی بناتے ہیں اور وہ ایک چھوٹی دیوار یا لکڑی کے ڈنڈے پر، جو دو ستونوں پر قائم ہوتا ہے، رکھی جاتی ہے اور اوپر اٹھتی ہے ۔ اس کے زیریں سرے پر دباؤ کے لیے کوئی وزن کی چیز اور اگلے سرے پر پانی کھینچنے کے لیے کسی قسم کا خالی برتن ہوتا ہے (فزّان میں اسے حکمہ اور قُرارہ میں جنینہ کہتے ہیں) ۔ اس برتن میں صرف پانچ سے دس لتر [= سیر] تک پانی سماتا ہے ۔ ڈول کی بہ نسبت یہ تیزی سے کام کرتا ہے لیکن عام طور پر چند سو مربع میٹر سے زیادہ رقبے کی آبپاشی کے قابل نہیں ہوتا ۔ کیونکہ یہ صرف انہیں جگہوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں زیرِ زمین پانی کی سطح (چند میٹر سے) زیادہ گہری نہیں ہوتی اور پانی بہت کم کھینچتا ہے ۔ اصل میں یہ غریب طبقے کا کنواں ہے، جسے ایک آدمی کھود سکتا اور ڈھینکلی لگا کے چلا سکتا ہے ۔ اس میں نہ تو جانور کے جوتنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی مہنگے چرس یا ڈول کی ۔ ایسا کنواں نہ صرف یورپ میں بلکہ چین تک کے دور دراز خطّوں میں عام طور پر مروج ہے، لیکن مراکش اور ساحلِ لیبیا میں اس نمونے کے کنویں بہت شاذ ہیں ۔ پھر بھی صحرائے اعظم زیرین درا (مراکش) میں تندوف کے علاقے سئورہ میں اور جنوبی موریتانیا کے اضلاع طوات اور قرارہ، اُوَرْقلہ، الجولیہ اور غدامس میں، فزان کے شمال اور جنوب دونوں طرف پھر برقہ (= سرِنیکا) میں کُفرہ کے نخلستانوں میں اور ابر [رَكْ بآں]، تبستی اور برقو کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں .

نوریہ یا رہٹ (ناعورہ اور بعض اوقات سانیہ) ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جس کے ڈونگے ایک گھومتی زنجیر میں بندھے ہوتے ہیں ۔ یہ رہٹ ایک بڑے پہیے کے ذریعے چلتا ہے ۔ جسے گھوڑا، خچر یا اونٹ کھینچتا ہے ۔ روایتی قسم کا رہٹ لکڑی کا بنا ہوتا ہے (اکثر اوقات زیتون کی لکڑی کا) ۔ اس میں مٹی کے لوٹے رسیوں سے بندھے ہوتے ہیں ۔ اب اس قدیم رہٹ کی جگہ آہستہ آہستہ لوہے کے بنے ہوئے رہٹ استعمال ہونے لگے ہیں، جن میں کسی دھات کی زنجیر اور ڈبّے ہوتے ہیں ۔ یہ آلات کم از کم مراکش، الجزائر اور شمالی تونس کے ساحلی میدانوں [نیز پاک

و هند] میں تیل یا بجلی کی موٹر سے چلتے ہیں ۔ ان علاقوں میں ایسے کنووں سے بعض اوقات سواحلِ بحر متوسط کے فرنگی، جنھوں نے تجارتی باغ لگائے ہیں ۔ کام لیتے ہیں ۔ وہ اپنے آبائی وطن میں بھی اس قسم کے آلات سے کام لینے کے عادی تھے ۔ وہاں اس رہٹ کو آب کشی کے مختلف نلوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ۔ صحراے اعظم میں یہ صرف شمالی علاقوں، مثلاً تافیلالت، اُوذ رغ Oued Righ اور طرابلس الغرب میں پایا جاتا ہے ۔ مراکش میں بڑے بڑے چرخ، جن کے گھیرے کنویں پر ٹکے ہوتے ہیں اور انھیں پن چکیاں چلاتی ہیں، یہ بھی ناعور (norias) کہلاتے ہیں ۔ یہ صرف فاس کے قرب و جوار میں استعمال ہوتے ہیں۔

جہاں تک فوارے کی قسم کے کنووں کا تعلق ہے وہ صرف کسی زمانے میں اوذ رغ کے علاقے میں پائے جاتے تھے (۱۸۵۶ء میں ان میں سے دو سو بیاسی کنویں کام کر رہے تھے) ۔ نیز الشاطی (فزّان) کے مشرقی حصّوں میں، جہاں انھیں عیون (واحد عین) کہتے ہیں، تھوڑی تعداد میں موجود تھے ۔ یہ کنویں ماہر کاریگر کھودتے تھے اور بہت کمزور ساخت کے ہوتے تھے ۔ الجوایہ اور اورقلہ سے لے کر زیبان تک اور ھدنہ سے لے کر جرید اور نفزاوہ تک پورے زیرین صحرا میں ان کنووں کی تعداد بڑھ گئی ہے لیکن آج کل یہ کنویں جدید طریقوں سے بنوائے اور کام میں لائے جاتے ہیں ۔ کچھ کنویں طرابلس اور فزّان میں بھی بنوائے گئے ہیں۔

مآخذ: (۱) G.S. Colin: *La noria marocaine*، در *Hespéris*، ۱۹۳۲ء؛ (۲) R. Capot-Rey: *Le Sahara* (1953)؛ (۳) J. Despois: *La Tunisie Orientale*، بار دوم، ۱۹۵۵ء؛ (۴) وھی مصنّف: *Le Fezzan (1946)* اور *Le Hodna (1953)*؛ (۵) E. Laoust: *Mots et choses berbèrs*، ۱۹۲۰ء؛ (۶) Ch. Monchicourt: *La Steppe Tunisienne*، در *Bull. de la Dir. de l'Agr.*، تونس ۱۹۰۶ء؛ (۷) *Il Sahara Italiano, Fezzan e oasi di Gat*، ۱۹۳۷ء؛ (۸) E. Scarin: *Le oasi del Fazzan*، ۱۹۳۳ء؛ (۹) *Le oasi cyrenaiche del 29° parallelo*، ۱۹۳۷ء؛ (۱۰) J. Lethiellaux: *Le Fezzan, ses jardins, ses palmiers*، در *IBLA*، تونس ۱۹۴۸ء؛ (۱۱) J. Bisson: *Le Gourara*، ۱۹۵۷ء؛ (۱۲) S. Isnard: *La culture des primeurs sur le littoral algerois*، ۱۹۳۵ء.

(J. DESPOIS)

بِئْر زَمْزَم: رَكَ بہ زَمْزَم۔

بِئْرالسبع: جنوبی فلسطین کے ایک مقام بیر سبا (شیبا) کا معرّب ۔ اس جگہ وہ چشمے تھے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے ہاتھ سے کھودے تھے ۔ ان چشموں کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں ۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی سے یہ جگہ غیر آباد پڑی تھی، آخر ترکوں نے اپنی جنوبی مملکت کے لیے اسے اداری مرکز بنا کر ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں اسے پھر سے آباد کیا ۔ اس اقدام کی وجہ مصری ۔ فلسطینی سرحد کے متعلق وہ اختلاف تھا جو حکومت برطانیہ سے پیدا ہوا اور ضرورت پیدا ہوئی کہ جنوبی قبائل پر کڑی نگرانی رکھی جائے ۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بئر السبع پر ترک اور برطانوی فوجوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی [اور یہ علاقہ برطانیہ کی نگرانی میں چلا گیا] ۔ برطانیہ کے زیر انتظام بئر السبع کی تحصیل فلسطین کے تقریباً نصف علاقے پر مشتمل تھی اور اس کے بدویوں کی آبادی کا اندازہ پچھتر ہزار سے ایک لاکھ نفوس تک کیا گیا ہے ۔ ۱۹۴۰ء میں شہر کی آبادی تین ہزار تھی، جن میں سے نصف کے قریب خانہ بدوش تھے ۔ جدید اکتشافات میں اس جگہ سے متعدد یونانی کتبے

برآمد ہوے ہیں .

مآخذ : یاقوت : معجم البلدان، ۵ : ۱۴؛ (۲) Le Strange : *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۳۰۲ ببعد؛ (۳) Robinson : *Biblical Rcsearches*، ۱ : ۲۳۰؛ (۴) Guérin : *Judee*، ۲ : ۲۷۶ تا ۲۸۴؛ (۵) Nöldeke : *Sieben Brennen*، در *ARW*، ۷ : ۳۴۰ تا ۳۴۴، ۱۹۰۴ء؛ (۶) A. Legendre : *Bersabée*، در *Dic. de la Bible*، ۱ / ۲ : عمود ۱۶۲۹ تا ۱۶۳۴؛ تکملہ، ۱ : ۹۶۳؛ تا ۹۶۸ (۷) عارف العارف : *Bedouin Love, law and Legend*، یروشلم ۱۹۴۴ء؛ (۸) وہی مصنف : تاریخ بیرالسبع و قبائلها، یروشلم ۱۹۳۴ء؛ (۹) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و Sanguinetti، ۱ : ۱۲۶ .

(E. HONIGMANN)

⊗ **بِئْر مَعُوْنَہ** : علاقۂ بنو عامر اور حرّۂ بنو سُلَیم کے درمیان ایک کنواں جو بنو سُلَیم کی ملکیت تھا اور ان کے قریب‌تر بھی ـ اس کے آس پاس کا علاقہ بھی بئر معونہ کہلاتا ہے ـ ویسے تو مدینۂ منورہ اور اس کے گرد و نواح میں بہت سے کنویں اور چشمے تھے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے جن کی تفصیلات انساب الاشراف، جمهرة انساب العرب، السمهودی : وفاء الوفاء، معجم البلدان وغیرہ میں موجود ہیں، لیکن تاریخ اسلام میں بئر معونہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ کفار نے سازش اور غداری سے بہت سے بلند مرتبت، فضیلت مآب، بزرگ اور حفّاظ و قرّا صحابۂ کرام رض کو شہید کر دیا تھا (زاد المعاد، ۲ : ۱۱۰).

جنگ احد کے بعد کفار اور منافقین کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ اسلام کو مٹانے کے لیے سازشیں کرنے لگے ـ مسلمانوں بالخصوص حفّاظ قرآن اور علماے دین کو غداری اور دھوکے سے قتل کرنے کے منصوبے تیار کیے گئے ـ اسی منصوبے کی ایک کڑی یوم الرَّجیع (رَکَ بآں) کے شہدا تھے (دیکھیے جوامع السیرۃ، سیر اعلام النبلاء، پہلی جلد، ابن خلدون، وغیرہ)، اور دوسری کڑی شہداے بئر معونہ .

ماہ صفر ۴ھ میں بنو عامر کا ایک معزز سردار ابو براء عامر بن مالک الکلابی، مُلاعِب الاَسِنَّۃ (نیزوں سے کھیلنے والا) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوا ـ آپؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی، لیکن نہ وہ اسلام لایا اور نہ انکار کیا ـ پھر اس نے کہا کہ اے محمدؐ! اگر آپ اپنے کچھ صحابہ کو اہلِ نجد کی طرف بھیجیں جو انھیں اسلام کی طرف بلائیں تو مجھے امید ہے وہ اسلام لے آئیں گے ـ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے ان کے بارے میں خدشہ ہے ـ ابو براء نے کہا کہ میں ان کا حامی و ضامن ہوں، چنانچہ آپؐ نے ایک سردار قبیلہ کی حمایت و ضمانت پر اعتماد کرتے ہوے حضرت المنذر بن عمرو بن خُنَیس الساعدی، الخزرجی، العقبی، البدری، النقیب کی سرکردگی میں ستّر صحابہؓ کا ایک وفد روانہ کیا (زاد المعاد، صحیح البخاری) ـ کتاب المحبر میں تعداد تیس درج ہے جن میں سے چھبیس انصار اور چار مہاجرین تھے (ص ۱۱۸) ـ جوامع السیرۃ (ص ۱۷۹) اور انساب الاشراف (۱ : ۳۷۵) میں چالیس یا ستّر مرقوم ہے ـ جب یہ وفد بئر معونہ کے علاقے میں فروکش ہوا تو انھوں نے حضرت حَرام بن مِلْحان النّجاری کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کا خط دے کر بنو عامر کے سردار عامر بن الطفیل بن مالک کے پاس بھیجا ـ عامر نے خط پڑھے بغیر قاصد کا سر قلم کر دیا، اور اپنے قبیلے کو مسلمانوں کے اس وفد پر حملہ کرنے کو کہا، مگر انھوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ ابو براء نے مسلمانوں کو اپنی حمایت و ضمانت میں لے رکھا تھا ـ ادھر سے ناکام ہو کر عامر بن الطفیل نے بنو سلیم کو حملہ

کرنے پر اکسایا تو بنو سُلَیم کے قبائل میں سے
بنوعُصَیّة بن خُفاف، بنو رِعْل بن مالک، بنو ذَکوان بن
رِفاعة مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے ۔ یه دیکھ کر مسلمان
بھی آرام گاھوں سے نکل آئے اور تلواریں نکال لیں
اور مقابله کرتے ھوے سارے شہید ھو گئے ۔ البته
حضرت کعب بن زید النّجاری یوں بچ گئے که
کفار نے اپنے زعم میں انھیں قتل کر کے پھینک
دیا، لیکن ان میں رمق باقی تھی، چنانچه وه زخموں
سے نڈھال گرتے پڑتے بچ نکلے اور بعد میں غزوۂ خُندق
میں شہید ھوے (سیر اعلام النبلاء، ۱ : ۱۷۳).

اتفاق کی بات ھے که اس وفد کے دو رکن
حضرت عمرو بن اُمیّه الضمری اور المُنذر بن محمد بن
عُقبه بن اُحَیحة بن الجُلاح الانصاری، البدری اپنے
اونٹوں کو چرانے نکلے ھوے تھے ۔ جب انھوں نے
دیکھا که مسلمانوں کی قیام گاه کے اوپر پرندے
منڈلا رھے ھیں تو حالات معلوم کرنے کے لیے وه
اپنی قیام گاه کی طرف لپکے ۔ وھاں پہنچ کر کیا
دیکھتے ھیں که ان کے سارے ساتھی شہید کر
دیے گئے ھیں اور حمله آور گھوڑ سوار ابھی وھیں
کھڑے ھیں ۔ جوشِ غیرت میں ان دونوں نے حمله
کر دیا ۔ المنذر تو وھیں شہید ھو گئے، اور الضّمری
گرفتار کر لیے گئے ۔ جب عامر بن الطفیل کو
معلوم ھوا که عمرو بن امیه قبیلۂ مضر سے ھیں تو
اس نے ان کی پیشانی کے بال کاٹ لیے اور یه کہه کر
آزاد کر دیا که میری ماں کے ذمے ایک غلام آزاد
کرنا تھا، سو میں اس کی طرف سے تجھے آزاد
کرتا ھوں.

اب حضرت عمرو رض بن امیه نے مدینۂ طیبه کا رخ
کیا. راستے میں بنوسلیم کی ایک گھاٹ قرقرة الکدر نامی
پر ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے ٹھیر گئے ۔
وھیں بنو کلاب یا بنو سلیم کے دو آدمی آ فروکش
ھوے ۔ ان کے پاس آنحضرت صلّی اللہ علیه و سلّم کا
معاهده تھا، مگر حضرت عمرو رض بن امیه کو اس کا
علم نه تھا ۔ جب وه سو گئے تو اپنے شہید ساتھیوں
کا انتقام لینے کے خیال سے حضرت عمرو رض نے دونوں
کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مدینۂ منوره
پہنچ کر آنحضرت صلّی اللہ علیه و سلّم کی خدمت
میں سارا ماجرا کہه سنایا ۔ آپ ؐ نے فرمایا که تم
نے دو ایسے آدمیوں کو قتل کر دیا ھے جن
کا خون بہا مجھے ادا کرنا پڑے گا، چنانچه آپ ؐ نے
ان دونوں کا خون بہا ان کے قبیلے میں بھیجدیا ۔
آنحضرت صلّی اللہ علیه و سلّم اور صحابۂ کرام رض کو
شہدائے بئر معونه کا بڑا دکھ ھوا ۔ اس سے کچھ دن
پہلے یوم الرَّجیع میں دس (البخاری؛ ابن سید الناس)
اور بقول دیگر سات (الواقدی) بہترین قاری صحابه
کی شہادت کا واقعه پیش آ چکا تھا، اس کا بھی
آپ ؐ کو بڑا صدمه تھا، چنانچه آپ ؐ تقریبًا ایک
مہینه ھر نماز میں شہدائے بئر معونه اور الرّجیع
کے قاتلوں کے لیے بد دعا کرتے رھے.

بئر معونه کا سانحه ۲۰ صفر کو پیش آیا
(المحبر، ص ۱۱۸) ۔ شہدا کے چند ھی نام مل
سکے ھیں جو درج ذیل ھیں : (۱) سعد رض بن عمرو بن
کعب النّجاری، الخزرجی، الانصاری، (جمهرة، ۳۴۹)؛
(۲) الحارث رض بن الصِّمّة بن عمرو النّجّاری، البدری
(جمهرة، ۳۴۹؛ سیر اعلام النبلاء، ۱ : ۱۷۳)؛ (۳)
قُطبة رض بن عبد عمرو النجاری (جمهرة، ۳۵۰)؛ (۴) سُلَیم رض
بن مِلْحان النجاری، البدری (جمهرة، ۳۵۱)؛ (۵) حَرام رض
بن مِلْحان النجاری (جوامع السیرة؛ ۱۷۹؛ سیر، ۱ :
۱۷۳)؛ (۶) خالد رض بن ابی صَعْصَعة النجاری (جمهرة،
۳۵۲)؛ (۷) المُنذر رض بن محمد بن عُقبه الاَوْسی، الانصاری
(جمهرة، ۳۳۵)؛ (۸) رافع رض بن وَرْقاء الخزاعی (سیر، ۱ :
۱۷۳)؛ (۹) عُروة رض بن اَسْماء بن الصَّلْت السُّلَمی،
(سیر، ۱ : ۱۷۳؛ ابن هشام ۳ : ۱۹۳)؛ (۱۰) حَکَم رض
بن کَیْسان (انساب الاشراف؛ ۱ : ۳۷۲)؛ (۱۱) نافع رض

ابن بُدَیل بن وَرقاء الخُزاعی (جمهرة، ۲۳۹)؛ جوامع السیرة، ۱۷۹)؛ (۱۲) عامر بن البکیر (ماں : عَفْراء بنت عبید، المحبر، ۴۰۹)؛ (۱۳) المنذر بن عمرو بن خُنیس الخزرجی، الساعدی، البدری، العقبی، النقیب، الانصاری (المحبر، ۲۷۱؛ جمهرة، ۳۶۶؛ انساب الاشراف، ۱ : ۳۷۰)؛ (۱۴) عامر بن فُہَیرة، البدری، حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے آزاد کردہ غلام (جمهرة، ۲۸۶)؛ ان کے قاتل جبّار بن سُلْمٰی بن مالک کا بیان ہے کہ جب میں نے اسے نیزہ مارا تو کسی نے اس کو میرے نیزے سے اچک لیا، میں نے کسی اور شخص کو تو دیکھا نہیں، لیکن میرے دیکھتے دیکھتے وہ آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا اور اس کی نعش نہیں ملی ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم نے فرمایا کہ عامر کو فرشتے لے گئے اور ان کی نعش کو دفن کر دیا (انساب الاشراف، ۱ : ۳۷۴).

مآخذ : (۱) ابن حزم : جمهرة انساب العرب (طبع عبدالسلام ہارون)، قاہرہ ۱۹۶۲ء؛ (۲) وہی مصنّف : جوامع السیرة (طبع احسان عباس)، ص ۱۷۰ تا ۱۸۰، قاہرہ ۱۹۵۶ء؛ (۳) ابن حبیب : المحبر، ۱۱۸، ۴۷۲، حیدر آباد (دکن) ۱۳۶۱ھ؛ (۴) ابن خلدون : تاریخ ابن خلدون (اردو ترجمه از ڈاکٹر عنایت اللہ)، ۱ : ۳۴۲ تا ۳۴۴، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۵) ابن سعد : الطبقات، ۲/۱ : ۳۶، ۲/۳ : ۷۱، ۳/۱ : ۱۸۳، ۳/۲ : ۸۹؛ (۶) ابن سید الناس : عیون الاثر، ۲ : ۴۶ ببعد، قاہرہ ۱۳۵۶ھ؛ (۷) ابن القیم : زاد المعاد، ۲ : ۱۰۹ تا ۱۱۰، مصر ۱۹۲۸ء؛ (۸) ابن کثیر : البدایة و النهایة ۴ : ۷۱ تا ۷۴، مصر و بیروت؛ (۹) ابن ہشام : السیرة (طبع مصطفٰی السقا وغیرہ)، ۳ : ۱۹۳ تا ۱۹۹، مصر ۱۹۳۶ء؛ (۱۰) البخاری : الصحیح، کتاب الجہاد، باب ۹، ۱۸۴، کتاب المغازی، باب ۱۸؛ (۱۱) ابو داؤد الطیالسی : المسند (تبویب جدید، طبع احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی)، ۲ : ۱۰۲، مصر ۱۳۷۲ھ؛ (۱۲) البلاذری : انساب الاشراف (طبع محمد حمید اللہ)، ۱ : ۳۷۵، ۳۴۲، ۳۷۰، ۱۹۳، ۱۹۳، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ (۱۳) الذہبی : سیر اعلام النبلاء (طبع صلاح الدین المنجد)، ۱ : ۱۷۳ قاہرہ؛ (۱۴) وہی مصنّف : العبر فی خبر من غبر (طبع صلاح الدین المنجد) ۱ : ۶، الکویت ۱۹۶۰ء؛ (۱۵) الدیار بکری : تاریخ الخمیس، ۱ : ۴۵۱؛ (۱۶) الطبری : تاریخ، ۳ : ۳۳؛ (۱۷) القسطلانی : المواهب اللدنية، ۱ : ۱۳۳؛ (۱۸) المقریزی : امتاع الاسماع، ۱۷۰؛ (۱۹) الزرقانی : شرح المواهب اللدنیه، ۲ : ۷۴ تا ۷۹، طبع مصر ۱۳۲۵ھ؛ (۲۰) یاقوت معجم البلدان (مادّۂ بئر) .

(عبدالقیوم)

بئر میمون : نواحِ مکّۂ مکرمہ میں ایک کنواں جو اسلام کے ابتدائی زمانے میں مشہور و معروف تھا، مگر اب مکّۂ مکرمہ کے علاقے میں یہ سننے میں نہیں آتا ۔ دستیاب مآخذ سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ آیا بئر میمون برباد ہو گیا یا کسی دوسرے نام سے اب بھی جاری ہے۔ قدیم کنویں کا محل وقوع بھی غیر یقینی ہے۔ بہت سے شواہد اس کا جائے وقوع مسجد الحرام اور مِنٰی کے درمیان، مِنٰی سے قدرے قریب تر قرار دیتے ہیں ۔ الطبری (۳ : ۴۵۶) نے بئر میمون کے مقام پر ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء میں خلیفہ المنصور کی وفات کے حالات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کنواں حدود حرم کے اندر تھا، نیز خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عراق سے آنے والے حاجیوں کی راہ پر تھا (ایک اور روایت کے مطابق المنصور کی قبر الحَجُون کی پہاڑی پر واقع ہوئی تھی نہ کہ بئر میمون کے مقام پر، دیکھیے Wüstenfeld : *Gesch. der Stadt Mekka*، لائپزگ ۱۸۶۱ء، ص ۱۶۰) - ایک تاریخی شہادت کے مطابق بئر میمون مکّے کے نزدیک مرّ الظہران (جسے اب وادی فاطمہ کہتے ہیں) کے پاس تھا [قبّ المنتقی، ص ۱۲۴] - الہمدانی، ۱ : ...

کے قول کے مطابق بئر میمون دنیا بھر کے دو قدیم‌ترین کنووں میں سے ایک تھا ۔ البکری (: معجم، قاہرہ ۱۹۴۵ - ۱۹۵۱ء، ۴ : ۱۲۸۵) کے قول کے مطابق یہ کنواں چاہ زمزم سے کہیں زیادہ قدیم تھا، لیکن [عہد نبوی میں یہ کنواں میمون بن الحضرمی کی ملکیت تھا (ابن حزم : جمهرة، ص ۴۶۱)] ۔ اگر یہ کنواں اتنے قدیم زمانے کا تھا تو اسے شروع میں لازماً [حضرت] العلاءؓ بن الحضرمی کے بھائی میمون سے بھی پہلے کسی شخص نے کھودا ہوگا ۔ یہ میمون اسی نام کے کسی چاہ کھودنے والوں میں سے ایک تھا ۔ قطبی کی لکھی ہوئی مکّے کی تاریخ الاعلام (مکه بدون تاریخ طباعت، ص ۲۸۲) میں لکھا ہے کہ بئر میمون مکّے کے لیے آب‌رسانی کے اس بڑے نظام سے وابستہ تھا جو سب سے پہلے ملکۂ زبیدہ نے تیار کرایا ۔ [حاکم اربل المظفر نے ۶۰۳ھ میں مرمت کے بعد اس کنویں کو از سر نو آباد کیا (المنتقی، ص ۱۲۴)] ۔ بعض مفسروں نے بئر میمون کو وہ پانی قرار دیا ہے جو قرآن کریم کی سورۃ الملک [۶۷] کی آخری آیت (فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ) میں مذکور ہوا ہے ۔

مآخذ : (۱) الهروی : الزیارات، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۸۹؛ (۲) الفاسی : شفاء الغرام، قاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱ : ۳۴۳؛ (۳) السباعی : تاریخ مکه، قاہرہ ۱۳۷۲ھ، ص ۹۶ [(۴) کتاب المنتقی فی اخبار ام‌القری، لائپزگ ۱۸۵۹ء، ص ۱۲۴] ۔

(G. RENTZ)

بَیْرام : معلوم نہیں کہ ترکوں نے کس زمانے میں لفظ بَیرام کو مسلمانوں کے دو بڑے تیوہاروں [عیدین] کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، نہ اس امر کی کوئی صریح شہادت موجود ہے کہ ترکوں میں اسلام سے پہلے مسلّمہ مذہبی تیوہاروں پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا ۔ محمود کاشغری نے لکھا ہے کہ گیارھویں صدی میں اُوغُز (= اوغوز) ترک یوم عید کو ''بیرام'' کہتے تھے اور وہ کہتا ہے کہ اس لفظ کے معنی اس کی ابتدائی شکل ''بَذْرَم'' کی طرح، ''یوم مسرّت و تفریح'' کے آتے ہیں ۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے اس لفظ کی اصل معلوم نہیں اور اس نے اسے ایرانیوں کے ہاں سنا ہے وہ مزید بیان کرتا ہے کہ ''پھولوں اور چراغوں سے آراستہ'' جگہ کو ''بذرم یر'' کہا جاتا ہے، یعنی ایک ایسی جگہ جہاں دل کو سکون حاصل ہوتا ہے'' (دیوان لُغات التُرک، ۱ : ۳۰۱؛ ۳ : ۱۳۳)، لیکن ہمیں اتنا پتا تو ملتا ہے کہ مابعد صدیوں میں یہ لفظ اپنے پورے اسلامی معنی میں استعمال ہونے لگا (ابن مُهنا : طبع کلیس لی رفعت، ص ۱۸۴)، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تیرھویں صدی سے یہ شخصی ناموں میں بھی استعمال ہوتا تھا ۔ قومان Kumans ترکوں کی تقویم میں ایک مہینے موسوم بہ قُربان باران کی موجودگی ہمارے لیے صرف اس امر کا مظہر ہونے کی وجہ سے اہم ہے کہ اسلام ہی نے اس لفظ کی اشاعت کی (*Codex Cumanicus* طبع G. Kuun، ۱۱۶) ۔ لفظ ''بیرام'' کا اشتقاق اور ابتدائی مادّہ ہنوز نامعلوم ہیں ۔ اگر ترکوں کے ہاں عید سے مطابقت رکھنے والا لفظ ''بیرام'' کا محمول موجود نہ ہوتا تو اُوغُز قوم میں اس لفظ کو بلا تامّل یہ معنی نہ دیے جاتے ۔

محمود کاشغری کے اس بیان کا کہ اسلام سے قبل ترکوں کا کوئی یوم عید نہ تھا (۳ : ۱۳۳)، ظاہر ہے کہ صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان کے ہاں اسلامی تیوہار نہ تھے ۔ ''بیرام'' سے ہمارا مطلب بعض رسوم و تفریحات کا ایک مجموعہ ہے، جو سال میں مقررہ اوقات پر منائی جاتی ہیں اور وہ یا تو مذہبی ہیں، یا اگر وہ مذہبی نظر نہیں آتیں تو بھی بہر حال ابتداءً مذہبی قسم کی تھیں ۔

اگر اس امر کو ملحوظ خاطر رکھیں تو پھر اس میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ شمنی مذہب کے ماتحت ترکوں کے ہاں بھی اپنے خاص ''بیرام'' ہوتے ہونگے، گو ہمیں فی الواقع معقول معلومات پر دسترس نہیں، لیکن بعض تاریخی دستاویزات سے جو اس مضمون سے متعلق ہیں، استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔ چینی مآخذ کے مطابق، گوک ۔ ترک امرا ہر سال اوتوکن Otüken غار کو جہاں سے ان کے اجداد برآمد ہوے تھے جایا کرتے تھے اور رسوم تقدیس ادا کیا کرتے تھے، گو یہ معلوم نہیں کہ عوام بھی اس دن کو تیوہار کے طور پر مناتے تھے یا نہیں، لیکن اسی مآخذ میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ پانچویں مہینے کے نصف آخر میں سب لوگ ایک بڑا تیوہار منایا کرتے تھے، جس میں گوک تنری (آسمان کے دیوتا) کے اور ارواح ارضی کے لیے قربانیاں دی جاتی تھیں St. Julien : *Docnments*، در *JA*، ۱۸۶۴ء، ۳ : ۳۳۵؛ E. Chavannes : *Documents*، پیٹرزبرگ، ۱۹۰۳ء، ص ۱۵؛ A. Remusat : *Recherches sur les Langues tartars*، ۱ : ۲۲۷؛ W. Eberhard : چینک شمالی قوشولری، انقرہ ۱۹۴۲ء، ص ۶۷) ۔ ان رسوم کا نہایت قریبی تعلق گوک ترکوں کی اصل سے متعلق چینی مآخذ کے افسانوں سے ہے اور وہ مسلم مآخذ میں بھی مذکور ہیں ۔ افسانۂ Ergenekon کے مطابق، جو تاریخ گوک ۔ ترک کا ایک افسانوی عکس ہے، ترک (دیکھیے زکی ولیدی طوغان : مغوللر، چنگیز و ترک لک، استانبول ۱۹۴۱ء)، ہر سال کے آغاز میں خاقان کی قیادت میں رسوم ادا کرتے اور تیوہار منایا کرتے تھے جس میں Ergenekon سے برآمد ہونے کی یاد میں سرخ لوہے کی سندان پر کوٹا جاتا تھا (جامع التواریخ، کتابخانہ طوپ قپی، مخطوطہ، ورق ۳۱ الف؛ نصیر الدین طوسی : زیج ایلخانی، کتابخانۂ نور عثمانیہ، مخطوطہ، عدد ۲۹۳۳؛ رضانور : شجرۂ ترک *Shejere-i-Turk*، ترجمہ ص ۳۸) ۔ یہ روایت، جو گوک ترکوں کی ابتدا اور ان کے پیشۂ حدادی اختیار کرنے پر مبنی ہے، بعینہ اسی صورت میں کنز الدرر میں مذکور ہے (رک بہ حسام الدین : اماسیہ تاریخی، ۲ : ۱۲) ۔ آغاز سال کے موقع پر وسطی ایشیا میں مغولوں کی قورولتای (Kurultay) کی تقریب (جوینی : جہان گشای، ۳ : ۱؛ تاریخ مبارک غازانی (بسلسلۂ یادگار گب) ص ۱۴۳، ۱۵۴) کا تعلق بھی اسی تہوار کے ساتھ معلوم ہوتا ہے، بحالیکہ تیوہاروں کی یہ روایت گوک ترکوں کی تاریخی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے ۔ اس امر کا امکان بھی موجود ہے کہ انھیں یہ رسم ہیونگ نو قوم سے ملی تھی اور وہ ہر اعتبار سے اسی قوم کے آئندہ سلسلے میں تھے ۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہیونگ نو حکومت کے اکابر ہر نو روز کے موقع پر تن یو کے مستقر پر اکٹھے ہوتے تھے اور زمین اور آسمان کے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دیتے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس طرح پانچویں مہینے میں ایک مقام پر جو بظاہر اتوکن سے متصل تھا قربانیاں دے کر بڑا تیوہار منایا کرتے تھے (De Groot : *Die Hunen der Vorchristenzeit*، ص ۵۹؛ Deguignes ترجمہ H. Cahid : ۱ : ۲۰۱؛ W. Eberhard : کتاب مذکور، ص ۶۷.

چینی اور مسلم مآخذ میں بعض ترکی قبائل کے تیوہاروں کے جو مبہم حوالے درج ہیں (W. Eberhard : *TM*، ۷ : ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۴۷؛ یاقوت : معجم، ۳ : ۳۴۸) ان کے متعلق فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ زیادہ مطلب خیز نہیں ہیں صرف عوامی تاریخ کے مواد کا کام دے سکتے ہیں.

زمانۂ قبل از اسلام کے ''بیرامون'' کی نوعیت کا احاطہ کرنے کے لیے ہم ان معلومات سے استفادہ کر سکتے ہیں جو طوی (یا طوء) [جشن] سے

متعلق ملتی ھیں ۔ ان تقریبات نے اسلامی عہد میں ایک حد تک اپنا مذہبی رنگ کھو دیا، تاہم ابھی تک ان کا ذکر قومی رزمیہ نظموں اور افسانوں میں باقی ھے ۔ کتاب دِدہ قورقوت میں یہ بیان کہ بایندرخان ہر سال ایک طُوی منعقد کیا کرتا تھا (طبع اورخان شائق Orhan Saik، ص ۵) ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ھے کہ طُوی بھی، بیراموں کی مانند، ایسی رسوم تھیں جو اوقات مقرّرہ پر ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس یہ امر کہ لفظ طوی (بعض اوقات ''شولن'') کا خان کی تخت نشینی، اور رسوم متعلقہ پیدائش سے جو ''یُغ'' [رسوم جنازہ وَکہ ۔ اس کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ رسوم مرگ کی طرح پیدائش پر بھی خاص جلسے اور دعوتیں ہوتی تھیں] سے مطابقت رکھتی تھیں (مثلاً اُغز خان کے بچوں کی پیدائش کے موقع پر، رك بہ اوغوز کاغان داستانی، طبع Rahmeti L, W. Bang، ص ۵ ؛ چنگیز کی پیدائش کی تقریب پر (جامع التواریخ، ۷۲ الف)، دِلی دمرول کی پیدائش کی تقریب پر، (دِدہ قورقوت، ص ۶۱)، نیز اس سے کہ یہ لفظ مسرّت کے جلسوں اور ان رسوم کے لیے استعمال ہوتا تھا جو کسی عظیم الشان فتح کے بعد یا شادی کے موقع پر منائی جاتی تھیں ۔ ظاہر ہوتا ھے کہ اسے پورے طور پر ''بیرام'' کا ہم معنی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ گو اسلام نے صرف اپنے ھی ''بیراموں'' کو اہمیت دی تھی اور بت پرستانہ روایات اس کی نظر میں مستحسن نہ تھیں، تاہم جزوًا دنیوی روپ اختیار کر کے وہ بعض خطّوں مثلاً مصر، شام اور ایران (قب : جشن) میں جاری رھیں، اسی طرح ترکی بیرام کی روایات بھی ایک طویل عرصے تک زندہ رھیں، بلکہ بعض قدیمی ترکی رسوم اسلامی بیراموں میں بھی داخل ھو گئیں ۔ آلتون اردو یا لشکر زرّیں (Golden Horde) میں بیرام سے متعلق جن رسوم کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ھے ان سے ان اثرات کا کچھ پتا چل سکتا ھے (رك بہ ترجمہ ایم ۔ شریف، ۱ : ۳۸۳).

گو ترکوں نے مشرّف باسلام ہونے کے بعد اپنی قدیمی بیرام کی رسوم قائم رکھیں لیکن انھوں نے اسے ایک فریضۂ مذہبی سمجھا کہ وہ اسلام کے مقرر کردہ بڑے ''بیراموں'' رمضان بیرامی اور قربان بیرامی کو اہم اور متدّس تصوّر کریں، لیکن مسلم ترکوں کے مخصوص بیراموں کے متعلق جو واضح اور مفصّل معلومات ہمیں حاصل ھیں وہ صرف سلطنت عثمانیہ کے دور کی ھیں ۔ فی الحال جو دستاویزات ہمیں میسّر ھیں ان کی بنا پر ہمیں لازمًا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فاتح سلطان محمّد اگر رسوم و جشن ھاے بیرام کا بانی نہیں تھا تو کم از کم قانونًا اسی نے انھیں منضبط و مدوّن کیا ۔ اس کا تحریری ثبوت موجود ھے کہ قانون نامہ کے مطابق، جو اس سے منسوب ھے، سلطان موصوف نے حکم دیا تھا کہ بیرام کے ایام میں تخت شاہی میدانِ دیوان میں بچھایا جائے، سلطان اس پر جلوہ افروز ھو اور اعلٰی عہدےداروں کو اجازت ھو کہ وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دیں (قانون نامۂ آلِ عثمان، در *TOEM* ضمیمہ ۳، استانبول، ۱۳۳۰ھ، ص ۲۵) ۔ وہ دقیق اور پیچیدہ رسوم جو بعد کے قانون ناموں، تواریخ اور آداب و رسوم کی کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ھیں سلطنت کے آخری ایّام تک جاری رھیں اور ان میں کوئی اصولی تغیر نہیں کیا گیا.

چونکہ استانبول میں یہ معمول تھا کہ رمضان بیرامی کی تقریب پر آنے والوں کی تواضع مٹھائیوں سے کی جائے اس لیے اس تیوہار کو شکر بیرامی (یعنی میٹھی عید) کہا جانے لگا؛ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہوتا، ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دی جاتی اور بڑی عمر کے لوگ بچّوں کو رومال

تحفے کے طور پر دیتے تھے ۔ قربانِ بیرامی (= عید قربان) کی تقریب پر قربانی کے جانوروں کا گوشت مساکین اور ہمسایوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس طرح کی مبارکباد کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، لہٰذا رمضان بیرامی، جسے ''بیرام کوچک'' کہا جاتا ہے، سرکاری تقریبات کے اعتبار سے بڑی عید کے رتبے کی ہوتی ہے (بیرام سے متعلق احکام مذہبی، اس کی ابتدا اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں بیرام سے متعلق رک بہ عید)۔

عہدِ جمہوریہ میں ان تقریبات بیرام کے موقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کا رواج ایک قومی روایت کے طور پر زندہ ہے ۔ اعلان آئین کی سالگرہ کو ترکیہ میں سب سے پہلے غیرمذہبی بیرام کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا، عہدِ جمہوریہ میں اس نے ''بیرام جمہوریہ'' (۲۹ اکتوبر) کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ انقرہ میں جب صدرِ جمہوریہ مجلس ملّیۂ کبیر میں مندوبین، اعلٰی حکّام اور سفرا کی مبارکباد لے چکتے ہیں تو ایک بڑی فوجی نمائش ہوتی ہے، شہروں میں، شہر کے اعلٰی انتظامی عہدیدار کو مبارکباد پیش کی جاتی ہے اور فوجی قواعد (پریڈ) کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ جس میں عسکری مدارس کے طلبہ حصہ لیتے ہیں ۔ بیرام کی یہ تقریبات تین دن تک جاری رہتی ہیں ۔ ترکیۂ جدید میں دوسرے درجے کے غیر مذہبی بیرام دو ہیں: ۲۳ اگست، جب کہ مجلس ملّیۂ کبیر قائم ہوئی اور ۳۰ اگست، جب کہ عساکر ترکیہ کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی ۔ ان بیراموں کے علاوہ یکم جنوری، سالِ نو کی تقریب کو بھی سرکاری تعطیل کا دن قرار دیا گیا ہے ۔

مآخذ: مقالے میں مندرجہ تصانیف کے علاوہ دیکھیے : (۱) اسد آفندی : تشریفات قدیمہ، بمواضع کثیرہ؛ (۲) خضر الیاس: تاریخ اندرون، ۱۲۷۶ھ، ص ۲۵، ۳۵ تا ۴۰، ۶۱ تا ۶۵؛ (۳) عطاء: تاریخ، ۱ : ۲۲۰ تا ۲۵۰؛ (۴) D'Ohsson : *Tableau général de l'Empire Othoman*، (پیرس ۱۷۸۸ء) ۲ : ۲۲۲ تا ۲۳۱، ۲۳۴ تا ۲۳۶؛ (۵) اے ۔ جاوید بے : *Etat Militaire Ottoman* (استانبول ۱۸۸۲ء)، ص ۲۶، تا ۲۷؛ (۶) محمّد زکی: اسلافنده بیرام تبریکاتی (*TOEM*، ۳۶ : ۴۰۷)؛ (۷) کوپرولو زادہ محمّد فؤاد: ترک ادبیاتنک منشای (*MTM*، جلد ۵، بمواضع کثیرہ)؛ (۸) عبدالقادر : اورن و اولوش (تورک حقوق و اقتصاد تاریخی مجموعہ سی)؛ (۹) عثمان توران : اون ایکی حیوانلی تورک تقویمی (استانبول ۱۹۴۱ء)، ص ۳۴ تا ۳۶، ۴۷ تا ۴۸، ۸۰، ۱۲۲۔

(عثمان توران)

بیرامیہ : ایک طریقہ جو خلوتیہ سے نکلا ہے اور جس کی بنیاد آٹھویں نویں صدی ہجری/چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں حاجی بیرام ولی نے انقرہ میں رکھی ۔ صوفی روایت کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلم نے حضرت ابو بکرؓ کو ''ذکرِ خفی'' کا حکم دیا اور حضرت علیؓ کو ''ذکرِ جلی'' کا ۔ بیرامیہ ذکرِ خفی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس بات میں نقشبندی بھی ان کے ہم‌نوا ہیں، لیکن حقیقۃ ؤخر الذکر کے ساتھ اس کا تعلق بہت تھوڑا ہے اور ذکر خفی کی مشق ان میں ملامتی اثر کے تحت آئی۔

اپنے بانی کی موت پر یہ طریقہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا ۔ ایک شاخ نے ذکر جلی کو اختیار کر لیا اور آق شمس الدین کے پیرو ہونے کی بنا پر بیرامیہ شمسیہ کہلانے لگے ۔ دوسری شاخ نے برسہ کے عمر ددہ کے زیر سرکردگی ذکر، ورد، اپنا شخصی لباس اور تکیہ سب کچھ ترک کر دیا اور ملامیّہ بیرامیہ کے نام سے مشہور ہوے ۔ بعد ازاں عزیز محمود ہدائی (م ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۸ - ۱۶۲۹ء) کے ماتحت ایک تیسری شاخ پیدا ہوئی جو جلوتیہ کہلائی۔

عقیدے کے اعتبار سے اس طریقے کی سب سے

بڑی خصوصیت جو اس کے ملامی الاصل ہونے کی دوسری دلیل ہے یہ ہے کہ اس حلقے میں داخل ہونے والے کو اس کی روحانی زندگی کے آغاز ہی سے وحدة الوجود کے تصور سے روشناس کر دیا جاتا تھا، حالانکہ دوسرے طریقوں میں یہ بات بالکل آخر میں ہوتی ہے - اسے سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ تمام افعال خدا کی طرف سے ہیں (توحید افعال یا فنائے افعال)، اس کے بعد یہ کہ افعال صفات کے مظہر ہیں جو سب خدا کی صفات ہیں (توحید صفات یا فنائے صفات) اور سب سے آخر میں یہ کہ صفات روح کے مظاہر ہیں، وجود صرف ایک ہی ہے اور یہ کہ تمام اشیا اَعیانِ علمیہ کے مظاہر ہیں، جو خدا کے علم میں ہیں (توحید ذات یا فنائے ذات).

اس طریقے کا سر کا لباس سفید نمدے کی ایک شش گوشہ ٹوپی ہوتی تھی جو گویا شش جہات (اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے) کی نشان دہی کرتی تھی اور اس سے اس بات کا اظہار مقصود تھا کہ اس کا پہننے والا تمام اشیائے موجودہ کی حقیقت سے آشنا ہے.

شروع ہی سے اس طریقے کے تعلقات اپنے اصل ملامتیّہ سے بہت زیادہ مضبوط و پختہ تھے؛ چنانچہ ملامتیّہ کئی بیرامی شیوخ کو قطب زمان تسلیم کرتے تھے.

۱۹۲۵ء میں جب ترکی میں یہ سب طریقے توڑے گئے تو اس وقت اس طریقے کے مرکز استانبول، انقرہ، ازمید، اور قسطمونی میں قائم تھے.

مآخذ: دیکھیے آآ، ت میں عبدالباقی گول پنار کا طویل مقالہ ''بیرامیّہ''، یہ مقالہ اسی کا ایجاز و اختصار ہے.

(G. L. Lewis)

* بِیرجَند: فارس کے نویں اُستان میں ایک ضلع اور شہر - شہر ۹ ۵ دقیقے ۱۳ ثانیے مشرقی عرض بلد (گرینوچ) اور ۳۲ دقیقے ۵۰ ثانیے شمالی طول بلد پر واقع ہے - یہ شہر ایک خشک و بے گیاہ وادی کی شمالی طرف ایسی دو پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے جن کے درمیان ایک پہاڑی نالے کی گزرگاہ ہے - سطح سمندر سے اس کی بلندی چودہ سو نوّے میٹر ہے.

قدیم عرب جغرافیہ‌نویسوں کے ہاں بیرجند کا کوئی حوالہ موجود نہیں اور یاقوت (۱ : ۷۸۳) بظاہر پہلا شخص ہے جس نے اس کا ذکر کیا (نواح ۶۲۳ھ/ ۱۲۲۶ء) - وہ اسے کوہستان کے، جو اس وقت بڑے صوبۂ خراسان کا ایک حصّہ تھا، نہایت عمدہ شہروں میں سے ایک شہر قرار دیتا ہے - حمد اللہ المُستَوفی نے تقریباً ۷۴۰-۷۴۱ھ/ ۱۳۴۰ء میں لکھا ہے (نزھۃ، ص ۱۴۳) کہ بیرجند ایک صوبائی شہر تھا، جس کے نواح میں کثرت سے زعفران اور کچھ غلّے کی کاشت ہوتی تھی - آس پاس کے دیہاتوں میں انگور اور دوسرے میوے پیدا ہوتے تھے - قائن [رک باں] کے شہر کی طرح، جو نوّے کیلومیٹر شمال میں واقع ہے، بیرجند کچھ مدت تک حششین [باطنیوں] کے زیر اقتدار رہا - یہ مقام شاعر نزاری کا مولد تھا اور جیسا کہ اس نام سے پتا چلتا ہے وہ اسمٰعیلی تھا - وہ ۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء کے قریب فوت ہوا.

بیرجند ایک طویل مدت تک قائن کے سامنے ماند رہا، لیکن انیسویں صدی میں اس نے کوہستان کے صدر مقام کی حیثیت سے قائن کی جگہ لے لی - اور اب بیرجند اور قائن کے اضلاع (شہرستانہا) کا انتظامی مرکز ایک فرماندار یا حاکم کے ماتحت ہے - ۱۹۴۶ء میں یہاں کی آبادی تیئیس ہزار چار سو اٹھاسی تھی، لیکن اب اس سے کم ہے کیونکہ یہاں کے کچھ باشندے نقل مکان کر کے مشہد اور دوسرے مقامات میں جا بسے - شہر میں نلوں سے

آب رسانی کا بندوبست ہے ۔ پانی کچھ تو جنوب کے کوہ بگران سے آنے والی قنات [کاریزوں] سے اور کچھ خود شہر کے ایک گہرے کنویں سے حاصل کیا جاتا ہے ۔

قدیم زمانے کی طرح آس پاس کے علاقے میں کثرت سے زعفران اور ہر قسم کے گری‌دار میووں کی کاشت ہوتی ہے ۔ یہ ضلع مدت سے اپنے غالیچوں اور قالینوں کی عمدہ نوعیت کے لیے مشہور چلا آ رہا ہے ۔ یہ مصنوعات زیادہ‌تر موضع دَرَخْش میں بنتی ہیں، جو اسّی میٹر شمال مشرق میں واقع ہے ۔ اور اپنے برکوں (اونٹ کی اون سے بنے ہوے پارچوں) کے لیے بھی مشہور ہے ۔ مشہد اور زاھدان کے مابین شاہراہ پر واقع ہونے کے باعث بھی بیرجند کو کچھ خوش‌حالی میسر ہے ۔ یہ شہر سڑک کے ذریعے کرمان سے بھی ملا ہوا ہے ۔

مآخذ : مقالے میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ : (۱) Major E. Smith : *The Perso-Afghan Mission*، ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء، در *Eastern Persia, an Account of the Persian Boundary Commission* 1870, 71, 72، لندن ۱۸۷۶ء، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۷؛ (۲) E. Reclus : *Nouv. géogr. Univ.* (1894)، ۹ : ۲۲۷ تا ۲۲۹؛ (۳) Le Strange، ص ۳۶۲؛ (۴) P. M. Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia*، لندن ۱۹۰۲ء، ص ۳۹۹؛ (۵) رزم آرا اور نوتاش : فرهنگ جغرافیای ایران، ۹ : ۱۷ ۔

(L. Lockhart)

* **بَیْرَق** : رک به عَلَم ۔

* **بَیْرَق‌دار** : فارسی زبان کی ایک اصطلاح، جس کے معنی عَلَم‌بردار ہیں ۔ عثمانی دورِ سلطنت میں اس اصطلاح کا اطلاق جاگیردارانہ اور مستقل ہر دو فوجوں کے متعدّد عہدیداروں نیز البانیہ کے کچھ موروثی سرداروں پر ہوتا تھا ۔ جاگیرداری فوج میں ہر صوبے کے آلای بیگی Alay-beyi کے ماتحت ایک بیرق‌دار ہوتا تھا اور مستقل فوج میں سوار فوج کے ہر بولوک کے اور ینی چری فوج کے ہر "اورته" [دستۂ فوج] کے افسروں میں سے ایک اس کا علمبردار ہوتا تھا عام طور پر بیرق‌دار کہتے تھے، یا پھر "علم‌بردار" بھی کہہ دیتے تھے (کیونکہ عربی زبان کا علم ترکی زبان کے بیرق بمعنی "جھنڈا" کا مرادف ہے) ۔ سلطان کا اپنا علمبردار، ملازمینِ محل میں سے کوئی اعلٰی عہدیدار یا آغایانِ رکاب میں سے ہوتا تھا، لیکن عام طور پر اسے بیرق‌دار نہیں بلکہ میرِ عَلَم (امیر العَلم) کہتے تھے ۔ علٰی ھٰذا القیاس بہت سی سابقہ مسلم ترکی حکومتوں میں حکمران اسی طرح سے اپنے ذاتی علم کی دیکھ بھال کسی اعلٰی عہدیدار کے سپرد کر دیتے تھے ۔ یہ عہدیدار یا تو "بیرق‌دار" کے نام سے معروف ہوتا تھا یا کسی دوسرے ہم‌معنی لقب، مثلاً "سنجاق دار" سے ملقّب ہوتا تھا ۔

مآخذ : (۱) آآ ۔ ت، مادّۂ بیرق (کوپرولو)؛ (۲) Gibb اور Bowen : *Islamic Society and The West*، جلد ۱، حصّۂ اول، بمدد اشاریہ ۔

(H. Bowen)

بَیْرَق‌دار مصطفٰی پاشا : رک بہ مصطفٰی پاشا بیرق‌دار ۔

بیرم خان، (محمد) : خان خاناں (امیر الامراء)، جسے اکبر بادشاہ [رک باں] اپنی نابالغی کے زمانے میں محبت اور عزّت کی بنا پر عام طور سے خان بابا یا "بابا ام" (باہام) کہا کرتا تھا ۔ وہ بہارلو قوم کا ترکمان تھا، جو قرا قویونلو کی ایک شاخ تھی، جس نے ملک شاہ سلجوقی [رک باں] کی وفات کے بعد دیار بکر میں نمایاں کارنامے انجام دیے ۔ بیرم خان کے آبا و اجداد میں سے ایک شخص علی شکور بیگ کے پاس، جس کے بیٹے ابو سعید مرزا

کی ملازمت میں اور ۸۳۷ھ / ۱۴۳۳ - ۱۴۳۴ء میں اوزون حسن کے ہاتھوں میرزا ابو سعید کی ہزیمت کے بعد اس کے بیٹے محمود میرزا (بابر نامہ، مترجمۂ A. S. Beveridge، ۱ : ۴۹) کی ملازمت میں رہے؛ ہمذان، دینور اور کردستان میں ان کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں - جس خاندان سے بیرم خان کا تعلق تھا وہ ہمیشہ بادشاہوں اور شاہزادوں کی ملازمت میں رہا - اس کا دادا یار علی بیگ، جس نے بدخشان میں سکونت اختیار کر لی تھی، بابر کے ہاں ملازم تھا (بابر نامہ، مترجمۂ A. S. Beveridge، ۱ : ۹۱، ۱۸۹)- اس کا باپ سیف علی بیگ (تاریخ فرشتہ، مطبوعہ بمبئی، ص ۲۰۰) کے بیان کے مطابق غزنہ کا گورنر تھا اور بابر کی وفات کے بعد اس نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی.

بیرم خان بدخشان میں (بعض کے نزدیک غزنہ میں جو زیادہ اغلب ہے) پیدا ہوا - خورد سالی ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا - اس کے بعد وہ بلخ چلا گیا - یہیں اس نے تعلیم حاصل کی - اس کی زندگی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم نہایت صحیح اور مکمل ہوئی تھی - بیرم خان نہایت وسیع المطالعہ اور درباری آداب میں پوری طرح تربیت‌یافتہ تھا - وہ صرف سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت میں داخل ہوا، جسے بابر نے ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء میں بدخشان کی گورنری پر مامور کر دیا تھا - اتفاق سے اس وقت ہمایوں کابل میں تھا - بیرم خان ہمایوں کے ساتھ ہندوستان چلا آیا اور اس کے ساتھ چوسا (۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء) اور قنوج (۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء) کی تباہ‌کن لڑائیوں میں شریک ہوا، جن میں ہمایوں کی فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں - دشمن کے نہایت شدید تعاقب سے پریشان ہو کر اس نے سنبھل کے ایک زمیندار کے ہاں پناہ لی، جو ہمایوں کا تعلقہ‌دار تھا - شیر شاہ سوری کے آدمیوں نے اس کی پناہ‌گاہ کا پتا لگا لیا اور اپنے افغان سردار کو اطلاع کر دی - شیر شاہ نے اس سے کہلا بھیجا کہ یا تو وہ اس کی ملازمت اختیار کر لے ورنہ سنبھل سے چلا جائے - بیرم خان اس کی ملازمت اختیار کرنے پر راضی نہ ہوا اور گجرات کی طرف بھاگ گیا - اس کے ایک رفیق میر ابوالقاسم کی ہوشیاری سے، جو اس وقت گوالیار کا حاکم تھا، وہ گرفتاری اور ذلت سے محفوظ رہا، لیکن اس سودے میں ابوالقاسم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے - بیرم گجرات کے بادشاہ سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس نے اسے نہ صرف پناہ دی بلکہ اسے ملازم بھی رکھ لیا - لیکن بیرم نے یہاں محض وقت گزاری کی اور حج کو جانے کے لیے اسے سورت جانے کی اجازت مل گئی - اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے راجپوتانہ کا رخ کیا اور راجپوتانہ کے صحرا کو عبور کر کے وہ (۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں) جُون کے مقام پر، جو اب بربادی کی حالت میں ہے، اپنے آقا ہمایوں سے جا ملا - ہمایوں اس وقت اپنے کھوئے ہوے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جان توڑ کوششوں میں لگا ہوا تھا - جب ہمایوں ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں اپنے بھائی میرزا عسکری سے مدد حاصل کرنے کے لیے قندھار گیا تو بیرم اس کے ساتھ تھا اور اس نے تردی بیگ کا وہ وحشیانہ اور سفیہانہ سلوک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو اس نے اس بے تخت و تاج بادشاہ کے ساتھ اس وقت کیا تھا جب اس نے اپنی ملکہ حمیدہ بانو بیگم کی سواری کے لیے، جو شیرخوار اکبر کی ماں تھیں، اس نا مہربان شہر سے فرار ہونے کے لیے گھوڑا مانگا تھا.

ایران کے شاہ طہماسپ نے، جس کی مالی، مادی اور فوجی مدد ہمایوں نے اپنا کھویا ہوا تاج و تخت واپس لینے کے لیے طلب کی تھی، جب بیرم کے حسب

بیرم خان، (محمد)

سبب اور خاندانی روابط سے متأثر ہو کر اسے اپنی ملازمت کی پیش کش کی تو بیرم نے اسے قبول نہیں کیا اور یوں اپنے بد نصیب آقا کے ساتھ اپنی غیر متزلزل وفاداری کا ثبوت دیا ۔ ہندوستانی مہموں کے دوران میں بیرم خان نے شاہی افواج کے سالار اعظم کی حیثیت سے ہمایوں کے لیے بہت سی فتوحات حاصل کیں (۹۶۱ھ/۱۵۵۳ - ۱۵۵۴ء)، لیکن ان مسلسل فتوحات میں سب سے بڑی وہ فتح تھی جو (۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء) میں سرہند کے قریب ماچھی واڑے کے مقام پر سکندر شاہ سوری کو شکست فاش دے کر حاصل کی ۔ اس وقت کے مروجه دستور کے خلاف بیرم خان نے حکم دیا کہ شکست خورده افغانوں کے بیوی بچوں کو نہ تو کسی قسم کی ایذا پہنچائی جائے اور نہ انہیں غلام بنایا جائے، اس لیے کہ یہ دونوں باتیں اسلامی شعار کے خلاف تھیں ۔ اس فتح نے ہمایوں کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا اور اسے تخت و تاج کے واپس ملنے کا یقین ہو گیا ۔ اور یہ بات بہت بڑی حد تک بیرم خان کی وفا شعاری اور خلوص کا نتیجه تھا جسے بظاہر اس کی ان قابلِ ستایش خدمات کے صلے میں ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ - ۱۵۵۵ء میں شاہزادۂ اکبر کا، جو اس وقت صرف تیرہ سال کا تھا، اتالیق مقرر کر دیا گیا اور اسے سرکاری طور پر خان بابا کا خطاب مرحمت ہوا ۔ اس کے بعد بیرم خان شاہزادۂ اکبر کے ساتھ پنجاب چلا گیا، جسے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا ۔ جب ہمایوں کی ناگہانی موت (۱۵۵۶ء) کی اطلاع پنجاب پہنچی تو بیرم خان کلا نور (ضلع گورداسپور، بھارت) میں سکندر شاہ سوری کی ہزیمت خورده فوج کے بقیة السیف کے خلاف مہموں میں مصروف تھا ۔ اس نے پھر صورتِ حال کو سنبھالا اور بلا تاخیر اکبر کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا ۔ اس نے اینٹوں کا عارضی تخت بنا کر اس کی تاجپوشی کر دی ۔ یہ تخت اب بھی کلانور میں موجود ہے ۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد ہیمو نے، جو در اصل الور کے متصل واقع ریواڑی کا ایک بقّال تھا اور جو سوری کی فوجوں کا سپه سالار تھا، دہلی پر حمله کر دیا ۔ تردی بیگ، جو وہاں کا مغل گورنر تھا، بغیر کسی مزاحمت کے وہاں سے نکل بھاگا ۔ بیرم خان نے، جو اب پوری طرح صاحبِ اقتدار تھا، تردی بیگ کے قتل کا فرمان جاری کر دیا ۔ اس حکم کا مقصد بظاہر یه تھا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو، لیکن غالباً اس کی غرض یه تھی کہ جو توہین اس نے ہمایوں کی اس مصیبت کے وقت کی تھی جب وہ قندھار سے بھاگ رہا تھا اس کا انتقام لیا جائے ۔ فرشته اس قتل کو سیاسی بنا پر حق بجانب قرار دیتا ہے ۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں جب پانی پت کے میدان پر ہیمو کی فوجوں کی شاہی افواج کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی تو بیرم خان کو نمایاں فتح حاصل ہوئی ۔ اس نے بادشاہ کی خاموش رضامندی پا کر زخمی سپه‌سالار کو قتل کر دیا ۔ بیرم خان نے شکست‌خورده دشمن کے ساتھ جو سنگدلانه سلوک کیا اسے اعتراض کی نظر سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت ایسی تمام حکومتوں میں قتل ایک عام مروّجه دستور تھا، بالخصوص باغیوں، تاج و تخت کے حریفوں اور سلطنت کے دشمنوں کے معاملے میں؛ علاوہ بریں بیرم خان سے ایک ایسے نیچ ذات نو دولتیے کے لیے جس کے سر میں بادشاہ بننے کا سودا سمایا ہوا تھا اور جس نے خود بادشاہ کے مقابل کھڑے ہونے کی جسارت کی تھی کسی طرح کے رحم کی توقع بیکار ہے ۔ ہیمو کی شکست اور افغان فوجوں کے انتشار اور خاتمے کے بعد ہندوستان کا تاج پکے ہوے سیب کی طرح اکبر کی گود میں آ گرا ۔ بیرم خان اس وقت اقتدار و اختیار کے انتہائی عروج پر تھا اور

وہ کمسن اکبر کی طرف سے پوری سلطنت پر حکومت کر رہا تھا؛ لیکن اکبر کی طرف سے اپنے اتالیق کی جانب ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا، اس لیے کہ بیرم اکبر کی تفریحات میں مخلّ ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ شاہانہ انداز اختیار کرے۔ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء میں سلیمہ سلطان بیگم سے بیرم کی شادی ہو گئی، جو ہمایوں کی بہن گل رخ کی بیٹی اور اکبر کی پھوپھی‌زاد بہن تھی اور یوں وہ گویا شاہی خاندان کا ایک باقاعدہ فرد بن گیا، جس سے اس کی شخصی عظمت اور اقتدار میں اور بھی اضافہ ہوا۔ یہ شادی نہایت شان و شوکت سے جالندھر [رکّ بآں] میں اس وقت ہوئی جب بیرم خان مان کوٹ (اب رام کوٹ جو جمّوں میں واقع ہے) سے واپس آ رہا تھا۔ مان کوٹ وہی مقام ہے جہاں بیرم اسی سال کے شروع میں اکبر کے ساتھ مشترکہ قیادت میں طویل محاصرے کے بعد سکندر سوری کو شکست دے چکا تھا۔ سلیمہ کے ساتھ شادی سے پہلے، جو خالص سیاسی نوعیت کی شادی تھی، وہ ایک میواتی سردار جمال خان کی بیٹی سے بھی شادی کر چکا تھا، جس سے اس کے ہاں اس کی موت سے صرف چار سال قبل مرزا عبدالرحیم خان خانان [رکّ بآں] پیدا ہوا۔ میوات کا علاقہ، جو تردی بیگ کو تفویض تھا، بیرم خان پہلے ہی اپنے ایک معتمد خادم مُلّا پیر محمد شروانی کو عطا کر چکا تھا۔

اس دوران میں بیرم خان سے ایک سیاسی غلطی ہوئی اور وہ یہ کہ اس نے دہلی کے رہنے والے ایک شخص شیخ گدائی کمبوہ کو ۹۶۶ھ / ۱۵۵۸ - ۱۵۵۹ء میں صدرالصّدور مقرر کر دیا۔ یہ بات لوگوں کے لیے اور تورانی سرداروں کے لیے سخت ناراضی کا سبب بنی؛ اور البداؤنی (انگریزی ترجمہ، ۲ : ۲۲ تا ۲۴) نے اس واقعے کو محور بنا کر بیرم خان کے خلاف سخت طنز آمیز اور زہر آلود باتیں لکھی ہیں۔ علاوہ بریں بیرم خان کے بعض اور ایسے ناعاقبت اندیشانہ افعال تھے، مثلاً تردی بیگ کا قتل، بادشاہ کے جیب خرچ کے مقرر کرنے میں کوتاہی اور بے توجہی جس کی ضروریات عمر کے ساتھ تیزی سے بڑھ رہی تھیں، شاہی خاندان کے لوگوں کے لیے بہت معمولی وظیفے مقرر کرنا، اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز اندازہ اور احساس اور حد درجہ متکبّرانہ طرزِعمل، ان سب باتوں نے اس کی طرف سے اکبر کے خیالات اور رویّے میں تبدیلی پیدا کر دی اور وہ بیرم کی اتالیقی اور ولایت کی قید و بند سے آزاد ہونے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ اکبر کی انّا (ماہم انگہ) بھی، جو محلِ شاہی کے خدّام کے ایک چھوٹے سے مگر با اثر گروہ کی سرغنہ تھی، خفیہ طور پر بیرم کی تباہی کی کوشش میں مصروف تھی اور اکبر اور بیرم کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا کرنے کا بڑا سبب بنی۔ بیرم نے، یہ محسوس کر کے کہ حالات کا رخ اس کے خلاف ہے اس قصّے کو لڑائی کے زور سے ختم کرنا چاہا اور اپنے گھر والوں کو بٹھنڈے کے قلعے میں چھوڑ کر مکۂ معظمہ جانے کے بہانے جالندھر آ گیا۔ اس کی نیّت جالندھر پر قبضہ کرنے کی تھی۔ اس کی اور شاہی فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی اور شاہی فوجوں نے اسے شکست دی اور اس سے اس کے منصب کا نشان چھین لیا۔ اپنے منصب اور خان خانان کے خطاب سے محرومی کے بعد اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ بادشاہ سے معافی مانگ لے۔ اکبر نے اسے معاف کر دیا۔ بیرم کا منصب اور خطاب اب منعم خان کو عطا ہوا؛ لیکن انتقام کے پیاسے ایک افغان دشمن مبارک خان لوحانی نے، جس کا باپ ماچھی‌واڑے کی لڑائی (۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء) میں مارا گیا تھا، دھوکے سے اسے قتل کر دیا۔ بیرم ۱۴ جمادی الاولی ۹۶۸ھ /

۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء کو قتل ہوا ۔ اس وقت وہ پٹن (انہلواڑہ) کے مقام پر خیمہ‌زن تھا ۔ اس کا خیمہ لوٹ لیا گیا اور اس کے اہل و عیال، جس میں اس کا چار سالہ بچّہ مرزا عبدالرحیم خان بھی تھا، بالکل خالی ہاتھ احمد آباد پہنچے ۔ پٹن کے فوجی سالار موسٰی خان پولادی نے، جس نے بیرم خان کا استقبال بڑی شان کے ساتھ کیا تھا مرنے والے بہادر کی، جو کبھی بےحد دولتمند تھا، تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہیں کی ۔ چند غریب و خدا ترس لوگوں نے سابق خان خانان کی تجہیز و تکفین کر دی اور اس کی وصیّت کے مطابق اس کی لاش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳-۱۵۶۴ء میں دہلی سے، جہاں اسے عارضی طور پر سپردِ خاک کر دیا گیا تھا، مشہد منتقل کر دی گئی اور اب وہ امام موسٰی رضاؑ کے روضے کے متصل ایک اونچے گنبد کے مقبرے میں مدفون ہے ۔

بیرم خان ایک بلندپایہ عالم و فاضل، ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا شاعر، فنونِ لطیفہ کا قدرشناس اور آزاد خیال تھا ۔ وہ فی‌الحقیقت ایک بڑا آدمی تھا ۔ وہ عالموں، فاضلوں، حتّٰی کہ شاعروں، مصوّروں، مغنیوں، موسیقاروں اور اہلِ صنعت و حرفت کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا ۔ البداؤنی جیسے نکتہ‌چین نقاد نے بھی اس کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی جی کھول کر تعریف کی ہے ۔ اس کا دیوان ۱۹۱۰ء میں کلکتے سے طبع ہوا ۔

اکبر نے جو اپنے باپ کی طرح خود اپنے تاج و تخت کے لیے بھی بیرم خان کا مرہونِ منت تھا اپنی ناسپاسی کی تلافی اس طرح کی کہ اول تو بیرم خان کے یتیم بچے مرزا عبدالرحیم کی پرورش کی (جسے بعد میں خان خانان کا خطاب ملا اور جو تاریخ میں اپنے باپ سے زیادہ معروف و مشہور ہے) اور دوسرے بیرم کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم سے شادی کر لی . . .

مآخذ: شیخ فرید بھکّری: ذخیرة الخوانین (مخطوطۂ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، عدد ۱)؛ (۲) صمصام الدولہ شاہ نواز خان: مآثر الامراء (Bib. Ind.)، ۱: ۳۷۱ تا ۳۸۴ (یہ حالات بیشتر ذخیرة الخوانین پر مبنی ہیں)؛ (۳) عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی (Bib. Ind.)، بمدد اشاریہ؛ (۴) نور اللہ شُشتری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء، ۳۳۱ تا ۳۳۲ (اس نے بیرم خان کا سلسلۂ نسب قطعًا غلط دیا ہے)؛ (۵) محسن الدین الحسینی العاملی: أعیان الشّیعة، دمشق ۱۹۳۹ء، ۱۴ : ۲۳۲؛ (۶) عبدالحیّ: نُزہة الخواطر، حیدر آباد ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۴ء، ۴ : ۶۴ تا ۶۶؛ (۷) *Camb. Hist. of India*، ج ۴، بمدد اشاریہ؛ (۸) علی شیر قانع: مقالات الشُّعراء (طبع حسام الدین راشدی)، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۹۸ تا ۱۰۲، نیز بمدد اشاریہ؛ (۹) البداؤنی: منتخب التواریخ (ترجمہ Lowe)، ج ۲ بمدد اشاریہ و ج ۳ : ۲۶۵، نیز بمدد اشاریہ؛ (۱۰) محمد حسین آزاد: دربار اکبری (بزبان اردو)، لاہور ۱۸۹۸ء، بذیل مادّہ؛ (۱۱) V. A. Smith : *Akbar the Great Mogul*، آوکسفرڈ ۱۹۱۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ: گلشن ابراہیمی (تاریخ فرشتہ)، بمبئی ۱۸۳۱ء، ص ۲۵۰؛ (۱۳) ابوالفضل: آئین اکبری، ج ۱ (مترجمۂ Blochmann)، کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۳۱۵ تا ۳۱۷؛ (۱۴) تذکرة الواقعات (اردو ترجمۂ معین الحق)، کراچی ۱۹۵۶ء، بمدد اشاریہ، (عہد ہمایوں میں بیرم خان کی سرگرمیوں اور اس کی صحرانوردیوں پر بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ)؛ (۱۵) امین احمد رازی: ہفت اقلیم؛ (۱۶) قدرت اللہ گوپاموی: نتائج الافکار، بمبئی ۱۳۳۴ھ ش، ص ۱۰۲ تا ۱۰۳؛ (۱۷) آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ، کانپور ۱۹۰۰ء، ص ۴۵۸ تا ۴۵۹؛ (۱۸) علی کوثر چاند پوری: محمد بیرم خان ترکمان، آگرہ ۱۹۳۱ء؛ [(۱۹) علی قلی والہ: تذکرہ ریاض الشعراء، مخطوطۂ کتاب‌خانۂ دانش‌گاہ پنجاب].

(بزمی انصاری)

بیرم علی : ماورائے خزر ریلوے پر مرو سے تقریباً ۴۶ میٹر (۵۰ کیلومیٹر) مشرق میں ایک مقام، جہاں فارسی زبان بولنے والے آباد ہیں اور جو اب اشتراکی جمہوریۂ ترکمانستان کے ضلع مرو میں واقع ہے ۔ یہ قدیم مرو کے اس نخلستان کے بالکل قریب ہے جو دریائے مرغاب [رک باں] کے باعث وجود میں آیا تھا اور اٹھارھویں صدی عیسوی تک موجود رہا ۔ اس کے کھنڈر تقریباً پچاس مربع کیلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ انیسویں صدی میں یہ علاقہ شہنشاہ کی ذاتی املاک کا ایک حصّہ بن گیا تھا اور ۱۹۱۷ء تک اسی حیثیت میں رہا ۔ ان دنوں بیرم علی میں ایک زرعی تحقیقاتی مرکز اور ایک زرعی فنّی سکول قائم ہے ۔ یہاں انگور کے اور دوسرے میوہ دار درختوں کے باغ ہیں، نیز ریشم کے کیڑے اور قراقلی بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔

مآخذ : (۱) *Enciklopedi-* : Brockhous-Yefron *češkiy Slovar'*، ۱۸۹۱ء، ۳ (دوم الف) : ۷۲۲؛ (۲) *Bolshaya Sovetskaya Enciklopediya*، بار دوم، ۴ (۱۹۵۰ء) : ۵۴ .

(B. Spuler)

بیرم علی خان : شاہزادۂ مرو، ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء تا ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء، خاندان قاچار کی فرمانروا شاخ کا ایک رکن، جس نے عباس اوّل [رک باں] کے زمانے سے وہاں حکومت کی ۔ اپنے زمانے میں وہ ایک بہادر جنگجو سپاہی کی حیثیت سے مشہور تھا ۔ مراد بی (شاہ معصوم) بخاری کے خلاف لڑائی کے دوران میں دشمنوں نے گھات لگا کر اسے قتل کر دیا ۔ مرو میں اس کا منجھلا لڑکا محمد کریم اس کا جانشین ہوا ۔ اس کے بڑے لڑکے محمد حسین نے اپنی زندگی مشہد میں علوم و معارف کے لیے وقف کر دی اور اسے اپنے زمانے کا افلاطون سمجھا جاتا تھا ۔

مآخذ : (۱) میر (سید) عبدالکریم بخاری : *Histoire de l'Asie Centrale*، طبع Schefer، ج ۱ (متن، پیرس ۱۸۷۶ء) : ص ۷۰ و ۲ (ترجمہ) : ۱۵۷ ببعد؛ (۲) V. Žukovskiy : *Razvalini Starago Merva* (The Ruins of Old Marw)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۴ء، ص ۸۳ ببعد .

(B. Spuler و W. Barthold)

بَیْرُوْت : (جیسے آج کل Beirut یا Beyrouth لکھا جاتا ہے) جمہوریۂ لبنان کا صدر مقام ہے ۔ اس کا عرض بلد ۳۳ درجے ۵۴ دقیقے شمالی اور طول بلد ۳۵ درجے، ۲۸ دقیقے شرقی ہے ۔ شروع شروع میں یہ ایک راس کے شمالی رخ پر آباد ہوا، مگر اب یہ اس کی پوری سطح پر پھیل چکا ہے ۔ لفظ بیروت کے اشتقاق کے متعلق عرصے سے اختلاف چلا آتا ہے ۔ بہر حال اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا مأخذ عبرانی لفظ بئیروت (be'erot) ہے، جو [عربی لفظ] "بئر" (= کنواں) کی جمع ہے ۔ رومیوں کے عہد تک کنویں مقامی طور پر پانی کی بہم رسانی کا واحد ذریعہ تھے ۔ انسانی مسکن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس قطعۂ زمین پر زمانۂ قبل از تاریخ میں بھی لوگ آباد تھے، کیونکہ یہاں سے اشولین (Acheulian) اور لیوالوزین (Levalloisian) دور کے آثار بھی ملے ہیں ۔ تلّ العمارنہ میں چودھویں صدی قبل مسیح کی جو تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں اس کا نام "بروتہ" کی صورت میں ساحل فینیقیہ کی ایک بندرگاہ کے طور پر آتا ہے ۔ اس زمانے میں یہاں ایک معمولی سی آبادی تھی، جس کی رونق ایک عرصے سے جُبَیل (Byblos) کے مقابلے میں ماند پڑ چکی تھی ۔ بارہ صدیوں کے دوران میں، جس کی تاریخ مبہم ہے، بروتہ مصر یا عراق سے آنے والی فوجوں کی گزرگاہ بنا رہا ۔ تیرھویں صدی قبل مسیح میں رامیس Ramses دوم اس راستے سے آیا اور ساتویں صدی قبل مسیح میں اسور کے بادشاہ اسارھدون

Asarhad don کا بھی یہیں سے گزر ہوا تھا۔
۲۰۰ ق م کے قریب انطیوخوس Antiochus سوم الاعظم نے بطلمیوس (Ptolemy) پنجم پر فتح پائی اور بیروت کو سلوقی (Seleucid) سلطنت اور شام کی ولایت میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۴۰ ق م کے قریب یہ شہر، جو کچھ عرصے لاذقیۂ کنعان (Laodicea of Canaan) کے نام سے بھی موسوم ہوا، سوریہ کے غاصب تریفون Tryphon کے ہاتھوں تباہ ہو گیا؛ مگر اس تباہی کے باوجود دیلوس Delos رومیوں اور اطالویوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے اس بندرگاہ کو خاصی ترقی ہوئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت سے بیروت کی اہمیت اجاگر ہو گئی۔

رومی شہنشاہ آگسٹس Augustus کے نام پر جب مارکس اگرپا Marcus Agrippa شہر بیروت پر قابض ہوا تو یہ شہر دوبارہ تعمیر ہوا۔ بڑی عمارتوں سے اس نے زینت پائی اور آزمودہ‌کار رومی سپاہی یہاں آباد کیے گئے۔ ۱۴ قبل مسیح میں اسے بیریتوس کے نام سے ایک رومی نوآبادی (Colonia Julia Augusta Felix Berytus) کا درجہ دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بیریتوس Berytus رومی حکومت کا ایک بڑا انتظامی مرکز بن گیا (چنانچہ ہیروڈ اعظم اور اس کے جانشین یہیں رہتے تھے)۔ اس کے علاوہ اسے تجارت اور مبادلے کے اعتبار سے ایک اہم منڈی اور علم کے لحاظ سے ایک بارونق علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ تیسری صدی عیسوی میں خاص طور سے یہاں کی جامعۂ قانون کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور علم و دانش کے اعتبار سے یہ شہر ایتھنز، اسکندریہ اور قیساریہ Caesarea کا ہم پایہ سمجھا جانے لگا۔ یہاں کی آبادی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور بالآخر پانی کی بہم رسانی کے لیے ماگوراس Magoras کی وادی (نہر بیروت) میں ایک نہر (قناطر زبیدہ) کی تعمیر ضروری سمجھی گئی۔

چوتھی صدی کے آخر میں بیروت (= بیریتوس) کا شمار فینیقیہ کے اہم‌ترین شہروں میں ہوتا تھا اور یہ اسقف کا صدر مقام بھی بن گیا۔ جولائی ۵۵۱ء میں ایک شدید زلزلے کے ساتھ ایک سیلاب بھی آیا، جس نے بیروت کو تباہ کر دیا۔ جسٹینین Justinian نے اس کے کھنڈروں پر نئے سرے سے عمارتیں بنوائیں، لیکن اسے پہلی سی شان و شوکت حاصل نہ ہو سکی، چنانچہ جب ۱۴ھ/ ۶۳۵ء میں حضرت ابوعُبیدہؓ [ابن الجراح] کی فوجیں اس شہر میں، جو بلادِ مشرق میں رومی تہذیب و تمدن کا بہترین نمونہ تھا، داخل ہوئیں تو اس کے اردگرد کوئی فصیل نہ تھی۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بیروت کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اموی خلیفہ امیر معاویہؓ نے ایران سے آبادکاروں کو بلایا اور انھیں بیروت اور اس کے گرد و نواح میں بسا کر اس علاقے کو دوبارہ آباد کیا۔ ریشم‌سازی کی صنعت پھر سے ترقی کرنے لگی اور تجارتی روابط ایک بار پھر پہلے اندرونِ ملک (دمشق) اور بعد ازاں مصر سے قائم ہوئے۔ اسلامی عہد کی پہلی چند صدیوں میں بیروت کو ایک رباط سمجھا جاتا تھا، چنانچہ شام کے امام الاَوزاعی نے یہاں ۱۵۷ھ/ ۷۷۳-۷۷۴ء میں سکونت اختیار کی۔ ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں جان زمسکز John Tzimisces نے بیروت کو فتح کر لیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسے فاطمیوں نے بوزنطیوں سے واپس لے لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری / دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے تمام عرب جغرافیہ‌دان لکھتے ہیں کہ شہر بیروت کے اردگرد فصیل تھی اور یہ دمشق کے صوبے (جُند) کا ایک حصّہ تھا۔

صلیبی جنگوں نے بیروت کے لیے تازہ پریشانیاں

پیدا کر دیں - ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں شمالی سمت سے ساحل کے راستے آنے والے صلیبی محاربین نے محض اتنا کیا کہ بیروت میں ٹھیر کر رسد فراہم کی اور بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ یہاں واپس چلے آئے - ۵۰۳ھ / ۱۱۰۹ - ۱۱۱۰ء میں بالڈون اول اور برٹرینڈ آو سینٹ گیلز Bertrand of St. Gilles نے خشکی اور سمندر دونوں جانب سے بیروت کی ناکہ بندی کی - ایک مصری بیڑے نے محصورین کو رسد مہیا کرنے کا اہتمام کیا، لیکن پیزا Pisa اور جنوآ Genoa کے جہازوں کی کمک پہنچنے کی وجہ سے وہ شہر پر حملہ کرنے کے قابل ہو گئے، چنانچہ انھوں نے ۲۱ شوال ۵۰۳ھ / ۱۳ مئی ۱۱۱۰ء کو اسے فتح کر لیا - ۱۱۱۲ء میں یہاں پہلے لاطینی اسقف بالڈون، باشندۂ بولون Boulogne، کی نامزدگی عمل میں آئی اور اس نے بیت المقدس کے بطریق کو سبکدوش کر دیا، کیونکہ بیروت گیارھویں صدی کی یونانی کلیسائی تنظیم کے دوران میں انطاکیہ کے ماتحت تھا - یہاں اسپتاریہ (Hospitallers) نام راہبوں کی مجلس نے سینٹ یوحنّا اصطباغی (St. John the Baptist) کا گرجا تعمیر کرایا جو بالآخر مسجد العُمَری کی صورت میں تبدیل ہوا - ربیع الآخر ۵۷۸ھ / اگست ۱۱۸۲ء میں صلاح الدین ایوّبی نے منصوبہ بنایا کہ بیروت کو دوبارہ فتح کر کے طرابلس کے علاقے کو بیت‌المقدس کی سلطنت سے جدا کر دیا جائے - پہلی مرتبہ تو اسے کامیابی نہ ہوئی، لیکن دوسری مرتبہ جمادی الآخرہ ۵۸۳ھ / اگست ۱۱۸۷ء میں اس نے بیروت فتح کر لیا - ذوالقعدہ ۵۹۳ھ / ستمبر ۱۱۹۷ء میں لوسی‌گان کے اما‌لرک Amalric of Lusigan نے اسے فتح کیا اور سلطان صلاح الدین کی فوجیں وہاں سے پسپا ہو گئیں - آئبیلنز Ibelins نے بیروت کو مستحکم کیا اور مشرق کے تمام لاطینی ممالک میں اس کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کیا - ۱۲۳۱ء میں شہنشاہ فریڈرک دوم کی طرف سے رکاردو فلنگاری Ricardo Filanghiari شہر بیروت پر قابض ہو گیا، لیکن بیروت کے قلعے تک اس کی رسائی نہ ہو سکی.

قاہرہ میں مملوک حکمران تخت‌نشین ہوے تو تھوڑے ہی عرصے میں بیروت کے امرا اس بات پر مجبور ہو گئے کہ دوسرے فرنگی (Franks) حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر ان سے عہد و پیمان کریں - ۶۶۷ھ / ۱۲۶۸ - ۱۲۶۹ء میں بیبرس نے امن کی ضمانت دی - ۶۸۳ھ / ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاؤن نے ان سے معاہدۂ صلح کیا، جس سے انھیں تجارتی سرگرمیاں دوبارہ جاری کرنے کی اجازت مل گئی - بالآخر ۲۳ رجب ۶۹۰ھ / جولائی ۱۲۹۱ء کو امیر سنجر [= سنقر] ابو شُجاعی دمشق سے آیا اور الملک الاشرف خلیل کی طرف سے بیروت پر قابض ہو گیا.

مملوک حکمرانوں کے عہد میں بیروت صوبۂ (جُند) دمشق کی ایک اہم ولایت تھی، اور ایک امیرِ طبل‌خانہ یہاں کا حاکم ہوتا تھا - قرونِ وسطٰی میں بیروت پر قبضہ کرنا بڑی اہم بات سمجھی جاتی تھی کیونکہ یہاں جنگی اہمیت کی دو کمیاب چیزیں لکڑی اور لوہا پایا جاتا تھا - لکڑی شہر کے جنوب میں صنوبر کے جنگلات سے حاصل ہوتی تھی اور لوہا قریبی کانوں سے نکلتا تھا.

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں بیروت کی بندرگاہ باشندگانِ جنوآ (Genoese) اور کتلانیوں (Catalans) کی باھمی رقابت کا نشانہ بنی - اس سے تجارت کو ضعف پہنچا - مملوک شہزادوں نے بیروت کا دفاع مضبوط کیا، چنانچہ امیر تنکز (۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء) اور [سلطان] برقوق (۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء تا ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء) دونوں نے

یہاں ایک ایک برج تعمیر کرایا ۔ نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی میں بیروت پہلے کی طرح مغربی تاجروں کی منڈی بن گیا ۔ یہ تاجر ریشم کی تلاش میں آیا کرتے تھے ۔ یہاں سے پھل اور برف قاہرہ کے دربار میں بھیجی جاتی تھی۔

فخرالدین (۱۵۹۰ تا ۱۶۳۴ء) کا عہدِ حکومت بیروت کے لیے درخشاں ثابت ہوا اور اس کے وینس Venice کے ساتھ دوبارہ روابط قائم ہو گئے ۔ یہاں سے سنگتروں کی بہ نسبت ریشم زیادہ مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا ۔ چاول اور سوتی کپڑا یہاں مصر سے آتا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں طرابلس کے بعد سب سے زیادہ آباد بندرگاہ بیروت تھی ۔ آبادی کے لحاظ سے مرکزی حیثیت مارونیوں (Maronites) کی تھی، جنھیں دروزی امرا کی حمایت حاصل تھی ۔ روسیوں اور ترکوں کی جنگ میں بیروت کو جوابی حملوں کا نشانہ بننا پڑا ۔ اس پر کئی بار بمباری ہوئی اور آخر کار اکتوبر ۱۷۷۳ء میں اسے روسیوں نے فتح کر لیا اور فروری ۱۷۷۴ء تک انھیں کے قبضے میں رہا ۔ ۱۸۲۱ء کے بعد [امیر] بشیر دوم (اعظم) نے (۱۷۸۸ تا ۱۸۵۰ء) نہایت عمدگی سے نظم و نسق قائم کیا تھا، لیکن ابراہیم پاشا کی مہموں میں اہلِ آسٹریا، انگریزوں اور ترکوں کے بحری بیڑوں نے متحدہ طور پر بیروت پر بمباری کی، جس سے یہاں کی تجارت تباہ ہو گئی ۔ ۱۸۶۰ء میں یہاں ایک نیا دور شروع ہوا ۔ شام [کے سیاسی حالات سے تنگ آ کر] عیسائی بہت بڑی تعداد میں ہجرت کر کے بیروت آ گئے اور بیس ہزار کی آبادی کے اس مختصر سے شہر پر مسیحیت کے نہایت گہرے نقوش ثبت ہو گئے ۔ بیروت کی ترقی کا دور، جو ایک صدی قبل شروع ہوا تھا، اب تک جاری ہے ۔ اس شہر میں پچھلے کئی سال سے اس تیزی سے ترقی ہوئی کہ رومی عہد کی شان و شوکت پر بھی سبقت لے گئی ۔ فرانسیسی انتداب (۱۹۲۰ - ۱۹۴۳ء) کے دوران میں جب بیروت فرانس کے ہائی کمشنر برائے ریاست‌ہائے لیوانت Levant کی قیام‌گاہ بنا تو اسے ایک خود مختار ریاست کے دارالحکومت، پارلیمان کے مقامِ اجلاس اور ملک کے اداری صدر مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی ۔ یہاں کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہے ۔ ان میں عربوں کی اکثریت ہے ۔ یہاں کی کل آبادی دو لاکھ (۱۹۵۸ء) ہے اور اتنی ہی تعداد آس پاس کے علاقوں سے روزانہ آنے والے دیہاتیوں، مزدوروں اور تاجروں کی ہے۔

بیروت میں تین یونیورسٹیاں قائم ہیں : امریکی، فرانسیسی اور لبنانی ۔ ہر قوم کے اپنے متعدد علمی ادارے ہیں ۔ یہاں ایک ملّی کتاب خانہ بھی ہے ۔ یہ شہر اب مشرقِ وسطٰی کے عرب ممالک میں ایک بڑا علمی اور فکری مرکز سمجھا جاتا ہے ۔ تجارت اور مبادلے کے لحاظ سے بھی اسے مرکزیت حاصل ہے ۔ چونکہ یہاں کی بندرگاہ میں لگا تار توسیع ہو رہی ہے اور ریلوے کے ذریعے یہ بندرگاہ شام اور اردن سے ملی ہوئی ہے، لہٰذا تجارتی میدان میں حیفا اور حال ہی میں شام کی بندرگاہ لاذقیہ (Lattakia) کے مقابلے کے باوجود ۱۹۵۰ء میں پچیس لاکھ ٹن مال و اسباب کی تجارت ہوئی ۔ اس بھاری تجارت کی بدولت صرّافہ وجود میں آیا اور بڑے بڑے بین الاقوامی بنکوں کی شاخیں کھلیں ۔ ایک بین‌الاقوامی درجے کا ہوائی مستقر ہونے کی وجہ سے اس کا تعلّق ساری دنیا سے قائم ہے ۔ اب یہ تجارتی منڈی بن گیا ہے ۔ بیروت اپنے قدرتی محلِّ وقوع کی بدولت مشرق اور مغرب کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتا ہے۔

مآخذ : (۱) الادریسی، طبع Jaubert، ۱ : ۳۵۵؛

(۲) یاقوت، ۱ : ۵۲۵؛ (۳) صالح بن یحیی: تاریخ بیروت، ۱۹۲۷ء؛ (۴) لوئیس شیخو: بیروت، تاریخہا و آثارہا، ۱۹۲۵ء؛ (۵) ابن القلانسی (طبع Le Tourneau)، ص ۹۳ تا ۹۵؛ (۶) C. Enlart: *Les monuments des Croisés*، ۳: ۶۸ تا ۸۲؛ (۷) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، ۱۸۹۰ء، ص ۴۰۸ تا ۴۱۰؛ (۸) Du Mesnil du Buisson: *Les Anciennes défenses de Beyrouth*، *Syria*، ۲ (۱۹۲۱ء): ۲۳۸ تا ۲۵۷، ۳۱۷ تا ۳۲۷؛ (۹) P. Collinet: *Hist. de l'École de Droit de Beyrouth*، ۱۹۲۵ء، باب ۱؛ (۱۰) R. Dussaud: *Topographie Historique de la Syrie*، ۱۹۲۷ء، ص ۵۸ تا ۶۰؛ (۱۱) R. Grousset: *Histoire des Croisades*، ۱۹۳۴ - ۱۹۳۶ء، ۱: ۲۵۳ تا ۲۵۶ و ۲: ۱۰۷ تا ۱۳۷ و ۳: ۱۵۵ تا ۱۶۰؛ (۱۲) J. Lauffray و R. Mouterde: *Beyrouth Ville romaine*، ۱۹۵۲ء؛ (۱۳) Dresch و Birot: *La Méditerranée et le Moyen Orient*، ۲ (۱۹۵۵ء): ۳۱۵ .

(N. Elisséeff)

• **بیرُون**: (فارسی، بمعنی باہر) عثمانی شاہی محل کے بیرونی محکموں اور شعبوں کا نام؛ اس کے مقابلے میں داخلی محکموں کا نام 'اندرون' [رک بآں] تھا ۔ اس طرح بیرون دربارِ شاہی اور حکومت کے عمّال کا مقام اتّصال تھا اور اس میں محل کے عہدیداروں کے علاوہ اعلٰی حکّام و عمائد بھی شامل ہوتے تھے، جو سلطنت کے انتظامی، عسکری اور مذہبی امور سے تعلق رکھتے تھے۔

مآخذ: (۱) D'Ohsson: *Tableau général de l'Empire Othoman*، پیرس ۱۸۲۴ء، ۷: ۱ تا ۳۳؛ (۲) اسماعیل حقّی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتنن سرای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء، ص ۳۰۸ ببعد؛ (۳) گب و بوون، ۱/۱: ۷۲، ۸۲ ببعد، ۳۴۶ ببعد؛ نیز رک بہ سرای.

(B. Lewis)

⊙ **البیرونی**: البیرونی کے حالاتِ زندگی کے مآخذ بہت محدود ہیں ۔ اس ضمن میں اس کی اپنی تحریریں مسامیر خوارزم [جس کا نام یاقوت نے معجم الادباء میں کتاب المسامرہ فی اخبار خوارزم لکھا ہے] اور تاریخ سلطان محمود و ابیہ اب ناپید ہیں ۔ اول الذکر کا کچھ حصّہ ابوالفضل بیہقی کے قلم سے ہم تک پہنچ سکا ہے ۔ [البیرونی کے ایک مکتوب سے بھی، جو اس نے ۴۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کو اپنی اور ابوبکر الرازی کی تصانیف کے بارے میں لکھا تھا، اس کے سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکتوب مع اس کی شرح کے، جو ابراہیم التبریزی (م ۶۹۲ھ / ۱۲۹۳ء) نے قلم بند کی تھی، لائڈن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ اصل رسالہ M. Krause کے زیر اہتمام ۱۹۳۶ء پیرس میں چھپ بھی چکا ہے ۔ اسی طرح ایک قصیدے میں، جو اس نے ابوالفتح البستی کی تعریف میں لکھا ہے، اس کے حالات کے متعلق بعض لطیف اشارے ملتے ہیں] ۔ البیرونی کا اپنا طرزِ بیان اتنا ادق، مختصر، پر مغز اور مسئلۂ درپیش پر حاوی ہے کہ اس کا سمجھنا ایک مبتدی کے بس کی بات نہیں؛ اس لیے ہر کس و ناکس کی دسترس اس تک نہیں ہو سکتی ۔ ابن خلّکان نے البیرونی کا تذکرہ تک نہیں کیا ۔ البیرونی کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد کی تحریریں غلو سے لبریز ہیں ۔

زمانۂ حال میں جس مغربی مصنّف نے اس کے حالات زندگی پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ہے وہ المانوی فاضل ایڈورڈ زخاؤ E. C. Sachau ہے، جس نے البیرونی کی دو کتابوں: تحقیق ما للہند [= *Alberuni's India*، لنڈن ۱۹۱۰ء] اور "الآثار الباقیة [= *The Chronology of Ancient people (Vestiges of the Past)*]" کی تدوین اور انگریزی میں ان کے تراجم کی اشاعت کی ہے [لیکن جب تحقیق ما للہند کا زخاؤ نے ترجمہ کیا تو البیرونی کی اس کتاب کا پورا مخطوطہ اس کے پیش نظر

نہ تھا، اس لیے یہ در اصل اس کے محض ایک حصّے کا ترجمہ ہے ۔ اس کے نزدیک البیرونی فکری اعتبار سے دنیا کا بلند ترین انسان تھا] ۔ البیرونی کے حالاتِ زندگی جو کچھ بھی ہمیں اب تک معلوم ہوے ہیں وہ اس کی اپنی تصانیف میں یا تو ضمناً اس نے خود بیان کیے ہیں یا اس کی تحریرات و مشاہداتِ فلکی کے سنین پر مبنی ہیں ۔ جیسے جیسے اس کی کتابیں معرضِ ظہور میں آ رہی ہیں اس جلیل القدر مصنف کے تبحر، جدّتِ طبع، حق‌جوئی اور حق گوئی کا پتا دیتی ہیں ۔

اس کا پورا نام برہان الحق ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی ہے ۔ السمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں اس کے نام البیرونی کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس کی سکونت شہر کے بیرونی حصے میں تھی، اس لیے عام طور پر البیرونی مشہور ہو گیا [نیز دیکھیے یاقوت، جو یہی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے؛ لیکن صاحبِ عیون الانباء نے لکھا ہے کہ یہ نسبت سندھ کے ایک قصبے بیرون کی طرف ہے] ۔ یہ خوارزم کے پاے تخت کاث میں ۳ ذوالحجہ ۳۶۲ھ/۴ ستمبر ۹۷۳ء کو ایک گم نام گھرانے میں پیدا ہوا (کاث اب دریا برد ہو چکا ہے اور اس کی جاے وقوع روسی (سوویٹ) ترکستان کے شہر خیوا پر تھی اور اب یہ البیرونی کا شہر کہلاتا ہے) ۔ [منجم ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد التبریزی الغضنفر (المولود ۶۳۰ھ/ ۱۲۳۱ء) نے البیرونی کے حالاتِ زندگی سے اس کی پیدائش کے گھنٹے اور منٹ متعین کیے ہیں ۔] البیرونی نے اپنے اساتذہ میں سے صرف ابو نصر منصور ابن علی بن عراق کا ذکر کیا ہے، جو پرانے خوارزم شاہی خاندان کا ایک فرد تھا ۔

البیرونی نے اپنی زندگی کے پہلے پچیس سال خوارزم شاہی خاندان کی خدمت میں گزارے ۔ جب ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں وہ تیئیس برس کا تھا تو ابو عبداللہ محمد خوارزم شاہ اور محمد بن مامون کے مابین، جس کا پاے تخت گرگنج [یا کہنہ اُرگنج (جرجانیہ)] دریاے جیحون کے اس پار تھا، لڑائی چھڑ گئی ۔ اس میں محمد بن مامون کامیاب ہوا اور البیرونی کو نقل‌مکانی کر کے جرجانیہ آنا پڑا؛ لیکن اسے وہاں بھی ٹھیرنا نصیب نہ ہوا اور وہ کچھ عرصہ قید و بند کی سختیاں جھیلتا اور حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے کھاتا ہوا آبائی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا ۔ ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں اس نے ماژندران یا طبرستان کے اسپہبذ مرزبان بن رستم بن شروین کے دربار میں رسائی حاصل کر لی ۔ اسی اسپہبذ کے نام پر اس نے اپنی سب سے پہلی تصنیف مقالید علم الهیئة مایحدث فی بسیط الکرة معنون کی ہے ۔ لیکن اسی سال اسپہبذ مذکور اور فخرالدولہ بویہی کے انتقال پر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوے کہ البیرونی اپنے نئے وطن کو بھی خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا اور نہایت خستہ حالت میں شہر رَی میں رہنے لگا۔ ۳۸۸ھ میں جب زیّاری سلطان قابوس بن وشمگیر سترہ سالہ جلاوطنی کے بعد طبرستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر قابض ہوا تو البیرونی کو پھر اپنے نئے وطن میں لوٹ کر آنے کا موقع مل گیا، جہاں اس نے اپنی دوسری تصنیف الآثار الباقیة عن القرون الخالیة، اس علم پرور اور عالم فرمانروا کے لیے (۳۹۰-۳۹۱ھ/ ۱۰۰۰ - ۱۰۰۱ء میں) لکھی ۔ وشمگیر کی خواہش اور اصرار کے باوجود البیرونی کا قیام جرجان میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اور ۳۹۳ھ/ ۱۰۰۳-۱۰۰۴ء میں سات سال کی جلاوطنی کے بعد اپنے آبائی وطن میں علی بن مامون کے دربار میں پہنچا اور ۳۹۷ھ/۱۰۰۶-۱۰۰۷ء میں اس شاہزادے کے انتقال کے بعد اس کے بھائی مامون بن مامون کے سایۂ عاطفت میں رہنے لگا؛ لیکن ۴۰۷ھ/ ۱۰۱۷ - ۱۰۱۸ء میں

جب یہ شاهزاده اپنی هی فوج کے سپاهیوں کے هاتھوں مارا گیا تو یہ ملک سلطان محمود غزنوی [م ۴۲۱ھ/۱۰۳۱ء]، کے قبضے میں آ گیا، جس کی بہن مقتول شاهزادے کے عقد میں تھی۔ محمود نے مامون کے لشکر کو شکست دے کر اپنے سردار التونتاش کو وهاں کا گورنر بنا دیا اور خود غزنه واپس چلا گیا۔ البیرونی بھی دوسرے ارکانِ شاهی کے ساتھ اپنے تین همراهیوں، یعنی ابو نصر منصور بن علی ابن عراق، ابوالخیر خمّار اور عبدالصمد اول سمیت غزنه پہنچ گیا [اس وقت اس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس سے پہلے بھی البیرونی غزنه دیکھ چکا تھا، جب اسے سلطان خوارزم کی طرف سے بطورِ سفیر یہاں بھیجا گیا تھا]۔

غزنه پہنچنے کے بعد البیرونی کی علمی زندگی کا زرّیں دور شروع هوتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی کتاب تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن مرتب کی۔ اس کتاب کا واحد نسخہ غالبًا اس کے اپنے قلم کا ۴۱٦ھ/ ۱۰۲۵ء کا لکھا هوا دستیاب هو چکا ہے۔ البیرونی نے اپنی زندگی کے غالبًا بارہ تیرہ سال شاهی نگرانی میں هندوستان میں گزارے، اس اثنا میں اس نے یہاں سنسکرت بھی سیکھی اور هندو مذهب، تہذیب و تمدّن، رسم و رواج، عادات و توهّمات کا مطالعه کیا۔ یہ معلومات اس نے ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں اپنی شہرهٔ آفاق کتاب تحقیق ما للہند من مقولة مقبولة فی العقل او مرذولة میں درج کی هیں۔

اس نے ایک سال قبل، یعنی ۴۲۰ھ/ ۱۰۲۹ء میں، اپنی تصنیف کتاب التفہیم لاوائل صناعة التنجیم ریحانه بنت حسن خوارزمی کے لیے لکھی۔ اس کی کتاب ما للہند اس وقت پایهٔ تکمیل کو پہنچی جب سلطان محمود کا ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں انتقال هو چکا تھا، لیکن جب اس کا بیٹا مسعود اپنے بھائی محمد سے کچھ عرصه نبرد آزما رہ کر تخت سلطنت کا وارث هوا تو البیرونی اپنی شاهکار تصنیف القانون المسعودی فی الهیئة والنجوم، جو ریاضی و هیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیے پر ہے، مرتب کر چکا تھا؛ چنانچه اس نے اپنی یہ تصنیف سلطان مسعود کے نام پر معنون کی۔

البیرونی هندوؤں کے علوم کا اس قدر دلداده اور شوقین تھا کہ وہ اپنی بیشتر تصانیف میں نه صرف ان علوم کا بالتفصیل ذکر کرتا ہے بلکه اس نے وراها سہیرا Veraha Mahira کی دو تصانیف برهت سمہتا اور لاگھو جاتکم اور برهم گپتا کی برهم اسپھٹ سدهانت اور کتاب پاتنجلی (سنسکرت) کا پاتنجلی فی الخلاص من الارتباک کے نام سے عربی میں ترجمه کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھگوت گیتا کا بڑا مدّاح تھا۔ اسی کے تتبع میں اس نے کپلا کی سانکھیا کا ترجمه عربی میں اور بطلمیوس کی کتاب المجسطی، تحریر اقلیدس اور اپنی کتاب صنعت اسطرلاب کا سنسکرت میں ترجمه کیا۔ [بجیانند بنارسی کی] جیوتش پر ایک کتاب کرن تلک کا، جس کا حال هی میں انکشاف هوا ہے، اس نے غرّة الزیجات [یا غرّة الازیاج] کے نام سے نه صرف تحت اللفظ ترجمه کیا ہے بلکه اس کے نفس مضمون کی اپنی طرف سے مثالیں دے کر وضاحت بھی کی ہے [غرّة کا مخطوطه کتاب خانهٔ شاہ پیر محمد، احمد آباد میں موجود ہے]۔ بالآخر البیرونی نے [جو "اپنے هاتھ کو قلم سے، آنکھ کو دیکھنے سے اور دل کو فکر سے کبھی خالی نہیں رکھتا تھا" (یاقوت)] غالبًا غزنه هی میں [بروز جمعه ۲ رجب] ۴۴۰ھ/ [۱۱ ستمبر] ۱۰۴۸ء کو [بعمر ۷۷ سال ۷ ماہ] داعی اجل کو لبیک کہا؛ لیکن اپنی کتاب الصیدلة (= الصیدنة) کے مقدمے میں وہ ایک جگه لکھتا ہے: میری عمر اسّی سال قمری سے متجاوز ہے [اس لحاظ سے اس کا سال وفات ۴۴۳ھ

ہو گا] ۔ اس کے شاگرد ابوالفضل سرخسی کا بیان ہے کہ میں نے شیخ کی ایک کتاب کے حاشیے پر یہ عبارت دیکھی ہے کہ وہ جمعے کی شب بوقت عشاء ۲ رجب ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء راہیِ ملک عدم ہو گیا ۔ وفات کے وقت کا ایک حیرت انگیز واقعہ فقیہ ابوالحسن علی بن عیسی الوَلْوالجی نے بیان کیا ہے : ''میں ابو ریحان کے پاس گیا ۔ میں نے دیکھا کہ وہ دم توڑ رہا ہے ۔ اسی حال میں اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے ایک روز جدّات فاسدہ [نانیوں کی وراثت] کا مسئلہ مجھے کس طرح بتایا تھا ۔ میں نے از راہ شفقت کہا کہ کیا میں تمھاری اس حالت میں بتاؤں ؟ اس نے جواب دیا : ''میں اس مسئلے کو جاننے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں'' ۔ میں نے اس مسئلے کو دہرایا اور اس نے یاد کر لیا ۔ اس کے بعد میں اس سے رخصت ہوا اور ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ میں نے اس کی وفات پر رونے پیٹنے کی آواز سنی۔

البیرونی کی فضیلت اور اس کا علمی رتبہ : البیرونی اسلام کے عظیم عالموں اور محققوں میں سے ہے ۔ وہ اپنی آزاد خیالی، ادبی جرأت، تحقیق، بیباک تنقید اور اصابت رامے میں اپنی مثال آپ ہے ۔ اس کی ہمہ گیری، اس کے مذاق کا تنوع اور پھر اس پر اس کے علم کی گہرائی بےنظیر ہے ۔ اس کی تنقیدی روح اور طرز بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زمانۂ حال کا مصنف ہے ۔ اس کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ وہ بہت سی زبانوں کا ماہر تھا ۔ اس کی مادری زبان سغدی یا خوارزمی ہے، جو ایرانی کی ایک شاخ بتائی جاتی ہے، جسے وہ کسی علم کے اظہار کے ناقابل پاتا ہے ۔ وہ صرف عربی زبان کو اہل سمجھتا ہے ۔ وہ اپنی کتاب الصیدلة [الصیدنة] میں یوں رقمطراز ہے : ''دنیا کے جملہ ممالک کے علوم عربی میں منتقل اور ہمارے دلوں میں راسخ و جاگزین ہو گئے ہیں اور اس زبان کی خوبیاں ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہیں، اگرچہ سب قوموں کی نظر میں ان کی اپنی زبانیں، جو ان کے ہاں رائج ہیں اور جن کے وہ عادی بن چکے ہیں اور جن میں وہ اپنے ہم‌عصروں اور ہمجولیوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، خوبصورت اور بولی نظرآتی ہیں؛ اس کا اندازہ میں اپنی ذات سے کرتا ہوں ۔ میں اپنی زبان کا خوگر ہو چکا ہوں، جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی علم اس زبان میں مستقل طور پر محفوظ کر لیا جائے تو یہ ویسا ہی عجیب و غریب نظر آئے گا جیسا کہ کسی نالی میں گرا ہوا اونٹ، یا یوں کہیے کہ ایک زرافہ جو شریف النسل عرب گھوڑوں میں مل‌جل جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں فارسی و عربی کی طرف مائل ہوا ہوں اور ان دونوں میں میری حیثیت ایک اجنبی اور دخیل کی سی ہے اور مجھے اُن کے استعمال میں اچھی خاصی دشواری پیش آتی ہے'' ۔ اس نے اپنی کتاب التفہیم عربی اور فارسی میں لکھی ہے ۔ ان زبانوں کے علاوہ وہ سنسکرت اور یونانی بھی جانتا تھا اور سریانی اور عبرانی زبانوں میں قدرے مہارت رکھتا تھا۔

البیرونی بیک وقت سیّاح، ریاضی دان، ماہرِ فلکیات، جغرافیہ‌دان اور مؤرخ، معدنیات، طبقات الارض اور خواص الادویہ کا ماہر اور آثار قدیمہ کا عالم تھا ۔ وہ اپنے ہم‌عصروں میں نمایاں نظر آتا ہے، حتی کہ اس کے استاد ابو نصر منصور اور رفیق کار ابوسہل المسیحی نے، جس سے اس کی ملاقات غالباً جرجان میں ہوئی، فرداً فرداً اس کے نام پر اپنی کئی مختلف نظریات پر مرتبہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ مشہور طبیب و فلسفی ابو علی ابن سینا سے کئی مرتبہ مختلف اوقات پر اس کے مناظرے ہوئے ۔ اُن سے متعلق متعدد رسائل ہم تک پہنچے ہیں ۔

البیرونی نے ارسطو کے فلسفے پر مبنی ''سما اور طبیعیات'' پر کوئی اٹھارہ سوال ابن سینا پر کیے ہیں اور اس کے جواب خاطرخواہ نہ پا کر خود ان کے جواب الجواب لکھے ہیں - ابو سہل ویجن بن رستم الکوھی، ابوالحسن کوشیار الجیلی، محمد بن اللیث ابو الجود، ابو محمود الخجندی، ابو سعید احمد بن محمد عبدالجلیل السجزی اور ابو الوفاء محمد بن محمد البوزجانی سے مختلف علمی مسائل پر اس کی خط و کتابت رہی ہے - ایک مرتبہ کشمیر کے ہندو فضلا نے اس سے دس سوالات کیے، جن کا اس نے خاطرخواہ جواب دیا - ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوے ''مقدمۂ تاریخ علوم'' (*Introduction to the History of Science*) کا مصنف جارج سارٹن حق بجانب تھا کہ وہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر اور پانچویں صدی کے نصف اول کو ابن سینا کے بجاے البیرونی کے نام پر نامزد کرے۔

ابن سینا کے ارتفاع قمر سے طول البلد دریافت کرنے کے طریق پر بحث کرتے ہوے البیرونی لکھتا ہے کہ یہ مقصد تک پہنچنے کا ایک اجتہادی طریقہ ہے، جو سہل ہے اور جو حدِ امکان سے باہر نہیں، مگر یہ کہ ابوعلی باوجود اپنی تیزی فہم و فراست اور جدّتِ طبع کے اس مسئلے میں ناقابل اعتبار ہے؛ اس کی تحقیق تقلید پر مبنی ہے اوز خاص کر امر زیر بحث کی تلاش کے لیے - البیرونی اِسی مسئلے کے متعلق ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ جرجان کا طول اس کے قریب ہے جو ابو علی سینوی نے اپنے ایک خط میں زرّین کیس بنت شمس المعالی کو لکھا ہے اور یہ کہ ابو علی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا.

علم المثلثات میں اس کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے: ایک دائرے میں منتظم نو اور دس اضلاع کی شکل کھینچنا اور اسی طرح دس اضلاع کی شکل کھینچ کر ۴۰ اور ۳۶ درجے کے زاویے کے بالمقابل وتر دریافت کرنا ہے اور اسے دو مرتبہ نصف کر کے ایک درجے کا وتر اور نصف اور چوتھائی درجے کی جیب دریافت کرنا اور اس پر جدول الجیوب کی بنیاد رکھنا، دائرے کے محیط و قطر کی نسبت π کا تین درجۂ اعشاریہ تک صحیح اندازہ کر لینا، جیوب و اظلال کے شمار کا قاعدہ اور دوسرے درجے کے فرقوں سے واقفیت اور خانہ پری ضابطہ (Interpola-tion formula)، جو آگے چل کر جیب کی قدر میں تفاعل (function) کی ایجاد کا باعث ہوا، اور اس سلسلے میں ایک عام قاعدے کی پیہم تلاش و جستجو، اور سب سے بڑھ کر کروی مثلثات کے دریافت شدہ ضوابط کی مدد سے کروی ہیئت کے مسائل کا حل کر لینا جو اعلٰی درجے کی جدّت پسندی و اختراع و ابداع کا نمونہ پیش کرتے ہیں - اس طرح زاویوں کی جیب و ظل کے جداول میں دائرے کے نصف قطر کو اکائی قرار دینا اور دوسرے درجے کے فرقوں کا استعمال خاص طور پر قابل ذکر مسائل ہیں - سمت قبلہ کی دریافت کا ایک صحیح و سہل طریقہ اور اس کے لیے کروی سطح کی سطحِ مستوی پر تسطیح بھی اس کی ایجاد ہے.

حساب میں ہندوؤں کے طریقۂ شمار و اعداد کی وضاحت، یعنی اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار وغیرہ کا تخیّل اور ان کا استعمال قابلِ قدر ہے - شطرنج میں ہندسی سلسلۂ اعداد (Geometrical Progression) کی مدد سے ۱۸۴۴۶۷۴۴۰۷۳۷۰۹۵۵۱۶۱۹ = $(۱۶)^{۱۶}$ - ۱ کلیے کی دریافت، صرف پرکار کی مدد سے ایک زاویے کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرنا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کا حل (جو مغرب میں ''مسائل بیرونی'' کہلاتے ہیں) قابلِ تعریف ہے - عرض البلد اور طول البلد سے سطح ارضی پر فاصلوں کی پیمائش اور اس کے برعکس عرض البلد اور

طول البلد کی دریافت کا عمل سب اسی کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔

اپنی کتاب استیعاب الوجوہ الممکنۃ الخ میں وہ ابو سعید السجزی کی اصطرلاب زورقی کے ذکر میں لکھتا ہے : ''مہندسین اور علمائے ہیئت میری تحریر پر طعنہ‌زن نہ ہوں کیونکہ حرکت شبانہ روز کو خواہ وہ حرکت ارض کے باعث ہو خواہ حرکت سماء کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں ان کے حساب میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو بالآخر طبیعیین ہی حل کر سکتے ہیں۔'' یہ ایک ایسی محیّر العقول پیش گوئی ہے جس کی تصدیق صدیوں بعد فوکے کے رقاص (Foucault's pendulum) کی حرکت سے ہوئی۔

بعض حالیہ تذکرہ‌نگاروں نے قلعۂ نندنہ (ٹلہ بالا ناتھ، ضلع جہلم، پاکستان) پر البیرونی کی پیمائش قطر ارضی کو اس کی طرف بطور موجد منسوب کیا ہے، جو صحیح نہیں؛ چنانچہ اپنی کتاب التحدید الخ میں، جو ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں اس نے تصنیف کی، وہ لکھتا ہے : ''بعینہٖ اسی طریقے سے مامون نے زمین کا قطر دریافت کیا تھا (ورق ۱۴۲، مخطوطۂ فاتح)، علاوہ بریں یہ طریقہ عملی طور پر زیادہ صحیح نہیں۔ بحوالۂ کتاب اسطرلاب وہ خود کہتا ہے : ''زمین کا قطر دریافت کرنے کا یہ طریقہ قابل تصور اور مبنی بر دلائل ہونے کے باوجود بمشکل قابل عمل ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مقدار کے ناپ پر یہ مبنی ہے وہ بیحد چھوٹی ہے اور اس کے لیے جو آلات استعمال کیے گئے ہیں وہ بھی اپنی قامت میں چھوٹے ہیں اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود کہتا ہے : ''میں نے یہ طریقہ محض مامون کے زمانے کی ایک درجہ عرض البلد کی پیمائش کے متعلق دو مختلف روایتوں کے آزمانے کے لیے اختیار کیا تھا۔'' ان میں سے اس نے حبش بن الحاسب کی بیان کردہ قدر (۵۶ میل) سے اتفاق کیا ہے (*Islamic Culture*، اپریل ۱۹۲۹ء)۔

علامہ اقبال ریاضی کی اصلاح ''تفاعل'' (function) کے تصور پر البیرونی کی ایجاد کا حال ڈاکٹر ضیاءالدین کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں : ''البیرونی نے اپنی کتاب قانون مسعودی میں نیوٹن کے ضابطۂ خانہ‌پری (Interpolation Formula) کو مثلثاتی تفاعل کی قدروں کے ناپنے میں استعمال کیا ہے، جیسے اس نے اپنے جداول جیوب میں ان زاویوں کے لیے دیا ہے جو ۱۵ دقیقے کے وقفے پر ہیں۔ اس نے اس خانہ‌پری ضابطے کا ہندسی ثبوت بھی دیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتا ہے کہ یہ برہان ہر تفاعل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، جو اصل کے گھٹنے بڑھنے پر گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ اس نے تفاعل کی اصطلاح کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس تصور کا عمومی اطلاق بتایا ہے جو مثلثاتی تفاعل ہی تک محدود نہیں۔

اٹھارہ جواہر اور دھاتوں کی کثافت اضافی کی صحیح صحیح قدروں کی دریافت بھی البیرونی نے کی ہے۔ آواز کی رفتار کے مقابلے میں روشنی کی رفتار حد درجے تیز ہے اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی اسی نے کی ہے۔ اسی طرح قدرتی چشموں اور مصنوعی زیر زمین چشموں (Artesian Wells) سے پانی کے اپنے آپ اوپر ابھر آنے کی توجیہ آج کل کے مائی سکونیات (Hydrostatis) اصولوں پر کرنا اسی کا کام ہے۔ خرق عادت تولید کا مسئلہ، جس میں سیامی توأم (Siami's twins) کا مسئلہ بھی شامل ہے، اسی کا بیان کردہ ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں کا شمار ۳، ۴، ۵، ۶ یا ۱۸ ہونا اور کبھی ۷ یا ۹ نہ ہونا اسی کا مشاہدہ ہے۔ دریاے سندھ کے طاس کا کسی زمانے میں زیر آب ہونا اور زمانۂ مابعد میں اس کا مٹی اور ریگ سے پر ہو کر زرخیز میدانوں میں تبدیل ہو جانا اسی کی دریافت ہے۔ سمندر کے پانی کے نمکین ہونے

کی توجیه اسی کے ذہن رسا کا حصہ ہے۔

ہندوؤں کے علوم و فنون، ان کے رسم و رواج، تمدن و تہذیب اور مذہب و فلسفہ میں اس کی نظر ایسی گہری ہے جس کے مقابلے میں ہیون سانگ، میگس تھنیز اور ابن بطوطہ کے سفرنامے بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کے مترادف ہیں۔ مغربی مستشرقین اسے ہندوستان کے دروازے پر افلاطون (Plato)، مسلمانوں کا بطلمیوس (Ptolemy) یا اپنے زمانے کا پلینی Pliny اور لیونار د ونسی (Leonard de Vinci) اور لائب‌نتز Leibnitz شمار کرتے ہیں۔ زخاؤ الآثار الباقیۃ اور کتاب الہند کے دیباچوں میں لکھتا ہے کہ البیرونی کی تصانیف میں اس کی تحقیق کی وسعت اس قدر ہے کہ اس کے بیان کے لیے کئی نسلیں درکار ہوں گی۔ ۱۸۷۸ء سے اب تک اس کی کئی تصانیف معرض ظہور میں آ چکی ہیں، لیکن اس کام کے پورا ہونے کے لیے نہ معلوم کتنا عرصہ اور درکار ہو گا۔

البیرونی کی قومیت اور اس کا مذہب: مغرب و مشرق کے سب مستشرقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ ایرانی النسل تھا۔ بعض حلقوں میں اس بات کے ثابت کرنے کی بیکار کوشش کی گئی ہے کہ وہ ترک نسل سے تھا، کیونکہ قرائن و شواہد اس کے برعکس ہیں۔ وہ ایک فراخ دل، قومی عصبیت سے ماورا، سچا اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا، جو تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھا۔

البیرونی کی تصنیفات: پروفیسر زخاؤ نے وہ خط جو البیرونی نے طبیب محمد بن زکریا الرّازی کی کتابوں کے متعلق اپنے کسی دوست کو (۴۲۷ھ / ۱۰۳۵-۱۰۳٦ء) لکھا ہے، شائع کیا ہے۔ اس میں اس نے اپنی ان تصانیف کی فہرست دی ہے جو وہ اس سنہ (پینسٹھ قمری سال کی عمر) تک لکھا چکا تھا؛ ان کی تعداد ایک سو تیرہ ہے۔ ان کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جو ابو نصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف منسوب کی ہیں؛ ان کی تعداد بارہ ہے۔ اسی طرح وہ کتب جو ابو سہل عیسی بن یحیی المسیحی نے اس کے لیے لکھیں ان کی تعداد بھی بارہ ہے۔ ایک کتاب ابو علی الحسن ابن علی الجیلی نے اس کی طرف منسوب کی۔ یہ کل ملا کر ایک سو اڑتیس کتب ہوئیں؛ [لیکن اس تعداد میں اس کی کتاب القرعۃ المثمنۃ لاستنباط الضمائر المخمنۃ کی ایک تشریح، جو خود البیرونی نے شرح مزامیر (مضامیر) القرعۃ المثمنۃ کے نام سے لکھی تھی، شامل نہیں۔ اس طرح اس کی مصنفہ کتب کی تعداد ایک سو انتالیس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس فہرست میں مندرجۂ ذیل کتب کا بھی ذکر نہیں:-

۱ - "الآثارالباقیۃ میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے ۹

۲ - کتاب الہند میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے ۷

۳ - جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے ۸

(کشف الظنون میں در اصل کل پندرہ کتب کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ زخاؤ نے لکھا ہے ان میں سے بعض کتب بعینہٖ یا معمولی سی تبدیلی کے ساتھ وہی ہیں جو اوپر کی تعداد میں شامل ہیں اور بعض کتب اس کی طرف غلط طور پر منسوب ہو گئی ہیں اس طرح حاجی خلیفہ کی بیان کردہ کتب کی تعداد صرف آٹھ رہ جاتی ہے)۔

۴ - غلام حسین بجنوری نے جامع بہادر خانی میں البیرونی کی ایک کتاب لمعات کا ذکر کیا ہے جو علم المناظر و انعکاس پر لکھی گئی تھی ۱

۵ - تاریخ خوارزم، جس کا ذکر ابوالفضل

نے تاریخ بیہقی میں کیا ہے ۱

۶ - وہ کتب جن کا ذکر یاقوت نے معجم الادباء میں کیا ہے ۷

۷ - وہ کتب جن کا ذکر کسی قدیم کتاب میں نہیں، لیکن جو اس وقت دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، یعنی (۱) کتاب الدرر فی سطح الاکر؛ (۲) نزهة النفوس والافکار فی خواص المولید الثلاثة المعادن و النبات و الاحجار؛ یہ دونوں کتب بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہیں ۲

۸ - وہ تصنیفات جن کے مسودے البیرونی کے پاس محفوظ نہ رہے تھے ۵

۳۶

اس طرح البیرونی کی تالیفات کی کل تعداد ۱۷۰ ہو جاتی ہے]؛ علاوہ ازیں وہ کتب ہیں جن کا ذکر D.J. Boilot نے *L'œuvre de l'Beruni* (= کتب البیرونی) میں کیا ہے - اسی طرح کتاب کرن تلک [= غرة الزیجات] ہے، جس کا اب تک کسی شائع شدہ فہرست میں ذکر نہیں - یوں البیرونی کی کل مصنّفہ اور مترجمہ کتب کی تعداد ایک سو اکاسی تک پہنچ جاتی ہے - [یاقوت نے لکھا ہے کہ میں نے البیرونی کی تصانیف کی ایک فہرست جامع مرو کے کتاب خانے میں ساٹھ ورق پر گنجان خط میں لکھی ہوئی دیکھی تھی.

البیرونی کی مصنّفات کے مخطوطے دنیا میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، اس کے لیے دیکھیے براکلمان: تکملہ؛ H. Suter : *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke* (عرب علمائے ریاضی و ہیئت اور ان کی تصنیفات)؛ ابو ریحان البیرونی، مطبع ادارۂ تصنیف و تالیف ص ۸۰ ببعد].

البیرونی کی جو کتب چھپ چکی ہیں یا زیر طبع ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱ - القانون المسعودی، ۳ جلد، ۱۹۵۴ء ببعد؛ (۲) الآثار الباقیة، طبع زخاؤ، متن، لائپزگ ۱۸۷۶ء، و انگریزی ترجمہ؛ (۳) کتاب الهند، طبع زخاؤ، لنڈن ۱۸۸۷ء، و انگریزی ترجمہ؛ (۴) پاتنجلی، طبع رٹر Ritter؛ تہران؛ (۵) مقالة فی استخراج الاوتار فی الدائرة بخواص الخط المنحنی فیها؛ (۶) تمهید المستقر لتحقیق معنی الممر، (انگریزی ترجمہ از E.S. Kenedy)؛ (۷) افراد المقال فی امر الظلال؛ (۸) فی راشیکات الهند؛ (۹) رسائل ابی نصر منصور بن علی بن عراق، جو اس نے البیرونی کے لیے لکھے (مندرجۂ بالا پانچوں کتابیں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہیں)؛ (۱۰) کتاب الجماهر فی معرفة الجواهر، طبع کرینکو ۱۹۳۶ء؛ تقی الدین الهلالی نے اس کا مقدمہ اور حواشی شائع کیے، لائپزگ ۱۹۴۱ء؛ (۱۱) کتاب التفهیم لاوائل صناعة التنجیم، عربی متن، طبع رامزے رائٹ و فارسی متن، طبع آقا جلال همائی، تہران ۱۹۴۰ء؛ (۱۲) تحدید نهایات الاماکن، طبع محمد بن تاویت الطنجی، انقرہ ۱۹۶۲ء وطبع بولجا کوف، قاہرہ ۱۹۶۴ء و عربی متن مع انگریزی ترجمہ از محمد فضل الدین قریشی، جو ابھی شائع نہیں ہوا؛ (۱۳) کرن تلک (= غرة الزیجات)، مع انگریزی ترجمہ و حواشی از محمد فضل الدین قریشی، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۱۵-۱۶) نهایات الاماکن اور الصیدنة فی الطب، انگریزی و اردو ترجمہ از فضل الدین قریشی، زیر سرپرستی پنجاب یونیورسٹی لاہور، پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے؛ (۱۷) صفة المعمورة کے نام سے زکی ولیدی طوغان نے مطبوعات آثار قدیمۂ ہند، شمارہ ۵۳، نئی دہلی ۱۹۴۱ء، میں اس کی چار کتابوں: قانون مسعودی، نهایات الاماکن، الجماهر اور الصیدنة کے کچھ اقتباسات شائع کیے تھے؛ (۱۸) مقالید علم الهیئة کے عکس حاصل کرنے کے بعد اس کی تہذیب کا کام، از محمد فضل الدین قریشی، ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے؛ (۱۹) ان کے علاوہ

یورپ کے مستشرقین مثلاً، ویدمن، سی۔ شاے، ڈلس، میکس مایرهاف، میکس کراؤزے اور ان کے رفقاےکار نے البیرونی کے بعض رسائل کے اقتباس مغربی زبانوں میں شائع کیے ھیں۔

مآخذ: (۱) ظہیرالدین علی بن زید البیہقی: تاریخ حکماء الاسلام، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۴۲ (= تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاهور ۱۹۳۵ء)؛ (۲) الغافقی: کتاب المفردات، طبع Max Meyerhof و صبحی، قاهره ۱۹۳۲ء، ص ۲۱ تا ۲۸؛ (۳) السیوطی: بغیة الوعاة، مصر ۱۳۲۶ھ؛ (۴) یاقوت: ارشاد، مطبوعۂ مصر، ۱۷: ۱۸۰ تا ۱۹۰؛ (۵) ابن ابی اُصَیبِعَه: عیون الانباء، مصر ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء، ۲: ۲۱ تا ۲۳؛ (۶) السمعانی: کتاب الانساب؛ (۷) الخوانساری: روضات الجنات، ۱: ۶۸ و ۴: ۱۶۷؛ (۸) ابن العبری: تاریخ مختصر الدول، ص ۳۲۴؛ (۹) طوسی: الذریعة، ۱: ۴۰۷ و ۲: ۲۰؛ (۱۰) الفهرس التمهیدی، مطبوعة الادارة الثقافیة، مصر، ص ۷۸۴؛ (۱۱) جرجی زیدان: آداب اللغة، ۲: ۳۳۵؛ (۱۲) فہرس الخزانة التیموریة، مصر ۱۹۴۸ء، ۳: ۴۳؛ (۱۳) ابن الاثیر: اللباب، ۱: ۱۶۰؛ (۱۴) محمد مسعود، در الاهرام، ج ۲ (۱۹۳۵ء)، شماره ۶؛ (۱۵) الهاشمی: نظریات الاقتصاد عندالبیرونی، در *MMIA*، شماره ۱۰، ص ۵۰۶؛ (۱۶) الزرکلی: الاعلام، بار دوم، ۶: ۲۰۵؛ (۱۷) سرکیس: معجم المطبوعات، ۱: عمود ۶۱۵؛ (۱۸) الغضنفر التبریزی (م ۶۹۲ھ): کتاب الفہرست مع المشاطة، طبع Max Krouse، پیرس ۱۸۳۶ء؛ (۱۹) ابوالفداء: تقویم البلدان؛ (۲۰) الشہرزوری: نزهة الارواح؛ (۲۱) میر خواند: روضة الصفا؛ (۲۲) خواند امیر: حبیب السیر؛ (۲۳) رشید الدین فضل اللہ: جامع التواریخ؛ (۲۴) نظامی عروضی سمرقندی: چہارمقالہ، طبع قزوینی، لائڈن ۱۹۰۹ء؛ (۲۵) الواعظ الکشفی: لطائف الطوائف؛ (۲۶) مرزا محمد قزوینی: چہار مقالہ، مترجمه و طبع براؤن، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۲۷) علی اکبر ده خدا: ابوریحان، تهران ۱۳۲۴ھ ش؛ (۲۸) ابوالفضل: آئین اکبری؛ (۲۹) قاضی احمد غفاری: نگارستان، بمبئی ۱۲۷۵ھ؛ (۳۰) عبداللہ خان: مشاهیر عالم، لاهور ۱۹۲۶ء؛ (۳۱) سید حسن برنی: البیرونی، بار دوم، علی گڑھ ۱۹۲۷ء؛ (۳۲) وهی مصنف: صفة المعمورة، در معارف، اعظم گڑھ، ۳۹/ ۶: ۴۰۵؛ (۳۳) ارمغان، پاکستان سائنس کانفرنس، اجلاس نہم، پنجاب یونیورسٹی، لاهور ۱۹۶۷ء؛ (۳۴) حمید عسکری: نامور مسلم سائنسدان، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب، لاهور ۱۹۶۲ء؛ (۳۵) ابو ظفر ندوی: ابو ریحان بیرونی کی ایک نئی کتاب، در معارف، اعظم گڑھ، ۲۲/ ۳: ۲۱۴؛ (۳۶) سید عبداللہ: قدیم عربی تصانیف میں هندوستانی الفاظ، در اورینٹل کالج میگزین، لاهور، مئی ۱۹۳۴ء، ص ۲۴ تا ۴۴؛ (۳۷) سید حسن برنی: *Ibn Sina and al-Beruni, A study in Similarities and Contrasts*، در *Avicenna Commemoration Volume*، کلکته ۱۹۵۶ء؛ (۳۸) ضیاء الدین و F. Krenkow، در *Islamic Culture*، ج ۶، جولائی تا اکتوبر ۱۹۳۲ء؛ (۳۹) F. Krenkow، در مجلۂ مذکور، ۹: ۳۲۳ تا ۳۲۸؛ (۴۰) ایران سوسائٹی: *Al-Biruni Commemoration Volume*، کلکته ۱۹۵۱ء؛ (۴۱) محمد نظام الدین: مقاله ''البیرونی اور اس کے کارنامے''، جو مؤتمر مستشرقین، منعقده ماسکو، اگست ۱۹۶۰ء، میں پڑھا گیا؛ (۴۲) مقدمۂ کتاب الصیدنه، عربی متن و حواشی و جرمن ترجمه از Max Meyerhof، برلن ۱۹۳۲ء و اردو ترجمه از فضل الدین قریشی (زیر ترتیب)؛ (۴۳) Max Krause: *Albîrûnî ein iranischer Forscher*، در *Islam*، شماره ۲۶: ص ۱ تا ۱۵؛ (۴۴) C. Schoy: *Aus der Mathematischen Geographie der Araber (nach dem Kānūn al Mas'ūdī) etc.*، در ISIS، ۱۹۲۲ء، ۵: ۵۱ تا ۵۷؛ (۴۵) وهی مصنف: *Die Bestimmung der Geographischen Breite der Stadt Ghazna durch al-Bīrūnī*، در *Annalen der*

Hydregraphie، ۱۹۲۰ء، ص ۱۳ تا ۸۳؛ (۴۶) وهی مصنف: *Die Trignometrischen Lehren des persischen Astronomen Abu'l Raihān Muh. Ibn Ahmad al-Bīrūnī*، هنوور ۱۹۲۷ء؛ (۴۷) G. Sarton: *Introduction to the History of Science*، بالٹی مور ۱۹۲۷ء، ۱: ۷۰۷ تا ۷۰۹؛ (۴۸) H. Beveridge در *JRAS*، ۱۹۰۲ء، ص ۳۳۳ تا ۳۳۵؛ (۴۹) براکلمان، ۱: ۶۲۶ ببعد و تکمله، ۱: ۸۷۰ ببعد؛ (۵۰) Cara de Vaux: *Penseurs de l' Islam*، پیرس ۱۹۲۱ء، ۲: ۷۵ تا ۸۷ و ۲۱۵ تا ۲۱۷؛ (۵۱) E. Schau: *Chronology* (= الآثار الباقیة) کا دیباچه (جرمن ترجمه از H. Suter و E. Wiedmann، در *SBPMS Erlg.*، ۵۲-۵۳ (۱۹۲۰-۱۹۲۱ء): ۱۷ تا ۹۷؛ (۵۲) L. Leclerc: *Histoire de la médecine arabe*، پیرس ۱۸۷۶ء؛ (۵۳) عبدالله یوسف علی، در *Islamic Culture*، جنوری - اپریل - دسمبر ۱۹۲۷ء؛ (۵۴) علامه اقبال، در مجلهٔ مذکور، اپریل ۱۹۲۰ء؛ (۵۵) سید حسن برنی: ... *Kitāb al-Tahdīd*، در مجلهٔ مذکور، اپریل ۱۹۵۷ء؛ (۵۵) H. Ritter: *Werke al-Bīrūnī's*، در *Orientalia*، استانبول ۱۹۳۲ء، ۱: ۳۴ تا ۸۷؛ (۵۶) زکی ولیدی طوغان: *New geographische und ethnographische Nachrichten*، نیز در *Geographische Zeitschrift*، ۱۹۳۳ء، ص ۳۶۳ ببعد؛ (۵۷) Max Meyerhof: *Études de Pharmacologie arabe*، در *BIE*، ۱۹۴۰ء، ص ۲۲، ۱۳۳ تا ۱۵۲؛ (۵۸) Wüstenfeld، در *Lüddes Zeitschr.*، ۱: ۳۶، نیز در *Die Arab. Ärzte*، عدد ۱۲۹ و در *Die Geschichsschreiber der Araber*، عدد ۱۹۵؛ (۵۹) Ramsay Wright: *Book of Instruction* (= کتاب التفهیم) کا مقدمه، لنڈن ۱۹۳۴ء؛ (۶۰) F. Taeschner، در *ZDMG*، شماره ۷۷، ص ۳۱ ببعد؛ (۶۱) *Bīrūnī*، مطبوعهٔ Academy of Sciences, USSR، شعبهٔ تاریخ و فلسفه، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۵۰ء؛ البیرونی کی تصنیفات کے لیے نیز دیکھیے (۶۲) E. Wiedemann: *Astronomische Instrumente, Trignometrische Grössen, Geodaetische Messungen*، *Beitr. XVIII*، در *SBPMS Erlg.* ۲۱ (۱۹۰۹ء): ۲۶ تا ۴۷؛ (۶۳) وهی مصنف: *Ein Instrument, das die Bewegung von sonne und Mond darstelt nach al-Bīrūnī*، در *Isl.*، ۴ (۱۹۱۳ء): ۵ تا ۱۳؛ (۶۴) وهی مصنف: *Über die verschiedenen, bei der Mondfinsternis auftretenden Farben nach al-Bīrūnī*، در *Eders Jahrbuch für Photographie*، ۱۹۱۳ء؛ (۶۵) وهی مصنف: *Über Erscheinungen bei der Dämmerung und bei Sonnenfinsternissen nach arabischen Quellen*، در *Archiv für Geschichte der Medizin*، ۱۵ (۱۹۲۳ء): ۴۳ تا ۵۲؛ (۶۶) وهی مصنف: *Meteorologisches aus der Chronologie von al-Bīrūnī*، در *Meteorolog. Zeitschr.*، ۱۹۲۲ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۳؛ (۶۷) وهی مصنف: *Über Gesetzanässigkeiten bei Pflanzen nach al-Bīrūnī*، در *Biolog. Zentralblatt*، ۴۰ (۱۹۲۰ء): ۱۳۴ تا ۱۳۶؛ (۶۸) وهی مصنف: *Beitr. XXVII, Geographisches aus al-Bīrūnī*، در *SBPMS. Erlg.*، ۴۴ (۱۹۱۲ء): ۱ تا ۴۶؛ (۶۹) E. Wiedemann و J. Frank: *Allgemeine Betrachtungen von al-Biruni in Seinem Werk über Astrolabien*، *Beitr. LXI*، در مجلهٔ مذکور، ۵۲-۵۳ (۱۹۲۰-۱۹۲۱ء): ۷۹ تا ۱۲۱؛ (۷۰) E. Wiedemann و J. Hell: *Geographisches aus dem mas'ūdischen Kanon von al-Bīrūnī*، *Beitr. XXIX*، در مجلهٔ مذکور، ۴۴ (۱۹۱۲ء): ۱۱۹ تا ۱۲۵؛ (۷۱) E. Wiedemann: *Über die Waage des Wechselns (ich al Khāzinī) und die Lehre von den Proportionen nach al-Bīrūnī*، *Beitr. LXVIII*، در *SBPMS Erlg.* ۴۸ (۱۹۱۶ء): ۱ تا ۱۵؛ (۷۲) J. Ruska: *al-Bīrūnī als Quelle für das Leben und*

die Schriften al-Rāzīs، در Isis، ۵ (۱۹۲۲ء): ۳۶ تا ۵۰؛ (۳م) H. Suter: Das Buch der Auffindung der Sehnen im Kreise von Abu'l-Raihān Muhammed al-Bīrūnī، در Bibl. math.، سلسلہ ۳، ۱۱ (۱۹۰۹ - ۱۹۱۰ء): ۱۱ تا ۸۷؛ (۳م) وہی مصنّف: Der Verfasser des Buches "Grunde der Tafeln" des Chuwārezmī (namlich al-Bīrūnī)، در مجلّۂ مذکور، ۴ (۱۹۰۳ء): ۱۲۷ تا ۱۲۹؛ (۵م) وُوّ، لائڈن، بار دوم، بذیلِ مادّہ؛ نیز رکّ بہ میزان.

(محمد فضل الدین قریشی [و ادارہ])

* **البِیْرہ**: عام طور پر ان اضلاع کی جہاں کبھی آرامی زبان بولی جاتی تھی متعدد جگھوں کا نام ہے (البیرہ آرامی لفظ بِیرثا، بمعنی قلعہ، حِصن، کا ہم معنی ہے: الجزیرہ کے شمال مغرب میں دریاے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع البیرہ (موجودہ بیرہ جک [رکّ بآن]) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ البیرہ نام کے دوسرے مقامات کے لیے قبّ یاقوت: معجم (طبع Wüstenfeld)، ۱: ۷۸۶؛ Nöldeke، در Nachr. der Götting. Ges der Wiss.، ۱۸۷۶ء، ص ۱۱ تا ۱۲؛ ڈخویہ، در BGA، ۴ (حاشیہ و فرہنگ): ۳۳۱؛ Le Strange: Palestine under the Moslems، ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۳.

(M. STRECK)

* **بِیْرہ جِک**: عراق میں دریاے فرات کے بائیں کنارے پر ایک قصبہ۔ بیرہ جک (مقامی لوگوں میں بلہ‌جک، نیز زخاؤ Sachau کے بیان کے مطابق حلبی بولی میں باراجیک) کے معنی بیرہ کوچک یعنی "چھوٹا قلعہ" ہیں (یہ عربی زبان کے لفظ "بیرہ" اور ترکی زبان کے لاحقۂ تصغیر "جک" سے مرکب ہے)۔ عربی نام البیرہ [رکّ بآن] بعد کے شامی مصنّفوں کے ہاں بیرہ Bireh آرامی زبان کے بیرثا bīrthā (بمعنی قلعہ) سے مشتق ہے۔ بیرہ‌جک، جو رومنوں کے ہاں (Cumont کے بیان کے مطابق) Birtha مشہور تھا، وہی Makedonopolis نام کا قصبہ ہے جس کا ذکر بعض بوزنطی مآخذ میں آتا ہے۔ محاربات صلیبی سے متعلق لاطینی تاریخوں میں اس قصبے کو بلہ Bile موسوم کیا گیا ہے.

بیرہ جک کے مقام پر شمالی شام سے عراق کو جانے والی ایک بڑی شاہراہ دریاے فرات کو عبور کرتی ہے۔ اس مقام پر دریا پہاڑوں سے نکل کر شام و عراق کے میدانوں میں بہتا ہے۔ اسی مقام پر دریاے فرات طوروس کے پہاڑوں سے گزرتے ہوے اُن آبشاروں کو پیچھے چھوڑنے کے بعد جو اس میں بنتے ہیں پہلی مرتبہ جہازرانی کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں دریا میں سے چونے کے پتھر کی ایک تن تنہا مخروطی پہاڑی بیرہ‌جک کے قریب یکایک بلند ہوتی ہے، جسے زمانۂ قدیم سے دریاے فرات کے اس اہم معبر کی حفاظت کی غرض سے قلعہ‌بند کیا جاتا رہا ہے۔ سلوقی خاندان کے زمانے میں یہاں کشتیوں کا ایک پل موجود تھا، جو دریا کے دائیں کنارے پر زیوجما Zeugma سے بائیں کنارے پر اَفامیہ Apamea (= بیرثا) تک بنا ہوا تھا (سلوقی نام اَفامیہ شاید کبھی عام طور پر مستعمل نہیں رہا اور آرامی بیرثا کے مقابلے میں غائب ہو گیا۔ اَفامیہ، جو ابتدا میں زیوجما کی ایک نواحی بستی تھا، حصار بند ہونے کی بدولت رفتہ رفتہ زیوجما سے کہیں زیادہ اہم بن گیا، اور زیوجما کا نام و نشان مٹ گیا)۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے (قبّ خلیل الظاہری) کہ پندرھویں صدی کے نصف آخر تک بیرہ جک کے مقام پر دریاے فرات کے راستے پر ایک پل موجود تھا.

قدیم تر عربی جغرافیائی تصانیف میں البیرہ کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ یہ نام تیرھویں صدی کے وسط میں ایسے رسالوں (مثلاً الدمشقی اور ابوالفداء)

میں پہلی مرتبہ آیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ادب میں البیرہ کے حوالے صلیبی جنگوں کے زمانے میں نمودار ہوے ۔ الرّھا (Edessa) کے لاطینی امرا ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ - ۱۰۹۹ء سے لے کر ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء تک اس شہر پر قابض رہے، لیکن ۵۳۹ھ / ۱۱۴۴ء میں جب الرّھا کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تو عیسائی اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے قابل نہ رہے اور انھوں نے اسے بوزنطیوں کے حوالے کر دیا؛ مگر جلد ھی ماردین کے اُرتُقی امیر نے اسے بوزنطیوں سے چھین لیا ۔ تیرھویں صدی میں مغول کے حملوں کے دوران میں البیرہ اپنے تقریبًا ناقابل تسخیر قلعے کے باعث مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط دفاعی حصار تھا ۔ شام اور مصر کے مملوکوں کو سلطان قایتبای کے دور حکومت میں اوزون حسن کے زیر قیادت آق قویونلو ترکمانوں کے مقابلے میں البیرہ کی مدافعت کرنا پڑی ۔ قایتبای نے ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷ - ۱۴۷۸ء میں دریاے فرات کے کنارے کے قلعوں کا معائنہ کیا اور کچھ مدت بعد ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء میں البیرہ کے برج و بارہ کی مرمت اور استحکام کی طرف توجہ کی ۔ البیرہ کے حصار پر چھے عربی کتبے ھیں ۔ قدیم ترین کتبہ مملوک سلطان برکۃ خان (۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء تا ۶۷۸ھ/ ۱۲۷۹ء) کے زمانے کا ہے، اور قریب‌ترین زمانے کا کتبہ سلطان قایتبای کے دور حکومت کے سنین ۸۸۷ھ/ ۱۴۸۲ء تا ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء کا ہے ۔ سلطان سلیم اوّل کی ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء تا ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء کی جنگی مہمات کے نتیجے میں البیرہ ترکوں کے زیر حکومت آ گیا اور اسے اُرفہ کی سنجاق میں شامل کر لیا گیا، جو ایالت حلب کا ایک حصہ تھا ۔ عثمانی ترک فرات میں اپنے دریائی بیڑے کی ضروریات بہم پہنچانے کے لیے بیرہ‌جک کے مقام پر ایک چھوٹا سا دریائی مخزن (یا سلاح خانہ) قائم رکھتے تھے ۔

۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ / ۲۴ جون ۱۸۳۹ء کو بیرہ‌جک کے قریب ھی نِسیب کے مقام پر مصری فوجوں نے ابراھیم پاشا کی سپہ‌سالاری میں ترکوں پر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی ۔ بیرہ جک، جہاں قدیم قلعوں کے کھنڈر اب بھی نظر آتے ھیں، آج کل موجود جمہوریۂ ترکیہ کی حدود میں واقع ہے ۔ ۱۹۴۵ء میں اس قصبے کی آبادی قریب قریب دس ہزار آٹھ سو نفوس تھی ۔

مآخذ: (۱) الدمشقی، ص ۲۰۶ و ۲۱۴؛ (۲) *Gregorii Abulfaragii Histor. Oriental* (= مختصر الدّول)، طبع E. Pococke، آوکسفرڈ ۱۶۶۳ء، ص ۲۰۰ و ۳۱۱؛ (۳) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۶۹؛ (۴) مراصد الاطّلاع، طبع A.W.T. Juynboll، Lugduni Batavorum ۱۸۵۰ تا ۱۸۶۴ء، ۱: ۱۸۹؛ (۵) خلیل الظاھری: زُبدۃ کشف الممالک (R. Hartmann: Tübinger Dissert.، ۱۹۰۷ء)، ص ۶۵ و ۸۴؛ (۶) *Beiträge zur Geschichte der Mamlüken-sultane in den Jahren 690-741*، طبع K.V. Zettersteen، لائڈن ۱۹۱۹ء، ص ۳۱۲ (اشاریہ)؛ (۷) ابن ایاس: بدائع الزھور، مرتبۂ P. Kahle و محمد مصطفٰی، ۳ (استانبول ۱۹۳۶ء): ۷۷ ببعد و بمواضع کثیرہ؛ (۸) اولیا چلبی: سیاحت‌نامہ، استانبول ۱۳۱۴ھ، ۳: ۱۴۵ ببعد؛ (۹) *Relation d'un. Voyage du Sultan Qâitbay en Palestine et en Syrie*، ترجمۂ R. L. Devonshire، در *BIFAO*، قاھرہ ۱۹۲۲ء، ۲۰: ۱ تا ۴۰؛ (۱۰) L. Rauwalff: *Aigentliche Beschreibung der Raisz.....inn die Morgenländer*، Laugingen ۱۵۸۳ء، ص ۱۳۸؛ (۱۱) J. B. Tavernier: *Les Six Voyages.....en Turquie, en Perse, et aux Indes*، پیرس ۱۶۷۶ء، ۱: ۱۶۳ تا ۱۶۴؛ (۱۲) H. Maundrell: *An Account of the Author's Journey from Aleppo to the River Euphrates*، در *A Journey from Aleppo to Jerusalem*، آوکسفرڈ ۱۷۱۴ء، ص ۳ تا ۵؛ (۱۳) R. Pococke:

A Description of the East، ج ۲، لنڈن ۱۷۴۵ء، حصۂ اول، ص ۱۶۰ ببعد؛ (۱۳) J. Otter : Voyage en Turquie et en Perse، پیرس ۱۷۴۸ء، ۱ : ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ (۱۵) C. Niebuhr : Reisebeschreibung nach Arabien، کوپن ہیگن ۱۷۷۸ء، ۲ : ۴۱۲؛ (۱۶) J. S. Buckingham : Travels in Mesopotamia، لنڈن ۱۸۲۷ء، ۱ : ۴۵ ببعد؛ (۱۷) C. Sandreczki : Reise nach Mosul und Urmia، Stuttgart ۱۸۵۷ء، ۲ : ۱۱۴ ببعد؛ (۱۸) H. Petermann : Reisen im Orient، لائپزگ ۱۸۶۱ء، ۲ : ۱۷ ببعد؛ (۱۹) J. Oppert : Expédition Scientifique en Mesopotamie، پیرس ۱۸۶۳ء، ۱ : ۴۴ ببعد؛ (۲۰) C. E. Sachau : Reise in Syrien und Mesopotamien، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۱۷۸ ببعد؛ (۲۱) H. von Moltke : Briefe uber Zustände und Begebenheiten in der Turkei aus den Jahren 1835 bis 1839، برلن ۱۸۷۷ء، ص ۲۲۴ تا ۲۲۶، ۲۳۲ تا ۲۳۴، ۲۶۶ ببعد؛ (۲۲) Fr. Spiegel : Eranische Altertumskunde، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱ : ۱۶۵ ببعد؛ (۲۳) G. Le Strange : Palestine under the Moslems، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۳؛ (۲۴) V. Chapot : La Frontiere de l' Euphrate، پیرس ۱۹۰۷ء، ص ۲۷۴ ببعد؛ (۲۵) F. Cumont : Études Syriennes، پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۱۲۰ ببعد، ۱۴۴ ببعد؛ (۲۶) M. Gaudefroy-Demombyness : La Syrie á L'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۰۲، ۲۱۸؛ (۲۷) F. Taeschner : Das anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen (Türkische Bibliothek، ج ۲۳)، لائپزگ ۱۹۲۶ء، ۱ : ۱۵۰؛ (۲۸) R. Dussaud : Topographie Historique de la Syrie Antique et Médiévale، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۸۵ (اشاریہ)؛ (۲۹) Cl. Cahen : La Syrie du Nord a l'époque des Croisades، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۲؛ (۳۰) A History of the Crusades، طبع K.M. Setton، ج ۱ (M.W.) Baldwin : The First Hundred Years، فلاڈلفیا ۱۹۵۵ء)، ص ۶۶ (اشاریہ)؛ (۳۱) اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی : عثمانلی دولتنن مرکز و بحریہ تشکیلاتی (Turk Tarih Kurumu Yayinlarindan، سلسلہ ۸، عدد ۶)، انقرہ ۱۹۴۸ء، ص ۴۰۳ تا ۴۰۵؛ (۳۲) M. van Berchem : Arabische Inschriften، در Beiträge zur Assyriologie und semitischen Sprachwissenschaft، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ۷ / ۱ : ۱۰۱ تا ۱۰۷؛ (۳۳) V. Cuinet : La Turquie d'Asie، پیرس ۱۸۹۱ء، ۲ : ۱۱۳، ۱۳۲، ۲۳۸، ۲۶۵ تا ۲۶۹؛ (۳۴) سامی : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۳۰۶ و ۱۳۳۶؛ (۳۵) علی جواد : تاریخ و جغرافیا لغتی، استانبول ۱۳۱۳ - ۱۳۱۴ھ، ص ۲۲۳ تا ۲۲۴؛ (۳۶) لائیڈن ۱ - انگریزی، بار دوم و لائیڈن ۱ - ترکی، بذیل مادّہ ابراہیم پاشا (۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں نسیب کے مقام پر لڑائی سے متعلق مآخذی اشارات کے لیے)؛ (۳۷) M. Streck، در لائیڈن ۱ - انگریزی بار اوّل و عربی بذیل مادّہ بیرہ جک.

([V. J. Parry] و M. Streck)

بیزا : رک بہ بیاسہ.

بیزبان : رک بہ (دلیسز).

بیزرہ : [= بزدرۃ (ع)]، پرندوں سے شکار کھیلنے کے فن پر دلالت کرتا ہے، اور فقط باز کے شکار تک محدود نہیں ہے (اس کی فارسی اصل ''باز'' [کے لیے] نیچے دیکھیے) بلکہ ''شاہین پروری کے فن'' کے مفہوم سے قریبی تعلق رکھتا ہے ۔ اسے ''بیزار'' (باز پالنے والا) سے مشتق اور فارسی کے ''بازیار'' یا ''باز دار'' کا معرب ہونے کی بنا پر ''بازدر'' کی مثنی صورت پر ترجیح دی جاتی تھی ۔ ''بازنۃ'' اور ''بیازہ'' کے الفاظ اسلامی بلاد مغرب میں بہت ہی کم مستعمل تھے ۔ اسلام سے پہلے عربوں کو

شکار کرنے والے پرندوں (کاسر، جمع : کواسر) کا استعمال بحیثیت شکاری درندوں (جارح، جمع : جوارح) کے معلوم تھا، چنانچہ امرؤ القیس نے اپنی ''ایام الصید'' میں پرندوں سے شکار کھیلنے کے کچھ نقشے کھینچے ہیں۔ بایں ہمہ شاہین بازی نے ان عظیم اسلامی فتوحات کے بعد ہی عربوں میں اہمیت حاصل کی جن کی وجہ سے ان کا رابطہ ایرانیوں اور بوزنطیوں سے قائم ہوا۔ یہ شکار جلد ہی نئے قائدین میں مقبول ہو گیا، جنھوں نے اس میں تفریح اور اپنے جذبۂ شہسواری کی پر امن تسکین کے امکانات دیکھے۔ خلفا اور عالی رتبہ مسلم حکام اپنے شوق صیدافگنی کے ساتھ اس قسم کے شکار کو بھی ایک ادارے کے مرتبے تک بلند کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنے لگے، جس کا باقاعدہ ناظم یا داروغۂ شکار (امیر الصید) اور آگے چل کر ''امیر شکار'' مقرر کیا جانے لگا۔ اموی خلیفہ یزید بن معاویہؓ (۶۸۰ تا ۶۸۳ء) اُن سب سے پہلے اشخاص میں تھا جنھوں نے پرندوں سے شکار کھیلنے میں اپنے والہانہ شوق کا ثبوت دیا۔ عربی زبان کے مؤرخوں، سوانح نگاروں اور وقائع نویسوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے عہد اور ملک کی شاہین بازی کے مروجہ طریقوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں اور موقع کے مطابق اس میدان میں خاص خاص ملوک و امرا کے نہایت دلچسپ محاضرات نقل کیے ہیں (دیکھیے الطبری، ابن الاثیر، السیوطی، المقریزی، ترجمۂ Quatremere، در J. Sauvaget : *Introduct. al'hist. de l'Orient Musulman*)۔ بیزرہ کے متعلق اس سے بھی کہیں زیادہ گرانقدر معلومات بعض ایسی قاموسی کتب میں پائی جاتی ہیں جو ادب یا فقہ اللغہ کے مقاصد کے لیے مرتب کی گئی ہیں، مثلاً الجاحظ : کتاب الحیوان (قاہرہ ۱۹۴۷ء)، ابن سیدہ : المخصص (اسکندریہ ۱۹۰۳ء، ج ۸ اور ایم۔ طالبی کے تیار کردہ اشاریات، تونس، ۱۹۵۶ء)، القلقشندی : صبح الاعشی (قاہرہ ۱۹۱۳ء، ج ۲) اور المسعودی : مروج الذہب۔

المغرب، مسلم ہسپانیہ اور علی ہذا بلادِ مشرق میں شکاری پرندوں سے شکار کھیلنے کے شائقین موجود تھے۔ اغلبی افریقیہ میں محمد ثانی (۸۶۴ تا ۸۷۵ء) کو ابوالغرانیق [واحد غرنوق = سارس یا کلنگ] بلا وجہ نہیں کہتے تھے۔ فی الواقع پرندوں سے شکار کھیلنے (لعب) کے اس شوق میں اس نے بے دریغ روپیہ خرچ کر کے سرکاری خزانہ خالی کر دیا تھا (دیکھیے ابن عذاری : البیان، ترجمہ Fagnan، الجزائر ۱۹۰۱ء، ص ۱۴۷ تا ۱۴۸)۔ بعد میں بنو حفص بھی شاہین بازی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ساسانی بادشاہوں کی طرح المستنصر (۱۲۴۹ تا ۱۲۷۷ء) بنزرت [رک بآں] کے قریب ایک وسیع شکارگاہ (مصید) میں ہاتھ پر شکرا لیے چلنے میں خوش ہوتا تھا (دیکھیے ابن خلدون : کتاب العبر، ترجمہ De Slane و Casanova، ۲ : ۳۳۸)۔ پندرھویں صدی میں اس کی اولاد میں عثمان (۱۴۳۵ تا ۱۴۸۸ء) ہفتے میں کئی روز اسی تفریح میں گزارا کرتا تھا (دیکھیے R. Brunschvig : *Deux récites de voyage inédits*، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۲۱۲)۔ قرطبہ کے اموی دربار میں امیر شکار (صاحب البیازرہ) فرمانروا کے مقربین میں بڑا عہدے دار ہوتا تھا (دیکھیے ابن عذاری : کتاب مذکور، در E. Levi-Provencal, X^e s.، پیرس ۱۹۳۲، ۱۹۵۵ء)۔ ازمنۂ وسطٰی میں شاہین بازی کا عام رواج ممالک اسلامی میں بہت سے لوگوں کی روزی کا ذریعہ تھا یہ رواج کسی ممتاز طبقے تک محدود نہ تھا، جیسا نہ مسیحی دنیا میں دستور تھا، بلکہ مسلمانوں میں دیہاتی آبادی اور خانہ بدوش بدوی تک برابر شکار کے گرویدہ رہے اور انھوں نے اس روایت کو بیسویں صدی عیسوی کے

آغاز تک قائم رکھا ۔ اسی حقیقت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شکاری پرندوں کا مسلمانوں کی معاشی زندگی میں کیا حصّہ تھا، خصوصاً ازمنۂ وسطٰی میں جب کہ اس کام نے ایک تجارت کی شکل اختیار کر لی، نیز اس بات سے کہ کتنے اشخاص اس کام کے اہتمام و انصرام کے لیے درکار ہوتے تھے (دیکھیے A. Ṭalas : *La vie économique aux IIème and IIIème Siècles de l' Hégire*، عربی میں درمجلّة المجمع العراقی، ۱۹۵۲ء، ۲ : ۲۷۱ تا ۳۰۱؛ الجاحظ (؟) : کتاب التبصّر بالتجارة طبع عبدالوهاب، قاهره ۱۹۳۵ء، ص ۳۴ تا ۳۵، ترجمهٔ Ch. Pellat، در *Arabica*، ۱ / ۲، ۱۹۵۴ء ص ۱۶۰ تا ۱۶۱).

واقعه یه هے که باز پالنے والی جاعت کا سردار اکثر و بیشتر اصطلاحی مفهوم میں خود شاهین‌باز نهیں هوا کرتا تها ۔ وه شکار کے دوران میں فقط دستانے (دستبان؛ المغرب : قفّاز) پهن لیا کرتا تها ۔ بازگهر (بیت الطُّیور) کی دیکھ بهال کا کام امیر شکار کے معاونین (غلام، جمع : غِلمان) کے سپرد هوتا تها، جو بازگهر کو کبوتروں اور دیگر کهانے کے پرندوں سے اچهی طرح معمور رکهنے کے علاوه بازوں اور شکروں کو سدهانے اور کهلانے پلانے کا کام انجام دیتے تهے ۔ باز فن ''بیزره'' کی عام اصطلاح هے، لیکن ان شکاری پرندوں کی مختلف قسمیں هوتی تهیں اور هر قسم کے لیے اس کے سدهانے والے کی خاص قابلیت دیکھنا پڑتی تهی؛ اسے بازیار (جمع : بیازره) کہتے تهے (بازیار کی لفظ بیاز پر ترجیح کے لیے دیکھیے ابن سعید العُکفانی : ارشاد المقاصد، ص ۹۲؛ بیّاز، بیّازی، بیاز، بازی اور بیزاری کی اصطلاحات شاهین باز کے عام مفهوم میں هسپانوی مغرب کی هیں اور اکثر اوقات شکره باز (طبّار) کے لیے صقّار کی اصطلاح ان کی جگه لے لیتی تهی) ۔ ان دونوں قسم کے استادوں کی معاونت اکثر کلابازی، یعنی شکاری کتّوں کا داروغه کیا کرتا تها، جو اپنے تازی کتّوں (سَلوقی، جمع سَلُوقیّة) کو هرن یا خرگوش پر چهوڑتا اور بڑا شاهین، گاهے گاهے جرّه (عربی صَقْر) بلکه عقاب بهی منڈلاتا رهتا، اُدهر شکاری اپنے کتّوں کو ٹهیک فاصلوں پر رکھ کے شکار پر چهوڑتا تها .

مشرق میں قابلِ تربیت شکاری پرندوں (ضَراوه یا ضَراءه) کی روایتی طبقه‌بندی کی بنیاد پردهٔ چشم کے سیاه یا زرد رنگ پر هوتی تهی، جو امتیازی قوت بصارت پر دلالت کرتا هے ۔ یه طبقه‌بندی جدید علم الطیور کے نظام سے عین مطابقت رکھتی هے ۔ واقعه یه هے که ''سیاه‌چشم'' پرند صرف طیور شکاری کی ایسی صنف هی میں پائے جاتے هیں جنکی آنکهیں ترچهی هوتی هیں اور فقط انهیں کی آنکھ کا پرده سیاه هوتا هے ۔ یه ''لمبے پروں اور سپاٹا بهرنے والے'' یا لمبی چونچ کے پرند هیں جو بلندپروازی کے عادی هوتے هیں، یعنی بگلے (بَلَشون) کی پرواز، علٰی هذا کُرکی یا غُرنیق کی، کوّوں (غربان) کی اور وقتاً فوقتاً عقاب، چیل (حداء) اور جنگلی مرغابی (طیرالماء) کی پرواز شامل هے ۔ شکاری پرندوں کی اصطلاحات کی کثرت کو دیکھ کر ایک عربی خوان عموماً پریشان هو جاتا هے، مگر اصطلاحات کی یه کثرت انواع کی بهتات کی وجه سے اتنی نهیں هے جتنی اسماے صفت کی بهت زیاده بوقلمونی کے باعث هے جو پرندے کے پروں کے بیشمار طرح طرح کے رنگوں کو ظاهر کرتے هیں، حالانکه یه رنگ پرند کی جنس، عمر اور مسکن کی وجه سے مختلف هوتے هیں ۔ اهل عرب نے ایک هی پرند کی مختلف انواع خیال کر لیں بحالیکه وه ایک هی خاندان کے الگ الگ پرندوں کا سوال تها اور ان میں نابخته، بچے، جوان، نر یا ماده کا بهی امتیاز نهیں کیا ۔ تاهم ان ناموں کے انبار میں، انسان دو امدادی طریقوں سے هر نوع

کے پرندوں کے اسم جنس کا پتا چلا سکتا ہے، اول تو ہر ملک کے طیور کی فہرست سے جو جدید علمی تحقیقات سے مرتب کی گئی ہیں اور دوسری طرف ان تشریحات کی مدد سے جنھیں بڑے بڑے مسلم علمائے طبیعیات نے فراہم کر دیا ہے، مثلاً القزوینی (۱۲۰۳ تا ۱۲۸۳ء) نے اپنی کتاب عجائب المخلوقات میں، الدمیری (۱۳۴۱ تا ۱۴۰۵ء) نے کتاب حیات الحیوان میں، اور خصوصاً ان مصنفین نے جنھوں نے شکار کھیلنے کے فن پر کتابیں لکھی ہیں (دیکھیے نیچے).

چنانچہ صقار ان بازوں کے سدھانے والے کو کہتے تھے جو فقط (الف) ''روسی باز'' (Ger-Falcon) (سنقور، شنقور، شنقار) کو سدھاتے تھے۔ یہ قسم بلاد عرب میں ناپید تھی اور بہت خرچ کر کے سائبیریا سے درآمد کرنا پڑتی تھی۔ اور سفیروں کے تبادلے کے موقع پر رسمی تحائف میں اکثر یہ بھی نمایاں ہوا کرتی تھی؛ (ب) جرہ (صقر، صقر الغزال شرق، the Saker Falcon)؛ (ج) شاہین شکاری (the Peregrine Falcon)، جس کی تین ذیلی مشرقی اصناف تھیں: شہباز (Perigrinator)، عراقی باز (Babylonicus) اور سفید باز (Calidus) (موسمی باز کے لیے شاہین یا بھری)؛ (د) سیاہ پروں کی چیل (Elanus Caeruleus زرق، صقر ابیض اور فارسی میں کودی)؛ (ہ) باشق (the Merlin یویو، جلم)؛ (و) کونج (the Hobby)؛ (ز) عاسوق (the Kestrel)؛ (ح) عویسق (Lesser Kestrel)؛ (ط) لذیق یا سرخ پا باز (دیکھیے امین معلوف: معجم الحیوان، قاہرہ ۱۹۳۲ء، لیکن ایسے علمی مواد میں جو عموماً قدامت کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے، بے شمار اغلاط ہونے کی بنا پر اس کتاب کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے).

اسلامی مغرب میں اس قسم کی شاہین بازی میں شکاری پرندوں کے صرف چار خاندان ہی معروف تھے: صقر یا شکرا (نبلی یا لبلی، اندلسی شہر لبلہ Niebla سے منسوب، جو دخیل لفظ ہونے کی غمازی کرتا ہے)؛ برنی (the Barbary Lanner Falcon)، جو مسیحی بازیاروں کے ہاں Alphanet کہلاتا تھا؛ ترکلی (the barbary Falcon) اور بحری (Falcon eleonorae)؛ دیکھیے (۱) Leo Africanus: *Il Viaggio*، وینس ۱۸۳۷ء، ص ۱٦٦؛ (۲) L. Mercier: *La chasse et les sports chez les Arabs*، پیرس ۱۹۲۷ء باب پنجم: *La Fauconnierie*، ص ۸۱ تا ۱۰٦ و مآخذ؛ (۳) E. Daumas: *Les chevaux du Sahara*، پیرس ۱۸۵۳ء، مع *Réflexions de l'Emir Abdelkader*، ص ۳۰۹ تا ۳۲۷۔ مذکورۂ بالا چار قسم کے باز المغرب میں ''حر'' (یعنی شریف النسل) بتائے گئے ہیں۔ رہے زردچشم طیور جو صرف بازیار ہی تیار کر سکتے ہیں تو ان کی قسم شکار میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ وہ سبھی ''بلند پرواز کوتاہ پر'' یا ''ہاتھ کے شکرے'' (fist-hawks) ہوتے ہیں، جنھیں ''نیچی پرواز'' کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ نوع زیادہ‌تر شکرے (accipiter) کی اقسام پر مشتمل ہوتی ہے اور ایران و ترکی کے بعض حصوں میں شاہین خرد (smaller "aquilidae") کو بھی اسی نوع میں شمار کرتے ہیں۔

جرہ (بڑا باز) ہی بلاشبہہ ایک ایسا پرند ہے جو مشرق کے ہر ملک میں عہد قدیم سے سب سے بڑھ کر مقبول رہا ہے۔ اس کی ذیلی انواع میں باز یا شہباز ہیں۔ یہ بلاد عرب کے طیور سے رشتہ نہیں رکھتی تھیں، لہٰذا انھیں سوداگر یونان، ترکستان، ایران اور ہندوستان سے درآمد کیا کرتے تھے۔ اسلامی مغرب انھیں بہت ہی کم جانتا تھا۔ اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ باز (جرہ) پیدا ہی فن پرواز کے لیے ہوا تھا۔ اس کا

فارسی نام ''باز'' اسلام سے پہلے عربی میں آ چکا تھا اور اس کا اطلاق، بظاہر لاعلمی کے باعث، ہر شکاری پرند پر ہوتا تھا۔ اور ''بیزرۃ'' کی اصطلاح، جس کے معنی ماہرین کے نزدیک شاہین سدھانے کا فن تھے، اسے عام طور پر شکار کھیلنا مراد لیتے تھے۔ اس کے برخلاف یورپ میں شاہین (Falcon) کو (باز اور) جرے پر فوقیت حاصل تھی لہٰذا وہاں اسے سدھانے کا سارا فن Falconry (بازیاری) کی اصطلاح کے اندر آ جاتا تھا۔ باز کی تعریب کے لیے اس کا ثلاثی (سہ حرفی) مادہ نکالنا ضروری ہوا تو علمائے لسانیات اور لغت‌نویسوں کو خاصی دقت پیش آئی۔ اس کے لیے تین متبادل صورتیں تجویز کی گئیں: (الف) ب ز و۔ ب ز ے، ان سے بروے اشتقاق بازٍ، البازی، بازیّ اور جمع بُزاۃ، بوازٍ، البوازی اور بُزْوان؛ (ب) ب و ز۔ ب ے ز۔ اس کے مشتقات بنے: بازٌ، جمع أبْواز، بِیزان؛ (ج) ب ء ز۔ سے بأزٌ جمع بئْزات، أبْؤُز، بؤُوز، بئْزان، بؤُز، بُئُز۔ باز کے بعد ''باشَق'' ''عُلام'' ''طُوط'' (Sparrow-hawk) Nisus Accipiter چڑی‌مار) تھا اور اس کی چھوٹے پاؤں والی ذیلی قسم جسے ''شِکرا'' (''بَیْدَق'') Accip. badius brevipes کہتے ہیں، جسے اس کی تربیت‌پذیری اور وسیع رقبے میں ہر جگہ ہونے کے باعث ترجیح دی جاتی تھی۔ اس کی مادہ ''صاف'' تونس میں کیپ‌بون کے مقام پر ابھی تک موسم بہار میں بٹیروں پر چھوڑے جانے میں استعمال ہوتی ہے (دیکھیے D.M. Mathis: *La chasse au Faucon en Tunisie*، در *Bull. Société Sc Natur. de Tunisie*، ۲: ۳ تا ۴؛ تونس ۱۹۴۹ء، ص ۱۰۷ تا ۱۱۸؛ اور تصاویر؛ وہی مجلہ، در A. Boyer و M. Planiol: *Traité de Fauconnerie et Autourserie*، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۲۴۲ تا ۲۴۸ - L. Lavauden: *La chasse et la faune cynégétique en Tunisie*، تونس ۱۹۲۰ء، ص ۲۰ تا ۲۱؛ اللطائف، عربی میں، تونس مئی ۱۹۵۵ء، ص ۳۲ تا ۳۷، اور تصاویر)۔

جہاں تک عقابوں کا تعلق ہے انھیں فی الواقع ''عِتاقُ الطَّیْر'' (شکاری پرند) کا درجہ نصیب نہیں ہوا۔ تاہم ایرانی اور ترک ''طُغْرُل'' (Spizaetus cirhatus=Crested Hawk Eagle) اور زُمّاج کو (جو Hieractus fasciatus=Bonelli's Eagle اور H. Pennatus = Booted Eagle دونوں کے لیے آتا ہے) سدھانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ''مُرزاۃ'' (Harriers مارخور شکرہ) اور ''سقّاوا'' (Buzzards چھوٹا عقاب) اپنی ناقابل تربیت تندی کے سبب نظرانداز کر دیے گئے تھے۔ اسی طرح ''نَسْر'' (چیل اور گدھ) کو بھی ان کے ذوق مردار خوری کے باعث نہیں سدھاتے تھے۔ ایرانی فن تربیت کو ''بُوھہ'' (Eagle owl بڑا اُلّو) تک لے جا چکے تھے جو دوسرے شکاری پرندوں کو لگا لانے کا کام کرتا تھا۔ تمام ''زردچشم پرند''، ''سُمانی''، ''سَلْوٰی'' (= بٹیر)، ''حَجَل'' (= تیتر)، ''قَبج'' (= چکور) اور ''طَیہوج'' (= تیہو)، ''قطا'' (= سنگخوار)، ''حُباری'' (= تغدار)، عَنقُود'' (Ruddy Shieldrake مصری ھنس) اور دیگر میدانی اور صحرائی طیور کو مار لانے کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔

بیزرہ کی مناسب حال فنی تدابیر پر مسلمانوں کے ابتدائی دور میں متعدّد رسائل تصنیف ہوئے، مگر ان میں سے اکثر اب موجود نہیں ہیں۔ ابن الندیم فہرست میں ایسے دس رسالوں کا ذکر کرتا ہے۔ دوسری طرف مخطوطات کی ایک بڑی تعداد کا، جو یورپ اور مشرق کے ذاتی اور عوامی کتاب‌خانوں میں ہے، ابھی تک مطالعہ نہیں ہوا (قب براکلمان ابواب، بعنوان "Naturwissenschaft" و "Jagged")۔ بایں ہمہ وہ فنی تدابیر، ان کئی ایک تصانیف کے طفیل جن کی پہلے ہی تصحیح اور طباعت

ہو چکی ہے، ہمیں نسبۃً بخوبی معلوم ہو چکی ہیں ۔ ان میں سے قدیم‌ترین کتب کے اصل متن، جو بازیاری پر بحث کرتے ہیں، عجب نہیں کہ روم کے ان لاطینی (مترجمہ) نسخوں کی بنیاد ہوں جن کی ابھی تک شناخت نہیں ہو سکی، لیکن جنھیں Moamin اور Ghatrif سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ (دیکھیے ان کتابوں کی تصحیح کردہ بہترین ناقدانہ طباعت از تجرنیلڈ H. Tjerneld، سٹاک ہام و پیرس ۱۹۴۵ء) ۔ کچھ عرصہ ہوا کہ کرد علی شامی کو ''البیزرۃ'' نام کا ایک رسالہ شائع کرنے کا پسندیدہ خیال آیا (دمشق ۱۹۵۳ء) جو خاص فاطمی خلیفہ العزیز باللہ (۹۷۵ تا ۹۹۶ء) کی شاہین‌بازی کے حالات پر لکھا گیا تھا ۔ اس کا نامعلوم مصنّف بازیاری میں اپنے طویل تجربے، نیز ماہرینِ فنِ بیزرہ (لُعاب) کے تجربات کے مواد کو ہمارے سامنے اس انداز سے پیش کرتا ہے جو غیر متعلق عبارت آرائی سے معرّا ہے ۔ اشعار کی نظیریں بھی صرف ایک خاص باب میں جمع کر دی گئی ہیں ۔ یہ کتاب ان تمام کتب میں سب سے زیادہ قابل قدر ہے جو عربی میں [پرندوں کو] سدھانے کے طریقوں پر اب تک ہمیں دستیاب ہوئیں ۔ اس کتاب کی اشاعت ہی کے قریبی زمانے میں اَسْعَد طلَس نے عربی کی قدیم‌ترین معلومہ کتاب المصاید و المطارد، جو مشہور شاعر الکُشاجِم (م ۹۶۱ء یا ۹۷۱ء) کی تصنیف ہے تصحیح کر کے شائع کی (بغداد ۱۹۵۴ء) (قب براکلمان، ۱ : ۸۵ و تکملہ، ۱ : ۱۳۷؛ طلَس، در مجلّۃ [المجمع العلمی العراقی ۲ : ۲۸۸] ...، و مقدمہ کتاب المصاید، تحلیل و تجزیۂ کتاب) ۔ شکار اور بازیاری پر یہ جامع رسالہ ان مآخذ میں ہے جن سے صیدافگنی کی کتب کے متأخر مصنفین نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ۔ بدقسمتی سے اس کتاب میں ''ادب'' کے ساتھ حد سے زیادہ توغّل مترشّح ہے، جس نے اسے عملی اہمیت سے محروم کر دیا ہے ۔ بخلاف اس کے اُسامہ بن مُنْقِذ (م ۱۱۸۸ء) کی کتاب الاعتبار (طبع فلپ حتّی، پرنسٹن ۱۹۳۰ء، باب سوم، ص ۱۹۲ تا ۲۲۹) میں ''بازیاری کی بادیس'' ہیں، جو کہیں زیادہ شگفتہ اور مفید ہیں ۔ یہ کتاب صلیبی جنگوں کے زمانے میں تالیف ہوئی تھی (دیکھیے Derenbourg : *Vie d'Ousa'ma*، . . . اور متونِ پیرس ۱۸۸۵ اور ۱۸۹۳ء) ۔ مملوک محمد [بن] مِنگلی کی کتاب اُنس الملأ بوحش الفلا ۱۳۷۱ء میں لکھی گئی (قب براکلمان، ۲ : ۱۳۶ و تکملۃ، ۲ : ۱۶۷) اور Florian Pharaon کے معمولی درجے کے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی (پیرس ۱۸۸۰ء)، لیکن جب سے کشاجم کا رسالہ دستیاب ہوا ہے اس کی زیادہ قدر و قیمت باقی نہیں رہی ۔ اس کے علاوہ ''بیزرۃ'' کا پند آمیز نظموں میں بھی ذکر آتا ہے، مثلاً المغربی الفجیجی (م ۱۵۱۳ء) کے ۲۱۳ اشعار کے قصیدے میں (براکلمان، ۲ : ۳۶۶)، اور عیسَی الأزْدِی (دسویں صدی عیسوی؟) نامی ایک شخص کی الجمہرۃ فی البیزرۃ (مخطوطۂ اسکوریال، شمارہ ۹۰۳) میں جس کا منگلی اکثر حوالہ دیتا ہے ۔ یہ نظمیں اس قابل ہیں کہ انھیں شائع کر دیا جائے، اگرچہ L. Mercier پہلے ہی ان سے فائدہ اٹھا چکا ہے (کتاب مذکور) ؛ مزید برآن اس نے الفاکہی (م ۱۵۴۱ء) اور الاشعری (۱۴۴۴ء) کے مخطوطات بھی استعمال کیے ہیں (مخطوطات پیرس، بی۔ این شمارہ ۲۸۳۱ اور ۲۸۳۳) ۔ طلَس (مجلّۃ) نے اصل متن مذکور کے ساتھ پرندوں سے شکار کھیلنے کے موضوع پر ابن نُباتہ (۱۲۸۷۔۱۳۶۶ء) کا نفیس اُرجوزہ) بعنوان فرائد السلوک فی مصاید المُلوک بھی شامل کر دیا ہے ۔

ان سب عربی متنوں کے پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر نوع کے شکاری پرندوں کو

پھانسنے اور سدھانے کے تقریباً ایک ھی جیسے طریقے تھے - باز کے بچے کو اس کے گھونسلے سے ایسی حالت میں پکڑتے جب وہ بے بال و پر یا کچی چونچ کا (غِطْراف یا غِطْریف) ھوتا، یا گھونسلا چھوڑ کر شاخ پر بیٹھنے والا (ناھِض) ھوتا - سرخ باز (فَرْخ) یا وحشی (haggard نوگرفتار شکرہ)، بلدی (= مقامی) یا قاطع یا راجع (= موسمی پردیسی) ھوتا تو اسے لاسے یا پھندوں والے جال کے ذریعے اور زیادہ تر ''بارَ ک'' (شکار پھانسنے والی چڑیا) کے ذریعے پکڑتے تھے (قب ابن مُنقذ : کتاب مذکور میں جھونپڑی کا طریقہ، ص ۲۰۰ تا ۲۰۱ - M. Planiol : کتاب مذکور، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶) - جب اسے پکڑ لیا جاتا تو اسے سدھایا جاتا (تَعْبیر - تَہْدِی) اس کے پپوٹوں کو سی دیا جاتا (خَیط) اور اسے بھوکا رکھ کر (: تجویع، تنقیص)، دھیما کیا جاتا، گھٹایا جاتا اور پھر بتدریج اس کے پپوٹوں کو کھولا جاتا اور اسے ترغیب دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی سے کلائی پر آ جائے - یہ ترغیب اسے ''تلقیم'' (لقمے دے کر) اور ''تلقیف'' (زندہ شکار کے گوشت) کا لالچ دے کر دی جاتی تھی - جب وہ رام ھو جاتا اور بلانے پر مٹھی یا کلائی پر بیٹھنے لگتا تو اسے ڈوری (طِوالۃ) میں باندھ دیا جاتا اور پھر اس کے مختلف قسم کے شکار پر جھپٹنے کی تربیت کا آغاز ھوتا - اس کے سامنے سدھانے کے پرند (تَسبِرۃ) چھوڑنے سے اس کی جبلّت گوشت‌خوری اور لپکنے کا شوق (فَراھۃ) ترقی کر جاتا تھا - یہ ترغیبی پرند ان انواع سے منتخب کیے جاتے تھے جن کے شکار کے لیے انھیں سدھایا جاتا تھا - ان مشقوں [illegible] کے ساتھ اور ھر دفعہ دور‌تر فاصلے سے برابر دھراتے رھتے تھے - جب وہ شکار کے پیچھے چھوڑنے کے قابل (مستولی‌الارسال) ھو جاتا تو پھر اس ''شاگرد'' کے پاؤں میں تسمے (سِاقان) اور گھنگرو (اَجراس ''خَلخال'') ڈال دیے جاتے - اور وہ اپنے سر پر چمڑے کی ٹوپی (بُرقُع، کُمّہ؛ مغرب میں: کَنبیل) اور ''شکاری پوشش'' (= قباء) پہننے کا عادی ھو جاتا تھا اور بازاروں اور منڈیوں کی بھیڑ بھاڑ میں گھنٹوں تک لیے پھرنے سے اسے انسانوں سے قدرے انس ھو جاتا تھا - جب وہ ایک بار آدمیوں، گھوڑوں، کتوں، اور پالتو جانوروں سے مانوس ھو جاتا تو اسے شکار گاھوں میں لے جاتے اور پوری آزادی دے کر مرغابیوں اور چڑیوں پر چھوڑتے تھے - وہ ڈھول کی آواز پر جو شکاری کی زین سے منسلک ھوتا لوٹ کر آ جاتا (دیکھیے L. Mercier : کتاب مذکور، ص ۹۸) اور اسے اپنے شکاروں میں سے کسی ایک سے لطف‌اندوز ھونے کی اجازت دے دی جاتی تھی.

اسلامی مغرب میں تربیت نفاست کے اس درجے تک نہیں دی جاتی تھی بلکہ یہاں پرندے کو ھمیشہ اس کی جوانی میں پکڑا جاتا اور تھوڑی سی ضروری تربیت دے کر جاڑوں میں شکار پر چھوڑا جاتا تھا (قب L. Mercier : کتاب مذکور، ص ۹۶ تا ۱۰۳) - باز کے سستانے کی خاطر اسے لکڑی کے کنڈے (حَمُولۃ، قُفّاز) یا چھتری (عارِضۃ، کَندرۃ) پر بٹھا دیا جاتا اور اس کے نہانے کی کنڈالی کے قریب اسے دھوپ (تشریق) بھی دی جاتی تھی - اس کے کریز کرنے (قرنصہ، تکریز) کے زمانے میں اسے ھر آواز سے دور رکھا جاتا تھا اور اس کے چرانے (ذَرق، رَمج) کی نگرانی رکھی جاتی تھی - اس طرح اسے پورا تندرست رکھنے کا اطمینان کیا جاتا تھا - بیزرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ھیں ان میں طویل باب شکاری پرندوں سے مخصوص امراض کی تشخیص اور ان کے علاج کے لیے وقف ھیں اور ان میں اکثر ٹوٹکے اور وحشیانہ قسم کی ہدایتوں کے ساتھ حفظانِ صحت کے متعلق توھمات

بھی شامل ہیں.

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ آیا قرآن مجید کی رو سے ایک سدھائے ہوئے شکاری پرند (باز، شکرہ) کے ذریعے پکڑے ہوئے شکار کا کھانا حلال ہے یا نہیں؟ سوال یہ تھا کہ پرندے کو شریعت کے مطابق ذبح کرنا واجب ہے یا نہیں؟ - ابن رشد: بدایة المجتہد . . . (قب ابن رشد: *Le livre de la chasse*، بدایة کا اقتباس، ترجمہ اور متن مع حواشی از F. Viré در *Revue* Tunisienne *de Droit*، شمارہ ۳ تا ۴، تونس ۱۹۵۴ء، ص ۲۲۸ تا ۲۵۹) فقہ کے چاروں مذاہب میں سے ہر ایک نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کا واضح حال بیان کرتا ہے - بازیاری اور شکار پر جتنی بھی کتب ہیں ان میں یہی مسئلہ مقدمۂ کتاب کی صورت میں ہوا کرتا ہے.

دوسری طرف نظر کیجیے تو بیزرہ شعر گوئی کا خاص محرک بن گیا اور بنو امیہ کے عہد سے شکار پکڑنے کے شوق کے ساتھ مقبول عام رجز کی نظموں کے بڑے بڑے موضوعات میں سے ایک موضوع ہو گیا - در اصل "اُرجوزہ" جو رسمی قسم کے معیاری قصیدے سے زیادہ سلیس و شگفتہ صنف تھی، اس نے الشمّاخ (م ۲۲ھ / ۶۴۲ - ۶۴۳ء)، العجّاج (م ۸۹ھ / ۷۰۷ - ۷۰۸ء)، اس کے بیٹے رُؤبة (م ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء) اور بعض شاعروں کے ہاں تھوڑے ہی دن میں "طردیّة" (یعنی صیدافگنی کی شاعری) کی مخصوص صورت اختیار کر لی - مؤخر الذکر کو، جو بنو عباس کے عہد میں نہایت مقبول و مروج تھی، شاعری کے بڑے بڑے استادوں، ابو نواس، ابن المعتز، کشاجم، اور النّاشی نے اپنے غریب الفاظ ڈھونڈ کر لانے اور اس طرح اپنی مہارت دکھانے کا موقع فراہم کر دیا (Ch. Pellat: *Langue et Litterature Arabes*، پیرس ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹) ("طردیّات" پر دیکھیے وہی مصنف: *Le milieu basrien*، ص ۱۶۰ ببعد و حواشی - ("طردیّات" (شکارنامے) شعرا کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں؛ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں بیشتر ابو نواس کے طردیات کے شعر نقل کیے ہیں) - یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ علمیّت کی اس نمائش نے ان لوگوں کو جو اس کے شائق تھے ایسی زبان اختیار کرنے پر مائل کر دیا جو خود شائقین شکار کی زبان سے بہت ہی کم ملتی تھی - ہسپانیہ کے مسلم دور حکومت میں شاعر خصوصاً گیارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد زیادہ‌تر بازیاری کے موضوع سے خوب خوب کام لیتے رہے، کیونکہ ایسی چیز ان کی قطعی فطرت‌پرست نگاہ سے نہ بچ سکتی تھی - وہ اس میں ایسا جذباتی رنگ بھرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جس سے مشرقی شعرا آشنا نہ تھے (قب H. Pérès: *Poésie Andalouse*، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۳۴۶ تا ۳۴۹) - عالمانہ زبان میں ان تخلیقات کے علاوہ بڑے بڑے عرب بدویوں کی بازیاری پر ایک طولانی اور محفوظ شاعری عظیم بدوی گروہوں کی خود اپنی مقامی بولیوں میں تھی - اس ضمن میں یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قبائل طوارق (Touaregs) بازیاری کے فن سے کبھی آشنا نہیں ہوئے (قب H. Lhote: *La chasse chez les Touaregs*، پیرس ۱۹۵۱ء) - شعرا کے کلام کو منتخب کرنے والے عرب علما "گنواری" بولی کو حقیر سمجھتے تھے، اس بات نے ان بدوی "گیتوں" سے ہمیں محروم کر دیا جن کی بالکل قریبی زمانے تک صحرا کے دور دراز علاقوں میں بڑی توقیر ہوتی تھی - ان میں شکرے کی پرواز اور اس کے شکار کی کیفیت ایسی حقیقت پسندی سے بیان کی گئی ہے کہ اساتذہ کے معیاری کلام میں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے (قب

Chants sur la chasse au faucon attribués : M. Sidoun áşi El-Hadj Aissa, Chérif de Laghouat، در R. Afr.، شمارہ ۷۲ تا ۷۲۱، ۱۹۰۸ء، ص ۲۷۲ تا ۲۹۳ متن، تراجم اور حواشی).

شکاری پرندے نے مسلمانوں کے فنون جمیلہ میں اثرآفرین موضوع کی حیثیت سے جو بڑا کردار ادا کیا ہے .... ۔ فی‌الواقع اظہار کے ان فنکارانہ طریقوں میں، جیسے مرقع کشی، پتھر، گچ، لکڑی اور ہاتھی دانت کے نقش و نگار، بلور اور تانبے میں کندہ‌کاری، کانسی، شیشے اور قیمتی دھاتوں میں آرائشی حاشیے، کوزہ‌گری، غالیچہ‌بافی، زربافی، یہ سب اپنے بیش‌بہا کارناموں میں بہت کچھ شاہین کے موضوع کے مرہون منت ہیں ۔ بلاشبہ اسی موضوع اور اس کی بےشمار تعبیرات ہی سے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کے فنون نے اپنی بہت سی خصوصیات حاصل کی ہیں (قب A. U. Pope : A survey of Persian Art، اوکسفرڈ ۱۹۳۹ء؛ G. Migeon : L' Art Musulman، پیرس ۱۹۰۶ء؛ G. Marçais : L' Art de l' Islam، پیرس ۱۹۴۶ء) ۔ آخر میں ہم اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ اسی موضوع سے بعد میں مملوک سلاطین کی توقیعات اور شاہی نشانات میں نہایت کثیر پیمانے پر فائدہ اٹھایا گیا ہے (قب L.A. Mayer : Saracenic Heraldry، اوکسفرڈ ۱۹۳۲ء؛ Artin Pacha : Cont. a l'étud du blason en Orient، لنڈن ۱۹۰۲ء).

مآخذ : متن میں دیے ہوے حوالوں کے علاوہ (۱) D. C. Phillott : The Bāz Nāma-i-Nāṣiri, A Persian Treatise on falconry، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۲) L. Mercier : La Parure des Cavaliers et l'Insigne des Preux، ابن هذیل الاندلسی کی کتاب حلیة الفرسان کا فرانسیسی ترجمه پیرس ۱۹۲۴ء ص ۶۱ ۔ ۴۰ و مآخذ؛ (۳) ز - ایم - حسن : Hunting as practised in Arab countries of the Middle Ages، گورنمنٹ پریس، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ (۴) R.F.E. : La chasse au faucon dans les Hauts du Constantinois، در Rev. "TAM"، ص ۳۰، الجزائر ۱۹۳۸ء؛ (۵) G. Dementieff : La Fauconnerie en Russie, Esquisse historique، در L'Oiseau اور Rev. Française d'Ornithologie، ج ۵، ۱۹۳۵ء، ص ۹ تا ۳۹.

(F. Viré)

* **بیزستان** : رک به قیصریه.

* **بیزور** : رک به بازهر.

* **بیزیٹا** : رک به ددو (Didò).

* **بیسان** : دریاے اردن کی وادی میں ایک چھوٹا سا فلسطینی قصبہ جو جھیل طبریہ کے جنوب میں اٹھارہ میل (تیس کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے ۔ یہ سطح سمندر سے اٹھانوے میٹر کی بلندی پر ایک مسطح مقام پر واقع ہے اور اس نشیبی زمین سے ۱۲۰ میٹر اونچا ہے جس میں ہو کر کچھ فاصلے پر دریاے اردن گزرتا ہے ۔ اس طرح یہ منطقۂ حارہ کی اس شدید گرمی سے محفوظ ہو گیا ہے جس کا شکار غور (رک بآں) کے علاقے کا ہر مقام ہے ۔ اس کے باوجود اس کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے جس کا ذکر عرب جغرافیہ‌دان ہمیشہ برائی کے ساتھ کرتے رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ یہاں کے خراب پانی کا ذکر بھی تلخی کے ساتھ کرتے ہیں (تاہم انھوں نے عین الفلوس نامی اس کنویں کا ذکر بھی کیا ہے جس کے متعلق عام طور سے یہ مشہور ہے کہ وہ بہشت کے چار چشموں میں سے ایک ہے) ۔ پہلے زمانے میں آب‌پاشی کی مدد سے دھان کی کاشت ہوتی تھی جو المقدسی کے عہد میں ملک کی ایک دولت سمجھی جاتی تھی ۔ رہے وہ نخلستان جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے تو جغرافیہ‌دان یاقوت کو ساتویں

صدی هجری / تیرھویں صدی عیسوی میں وھاں صرف دو کھجور کے درخت نظر آئے تھے ۔ ان سب باتوں کے باوجود بیسان کی خوش‌قسمتی یہ ہے کہ وہ آمد و رفت کی اس خاص آبی شاھراہ پر جو دمشق اور اندرون شام کو گیلیلی Galilee سے، اور پھر مصر اور ساحل روم سے ملاتی ھے، ایک شاندار تجارتی اور فوجی اھمیت کے مقام پر واقع ھے اور اس لیے بے شمار تاریخی انقلابات کے باوجود اس کی شہری حیثیت آج تک محفوظ ھے۔

تلّ الحُصن کی کھدائیوں سے جو دھات کی سطح تک پہنچ گئی ھیں یہ بات ثابت ھو چکی ھے کہ یہ شہر تین ھزار سال پہلے بھی موجود تھا ۔ ھمیں اب اس بات کا بھی علم ھے کہ بت شان (Bethšan) یا بت شعان (Bethše'an) میں مصریوں کے مفاد موجود تھے اور اس کا نام انھوں نے بدل کر ب ت ش ء ر رکھ دیا تھا اور جو Megiddo کے میدانوں میں Thutmoses سوم کی فتح کے بعد تین صدی تک ان کے قبضے میں رھا، چنانچہ ان کے اس قبضے کے متعدد آثار باقی ھیں ۔ اس کے بعد یہ اھم گاؤں جس پر فلسطینی، اسرائیلی اور مدائنی سب کی للچائی ھوئی نظریں پڑتی تھیں اورجو ایک زمانے میں [حضرت] سلیمانؑ کی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور ھمیشہ یہودیت کا دشمن رھا ۔ یونانیوں اور رومیوں کے زمانوں میں سکائی تھوپولس Scythopolis کے نام سے ڈکاپولس Decapolis کے اھم‌ترین شہروں میں شمار ھونے لگا ۔ یونانیت وھاں خوب پھولی پھلی اور آگے چل کر عیسائیت نے یہاں جو فتح حاصل کی وہ متعدد کلیسا اور خانقاھیں بن جانے سے مسلّم ھو گئی ۔ اس کا اسقف فلسطین ثانیہ کا اسقف اعظم تھا اور انبیاے کرام اور اولیاء اللہ کی سوانح عمریوں کا معروف مصنف سکائیتھوپولس کا باشندہ سِرل Cyril اسی جگہ پیدا ھوا تھا۔

اوّلین عرب حملوں کا رخ اسی طرف تھا، چنانچہ ۱۳ھ / ۶۳۴ء میں حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر نے جب ایک بوزنطی فوج پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا تو شہر کو اس کا پرانا دیسی نام مل گیا اور اس نے آھستہ آھستہ بیسان کی صورت اختیار کر لی ۔ ۱۵ھ / ۶۳۶ء میں جب حضرت شُرَحْبِیلؓ بن حَسَنَة نے اردن کے علاقے کو فتح کیا تھا تو اس شہر پر یقیناً قبضہ ھو چکا تھا اور اسے حضرت ابو عُبَیْدَۃؓ بن جرّاح، جن کا مزار بعض مصنّفین کے بیان کے مطابق یہیں واقع ھے یقیناً دیکھ چکے تھے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ جُند الأُرْدُن کے اضلاع میں سے ایک ضلعے کا انتظامی مرکز ھونے کی وجہ سے باغوں سے گھرا ھوا یہ شہر بڑے سکون اور اطمینان سے ترقی کرتا رھا، یہاں تک کہ پہلی صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے اس پر حملہ کیا اور جب Tancred نے ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا تو اسے بیت‌المقدس کی لاطینی سلطنت سے ملحق کر دیا گیا ۔ انھوں نے بیسان کی نوابی جاگیرداری (barony) تو قائم کر دی، لیکن اسقفی حکومت کو ناصرہ (Nazareth) منتقل کر دیا ۔ اس کی تاریخ اسی طرح برابر پرآشوب رھی ۔ جب صلاح الدین نے ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں اسے دوبارہ فتح کیا تو مسلمانوں کے حملوں کا بھی خاتمہ ھو گیا ۔ بعد ازاں پانچویں صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے اس پر پھر یلغار کی اور ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں اسے تاخت و تاراج کر دیا ۔ اسے مغولوں کے حملے سے بھی کاری ضرب لگی جنھیں ۶۵۸ھ / ۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ء میں اس قصبے کے قریب عین جالوت (رکَ باں) کے مقام پر شکست ھوئی، لیکن آگے چل کر مملوکوں کے عہد میں یہ شہر صوبۂ دمشق کے دوسرے جنوبی سرحدی ضلع میں ایک ''ولایة'' کا دارالحکومت بن گیا ۔ اسی

عہد میں اس کے بالکل قرب و جوار میں موجودہ ریلوے لائن کے راستے پر سلار کی کاروان سرائے تعمیر ہوئی ۔ اس سرائے کو گھوڑ سوار قاصد استعمال کیا کرتے تھے ۔ امیر وزارت ابن فضل اللہ کی کوشش سے ۷۴۱ھ / ۱۳۴۰ء میں ان قاصدوں کی گزرگاہ میں تبدیلی کی گئی.

مآخذ: (۱) F.M. Abel : Géographie de la Palestine، پیرس ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۸ء، خصوصاً ۲ : ۲۸۰ تا ۲۸۱ (رک بہ Bethšan) بحوالۂ Rowe : Beth-Shan Topography and History، ۱۹۳۰ء؛ و متعدد مقالات در Revue Biblique، خصوصاً ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۵ء کے برسوں کے درمیان؛ (۲) G. Le Strange : Palestine under the Moslems، لنڈن ۱۸۹۰ء، خصوصاً ص ۴۱۰ تا ۴۱۱؛ (۳) A. S. Marmardji : Textes géographiques، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۳۷ تا ۳۸؛ (۴) Caetani : Annali، بمدد اشاریات (۲ : ۱۲۸۹ اور ۶ : ۴۲)؛ (۵) وہی مصنف : Chronographia، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱، ۱۷۹؛ (۶) البَلاذُری: فتوح، ص ۱۱۶؛ (۷) الطّبری: بامداد اشاریہ خصوصاً ۱ : ۲۱۰۷ تا ۲۱۰۸؛ (۸) ابن الاثیر: بامداد اشاریہ؛ خصوصاً ۹ : ۳۶۱؛ (۹) Hist. Or. Cr.، بمدد اشاریات؛ (۱۰) ہروی: کتاب الزیارات، طبع Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۲۱ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۵۴)؛ (۱۱) یاقوت ۱ : ۷۸۸؛ (۱۲) البکری: معجم ما استعجم، طبع وسٹنفلٹ Wüstenfeld، ص ۱۸۸؛ (۱۳) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۴۳؛ (۱۴) R. Grousset : Hist. des Croisades، ۱۹۳۴ء، ص ۳۶، بمدد اشاریہ؛ خصوصاً ۱ : ۱۷۹ تا ۱۸۱ و ۲ : ۲۰۱ تا ۲۰۴؛ (۱۵) M. Gaudefroy-Demombynes : La Syrie à l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، خصوصاً ص ۶۴ اور ۱۷۹؛ (۱۶) J. Sauvaget : La poste aux chevaux، پیرس ۱۹۴۱ء، ص ۴۷ تا ۵۷.

(J. SOURDEL-THOMINE)

* بِیسْتُون: (عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں بہِستُون، موجودہ مقامی محاورہ میں بِیسْتُون)، بغداد سے ہمدان جانے والی شاہراہ پر کرمانشاہ سے تقریباً ۳۰ کیلومیٹر مشرق میں ایک پہاڑ ہے.

یہ نام یونانی مآخذ میں (Diodorus، ۲ : ۱۳ اور Charax کے Isidore کے ہاں) τὸ βαγίστανον ὄρος, کی شکل میں، ابتدائی اسلامی دور کے مصنّفین (مثلاً الخوارِزمی اور حمزۃ الاِصْفہانی) کے ہاں بِغْستان کے متروک نام سے اور قدیم فارسی میں باغستانہ (دیوتاؤں کا مقام) کے نام سے ملتا ہے ۔ بعد کے مسلمان مصنّفین کے ہاں اس نام کی صورت بِہِستُون (بَہِسْتُون) ہے جو موجودہ زمانے میں بِیسْتُون (بِیسُتُون) بن گیا ۔ عراق سے خراسان جانے والی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا ذکر عربی ادبیات میں بہت سی جگہ آیا ہے .

سڑک سے بہت بلندی پر دارائے اعظم کا مشہور منقّش کتبہ ہے جس پر تین زبانوں، یعنی قدیم فارسی، اکدی (Accadian) اور عِیلامی (Elamite) میں میخی خط کی (cuneiform) تحریریں ہیں ۔ نیچے کی شاہراہ کے برابر پارتھی بادشاہ گودرز (Gotarzes) کی فوجی قیامگاہ تھی، لیکن بد قسمتی سے ایک جدید فارسی کتبے کی وجہ سے یہ تحریر مٹ چکی ہے.

مسلمان بیستون کو عجائب عالم میں سے ایک سمجھتے تھے ۔ ان مصنّفوں کی کتابوں میں جنھوں نے ابو زَید بلخی کا تتبّع کیا ہے ان کتبوں کا مختصر ذکر ملتا ہے، لیکن یہ بیان محض خیالی ہے، اس لیے کہ بیستون کے مجسموں اور قریب کے طاق بستان کے مجسموں کے درمیان التباس پیدا ہو گیا ہے ۔ (خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خسرو پرویز ثانی اور اس کے گھوڑے کا مجسمہ ہے جو قُطّوس بن سِنّمار کا تراشا ہوا ہے) ۔ ابن حَوْقَلْ نے دارا اور اس کے قیدیوں کے مجسموں کی

عجیب و غریب توجیہ کی ہے اور انھیں استاد اور شاگردوں کے مجسمے بتایا ہے ۔ اکثر مسلم مصنّفوں کا خیال ہے کہ یہ مجسمے شیریں اور خسرو ثانی کے ہیں۔

دارا کا مثلث شکل کا کتبہ تمام میخی کتبات کے پڑھنے میں ممد ثابت ہوا۔

مآخذ: (۱) Le Strange، ص ۱۸۷؛ (۲) الخوارزمی (طبع Vloten)، ص ۱۱۱؛ (۳) عرب جغرافیہ نویسوں کا اختصار Schwarz : *Iran im Mittelalter*، جلد ۳، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۷۸۳ ببعد میں دیا ہے؛ (۴) قدیم فارسی کتبات کے لیے تب R. G. Kent : *Old Persian*، New Haven ۱۹۰۳ء، ص ۱۰۸؛ (۵) عکسی تصاویر کے لیے دیکھیے F. Sarre و E. Herzfeld : *Iranische Felsreliefs*، ص ۱۸۹ تا ۱۹۸، الواح ۳۳ تا ۳۵؛ [(۶) بطرس البستانی: دائرة المعارف، بذیل بہستون].

((R. N. Frye) و E. Herzfeld)

* **بیستی**: رک بہ سکّہ.

* **بیشة**: مغربی عرب میں ایک نخلستان جو اسی نام کی ایک وادی [= ندی] کے کناروں پر ۲۰ درجے شمالی عرض بلد کے متّصل شمال میں تقریباً پچیس میل تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس وادی کے سر چشمے عسیر کے خطۂ مرتفع میں اَبْہا کے مشرق میں ہیں اور یہ ندی وادی رنیة سے جا ملنے کے مقام تک جانب شمال تقریباً چارسو میل تک چلی گئی ہے جہاں سے یہ دونوں ندیاں مل کر وادی تثلیث اور وادی الدّواسر کے اندرونی علاقے کی طرف مڑ جاتی ہیں (رک بہ الدّواسر) ۔ اس کے معاون ھرجاب اور ترج علی الترتیب اور مغرب سے آتے ہیں اور نخلستان بیشہ کے جنوب میں وادی بیشہ میں آ کر گرتے ہیں، اور وادی تبالۃ (رک بہ تبالة) وادی بیشہ سے نخلستان کے عین وسط میں آ کر ملتی ہے ۔ متقدم شعرا بیشہ کا اکثر و بیشتر ذکر کرتے ہیں، لیکن گاہے گاہے بیش نام کی وادی اور بستی کے ساتھ جو تہامۃ عسیر میں ہے اسے ملتبس کر دیتے ہیں (دیکھیے A. Sprenger : *Die alte Geogr. Arabiens*، برن Bern ۱۸۷۵ء).

نخلستان بیشة اپنی کھجوروں کے لیے مشہور ہے، جنھیں جیزان تک لے جایا جاتا ہے اور گرد و نواح کے بدوی سفید اونٹوں کی ایک مشہور نسل پالتے ہیں جو اَوارِک (یعنی اراک کے پتے کھانے والے) کے نام سے معروف ہے ۔ بیشة، الطّائف اور الرِّیاض سے اَبْہا، نَجْران اور تمام جنوب مغربی عرب کو جانے والے راستوں کے مقام اتصال پر ہونے کی وجہ سے بخور، حج اور حملہ‌آوروں کے راستوں پر ایک اہم منزل ہے ۔ نِمران اور الرّوشن (یاقوت کا رَوشان؟) اس نخلستان کے بڑے قصبے ہیں، نمران اس خطّے کی اہم‌ترین منڈی اور الرّوشن میں قلعۂ بیشة واقع ہے جہاں سعودی عرب کا امیر ضلع اقامت رکھتا ہے ۔ الرّوشن، روشن آل مہدی اور روشن بنی سلول میں منقسم ہے ۔ اس کی دوسری بستیوں اور دیہات میں الدّحو، عطف الجبرة، الرّقیطا، النّقیع، الشّقیقة اور الجنینة شامل ہیں۔

یاقوت نے بیشة کے قبیلوں کی یہ فہرست مرتب کی ہے ۔ خثعم، ہلال، سواءة بن عامر بن صعصعة، سلول، عقیل، الضباب اور قریش کے بنو ہاشم ۔ آج کل شہران اور اکلب (یہ دونوں ہی خثعم کی شاخیں ہیں) کے بعض عناصر، بنی سلول اور قحطان کا غلبہ ہے۔

مآخذ: الہمدانی اور یاقوت کے علاوہ: (۱) فؤاد حمزة: فی بلاد عسیر، قاہرة ۱۹۵۱ء؛ (۲) محمّد بن بلیہد: صحیح الأخبار، قاہرة ۱۳۷۰ - ۱۳۷۳ھ؛ (۳) عمر رضا کحّالة: جغرافیة شبہ جزیرة العرب، دمشق ۱۳۶۳ھ؛ (۴) برطانوی امارت بحری: *A Handbook of Arabia*، لندن ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء؛ (۵) H. Philby : *Arabian Highlands*،

Ithaca، نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۶) M. Tamisier: *Voyage en Arabie*، پیرس ۱۸۴۰ء؛ [(۷) Sprenger: *Die alte Geographie Arabiens*، ص ۳۷؛ (۸) Ritter: *Erdkunde*، جلد ۱۲، ص ۲۰۲، ۳۴۹ ببعد؛ (۹) حافظ وهبه: جزیرة العرب فی القرن العشرین، ص ۳۴ تا ۴۴].

(W.E. MULLIGAN)

• **بیشرع**: (فارسی)، ایک اصطلاح جو کم‌تر مستعمل ہے، اور وہ بھی زیادہ تر تضحیک آمیز مفہوم کے لیے۔ یہ فارسی کے منفی سابقے ''بی'' (بمعنی بغیر) اور عربی کے لفظِ شرع، (اسلامی شرعی قانون) سے مرکب ہے۔ یہ اصطلاح خصوصیت سے ان صوفیہ کے لیے مستعمل ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ احکام شرعی ان کے لیے نہیں ہیں جنھیں تصوّف کے ذریعے نور معرفت حاصل ہو چکا ہو (یعنی آزاد قلندروں کے لیے)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک حد تک عوامی بول چال کی اصطلاح اصل میں صوفی فرقۂ مَلامتیہ کے ان پیرووں پر دلالت کرتی تھی جو اپنی عبادت کے طریقے خفیہ رکھتے اور شرعی رسوم کے ترک کرنے کے عادی تھے۔ یہ اصطلاح تصوّف کی فنی مصطلحات میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

(سعید نفیسی)

• **بیشہر**: (بے شہری)، [= بکشهری (قاموس الاعلام)] آج کل ایک قضا کا صدر مقام ہے۔ یہ صوبہ قونیہ میں اسی نام کی ایک جھیل کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ قدیم لوگوں میں یہ کَرالیس کے نام سے مشہور تھی (ایک گاؤں قیرایلی کہلاتا ہے، جو آج کل بھی اس کے شمال مشرقی ساحل کے متصل پایا جاتا ہے)۔ قدیم زمانے میں شہر کرالیا، جو پام‌فیلیا Pamphylia کے علاقے میں تھا، وہ بھی اسی جھیل کے قریب واقع تھا۔ خود بیشہر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ سلجوقی سلطان روم علاء الدین اول (۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء) کے زمانے میں اس کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب ترک ۱۳۰۰ء کے آس پاس ایشیاے کوچک کے مغربی حصے پر چھا گئے تھے۔ اس وقت بیشہر، حمید کے بیگون کے قبضے میں آ گیا جنھیں مختلف موقعوں پر قراماں Karāmān کے همسایه بیگون کے مقابلے میں اس کی مدافعت کرنی پڑتی تھی۔ عثمانی سلطان مراد اوّل نے ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں بیشہر اور بعض دیگر شہر دولت حمیدیہ کے بیگ کمال الدین حسین سے خرید لیے۔ جنگ انقرہ (۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء) کے بعد بیشہر قراماں کے زیر اقتدار آ گیا۔

سلطان محمد (۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) کے زمانے میں بیشہر عثمانیوں نے دوبارہ لے لیا، لیکن اس شہر پر ان کا قطعی قبضہ ۸۴۷ھ/۱۴۴۳ء سے پہلے نہیں ہوا۔ آج کل کا بیشہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کی آبادی ۱۹۶۰ء میں ۲۶۲۰ تھی۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفه: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء، ص ۶۱۰؛ (۲) W. M. Ramsay: *A Historical Geography of Asia Minor*، (Roy. Geogr. Soc. Supplementary Papers، ج ۴)، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۳۹۰؛ (۳) F. Sarre: *Reise in Kleinasien*، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۱۱۸ ببعد؛ (۴) Hammar-Purgstall، ۱: ۱۸۰؛ (۵) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: آنادولو بیلکلری، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۵۱ ببعد؛ (۶) S.S. Üçer و M. M. Koman: *Konya lii köy ve yer adlare üzorinde bir deneme Konya halkevi tarih, muze komitesi Yayinlari*: سلسله ۱، عدد ۴، قونیه ۱۹۴۵ء: ۲ (حاشیه ۴۲)؛ (۷) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ۱، پیرس ۱۸۹۰ء: ۸۲۳ ببعد؛ (۸) سامی: قاموس الاعلام، ۲، استانبول ۱۳۰۶ھ: ۱۳۳۴؛ (۹) علی جواد: تاریخ و جغرافیه لغتی، استانبول ۱۳۱۳ تا ۱۳۱۴ھ، ص ۱۸۷؛ (۱۰) W.Tomaschek: *Zur Historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter SBAk. Wien Phil. Hist. Cl.*، عدد ۱۲۴،

وی انا ۱۸۹۰ء، ص ۱۰۰؛ (۱۱) Pauly Wissowa : Karalleia, و Karallis بذیل مادہ (۱۹۱۹ء)، ۲/۱۰ عمود ۱۹۲۶ تا ۱۹۲۷ء؛ (۱۲) وو، ت بذیل مادہ، بیشہر (از Besim Darkot)؛ (۱۳) نیز قب Y. Akyurt : *Beyschri Kitabeleri ve Türk Tarih Arkeologya ve Etnografya Dergisi, Esrefoğlu Camii ve Türbesi*، عدد ۴، استانبول ۱۹۴۰ء : ص ۹۱ تا ۱۲۹۔

(V. J. PARRY)

البَیْضاء : مملکت لیبیا کا دارالحکومت، سلسلۂ صوفیۂ سنوسیّہ کے بانی سیدی محمد بن علی السنوسی المجاهری الحسنی الادریسی (رکّ بہ السنوسی) نے ۱۸۴۳ء میں درنہ کے قریب جبل اخضر میں الزاویۃ البیضا کے نام سے اپنا ایک ''زاویہ'' قائم کیا جس نے بعد میں ایک خود کفیل بستی کی شکل اختیار کر لی ۔ مملکت لیبیا کے موجودہ حکمران سیّد محمد ادریس المهدی انهیں کے پوتے هیں۔

البیضاء علاقۂ برقہ (رکّ باں) یعنی قدیم سرینیکا Cyrenaica میں واقع هے ۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں برطانیہ طرابلس الغرب اور برقہ میں اور فرانس فزّان میں اپنے اختیارات سے دست بردار هو گئے اور لیبیا کی وفاقی حکومت ظهور میں آئی ۔ طرابلس اور بنغازی (رکّ باں) باری باری اس حکومت کے صدر مقام هوا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں لیبیا کے آئین میں بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئیں اور وفاقی حکومت کی جگہ ایک مرکزی حکومت نے لے لی، جس کا صدر مقام البیضاء قرار پایا۔

البیضاء کی آبادی ۳۰۰۹۸ هے اور ساری کی ساری مسلمانوں پر مشتمل هے ۔

مآخذ : (۱) *World Muslim Gazetteer*، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۱ ببعد؛ (۲) *Statesman's Year Book*، بابت ۱۹۶۷ء، ص ۲۳۳ ببعد؛ (۳) *The World Almanac*، بابت ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۶ ببعد؛ (۴) ممدوح حقی : لیبیا العربیۃ، بار اول، ۱۹۶۲ء، دمشق ص ۶۲ تا ۶۳؛ (۵) ووّ، لائڈن، طبع اوّل، مادّہ هاے برقہ، السنوسی۔

(سیّد امجد ألطاف)

البَیْضاء : ''سفید شہر (قصر)'' ۔ ایک عام عربی اسم موضع، جو عرب دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے هوے مختلف مقامات کے لیے استعمال هوتا هے ۔ الهمدانی : صفۃ اس نام کے چار مقامات کا ذکر کرتا هے ۔ یاقوت نے اس نام کی سوله مختلف جگهیں شمار کی هیں ۔ ان سب میں اهم‌ترین ایرانی شهر ''البیضاء'' هے، جو صوبۂ فارس میں شیراز کے شمال اور اصطخر کے مغرب میں واقع هے ۔ اس کا اصلی نام نسا تھا ۔ ضلع کام فیروز کا سب سے بڑا شہر هونے کے باعث چوتھی صدی هجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ اتنا هی بڑا تھا جتنا اصطخر، اور زرخیز مرغزاروں سے گھرا هوا تھا۔ متعدد اهل علم اس شہر سے منسوب هیں [رکّ بہ البیضاوی] ۔ الحلّاج [رکّ باں] بھی اسی جگہ پیدا هوا تھا ۔ عرب کے جنوبی شہر البیضاء کے لیے، جو بالائی بیحان کا صدر مقام هے، رکّ بہ بیحان۔

مآخذ : (۱) اِصْطَخری، ص ۱۲۶، ۱۹۷؛ (۲) ابن حوقل، ص ۱۹۷؛ (۳) ابن خُرداذبہ، ص ۶۴ ببعد؛ (۴) المقدسی، ص ۲۴، ۴۳۲؛ (۵) یاقوت، ۱ : ۷۹۱ ببعد، مشترک، ص ۷۷؛ (۶) Le Strange، ص ۲۸۰؛ (۷) H. von Wissmann و Höfner : *Beiträge zur histor. Geogr. des vorislamischen Südarabien*، ص ۱۴، ۲۳، ۵۸، ۶۲، ۶۶۔

(C. LÖFGREN)

البَیْضاوی : [امام] عبداللّٰہ بن عمر بن محمد بن علی، ابوالخیر [نیز ابوسعید]، ناصرالدین، شافعی مذهب سے تعلق رکھتے تھے اور شیراز کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رهے ۔ ان کی شہرت ایک جید اور متبحر عالم کی حیثیت سے بھی هے؛ انهوں نے تفسیر قرآن،

قانون، فقہ، علم الکلام اور صرف و نحو جیسے متعدد موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں ۔ عام طور پر ان کی تصنیفات کی بنیاد دوسرے مصنفین کی تصنیفات پر ہے ۔ البتہ ان کی شہرت اس بنا پر ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ اختصار اور ایجاز سے لکھا ہے ۔ ان کی بہت مشہور تالیف ان کی تفسیر انوار التنزیل و اسرار التأویل ہے، جو زیادہ‌تر زمخشری کی الکشاف کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے ۔ الکشاف گو زبردست علمیت کی آئینہ‌دار ہے، لیکن اس پر معتزلی نظریات کا رنگ چڑھا ہوا ہے جن میں اصلاح پیدا کرنے کی کوشش میں البیضاوی نے بعض اوقات انھیں مسترد اور بعض اوقات حذف کر دیا ہے، لیکن کہیں کہیں البیضاوی نے ان تصورات کی اہمیت کو غالبًا نظر انداز کرتے ہوئے انھیں جوں کا توں بھی رہنے دیا ہے ۔ اپنے مقدّمے میں [فاضل مفسر] نے اس کے اوریجنل ہونے کا دعوٰی نہیں کیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ میری مدت سے آرزو تھی کہ میں کوئی ایسی کتاب لکھوں جو ان بہترین افکار کا مجموعہ ہو جو میں نے نامور صحابۂ کرام رض، مقتدر علماے تابعین اور دیگر سلف صالحین سے حاصل کیے ہیں ۔ اس کتاب میں وہ ان عمدہ نکات اور دلچسپ لطائف کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے جو ان کے پیش‌رووں اور خود ان کی تحقیقات کا حاصل تھے ۔ اس کتاب میں انھوں نے آٹھ مشہور اماموں (کیونکہ البیضاوی، قرآن کے قاریوں کی سات کی مروجہ تعداد میں یعقوب البصری کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں) کی بعض قراءتوں اور مستند قاریوں کی ان قراءتوں کو بھی شامل کیا ہے جو کسی نہ کسی قراءت کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا جو ہمیشہ بےحد مقبول رہی ہے اور اسی بنا پر کئی بار شائع ہو چکی ہے ۔

اس پوری کتاب کی یا اس کے مختلف حصوں کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں ۔ براکلمان نے ان کی تعداد تراسی بتائی ہے اور ان کی فہرست مرتب کی ہے ۔ اس کے بعد وہ دو کتابوں کا ذکر کرتا ہے جن میں ان دو مقامات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جہاں البیضاوی نے الزمخشری کے اعتزال کا رد نہیں کیا ۔ اس کتاب کی کثیر اشاعتوں میں سے ایک تو H. O. Fleischer (لائپزگ ۱۸۴۶ تا ۱۸۴۸ء، دو جلد) کی ہے، جس میں اشاریے W. Fell (لائپزگ ۱۸۷۸ء) کے ہیں اور دوسری قاہرہ کی (دو جلدوں میں چار حصے)، جو الخطیب الکازرونی کی شرح کی حامل اور ازہر کے چھٹے سال کے طلبہ کے نصاب میں داخل ہے ۔ دوسری اشاعتوں کا ذکر براکلمان اور سرکیس Sarkis میں ملتا ہے ۔ البیضاوی کی دیگر مطبوعہ یا مخطوطہ شکل میں موجود تصانیف میں سے منہاج الوصول الی علم الاصول (فقہ)، الغایة القصوی (دستاویز قانون)، لب الالباب فی علم الاعراب (صرف و نحو)، مصباح الارواح اور طوالع الانوار من مطالع الانظار (علم کلام) ہیں، انھوں نے ایک کتاب نظام التواریخ (مرتبۂ سید منصور مع اردو حواشی، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۰ء) فارسی میں بھی لکھی ہے، جو ۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء تک کی تاریخ عالم سے بحث کرتی ہے ۔ السیوطی نے الصفدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ البیضاوی نے ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء میں وفات پائی ۔ وہ کہتا ہے کہ السبکی نے سنہ وفات ۶۹۱ھ/ ۱۲۹۲ء لکھا ہے، لیکن السبکی اپنی طبقات میں کوئی تاریخ نہیں لکھتا، الیافعی کے نزدیک ۶۹۲ھ/ ۱۲۹۳ء ہے ۔ ریو Rieu (تتمہ فہرس مخطوطات عربی، در موزۂ بریطانیہ، ص ۶۸) ایک قول کا حوالہ دیتا ہے، جس کی رو سے ان کا انتقال ۷۱۶ھ/

۱۳۱۶ء میں ہوا۔

مآخذ : (۱) السُّبکی: طبقات الشافعیّة الکبری، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۵ : ۵۹؛ (۲) السیوطی: بُغیة الوُعاة، قاہرہ ۱۳۲۰ء، ص ۲۸۶؛ (۳) الیافعی: مِرآة الجِنان، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۷ تا ۱۳۳۹ھ، ۴ : ۲۲۰؛ (۴) براکلمان، ۱ : ۵۳۰ ببعد؛ تکملہ، ۱ : ۷۳۸ ببعد؛ (۵) سرکیس : معجم المطبوعات العربیة، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۰ء، ص ۶۱۶ ببعد؛ (۶) Margoliouth : *Chrestomathia Baidawiana*، لنڈن ۱۸۹۴ء؛ (۷) Th. Nöldeke : *Geschichte des Qorans*، بار دوم، لائپزگ ۱۹۰۹ تا ۱۹۳۸ء، ۲ : ۱۷۶؛ ۳ : ۲۴۲؛ [(۸) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادة، ۱ : ۴۳۶؛ (۹) العباس الموسوی: نزہة الجلیس، ۲ : ۸۷؛ (۱۰) صدیق حسن خان: الاکسیر فی اصول التفسیر]۔

(J. Robson)

بَیْطار: یہ لفظ عام طور سے حیوانات کے ڈاکٹر (سرجن) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ iππιατρος، کی معرّب صورت ہے اور اس واقعہ یہ ہے کہ اس کی زیادہ صحیح صورت بَیْطَر [بر وزنِ ہِزَبْر] اور بَیْطَر بھی قدیم شاعری میں ملتی ہے [لسان العرب، بیروت ۱۹۵۵ء، ۴ : ۶۹ تا ۷۰، مادہ بطر]۔ مشرقی زبانوں میں اصلی یونانی شکل بارھویں صدی تک باقی رہی، *Midrash Numeri rabba 9* میں אפ״טרוס واضح طور پر لکھا ہوا ہے، لیکن اگر البیرونی: الجماہر فی معرفة الجواہر، ص ۱۰۱، میں جس Heraclides کا اقتباس دیا گیا ہے اس سے Tarentum کا رہنے والا Heraclides (تقریباً ۷۵ قبل مسیح) مراد ہے، جس نے منجملہ دوسری کتابوں کے ایک کتاب گھوڑوں کے علاج معالجے پر بھی لکھی تھی (قب M. J. Haschim : *Die Quellen des Steinbuches des Bērūnī*، تحقیقی مقالہ، Bonn ۱۹۳۵ء، ص ۴۳)، تو بہرحال مسلمان علاج اسپاں سے متعلق یونانی تصانیف سے آشنا تھے۔ اس موضوع پر ایک نام نہاد کتاب، جس کا نام *De Curationibus infirmitatum aequorum* ہے، جس کا ترجمہ موسٰی نامی ایک یہودی نے، جو پالرمو [= پلرمو، بلرم] کا رہنے والا تھا، انجو کے چارلس اول کے لیے (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۵ء) کیا تھا اور بولونہ میں ۱۸۶۵ء میں P. Delprato : *Trattati di mascalcia attribuiti ad Ippocrate tradotti dall 'arabo in latino* میں چھپا ہے۔

بیطاری پر قدیم‌ترین عربی کتاب ابن ابی اُصَیْبِعَہ (۱ : ۲۰۰، سطر ۲۶) نے حنین ابن اسحٰق کی طرف منسوب کی ہے۔ اس مضمون پر یہ واحد کتاب ہے جس کا حوالہ طاش کوپردزادہ: مفتاح السعادہ، ۱ : ۲۷۰، نے دیا ہے اور اسے ''کافی'' بتایا ہے۔ حنین کا ہمعصر ابو یوسف یعقوب بن اخی حِزام، جو المعتصم اور المعتضد (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا نصف آخر) کا داروغۂ اصطبل تھا (قب براکلمان: تکملہ، ۱ : ۴۳۲ ببعد، جہاں اس نے مزید مآخذ کے حوالے دیے ہیں) پہلا شخص تھا جس نے علاج اسپاں پر کتابیں لکھیں، جو محفوظ ہیں۔ H. Ritter نے علی بن عبدالرحمٰن بن ہذیل الاندلسی : *La parure des cavaliers*، طبع L. Mercier، ۱۹۲۲ء پر تبصرے کے سلسلے میں متعدد مصنفین کی کتابوں کے مخطوطات کی فہرست دی ہے (*Der Islam*، ۱۸، ۱۹۲۹ء : ۱۱۹ تا ۱۲۶)۔ بیطار اور بیطرہ کے الفاظ ہسپانوی زبان میں آج بھی مستعمل ہیں (albéitar اور albeitaria)۔ بدویوں کی حیوانی ادویہ پر ایک فرانسیسی مقالے کا ترجمہ Pere Anastase نے عربی میں کیا تھا (المشرق، ۱، ۱۸۹۸ء : ۶۸۳، ۹۴۲)۔

مآخذ: (متن میں جن کتابوں کا ذکر آ چکا ہے ان کے علاوہ) (۱) تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۲) الاصمعیات، طبع Ahlwardt، ص ۳، ۸؛ (۳) الفرزدق، طبع Hell،

ص ۱۳۸۳؛ (۳) S. Fraenkel: *Aram. Fremdwörter*،
۲۶۵؛ (۵) M. Sterinschneider: *Übers. a. d. Arab.*،
۱، ۱۹۰۳ء، عدد ۸۶؛ (۶) W. Cohn: *Jüdische Übersetzer am Hofe Karl. I. von Anjou, Königs von Sizilien*، در *Monatsschrift f. Gesch. u. Wiss. d. Judentums*، ۷۹، ۱۹۳۵ء: ۲۳۶ ببعد؛ (۷) G. Sarton: *IHS*، ۲: ۸۹، ۷۹۳، ۱۰۹۱، ۱۰۹۳؛ ۳: ۲۸۳، ۱۲۱۶، ۱۲۳۸، ۱۸۳۷ ببعد؛ (۸) E. Leclainche: *Hist. de la méd. vét.*، ۲ (*med. vét. arabe*)، ۱۸۹۶ء.

(M. PLESSNER)

⊗ **بَیْع** : (ع)، لسان میں ہے : البیعُ ضِدُّ الشّراء، یعنی بیع (فروخت کرنا)، شراء (خریدنا) کی ضد ہے ۔ و البیعُ شِراء ایضًا و ھُو من الاضداد = اور بیع شراء کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ اضداد میں سے ہے، یعنی دو متضاد معنے دیتا ہے، لیکن باب افتعال سے ابتیاع کے معنی فقط خریدنے کے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح شِراء بھی اضداد میں سے ہے، اس کے معنی خریدنے کے علاوہ فروخت کرنا بھی ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادّہ) .

قرآن مجید میں لفظ بیع اور متعلقہ مشتقات پندرہ مرتبہ وارد ہوے ہیں بصورت بیع، بایعتم، یبایعنک، یبایعون، یبایعونک، فبایعھن، تبایعتم، ببیعکم، (دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادّہ) .

بیع کے اصل معنی معاھدے کے اختتام پر ہاتھ ملانے کے ہیں اور بیعۃ بھی اسی سے ہے ۔ اور شری کے معنی منڈی کی چہل پہل کے ہیں۔

بیع اسلامی قانون کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب خرید و فروخت کا معاھدہ ہے؛ اس کے لیے ایجاب و قبول ضروری ہے ۔ قرآن مجید میں بیع بمعنی تجارت (رک بآں) بھی آیا ہے : اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (۹ [الجمعۃ]: ۹) میں تجارت کو ملتوی کرنے کا ذکر آیا ہے اور رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (۲۴ [النّور] : ۳۷) میں تجارۃ اور بیع کے الفاظ میں ترادف بھی ہو سکتا ہے یا ترادف مع معنی زائد بھی ۔ اسی طرح آیت وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲ [البقرۃ] : ۲۷۵) میں بیع عمومی طور پر بمعنی تجارت ہے اور خصوصی طور پر بمعنی خرید و فروخت ۔ شرع میں معاھدۂ بیع سے مُبادلۃ مالٍ بمالٍ بِتَرَاضٍ (رضامندی سے مال کا مبادلہ مال سے) مراد ہے ۔ اس لحاظ سے بیع کی بحث دو طرح ہو سکتی ہے : (۱) محدود معنی میں تملیک کا معاھدہ؛ (۲) تجارت کے سلسلے میں معاھدہ اور اس کی صورتیں، اگرچہ دونوں میں معاھدے کی اخلاقی بنیادیں یکساں ہیں، یعنی فریقین کی طرف سے ایسا معاملہ جو فرد یا جماعت کی نقصان‌رسانی اور فریب‌دھی کے شوائب سے پاک ہو اور اس میں ایسی قطعیت ہو کہ نزاع مابعد کا ہر امکان رفع ہو جائے ۔ بیع کا تملیک کے تین ذرائع (احراز (جیسے احیاے موات)، خَلَف اور نَقْل) میں سے مؤخرالذکر سے تعلق ہے اور یہ معاھدات اور عقد سے متعلق ہے اور اس میں علل اربعہ، یعنی علت فاعلی، علت مادّی، علت صوری اور علت غائی پائی جاتی ہیں ۔ اسلام میں دیگر تمدنی عہدناموں کی طرح تملیکی یا تجارتی عہد و پیمان بھی ایک دینی فریضہ ہے، اور اس کی اساس بھی معاملات میں سچائی، خوفِ خدا اور خلق خدا کے ساتھ دیانت‌دارانہ سلوک اور قانون عدل پر رکھی گئی ہے تا کہ باھمی تعلقات کی فضا خوشگوار رہے اور اجتماعی زندگی میں خلل اور فساد واقع نہ ہو۔

بیوع کی تفصیلات جملہ کتب فقہ میں موجود ہیں ۔ ان کی چند اہم انواع یہ ہیں:

(الف) سامانِ تجارت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو فقہا نے ایسی بیع کی چار اقسام بیان کی ہیں:

(۱) مقایضہ (barter)، یعنی سامان کے بدلے سامان؛ (۲) صرف (exchange)، یعنی نقد کا نقد سے تبادلہ، جیسے سونے کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ تعداد کے لحاظ سے دونوں طرف کی اشیا یکساں ہوں جسے اصطلاح میں ''مبادلۃ'' کہتے ہیں اور اگر دونوں طرف کی اشیا میں وزن میں برابری کو مد نظر رکھا جائے تو اسے اصطلاح میں ''مراطلۃ'' کہتے ہیں؛ (۳) سلم جسے بعض فقہا نے سلف کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے، جس میں قیمت نقد وصول کر لی جاتی ہے اور جنس بعد میں ادا ہوتی ہے؛ (۴) بیع مطلق، یعنی دست بدست قیمت (ثمن) اور مال تجارت (مبیعہ) کا تبادلہ ۔ اس طرح اگر مال تجارت موجود ہو تو وہ بیع حاضر کہلاتی ہے ورنہ بیع غائب۔

(ب) باعتبار صحت و عدم صحت بیع کی چار اقسام ہیں (۱) بیع صحیح؛ (۲) بیع باطل؛ (۳) بیع فاسد؛ (۴) بیع مکروہ ۔ بیع کی چند مشہور اقسام جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی یہ ہیں: ''بیع الحبل''، یعنی یہ سودا کرنا کہ فلاں مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے بیچ دیا جائے ۔ اس کی ایک صورت بیع ''حبل الحبلۃ'' ہے ۔ ''بیع الحصاۃ''، یعنی کنکر وغیرہ پھینکنا اور وہ جس چیز پر گرے وہ پہلے سے طے شدہ قیمت پر فروخت ہو جائے ۔ اس کی ایک صورت ''بیع المنابذۃ'' ہے ۔ ''بیع المضامین''، یعنی نر کی پشت میں جو منی ہے اس کی فروخت ۔ ''بیع المزابنۃ'' اس پھل کا جو ابھی درخت میں ہے اترے ہوئے اور خشک شدہ پھل کے مقابل میں سودا ۔ ایسی ہی ایک صورت ''بیع المحاقلۃ'' کی ہے ۔ ''بیع المنابجۃ'' کوئی سودا اس شرط سے طے کرنا کہ اگر یہ سودا ہو جائے تو اس سے پہلے لیا ہوا فلاں قرضہ از خود ختم ہو جائے گا ۔ ''احتکار'' (ذخیرہ اندوزی)، یعنی مال تجارت کو اس غرض سے روکے رکھنا کہ اس کی ضرورت بڑھ جائے اور قیمت چڑھ جائے تو پھر فروخت کیا جائے ۔ ''نجش''، یعنی نیلام میں محض بولی بڑھانے کی خاطر بولی دیتے جانا بھی منع ہے ۔ السوم علی سوم الغیر، یعنی کوئی شخص سودا کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس میں دخل دے کر خود سودا کرنے لگے، نیز تمام ایسے سودے اسلام میں ناجائز ہیں جن میں سود، میسر یا غرر کا دخل ہو.

فقہا نے شروط بیع کو چار اقسام پر منقسم کیا ہے اگر وہ نہ پائی جائیں تو بیع باطل یا فاسد یا مکروہ ہو جاتی ہے.

۱ - شروط انعقاد بیع، مثلاً بائع اور مشتری کے لیے ضروری ہے کہ وہ عاقل ہوں، یا مبیعہ معدوم نہ ہو ۔ فقہ حنفی میں ان شروط کی بارہ اقسام ہیں، جن میں سے تین کا تعلق بائع اور مشتری کے ساتھ ہے، ایک کا بیع کے عقد و قیام کے ساتھ، پانچ کا مال تجارت کے ساتھ، ایک کا ثمن اور مبلغہ، یعنی مال تجارت کے ساتھ، ایک کا سماع کلام کے ساتھ، یعنی سودے کے وقت جو گفتگو ہو رہی ہے وہ فریقین سن اور سمجھ رہے ہوں اور ایک کا مقام بیع کے ساتھ ہے.

۲ - شروط انفاذ بیع، مثلاً یہ کہ مال تجارت پوری طرح فروخت کنندہ کی ملکیت اور قبضے میں ہو، مثلاً بیع الطیر فی الهواء، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے یا سمندر میں پڑی ہوئی مچھلی کا سودا نہیں ہو سکتا.

۳ - شروط صحت بیع، مثلاً بیع موقت نہ ہو، ثمن اور مبیعہ یعنی مال تجارت کی مکمل تعیین ہو (المبیع معلوماً والثمن معلوماً).

۴ - شروط لزوم بیع، مثلاً ہر قسم کا خیار (خیار مجلس، خیار شرط، خیار عیب، خیار رؤیت، خیار تقریر) کالعدم نہ قرار دے دیا جائے یا مثلاً سودا کرنے وا

محجور نابالغ نہ ہو.

بیع کی وہ صورت جو تجارت کہلاتی ہے وہ بھی انہیں پاکیزہ اصولوں کی پابند ہے جن کا ذکر محدود انفرادی لین دین کے سلسلے میں اوپر ہو چکا ہے ۔ قرآن مجید کی رو سے تجارت طیّب عمل ہے، لیکن وہ عام طریقے جن سے تمدن کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً احتکار وغیرہ، یا ایسے سودے جن میں سود اور قمار کا دخل ہوتا ہے ممنوع ہیں.

تجارت میں بھی فریقین کی رضامندی ضروری ہے، جب معاملہ طے ہو جائے تو ضروری ہے کہ اسے بائع یا مشتری نبھائیں گو بعض شرائط کے ماتحت وہ اسے فسخ بھی کر سکتے ہیں ۔ تجارت میں قسمیں کھانے کو بھی منع کیا گیا ہے، حجت و تکرار اور جھگڑے کو بھی ناپسند کیا گیا ہے ۔ کم تولنے کی تو سخت ممانعت اور وعید ہے اور ملاوٹ کے لیے سخت وعید آئی ہے ۔ شراب، خنزیر، بت اور میتۃ، کی تجارت کو بھی منع کیا گیا ہے ۔ پانی کو انسانوں کا مشترک مال سمجھا گیا ہے اس کا بیچنا بھی درست نہیں ۔ غرض وہ تمام سودے جن میں مذکورۂ بالا شرائط کو مدّ نظر نہ رکھا جائے ممنوع ہیں (تفصیل کے لیے رک بہ تجارت).

مآخذ : (۱) کتب لغت، مثلاً لسان العرب، بذیل مادّہ ب ی ع؛ تاج العروس، بذیل مادّہ؛ راغب : مفردات؛ ابن الأثیر، نہایۃ؛ (۲) کتب حدیث، مثلاً صحاح ستّہ؛ صحاح اربعہ؛ مالک : موطأ، بذیل کتاب البیوع؛ (۳) کتب فقہ، مثلاً الشافعی : کتاب الأم؛ السحنون : المدونۃ الکبرٰی؛ الھدایۃ؛ درالمختار؛ عبدالرحمٰن الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ۲ : ۱۴۷؛ (۴) الغزالی : کیمیاے سعادت، مطبوعۂ تہران، ۱ : ۲۰۹؛ (۵) شاہ ولی اللہ : حجۃ اللہ البالغۃ، بذیل طلب الرزق، المبادلۃ؛ (۶) نذیر احمد : الحقوق والفرائض، ۳ : ۲۶۳، آداب البیع؛ (۷) عبدالرحیم : *Muhammadan Jurisprudence*، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۲۹۰، Sale (اردو ترجمہ : اصول فقہ اسلامی)؛ (۸) التھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل بیع.

(ادارہ)

بَیْعَۃ : (ع)، اصطلاح میں اس سے ایسا عمل مراد ہے جسے انجام دے کر کوئی شخص یا جماعت کسی دوسرے شخص کے اقتدار کو تسلیم کر لے؛ چنانچہ خلیفہ کی بیعت وہ عمل ہے جس سے اس امر کا اعلان و اعتراف مقصود ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا سربراہ ہے . . .

۱ ۔ اشتقاق : ''بیعۃ'' کی اصطلاح بیع سے نکلی ہے، جس کے لغوی معنی ہیں بیچ دینا ۔ بیعت در اصل اس حرکت جسمانی کو کہتے ہیں جو عرب قدیم میں دو شخصوں کے مابین کسی معاہدے کے طے پا جانے کی علامت تھی اور جس میں ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا تھا (قب بعض مغربی ممالک کی پرانی قانونی اصطلاح Manumissio) ۔ کسی کام کے لیے تبایع علی الامر کے معنے ''کسی کام میں معاہدہ طے پا جانے'' ہی کے ہیں (قب ؛ صفقۃ، لغوی معنی Manumissio = معاہدہ = باہمی اقرار) ۔ بیعت میں معاہدے کی علامت مصافحہ تھی اور چونکہ ایک سردار کا انتخاب (اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لینے کا عہد) ہاتھ سے ہاتھ ملا کر کیا جاتا تھا لہٰذا اس کے لیے وہی لفظ (بیعت) بولا جانے لگا [اور بیعت کرتے وقت بھی بیعت لینے والا اپنا ہاتھ بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر رکھتا ہے ۔ بلکہ صوفیہ کے بعض سلسلوں میں پیر مرید کا ہاتھ تھام کر بیعت لیتا ہے].

بیعت کے دو بڑے مقاصد ہیں : ایک تو اصولاً کسی عقیدے سے وابستگی اور کسی شخص کی تعلیم کو قبول کرنا؛ دوسرے معنی کسی کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ۔ وہ بیعت جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور ان پر ایمان لانے والوں

کے مابین ہوتی تھی وہ اسی قسم کی تھی (۴۸ [الفتح] : ۱۰ و ۱۸ ؛ ٦٠ [الممتحنة] : ۱۲) - بیعت کا یہ مقصد بھی ہوتا تھا کہ کسی شخص کی قائم‌شدہ حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی جائے - کسی نئے خلیفہ کے حق میں . . . اسی قسم کی بیعت ہوتی تھی [صوفیہ کے ہاں ایک 'بیعت ارشاد' ہوتی ہے، یعنی جب وہ اپنے کسی مرید سے خوش ہوتے ہیں اور اسے مراتب سلوک میں اور بلند لے جانا چاہتے ہیں تو اس مرید سے بیعت ارشاد لیتے ہیں].

(۲) قانونی نوعیت: قانونی نظریے کا تجزیہ کریں تو بیعت ایک قرارداد اور ایک معاہدہ ہے - اس میں ایجاب و قبول اور باہمی رضامندی ضروری ہے، یعنی ایک طرف انتخاب کرنے والوں کی رضامندی یا ارادہ جس کا امیدوار کو نامزد کرنے میں اظہار ہوا اور جس میں ان کی استدعا بھی شامل ہے اور دوسری طرف منتخب ہونے والے کا اظہار رضامندی جسے اس کی طرف سے "قبولیت" سمجھنا چاہیے - یہ تجزیہ قابل تسلیم ہے بشرطیکہ اسے اس حد تک نہ لے جایا جائے کہ عمل بیعت قانونی نوعیت کے معمولی معاہدوں کی سطح پر آ جائے - کیونکہ بیعت ایک مختص النوع رضاکارانہ عمل ہے جس میں جمہور شامل ہوتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ اس بیعت میں اطاعت کا عہد بھی شامل ہو - کیونکہ اس کا تعلق اصلاً انتخابی کارروائی سے ہے، نہ کہ اطاعت سے - بیعت انتخاب کے ساتھ غیر مشروط پر اطاعت لازمی نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے آزادی فیصلہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی - تاہم اکثر اوقات بیعت میں اطاعت کا مفہوم شامل ہی ہوتا ہے [حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا کہ جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں تم پر میری اطاعت فرض ہے . . . یہ انداز فکر و خطاب بھی اجتماعی بیعت کے مترادف ہے].

اب سوال یہ ہے کہ انتخابی بیعت میں انتخاب کرنے والوں (اہل الاختیار) کی کتنی تعداد ہونی چاہیے جس سے عمل بیعت شرعاً درست ہو جائے - اس باب میں متعدد رائیں ہیں جن میں باہم وسیع اختلاف ہے اور ایک انتہا سے دوسری انتہا تک پہنچتی ہیں، چنانچہ ایک طرف یہ نظریہ ہے کہ بیعت کا پوری سلطنت کے تمام صالحین کی طرف سے اظہار ضروری ہے - اور دوسری طرف یہ ہے کہ صرف ایک فرد کا بیعت کر لینا کافی ہے [لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ انتخاب کرنے والے دراصل جمہور ہوتے ہیں، خواہ وہ اس کا اظہار اہل العقد والحل کے ذریعے کریں یا براہِ راست [نیز دیکھیے الماوردی : الاحکام السلطانیہ].

بیعت کی تکمیل صرف 'قبول' سے ہو جاتی ہے - اس کے جواز یا محض ثبوت کے لیے نہ تو جسمانی اشارہ و حرکت (Manumissio) کی شرط ہے اور نہ حلف اٹھانے کی - اظہار رضامندی کے لیے کسی خاص رسم کی انجام‌دہی بھی ضروری نہیں - اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا اظہار کسی واضح اور قطعی صورت میں کر دیا جائے.

ایک ہی شخص کی بیعت کے عمل کی رسم کو دو یا زیادہ جلسوں میں سر انجام دیا جا سکتا ہے، چنانچہ بعض دفعہ اس کا پہلا قدم بیعت الخاصّہ کے ذریعے اٹھایا جاتا ہے، جس میں نہایت محدود تعداد میں حکومت کے مقتدر عمّال [اہل العقد] حصّہ لیتے ہیں، بعد ازاں بیعت العامّہ ہوتی ہے - مزید برآں بیعت کے لیے بعض اوقات باضابطہ اجلاس مختلف صوبوں کے مرکزی مقامات میں منعقد کیے جاتے ہیں.

عہد بنو امیّہ سے ایک اور رسم "تجدید البیعة" کا رواج ہوا، جس کے ذریعے خلیفہ یا بادشاہ

اپنے عہد حکومت میں از سر نو بیعت لے کر اپنے یا اپنے ولی عہد کے حق میں تائید حاصل کرتا تھا۔ یہ بیعت دو یا زیادہ مرتبہ بھی ہوتی تھی۔ حکمران وقت اسے رعایا کے دل میں وفاداری کے جذبے کو مستحکم کرنے کی غرض سے استعمال کرتا تھا۔

(۳) بیعت کے خواص: بیعت انتخاب کے باب میں ایک مخصوص سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بیعت اولوالامر یا حاکم کو اختیار تفویض کرتی ہے یا اختیار کی صرف تصدیق کرتی ہے۔ اس عقیدے سے یہ عام طور پر مسلم ہو گیا ہے کہ تفویض اختیار منجانب اللہ ہوتا ہے [جمہور کی طرف سے بیعت کا مطلب اس اختیار کی تصدیق ہے]۔

بیعت قطعی طور پر بیعت کرنے والوں اور ان کے مؤیدوں کو پابند کر دیتی ہے۔ بیعت نے دور عباسیہ کی ابتدا ہی سے مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اس پابندی کو اور بھی سخت کر دیا۔ اس کی وجہ سے اقتدار کا مسئلہ دینی نوعیت اختیار کر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولوالامر کے ساتھ بیعت (معاہدہ) کو خدا کے ساتھ معاہدہ سمجھا جانے لگا۔ پھر چونکہ بیعت کی خلاف‌ورزی کی دنیوی انتہائی سزا (یعنی موت) رکھی گئی [اس لیے بیعت ایک نازک ذمےدارانہ دینی عمل بن گئی]۔ بیعت کی پابندی شخصی اور مدت العمر کے لیے ہوتی ہے۔ دراصل محدود الوقت بیعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ تاہم شریعت نے ایک طرح خلفا کی معزولی پر ایک شرط بھی لگا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس کی بیعت کی جائے وہ احکام الٰہی پر پوری طرح کاربند رہے گا جس کے یہ معنے ہیں کہ اگر صاحب امر ان احکام الٰہی پر قائم نہ رہے تو بیعت کرنے والے بھی پابندی سے آزاد ہو جائیں گے [قب خطبۂ خلیفۂ اول رض]، لیکن اس فسخ بیعت کے لیے تقوی، عدل اور محض لوجہ اللہ اور لدین اللہ کی شرط ہے اور اس میں بڑی چھان بین کی ضرورت ہے تاکہ فسخ بیعت اور بغی میں امتیاز رہے۔ [نیز بیعت لینے والا خود بھی اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت امام حسن ؑ نے کیا یا حضرت علی رض نے تحکیم کے فیصلے کے مطابق معزول ہونے پر آمادگی کا اظہار فرما دیا]۔

مآخذ: (۱) الفرّاء: الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ [۱۹۳۸ء]؛ (۲) فیروز آبادی: القاموس المحیط، بذیل مادۂ بیع؛ (۳) ابن خلدون: المقدمۃ، بیروت ۱۹۰۰ء، (ترجمۂ انگریزی از Rosenthal، نیویارک ۱۹۵۹ء، ۱: ۴۲۸ ببعد)؛ (۴) الماوردی: الاحکام السّلطانیۃ، ترجمۂ E. Tyan: *Institutions du droit public musulman*، پیرس ۱۹۵۴ء، ۱: ۳۱۵ ببعد، ۱۹۵۷ء، ۲: ۶۰۵، ۱۲۹ ببعد (حوالوں سمیت)؛ (۵) Dozy: *Suppl.*، بذیل مادۂ بیع [بیعت کے سلسلے میں مزید تاریخی، دینی اور شرعی نوعیت کی معلومات کے لیے مفتاح کنوز السنۃ (مصر، ۱۹۳۴ء) تعریب محمد فؤاد عبدالباقی، ص ۸۰ تا ۸۶ (مادۂ البیعۃ) کے حوالے دیکھیے]۔

(E. TYAN)

* **بیغہ**: رک بہ کنیسہ۔

* **بیغا**: (یونانی: Πηγαί) ایشیاے کوچک کے شمال مغرب میں ایک قصبہ جو آج کل صوبۂ چناق‌قلعہ کی ایک ''قضا'' کا صدر مقام ہے، قوجہ چای (دریا) پر، جو زمانۂ قدیم میں گرینیکوس (Granicus) کہلاتا تھا۔ بحیرۂ مرمرہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قوجہ چای کے دہانے پر قرہ بیغا واقع ہے (قدیم یونانی عہد کا Πρίαπος)، جو بیغا کی بندرگاہ (اسکلہ) ہے۔ ترکوں کی سلطنت میں بیغا مختلف زمانوں میں ایالت بحر سفید (قپودان پاشا، یعنی عثمانی بیڑے کے امیر البحر اعلیٰ کے صوبے) کے سنجاق پھر ولایت خداوندگار (بروسہ) کے سنجاق اور اس کے بعد کے

زمانے میں بیغا کی متصرفلق کی ایک قضا رہا ہے (اگرچہ اس متصرفلق کا نام بیغا تھا، لیکن صدر مقام قصبۂ بیغا نہ تھا، بلکہ قلعۂ سلطانیہ، یعنی چناق قلعہ تھا) ۔ اس قصبے کی مردم شماری ۱۹۳۵ء میں ۸۱۵۰ تھی۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء، ص ۶۶۷؛ (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۵ھ، ۵: ۲۹۹ تا ۳۰۰؛ (۳) P. A. von Tischendorf: *Das Lehnswesen in den moslemischen Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء، ص ۱۷؛ (۴) W. Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*، در *(SBAk. Wien, Phil.-Hist. Cl., Bd. 124)*، Wein ۱۸۹۱ء، ص ۱۴ اور ۳۹؛ (۵) F. Taeschner: *Das anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen*، (*Türkische Bibliothek, Bd. 23*)، لائپزگ [illegible]، ۱: ۱۰۸ اور ۲: ۷۰؛ (۶) Ö. L. Barkan: [illegible] ۱۹ تا ۲۱ (Biga Livâsi Kanunu)؛ (۷) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ۴، پیرس ۱۸۹۴ء: ۷۵۳ ببعد؛ (۸) Pauly-Wissowa، ۷/۲ (۱۹۱۲ء)، بذیل مادہ Granikos، عمود ۱۸۱۴ تا ۱۸۱۵؛ (۹) سامی: قاموس الاعلام، ۲، استانبول ۱۳۰۶ھ: ۱۴۴۳؛ (۱۰) علی جواد: تاریخ و جغرافیۂ لغتی، استانبول ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۴ھ، ص ۲۲۴ تا ۲۲۵؛ (۱۱) آ، (ترکی)، بذیل مادہ، بیغا Biga (Besim Darkot).

(V. J. PARRY)

* **بیغه**: رك به مساحة.
* **بیقرا**: [= بیقرہ]، رك به بایقرا.
* **بیکل**: [= بایقال اور بیکال]، مشرقی ترکی میں (عوامی اشتقاق سے) "مایہ دار جھیل" اور مغولی میں Dalai nor "سمندر جھیل" ۔ یہ دنیا کی عمیق ترین جھیل (۱۷۴۱ میٹر) اور سب سے بڑی پہاڑی جھیل ہے ۔ جو مابین ۵۱ درجے ۲۹ دقیقے اور ۵۵ درجے اور ۴۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۰۳ درجے، ۴۴ دقیقے اور ۱۱۰ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد مشرقی، بلند پہاڑی سلسلوں میں محصور، ۶۳۵ کیلومیٹر طویل ہے ۔ عرض مختلف مقامات پر پندرہ کیلومیٹر سے نواسی کیلومیٹر تک اور کل رقبہ ۳۱۵۰۰ مربع کیلومیٹر ہوتا ہے ۔ اس میں سلنگا Selenga، برگوزن Barguzin اور بالائی آنغارہ Angara کی ندیاں آ کر گرتی ہیں اور پنی سی کے مقام پر آنغارہ Angara اس سے نکلتا ہے ۔ جھیل بیکل ریلوے (۲۰۷ کیلومیٹر لمبی، جس میں چالیس سرنگیں ہیں اور ٹرانس سائبرین ریلوے کی ایک شاخ ہے) ۔ اس جھیل کے جنوبی حصے کے گرد ۱۹۰۴ء کے خزاں میں مکمل کی گئی تھی (یعنی وہ حصہ جو آنغارہ کے منبع اور سلنگا کے شاخ دار دہانے کے درمیان ہے).

معلوم ہوتا ہے مغول کے عہد میں مسلم جغرافیہ نویسوں کو جھیل بیکل کا علم نہ تھا ۔ صرف رشید الدین نے جامع التواریخ میں اس کا ذکر کیا ہے (طبع Berezin، ۳: ۱۸۰ (Trudi Vost. otd. Imp. Arkheol. Ob-va XIII) ۔ جو لوگ اس جھیل کے کناروں پر آباد ہیں وہ یہاں برقوت کہلاتے ہیں (مغول زبان میں آخر میں "ت" جمع کی علامت ہے) اور اس کے گرد کا علاقہ برقوجین (تو توم) کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ نام دریاے برگوزن کی صداے بازگشت ہے ۔ جھیل مذکور کا علم روسیوں کو سترھویں صدی کے نصف اول میں ہوا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد مغربی یورپ کو.

مآخذ: (۱) Brockhaus Efron: *Enciklop. Slovar*، IIA (۴۴): ۷۱۵ تا ۷۱۷؛ (۲) *Bol'shaya Sovetskaya Enciklopediya*، بار دوم، ۴ (۱۹۵۰ء): ۹۴ تا ۱۰۲، (دونوں جغرافیائی کتب حوالہ ہیں سے مزید جغرافیائی فہرس ماخذ کے لیے؛

(۳) H. Johansen: *Der Baikal-See*، در *Mitt. Geogr. Ges. München* ۱۸/۱، ۱۹۲۵ء: ۱ تا ۲۰۲؛ (۴) W. Leimbach: *Die Sowjetunion* (۱۹۵۰ء)، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸؛ (۵) Th. Shabad: *Geography of the USSR* (۱۹۵۱ء)؛ نقشے کے لیے: *Bol'shaya Sov. Encikl.* و *Leimbach*.

(B. SPULER)

* **بیگ**: (= بِک، بے)، ایک ترکی اعزازی لقب، جو کئی مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کی تمام شکلیں، جو مختلف مقامی بولیوں میں مستعمل ہیں (بیگ، بیک، بِک، بے، بی، بائی بِگ وغیرہ)، سب قدیم ترکی لفظ بیگ سے مشتق ہیں جیسا کہ اورخون Orkhon کے کتبات سے (آٹھویں صدی) اور اسی زمانے کے ترک اور منگولیا سے متعلق چینی منقولات سے ظاہر ہے ۔ یہ لفظ آلتای (آلتون طاغ) گروہ السنہ سے تعلق نہیں رکھتا (مغولی زبان کا لفظ بیگی، بعد میں ترکی سے مستعار لیا گیا ہے)؛ ترکی بیرک، بیک اور مغولی بیرکا، بیکی (طاقتور آواز وغیرہ کا قدیم لفظ ترکی بیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس سے ان سب کو علیحدہ رکھنا چاہیے ۔ یہی حال ترکی بُگو، بُگ (خردمند، ساحر)) اور منگولی بوگے، بو، ''شمن'' (بت پرست) کا ہے؛ دیگر القاب کی طرح بیگ (بمعنی لاھوتی، مقدس، جو قدیم لفظ باگا ''خدا'' سے لیا گیا ہے، قب بگ‌داد [بغداد]) ایک مستعار لفظ ہے جو غالبًا ایرانی سے لیا گیا ہے اور ساسانی بادشاہوں کا لقب تھا ۔

اورخان [رک بآن] کے کتبات میں ایک مرکب اصطلاح بیگلرؔ طبقۂ اشراف کے لیے استعمال ہوئی ہے، یعنی ''بک'' کی جماعت، جس کا ضد لفظ بودون Bodun (اخلاط، عوام الناس) ہے ۔ ان کی عبارات میں لفظ ''بیگ'' اونچے درجے کے لوگوں میں دوسرے درجے کا طبقہ ظاہر کرتا ہے ۔ بالآخر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک برس بیگ Bars Bag آگے چل کر خان بنا دیا گیا اور ترکی ''خان اعظم'' کا سالا بھی ہو گیا ۔ لفظ کے ان مختلف استعمالات سے عیاں ہے کہ ''بیگ'' کا لقبْ (جیسے بعد میں بیگ یا بک بھی) کسی خاص عہدے یا منصب کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اصلاً ایک تعظیمی اور عزازی لقب ہے ۔ اسی لیے بہت سی ترکی قومیں اسے سب سے بڑے بھائی کے نام کے ساتھ لگا دیتی ہیں ۔ آغا (بیگ آغا، یا آغا بیگ ــ قدیم عثمانی لفظ آغا بے (معظم برادر کلاں) ۔ بعض ترکی گروہوں میں یہ لفظ اونچے درجے کے لوگوں کے لقب کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، بعض دیگر گروہ اسے وسیع عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور رئیس و سردار، آقا، خاوند اور جناب کی جگہ کام میں لاتے ہیں ۔ اس کے خاص معیّن معنی اسی وقت واضح ہو سکتے ہیں جب استعمال کرنے والوں کے معاشرتی اور اداری حالات اور اصطلاحات کا علم ہو ۔ زیادہ‌تر ایک مرکب لفظ کے آخری حصے کے طور پر (اون بیگی ''دس کا افسر'' دفعدار؛ آلتون اردو (Golden Horde) عثمانی اصطلاح سنجاق بے (بائی) وغیرہ) یا بطور لقب جب کسی خاص نام کے ساتھ استعمال کیا جائے اس وقت یہ آخر میں بڑھایا جاتا ہے ۔ برس بیگ، محمد بک، مؤنث خطاب بیگم [رک بآں] بیگ کے مرکب اضافی واحد متکلم کی ایک سادہ شکل ہے (بیگ ام ''میرے آقا'' اور اس کے بعد ''میری محترمہ'' قب خان ۔ ام (خانم) جو اسی طرح کی ایک اضافی ترکیب ہے جو آگے چل کر مؤنث کے لیے مخصوص ہو گئی) ۔

(L. BAZIN)

(ب) مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ قراخانیوں میں ایک بڑے عہدےدار کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا تھا ۔ پہلے پہل یہ خطاب طُغرُل اور اس کے بھائی جُغری نے اختیار کیا، جو

سلجوقی سلطنت کے بانی تھے ۔ سلجوقیوں اوز بعد کی دیگر ترکی حکومتوں میں جب ترکی الفاظ سرکاری طور پر مروجہ عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ استعمال ہونے لگے تو ''بیگ'' عربی لفظ ''امیر'' کا مترادف قرار دیا گیا، جیسا کہ خطابات بیگلر بیگی یا بیلر بائی جو امیرالامراء کا ہم پلہ قرار پایا اور سنجاق بیگی جو امیر لواء کے برابر ٹھیرا ۔ انھیں حکومتوں کے اندر جہاں بڑے بادشاہوں کو خاقان، خان یا سلطان کہتے تھے وہاں چھوٹے فرمانرواؤں کو، جیسے آناطولی [رک بآں] کی ریاستوں کے حکمران سلجوقیوں کے اخلاف، قرا قویونلو، اور آق قویونلو کو بیگ کہتے تھے ۔ تیمور اعظم بھی در حقیقت بیگ ہی تھا ۔

ایلخانوں کے زمانے میں بیگ کبھی کبھی مستورات کے لیے استعمال ہوتا تھا اور ہندوستان کے مغلوں میں مؤنث کے لیے عام صورت بیگم تھی ۔ صفویوں میں اعلیٰ حکمران کا لقب شاہ قرار پایا، اس لیے کمتر شخصیتوں کو بجائے بیگ کے خان حتّٰی کہ سلطان کہنے لگے ۔ دوسری جانب عثمانیوں میں یہ لفظ قبیلوں کے سرداروں، بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدےداروں اور سربرآوردہ لوگوں کے فرزندوں کے لیے خاص کر پاشاؤں کی نرینہ اولاد کے لیے استعمال ہوتا رہا ۔

مآخذ : (۱) آآ، لائڈن، مقالۂ بیگ از Barthold؛ (۲) آآ، ت، مقالۂ ''بیگ'' از کوپرولو؛ (۳) Redhouse : *Turkish English Lexicon*، بذیل مادّہ ۔

(H. Bowen)

بیگدلی : اوغوز (ترکمان) اقوام کی شاخ بوزاوق Boz-Ok کے ایک قبیلے کا نام ہے ۔ خاندان خوارزم شاہی کے مورث اعلیٰ انوشتگین کو بعض اوقات خاندان کا ایک فرد قرار دیا جاتا ہے ۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں بیگدلی کی ایک بڑی جماعت شام کے ترکمانوں میں پائی جاتی تھی ۔ اس زمانے میں ان کی قیادت تشخون (تشکون) اوغللری کے ہاتھ میں تھی ۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں اس جماعت کو ترکمانوں کے سب سے زیادہ زوردار قبائل میں سے سمجھا جاتا تھا ۔ اسی قبیلے کی ایک اور اہم شاخ اسی صدی کے اندر صوبۂ اِچِل میں ضلع گُلنار Gulnar کے چودہ دیہات میں بستی تھی ۔ ان کے سرداروں کے پاس جاگیریں (دِرْلِک) تھیں ۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں شام کے بیگدلی حَلَب کے علاقے کے اندر ترکمان قبیلوں میں سب سے بڑا قبیلہ تھا ۔ اس صدی کے نصف اول میں ان کے چالیس خاندان تھے ۔ علاقۂ دیاربکر میں بھی بنی ایل اور بوز اولوس کے درمیان شامی بیگدلی کے اہم خاندان تھے ۔ انھیں بیگدلی کی ایک اور شاخ قزلباش شاملو قبیلے کے ہمراہ ایران پہنچی ۔ دیار بکر اور حلب کے درمیان نفیس‌ترین چراگاہیں گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں انھیں کے قبضے میں تھیں، مگر خسرو پاشا نے بغداد پر حملے کے دوران میں (۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء) انھیں اس قصور پر کہ انھوں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے مویشی سے مقامی لوگوں کے کھیتوں کو ویران کرا دیا تھا خوب سزا دی ۔ اسی صدی کے نصف ثانی میں اندازہ کیا گیا تھا کہ ان لوگوں کے بارہ ہزار خیمے نصب تھے ۔ بہت سے دیگر قبیلوں کی طرح بیگدلی قبیلے سے بھی ۱۱۰۱ھ / ۱۶۹۰ء میں مطالبہ کیا گیا کہ وہ آسٹریا پر حملے کرنے کی مہم میں حصہ لے ۔ اس کے چند سال بعد حکومت نے کوشش کی کہ بیگدلی اور دیگر ترکمان قبیلوں کو، جو اس کے آس پاس رہتے تھے، رَقّہ کے علاقے میں بسا دے ۔ اس کے بعد کچھ بیگدلی رَقّہ میں جا بسے اور باقی ماندہ حلب اور عین تاب کے علاقوں میں رہ گئے ۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے

کہ شامی بیگدلی کی ایک شاخ شاملو کے ساتھ ایران چلی گئی تھی ۔ صفوی عہد میں بہت سے سپہ سالار اور حاکم اسی قبیلے سے تھے ۔ بیگدلی کی ایک شاخ استرآباد کے علاقے میں گوکلان ایلی Goklen Ili کے درمیان پائی جاتی ہے ۔

مآخذ : (۱) Faruq Sumer : *Bozoklu Oğuz Boylarina Dair*، در *Dil ve Tarih ve Coğrafya Fakültesi Dergisi*، ۱۱/۱، انقرہ ۱۹۵۳ء۔

(FARUK SÜMER)

* **بیگلر بیگی** : بیلربای، ترکی لقب، جس کے معنی ہیں ''بیگوں کا بیگ'' یعنی ''امیر الأمراء'' ۔ دیگر القاب کی طرح اسے بھی رفتہ رفتہ تنزل کا منہ دیکھنا پڑا ۔ ابتدا میں اس لقب سے مراد ''سپہ سالار اعظم'' ہوتا تھا ۔ اس کے بعد یہ صوبے کے حاکم کے معنی تک محدود ہو گیا اور آخرکار اس کا مطلب سوائے ایک اعزازی مرتبے کے اور کچھ نہ رہا ۔ پہلے معنی میں اسے روم کے سلاجقہ نے استعمال کیا اور اسے ''ملک الأمراء'' کے مساوی قرار دیا ۔ ایلخانیوں نے بھی اسے استعمال کیا اور اس سے چار امراء الأولوس کا سردار مراد لیا ۔ آلتون ارد (Golden Horde) کی سلطنت میں یہ تمام امراء الأولوس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ مصر کی مملوک حکومت میں یہ اتابک العساکر کے لیے استعمال ہوتا تھا (مآخذ کے حوالوں کے لیے دیکھیے M. F. Köprülüzade : *Bizans Müesseselerinin Osmanli Müesseselerine Te'siri*، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۰ تا ۱۹۵ [اطالوی ترجمہ *Alcune osservazioni...*، Pubblicazioni dell' Instituto per l'Oriente di Roma، ۱۹۴۴ء] اور اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی *Osmanli Devleti Teşkilâtina Medhal*، اول ۱۹۴۱ء، بمدد اشاریہ؛ نیز قب D. Ayalon، در *BSOAS*، (۱۹۵۴ء)، ۱۶ : ۵۹).

عثمانیوں میں بھی اس لقب سے ابتدا میں ''سپہ سالاراعظم'' مراد لیا جاتا تھا (سعد الدین، ۱ : ۶۹، نے اسے اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے) ۔ کہا جاتا ہے کہ جب مراد اول ادرنہ [رک بآن] پر قبضہ کر کے بروسہ [= بورسہ رک بآن] واپس گیا تھا تو اس نے یہ خطاب سب سے پہلی بار لالا شاھین Lala Shahin کو عطا کیا تھا (*Anon.* : Giese، ص ۲۲، س ۱۹ = Urudj، ص ۲۲، س ۹) ۔ لالا شاھین کی جگہ تمرتاش آیا، جو بظاہر اسی کی طرح ایک بیگلربیگی تھا ۔ اسے آناطولی (= آنا دولو) کی حفاظت کے لیے بایزید اول اس وقت چھوڑ گیا تھا جب خود بایزید نے مرچہ Mirča پر فوج کشی کی (نشری [Taeschner]، ۱ : ۸۶) ۔ زمانۂ اضطراب میں جب موسیٰ نے یورپی ملکوں پر قبضہ کر لیا تو اس نے ایک وزیر، ایک قاضی عسکر اور ایک بیگلربیگی مقرر کیا (*Anon.* : Giese، ص ۹۴ س ۲۳، مگر ''روم ایلی کا بیگلربیگی'' در Urudj، ص ۳۹، س ۱۳ اور عاشق پاشازادہ [Giese] فصل ۶۹) ۔ اواخر عہد محمد اول کے اندر سب سے آخر میں علاقائی اعتبار سے دو بیگلربیگی موجود تھے : ایک روم ایلی کا اور ایک آناطولی کا ۔ (قب عاشق پاشازادہ، فصل ۸۱ : ''اناطولیہ کا بیگلربیگی'' اور فصل ۸۳ : ''روم ایلی کا بیگلربیگی''؛ متأخر مؤرخوں کے ہاں اس سے قدیم‌تر زمانوں کے لیے ایسے حوالے تاریخی واقعات کے تسلسل کی غلطیاں قرار دینی چاہییں) ۔ مراد ثانی کے عہد میں صاف طور پر یہی صورت تھی، کیونکہ اس کے زمانے میں روم ایلی اور آناطولی کے بیگلربیگی ان دونوں صوبوں کے گورنر جنرل تھے ۔ ان کے بڑے فرائض یہ تھے کہ سنجاق بیگیوں (رک بآن) کی معرفت جاگیروں کی اس سپاہ کی نگہبانی کریں جن کے سپہ سالار لڑائی

کے وقت وہ خود ہوتے تھے ۔ جب سلطنت عثمانیہ کی حدود میں وسعت ہوئی تو نئے صوبے پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ دسویں صدی هجری / سولھویں صدی عیسوی میں بیگلربیگیوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی تھی ۔ روم ایلی کا بیگلربیگی (جو ۹۴۳ھ / ۱۵۳۷ء سے ''دیوان'' میں داخل کر لیا گیا تھا، قب فریدون، باردوم، ۱ : ۵۹۵) ہمیشہ سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا ۔ دوسرے بھی اسی درجے کے ہوتے (دیکھیے بیان آئندہ) تو ان کا مرتبہ ان کے صوبوں کی فتح کی تاریخ کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا تھا ۔ وزیر اعظم کا روم ایلی کے بیگلربیگی کا عہدہ خود سنبھال لینا بھی کوئی غیر معروف بات نہ تھی ۔

محمد ثانی کے قانون نامہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسی کے زمانے میں بیگلربیگی ایک اعزازی مرتبہ بھی ہو گیا تھا (جیسا کہ سلاجقۂ روم کے زمانے میں ہو گیا تھا، قب کوپرولوزادہ، کتاب مذکور، ص ۱۹۲) جس کے حاصل کرنے والے وزیر کے بعد سب سے مقدم سمجھے جاتے تھے ۔ گیارھویں صدی هجری / سترھویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے روم ایلی کے بیگلربیگی کا عہدہ بھی ایک اعزازی مرتبہ ہو گیا تھا، اگرچہ اس سے واقعی گورنر جنرل ہونا بھی سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے برعکس دسویں صدی هجری / سولھویں صدی عیسوی سے اہم صوبوں کے بیگلربیگی کا عہدہ انہیں عطا کیا جاتا تھا جو وزارت کا مرتبہ حاصل کیے ہوے تھے ۔ انھیں ارد گرد کے صوبوں کے بیگلربیگیوں پر اقتدار حاصل ہوتا تھا ۔ وزیر تین تغ (Tughs) کا اور بیگلربیگی دو تغ کا مستحق ہوتا تھا ۔ وزیر اور بیگلربیگی دونوں کا خطاب پاشا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے جس سنجاق میں بیگلربیگی بودوباش رکھتا تھا اسے پاشا سنجغی کہتے تھے ۔

بیگلر بیگی کو نائب السلطنت (سلطنت وکیلی) سمجھا جاتا تھا ۔ اس کی اپنی ایک چھوٹی سی کچہری ہوتی تھی اور وہ اپنے ''دیوان''، یعنی مجلس مشاورت کی خود صدارت کرتا تھا ۔ پہلے پہل اسے تیماریں اور زعامتیں عطا کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا اور اس کے مقرر کردہ عہدےداروں کے تقرر کی بلاتأمل منظوری دے دی جاتی تھی، مگر ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء کے بعد وہ اپنے حکم (برات) سے فقط چھوٹے چھوٹے (تذکرہ سز) تیمار عطا کر سکتا تھا ۔

بارھویں صدی هجری / اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ اصطلاح اور بھی زیادہ ملتبس ہو گئی، کیونکہ (۱) گورنر جنرلوں کو زیادہتر ''والی'' کا لقب دیا جانے لگا اور بیگلربیگی کا استعمال اس معنی میں متروک ہو گیا (روم ایلی اور آناطولی کے بیگلربیگیوں کے سوا، جیسا کہ D'Ohsson : *Tableu général*، ۷ : ۲۷۸ سے سمجھا جاتا ہے)؛ (۲) فارسی میر میران [رک بآں] جو اس سے پہلے (عربی کے امیر الامراء [رک بآں] کی طرح) بلا تمیز استعمال ہوتا تھا اور بیگلربیگی کا ہم‌معنی سمجھا جاتا تھا، اب بیگلربیگی کے اعزازی مرتبے کے لیے زیادہتر مستعمل ہونے لگا اور اسی اعتبار سے سنجاقوں کے گورنروں کو دیا جانے لگا ۔ جب صوبوں کا انتظام حسب قانون ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء بالکل جدید طریقے سے منضبط ہو گیا تو صوبے کے گورنر کا لقب سرکاری طور پر ''والی'' قرار پایا (قب A. Heidborn : *Droit public et administratif de l'Empire Ottoman* وی انا ـ لائپزگ ۱۹۰۸ء، ص ۱۵۷ ببعد) ۔ اس کے بعد فقط روم‌ایلی بیگلربیگی، میر میران اور میر امراء کے خطابات باقی رہ گئے اور وہ بھی محض اعزازی القاب کے طور پر ۔

مملکتِ صفویہ میں بیگلربیگیوں کا صوبائی گورنروں کے چار طبقوں میں سے دوسرا طبقہ تھا

(تذکرۃ الملوک، ترجمہ اور شرح از V. Minorsky، در سلسلۂ یادگارِ گب (جدید)، ۱۶، لنڈن ۱۹۴۳ء، ص ۲۵، ۴۳، ۱۶۳).

مآخذ: (۱) Hammer-Purgstall: *Staats.*، بمواضع کثیرہ؛ (۲) P. A. von Tischendorf: *Das Lehns-wesen in den Moslemischen Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء؛ (۳) J. Deny: *Sommaire des Archives Turques du Caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء، ص ۱۴ تا ۲۵ و رک بہ ''پاشا'' و ''تیمار''، در ؤ، لائڈن؛ (۴) W. L. Wright: *Ottoman Statecraft*، پرنسٹن ۱۹۳۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: *Osmanli Devletinin Saray Teşkilâtı*، انقرہ ۱۹۴۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۶) وہی مصنف: *Osmanli Devletinin Merkez ve Bahriye Teşkilâtı*، انقرہ ۱۹۴۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) M. Z. Pakalin: *Osmanlı Tarih Deyimleri ve Terimleri Sözlüğü*، بذیل مادۂ *Beylerbeyi*؛ (۸) H. A. R. Gibb و H. Bowen: *Islamic Society and the West*، آوکسفرڈ ۱۹۵۰ء، ۱/۱، خصوصاً ص ۱۳۷ ببعد، اور جو مآخذ وہاں مذکور ہیں۔ اس لفظ کے مرکبات مستعملہ کے لیے دیکھیے Deny: *Gr.*، فصول ۱۱۱۵ تا ۱۱۱۷۔

(V. L. MÉNAGE)

بیگم: (ہندوستانی فارسی میں بیگم؛ ترکی: بیگم)، بیگ [رک بآں] کی تانیث۔ تاریخ ہند کے مغلیہ عہد میں اس کا استعمال تعظیم کے طور پر شہزادیوں ہی تک محدود تھا۔ جہاں آرا بیگم [رک بآں] کا لقب، جو شاہجہان [رک بآں] کی چہیتی بیٹی تھی، اپنے باپ کے عہد میں سرکاری طور پر ''پادشاہ بیگم'' تھا، جس سے شاہجہان کی معزولی اور قید کے بعد بھی وہ بدستور ملقب رہی۔ [انہیں بیگم صاحب، یا صاحبہ کہا جاتا تھا]۔ اکبر کے دور حکومت میں بیگمات (بادشاہ کی بیویاں اور شہزادیاں) ذاتی خرچ کے طور پر ۱۰۲۸ روپے سے لے کر ۱۶۱۰ روپے سالانہ تک لیا کرتی تھیں۔ جہانگیر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نور جہاں کو دو لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے جس کی منظوری اسے شاہجہان نے دے رکھی تھی۔ شاہجہان کی ملکہ ممتاز محل شاہی خزانے سے دس لاکھ روپے سالانہ لیتی تھی، جب کہ بادشاہ بیگم کو چھے لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملا کرتا تھا جو نصف زر نقد اور نصف زمینوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ پاکستان کے قیام (۱۹۴۷ء) سے پہلے ہندوستان کے اعلیٰ، معزز اور شریف خاندانوں کی مسلم خواتین کو ''بیگمات'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اب پاکستان میں تمام شادی شدہ عورتیں بجز غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والیوں کے ''بیگمات'' کہلاتی ہیں، جو ''خانم''، ''مسز'' Mrs. یا ''میڈم'' Madame کا مترادف ہے۔ عربی اور فارسی بولنے والے ممالک اس لفظ کو اس مفہوم میں قطعاً نہیں جانتے۔ شوہر خلوت و جلوت میں اکثر اپنی بیویوں کے اصلی نام لینے سے بچنے کا لحاظ رکھتے اور انہیں بیگم کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان میں مسلمان گھرانوں کے گھریلو ملازم اور خادمائیں اپنی مالکاؤں کو عموماً بیگم کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ رسمی طور پر نوزائیدہ لڑکی کے نام کے ساتھ اس لفظ کو لاحقے کے طور پر لگا دیا جاتا ہے، لیکن اب یہ رواج بڑی تیزی کے ساتھ ناپید ہو رہا ہے۔

مآخذ: (۱) ہوبسن جوبسن Hobson-Jobson بذیل مادہ؛ (۲) آصف اللغات، بذیل مادہ؛ (۳) سید احمد: فرہنگ آصفیہ، بذیل مادہ؛ (۴) عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، مطبوعۂ Bib. Ind.، ۱: ۹۶ و بمدد اشاریہ؛ (۵) آئین اکبری (انگریزی ترجمہ)، ۱: ۶۱۵۔

(بزمی انصاری)

بنگن پلے: ۱۹۴۸ء میں صوبۂ مدراس میں

ضم ہو جانے سے پہلے جنوبی ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست - ریاست کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ تنگا بھدرا کے جنوب میں یہ واحد ریاست تھی جس کا فرمانروا مسلمان تھا - ۱۹۴۸ء میں اس کا رقبہ ۲۷۵ مربع میل اور اس کی آبادی ۴۴,۶۳۱ تھی - ریاست مذکور ۱۵ درجے ۳ دقیقے اور ۱۵ درجے ۲۹ دقیقے عرض البلد شمالی ۷۷ درجے ۵۹ دقیقے اور ۷۸ درجے ۲۲ دقیقے طول البلد مشرقی کے درمیان واقع تھی۔

بنگن پلے کی تاریخ بڑی بوقلموں ہے، اس کا فرمانروا اپنا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے شاہ ایران شاہ عباس ثانی کے ایک وزیر اور ماں کی طرف سے شاہ عالمگیر سے ملاتا ہے - خاندان کے جد اعلٰی میر طاہر علی ترکِ وطن کر کے ایران سے بیجاپور آئے، کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہوے اور وہ انہیں میں مارے گئے - میر طاہر علی کی بیوہ اور چار لڑکوں نے ارکاٹ کے مغل فوجدار سے پناہ طلب کی - اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی پوتی سے شادی کر لی اور یوں گویا اس کا تعلق اس ماحول سے ہو گیا جو آئندہ اس خاندان کا مسکن و مستقر بننے والا تھا۔

بنگن پلے مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں کے قبضے میں آتا جاتا رہا - ۱۶۴۳ء میں وجیانگر کی ریاست کے ایک بڑے حصے کے ساتھ وہ بیجاپور کے زیر اقتدار آ گیا، لیکن جلدی ہی بیجاپور پر مغلوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور یہاں آصفجاہی حکومت قائم ہو گئی - جاگیردار حسین علی نے شاہ میسور حیدر علی کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے زیر سایہ کئی جنگیں لڑیں، لیکن جب سلطان ٹیپو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا تو اس نے جاگیر اس سے واپس لے لی - حسین کی وفات پر اس کی بیوہ نے نظام حیدرآباد (دکن) کے یہاں جا کر پناہ لی اور کہا جاتا ہے کہ خاندان کے کسی ایک شخص نے ۱۷۹۰ء میں سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا - سرنگاپٹم کے معاهدے کی رو سے جاگیر مذکور ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے زیراقتدار آ گئی، یہ ۱۸۳۹ء تک احاطۂ مدراس کے ماتحت رهی اور اس سال سے حکومت هند نے اسے براہِ راست اپنے هاتھ میں لے لیا۔

۱۸۶۲ء کی سند کی رُو سے کسی فرمانروا کے بےاولاد مر جانے کی صورت میں برطانوی حکومت نے اسلامی قانون کے مطابق حق توریث تسلیم کر لیا - ۱۸۶۷ء کو جاگیردار کو نواب کا خاندانی لقب دیا گیا - ۱۸۶۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی تقرئی جبلی کے موقع پر نواب مذکور کو هزهائی‌نس کے الفاظ سے خطاب کیا گیا - آخری فرمانروا نواب میر فضل علی خان ریاست کے مدغم ہونے کے کچھ هی عرصے بعد فوت هوگئے اور خطاب ان کے بڑے لڑکے غلام علی خان کو مل گیا۔

مآخذ: A. Vadivelu: *The Aristocracy of Southern India*، مدراس ۱۹۰۳ء؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*؛ (۳) *The Indian Year Book and Who is Who* ۱۹۴۸ء؛ (۴) *Banganapalle State, its Ruler and Method of Administration*.

(هارون خاں شروانی)

بَیْلان: (نیز Belen)، ایک گاؤں، جو کوهسار امانوس Amanus (= الماطاغ [رکّ باں]) میں اس شاهراہ پر واقع ہے جو اسکندرون سے مشرق کی جانب شمالی شام کی طرف چلی گئی ہے - حکومت اسلامیہ کی ابتدائی صدیوں میں اس مقام کو بظاهر کوئی خاص اهمیت حاصل نہ تھی اور ان دنوں مقامی علاقے کا مشہور شہر بغراس (Πάγραι) تھا - ملحقہ درّۂ بیلان (یعنی قدیم Σύριαι Πύλαι یا Ἀμανίδες Πύλαι) شمالی سوریا کے عواصم میں شامل تھا - اسلامی اقتدار کے طویل دور میں یہ متعدد

ناموں سے موسوم رہا ہے، مثلاً عقبۃ النساء (البلاذری)، ''مضیق بغراس''، باب اسکندرون (قب لا، ت، بذیل مادۂ Belen اور بغراس بیلی (حاجی خلیفہ) - ولایت حلب کے ایک سالنامے مؤرخہ ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ - ۱۹۰۳ء کے مطابق عثمانی سلطان سلیمان قانونی نے بیلان میں ۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء - ۱۵۵۳ء میں ایک مسجد، ایک خان (سرائے) اور حمام بنوایا تھا - اسی مأخذ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن پاشا کی کوششوں سے، جو اس وقت اَدَنہ کی سنجاق کا نگران تھا، ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ - ۱۷۷۰ء میں بیلان کی آبادی بڑھ گئی تھی - جولائی ۱۸۳۲ء میں عثمانیوں نے، مصری فوجوں کے مقابلے میں، جن کی کمان ابراہیم پاشا کے ہاتھ میں تھی، شکست کھائی - اس واقعے کو اس بات کی توجیہ میں پیش کیا جاتا ہے درۂ مذکور کو بعض اوقات مقامی طور پر توپ یولو یا توپ بوغازی کہا جاتا ہے (قب لا، لائڈن، بار اول، بذیل مادۂ Beilan و لا، ت، بذیل مادۂ Belen) - بیلان یا بیان نام کا تسمیہ واضح کرنے کے لیے کئی ایک اشتقاق بتلائے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ ایک یونانی لفظ Πύλαι سے نکلا ہے یا کہ یہ ترکی لفظ bel یا beyl سے مشتق ہے (کسی پہاڑ کی پیٹھ پر کوئی غار) یا bil یا bayl سے مأخوذ ہے (دو پہاڑیوں کے درمیان ایک اونچا راستہ) (قب لا، ت، بذیل مادہ Beilan) - اولیا چلبی کہتا ہے کہ Belen کا لفظ ترکمانوں کی زبان میں نہایت عمودی چڑھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے - بیلان Baylan، جو عثمانی عہد حکومت میں حلب کی ولایت میں ایک قضا کا مرکز تھا، اب صرف ایک ''ناحیہ'' ہے جو ہتائے Hatay کی ولایت میں اسکندرون کی قضا کے ماتحت ہے - ۱۹۴۰ء میں اس کی آبادی گیارہ سو تریپن اور پورے ناحیے کی آبادی پانچ ہزار تین سو تہتر تھی - اناج، پھل، ریشم اور شراب اس علاقے کی زیادہ قابل ذکر پیداوار ہیں.

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح، ص ۱۶۳، ۱۶۷؛ (۲) یاقوت، ۳: ۶۹۲؛ (۳) ابن الشحنہ: الدرّالمنتخب، طبع یوسف بن الیان سرکیس، بیروت ۱۹۰۹ء، ص ۲۲۱؛ (۴) Ch. Ledit: العلائق الخطیرہ (مخطوطۂ ابن شدّاد)، در المشرق، ۳۳/۲، ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۳ تا ۲۰۴؛ (۵) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۵۹۷؛ (۶) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ج ۳، استانبول ۱۳۱۴ھ، ص ۴۸؛ (۷) R. Pococke: *A Description of the East and some other countries*، ج ۲، لنڈن ۱۷۴۵ء، ص ۱۷۳ ببعد، لوحہ ۱؛ (۸) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۳۷؛ (۹) M. Hartmann: *Das Liwa Haleb*، در *ZGErdk Berl*، ۲۹، ۱۸۹۴ء، ص ۷، ۱۰، ۱۱، ۲۶، ۳۲ تا ۳۷، ۸۷ تا ۸۸؛ (۱۰) Cl. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۰ ببعد؛ (۱۱) M. Canard: *Histoire de la Dynastie des Hamdanides de Jazîra et de Syrie*، ج ۱، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۲۲۹؛ (۱۲) Pauly-Wissowa، بذیل مادۂ Σύριαι Πύλαι و Ἀμανίδες Πύλαι؛ (۱۳) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ج ۲، پیرس ۱۸۹۱ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۳؛ (۱۴) E. Honigmann: *Historische Topographie von Nord-Syrien im Altertum*، در *ZDPV*، ج ۴۷، لائپزگ ۱۹۲۴ء، ص ۵۹، و بمدد اشاریہ؛ (۱۵) R. Dussaud: *Topographie Historique de la Syrie Antique et Medièvale*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۳۳ تا ۴۳۶، ۴۴۱ تا ۴۴۳ تا ۴۴۶؛ (۱۶) لا، ت، بذیل مادۂ *Belen* (از Besim Darkot)؛ نیز دیکھیے لا، لائڈن، بار دوم، بذیل مادۂ بغراس و الماطاغی - درۂ بیلان کی لڑائی ۱۸۳۲ء پر قب مآخذ بذیل مادۂ ابراہیم پاشا، در لا، لائڈن، بار دوم و لا، ت.

(V. J. PARRY)

* بیلقان : اران (البانیہ) کا ایک قدیم شہر، جو قفقاز کے جنوب میں واقع ہے ۔ کہتے ہیں اس کی بنیاد قباد ساسانی نے رکھی تھی ۔ بیلقان دوسری عرب خزر جنگ میں میدان کارزار بنا اور ۱۱۲ھ / ۷۳۰ء میں مسلمان جرنیل سعید بن عمرو الحرشی نے یہاں خزروں پر بڑی اہم فتح حاصل کی ۔

مآخذ : D. M. Dunlop : *History of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۴ء ۔

(D. M. DUNLOP)

* البیلمان : رک بہ مجلس ۔

* بیلان : رک بہ بیلان ۔

* بیلو : (= بیلوس)، رک بہ بالیوس ۔

* بیلہ جک : رک بہ بلجک ۔

* بیلین : (Beleyn) چرواہوں اور مزارعوں کے ایک جتھے کا نام، جو صوبۂ کرن واقع ارتریا [رک بآں] (= اریتریا) کے جنوبی حصے میں بود و باش رکھتا ہے ۔ یہ لوگ آپس میں بوگوس Bogos کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تعداد کوئی تیس ہزار ہے ۔ جتھابندی کی رو سے ان کے دو بڑے قبیلے ہیں، بیت ترکی Bait Tarké اور بیت توکی Bait Tawké، جن میں تمدنی اور معاشری لحاظ سے باہم غایت درجہ یگانگت ہے، اگرچہ نسلاً (جو محض افسانوی تخیل ہے) باہم مختلف ہونے کے مدعی ہیں ۔ ہرچند کہ ایک خاص قسم کا آقا اور غلام کا سا باہمی تعلق ان کے اندر قدیم الایام سے موجود ہے، لیکن اب حکومت کے براہ راست اقتدار نے بہت کچھ قبائلی منصب کی جگہ لے لی ہے ۔ کرن کے علاقے پر مصری قبضہ ہونے تک (۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء تا ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) بیلین کے لوگ بالعموم عیسائی مذہب کے پیرو رہے، اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا ۔

بیلینی زبان، جو اور کہیں نہیں بولی جاتی Kushitic (حامی) زبانوں کی شاخ اگاؤ Agau کی بولی ہے جسے سامی زبان نہیں بتایا جا سکتا ہے، نیز ان کی معاشری ڈھانچے اور عوامی کہانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد خالص اگاؤ Agau عناصر سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایز میں ان کا وجود اس (غیر اثرپذیر) اگاؤ عنصر کا رہین منت ہے جو دسویں ۔ گیارھویں صدی ہجری/سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں شمالی حبشہ سے ترک وطن کر کے اس علاقے میں آئے جہاں کے لوگ تمدن اور طاقت میں ان سے کم درجے کے تھے ۔

مآخذ : (۱) W. Münzinger : *...udi sull' Africa Orientale*، روما ۱۸۸۲ء؛ (۲) C. Conti Rossini : *Principi di diritto Consuetudinario dell' Eritrea*، ۱۹۱۶ء؛ (۳) A. Pollera : *popolazioni indigene dell' Eritrea*، Bologna ۱۹۳۰ء؛ (۴) H. Longrigg : *Short History of Eritrea*، آوکسفرڈ ۱۹۴۵؛ (۵) British Military Administration of Eritrea : *Races and Tribes of Eritrea* : (S. F. Nadel) Eritrea Asmara ۱۹۴۳ء ۔

(S. H. LONGRIGG)

بیمارستان : اکثر بالتخفیف ''مارستان''، فارسی کلمۂ ''بیمار'' اور لاحقہ ''ستان'' (بمعنی جگہ) مرکب ہے، بمعنی ہسپتال ۔ جدید محاورے میں بیمارستان کا اطلاق خصوصاً پاگل خانے ہوتا ہے ۔

(۱) ابتدائی دور اور اسلامی مشرق

خود عربوں کے قول کے مطابق (قب المقریزی: الخطط، ۲ : ۴۰۵ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۳ : ۲۰۸])، سب سے پہلے ہسپتال کی بنیاد یا تو مصر کے ایک اساطیری [قبطی] بادشاہ مناقیوش [بن اشمون] نے رکھی تھی یا بقراط نے ۔ مؤخرالذکر کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے اپنے گھر کے پاس ایک

میں بیماروں کے لیے ایک قیام گاہ آخندوکین Xenodokeion بنائی تھی، جس کا لفظی ترجمہ ''پردیسیوں کی اقامت گاہ'' ہے ۔ اس بیان کی سند میں ابن ابی اُصیبعۃ (عیون، طبع مُلّر Müller، ۱ : ۲۶ تا ۲۷)، جالینوس Galen کی کتاب فی اخلاق النفس، مقالۂ سوم (*Peri Ethon*) پیش کرتا ہے ۔ یہ کتاب اب یونانی زبان میں ناپید ہے [عیون، محل مذکور سے واضح نہیں ہوتا کہ بیمارستان کی ایجاد جالینوس نے بقراط کی طرف منسوب کی ہے] ۔ عہدِ عتیق میں ہسپتال چونکہ لوگوں کی زندگی میں کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے لہٰذا مذکورۂ بالا حوالوں سے ان کے آغاز کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ الولید ابن عبدالملک (۸۶ھ / ۷۰۵ء تا ۹۶ھ / ۷۱۵ء) پہلا شخص تھا جس نے عالمِ اسلام میں مارستان تعمیر کیا اور اس میں اطبّا رکھے اور ان کے لیے وجہ معاش [ارزاق] مقرر کی (المقریزی، محل مذکور)، لیکن اس امر کے باوجود کہ ابنُ الفقیہ جیسے قدیم مصنّف نے بھی، جس کا سنہ تقریباً ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء (ص ۱۰۶ تا ۱۰۷) ہے، اس کا ذکر بالکل ایسے ہی الفاظ میں کیا ہے (البیمارستانات للمرضی، یعنی بیمارستان مریضوں کے لیے ہوتے ہیں)، پھر بھی اس واقعے میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی ہے بقول الطبری (۲ : ۱۱۹۶)، الولید نے کوڑھیوں کو [علیحدہ رکھنے کا حکم دیا اور ان کے لیے عام لوگوں سے اختلاط ممنوع قرار دیا] اور ان کے لیے مدد معاش مقرر کر دی ۔ یہ ایک مختصر سا بیان ہے جو ایک اور مقام پر قدرے زیادہ تفصیل سے دیا گیا ہے (۲ : ۱۲۷۱)، جس میں الطبری لکھتا ہے کہ الولید نے کوڑھیوں کو عطیے دیے اور بھیک مانگنے سے منع کیا ۔ اس نے ہر اپاھج کے لیے ایک خادم اور ہر اندھے کے لیے ایک عصا کش (رھنما) مقرر کر دیا تھا ۔ ابن الاثیر (بذیل سنہ ۸۸ھ/۷۰۷ء) بھی مختصراً یہی کہتا ہے (نیز دیکھیے الذھبی : تاریخ الاسلام، ۴ : ۶۷) ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ ایسے اقدامات کا ذکر ہے جو بیماروں کو باقی آبادی سے علیحدہ رکھنے سے متعلق کیے گئے ۔ تقریباً اسی طرح جیسا کہ بعد میں مسلم ہسپانیہ میں کیا گیا، جہاں قُرطُبہ کا پورا ایک محلہ ''رَبضُ المَرضٰی'' (بیماروں کی بستی) کے طور پر معروف تھا (قبّ E. Lévi-Provençal : *Hist Esp. mus.*، ۳ : ۳۸۱ تا ۳۸۲، ۴۳۴).

اسلام میں ہسپتالوں کے قیام میں خوزستان میں جُندیشاپور [رکّ بآن] کے مدرسۂ طبّ اور ہسپتال کا اثر بھی پڑا ۔ اس ادارے نے، جس کی بنیاد ساسانیوں نے رکھی تھی، اپنی شامی، ایرانی اور ھندی اور آخر میں یونانی روایات کو عربوں کے عہد تک بر قرار رکھا ۔ اور جس وقت دارالحکومت العراق میں منتقل ہو گیا، اس نے طب عربی کے ارتقا پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ جہاں تک ہسپتالوں کا تعلق ہے، جُندیسابور سے رابطے کے ثمرات ہارون الرشید (۱۷۰ھ / ۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء) کے عہدِ حکومت میں ظاہر ہوے، جس نے جبرائیل بن بختیشوع کو جو اس (جُندیسابور) کے مدرسے کا عیسائی طبیب تھا بغداد میں ایک بیمارستان کے قائم کرنے کا کام سپرد کر دیا ۔ اسی موقع پر جندیسابور کے بیمارستان کے ایک ماھر دواساز کو بغداد بھجوا دیا گیا ۔ اس شخص کا بیٹا یوحنّا (یحیی) بن ماسویہ بعد میں اس بیمارستان کا رئیس بن گیا (ابن القفطی : تاریخ الحکما، طبع لپرٹ Lippert، ص ۳۸۳ تا ۳۸۴؛ ابن ابی اصیبعہ، ۱ : ۱۷۳ تا ۱۷۵) ۔ بغداد کا اصلی ہسپتال جنوب مغربی مضافات شہر میں نہر کرخایا پر واقع تھا، یہی وہ جگہ ہے جہاں

جُندیسابور کی رواداراَنہ روایات کے تتبع میں یحیی بن خالد البرمکی کی فرمائش پر مَنکَہ ہندی نے سنسکرت کی طبی تصنیف سُشرتہ ـ سمہتا susruta samhitā کا فارسی میں ترجمہ کیا (الفہرست، ص۳۰۳) اور بعض روایات کے مطابق الرازی (Rhazes) نے بھی وہاں درس دیا.

یہ بات واضح نہیں کہ ہارون کا بیمارستان کب تک تنہا چلتا رہا ـ بہر حال ہم یہ سنتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے شروع سے یا اس سے ذرا پہلے سے بغداد میں نئے بیمارستانوں کا سیلاب اُمنڈ آیا ـ ایک بیمارستان کی بنیاد بدر المعتضد (۲۷۹ھ/۸۹۲ء تا ۲۸۹ھ/۹۰۲ء) کے غلام المعتضدی نے دریاے دجلہ کے مشرقی کنارے پر المخرِم کے علاقے میں رکھی تھی (ابن ابی اُصیبِعۃ، ۱ : ۲۲۱، قبّ ۲۱۴) ـ ایک اور بیمارستان علاقۂ الحربیہ میں، شہر المنصور کے شمال میں تھا، جس کے لیے ۳۰۲ھ/۹۱۴ء میں نیک وزیر [ابوالحسن] علی بن عیسی نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا ـ اسی وزیر نے نہ صرف اس ہسپتال بلکہ بغداد، مکّۂ معظّمہ اور مدینۂ منورہ کے تمام ہسپتالوں کی نگرانی ابو عثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کے سپرد کی تھی ـ [ابو عثمان مذکور اس لیے بھی فاضل طبیب ہے کہ اس نے طب کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل کیں] (ابن ابی اُصیبعہ، ۱ : ۲۳۴)؛ بیمارستان السیّدہ [دجلہ کے] مشرقی کنارے پر تھا جسے سِنان بن ثابت نے محرم ۳۰۶ھ/جون ۹۱۸ء میں بنایا تھا ـ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغداد اور دیگر مقامات کے ہسپتالوں کے منتظم عمومی کی حیثیت سے ابو عثمان الدمشقی کا جانشین مقرر ہوا تھا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱ : ۲۲۱ تا ۲۲۲)؛ البیمارستان المقتدری، باب الشام میں [۳۰۶ھ] کے قریب ہی کے عہد میں تعمیر ہوا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱، ۲۲۲)، اور بیمارستان ابن الفُرات، دَرب المُفضّل میں؛ کہتے ہیں کہ اسے ۳۱۳ھ/۹۲۵ء میں ثابت بن سنان کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱ : ۲۲۴) ـ ان ہسپتالوں کی آمدنی کا ذریعہ وہ اوقاف ہوتے تھے جنھیں اربابِ اختیار اور اہلِ ثروت اس مطلب کے لیے قائم کر دیا کرتے تھے ـ یہ اوقاف متولیوں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے جو شاید بعض صورتوں میں اپنے فرائض کا پورا خیال نہیں رکھتے تھے ([قبّ] ابن ابی اُصیبعہ؛ ۱ : ۲۲۱) ـ ہسپتالوں کی وسعت کا اندازہ ان کے ماہانہ اخراجات سے لگایا جا سکتا ہے ـ بیمارستان مُقتدری کا خرچ دو سو دینار ماہانہ؛ بیمارستان سیّدہ کا چھے سو دینار ماہانہ (علٰی ہٰذاالقیاس) ـ مریضوں کی آسائش کے لیے جاڑے میں کمبلوں [اور لباس] اور کوئلے [اور غذا] کا انتظام بھی ہوتا تھا، اور بعض اوقات تو اس قسم کی سہولتیں اور بھی زیادہ وسیع پیمانے پر مہیّا کی جاتی تھیں (دیکھیے سطور ذیل).

صوبائی ہسپتالوں کے متعلق ہماری معلومات نسبۃً کم ہیں، لیکن کچھ ہسپتال چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی سے پہلے یقیناً موجود تھے ـ الرّیّ کا بیمارستان، جس کا الرازی بغداد آنے سے پہلے ناظم تھا، جہاں اس نے ۳۲۰ھ/۹۳۲ء کے قریب ایک ہسپتال کے ناظم کی حیثیت میں وفات پائی (ابن القفطی، ص ۲۷۲)، ایک بڑا ادارہ تھا (قبّ ابن القفطی، ص ۲۷۳؛ ابن ابی اُصیبعہ، ۱ : ۳۱۰ تا ۳۱۱) اور غالباً کچھ عرصے سے قائم تھا ـ ایک پاگل‌خانہ واسط اور بغداد کے درمیان دَیر ہِزقِل کے مقام پر تھا، جسے المُبرّد نے المتوکّل کے عہدِ خلافت میں دیکھا تھا، یعنی ۲۳۲ھ/۸۴۷ء اور ۲۴۷ھ/۸۶۱ء کے درمیان (المسعودی : مروج، ۷ : ۱۹۷ ببعد [العقد، طبع ۱۳۲۱ھ، ۳ : ۲۶۰

و نہارس و حواشی؛ ابن جُبیر (رحلة، ص ۲۸۳) نے چوتھی صدی ہجری میں دمشق کے دارالمجانین میں علاج مجانین کا بھی ذکر کیا ہے]۔

سنان بن ثابت (م [ذوالحجہ] ۳۳۱ھ / ۹۴۳ء، الفہرست، ص ۳۰۲)، کے زمانے میں علی بن عیسی مذکور کے حکم کے مطابق اطبا روزانہ جیل خانوں کا معائنہ کرتے تھے ۔ بیمار قیدیوں کی دوا دارو کی جاتی تھی اور [حسب ضرورت ان کے لیے مُزوّرات بھی (یعنی طعام بے گوشت کہ جس میں دھنیا وغیرہ ڈال کر بیماروں کے لیے پکاتے ہیں) تیار کیے جاتے تھے] (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱ : ۲۲۱) ۔ اسی زمانے میں اطبا اور اُن کے ہمراہ ایک گشتی شفاخانہ (خِزانةُ الْاَدْوِیَةِ و الْاَشْرِبة) کوسواد (یعنی عراق زیریں) کے دیہات میں بھیجا جاتا تھا ۔ اس گشتی شفاخانے سے متعلق سنان اور وزیر کے درمیان خط و کتابت سے مترشّح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بلا امتیاز غیر مسلموں اور مسلموں دونوں کا علاج بیمارستانوں میں ہوتا تھا (ابن ابی اُصَیبعہ، کتاب مذکور)۔

عضُدالدولہ بویہی نے دریاے دجلہ کے موڑ پر مغربی بغداد میں جب ''بیمارستان عضُدی'' کی بنیاد رکھی تھی تو اس وقت بغداد کے مذکورۂ بالا بیمارستانوں میں سے کم از کم کچھ بہرحال موجود تھے ۔ عضدالدولہ کا یہ ہسپتال عضدالدولہ کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے، یعنی ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں قائم ہوا، (الذہبی : دول الاسلام، ۱ : ۱۶۷) اور بغداد کا سب سے زیادہ شاندار ہسپتال سمجھا جاتا تھا اور الرازی کا نام اس ہسپتال کے سلسلے میں بار بار لیا جاتا ہے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ الرازی نے اس ہسپتال کی جگہ اس طریقے سے منتخب کی کہ اس نے بغداد کے دونوں حصوں کے ہر ناحیے میں گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لٹکوا دیا، اور جہاں گوشت میں بدبو نسبۃً دیر میں پیدا ہوئی وہ جگہ ہسپتال کے لیے منتخب کر لی، نیز یہ کہ عضدالدولہ نے الرازی کو ایک سو سے زائد اطبّا میں سے اُس نئے ادارے کا مہتمم اعلٰی (اصل میں لفظ ''ساعُور'' ہے جو سریانی سے ماخوذ ہے) منتخب کیا تھا (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱ : ۳۰۹ تا ۳۱۰)، لیکن الرازی پچاس برس پہلے فوت ہو چکا تھا ۔ اس اختلاف زمانی کی توجیہ، جس کی طرف ابن ابی اُصَیبعہ (: کتاب مذکور) پہلے ہی توجّہ دلا چکا ہے، یہ ہو سکتی ہے کہ بیمارستان عضدی اور بیمارستان معتضدی کے اسلا میں مماثلت پائی ہے، بیمارستان معتضدی کی بنیاد المعتضد نے الرازی کی زندگی ہی میں رکھی تھی (دیکھیے اُوپر)۔

جب عضدالدولہ نے بغداد میں بیمارستان بنایا تو اس میں چوبیس اطبّا تھے (ابن القفطی، ص ۲۳۵ تا ۲۳۶) ۔ ماہرین خصوصی کی متعدد جماعتوں کا ذکر آتا ہے : طبائعیون (ماہرین عضویات)، کحّالون (ماہرین امراض چشم)، جرّاحون (surgeons) اور مُجبِّرون (ہڈی بٹھانے والے bone-setters) (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱ : ۳۱۰) ۔ جبرائیل بن عبیداللہ کے کام کرنے کے مقررہ اوقات ہفتے میں دو دن اور دو راتیں ہوتی تھیں، اور اس کی تنخواہ ماہانہ تین سو درہم تھی (ابن القفطی، ص ۱۴۸) ۔ عضدی ہسپتال میں لیکچر دیے جاتے تھے (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱ : ۲۳۹، ۲۴۴)، اور اس طریقے سے جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے بعض کا ہمیں علم ہے، مثلا سابور بن سہل جندیسابوری کی اقراباذین (Antidotarium) (الفہرست، ص ۲۹۷، قبّ براکلمان، ۱ : ۲۳۲)، جس کے بجاے بالآخر ابنُ التِّلمیذ کی اسی نام کی کتاب استعمال میں آنے لگی ۔ ابن التلمیذ بعد میں عضدی ہسپتال کا صدر (ساعُور، اُوپر دیکھیے) بنا (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱ : ۲۵۹، ۲۶۱)؛ [مگر الفہرست

اور عیون میں صرف یہ لکھا ہے کہ سابور کی اقراباذین بیمارستان میں اور صیادلہ کی دکانوں میں معمول علیہ تھی خصوصًا ابن التلمیذ کی مؤلفہ اقراباذین سے پہلے] - جب ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں ابن جبیر بغداد آیا تو یہ جگہ ایک بڑے قلعے کی مانند تھی، جس میں آب رسانی کا انتظام دریاے دجلہ سے تھا اور شاہی محلات کا پورا ساز و سامان موجود تھا (رحلۃ، طبع ڈخویہ De Goeje، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶).

مسلمانوں کے ازمنۂ وسطٰی کے بڑے بڑے ہسپتالوں کے سلسلے کے ایک اور ہسپتال کی بنیاد نور الدین بن زنگی (۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء تا ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء) نے دمشق میں رکھی تھی - کہا جاتا ہے کہ نوری ہسپتال ایک فرنگی بادشاہ کے زر فدیہ سے تعمیر ہوا تھا جس کا نام نہیں بتایا گیا - المقریزی : خطط، ۲ : ۴۰۸ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۴ : ۲۶۲] - ہسپتال کے ملازمین رجسٹروں میں مریضوں کے نام اور وہ اخراجات بھی درج کرتے تھے جو ہر ایک مریض کی غذا اور دواؤں وغیرہ کے لیے روزانہ کیے جاتے تھے - یہ تمام کیفیت ابن جبیر (رحلۃ، ص ۲۸۳) نے ہمیں بتائی ہے - نوری ہسپتال کے کسی سر برآوردہ طبیب کی زندگی کے ایک مثالی دن میں یہ چیزیں شامل تھیں : بیماروں کا پھر کر معائنہ کرنا [اور ان کا حال پوچھنا]، ہر مریض کے لیے نسخے اور ہدایات ("المداواۃ و التدبیر") تجویز کرنا، نجی مریضوں کا معائنہ کرنا اور شام کو واپس ہسپتال [کے بڑے ہال (الایوان الکبیر) میں بیٹھ کر جہاں لائبریری بھی تھی اطبا اور طلبہ کی جماعت کے ساتھ تین گھنٹے تک طبی مباحث اور درس میں اشتغال اور مطالعۂ کتب] (ابن ابی اصیبعہ، ۲ : ۱۵۵) - حلب میں بھی ایک نوری ہسپتال تھا (راغب الطباخ : تاریخ حلب ۲ : ۷۷).

جب احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ / ۸۷۲ء تا ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء میں بیمارستان بنایا، تو اس وقت تک مصر میں کوئی بیمارستان موجود نہ تھا المقریزی : خطط، ۲ : ۴۰۵ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۴ : ۲۵۸] - یہاں یہ قاعدہ تھا کہ کسی فوجی سپاہی یا غلام کو اس میں بغرض معالجہ داخل نہیں کیا جاتا تھا - اس ادارے میں مردوں اور عورتوں کی آسائش کے لیے وافر سامان مہیا تھا - بیمارستان ناصری سلطان صلاح الدین نے تعمیر کیا تھا، لیکن المنصور قلاؤن کا عظیم‌الشان بیمارستان جو ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں گیارہ ماہ [اور کچھ دن] میں مکمل ہوا [خطط، طبع مصر ۱۳۲۶ھ ۴ : ۲۶۰]، یہ مصر میں اپنی قسم کا سب سے زیادہ شاندار ہسپتال تھا، اور شاید ان سب ہسپتالوں سے زیادہ مکمل جو دنیاے اسلام میں اس وقت تک دیکھنے میں آئے تھے - [عمارت مکمل ہوئی تو ملک منصور قلاؤن نے] تقریبًا دس لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف اس ہسپتال سے متعلق کیے (المقریزی، خطط، ۲ : ۴۰۶، بمصر ۱۳۲۶ھ محل مذکور) - اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کو داخل کیا جاتا تھا - کسی کو رد نہیں کیا جاتا تھا، اور نہ ہی معالجے کی مدت کی کوئی حد مقرر تھی - منصوری ہسپتال میں جو پہلے فاطمیوں کا محل تھا، آٹھ ہزار نفوس کے لیے جگہ تھی، علیحدہ علیحدہ ایوان یا وارڈ تھے، جن میں حمیات (یعنی بخاروں کے لیے)، آشوب چشم، مواردِ عمل جراحی، اسہال کے مریضوں کے لیے الگ الگ ایوان تھے جہاں مریضوں کا علیحدہ علیحدہ علاج ہوتا تھا، اس میں ادویہ سازی کا شعبہ، نسخے بنانے کا کمرہ اور مخازن تھے، ہر دو صنف کے خدمت گزار، کثیرالتعداد انتظامی عملہ، لیکچروں کے لیے انتظامات، غرض وہاں بیماروں کی شفایابی کے لیے ہر وہ

چیز موجود تھی جو اس عہد کے بہترین تجارب کی رو سے ضروری تھی ۔ ان امور کا حال جو المقریزی (خطط، ۲ : ۴۰۶ تا ۴۰۸) نے بیان کیا ہے وہ گویا ایک مؤثر خراجِ تحسین ہے جو قرونِ وسطی کے اسلامی علمِ بیمارستان کو پیش کیا جا رہا ہے ۔

ہسپتالوں کے متعلق کتابیں تصنیف ہوئیں، مثلاً الرازی کی کتاب فی صفات البیمارستان (ابن ابی اصیبعہ، ۱ : ۳۱۰)، جو بیمارستان پر بہترین کتاب ہے (قب ابن القفطی، ص ۲۷۲ = ابن جُلجل، طبع فؤاد سیّد، ص ۷۷)، جو زاہد العلماء الفارقی کی کتاب البیمارستانات کی طرح اب ناپید ہے (ابن ابی اُصیبعۃ، ۱ : ۲۵۳) ۔[الفارقی پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے ماہر طبیبوں میں سے تھا، جس نے نصیرالدولہ بن مروان کے حکم سے میافارقین میں بیمارستان بنایا جس میں نہایت عمدہ سامان موجود تھا] ۔ ان سے ذرا مختلف یہ کتابیں ہیں: ابن التلمیذ: مقالۃ امینیۃ فی الادویۃ البیمارستانیۃ اور ابن ابی البیان: الدستور البیمارستانی؛ یہ دونوں تصنیفات قرابادین (دستور دوا سازی) کی قسم کی ہیں جن کا ذکر Paul Sbath نے کیا ہے (الفہرست، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۱ : ۱۰، ۵۷) ۔ الدستور البیمارستانی اس نے طبع بھی کی ہے (*Bulletin de l' Institut d' Egypte*، ۱۵، ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء: ۱۳ تا ۷۸).

مآخذ: (۱) W. Leclerc : *Histoire de la Médecine arabe*، پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۵۵۷ تا ۵۷۲؛ (۲) E. G. Browne : *Arabian Medicine*، کیمبرج ۱۹۲۱ء، ص ۴۵ تا ۴۶، ۵۶، ۱۰۱ تا ۱۰۲؛ (۳) امین أ ۔ خیراللہ : *Outline of Arabic Contributions to Medicine and the Allied Sciences*، بیروت ۱۹۴۶ء، ص ۵۹ تا ۷۳ (اس میں چند غلطیاں پائی جاتی ہیں)؛ (۴) C. Elgood : *A Medical History of Persia and the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۵۱ء، بمدد اشاریہ (اس میں المغرب کے اسلامی ممالک کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں)؛ (۵) G. Le Strange : *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، آوکسفرڈ ۱۹۰۰ء، بار دوم ۱۹۲۴ء، ص ۶۲، ۱۰۳ تا ۱۰۵؛ (۶) E. W. Lane : *Cairo Fifty Years Ago*، لنڈن ۱۸۹۶ء ص ۹۲ تا ۹۴ (گذشتہ صدی میں منصوری ہسپتال کی زبون حالی)؛ (۷) M.W. Hilton-Simpson : *Arab Medicine and Surgery*، آوکسفرڈ ۱۹۲۲ء، ص ۱۳ (الجزائر جدید میں دیہاتی ہسپتال)؛ (۸) احمد عیسٰی بک : *Histoire des bimaristans (hôpitaux) à l'époque islamique*، قاہرہ ۱۹۲۸ء؛ (۹) وہی مصنف: تاریخ البیمارستانات فی الاسلام، دمشق ۱۹۳۹ء؛ (۱۰) J. Sauvaget : *Alep*، متن، ۱۲۶ حاشیہ ۱، اور مرقع، لوح ۶۱ ۔

(D. M. Dunlop)

۲ ۔ المغرب کے اسلامی ممالک.

شمالی افریقہ میں پہلا بڑا ہسپتال، جس کے متعلق کوئی شہادت موجود ہے، قاہرہ کے بڑے ہسپتال کے قیام سے تقریباً ایک صدی پہلے سلطان یعقوب المنصور الموحدی (۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء) کے ہاتھوں مراکش میں تعمیر ہوا تھا ۔ اس سلطان کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا، چنانچہ جب وہ اپنے وقت کے مشہور ہسپانوی اطبا کو، مثلاً ابن طفیل، ابن رُشد، ابن زُہر الحَفید اور اس کے بیٹے کو اپنے دربار میں کھینچ لایا تو اس نے غیر ملکی غریب و امیر مریضوں کے لیے اپنے دارالحکومت میں ایک عظیم الشان ہسپتال بنوایا، جس کی کیفیت عبدالواحد المراکشی نے بیان کی ہے (قب المعجب، طبع محمد الفاسی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۷۶ تا ۱۷۷ [= طبع ڈوزی، ص ۲۰۹]) ۔ اسی سلطان نے اپنی سلطنت کے

مختلف حصوں میں پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے بھی ہسپتال تعمیر کیے (قب القرطاس، مطبوعۂ فاس، ۱۳۰۵ھ، ص ۱۵۳، ترجمہ Beaumier، ص ۳۰۶).

عظیم مرینی سلطانوں [رک بآں]، مثلاً ابو یوسف یعقوب، ابوالحسن اور ابو عنان نے ان ہسپتالوں کو بدستور قائم رکھا بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ بھی کیا (قب القرطاس، فاس ۱۳۰۵ھ، ص ۲۱۳؛ الذخیرة السنیة، طبع ابن شنب، ص ۱۰۰؛ ابن مرزوق: المسند، طبع Lévi Provençal، در *Hesperis*، ۵ (۱۹۲۵ء): ۳۶؛ ابن بطوطه: رحلة، طبع Defremery اور Sanguinetti، ۴: ۳۴۷) ۔ زمانۂ بعد کے سلاطین نے ان محاصل کو جو ہسپتالوں پر صرف ہونے چاہیے تھے اپنے تصرف میں لے لیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپتالوں کی حالت خراب ہو گئی یا بند ہو گئے۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں [الحسن بن محمد الوزان] (Leo Africanus) نے فاس کے ہسپتال کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بالکل انحطاط کی حالت میں تھا، اور اسے بنیادی طور پر خطرناک پاگلوں کے قیدخانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ اس ہسپتال سے ابھی تک یہی کام لیا جاتا ہے اور یہ زنانے جیل‌خانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے (قب Leo Africanus : *Description de l'Afrique*، ترجمۂ Schefer ۲ : ۷۸، ترجمۂ Épaulard، ۱ : ۱۸۸؛ *Fes* : Le Tourneau، ص ۲۰۵ تا ۲۰۷).

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مراکش میں مشہور الموحدی ہسپتال اس طرح غائب ہوا کہ اس کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہا، اور وہاں جو ہسپتال سلطان عبداللہ الغالب باللہ السعدی (۹۶۵ھ/ ۱۵۵۷ء تا ۹۸۱ھ / ۱۵۷۴ء) نے تعمیر کیا تھا، وہ عورتوں کا جیل‌خانہ بن گیا (قب، الناصری : کتاب الاستقصاء، ترجمہ ۵ : ۶۳).

۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ - ۱۸۳۲ء میں علوی سلطان مولای عبدالرحمن نے سالی Salé کے مقام پر سیدی ابن عاشر کی درگاہ سے متصل ایک ہسپتال تعمیر کیا تھا ۔ اس ہسپتال میں جو ابھی تک موجود ہے، اطبا سے کام نہیں لیا جاتا تھا ۔ ان کے بجائے مریض اپنی شفایابی کے لیے اس ولی کی ''برکت'' پر بھروسا کرتے تھے ۔ پرانے ہسپتالوں کی یاد، جو اب ناپید ہو چکے ہیں یا استعمال میں نہیں رہے ہیں، مراکش کے بعض شہروں، مثلاً رباط اور القصر میں ابھی تک باقی ہے (قب برونو *Textes arabes de Rabat* : L. Brunot، جلد ۲، فرہنگ ص ۳۵۷) اور اسی طرح طنجہ میں بھی.

کوڑھیوں کو، جنھیں حسن تعبیر سے جذامی کے بجائے ''مرضی'' کہتے تھے، شہروں سے باہر ''الحارة'' نام کے ایک خاص محلے میں رکھا جاتا تھا ۔ فاس میں انھیں ابتدا میں باب الخوخة کے باہر تلمسان جانے والی سڑک پر آباد کیا گیا تھا ۔ تیرھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں انھیں باب الشریعة کے باہر غاروں میں منتقل کر دیا گیا، پھر ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں انھیں باب الگیسه (الجیزة) کے باہر دوسرے غاروں میں رکھ دیا گیا ۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں وہ سوق الخمیس کے قریب ایک قصبے میں رہا کرتے تھے (قب، القرطاس، رباط ۱۹۳۶، ۱ : ۵۳ تا ۵۴؛ الحسن بن محمد الوزان Leo Africanus : *Description de l'Afrique*، ترجمۂ Epaulard، ۱ : ۲۲۹) ۔ مراکش میں ''حارہ'' ابتدا میں باب آغمات کے باہر تھا ۔ یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطان المنصور السعدی نے انھیں باب دکالہ کے باہر منتقل کر دیا۔

تونس میں، سلطان ابو فارس الحفصی نے ''مفلس، غریب الدیار اور بیمار مسلمانوں'' کے لیے پہلے ہسپتال کی بنیاد رکھی، جو ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا (قب الزرکشی : تاریخ الدولتین، تونس ۱۲۸۹ء، ص ۱۰۲) - غرناطہ میں بنو نصر کے سلطان محمد پنجم نے ''بیمار اور غریب مسلمانوں'' کے لیے ایک شاندار ہسپتال بنایا، جو ۷۶۸ھ / ۱۳۶۷ء میں مکمل ہوا - اس کے سنگ بنیاد پر یہ عبارت مرقوم ہے : ''ان علاقوں میں اسلام کے اثر و نفوذ کی ابتدا سے لے کر آج تک اس قسم کا کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا'' - ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے بلنسیہ کی *Vocabulista* میں ہسپتال Hospitale کا ترجمہ مقامی بولی، یعنی مروجہ روزمرہ میں ''مرستان'' اور ''ملستان'' کیا جاتا رہا ہے (قب ابن الخطیب : الاحاطة، قاهرة ۱۳۱۹ھ، ۲ : ۲۹؛ Lévi Provençal : *Inscriptions arabes d' Espagne*، ص ۱۶۳؛ L. Seco de Lucena : *Plano de Granada arabe*، ص ۳۵).

'بیمارستان' (Hospital؛ جو مریضوں کے لیے ہوتا تھا) اور 'منزل' (hospicess؛ مسافروں کے ٹھیرنے کی جگہ) کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے - المغرب (بلاد اسلامیہ) میں جن بادشاہوں نے اکثر ہسپتال تعمیر کیے، انھوں نے ایسی منازل بھی بڑے بڑے شہروں کے باہر بنائیں جن کا نام ''زاویۃ'' [رک بآں] ہو گیا (قب G. S. Colin : *La Zaouya mérinite d'Ancmli, a Taza*، در *Hespéris*، ۱۹۵۳ء، ۲ : ۱) - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الخفاجی نے اس بیان میں اپنے زمانے سے پہلے کی ایک غلطی کو دھرایا ہے کہ سب سے پہلا بیمارستان بقراط نے قائم کیا تھا، جس نے اسے ''اخشندوکیون'' (ξενοδοχεῖον)، یعنی (مسافروں کی قیام گاہ) کے نام سے موسوم کیا (قب شفاء الغلیل، قاهرة ۱۲۸۲ھ، ۵۶) (قب سطور بالا، حصہ اول).

المعجب کا مراکشی مصنف (قب سطور بالا) ھی فقط ایسا المغرب (شمالی افریقہ) کا مصنف ہے جس نے ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء میں اپنی کتاب بغداد میں لکھتے ہوئے صحیح صرفی صورت : ''بیمارستان'' استعمال کی ہے، ورنہ دوسرے سبھی ''مارستان'' ھی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی بحذف جزء اول کلمہ (بی) - مارستان کے پہلے الف ساکن کو بہت جلد حذف کر دیا جانے لگا - ہسپانوی بولیوں میں ر کے بعد زبر کی آواز ہوتی تھی (*Vocabulista* : *Marastān* و *Malastan* ؛ P. de Alcalá : *Marastèn* - الخفاجی کے بیان سے ظاہر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں مصر میں بھی یہی تلفظ رائج تھا (قب شفاء، قاهرة ۱۲۸۲ء، ص ۲۰۶) - آج کل قاهرہ میں اس لفظ کا تلفظ مرستان کیا جاتا ہے .

المغرب کی جدید بولیوں میں، اس لفظ میں کچھ حلقیت (Velarisation) آ گئی ہے، یعنی ان میں اس کی شکل مورضطان ہو گئی ہے - اس صوتی تبدیلی کا سبب شاید جذباتی ہے - تطوان [رک بہ تیطاوین] میں اس کا تلفظ مرضطان ہے، اور پورے المغرب میں اس کے معنی ''خطرناک پاگلوں کا قیدخانہ'' ہے (قب W. Marçais : *Textes arabes de Tanger*، ص ۴۶۵).

(G. S. Colin کولن)

۳ - ترکیہ

پہلا ساجوقی دارالشفاء (ہسپتال) اور مدرسہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں قیصری کے مقام پر قائم ہوا اس کے بعد سیواس Sivas، دیورگی Diviriri، چانکیری Cankiri، قسطمونی Kastamonu، قونیہ Konya، توقاد Toket، ارزروم Erzurum، ارزنجان Erzincan، ماردین Mardin اور آماسیہ Amasya میں

ہسپتال بنے ۔ آناطولی کے ہسپتالوں کو آج کی طرح اس وقت بھی بیمارستان، مارستان، تیمارخانہ، دارالشفاء یا دارالعافیة کہتے تھے ۔ وہ عام ہسپتال تھے، ان معنی میں کہ ان میں ہر قسم کے مریضوں کو داخل کر لیا جاتا تھا، اور ان کے عملے میں جرّاح، اطبّاء، دواساز اور امراض چشم کے ماہر ہوا کرتے تھے ۔ ان کے مصارف کے لیے علیحدہ روپیہ رہتا تھا، اور ان کی تنظیم ان کی جاے وقوع کی وسعت، اہمیت اور مخصوص ضروریات کے مطابق ہوا کرتی تھی۔

آناطولی میں پہلا عثمانی بیمارستان، برُسہ کا دارالشفاے یلدرِم، تھا ۔ جب عثمانیوں نے ۷۲۶ھ/ ۱۳۰۶ء میں برُسہ کو سر کیا، تو اس میں کوئی ہسپتال نہ تھا ۔ پہلے عثمانی سلطانوں (سلطان اورخان، مراد اوّل، یلدرِم بایزید) نے شہر کو بھی وسعت دی اور کچھ ادارے قائم کیے جن میں سے ایک دارالشفاے یلدرِم تھا، جس کا افتتاح ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں ہوا ۔ اس ادارے کی جو ''یلدرِم عمارتی'' (ایک مخصوص مرکز جو ہسپتال، حمام اور مسافروں کی آرامگاہ پر مشتمل تھا) کا ایک جزو تھا، متعدد دفعہ مرمت کی گئی ۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کی جگہ وفیق پاشا ہسپتال نے لے لی ۔ اب یہ شکستہ ہو چکا ہے۔

وہ کوڑھی‌خانہ جو مراد دوم (۸۲۴ھ/ ۱۴۲۱ء تا ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) کے عہد میں ادرِنہ میں تعمیر ہوا تقریباً دو صدیوں تک چلتا رہا ۔ اس کوڑھی خانے سے پہلے، ترکان آناطولی میں سیواس Sivas، قسطمونی (Kastamonu) اور قیصری کے مقامات پر دوسرے کوڑھی‌خانے بنا چکے تھے۔

دارالشفاے فاتح، جس کا افتتاح ۸۷۵ھ/ ۱۴۷۰ء میں ہوا، محمد دوم الفاتح (۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء تا ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء) نے تعمیر کیا تھا اور وہ اس کے کلیہ (کالج) کا ایک حصّہ تھا ۔ اگرچہ متعدّد بڑی بڑی آتش‌زدگیوں کے باعث یہ ہسپتال اب کھنڈر ہو گیا ہے، تاہم اس کی عمارتوں سے گزشتہ صدی تک کام لیا جاتا رہا تھا ۔ اس کے وقف نامے (وقفیة) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اطبّاء کے عملے کے علاوہ طلبہ کی بھی ایک بڑی جماعت موجود رہتی تھی ۔ اسلامی ہسپتالوں میں طب کے طلبہ کو تربیت دینے کا یہ روایتی طریقہ تھا۔

اسی صدی میں بایزید دوم (۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء تا ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء) میں ادرِنہ میں دریاے تُنجہ کے کناروں پر ایک اور ''عمارت'' قائم کی ۔ اس ادارے کا ایک حصہ ہسپتال تھا، جو اس سلطان کے نام سے موسوم تھا ۔ اس کی تعمیر ۸۹۱ھ/ ۱۴۸۶ء میں شروع ہوئی اور آٹھ برس میں مکمل ہوئی، لیکن وقف (وقفیة) ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۳ء تک قائم نہیں ہوا تھا، گو اب یہ ادارہ کھنڈر بن چکا ہے، اس کا وسیع عملہ اس صدی کے آغاز تک عوام کی خدمت بہت خوبی سے کرتا رہا ۔ بقول اولیاء چلبی اس میں دس موسیقاروں کا ایک عملہ جو کسی کسی وقت بیماروں کو ساز بجا کر سنایا کرتے تھے ۔ اس ادارے کی عمارت کے نقشوں میں، جنھیں C. Gurlitt نے بڑی عجلت سے بنایا تھا، بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں؛ قب گرلٹ : *Die Boukunst Konstantinopels*، برلن ۱۸۷۲ء، دو جلدیں۔

سولھویں صدی کے دوران میں بڑے بڑے تین ہسپتال استانبول میں قائم ہوے اور ایک مَنیسہ میں، خاصّکی کا بیمارخانہ ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء میں، خرم سلطان زوجۂ سلطان سلیمان اعظم کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوا تھا؛ سلیمان کا دارالشفاء اور اس کا مدرسة الطب، ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۵ء میں خود سلطان کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوے ۔ حافظ سلطان کا دارالشفاء ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء میں سلطان

کی والدہ کے اعزاز میں مَنیسہ کے مقام پر تعمیر ہوا ۔ خاصّکی کے بیمارخانے کو زلزلوں اور آتش زدگیوں نے جزوی طور پر تباہ کر دیا تھا، لیکن اسے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا ہے اور اب وہ مرکز صحت کے طور پر استعمال ہوتا ہے مَنیسہ کا بیمارستان پہلی عالم گیر جنگ کے اختتام تک کام کرتا رہا، لیکن اب وہ خالی پڑا ہے۔

چوتھا ہسپتال، طوپ طاشی Toptaşi کا بیمارخانہ ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں نوربانوسلطان، والدۂ مراد ثالث (۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء) کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوا، یہ ادارہ ہسپتال کے طور پر ۱۹۲۷ء تک کام کرتا رہا۔

سترھویں صدی میں احمد اوّل (۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء تا ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء) نے اپنی مشہور مسجد کے قریب، بوزنطی گھڑ دوڑ کے میدان (Hippodrome) کے عقب میں ایک بہت وسیع ہسپتال تعمیر کرایا ۔ ہسپتال کا افتتاح ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں ہوا تھا، اور ابھی حال ہی میں ایک نئے سکول کے لیے جگہ بنانے کی خاطر اسے مسمار کر دیا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران میں صحت اور معاشرتی امداد سے متعلق عثمانی اداروں کی تأسیس میں تنزّل پیدا ہو گیا، لیکن اُنیسویں صدی عیسوی میں، فوجی ملازمت، لباس کی وضع قطع، تعلیم وغیرہ کو عثمانی سلطنت میں جدید شکلوں میں ڈھال دیا گیا - ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں استانبول میں ادرنہ قپی Edirne Kapi کے مقام پر مِہر ماہ سلطان کے مدرسے میں غرباء کے لیے ہسپتال قائم ہوا ۔ جس زمانے میں بزم عالم والدہ سلطان، مادرِ سلطان عبدالحمید اس ہسپتال کی تجدید کر رہی تھی تو کئی اور نئی طرز کے عسکری ہسپتال اور ایک جدید طرز کا طبی مدرسہ بھی قائم ہو چکا تھا ۔ یہ ادارے نئی فوج کی طبّی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے تھے - ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں سلطان محمود ثانی (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ءتا۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) نے استانبول میں ایک نیا مدرسۃ الطّب و الجراحت قائم کیا، جہاں شروعؔ میں اطالوی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی، لیکن ۱۸۳۹ء میں وہاں آسٹریا سے کچھ قابل اساتذہ کے آ جانے پر اطالوی کے بجائے فرانسیسی میں تعلیم دی جانے لگی ۔ اس مدرسے کی توسیع، سلطان عبدالحمید، سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید ثانی کے ہاتھوں ہوتی رہی، اور آخرکار اس میں کُتے کے کاٹے (Rabies) کا ایک ادارہ، ایک اور ادارہ تحقیق جراثیم سے متعلق، اور ٹیکہ لگانے کا ایک مرکز شامل کر دیے گئے ۔ متعدّد اطبّاء نے جو مغربی زبانوں اور جدید طبّی اسالیب کا علم رکھتے تھے اس مدرسے سے سند فضیلت حاصل کی ۔ وہ آناطولی چلے گئے، جہاں اُنھوں نے جدید ہسپتالوں کی بنیاد رکھی ۔ یہاں کُتے کے کاٹے اور چیچک سے محفوظ کرنے کے انتظامات تقریباً اسی وقت شروع ہو گئے جب وہ یورپ میں شروع کیے گئے تھے ۔ عثمانی حکومت ان حکومتوں میں سے ایک ہے جنھوں نے پاستوری [لوئی پاستور Louis Pasteur] فرانسیسی سائنسدان، جس نے دوسرے امراض بالخصوص کتے کے کاٹے کا اور اس مرض سے بچاؤ کا علاج ٹیکے کے ذریعے کرنے کی طرح ڈالی، ادارے کے قیام میں امداد دی۔

بچوں کا شِشلی [شیشہ لی، بمعنی شیشہ‌دار] ہسپتال جو استانبول کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں سے ایک ہے، سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں قائم کیا تھا۔

یہ ہسپتال عثمانی سلطنت کے اہم‌ترین ہسپتالوں میں سے تھے؛ اگرچہ اور بہت سے دوسرے ہسپتال بھی ہیں جو ترکیہ کے اطراف و جوانب میں پائے جاتے ہیں، لیکن انھیں یہاں شامل کرنے کی

گنجائش نہیں ہے ۔ ترکوں نے پانچ صدیوں میں صرف استانبول ہی میں تقریباً ستّر ہسپتال قائم کیے ۔

(BEDI N. ŞEHSUVAROĞLU)

⊗ **بیمہ** : رک بہ معاقل ۔

* **بینکنگ** : رک بہ جہبذ، صیرفی و بیت المال ۔

* **بینورت** : ایک مسلم رہنما، جس نے ۴۶۴ھ / ۱۰۷۲ء سے ۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء تک مشرقی صقلیہ [رک بآں] میں مسلمانوں کو نارمنوں کی مقاومت کرنے کا جوش دلایا ۔ نارمنوں کے مؤرخ ملترا Malaterra کے بیان میں اس کا نام بینورت Benavert یا بینوث Benaveth کی شکل میں آتا ہے ۔ اس شخص نے، جس کا مسلم مآخذ میں کوئی ذکر نہیں، کونٹ روجر Count Roger کے لڑکے کو ۴۶۷ھ / ۱۰۷۵ء میں کتانیہ Catania کے قریب شکست دی اور ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا، پھر ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء میں یہیں سے کلبریا Calabria کی مہمات پر روانہ ہوا ۔ اس سے اگلے سال روجر نے سیراکیوز میں اسے محصور کر لیا اور اس قلعے کو بینورت کے قبضے سے نکال لینے کی انتہائی کوشش کی کیونکہ بظاہر وہی اس کی قوت کا گڑھ بن گیا تھا ۔ ۸ صفر ۴۷۹ھ/۲۵ مئی ۱۰۸۶ء کو وہ اس بحری لڑائی میں مارا گیا جو اس بندرگاہ میں ہوئی ۔ صقلیہ میں اسلام کے اس بطل کا اصلی عربی نام ابن عبّاد تھا ۔ اس کا تذکرہ ہمیں فقط اس کے دشمنوں کے ذریعے ہاتھ لگا ہے جو اس کی ہمت و جرأت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ۔ تقریباً پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس محمد ابن عباد کے اسلاف میں سے تھا جس نے ڈیڑھ صدی بعد صقلیہ کے مسلمانوں کی فریڈرک دوم کے خلاف آخری سب سے بڑی بغاوت کی قیادت کی اور فریڈرک نے اسے قتل کرا دیا۔

مآخذ : M. Amari : *Storia dei Musulmani di Cicilia*، بار دوم، ۳ : ۱۵۱ تا ۱۶۹ ۔

(F. GABRIELI)

بینون : جنوبی عرب کے ایک قدیم قلعے اور قصبے کا نام، ہمدانی (صفة جزیرة العرب، ص ۲۰۳) نے اسے مشہور یمنی قلعوں (محافد) میں شمار کیا ہے، اس نے اس کا حال کتاب الاکلیل، جز ۸ (طبع ملر، ص ۳۱، ۸۶ ببعد؛ کرملی، ص ۶۶ ببعد؛ فارس، ص ۴۵ ببعد) میں بیان کیا ہے ۔ بینون کے متعلق اساطیری روایات میں ہے کہ اسے غُمدان (غ ن د ن) اور سلحین (س ل ح ن) کی طرح، جو صنعاء [رک بآں] اور مارب [رک بآں] کے قلعے ہیں، جنوں نے حضرت سلیمان[۴] کے لیے تعمیر کیا تھا ۔ ہمدانی نے بینون کا محلّ وقوع علاقۂ عنس (بن مذحج) کے مشرقی علاقے میں بتایا ہے ۔ یہ قصبہ حرۂ کومان کے مقابل واقع ہے (حرۂ مذکور کوہ اسبیل کے شمال مغرب میں چھے گھنٹے کی مسافت پر ہے) ۔ اس کے کھنڈر اس جگہ ملتے ہیں جہاں اب ہیاوہ آباد ہے اور Glaser کو یہیں سے دس کتبے ملے تھے ۔

بینون دو زمین دوز راستوں کی وجہ سے مشہور تھا، جو چٹانوں میں سرنگیں کھود کر بنائے گئے تھے ۔ حمیری بادشاہ اسعد تبع (ابو کرب اسعد، نواح ۳۸۵ تا ۴۲۰ء) باری باری سے کبھی یہاں اور کبھی ظفار [رک بآں] میں قیام کیا کرتا تھا ۔ بینون کو غمدان اور سلحین کے ساتھ ہی حبشیوں نے ارباط کی کمان میں ۵۲۵ء (کے حدود) میں تباہ کر دیا تھا ۔ بینون کو بطلمیوس کے نقشے پر (۴۸ درجے ۳۰ ثانیے، ۱۴ درجے ۱۵ ثانیے) حضرموت وادی دوعن [رک بآں] کے آس پاس تلاش کرنا چاہیے ۔ ممکن ہے وہ کینون Kaynun کی تصحیف ہو ۔

مآخذ: (۱) الہمدانی، محلّ مذکور؛ (۲) نشان، طبع عظیم الدین، ص ۱۰۱، ۱۶۷؛ (۳) ابن المجاور، ص ۲۰۱ ببعد؛ (۴) یاقوت، ۱ : ۸۰۱؛ (۵) سپرنگر Sprenger : *Die alte*

Geographie Arabiens، ص ۳۶۱؛ (۶) H. von Wissmann و Höfner : *Beitrage zur historischen Geographie de vorislam Südarabien*، ص ۳۰، ۹۹؛ (۷) C. Conti Rossini : *Storia d' Etiopia*، ص ۱۲۸.

(O. LÖFGREN)

* **بینه** : رک به بیانه.

* **بیورلدی** : نیز بیورلتی، بیوردی وغیرہ [ترکی]، وہ حکم جو وزیر اعظم، وزیر بیگلربیگی، دفتردار یا دیگر اعلٰی افسروں کی طرف سے کسی ماتحت افسر کو دیا جائے - یہ لفظ ''بیورلدی'' سے بنا ہے جو سرکاری فرمان کے خاتمے پر لکھا جاتا تھا اور جس کے معنی ہیں حکم دیا گیا - بعد ازاں یہ اصطلاح ہر حکم کے لیے استعمال ہونے لگی - بیورلدی (احکام) کی دو بڑی قسمیں تھیں : (۱) وہ حکم جو کسی وصول‌شدہ عرضی یا اطلاعنامے کے حاشیے پر (در کنار) لکھا جائے - اس میں اکثر اس بات کی ہدایت کی جاتی تھی کہ اس غرض خاص کے حصول کے لیے ایک فرمان (یا برات وغیرہ) جاری کیا جائے (قب قانون نامۂ آل عثمان، *TOEM*، ضمیمہ، ۱۳۳۰ھ، ص ۱۶)؛ (ب) وہ احکام جو براہ‌راست (رأسًا، بیاض اُزرینہ beyad Üzerine) جاری کیے جائیں - ان احکام کی شکل سلطانی فرمان [رک به فرمان] کی سی ہوتی تھی - اس طرح کے بہت سے احکام پر ایک مہر لگا دی جاتی تھی، یا طغرا کی شکل کے دستخط، جو پنچے (Pençe) کہلاتے تھے، ثبت کر دیے جاتے تھے - بعض اوقات ثبوت اور توثیق کے لیے لفظ ''صح'' (یعنی یہ ٹھیک ہے) بڑھا دیا جاتا تھا - بیورلدی بہت سی انتظامی اغراض کے لیے جاری کیے جاتے تھے، خصوصًا ملازمت عطا کرنے، جاگیر بخشنے، آمد و خرچ کی بابت ضوابط بنانے اور امن و امان کے ساتھ سفر کرنے کے لیے - اصل بیورلدی ترکی اور دیگر مقامات کے بہت سے دفترخانوں میں محفوظ ہیں - استانبول کی لائبریری باش‌وکالت آرشیوی [رک بآں] میں بھی بیورلدی کی نقول کی متعدد جلدیں موجود ہیں - دوسرے بہت سے بیورلدیوں کے اصل نسخے انشا کی کتابوں میں ملتے ہیں (مثلاً کتبخانۂ Türk Tarih Kurumu، انقرہ، مخطوطہ عدد ۷۰؛ کتاب خانۂ ملی Bibli. Nat.، پیرس، ضمیمہ turc، مخطوطہ عدد ۹۰)، نیز شریعت کی عدالتوں کے سجلات میں موجود ہیں.

مآخذ : (۱) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی کے مقالات در *Belleten*، ۳ (۱۹۳۰ء) : ۳۹۷ ببعد؛ ۵ (۱۹۴۱ء) : ۱۰۱ تا ۱۰۷، ۲۸۹ تا ۳۱۸ (فوٹو سمیت) اور اس کی *O. D.* مرکز و بحریہ تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۳۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۲) L. Fekete : *Einführung in die osman-türk. Diplomatik*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۶ء، ۵۳ تا ۵۵؛ (۳) J. Deny : *Sommaire des archives turques du Caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء، ص ۱۳۷ تا ۱۳۸؛ (۴) U. Heyd : *Ottoman Documents on Palestine 1552-1615*، آوکسفرڈ ۱۹۶۰ء، بمدد اشاریہ؛ نیز رک بہ مرکزی دستاویزات (Diplomatic) بذیل عثمانی سلطنت.

(U. HEYD)

⊗ **بیول** : (Frantz Buhl)، ڈنمارک کا ایک مشہور مستشرق، ۱۸۵۰ء میں بمقام کوپن‌ہیگن Copenhagen پیدا ہوا - اس نے وہیں تعلیم پائی اور ۱۸۷۴ء کے بعد عربی نحو اور تاریخ لغات سامیہ میں تخصص کی غرض سے پروفیسر فلائشر Fleischer اور پروفیسر ڈلتیس Delitzch سے استفادہ کیا اور ۱۸۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد اس نے کوپن‌ہیگن کی یونیورسٹی میں عہدنامۂ عتیق (Old Testament) سے متعلقہ علوم پڑھانے کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا.

۱۸۸۹ء میں بیول کو مصر، فلسطین، شام اور ترکیہ کے سفر کا موقع ملا - ۱۸۹۰ء میں واپس آنے پر اسے لائپزگ (جرمنی) کی یونیورسٹی میں عہدنامۂ عتیق

کے پروفیسر کا منصب عطا کیا گیا ۔ یہاں اس نے Gesenins کی شہرۂ آفاق قاموس عبری پر استدراکات لکھے ۔ ۱۸۹۸ء میں وہ اپنے وطن کوپن ہیگن کی یونیورسٹی میں السنۂ سامیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے بلا لیا گیا ۔ اس عرصے میں اس نے ڈنمارک کی زبان میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کی زندگی پر ایک کتاب *Mohammeds Liv* (۱۹۰۳ء) لکھی جس کا جرمن ترجمہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ۔ نیز اموی دور کی تحریک شیعہ سے متعلق اس کا ایک مقالہ ۱۹۱۰ء میں، اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کی تعلیمات کے بارے میں اس کی ایک تالیف ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۱۱ء میں بیول کو کوپن ہیگن یونیورسٹی کا ریکٹر Rector بنا دیا گیا اور یہیں ۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو بیاسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بیول کی اکثر تالیفات یروشلم اور فلسطین قدیم کے جغرافیے سے متعلق ہیں ۔ مشاہیر اسلام اور اہم مقدس مقامات کے جغرافیائی حالات کے بارے میں بھی اس کے متعدد مقالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لائڈن میں شائع ہوئے ہیں۔

مآخذ (۱) مجلّۃ المجمع العلمی (۱۹۳۲ء)، ۱۳ : ۲۸۲؛ (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۱ - ۱۸۲؛ (۳) براکلمان، باتداد اشاریہ؛ (۴) الزرکلی : الأعلام، بذیل مادۂ فرانتس؛ (۵) انسائیکلوپیڈیا امیریکانا، ۱۹۶۰ء، بذیل مادّہ.

(احسان الٰہی رانا)

* **البَیْہسیّہ** : رک بہ ابو بیہس.

* **بَیْہق** : پہلے نیشاپور کی مغرب کی جانب خراسان میں ایک ضلع کا نام تھا ۔ آل طاہر کے زمانے میں اس میں ۳۹۰ گاؤں شامل تھے، جن کی سالانہ آمدنی تقریباً دو لاکھ چھتیس ہزار درہم تشخیص ہوتی تھی ۔ اس کے بڑے شہر سبزوار اور خسرو جرد تھے ۔ اس شہر کو ۳۰ھ / ۶۵۰ تا ۶۵۱ء میں ایک عرب فوج نے سپہ‌سالار عبداللہ بن عامر کی زیر قیادت فتح کیا تھا ۔ ۴۸۸ھ / ۱۱۵۳ تا ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء میں اسے ینالتگین نے تاراج کیا ۔ حمداللہ مستوفی کہتا ہے کہ اس کے باشندے اثناعشری شیعہ تھے ۔ اس کی مشہور شخصیتوں میں نظام‌الملک جو الپ ارسلان اور ملکشاہ کا وزیر تھا، ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی مصنف تاریخ البیہقی اور عبدالرزاق بانی خاندان سربدار گزرے ہیں ۔ پہلے زمانے میں یہاں کانوں سے سنگ مرمر نکالا جاتا تھا۔

مآخذ : (۱) ابن فندق : تاریخ بیہق؛ (۲) المقدسی : ۳۱۸، ۳۲۶؛ (۳) حمداللہ مستوفی : نزہۃ، ۱۴۹ تا ۱۵۰؛ (۴) محمد حسن خان : مرآۃ البلدان، ۱ : ۳۲۷ : (۵) دولت شاہ، ص ۲۷۷؛ (۶) Barbier de Meynard : *Dictionnaire de la Perse*، ص ۱۳۰.

(A. K. S. LAMBTON)

⊗ **بیہقی، ابوالفضل** : (ابوالفضل) محمد بن الحسین کاتب (فارسی : دبیر) البیہقی، پانچویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل کا مشہور ایرانی مؤرخ، سرزمین بیہق اور سبزوار کے خطے میں، جو آج کل خراسان میں ہے، حارث‌آباد نامی گاؤں میں پیدا ہوا ۔ جوانی میں تحصیل علم کے لیے نیشاپور گیا، جو اس دور میں ایران کے عظیم‌ترین علمی مراکز میں سے ایک علمی مرکز تھا ۔ تھوڑی ہی مدت بعد اسے غزنویوں کے دربار میں باریابی ہوئی اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی ماحول میں گزرا ۔ وہ ان دبیروں میں تھا جو غزنویوں کے محکمۂ مراسلات (سکریٹیریٹ) کے صدر، [الشیخ العمید] خواجہ ابو نصر [بن] مشکان کے ماتحت کام کرتے تھے ۔ وہ تمام دبیروں سے زیادہ رئیس ادارہ کا مقرب تھا ۔ کبھی کبھی دربار کے اہم خطوط وہ خود تیار کرتا تھا اور

کبھی ان کی تحریر و تصحیح اسے کرنی پڑتی تھی ۔ ابو نصر کی موت کے بعد مسعود غزنوی کے دربار میں ابو سہل زوزنی کے ماتحت وہ اسی عہدے پر فائز رہا، لیکن ابو سہل کی اس سے کچھ زیادہ نہ بنی ۔ بعد میں عبدالرشید کے زمانے میں وہ محکمۂ مراسلات کا مہتمم اعلٰی ہو گیا، لیکن کچھ مدت کے بعد معزول ہو گیا اور بادشاہ کے حکم سے نویان نامی ایک غلام نے اس کی جائداد قرق کر لی؛ بعد میں اسے اس الزام میں کہ اس نے اپنی بیوی کا مہر ادا نہیں کیا بحکم قاضی گرفتار کر لیا گیا ۔ جب غزنویوں کے ایک مغرور غلام طغرل برار نے عبدالرشید کو قتل کر کے غزنہ پر قبضہ کر لیا تو اس وقت بیہقی کو دوسرے درباریوں کے ساتھ زندان قاضی سے قلعے میں بھیج کر وہاں قید کر دیا گیا ۔ اس قید و بند سے نجات حاصل کرنے کے بعد پھر اس نے کسی سرکاری محکمے میں ملازمت نہیں کی، تاآنکہ صفر ۴۷۰ھ / اگست ۱۰۷۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا ۔ ابوالفضل بیہقی فارسی زبان کا سب سے بڑا مؤرخ ہے اور اس نے اپنے زمانے کے واقعات کو، جنھیں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا، انتہائی سچائی، حق گوئی اور دیانت کے ساتھ فصیح ادبی زبان میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ معتبر اسناد اپنی کتاب میں درج کی ہیں اور جزئی واقعات کے ساتھ ہر ایک کا دن، مہینہ اور سال سبھی ذکر کیا ہے ۔ اس کی سب سے اہم تصنیف ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، جسے لوگوں نے مختلف نام دیے ہیں جیسے جامع التواریخ اور جامع فی تاریخ سبکتگین، تاریخ آل محمود (در تاریخ بیہقی، ص ۲) تاریخ ناصری، تاریخ آل سبکتگین، مگر ثابت شدہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تیس جلدیں تھیں اور سب کو ملا کر اسے جامع التواریخ یا تاریخ آل سبکتگین کہتے تھے [از روے تتمۂ صوان الحکمۃ] ۔ اس کتاب کے ہر حصے کا بھی الگ الگ نام تھا جو کسی نہ کسی غزنوی بادشاہ کے نام پر جس کا اس میں ذکر تھا رکھا گیا تھا، پہلا حصہ تاریخ ناصری تھا، جس میں ناصرالدین سبکتگین کے حالات تھے، دوسرا حصہ تاریخ یمینی یا مقامات محمودی جو (سلطان) محمود کے بارے میں تھا اور تیسرا حصہ تاریخ مسعودی تھا جس میں مسعود کے حالات تھے، اس کے بعد کے حصوں کے نام معلوم نہیں کیا کیا تھے ۔ شروع کی بیس جلدوں میں سے چار جلدیں جو تاریخ ناصری اور تاریخ یمینی پر مشتمل تھیں مفقود ہیں، فقط پانچویں سے دسویں جلد تک ہی وہ جلدیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں جو تاریخ مسعودی پر مشتمل ہے ۔ گیارھویں سے تیسویں جلد تک ناپید ہو چکی ہیں ۔ وہ چھے جلدیں بھی جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور تاریخ بیہقی کے نام سے موسوم ہیں ان کی بابت کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا کہ ان کے درمیان کے کچھ حصے گم ہو چکے ہیں یا نہیں، اس لیے کہ بعض مقامات پر سلسلۂ بیان و کلام ٹوٹ جاتا ہے اور واقعات کے سیاق و سباق منضبط نہیں رہتے ۔ گیارھویں سے تیسویں جلد تک مسعود کے جانشینوں کی تاریخ ہے ۔ ابراہیم بن مسعود کی سلطنت کے آغاز تک، یعنی مودود، مسعود دوم، ابوالحسن علی، عبدالرشید اور فرخ زاد کی تاریخ اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰-۱۰۴۱ء سے ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹-۱۰۶۰ء تک انیس سال کے واقعات بیان ہو گئے ہیں، لیکن تاریخ مسعودی، جو اس وقت موجود ہے مسعود کے عہد کے تمام واقعات پر مشتمل نہیں ہے اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰-۱۰۴۱ء ہی تک اختتام پذیر ہو جاتی ہے نیز مسعود کی سلطنت کا آخری ایک سال اس میں مذکور نہیں ۔ اس حصے کو اس نے اپنے ذاتی مکتوبی یادداشت میں سے مسعود کی سلطنت کے بعد لکھا ہے، چنانچہ تاریخ مسعودی میں اس نے پانچ جگہ صراحت کر دی ہے کہ اس حصے کو

اس نے ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء میں لکھا اور ایک جگہ کہتا ہے کہ وہ بیس سال تک غزنویوں کی ملازمت میں رہا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۳۱ھ / ۱۰۴۰ء میں وہ غزنویوں کے دربار میں داخل ہوا اور اس وقت اس کی عمر چھیالیس برس تھی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء میں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوا اور ان اسناد اور یادداشتوں کی مدد سے جو اس کے پاس موجود تھیں اس نے اپنے عہد کے چوراسی سال کی، یعنی غزنویوں کی حکومت کے ابتدائی سال ۳۶۷ھ / ۹۷۷ - ۹۷۸ء سے لے کر ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء تک کی تاریخ مرتب کر دی ہے ۔ تاریخ مسعودی کے آخر میں مشہور فاضل روزگار ابوالریحان البیرونی کی کتاب المسامرة فی اخبار خوارزم کو، جس کا نشان کسی دوسری جگہ نہیں ملتا، بعینہ نقل کر دیا ہے ۔ بدقسمتی سے چونکہ تاریخ بیہقی کی دسویں جلد ناپید ہو چکی ہے اس لیے یہ کتاب (المسامرة) بھی جو نہایت درجہ اہم ہے ہم تک ناقص شکل میں پہنچی ہے ۔ علاوہ جامع التواریخ یا تاریخ آل سبکتگین جیسی ضخیم کتاب کے، جس کی صرف پانچ جلدیں ناقص حالت میں ہم تک پہنچی ہیں، ابوالفضل البیہقی کی دو اور تصنیفیں ہیں ۔ ان میں سے ایک کا نام مقامات ابو نصر مشکان ہے اور جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں وہ تاریخی وقائع درج تھے جنھیں مؤرخ نے اپنے رئیس اور استاد ابونصر مشکان، محمود و مسعود کے محکمۂ مراسلات کے مہتمم، سے سن رکھا تھا ۔ انھیں کے بعض اجزاء بعض کتابوں میں باقی رہ گئے ہیں ۔ دوسری کتاب زینة الکتّاب یا رتبة الکتّاب ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب انشاپردازی اور نامہ نویسی کے فن پر تھی ۔ تاریخ ناصری کے گمشدہ اجزا میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ محمد عوفی کی کتاب جوامع الحکایات و لوامع الروایات اور منہاج الدین بن سراج الدین جوزجانی کی طبقات ناصری اور محمد بن علی بن محمد شبانکارہی کی مجمع الانساب میں موجود ہے ۔ تاریخ یمینی میں سے جو کچھ بچا ہے وہ جوامع الحکایات و لوامع الروایات تالیف محمد عوفی میں مذکور ہے ۔ مقامات ابو نصر مشکان کے جو اجزا ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی جوامع الحکایات و لوامع الروایات اور عقیلی کی آثار الوزراء میں باقی ہیں ۔ امام ابوالحسن بیہقی نے تاریخ بیہق [ص ۱۷۵] میں وضاحت کر دی ہے کہ ”تاریخ ناصری کی جلدیں تیس سے زیادہ ہوں گی ۔ کچھ جلدیں میں نے کتابخانۂ سرخس میں دیکھی ہیں اور کچھ کتابخانۂ مہد عراق میں اور چند ہر شخص کے ہاتھوں میں، مگر مکمل کتاب نہیں دیکھی“ ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کے اہم حصے بہت جلد ناپید ہو گئے اور ابوالحسن بیہقی کے زمانے میں بھی دستیاب نہ ہو سکے ۔ بعض حصے محمد عوفی، منہاج الدین بن سراج الدین اور محمد بن علی شبانکارہی کے زمانے، یعنی آٹھویں صدی ہجری تک مروج و متداول تھے ۔ کتاب مقامات ابو نصر مشکان نویں صدی ہجری تک عقیلی مؤلف آثار الوزراء کے زمانے میں موجود تھی اور رتبة الکتّاب یا زینة الکتّاب ابوالحسن بیہقی، مؤلف تاریخ بیہق، کے زمانے تک دستیاب تھی ۔ [بیہقی کو شعر گوئی کا شوق بھی تھا] ۔

مآخذ : (۱) تاریخ بیہقی، طبع W. H. Morley، Bib. Ind.، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۲) تاریخ بیہقی، تہران ۱۳۰۵ - ۱۳۰۷ هش؛ (۳) تاریخ بیہقی، خواجہ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی دبیر، طبع دکتر غنی و دکتر فیاض، تہران ۱۳۲۴ هش؛ (۴) تاریخ مسعودی، معروف بتاریخ بیہقی، از مولف مذکور، طبع، مقابلہ و تصحیح و تحشیہ و تعلیق از سعید نفیسی، ۳ جلد، تہران ۱۳۱۹، ۱۳۲۶، ۱۳۳۲ هش؛

(۵) سعید نفیسی: آثار گمشدہ ابوالفضل بیہقی، تہران ۱۳۱۰ ھش؛ (۶) مقالۂ دکتر رضازادہ شفق، در مجلہ ارمغان، شمارہ ۱۲، سال ۱۱، و شمارہ ۱، ۲، سال ۱۲؛ (۷) مقالۂ عباس اقبال، در مجلہ ارمغان، شمارہ ۱، سال ۱۳؛ (۸) ابوالحسن علی بن زید بیہقی، معروف بہ ابن فُندُق: تاریخ بیہق، تہران ۱۳۱۷ ھش (ص ۱۷۵، ۲۰۰)؛ (۹) بارتولڈ: *Turkestan*، بسلسلۂ یادگار گب، ۲: ۲۲، و در وا، لائڈن، بار اول، ۱: ۵۹۳؛ [(۱۰) الزرکلی: الاعلام، ۶: ۳۳۱-۳۳۲؛ (۱۱) الصفدی: الوافی بالوفیات، ۳: ۲۰]۔

(سعید نفیسی)

البَیْہقی: ابراہیم بن محمد، ایک عرب مصنف، جس کی بابت اس کے سوا کوئی علم نہیں کہ وہ ابن المعتزؒ کے حلقے میں شامل تھا اور اس نے ادب کی ایک کتاب المحاسن و المساوی (طبع F. Schwally، Giesen ۱۹۰۲ء، بار دوم، قاہرہ ۱۹۰۶ء) خلیفہ المقتدر کے عہد (۲۹۵ھ / ۹۰۸ء تا ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء) میں لکھی۔

(C. Brockelmann)

البَیْہقی: ابوبکر احمد بن الحسین بن علی (بن عبداللہ) بن موسی الخُسْرُوْجِرْدی، محدث اور شافعی فقیہ۔ انہوں نے حدیث ابوالحسن محمد بن الحسین العلوی، الحاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی اور اس علم کی تحصیل کے لیے بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایک سو شیوخ سے استفادہ کا شرف حاصل کیا۔ عقائد میں امام اشعری کے پیرو تھے۔ وہ فطرۃً کفایت شعار، متقی اور طالب علم کے دلدادہ تھے۔ اواخر عمر میں نیشاپور چلے گئے اور وہاں تدریس حدیث اور اپنی کتابوں کی نقل کرانے میں مشغول ہوئے۔ بہت پر نویس تھے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے نوشتوں کی تعداد ایک ہزار اجزا تک پہنچتی ہے۔ ممتاز محدث ہونے کے باوجود مشہور یہ ہے کہ وہ الترمذی، النسائی اور ابن ماجہ کی تالیفات سے ناواقف تھے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انہوں نے مسند احمد بن حنبل نہیں دیکھی تھی، البتہ حاکم کی المستدرک کا آزادی سے استعمال کیا۔ الذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث میں البیہقی کا دائرۂ علم بہت زیادہ وسیع نہ تھا، لیکن اس کے ضمنی فنون اور علم الرجال والاسانید سے خوب واقف ہونے کی وجہ سے وہ حدیث پر بحث کرنے میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تالیفات میں کتاب السُّنَن الکُبْرٰی (۱۰ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۴۴-۱۳۵۵ھ) شاید سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔ اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی ہے، مثلاً السبکی نے کہا ہے کہ تناسب، ترتیب اور عمدگی میں کوئی شے اس کی مثل نہیں ہے [اس کی اکثر احادیث احکام پر حاوی ہیں]۔ اس کتاب میں مصنف نیز بکثرت حواشی بڑھائے ہیں، جن میں احادیث اور محدثین کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اکثر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خاص خاص حدیثیں فلاں فلاں مسلّم الثبوت مجموعوں میں بھی موجود ہیں۔ حیدرآباد (دکن) کے مطبوعہ نسخے میں ہر جلد کے ساتھ قرون ثلاثہ کے راویوں اور ان کی مرویات کا ایک قابل قدر اشاریہ لگا دیا گیا ہے اور ساتھ ہی روایت کی نوعیت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ البیہقی کی دوسری قابل قدر کتاب المبسوط فی نصوص الشافعیؒ ہے۔ الذہبی نے کہا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام شافعیؒ کے اصول فقہ جمع کیے، مگر السبکی کی رائے میں بیہقی سب سے آخری ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی اکثر معلومات کو جمع کر کے اس دروازے کو بند کر دیا، پھر اس کے بعد اس موضوع پر کسی اور نے قلم نہیں اٹھایا [السبکی، ۳: ۴]۔ امام الحرمین الجوینی البیہقی کی کتابوں کی، جو شافعی مذہب کی

تائید میں ہیں، بہت تعریف کرتے تھے ۔ البیہقی شعبان ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں پیدا ہوے اور [۱۰ جمادی الاولی] ۴۵۸ھ/[۹ اپریل] ۱۰۶۶ء میں نیشاپور میں وفات پائی ۔ (ان کا تابوت بیہق لایا گیا) اور خسروجرد میں مدفون ہوے ۔ [السنن الکبری پر قاضی القضاۃ شیخ علاءالدین علی بن فخرالدین عثمان بن ابراہیم الماردینی الحنفی المعروف بابن الترکمانی (م ۷۵۰ھ) نے ایک ضخیم حاشیہ موسومہ الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی لکھا، جس میں معترضانہ اور مناقشانہ انداز اختیار کیا ۔ اس حاشیے کی تلخیص زین الدین قاسم بن قطلوبغا الحنفی (م ۸۷۹ھ) نے ترصیع الجوہر النقی کے نام سے لکھی۔

[امام بیہقی کی تصانیف بکثرت بتائی جاتی ہیں، جن میں کتاب الاعتقاد، دلائل النبوۃ، شعب الایمان، مناقب الشافعی، الدعوات الکبیرۃ، کتاب الاسماء و الصفات، کتاب الخلافیات، کتاب معرفۃ السنن و الآثار، کتاب المدخل الی السنن الکبری، کتاب البعث و النشور اور کتاب الزہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ السبکی کے نزدیک ان میں سے بعض کتابیں تو بےنظیر ہیں]۔

مآخذ: (۱) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۳: ۳۰۹ ببعد؛ (۲) السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبری، ۳: ۳ ببعد؛ (۳) ابن خلکان، عدد ۲۷؛ (۴) السمعانی، کتاب الانساب، ورق ۱۰۱ الف [- حیدر آباد (دکن) ۱۹۶۳ء، ۲: ۳۸۱ تا ۳۸۳]؛ (۵) الیافعی: مرآۃ الجنان، ۳: ۸۱؛ (۶) ابن العماد: شذرات الذہب، ۳: ۳۰۴؛ (۷) براکلمان، ۱: ۳۶۳ ببعد و تکملہ، ۱: ۶۱۸ ببعد؛ (۸) سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، عمود ۶۲۰ ببعد؛ [(۹) محمد بن جعفر الکتانی: الرسالۃ المستطرفۃ، ص ۳۲ تا ۳۴، کراچی ۱۹۶۰ء؛ (۱۰) یاقوت: معجم البلدان، ۲: ۳۵۳ (مطبوعۂ مصر)؛ (۱۱) ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۲۴۲، حیدرآباد ۱۳۵۹ھ؛ (۱۲) ابن الاثیر: اللباب فی تہذیب الانساب، ۱: ۱۶۵، مصر ۱۳۵۶ھ]۔

(J. Robson و [ادارہ])

البیہقی: ظہیرالدین ابوالحسن علی بن زید ابن فندق، ایرانی مصنف، سبزوار میں پیدا ہوا، جو [نیشاپور کے مغرب میں خراسان میں] ضلع بیہق کا انتظامی مرکز (قصبہ) تھا ۔ تاریخ پیدائش ۴۹۳ھ/ ۱۱۰۰ء ہے ۔ یاقوت (ارشاد، ۵: ۲۰۸) نے اس کی تاریخ پیدائش البیہقی کی خودنوشت سوانح عمری سے ۴۹۹ھ/۱۱۰۶ء دی ہے (دیکھیے سطور آئندہ)، لیکن محمد القزوینی نے اسے غلط قرار دیا ہے ۔ اس کی کثیرالتعداد تصانیف (یاقوت نے ستر سے زیادہ تصانیف کے نام گنوائے ہیں جو قاموسی قسم کے ہمہ گیر موضوعات پر لکھی گئی ہیں) میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: فارسی میں اپنی پیدائش کے ضلع کی تاریخ بیہق (یہ ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی سے جداگانہ کتاب ہے (دیکھیے مقالۂ سابقہ)، ابو سلیمان السجستانی کے تذکرے صوان الحکمۃ کا تتمہ عربی میں ۔ اس تتمۃ صوان الحکمۃ کا ترجمہ فارسی میں غالبًا ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء کے قریب کیا گیا تھا ۔ پروفیسر محمد شفیع (لاہور ۱۹۳۵ء) نے عربی متن مع ترجمۂ فارسی، بعد تصحیح و تنقیح اور اس کے بعد کرد علی (دمشق ۱۹۴۶ء) نے تاریخ حکماء الاسلام کے نام سے اسے چھپوایا ۔ تاریخ بیہق میں بالکل نئی معلومات مشکل سے ملیں گی (خود مؤلف کا بیان ہے کہ یہ کتاب ایک قدیم تاریخ بیہق پر، نیز الحاکم محمد بن عبداللہ کی بارہ جلدوں والی تاریخ نیسابور پر مبنی ہے) ۔ پھر بھی یہ کتاب بہت دلچسپ ہے ۔ ریو Rieu نے اس کے مضامین کی شرح کی تھی (*Supplement to the Catalogue of Persian MSS. in the British Museum*، ۶۰ ببعد) اور ایک نسخہ بہمنیار کا طبع کردہ (تہران ۱۳۱۷ھ/۱۹۳۸ء) ہے، جس پر محمد القزوینی نے فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔

البیہقی کا خاندان اس کے زمانے سے بھی چند پشت پہلے سے ممتاز و معزز چلا آتا تھا ۔ اس خاندان کے افراد الحاکمی کا لقب اختیار کرتے تھے، کیونکہ ان کے اجداد میں سے ایک الحاکم فندق تھا (تاریخ بیہق، ص ۱۰۲) اور اپنے نسب کا سلسلہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے ایک صحابی خُزَیمۃ بن ثابت رضؓ (الانصاری) ذوالشہادتین سے ملاتے تھے ۔ البیہقی کا یہ بھی دعوی تھا کہ وہ مؤرخ الطبری کا رشتے دار ہے (تاریخ بیہق، ص ۱۹) ۔ اس کی اپنی خودنوشت سوانح عمری سے، جو اس کی گمشدہ تاریخی تصنیف مشارب التجارب و غوارب الغرائب (یا مشارب التجارب فی التواریخ) میں دی ہوئی ہے اور جسے یاقوت نے بجنسہٖ نقل کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اعلٰی تعلیم نیشاپور اور مرو میں حاصل کی اور زندگی زیادہ‌تر خراسان میں گزاری ۔ تھوڑی مدت کے لیے (۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء) وہ بیہق کا قاضی ہو گیا تھا، غالباً اپنے خسر محمد بن مسعود کے رسوخ کی بدولت، جو ری کا ایک سابق گورنر تھا، پھر مُشْرِف‌المملکۃ ہو گیا، مگر اس عہدے کے فرائض البیہقی کو سخت اور محنت طلب نظر آئے اور وہ جلد ہی مستعفی ہو گیا ۔ کچھ عرصہ بعد ہم اسے ری میں الجبرا اور علم نجوم کا مطالعہ کرتے ہوئے پاتے ہیں (ارشاد، ۵ : ۲۱۰) ۔ خودنوشت سوانح عمری میں ۵۴۹ھ/۱۱۵۴-۱۱۵۵ء تک کے واقعات ہیں جبکہ البیہقی نیشاپور میں تھا، مگر اس میں اس کا کچھ ذکر نہیں کہ ۵۰۷ھ/۱۱۱۳-۱۱۱۴ء میں وہ اپنے والد کے ساتھ عمر خیام سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تھا (تتمۃ صوان‌الحکمۃ، ص ۱۱۶)، نہ اس واقعے کا کچھ ذکر ہے جو ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء میں پیش آیا ۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ خراسان میں سلطان سنجر کے دربار میں گرجستان (Georgia) کے عیسائی بادشاہ Demetrius کی طرف سے ایک قاصد کچھ سوالات لے کر پہنچا جو عربی اور سریانی (تازی و سریانی) میں لکھے ہوئے تھے ۔ بظاہر یہ سوالات دینی مباحث سے متعلق ہوں گے ۔ سنجر کے ایما سے ان سوالات کے جوابات البیہقی نے انھیں دونوں زبانوں میں لکھے ۔ یہ واقعہ اس نے خود بیان کیا ہے (تاریخ بیہق، ص ۱۶۳) ۔ اس کی کتاب مشارب‌التجارب کا موضوع، معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی تاریخ ۴۱۰ھ / ۱۰۲۰ء تا ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء تھا (محمد قزوینی) ۔ غرض یہ تھی کہ یہ العتبی کی تاریخ یمینی کا تکملہ ہو (تاریخ بیہق، ص ۲۰) ۔ یاقوت نے اور جگہ اس کے اقتباسات دیے ہیں، مثلاً ارشاد، ۵ : ۱۲۴ ۔ ابن الاثیر نے بھی (۱۱: ۲۴۷ تا ۲۴۹، قبّ ص ۲۵۳) خوارزم کے سلطان شاہ کے حالات زندگی کے لیے اس سے نقل کیا ہے اور جوینی نے (تاریخ جہان گشای، ۲ : ۱ = J.A. Boyle، *The History of the World-Conqueror*، ص ۲۷۷) خوارزم شاہیوں کی اصل و ابتدا کے بارے میں صراحۃً اسی سے نقل کیا ہے (جوینی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ مشارب التجارب ابن مسکویہ کی تجارب‌الامم کا سلسلۂ مابعد ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے)، لیکن غالباً دیگر مواقع پر اس نے بلا تصریح بھی البیہقی کی عبارت نقل کی ہے (قبّ تاریخ جہان گشای، ۲ : ۲۲ ببعد = Boyle، ص ۲۹۳ ببعد) ۔ ابن الاثیر کی اس عبارت کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہوا البیہقی نے خود اپنے ہم‌عصر شاعر رشیدالدین وطواط کے حالات میں مشارب التجارب کا حوالہ دیا ہے (تتمہ، ص ۱۶۸) اور ابن ابی اصیبعہ نے بھی جالینوس کا زمانہ متعین کرنے میں اسی (مشارب) کو پیش کیا ہے (طبقات‌الاطبّاء، ۱ : ۷۲) ۔ کچھ اور مصنفوں نے بھی اس سے نقل کیا ہے، جن میں حمداللہ المستوفی (آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی) سب سے بعد کا معلوم ہوتا ہے ۔ خود البیہقی کی وفات یاقوت کے قول کے مطابق ۵۶۵ھ / ۱۱۶۹-۱۱۷۰ء میں ہوئی ۔

البیہقی کے انتخاب اشعار وِشاح الدُّمیۃ کے کچھ حصوں کا پتا چلا ہے، جسے باخرزی کی دمیۃ القصر کا تکملہ کہنا چاہیے، جس میں اس کے اپنے عربی اشعار کے نمونے بھی درج ہیں (دیکھیے براکلمان اور H. Ritter: *Philologika XIII*، عدد ۱۷۳ و *Oriens*، ۳، ۱۹۵۰ء: ۷۷)۔ اس کا ایک ضمیمہ بھی تھا، جس کا نام دُرّۃ الوِشاح تھا (ارشاد، ۵: ۲۱۲)۔

فقہی علوم نجوم پر فارسی میں البیہقی کا ایک رسالہ جوامع الاحکام کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے (E.G. Browne: *Handlist of Muhammadan Manuscripts*، ص ۲۵۵)۔ ایک زمانے میں اس کا خلاصہ بھی موجود تھا (حوالۂ مذکور، ص ۲۰۴)۔

مآخذ: (۱) یاقوت: ارشاد، ۵: ۲۰۸ تا ۲۱۸؛ (۲) محمد قزوینی: مقدمۂ تاریخ بیہق (*Mukaddima to Tarikh-i-Bayhaq*)، طبع بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ھ/ ۱۹۳۸ء؛ (۳) Storey، ص ۳۵۳ تا ۳۵۴، ۱۱۰۵ تا ۱۱۰۶، ۱۲ تا ۱۲۹۶، ۱۳۵۰؛ (۴) براکلمان، ۱: ۳۲۴ اور تکملہ، ۱: ۵۵۷ تا ۵۵۸؛ (۵) محمد شفیع: *The author of the oldest biographical notice of ʻUmar Khayyām and the notice in question*، در *Islamic Culture*، ۶ (۱۹۳۲ء): ۵۸۶ تا ۶۲۳؛ [(۶) محمد خان طہرانی، میرزا: ترجمۂ ابی الحسن البیہقی؛ (۷) محمد محسن: الذریعۃ، ۴: ۱۴۹، النجف ۱۹۳۶ء؛ (۸) اسمٰعیل پاشا البغدادی: ہدیۃ العارفین، ۱: ۶۹۹، استانبول ۱۹۵۱ء؛ (۹) الزرکلی: الاعلام، ۵: ۱۰۱، بار دوم]۔

(D.M. Dunlop)

* **بیّاسۃ**: (ہسپانوی میں بیزا Baeza)، صوبۂ جیّان میں، دارالحکومت سے اڑتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر، ایک شہر۔ اس کی موجودہ آبادی تقریباً سترہ ہزار ہے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے، جس کی ڈھلانیں الکبیر اور الجوز کی وادیوں میں اترتی ہیں۔ بطلمیوس کے خیال میں اسے عبرانی الاصل ہونے کی وجہ سے بیاترہ کہتے تھے۔ پلینی Pliny اس کے باشندوں کو وِنشنی (Vincienses) کہتا ہے۔ قوطوں (Goths) نے اسے اسقف کا تعلقہ بنا دیا۔ جب یہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس کا نام بیّاسہ ہو گیا۔ الادریسی کے قول کے مطابق اس کی مکئی اور باجرہ بہت مشہور تھا لیکن اس نے زیتون کے ان جھنڈوں کا ذکر نہیں کیا جو اس کے نصف علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں [بیّاسہ میں نہایت عمدہ زعفران پیدا ہوتی تھی اور دوسرے ملکوں کو بھی بھیجی جاتی تھی]۔

خلافت بنو امیہ کے دوران میں ابن حفصون [رَكَ باَں] نے اسے فتح کیا، لیکن عبدالرحمٰن سوم نے ۲۹۷ھ / ۹۱۰ء میں اسے واپس لے لیا۔ ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء میں یہ شہر، جیّان اور قلعۂ رباح سمیت، زہیر فتی عامری کی جاگیر میں شامل تھا۔ بعد میں اس پر المرابطون نے قبضہ کر لیا، لیکن اندلس میں ان کے آخری بطل ابن غانیہ نے ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء میں اس شہر کو شہنشاہ الفانسو ہفتم کے حوالے کر دیا۔ مؤخرالذکر نے اسے اپنے قبضے میں رکھا یہاں تک کہ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں اپنی موت سے ذرا پہلے اور المریہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اُبدہ کے ساتھ ہی اسے بھی خالی کر دیا۔ تقریباً ایک صدی تک یہ شہر الموحدون کے قبضے میں رہا اور ۶۰۹ھ/ ۱۲۱۲ء میں الناصر نے Las Navas de Tolosa جاتے ہوئے اپنی چھاؤنی کو جیّان سے بیزا میں منتقل کر دیا۔ شکست فاش کھانے کے بعد بیزا کے باشندے اُبدہ کی طرف بھاگ گئے اور ۱۸ صفر ۶۰۹ھ/ ۲۰ جولائی ۱۲۱۲ء کو فاتحین خالی شہر میں داخل ہوئے اور اسے نذر آتش کر دیا۔ جب عیسائی واپس چلے گئے تو اس کی از سر نو تعمیر کی گئی اور یہ دوبارہ آباد ہوا۔ اگلے ہی سال الفانسو ہشتم نے ۱۲۱۳ تا ۱۲۱۴ء کی سردیوں میں اسے دقت کے ساتھ محاصرے میں لے لیا، لیکن اسے ناکام لوٹنا پڑا، عبدالمؤمن،

ابوعبداللہ کا ایک بھتیجا، جو بجایہ (Bougie)، جزائر شرق‌الاندلس (the Balearics) اور بلنسیہ (Valencia) کا حاکم تھا، بیزا میں یقیناً بہت مدت رہا ہوگا، کیونکہ اس کے دس لڑکوں کا لقب البیّاسی تھا اور ان میں سے سب سے بڑے لڑکے عبداللہ نے بیزا ھی میں العادل اور المأمون کے خلاف بغاوت کی تھی۔ وہ فرڈیننڈ سوم کا حلیف بن گیا اور بیزا کے مقام پر اس کے پاس قشتالیہ کی ایک محافظ فوج پہنچ گئی۔ جب ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء میں وہ قرطبیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو بیزا کے باشندوں نے پھر یہ شہر چھوڑ دیا اور انجام‌کار فرڈیننڈ سوم نے ذوالحجہ ۶۲۴ھ / ۳۰ نومبر ۱۲۲۷ء کو اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں بیزا بڑی حربی اہمیت کا قلعہ تھا اور قشتالیہ اور غرناطہ کی مملکت کے درمیان سرحد پر واقع ہونے کے باعث اس نے نصریوں اور مرینیوں کے مابین تسخیر مکرر کی لڑائیوں میں اہم کردار ادا کیا۔

مآخذ: (۱) الادریسی: .Desc، متن ص ۲۰۳، ترجمہ ص ۲۴۹؛ (۲) عبدالمنعم الحمیری: الروض المعطار، متن ص ۵۷، ترجمہ ص ۷۲؛ (۳) G. Cirot: *Chronique Latine des rois de Castille*، ص ۱۱۵؛ (۴) Fernando de Cozer: *Noticias y documentos para la historia de Baeza*، ۱۸۸۴ء؛ (۵) E. Lévi-Provençal: *Hist. Esp. Mus.*، بمدد اشاریہ؛ (۶) A. Huici Miranda: *Historia del imperio almohade*، ۳: ۳۳۲ تا ۳۳۶؛ [(۷) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۴۷ تا ۱۷۵؛ (۸) یاقوت، ۱: ۷۲۳].

(A. HUICI MIRANDA)

* **بیّانہ**: ہسپانوی میں بینہ Baena، قرطبہ کے صوبے میں ایک چھوٹا سا شہر، جو دارالحکومت سے انسٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ ضلع قبرہ میں تھا۔ اس کے علاوہ الزہراء، استجہ، یسانہ اور قرطبہ کو ملا کر القنبانیہ (La Compina) کی اقلیم بنتی تھی۔ یہ قرطبہ کے صوبے میں ایک پہاڑی پر واقع ہے اور اسے وادی الجوز کا ایک معاون دریا مربلہ سیراب کرتا ہے۔ آج کل کی طرح یہ ہمیشہ سے باغوں، تاکستانوں اور زیتون کے جھنڈوں سے گھرا ہوا تھا اور بنی امیہ کے عہد میں اس نے بڑی خوشحالی کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس شہر میں دریا کے روبرو ایک ڈھلان پر ایک چھوٹا سا مضبوط قلعہ اور ایک جامع مسجد، جو عبدالرحمٰن دوم کے حکم سے تعمیر کی گئی تھی، اور اس کے علاوہ بازار اور حمام بھی تھے۔ ابن حفصون [رک بآں] نے امیر عبداللہ کے عہد میں بیّانہ کو تسخیر کیا، لیکن خلافت کے خاتمے اور اس کے بعد بدامنی کے برپا ہونے سے شہر کی پرسکون زندگی برباد ہو گئی۔ اس کے موجودہ محل وقوع کی تاریخ عہد اسلامی سے شروع ہوتی ہے کیونکہ وہاں اہل روما کے آثار نہیں ملتے، بلکہ یہ آثار اس کے قریب کی راس انطقوہ کے متعدد نواحی علاقوں تک بھی کہیں نہیں ملتے۔ جنگجو الفانسو (= الفونشو [رک بآں]) اندلس میں اپنی مشہور مہم پر جاتے ہوے ارنیسول کی لڑائی (صفر ۵۲۰ھ / مارچ ۱۱۲۶ء) سے ذرا پہلے بیانہ سے ہو کر گزرا تھا، گو اس نے اسے تسخیر نہیں کیا تھا۔ جب یہ شہر ۱۲۳۴ء میں فرڈیننڈ سوم کے قبضے میں آیا تو اس وقت اس کی دہری شہر پناہ تھی، ایک اندرونی فصیل جو ''القزابہ'' اور ''مدینہ'' کے گرد تھی، اور دوسری بیرونی فصیل، جس کے احاطے میں وہ بیرونی مضافات تھے جن میں شہری لوگ آباد تھے۔ جو پناہ گزین بیّانہ میں رہ گئے تھے انہیں ۱۲۴۱ء میں قشتالیہ بھیج دیا گیا، لیکن ایک شاہی فرمان کے ذریعے انہیں اپنے آخری انخلا تک قرطبہ میں قیام کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس شہر کی سب سے زیادہ نامور

شخصیت قاسم بن اَصْبغ بن محمد بن یوسف بن ناصح ابن عطاء کی تھی جو محدث اور فاضل فقہ اللغة تھا ۔ یہ ۲۴۷ھ/۸۶۲ء میں بیانہ میں پیدا اور ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں قرطبہ میں فوت ہوا۔

مآخذ : (۱) الادریسی : .Desc، ص ۱۷۴، ۲۰۵ اور ترجمہ ص ۲۰۹، ۲۵۲؛ (۲) یاقوت، ۲ : ۱۳؛ (۳) عبدالمنعم الحِمْیَری : الروض المعطار، طبع Lévi-Provençal، متن ص ۵۹، ترجمہ : ص ۷۴؛ [(۴) محمد عنایت اللہ : اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۷۵]۔

(A. HUICI MIRANDA)

⊗ **بَیِّنَة** : (ع) اس کے معنی ہیں واضح ثبوت اور روشن دلیل، خواہ اس دلیل کی دلالت عقل سے تعلق رکھتی ہو یا حواس سے؛ بیان بھی اسی مادے سے ہے، کلام کو بھی بیان اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے انسان اپنا ما فی‌الضمیر ظاہر کرتا ہے اور اس کے ذریعے مجمل اور مبہم بیان کی تشریح اور توضیح ہو جاتی ہے (المفردات)، لہٰذا علم بیان بھی وہ علم ہے جس میں مختلف پیرایہ ہاے بیان کی بہ حیثیت دلالت معنوی و لفظی بحث ہے ۔

علم اصول میں بیان استقرائی کی پانچ اقسام بتائی گئی ہیں : بیان تقریر، بیان تفسیر، بیان تغییر، بیان تبدیل اور بیان ضرورت ۔ بہرحال بیّنہ کے معنی ہیں : واضح ثبوت اور روشن دلیل ۔ قانونی اصطلاح میں گواہوں کی دلیل اور ان کی شہادت کو بیّنة کہا جاتا ہے، جیسے حدیث میں ہے : البیّنة علی المدعی و الیمین علی المدعٰی علیه (البخاری، کتاب الرهن؛ الترمذی، کتاب‌الاحکام ۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے بیہقی کی روایت میں المدعٰی علیه کے بجاے مَنْ اَنْکَرَ کے الفاظ ہیں)، یعنی مقدمے میں مدعی کا فرض ہے کہ گواہ پیش کرے اور اگر وہ گواہ پیش نہ کرے تو مدعٰی علیه سے حلف اٹھوایا جائے ۔ زبانی شہادت یا تمسکات وغیرہ سے جو ثبوت متحقق ہو جائے اسے بھی بیّنة کہتے ہیں ۔ اسلام کے قانون شہادت میں زبانی شہادت کی حیثیت گر جاتی ہے جہاں تمسکات کی رجسٹری ضروری ہے جبکہ تمسکات کا استناد گواہوں کی موجودگی میں بڑھ جاتا ہے ۔ اس قانون میں حلفیہ شہادت اور قسم کے درمیان واضح امتیاز کیا گیا ہے، چنانچہ شہادت وغیرہ کے ذریعے بار ثبوت مدعی پر ہے اور قسم کا تعلق اس موقع پر ثبوت سے نہیں بلکہ مدعی کی طرف سے ثبوت کی عدم موجودگی میں مدعٰی علیه کی صفائی کے لیے اس کے حلف کو کافی قرار دینے سے ہے اور ایسے حلف کا حق مدعی کی طرف سے ''بیّنة'' کی عدم موجودگی کی صورت میں مدعٰی علیه کو ملتا ہے اور اس کے مقابلے میں مدعی کو، جس پر بار ثبوت ہے، بیّنة کے بجاے حلف کا حق حاصل نہیں اور وہ یہ نہیں کر سکتا کہ بیّنة پیش کرنے کے بجاے حلف اٹھا لے ۔

شریعت میں حجة کی تین اقسام ہیں : (۱) بیّنة؛ (۲) اقرار (رکّ بآں)؛ (۳) نُکُول (یعنی جب مدعی بیّنة پیش نہ کر رہا ہو تو مدعٰی علیه کا حلف اٹھانے سے انکار) ۔ نکول کی آگے دو قسمیں ہیں : نکول حقیقی اور نکولِ حکمی (کشاف اصطلاحات الفنون) ۔ قاضی کا فرض ہے کہ بیّنة کی توثیق کی صورت میں اور جب کہ دوسری قانونی شرائط بھی پوری ہو رہی ہوں بیّنة کے مطابق فیصلہ کرے (هدایة، باب التحالف) ۔

جب عدالت میں متضاد شہادتیں اور ثبوت پیش (تعارض البینات) ہو جائیں تو قانوناً ''ترجیح البینة'' کا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کے دلائل اور گواہوں میں سے کن دلائل اور گواہوں کو ترجیح دی جائے اور اس سلسلے میں ''استصحاب الحال''، ''تحکیم الحال''، ''قرائن'' اور ''بحالف'' کی بحثیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور قاضی

کا فرض ہے کہ ان کی طرف بھی توجہ دے ۔ اگر اس طرح بھی کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو تو قرعہ اندازی یا تقسیم جائداد بھی کی جا سکتی ہے ۔

بعض لوگ اقرار (رکَ بآں) کے مقابلے میں بیّنة کو اقوٰی نہیں سمجھتے، لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں (المحلّٰی، ۹ : ۴۲۶)، کیونکہ یہ فرض کرنا درست نہیں کہ شاہد کے مقابلے میں مقر یقیناً سچا ہے، لیکن زیادہ درست یہ بات ہے کہ اقرار کرنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں ۔ بعض وہ ہوتے ہیں جن کے اقرار سے ایک تیسرا فریق متأثر ہوتا ہے اور ان کا اقرار ''فی حقِ غیرہ'' ہوتا ہے اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کا اقرار ''علی نفسہ'' ہوتا ہے اور اس سے اقرار کرنے والا خود پابند ہو جاتا ہے اس لیے ان کے اقراروں کی قانونی حیثیت ایک دوسرے سے مختلف قرار پائے گی۔

مآخذ : (۱) کتب تفسیر، مثلاً ابن جریر، الکشاف، بحر محیط، روح المعانی، بذیل آیت؛ (۲) کتب حدیث، مثلاً فتح الباری؛ القسطلانی: شرح البخاری، ابواب القضاء، کتاب الخصومات، کتاب الاحکام؛ مسلم، کتاب الایمان؛ ابو داؤد، کتاب الاقضیة، کتاب البیوع؛ الترمذی، کتاب البیوع، کتاب الاحکام؛ ابن ماجة، کتاب الاحکام؛ (۳) هدایة، کتاب الدعوٰی؛ (۴) تهانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل بیّنات؛ (۵) عبدالرحیم : *Muhammadan Jurisprudence*، لاہور ۱۹۰۸ء، بذیل Evidence؛ (۶) وو، لائڈن، طبع اوّل و دوم، اور جو مآخذ وہاں درج ہیں۔

(ادارہ)

⊗ **اَلْبَیِّنَة** : قرآن مجید کی ایک سورت کا نام، عدد تلاوت ۹۸، عدد نزول ۱۰۰ ۔ جمہور مفسّرین کے نزدیک یہ سورت مدنی ہے اور سورۃ الطلاق کے بعد نازل ہوئی تھی۔ لیکن بعض ضعیف روایات میں اسے مکّی بھی کہا گیا ہے ۔ اس کے اور نام بھی ہیں، مثلاً سُورۃ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا، سورۃ القیّمة، سورۃ المنفکّین، سورۃ البریّة ۔ اس میں ایک رکوع، آٹھ آیات، چورانوے کلمات اور تین سو نوّے حروف ہیں۔

البیّنة کے لفظی معنی ہیں عقلی اور حسی طور پر کھلی دلیل اور واضح حجت ۔ یہاں البینة سے مراد آنحضرت صلّی اللہ علیه و آله و سلّم ہیں ۔ اس سورت کا نام البیّنة اسی لیے رکھا گیا کہ یہ سورت بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی ہی آپؐ کی نبوت کی دلیل ہے ۔ پچھلی سورت، یعنی القدر میں نزول قرآن کا ذکر تھا اور بتایا تھا کہ کس طرح زمانۂ نزول قرآن میں دنیا خیر و برکت سے بھر جائے گی، مگر سُورۃ البیّنة میں یہ خبر دی کہ اگر حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیه و سلّم ایسے عظیم المرتبت پیغمبر تشریف نہ لاتے تو اہل کتاب اور مشرکین، جو کفر و شرک کی گمراہیوں میں مبتلا تھے، اپنے کفر و شرک سے باز نہ آتے ۔ اللہ تعالٰی نے آنحضرت صلّی اللہ علیه و سلّم کو رحمت بنا کر بھیجا، آپؐ قرآن مجید (صُحُف مُطَهّرة) تلاوت فرماتے اور کافروں اور مشرکوں کو راہ ہدایت دکھاتے تھے ۔ قرآن و سنت سے ہدایت ملتی ہے اور اللہ تعالٰی کی وحدانیت معلوم ہوتی ہے ۔ قرآن مجید میں آخرت کے معاملات میں بھی پوری رہنمائی موجود ہے ۔ قرآن مجید پاکیزہ ہے، قرآنی تعلیمات پاکیزہ ہیں ۔ ان سے روح و قلب اور اخلاق و اعمال کو طہارت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے ۔ نیز قرآن مجید انسانی افترا، جنّاتی وساوس اور القاے شیطانی سے پاک و مبرا ہے ۔ قرآن مجید کی سورتوں میں شریعت کے محکم احکام مندرج ہیں، جو سابقہ کتب سماویه کا خلاصہ ہیں ۔ ایک طرف تو قرآن مجید احکام شرعیه کا مجموعہ ہے اور دوسری طرف اصولی طور پر سابقہ کتب سماویه، مثلاً تورات، زبور اور انجیل کی غیر منسوخ تعلیمات پر بھی حاوی ہے ۔ پہلی کتابوں کی اصولی تعلیم بالخصوص پیغام

توحید موجود ہے ۔ قرآن مجید میں وہ تمام باتیں پیش کر دی گئی ہیں جو بنی نوع انسان کی معاش اور معاد کو درست کرنے والی ہیں ۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ خالص اللہ ہی کی عبادت کریں، نماز کو جملہ شرائط کے ساتھ قائم رکھیں اور زکوۃ ادا کرتے رہیں، کیونکہ جو لوگ دین حق پر قائم ہیں ان سب کا دین و آئین یہی رہا ہے ۔

سورت کے آخر میں کفّار کے لیے آتش دوزخ کی وعید سنائی اور انھیں بدترین خلائق ٹھیرایا ۔ اس کے مقابلے پر عمل صالح کرنے والے اهل ایمان کو خیرالخلائق قرار دیتے ہوے انھیں جنت کی خوش‌خبری دی ۔ مقصد یہ کہ خداے تعالٰی کے احکام سے سرتابی عذاب کا باعث ہے اور اس کی فرماں‌برداری سے انسان نعمتوں اور آسائشوں کا مستحق ٹھیرتا ہے ۔

اس سورت کی سب سے پہلی آیت کے متعلق علّامہ واحدی نے کتاب بسیط میں لکھا ہے کہ یہ آیت اپنی عبارت اور تفسیر کے لحاظ سے قرآن مجید کی مشکل‌ترین آیتوں میں سے ہے اور بڑے بڑے علما اس کی تفسیر میں حیران رہ گئے ہیں اور انھوں نے اس کے معنی کرنے میں مختلف راہیں اختیار کی ہیں (الرازی، ۸ : ۹ ۴۴؛ تفسیر مواهب الرحمن، ۳۰ : ۶۷۰) .

مآخذ : (۱) الترمذی : الجامع، ابواب تفسیر القرآن : تفسیر سورۃ لم یکن؛ (۲) الزمخشری : الکشاف، ۴ : ۲۲۶ ببعد، مصر ۱۳۵۴ھ؛ (۳) الرازی، مفاتح الغیب، ۸ : ۴۴۹ ببعد؛ (۴) الراغب : المفردات؛ (۵) السجستانی : غریب القرآن؛ (۵) علی المھائمی : تبصیر الرحمن، ۲ : ۴۰۹، مصر ۱۲۹۵ھ؛ (۶) محمد جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۲۳ ببعد، مصر ۱۳۸۰ھ؛ (۷) امیر علی : تفسیر مواهب الرحمن، ۳۰ : ۶۶۷ ببعد، لکھنؤ ۱۳۵۰ھ؛ (۸) محمد ابراهیم میر سیالکوٹی : تفسیر الدرالنظیم (النکات القیمۃ فی تفسیر سورۃ البینۃ)، ص ۰ ۹ تا ۱۱۰، امرتسر، نیز دیکھیے دیگر عربی اور اردو تفاسیر بذیل سورۃ البیّنۃ .

(ادارہ)

* **بیُّومیّۃ** : ایک مصری طریقہ (مسلک تصوف) جس کی بنیاد علی بن الحجازی بن محمد البیومی الشافعی نے رکھی تھی، جو ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں قاهرہ میں پیدا ہوے اور وهیں ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں وفات پائی ۔ احمدیہ اور خلوتیہ (مؤخرالذکر بذریعۂ دمِرْدَشیّۃ) طریقوں کو جمع کرنے کے بعد بیّومی نے ایک ایسے ''ذکر'' کی بنیاد رکھی جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اسے بلند آواز میں اور زور دے کر ادا کیا جاتا تھا ۔ بیومی علیہ‌الرحمہ کے طریقے کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے حد سے زیادہ غریب طبقوں کو متأثر کیا اور رهزنوں کو راہ راست دکھانے میں خاص کردار ادا کیا ہے، چنانچہ رهزنوں کی ایک بہت بڑی جماعت بیومی کے ہاتھ پر تائب ہوئی اور پھر اس مسلح جماعت میں شامل ہو گئی جو همیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی، جب وہ کبھی کبھار باہر نکلتے تھے، لیکن بیومی کے اثر و رسوخ کی ایک بڑی وجہ ان کے تہیج و جمود کی وہ شدتیں تھیں جو ''ذکر'' کے دوران میں ان پر وارد ہوتی تھیں ۔ علما نے ان کی مجالس ''ذکر'' کو (جو حسینی مشہد میں ہر منگل کو منعقد ہوتی تھیں) ممنوع قرار دینے کی جو کوشش کی انھیں ناکام بنانے میں شیخ شبروی شیخ الجامع الازهر کے عزم نے بڑا کام کیا اور اس مسئلے پر ان کی ثابت قدمی ان کی عام کمزور روش کے برعکس تھی (تاریخ الجبرتی، ۱ : ۱۹۵) ۔ بیومی کی تصانیف میں دمرداشیّۃ اور بیومیّۃ پر اس کے رسالے اور جیلی کی الانسان‌الکامل کی شرح شامل ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیوّمی کو ''حدیث'' میں بڑی دسترس حاصل تھی کیونکہ جب شبروی نے انھیں جامع ازهر

کے مدرسۂ تیبرسیہ میں مدعو کیا تو انھوں نے حدیث کے موضوع پر خطبے دیے ۔ جس مسجد میں وہ مدفون ہیں اسے مصطفی پاشا والئ مصر نے (غالبًا ۱۷۵۷ سے ۱۷۶۰ء کے درمیان) اس وقت تعمیر کرایا تھا جب بقول جبرتی وہ وزیر اعظم ہو گیا تھا (غالبًا ۱۷۶۳-۱۷۶۵ء کے درمیان) ۔ بیومی نے کوئی ممتاز خلیفہ نہیں چھوڑا، لیکن لین Lane کے زمانے تک آنحضرت کے یوم پیدائش کے موقع پر اس کا طریقۂ ذکر خاصا عام تھا.

مآخذ: (۱) براکلمان، ۲ : ۳۶۲؛ تکملہ، ۱ : ۷۸۴؛ ۲ : ۱۳۶، ۳۷۸؛ (۲) رسالۃ التنزیہ المطابق لمن لہ الوجود الکامل (مخطوطہ راقم الحروف کے پاس ہے)؛ (۳) سرکیس، عمود ۶۲۲؛ (۴) تاریخ الجبرتی، ۱ : ۳۳۹؛ (۵) Lane : *Modern Egyptians*، ص ۲۴۹، ۳۶۱.

(W. A. S. KHALIDI)

⊗ **بہاٹیا:** ایک قلعہ‌بند شہر، جس کا ذکر چچ کے برہمن راجا کی معرکہ‌آرائیوں کے سلسلے میں پہلی مرتبہ چچنامہ میں آتا ہے ۔ یہ برہمن‌زادہ الور (سندھ) کے مشہور راجا داھر کا باپ تھا، جسے مشہور اموی سپہ‌سالار محمد بن قاسم [رک بآں] نے شکست دی تھی.

ہنری ایلیٹ Sir Henry Elliot، محمد ناظم اور متعدد دیگر مصنفوں نے بہاٹیا کے نام کی صحت و عدم صحت کے متعلق ایک بےمقصد نزاع پیدا کر دی ہے اور اسے بھیرہ (پنجاب میں) اچھ اور بھٹنیر (بیکانیر میں) سے ملتبس کیا ہے (دیکھیے محمد ناظم : *The Life and Times of Mahmud of Ghazna*، ص ۱۹۷) لیکن یہ تمام اختلافات چچنامہ کے ناقابل تردید ثبوت سے ختم ہو جاتے ہیں، جس میں کم از کم آٹھ بار واضح طور پر اس کا نام بہاٹیا آیا ہے اور اس کا محل وقوع بالعموم الور اور ملتان کے درمیان بتایا گیا ہے ۔ تاریخ مبارک شاہی اور طبقات ناصری میں بھی یہ نام بہاٹیا ہی کی شکل میں مرقوم ہے ۔

بھٹیوں کے وقائع اور ان کی قبائلی تاریخ میں اس شہر کی بنیاد کو راجا بھٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جو سیالکوٹ کے راجا سال‌باھن Salbahan کا پوتا اور موجودہ بھٹی خیل کا مورث اعلٰی تھا ۔ اسی راجا کے متعلق روایت ہے کہ اس نے اس شہر کی بنیاد بٹون (موجودہ بھٹون) کے علاقے میں رکھی تھی اور اس سے اس علاقے کے موجودہ نام بھٹا واھن Bhutta Wahan کی توجیہ ہوتی ہے، جو ایک مترادف نام کے طور پر ہمیشہ لوگوں کی زبان پر رہا ۔ اس کی تاریخ اساس دوسری صدی عسوی خیال کی جاتی ہے اور اس کا قلعہ اس تاریخ سے مسلسل بھٹی قبیلے کے صدر مقام کے قریب رہا، جو پہلے لودروا Lodarva میں اور بعد ازاں جیسلمیر میں تھا ۔

چچنامہ میں بہاٹیا [= باتیہ، بھاتیہ، بھاطیہ] کا ذکر تین اہم واقعات کے سلسلے میں آتا ہے : اولاً، الور کے چچوں کی شمالی مہم (تقریبًا قبل ۱۲ھ / ۶۰۹ء) کے سلسلے میں، جس نے بہاٹیا کا قلعہ فتح کیا اور اس جگہ کے گورنر کو، جو سہاسیوں کا طرفدار تھا، مؤخرالذکر کے ایک ماتحت افسر کے ذریعے اسکلندا Asklanda (موجودہ اُچ) میں مروا ڈالا، جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی ۔ ثانیًا، بہاٹیا کا ذکر ایک واقعے کے ضمن میں آتا ہے جو محمد بن قاسم کے راوڑ Rawar فتح کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا (۹۳ھ / ۷۱۱ء)، جب راجا داھر کا بیٹا جیسیا Jaesia [= حیسیہ یا جیسیہ] بھاگ کر برہمن‌آباد چلا گیا تھا اور وہاں سے اس نے اپنے جاگیرداروں اور رشتے داروں کو اپنی امداد کے لیے خط لکھے، جن میں دھرسیا کا بیٹا ججح دوم بھی تھا، جو بہاٹیا میں متعین تھا ۔ ثالثًا، بہاٹیا کا ذکر محمد بن قاسم کے سندھ میں ورود و سفر (۹۵ھ / ۷۱۳ء) کے واقعے سے تعلق رکھتا ہے، جب وہ فتح کے قدم بڑھاتا ہوا ملتان کی طرف جا رہا تھا، اس نے الور کو چھوڑ دیا اور بہاٹیا پر حملہ کیا، جو

اسکلندا (موجودہ اُچ) اور ملتان کو جاتے ہوئے چچ کی دھلیز پر واقع اس کی راہ میں پہلا قلعہ تھا ۔ قلعے کی محافظ فوج نے معاہدۂ اطاعت اور Kuksa کی شرائط پر ہتیار ڈال دیے ۔ وہاں کا ایک متبحر عالم، جو قلعے کا گورنر اور راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا، محمّد ابن قاسم کا اس کی مزید فتوحات میں ایک وفادار حلیف بن گیا .

مسلمانوں کی اس فتح کے بعد امن و سلامتی اور خوشحالی کا دور آیا، جس میں بڑے بڑے ممتاز مسلمان سیّاحوں، جغرافیہ‌نویسوں اور ملکوں کا سراغ لگانے والوں کے گروہ مسلسل سندھ اور پنجاب میں آتے رہے ۔ ان تمام لوگوں نے ملتان کے احوال واضح طور پر لکھے ہیں، لیکن وہ بھاٹیا اور الور اور اُچ کے مابین دیگر شہروں کے متعلق خاموش ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ان کا مقصد نئے علاقوں کا دریافت کرنا تھا اور اپنے اس مقصد میں مخلص بھی تھے لہٰذا انہوں نے ان بستیوں میں جو یقیناً ان کے راستے میں پڑتی تھیں کوئی قابل ذکر چیز نہیں دیکھی .

ابو زید الحسن السیرافی (۲۶۳ھ / ۸۷۷ء) اس عہد کے شہر ملتان کا حال بڑی وضاحت سے لکھتا ہے، لیکن اسکلندا ایسے مشہور مضافاتی شہر کا ذکر نہیں کرتا ۔ البلاذری (۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) بھی محمّد ابن قاسم کے اس راستے کا حال جو اس نے الور اور ملتان کے درمیان اختیار کیا تھا بیان کرتے ہوئے بھاٹیا سے صرف نظر کر لیتا ہے، لیکن الاسکا Alaska نامی ایک قلعے کا ذکر کرتا ہے، جو ظاہر ہے عصر حاضر کا اسکلندا یا اُچ ہے ۔ ابن خُرداذبہ (۳۰۰ھ / ۹۱۲ء) مسعر بن مہلہل، ابن حوقل (۹۴۳ تا ۹۶۸ء)، الاصطخری (۹۵۰-۹۹۰ء) اور المقدسی وغیرہ (۹۵۰ / ۱۰۰۰ء) یہ سب ملتان کا حال بیان کرتے ہیں، لیکن الور اور ملتان کے درمیان کسی قصبے کا ذکر نہیں کرتے، شاید بجز بسمد کے، جو پنج‌ند اور دشاب معلوم ہوتا ہے اور دریاے سندھ (مہران) کے دوسرے دریاؤں کے ساتھ اتصال کا مقام ہے .

بھاٹیا کا شہر اور قلعہ دونوں البیرونی (تقریباً ۱۰۰۰ء) کے عہد تک پر رونق تھے، کیونکہ وہ اس کا ذکر ملتان، الور اور اس وقت کے دریاے سندھ کی دو شاخوں کے وسط میں ایک اہم منزل کے طور پر کرتا ہے .

بھاٹیا [بہاطیة] کا ایک اور ذکر العُتبی کی تاریخ یمینی میں سلطان محمود غزنوی کی (۳۹۵ھ/۱۰۰۴-۱۰۰۵ء) کی مہم کے سلسلے میں ملتا ہے۔ العُتبی بھاٹیا کا مقام دریاے سندھ کے مشرق میں ملتان کے نزدیک بتاتا ہے ۔ سلطان نے اس قلعے پر دھاوا بول کر اسے قبضے میں کر لیا ۔ راجا [بجے راے] چپکے سے فرار ہو گیا، لیکن جب اسے گرفتار کرنے لگے تو اس نے اپنا کام تمام کر لیا [سلطان محمود جب سیستان کے معاملات کا تصفیہ کر چکا تو اس نے بھاٹیا فتح کرنے کے منصوبے کی تکمیل کا فیصلہ کیا، چنانچہ وہ دریاے سیہوں (= دریاے سندھ) اور صوبۂ ملتان کو عبور کر کے بھاٹیا کے سامنے لشکر لے آیا ۔ شہر کی فصیل بہت اونچی تھی. . . . اس کے اردگرد خندق تھی، جو بہت گہری اور چوڑی تھی، اور اس کے چاروں طرف ایک وسیع حصار بنا ہوا تھا، جس میں علاقے کے دفاع کے لیے بڑے طاقتور سپاھی اور جنگجو ھاتھی متعین تھے ۔ اس کا راجا، جسے اپنے سپاھیوں کی بہادری پر بڑا اعتماد تھا، مقابلے کے لیے قلعے سے باھر نکل آیا ۔ تین دن گھمسان کا رن پڑا، اور آخرکار مسلمانوں کو فتح ھوئی اور انہوں نے قلعہ سر کر لیا ۔ راجا بجے راے Bijai Rāy نے بھاگ کر قریبی جنگل میں پناہ لی، لیکن جب گرفتار ہونے لگا تو خوف سے اپنے ھی خنجر سے خودکشی کر لی (العتبی : تاریخ یمینی،

ص ۳۲۲ تا ۳۲۳).

عنصری، جو سلطان محمود کا درباری شاعر تھا، بھاٹیا کے متعلق اپنے ایک قصیدے میں لکھتا ہے:

ور از بھاطیه (؟) گویم عجب فرومانی
که شاہ ایران آنجا چگونه شد بسفر
رہے که خاک درشتش چو تودهای خسک
بسان عالم و منزلگه اندرو کشور
برون گزشت برو شاه شهریار چو باد
بزور دین و بازار مذهب آزر
گرفت ملک بجیرا و گنج خانهٔ او
ز خون لشکر او کرد دشتِ خشک شمر
چنانش کرد خداوند خسروان زمین
که نام او بجهان گم شد است طول و قصر

(محمد ناظم: وہی کتاب، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸)]

گردیزی اپنی کتاب زین الاخبار میں اس واقعے کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ بھاٹیا [بہاطیه] دریائے سندھ پر واقع تھا۔ دریا کے کنارے گھنے جنگلات نے بھاٹیا کے مقامی راجا بجے رائے کے لیے روپوشی کا کام دیا، لیکن جب لشکر نے اسے تلاش کر لیا تو اس سے پہلے کہ وہ ان کے قابو میں آ جاتا اس نے اپنے آپ کو خنجر مار کر ہلاک کر لیا۔ گردیزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان براستهٔ والشتان (بلوچستان) اور حصار (قلعهٔ سیف اللہ) یہاں پہنچا تھا اور اسے آتے اور جاتے ہوے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس اعتبار سے بھاٹیا کا قلعہ قُصدار (= قزدار) Qusdar کی عین سرحد پر واقع تھا، جسے سلطان نے قریب ھی میں فتح کیا تھا؛ اصلی سرحد کی تعیین اس وقت کا دریائے سندھ کرتا تھا اور اس طرح راجا بجے رائے کو سلطان کی سرحد پر تاخت و تاز کرنے کی سہولت پیدا ہو گئی، نتیجۃً سلطان کو میدان میں نکلنا پڑا۔

یہی مصنف بھاٹیا کا ذکر سلطان محمود کی آخری مہم کے ضمن میں کرتا ہے، جو اس نے سندھ کے جاٹوں کو کچلنے کے لیے اختیار کی تھی اور لکھتا ہے کہ سلطان کو ملتان اور بھاٹیا کے جاٹوں سے، جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر آباد تھے، شکایت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بادشاہ کے لشکر کو، جب وہ سومنات سے واپس جا رہا تھا، بہت ہراساں کیا تھا۔ ملتان کے مقام پر سلطان نے آہنی سلاخوں کے ساتھ کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرایا اور دریائے سندھ کے اُتر کی طرف جاتے ہوے جاٹوں کی نسبۃً زیادہ ہلکی کشتیوں کو تباہ کر دیا، جبکہ بری افواج نے ان تمام فوجیوں کا خاتمہ کر دیا جنھوں نے بھاگ کر کناروں پر جانے کی کوشش کی۔ سلطان ان کے ٹھکانوں پر پہنچا اور ان کے مال و املاک اور ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ بھاٹیا کے جاٹوں کے مختلف قبائل تھے، مثلاً بھٹی، بھٹه، ماشی، دھر اور بلوچ، جو اس علاقے میں آباد تھے اور فوقیت حاصل کرنے کی خاطر ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔

تاریخ مبارک شاہی میں مرقوم ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء میں اُچ اور بھاٹیا کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی تاکہ وہ شورش پسند بھاٹیا قبیلے کو سزا دے۔ اس مہم میں وہ کامیاب رہا اور اس نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو اُچ اور ملتان کا گورنر مقرّر کیا۔

طبقات ناصری اور طبقات اکبری کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ بھٹی اُس وقت تک وہاں قابض تھے۔

بھاٹیا کا ایک اور سراغ تیمور کے پوتے مرزا پیر محمد کے حملے کے سلسلے میں تاریخ معصومی میں ملتا ہے، جس نے بھاٹیا پر، جو اس زمانے میں بھاٹی واہن کہلاتا تھا، حملہ کیا اور تقریباً پورے

شہر کو مسمار کر دیا (تقریباً ۱۰۰۹ء)، تاکہ اس جگہ کے حد سے زیادہ شورش پسند لوگوں کی قوت کو کچل ڈالے، یہ بھی غالباً "بھاٹی" تھے۔

لیکن ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھاٹیا اس آفت سے بھی بچ نکلا تھا۔ تاریخ معصومی میں لکھا ہے کہ واھنوں کے نسبةً زیادہ شورش پسند قبیلے نے، جو اس وقت قابض تھا، پھر علم بغاوت بلند کیا، لیکن اس دفعہ یہ بغاوت سندھ کے حکمران شاہ حسن ارغون کے خلاف (۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء) تھی۔ انھیں بالآخر حسن شاہ کے سپہ‌سالار بابا احمد نے کچل ڈالا، لیکن اسے اس معرکے میں اپنی جان سے ھاتھ دھونے پڑے۔

اس واقعہ کے بعد بھاٹیا ایک اور تغیر سے دوچار ہوا اور طاقتور بھٹا قبیلے کے ایک بار پھر عروج کے سبب اس کا نام بھٹا واھن پڑ گیا، اور اس وقت سے آج تک اسی نام سے معروف ہے۔ مقامی روایت کی رو سے اس شہر کے ناموں کی ترتیب‌وار فہرست یہ ہے۔ لتی واھن (قدیم لتا قبیلے کے نام پر) بھاٹیا، بھاٹی واھن اور بھٹا واھن، لیکن لوگ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ تمام نام بیک وقت مروج تھے۔

آج کل بھٹا واھن صادق‌آباد ریلوے سٹیشن کے شمال میں تقریباً نو میل کے فاصلے پر جمال دین والی کو جانے والی پکی سڑک پر واقع ہے اور صادق آباد مغربی پاکستان کی قسمت بہاولپور میں ہے۔ یہ جگہ وسیع کھنڈروں سے بھی پڑی ہے، جو قلعے کے دو میل سے زائد دائرے پر پھیلے ہوئے ہیں اور قلعے پر موجودہ گاؤں آباد ہے۔ یہ امر ایک بڑے شہر کی نشان دہی کرتا ہے جو قدیم دریاے سندھ کی تہ کی ایک خشک شاخ پر واقع تھا، جو پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے ساتھ آج کے مقام پر مل جانے کے فوراً بعد ھی دو شاخوں میں منقسم ہو جاتا تھا، یعنی لوھاروانی اور بیچ میں، اور یہ دونوں شاخیں پھر بھٹا واھن سے ذرا نیچے باھم مل جاتی تھیں اور پھر یہاں پھیل کر ایک جھیل کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ یہ شمالی یا لوھاروانی شاخ کا بایاں کنارا تھا جہاں بھاٹیا کا موجودہ گاؤں واقع ہے۔

تقریباً ۱۷۰۰ء میں دریاے سندھ نے مذکورۂ بالا راستہ تبدیل کر کے موجودہ راستہ اختیار کیا اور یہ مقام اپنی مرکزی اور عسکری اھمیت سے محروم ہو گیا اور بعد میں اس کی حالت جان باب مریض کی سی ہو گئی۔

اس جگہ کی روایاتی تاریخ اسے سسّی کا مولد و منشا بتاتی ہے، جو پاکستان کی مشہور عوامی عشقیہ کہانی "سسّی پنّوں" کی ہیروئن ہے۔ اس جگہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دربار اکبری کے دو مشہور شخصیتوں ابوالفضل اور فیضی کی جاے پیدائش ہے۔

مآخذ: (۱) Elliot و Dowson : *History of India as told by its own Historians*، لنڈن ۱۸۶۷ء، ج ۲، تکملہ، بذیل مادۂ بھاٹیا؛ (۲) علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی: فتح نامۂ سندھ، المعروف بہ چچنامہ، طبع داؤد پوتہ، دہلی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء، ص ۱۵، ۳۳، ۳۴، ۵۳، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۷۵؛ (۳) گردیزی: زین الاخبار، طبع محمد ناظم، ص ۶۶؛ (۴) Guy Le Strange : *Lands of the Eastern Caliphate*، بار سوم، لنڈن ۱۹۶۶ء، نقشہ ۷؛ (۵) البیرونی: *Indica*، ترجمۂ Sachau، لنڈن، ۲ : ۲۰۵؛ (۶) محمد ناظم : *The Life and Times of Sultān Mahmūd of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۷، ۲۰۲؛ (۷) Elliot : *Muslim Historians*، ج ۱، بذیل مادۂ رشیدالدین؛ (۸) Alexander Cunningham : *The Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، ص ۲۱۳، ۲۳۲؛ (۹) *Bahawalpur State Gazetteer*، حصّۂ الف، ۱۹۰۴ء،

ص ۶، ۷، ۵۷، ۳۵۹؛ (۱۰) Abbott : *Reorientation on an Unhappy Valley*، ص ۱۰۰؛ (۱۱) میر معصوم بکّری : تاریخ سندھ، المعروف بہ تاریخ معصومی، طبع داؤد پوتہ، ص ۶۹، ۱۳۳، ۱۶۳، ۲۲۳؛ (۱۲) سلطان احمد: *Ghost Cities of Pakistan*، بذیل مادّۂ بھاٹیا؛ (۱۳) محمد حسین سیالکوٹی : *History of Gujars alias Ansab Gujran*، بذیل مادّۂ بھٹی، ص ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳؛ (۱۴) Ibbetson : *Tribes and Castes in the Punjab*، ج ۱، بذیل مادّۂ بھٹی؛ (۱۵) *Epigraphia Indika*، ج ۲۱؛ (۱۶) العتبی : تاریخ یمینی، ترجمۂ James Reynolds، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۳۲۲ بعد؛ (۱۷) تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۵، ۶؛ (۱۸) طبقات ناصری، ص ۱۱۶ (بذیل مادّۂ سلطان محمد بن سام شہاب الدین غوری)، کلکتہ ۱۹۶۳ء؛ (۱۹) James Tod : *Annals and Antiquities of Rajasthan*، طبع W. Crooke، لنڈن - بمبئی ۱۹۲۰ء، ۲ : ۱۱۶۹ تا ۹۷ : ۱ء؛ (۲۰) طبقات اکبری (۱ : ۱۶)، کلکتہ ۱۹۲۷ء - ۱۹۳۵ء.

(سلطان احمد)

⊗ **بھارت** : رک بہ ہندوستان.

⊗* **بھٹائی** : شاہ عبداللطیفؒ (۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) ایک سندھی صوفی شاعر اور پیشواے دین، جو مٹیاری [کے قریب ہالہ حویلی نام گاؤں] میں پیدا ہوے - یہ مٹیاری سادات سے تعلق رکھتے تھے - انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بھٹ (= ریت کا ٹیلہ) میں گزارا، جو ہالہ ضلع حیدرآباد سندھ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے - ان کی شاعری صوفیانہ رنگ کی ہے - ان پر جلال الدّین رومی کے متصوفانہ افکار کا بہت گہرا اثر پڑا تھا اور یہ اثر ان کی بہت سی نظموں میں نمایاں ہے - یہ نظمیں ان کی وفات کے بعد اکھٹی کی گئیں، جنھیں ان کے مریدوں نے جمع کر کے اس کا نام رسالو [= رسالہ، دیوان] رکھا - یہ نظمیں اٹھارھویں صدی عیسوی کی سندھی میں لکھی گئی ہیں اور اپنی اس طرز خاص کے لیے ممتاز ہیں جس میں حضرت بھٹائی نے سندھ کی لوک کہانیوں کو عارفانہ رنگ میں پیش کیا ہے.

یہ نظمیں ان جذبات سے بحث کرتی ہیں جو ہجر و فراق کے عالم میں پیدا ہوتے ہیں اور اللہ عزّوجل کی قدرت، حکمت اور رحمت پر تکیہ کرنے کی ضرورت جتاتی ہیں - ان کی گہری صوفیانہ نوعیت نے انھیں عام و خاص سب میں نہایت مقبول بنا دیا ہے - قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے لیے بھی وہی دل کشی رکھتی ہیں جو مسلمانوں کے لیے. . . - شاہ لطیفؒ کے رسالو کی نظمیں غنائی ہیں اور مشہور ہندوستانی راگوں میں گائی جاتی ہیں، اور ان میں سے بہت سی، مثلاً سُرآسا اور سُر بلاوَل کی ارفع صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، دوسری طرف عوامی کہانیاں جذب و حال کی کیفیت لیے ہوے جو عام قاری اور مخاطب پر، جس میں سادہ دیہاتی بھی شامل ہیں، براہ راست اثر کرتی ہیں - 'سسّی پنّوں'، 'سوھنی مہینوال' اور 'لیلا چنیسر'، 'مومل رانو'، 'عمر ماروی'، 'نوری جام تماچی' اور 'سورٹھ راے ڈیاچ' کی محبت کی کہانیاں آج بھی سندھی بچوں کو پنگورے میں سنائی جاتی ہیں - ان وجوہ سے سندھی زبان میں حضرت بھٹائیؒ کے بارے میں وسیع ادب پیدا ہو گیا ہے اور روضۂ عبداللطیفؒ پر ان کے معتقدین آج بھی دور دور سے زیارت کے لیے آتے ہیں اور ان کی نظموں کو پڑھتے اور گاتے ہوے سنتے ہیں - شاہ عبداللطیفؒ کی تصنیفات اور زندگی کا مطالعہ تین ممتاز سندھی اہل علم نے کیا ہے، یعنی شمس العلما میرزا قلیج بیگ، پروفیسر ایچ - ایم - گور بخشانی اور شمس العلما عمر بن محمد داؤد پوتہ.

(H.T. SORLEY)

[سندھ کے مشہور بزرگ اور صوفی شاعر سیّد

عبدالکریم بُلڑی والے شاہ عبداللطیف کے جد امجد تھے۔ ان کا شجرۂ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے : سیّد عبداللطیف بن سیّد حبیب بن سیّد عبدالقدوس بن سیّد عبدالکریم بلڑی والا.

شاہ عبداللطیف کا بچپن اپنے گاؤں ہالہ حویلی میں اور شباب کا زمانہ کوٹری میں گزرا، لیکن اس کے بعد انھوں نے بھٹ کے ویران مقام کو اپنی مستقل سکونت کے لیے منتخب کیا، جہاں ان کا مزار ہے۔ بچپن ھی سے ان کا رجحان دین اور تصوّف کی طرف تھا ۔ بڑے ہوے تو فقیروں اور صوفی منش بزرگوں میں بیٹھنا اور ذکر و فکر کرنا ان کا محبوب مشغلہ ٹھیرا ۔ وہ طبعًا سادگی‌پسند تھے، ان کی گفتگو سادہ، مگر شیریں و پُرسوز ہوتی تھی، عجز و انکسار ان کی سیرت کی امتیازی خوبی تھی ۔ شعر سے انھیں فطری لگاؤ تھا.

ہر سال صفر کی چودہ تاریخ کو شاہ لطیف کے مقبرے پر بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے ۔ اس موقع پر لوگ اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ٹولی شاہ بھٹائی کا کلام اپنی مخصوص طرز میں ترنّم سے پڑھتی ہے ۔ ابھی تک کچھ ٹولیاں ایسی بھی ہیں جو اُن کے کلام کو اُس طرز میں گاتی ہیں جس میں آج سے دو سو سال پہلے لوگ خود شاہ بھٹائی کے زمانے میں گاتے تھے ۔ ہر سو وجد و حال کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ حکومت مغربی پاکستان نے شاہ لطیف کے مقبرے کے ساتھ، جسے سندھ کے امیر غلام شاہ کلورو نے تعمیر کرایا تھا، مرکزِ ثقافت قائم کیا ہے، جس کا مقصد شاہ بھٹائی کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے.

شاہ بھٹائی کا مزاج قلندرانہ اور دل عشقِ الٰہی سے معمور تھا ۔ ان کی طبیعت میں موزونیت اور دل میں سوز و گداز بدرجۂ اتم موجود تھا، چونکہ ان کی ساری زندگی صحرائی ماحول میں اور عوام کے درمیان گزری تھی اس لیے انھیں صحرائی ماحول اور عوامی زندگی سے بےحد محبت تھی ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت شاعرِ نہایت بھی ہیں اور عوام کے شاعر بھی ۔ ان کے کلام کی مقبولیت اور شہرت کے تین اہم اسباب ہیں : اوّلًا اس میں بےحد سوز و گداز پایا جاتا ہے، جو صوفیانہ رنگ سے مزین ہے، ثانیًا اس میں شعریت و موسیقیت غایت درجہ موجود ہے اور ثالثًا وہ اپنے علاقے کی رومانی داستانوں پر مشتمل ہے، جو نہایت دلچسپ، مشہور اور مقبول عام ہیں۔ ان کا دیوان شاہ جو رسالو (یعنی شاہ جی کا دیوان) سندھ کے گوشے گوشے میں عقیدت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اس سے یقینًا سندھی ادبیات کی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے ۔ اس دیوان کو سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع کرنے کا سہرا ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر ٹرمپ کے سر ہے، بعدازاں یہ متعدّد بار شائع ہوا؛ مشہور مؤلفین کے نام یہ ہیں : محمد صدیق میمن؛ مرزا قلیچ بیگ؛ ڈاکٹر گوربخشانی؛ غلام محمّد شہوانی؛ محمّد عثمان ڈیپلائی؛ مولوی غلام مصطفٰی قاسمی؛ آئی ۔ آئی ۔ قاضی اور کلیان اڈوانی ۔ علاوہ ازیں حکومت سندھ نے بھی اس دیوان کا ایک اڈیشن شائع کیا تھا.

شاہ بھٹائی کے ہمعصر شعرا میں مندرجۂ ذیل نام قابل ذکر ہیں:۔

پنجابی شعرا: بلّھے شاہ (۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء تا ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، شاہ شرف بٹالوی (۱۰۶۳ھ/ ۱۶۵۳ء تا ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء)، سیّد علی حیدر ملتانی (۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء تا ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، میاں اشرف لاہوری (م ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء)، غلام قادر بٹالوی (م ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ - ۱۷۶۳ء).

پشتو شعرا : خوشحال خان خٹک (ولادت ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء)، عبدالرحمٰن المعروف بہ رحمان بابا (۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ - ۱۶۳۳ء تا ۱۱۱۸ھ/

۱۷۰۶ء)۔

اردو شعرا: ولی دکنی (۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء تا ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء)؛ شاہ مبارک آبرو (م ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء)؛ سراج الدین خان آرزو (۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء)؛ ظہورالدین حاتم (۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء تا ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء)؛ مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء تا ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) - ان تمام شعرا کے کلام کے تقابلی مطالعے سے اس دور کے ذہنی رجحانات اور ثقافتی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے]۔

مآخذ: (۱) آئی۔ آئی۔ قاضی: *Shah Abdul Latif-An Introduction to His Art*، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد - کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲) H. T. Sorley: *Shah Abdul Latif of Bhit*، لندن ۱۹۴۰ء؛ (۳) Ernest Trumpp: *The Risalo*، ۱۸۶۶ء؛ (۴) تاراچند شوکی رام: *The Risalo*، ۱۹۰۰ء؛ (۵) گوربخشانی H.M. Gurbuxani: *The Risalo*، کراچی ۱۹۲۳ء؛ (۶) مرزا قلیچ بیگ: لغت لطیفی، ۱۹۱۳ء؛ (۷) قدیم سندھ، ۱۹۲۵ء؛ (۸) وہی مصنف: شاہ عبداللطیف بھٹائی، ۱۹۱۰ء؛ (۹) ایم - ایم - گدوانی: *Shāh Abdul Latīf*، لندن ۱۹۲۲ء؛ (۱۰) جیٹھا مل پرس رام: *Sind and its Sūfis*، ۱۹۲۴ء؛ (۱۱) وہی مصنف: *Shāh Jūn Akhānūn*، ۱۹۲۳ء؛ (۱۲) N. N. Bilimoria: *Bibliography of publications on Sind and Balūchistān*، ۱۹۳۰ء؛ (۱۳) جیٹھامل پرس رام: *Interesting New Ballads*، ۲ جلد، ۱۹۲۷ء؛ (۱۴) ایچ - ایچ - لال وانی و آر - ایم - خیمانی: تواریخ سندھ، ۱۹۲۷ء؛ (۱۵) جیٹھامل پرس رام: قدیم سندھ؛ (۱۶) وہی مصنف: *Saints of Sind*، ۱۹۲۶ء؛ (۱۷) وہی مصنف: *India and Sind and its Sufis*، حیدر آباد ۱۹۲۴ء - محکمۂ اطلاعات حکومت مغربی پاکستان، حیدر آباد کی مطبوعات: (۱۸) گلستان لطیف؛ (۱۹) نذر لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۲۰) یاد لطیف (سندھی)، کراچی ۱۹۵۷ء؛ (۲۱) تحفۂ لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۲۲) بہار لطیف (سندھی)؛ (۲۳) نغمات لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۶۰ء؛ (۲۴) *Shah Abdul Latif of Bhit*، ۱۹۵۳ء؛ (۲۵) Ernest Trumpp: *The Risalo*، لائپزگ ۱۸۶۶ء؛ (۲۶) قاضی ابراہیم: *The Risalo*، بمبئی ۱۸۶۷ء؛ (۲۷) مرزا قلیچ بیگ: شاہ جو رسالو، سکھر ۱۹۱۳ء؛ (۲۸) آئی - آئی - قاضی: *The Risalo*، حیدر آباد ۱۹۶۱ء؛ (۲۹) E. H. Aitken: *Sind Gazetteer*، جلد ۱، بمبئی ۱۹۰۷ء؛ (۳۰) G. Allana: *Presenting Pakistani Poetry*، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۳۱) اے - کے - بروہی: *An Adventure in Self-Expression*، کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۳۲) Burton H. Richard: *History of Sind*، لندن ۱۸۵۱ء؛ (۳۳) کریم بخش خالد: *Poet Laureate of Sindhi*، حیدرآباد ۱۹۶۱ء؛ (۳۴) S. A. Kincaid: *Tales of Old Sind*، ۱۹۲۲ء؛ (۳۵) لیلا رام رتن مل: *The Life, Religion and Poetry of Shah Abdul Latif*، ۱۸۹۰ء؛ (۳۶) مرزا قلیچ بیگ: *Life of Shah Abdul Latif Bhitai*، ۱۸۸۷ء؛ (۳۷) W. Southey: *Life of Shah Anbdul Latif*، کراچی ۱۸۷۰ء؛ (۳۸) Tirithdas Hotchand: *Shah Abdul Latif-An Introdction to His Seven Singing Stories*، حیدرآباد ۱۹۶۲ء؛ (۳۹) آغا تاج محمد: عکس لطیف، حیدر آباد ۱۹۵۱ء؛ (۴۰) رشید احمد لاشاری: روح لطیف، حیدر آباد ۱۹۵۳ء؛ (۴۱) نذر علی بلوچ: مرغوب الاحباب، ۱۸۳۵ء؛ (۴۲) عبدالرحیم بیدل آبرو: *Barsati Boondoon* (سندھی)، ہالہ ۱۹۵۲ء؛ (۴۳) بھیرومل مہرچند اڈوانی: *Latifi Sair* (سندھی)، ۱۹۲۸ء؛ (۴۴) وہی مصنف: لغت غریب (سندھی)، حیدر آباد ۱۹۰۷ء؛ (۴۵) وہی مصنف: *Choond Kalam*، حیدر آباد؛ (۴۶) کلیان اڈوانی: شاہ (سندھی)، بمبئی ۱۹۵۱ء؛ (۴۷) لطف اللہ بدوی: تذکرۂ لطفی (سندھی)، حیدر آباد؛ (۴۸) میرزا قلیچ بیگ: شاہ

جے رسالے جی کنجی (سندھی)، ۱۹۱۸ء؛ (۴۹) حاجی موسی خان : بادشاہ بھٹائی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء.

([H.T. Sorley] و ادارہ)

* **بَھٹِنْڈَہ** : سابق ریاست پٹیالہ کی، جو آج کل بھارت کے صوبۂ پنجاب میں مدغم ہو گئی ہے، تحصیل گووند گڑھ کا صدر مقام، ۳۰ درجے ۱۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۵۷ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کی آبادی (۱۹۰۱ء میں) ۳۴۹۹۱ تھی۔ یہ قدیم شہر بھاٹیا راجپوتوں کا مسکن تھا اور جنگی اہمیت کے وہ راستے اس کی زد میں تھے جو ملتان سے راجستھان اور وادی گنگ کی طرف جاتے تھے، جن میں کئی تاریخی مقامات مانند پانی پت، اور آگے بڑھ کر اندرا پت (دہلی) شامل ہیں۔ انھیں راستوں سے شمال مغرب کے حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملے کیے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر گھگر ندی کے، جو آج کل بھی انبالہ [رک بآں] کے پاس سے گزرتی ہے، ایک معاون نالے پر واقع تھا اور اس کے گرد کی زمین عملاً غیرآباد تھی۔ مسلمانوں کے زمانے سے پہلے یہ وکرم گڑھ کے نام سے مشہور تھا۔ مسلم ہند کے ابتدائی وقائع، مثلاً طبقات ناصری اور حسن نظامی کی تاج المآثر (پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ) میں اسے تبرھندہ لکھا ہے، جو اس کے صحیح نام بتِرندہ (بھَتِرنْدہ) کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اس تبدیلی کی وجہ ب اور ت کے نقطوں کا جگہ سے بدل جانا ہے۔ مرتضی الزّبیدی اصلیت کے زیادہ قریب ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ البترندہ ہندوستان میں ایک شہر ہے (تاج العروس، ۹ : ۲۱۲)۔ ''بھٹرندہ'' لفظ بھٹّی اور رندہ (= جنگل، گزرگاہ) سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں وہ مقام جہاں بھٹّی لوگ بکثرت ہیں، اسی طرح ''سہرند'' سیلہ (porcupine) اور رند (جنگل) سے مرکب ہے اور اسے بھی غیر ہندی مسلم مؤرخوں نے بدل کر سرھند کر دیا ہے۔ تمام قدیم تر فارسی وقائع اور صوفیوں کے تذکروں میں اس جگہ کا نام عموماً سہرند ہی لکھا ہے (مثلاً بابر نامہ، انگریزی ترجمہ از A. S. Beveridge، ۱ : ۳۸۳)۔ طبقات ناصری (طبع عبدالحیّ حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ۱ : ۵۳۷) میں بھٹنڈہ کو غلطی سے سرھند لکھا ہے، اس لیے کہ اس شہر کے قرب و جوار میں کہیں پہاڑیاں نہیں۔ ہاں بھٹنڈہ سے تیس میل دور سرھند کے راستے میں ایک گھنے جنگل کا وجود ملفوظات تیموری کے بیان سے ثابت ہوتا ہے (Elliot و Dowson، ۳ : ۴۲۷)۔ یہ جنگل چیتے کے شکار کے لیے اکبر کی پسندیدہ شکارگاہ تھا (آئین اکبری، انگریزی ترجمہ Blochmann، ۱ : ۲۸۶)۔ بھٹنڈہ اور اس کے گرد و نواح میں بھٹیوں کی کثرت کی بابت وافر شہادت موجود ہے (Imp. Gazetteer of India، طبع جدید، ۸ : ۹۱) کننگھم Cunningham نے بھٹنڈہ کے اشتقاق کی بابت محض قیاس کی بنا پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ صحیح نہیں اور حقیقت سے دور ہے۔

بھٹنڈہ کو محمود غزنوی نے ۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ء میں فتح کیا۔ بھٹنڈہ (بہاطیہ) کا راجا بجے رائے محاصرہ کرنے والوں کی تاب مقاومت نہ لا سکا، قلعے سے نکل بھاگا اور خودکشی کر لی۔ جس ''بہاطیہ'' (بھاٹیا) [رک بآں] کا العُتبی (تاریخ یمینی، لاہور ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء، ص ۲۰۹ ببعد) نے ذکر کیا ہے اس کی شناخت میں کس قدر اختلاف رائے ہے۔ محمد ناظم (The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۷ - ۲۰۳) وثوق سے کہتا ہے کہ وہ اور کوئی شہر نہیں بھٹنڈہ ہی تھا، لیکن ایک غیر معروف مقام ہاطیّہ اب بھی راولپنڈی کے اطراف میں موجود ہے اور اس پر بھی کسی حد تک العُتبی کا بیان صادق آتا ہے۔ بہرحال جب تک زیادہ قطعی شہادت نہ ملے محمد ناظم کا قول ماننا پڑے گا۔ العُتبی

(ص ۹ ۔ ۲) بھٹنڈہ کی بلند فصیل اور اس کے استحکامات کی، جو محمود کے زمانے میں موجود تھے، بڑی جیتی جاگتی کیفیت بیان کرتا ہے ۔ سلطان محمود کی یہی فتح بالواسطہ ھندوستان کے سامانہ، انبالہ اور حصار کے خطے میں اسلام کے تعارف کا نشان آغاز ہے ۔ معزالدین سام شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں بھٹنڈہ فتح کیا ۔ جب محمد غوری غزنہ واپس چلا گیا تو ملک ضیاءالدین تولکی پر، جو بھٹنڈہ میں اس کا نائب حکمران تھا، رائے پتھورا (پرتھوی راجا) نے حملہ کر دیا اور قلعے کا محاصرہ تیرہ مہینے جاری رکھا ۔ انجام‌کار قلعہ‌دار نے دشمن سے صلح کر لی اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا ۔ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں قطب‌الدین ایبک کی وفات کے بعد ناصرالدین قباچہ نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد یہ خاندانِ غلاماں کے بادشاھوں کے قبضے میں رہا ۔ ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء میں ملک اختیارالدین آلتونیہ نے، جو بھٹنڈے کا حاکم تھا، بغاوت کر دی ۔ یاقوت حبشی کو قتل کر دیا اور رضیہ سلطانہ [رَكَ بآں] کو قید کر کے قلعے میں رکھا اور وھیں اس سے شادی بھی کر لی ۔ مگر وہ دونوں بھٹنڈے سے دہلی جاتے وقت ھندؤوں کے ھاتھوں مارے گئے ۔ ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں ناصرالدین محمود نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور ملک شیر خاں کو وھاں کا حاکم مقرر کردیا ۔

اس کے بعد اس شہر کا ذکر بہت کم سننے میں آتا ہے ۔ اگرچہ اس کا قلعہ اپنی مضبوطی اور ناقابل تسخیر ہونے کے باعث ھر زمانے میں مشہور رہا ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بابرنامہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں ۔ یہ ذکر پہلے آ چکا ہے کہ اکبر پرگنۂ بھٹنڈہ میں شکار کھیلا کرتا تھا ۔ اس کے اتالیق بیرم خاں [رَكَ بآں] نے معتوب ہونے کے بعد جلندر [رَكَ بہ دوآب] جانے سے پہلے اپنے اھل و عیال کو اس قلعے میں ٹھیرایا تھا ۔ جلندر پر اس کی شاھی لشکر سے ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں وہ بری طرح ھارا ۔ اس کے بعد بھٹنڈے کا نام تاریخ سے غائب ھو جاتا ہے اور فقط ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء میں اس کا پھر نام آتا ہے جب اسے پٹیالہ کے راجہ آلا سنگھ نے فتح کیا ۔ اس کے بعد یہ اس کی اولاد کے قبضے میں رہتا چلا آیا یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں اس سارے علاقے کو بھارت میں مدغم کر لیا گیا ۔ موجودہ قلعہ ایک سو اٹھارہ فٹ بلند ہے اور اس کے چھتیس برج ھیں ۔ قلعہ شہر پر، جو لین دین اور تجارت کی بارونق منڈی ہے، حاوی ہے، اور ارد گرد کئی میل سے نظر آتا ہے ۔ سلطان محمود کے زمانے میں اس کے گرد ایک چوڑی اور گہری خندق تھی، جسے اس کے حکم سے درختوں اور پتھروں سے پاٹا گیا تب قلعہ فتح ھوا ۔ یہ خندق آج‌کل بھی موجود ہے، مگر جگہ جگہ کوڑے کرکٹ اور شہر کے ملبے سے اٹ گئی ہے، جو اس میں لا کر ڈالا جاتا رہا ہے ۔ یہ قلعہ اب تیزی کے ساتھ خستہ و شکستہ ھوتا جا رھا ہے اور اس کے سب سے بڑے دروازے کی محرابوں تک میں بڑی بڑی درزیں پڑ گئی ھیں ۔ اس کے دو بھاری مینار ۱۹۵۸ء میں گر چکے ھیں ۔ بابا حاجی رتن ھندی [رَكَ بہ رتن] کی بابت مشہور ہے کہ وہ اس شہر کے باشندے تھے ۔

مآخذ : (۱) العُتبی : تاریخ یمینی، (کتاب الیمینی) لاھور، ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء، ص ۹۰ ۲ ببعد اور انگریزی ترجمہ از J. Reynolds، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۳۲۲ تا ۳۲۶؛ (۲) طبقات ناصری (طبع عبدالحی حبیبی) ۲ جلد، ج ۱، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ج ۲، لاھور ۱۹۵۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) فرشتہ : گلشنِ ابراھیمی، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ص ۳۴؛ (۴) گردیزی : زین الاخبار، طبع محمد ناظم، کیمبرج ۱۹۲۸ء، ص ۶۷؛ (۵) H. G. Raverty : انگریزی ترجمۂ طبقات ناصری، لنڈن ۱۸۸۱ء، ۱ : ۷۹ تا ۸۰، ۴۶۲، ۵۳۳، ۶۳۵؛ ۲ : ۷۹۰؛ (۶) P. W. Powlett : *Gazetteer of Bikanér State*،

(۱۸۷۳ء)، ص ۱۲۲ بعد؛ (۷) سجان رائے: خلاصۃ التواریخ، طبع ظفر حسن، دہلی ۱۹۱۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) نظام الدین احمد: انگریزی ترجمۂ طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ۱: ۵ بعد؛ (۹) البداؤنی: منتخب التواریخ، انگریزی ترجمہ، کلکتہ ۱۸۹۸ء، جلد ۱، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) *Imp. Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۸۹ تا ۹۰؛ (۱۱) محمد ناظم: *The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۶ تا ۲۰۳ اور بمدد اشاریہ؛ (۱۲) A. Cunningham: *Archaeological Survey of India* (سالانہ اطلاعات) ۲۳: ۲ تا ۸؛ (۱۳) *Journal of the Punjab Historical Society*، ۲: ۱۰۹؛ ۳: ۳۰؛ (۱۴) *Cambridge History of India*، ۳: ۱۳؛ (۱۵) اکبر نامہ (Bib. Ind.) انگریزی ترجمہ، ۲: ۱۶۶؛ (۱۶) آئین اکبری، (انگریزی ترجمہ از Jarret) کلکتہ ۱۸۹۱ء، ۲: ۲۹۵، ۳۶۰ تا ۳۶۱ (۱۷) Elliot و Dowson، ۲: ۴۳۸ تا ۴۴۰؛ (۱۸) مقالہ رتن، در آآو، لائڈن، طبع اول، تکملۃ؛ (۱۹) المیزان، حیدر آباد ۱۳۳۰ھ، ۲: ۴۰۰.

(بزمی انصاری)

* بھٹی: راجپوتی لفظ بھاٹی کی پنجابی شکل، ایک دور دور تک پھیلے ہوئے راجپوت قبیلے کا نام، جس کا تعلق اس علاقے سے ہے جو جیسلمیر سے مغربی پنجاب کے فتح آباد اور بھٹنیر کے درمیان کے قطعے تک پھیلا ہوا ہے ۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نے، جو پنجاب میں بس گئی تھی، اسلام قبول کر لیا ۔ ان کی روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق جیسلمیر کے جادون Jadons، زابلستان سے پنجاب اور راجپوتانے کی طرف نکال دیے گئے تھے ۔ ان کی وہ شاخ جو راجپوتانے میں جا بسی بھاٹی کہلائی ۔ چچ نامہ میں صحرائے تھر Thar کے مقام رمل کے بھٹی راجا کے جو حالات دیے گئے ہیں وہ ان قصوں کی تصدیق کرتے ہیں جو Tod: *Annals and antiquities of Rajasthan*، مدراس ۱۸۷۳ء، میں محفوظ کیے گئے ہیں ۔ ان کا ذکر عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (Bib. Indica، ص ۳۶ تا ۳۹) میں بھی آیا ہے، ان کی بستیوں کی وسیع نوعیت کا ذکر آئین اکبری میں آیا ہے، جہاں ابوالفضل ''بھٹی'' کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے مخصوص کرتا ہے جو سرہند، ملتان اور پنجاب میں آباد تھے [نیز رک بہ بھاٹیا].

مأخذ: مخطوطہ عدد Eur. D. 164، انڈیا آفس لائبریری: *History of the Rathors and Bhattis of Rajputana*.

(C. COLLIN DAVIES)

* بھرتپور: بھارت کی ایک سابق ریاست؛ آج کل راجستھان کا ایک حصہ، ۲۶ درجے ۴۳ دقیقے اور ۲۷ درجے ۵۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۶ درجے ۵۳ دقیقے اور ۷۷ درجے ۴۶ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے ۔ ریاست کا صدر مقام بھرتپور شہر ہے، جو ۲۷ درجے ۱۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی پر، آگرے سے چونتیس میل کے فاصلے پر ہے ۔ اس شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۴۳۲۱۱ تھی ۔ بھرسر کو، جو بھرتپور سے چودہ میل ہے، پانچویں صدی ہجری / گیارھویں عیسوی میں محمود غزنوی کی فوجوں نے سید بھائیوں جلال الدین اور علاءالدین کے زیر قیادت، جو اپنے آپ کو امام جعفرالصادقؓ کی اولاد بتاتے تھے، فتح کیا ۔ یہاں کی ایک مقامی روایت کے مطابق اس کے فتح کرنے میں تین گھنٹے کے قریب لگے تھے اور اس وجہ سے اس کا نام بھر (۳ گھنٹے) سر (فتح کیا ہوا) پڑ گیا ۔ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ معزالدین بن سام شہاب الدین محمد غوری کے قبضے میں آ گیا ۔ اس کے بعد مختلف خانوادوں کے زیر حکومت رہتا چلا آیا، یہاں تک

کہ بابر نے اسے فتح کیا۔ بابر نے بیانہ (بھرتپور سے چونتیس میل) کے رئیس کو ایک منظوم اعلان جنگ بھیجا تھا، جس کے شروع کا مصرعہ تھا:

با ترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ

[اور باقی مصرعے حسب ذیل تھے:

مردانگی و چستی اتراک عیان است

گر زود نیائی و اطاعت نکنی پیش

آنرا کہ عیا نست چہ حاجت بہ بیانست]

اس کے بعد یہ مغلوں ہی کی حکومت میں رہا۔ اورنگ‌زیب کے آخری ایام میں برج، نے جو ریاست بھرتپور کا بانی تھا، کوشش کی کہ خودمختاری حاصل کر لے، لیکن شاہی فوج نے اس کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور برج لڑائی میں مارا گیا۔ فرخ‌سیر کے زمانۂ سلطنت (۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) میں چورامن جاٹ نے اس علاقے میں لوٹ مار کی، اور دہلی اور آگرے کے راستے بند کر دیے۔ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں ایک بڑی مہم جے پور کے راجا سوائی جے سنگھ کے زیر قیادت چورامن کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی، لیکن بادشاہ گر سیدوں نے، جو محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے خلاف تھے، جاٹوں سے ازخود صلح کر لی۔ ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۲ء میں شہنشاہ کو خراج دینے کی شرط پر چورامن کے جانشین بدن سنگھ کے پورے بھرتپور کے راجا ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں اس کے بیٹے سورج مل نے اتنی قوت بہم پہنچا لی کہ شاہی صدر مقام (دہلی) پر ہلہ بول دیا اور لوٹ کھسوٹ مچائی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی [رک بآں] نے اپنے چند خطوط میں ان مظالم کا نوحہ کیا ہے جو جاٹوں کے ہاتھوں باشندگان دہلی پر ہوے۔

موجودہ شہر بھرتپور اور اس کے کچے قلعے کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۱۳۶ھ / ۱۷۳۳ء میں تعمیر ہوے تھے۔ انگریزوں نے لارڈ لیک کی قیادت میں اس قلعے پر ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں حملہ کیا جو ناکام رہا۔ آخر لارڈ کومبر میر Combermere نے ۱۲۳۲ھ / ۱۸۲۶ء میں اسے فتح کیا۔

مآخذ: (۱) سید علی رضا: تاریخ بیانہ (مخطوطہ)؛ (۲) محمد ظہیر الحسن: تاریخ سادات بھرتپور، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۳) C. K. M. Walter: *Gazetteer of Bharatpore State*، آگرہ ۱۸۶۸ء؛ (۴) *Imp. Gaz. of India*، ۸، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۷۳ تا ۸۷؛ (۵) J.N. Creighton: *Narrative of the Seige and Capture of Bhuratpore*، لنڈن ۱۸۳۰ء؛ (۶) Storey، ۱ / ۱: ۶۸۸ تا ۶۹۰، ۱ / ۲: ۱۳۲۶؛ (۷) J.N. Sarkar: *Fall of the Moghal Empire*، بار دوم، کلکتہ ۱۹۴۹ء، ۱: ۱۷۲ تا ۱۷۳؛ ۲ (۱۹۵۰ء): ۳۱۰ تا ۳۰۱؛ (۸) J. Tod: *Annals and Antiquities of Rajasthan*، لنڈن ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) *History of the Freedom Movement*، ج ۱، کراچی ۱۹۵۷ء، بمدد اشاریہ.

(بزمی انصاری)

بھڑوچ: گجرات [رک بآں] کا ایک ضلع، جو آج کل صوبۂ بمبئی (بھارت) میں شامل ہے اور جس کا رقبہ تقریباً چودہ سو پچاس مربع میل اور آبادی تین لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے پہلے کل آبادی کا بیس فیصد تھی، لیکن اس کا ایک بڑا حصہ اس کے بعد سے پاکستان چلا آیا ہے۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت وہ تھی جو بوہرہ [رک بآں] کہلاتی ہے۔ اس ضلع کے صدر مقام کا نام بھی بھڑوچ ہے، عرض‌بلد شمالی ۲۱ درجے ۴۲ دقیقے، طول‌بلد شرقی ۷۳ درجے ۲ دقیقے ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے موریا سلطنت کے ایک شہر کی حیثیت سے آتا ہے۔ بعد میں (تقریباً ۵۰ء) یہ پارتھی ساھوں (Sāhas) کے قبضے میں رہا۔ وسط ہند کی بولی میں اس کے نام کی شکل بھڑوچھہ bharugaccha تھی جو سنسکرت بھڑگک شیترہ bhrgukṣetre سے بنی

تھی۔ اس سے یونانیوں میں یہ βapuyaζa کے نام سے مشہور تھا اور یہاں ایک بندرگاہ تھی جہاں سے بحر احمر کی تجارت ہوا کرتی تھی (Ptolemy: *Geog.*، VII ، ۱ : ۶۳؛ VIII ۳۶ : ۱۲)، اور اندرون ہندوستان کی ایک اہم تجارتی شاہراہ کے سرے پر واقع تھا (*Periplus*، فصل ۴۷ تا ۴۸)۔ یہ راجپوتوں اور گوجروں (گورجروں) (Gurajaras) کے قبضے میں تھا جو غالباً چالوکیہ راجاؤں کے باج گزاروں کی حیثیت رکھتے تھے، جب اسے ۱۵ھ / ۶۳۶ء، ۹۹ھ/۷۱۷ء اور ۱۵۴ھ/۷۷۰ء میں عربوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں راشٹرکوٹوں Rastrakutas کے قبضے میں رہا۔ پھر چالوکیہ راجاؤں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء میں اسے سلطان علاءالدین خلجی کے بھائی الغ خان نے فتح کر لیا... (فرشتہ، طبع Briggs، ۱ : ۳۲۷)۔ اس کے بعد یہ مسلسل مسلمان والیوں کے تحت رہا جو سلاطین دہلی کے نائب ہوتے تھے، یہاں تک کہ ۷۹۸ھ / ۱۳۹۵ - ۱۳۹۶ء میں محمد ظفر خان (جو ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء سے یہاں کا والی تھا) خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اس وقت سے یہ احمد شاہی [رک بآں] بادشاہوں کے تحت رہا یہاں تک کہ اکبر نے ۹۸۰ھ/ ۱۵۷۲ء میں اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء میں عبداللہ بیگ کو نظام الملک سے (جو ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۲ء سے دکن کا خود مختار حکمران بن گیا تھا اور جس نے اس وقت جب گجرات کا صوبےدار تھا بھڑوچ کو اپنی ذاتی جائداد میں شامل کر لیا تھا) نیک عالم خاں کا خطاب مل گیا اور اس نے بھڑوچ کے نوابی خاندان کی بنیاد رکھی۔ انگریزوں نے اسے ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں فتح کر لیا تھا اور تب اس کا اینگلو انڈین نام بروچ Broach ہو گیا تھا۔

عمارات : بہادر شاہ (۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تا ۹۴۳ھ / ۱۵۳۷ء) نے قدیم استحکامات کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء میں اورنگ زیب نے انھیں کہیں کہیں سے منہدم کرا دیا مگر ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء میں اس کے حکم سے انھیں دوبارہ تعمیر کیا گیا تاکہ بھڑوچ مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہے۔ آج کل وہ بہت خراب و خستہ حالت میں ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد (تقریباً ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱ - ۱۳۰۲ء) گجرات میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا ارتقا ظاہر کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ شروع میں پٹن میں جو عمارتیں بنیں وہ جین اور ہندو عمارتوں کی نقلیں تھیں، لیکن اس کے برعکس یہاں مسلمانوں نے خود اپنے روایتی نقشے کے مطابق مسجد تعمیر کی، جس میں پرانی عمارتوں کا ملبہ کام میں لایا گیا اور چار دیواری میں مستعمل پتھروں کو نئے سرے سے تراش کر لگایا گیا۔ اس طرح یہ مسجد گجرات میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا سب سے پہلا نمونہ ہے۔ مسجد کا صدر دالان دونوں طرف سے کھلے ستونوں کی قطار کی شکل میں ہے...

....

دالان کے اڑتالیس ستون ہیں جن پر کثرت سے باریک نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ اس کی تین محرابیں اب تک موجود ہیں جن کی سردلوں کے نیچے نوکدار قوسیں قائم کی گئی ہیں۔ لیوان کی چھت پر تین بڑے اور دس چھوٹے گنبد ہیں اور نیچے کی طرف پرانی عمارتوں سے نکالی ہوئی چھتیں بڑی محنت سے اندر بٹھائی گئی ہیں۔ ان کے نقش و نگار اگرچہ ہندوانی تھے لیکن ان کی نوعیت رسمی تھی اور وہی بعد میں مسلمانوں کی گجرات کی عمارتوں میں برابر مروّج رہے۔ معلوم ہوتا ہے اس پوری عمارت کا کام مقامی معماروں ہی کے ہاتھ سے مسلمان

نگران کاروں کے تحت انجام پایا ۔ جس کے تین حصے تین منڈھپ Mandpas کی طرح ھیں، جنھیں از سر نو جوں کا توں کھڑا کر دیا گیا ھے۔

مآخذ : (۱) تاریخ کے لیے رک بہ گجرات؛ (۲) Bombay Gazetteer، ۲ : ۱۸۷۷ء : ۳۳۷ تا ۵۶۹؛ (۳) جامع مسجد کے پورے حالات کے لیے دیکھیے : J. Burgess : On the Mohammadan architecture of Bharoch... in Gujarat، ASWI، ج ۶ (= ASI، NIS، ج ۲۳) لنڈن ۱۸۹۶ء.

(J. BURTON-PAGE)

بھکر : رک بہ بکر.

مآخذ : بکر کے تحت جو مآخذ وھاں موجود ھیں ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل : (۱) Gaz. of Sind، B III، ص ۵۳ تا ۶۰؛ (۲) Imp. Gaz. of India، ۹ : ۴۷؛ (۳) Henry Cousens : Antiquities of Sind، کلکتہ ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۲ تا ۱۴۹؛ (۴) J. Abbot : Sind، آوکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۵۶ تا ۶۱؛ (۵) طبقات ناصری، طبع عبدالحی حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ج ۱، بمدد اشاریہ؛ (۶) سیف بن محمد الہروی : تاریخ نامۂ ہرات، کلکتہ ۱۹۴۴ء، ص ۲۰۰ تا ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۰۹؛ (۷) جوہر آفتابچی: تذکرۃ الواقعات، اردو ترجمہ از معین الحق، کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۵۶ تا ۵۹ و بمدد اشاریہ؛ (۸) گلبدن بیگم : ھمایوں نامہ، لنڈن ۱۹۰۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) میر محمد معصوم بکری : تاریخ سندھ، طبع عمر بن محمد داؤد پوتہ [دہلی ۱۹۳۹ء]، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) Journal of the Sind Hist. Society، ۴ / ۳؛ (۱۱) Goldsmid : The Syeds of Roree and Bukkur، Bombay Govt. Selections، ۱۸۵۵ء؛ (۱۲) محب اللہ : مصار سندھ (مخطوطہ فارسی) بذیل مادۂ بھکر؛ (۱۳) Manucci : Storia do Mogor، ترجمہ W. Irvine، لنڈن ۱۹۰۷ - ۱۹۰۸ء، ص ۱۱۹ تا ۱۲۸؛ (۱۴) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و Sanguinetti، پیرس ۱۸۵۸ء، ۳ : ۱۱۵؛ (۱۵) T. H. Sorley : Shah Abdul Latif of Bhit، آوکسفرڈ ۱۹۴۰ء، ص ۷۷ تا ۸۰ نیز بمدد اشاریہ؛ (۱۶) Alexander Burnes : Travel into Bokhara، لنڈن ۱۸۳۵ء، ص ۲۵۶؛ (۱۷) G. E. Westmacott، در JRAS، ۹ / ۲ (۱۸۴۰ء): ۱۱۸۷ ببعد؛ (۱۸) ابو الفضل : آئین اکبری، ترجمہ Gladwin، ۲ : ۱۱۲؛ (۱۹) فریدون بیگ قلیچ بیگ : History of Sind، کراچی ۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ء، ۲ : ۸۷؛ (۲۰) G. H. Raverty : Mihran of Sind، (JASB) ۱۸۹۲ء، ص ۳۹۳ حاشیہ، ۳۹۵ حاشیہ؛ (۲۱) Indian Antiquary، ۳۴ : ۱۴۴؛ (۲۲) Jour. Bombay Br. RAS، (۱۸۴۳ء)، ۱ : ۲۰۴؛ (۲۳) J. N. Sarkar: History of Aurangzeb، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۰؛ (۲۴) James Todd : The Antiquities and annals of Rajasthan، لنڈن/نیویارک ۱۹۱۴ء، ص ۲۰۰؛ (۲۵) مجمل الامکنۃ، حیدر آباد [دکن] ۱۳۰۳ھ، ص ۱۳؛ (۲۶) عبدالحمید خان : The Towns of Pakistan، کراچی ۱۹۵۰ء، ص ۵۶ تا ۵۷؛ (۲۷) چچ نامہ (سندھی اڈیشن) کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۲۸۷، ۲۸۹، ۳۲۰، ۳۹۷؛ (۲۸) اوریئنٹل کالج میگزین، لاہور ۱۹۳۷ء، ص ۳۷ تا ۶۷؛ (۲۹) جوینی ۲ : ۱۳۶؛ (۳۰) Storey، ۱/۲ : ۹۳۸ تا ۹۳۹.

(بزمی انصاری)

بھمبر : بھمبر ایک چھوٹا سا شہر، جو گجرات (مغربی پاکستان) سے نو میل کے فاصلے پر شمال کی سمت اسی نام کی ایک ندی کے کنارے کشمیر کے قدیم مغل راستے پر واقع ھے ۔ قدیم زمانے میں یہ کانگڑا اور جالندھر کے سوم ونشی راجاؤں کی شاخ چبھ Chibh یا چبھن Chibhan کی مملکت کا ایک حصہ تھا ۔ چنانچہ پہلے اس کا ذکر چبھن کے نام سے بھی آیا ھے، جیسے ظفر نامہ میں جبھل لکھا ھے ۔ یہ شہر زیادہ تر پتھر سے تعمیر کیا گیا ھے ۔ ایک زمانے میں بھمبر اور راجوڑی دونوں دُرواب حصارا Darva Hisūra کے علاقے میں شامل تھے ۔ اس پر خود مختار

راجا اور فرمانروا حکومت کرتے رہے، جن میں سے آخری سلطان خاں تھا، جس نے کشمیر پر سکھوں کے منصوبوں کی مزاحمت کی - راجا گلاب سنگھ نے، جو کشمیر میں ڈوگرا راج کا بانی اور سلطان خاں کا سابق ملازم تھا، اسے گرفتار کر کے رنجیت سنگھ کے پاس بھیج دیا - یہاں مغلوں کے آثار میں باولی سرائے اور ایک خوبصورت مسجد ہے.

مآخذ: (۱) ابوالفضل: آئین اکبری، ترجمہ H. Blochmann؛ (۲): توزک جہانگیری، طبع سیّد احمد خان، علیگڑھ ۱۸۶۴؛ (۳) عبدالحمید لاہوری، پادشاہ‌نامہ، Bibl. Indica، کلکتہ ۱۸۶۷ - ۱۸۶۸ء؛ (۴) جی - ایم - ڈی صوفی: *Kashir*، ج ۱، ۱۹۴۸ء، ج ۲، ۱۹۴۹ء؛ (۵) Stein: *Ancient Geography of Kashmir*، لنڈن ۱۸۹۹ء؛ (۶) A. Cunningham: *Archaeological Survey of India*، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۷) *The Kashmir Archaeological Report*، ۱۹۲۰ء؛ (۸) Arthur Neve: *Picturesque Kashmir*، ۱۹۰۰ء؛ (۹) *The Jamoo and Kashmir Territories*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۰) راج ترنگنی، انگریزی ترجمہ از Stein، ج ۱ و ۲، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۱۱) Richard Temple: *Journals kept in Hyderabad, Kashmir, Sikkim and Nepal*، ج ۲، لنڈن ۱۸۸۷ء؛ (۱۲) Ram Chandra Kak: *Memoirs of the Archaeological Survey of India*، عدد ۱۳، کلکتہ ۱۹۲۳ء؛ (۱۳) Carl Frehrr Hugel: *Kashmir und das Reich der Siek*، ۱۸۳۰ - ۱۸۳۳ء، ترجمہ انگریزی از J.B. Jervis: *Travels in Kashmir and the Panjab*، لنڈن ۱۸۴۵ء.

(یار محمد)

⊗ **بھنبھور**: بھنبھور کا نام مشہور عشقیہ داستان سسی (= سسئی) پنوں سے وابستہ ہے - سندھ اور بلوچستان کی اس قدیم اور مشہور داستان کا جغرافیائی پس‌منظر سندھ اور بلوچستان کا وہ خطہ ہے جو دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کی اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سندھ سے عراق تک تجارتی شاہراہ ہونے کی وجہ سے عروج پر تھا - تخمیناً پانچویں صدی کے نصف میں جب سندھ میں عرب اقتدار کا خاتمہ ہونے لگا تو تجارتی اور تمدنی شاہراہ جو سندھ، مکران اور ایران سے گذر کر عراق و شام تک پہنچتی تھی، وہ اور اس کی یاد ایک افسانہ بن گئی - داستان سسی پنوں، اسی یاد کا شاخسانہ ہے جسے عوام کا ذہن معرض وجود میں لایا - روایت ہے کہ سسی کے پیدا ہوتے ہی اس کے والدین نے اسے ایک صندوقچے میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا - یہ صندوقچہ بھنبھور کے گھاٹ پر محمد نامی رنگریز نے دریا سے نکالا اور نوزائیدہ سسی کو اپنے گھر لے گیا - بھنبھور ہی میں محمد رنگریز کے گھر سسی کی پرورش ہوئی - جب وہ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال کی شہرت مکران کے بلوچ سردار عالی خان کے فرزند پنوں تک پہنچی - وہ غائبانہ طور پر سسی کی محبت میں گرفتار ہو کر ایک تاجر کے بھیس میں قافلہ لے کر بھنبھور پہنچا - شدہ شدہ اس کی شادی سسی سے ہو گئی، اور وہ میاں بیوی بھنبھور ہی میں رہنے لگے - پنوں کے بھائی اس کی تلاش میں بھنبھور پہنچے اور پنوں سے واپس چلنے کے لیے کہا، لیکن جب وہ کسی طرح نہ مانا تو آدھی رات کو اسے خواب کی حالت میں اٹھا کر تیز رفتار اونٹوں پر لاد کر مکران کی طرف چل دیے - سسی جب صبح کو بیدار ہوئی تو پنوں کو پاس نہ پایا - بہت بےچینی کی حالت میں وہ پنوں کی تلاش میں نکل پڑی - پہاڑوں کی گھاٹی میں ایک چرواہے نے جب سسی کو بری نظر سے دیکھا تو سسی نے خدائے عزوجل سے پناہ مانگی - اس کی دعا قبول ہوئی زمین پھٹ گئی اور وہ خود اس میں سما گئی.

بھنبھور نامی شہر کی تشہیر سسی پنوں کی

داستان سے ہوئی - اس داستان کی داغ بیل غالباً سندھ کی تاریخ کے رومانوی دور یعنی سومرہ خاندان کی حکمرانی (۱۰۵۰ تا ۱۳۵۰ء) میں پڑی، اور بعد میں سمہ خاندان (۱۳۵۰ تا ۱۵۲۰ء) کے منگنہاروں اور بھانوں (= چارنو اور بھاٹوں) ھی نے غالبًا اسے پروان چڑھایا - علما و فضلا میں سے میر محمد معصوم بکّری (م ۱۰۱۵ھ) نے غالبًا پہلی بار قبل از سال ۱۰۰۲ھ اس داستان کو فارسی میں بعنوان مثنوی حسن و ناز منظوم کیا - اسی فارسی مثنوی میں شہر بھنبھور کا ذکر پہلی بار ملتا ہے - سندھی شاعری میں حضرت شاہ عبداللطیف کے جدّ اعلٰی حضرت شاہ عبدالکریم (م ذوی‌القعدہ ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۰-۱۶۲۱ء) کے صوفیانہ سندھی ابیات میں سے چند ابیات اسی داستان کی تلمیحات پر منبی ھیں - ان میں سے دو ابیات میں بھنبھور شہر کا نام آیا ہے - سندھی میں یہ پہلا ماخذ ہے جس میں شہر بھنبھور کا نام ملتا ہے، مثلًا ایک بیت ہے:

جي مون سڏ ڪيا 'ڀنڀورا' ڀھارتي،

جي سي ڀريءَ سا، تہ هُندوئاني نڪري

(سسی کہتی ہے کہ بھنبھور سے باھر نکل کر میں نے جو (زور سے) آوازیں دیں وہ اگر میرے محبوب نے سنی ہوتیں تو (مجھے چھوڑ کر) چلے نہ جاتے).

شاہ عبدالکریم کے بعد، میاں شاہ عنایت، (م ۱۱۲۰-۱۱۲۵/۱۷۰۸-۱۷۱۳ء) اور شاہ عبداللطیف (م ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) کے ''رسالوں'' میں سسی پنوں کی داستان کے تحت اس شہر کا نام بار بار آیا ہے اور بھنبھور اور بنبھور، دونوں صورتوں میں ملتا ہے - آج تک سندھ کے عوام میں یہ دونوں تلفظ مروج ھیں.

فی‌الوقت تاریخی لحاظ سے ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں جس کی بنا پر یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ کسی زمانے میں بھنبھور نامی کوئی شہر سندھ میں واقعی تھا یا محض سسی پنوں کی داستان میں یہ ایک فرضی شہر کا نام ہے؟ تاریخی ماخذوں میں تاریخی واقعات کے سلسلے میں شہر بھنبھور کا نام کہیں نہیں ملتا - ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں اس نام کا کوئی شہر موجود ہو جسے بعد میں سسی پنوں کی عوامی داستان نے اپنایا، لیکن یہ محض ایک گمان ھی ہو سکتا ہے.

قدیم سندھی روایت کی رو سے سسی پنوں داستان کا پس‌منظر وہ خطہ ہے جو مکران میں وادی کیچ سے لے کر جنوبی سندھ تک پھیلا ہوا ہے - عوامی ذہن نے فطری طور پر اس داستان میں مذکورہ مقامات کو اسی خطے میں سے گذرتی ہوئی قدیم تجارتی اور تمدنی شاہراہ کے خطوط پر متعین کیا - چنانچہ شہر تربت کے نزدیک نہر کیچ کی وادی میں واقع آثار کو پنوں کے والد سردار عالی خان کی ''میری'' (محل اور قلعہ) مانا گیا اور کراچی سے انتالیس میل جنوب مشرق میں واقع آثار کو شہر بھنبھور کے کھنڈروں سے متعین کیا گیا - اول تو یہ کھنڈر دریاے سندھ کی ایک قدیم گذرگاہ پر واقع ھیں - دوسرے یہ کہ مقامی طور پر لوگوں نے ان کھنڈروں کے شمال مغربی اطراف میں رنگریزوں کی رنگ آمیزیوں کے آثار دیکھے - اور تیسرے یہ کہ کھنڈر اسی قدیم شاہراہ کے خطوط پر واقع ھیں جو کراچی کے شمال سے گذر کر لس‌بیلہ کی حدود میں سے پھر مکران کی طرف جاتی ہے - سسی بھی بھنبھور سے نکل کر اسی شاہراہ کے خطوط پر پنوں کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی، اور وہ مقام جہاں وہ زمین کے اندر داخل ہوئی عوام نے اسے کراچی سے شمال مغرب کو پہاڑ پب کی گذرگاہ سے آگے ''سانگھڑ'' کی وادی میں قرار دیا اور وہاں سسی کی قبر کا نشان قائم کر دیا جو اب تک موجود ہے.

مسی پنوں لوک کہانی سے قطع نظر اگر ان کھنڈروں کا کھوج لگایا جائے جنھیں عوامی تخیل نے بھنبھور قرار دیا ہے تو تاریخی شواھد کی روشنی میں یہ کھنڈر یقینی طور پر دیبل بندر کے معلوم ہوتے ہیں - جسے محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں فتح کیا - دیبل عربی دور حکومت میں سندھ کی اہم بندرگاہ رہا اور کہیں تیرھویں صدی میں غالبًا میٹھے پانی کی قلت کی وجہ سے ویرانہ ہو گیا - گزشتہ پندرہ سال میں محکمۂ آثار قدیمہ کی جانب سے ان کھنڈروں کی کھدائی سے جو آثار برآمد ہوے ہیں وہ اس نظریّے کی مزید تائید کرتے ہیں کہ جن کھنڈروں کو عوام نے بھنبھور سمجھا ہے وہ درحقیقت مشہور بندر دیبل کے کھنڈر ہیں۔

مآخذ : (۱) میر محمد معصوم بکری : مثنوی حسن و ناز (مخطوطہ)؛ (۲) رسالۂ کریمی (ملفوظات شاہ عبدالکریم) حیدر آباد / بمبئی، ۱۳۰۶ھ/۱۹۳۷ء؛ (۳) میین شاہ عنات جو کلام (میاں شاہ عنایت کا کلام) سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۳ء؛ (۴) شاہ عبداللطیفؒ جو رسالو (شاہ عبداللطیفؒ کا مجموعۂ کلام)، مطبوعۂ بمبئی، کراچی، حیدرآباد؛ (۵) مشہور تاریخی شہر دیبل بندر کا محل وقوع (انگریزی میں مقالہ از ڈاکٹر بلوچ: *The Most probable site of Debal, the famous Historical Port of Sind*)، در اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۵۲ء؛ (۶) فتحنامۂ سندھ عرف چچنامہ (طبع نبی بخش خان بلوچ)، اردو ترجمہ، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۳ء؛ (۷) انگریزی کتابچہ بھنبھور (*Bhambhore*) مطبوعۂ محکمۂ آثار قدیمۂ حکومت پاکستان، کراچی۔

(نبی بخش بلوچ)

* **بھوپال** : بھارت کی ایک سابقہ نوابی ریاست، ۲۲ درجے ۲۹ دقیقے اور ۲۳ درجے ۵۴ دقیقے عرض بلد شالی اور ۷۶ درجے ۲۸ دقیقے اور ۷۸ درجے ۵۰ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے - اس کا رقبہ ۶۸۷۸ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۰۱ء میں ۶۶۵،۹۶۱ تھی - ہندوستان میں حیدرآباد [دکن] [رک باں] کے بعد یہ سب سے اہم مُسلِم ریاست تھی۔

ریاست بھوپال کی بنیاد ایک سپاہی پیشہ بخت آزما دوست محمد خاں نے رکھی تھی جو تیراہ (جو آج کل پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہے) کا باشندہ اور آفریدی پٹھانوں کے قبیلۂ مرزیٔ خیل سے تھا - چونتیس سال کی عمر میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں وہ ملازمت کی تلاش میں دہلی گیا - شہنشاہ دہلی بہادر شاہ اوّل [رک باں] سے کچھ تو اپنی فوجی خدمات کے صلے میں اور کچھ خود اپنی کوششوں کی طفیل بیراسیہ پرگنہ کا پٹہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا - [بھوپال کی مشہور تاریخ تاج الاقبال مؤلفۂ سلطان شاہ جہاں بیگم میں اس مقام کو بیرشیہ لکھا گیا ہے جو ایک مقامی جاگیردار نے دوست محمد خاں کو اجارۃً دیا تھا، دفتر اول، طبع کانپور، ص ۱۲۹] - دوست محمد غیر معمولی شجاعت کا آدمی تھا اور فن جنگ میں نمایاں مہارت رکھنے کی بدولت اس نے بہت جلد ایک بہت بڑے علاقے پر تسلّط جما لیا اور شہر بھوپال اور اس کے قلعے کی، جس کا نام فتح گڑھ رکھوا، بنا ڈالی - مغلوں کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوے اس نے اس علاقے پر قبضہ کر کے نوّاب کا لقب اختیار کیا - ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا نابالغ بیٹا محمد خاں جانشین ہوا، مگر اسے بہت جلد یار محمد خاں نے نکال باہر کیا جو دوست محمد کا ایک دوسرا بیٹا تھا - یار محمد خاں کا ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں انتقال ہو گیا اور وہ کبھی رسمی طور پر نواب کی حیثیت سے مسند نشین نہیں ہوا - اس کے بعد فیض محمد خاں اس کا جانشین ہوا - یہ ایک متّقی اور زیادہ تر عزلت نشین شخص تھا - بہ حیثیت حاکم اس کی کمزوری

اور دوسرے اس کے ہندو وزیر کی حیلہ گری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوپال کی ریاست کا آدھا علاقہ ہاتھ سے نکل کر مرہٹہ پیشوا باجی راؤ اوّل کے قبضے میں چلا گیا۔ فیض محمد خان کی وفات ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۷-۱۷۷۸ء میں ہوئی اور اس کا بھائی حیات محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ عجیب بات ہے کہ اس نے چار ہندو لڑکے پال کر انھیں اپنا چیلا بنا لیا تھا، جن میں سے دو، یعنی فولاد خان اور چھوٹے خان بعد میں اس کے وزیر ہوے۔ اس کے ایک عمزاد بھائی وزیر محمد خان اور ریاست کے وزیر مرید محمد خان کے درمیان رقابت کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح گڑھ کا قلعہ امیر خان پنڈاری کے قبضے میں چلا گیا، (یہ امیر خان سابق ریاست ٹونک [رکَ باں] کا بانی ہے) جو اس وقت گوالیار کے سندھیا کا ملازم تھا۔ وزیر محمد خان کو بھوپال چھوڑنا پڑا، مگر جب سندھیا واپس گوالیار گیا، جہاں فسادات برپا ہو گئے تھے، تو وزیر محمد ایک معقول لشکر لے کر لوٹ آیا اور اس نے مرہٹوں کو، جو امیر خان کی قیادت میں تھے، قلعے سے نکال دیا اور تھوڑے دن کے بعد پنڈاریوں کو بھی نکال باہر کیا۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء میں حیات محمد خان کی وفات ہوئی اور اس کے بعد وزیر محمد خان، جو اپنے آپ کو حاکم بننے کا اہل ثابت کر چکا تھا، ریاست کا حاکم بنا اور اس نے متوفی حکمران کے لڑکے غوث محمد خان کا دعوی نہ چلنے دیا۔ ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء میں ناگپور اور گوالیار کی فوجوں نے باہم مل کر بھوپال پر حملہ کر دیا، مگر بھوپال نے آٹھ ماہ کی طویل مدت تک بہادری سے حملہ آوروں کی مزاحمت کی، محاصرہ ناکام رہا اور ناچار اٹھانا پڑا۔

جب ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں وزیر محمد خان کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا نذر محمد، جو غوث محمد خان کا داماد بھی تھا، اس کا جانشین ہوا۔ اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کر لیا اور اس معاہدے کی شرائط کی پوری پابندی کی۔ اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا، اور ریاست بھوپال کی طرف سے اقرار کیا گیا کہ ریاست کی فوجیں پنڈاریوں کے استیصال میں انگریزوں کی مدد کریں گی۔ پنڈاری اس وقت وسط ہند پر چھائے جا رہے تھے۔ ان کی حیثیت منظم ڈاکوؤں سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نذر محمد کی شادی غوث محمد کی بیٹی قدسیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خاوند نذر محمد کے انتقال کے بعد ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء میں اپنی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کے نگران کی حیثیت سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پچیس سال بعد ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں سکندر بیگم باقاعدہ طور پر مسندنشین ہوئی، اور اس خاتون سے ایک طویل اور نام آور سلسلہ بھوپال کی بیگموں کا چلا جو اس وقت جا کر ختم ہوا جب سلطان جہاں بیگم نے ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں برضا و رغبت ریاست سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے حمیداللہ خاں کو اپنی جگہ مسندنشین کر دیا۔ سلطان جہاں بیگم نے ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی (یہی نواب حمیداللہ ریاست بھوپال کے آخری سربراہ تھے)۔

سکندر بیگم کی والدہ اختیارات اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی ناکام منصوبہ کی چالوں سے سکندر بیگم کی شادی نذر محمد خان کے بھتیجے جہانگیر محمد خان سے کہیں ذوالحجہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء میں جا کر ہوئی۔ [شادی کے وقت سکندر بیگم کی عمر سترہ سال کے قریب اور جہانگیر محمد خان چودہ سال کے تھے (تاج الاقبال، دفتر اوّل)۔] اس کی شادی ہو جانے کے بعد بھی قدسیہ بیگم (سکندر بیگم کی والدہ) کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی کہ اس کے ہاتھ سے حکومت نکل جائے۔ اس لیے اس نے آپس میں جنگ کرا دی۔ اس جنگ میں

[جہانگیر محمد خان] کو اس کی اپنی بیوی اور بڑی بیگم (قدسیہ بیگم) کی متحدہ فوج نے شکست دے دی ۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے مداخلت کی اور ریاست کا انتظام حکومت جہانگیر محمد خان کو واپس دلا دیا ۔ قدسیہ بیگم کو وظیفہ لے کر الگ ہونا پڑا ۔ اس کے بعد وہ بہت عرصے تک زندہ رہی، لیکن اس کے جانشینوں، یعنی سکندر بیگم اور اس کی بیٹی شاہجہاں بیگم نے اسے پورے حزم و احتیاط سے معاملات ریاست سے دور ہی رکھا ۔ شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خان نے تو کچھ ذاتی اور کچھ سرکاری وجوہ کی بنا پر اتنی بھی اجازت نہ دی کہ یہ بوڑھی بیگم حکمران خاندان کی مجلسی تقریبات میں بھی شرکت کرے ۔ قدسیہ بیگم کی وفات ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء میں ہوئی ۔ ریاست سے سبکدوش کیے جانے کے بعد مرتے دم تک وہ ۹۸۶۸۲ روپے کی جاگیر کی مالک رہی ۔ سکندر بیگم کی حکومت کا زمانہ متعدد فوجی اصلاحات کی وجہ سے یادگار ہے، جن کی بدولت بھوپال کی بے قاعدہ فوجیں منظم ہو کر ایک عمدہ اور متحدہ سپاہ بن گئیں ۔ ۱۸۵۷ء کی ہلچل میں ریاست بھوپال بالادست انگریزی حکومت کی وفادار رہی ۔ اگرچہ ریاست کے معدودے چند امرا نے انگریز دشمنی کی روش اختیار کی تھی ۔ اس بیگم نے زرعی، اقتصادی، انتظامی اور قانونی اصلاحات بھی نافذ کیں ۔ ایک اسلامی ریاست کی سربراہ ہونے کے باوجود اس نے اتنی دلیری کی کہ پردے کو خیرباد کہا اور فوجی لباس میں ہتیاروں سے مسلّح ہو کر سب کے سامنے آنے لگی ۔ پھر بھی اس کا دلی رجحان دین کی طرف تھا اور ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں اس نے فریضۂ حج ادا کیا ۔ تیئیس سال کی حکومت کے بعد ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی نابالغ لڑکی شاہجہاں بیگم اس کی جانشین قرار پائی ۔ [یہ سارا بیان سخت ابہام پیدا کرنے والا ہے ۔ شاہجہاں بیگم اپنے باپ جہانگیر محمد خان کے انتقال کے بعد ہی وارث ریاست تسلیم کر لی گئی تھیں (۱۲۶۱ھ) ۔ ان کی ماں سکندر بیگم محض مختار ریاست کی حیثیت سے اپنی وفات تک ریاست کا کام کرتی رہیں] ۔ سکندر بیگم کا ایک چچا فوجدار محمد خان اس کا نگران اور نائب ریاست بنا، مگر ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں اسے استعفا دینا پڑا ۔ اس میں زیادہ تر قدسیہ بیگم کی تدابیر کارگر تھیں ۔ اس کے بعد سکندر بیگم اس کی جگہ نگران اور نائب سلطنت کے عہدے پر مقرر کی گئی ۔ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء میں شاہجہاں بیگم کی بخشی باقی محمد خان کے ساتھ شادی ہو گئی، مگر وہ حکمران خاندان سے نہ تھا، اس وجہ سے اسے اور اس کے بعد بھوپال کی تمام بیگمات کے شوہروں کو صرف یہ امتیاز حاصل ہوتا تھا کہ وہ نواب دولھا کا مرتبہ حاصل کریں ۔ ریاست کے انتظام میں عملاً ان کا کوئی دخل نہ ہوتا تھا ۔ ریاست کے انتظامی اختیارات سارے کے سارے سکندر بیگم کے ہاتھ میں چلے گئے، جو اپنے مرتبے اور شان و شوکت میں کسی کی شرکت گوارا نہ کرتی تھی ۔ جب اس کی نابالغ لڑکی شاہجہاں بیگم کو ریاست کا حکمران تسلیم کر لیا گیا تو وہ ناراض ہو گئی ۔ اور صرف اس وقت غصّہ دور ہوا جب شاہجہاں بیگم بطیب خاطر اپنی ماں کی زندگی میں حکومت سے دست کش ہو گئی ۔ شاہجہاں بیگم کا یہ فعل وقتی مصلحت یا سیاسی دانشمندی کے بجائے دخترانہ محبت پر زیادہ مبنی تھا ۔

شاہجہاں بیگم کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور اس کے ایک سال بعد ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں وہ مسند حکومت پر باقاعدہ متمکن ہوئی ۔ اس کے تین سال بعد اس نے دوبارہ شادی کر لی، اس دفعہ اس نے قنوج کے [مقتدر عالم دین] سید صدیق حسن [رک بآں]

سے نکاح کیا جو پہلے ریاست کے ایک عہدے دار تھے ۔ بیگم کی کوششوں سے انہیں نواب کا خطاب اور حکومت کے دوسرے مراتب و اعزازات عطا ہو گئے، محض اس بنا پر کہ وہ رئیسہ کے شوہر تھے ۔ اپنے پہلے شوہر کی وفات کے بعد سلطان شاھجہان بیگم نے پردہ چھوڑ دیا تھا، لیکن جب سید صدیق حسن خان سے شادی ہو گئی تو وہ پھر پردہ کرنے لگیں ۔ وہ ان کی قابلیت اور فضیلت علمی سے ہمیشہ مرعوب رہیں ۔ نواب صدیق حسن خان کی وفات ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء میں ہوئی اور ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں شاھجہان بیگم کا مرض سرطان سے انتقال ہو گیا ۔ اور سند کی رو سے، جو ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے لکھ دی تھی، سلطان جہان بیگم، جو شاھجہان بیگم کے پہلے خاوند سے اکلوتی بیٹی تھیں، جانشین ہوئیں ۔ شاھجہان بیگم کی نواب صدیق حسن خان سے کوئی اولاد نہ تھی ۔ سلطان جہان بیگم نے اپنی پچیس سالہ حکومت میں ریاست کا انتظام خود چلایا اور اس میں متعدد اصلاحات کیں ۔ وہ دو مرتبہ انگلستان گئیں، ایک دفعہ ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم (۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۶ء) کی رسم تاجپوشی میں شریک ہونے کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں اس غرض سے کہ حکومت برطانیہ سے اپنے چھوٹے بیٹے الحاج حمید اللہ خان کی ولیعہدی منظور کرا لیں، کیونکہ ان کی اولاد میں سے یہی لڑکا سلامت رہا تھا ۔ دو اور لڑکے محمد نصراللہ خان (ولادت ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) اور حافظ عُبید اللہ خان (ولادت ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء) دونوں یکے بعد دیگرے بہت قلیل وقفے سے ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء میں فوت ہو گئے تھے ۔ شبہہ کیا جاتا تھا کہ ان دونوں کو زہر دیا گیا ہے، لیکن سلطان جہان بیگم کی سیاسی دانائی نے کوئی خطرناک پیچیدگی نہ پیدا ہونے دی ۔ آغا خان نے بھی حمید اللہ خان کے لیے سلطان جہان بیگم کی بہت مدد کی، اور وہ اپنے دو متوفی بھائیوں کی اولاد کو برطرف کر کے خود وارث ریاست ہو گئے ۔ **حمید اللہ خان** ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوے ۔ **علیگڑھ** میں تعلیم پائی اور سیاسیات میں، جہاں تک ملکی والیان ریاست کا تعلق تھا سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ۔ دو مرتبہ وہ چیمبر آف پرنسس (= مجلس والیانِ ریاست) کے صدر منتخب ہوے (۱۹۳۱ تا ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۷ء) اور اس حیثیت سے انہوں نے اپنے ساتھی والیان ریاست کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں ۔ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے سیاست ہند میں ایک یادگار کام یہ کیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس اور محمد علی جناح [رکَ بآں] کی زیر قیادت مسلم لیگ کے درمیان واسطہ بنے اور کچھ ایسی تدبیر کی کہ کانگریس سے مسلم لیگ کے حق میں ایک carte blanche [= "سادہ کاغذ" یعنی لیگ کی شرائط قبول کرنے کا اقرار] حاصل کر لیا ۔ لیکن بعد میں ایم ۔ کے ۔ گاندھی نے، جو کانگریس کے مسلمہ رہنما تھے، اس قول و قرار کو مسترد کر دیا.

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان پر انگریزی اقتدار ختم ہوا اور بھارت اور پاکستان دو خود مختار حکومتیں بن گئیں تو بھوپال ابتدا میں تو مرکزی حکومت کے زیر انتظام رہا، لیکن ۱۹۴۹ء میں بھارت میں مدغم کر دیا گیا ۔ اس میں ایک انتخاب کردہ قانون ساز مجلس نیز وزرا کی جماعت تھی، جس کا آئینی صدر چیف کمشنر ہوتا تھا سابق نواب کو، جو اب ایک معمولی شہری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، پنشن دے دی گئی ۔ ان کے جیب خرچ (privy purse) کے لیے گیارہ لاکھ سالانہ کی رقم منظور کی گئی جس میں سے ایک لاکھ روپے ان کی ولیعہد گوہر تاج عابدہ سلطان کو دیا گیا. جو اس وقت سے پاکستان چلی آئی ہیں اور انہوں نے یہیں

مستقل طور پر بود و باش اختیار کر لی ہے [نواب حمیداللہ خان کا ۱۳۷۹ھ / فروری ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا اور ان کی دوسری صاحبزادی ساجدہ سلطان بیگم کو ان کا جانشین تسلیم کیا گیا].

مآخذ: (۱) نواب شاہجہان بیگم شیرین: تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال، کانپور ۱۲۸۹ تا ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء (نیز اردو ترجمہ، کانپور ۱۸۷۳ء، انگریزی ترجمہ از H. C. Barstow، کلکتہ ۱۸۷۶ء)؛ (۲) نواب سلطان جہاں بیگم: حیات شاہجہانی (انگریزی ترجمہ از B. Ghosal)، بمبئی ۱۹۲۶ء؛ (۳) وہی مصنف: *An Account of My Life*، (انگریزی ترجمہ از C. H. Payne)، لنڈن ۱۹۱۰ - ۱۹۱۲ء؛ (۴) ایم - علی حسن خان: مآثر صدیقی، ۴ جلد، لکھنؤ ۱۹۲۴ء؛ (۵) سرجان میلکم: *A Memoir of Central India*، لنڈن ۱۸۲۳ء؛ (۶) G. B. Malleson: *An Historical Sketch of the Native States of India*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۷) Rousselet: *L' Inde des Rajahs*، پیرس ۱۸۷۷ء، (انگریزی ترجمہ *India and its native Rulers*، لنڈن ۱۸۸۱ء)؛ (۸) C. U. Aitchison: *A Collection of Treaties, Engagements and Sanads relating to India*، ج ۴، کلکتہ ۱۹۰۹ء؛ (۹) *Imperial Gazetteer of India*، جلد ۸، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ص ۱۲۸ تا ۱۳۲؛ (۱۰) *A Pilgrimage to Macca by the Nawāb Sikandar Bégam of Bhopāl*، (انگریزی ترجمہ از Mrs. Willoughby-Osborne)، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۱) و- ل- صاحبہ (بلقیس بیگم): بیگمات بھوپال، لاہور ۱۹۱۰ء؛ (۱۲) *A Memorandum on the Indian States* (طبع سابق حکومت ہندوستان)، کلکتہ ۱۹۳۰ء، بذیل مادہ؛ (۱۳) محمد امین زبیری: تاریخ بیگمات بھوپال، بھوپال ۱۹۱۹ء (؟)؛ (۱۴) محمد سعید احمد: مقالہ در مخزن (اردو ماہنامہ) لاہور، جنوری ۱۹۰۸ء؛ (۱۵) Storey، ۱/۱: ۷۳۳؛ ۲/۱: ۱۳۲۹؛ (۱۶) V. P. Menon: *The Story of the Integration of the Indian States*، کلکتہ ۱۹۵۶ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۶ اور اشاریہ؛ (۱۷) *Statesman's Year Book*، ۱۹۰۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۸) H. W. Bellew: *The Races of Afghanistan*، کلکتہ ۱۸۸۰ء، ص ۷۹؛ (۱۹) William Hagg: *A History of Bhōpāl*؛ (۲۰) جگل کشور: فسانۂ رنگین بھوپال، (مخطوطہ).

(بزمی انصاری)

بھوپال: (شہر)، ہندوستان کے صوبۂ مدھیا پردیش کا صدر مقام، ۲۳ درجے ۱۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۲۵ دقیقے طول بلد مشرقی میں، ایک ریتلے پتھر کی پہاڑی پر دو خوش نما جھیلوں "پختہ پل تلاؤ" اور "بڑے تلاؤ" کے کنارے واقع ہے - یہ شہر ہندوستان بھر میں اپنی طبعی دل کشی اور اپنے نظر فریب گرد و پیش کی وجہ سے مشہور ہے، اسے دوست محمد خان نے، جو ایک اورکزئی [میرزئی؟] آفریدی تھا، ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں بسایا - اس سے پہلے وہ یہاں قلعۂ فتح گڑھ تعمیر کر چکا تھا، جس کا نام اس نے اپنی ہندوستانی بیوی فتح بی بی کے نام پر رکھا تھا اور ایک دیوار کے ذریعے اسے وہاں کے پرانے شکستہ حال قلعے سے ملا دیا تھا جسے افسانوی روایات راجا بھوج سے منسوب کرتی ہیں - اسی راجا بھوج کے نام پر شہر کا ایک محلہ آج تک بھوج پورہ کہلاتا ہے - شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۱۲۰۳۳۳ تھی - اس کے دو حصے ہیں: (۱) شہر خاص، جس کے گرد ایک فصیل ہے، جو خود دوست محمد خان نے بنوائی تھی، (۲) جہانگیر آباد اور احمد آباد کے جدید محلے اور مضافات، جو بعد کے حکمرانوں جہانگیر محمد خان شوہر سکندر بیگم اور احمد علی خان شوہر سلطان جہان بیگم کی یادگار قائم رکھنے کے لیے اضافہ کیے گئے - اس شہر کو ریاست کا صدر مقام نواب فیض محمد خان (۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء تا ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء) نے مقرر کیا - اس سے

پہلے نوابوں کا صدر مقام اسلام نگر تھا (۲۳ درجے ۲۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۲۰ دقیقے طول بلد مشرقی).

۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء میں ناگپور اور گوالیار کی متحدہ افواج نے بھوپال پر حملہ کر کے فصیل کے باھر کے شہر کو تاراج کر دیا تھا۔ نذر محمد خاں نے اپنے مختصر زمانۂ حکومت (۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۶ء تا ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء) میں شہر کو دوبارہ بحال کرانا شروع کیا اور اس کے بعد یہ کام بیسیوں سال تک جاری رہا۔ شہری آسائش کے بہت سے کام، مثلاً سڑکوں کی تعمیر، بازاروں اور گلیوں میں روشنی، سکندر بیگم نے شروع کر دیے تھے۔ سلطان شاھجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم بھی ایسا ھی کرتی رھیں۔ سلطان شاھجہاں بیگم نے خاص طور پر بعض شاندار عمارتوں کا اضافہ کیا جن میں سے قصر تاج محل اور تاج المساجد قابل ذکر ھیں۔ [نیز اسلامی علوم کی سرپرستی فرمائی اور لاکھوں روپوں کے صرف سے تفسیر و حدیث کی اھم مگر نایاب و نادر کتب کی طباعت و اشاعت کر کے اھلِ علم کے لیے دین فہمی کے مواقع میسر کر دیے۔ سلطان شاھجہاں بیگم کے عہد میں صحاح ستہ کے اردو تراجم بھی تیار کیے گئے].

دونوں جھیلیں، جن کے کناروں پر تقریباً سبھی سربراھوں نے محلات کی ایک قطار کھڑی کر دی ھے، آب رسانی کی ایک نہر کے ذریعے ملا دی گئی ھیں اور شہریوں کے لیے پینے کا پانی مہیا کرتی ھیں۔ انہیں جھیلوں کے اوپر شہر کے بےقاعدہ مکانات طبق بر طبق بنے ھوے ھیں جن کے ساتھ کہیں کہیں وسیع باغات ھیں۔ ان سب پر قدسیہ بیگم کی جامع مسجد چھائی ھوئی ھے جو ریتلے سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی ھے۔ اس کے دو بلند مینار ھیں جن پر ماہ رمضان میں سحر اور افطار دونوں وقت نقارہ [رَک بآں] بجایا جاتا تھا۔

مآخذ: دیکھیے مقالۂ بھوپال اور *Imperial Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۱۳۲ تا ۱۳۵۔

(بزمی انصاری)

بھیرَہ: [مغربی پاکستان کا] ایک قدیم شہر جو دریاے جہلم کے مغربی کنارے پر بُراری کی پہاڑیوں (جو کئی میل تک پھیلی ھوئی ھیں) کے دامن میں واقع ھے۔ یہاں تین ٹیلے ھیں جنھیں مجموعی طور پر بھیراری، یا بھیرہ دہ، یا "بھیرے کا ٹیلہ" کہتے ھیں۔ شروع میں اس کا نام راجا بھدراسین کے نام پر بھدروی نگر [بھدراوتی نگری، کننگھم: *Archaeological Reports*، ۱۴: ۳۰] تھا۔ العُتبی نے اس کا ذکر بتیہ یا بھدیہ کے نام سے کیا ھے۔ اس کا ذکر Bheda کے نام سے چینی زائر Fa-Hian کے ھاں بھی ملتا ھے جو یہاں تقریباً ۴۰۰ء میں آیا تھا [(Beal کا ترجمہ، باب ۱۵) اور اس جگہ سے اس نے جہلم کو عبور کیا تھا]۔ بقول کننگھم Cunningham یہ Sopeithes کا مرکز حکومت تھا جو اسکندر اعظم کا ھمعصر ایک مقامی حکمران تھا۔ [اسکندر جب ۳۲۶ قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ آور ھوا تو بھیرہ دریاے جہلم کے مشرقی کنارے پر تقریباً اس جگہ آباد تھا جہاں آج کل احمد آباد کی بستی ھے۔ اس کے گیارہ سو سال بعد جب بابر اس جگہ پہنچا ھے تو اس کی تزوک بتاتی ھے کہ اس وقت بھی یہ شہر پہلے کی طرح مشرقی کنارے ھی پر تھا اور یہی وہ انتہائی جگہ ھے جہاں تک بابر اپنی ابتدائی فتوحات کے سلسلے میں پہنچا تھا۔ اس نواح سے Graeco-Bactrian اور Indo-Scythic عہد کے سکے بھی برآمد ھوے ھیں۔

سیکنڈ پنجاب کیولری 2nd Punjab Cavalry کے میجر نارمن W. W. Norman نے موقع پر پہنچ

کر بڑی محنت اور احتیاط سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسکندر اور پورس کی مشہور عالم لڑائی دریاے جہلم کے کنارے کس جگہ لڑی گئی تھی ۔ جتنے لوگوں نے اس سلسلے میں تحقیقات کی ہے ان کے بیانات کے مطابق یہ جگہ جہلم شہر سے چند میل شمال سے لے کر موجودہ احمد آباد کے درمیان کا علاقہ ہے ۔ نارمن کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکندر کے شہر Bukephala کی جاے وقوع برارِی کی پہاڑیاں ہیں (*Punjab Distt. Gazetteer*، ۱۹۰۴ء، ص ۳۸، ۵۸)۔ انڈین سول سروس کے M.L. Dames نے بھی اس تحقیق کی تائید کی ہے اور کچھ مزید ثبوت فراہم کیے ہیں (بحوالۂ سابق)، گویا ان کی راے میں اس جنگ کے لیے اسکندر نے اپنا فوجی پڑاؤ نواح قدیم بھیرہ میں کیا اور اصل جنگ دریا کے بائیں کنارے پر موجودہ بھیرے کے نواح میں لڑی گئی] ۔ موجودہ شہر مغربی پاکستان کے ضلع شاہ پور کی ایک تحصیل ہے (محل وقوع ۳۱ درجے، ۴۰ دقیقے، ۰۵ ثانیے اور ۳۲ درجے، ۳۵ دقیقے، ۴۵ ثانیے عرض بلد اور ۷۲ درجے، ۴۵ دقیقے، ۴۵ ثانیے اور ۷۳ درجے، ۲۵ دقیقے، ۱۵ ثانیے طول بلد کے درمیان) ۔ موجودہ بھیرہ، شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں، دریا کے بائیں کنارے پر ایک مسجد اور ایک ولی اللہ کے مزار کے گرد تعمیر کیا تھا ۔ العُتبی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اسے آنند پال کے ایک ماتحت راجا بجی راے سے چھینا تھا ۔ ۱۲۲۱ء میں اسے چنگیز خاں کے ایک سپہسالار تورتای Turti نے اس وقت فتح کیا جب وہ جلال‌الدین خورازم شاہ کا تعاقب کر رہا تھا ۔ ۱۳۹۸ء میں جود پہاڑیوں کے راجے، جن میں بھیرے کا راجا بھی شامل تھا، تحائف لے کر امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ۱۵۱۹ء میں بابر نے ہندوستان پر اپنے پہلے حملے کے دوران میں بھیرے کے باشندوں پر چار لاکھ شاہرخی کا تاوان عائد کیا ۔ اس نے اپنی توزک میں ان کے قلعے کا نام ''جہاں نما'' لکھا ہے ۔ اکبر کے زمانے میں یہاں تانبے کے سکوں کی ٹکسال تھی ۔ ۱۷۵۷ء میں اس پر احمد شاہ ابدالی کے سپہ سالار نورالدین نے حملہ کیا ۔ بھنگی مسل کے سکھوں نے اسے دوبارہ آباد کیا ۔ یہاں سے کندہ‌کاری کی ہوئی تراشیدہ لکڑی، پیتل کے برتن اور لوہے کی تلواریں وغیرہ برآمد ہوتی ہیں اور پتھر کی گھڑائی کا عمدہ کام ہوتا ہے ۔

مآخذ : (۱) عطا ملک جُوینی : تاریخ جہان گشای؛ (۲) العُتبی : تاریخ یمینی، نیز فارسی، اردو اور انگریزی تراجم؛ (۳) امیر تیمور : تزوک تیموری؛ (۴) شرف الدین علی یزدی : ظفر نامہ؛ (۵) عباس خان شروانی : تاریخ شیر شاہی؛ (۶) ابوالفضل : آئین اکبری، طبع H. Blochmann، کلکتہ؛ (۷) Cunningham : *The Ancient Geography of India*، ج ۱، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۸) W.W. Hunter : *Imperial Gazetteer of India*، ج ۲، لنڈن ۱۸۶۵ء؛ (۹) Cunningham : *Archaeological Survey of India*، ج ۲، کلکتہ ۱۸۷۲ء (رپورٹ براے ۱۹۶۳ - ۱۹۶۵ء)؛ (۱۰) *Punjab District Gazetteer*، ج ۲۷ (الف)، ضلع جہلم (۱۹۰۴ء)، لاہور ۱۹۰۷ء؛ [(۱۱) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۰۰ء، بذیل Bhera].

(یار محمد خان [و ادارہ])

⊗ * پ: (پے؛ ف) باے فارسی یا باے عجمی: (اسم مؤنث) وہ ب جس کے نیچے تین نقطے ھیں - عربی باء کی صورت خفیف کا تکملہ فارسی کے لیے، جو سخت شفوی آواز کو ظاھر کرنے کے لیے وضع کیا گیا ھے - [فارسی و اردو حروف ھجا کا تیسرا اور ھندی حروف صحیح کا اکیسواں حرف] - بعض اوقات اس کا تبادلہ ب سے ھوتا ھے، جیسے اسپ اور اسب، دبیر اور دبیر [پونگا اور بونگا]، اور بسا اوقات، ف سے، جیسے [پیل اور فیل]، سپید اور سفید، پارس اور فارس - [اردو میں اس کا تبادلہ ت سے، جیسے پلی اور تلی اور ج سے، جیسے گپی اور گجی اور چ سے، جیسے پھلانگنا اور چھلانگنا اور ک سے، جیسے پھوکلا اور کھوکھلا اور م سے، جیسے بٹ پار اور بٹ مار سے بھی ھوتا ھے] - مخطوطات میں اس حرف کا باقاعدہ استعمال نسبۃً نیا ھے - تاھم ساتویں سے تیرھویں صدی تک کے بعض نفیس مخطوطات میں اس حرف کا استعمال ملتا ھے - اگرچہ بہت بعد کے مخطوطات میں سے اکثر چھوڑ دیا گیا ھے (GIPh، ۱/۴ : ۴۷) - [حساب جُمّل میں اس کے بھی ب کے برابر دو عدد ھی شمار کیے جاتے ھیں - اردو اور ہندی میں جب الف کے ساتھ کسی صفت کے اخیر میں آتا ھے تو اسے اسم بنا دیتا ھے یا نسبت کے معنی دیتا ھے، جیسے موٹاپا، چھٹاپا، جلاپا].

(R. Levy و ادارہ])

• پائی: (ھندی)، انگریزی: Pie، برطانوی ھند کا ۱/۱۲ آنے [اور ۱/۱۹۲ روپے] کے مساوی تانبے کا سب سے چھوٹا سکہ - ابتداءً جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجربۃً تانبے کا سکہ چلایا تو پائی، جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ھے، ایک آنے کی چوتھائی یا ایک پیسے کے برابر تھی (قب پیسہ)، مگر ایکٹ ۱۸۳۵ء، ۱۸۴۴ء اور ۱۸۷۰ء کے مطابق، پائی ایک پیسے کی تہائی رہ گئی.

(J. Allan)

⊗ پادری: پرتگالی لفظ ھے - اسم مذکر، بمعنی عیسائی پیشوا، عیسائی واعظ - ایک قول کے مطابق یہ لفظ اصل میں فارسی پدر یا انگریزی فادر father سے بنایا گیا ھے (تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائڈن، بار اول، بذیل مادۂ Padre).

[ادارہ]

⊗ پاد زھر: رک بہ بازَھر.

* پادشاہ: مسلمان والیان ملک، خصوصاً شہنشاھوں کا لقب (بقول M. Bittner، در E. Oberbummer : *Die Türken und das Osmanische Reich*، لائپزگ ۱۹۱۷ء، ص ۱۰۵) - فارسی اصطلاح ''پادشاہ'' کے معنی سردار تاجدار کے ھیں - اس میں مادہ ''پاد'' سنسکرت Patis (پتی)، سردار، شوھر، (اس کی تانیث پتنی) اور یونانی πότνια δεσ-πότης اور لاطینی Potens سے تعلق رکھتا ھے (G. Curtius : *Griech Etymol.*، ص ۲۷۷) - یہ لقب دراصل بادشاہ اور فرمانروا کے لیے مخصوص تھا، جو، مرور ایام سے، نیز اس لیے کہ ترکوں کے دُول یورپ کے ساتھ دیر تک تعلقات رھے، بعض یورپی حکمرانوں کے لیے بھی

پسند کیا جانے لگا تھا، باب عالی اور یورپی سلطنتوں کی خط و کتابت میں غالباً صدر اعظم قویوجی مراد پاشا (م ۵ اگست ۱۶۱۲ء) نے سب سے پہلے بادشاہ کا خطاب شہنشاہ آسٹریا، رڈولف Rudolf دوم کے لیے استعمال کیا ۔ Nemirow کانفرنس (۱۷۳۷ء) میں روس نے اپنے زار کے لیے اس لقب کا مطالبہ کیا تھا (قب J. v. Hammer، در *GOR*، ۷: ۴۸۸) اور دوبارہ بخارسٹ کانفرنس (۱۷۷۳ء) کے مذاکرات میں اس کا دعوی کیا (قب کتاب مذکور، ۸ : ۴۱۲) ۔ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ سلطان روم کو کب سے ''پادشاہ آلِ عثمان'' کہا جانے لگا ۔ بہرحال ہمیں یہ لقب اُن ترکی دستاویزوں میں طرح طرح کے ہم قافیہ الفاظ کے ساتھ ملتا ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں لکھی گئیں ، اس لیے ممکن ہے کہ پندرھویں صدی کے خاتمے پر یہ لقب استعمال میں آنے لگا ہو اور بظاہر اس نے ''خنکار'' (از خداوندگار) کی جگہ لے لی ہو، جو متروک ہو گیا تھا (قب *F.A.*، سلسلہ ۲، ۱۰ : ۲۷۶، ۵۷۲) ۔ یہی حال سلطان کے لقب کا ہے جسے پہلے صوفی درویشوں نے استعمال کیا اور پھر آخر تک سلاطینِ آلِ عثمان کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا (قب *Isl.*، ۱۱ : ۷۰) ۔ سلطان کی رعایا اور فوج زمانۂ حال تک ''پادشاہِ مز چوق'' یا ''بکْ یاشا'' [ہمارا بادشاہ تا دیر، یا تا ہزار سال زندہ رہے] کہہ کر خیرمقدم کرتی تھی۔

مآخذ : (۱) St. Kekulé : *Ueber Titel Aemter Rangstufen und Anreden in der offiziellen osmanischen Sprache*، Halle ۱۸۹۲ء، ص ۳ ؛ (۲) P. Horn : *Grundriss der neupersischen Etymologie*، Strassburg ۱۸۹۳ء، ص ۶۱، عدد ۲۶۶ (اس کتاب میں ایک دوسرا اشتقاق بھی لکھا ہے ۔ پرانا فارسی لفظ بد، بمعنی محافظ اور شاہ، یعنی حکمران، اس باب میں قب Horn، در *GIPh*، ۱/۱، ص ۱۷۳، ۲۰۹، اور ۱/۲، ص ۳۱، ۸۸، ۹۷ و ۱۰۹)؛ جہاں قدیم فارسی اور پہلوی وغیرہ میں اس کلمے کی مختلف صورتیں درج ہیں [آصفیہ کا بیان یہ ہے کہ یہ لفظ پاد، بمعنی تخت اور شاہ، بمعنی مالک سے مرکب ہے، یعنی مالک تخت ۔ کسی اچھے یا برے فن کے ماہر کو بھی مجازاً بادشاہ کہتے ہیں مثلاً جھوٹوں کا بادشاہ (فرہنگ آصفیہ)] ۔

(FRANZ BABINGER)

پاراچنار : پاکستان کے شمال مغربی سلسلۂ کوہ میں، دریاے کرّم کی بالائی وادی میں، کرم ایجنسی کا اداری مرکز، فوجی چھاؤنی اور صحت افزا مقام، جو ۲۳′، ۲۰° عرض بلد شمالی اور ۰۷′، ۴° طول بلد پر واقع ہے ۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ۶۰۷۰ فٹ ہے، یہ درّۂ کرم کی پاسبانی کرتا ہے اور اس میں خوبصورت مناظر بکثرت ہیں ۔

گردونواح میں گندم، چاول اور مکئی کی کاشت ہوتی ہے ۔ پھلوں میں خاص طور پر سیب اور ناشپاتی قابل ذکر ہیں ۔ قصبے کی آبادی خٹک قبیلے کے پٹھانوں پر مشتمل ہے ۔ قصبے کی وجہ تسمیہ کے لیے اس روایت کو پیش کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں پارا نامی ایک قبیلہ یہاں ایک بڑے چنار کے درخت کے زیر سایہ مقیم تھا ۔ [دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس وادی میں چنار کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں] ۔ یہاں سے افغانستان کو ایک راستہ درۂ پایےوار سے ہوتا ہوا جاتا ہے جس کے ذریعے اون، پھل، شالوں اور قراقلی وغیرہ کی تجارت ہوتی ہے ۔ [۱۸۹۲ء میں اس کا الحاق برطانوی ہند سے ہوا تھا ۔ اب پاکستان کا حصہ ہے] ۔

مآخذ : (۱) *Gazetteer of the Kurram Agency*، پشاور ۱۹۰۸ء؛ (۲) Sir James David : *North West Frontier Province and Kashmir*، کیمبرج ۱۹۱۶ء، ص ۳۱۱ ببعد) ۔

(سعیدالدین احمد)

⊗ پارتھیا : بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی پہاڑی علاقے کا نام، جو کوہ البرز سے مشرق کی طرف ہرات تک پھیلا ہوا ہے ۔ یہ ایران کا شمال مشرقی صوبہ ہے اور اب خراسان کہلاتا ہے ۔ اس علاقے کے شمالی سرے پر ایک زرخیز میدان صحرائے توران واقع ہے ۔ جنوب کی طرف صحرائے لوط اور مغربی جانب دشت کویر ہے ۔ اس خطے کی غیر معتدل آب و ہوا اور سطح کا قدرتی طور پر کٹا پھٹا ہونا یہاں کے لوگوں کو جفاکش اور محنتی بنانے میں بہت ممدّ ثابت ہوا ہے ۔ پرانے زمانے میں یہاں پارتھوا نام کا ایک ایرانی قبیلہ آباد تھا، جس کی بنا پر پارتھیا نام پڑا ۔ دامغان کے قریب اس زمانے کے کھنڈر بھی دریافت ہوئے ہیں ۔ یہ علاقہ عرصۂ دراز تک قدیم یونانی تہذیب سے بھی وابستہ رہ چکا ہے ۔ کہتے ہیں کہ ایران کے پہلوی خاندان کی اصل بھی پارتھیا ہی سے ہے ۔ اس کی سرحد شمال کی جانب روس سے ملحق ہے ۔ یہاں کے قبائلی باشندے نہایت جنگجو اور بہادر ہیں ۔ یہ لوگ تیراندازی میں بہت مشّاق ہیں ۔ اس کے شمالی حصے میں شہر مشہد واقع ہے، جسے اہل تشیّع حضرت امام علی الرّضا علیہ السلام کے مزار کی وجہ سے نہایت مقدس مانتے ہیں ۔ یہ علاقہ قدیم پہلوی تہذیب کا مرکز رہ چکا ہے ۔

(قاضی سعیدالدین احمد)

⊗ پارچہ بافی : رک بہ فن، پارچہ بافی (اسلامی) ۔

⊗ پارسی : ابتدائے تاریخ سے پارسیوں کے آبا و اجداد کا اصل مسکن ایران تھا اور وہ مشرقی ایران میں پیشدادیوں اور کیانیوں کے دور میں ایرانی کہلاتے تھے ۔

جب سائرس (Cyrus) نے ھخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی اس وقت سے یونانیوں سے ایران کے تعلقات قریب تر ہو گئے ۔ دارائے اعظم نے ڈھائی ہزار سال قبل اپنی تاریخ کوہ بہستون نزد کرمان شاہ پر کندہ کرائی تھی ۔ اس زمانے میں اس کی سلطنت دنیا بھر میں وسیع ترین سلطنت تھی ۔ اس کی تئیس ولایتیں اور نوآبادیات ایشیا، افریقہ اور یورپ کی جنوبی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ صوبۂ فارس میں شیراز کے قریب اصطخر کے مقام پر اس دور کے کتبوں اور محلات کے آثار پائے جاتے ہیں ۔ فارس کے باشندے اب پارسی کہلانے لگے ۔ وہ ایران یا فارس میں ساسانی دور کے اختتام تک رہے تاآنکہ عربوں نے ساتویں صدی میں آخری تاجدار یزدگرد (= یزد جرد) کو شکست دی ۔

گزشتہ بارہ صدیوں میں بے شمار پارسیوں نے اسلام قبول کیا ۔ معدودے چند جو ہندوستان بھاگ آئے اور جو لوگ اب بھی فارس میں رہتے ہیں دونوں مل کر ایک لاکھ پچیس ہزار افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا فرقہ بن گیا ہے ۔ جب تھوڑے سے پارسی پہلی بار ہندوستان آئے تو کھیتی باڑی کرنے لگے ۔ ان کی خوشحالی کا دور پندرھویں صدی سے شروع ہوا اور ان کے ہم‌مذہب لوگ کثیر تعداد میں ہندوستان آنے لگے ۔ ان میں سے بہت سے دکاندار بن گئے ۔ ان کی سب سے بڑی تعداد سورت میں رہتی تھی ۔

جب انگریز آئے اور انھوں نے سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت اس کے گماشتے دو پارسی بھائی تھے ۔ جب انگریزوں نے ہانگ کانگ، شنگھائی اور کانٹن کو لے لیا تو پارسی کثیر تعداد میں بحیثیت سوداگر وہاں پہنچے ۔ انھوں نے بے شمار دولت جمع کر لی، جسے انھوں نے بڑی فراخدلی سے قومی فلاح اور رفاہ عامّہ کے کاموں، مثلاً مدرسے و شفاخانے اور دوسرے اداروں کے قائم کرنے میں صرف کیا ۔ اس طرح یہ فرقہ رفاہ عامّہ کے کاموں کے لیے اب تک سولہ کروڑ سے زائد روپیہ خیرات کر چکا ہے ۔ گزشتہ صدیوں کے

اختتام تک پارسی لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کی اوسط شرح فی صد انگلستان اور امریکہ کے برابر ہوگئی۔

پارسی گزشتہ صدی میں کارخانہ‌داری کی صنعت کے پہلے علمبردار تھے ۔ مشہور ٹاٹا کمپنی، جو جمشید پور میں کلکتے (بھارت) کے قریب واقع ہے، فولاد سازی میں ایک مشہور صنعت گاہ ہے ۔ برطانوی پارلیمنٹ میں تین ہندوستانی آج تک منتخب ہوے، وہ تینوں پارسی تھے ۔ دادا بھائی نوروجی جو بابائے ہند کے نام سے مشہور ہیں لبرل Liberal پارٹی کے رکن تھے ۔ سر منوچہرجی بھاؤنگری قدامت پسند (Conservative) پارٹی کے رکن تھے اور مسٹر شاہ پورجی سکلتوالا مزدور (Labour) پارٹی سے تعلق رکھتے تھے ۔ جس وقت کرکٹ کا کھیل شروع ہوا تو پارسی سب سے پہلی مرتبہ انگریزوں کے مقابلے میں کھیلے ۔ ان لوگوں نے اپنی ٹیم لنڈن بھیجی ۔ لارڈ ھاک Hawk، آوکسفرڈ اتھلٹک اور وارنر Warner اپنی تین ٹیمیں پارسیوں سے میچ کھیلنے کے لیے ہندوستان لائے تھے۔

(M.N. DHALLA)

پارہ : ایک ترکی سکّہ، جو ابتداءً ۴ آقچہ کے برابر چاندی کا سکہ ہوتا تھا ۔ یہ سکہ سترھویں صدی کے شروع میں جاری ہوا، اور بہت جلد آقچہ کی جگہ سکّۂ رائجہ کے طور پر چلنے لگا ۔ اس کا وزن، جو ابتدا میں ۱۶ گرین (=۱۰۱٫۰ گرام) تھا، انیسویں صدی کے آغاز میں گھٹ کر اس وزن کا ایک چوتھائی رہ گیا ۔ اور چاندی کا حصہ بھی کم ہو گیا ۔ چاندی کے پارہ کے اضعاف یہ تھے : ۵ (بشلک)؛ ۱۰ (اونلق)؛ ۱۵ (اونبشلک)؛ ۲۰ (یگرمی پارہ لک)؛ ۳۰ (زولتہ)؛ ۴۰ (غروش یا پیاسٹر) ۔ کبھی کبھی زیادہ بڑے اضعاف : ۶۰ (التمشلک)؛ ۸۰ (ایکیلک) اور ۱۰۰ (یوزلک) بھی جاری ہوے۔

۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں نئے مجیدی سکّوں کے رواج کے وقت پارہ تانبے کا چھوٹا سکّہ قرار دیا گیا اور اس کے اضعاف یہ تھے : ۵ (بش پارہ لک)؛ ۱۰ (اون پارہ لک)؛ ۲۰ (یگرمی پارہ لک)؛ ۴۰ (غروش یا پیاسٹر) ۔ ترکی سلطنت کے آخری دور میں زیادہ قیمت کے سکّے تانبے کے بجاے نکل کے بننے لگے ۔ جمہوری حکومت میں پارہ صرف زرحسابی رہ گیا ہے، اور ایلومینیئم و کانسی کا ۲½ پیاسٹر کا سکّہ سب سے چھوٹے سکّے کے طور پر مضروب ہوتا ہے۔

جب سربیا آزاد ہوا تو اس نے اپنے سب سے چھوٹے سکّے کے لیے پارہ کا نام باقی رہنے دیا اور جبل اسود (مانٹی نیگرو) نے بھی یہی کیا ۔ اسی طرح یوگوسلاویا میں بھی یہ نام باقی ہے ۔ وہاں سب سے چھوٹا سکّہ، جو نکل کا ہوتا ہے، ۵۰ پارہ کے مساوی ہے ۔ ۱۷۷۱ سے ۱۷۷۴ء تک، جب مولدیویا اور افلاق (Wallachia) [رک بآں] میں روس کا قبضہ رہا تو، وہاں ایسے تانبے کے سکّے جاری کیے گئے جن کی قیمت پارہ اور کوپک [Kopeck، روسی سکّہ] میں ہوتی تھی۔

مآخذ : (۱) Lane-Poole : *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*، ج ۸، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲) Belin، در *J A*، سلسلہ ۶، ج ۳ : ص ۴۲۷ تا ۴۵۱۔

(J. ALLAN)

پازھر : رک بہ بازھر۔

پاسبان اوغلو : (= پاسبان اوغلی)، (قب قاموس الاعلام، ۲ : ۱۳۶۷) یا پازوانند اوغلو (عبدالرحمٰن شرف : تاریخ، ۲ : ۲۸۰) یا جدید املاء کے مطابق Pazwant-Oghlu (حامد و محسن : ترکیہ تاریخی، ص ۳۲۳)، لیکن خود اس کی مہر پر "پازواندزادہ عثمان" (در Orčškov، دیکھیے مآخذ)، کندہ تھا، ودین کا باغی پاشا (۱۱۷۸ تا

۱۸۰۷ء) اس کے خاندان کا اصلی وطن بوسنہ میں طوزلہ تھا، لیکن اس کے دادا پاسبان آغا کو، آسٹریا کے خلاف جنگی خدمات کے صلے میں ۱۷۳۹ء کے قریب بلغاریا میں ودین کے آس پاس دو گاؤں عطا ہوئے تھے۔ عثمان کا باپ عمر آغا پاسبان اوغلو نہ صرف ان دو گاؤوں کا موروثی زمیندار تھا بلکہ "بیرق‌دار" [رک بآں] وغیرہ ہونے کی وجہ سے دولت‌مند اور سرکردہ لوگوں (اعیان) میں سے تھا، مگر اس کی سرکشی کی وجہ سے مقامی گورنر نے اسے قتل کر دیا تھا۔

خود عثمان نے بھی اپنی جان صرف البانیا بھاگ کر بچائی، لیکن ۱۷۸۷ تا ۱۷۸۹ء کی لڑائی میں رضاکار کی حیثیت سے حصہ لینے کے بعد وہ وطن واپس آ گیا۔ بہت تھوڑی مدت بعد وہ دوبارہ میدان جنگ میں گیا اور داد شجاعت دے کر ۱۷۹۱ء میں ودین کی طرف پلٹا۔ یہاں سے اس نے ساتھیوں کے ہمراہ افلاق (Wallachia) اور سربیا پر حملے شروع کیے۔ جب سلطان نے اس حرکت پر اس کو سزا دینا چاہی تو ۱۷۹۳ء میں اس نے ترک اطاعت کر کے پہاڑوں میں پناہ لی اور ۱۷۹۴ء کے اخیر میں اپنی رہزن جماعت کی مدد سے ودین کو فتح کر لیا اور اس پاشالیق [صوبے] کا حقیقی حاکم بن گیا۔ ودین، جس کی اس نے پھر سے قلعہ بندی کر لی، اب رہزنوں اور ان بد دل ینی‌چری سپاہیوں کا مرکز بن گیا جو ۱۷۹۲ء میں سربیا سے نکال دیے گئے تھے، اور عثمان ان سب لوگوں کا ہر دل عزیز سرغنہ بن گیا جو سلیم ثالث کی اصلاحات کے مخالف تھے۔

پاسبان اوغلو نے ۱۷۹۵ء میں خود بلغراد کے والی حاجی مصطفی پاشا پر فوج کشی کی، جو اصلاحات کا حامی تھا اور پاسبان اوغلو کے قلع قمع کرنے کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ باب عالی نے خاصی بڑی فوجیں پاسبان اوغلو کے مقابلے کو بھیجیں، لیکن وہ ناکام رہیں۔ نتیجے کے طور پر ۱۷۹۵ء کے آخر میں صلح کی بات چیت شروع ہوئی، لیکن پاسبان اوغلو عملاً پورے بالائی بلغاریا پر بدستور قابض رہا۔

چونکہ باب عالی نے پاسبان اوغلو کی حکومت کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے ودین کے سرکاری حاکم کو شہر بدر کر دیا اور ۱۷۹۷ء میں آس پاس کے علاقوں (پاشالیقوں) پر حملہ آور ہوا۔ مشرق میں اس کی فوجیں بلغاریا کے کئی شہروں پر یا تو قابض ہو گئیں یا ان کے لیے خطرے کا باعث بن گئیں تھیں (البتہ وارنہ Varna میں انھوں نے شکست کھائی)۔ جنوب میں انھوں نے نش Nish [رک بآں] پر حملہ کیا لیکن ناکام رہیں۔ مغرب میں وہ بلغراد [رک بآں] تک پہنچیں اور یہ شہر فتح کر لیا، لیکن ترکوں اور سربیوں نے، جنھیں حاجی مصطفی نے مسلح کر دیا تھا، قلعے کی مدافعت کی اور حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ اس حملے کے باعث، نیز پاسبان اوغلو کے فرانس اور روس سے نامہ و پیام کرنے پر، باب عالی نے ۱۷۹۸ء میں امیر البحر کوچک حسین پاشا کے زیر قیادت لاکھ سپاہیوں کی ایک فوج پاسبان کے مقابلے کو بھیجی۔ اس فوج نے اکتوبر کے مہینے تک شہر کو گھیرے رکھا مگر فتح نہ کر سکی اور اسے بھاری نقصانات اٹھا کر واپس ہونا پڑا۔ اس شکست اور نپولین کے حملۂ مصر سے مجبور ہو کر باب عالی نے پاسبان اوغلو سے کم از کم برائے نام صلح کر لی اور ۱۷۹۹ء میں اسے پاشائے سہ دم اسپ [اوچ طوغ پاشا] کا منصب دے دیا۔

بایں ہمہ پاسبان اوغلو نے علی الاعلان اصلاحات، مرکزی حکومت اور خود سلیم ثالث، سب کی مخالفت کی۔ اس نے متعدد بار (۱۸۰۰ اور ۱۸۰۱ء) افلاق

کو تاخت و تاراج کیا اور ینی چری فوج کو، جو
(۱۸۰۰ء کے موسم گرما میں) بلغراد واپس آ گئی
تھی قلعے پر قبضہ کر لینے اور (سال کے آخر میں)
حاجی مصطفٰی پاشا کے قتل پر ابھارا۔

اسی زمانے میں پاسبان اوغلو نے کئی بار زار سے
خواھش کی کہ وہ اسے اپنی مخلص رعایا میں شمار
کرے اور فرانس کو بھی اپنی خدمات پیش کیں ۔
باب عالی نے کچھ ھی عرصے پہلے پاسبان اوغلو کے
سارے قصور معاف کر دیے تھے، لیکن ۱۸۰۳ء سے
اس کے خلاف پھر اعلان جنگ کر دیا، مگر ۱۸۰۴ء
میں سربیا والوں نے بغاوت کر دی، جس سے ترکوں
کی توجہ اس کی جانب ھٹ گئی ۔ پاسبان اوغلو کو
خود اپنے مقبوضات کے مغربی حصے میں ۱۸۰۵ء
میں پنٹزو Pintzo کی شورش دبانے کے لیے لڑنا
پڑا ۔ ۱۸۰۶ء میں جب روسی فوجیں ڈینیوب
کے بائیں کنارے پر نمودار ھوئیں تو پاسبان کو
مصلحت یہی نظر آئی کہ باب عالی کو اپنی خدمات
پیش کرے ۔ لیکن باب عالی نے رُوسچُق کے سپہ سالار
کو قیادت اعلی عطا کر دی ۔ اس سے پاسبان بہت
تلخ کام ھوا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ روس اور
سربیا کے متحدہ حملوں کے خلاف صرف اپنے ملک کی
حفاظت کرے گا، لیکن بعد ازاں وہ جلد ھی یعنی
۲۷ جنوری ۱۸۰۷ء کو اس دنیا سے چل بسا ۔

پاسبان کو اتنے عرصے تک ثابت قدم رھنے
میں جن چیزوں نے مدد دی وہ اس زمانے میں
سلطنت عثمانیہ کی گری ھوئی حالت اور اس کی اپنی
ذاتی قابلیت اور دوربینی تھی (وہ کبھی ودین چھوڑ
کر نہ نکلا)، مگر سب سے بڑی وجہ تقدیر کی یاوری
تھی ۔ اپنے علاقے کے اندر وہ تجارتی اور دوسرے
محاصل وصول کرتا اور سختی اور استبداد کے ساتھ
حکومت کرتا تھا، مگر یہ مطلق العنانی انصاف اور
نرمی سے خالی نہ تھی ۔ دماغی پریشانیوں کی وجہ
سے اس کی صحت کچھ اچھی نہ رھنے کے باوجود
اس کی اولوالعزمی کا منتہا آزادی تھا، جس کا ثبوت
وہ سکے ھیں جو اس نے مضروب کرائے اور جو
پازوانچہ Pazvančeta کے نام سے معروف تھے ۔

مآخذ: پاسبان اوغلو پر مختلف اطلاعات
G. A. Oliver (۱۸۰۱ء) اور L. Pouqueville (۱۸۰۵ء)
کے معاصر سفرناموں میں ملتی ھیں؛ لیکن اس کی مکمل
تصویر (۱) *Notes sur Passvan-Oglu 1758-1807 par l' adjudant-commandant Mériage*، میں نظر آتی
ھے، جو ودین کے فرانسیسی ایجنٹ (۱۸۰۷ و ۱۸۰۸ء)
نے مرتب کیے تھے ۔ اس کے وقائع حیات سے متعلق
اس سے بہتر تصنیف اب تک شائع نہیں ھوئی ۔ انھیں
Grgur Jakšić نے مرتب کر کے *Le Revue Slave*
(ج ۱، پیرس ۱۹۰۶ء: ص ۲۶۱ تا ۲۷۹ اور ۴۱۸ تا
۴۲۹؛ ج ۲، ۱۹۰۶ء: ص ۱۳۹ تا ۱۴۴ اور ۳۳۶ تا
۳۴۸؛ ج ۳، ۱۹۰۷ء: ص ۱۳۸ تا ۱۴۴ اور ص ۲۷۸
تا ۲۸۸) میں چھاپا ۔ ان کا ترجمہ سربوکروٹی زبان میں
ھوا، *Glasnik zemaljs kog muzeja* (ج ۱۷، سیراجیو
۱۹۰۶ء: ص ۱۷۳ تا ۲۱۶)؛ نیز دیکھیے: (۲)
J. W. Zinkeisen: *G. O. R. in Europa*، ج ۷، گوتھا
۱۸۶۳ء: ۲۳۰ تا ۲۳۱؛ (۳) C. Jireček:
Geschichte der Bulgaren، پراگ ۱۸۷۶ء، ص ۴۸۶
تا ۵۰۳؛ (۴) Iv. Pavlović: *Ispisi iz francuskih arhiva*، بلغراد ۱۸۹۰ء، بالخصوص ص ۱۰۳ تا ۱۲۸،
یہ پاسبان اوغلو کے متعلق سفارتی اطلاعات ھیں
(۱۷۹۵ تا ۱۸۰۷ء)؛ (۵) M. Gavrilović، در *La Grande Encyclopédie*، ۲۶ : ۶۸، پیرس بدون تاریخ؛
(۶) St. Novaković: *Tursko carstvo pred srpski ustanak 1780-1804*، بلغراد ۱۹۰۶ء، ص ۳۲۳ تا ۳۸۹؛
(۷) M. Vukićević: *Karađorđe*، ۱، بلغراد ۱۹۰۷ء:
۱۶۶ تا ۱۷۶ اور ۱۸۵ تا ۲۰۸؛ (۸) P. Orěškov:
Několko dokumenta za pazvantoglu i Sofroni

Vračanski (1800-1812) [از روسی وزارت خارجه]، در مجلّهٔ سائنس اکیڈیمی، بلغاریا : *Sbornik*، جلد ۳، صوفیا ۱۹۰۳ء، مادہ ۳، ص ۱ تا ۵۵؛ (۹) V. Ćorović، در *Narodna enciklopedija*، ج ۳ : Zagreb ۱۹۲۸ء: ص ۲۷۲.

(FEHIM BAJRAKTAREVIC)

پاسے : (Pasé) سماترا میں آچیے (= اَچِیے) کے شمالی ساحل پر ایک ضلع، جو وهاں کے عام خیال کے مطابق مشرق میں دریاے جمبو آچیے (Djambo-Ajé) سے شروع هو کر مغرب میں دریاے پاسے کے دوسرے کنارے تک پھیلا هوا ہے۔ یه تمام علاقه چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا هوا ہے، جن میں سے هر ایک میں ایک اولی‌بلانگ uleïbalang یا سردار هوتا ہے۔

پاسے کسی زمانے میں مشرقی ایشا میں ایک مشہور مملکت تھی۔ آچیے کا شمالی ساحل قرون وسطٰی میں اس بحری تجارتی راستے پر واقع تھا جو هندوستان سے چین کو جاتا ہے۔ اسلام اسی راستے سے آیا اور اس نے هندوستان سے نکل کر اس ساحل پر مضبوط قدم جما لیے۔ جزائر شرق‌الہند میں یه پہلا مقام تھا جہاں اسلام پہنچا۔ هم جانتے هیں کہ تیرهویں صدی عیسوی میں وهاں پہلے سے مسلمان حکومت کر رهے تھے ان میں سے ایک الملک الصّالح (م ۱۲۹۷ء) مقامی روایت کے مطابق سلطنت کا بانی تھا۔ اسی نے اس ملک میں دین اسلام پھیلایا۔ اس کی قبر، جو کھنبایت (هندوستان) سے لائے هوے پتھروں سے بنی هوئی ہے، بعض دوسری قبروں کے تعویذوں کے ساتھ دریاے پاسے کے بائیں کنارے پر سمندر کے قریب هی دریافت هوئی ہے۔ کہتے هیں کہ یہیں سلطنت کا پاے تخت واقع تھا۔ ایک اور پاے تخت، جو قدرے مغرب میں ہے، سَمُدرا تھا۔ تیرهویں صدی عیسوی کے وسط میں جب چین کو جاتے اور وهاں سے واپس آتے هوے ابن بطّوطه دو دفعه یہاں آیا تو بادشاہ کی سکونت سمدرا هی میں تھی۔ سماترا کے جزیرے کا موجودہ نام، جس سے وہ یورپ میں مشہور ہے، اسی سَمُدرا سے بنا ہے۔ ابن بطوطه اسے ''سمطره'' لکھتا ہے۔ پاسے اس زمانے میں ایک خوش حال ساحلی خطه تھا، وهاں کا حکمران بندرگاہ کا بادشاہ تھا، جس کے بہت سے تجارتی جہاز چلتے تھے؛ چنانچه ابن بطوطه نے اس کا ایک جہاز جنوبی چین کے بندر چوئن‌چاؤ ch'ünchou (فوکین Fukien) میں دیکھا تھا۔ یہاں کی درباری زندگی بالکل هندوستان کے بادشاهوں کے درباروں کے نمونے پر ڈھالی گئی تھی۔ اس وقت کا بادشاہ بڑا پرجوش مسلمان تھا۔ اسے علوم کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ساحل کے عقبی علاقے میں کئی فتوحات حاصل کیں۔ پاسے میں لین دین کے لیے سیسے کے سکے [ابن بطّوطه : قطعِ قصدیر] اور چین کا خام سونا استعمال هوتا تھا۔ خوراک زیادہ‌تر چاول تھی۔

ابن بطّوطه کی اس ملک سے روانگی کے کچھ هی عرصے بعد (۱۳۶۵ء سے قبل) بادشاہ کو جاوا کی هندو سلطنت مجاپائت Madjapait کی سیادت تسلیم کرنا پڑی۔ لُوہ سوکُون Lho-Sukon کے قریب کسی ملکه یا شہزادی کی قبر ملی ہے جس کی لوح کے اوپر کی طرف ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء کا ایک عربی کتبه ہے اور زیریں حصے پر قدیم جاوی رسم‌الخط میں ایک بہت هی بوسیدہ کتبه ہے۔ یه اب تک پڑھا نہیں جاسکا۔ چینی سفیر تشنگ هو (Cheng Ho) نے ۱۴۱۶ء میں بیان کیا ہے کہ یه حکومت ناگو (پیڈی=Pidië) سے مسلسل لڑائیوں میں الجھی رهی۔ وہ یہاں کی پیداوار میں چاول، سیاہ مرچ اور کرم ابریشم کا تذکرہ کرتا ہے۔ سیاہ مرچ نے پرتگالیوں کو یہاں کھینچ بلایا۔ اُنھوں نے ۱۵۲۱ء سے پاسے میں ایک قلعه‌بند بستی بنائی، لیکن آچیے کے سلطان

نے، جس کی سلطنت روزافزوں ترقی پر تھی، ۱۵۲۴ء میں ان کو نکال دیا ۔ اس کے بعد سے پاسے سلطنت آچے کا ماتحت صوبہ ہو گیا ۔ قدیم حکومت کے سلاطین کی قبریں بہت بعد کے زمانے، یعنی ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸-۱۶۳۹ء تک آچے کے مشہورترین سلطان سکندر ثانی کی زیارت‌گاہ تھیں، لیکن اب اس قدیم سلطنت کی یاد بھی محو ہو گئی ہے ۔ دریاے پاسے کا دہانہ گاد سے اَٹ گیا ہے اور وہ مقام جہاں پاسے تخت واقع تھا قابل شناخت نہیں رہا .

پاسے نے مسلمان علما اور مبلغین کے ذریعے سالہاے دراز تک مجمع‌الجزائر ملایا پر کافی اثر ڈالے رکھا ۔ اُن کی یاد جاوی اور ملائی روایات میں باقی ہے .

مآخذ : (۱) C. Snouck-Hurgronje: *Verspreide Geschriften*، ۴ / ۱ : ۴۰۲ ببعد؛ ۴ / ۲ : ۱۰۱ ببعد؛ (۲) C. Defrémery و B. R. Sanguinetti : *Voyages d'Ibn Batoutah*، ۴ : ۲۲۸ ببعد؛ (۳) W.P. Groene-veldt: *Notes on the Malay Archipelago and Malacca*، در *Miscellaneous Papers relating to Indo-China and the Indian Archipelago*، سلسلہ ۲، ج ۱، لنڈن ۱۸۸۷ء: ص ۱۷۱، ۲۰۸ ببعد؛ (۴) J.P. Moquette : *De eerste vorsten van Samoedra-Pasè (Noord-Sumatra)*، در *Rapporten Oudheidk. Dienst Nederlandsch-Indië*، ۱۹۱۳ء، ص ۱ ببعد؛ (۵) *Oudheidk. Verslag*، در کتاب مذکور، ۱۹۱۵ء، ص ۱۲۷ ببعد.

(R.A. Kern)

پاشا : (ترکی، فارسی لفظ پادشاہ سے ماخوذ، غالباً ترکی لفظ ''بشقق'' سے متأثر)، سب سے بڑا اعزازی لقب یا عنوان، جو ترکی میں قریبی عہد تک مستعمل رہا اور جو اب تک ان اسلامی ممالک میں باقی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے اجزا رہ چکے ہیں (مثلاً مصر، عراق اور شام) ۔ پاشا، یورپ کے امرا کے القاب کی طرح ہمیشہ اسم عَلَم کے ساتھ استعمال ہوتا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ یہ نام کے بعد آتا تھا (یہی حال بے اور افندی کا ہے، جو پاشا سے کم‌تر درجے کے خطاب ہیں) ۔ مزید یہ کہ نوعیت کے لحاظ سے جاگیرداری کی بہ‌نسبت یہ زیادہ‌تر فوجی لقب تھا، کیونکہ یہ نہ تو وراثۃً آگے چلتا تھا، نہ اس سے بیویوں کو کوئی درجہ ملتا تھا اور نہ جاگیروں سے اس کا تعلق تھا؛ تاہم یہ لقب صرف اہلِ فوج کے لیے مخصوص نہ تھا، بلکہ (مذہبی عہدوں کو چھوڑ کر) بعض غیر عسکری یا دیوانی حکام کو بھی دیا جاتا تھا .

پاشا کا لقب پہلی بار تیرھویں صدی عیسوی میں دیکھنے میں آتا ہے ۔ اس کے ابتدائی استعمال کی صحیح تعیین مشکل ہے؛ لیکن کچھ بھی ہو، یہ لقب بہت پہلے آقا یا صاحب کے مبہم معنی میں استعمال ہوا اور پھر یہ معنی متروک ہو گئے (قب دیوانِ ترکی سلطان ولد، ص ۴۱، متن مؤرخہ ۷۱۲ھ / ۱۳۱۳ء، جہاں خود خدا کو ''اے پاشا'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے) ۔ اسی زمانے میں پاشا کا لقب، سلطان کے لقب کی طرح، بعض اوقات عورتوں کو بھی دیا گیا (قب اسمعیل حقی: کتابہ‌لر، ۱۹۲۷ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ قادم پاشا، سلجوق پاشا) ۔ یہ دستور اُنیسویں صدی میں صرف ایک بار اَور دیکھنے میں آیا ہے اور وہ بھی بطور استثناء، یعنی خدیو کی والدہ کے لیے (قب والدہ سلطان) .

سلاجقۂ روم کے زمانے میں پاشا کا لقب (لفظ پادشاہ کا اختصار اور ہمیشہ لفظ سلطان کا مماثل ہونے کی حیثیت سے) وقتاً فوقتاً بعض ایسے مذہبی افراد کو بھی دیا گیا جو ضرور سپاہی بھی ہوں گے اور جن کی تاریخ سے اب تک ہم اچھی طرح واقف نہیں ۔ عاشق پاشازادہ نے جو اپنا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے اگر اس سے استدلال کریں تو یہ لقب تیرھویں صدی

کے نصف اول ہی میں مستعمل تھا ۔ مخلص الدّین موسٰی بابا، عرف شیخ مخلص یا مخلص پاشا، علی افندی کی روایت کے مطابق، ۱۲۲۲ء میں سلجوقی سلطان غیاث الدین کیخسرو ثانی کی شکست کے بعد قرہمان اوغلو سے پہلے اس علاقے میں حکومت پر قابض ہو گیا تھا (قب Gibb : *A History of the Ottoman Poetry*، ۱ : ۱۷۷).

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی صدی کے آخر میں پاشا کا لقب ان خاندانی رئیسوں کے خاص خاص افراد کے ناموں کے ساتھ بڑھایا گیا، جن کی تعداد محدود تھی اور جنھوں نے ایشیاے کوچک میں چھوٹی چھوٹی ترکی اور ترکمانی موروثی ریاستیں قائم کرلی تھیں ۔ یہ خطاب پانے والے بعض اوقات حکمران اور بعض اوقات حکمران خاندان کے ارکان تھے ۔ یہی حال ریاستہاے تکّہ، آیدین، دنزلی اور قزیل احمدلی کا تھا (قب مادّۂ ترک) اور غالبًا آناطولی کی چھوٹی ریاستوں کا بھی (قب صاروخان کے لیے علی پاشا، بروایت شہاب الدین بن العُمَری : التعریف وغیرہ، جس کا حوالہ القلقشندی : صبح الأعشٰی، ۸ : ۱۶، س ۱۳، میں دیا ہے).

آلِ عثمان میں دو شخص پاشا کے لقب سے ملقب بتائے گئے ہیں: علاء الدّین، جو عثمان کا بیٹا تھا اور سلیمان، جو اورخان کا لڑکا تھا.

علاء الدین کا معاملہ بہت مبہم ہے ۔ اس نام کے دو آدمی یکساں ممتاز ہیں: ایک تو علاء الدین بے، جو عثمان کا بیٹا تھا اور دوسرا علاء الدین پاشا، جو عثمان کا وزیر تھا اور ممکن ہے ان دونوں کو ملتبس کر دیا گیا ہو (قب حسین حُسام الدین : علاء الدین بے، در *TTEM*، سال ۱۳، و ۱۰، ۴ مقالے) ۔ مزید برآں ہو سکتا ہے یہی شخص یا ان دو میں سے کوئی ایک علاء الدین ''بیلربے'' بھی ہو (قب اوروج : *Chronicle*، طبع بابنگر Babinger، ص ۱۰، س ۱۵) ۔ اس مسئلے کی، جو حل نہیں ہوا، جو بھی حقیقت ہو، یہ یقینی ہے کہ پاشا کا لقب شروع زمانے ہی سے ارباب سیاست کو دیا جاتا تھا (قب سنان پاشا، تحت اورخان، ترک).

بہرحال پاشا کا لقب بہت جلد ارباب مناصب میں سے دو طبقوں کا خصوصی امتیاز بن گیا : (۱) صوبوں کے بیلربی (امیرالامرا) اور (۲) پاے تخت کے وزرا؛ مگر کچھ مدت بعد اسی قسم کی خدمات انجام دینے والے دوسرے عہدےداروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا.

چودھویں صدی عیسوی کے نصف دوم (۱۳۵۹ء یا ۱۳۶۲ء ؟) میں ترک مؤرخوں کے قول کے مطابق لالہ شاہین کو، جو عثمانلی ترکوں کا سب سے پہلا (؟) ''بیلربی'' تھا، اس منصب کے ساتھ ہی پاشا کا لقب دیا گیا ۔ پھر یہی لقب آناطولی کے بیلربی کو عطا کیا گیا (اس طرح [سلطنت کے] دائیں اور بائیں بازو دونوں میں ایک ایک بیلربی رکھنے کا خیال ملحوظ رکھا گیا) ۔ بعد میں جب وسعت‌پذیر سلطنت میں نئی ایالتیں بنائی گئیں تو دوسرے بیلربیوں یا والیوں (گورنر جنرلوں) کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا.

وزرا کے معاملے میں بھی یہی صورت ہوئی ۔ ان میں پہلا (؟) عثمانلی مؤرخین کے بقول، جَندَرلی [ترک بآن] خلیل الملقب بہ خیرالدین پاشا تھا (۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸-۱۳۶۹ء میں) ۔ جو وزیر (قب مادّۂ وزیر) سلطان احمد ثالث کے زمانے تک ''قبّہ وزیرلری'' کہلاتے تھے ان کی تعداد پہلے تین اور پھر نو کی گئی اور وزیر کا لقب دوسرے بڑے عہدےداروں، مثلاً ''قپودان پاشا''، ''نشانجی''، ''دفتردار'' کو بھی دیا جانے لگا ۔ اس طرح وزیر کا لقب بھی زیادہ‌تر اعزازی ہوتا گیا، جس کے ساتھ پاشا کا خطاب بھی ضم ہوتا تھا؛ لیکن چونکہ ابتدا میں اور آئندہ بہت زمانے تک پاے تخت

میں ایک ھی وزیر رھتا تھا، لہٰذا پاشا کے لقب کا اطلاق خصوصیت سے اور بلا کسی اضافت کے، بڑے وزیر پر کیا جانے لگا، جو آگے چل کر ''اولو وزیر'' یا ''صدر اعظم'' کہلایا ۔ یہیں سے پاشا قپوسی کی اصطلاح بنی، جس کو بعد میں بدل کر باب عالی، یعنی ''بڑے وزیر کی ڈیوڑھی'' کہنے لگے ۔

پاشاؤں کی تعداد ابتداءً تیزی سے نہیں بڑھی ۔ M. d' Aramon نے صرف چار پانچ پاشاؤں یا وزیر پاشاؤں کا ذکر کیا ھے اور جس زمانے میں (۱۵۴۷ء میں) اس نے اپنی کتاب لکھی اس وقت صرف تین پاشا تھے (ایاز، گوزلجہ قاسم اور ابراھیم؛ یہ تینوں نصرانی‌الاصل تھے)؛ لیکن یہ بھی واقعہ ھے کہ یہاں اس نے صرف پایۂ تخت کے پاشاؤں کا ذکر کیا ھے ۔

صوبوں میں پاشاؤں کی تعداد زیادہ تھی اور یہ بڑھتی گئی ۔ ان میں دو قسمیں ممتاز تھیں : (۱) سہ دم اسپ (طوغ) کا نشان پانے والے پاشا یا وزیر، یہ منصب روز بروز اعزازی ھوتا گیا اور صوبوں میں پہنچ کر بتدریج رتبۂ بیلربی اسی میں ضم ھوگیا، (۲) دو دم اسپ والے پاشا، یا ''میر میراں'' ۔ یہ فارسی اصطلاح ترکی لفظ بیلربی اور عربی لفظ امیرالامرا کے مرادف تھی، لیکن بتدریج یہ منصب ادنٰی درجے کا رہ گیا ۔ علاوہ بریں سابق سنجاق‌بے، یعنی حاکمان ضلع، جو اصولاً صرف ایک طوغ کے نشان کا حق رکھتے تھے، رتبۂ ''میر میراں'' پر فائز کر دیے گئے اور یوں وہ بھی اپنی نوبت پر پاشا ھو گئے ۔

قانون ''تنظیمات'' [رَكْ بآں] کے بعد پاشا کا لقب نو قسم کے دیوانی اعلٰی حکام میں سے پہلے چار (۱ ۔ وزیر، ۲ ۔ بالا، ۳ ۔ اولٰی، ۴ ۔ ثانیہ صنف اولٰی، اور فوج میں (۱ ۔ مشیر، ۲ ۔ برنجی فریق، ۳ ۔ فریق، ۴ ۔ لوا کو دیا گیا، اور نامور اشخاص (۳ ۔ روم ایلی بیلربی اور ۴ ۔ میر میراں بھی اس کے مستحق قرار پائے) پاشا کے لقب سے عملاً اگرچہ بلااستحقاق معزول شدہ ''امیرالامرا'' بھی سرفراز کیے جاتے تھے اور اس حالت میں یہ محض ایک چھوٹے درجے کا اعزازی لقب ھوتا تھا ۔

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر مناصب کی یہ ترتیب اڑا دی گئی اور جمہوریۂ ترکیہ نے پاشا کا لقب صرف اھل فوج کے لیے رھنے دیا ۔ اسے بھی حال میں انقرہ کی مجلس ملّی کبیر نے (۲۶ نومبر ۱۹۳۴ء کو) موتوف کر دیا ۔ اب پاشا کی جگہ جنرل اور مشیر کے بجائے ''مارشل'' بولا جاتا ھے ۔

یورپ میں ابتداءً اس لفظ کا تلفظ ''باشا'' تھا (چنانچہ سترھویں صدی سے قبل ''پاشا'' کے تلفظ سے کوئی واقف نہ تھا) : اطالوی میں bascia، ازمنۂ وسطٰی یا عہد متأخر کی لاطینی میں bassa، فرانسیسی میں bacha یا bassa، انگریزی میں bashaw ۔ رسم الخط کا اختلاف اس کے علاوہ ھے ۔ یونانی میں اس کے برعکس پاشا کی شکل سب سے قدیم (چودھویں صدی عیسوی) ھے، لیکن غالباً یورپ کے اثر سے (سولھویں صدی میں) باشا بھی ملتا ھے، قب Ducange : *Glossarium mediae et infimae Graecitatis*، بذیل مادۂ μπασίας ۔ اس لفظ کا تلفظ باشا جو یورپ والوں نے کیا ھے وہ یا تو اس لیے ھے کہ مصر میں ان پر عربی زبان کا اثر پڑا یا پاشا اور پرانے ترکی لقب باشا کو انھوں نے گڈ مڈ کر دیا ھے (دیکھیے مقالے کا آخری حصہ) ۔

لفظ پاشا کا اشتقاق : اس لفظ کے مختلف اشتقاق بیان کیے گئے ھیں ۔ اب ھم ان پر غور کریں گے : (۱) یہ فارسی ''پاے شاہ'' (= بادشاہ کا قدم) سے ماخوذ ھے ۔ یہ تشریح، جو اس بنیاد پر ھے کہ ایران قدیم میں چند عہدے دار ''بادشاہ کی آنکھ'' کہلاتے تھے، پہلے تریوو (Trévoux) نے اپنی لغت (بذیل مادّہ) میں

درج کی، پھر G. v. Hammer نے از سر نو اسے اٹھایا - [بہرحال] یہ قابل قبول نہیں۔ (۲) ترکی ''باش'' (سر یا سردار) سے - یہ قیاس Antoine Geuffroy : *Briesve description de la Court du Grand Turc*، ۱۵۴۲ء، اور Leunclavius (Löwenklau) : *Pandectes historiae Turcicae*، اپنے وقائع کے تتمے (۱۵۸۸ء) میں پیش کر چکے ہیں، دیکھیے نیز تریوو Trévoux : *Dict.* اور Barbier de Meynard : *Suppl.* - یہ بھی قابل قبول نہیں - قب ذیل کا لفظ - (۳) ترکی ''باش آغا'' سے، جس کے معنے (تائید کی غرض سے) ''بڑا بھائی'' بتائے جاتے ہیں - اشتقاق کی اس صورت کو زمانۂ حال تک ترکی میں تسلیم کیا گیا ہے (محمد ثریا : سجل عثمانی، ۴ : ۳۸۷؛ شمس الدین سامی : قاموس ترکی، بذیل مادۂ پاشا) اور اس کی بنیاد یہ واقعہ ہے کہ سلیمان پاشا اور علاءالدین پاشا، بالترتیب، اورخان اور عثمان کے بڑے بھائی تھے۔ علی آفندی: کنہ الاخبار (۵ : ۴۹، س ۳۲)، تاریخ تصنیف ۱۵۹۳ تا ۱۵۹۹ء، اور عثمان زادہ احمد تائب (م ۱۷۲۴ء) نے ترکمانوں کے ہاں لفظ پاشا کے اس استعمال کی طرف توجہ دلائی (حدیقة الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۴، س ۱۶) - Heidborn : *Manuel de Droit Public et Administratif Ottoman*، ویانا ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۶، حاشیہ a) نے بھی لکھا ہے کہ قرہ مانیا کے یونانیوں کے نزدیک پاشا کے معنے ''بڑا بھائی'' ہیں، لیکن ان متفرق بیانات کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی - چند ترک لغت نویس، مثلاً احمد وفیق (بذیل باشہ) اور صلاحی نے اس اشتقاق کو قبول کر لیا ہے، مگر دو مرحلوں میں : پاشا ترکی لقب ''باشہ'' سے بنا ہے جو خود ''باش آغا'' سے ماخوذ ہے - ''باشہ'' کا لقب، جس پر ہم آگے گفتگو کریں گے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ''باش آغا'' سے بنا ہے، لیکن برعکس اس کے جو مقالہ نگار پہلے سمجھتا تھا اس کا پاشا سے کچھ تعلق نہیں۔

(۴) فارسی پادشاہ (فرمانروا) سے - یہ اشتقاق Boudagov کی ترکی۔ روسی لغت (تصنیف ۱۸۶۹ء) میں درج ہے، جس کی تائید آگے چل کر روسی دائرة المعارف مؤلفۂ Brockhaus اور افرون Efron نے کی ہے - صرف یہی اشتقاق قابل تسلیم ہے (گو جس اثر کی آئندہ نمبر ۵ میں تشریح کی گئی ہے اس کا امکان بھی موجود ہے - d'Herbelot نے ان لوگوں سے پہلے یہی اشتقاق پیش کیا تھا (تحت pascha، آخر میں 'ہ' کے ساتھ املا کے سلسلے میں) یہ تشریح اس پر مبنی ہے کہ اکابر مذہب (درویشوں) کے ناموں کے بعد جو القاب استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سلطان اور پادشاہ کے لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہیں قب Giese، در ترکیات مجموعہ سی، ۱، ۱۹۲۵ء : ۱۶۴ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورخان نے علاءالدین پاشا سے اس کے مستعفی ہونے سے پہلے جو مبہم الفاظ کہے تھے اور جنھیں عاشق پاشازادہ (طبع Giese، ص ۳۴ تا ۳۵) نے نقل کیا ہے، ان کی تشریح بھی پادشاہ سے ہو سکتی ہے - (قب بالا) - اورخان کہتا ہے : ''تم میرے لیے پاشا ہو گئے'' - اور اس سے چند سطر اوپر اورخان اس سے ''چوبان پادشاہ''، یعنی اپنی قوم کا راعی ہونے کو کہہ چکا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ پاشا کا لقب اکثر نہ صرف ''پادشاہ'' بلکہ ''شاہ'' کے بدل کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، چند مثالیں پیش ہیں :-

قزل احمد لی خاندان کے شجاع الدین سلیمان کو ابن بطوطہ [: رحلة] (طبع Defrémery و Sanguinetti، ۲ : ۳۴۳) نے سلیمان پادشاہ اور شہاب الدین بن

العمری : التعریف بالمصطلح الشریف، قاهرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۴ نے (عربی رسم الخط کے مطابق) باشا [= پاشا] لکھا ہے اور منجم باشی [کی تصنیف] (۳ : ۳۰۰) میں سلیمان پاشا کہا گیا ہے ۔ اس حکمران کے بیٹے اور جانشین ابراھیم کو، ابن العمری نے ''شاہ'' اور منجم باشی نے ''پاشا'' کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ دستور نامۂ انوری، طبع مکرمین خلیل، ص ۸۳ تا ۸۴، میں سلیمان پاشا بن اور خان کو شاعرانہ ترکیب مقلوب کے ساتھ شاہ سلیمان کہا گیا ہے ۔ ابن العمری نے بغداد کے ایلخانی گورنر علی بن چیچک Čečäk (م ۱۳۳۶ء) کا ذکر علی پاشا کے نام سے کیا ہے، بقول نظمی زادہ (گلشن خلفاء، قسطنطینیه ۱۱۴۳ھ) بعض مخطوطات میں اسے علی شاہ لکھا ہے۔ اس کا ذکر علی پادشاہ کے نام سے بھی آیا ہے (Histoire de Bagdad : Cl. Huart، ص ۱۰) ۔ مشرقی [ترکی] بولیوں میں چھوٹے والیان ریاست کو بھی پادشاہ کہا گیا ہے ۔ وھاں اس لفظ کی شکل پاشا میں تبدیل نہیں ھوئی، بلکہ ''پاتشا'' (قرغیز) اور ''پوتشو'' (ازبک) ھوگئی ہے .

۵ ۔ ترکی لفظ ''باسقاق'' (متبادل شکلیں: باشکک ؟، باشکن ؟) سے، جس کے معنے 'حاکم' (یا) صدر کوتوالی پولیس ھیں (در لغت از Pavet de Courteille اور Boudagov کی لغت میں ''باسمق'' کے تحت) ۔ خوارزمی زبان کا یہ لفظ بقول Vullers ایران میں (بعہد سلطنت ایلخانیہ) رائج ھوا ۔ مغول میں اس کا اطلاق ان گماشتوں یا ناظروں اور صدر ناظروں پر ھوتا تھا جو مفتوحہ صوبوں (صرف یورپ کے ؟)، خصوصاً روس میں بھیجے جاتے تھے ۔ مسلمہ اشتقاق کی رو سے یہ لفظ فعل ''باسمق'' (= باصمق) سے بنا ہے، جس کے معنے ھیں ''دبانا، ھجوم یا ازدحام کرنا، تنگ کرنا، نقش کرنا''؛ اور یہ قابل لحاظ ہے کہ یہیں لفظ ''باسقاق'' کے معنی ظالم (یا) جبراً حاصل کرنے والا قرار پائے، یعنی ایک عہدے دار (قب روسی اور پولش دوائر معارف) جس کا خاص کام محصول اور خراج وصول کرنا تھا ۔ کسی عہدے کے نام کی یہ تشریح کتنی ھی انوکھی کیوں نہ ھو اس کی تائید اس مشابہت سے ھوتی ہے جو باسقاق اور اس کے مرادف مغولی زبان کے لفظ ''داروغہ'' darugha یا darogha [رک بان] کے درمیان موجود ہے، چنانچہ لفظ داروغہ کا موازنہ ھم مغل زبان کے فعل ''دروخو'' سے کرسکتے ھیں، جس کے معنی ''اندز کو دبانا یا نقش کرنا'' ھیں، اور وہ اس مفہوم میں باسمق کا ھم‌معنی ہے، مگر ھوسکتا ہے کہ یہ محض عوامی اشتقاقات ھوں.

شیفر Schefer نے کتاب Voyage de. M. d' Aramon کے اپنے طبع کردہ نسخے (ص ۳۲۸، حاشیہ ۳) میں لکھا ہے کہ لفظ پاشا Pacha کا اشتقاق (ترکی باش bach سے)، جو Geuffroy نے بتایا ہے، غلط ہے ۔ پاشا لفظ باشقاق bachqaq یا پاشقاق pachqaq کی مختلف صورت ہے، جس کے معنے فوجی حاکم کے ھیں ۔ Carpini نے مغل لفظ باسقاق کا ترجمہ baschati کیا ہے (مخطوطات میں مختلف املاء : باسجاتی bascati اور باستاجی bastaci) (قب *The texts and versions of John de Pl. Carpini....*، لنڈن HaKluyt Soc. ۱۹۰۳ء، ص ۶۷ و ۲۶۱ حواشی) ۔ ۱۵۹۸ء کی طبع (HaKluyt) میں حاشیے پر یہ تشریح ہے : ''باشا تاتاری لفظ ہے جسے ترک استعمال کرتے ھیں'' ۔ اس تشریح سے بھی یہ معلوم ھوتا ہے کہ لفظ باسقاق اور پاشا کو ملتبس کر دیا گیا ہے .

یہ بھی ممکن ہے کہ فی‌الواقع خود ترکوں نے لفظ ''بادشاہ'' (پاشا) اور باسقاق کو، جو مغل داروغہ کا تقریباً ھم معنی ہے، ملتبس کر دیا ھو، شیفر اور ھکلیوت کے حواشی دیکھنے سے قبل بھی

ہمارا یہ خیال تھا ـ واضح رہے کہ پاشا کا لقب (جو فارسی مآخذ میں کہیں نہیں آیا، جیسا کہ [میرزا] محمد قزوینی از راہ عنایت ہمیں اطلاع دیتا ہے) یا تو آناطولی کے اُن امرا کے لیے استعمال ہوتا تھا جو فی‌الواقع یا برائے نام مغول کی رعایا تھے یا ایلخانی مغول کے حکام کے لیے (مثلاً بغداد کا سابق‌الذکر والی؛ قب نیز پسر علی پاشا مذکور کا حال، در بزم و رزم مصنفۂ عزیز بن اردشیر استرآبادی [طبع کوپرولو، ص ۹۳۲، س ۸]) ـ اس التباس کی توضیح اس لیے زیادہ آسان ہے کہ ''باشقاق'' کا لفظ (گو شاذ و نادر) ملتا ہے (انجوینی: تاریخ جہاں گشای، ۱۲۶۰ھ، طبع [میرزا] محمد قزوینی، ۲ : ۸۳، حاشیہ ۹، اس بیان میں ایک خوارزمی عہدے دار کا ذکر ہے، جو ۶۰۹ھ میں، یعنی مغلوں کی فتح سے پہلے موجود تھا).

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر باشقاق اور پاشا کے لقبوں میں یہ التباس نہ ہوتا تو پاشا کے لقب کو ہرگز اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی.

ترکی لقب باشہ : یہ لقب بھی، جسے مقدم‌الذکر لقب سے ملتبس نہ کرنا چاہیے اور نہ پاشا کے عربی یا قدیم مشرقی تلفظوں سے، اسم علم کے بعد استعمال ہوتا تھا، لیکن اس کا اطلاق صرف فوجیوں اور نیچے درجے کے افسروں (خصوصاً ینی چریوں) پر ہوتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں کے ممتاز اشخاص پر بھی [Meninski : *Thesaurus*، ج ۱ : عمود ۶۶۲ و ۲۹۳، س ۱۸؛ *Onomasticon*، عمود ۳۲۷؛ d,Herbelot، بذیل مادۂ pascha؛ Viguier : *Éléments de la langue turque*، ۱۷۹۰ء، ص ۲۱۸، ۳۰۹، ۳۲۷؛ Zenker، ص ۱۶۳، عمود ۲ (غالباً Meninski کے تتبع میں)؛ De La Mottraye : *Voyages*، ۱۷۲۷ء، ۱ : ۱۸۰، حاشیہ a؛ قب اولیا چلبی، ۵ : ۷۰، ۱، س ۶، ۶۰۲، س ۱۸؛ نعیما، ۵ : ۷، س ۱۱، اسمعیل حقی: کتابلر (سفر بشہ، ص ۳ و ۸) ـ De La Boullaye Le-- Gouz (*Voyages*، ۱۶۵۷ء، ص ۵۹ و ۵۰۲) بھی اس لقب اور پاشا Bacha میں امتیاز کرتا ہے اور اس کا ترجمہ لفظ موسیو Monsieur سے کرتا ہے ـ Meninski نے (محلِّ مذکور) تلفظ بشی [باشی] (bashi) بھی قلمبند کیا ہے، جسے بش [باش] (bash) نہیں سمجھنا چاہیے، جس کے آخر میں اضافی ضمیر غائب کی ''ی'' لگ دی گئی ہو ـ Meninski ترکی اتنی جانتا تھا کہ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا ـ Chloros نے جو تلفظ بشِہ beshe (بذیل پاشا) درج کیا ہے وہ املا بشہ سے ماخوذ ہے (قب مثلاً احمد وفیق : زور اکی طبیب، باب (act) ۱، سنظر ۲، جہاں یہ طنزاً ایک عورت کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن Meninski اس املا کے باوجود بھی بشہ (basha) تلفظ کرتا ہے.

چونکہ لغت نویسوں نے بشہ اور پاشا میں التباس کر دیا تھا لہٰذا بعض لوگوں نے سمجھ لیا کہ باشہ کے معنے بھی ''بڑا بھائی'' ہیں (محمد صلاحی : قاموس عثمانی، ۲ : ۲۹۱ بعد؛ Chloros نے اس کا تتبع کیا ہے) ـ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ دو جداگانہ مسئلے ہیں اور یہ کہ (بشہ یا) باشا دراصل ''باش آغا'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے معنے ''agha'' (فوجی لقب) ''in chief'' یعنی صدر آغا کے ہیں ـ قواس کو (جو ینی‌چری یا یاساقجی بھی کہلاتے تھے) بقول Rochrig ''بش [باش] آغا'' کہا جاتا تھا ـ باش آغا کے دوسرے معانی اور عام طور سے بعض ان نکات پر جن سے یہاں بحث کی گئی ہے مزید تفصیل کے لیے دیکھیے Deny : *Sommaire des Archives turques du Caire*.

تلفظ کے متعلق یادداشت : لفظ پاشا میں زور آخری جزء کلمہ پر ہے (پشا pashá) اور لفظ باشہ میں پہلے جز پر (باشہ básha) جو لفظ باشی (báshi) کے تلفظ میں آخری حرف علت کی تخفیف سے ظاہر

ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

(J. DENY)

[دونوں ترکی لقب آغا اور باش آغا، بلاد الجزائر میں برابر استعمال ہوے۔ ان کا اطلاق وہاں بڑے یا متحد قبائل کے بعض رؤسا پر ہوتا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے انھیں باضابطہ مان لیا ہے۔ پاشا کا لقب معلوم نہیں کب تک شرفاے مراکش میں مستعمل رہا۔ یہ لقب ان میں سولھویں صدی عیسوی میں رائج ہوا جب کہ حکومت بنی سعد ترکی اثرات سے کسی قدر متأثر ہوئی تھی۔ فرانسیسی نگرانی کی ابتدا ہی میں مراکش سے پاشا کا لقب نابود ہو گیا۔ اس کا اطلاق صرف بعض زعماے قبائل پر ہوتا تھا، مثلاً قبیلۂ شراجہ، جو شمالی فارس میں تھا اور قبیلۂ العبدالاحمر جو سمندر کے ساحل پر بود و باش رکھتا تھا۔ نگران حکومت نے اس لقب کو بلاقصد رہنے دیا اور یہ دیہات میں باضابطہ طور پر ''قائد'' کا قائم مقام ہو گیا۔ اہل مقدّمہ قاضی کو قائد کہتے ہیں۔ فرانسیسی اور ہسپانوی زیر اثر علاقوں میں وہ تمام شہر جن میں میونسپلٹیاں قائم ہیں پاشاؤں سے خالی نہیں۔ یہ لوگ باشا کہلاتے ہیں اور جمع باشاوات آتی ہے (وَاْ، ع)]۔

* **پاشالیق**: (ترکی)، اس کے معنے ہیں: (۱) کسی پاشا [رک بآن]، کا منصب یا لقب؛ (۲) (صوبوں کا) وہ علاقہ جو کسی پاشا کے زیر اختیار ہو۔

جب بعض والیوں کو جو ''سنجاق بے'' (یا ''میر لوا'') کہلاتے تھے، ترقی دے کر ''پاشا'' کے مرتبے تک پہنچا دیا جاتا تھا، تو ان کے علاقے (سنجاق یا لوا [رک بآن] بھی پاشالیق کہلانے لگتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ۱۰۸ سنجاقوں میں سے ستر پاشالیق تھیں۔ ان میں سے پچیس پاشا سنجاسی تھیں، یعنی وہ سنجاقیں جن میں ''ایالت'' کا مستقر صوبے کے والی یا گورنر جنرل کے رہنے کا مقام ہوتا تھا۔ مزید تفصیلات کے لیے قب *Tableau général de l' Empire* : Mouradgea d' Ohsson *Othoman*، ے : ۳۰۲۔

(J. DENY)

پاشغرد: رک بہ باشقرت۔ ⊗

پاک پٹن: (= پاک پتن، ساھی وال، مغربی پاکستان) کا مشہور قصبہ، جسے قدیم زمانے سے تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ''زمانۂ سلف میں اس کا نام اجودھن تھا، جو چالوکیا خاندان کی راجدھانی تھا۔ بابا فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ کے سبب اسے اکبر بادشاہ کے حکم سے پاک پٹن کہنے لگے'' (بشیرالدین احمد: واقعات دارالحکومت، ص ۱۰، ۱۶)۔ ⊗

۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ملتان فتح کرنے کے بعد پاک پٹن پر لشکرکشی کی۔ اس نے بابا فرید الدین گنج شکر کی مقدس یاد میں اہل شہر پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی (*Gaztteer of the Montgomery District (898-99)*، ص ۳۳)۔ پاک پٹن دریاے ستلج کے دائیں کنارے سے آٹھ میل دور ۲۱ء۳۰ شمالی عرض‌بلد اور ۲۰ء۷۳ مشرقی عرض‌بلد پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں اسے دست‌کاریوں کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ مسٹر لاک وڈ کپلنگ سابق پرنسپل لاھور سکول آف آرٹ نے لکھا تھا کہ ''منٹگمری میں لاکھ بنانے کی صنعت بہت مشہور ہے جو پاک پٹن میں قائم ہے۔ اس قصبے میں صنعت‌کاروں کے بعض خاندان کھلونے، صندوق، چرخے اور چارپائیوں کے پائے بہت عمدہ بناتے ہیں جو پنجاب کے اکثر شہروں میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں کے کاریگر بہت عمدہ کپڑا بنتے ہیں۔ ان کے بنے ہوے خانہ‌دار کھیس، لنگیاں اور چوتہیاں وغیرہ بہت مضبوط اور صاف ہوتی ہیں'' (*Gazatteer of the Montgomery District*، ص ۱۷۰)۔

پاک پٹن کو حقیقی شہرت حضرت بابا فریدالدین

گنج شکر کے نام نامی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، جو اپنی وفات (۱۲۶۵ء) تک یہیں اقامت گزیں رہے اور جن کے وعظ و ارشاد سے مغربی پنجاب کے بڑے بڑے قبیلے، مثلاً سیال، راجپوت، وٹو اور دوسرے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوے۔ ان کا مزار ایک عظیم زیارت گاہ ہے، جس کا اہتمام چند سال سے محکمۂ اوقاف، مغربی پاکستان نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہاں کی ایک اور قابل ذکر قدیمی جگہ گنج شہیداں ہے، جو مزار مذکور کے قریب واقع ہے۔

پاک پتن کو کسی زمانے میں تجارتی منڈی کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس کے اردگرد دیہاتی آبادی ہے۔ یہاں میونسپلٹی بھی ہے، جس کا قیام ۱۸۶۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ مشرقی جانب تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تحصیل، تھانہ اور عدالتیں ہیں۔ قصبے کی گلیاں عموماً کشادہ اور شمالاً جنوباً ہیں۔ کچھ گلیاں تنگ اور گنجان بھی ہیں۔ یہاں ریلوے سٹیشن بھی ہے، جو ساہیوال سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

⊗ **پاک دامن بیبیاں:** (بی بی پاکدامناں)، لاہور کے مزارات و مقابر میں سے قبرستان بی بی پاکدامناں بھی زمانۂ دراز سے مشہور و متبرک چلا آتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس قبرستان کا آغاز کب ہوا۔ صاحب حدیقة الاولیاء نے بحوالۂ تذکرۂ حمیدیہ لکھا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک عابد و زاہد بزرگ سید احمد توختہ (م ۶۰۲ھ) لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوے۔ ان کی چھے بیٹیاں تھیں: بی بی حاج (رقیہ)، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حور، بی بی گوھر اور بی بی شہباز۔ یہ سب بڑی عابدہ زاھدہ تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد، جن کا مزار محلۂ چہل بیبیاں لاہور میں موجود ہے، یہ صاحبزادیاں فصیل سے گھرے ہوے لاہور کو چھوڑ کر اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئیں جہاں اب یہ قبرستان واقع ہے۔ ان کا سال وفات ۶۱۰ھ کے بعد ہوگا کیونکہ جب چنگیز خان ۶۲۰ھ میں جلال الدین خوارزم کا تعاقب کر رہا تھا تو اس وقت ان بیبیوں کی لاہور میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے (کنہیا لال: تاریخ لاہور، ص ۳۰۸)۔ یہ سب بیبیاں اس جگہ مدفون ہیں اور ان کے مزار دو احاطوں میں ہیں۔ پہلے احاطے میں بی بی حاج، بی بی تاج اور بی بی نور کی قبریں ہیں اور دوسرے احاطے میں بی بی حور، بی بی گوھر اور بی بی شہباز کی۔ یہ سب قبریں پختہ چونہ گچ سے بنی ہوئی ہیں۔ پہلے احاطے میں ایک مقبرہ پختہ گنبددار بنا ہوا ہے جس کا سن تعمیر ۱۰۱۶ھ ہے اور جو میراں محمد شاہ موج دریا بخاری (م ۱۰۱۳ھ) کے بھائی سید جلال الدین حیدر بخاری، کا مزار ہے۔ اس قبرستان کے مجاور ان خواتین کے متعلق جو قصے سناتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ بیبیاں حضرت عقیل رض بن ابی طالب کی صاحبزادیاں تھیں اور واقعۂ کربلا کے موقع پر لاہور میں تشریف لائیں اور تحقیقات چشتی میں ہے کہ ان میں سے ایک (بی بی حاج) حضرت علی رض کی بہن ہیں اور بقیہ پانچ حضرت عقیل رض کی صاحبزادیاں اور ان کے ہمراہ قرآن مجید کے سات سو چار حافظ تھے؛ واللہ اعلم۔ عبداللہ (یا محمد جمال) المعروف بہ بابا خاکی کی اولاد ان خواتین کے مزاروں کی مجاور ہے۔ ان مزاروں کے ساتھ سلاطین وقت نے کچھ اراضی وقف کر دی تھی۔

مآخذ: (۱) نور احمد چشتی: تحقیقات چشتی، لاہور؛ (۲) کنہیا لال: تاریخ لاہور، لاہور ۱۸۸۲ء؛ (۳) غلام سرور: حدیقة الاولیاء؛ (۴) غلام دستگیر نامی: بی بی پاکدامناں، لاہور؛ (۵) محمد باقر: *Lahore*، لاہور ۱۹۰۲ء۔

(ادارہ)

پاکستان : جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان، آبادی کے لحاظ سے دنیا کی ساتویں بڑی مملکت (اسلامی ممالک میں صرف انڈونیشیا کی آبادی اس سے زیادہ ہے)، جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئی۔ انگریزی دور ختم ہونے پر ہندوستان کو دو آزاد ریاستوں، بھارت اور پاکستان، میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستان کے حصے میں برطانوی ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے آئے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مغربی حصے میں صوبۂ مغربی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، صوبۂ سندھ، صوبۂ بلوچستان، ریاستہاے بہاولپور، خیرپور، نیز بلوچستان اور صوبۂ سرحد کی ریاستیں شامل ہوئیں اور مشرقی حصے میں مشرقی بنگال اور سلہٹ کا ضلع۔ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کے متعلق ابھی تک فیصلہ کن صورت پیدا نہیں ہوئی۔ کاٹھیاواڑ کی چند ریاستوں، یعنی جوناگڑھ، مانا ودر اور مانگرول نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا، لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا، چنانچہ یہ ابھی تک ہندوستان کے قبضے میں ہیں۔

۱ - طبعی حالات

(الف) محل وقوع، حدوداربعہ اور رقبہ

پاکستان دو حصوں پر مشتمل ہے : مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ ان دونوں کے درمیان بھارت کا علاقہ حائل ہے اور ان کا باہمی فاصلہ تقریباً ایک ہزار میل ہے۔ مشرقی پاکستان ۲۰ درجے، ۳۰ دقیقے و ۲۶ درجے، ۴۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸۸ درجے و ۹۲ درجے، ۵۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے اور مغربی پاکستان ۲۳ درجے، ۳۰ دقیقے و ۲۶ درجے، ۴۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۱ درجے و ۷۵ درجے، ۳۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان۔

مشرقی پاکستان کے شمال، مشرق اور مغرب میں بھارت ہے اور جنوب میں خلیج بنگال، جنوب مشرق میں اس کی سرحد کا کچھ حصہ برما سے بھی ملتا ہے۔ مغربی پاکستان کے مشرق اور جنوب مشرق میں بھارت ہے، شمال اور شمال مغرب میں افغانستان، مغرب میں ایران اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے؛ گلگت ایجنسی میں اس کی سرحد چین سے ملتی ہے؛ روس اور پاکستان کی سرحدوں کے درمیان افغانستان کے علاقۂ دخان کی تنگ سی پٹی واقع ہے۔ گویا پاکستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے نہ صرف ایشیا کی تین بڑی طاقتوں — روس، چین اور بھارت — کا ہمسایہ ہے، بلکہ اس اعتبار سے بھی ایک منفرد ملک ہے کہ اس کا شمار بیک وقت مشرق اوسط اور مشرق بعید میں کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا مجموعی رقبہ ۳،۶۵،۵۲۹ مربع میل ہے (مشرقی پاکستان : ۵۵،۱۲۶ مربع میل اور مغربی پاکستان : ۳،۱۰،۴۰۳ مربع میل)۔

(ب) سطح زمین

مشرقی پاکستان کا نوے فی صد حصہ ایک وسیع، ہموار اور کم بلند میدان پر مشتمل ہے، جسے اصطلاحاً گنگا کی زیریں وادی کہا جاتا ہے۔ اس کی تشکیل دریاے گنگا (=پدما)، برھم پتر (= جمنا)، میگھنا اور ان کے بیسیوں معاونین کی لائی ہوئی سیلابی مٹی سے ہوئی ہے۔ کئی ایک مقامات کی سطح سمندر سے بلندی صرف تیس فٹ ہے۔ میدان کی ڈھلان پانچ انچ فی میل سے بھی کم ہے اور اس پر دریاؤں اور ندی نالوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ ان کی بدولت میدان کئی دوآبوں میں تقسیم ہو گیا ہے، جو زرخیزی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ پدما، جمنا اور میگھنا یہاں دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا بناتے ہیں، جس کا علاقہ موسم برسات میں اکثر زیرآب رہتا ہے۔ کثرت باراں سے متعدد علاقے دلدلی

بن گئے ہیں ۔ ڈیلٹا کے زیریں حصے میں سندربن کے
مشہور عالم جنگلات ہیں ۔ علم طبقات الارض کی
رو سے اس میدان کو جدیدترین، یعنی پلائی سٹوسین
Pleistocene طبقہ قرار دے سکتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں میدانی یکسانی ہے، مگر
جنوب مشرق میں چاٹگام کی پہاڑیاں بھی ہیں، جو
آسام کے پہاڑوں اور اراکان برما کی شاخیں ہیں اور
ساحل کے قریب ایک دوسرے کے متوازی پھیلتی
چلی گئی ہیں ۔ یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں اور
اپنی چوٹی پر عموماً ۱۲۰۰ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں
ہوتیں ۔ بلندترین چوٹی کوکراڈونگ ۴،۰۳۴ فٹ
اونچی ہے ۔ ان کی ڈھلانوں پر خوب بارش ہوتی ہے،
اس لیے یہ جنگلات سے ڈھکی رہتی ہیں ۔ اس علاقے
کا سب سے مشہور دریا کرنافلی ہے، جو ان پہاڑیوں
کے درمیان بہتا ہے ۔ مجموعی حیثیت سے مشرقی
پاکستان کی زمینی سطح کا شمار مرطوب منطقے میں
ہوتا ہے ۔

علم طبقات الارض کی رو سے مشرقی اور
مغربی پاکستان کا بڑا حصہ ''جزیرہ نما''
سے باہر (Extra-Peninsula) ہے، جس میں ہمالیہ
کا مشرقی اور مغربی پھیلاؤ، نیز سندھ اور گنگا کا
وسیع میدان شامل ہے، جو کوہ ہمالیہ اور سطح مرتفع
دکن کے درمیان واقع ہے؛ البتہ پنجاب کے
دریا برآمد (alluvial) میدان کا بڑا حصہ جزیرہ نمائی
خطّے (Peninsular Block) کا جز سمجھا جاتا ہے ۔

مغربی پاکستان کا یہ منطقہ کوہ ہمالیہ
کے شمال مغربی علاقے پر مشتمل، ایک قوس کی
شکل میں پھیلا ہوا ہے ۔ کیمبری (Cambrian)
زمانے سے ابتدائی عہد ثالث (Early Tertiary Times)
تک یہ علاقہ ایک بہت بڑے سمندر ٹیتھس Tethys کا
حصہ تھا ۔ یہ سمندر جنوبی تبت سے موجودہ افغانستان،
بلوچستان اور ایران سے ہوتا ہوا جزیرہ نمائے
عمان تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس کا جنوبی ساحل
اس علاقے سے گزرتا تھا جہاں اب کوہستان نمک
ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں آج بھی سمندری چٹانیں
پائی جاتی ہیں ۔ بحر ٹیتھس کے شمال میں انگارا لینڈ
اور جنوب میں گونڈوانا لینڈ کے دو براعظم تھے۔
آہستہ آہستہ اس میں سمندری تلچھٹ کی موٹی موٹی
تہیں جمع ہوتی گئیں ۔ آخری عہد ثالث میں یہاں
ایک ارضی ہلچل پیدا ہونا شروع ہوئی، جسے
''حرکت تکوین جبال ہمالیہ'' (Himalayan Orogeny)
کہتے ہیں اور وسیع سمندری علاقے ٹوٹ پھوٹ کر
شمال اور مغرب میں سربفلک پہاڑ بن گئے ۔ یوں
ہمالیہ کا سلسلۂ کوہ وجود میں آیا ۔ اس سلسلے کا
بیشتر حصہ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے، لیکن مغربی
حصے کا رخ شمالاً جنوباً ہو گیا ہے ۔ یہ شمالاً جنوباً
قوس تین وحدتوں، یعنی ہزارہ، سلیمان اور کیرتھر
کے سلسلہ‌ہائے کوہ پر مشتمل ہے ۔ رُخ کی اس
تبدیلی کا باعث وہ فانے (wedges) ہیں جو دریائی
مٹی سے تشکیل شدہ (alluvial) میدان کے نیچے
چھپے ہوئے ہیں ۔ اسی ارضی ہلچل کے دوران میں
گونڈوانالینڈ شمال مشرق میں انگارالینڈ کی طرف
کھسکنے لگا، جس سے ٹیتھس کے درمیان سمندری
تلچھٹ میں بڑی بڑی شکنیں پیدا ہو گئیں، جنھوں
نے بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل اختیار کر لی ۔ شمالی
علاقے میں کالا چٹا پہاڑ، کوہستان نمک اور کوہاٹ
و بنوں کی پہاڑیاں ''ہمالیائی نظام تکوین جبال''
سب سے آگے کی شکنیں (advance folds) سمجھی
جاتی ہیں اور جنوبی علاقے میں سلسلۂ زندہ پیر اور
روھڑی کے جنوب میں خیرپور، نیز سندھ اور بلوچستان
کے سرحدی علاقے کی پہاڑیاں کوہ سلیمان کی ۔ اس
شکن‌دار پہاڑی، منطقے اور دکن کی سطح مرتفع کے
درمیان تلچھٹ سے بنی ہوئی چٹانوں کے دب جانے
سے قشرۃ الارض میں ایک بہت بڑا گڑھا پیدا ہو گیا،

جو بعدازاں پہاڑی دریاؤں سے لائے ہوئے مادّے سے رفتہ رفتہ پُر ہو کر ایک وسیع میدان کی شکل میں تبدیل ہوتا گیا ۔ یہی گنگا اور سندھ کا میدان ہے ۔ اس کے مغربی حصے، یعنی دریاے سندھ کے میدان، کی تشکیل میں ہواؤں سے لائی ہوئی مٹی اور ریت کا بھی بہت کچھ دخل ہے ۔ عموماً اس میدان کی ساخت میں ریت کے مہین ذرّے اور مٹی شامل ہے، لیکن پہاڑوں کے قرب و جوار میں کنکر، پتھر ملتے ہیں ۔ اس میدان کے مادّوں کی گہرائی کا اندازہ اب تک نہیں لگایا جا سکا.

اس ارضیاتی تجزیے کی روشنی میں مغربی پاکستان کو سطح کے اعتبار سے تین خطّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) پہاڑی علاقہ : یہ مغربی پاکستان کے شمال اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے : (الف) شمالی پہاڑ کوہستان ہمالیہ کی مغربی شاخیں ہیں، جن کی کئی کئی قطاریں برابر برابر فصیل کی طرح کھڑی ہیں ۔ ان میں اصل ہمالیہ کے علاوہ چترال اور مری کی پہاڑیاں اور وادی کاغان اور قبائلی علاقے کے پہاڑ شامل ہیں ۔ اصل ہمالیہ کی اوسط بلندی بیس ہزار فٹ ہے اور اس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں ۔ گلگت میں نانگا پربت کی چوٹی ۲۶،۱۸۳ فٹ اور قراقرم میں کے ٹو (K2) ۲۸،۲۵۰ فٹ بلند ہے ۔ شمال مغربی سرحد پر کوہ ہندوکش پھیلا ہوا ہے، جس کی بلندترین چوٹی تیرچ میر (۲۵،۲۶۳ فٹ) ہے ۔ برفانی پہاڑوں سے نکلنے والے دریا سارا سال خشک نہیں ہوتے ۔ زیادہ بلند مقامات پر گلیشیر موجود ہیں ۔ سارا علاقہ ناہموار ہے ۔ درّے بہت کم ہیں اور بہت بلندی پر واقع ہیں، جن کے ذریعے صرف موسم گرما ہی میں برف پگھل جانے پر آمد و رفت ہو سکتی ہے، مثلاً بابوسر، زوجیلا، لوآری، قراقرم وغیرہ؛ (ب) مغربی پہاڑی سلسلہ وادی سندھ کے مغرب کی طرف بحیرۂ عرب تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے ۔ اس میں کوہ سفید، کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر شامل ہیں، جو ہمالیہ کے مقابلے میں بہت کم بلند اور بارش کی کمی کے باعث بنجر اور خشک ہیں ۔ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی چوٹی تخت سلیمان تقریبًا گیارہ ہزار فٹ بلند ہے ۔ ان پہاڑوں میں متعدد درّے زمانۂ قدیم سے آمدورفت کا ذریعہ بنے رہے ہیں، مثلاً خیبر، کرم، گومل، ٹوچی، بولان.

(۲) میدانی علاقہ : مغربی پاکستان کا نصف مشرقی حصہ قریب قریب میدانی ہے ۔ اسے میدان سندھ کہتے ہیں کیونکہ اس میں دریاے سندھ اور اس کے معاونین—ستلج، راوی، چناب اور جہلم—بہتے ہیں (سندھ کے مغربی معاونین میں دریاے کابل مشہور ہے) ۔ دریاے سندھ کا طاس ایک وسیع میدان ہے، جو کشمیر سے بحیرۂ عرب تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے دو حصے ہیں : (الف) سندھ کا بالائی میدان : اس میں پنجاب اور بہاول پور کے علاقے شامل ہیں اور یہاں کی زمین کا بڑا حصہ بےحد زرخیز ہے ۔ دریاؤں کے درمیان دوآبوں (یعنی باری دوآب، رچنا دوآب، چج دوآب اور سندھ ساگر دوآب) میں نہروں کا جال بچھا ہے ۔ بہاول پور کے قریب یہ میدان خشک اور ریگستان کی صورت اختیار کر گیا ہے، جسے چولستان کہتے ہیں ۔ دریاے جہلم کے مغرب میں سندھ ساگر دوآب کا خاصا حصہ خشک اور ریگستانی ہے اور تھل کہلاتا ہے؛ (ب) سندھ کا زیریں میدان : اس حصے میں دریاے سندھ مٹھن کوٹ کے قریب اپنے معاونوں کا پانی لے کر بہتا ہے اور بہت زیادہ چوڑا ہو گیا ہے ۔ زمین کی ڈھلان کم ہونے کی وجہ سے رفتار بھی سست ہو گئی ہے اور یہ بڑی مقدار میں ریت مٹی وغیرہ بچھاتا چلا جاتا ہے، چنانچہ اس کی گزرگاہ بعض علاقوں میں دونوں طرف کی زمین سے اونچی ہو گئی ہے، جیسے

سیلاب سے بچانے کے لیے اس کے کناروں پر متعدد بند باندھے گئے ہیں ۔ بارش کی کمی کی وجہ سے سندھ کی زیریں وادی ریگستان بن گئی ہے، جسے زیر کاشت لانے کے لیے سکھر، کوٹری، گدو اور تونسہ سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں ۔ حیدرآباد کے پاس سندھ کا ڈیلٹا شروع ہو جاتا ہے.

(۳) سطح مرتفع کا علاقہ : اس کے بھی دو حصے ہیں : (الف) پوٹھوھار: میدان کے شمال میں، دریاے جہلم کے کنارے، تقریباً دو ہزار فٹ اونچا کوھستان نمک کا چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ مغرب کی طرف چلا گیا ہے، جس میں جگہ جگہ نمک کی چٹانیں پائی جاتی ہیں ۔ اس کے شمال میں پوٹھوھار کی سطح مرتفع ہے، جس میں راولپنڈی، کیمبل پور اور جہلم کے علاقے شامل ہیں ۔ اس کی بلندی ایک سے دو ہزار فٹ تک ہے ۔ زمین ناھموار ہے اور کٹاؤ کے باعث ہر طرف کھڈ، گڑھے اور ٹیلے نظر آتے ہیں ۔ گلیشی دور کے برف کے ذریعے لائے ہوے پتھر بھی جگہ جگہ پڑے ہیں ۔ یہ سارا علاقہ بارانی ہے ۔ اس میں مٹی کا تیل، کوئلہ اور دوسری معدنیات پائی جاتی ہیں؛ (ب) بلوچستان : کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر کے مغرب میں بلوچستان کی وسیع سطح مرتفع ہے، جو ایک سے تین ہزار فٹ تک بلند ہے ۔ آب و ہوا نہایت خشک ہونے کے باعث اس کا بہت سا حصہ بنجر اور ریگستانی ہے ۔ خشک پہاڑیاں شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن کو چاروں طرف سے پانچ سے سات ہزار فٹ تک اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے ۔ وسط میں نمکین پانی کی جھیل ہے، جس میں تمام ندی نالے آکر گرتے ہیں ۔ شمال مشرقی حصے میں کرومیم اور دیگر معدنیات ملتی ہیں ۔ ایران کی سرحد کے قریب کوہ سلطان اور کوہ تفتان آتش‌فشاں پہاڑ ہیں.

(ج) آب و ہوا

مشرقی پاکستان کے جنوب مشرقی حصے سے قطع‌نظر، جو منطقۂ حارہ میں واقع ہے، پاکستان کا پورا علاقہ منطقۂ معتدلہ میں آتا ہے، لیکن ایک ھی منطقے میں اور خط استوا سے تقریباً یکساں فاصلے پر واقع ہونے کے باوجود اس کے دونوں حصوں کی آب و ہوا میں بڑا اختلاف ہے ۔ مغربی پاکستان کا بیشتر علاقہ سمندر سے کافی فاصلے پر ہے اور اس کے شمال اور مغرب میں بہت اونچے اونچے پہاڑ ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا مجموعی طور پر شدید خشک، یعنی بری قسم کی ہے ۔ اس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی آب و ہوا بارش کی کثرت، سمندر سے قرب اور اردگرد بلند پہاڑ نہ ہونے کے باعث مرطوب اور معتدل ہے ۔ وھاں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے، نہ سردی؛ چنانچہ کم از کم درجۂ حرارت جنوری میں ۴۹ سے ۵۶° ف اور جولائی میں ۷۹ سے ۸۰° ف رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت جنوری میں ۷۵ سے ۷۸° ف اور جولائی میں ۸۶ سے ۸۹° ف ۔ زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت وھاں ۱۰۰° ف ریکارڈ کیا گیا ہے ۔ سالانہ اوسط درجۂ حرارت ۷۵ سے ۸۰° ف ہے.

مشرقی پاکستان کی بہ نسبت مغربی پاکستان کے طبعی حالات میں اس قدر تنوع ہے کہ اس کے ہر خطے کی آب و ہوا دوسرے سے مختلف ہے ۔ میدانوں میں کم از کم درجۂ حرارت جنوری میں ۴۰ سے ۵۷° ف اور جولائی میں ۷۹ سے ۸۷° ف رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت جنوری میں ۶۳ سے ۷۸° ف اور جون میں ۹۰ سے ۱۱۴° ف ۔ جیکب‌آباد میں درجۂ حرارت ۱۲۶° ف تک پہنچ جاتا ہے اور وہ دنیا کا سب سے زیادہ گرم مقام ہے ۔ مغربی پاکستان کے بیشتر علاقے میں موسم گرما کا زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۱۱۰ سے ۱۱۲° ف اور

موسم سرما کا کم سے کم درجۂ حرارت ۴۰ سے ۵۰° ف رہتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی نیچے گر جاتا ہے ۔ شمالی پہاڑوں اور بلوچستان کے بعض حصوں میں کم از کم درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی خاصا کم ہوتا ہے ۔

مشرقی پاکستان میں بارش کی سالانہ اوسط مغربی حصے میں ۵۰" سے جنوب مشرق میں ۱۰۰" تک ہے اور شمال مشرقی سلہٹ کے کوہ دامنی علاقے میں تقریباً ۲۰۰" ۔ کم سے کم بارش لال پور (راجشاهی) میں ۴۷ء۹۰" اور زیادہ سے زیادہ بارش للہ کھیل (سلہٹ) میں ۲۲۰۰۸" ریکارڈ ہوئی ہے ۔ دو تہائی بارش جون سے ستمبر تک، یعنی مون سون کے موسم میں، ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات استوائی طوفان باد بھی اس کا موجب بنتے ہیں ۔ خلیج بنگال میں اٹھنے والے طوفانوں سے برسات کا موسم کبھی کبھی اکتوبر بلکہ نومبر تک بھی جاری رہتا ہے ۔ دسمبر اور جنوری خشک مہینے ہیں اور ان میں کہیں بھی انچ، ڈیڑھ انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی ۔ مون سون شروع ہونے سے قبل اپریل اور مئی میں شمال مغربی طوفانی ہواؤں کے باعث برسات کا ایک اور مختصر موسم آتا ہے اور اس میں ۲ سے ۱۵" تک بارش ہو جاتی ہے ۔ اس زمانے میں گاھے بگاھے باد و باران کے زبردست طوفان بھی آتے ہیں، جو بعض اوقات بےحد نقصان‌دہ ثابت ہوتے ہیں ۔

مغربی پاکستان میں بالعموم بارش کی کمی رہتی ہے ۔ میدانوں میں بارش کی سالانہ اوسط سندھ کے زیریں میدان میں ۵" سے ہمالیہ کی ترائی کے علاقوں میں ۳۰" تک ہے ۔ بارش زیادہ‌تر مون سون ہواؤں کی مرہون منت ہے ۔ جو وسط گرما میں یہاں پہنچنے لگتی ہیں ۔ بعض اوقات موسم گرما کے آغاز میں جو آندھیاں چلتی ہیں ان کے بعد بھی ہلکی سی بارش ہو جاتی ہے ۔ بلوچستان خشک ترین علاقہ ہے، جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۸" ہے اور صحرائے خاران میں صرف ۲" رہ جاتا ہے ۔ ہمالیہ کی جنوبی شاخوں پر بارش ۵۰" تک، لیکن گلگت اور بلتستان جیسے پہاڑوں میں گھرے ہوئے علاقوں میں بمشکل ۴" تک ہوتی ہے ۔

بحیرۂ روم اور خلیج فارس سے اٹھنے والے طوفان اور گردباد بھی بارش لاتے ہیں ۔ ان کے باعث موسم سرما میں مغربی پہاڑوں اور شمالی بلوچستان اور علاقۂ سرحد میں ۱۰ سے ۳۰" تک سالانہ بارش ہو جاتی ہے ۔

بارش کی اس قدرتی تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرقی پاکستان میں سارا سال ہوا میں بہت زیادہ نمی رہتی ہے، جو موسم گرما میں اکثر ۸۰ فی‌صد سے بھی بڑھ جاتی ہے ۔ ادھر مغربی پاکستان میں بارش کی کمی اور درجۂ حرارت میں زیادہ تفاوت کے باعث ہوا میں رطوبت کم ہوتی ہے؛ صرف ساحلی علاقے میں زیادہ نمی پائی جاتی ہے ۔

(د) جنگلات

پاکستان میں جنگلات کا رقبہ ایک کروڑ ایکڑ سے زائد ہے، جو ملک کے کل رقبے کا تقریباً ۴ء۵ فی‌صد ہے ۔

مشرقی پاکستان اپنی معتدل آب و ہوا، کثرت باران اور زرخیز زمین کی بدولت بےانتہا سرسبز ہے اور اس کا ۱۶ فی‌صد علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے ۔ اس اعتبار سے تین علاقے بہت اہم ہیں : (۱) چاٹگام اور چاٹگام کا پہاڑی علاقہ : یہاں استوائی جنگلات ملتے ہیں، جن میں سو سو فٹ سے اونچے درختوں سے لے کر جھاڑیوں تک ہر قسم کی نباتی انواع ملتی ہیں ۔ درختوں پر چڑھنے والی بیلوں کی متعدد قسمیں بھی پائی جاتی ہیں، جو بڑی تیزی

سے بڑھتی ہیں ۔ اس سلسلے میں بطور مثال بید کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ ان جنگلوں میں عام طور پر ساگوان اور گرجن کے درخت ہیں ۔ علاوہ ازیں کئی قسم کا بانس بھی ہوتا ہے؛ (۲) سندربن، جس کا شمار ڈیلٹائی جنگلات میں ہوتا ہے ۔ سندری یہاں کا اہم‌ترین درخت ہے ۔ اس کے بعد گیوہ کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ دلدلی علاقوں میں کرنا پھیلا ہوا ہے ۔ علاوہ بریں ناریل بھی عام ہے؛ (۳) مادھوپور کا جنگل، جو دریاے میگھنا اور جمنا کے درمیان واقع ہے، یہاں کا مشہور درخت سال ہے ۔

مشرقی پاکستان میں ناریل، بانس، ساگوان، مہاگنی، سنبل، کیلا، چمپا اور کنیر کی کئی اقسام ملتی ہیں ۔ چراگاہیں بہت کم ہیں اور شمال میں کومیلا سے جنوب میں سلہٹ اور میمن سنگھ تک کے علاقوں میں ملتی ہیں ۔ دریاؤں کے کنارے گھاس کے میدان نظر آتے ہیں۔

مغربی پاکستان کا ایک بہت بڑا علاقہ بالکل خشک اور بنجر ہے ۔ صرف ۲۰۵ فی صد رقبے پر جنگل ہیں ۔ زیادہ‌تر جنگلات شمالی اور مغربی پہاڑی علاقوں میں ملتے ہیں ۔ میدانی جنگلوں میں چھانگا مانگا اور چیچا وطنی (ضلع ساہی‌وال) اور واں بھچراں (علاقۂ تھل) کے جنگلات قابل ذکر ہیں ۔ اکثر دریاؤں کے کنارے بیلے کے جنگل ہیں ۔ ان کے علاوہ نہری باغات کو بھی اس ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ میدانی علاقے میں عام طور پر شیشم، شہتوت، ببول، اور جنڈ کے درخت ملتے ہیں ۔ سندھ اور پنجاب کے علاقے میں آم، کیلا، امرود اور سنگترے، مالٹے وغیرہ کے اور شمال مشرقی بلوچستان اور سرحدی علاقے میں بادام، سیب، خوبانی، انگور وغیرہ کے باغات ہیں .

پہاڑی علاقوں میں مختلف النوع نباتات ملتی ہیں اور ان کی نوعیت علاقے کی بلندی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے، مثلاً تین ہزار فٹ سے کم بلندی پر پھلاہ، کاؤ، چنار اور جنگلی زیتون کے درخت ہیں، تین ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر چیڑ اور دیودار جیسے سدا بہار درختوں کے جنگلات ہیں، سات ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر عموماً صنوبر ملتا ہے اور دس گیارہ ہزار فٹ پر صرف برچ کے درخت رہ جاتے ہیں ۔ ان جنگلات میں متعدد قسم کی جڑی بوٹیاں اور پھول بھی ملتے ہیں ۔ اس سلسلے میں سوات کی پہاڑیاں بالخصوص قابل ذکر ہیں .

(ہ) حیوانات

پاکستان میں طرح طرح کے حیوانات پائے جاتے ہیں ۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں شیر (سندربن میں)، چیتا (سارے پاکستان، بالخصوص کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں)، برفانی چیتا (ہمالیہ کی پہاڑیوں اور چترال کی بالائی وادی میں)، چیتانما بلی (مشرقی پاکستان میں)، صحرائی بلی (مغربی پاکستان کے صحرائی علاقے میں)، بن بلاؤ (بالائی وادی سندھ، گلگت، لداخ اور چترال میں)، سیاہ‌گوش (سندھ اور پنجاب کے خشک علاقوں میں)، مشک بلاؤ (مغربی پاکستان میں)، ٹوڈی بلی (مشرقی پاکستان میں)، نیولے کی متعدد قسمیں (تقریباً ہر جگہ)، دھاری‌دار لگڑ بگڑ (پہاڑی اور ایسے خشک علاقے میں جہاں بھیڑیا نہیں ہوتا)، بھیڑیا (اکثر علاقوں میں)، لومڑی (تقریباً ہر جگہ)، سرخ لومڑی (کشمیر، لداخ، سندھ اور بلوچستان میں)، جنگلی کتے (کشمیر، وادی گنگا اور گلگت میں)، کالا ریچھ (کشمیر، بلوچستان اور جھاڑیوں، جنگلوں اور پہاڑی علاقے میں)، بھورا ریچھ (سرحدی علاقے، بالخصوص وزیرستان اور بلوچستان میں)، مختلف انواع کے بندر (ملک کے دونوں حصوں میں؛ چھوٹی دم والے بندر : مشرقی پاکستان اور چترال میں؛ سفید پیشانی اور چوٹی والے لنگور : چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں؛

آسامی بندر؛ سندر بن میں)، اود بلاؤ (پہاڑی ندیوں اور دریاؤں میں) اور بجو (صحرائی علاقے میں دریاؤں کے کنارے) ملتے ہیں - سم‌دار جانوروں میں قابل ذکر یہ ہیں: جاوا کا گینڈا اور ایک سینگ والا چھوٹا گینڈا (سلہٹ اور چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں)، ہاتھی (مشرقی پاکستان، خصوصاً کاکس بازار میں)، جنگلی بھینسا (مشرقی پاکستان میں برھم‌پتر کے آس پاس لمبی گھاس کے جنگلوں میں)، جنگلی گدھا (سندھ کے صحرائی علاقے میں)، جنگلی بھیڑ بکریوں کی کئی اقسام (ھڑیال: پنجاب کی بنجر یا جھاڑی‌دار پہاڑیوں، سندھ اور بلوچستان میں؛ بھرل: ھمالیہ کی اونچی پہاڑیوں میں؛ مارخور: بلوچستان، چترال اور سوات میں؛ غورال: سوات میں؛ جنگلی بکرا: سندھ میں)، ہرن کی مختلف قسمیں (کالا ھرن: سندھ، بہاولپور، پنجاب اور مشرقی پاکستان میں؛ چکارا: مغربی پاکستان کے صحرائی اور پہاڑی علاقے اور چاٹگام کی پہاڑیوں میں؛ نیل گائے: پنجاب اور مشرقی بنگال کے کھلے جنگل میں؛ بارہ سنگھا: کشمیر میں؛ دلدلی ہرن: سندر بن اور ڈیلٹا کے علاقے میں؛ چیتل: ھمالیہ کی ترائی کے جنگلات میں؛ مشک آھو: گلگت کے نواح میں؛ سانبھر: چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں) اور جنگلی سور (ہر جگہ) کے علاوہ چمگادڑوں اور چوھوں کی کئی اقسام، جھاؤ چوھے، سیہ وغیرہ (ملک کے دونوں حصوں میں) - پالتو جانوروں میں بھیڑ، بکری، گاے، بھینس، گھوڑا اور اونٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - دودھ دینے والے آبی حیوانات میں کراچی کے قریب ساحل سمندر اور دریاے گنگا کے دہانے پر ڈالفن مچھلی اور خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب میں وھیل ملتی ہے۔

پاکستانی پرندوں میں سے حسب ذیل عام طور پر ملتے ہیں: تیتر، تلیر، بٹیر، چکور، بگلے، حواصل، بطخیں، مرغابیاں، بلبل، گلدم، مینا، کویل، ھدھد، بئے، طوطے، کبوتر، فاختہ، مور، کوے، گھریلو چڑیاں اور مرغیاں، جنگلی مرغ، نیلکنٹھ، ابابیل وغیرہ اور شکاری پرندوں میں باز، عقاب، شکرے، چیل اور گدھ وغیرہ۔

رینگنے والے جانوروں میں گھڑیال، مگرمچھ، برّی اور بحری کچھوے، چھپکلیاں، سانڈے، گرگٹ، مختلف قسم کے زھریلے اور بے‌ضرر سانپ ملتے ہیں اور آبی جانوروں میں ہر طرح کی مچھلیاں، جن میں روھو، مہا شیر، ملّی، سنگھاڑا، مول، پلّہ، ٹراؤٹ، ھلسہ، میکریل، پومفرٹ، وغیرہ زیادہ مشہور ہیں - سمندر میں شارک بھی ہوتی ہے - بغیر ریڑھ کی ھڈی کے جانوروں میں اسفنج، جیلی فش، مونگے، گھونگھے، سیپیاں، کیکڑے اور جھینگے قابل ذکر ہیں - ان کے علاوہ پرداروں اور دیگر حشرات میں طرح طرح کی تتلیاں، بحری و بری بھونڈیاں، مکھیاں، کھٹمل، بھڑیں، چیونٹیاں، لال بیگ، شہد کی مکھیاں، ریشم کے کیڑے، بچھو، ہزار پاے، کن کھجورے، وغیرہ ملک کے تقریباً ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔

(و) قدرتی وسائل

(۱) معدنی وسائل: مغربی پاکستان میں کوھستان نمک، سطح مرتفع پوٹھوھار، وزیرستان، بلوچستان اور شمالی پہاڑی علاقے اپنی معدنی پیداوار کے لیے مشہور ہیں - مشرقی پاکستان میں بھی بعض علاقوں، خصوصاً سلہٹ، میں معدنی ذخائر دریافت ہوے ہیں - پاکستان میں ملنے والی معدنیات میں سے مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں:

کوئلہ (مغربی پاکستان: کوھستان نمک میں ڈنڈوت، پڈھ اور مکڑوال، شمال مشرقی بلوچستان میں ھرنائی، خوست، شارغ، سارپہاڑ، ڈگاری اور مچ اور وادی سندھ میں جمپیر [ضلع ٹھٹھہ]؛ مشرقی پاکستان: سنام گنج [ضلع سلہٹ] اور سب گنج [ضلع راجشاھی] - دلدلی کوئلہ فریدپور، سلہٹ اور

کوئلا ملتا ہے)؛

معدنی تیل (مغربی پاکستان: ضلع کیمبلپور میں کھوڑ، کوٹ سارنگ اور ڈھلیاں اور ضلع جہلم میں جویامیر، بلکسر، چکوال اور کرسال کے مقامات پر؛ مشرقی پاکستان: پتھاریا اور پاٹیا کے علاقے)؛

قدرتی گیس (مغربی پاکستان: بلوچستان میں بمقام سوئی؛ مشرقی پاکستان: علاقۂ سلہٹ)؛

کرومائیٹ (مغربی پاکستان: ہندو باغ، چاغی، خاران اور وزیرستان)؛

نمک (مغربی پاکستان: کھیوڑہ [ضلع جہلم]، وڑچھا اور کالا باغ؛ کراچی کے قریب ماری پور میں، نیز مشرقی پاکستان میں سمندری پانی خشک کر کے نمک حاصل کیا جاتا ہے)؛

جپسم (مغربی پاکستان: ضلع لورالائی اور کوهستان نمک)؛

گندھک (مغربی پاکستان: بلوچستان میں کوہ سلطان)؛

چونے کا پتھر (مغربی پاکستان: مغربی پہاڑ؛ مشرقی پاکستان: بھولا گنج [ضلع سلہٹ])؛

لوہا (مغربی پاکستان: کالا باغ، چترال خاران اور چاغی میں کچے لوہے کے ذخیرے ہیں)؛

علاوہ ازیں مغربی پاکستان میں سنگ مرمر (مردان، سوات، چاغی اور کالا چٹا پہاڑ [ضلع کیمبل پور] میں)، سرمہ (چترال) اور خام جست (ہزارہ، چترال، لس بیلہ اور چاغی میں) بھی دستیاب ہوتا ہے.

پاکستان میں صنعتوں کے لیے لوہے، کوئلے اور معدنی تیل جیسی خام اشیا ابھی تک درآمد کی جاتی ہیں۔ ملک میں وسیع علاقے ایسے پڑے ہیں جہاں معدنی ذخائر موجود ہیں، مگر ان کا کھوج نہیں لگایا گیا۔ اب کچھ عرصے سے اس سلسلے میں بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اور غیر ملکی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں.

(۲) طاقت کے وسائل: کوئلے اور معدنی تیل کی کمی کی صورت میں زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کے لیے پن بجلی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ مغربی پاکستان میں کچھ ایسے مقامات موجود ہیں جہاں دریاؤں اور نہروں کی آبشاروں سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ سالوں میں برقی قوت پیدا کرنے کے کئی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے، مثلاً منصوبۂ پن بجلی مالاکنڈ و درگئی، منصوبۂ پن بجلی رسول، کثیر المقاصد منصوبۂ وارسک ڈیم، منصوبۂ منگلا ڈیم۔ پنجاب میں کئی نہروں پر آبشاریں بنا کر بھی بجلی پیدا کی گئی ہے، مثلاً شادیوال (گجرات)، نندی پور (گوجرانوالہ) اور چیچوکی ملیاں اور جویانوالہ (شیخوپورہ)۔ مشرقی پاکستان کا اہم‌ترین منصوبہ کرنافلی کا ہے، جس کا بجلی گھر کپتائی کے مقام پر واقع ہے.

(ز) باشندے، آبادی اور زبانیں

زمانۂ قبل از تاریخ ہی سے برصغیر پاکستان و ہند کی شمال مشرقی اور شمال مغربی سرحدیں پار کر کے مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے ہیں۔ یہ تارکین وطن زیادہ‌تر وسطی اور مغربی ایشیا سے آئے۔ مقامی باشندوں کے ساتھ ان کے اختلاط کے باعث دراوڑی نسل وجود میں آئی۔ دراوڑوں کے بعد بھی غیر ملکی اقوام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ یہاں یکے بعد دیگرے آریا، یونانی، ایرانی، عرب، ترک اور منگول پہنچے اور آباد ہوگئے۔ رفتہ رفتہ باہمی اختلاط و ازدواج سے ان کی نسلیں بھی مخلوط ہوتی گئیں۔ بہرحال آج پاکستان کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد کا تعلق اس نسل سے ہے جسے ہندی آریا کہا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مشرقی اضلاع میں منگول

نسل کے لوگ بھی ملتے ہیں اسی طرح مغربی پاکستان کے علاقۂ قلات میں دراوڑی نسل کے افراد آج بھی موجود ہیں - بلوچوں اور پٹھانوں میں زیادہ‌تر ترکوں اور ایرانیوں، یعنی آریاؤں کی دو اہم شاخوں کے خون کی آمیزش ہے - جن باشندوں کے آبا و اجداد عرب سے آئے تھے وہ نسلی اعتبار سے سامی ہیں۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے پاکستان کی کل آبادی ۹،۳۷،۲۰،۶۱۳ تھی، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

	مرد	عورتیں	میزان
مشرقی پاکستان	۲،۶۳،۴۸،۸۴۳	۲،۴۴،۹۱،۳۹۲	۵،۰۸،۴۰،۲۳۵
مغربی پاکستان	۲،۲۹،۵۹،۸۰۲	۱،۹۹،۲۰،۵۷۶	۴،۲۸،۸۰،۳۷۸
پاکستان	۴،۹۳،۰۸،۶۴۵	۴،۴۴،۱۱،۹۶۸	۹،۳۷،۲۰،۶۱۳

۱۹۶۱ء کے بعد بعض اداروں نے آبادی کا از سر نو جائزہ لیا ہے - مرکزی دفتر اعداد و شمار (Central Statistical Office) اور ادارۂ ترقیاتی معاشیات پاکستان (Pakistan Institute of Development Economics) کے مشترکہ جائزے کی رو سے ۱۹۶۲ء میں افزائش آبادی کی شرح دونوں صوبوں میں ۲٫۶ فی‌صد تھی - موجودہ شرح کا اندازہ ۲٫۷ فی‌صد ہے - کئی ماہرین کا خیال ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم‌شماری میں آبادی کا اندراج بھی کچھ کم کیا گیا تھا - منصوبہ بندی کمیشن نے مختلف سالوں کے لیے آبادی کے حسب ذیل تخمینے پیش نظر رکھے ہیں :

۱۹۵۹ - ۱۹۶۰ء	۹،۸۸،۸۰،۰۰۰
۱۹۶۰ - ۱۹۶۱ء	۱۰،۱۴،۵۰،۰۰۰
۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ء	۱۰،۴۰،۹۰،۰۰۰
۱۹۶۲ - ۱۹۶۳ء	۱۰،۶۷،۹۰،۰۰۰
۱۹۶۳ - ۱۹۶۴ء	۱۰،۹۵،۶۰،۰۰۰
۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء	۱۱،۲۴،۱۰،۰۰۰
۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء	۱۱،۵۵،۴۰،۰۰۰
۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء	۱۲،۱۷،۶۰،۰۰۰
۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء	۱۲،۱۷،۶۰،۰۰۰
۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ء	۱۲،۲۵،۰۰،۰۰۰

اہل پاکستان کی غالب اکثریت اسلام کی پیرو ہے، لیکن یہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آباد ہیں - مذہبی اعتبار سے ہندو سب سے بڑی اقلیت ہیں اور زیادہ‌تر مشرقی پاکستان میں ہیں - اعلٰی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کی مجموعی تعداد نوے لاکھ کے قریب ہے - بدھ بھی زیادہ‌تر مشرقی پاکستان ہی میں ہیں - ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ ستر ہزار ہے - دونوں صوبوں میں عیسائیوں کی بھی خاصی تعداد ہے - پارسی صرف مغربی پاکستان میں آباد ہیں - ان کی تعداد زیادہ نہیں (صرف پانچ ہزار)، لیکن اقتصادی اعتبار سے وہ یہاں کی آبادی کا اہم عنصر ہیں - مذہبی اعتبار سے اہل پاکستان کی فی صد تعداد مندرجۂ ذیل گوشوارے سے واضح ہوگی :

مذہب	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	پاکستان
مسلمان	۸۰٫۴۳	۹۷٫۱۷	۸۸٫۸۰
اعلٰی ذات کے ہندو	۸٫۶۳	۰٫۴۸	۴٫۵۵
ہندو اچھوت	۹٫۸۲	۰٫۹۷	۵٫۴۰
عیسائی	۰٫۲۹	۱٫۳۶	۰٫۸۲
بدھ	۰٫۷۴	۰٫۰۱	۰٫۳۸
دیگر مذاہب	۰٫۰۹	۰٫۰۱	۰٫۰۵

پاکستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں - مشرقی پاکستان کی عام زبان بنگلہ ہے، البتہ بھارت سے آئے ہوئے مہاجرین (بہاری وغیرہ) اردو بولتے ہیں - مغربی پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں ہیں،

مثلاً پنجابی (جس میں سرائیکی اور پوٹھوھاری بھی شامل ھیں - بعض کی رائے میں ھندکو بھی اسی میں شامل ھے)، سندھی، پشتو، بلوچی، اور براھوئی؛ لیکن اردو ایک طرح کی ''لنگوافرانکا'' (Lingua Franca) ھے، جو بڑے پیمانے پر لکھی اور پڑھی جاتی ھے اور رابطے کی زبان کے طور پر تقریباً ھر جگہ بولی جاتی ھے - اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں ھیں، مگر دفتری زبان ابھی تک انگریزی ھے - مختلف اھم زبانوں کا آبادی کے اعتبار سے فی صد تناسب حسب ذیل ھے (اعداد و شمار ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ھیں):

زبان	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	پاکستان (اوسط)
بنگلہ	۹۸٫۴۲	۰٫۱۲	۵۵٫۴۸
*پنجابی	۰٫۰۲	۶۶٫۳۹	۲۹٫۰۲
سندھی	۰٫۰۱	۱۲٫۵۹	۵٫۵۰
پشتو	۰٫۰۱	۸٫۴۷	۳٫۷۰
**اردو (مادری)	۰٫۶۱	۷٫۵۷	۳٫۶۵
بلوچی	—	۲٫۴۹	۱٫۰۹
براھوئی	—	۰٫۹۳	۰٫۴۱
انگریزی	۰٫۰۱	۰٫۰۴	۰٫۰۲
فارسی	—	۰٫۰۷	۰٫۰۳
عربی	—	۰٫۰۱	۰٫۰۱
*** دیگر زبانیں	۰٫۹۲	۱٫۳۲	۱٫۱۰

۲ - تاریخ

(الف) قبل از اسلام

پاکستان ایک علیحدہ مملکت کی حیثیت سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا، لیکن جن علاقوں پر یہ مشتمل ھے ان کی تاریخ بہت پرانی ھے اور یہ علاقے بعض قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رھے ھیں.

(۱) مغربی پاکستان:

قدیم تہذیبیں: اگرچہ مغربی پاکستان میں قدیم ایام ھی سے متعدد قوموں اور نسلوں کے قبیلے، تاجر اور حملہ آور مغربی دروں کے راستے آ آ کر آباد ھوتے رھے ھیں، تاھم ھم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں انسانی معاشرے کی بنیاد کب پڑی۔ راولپنڈی کے نواح میں پتھر کے بعض ایسے اوزار زمین سے نکلے ھیں جنھیں ماھرین دو سے چار لاکھ سال پیشتر کا بتاتے ھیں، لیکن ایک منظم تہذیب اور آبادی کے قدیم ترین آثار موھنجوڈارو (ضلع لاڑکانہ، سندھ) اور ھڑپا (ضلع ساھیوال، پنجاب) میں پائے گئے ھیں۔ اس تہذیب کو وادی سندھ کی تہذیب کا نام دیا گیا ھے اور اس کا زمانہ تقریباً تین ھزار سال قبل مسیح سے شروع ھوتا ھے - وادی سندھ کی تہذیب سے تقریباً دو ھزار سال پیشتر کچھ دیہاتی آبادیوں کے نشانات بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں بھی ملے ھیں، لیکن برعظیم پاک و ھند میں منظم شہری تہذیب کا اولین گہوارہ سندھ کی وادی ھی ھے - وادی سندھ کے قدیم باشندے شہر آباد کرنے میں ماھر اور اعلٰی درجے کے معمار تھے - موھن جوڈارو کی سڑکیں وسیع اور کشادہ ھونے کے علاوہ بالکل سیدھی ھیں اور ان سے عمودی زاویے پر گلیاں نکلتی نظر آتی ھیں - سڑک کے دونوں طرف پانی کے نکاس کا انتظام ھے - مکانات پکی اینٹوں کے بنے ھیں - ھر مکان میں صحن ھے اور پانی نکلنے کی پکی نالیاں بنی ھوئی ھیں - تعمیری اعتبار سے سب سے نمایاں چیز غسل کا بڑا تالاب ھے، جس میں اینٹ کو اینٹ

* ان اعداد و شمار میں ھندکو (بشمول تنولی)، سرائیکی اور پوٹھوھاری بھی شامل ھیں.

** بین العلاقائی رابطے کے اعتبار سے اردو ملک کی زبانوں میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ھے.

*** جو کشمیر، لداخ اور گلگت وغیرہ سے متعلق ھیں.

پر ایسے مسالے سے جمایا گیا ہے کہ اب تک بال برابر فرق نہیں آیا ہے ۔ دشمن کے حملے اور موسمی طغیانی سے شہر کو محفوظ رکھنے کے عمدہ انتظامات ہیں ۔ ہڑپا کی بناوٹ اور طرز تعمیر بھی یہی ہے ۔ ان لوگوں کی سکونت، ضروریات اور آرائش کی بےشمار چیزیں برآمد ہوئی ہیں، جو موہن‌جوڈارو، ہڑپا، لاہور اور کراچی کے عجائب گھروں میں رکھی ہوئی ہیں ۔ ان سے ان کی اعلیٰ تہذیب اور ہنرمندی کا پتا چلتا ہے ۔ ان کے زیورات سونے، چاندی، ہاتھی دانت، ہیرے، عقیق، لاجورد اور دوسرے قیمتی پتھروں کے ہوتے تھے ۔ وہ نقاشی اور بت تراشی سے بخوبی واقف تھے، سوتی اور اونی کپڑے پہنتے تھے اور مٹی، چینی اور دھاتوں کے برتن استعمال کرتے تھے ۔ بچوں کے کھلونوں میں ایک گاڑی نکلی ہے، جس کی شکل سندھ کی بیل گاڑیوں سے ملتی جلتی ہے ۔ ان کی رسم تحریر کے نمونے بھی ملے ہیں، لیکن ہنوز پڑھے نہیں جا سکے، لہٰذا یہ بتانا ممکن نہیں کہ وہ کونسی زبان بولتے تھے ۔ ان شہروں کی کھدائی میں مختلف قسم کی مہریں بڑی تعداد میں ملی ہیں، جو غالبًا تجارتی اور دفتری کاموں میں استعمال ہوتی ہوں گی ۔ اسی قسم کی مہریں عراق میں سمیری تہذیب کے آثار سے بھی نکلی ہیں، جس کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ وادی سندھ اور وادی دجلہ و فرات میں اس قدیم عہد ماقبل تاریخ میں تجارتی تعلقات ہوں گے اور آمدورفت کا سلسلہ عام ہوگا ۔ مغربی پاکستان کے قریب قریب سارے علاقے میں (شمال مغربی سرحد کو چھوڑ کر) اس قسم کے چھوٹے بڑے شہر آباد تھے ۔ سندھ اور بہاول‌پور میں ان کے آثار کئی جگہ ملے ہیں ۔ قیاس ہے کہ اس زمانے کے لوگ دراوڑی نسل کے تھے ۔ اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ بلوچستان میں بروہی قبیلے کے لوگ اب بھی ایک ایسی زبان (براہوئی، رکّ بان) بولتے ہیں، جو دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ تہذیب آریاؤں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی اور یہاں کے جو باشندے قتل و غارت سے بچے وہ جنوب کی جانب بھاگ گئے ۔

ہندوؤں کا زمانہ : ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے لگ‌بھگ مختلف آریا قبیلوں نے یکے بعد دیگرے مغربی دروں سے داخل ہو کر مغربی پاکستان میں آباد ہونا شروع کیا ۔ ان کی ابتدائی آبادیاں گاؤں یا چھوٹے قصبوں کے طرز پر تھیں اور بیشتر دریا کے کنارے تھیں ۔ ان کی سب سے پہلی مذہبی کتاب رگ وید اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب وہ پہلے پہل آ کر پنجاب میں آباد ہوئے تھے اور یہاں سے موجودہ اترپردیش (بھارت) کے مغربی علاقے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے ۔ یہ لوگ ابھی تک فن تحریر سے ناآشنا تھے اور ان کا جتنا علم تھا وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا تھا ۔ رگ وید میں دریائے کابل اور سوات سے لے کر گنگا اور جمنا تک سب دریاؤں کا ذکر آتا ہے، جس سے آریاؤں کے ابتدائی پھیلاؤ کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ان لوگوں میں مُردوں کو دفن کرنے اور جلانے دونوں کا دستور تھا ۔ وہ عمومًا سبزی، دودھ اور گوشت استعمال کرتے تھے ۔ شکار، بیل گاڑیوں کی دوڑ، موسیقی اور رقص کا انھیں خاص طور سے شوق تھا ۔ ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم بڑی سادہ تھی ۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ رگ وید کے بعد کے زمانے میں ان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں کافی اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں ۔ ذات‌پات کی تفریق ابتدائی شکل میں ظاہر ہوئی ۔ قبائلی ریاستوں کی جگہ بڑی بڑی سلطنتوں نے لے لی ۔ پھر قصبات کے ساتھ ساتھ شہر بھی آباد ہونا شروع ہوئے ۔ انھیں بڑے شہروں میں ٹیکسلا بھی تھا، جو تجارت کی ایک اہم منڈی

ہونے کے علاوہ علم کا بھی مشہور مرکز تھا۔

چھٹی صدی ق ۔ م کے نصف آخر میں مغربی پاکستان کے بیشتر علاقے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیے گئے ۔ یہ علاقہ ایران کی وسیع سلطنت کا سب سے بڑا اور زرخیز صوبہ تھا ۔ چوتھی صدی کے وسط کے قریب جب ایران کا تسلط کمزور ہو گیا تو یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا ۔ ٣٣١ ق ۔ م میں جب سکندر نے ایران فتح کیا تو ان علاقوں کی طوائف الملوکی نے اس کے فاتحانہ عزائم کو شہ دی ۔ شمال میں گورداسپور اور جنوب میں سندھ تک کا علاقہ فتح کر کے سکندر مکران کے راستے واپس چلا گیا ۔ چوتھی صدی ق ۔ م کے ختم ہونے سے پہلے ہی مغربی پاکستان کے یونانی صوبے موریا سلطنت کا حصہ بن چکے تھے، لیکن یونانی حملے نے ان علاقوں کی تہذیب و تمدن پر گہرا اثر ڈالا ۔ بیرونی دنیا سے مغربی پاکستان کا رابطہ از سر نو شروع ہو گیا ۔ یونانی خیالات کا اثر گندھارا سنگتراشی میں اور ٹیکسلا کی مورتیوں کے لباس، چہرے کے خطوط اور بالوں کی آرائش میں صاف نظر آتا ہے ۔

موریا خاندان کا نامور فرمانروا اشوک اپنی ولی عہدی کے زمانے میں پنجاب کا وائسرائے رہا تھا ۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے بدھ مت قبول کر لیا اور اس کی تبلیغ کی زبردست کوشش کی ۔ پنجاب، شمال مغربی سرحد، کشمیر، سندھ، یہ سارے کے سارے علاقے بدھ مت سے متاثر ہوئے ۔ ٹیکسلا بدھ مت کے مذہبی علوم کا بہت بڑا مرکز بن گیا ۔ اشوک کی اس عظیم الشان کوشش کے آثار اور اثرات بدھ مت کی خانقاہوں اور بدھ کی مورتیوں میں نظر آتے ہیں، جو ٹیکسلا، پشاور، تخت بائی (ضلع پشاور) وغیرہ میں بکثرت ملتی ہیں ۔ یہ تمام آثار خاص اشوک کے زمانے ہی کے نہیں ہیں، لیکن ان کا منبع اشوک کا دور ہے ۔

خاندان موریا کے زوال پر ملک ایک بار پھر طوائف الملوکی اور بعدازاں ایران کی جانب سے بیرونی حملوں کا شکار ہو گیا ۔ ان حملوں کے ساتھ ایرانی اور یونانی تہذیبی اثرات ان علاقوں میں دوبارہ داخل ہوئے جنھیں اب مغربی پاکستان کہا جاتا ہے ۔ پہلی صدی عیسوی کے اختتام کے قریب وسط ایشیا سے آئی ہوئی کشان قوم نے شمال مغرب سے حملہ کیا اور پنجاب اور سرحدی علاقوں میں اپنی سلطنت قائم کی، جس کا صدر مقام پشاور تھا ۔

ٹیکسلا ان تمام بیرونی اثرات کی لہروں کو جو یکے بعد دیگرے آتی رہیں جذب کرتا رہا ۔ دہلی کی طرح یہ شہر کئی بار آباد ہوا ۔ گہری کھدائی کرنے پر بعض جگہ ایک ہی مقام پر اوپر تلے پانچ چھے آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں ۔ یونانی ستون، یونانی چہروں اور رومی لباس والے بت، خروشتی طرز تحریر (جو دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی ہے) کے نمونے اور بدھ مت کی بےشمار باقیات ٹیکسلا کے آثار میں موجود ہیں ۔

گپتا راجاؤں کا مغربی پاکستان کے علاقوں میں کچھ زیادہ عمل دخل نہ تھا ۔ سیالکوٹ ان کے زیر اثر ضرور تھا، لیکن جب پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ہنوں کے حملے شروع ہوئے تو مغربی صوبے بہت جلد ان کے زیر تسلط آ گئے ۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ Hiuen Tsang ٦٤١ء میں سندھ آیا تو یہاں جو راجا حکمران تھا وہ بدھ مت کا پیرو تھا اور ایک شودر خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ محمد بن قاسمؒ کے حملے کے وقت سندھ میں ایک برہمن خاندان حکمران تھا، لیکن وہاں اس وقت بھی بدھوں کی کافی آبادی تھی ۔ محمود غزنویؒ کے حملوں کے زمانے میں پنجاب اور سرحدی علاقے ہندو شاہی خاندان کے زیرنگیں تھے اور ملتان فرقۂ باطنیہ کے

مسلمانوں کے هاتھ میں تھا۔

۲ - مشرقی پاکستان:

مشرقی پاکستان کی قدیم تاریخ کے نقوش اتنے واضح نہیں جتنے مغربی پاکستان کے هیں - وهاں کی قدیم آبادی بنگ قوم پر مشتمل تھی اور انھیں کے نام پر اس ملک کا نام بنگال پڑا - آریاؤں کی آمد سے پیشتر کے حالات اور تاریخ تو ماضی کے دھندلکے میں گم ھے - خود آریاؤں کے آنے کی کوئی واضح تاریخ متعین نہیں - قیاس کہتا ھے کہ ایک هزار سال ق - م یا اس سے کچھ پیشتر یہ لوگ یہاں آنا شروع ھوے - آریاؤں کی آبادی کے بھی کئی صدیوں بعد تک کی تاریخ کے مآخذ نہایت محدود اور غیر اطمینان بخش ھیں - شمالی حصے میں ''پندر'' آباد تھے، جو بہت جنگجو تھے - ان کے حالات مہستان (ضلع بوگرہ) کے کھنڈروں سے معلوم ھوے ھیں - یہاں سے برآمد شدہ ایک کتبے سے پتا چلتا ھے کہ یہ علاقہ مگدھ کے موریا راجاؤں کے ماتحت تھا - گپتا سلطنت کے عروج کے زمانے میں بنگال بھی اس میں شامل ھوا - چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس سلطنت پر زوال آیا تو بنگال میں طوائف الملوکی پھیل گئی - آٹھویں صدی کے وسط میں گوپال نامی ایک سردار نے پال سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو اس صدی کے ختم ھوتے ھوتے پورے بنگال اور بہار پر حاوی ھو گئی - پال راجے بدھ مت کے پیرو تھے اور ان کے عہد میں اهل بنگال کی ایک بڑی تعداد اس مذھب کی پیرو ھوگئی - پال حکمرانوں نے بدھ مت کے کئی شاندار معبد بنوائے، جن کے آثار آج بھی باقی ھیں، مثلاً راجشاھی کے نزدیک پندرنگر میں (۸۰۰ء) اور کومیلا کی پہاڑیوں میناستی اور لال مائی میں (گیارھویں بارھویں صدی) - تین سو سال کے بعد ان کی سلطنت ختم ھوئی تو سین خاندان برسر اقتدار آیا، جو کٹر هندو تھا - بنگال کے لیے یہ زوال کا دور تھا - راجے نکمے، بزدل اور بےخبر تھے اور اپنی سلطنت کی بیرونی حفاظت سے بالکل لاپروا تھے - لوگوں میں کوئی قومی جذبہ تھا، نہ صحیح مذھبی احساس - بدھ مت رفتہ رفتہ کمزور ھوتا جا رھا تھا، لیکن زوال آمادہ بدھ مت کے اثرات دنیا سے بےتعلقی اور جنگ سے بیزاری کی شکل میں سارے بنگال میں سرایت کر چکے تھے - یہی سبب ھے کہ لکشمن سین کے عہد میں جنگجو اور دلیر ترکوں کی ایک نہایت مختصر جماعت نے ایک ھی دھاوے میں اتنی بڑی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔

(ب) عہد اسلامی

مسلمانوں کی آمد: عربوں کا مغربی سواحل هند سے دیرینہ تعلق تھا (سلیمان ندوی: عربوں کا فن جہازرانی)، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد بھی مسلمانوں کا برصغیر میں بسلسلۂ تجارت آنا جاری رھا (دیکھیے سلیمان ندوی: عرب و هند کے تعلقات)، لیکن سیاسی طور سے مسلمانوں کا اس سرزمین سے تعلق محمد بن قاسم کے حملے (۹۳ھ/۷۱۲ء) سے شروع ھوتا ھے، جس نے دو ڈھائی سال کے قلیل عرصے میں سندھ اور ملتان کو فتح کر کے موجودہ مغربی پاکستان کے جنوبی اور وسطی علاقوں میں اسلامی اقتدار کی بنیاد ڈالی - محمد بن قاسم نے سندھ کے لوگوں سے رواداری اور شفقت کا سلوک کیا - انھیں مندر بنانے اور اپنی مذھبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دی - ان پر هندو افسر مقرر کیے اور هندوؤں کو اپنا مشیر اور وزیر بنایا - محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد سندھ میں تقریباً دو سو سال تک عربوں کی حکومت قائم رھی - اس کے بعد اگرچہ سندھ کا خلافت بغداد سے تعلق منقطع ھو گیا، تاھم بعض عرب سردار اس کے کچھ علاقوں پر حکومت کرتے رھے۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا بڑا ریلا غزنویوں کے

حملے کے ساتھ آیا - سبکتگین کے بعد اس کے نامور فرزند محمود غزنوی (رک بآن) نے پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان شمالی علاقوں پر جو اب پاکستان کہلاتے ھیں، متعدد حملے کیے اور موجودہ مغربی پاکستان کا بیشتر حصہ اس کے زیر نگیں آ گیا - ملتان میں اس وقت قرامطہ (رک بآن) کا زور تھا - یہ ایک فرقہ تھا جو اکثر اسلامی اصولوں سے منحرف اور خلافت اسلامی کا دشمن تھا - محمود نے ملتان پر دو حملے کیے اور انھیں شکست دے کر تبدیلِ عقائد پر مجبور کیا۔

سلطنت دہلی کا قیام : چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں شہاب‌الدین (معزالدین بن سام) محمد غوری کی قیادت میں ترکوں اور افغانوں نے مغربی سرحدوں پر حملہ شووع کیا اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ تیرھویں صدی کے آغاز میں پشاور اور دیبل سے موجودہ مشرقی پاکستان کے علاقے تک ان کے جھنڈے لہرانے لگے۔

محمد غوری کی وفات (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) کے بعد اس کے سپہ سالار قطب الدین ایبک (رک بآن) نے سلطنت دہلی اور خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی، جو تقریباً اسی سال تک (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء تا ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء) برسراقتدار رھا - التتمش (رک بآن) کے زمانے میں مغربی پاکستان پر چنگیزی مغولوں کا حملہ ھوا، لیکن وہ جلال الدین منگبرتی (رک بآن) کے تعاقب میں ملتان ھی سے واپس ھو گئے - التتمش نے پنجاب اور سندھ میں مرکزی اقتدار قائم کیا - مغولوں کے پیہم حملوں سے لاھور پر بری طرح تباھی آئی تھی - بلبن (رک بآن) نے لاھور کی قلعہ بندی کی اور پنجاب اور سندھ کو مغولوں کی تباہ‌کاری سے نجات دلائی - اس نے ملتان میں اپنے ولی عہد کو وائسرائے مقرر کیا اور اسے مغربی سرحدوں کی حفاظت کا ذمےدار بنایا۔

بنگال کی فتح ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطان ایبک کے زمانے میں محمد بن بختیار خلجی کے ھاتھوں ھوئی - اس وقت سے خلجی بنگال پر قابض ھو گئے - التتمش نے بڑی کوشش سے وھاں نظم وضبط قائم کیا، مگر اس کے بعد پھر حالات خراب ھو گئے اور صوبیداروں نے خودسری اختیار کر لی، تاآنکہ بلبن نے ازسر نو بنگال میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔

خلجی اور تغلق : ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء میں دہلی میں خلجیوں کی حکومت قائم ھوئی - ان کے دور میں بنگال مرکزی اقتدار سے آزاد رھا اور وھاں کی خودمختار حکومت بلبن کے خاندان میں رھی (رک بہ بنگالہ) - بلبن کے عہد میں مغربی پاکستان کے علاقوں میں مغول حملہ‌آوروں اور دہلی کی افواج میں زبردست معرکے ھوے۔

عہد غلاماں کے بعد خلجیوں کا دور آیا - علاءالدین خلجی (۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ تا ۷۱۵ھ / ۱۳۱۶ء) بڑا مدبر سلطان تھا - اس نے ایک نیا اقتصادی نظام قائم کیا، جس کے تحت تمام ضروری اشیا کی قیمتیں سرکاری طور پر مقرر ھوئیں - اس نے ایک فوج دکن کی فتح کے لیے منظم کی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن اور جنوبی ھند پر فوج کشی کر کے وھاں کے تمام راجاؤں کو سلطنت دہلی کا مطیع اور باجگزار بنایا - علاءالدین نے ایک اور فوج صرف مغولوں کی مدافعت کے لیے تیار کی - اس نے پنجاب اور سندھ کی مغربی سرحدوں سے مغولوں کو بالکل نکال دیا اور ان علاقوں میں مکمل امن و امان اور نظم و ضبط قائم کیا - سندھ کی مقامی سیاست میں اس زمانے میں سومرہ نام کا ایک قبیلہ نمایاں تھا۔

خلجیوں کے بعد تغلق برسراقتدار آئے - اس خاندان کا بانی غیاث‌الدین تغلق (۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء

تا ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ - ۱۳۲۵ء) خلجی عہد میں دیپال پور (ضلع ساھیوال، پنجاب) کا صوبیدار تھا اور اس نے مغربی سرحدوں پر مغولوں کو بارھا شکست دی تھی - اب وہ تخت نشین ھوا - اس نے ملک بھر میں نظم و نسق اچھی طرح قائم کیا، بنگال پر چڑھائی کی اور مشرقی صوبوں کو از سرنو سلطنت میں شامل کیا - اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تغلق (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴-۱۳۲۵ء تا ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) تخت نشین ھوا - وہ خود عالم فاضل تھا اور اھل علم و ھنر کی دل کھول کر قدردانی کرتا تھا - وہ ایک سخت گیر، مگر مستعد حکمران تھا، چنانچہ اس کے زمانے میں ملک کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ھوا - اس کی بلند خیالی اور عالی ھمتی میں کوئی شبہہ نہ تھا، مگر بدقسمتی سے وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور لوگ اس کا ساتھ نہ دے سکے، اسی لیے اس کے کئی عظیم منصوبے ناکامی پر منتج ھوے (اس کے حالات کے لیے دیکھیے ضیا برنی کی تاریخ؛ ابن بطوطہ کا سفرنامہ عجائب الاسفار اور دوسری معاصر کتابیں) - بہرحال اس نے مغول لشکر کو پسپا کیا اور شمالی سرحدوں کے استحکام کی خاطر غزنہ تک یلغار کی - ممالک دکن پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے اس نے دولت آباد میں دارالحکومت منتقل کیا، جس کی بدولت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مستقل طور پر دکن میں بس گئی - سرحدِ چین کی فتح کا مہلک منصوبہ، تانبے کے سکے کا اجرا اور پھر اس کی تنسیخ، شمالی علاقوں میں قحط، وغیرہ، ایسے واقعات تھے جن کے باعث اس کا آخری عہد بڑی ابتری میں گزرا - بنگال میں بغاوت ھوئی اور یہ خطہ دو سو سال کے لیے دہلی کے تسلط سے نکل گیا - پنجاب اور سندھ میں بھی محمد بن تغلق کے زمانے میں کئی بغاوتیں ھوئیں - ۱۳۵۱ء میں محمد بن تغلق نے ایک باغی کا تعاقب کرتے ھوے ٹھٹھہ (سندھ) کے قریب جان دی - اس کے جانشین فیروز شاہ (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸-۱۳۸۹ء) نے دو بار بنگال پر فوج کشی کی، لیکن وھاں کے خودمختار سلاطین سے تسلیم و اطاعت کے رسمی دعوے سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا اور بنگال بدستور دہلی کے تسلط سے آزاد رھا - سندھ میں بھی فیروز شاہ نے ایک طویل مہم سر کی - محمد بن تغلق کے اواخر عہد میں سندھ کی مقامی سیاست میں سمہ قبیلہ سومروں پر غالب آیا - سمہ قبیلے کے جاموں نے دہلی سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا - فیروز شاہ کو اس مہم میں کامیابی ھوئی - وہ باغی جاموں کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا اور ان کی جگہ اسی خاندان کے دیگر افراد کو مقرر کیا - فیروز شاہ کے زمانے میں مغربی سرحدوں پر مغولوں نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی، لیکن کوئی بڑا حملہ نہ کر سکے - فیروز شاہ بڑا نیک دل بادشاہ تھا - اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے نظم و نسق میں بہت سی اصلاحات کیں - اس کے زمانے کے حالات شمس سراج عفیف (تاریخ فیروز شاھی) اور دوسرے مؤرخوں نے اپنی اپنی تاریخوں میں لکھے ھیں (نیز دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشی).

سید اور افغان: فیروز شاہ کے بعد سلطنت دہلی پر زوال آ گیا - اس کے جانشین نااھل ثابت ھوے اور سندھ اور پنجاب پر ان کا اقتدار براے نام رہ گیا - ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں تیمور کا حملہ ھوا اور وہ اُچ اور ملتان ھوتا ھوا دہلی تک جا پہنچا - کئی شہروں کی فاتحانہ تاراج کے بعد پنجاب سے ھوتا ھوا وہ ۱۳۹۹ء میں واپس چلا گیا - واپسی کے وقت اس نے لاھور، دیپال پور اور ملتان کی حکومت سید خضر خاں کے سپرد کر دی - تیمور کے حملے سے پنجاب اور سندھ کے علاقے خاصے تباہ ھوے - اس کے جانے کے بعد خضرخاں نے اس کے نائب السلطنت کی حیثیت سے پنجاب پر حکمرانی کی - ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں وہ دہلی پر قابض

ہو گیا اور خاندان سادات کی بنیاد ڈالی ۔ سادات کا عہد حکومت زیادہ‌تر بغاوتوں سے نمٹنے میں گزرا ۔ پنجاب میں سرکش عناصر نے سر اٹھایا اور وہ انھیں دبانے میں ناکام رہے ۔ بہلولؒ لودھی نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور بالآخر ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء میں وہ تخت دہلی پر بھی قابض ہو گیا۔

لودھی عہد میں مرکزی سلطنت کا اقتدار قدرے بحال ہو گیا، تاہم ان افغان سلاطین کا بیشتر وقت بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا ۔ ان میں سے سکندر لودھی بڑا باخبر، مدّبر اور متّقی بادشاہ تھا، مگر اس کا بیٹا ابراہیم لودھی اس کا اچھا جانشین ثابت نہ ہوا ۔ اس کی بےجا سختی سے امرا بھڑک اٹھے، جنھوں نے خفیہ طور پر بابر [رکّ بآں] کو، جو شیبانی اُزبکوں کے ہاتھوں اپنی آبائی ریاست فرغانہ سے محروم ہو کر اس وقت کابل (افغانستان) پر قابض تھا، حملے کی دعوت دی اور پانی پت کے تاریخی معرکے (۹۳۰ھ/۱۵۲۶ء) میں ہندوستان کا تخت و تاج مغلوں کے ہاتھ آ گیا۔

سلطنت بنگالہ : چودھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں دہلی کا نظم و ضبط بنگال سے اٹھ گیا تھا اور وہاں سلطان شمس‌الدین حاجی الیاس نے ایک صوبائی خودمختار سلطنت کی بنیاد ڈالی ۔ اس خاندان کے کئی بادشاہ بڑے بیدار مغز تھے اور ان کے عہد میں بنگال نے نمایاں ترقی کی ۔ اس خاندان کا ایک حکمران سلطان غیاث‌الدین (۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء تا ۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء) بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا ۔ اس کے عہد میں چین کے بادشاہ کی طرف سے ایک سفارت آئی اور غیاث‌الدین نے بھی ایک جوابی سفارت بھیجی ۔ روایت ہے کہ اس کی خواجہ حافظ شیرازی سے بھی خط و کتابت تھی ۔ کچھ عرصے کے بعد الیاس کے خاندان سے تخت و تاج چھن گیا، لیکن پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں وہ پھر تخت و تاج کے مالک ہو گئے ۔ پندرھویں صدی کے آخری ربع میں حبشی امرا نے بڑی گڑبڑ مچائی ۔ بالآخر ۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء میں سید علاءالدین حسین شاہ تخت نشین ہوا ۔ یہ خاندان شیر شاہ سوری کے عروج تک بنگال میں حکمران رہا ۔ سوریوں کے زوال کے بعد بھی بنگالہ کافی عرصے تک پٹھانوں کے ہاتھ میں رہا، لیکن ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۵-۱۵۷۶ء میں یہ پورے طور پر مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔

بنگالہ میں یہ دو ڈھائی سو سال کا زمانہ آسودگی اور ترقی کا دور تھا ۔ ملایا اور جنوبی افریقہ سے بھی تھوڑے بہت تجارتی تعلقات تھے اور بحری جہازوں کے ذریعے مال کی آمدورفت تھی ۔ بنگالہ کے خودمختار سلاطین نے کئی عالی‌شان عمارتیں بنوائیں، جن میں ادینہ مسجد (پانڈوہ)، ساٹھ گنبد مسجد (بگرہاٹ)، چھوٹا سونا مسجد (گوڑ)، دخیل دروازہ (گوڑ)، بڑا سونا مسجد (گوڑ)، قدم رسول مسجد (گوڑ) اور فیروز مینار خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ اس زمانے میں بنگالی زبان کو بھی نمایاں ترقی ہوئی اور مہابھارت کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا (مزید تفصیل کے لیے رکّ بہ بنگالہ؛ بنگلہ).

مغل بادشاہی کا آغاز: دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد بابر کو اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا ۔ اسے سب سے پہلے راجپوتوں سے نبردآزما ہونا پڑا ۔ ادھر مشرقی صوبوں میں افغان جمع ہو رہے تھے اور تخت دہلی واپس لینے کے منصوبے بنا رہے تھے ۔ بابر نے دونوں کو شکست دی، لیکن اس کے جانشین ہمایوں کی غفلت سے افغانوں کو پھر منظم ہونے کا موقع ملا اور شیر شاہ سوری کی قیادت میں وہ بہار اور بنگالہ پر قابض ہو گئے ۔ شیر شاہ نے پانچ چھے سال (۹۴۶ھ/ ۱۵۴۰ء تا ۹۵۲ھ/ ۱۵۴۵ء) کے مختصر عرصے میں سارا شمالی

ہندوستان زیرنگیں کر لیا اور نظم و نسق کے ہر شعبے میں اہم اور مفید اصلاحات کیں۔ پنجاب پر قبضہ کر کے شیرشاہ نے امن و امان قائم کیا اور گکھڑوں کی گوشمالی کی۔ جہلم سے بارہ میل کے فاصلے پر اس نے قلعۂ رہتاس تعمیر کیا تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور گکھڑ قبیلے پر بھی نگرانی رکھی جاسکے۔ بنگال میں بغاوت کا فتنہ کھڑا ہوا تو شیرشاہ نے اسے محض کچلنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایسی انتظامی تبدیلیاں کیں کہ پھر وہاں بغاوت کرنا محال ہو گیا۔ اسی بادشاہ نے وہ شاہراہ اعظم (گرانڈ ٹرنک روڈ) تعمیر کرائی جو سنار گاؤں (مشرقی بنگال) کو جہلم (مغربی پنجاب) سے ملاتی تھی۔ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد ہمایوں ہندوستان لوٹ کر آیا تو شیرشاہ کے نااہل جانشینوں سے عنان حکومت چھیننے میں اسے کوئی دقّت پیش نہ آئی (۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء)۔ دو سال بعد ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر تیرہ سال کی عمر میں کلانور (ضلع گورداسپور) میں تخت نشین ہوا.

اکبر کا پچاس سالہ دور حکومت (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) پاکستان و ہند کی تاریخ کے ممتاز ترین ادوار میں ہے۔ افغانستان سے بنگال تک اور کشمیر سے اسیرگڑھ تک اکبر نے ایک مضبوط، منظم اور خوشحال سلطنت قائم کی (تفصیل کے لیے رکّ بہ اکبر).

مغربی پاکستان، مغلوں کے دور میں: اکبر کے عہد میں شمال مغربی سرحد کافی عرصہ تک خطرے میں رہی۔ اکبر کا بھائی مرزا حکیم کابل کا خودمختار فرمانروا تھا۔ ہندوستان میں اکبر کے مخالفین کے اکسانے پر وہ پنجاب پر حملہ کر کے دہلی کے تخت پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ماوراءالنہر میں ازبک زور پکڑتے جا رہے تھے اور ان کا سردار عبداللہ خاں ہندوستان پر حملہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایران میں صفویوں کی طاقت شباب پر تھی اور ان سے بھی خطرہ لگا رہتا تھا۔ سرحد کے جنگجو قبائل بھی ہر وقت شرارت اور بغاوت کے لیے تیار رہتے تھے۔ اکبر خود ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء اور ۹۸۵ھ/۱۵۷۷-۱۵۷۸ء میں پنجاب آیا اور بلوچ اور افغان قبیلوں کی گوشمالی کی گئی۔ ۱۵۷۹ء میں مرزا حکیم نے پنجاب پر باقاعدہ حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ سرحد کے گوناگوں خطرات کے پیش نظر ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں اکبر خود لاہور آیا۔ یہیں سے وہ کابل گیا اور مرزا حکیم کو معاف کر کے اسے دوبارہ وہاں کا حاکم مقرر کیا.

۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں مرزا حکیم کی وفات سے سرحد کے معاملات اور پیچیدہ ہو گئے۔ اکبر پنجاب روانہ ہوا اور ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک لاہور میں مقیم رہ کر سرحدی قبائل میں روشنیہ تحریک [رکّ بہ بایزید انصاری] کو دبایا، کشمیر اور سندھ فتح ہو کر مغلیہ سلطنت میں شامل ہوئے۔ قندہار پر حملہ کرنے کے حوصلے پست ہو گئے۔ لاہور میں بادشاہ کے دوران قیام میں یہاں کی رونق، آبادی، عمارات اور صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اسی زمانے میں عیسائیوں کے دو مشن آئے۔ اکبر ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور انہیں گرجا تعمیر کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت دی۔ اکبر نے پنجاب کے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ ستی کی روک تھام اور ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت کے سلسلے میں احکام جاری کیے.

جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) نے تخت نشینی کے بعد چند مناسب اور مقبول عام اصلاحات کا اعلان کیا۔ اس نے عموماً اکبر کی پالیسی اور اس کے نظام حکومت کو قائم رکھا۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کی اور لاہور کا رخ کیا، لیکن بالآخر شکست کھا کر

گرفتار ہوا ۔ خسرو کو مالی امداد دینے کی پاداش میں سکھوں کے مذہبی پیشوا گورو ارجن دیو کو سزائے موت دی گئی - ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں جہانگیر راولپنڈی ہوتا ہوا کابل گیا اور وہاں سے واپسی پر لاہور میں قیام کیا ۔ جہانگیر کو کشمیر بے حد پسند تھا اور وہ کئی بار وہاں گیا ۔ جہانگیر کا نظم و نسق شروع میں بہت اچھا تھا اور وہ خود ملکی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس نے سلطنت کا کاروبار نورجہاں پر چھوڑ دیا ۔ نورجہاں نے اپنی لیاقت سے تمام کام سنبھال لیے، لیکن کچھ عرصے بعد جہانگیر کے سب سے لائق اور اولوالعزم بیٹے خرم (شاہجہان) سے اس کی ٹھن گئی ۔ سلطنت کے ممتازترین سپہ سالار مہابت خاں سے بھی اس کی نہ بن سکی ۔ اس باہمی کشمکش کا انجام یہ ہوا کہ ایران نے قندہار پر قبضہ کر لیا اور جہانگیر کے عہد میں مغل اسے واپس نہ لے سکے اور خود جہانگیر کو مہابت خاں نے جہلم پر حراست میں لے لیا، مگر نورجہاں نے اپنی فراست اور سیاست سے جہانگیر کو چھڑا لیا ۔ جہانگیر کا انتقال پنجاب میں ہوا اور وہ لاہور میں مدفون ہے ۔ اس کے عہد میں لاہور کی رونق اور خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوا ۔ نورجہاں کی مدد سے شاہزادۂ شہریار نے لاہور میں بادشاہت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن شاہجہان کا خسر (ممتاز محل کا باپ) آصف خاں بھی لاہور میں موجود تھا ۔ اس نے حالات پر پوری طرح قابو پا لیا اور تاج و تخت کو شاہجہان کے لیے محفوظ کر دیا ۔ جہانگیر کے زمانے میں نظم و نسق میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، شاہجہان نے ان کو دور کیا ۔ منصب داری نظام کی ازسر نو تنظیم کر کے فوج کی قوت اور استعداد میں اضافہ کیا ۔ شاہجہان لاہور اور کشمیر کئی بار آیا ۔ لاہور کی کئی مشہور عمارات شاہجہان اور اس کے وائسرائے وزیر خاں کے ایما سے تعمیر ہوئیں ۔ اسی عہد میں راوی سے ایک نہر نکالی گئی جس کے پانی سے شالامار باغ وغیرہ سیراب ہوتے تھے ۔ شاہجہان کو اپنے آبائی وطن ماوراءالنہر سے بڑی محبت تھی اور وہاں کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرنے کا خواہش‌مند تھا ۔ اس نے کئی بڑی بڑی مہمیں بھیجیں، لیکن ان کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ قندہار پر قبضہ ہو گیا تاہم چند ہی سال میں ایرانیوں نے قندہار پھر واپس لے لیا ۔ مغل پھر کبھی اسے حاصل نہ کر سکے اور شاہجہان کی تمام کوششیں اور مہمیں ناکام رہیں ۔

شاہجہان کی بیماری (۱۶۵۷ء) میں اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جنگ چھڑی تو پنجاب بھی اس کی زد میں آیا ۔ داراشکوہ دہلی سے فرار ہوکر پنجاب آیا ۔ سکھوں کے گورو ہررائے نے اسے امداد دی، لیکن اورنگ‌زیب کے سپہ‌سالار اس کے تعاقب میں تھے ۔ اورنگ‌زیب خود اس کے تعاقب میں لاہور اور ملتان آیا ۔ داراشکوہ لاہور، ملتان، بھکر اور مختلف مقامات میں بھاگا بھاگا پھرا، بالآخر سرحدی علاقے میں پکڑا گیا ۔

اورنگ‌زیب (۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے تقریباً پچاس سالہ عہد میں دکن اور شمال مشرق میں مغل سرحد میں توسیع ہوئی ۔ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں سرحدی علاقے میں بڑی زور کی بغاوت ہوئی ۔ اس بغاوت کے قائدین میں خوشحال خاں خٹک بھی شامل تھا، جو تلوار کا دھنی ہونے کے علاوہ پشتو کا مشہور شاعر بھی تھا ۔ اورنگ زیب کو خود اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے جانا پڑا ۔ جب بغاوت کچل دی گئی تو اورنگ زیب نے قبائلیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا ۔

اورنگ زیب کے عہد میں سکھوں کی طاقت بہت بڑھ گئی ۔ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں گورو تیغ بہادر نے

بغاوت اور سرکشی کے الزام میں سزاے موت دی گئی ۔ سکھوں میں اس اقدام سے بہت اضطراب پھیلا اور مغل حکومت سے نفرت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی ۔ تیغ بہادر کے جانشین گورو گوبند نے سکھوں کو امتیازی نشان دے کر ان میں زبردست عصبیت پیدا کی اور ان میں عسکری روح پھونک دی ۔ سکھوں کی مذھبیت پر عسکریت غالب آ گئی ۔ گورو گوبند نے اب باقاعدہ فوج رکھنا شروع کر دی اور چند قلعے بھی تعمیر کرائے ۔ اورنگ زیب اس زمانے میں دکن میں مصروف تھا ۔ اس کی غیرحاضری اور مصروفیت سے گورو نے پورا فائدہ اٹھایا ۔ اس نے قرب و جوار کی ھندو ریاستوں پر حملے کرنے شروع کیے اور مغل افواج کو بھی زک پہنچائی ۔ ان راجاؤں نے دربار دہلی سے امداد کی درخواست کی ۔ اس بار سکھوں کے خلاف باقاعدہ فوج کشی کی گئی ۔ سکھ افواج کو شکست ہوئی اور گورو گوبند بھیس بدل کر روپوش ہو گیا ۔ اس شکست سے سکھوں کی طاقت کچھ دنوں کے لیے دب گئی، لیکن ان کے فوجی اور قومی جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی.

اورنگ زیب کے بعد: ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں اورنگ‌زیب نے وفات پائی ۔ اپنی زندگی کے آخری چھبیس سال اس نے دکن میں گزارے تھے ۔ اس طویل غیر حاضری کے باعث برصغیر کے شمالی علاقوں کے نظم و نسق میں بڑی کمزوری پیدا ہو گئی تھی اور بغاوت‌پسند عناصر کو ابھرنے کا موقع مل گیا، پھر بھی اورنگ‌زیب کے نام کی دھاک قائم تھی اور مخالفین کھلم کھلا میدان میں آنے سے دبکتے تھے ۔ اس کی وفات کے بعد سارے ملک میں انتشار پھیل گیا ۔ انتشارپسند عناصر میں دو گروہ سب سے قوی ثابت ہوے : اولاً سکھ، جنھوں نے پنجاب اور سرحد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؛ ثانیاً مرھٹے، جنھوں نے مہاراشٹر سے نکل کر شمال میں پنجاب اور مشرق میں بنگال تک لوٹ مار مچا دی.

۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء میں بندا بیراگی کی قیادت میں سکھوں نے لاھور کے مضافات میں قتل و غارت شروع کر دی ۔ آٹھ نو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن بہادر شاہ نے ان حالات کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہ دی ۔ چار سال بعد اس کا انتقال ہوا تو رھی سہی آن بھی ختم ہو گئی ۔ شاہی دربار امرا کے عزائم کی بازی گاہ بن گیا ۔ وہ جسے چاھتے تخت پر بٹھاتے اور جب چاھتے اتار دیتے ۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کی طاقت اور تنظیم بہت بڑھ گئی ۔ مسلمان اور مسلمانوں کی مساجد اور مقابر ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے ۔ لاھور سے سرھند تک کوئی مقام محفوظ نہ تھا اور سکھ جو چاھتے تھے، کرتے تھے ۔ ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء میں پنجاب کے صوبیدار عبدالصمد خاں نے سکھوں کو زبردست شکست دی ۔ بندا گرفتار ہو کر مارا گیا اور سکھ کچھ عرصے کے لیے دب گئے.

بیرونی حملے: اس افراتفری میں، جو ملک میں پھیل رہی تھی، سرحد کی حفاظت کی فکر کون کرتا ۔ کابل کا صوبیدار آرام سے پشاور رہتا تھا ۔ نادر نے حملہ کیا تو اس نے سارے راستے کھلے پائے ۔ وہ لاھور آیا اور وہاں کے صوبیدار زکریا خاں کی اطاعت قبول کر کے دہلی جا پہنچا ۔ بادشاہ دہلی محمد شاہ نے سندھ پار کے تمام علاقے، یعنی سندھ، کابل اور مغربی پنجاب، نادر کے حوالے کر دیے ۔ نادر کے حملے سے سارے ملک میں بےاطمینانی پھیل گئی ۔ ان حالات میں سکھوں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی اور راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے کو کھنگال ڈالا ۔ زکریا خاں نے بڑی کوشش اور سختی سے انھیں کچلا اور ان کے قلعے مسمار کیے ۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی (رك بآن) نے ھندوستان پر پہلا

حملہ کیا ۔ اسے اس حملے پر اکسانے میں جالندھر کے صوبیدار آدینہ بیگ (رک باں) کا ھاتھ تھا ۔ ابدالی نے لاھور فتح کر کے وھاں اپنا صوبیدار مقرر کیا اور وھاں سے تیس لاکھ روپے اور بےشمار مال غنیمت لیتا ھوا دہلی چلا گیا ۔ سرھند کے پاس وزیر قمرالدین کے بیٹے میر منو نے جم کر مقابلہ کیا اور درّانی فوج کو پسپا کر دیا ۔ بادشاہ نے خوش ھو کر میر منو کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا ۔ اس کے بعد احمد شاہ نے پنجاب پر سات حملے اور کیے ۔ اس کے حملوں کا مجموعی اثر یہ ھوا کہ پنجاب میں حکومت کا وقار بالکل ختم ھو گیا ۔ پنجاب کی دولت سمٹ سمٹ کر افغان حملہ‌آوروں کے ساتھ چلی گئی اور سکھوں کو اپنی قوت بڑھانے اور لوٹ مار کرنے کا نادر موقع ھاتھ آیا ۔ کئی بار انھوں نے لاھور پر یورش کی ۔ بعض مغل حکام نے بھی ابدالی کے راستے میں دقتیں پیدا کرنے کے لیے کئی بار سکھوں کو اکسایا ۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ھے کہ ابدالی اور اس کے سپہ سالاروں نے سکھوں کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن ابدالی کے متواتر حملوں سے سکھوں کی طاقت کو فروغ بھی ھوا، اس لیے کہ ان حملوں سے جو افراتفری اور بے اطمینانی پھیلی وہ سکھوں کو راس آئی ۔ روھیلوں اور مالیر کوٹلہ کے افغانوں نے بھی خوب لوٹ مار مچائی .

پنجاب میں یونھیں بدامنی اور انتشار کی کمی نہ تھی کہ اب ایک نیا خطرہ نمودار ھوا ۔ آدینہ بیگ کے اشارے پر مرھٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور ابدالی کے حکام کو شکست دے کر لاھور پر قابض ھو گئے ۔ انھوں نے سارے صوبے سے ابدالی کے حکام کو مار بھگایا، لیکن کچھ عرصے بعد واپس چلے گئے .

۱۷۶۵ - ۱۷۶۶ء میں سکھوں نے لاھور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے ستلج تک کے سارے علاقے پر قابض ھوگئے ۔ انھوں نے امن و امان قائم کیا اور مضبوطی سے حکومت کی ۔ اگلے سال ابدالی نے اپنا آخری حملہ کیا ۔ سکھ وقتی طور سے پسپا ھو گئے، لیکن اس کے جاتے ھی پھر نکل پڑے اور چند ھی سال میں وہ کانگڑہ اور جموں سے اٹک اور ملتان تک کے سارے علاقے پر غالب آ گئے ۔ اس طرح پنجاب میں مغلوں اور افغانوں کی جنگ سکھوں کی فتح پر منتج ھوئی.

مغلیہ عہد میں پنجاب کے عام حالات : مغلوں کے عروج کا زمانہ پنجاب کے لیے بڑا اچھا گزرا ۔ زراعت کا فروغ ھوا ۔ تجارت اور صنعت کو ترقی ھوئی ۔ لاھور اور ملتان شاھراھوں کے اتصال پر واقع تھے ۔ ان دونوں شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ تجارت کی بڑی منڈی تھے ۔ امن و امان اور عام خوشحالی کے باعث زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی رونما ھوئی ۔ مغل بادشاہ ۔ اور ان کی متابعت میں مغل امرا ۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے سرپرست تھے ۔ شاھی دربار کی طرح ھر صوبیدار بلکہ ھر بڑے امیر کی بارگاہ کے ساتھ اھل علم، شعرا اور فن‌کار ضرور وابستہ ھوتے تھے ۔ مصوری کو شاھی سرپرستی میں بڑا فروغ حاصل ھوا ۔ مغل مصوری کے بعض اچھے نمونے لاھور کے عجائب گھر میں موجود ھیں ۔ علما میں ملا عبداللہ سلطان پوری اور مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی اور صوفیہ میں شیخ میاں میرؒ اور ملا شاہ قادری کے نام ممتاز ھیں ۔ مہابھارت، جوگ وششٹ، راماٸن اور نل‌دمن کے فارسی تراجم کی تیاری میں پنجاب کے کئی فضلا نے حصہ لیا ۔ پنجابی زبان کی سب سے بلند پایہ نظم وارث شاہ کی ھیر بھی مغلوں کے آخری دور کی تخلیق ھے ۔ لاھور اور ٹھٹھہ بڑے علمی مرکز تھے ۔ ایک یورپی سیاح کا بیان ھے کہ ٹھٹھہ میں چار سو سے زیادہ دارالعلوم تھے (تفصیل کے لیے رک بہ پنجاب؛ پنجابی؛ سندھ؛

سندھی)۔

بنگال عہد مغلیہ میں: مغلوں کا اقتدار قائم ہونے سے بنگال پر کئی اہم اثرات پڑے۔ ہندوستان سے بنگال کی علیحدگی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ہندوستان کی شاہراہوں کے واسطے سے وسطی اور مغربی ایشیا سے بھی بنگال کے تجارتی اور تمدنی تعلقات ازسرِ نو استوار ہوگئے۔ اسی زمانے میں مغربی اقوام نے بنگال اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کرنا شروع کیے۔ شروع شروع میں جب پرتگالیوں نے خلیج بنگال کو اپنی بحری قزاقی کا اڈا بنایا تو بنگال کی بحری تجارت یکسر ختم ہو گئی، لیکن ۱۶۶۶ء میں مغلوں نے چٹاگانگ فتح کر کے ان کا زور توڑا تو بنگال کی بحری تجارت بڑے پیمانے پر پھر شروع ہو گئی، اگرچہ یہ تمام‌تر مغربی اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ اس بیرونی تجارت کی بدولت صوبے کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور صوبے کی صنعت میں بھی ز[illegible]ت ترقی اور توسیع ہوئی۔ مغلوں کے زمانے میں بنگال میں نظم و نسق کے استحکام اور عام امن و امان کے باعث وہاں کی خوشحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور زراعت اور صنعت میں ترقی ہوئی۔ جہانگیر کے زمانے سے صوبۂ بنگال سے ایک بھاری رقم بطور سالانہ خراج کے ہر سال مرکزی خزانے میں جاتی رہی اور جب اورنگ‌زیب کے آخری زمانے میں دوسرے صوبوں سے روپیہ آنا کم و بیش بند ہو چکا تھا تو بنگال کا سالانہ خراج شاہی کیمپ کے اخراجات کا ضامن تھا۔

اکبر نے بنگال فتح کیا اور وہاں کی بغاوتوں کو دبایا، لیکن بنگال کے نظم و نسق کو جہانگیر ہی کے زمانے میں استحکام حاصل ہوا۔ صوبیدار اسلام خاں کے زمانے میں مشرقی بنگال کے بیشتر علاقے فتح ہو کر صوبۂ بنگال کا حصہ بنے۔ اس صوبیدار کے زمانے میں ڈھاکہ جہانگیر آباد کے نام سے بنگال کا صدر مقام بنا۔ اس کی ترقی اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد ایک نمایاں تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا۔ یہاں کی باریک ململ کی بیرونی ممالک میں زبردست مانگ تھی۔

جہانگیر کے بیٹے شاہجہاں نے بغاوت کا علم اٹھایا تو وہ دکن سے آ کر صوبۂ بنگال پر قابض ہو گیا؛ لیکن تھوڑے ھی عرصے بعد اس نے شاہی فوج سے شکست کھائی اور دکن واپس چلا گیا۔ شاھجہاں کے عہد میں پرتگالیوں کی دست درازیوں اور شرارتوں میں اضافہ ہوا تو انھیں شکست دے کر ان سے ھگلی چھین لیا گیا۔ شاھجہاں کی علالت پر اس کے بیٹوں میں جو خانہ‌جنگی ہوئی اس میں بنگال کے صوبیدار شاہ شجاع نے بھی صوبے کی دولت اور سپاہ کو تخت پر چڑھنے کا زینہ بنانا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کو خوش قسمتی سے شائستہ خاں اور مرشد قلی خاں جیسے لائق صوبیدار ملے۔ شائستہ خاں کے زمانے میں انگریزوں سے جنگ ہوئی۔ بالآخر معاملات گفت و شنید سے سلجھ گئے۔ شائستہ خاں نے بحری دفاع کے لیے ایک بیڑا بھی تیار کیا۔

مرشد قلی کے زمانے میں بنگال میں غیر معمولی ترقی رونما ہوئی۔ اس نے بنگال کے مالیاتی نظام کی ازسرِ نو تنظیم کی اور وہاں کی مالی آمدنی میں زبردست اضافہ کیا۔ مرشد قلی خود ایرانی تھا۔ اس زمانے میں ایران میں خلفشار پھیلا ہوا تھا، چنانچہ بہت سے ایرانی علما اور فضلا اور ممتاز لوگ ترک وطن کر کے بنگال آ گئے۔ ایک اور اعتبار سے بھی مرشد قلی کا عہد تاریخی اہمیت رکھتا ھے۔ اس نے بنگالی ہندوؤں کو دفاتر میں کثرت سے ملازم رکھا اور انھیں بڑی اسامیوں پر مامور کیا۔ بنگال کی سیاسی زندگی میں مقامی ہندوؤں کے داخلے کی یہ گویا ابتدا تھی۔

اس کے بعد کے نوابوں نے ہندوؤں کو اور بھی زیادہ اسامیاں دیں اور حکومت میں ان کا حصہ اور اقتدار برابر بڑھتا رہا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بیس سال تک مرشد قلی بنگال کا نواب، یعنی خودمختار صوبیدار، رہا۔ اس عرصے میں جب کہ سارے ملک میں ابتری پھیلتی جا رہی تھی، مرشد قلی نے صوبے کو پوری طرح قابو میں رکھا اور اندرونی امن و امان کے ساتھ صوبے کو مرہٹوں کی دست‌درازیوں سے بھی محفوظ رکھا۔ مرشد قلی نے اپنا صدر مقام مرشد آباد متعین کیا اور ڈھاکے میں ایک نائب ناظم مقرر کیا۔ اس کے بعد ڈھاکے میں ایک نائب ناظم مستقلاً رہنے لگا۔ مرشد قلی کے بعد اس کے خاندان کے دو افراد یکے بعد دیگرے صوبیدار بنے، لیکن ان کے زمانے میں حالات خراب ہو چلے۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں علی وردی خاں نے بنگال کی نوابی حاصل کی۔ علی وردی ہوشیار اور مستعد حاکم تھا، لیکن مرہٹوں کے مسلسل حملوں اور خود اس کے افغان فوجیوں کی بغاوت نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مرہٹوں کی غارتگری نے بنگال کی خوشحالی کو زبردست صدمہ پہنچایا۔ علی وردی نے اپنی فراست اور سیاست سے یورپی تجار کو صوبے کے معاملات میں دخیل نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر جگہ دی۔ علی وردی نے اپنے بڑے داماد کو ڈھاکے میں نائب ناظم مقرر کیا۔ اس کے بعد ڈھاکے میں کئی اور نائب ناظم علی وردی کے خاندان سے ہوے، لیکن آخر میں ان کی حیثیت برائے نام رہ گئی تھی۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کے بعد کوئی نائب ناظم مقرر نہ ہوا۔

علی وردی کے بعد بنگال کی نوابی اس کے نواسے سراج‌الدولہ کو ملی۔ سراج‌الدولہ نے انگریزوں کی تجارتی بدعنوانیوں اور دیگر دست‌درازیوں کے خلاف کارروائی شروع کی اور ابتدا میں اسے کامیابی بھی ہوئی، لیکن پلاسی کی تاریخی جنگ (۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) کے بعد انگریزوں کا بنگال پر غلبہ ہو گیا۔

عام حالات اور رجحانات: مغل دور میں بنگال کے عام حالات اطمینان بخش تھے۔ برطانوی عہد سے قطع‌نظر بنگال نے شاید اپنی پوری تاریخ میں امن و امان اور خوش نظمی کا اتنا طویل دور کبھی نہیں دیکھا جتنا کہ اکبر کی فتح سے مرشد قلی کی وفات تک کا زمانہ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو ترقی ہوئی اور غلہ سستا ملنے لگا؛ صنعت کو ترقی ہوئی اور اس کے باعث بیرونی تجارت کو بے‌حد فروغ ہوا؛ نتیجۃً بیرونی ممالک سے سونا چاندی کثیر مقدار میں بنگال آیا۔ ایک پرتگالی پادری نے، جو ۱۶۴۰ء میں ڈھاکے آیا تھا، لکھا ہے کہ ''ڈھاکے میں روپیے کی اتنی بہتات ہے کہ اسے گنا نہیں جاتا بلکہ تولا جاتا ہے۔ اس کے بے‌شمار بازاروں میں کھانے کی چیزیں اور دیگر اشیا افراط سے ملتی ہیں۔ اس شہر کی دولت دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے''۔ شائستہ خاں کے زمانے میں ڈھاکے کی عمارات اور رونق میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی عمارات ایک خاص طرز کی حامل ہیں، جسے شائستہ‌خانی طرز کہا جاتا ہے۔ غالباً اس کے عہد میں جنم اشٹمی جلوس کی رسم شروع ہوئی، جو ڈھاکے کے ہندو نداف اور دستکار نکالتے تھے۔ یہ جلوس دو روز متواتر نکلتا تھا اور اس میں علاوہ اور باتوں کے ڈھاکے کے فنون کی بڑی اچھی نمائش ہوتی تھی۔ مرشد قلی کے زمانے میں علوم و فنون کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ مغل عہد میں وشنومت کو بہت فروغ ہوا اور یہ امر بنگال میں ہندوؤں کے مذہبی احیا کا پیش خیمہ ثابت ہوا (مزید تفصیلات کے لیے رک بہ بنگلہ؛ بنگم).

پنجاب اور سرحد میں سکھوں کا دور

اور کمپنی کی حکومت : سکھوں نے جب لاہور اور پنجاب پر قبضہ کیا تو وہ متعدد مثلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں باہمی رقابتیں اور مناقشے چلتے رہتے تھے ۔ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کو رنجیت سنگھ کے سپرد کر کے وہ واپس چلا گیا ۔ رنجیت سنگھ نے اپنی انتظامی اور فوجی لیاقت کا سکہ جمایا اور سکھ سرداروں میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی ۔ اس نے رفتہ رفتہ چھوٹی موٹی سکھ ریاستوں کو شامل کر کے اپنا علاقہ خاصا وسیع کر لیا، لیکن ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعلان کر دیا کہ ستلج کے بائیں جانب جتنا علاقہ ہے (علاوہ اس کے جس پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو چکا تھا) وہ اس کے زیر حفاظت ہے ۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے لیے جنوب مشرق میں مزید توسیع کا راستہ بند ہو گیا ۔ اب اس نے اپنی پوری توجہ مغرب کی سمت لگا دی ۔ ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۲۰ء تک ملتان، پشاور، ڈیرہ جات اور کشمیر فتح ہو کر اس کی ریاست میں داخل ہو چکے تھے ۔ سکھوں نے پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں پر جو مظالم کیے ان کے رد عمل میں حضرت سیّد احمدؒ شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ شہید کی قیادت میں مسلمان مجاہدوں نے ایک منظم مہم شروع کی اور سکھوں سے پشاور چھین لیا؛ لیکن بالاکوٹ کی لڑائی (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) میں ان کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی ۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی ۔ اس کے جانشین نالائق نکلے ۔ سکھ فوج خودسر ہو گئی اور ستلج پار کر کے انگریزوں سے جا ٹکرائی ۔ سکھوں کا یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا ۔ ۱۸۴۹ء میں سکھ راج یکسر ختم ہوگیا اور پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوگئی (مزید تفصیلات کے لیے رکّ بہ پنجاب) .

سندھ کی خود مختار سلطنتیں : فیروز شاہ تغلق کے انتقال (۷۹۰ھ/ ۱۳۸۹ء) کے بعد سندھ بہت جلد سلطنت دہلی سے آزاد ہوگیا اور وہاں سمہ قبیلے نے ایک خودمختار سلطنت قائم کر لی ، جو ۱۵۲۰ء تک قائم رہی ۔ اس کے فرمانروا جام کہلاتے تھے اور ان کی تعداد پندرہ سے انیس تک بیان کی جاتی ہے ۔ ان میں جام سنجر اور جام نظام الدین ننداِ زیادہ مشہور ہے ۔ ننداِ کا زمانہ بڑی خوشحالی کا تھا ۔ جام ننداِ کا مقبرہ مکلی پہاڑی کی عمارتوں میں نمایاں نظر آتا ہے ۔ ملتان میں ان دنوں لنگاہ خاندان کی حکومت تھی ۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کیا اور دو تین سال کے اندر پورے سندھ پر قابض ہو گیا ۔ ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ آیا تو مرزا شاہ حسن ارغون حکمران تھا اور اس نے شکست خوردہ بادشاہ کی طرف کوئی التفات نہ کیا ۔ مغلوں کے ارغون قبیلے کے علاوہ سندھ میں اس وقت ایک اور بڑا اہم قبیلہ ترخان تھا ۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے کچھ بعد سندھ کی عنان حکومت ترخانوں کے ہاتھ میں آ گئی ۔ انھیں کے دور میں پرتگالیوں نے ٹھٹھہ کو تاراج کیا (۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء) ۔ اکبر نے جب سندھ کو پوری طرح زیر تسلط لانے کی ٹھانی تو وہاں کا حاکم مرزا جانی بیگ ترخان تھا ۔ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱- ۱۵۹۲ء میں سندھ مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا ۔ سترھویں صدی کے اوائل میں داؤد پوتہ خاندان نے شمالی سندھ میں زور پکڑا ۔ اٹھارھویں صدی میں کلہوڑا خاندان کے امیروں نے سر اٹھایا اور اورنگ زیب نے ان کی نیم خودمختار حیثیت تسلیم کر لی ۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ - ۱۷۳۷ء میں کلہوڑا پورے سندھ پر حاوی ہو چکے تھے ، لیکن اس کے بعد مغربی سرحدوں سے حملے

شروع ہوگئے اور نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، تیمور شاہ اور ان کے فوجی سرداروں کے حملوں نے سندھ کو تباہ کر دیا ۔ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۳ء میں تالپور خاندان برسراقتدار آیا، لیکن یہ دور خانہ‌جنگیوں کا شکار رہا ۔ ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں نے امیرانِ سندھ سے دوستی کا معاهده کیا، لیکن چند ھی سال بعد انہوں نے اس کی خلاف‌ورزی شروع کر دی اور بالآخر ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا (مزید تفصیلات کے لیے رک به سندھ؛ سندھی).

عہد اسلامی پر ایک نظر: برصغیر میں سلمانوں کی پہلی حکومت سندھ میں قائم ہوئی ہی، لیکن ایک مستقل اسلامی سلطنت کی بنیاد طب‌الدین ایبک نے ڈالی اور اس کا دارالحکومت ہلی قرار پایا ۔ حکومت کی نوعیت شخصی بادشاهت ، تھی، جس میں اکثر عسکریت کا رنگ غالب ھا ۔ مسلمانوں نے نہ صرف ملک میں لامرکزیت کا اتمہ کیا بلکہ نظم و نسق حکومت اور بندوبست اضی کا ایک باقاعدہ اور مستقل نظام بھی قائم کیا ۔ ں دور میں کئی ایسے بادشاہ ہوے ھیں جنھوں بڑے تدبر اور جانفشانی سے سلطنت کو استحکام، ایا کو خوشحالی اور ملک کو امن و امان بخشا؛ اسی ھندووں کے ساتھ انتہائی شفقت اور رواداری سلوک روا رکھا اور انھیں ھر طرح کے تحفظات ے ۔ برصغیر کے مسلمان بادشاھوں نے علوم و فنون جیسی سرپرستی کی، اس کی مثال تاریخ میں مشکل ، سے ملے گی ۔ ان کی قدردانی کا اس قدر شهره تھا تمام اسلامی ممالک کے اهل کمال یہاں کھچے آتے تھے ۔ علم و فن کی سرپرستی ایک ایسی روایت ، جسے عہد زوال کے فرمانروا بھی نباھتے رہے، نچه بہادرشاہ ظفر تک، لال قلعے کا لٹا پٹا دربار و شعر کا گہوارہ اور علما و شعرا کا مأمن بنا ۔ عہد اسلامی میں ابتدا ھی سے تعلیم کو خصوصی توجه کا مستحق سمجھا گیا ۔ بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات و دیہات میں بھی مدرسے قائم کیے گئے، علما و معلّمین کو فکر معیشت سے سے آزاد کیا، طلبه کے لیے وظائف جاری کیے اور ملک کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلائی ۔ سرکاری مدارس کے علاوہ ارباب خیر اور علماے دین نے بھی لاتعداد مدرسے قائم کر رکھے تھے ۔ یہاں کے بعض ادارے اپنی تعلیم و تدریس کے لیے بلادِ اسلامیه میں مشہور تھے (مثلاً لاھور میں ملّا جمال، ملّا یوسف اور ملّا عبدالسلام کے مدارس، سیالکوٹ میں ملا کمال اور ان کے نامور فرزند ملّا عبدالحکیم کا مدرسه، دہلی میں شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ مدرسه اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسۂ نظامیه) اور تحصیل علم کے لیے یہاں کثیر التعداد غیر ملکی طالب علم آتے تھے ۔ اس دور میں فنون لطیفه، بالخصوص مصوری، خطاطی اور فن تعمیر کی بےحد حوصلہ‌افزائی ہوئی ۔ عہد اسلامی کی لاتعداد یادگاریں آج بھی مسلمان فن‌کاروں کے کمال کا ثبوت پیش کر رھی ھیں ۔ اکثر سلاطین کی یه کوشش رھی که وہ یہاں ایک فلاحی مملکت قائم کریں ۔ زراعت اور کاشتکاروں کی بہبود پر ان کی خاص نظر تھی ۔ زراعت کو ترقی دینے کے لیے ایک خاص محکمه (دیوان کوھی) قائم تھا، جس کے سپرد بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور کم پانی والے علاقے میں کنویں اور نہریں اور بند تعمیر کرانے کا کام تھا ۔ قحط کے زمانے میں کاشتکاروں کو خاص طور پر مدد دی جاتی تھی ۔ ان فرمانرواؤں نے عوام کے اخلاق کی نگرانی کے لیے محکمۂ احتساب قائم کیا، جس نے شراب‌خوری، قماربازی اور چوربازاری کا سدباب کرنے کی بڑی کوشش کی ۔ لاتعداد سڑکیں، پل، تالاب، کنویں، سرائیں، مسجدیں، شفاخانے اور مدرسے بنوائے گئے ۔ درویشوں، بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں

کی اعانت وسیع پیمانے پر حکومت کی طرف سے بھی ہوتی تھی اور صاحب استطاعت افراد بھی کرتے تھے ۔ تاریخ میں سلاطین اور ان کے امرا کی فیاضی اور غریب‌پروری کی بےشمار مثالیں ملتی ہیں ۔ محکمۂ خیرات و حسنات کی طرف سے علما و طلبہ میں سرکاری وظائف تقسیم ہوتے اور لوگوں کو مدد معاش کے لیے عطیات دیے جاتے تھے ۔ مجموعی طور پر ملک دولت‌مند اور خوشحال تھا ۔ لوگوں کی یہ آسودگی زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کی مرہون منت تھی اور اس میں فرمانرواؤں کے حسن انتظام اور رعایا پروری کا بڑا حصہ تھا ۔

اسلامی سلطنت کا زوال : عہد عالمگیری میں سلطنت مغلیہ کی حدود برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھیں، لیکن اورنگ‌زیب کی وفات کے بعد اس کا شیرازہ بکھرنے میں زیادہ دیر نہ لگی ۔ اس زوال کا ایک بنیادی سبب مسلمانوں کا علمی انحطاط تھا ۔ تاتاریوں کے حملوں سے اسلامی ممالک کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ کتب خانے ضائع ہو گئے، درسگاہیں اجڑ گئیں، علما کا کوئی پرسان حال نہ رہا، تعلیم کا معیار حد درجے پست اور تحقیق و تجسس کا مادہ مفقود ہو گیا اور جدید علوم و فنون سیکھنے کا ذوق جاتا رہا ۔ اس ذہنی اور فکری زوال کا اثر ان کی عسکری قوت پر بھی پڑا ۔ بابر کے بعد طریق جنگ میں کوئی ترقی نہ ہو سکی ۔ یورپ میں فنون جنگ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں، لیکن برصغیر کے مسلمان حکمران پرانی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے تھے ۔ اس سلسلے میں ان کی بےخبری اور بےنیازی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ایک طرف تو بحریہ قائم کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی اور دوسری طرف توپ خانے کا استعمال معدودے چند لوگوں تک محدود رکھا گیا، چنانچہ اکثر انہیں اس کے لیے فرنگیوں کو ملازم رکھنا پڑا ۔

اسلامی زوال کا ایک اور بڑا سبب وہ اخلاقی کمزوریاں تھیں جو جتماعی اور انفرادی طور پر پوری قوم میں در آئی تھیں ۔ امن و امان کے طویل ادوار، سلطنت کے استحکام اور معاشی خوشحالی نے رفتہ رفتہ بادشاہ اور امرا ہی کو نہیں، عوام کو بھی سہل‌انگار اور عیش‌کوش بنا دیا ۔ اسی چیز نے بدنظمی کو راہ دی ۔ عمال حکومت کے لیے فرائض منصبی سے گریز معمول بن گیا اور اپنے معیار زندگی کو بلندتر کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہونے لگے، یہاں تک کہ ملک و ملت سے غداری بھی ان کے نزدیک کوئی جرم یا گناہ نہ رہا ۔

شخصی بادشاہتوں میں ملک کا امن و استحکام فی‌الحقیقت بادشاہ کے ذاتی کردار، حسن تدبر، شجاعت اور تدیّن پر منحصر ہوتا ہے اور کمزور اور نااہل شخص برسر حکومت آتے ہی ملک اور اہل ملک انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ برصغیر میں تخت نشینی کا کوئی مسلمہ اصول نہ ہونے کے باعث بادشاہ کی وفات پر شہزادوں اور امرا میں اکثر ٹھن جاتی تھی ۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد یہ صورت‌حال بد سے بدتر ہوتی گئی اور باہمی ناچاقیوں اور خانہ‌جنگیوں نے نظم و نسق کی بربادی کے علاوہ مرکزی حکومت کی عسکری قوت اس حد تک تباہ کر دی کہ شورش پسندوں کی معمولی ہنگامہ آرائیوں کو فرو کرنا بھی اس کے بس میں نہ رہا اور مغلوں کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو گئی ۔

(ج) برطانوی دور

انگریزوں کی آمد : ہندوستان میں یورپی اقوام پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بسلسلۂ تجارت آئیں ۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارتی کوٹھیاں جنوبی ہند کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر اور خلیج

بنگال کی بندرگاھوں میں قائم ہو گئیں اور انھوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی سیاست کا جال بھی پھیلانا شروع کیا ۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت پر تیزی سے زوال آیا اور صوبوں میں طوائف الملوکی اور افراتفری پھیلی تو مغربی اقوام میں ملک گیری کا حوصلہ پیدا ھوا اور وہ مختلف ملکی قوتوں کے ھنگامۂ مسابقت میں مدعیانِ حکومت کی معاون بن کر میدان میں اتر آئیں ۔ پرتگیز تو اپنے تشدد اور بےتدبیری کے باعث جلد ھی یہاں سے نکل گئے ۔ ولندیزی بھی کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ کر سکے ۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ایک عرصے تک آویزش جاری رھی، جس میں انگریز غالب آئے ۔ شمال میں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں، جنوب میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو اور مشرق میں علی وردی اور سراج الدولہ، وغیرہ نے بڑھتے ھوے طوفان کو روکنے کی کوشش کی، لیکن انگریزوں کو بہتر اسلحہ، بہتر فوجی نظم، اعلٰی درجے کی بحری طاقت، ایک منظم اور مضبوط سلطنت کی سرپرستی اور متعدد بےضمیر مقامی ریاستوں کی تائید کی بدولت غیر معمولی تفوق حاصل تھا؛ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک پورا ملک انگریزوں کے قبضے میں آ گیا.

ایسٹ انڈیا کمپنی: ۱۶۰۰ء میں ملکۂ انگلستان کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ وجود میں آیا، جسے برصغیر سے تجارت کا اجارہ دے دیا گیا ۔ اسی زمانے میں فرانسیسیوں نے بھی اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر برصغیر سے تجارت شروع کر دی ۔ چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور ان میں ھمیشہ جنگ جاری رھتی تھی، اس لیے بیرونی تاجروں کو ان کے باھمی جھگڑوں میں دخل دے کر اپنی طاقت بڑھانے کا آسانی سے موقع مل گیا ۔ اٹھارھویں صدی کا نصف آخر جنوبی ھند میں ان کی باھمی آویزشوں اور ریشہ دوانیوں کا زمانہ ھے، اس میں انگریز کامیاب رھے اور فرانسیسی ان کے لیے میدان خالی کر گئے.

بنگال: دکن کے بعد بنگال کی باری آئی ۔ یہ صوبہ اورنگ زیب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد خودمختار ہو گیا تھا ۔ اس کے مدبر حکمران علی وردی خاں نے جیتے جی انگریزوں کو ان کی حدود سے باھر قدم نہ رکھنے دیا ۔ اس کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ مسند نشین ھوا ۔ وہ ایک محب وطن فرمانروا تھا ۔ انگریزوں نے اس کے مخالفین اور باغیوں کو پناہ دے کر اور کلکتے میں قلعہ بندی کر کے ملکی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی کی ۔ جب نواب نے کلکتے پر چڑھائی کر کے انھیں ذلت آمیز شکست دی تو وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کرنے لگے ۔ فوجی سازوسامان اکھٹا کرنے اور دکن سے فوج منگوانے کے علاوہ انھوں نے نواب کے وزیر میر جعفر اور بعض دوسرے عمال کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جون ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر جنگ ھوئی ۔ میر جعفر کی غداری کے باعث نواب کی فوج کو شکست ھوئی ۔ میر جعفر کو گدی پر بٹھا دیا گیا اور یوں بالواسطہ طور پر بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا ۔ میر جعفر کی معزولی کے بعد نواب میر قاسم نے انگریزوں کے بڑھتے ھوے اقتدار کو روکنے کی ایک آخری کوشش کی، لیکن جنگ بکسر میں میر قاسم، شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی عسکری فوقیت کا سکہ جما دیا ۔ نوابوں اور انگریزوں کی اس کشمکش میں، بقول کے ۔ کے ۔ دت، ھندو امرا اور عمائدین نے انگریزوں کا ساتھ دیا ۔ نوابی برائے نام اب بھی قائم رکھی گئی، لیکن اصل

اقتدار کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ بکسر کے ایک سال بعد مغل بادشاہ نے بنگال کی دیوانی بھی باضابطہ طور پر انگریزوں کے حوالے کر دی۔ انھوں نے اپنی تجارت کو پھیلانے میں من‌مانی کارروائیاں کیں اور دونوں ہاتھوں سے بنگال کی دولت سمیٹی، لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا، انگلستان سے درآمدہ مال کی کھپت کے لیے یہاں کی صنعتیں پوری طرح تباہ کر دیں اور اہل حرفہ کو قلاش بنا دیا۔

دکن: دکن میں تین اہم طاقتیں تھیں: حیدرآباد، مرہٹے اور میسور۔ حیدرآباد پوری طرح انگریزوں کا وفادار تھا۔ مرہٹے اپنی باہمی ناچاقی کے باوجود اسلامی ریاستوں کو یکسر ختم کر کے برصغیر میں اپنا راج قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ میسور میں حیدر علی نے ایک مستحکم ریاست قائم کر کے حیدر آباد اور مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کو بھی میدان جنگ میں مات دی۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان نے برصغیر کو فرنگیوں کے وجود سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں اس نے کابل، ترکیہ اور فرانس کے بادشاہوں سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ انگریزوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنایا جا سکے، مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ حیدرآباد اور مرہٹے دونوں اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے انگریزوں کی ہر ممکن مدد کی۔ ادھر خود سلطان کے اپنے متعدد عمائدین غداری کر کے انگریزوں سے مل گئے۔ بالآخر سلطان جوانمردی سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور مسلمانوں کی آخری آزاد سلطنت بھی مٹ گئی۔ میسور کو ختم کرنے کے بعد مرہٹوں سے نمٹنا بھی انگریزوں کے لیے مشکل نہ رہا۔ انھوں نے ایک ایک کر کے تمام ریاستوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ امداد باہمی کے نام پر انھوں نے مقامی حکمرانوں سے ایسے معاہدے کیے جن کی رو سے وہ ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی حمایت کرنے کا وعدہ کرتے اور اس سلسلے میں وہ نہ صرف اپنے خارجہ تعلقات انگریزوں پر چھوڑ دیتے بلکہ اپنے ہاں انگریزی فوج کو اپنے خرچ پر رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مقامی حکمرانوں کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ ان کے محل سازشوں کے اڈے بن گئے، رعایا کی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتی تعیش ان کا مطمح نظر ٹھیرا اور ان کے درباروں میں کمپنی کی طرف سے مقرر کردہ مشیر (ریزیڈنٹ) اتنے بااختیار ہو گئے کہ حکمران ان کے اشارۂ ابرو کے پابند ہو کر رہ گئے۔

فتح دھلی: ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں سے جنگ ختم ہوئی تو کامیاب و کامران انگریزوں نے دوآب اور دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ دارالسطنت ہاتھ میں آ جانے کے بعد انگریزوں کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔ مغل بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے صرف لال قلعے کا مالک رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء تک یہی حالت رہی۔

سندھ: سندھ میں کلھوڑہ خاندان کے زوال کے بعد تالپور قبیلہ برسراقتدار آیا (۱۱۹۸ھ تا ۱۷۸۳ء) اور اس کے تین سرداروں نے حیدرآباد (سندھ)، میرپور خاص اور خیرپور میں اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان حکمرانوں کو میرانِ سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی نظر ایک مدت سے اس علاقے پر تھی۔ ۱۸۰۹ء میں انھوں نے میروں سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے انھیں دریاے سندھ کے راستے اپنا مال تجارت گزارنے کی اجازت مل گئی اور انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ نہ تو سندھ میں فوجی سازوسامان لائیں گے، نہ یہاں کوئی فوجی کارروائی کریں گے۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی فوج سندھ کے راستے

افغانستان بھیجی ۔ میرانِ سندھ نے جنگ افغانستان کے دوران میں نہ صرف ان کی فوجی نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی بلکہ مالی اعانت بھی کی ۔ اس احسان کا بدلہ انھیں یہ ملا کہ ۱۸۴۳ء میں چند ناواجب مطالبات کی آڑ میں چارلس نیپیئر نے زبردستی سندھ پر چڑھائی کر دی ۔ رئیسِ خیرپور نے اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر انگریزوں کی معاونت کی تھی، چنانچہ اسے ایک مختصر سے علاقے کی دیسی ریاست کا حکمران بنا دیا گیا اور باقی سارا سندھ کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا ۔ انگریزوں نے ملک گیری کے سلسلے میں شاید اس سے زیادہ مذموم اور مجرمانہ حرکت کبھی نہ کی ہو اور اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں ۔ ۱۸۴۷ء میں یہ علاقہ صوبۂ بمبئی سے ملحق کر دیا گیا ۔

پنجاب : دہلی کی فتح کے بعد انگریزوں نے دریاے جمنا اور ستلج کے درمیانی علاقے کو زیر تصرف لانے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ ان دنوں پنجاب پر رنجیت سنگھ حکومت کر رہا تھا اور کشمیر، بہاول پور، ڈیرہ جات، ہزارہ اور پشاور کے علاقے اس کے قبضے میں آ چکے تھے ۔ ۱۸۰۹ء میں عہد نامۂ امرتسر کی رو سے دریاے ستلج انگریزوں اور سکھوں کی درمیانی سرحد قرار پایا ۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھ فوج بے قابو ہوگئی ۔ چند سال کے اندر اندر اس نے چار حکمرانوں کو گدی پر بٹھایا ۔ چوتھا راجا رنجیت سنگھ کا نابالغ بیٹا دلیپ سنگھ تھا، جس کی سرپرست اس کی ماں جنداں اور وزیر لال سنگھ نے فوج کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی ۔ مدکی، سبراؤں اور فیروز شاہ کے مقامات پر یکے بعد دیگرے شکستیں کھانے کے بعد ۱۸۴۵ء میں سکھوں کو معاہدۂ لاہور پر دستخط کرنے پڑے، جس کی رو سے انھوں نے ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ (جالندھر دوآب) انگریزوں کے حوالے کر دیا اور بھاری تاوان دینے کا وعدہ کیا ۔ یہ تاوان جموں اور کشمیر کا صوبہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ فروخت کر کے ادا کیا گیا ۔ لڑائی کے بعد سکھوں میں انتقام لینے کا جوش پیدا ہوا ۔ ادھر دربار لاہور میں جو انگریز مشیر مقرر ہوا تھا اس نے کاروبار حکومت میں بے جا دخل دے کر اس جوش کو اور بھڑکا دیا ۔ ملتان کے صوبیدار مول راج نے دو انگریزوں کو قتل کر کے بغاوت کا آغاز کیا اور پھر یہ آگ پورے صوبے میں پھیل گئی ۔ گجرات اور چیلیانوالہ کی خونریز لڑائیوں نے سکھوں کی فوجی قوت ختم کر کے رکھ دی اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب اور ملحقہ سرحدی علاقے انگریزوں کی عملداری میں آ گئے ۔

برصغیر پر انگریزوں کا تسلط : اس طرح ایک ایک قوت مجروح ہو کر میدان سے ہٹتی گئی، تاآنکہ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز اپنے سیاسی جوڑ توڑ اور اعلٰی و منظم حربی قوت کے سہارے اور مقامی ریاستوں کی کمزوری اور نااتفاقی اور ان کے حکام کی خود غرضی، عیش کوشی اور ہوس جاہ و زر کی بدولت پورے بر صغیر پر مسلط ہوگئے ۔ جو ملکی گدیاں براے نام باقی رہ گئیں وہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ آخری مغل فرمانروا بھی انھیں میں شامل تھے ۔ جن قوتوں نے انگریزوں کو سہارا دے کر آگے بڑھایا تھا، وہ بھی ان کی زد سے نہ بچیں، مثلاً نظام اور مرہٹے، چنانچہ یہ لوگ یا تو بالکل مٹ گئے، یا انگریزوں کے اجیر ہو کر رہ گئے ۔

مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت، تفوق، قیادت، خوشحالی، سب کچھ جاتا رہا ۔ نئی حکومت سے بیزاری ان کے لیے فطری تھی ۔ اسلامیت اور سلطنت کے احیا کے لیے ارباب تخت و عساکر سے کچھ کرنے کی امید باقی نہیں رہی تھی، اس لیے کہ تمام امرا و

رؤسا انگریزوں سے وابستہ ہو چکے تھے، لہٰذا اب عوام کو براہ راست یہ فرض ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

فرائضی تحریک : اس سلسلے کی سب سے پہلی تحریک، جو بنگال سے شروع ہوئی، فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہے ۔ ابتدا میں یہ صرف اصلاح عقائد و عمل تک محدود تھی اور اس کے بانی حاجی شریعت اللہ عمر بھر ان مشرکانہ عقیدوں اور غیر اسلامی رسموں کی مذمت کرتے رہے جنھوں نے اسلامی معاشرے میں راہ پا کر اسے کھوکھلا کر دیا تھا ۔ ان کے بیٹے مولوی محمد محسن (دودھو میاں) کے زمانے میں اس تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کیا ۔ دودھو میاں نے چھوٹے چھوٹے مسلمان کاشتکاروں کو ہندو زمینداروں کے مظالم سے چھٹکارا دلانے کے لیے انھیں منظم کیا اور بنگال کے مختلف اضلاع میں اک گونہ متوازی حکومت کی داغ بیل ڈال دی ۔ بدقسمتی سے غرض‌پرستوں کی دراندازیوں کے باعث یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی (تفصیل کے لیے رک بہ فرائضی تحریک) .

سیّد احمد شہید کی تحریک : اصلاح و جہاد کی دوسری نمایاں تحریک وہ تھی جس کا علم سیّد احمد بریلوی نے بلند کیا ۔ مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعات کا قلع قمع اور برصغیر میں آزاد اسلامی حکومت کا قیام ان کا مطمح نظر تھا ۔ انھوں نے تھوڑی ھی مدت میں شاہ عبدالحی[؟] اور شاہ اسمٰعیل[؟] جیسے مجاہدینِ اسلام و علمبردارانِ حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کر لی جو اپنے نصب‌العین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کو اپنا دینی فرض جانتی تھی ۔ افسوس کہ یہ تحریک بھی خاص موانع کے باعث مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکی (رک بہ احمد شہید، سیّد؛ اسمٰعیل شہید، شاہ) ۔ سیّد صاحب اور ان کے رفقا ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوے شہید ہو گئے ۔ ان کی جماعت کے بقیۃ السیف افراد سرحد آزاد ھی میں مقیم رہے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی مجاھدانہ سرگرمیوں سے مسلمانان ہند کو برابر یاد دلاتے رہے کہ مسلمان کا نصب العین آزاد اسلامی حکومت کی بحالی کے سوا کچھ نہیں.

۱۸۵۷ء کا ھنگامۂ خونیں : سید احمد بریلوی[؟] کی شہادت کے بعد ہندوستان میں مختلف کارکن انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ خفیہ ایک منظم انقلاب کا سروسامان کر رہے تھے کہ اچانک کمپنی کی فوج میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے دیکھتے ھی دیکھتے ۱۸۵۷ء کے ھنگامۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی اور قومی کارکنوں کو اپنی تیاری کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا پڑا ۔ ڈھونڈو پنتھ عرف نانا صاحب اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی جیسے غیر مسلم زعما بھی اس میں شامل تھے، لیکن انھیں اپنی سلطنتیں چھن جانے کا رنج تھا ۔ مسلمان کارکنوں کے سامنے اسلامی حکومت کی بحالی اور ملک میں اسلامیت کے احیا کے سوا کوئی ذاتی غرض نہ تھی ۔ ان میں ممتاز ترین مولانا احمد اللہ مدراسی اور مولوی عظیم اللہ خان تھے ۔ اول الذکر نے ایک دوست نما تعلقدار کے ھاتھوں شہادت پائی اور آخر الذکر نے ھنگامے کے بعد روپوشی اختیار کر لی اور غالبًا ۱۸۵۹ء میں وفات پائی .

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ فوجی سپاھی پیش پیش تھے، لیکن عام شہریوں (بالخصوص مسلمانوں) نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بحیثیت مجموعی یہ مسلمانوں اور ھندووں کی طرف سے نئے حکمرانوں کو ملک سے نکال دینے کی مشترکہ اور بھرپور کوشش تھی ۔ اس کی ایک وجہ تو سیاسی تھی ۔ لارڈ ڈلھوزی نے انگریزی مقبوضات میں

انضمام ہند اضافہ کر کے سینہ زوری اور بے آئینی کا ثبوت دیا تھا، جس سے ہر طرف بدگمانی اور نفرت پھیل گئی ۔ اودھ، ستارہ، جھانسی وغیرہ کا الحاق انگریزی سلطنت میں اسی نے کیا تھا ۔ علاوہ ازیں اس نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد مغل بادشاہت ختم کر دی جائے گی اور اس کے جانشین لال قلعہ خالی کر کے مہرولی چلے جائیں گے ۔ اپنے سیاسی اقتدار کی آخری علامت ناپید ہوتے دیکھ کر مسلمانوں کو بہت رنج ہوا ۔ دوسری وجہ اقتصادی اور معاشرتی تھی ۔ انگریزوں نے ایک طرف تو جاگیریں ضبط کر کے ملک کے خوشحال طبقے کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف اپنی درآمدات میں اضافہ کرنے کی غرض سے مقامی صنعتوں کو تباہ اور مفلوج کر کے رکھ دیا ۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ عیسائی مبلغوں نے حکومت کی پشت پناہی میں تمام مذاہب کی تضحیک کرنا شروع کر دی اور عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے ترغیب، تحریص اور ترھیب کے حربے استعمال کیے ۔ چوتھے انتظامی اصلاحات کی وجہ سے قدیم طرز زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں جو لوگوں کو قبول نہ تھیں ۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ لارڈ کیننگ کے General Services Enlistment Act نے فوج میں بے چینی پھیلا دی ۔ ان سے بیرون ملک خدمات کا حلف لیا جانے لگا اور اس کے عوض فالتو عوضانہ دینے سے انکار کر دیا ۔ جن فوجیوں نے صدائے احتجاج بلند کی، ان پر انتہائی سختی کی گئی اور بعض مقامات پر انھیں گولی سے اڑا دیا گیا ۔ فوجی بغاوت کا فوری سبب یہ تھا کہ فوج کو ایسے کارتوسوں کے استعمال کا حکم دیا گیا، جن پر چربی چڑھی ہوئی تھی اور انھیں چلانے سے قبل چربی کی جھلی کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا ۔ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے کچھ سپاھیوں کو یہ کارتوس استعمال نہ کرنے کی پاداش میں دس دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ۔ ان کے ساتھیوں نے اگلی صبح بغاوت کر کے جو انگریز افسر ھاتھ آیا اسے قتل کر دیا ۔ تقریباً پانچ ھزار سپاھی دہلی پہنچ گئے اور ۱۱ مئی کو بہادر شاہ ظفر کی شہنشاھی کا اعلان کر دیا ۔ کئی مسلمان سردار، جن میں بریلی کا نامور سالار بخت خان (رک بآن) ممتاز ترین تھا، بہادر شاہ کے ساتھ مل گئے ۔ ۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو، جو ھمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں تھا، گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا ۔ لکھنؤ میں مجاھدین کی قیادت مولوی احمد اللہ نے کی ۔ ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز دوبارہ علاقۂ اودھ پر قابض ہو گئے ۔ نانا صاحب نے مولوی عظیم اللہ خان اور تانتیا ٹوپی کی معیت میں کانپور سے مقابلے کا علم بلند کیا، مگر ھیولاک نے انھیں شکست دی ۔ اسی طرح ھندوستان کے شمالی اور وسطی علاقوں میں جو شورشیں ہوئیں وہ ۱۸۵۸ء کے آخر تک فرو ہو گئیں .

تحریک انقلاب کی ناکامی کے کئی اسباب تھے : ھندوستانیوں میں تنظیم، اتحاد اور منصوبہ بندی کا فقدان تھا ۔ ان کے پاس اسلحہ بھی مقابلۃً ناقص تھے ۔ ڈاک اور تار جیسے اھم وسائل اطلاعات انگریزوں کے قبضے میں تھے، جن کی وجہ سے وہ ھر محاذ کے بارے میں باخبر رھتے تھے ۔ انقلابیوں کو اعلٰی درجے کے جرنیل بھی میسر نہ تھے ۔ وہ ھر جگہ لوگوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے، بلکہ اکثر مقامات پر خود مقامی رؤسا نے انگریزوں کی حمایت کی ۔ اکثر ھندوستانی ریاستوں، مثلاً گوالیار، حیدر آباد، نیپال اور پنجاب کے سکھوں نے ان کی پوری مدد کی اور افغانستان کے امیر دوست محمد نے بھی اس موقع پر انھیں تنگ کرنے سے اجتناب کیا.

۱۸۵۷ء کا ھنگامۂ خونیں اپنی ناکامی کے

باوجود بہت اہم ہے ۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ کمپنی کی گرفت ملک پر کمزور ہے اور حکمرانوں کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۸۵۸ء نے کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان براہ راست ملکۂ انگلستان کی عملداری میں شامل کر لیا گیا ۔ لارڈ کیننگ پہلا وائسرائے مقرر ہوا؛ برطانوی مجلس وزرا میں وزیر مملکت برائے ہندوستان کا تقرر عمل میں آیا، جو پندرہ ارکان کی مجلس مشاورت کا سربراہ تھا اور ملکہ کے اعلان میں مقامی باشندوں کے جان و مال اور حقوق کی پوری نگہداشت کا یقین دلایا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو بالخصوص انگریزوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا ۔ ان کی املاک ضبط ہوئیں اور اوقاف چھین لیے گئے ۔ انھیں ملازمتوں سے علیحدہ رکھا گیا ۔ معاشی ترقی کی تمام راہیں ان پر بند کر دی گئیں ۔ ہزاروں نے پھانسیاں پائیں ،، میدان جنگ میں ہلاک ہو گئے اور سینکڑوں کو کالے پانی بھیج دیا گیا ۔ مسلمانوں کی برتری کا زمانہ ختم ہوا ۔ ان میں خوف، بددلی اور مایوسی پھیل گئی ۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں نے بہت جلد حالات سے سمجھوتا کر لیا اور وہ تعلیم، تجارت اور ملازمتوں میں ترقی کرنے لگے۔

مسلمانان ہند کے احیا کی تحریکیں: حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوجود مسلمان رہنما اس کوشش میں لگے رہے کہ عوام کو بہتر مسلمان بنا کر منظم کر دیں تا کہ وہ اپنی زائل شدہ حیثیت دوبارہ حاصل کر لیں ۔ اس سلسلے میں مختلف نوعیت کی متعدد تحریکیں جاری ہوئیں، مثلاً (۱) تبلیغی، جس کے علم بردار مولوی کرامت علی جونپوری تھے ۔ انھوں نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی مذہبی بیداری کے لیے ان تھک کوششیں کیں (رک بہ کرامت علی)؛ (۲) دینی تعلیم، جس کی داغ بیل دارالعلوم دیوبند کی شکل میں پڑی ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اس کے قائد تھے؛ (۳) سیاسی، جسے عام طور پر وہابی تحریک کہا جاتا ہے ۔ یہ تحریک سید احمد بریلویؒ کے خلفا و مریدین نے منظم کی ۔ اس کی غرض یہ تھی کہ ہندوستان میں دعوت و جہاد کا سلسلہ جاری رہے تا کہ یہاں سے روپیہ اور مجاہدین برابر سرحد آزاد میں ستھانہ کے مقام پر ان کے مرکز میں پہنچتے رہیں ۔ سب سے زیادہ قربانیاں اسی جماعت کو دینا پڑیں ۔

سر سید کی تعلیمی تحریک: مسلمانوں کے سامنے ملکی و ملی مقاصد کے لیے غیر مسلموں سے اتحاد اور ان کے ساتھ مل کر سعی و جد و جہد کی صورت اس لیے باقی نہ رہی تھی کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں کے آغاز تسلط ہی میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا ۔ سکھوں اور مرہٹوں نے اپنی اغراض کے لیے فرقہ پرستی کی جو آگ بھڑکائی تھی وہ ملک میں شدید تفرقے کا باعث بن گئی، جس سے انگریزوں کے لیے قیام و استحکام حکومت میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزی حکومت کا مسلمانوں پر خصوصی عتاب اور مسلمانوں کا حکومت سے عدم تعاون اور اس کے مقابلے میں حکومت اور غیر مسلم عناصر کا باہمی تعاون روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکا تھا ۔ مسلمان نہ اپنے آپ کو بدلنے پر تیار تھے، نہ حالات کو بدلنے پر قادر تھے ۔ ان کا مستقبل روز بروز تاریک ہوتا جا رہا تھا ۔ انگریزوں کے ماتحت نظم و نسق، تجارت اور انتفاع کے دوسرے وسائل پر غیر مسلم قابض ہو چکے تھے ۔ اس نازک موقع پر سر سید (رک بہ احمد خان) آگے بڑھے ۔ انھوں نے حکومت وقت کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کی

سیاسی و معاشی بحالی کی کوشش کی ۔ سر سید نے مغربی تعلیم اور خصوصاً سائنس کی اهمیت کی طرف مسلمانوں کو توجه دلائی، جس کے بغیر وہ نظم و نسقِ ملک میں اپنی جگه لینے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے اهل نه بن سکتے تھے ۔ ان کے رفقاے کار میں محسن الملک، وقارالملک، مولوی چراغ علی، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد اور خواجه الطاف حسین حالی کے نام خاص طور سے قابل ذکر هیں ۔ ان مصلحین کے ساتھ مسلمانوں کی مذهبی، علمی، ادبی اور سیاسی احیا کی وہ همه گیر تحریک وابسته هے جسے علی گڑھ تحریک کہتے هیں ۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک سکول جاری کیا گیا، جو دو سال بعد کالج میں (اور ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی میں) تبدیل هو گیا ۔ سر سید نے ایک طرف تو انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی (دیکھیے رسالۂ اسباب بغاوت هند) اور دوسری طرف مسلمانوں کو تلقین کی که وہ انگریزوں سے مغایرت چھوڑ کر ان کے طرز فکر و معاشرت کا مطالعه کریں (دیکھیے احکام طعام اهل کتاب، وغیرہ) ۔ انھوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کو علومِ جدیده سے هم‌آهنگ کرنے کی سعی کی ۔ بعض لوگوں کی مخالفت کے باوجود علی گڑھ کالج کو بهت مقبولیت حاصل هوئی اور جلد هی یه بر صغیر کے مسلمانوں کا مرکزی اداره بن گیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس: سر سید کی خواهش تھی که مسلمان سیاسی بحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجاے اپنی تعلیمی ترقی میں کوشش کریں، چنانچه ۱۸۸۶ء میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی، جسے جلد هی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا ۔ اس کے سالانه اجلاس بڑے بڑے شہروں میں هوتے اور مسلمانوں کے رهنما جمع هو کر قومی اور تعلیمی ترقی کے مسائل پر غور و خوض کرتے ۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے یه کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی خیالات کے اظهار کا واحد ذریعه تھی ۔

سر سید کی تعلیمی تحریک کے اثرات بهت دور دور تک پھیلے ۔ شبلی نعمانی نے، جو پہلے علی گڑھ تحریک هی میں شامل رهے تھے، لکھنؤ میں ندوة العلماء کی بنیاد رکھی اور اس کے نصاب میں مذهبی اور مغربی علوم کو سمونے کی کوشش کی۔ بنگال میں نواب عبداللطیف کی مساعی سے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا هوا ۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر مذهب سے جو بے‌رخی پیدا هونے لگی تھی اس کی اصلاح میں سید امیر علی نے بڑا کام کیا ۔ ان کی نگارشات نے انگریزوں اور انگریزی زده لوگوں کی نگاه میں اسلام اور اسلامی تاریخ و ثقافت کی توقیر بڑھائی ۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام، لاهور، قائم هوئی جو اغراض و مقاصد کے اعتبار سے علی‌گڑھ تحریک هی کی ایک شاخ تھی۔

هندو تحریکیں: هنود، خصوصاً بنگالی هندوؤں نے انگریزی‌تعلیم حاصل کرنے میں سبقت کی اور دوسروں سے پہلے مغربی خیالات اور تهذیب کے زیراثر آئے ۔ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا ۔ کارنوالس کے دوامی بندوبست نے ایک طرف مسلمانوں کو تباه کیا تو دوسری طرف هندو زمینداروں کا ایک خوشحال طبقه پیدا کیا جو انگریزی حکومت کا حامی اور مددگار تھا ۔ رفته رفته هندوؤں پر انگریزی تعلیم اور مغربی تهذیب کا اثر مترتب هونے لگا ۔ ان کے یہاں خیالات کا ایک نیا دھارا بهنے لگا، جس میں مغرب کی وسیع المشربی کے ساتھ مذهبی احیا کا جذبه ملا هوا تھا ۔ اس تحریک کے بانی راجه رام موهن راے (۱۷۷۴ تا ۱۸۳۳ء) تھے ۔ وہ سنسکرت کے

ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے بھی عالم تھے اور ان کے خیالات میں اسلام کا اثر صاف نظر آتا ہے ۔ وہ ایک خدا کے قائل تھے اور بت پرستی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف تھے ۔ وہ ہندوؤں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کے حامی تھے اور دوسرے مذاہب کو بھی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ اس تحریک نے آگے چل کر برہمو سماج کی شکل اختیار کی ۔ کیشب چندر سین کی قیادت میں یہ تحریک خالص خدا پرستی کی تحریک ہو گئی ۔ اس کی رو سے تمام مذاہب کی کتابیں یکساں طور پر مقدس تھیں ۔ کیشب چندر تعلیمی اور سماجی اصلاح کے پر زور حامی تھے ۔ اس کی چند شاخیں پنجاب اور سرحد میں بھی قائم ہوئیں ۔ پنجاب میں سردار دیال سنگھ مجیٹھیا اس کے سرگرم حامی تھے ۔ ان کی روشن خیالی اور وسیع المشربی کی یادگار دیال سنگھ کالج لاہور کی صورت میں اب بھی قائم ہے ۔ اس کے بالکل برعکس جارحانہ رد عمل کے طور پر آریا سماج تحریک شروع ہوئی ۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ تا ۱۸۸۳ء) تھا ۔ اس نے ویدوں کو ہندو دھرم کی بنیاد قرار دیا اور ہنود کو ویدوں کی پیروی کی تلقین کی ۔ وہ توحید کا قائل تھا اور اسے ویدوں سے ثابت کرتا تھا اور ذات پات کے خلاف تھا ۔ اس کی تعلیمات نے ہندوؤں میں ایک جارحیت پسندانہ عصبیت کی پرورش کی ۔ آریا سماج تحریک ۱۸۷۵ء میں قائم ہوئی اور بہت جلد شمالی ہندوستان میں پھیل گئی ۔ لالہ ہنس راج اور لالہ لاجپت رائے اس کے زبردست کارکنوں میں تھے ۔ لاہور کا ڈی ۔ اے ۔ وی ۔ کالج اس تحریک کے زیراثر قائم کیا گیا تھا ۔ آریہ سماج کے بعد جنوبی ہند میں تھیاسوفیکل سوسائٹی قائم ہوئی، جس کا مقصد ہندو فلسفے اور ویدک تعلیمات کا پرچار تھا ۔ اس کا اثر پڑھے لکھے ہندوؤں نے سب سے زیادہ قبول کیا اور ان کے ذہن میں ایک ایسے ہندوستان کا خاکہ بس گیا جس میں ہندوؤں کے سوا کسی اور قوم کی گنجائش نہ تھی ۔ ہندو عصبیت کی اس بیداری کا بر صغیر کی سیاست پر، خصوصاً ان علاقوں پر جن پر پاکستان اب مشتمل ہے، دور رس اور دیرپا اثر پڑا ۔ انیسویں صدی میں ہندی اردو کا مناقشہ اسی کا شاخسانہ تھا ۔ یہی طرز فکر تھا جو بعد میں ایک طرف بال گنگا دھر تلک جیسے تشدّد پسند اور دوسری طرف مدن موہن مالویہ جیسے اعتدال پسند ہندو رہنماؤں کے افکار میں نمودار ہوا اور جس نے برصغیر میں صحیح قومی اتحاد کا قیام ناممکن بنا دیا ۔

پاکستان کے واضح تصور سے پہلے کے واقعات :

سیاسی بیداری : مغربی تعلیم کی ترویج کے ساتھ ساتھ برصغیر میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھیلنا شروع ہوئی ۔ اس کا آغاز ایک محدود اور مختصر طبقے سے ہوا، جو انگریزی تعلیم سے فیض‌یاب ہو کر مغربی سیاسی نظریات سے آگاہ اور متأثر تھا، عموماً خوشحال بھی تھا اور اعلٰی ملازمتوں میں اور ملکی معاملات میں اپنے حصّے کا طلبگار تھا ۔ بہر حال ان لوگوں کی دولتِ برطانیہ سے وفاداری پوری طرح مستحکم تھی ۔

حکومت برطانیہ نے برصغیر میں اپنی بنیادیں مضبوط کر لینے کے بعد یہاں آئینی اصلاحات جاری کرنے کا بندوبست کیا، جن کا آغاز لارڈ کیننگ کے عہد ہی میں ہو گیا تھا ۔ اکثر انگریز افسر نسل و رنگ کے تعصب کی بنا پر ہندوستانیوں کو اپنے برابر اور نظم و نسق کا اہل نہیں سمجھتے تھے، تاہم ان میں بعض ایسے آزاد خیال افراد بھی موجود تھے جو ہندوستانیوں کو تھوڑے بہت آئینی حقوق دینے کے حق میں تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا دل ہی دل میں کڑھنا

ٹھیک نہیں، لہٰذا ان کے لیے جی کی بھڑاس نکالنے کا انتظام ہونا چاہیے؛ چنانچہ ان کی سرپرستی میں چند ممتاز ہندو لیڈروں نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی ۔ ابتدا میں پارسی اور مسلمان عمائد بھی اس میں شامل تھے، لیکن مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما سر سیّد احمد خاں نے اپنی دور رس سیاسی بصیرت سے دیکھ لیا کہ سیاسی حقوق کے مطالبے میں یہ ہندو مسلم اشتراک مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہ ہو گا اس لیے کہ جو حقوق اور فوائد بھی ملیں گے ان پر ہندو اپنی کثرت تعداد، بہتر تعلیم اور قومی تنظیم کے باعث قابض ہو جائیں گے ۔ سر سید کی مخالفت کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان عموماً کانگرس سے الگ رہے اور اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے بھی ان کی ترجمانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کرتی رہی ۔ ۱۸۸۰ء میں میونسپل کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے اور ۱۸۹۲ء میں صوبائی کونسلوں کے لیے انتخاب کا طریقہ جاری ہوا تو چونکہ انتخابات مخلوط تھے اس لیے مسلمان اقلیت والے علاقوں ہی میں نہیں اکثریت والے علاقوں میں بھی بالکل بے بس رہ گئے ۔ نہ حکومت ان کی حفاظت پر متوجہ ہوئی، نہ کانگرس نے ان کے حقوق کی نگہداشت کا کچھ خیال کیا، حالانکہ وہ پورے ملک کی نمائندگی کی دعویدار تھی ۔ بعض مسلمان رہنماؤں نے کانگرس کے کارفرماؤں سے تلافی کی درخواستیں کیں، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اور مسلمان اپنے تحفظ کی تدبیروں پر سرگرمی سے غور کرنے لگے ۔

تقسیم بنگال، پس منظر و پیش منظر : لارڈ کرزن کے عہد میں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر صوبۂ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی (۱۹۰۵ء) کیونکہ صوبے کی وسعت کے باعث انتظامی حالت بہت خراب تھی، خصوصاً مشرقی بنگال میں نظم و نسق ناگفتہ بہ تھا ۔ وہاں جرائم کا ارتکاب آزادی سے ہو رہا تھا، رسل و رسائل کے وسائل بری حالت میں تھے، رعایا کی تعلیم اور اقتصادی ترقی نظر انداز کی جا رہی تھی اور یہاں کی آمدنی مغربی بنگال کی ترقی پر خرچ ہو رہی تھی ۔ اس تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا، جس میں مسلمان اکثریت میں تھے .

کمپنی کی حکومت کے زمانے ہی سے بنگالی مسلمان طرح طرح کی ناانصافیوں کا ہدف بنتے چلے آ رہے تھے ۔ حکومت کے ساتھ ہی ان کی خوشحالی بھی مفقود ہو گئی ۔ صنعت و تجارت کے میدان سے تو انہیں پہلے ہی نکال دیا گیا تھا، اب آہستہ آہستہ زراعت پیشہ مسلمانوں کو بھی معاشی اعتبار سے تباہ کیا جانے لگا ۔ ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی نے مسلمان زمینداریاں ختم کر کے رکھ دیں، مالگزاری جمع کرنے والے ہندو سرکاری ملازمین اراضی کے مالک قرار پائے اور مسلمانوں کی حیثیت مزارعین کی ہو کر رہ گئی ۔ اسلامی مدارس کے لیے عہد اسلامی میں جو جاگیریں وقف تھیں، انہیں ضبط کر کے مسلمانوں کے لیے حصول تعلیم کو ناممکن بنا دیا گیا کیونکہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں اپنے مذہبی رجحانات یا معاشی حالات کی بنا پر داخل نہیں کرا سکتے تھے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۸۳۰ء میں فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان بنا کر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں کے لیے بھی نااہل بنا دیا ۔ حکومت کے خاتمے پر تقریباً ایک لاکھ سپاہی بیکار ہو کر کاشتکاری پر مجبور ہوئے تھے، اب سرکاری ملازمتوں سے بر طرف ہونے والے ہزاروں افراد اپنے کنبوں سمیت زمینوں پر آباد ہونے لگے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم در تقسیم کے باعث زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مزارعین کے لیے اس سے پیٹ بھر اناج حاصل

کرنا بھی مشکل ہو گیا ۔ ہندو زمیندار اکثر شہروں میں رہتے اور ان کے گماشتے لگان اور کئی دوسرے ناواجب ٹیکس وصول کرنے کے لیے کسانوں کے ساتھ انتہائی بےرحمی سے پیش آتے ۔ ان ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انھیں اکثر پچاس سے ساٹھ فی صد شرح سود پر ہندو مہاجنوں سے قرض لینا پڑتا تھا، جس سے وہ پوری طرح ان کے شکنجے میں جکڑے چلے گئے ۔ یہی سلوک خود انگریزوں نے ان کسانوں سے روا رکھا جو ان کے لیے نیل کاشت کرتے تھے ۔ اول تو انھیں اجرت ھی اتنی کم ملتی تھی جو اُن کے معمولی اخراجات کی بھی متحمل نہ ہو سکتی تھی، اس پر طرہ یہ کہ اگر کوئی کاشتکار نیل کی مقررہ مقدار مہیا نہ کر سکتا تو نہ صرف اسے کوڑے لگوائے جاتے بلکہ اس کے مکان اور فصل کو بھی آگ دکھا دی جاتی ۔ اسی طرح کپڑے کی تجارت کو اپنے ھاتھ میں لے کر انگریزوں نے نہایت معمولی اجرت پر مسلمان جولاھوں سے کام لینا شروع کیا اور انکار کرنے والوں کو ایسی خوفناک سزائیں دیں کہ کئی کاریگروں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے تاکہ کام کرنے کے قابل نہ رہیں ۔ بقول ولیم ہنٹر مسلمان تباھی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے ۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو اس صوبے میں اتنی اقتصادی اور تعلیمی برتری حاصل ہو چکی تھی جسے ایک سو سال میں بھی مٹانا ممکن نہ تھا ۔

تقسیم بنگال سے ہندوؤں کو نئے صوبے میں اپنی برتری اور اجارہ داری ھاتھ سے نکلتی نظر آئی تو انھوں نے اسے اپنے قومی اتحاد پر ضرب کاری قرار دیتے ہوے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف ایک ہندوستان گیر تحریک چلا دی ۔ کانگرس نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کیے اور بنگالی ہندو تشدد اور دہشت پسندی پر اتر آئے ۔ انھوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا اور ایک طرف تو انگریز افسروں کو گولی کا نشانہ بنانے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ فساد پر اتر آئے ۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات بگڑنے لگے ۔ مسلمانوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو قدرے نفع پہنچ رہا تھا ۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنی سیاسی زبوں حالی کا شدت سے احساس ہوا اور انھوں نے اپنے تحفظ کے لیے نمائندہ اداروں میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے عبداللہ ملک : تحریک آزادی بنگال)۔

مسلم لیگ کا قیام : ۱۹۰۶ء میں آغا خان کے زیر قیادت مسلمان لیڈروں کا ایک وفد شملے میں وائسرائے سے ملا اور اپنے سیاسی مطالبات پیش کیے ۔ اسی سال ڈھاکے میں مسلمانان ہند کے حقوق کی حفاظت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا ۔ اس کے بانیوں میں ڈھاکے کے نواب سلیم اللہ کے علاوہ سر سید کے دو رفقا محسن‌الملک اور وقارالملک خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ اس طرح ۱۸۵۷ء میں مستقل اسلامی حکومت کی بحالی کا جو خواب پریشان ہوا تھا اس کی تعمیر نو کا واضح آغاز ہو گیا ۔ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کو پہلی کامیابی یہ نصیب ہوئی کہ ان کی یکجہتی اور متفقہ مطالبے کے سامنے جھک کر حکومت کو تسلیم کرنا پڑا کہ کونسلوں میں مسلمانوں کے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعے چنے جائیں (منٹو-مورلے سکیم) ۔ اس وقت مسلم لیگ میں زیادہ تعداد اعتدال پسند مسلمانوں کی تھی اور ان کی مساعی اس امر پر مرکوز تھیں کہ برادران وطن سے ایسا سمجھوتا ہو جائے جو مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کے تحفظ پر مبنی ہو، تاکہ سب متحد ہو کر آزادی ملک کے لیے جد و جہد کر سکیں ۔

مسلمانوں میں ہمہ گیر بیداری : اس کا

آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوا، جس کے متعدد اسباب تھے، مثلاً (۱) تقسیم بنگال کی تنسیخ : بنگالی ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر ۱۹۱۲ء میں حکومت نے بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی۔ اس سے جہاں مسلمانوں کے اندر ایک بار پھر اپنی حق تلفی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوا وہاں ان کی سیاست میں جوش اور سرگرمی کا عنصر بھی بڑھ گیا اور مسلم لیگ میں ان قدامت پسند لیڈروں کی جگہ جو ہمیشہ میانہ روی کی تلقین کرتے رہتے تھے، آزاد خیال رهنماؤں کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ (۲) دنیائے اسلام کے دگرگوں حالات : یہی وہ زمانہ تھا جب اسلامی مملکتیں بڑی تیزی سے اپنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو رہی تھیں، (الف) ایران : انگریز اور روسی مل کر ایران کے حصے بخرے کر رہے تھے۔ ان دونوں ملکوں نے ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ طے کیا، جس کے ذریعے شمالی ایران پر روس کی اور جنوبی ایران پر انگلستان کی سیادت تسلیم کی گئی۔ اس کے بعد روس نے مشہد مقدس پر گولہ باری کی، جس سے مسلمانانِ ہند میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ (ب) طرابلس : ۱۹۱۲ء ہی میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا، جو سلطنت عثمانیہ کا ایک دور افتادہ علاقہ تھا۔ اطالویوں نے اہل طرابلس کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حملے میں برطانیہ کا ایما بھی شامل تھا، اسی لیے انھوں نے ترکیہ کو مصر کے راستے اپنی فوجیں طرابلس بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ انور پاشا چند رفقا سمیت بمشکل طرابلس پہنچے اور سنوسی قبائل کو منظم کر کے جنگ شروع کر دی، لیکن وسائل کی کمی کے باعث مزاحمت زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکی اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ کے دوران میں مسلمانانِ ہند سخت مضطرب رہے۔ عربوں کی مظلومی، اطالویوں کی ستمگری

اور انور پاشا کی شجاعت کی کہانیاں ہر جگہ سنی جا سکتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال (کلکتہ)، مولانا محمد علی کے کامریڈ (کلکتہ) اور مولانا ظفر علی خان کے روزنامے زمیندار (لاہور) نے مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ مجاہدینِ طرابلس کے لیے چندے ہونے لگے، اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور عام مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات شدید تر ہو گئے۔ (ج) بلقان : ابھی طرابلس کی جنگ جاری تھی کہ دولِ یورپ کے اشارے پر بلقان کی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور متحد ہو کر ترکیہ پر حملہ کر دیا۔ اس پر ہندوستانی مسلمانوں نے برافروختہ ہو کر ایسے مظاہرے کیے کہ انگریزی حکومت کو بھی یہ اجازت دینی پڑی کہ وہ ترکوں کی مالی مدد کر سکتے ہیں، چنانچہ لاکھوں روپیہ جمع کر کے بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد کا انتظام کیا جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بلقان گیا۔ ان دونوں جنگوں کے باعث برصغیر کے مسلمانوں کے قومی جذبے کو بڑی تقویت پہنچی اور ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کا خاتمہ ہو گیا اور ریاست ہائے بلقان سے ترکیہ کا اقتدار ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا۔ ترکوں کی اس شکست میں چونکہ برطانیہ کا بھی ہاتھ تھا اس لیے مسلمانوں میں انگریزوں کے لیے نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ (د) مسجد مچھلی بازار (کانپور) کا واقعہ : اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کے عمالِ حکومت نے سڑک سیدھی کرنے کے لیے مسجد مچھلی بازار کا ایک حصہ منہدم کر دیا اور جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر گولی چلا دی، جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ تمام ملک میں اس پر غم و غصہ کا اظہار ہوا۔ آخرکار لارڈ ہارڈنگ

نے اس جھگڑے کا تصفیہ کیا، لیکن مسلمان پوری طرح مطمئن نہیں ہوے اور حکومت کے خلاف ان کی شکایات میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

(٥) پہلی جنگ عظیم : اگست ۱۹۱۴ء میں سارا یورپ جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گیا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں سلطان ترکیہ نے، جو خلیفة المسلمین بھی تھے، جرمنی کی حمایت میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس سے برصغیر کے مسلمان ایک عجیب مشکل سے دو چار ہوگئے۔ ان کی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں اور انھیں اندیشہ تھا کہ اگر عرب و فلسطین کے مقامات مقدسہ ترکوں کے ھاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضے میں آ گئے تو ان کی حرمت باقی نہ رہے گی۔ دوسری طرف وہ انگریزوں کے محکوم تھے اور ان کی جنگی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور۔ انھیں دنوں میں لنڈن ٹائمز نے ''ترکوں کی پسند'' (The Choice of the Turks) کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا اور اس میں ترکوں کی بڑی توہین و تذلیل کی۔ مولانا محمد علی نے اسی عنوان سے اس کا فاضلانہ جواب اپنے اخبار کامریڈ میں دیا اور ترکوں کو حق بجانب ٹھیرایا۔ حکومت نے کامریڈ کی اشاعت بند کر دی اور مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ اگرچہ برطانوی حکومت اور اس کی تحریک پر فرانس اور روس نے دوران جنگ میں مسلمانوں کے اماکن مقدسہ کے تحفظ کا یقین دلایا تھا، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی مسلمان سخت مضطرب تھے، کیونکہ مسلمان سپاھی ترکوں کے مقابلے میں بلا تکلف بھیجے جا رہے تھے۔ انگریزی افواج نے عراق و فلسطین پر حملہ آور ہو کر بیت المقدس فتح کر لیا اور اسے صلیبی جنگوں کا انتقام قرار دیا۔ پھر شریف مکّہ کو اکسا کر ترکوں کے خلاف بغاوت کرا دی اور اس باغیانہ جنگ میں کوئی مقدس مقام محفوظ نہ رہا۔ مسلمانان ہند کی طرف سے شریفِ مکّہ کی مذمت میں اور ترکوں کے حق میں جو آواز بھی بلند ہوتی اسے حکومت کی طرف سے بغاوت کا نام دیا جاتا۔ حکومت کا تشدد اور مسلمانوں کا دینی و قومی جذبہ بڑھتا گیا۔ علی برادران کے علاوہ کئی اور مسلمان رہنما، مثلاً مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان قید کر دیے گئے اور اخبارات پر کڑی پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان حالات میں کئی پرجوش مسلمان اور طلبہ ترکوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لیے چوری چھپے ہندوستان سے ھجرت کر گئے۔ مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کابل پہنچ کر انقلاب کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس سلسلے میں ''ریشمی رومال'' کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں مسلمانوں کی توجہ داخلی سیاست سے ھٹ گئی تھی، لیکن اس کے باوجود چند واقعات ایسے پیش آئے جو ان کی آئینی جدو جہد کی تاریخ میں بہت ممتاز ھیں۔

(قائداعظم) محمد علی جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت : منٹو مورلے سکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنے کے باعث ہندو بہت برافروختہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا تو باھمی کشیدگی دور کرنے کے لیے ہندو مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں قومیں ایک مطمح نظر پر متحد ہو جائیں۔ اس سلسلے میں (قائداعظم) مسٹر جناح نے بڑی سرگرمی دکھائی، لیکن ہندو لیڈروں کی ضد کے باعث کانفرنس ناکام ہو گئی۔

مسلمان اب حوصلہ مندی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ

کے اجلاس لکھنؤ میں (قائداعظم) مسٹر جناح کو خاص طور سے مدعو کیا گیا اور غورو خوض کے بعد مسلم لیگ نے اپنے دستور اساسی میں یہ تبدیلی کی کہ اس کا مطمح نظر "زیر سایۂ تاج برطانیہ آئینی وسائل سے ایسا طرز حکومت خود اختیاری حاصل کرنا جو ہندوستان کے لیے موزوں" ھو قرار پایا۔ (قائداعظم) مسٹر جناح جلد ھی مسلم لیگ کی صف اول کے رھنما بن گئے اور مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین اھم آئینی مسائل پر مفاھمت کی کوشش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں "میثاق لکھنؤ" کی صورت میں برآمد ھوا اور چونکہ اس معاھدے کے روح و روان (قائداعظم) مسٹر جناح تھے، اس لیے انھیں ھندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ اس معاھدے کی رو سے کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت تسلیم کر لیا، صوبائی کونسلوں اور امپیریل کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب طے پایا اور متفقہ طور پر فیصلہ ھوا کہ کسی فرقے پر اثر انداز ھونے والے کسی مسودۂ قانون یا قرار داد پر اس صورت میں کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی جب کہ فرقۂ متأثرہ کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد اس کی مخالفت کرے۔ معاھدۂ لکھنؤ سے بڑی روشن امیدیں وابستہ کی گئیں اور دونوں قوموں میں صلح و تعاون کی فضا پیدا ھو گئی اور وہ متحد ھو کر "ھوم رول" کی تحریک میں حصہ لینے لگے۔

مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات : ملک میں سیاسی بیداری کی شدت دیکھ کر حکومت نے ۱۹۱۸ء میں مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات شائع کیں۔ ان میں لیگ اور کانگرس کا منصوبہ مسترد کر کے حکومت نے ایک دو پہلو سکیم پیش کی تھی، جس میں کچھ اختیارات عوامی نمائندوں کو تفویض کرنے کے ساتھ باقی تمام اختیارات گورنر اور اس کی انتظامی کونسل کے ھاتھ میں دے دیے گئے، نیز گورنر کو قانون ساز اسمبلی سے مشورہ کیے بغیر کوئی قانون نافذ کرنے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ ملک میں عام بےاطمینانی اور سیاسی تناؤ نقطۂ عروج پر جا پہنچا۔ اصلاحات عملی طور پر ناکام ھو گئیں اور حکومت نے جبر و تشدد شروع کر دیا۔

رولٹ ایکٹ : حکومت کی رائے کے مطابق ملک میں دہشت انگیزی کی تحریک ازسرِ نو تقویت پکڑنے لگی تھی۔ اس کے سد باب کے لیے جسٹس رولٹ کے زیر سرکردگی ایک کمیشن بنایا گیا، جس کی رپورٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مارچ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پیش ھوا۔ اس کی رو سے کسی شخص کو بغیر وارنٹ گرفتار کیا جا سکتا تھا، بغیر سماعت کے جیل بھیجا جا سکتا تھا اور صفائی پیش کیے بغیر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ (قائداعظم) مسٹر جناح نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اس کی شدید مخالفت کی اور جب یہ قانون منظور ھو گیا تو بطور احتجاج کونسل سے استعفا دے دیا۔ یہ تو آئینی احتجاج تھا۔ اس کے مقابلے میں گاندھی جی نے ایک منظم احتجاج کا منصوبہ بنایا اور ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو یوم ستیاگرہ مقرر کیا۔ اس دن ھڑتالیں ھوئیں، جلوس نکلے، جلسے ھوے؛ ان میں پرجوش تقریریں کی گئیں؛ لیکن بعض مقامات پر جوشیلے مظاھرین نے لوٹ مار اور آتش‌زنی بھی شروع کر دی اور گاندھی جی نے گھبرا کر ۱۸ اپریل کو ستیاگرہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک میں جہاں ھندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثالیں دیکھنے میں آئیں وھاں انگریزی حکومت نے بھی اپنے جبرو استبداد کا انتہائی خوفناک نمونہ پیش کیا۔ بریگیڈیر جنرل ڈائر نے، جو امرتسر میں متعین تھا، جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی، لیکن عوام نے جلیانوالہ باغ میں عظیم الشان جلسہ کیا۔ باغ کے تین طرف فصیل تھی۔ ڈائر نے واحد کھلے راستے کو

بند کر کے فوج کو نہتے مجمع پر گولی چلانے کا حکم دے دیا - ۳۷۹ آدمی ھلاک اور ۱۱۳۷ مجروح ہوئے - پنجاب کے کئی شہر فوج کے حوالے کر دیے گئے - چھپانے کے باوجود یہ خبر ملک بھر میں پھیل گئی، جس سے لوگوں میں حکومت کے خلاف جوش و جنون کی کیفیت پیدا ہو گئی.

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات: جلیانواله باغ کے سانحے کا صدمہ ابھی تازہ ھی تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں کامیابی کے بعد اتحادیوں نے ترکیه کے ساتھ انتہائی بےدردانہ سلوک روا رکھا - اس سے مسلمانوں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی - برطانیه اور فرانس عربوں کے وسیع علاقوں پر قابض ہو گئے - سمرنا میں یونانی فوجوں کو اتار کر مسلمان آبادی کا قتل عام کیا گیا - معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطنت عثمانیه کو پارہ پارہ کرنے پر تلے ہوئے ھیں - بر صغیر کے مسلمانوں نے اپنی بے بسی کے باوجود علی برادران کے زیر قیادت تحریک خلافت شروع کر دی، جس کے مطالبات یہ تھے کہ خلافت عثمانیه برقرار رہے، مقامات مقدسہ ترکوں کی حفاظت میں رہیں اور انتقامی کارروائی کے بجائے ترکوں کی سلطنت کی حدود وھی رکھی جائیں جو قبل از جنگ تھیں - جب ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے ان مطالبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی اور سید حسین پر مشتمل ایک وفد خلافت کمیٹی کی طرف سے انگلستان بھیجا گیا تاکہ اتحادیوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ عرب علاقوں کو برطانیه اور فرانس کی نگرانی میں دینے کی تجویز کو مسلمانان ھند کبھی قبول نہ کریں گے - وفد نے انگلستان کے علاوہ فرانس، سوئٹزر لینڈ اور اٹلی کا دورہ بھی کیا اور ان حکومتوں کے سربراھوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، لیکن اس کا کوئی سود مند نتیجه نہ نکلا - مئی ۱۹۲۰ء میں صلح نامے کا اعلان ہوا، جس کی شرائط ترکوں کے لیے مہلک تھیں، لیکن انھیں اس پر دستخط کرنا پڑے - ان کے تمام بیرونی مقبوضات چھن گئے، استانبول بین الاقوامی شہر قرار پایا، بحری جہاز ضبط کر لیے گئے، فضائیه قائم کرنے پر پابندی لگانے کے علاوہ بری فوج میں بھی کمی کر دی گئی اور فوجی سکول بند کر دیے گئے.

خلافت کمیٹی کا وفد یورپ سے ناکام لوٹا، لیکن ہندوستان میں اس کی تنظیم بڑی وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی - اس کی تائید میں رائے عامّہ اس قدر طاقتور اور پرزور تھی کہ جلسوں یا اخبارات میں اس کی مخالفت کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، حتٰی کہ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں نے بھی مسئلۂ خلافت میں اشتراکِ عمل کا ثبوت دیا اور یوں تحریکِ خلافت نے تحریکِ آزادی ھند کی بھی صورت اختیار کر لی.

ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے کلکتے میں کانگرس کے ایک غیر معمولی اجلاس میں ترکِ موالات یا عدم تعاون کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا کہ لوگ سرکاری خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں، سرکاری کالجوں، نیز عراق میں فوجی خدمات کا مقاطعہ کر دیں - دسمبر میں ناگپور کے اجلاس میں اس تجویز کی توثیق کر دی گئی، لیکن (قائداعظم) مسٹر جناح نے همه گیر عدم تعاون کو وقتی حالات میں ناممکن العمل ٹھیراتے ہوئے آئینی ذرائع اختیار کرنے پر زور دیا اور کانگرس سے علیحدہ ہو گئے - ناگپور کے فیصلوں پر عمل شروع ہو گیا - گاندھی جی اور علی برادران میں سمجھوتے کے بعد دونوں تحریکیں متحد ہو گئیں - ہندو مسلم تعاون نقطۂ عروج پر جا پہنچا - مسلمانوں نے عیدالاضحٰی پر گائے کی قربانی بھی بند

کر دی، حتیٰ کہ ہندو رہنما گاندھی جی سے جامع مسجد دہلی میں خطاب کرایا گیا ۔ اوائل جولائی ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا، جس میں سلطان ترکیہ کو مسلمانانِ ہند کی وفاداری کا یقین دلایا گیا اور مسلمانوں پر انگریزی فوج میں ملازمت حرام قرار دی گئی، مصطفیٰ کمال پاشا کو، جس نے حریت پسند ترکوں کی مدد سے انقرہ میں حکومت قائم کر لی تھی، مبارک باد دی گئی اور انگریزوں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کی تو مسلمان سول نافرمانی کریں گے اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر کے جمہوری حکومت قائم کر لیں گے ۔ اس اجلاس کے بعد علی برادران پھر گرفتار کر لیے گئے، لیکن انگریزی حکومت کے خلاف تحریک جاری رہی ۔ یہاں تک کہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز دورے کی غرض سے ہندوستان پہنچا تو پورے ملک نے ہڑتال کی صورت میں اس کا خیر مقدم کیا ۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قوت نے حکومت کو متزلزل کر دیا اور قریب تھا کہ انگریز اپنا رویّہ تبدیل کر لیں کہ گاندھی جی نے اپنے بعض پیروؤں کی متشددانہ کارروائیوں کے پیش نظر ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا ۔ اس کا اثر تحریک خلافت پر بھی پڑا اور جب ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکیہ کی نئی حکومت نے خلافت کو ختم کر دیا تو تحریک خلافت بھی خود بخود ختم ہو گئی ۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں مسلمانوں نے بڑی شاندار قربانیاں دیں ۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں قید ہوے ۔ ان کی عالی شان درسگاہوں پر سخت ضرب لگی ۔ سینکڑوں نے وکالت اور سرکاری ملازمت سے دستبرداری اختیار کی ۔ کروڑوں روپے کی جائدادیں ترک کر دی گئیں ۔ لاکھوں روپے چندے کے طور پر دیے گئے ۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے تقریباً اٹھارہ ہزار مسلمان اپنا مال و متاع کوڑیوں کے مول بیچ کر افغانستان کو ھجرت کر گئے اور انھیں وہاں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ یہ سب قربانیاں دراصل ہندوستان کی آزادی، اسلامی سلطنتوں کی بقا اور اپنی قومی حیثیت کے تحفظ کے لیے تھیں ۔

ہندو مسلم اختلاف : خلافت اور ترک موالات کی گرم جوشیاں ذرا مدھم پڑیں تو متعدد غیر مسلم عناصر تفرقہ انگیزی کے لیے بروے کار آ گئے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھل گئے ۔ مالا بار میں موپلوں کی بغاوت کو، جو انگریزوں کے خلاف تھی، ہندوؤں نے فرقہ وارانہ حملہ قرار دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ ۱۹۲۱ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے آل انڈیا ہندو مہاسبھا قائم کی، جس کا موقف یہ تھا کہ مسلمان باہر سے آئے ہیں، لہٰذا انھیں یہاں رہنا ہے تو ہندوؤں کے مطیع بن کر رہنا ہوگا؛ ہندوؤں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو مضبوط بنائیں، سارے مسلمانوں کو ہندو بنا لیں یا انھیں ملک سے خارج کر دیں ۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے ''شدھی'' کی تحریک چلائی اور غریب اور پسماندہ مسلمانوں کی بستیوں کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا ۔ اس کے کارکن ایک طرف تو روپے پیسے کا لالچ دیتے اور دوسری طرف مشاہیر اسلام کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کرتے ۔ ہندوؤں کو مضبوط اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار کرنے کے لیے لالہ لاجپت رائے نے ''ہندو سنگھٹن'' کی تحریک شروع کی ۔ ان سب تحریکوں سے ہندو مسلم اتحاد ایک افسانہ ہو کر رہ گیا؛ جگہ جگہ فسادات ہونے لگے ۔ پہلا بلوہ

۱۹۲۲ء میں محرم کے موقع پر ملتان میں ہوا - پھر دہلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، ناگپور، جبلپور، گلبرگہ، شاہجہانپور اور کوہاٹ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے - پھر سوامی شردھانند کے قتل کے بعد ان کی تعداد اور بڑھی اور بمبئی، پنجاب، سی پی، بنگال، بہار، یوپی، سبھی صوبے ان کی لپیٹ میں آ گئے - ان کی روک تھام کے لیے باہم سمجھوتے کی متعدد کوششیں کی گئیں، لیکن ہندو مہاسبھا اور منفی ذہن رکھنے والے کانگرسی رہنماؤں کے باعث کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی - کانگرس کی طرف سے پھر یہ مطالبہ ہونے لگا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں تاکہ مخلوط انتخاب کی صورت میں وہ اپنی مرضی کے تابع مسلمان نمائندے اسمبلیوں میں بھیج سکیں - اسی زمانے میں مسلمانوں پر ایک نئی افتاد یہ پڑی کہ حجاز میں سلطان ابن سعود کی بادشاہت قائم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی میں افتراق پیدا ہو گیا اور مسلمان مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ گئے - اس سے ہندو رہنماؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

مسلم اکثریت کے علاقے : سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت یوں تو سارے ملک میں زبوں تھی، لیکن جن علاقوں میں وہ اکثریت میں تھے وہاں بھی وہ انگریزی حکومت اور غیر مسلم عناصر کی ریشہ دوانیوں کے باعث اپنے جائز حقوق اور ترقی کے وسائل سے محروم ہو چکے تھے - بنگال کی کیفیت قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ وہاں کس طرح مسلمانوں کو معاشی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھ کر انھیں سیاسی اعتبار سے ہندوؤں کا مطیع بنا دیا گیا تھا - شمال مغربی ہند کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

پنجاب میں انگریزی دور آیا تو حکومت نے سکھوں اور ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کی اور انھیں بہت سی مراعات عطا کیں - اس کے برعکس مسلمان، جو مدت سے سکھاشاہی کا ہدف بنتے چلے آ رہے تھے، حکومت کی بے اعتنائی کا خاص طور پر نشانہ بنے اور انھیں سرکاری ملازمتوں سے بے دخل کیا جانے لگا - پنجاب میں پورے برطانوی عہد میں کوئی قابل ذکر صنعت قائم نہیں ہوئی، دفتروں پر غیر مسلم چھائے رہے اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہی - مسلمان زیادہ تر دیہاتی اور زراعت پیشہ تھے - مسلمان کسان شدید محنت کے باوجود ہندو مہاجنوں کے قرض کے بوجھ تلے پسا جا رہا تھا - انگریزوں کی آمد سے قبل مہاجن بسا اوقات لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر شرح سود میں کمی کر دیتے اور قرضدار سے مصالحت کر لیتے تھے، لیکن ۱۸۶۶ء میں چیف کورٹ کے قیام کے بعد قرضے کے تمام مقدمات کی سماعت دیوانی عدالتوں میں ہونے لگی اور اب کسان پر عدالتی کارروائی کے اخراجات بھی آ پڑے - نئے قانون کی رو سے قرضدار کسان کی زمین حتٰی کہ اس کا گھریلو سامان بھی قرق کرا سکتا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساہوکار جھوٹے سچے بہی کھاتوں اور ناقابل برداشت شرح سود کی مدد سے کسانوں کو بے دخل کر کے ان کی اراضی کے مالک بنتے چلے گئے - ۱۸۹۸ء میں پنجاب میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی، جس کے اختیارات بہت محدود تھے اور اس میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی - ۱۹۰۹ء میں انتخاب کا طریق جاری ہوا تو مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نیابت نہ ملی اور مخلوط انتخاب کی وجہ سے کونسل میں وہ ایک بےآواز اقلیت ہو کر رہ گئے - جداگانہ انتخاب کا طریق منظور ہونے اور میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کو کونسل میں پچاس فی صد نیابت دینے کی شرط ہندوؤں پر بہت گراں گزری، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب

سکھوں میں اپنی علیحدہ قومی ہستی کا شعور پیدا ہوا تو ہندوؤں نے ان کی ہر طرح تائید کی اور مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ ہندو سکھ محاذ بن گیا، جس کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کوئی مسلمان جماعت بر سر اقتدار نہ آ سکتی تھی۔

سندھ اپنی آزادی سے محروم ہونے کے بعد صوبۂ بمبئی کا حصہ چلا آ رہا تھا۔ سندھی مسلمانوں کو بھی انگریزی حکومت کا خصوصی عتاب برداشت کرنا پڑا۔ بمبئی کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سندھ کی تعلیمی اور معاشی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، چنانچہ ۱۹۰۰ء تک یہاں صرف تین سرکاری ہائی سکول تھے۔ مسلمانانِ سندھ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ اگر وہ صوبۂ بمبئی کے ساتھ ملحق رہے تو اپنی پسماندگی سے کبھی چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ ۱۹۱۶ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کی لہر چلی تھی تو خود ہندوؤں نے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی تجویز پیش کی تھی، مگر اب انھوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور یہ حیلہ تراشا کہ اگر سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا گیا تو اس کی حکومت نظم و نسق کے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکے گی۔

۱۹۰۱ء میں سندھ پار کے چھے اضلاع کو پنجاب سے علیحدہ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ بنایا گیا، لیکن اس نئے صوبے کا نظم و نسق مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیا صوبہ ایسی بہت سی مراعات سے محروم ہو گیا جو یہاں کے لوگوں کو قبل ازیں حاصل تھیں۔ تحریر و تقریر کی آزادی واپس لے لی گئی اور کوشش یہ رہی کہ یہاں کے باشندے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے الگ تھلگ رہیں۔ قبائلی علاقوں میں پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے سازشوں کا جال بچھا دیا گیا اور مختلف قبائل کو ایک دوسرے سے لڑانے کا کھیل شروع ہو گیا۔ حریت پسند قبیلوں کو دبانے کے لیے انتہائی سختی اور بربریت سے کام لیا جانے لگا اور غازی ایکٹ جیسے کئی ظالمانہ قوانین نافذ کر دیے گئے۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات کو تمام صوبوں میں نافذ کیا گیا، لیکن صوبۂ سرحد ان سے بھی محروم رہا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ یہاں آئینی اور نمائندہ اداروں کا قیام امن عامّہ کے منافی ہے اور ہندوؤں نے اس کی پر زور تائید کی۔ ۱۹۲۲ء میں صوبے کو آئینی اصلاحات دینے کے مسئلے کی چھان بین کرنے کے لیے ایک سرکاری کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کی رپورٹ صوبۂ سرحد کے حق میں تھی، لیکن اسے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ صوبے کی سات فی صد ہندو سکھ اقلیت اصلاحات کے خلاف ہے۔ بلوچستان کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور وہ بھی ہر طرح کی آئینی اصلاحات سے محروم چلا آ رہا تھا۔

الغرض جن علاقوں میں ہندو اکثریت تھی وہاں تو ہندو رہنماؤں کا اصرار یہ تھا کہ کونسلوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار ملیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ حکومت کے کاروبار میں شریک ہو سکیں، لیکن جہاں وہ اقلیت میں تھے وہاں وہ یا تو کونسلوں کے قیام کی مخالفت کرتے تھے، یا ان کے اختیارات پر پابندیاں عائد کرنے پر مصر ہوتے تھے اور انگریزی حکومت اکثر ان کی رائے کو مسلمانوں کے مقابلے میں ترجیح دیتی تھی۔

مسلمانوں کے مطالبات اور ہندوؤں کا سمجھوتے سے گریز: ۱۹۲۳ء کے انتخابات کے بعد مرکزی اسمبلی میں مسٹر رنگا چاریہ نے یہ قرار داد پیش کی کہ ملک کا آئینی نظام فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ترمیم پیش کی کہ ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلائی جائے جو ہندوستان

کے لیے کامل ذمےدار حکومت کی سفارش کرے ۔ (قائد اعظم) مسٹر محمد علی جناح نے اس کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ھی ھندوستان میں آئینی سرگرمیاں اور مختلف رھنماؤں میں گفتگو شروع ھوگئی۔ مئی ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لاھور میں منعقد ھوا تو (قائد اعظم) مسٹر محمد علی جناح نے بتایا کہ جس دن ھندو اور مسلمان متحد ھو جائیں گے، ملک کو نو آبادی کے درجے کی حکومت مل جائے گی ۔ انھوں نے ھندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں، لیکن ھندو رھنما جداگانہ انتخاب سے مسلمانوں کی دستبرداری پر اتحاد کو موقوف سمجھتے تھے ۔ (قائد اعظم) مسٹر جناح نے ان کے اس حیلے کو بھی رفع کرنے کے لیے ۱۹۲۷ء میں مسلمانوں کے زعما کی ایک کانفرنس دہلی میں بلوائی اور طویل بحث کے بعد مندرجۂ ذیل شرائط وضع کیں، جن کی بنا پر مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کرنے پر آمادہ ھو سکتے تھے: (۱) سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے تاکہ یہاں کی حکومت اپنے نوے فی صد مسلمان باشندوں کے مفاد کی طرف توجہ کر سکے؛ (۲) صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں اسی سطح اور معیار کی اصلاحات نافذ کی جائیں جو دوسرے صوبوں میں ھیں تاکہ ان علاقوں کے باشندوں سے جو ناانصافی ھوئی ھے اس کی تلافی کی جا سکے؛ (۳) پنجاب اور بنگال میں نیابت کا تناسب آبادی کے تناسب کے مطابق ھو تاکہ بنگال میں چالیس فی صد اور پنجاب میں پچاس فی صد نشستوں کے بجاے ان صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو علی الترتیب چوّن اور چھپّن فی صد نشستیں دی جائیں تاکہ انھیں وھاں واضح اکثریت حاصل ھو جائے؛ (۴) سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں ھندو اقلیتوں کو وھی مراعات دی جائیں جو ھندو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کو دینے پر رضامند ھوں؛ (۵) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ھو؛ (۶) طرز حکومت وفاقی ھو.

یہ تجاویز انتہائی منصفانہ تھیں، لیکن ھندو جماعتیں مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کے بارے میں کچھ کہنے سننے کے لیے تیار نہ تھیں، لہٰذا کانگرس کمیٹی کی طرف سے منظوری کے باوجود ھندووں نے مہاسبھائی لیڈر پنڈت مالویہ کے زیر قیادت ان کی سخت مخالفت کی اور مسلمانوں کے خلاف بلوے شروع کر دیے.

سائمن کمیشن: نومبر ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا، جس کی غایت یہ تھی کہ وہ ھندوستان جا کر اس امر کا جائزہ لے کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا کیا اثر ھوا ھے اور اس امر کی سفارش کرے کہ ھندوستان میں کس حد تک ذمےدار حکومت قائم کی جا سکتی ھے ۔ اس کمیشن کے تقرر پر پورے ملک میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور اکثر جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ مولانا محمد علی اور (قائد اعظم) مسٹر جناح بائیکاٹ کی تائید میں تھے، لیکن ھندووں کے رویّے کی وجہ سے مسلمانوں میں اس قدر تلخی پیدا ھو گئی تھی کہ ان کا ایک گروہ کمیشن کے ساتھ تعاون پر آمادہ ھوگیا ۔ اس سے مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی: ''شفیع لیگ'' تعاون کے حق میں تھی اور ''جناح لیگ'' مقاطعے کے حق میں ۔ ملک گیر مقاطعے کے باعث سائمن کمیشن اپنے مقصد میں ناکام رھا تو لارڈ برکن ھیڈ، وزیر ھند، نے جھنجھلا کر ھندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ وہ حکومت پر تخریبی نکتہ چینی کرنے کے بجاے اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ سکیم پیش کریں.

نہرو رپورٹ: اس چیلنج کا جواب دینے

کے لیے فروری ۱۹۲۸ء میں پہلی آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندوستانی اقوام کے نمائندے شریک ہوئے۔ طے پایا کہ آئندہ دستور کا بنیادی تصور یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں کامل ذمے دار حکومت قائم ہو اور اس مسئلے کو حل کیا جائے کہ فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کیا ہوں۔ دو مہینے کے اندر کانفرنس کے پچیس اجلاس ہوئے، لیکن ہندو رہنماؤں کی کٹ‌حجتی کے باعث کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، آخر گاندھی جی کی تجویز اور مولانا شوکت علی کی تائید سے ہندوستان کا دستوری خاکہ تیار کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں تشکیل دی گئی۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ، جس میں اس کے مسلمان رکن محمد شعیب قریشی کا اختلافی نوٹ موجود تھا، اگست ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پیش کی گئی۔ مسلمان نمائندوں نے اس کی سخت مخالفت کی، کیونکہ اس میں ان کے تمام مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور کامل آزادی کے بجائے ہندوستان کا مطمح نظر نو آبادیاتی درجے کی حکومت قرار دینے کے علاوہ نشستوں کا تعین کیے بغیر مخلوط انتخاب اور وحدانی طرز حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کی مخالفت کے باوجود کانفرنس میں شریک ہندوؤں نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہ رپورٹ منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بُعد اور بھی بڑھ گیا اور اکثر مسلمان رہنما کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔

اسی سال کانگرس کے اجلاس کے ساتھ کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا تاکہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی طرف سے نہرو رپورٹ پر مہر تصدیق ثبت کی جائے۔ مولانا محمد علی اور (قائداعظم) مسٹر جناح نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مولانا محمد علی ڈومینین سٹیٹس کے سوال پر کنونشن کو چھوڑ کر چلے گئے۔ (قائداعظم) مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی طرف سے اس میں ترمیمات پیش کیں، جن میں اہم ترین یہ تھیں کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے، پنجاب اور بنگال میں انھیں دس سال کے لیے آبادی کے تناسب سے نمائندگی حاصل رہے اور بعدازاں اگر ضرورت محسوس ہو تو اس پر نظرثانی کر لی جائے اور مرکز کے بجائے صوبوں کو اختیارات دیے جائیں تاکہ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں حکومت خود مختاری سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تمام ترمیمات مسترد کر دی گئیں اور رپورٹ منظور ہو گئی۔ کانگرس نے اعلان کیا کہ اگر دسمبر ۱۹۲۹ء تک اسے آئندہ دستور کی بنیاد قرار نہ دیا گیا تو آزادی کامل کے لیے سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

مسلم آل پارٹیز کانفرنس: کانگرس اور ہندوؤں سے مایوس ہو جانے کے بعد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو مولانا محمد علی نے تمام مسلمان جماعتوں کی ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی تاکہ مسلمانوں کے حقوق کے تعین اور تحفظ کے بارے میں تمام جماعتوں میں اتفاق رائے ہو جائے۔ کانفرنس نے نہرو رپورٹ کی پوری قوت سے مذمت کی اور تجاویز دہلی کی بنیادوں پر، لیکن مخلوط انتخاب کے ذکر کو محو کر کے، ایک طویل قرار داد مرتب کی، جس میں مسلمانوں کے شہری اور سیاسی حقوق کا احاطہ کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں ان کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں (قائداعظم) مسٹر جناح کے زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس

میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کا اختلاف دور ہو گیا اور سر شفیع کی جماعت نے اس میں شرکت کی ۔ اس اجلاس میں (قائد اعظم) مسٹر جناح نے مستقبل کے ہندوستان میں مسلم انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہ تجویز پیش کی جو ''چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہوئی اور جسے آزادی کے حصول تک مسلمانوں کے قومی مطالبات کی حیثیت حاصل رہی ۔ اس میں ملک کے لیے وفاقی دستور، صوبوں کی کامل خودمختاری، صوبائی مجالس قانون ساز میں اقلیتوں کی کافی اور مؤثر نیابت اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی جائز نیابت کے تحفظ، مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، ہر صوبے کی کابینۂ وزارت میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات کے نفاذ، سندھ کی صوبۂ بمبئی سے علیحدگی، سرکاری ملازمتوں اور ذمےدار عہدوں پر تقرر کے وقت مسلمانوں کے مناسب حصّے کا لحاظ، تمام ملّتوں کے لیے ضمیر و مذہب کی آزادی اور اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و زبان وغیرہ کی حفاظت و ترقی کا مطالبہ کیا گیا ۔

پہلی گول میز کانفرنس: کانگرس نے مسلمانوں کے مطالبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے سابقہ اعلان پر قائم رہی ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگرس نے یوم آزادی منایا اور مارچ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی ۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے ۶ اپریل کو ڈانڈی کے مقام پر نمک بنا کر قانون کی خلاف ورزی کی اور مئی میں انہیں اور دوسرے بڑے بڑے کانگرسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ اسی دوران میں سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر دی ۔ اس پر غور کرنے کے لیے لنڈن میں ہندوستان کی تمام جماعتوں اور ریاستوں کے نمائندے مدعو کیے گئے ۔ کانگرس نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا، لیکن باقی جماعتوں نے دعوت قبول کر لی ۔ اس میں صرف اتنا طے ہو سکا کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت وفاقی ہو گی، لیکن مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ جوں کا توں رہ گیا ۔

دوسری گول میز کانفرنس: کانگرسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد بھی سول نافرمانی جاری رہی ۔ اس دوران میں بنگال اور پنجاب میں دہشت انگیزوں کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں ۔ حکومت نے اس تحریک کو دبانے میں خاصی سختی سے کام لیا ۔ بالآخر مارچ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ اروِن اور گاندھی جی کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا ۔ سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی گئی، تمام ستیہ گرہی رہا کر دیے گئے اور کانگرس موسم سرما میں ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے پر رضا مند ہو گئی ۔

دوسری گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کے باعث فرقہ وار مسئلہ پھر لاینحل ہی رہا اور عاجز آ کر مسلمان، پست اقوام، ہندوستانی، عیسائی، اینگلوانڈین اور برطانوی مفاد کے نمائندوں نے مشترکہ طور پر اپنے مطالبات اور دعاوی پیش کیے، جس پر ہندو نمائندوں نے وزیر اعظم انگلستان کو فرقہ دار مسئلہ حل کرنے کا اختیار دے دیا ۔

کمیونل ایوارڈ اور یونٹی کانفرنس: ہندوستانی نمائندے واپس پہنچے تو ملک میں ہر طرف بےچینی پھیلی ہوئی تھی ۔ خصوصاً پنجاب اور بنگال میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دیے جانے کے بعد سے حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی ۔ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے قانون شکن سرگرمیوں کے سدباب کے لیے متعدد آرڈی ننسوں کے ذریعے شہری آزادی پر پابندیاں عائد کر دی تھیں،

کانگرسی رہنما ٹیکس کی عدم ادائی کی تحریک شروع کر چکے تھے اور ان میں سے اکثر گرفتار کر لیے گئے تھے، مثلاً یو۔ پی میں جواہرلال نہرو اور سرحد میں عبدالغفار خان ۔ گاندھی جی نے آرڈی نسوں کی تنسیخ کا مطالبہ کیا، جسے وائسرائے نے مسترد کر دیا، چنانچہ کانگرس نے دوبارہ سول نافرمانی کا اعلان کر دیا اور ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی اور ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ جیل میں نظربند کر دیے گئے ۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا، جس میں صوبائی مجالس کی حد تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپین، سکھ، اینگلوانڈین، ہندوستانی عیسائی اور پست اقوام کو بھی اپنے اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعے چننے کا حق دیا گیا اور ہر قوم اور طبقے کے لیے نشستیں متعین کر دی گئیں۔

پست اقوام کی جداگانہ نیابت ہندوؤں کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہ تھی، کیونکہ اس سے ان کی فیصلہ کن حیثیت پر کاری ضرب لگتی تھی؛ چنانچہ گاندھی جی نے اس کے خلاف ۲ ستمبر کو مرن برت رکھ لیا ۔ اس سے اتنی ہلچل مچی اور ہندو رہنماؤں نے پست اقوام کے نمائندے ڈاکٹر امبیدکر پر اس قدر زور دیا کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئے اور حکومت نے پست اقوام کی حد تک اپنے ایوارڈ میں ترمیم کر لی ۔ کمیونل ایوارڈ میں مسلمانوں کے مطالبے کو پورا نہیں کیا گیا تھا اور اس کی رو سے اگرچہ سرحد کو اصلاحات مل گئیں، لیکن انھیں بنگال میں صرف ۴۷.۵ فی صد اور پنجاب میں ۴۹ فی صد نیابت دی گئی ۔ اس کے باوجود ہندوؤں کی ہر جماعت اس کی مخالفت میں پیش پیش تھی ۔ مسلمان ان کے ساتھ معقول اور منصفانہ شرائط پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار تھے، چنانچہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں اختلافی مسائل کو حل کرنے کے لیے الہ آباد میں ایک ”یونٹی کانفرنس“ بلائی گئی ۔ ہندو بڑی مشکل سے مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۳۰ فی صد نشستیں دینے پر آمادہ ہوے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ زائد نشستیں ہندوؤں کے ساتھ عیسائی اور یورپین نشستوں کو بھی کم کر کے پوری کی جائیں ۔ اس پر بات چیت ٹوٹ گئی اور حکومت نے مرکز میں مسلمانوں کے لیے ۳۳⅓ فی صد نشستوں اور بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا اعلان کر دیا ۔

تیسری گول میز کانفرنس، قرطاس ابیض اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ: دسمبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی، لیکن اس میں نہ صرف کانگرس بلکہ بیشتر مسلمان رہنماؤں نے بھی شرکت نہیں کی ۔ بہرحال کانفرنس نے اپنا کام جاری رکھا ۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں تینوں کانفرنسوں کی رودادوں پر مشتمل قرطاس ابیض شائع کیا گیا اور برطانیہ کے دونوں ایوانوں کی طرف سے منتخبہ کمیٹی نے اس کی تجاویز کے مطابق آئندہ دستور کے بارے میں غور کرنا شروع کیا ۔ کمیٹی کی رپورٹ دسمبر ۱۹۳۴ء میں پارلیمنٹ کے سامنے ایک مسودۂ قانون کی شکل میں پیش ہوئی اور ۴ اگست ۱۹۳۵ء کو وہ دستور منظور ہو گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے مشہور ہے ۔

اس قانون کی رو سے ملک کے لیے وفاقی طرز حکومت منظور کیا گیا اور مرکزی حکومت کے اقتدار کو کم کر کے صوبوں کو وسیع اختیارات دیے گئے، البتہ گورنروں کو یہ حق دیا گیا کہ اگر کسی صوبے میں اقلیتوں کی حق تلفی کی جائے تو وہ صوبائی وزرا کے احکام منسوخ کر سکتا ہے ۔ کانگرس اس شرط کے خلاف تھی، کیونکہ اس طرح اسے اپنے اکثریتی صوبوں میں من مانی کارروائی کرنے کی مکمل آزادی نہیں رہتی تھی ۔ مسلمانوں کو

اس قانون کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ ان کے حقوق و مقاصد کی حفاظت کے لیے واجب التعمیل دفعات نہیں رکھی گئی تھیں بلکہ اس مسئلے کو گورنروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس قانون کو کسی نے پسند نہیں کیا ۔ اس کا دوسرا حصہ پورے ملک میں وفاق پیدا کرنے کے بارے میں تھا، لیکن اس کا نفاذ کبھی نہ ہو سکا کیونکہ والیان ملک نے وفاق میں شامل ہونا منظور نہ کیا؛ لہذا مرکز اسی طرح رہا جس طرح کہ پہلے تھا ۔ بہرحال کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس قانون کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مسلمانوں کی تنظیم نو: مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی (۱۹۳۶ء) میں یہ رائے ظاہر کی کہ نیا دستور اگرچہ برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں کے لیے مضر ہے اور اس کا مقصد محض یہ ہے کہ ملک کو کبھی ذمےدار حکومت نہ ملے، تاہم حالات کا تقاضا یہ ہے کہ صوبائی خود مختار حکومتوں کے قیام کے لیے انتخابات میں حصہ لیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں (قائداعظم) مسٹر جناح کے زیر قیادت ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر دیا گیا۔

انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا بڑا مشکل کام تھا، خصوصاً اس لیے کہ ان میں نہ کوئی تنظیم تھی اور نہ وہ کسی مرکز پر متحد تھے ۔ اس انتشار اور لامرکزیت کا باعث در اصل وہ چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتیں تھیں جو وقتی حالات کے تحت وجود میں آئیں اور اپنی انفرادی حیثیت سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھیں ۔ ان میں وہ جماعتیں مسلمانوں کی تنظیم میں خاص طور پر رکاوٹ کا باعث بن رہی تھیں جو کانگرس سے منسلک تھیں ۔ اس سلسلے میں وہ مسلمان رہنما بالخصوص قابل ذکر ہیں جو کانگرس کے مہاسبھائی طرز عمل کا متعدد بار تجربہ کرنے کے باوجود اس جماعت کے وفادار چلے آ رہے تھے اور اپنے آپ کو ''نیشنلسٹ مسلمان'' کہتے تھے ۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پہلے انگریز سے آزادی حاصل کر لیں پھر مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہندووں سے تصفیہ ہو جائے گا ۔ ان کی جماعت کی باقاعدہ تشکیل جنوری ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی ۔ اس نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی اور ۱۹۳۱ء کے بعد ختم ہو گئی؛ تاہم اس کے رہنما، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، تصدق احمد شروانی، وغیرہ بدستور کانگرس کے ساتھ رہے۔

اسی زمانے میں چند اور اسلامی جماعتیں بھی وجود میں آئیں ۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان پر مشتمل ایک جماعت مجلس احرار اسلام کے نام سے قائم ہوئی اور اس نے سول نافرمانی کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف کانگرس کا ساتھ دیا ۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی ختم ہوئی تو اس نے اپنی توجہ کشمیر کی طرف پھیر دی ۔ ان دنوں ریاست کے خلاف وہاں کے باشندوں کا ایجی ٹیشن شروع تھا اور وہ حکومت میں حصہ لینے کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ احرار نے پنجاب میں اس تحریک کی قیادت سنبھال لی اور کشمیر میں جتھے بھیج بھیج کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا ۔ بالآخر ریاستی حکومت تحریک کے رہنماؤں سے بات چیت پر مجبور ہو گئی اور اس کامیابی نے احرار کو پنجاب میں بہت مقبول بنا دیا ۔ اس کے بعد احرار نے تحریک ختم نبوت کا آغاز کیا اور جو جتھے کشمیر سے رہائی پا کر آئے انھیں قادیاں بھیجنا شروع کر دیا ۔ گورنر نے احرار کا داخلہ قادیاں میں بند کر دیا تو یہ تحریک قدرے دب گئی، تاہم

اس سے عام مسلمانوں میں اس کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اب احرار نے پنجاب میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کر دی، لیکن سر فضل حسین نے ان کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ ان کے بعد سر سکندر حیات نے ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے یونینسٹ پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کر لی تو احرار نے پھر جد و جہد کا آغاز کر دیا اور سکھوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے نئے انتخابات میں حصہ لینے کا عزم کیا۔ احرار سکھ اتحاد کا قرینہ پیدا ہو رہا تھا کہ مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آ گیا۔ لاہور کی اس مسجد پر سکھوں کا قبضہ چلا آ رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اسے اپنے گوردوارے میں شامل کرنے کے لیے حکومت سے اس کے انہدام کی اجازت چاہی، جو انہیں دے دی گئی۔ اس پر مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور وہ مسجد پر قبضہ کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں شہر سے باہر جمع ہونے لگے۔ سکھوں نے یہ صورت دیکھی تو حکومت کی مدد سے مسجد کو فوراً ڈھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے بڑے وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن شروع کر دی اور جتھے بنا بنا کر مسجد شہید گنج کی طرف جانے لگے۔ بہت سے مسلمان فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ہزاروں قید کر لیے گئے۔ پنجاب میں جا بجا ہندو سکھ فسادات ہونے لگے۔ آخر (قائداعظم) مسٹر جناح نے لاہور آ کر ایک طرف تو ایجی ٹیشن بند کرا دی اور دوسری طرف حکومت اور سکھوں سے مسجد کی واپسی کے متعلق گفتگو شروع کی۔ آخر طے پایا کہ مسلمان آئینی طریقہ اختیار کریں اور مسجد کی بازیافت کے لیے عدالت سے رجوع کریں۔ اس دوران میں احرار بالکل الگ تھلگ رہے اگرچہ اس جماعت کی تاریخ میں مظاہروں کو ہمیشہ اہمیت رہی تھی۔ اس موقع پر جب قوم نے ان سے محاسبہ کیا تو انہوں نے اعتدال و میانہ‌روی پر اصرار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجلس احرار اپنی مقبولیت کھو بیٹھی اور بحیثیت جماعت اس کا رسوخ باقی نہ رہا، تاہم اس کے بعض رہنما حصول آزادی کی بڑے جوش سے حمایت کرتے رہے۔

تیسری اہم جماعت خدائی خدمت‌گاروں کی تھی، جو صوبۂ سرحد میں خان عبدالغفار خان نے ۱۹۲۹ء میں قائم کی۔ یہ جماعت ہمیشہ پوری طرح کانگرس کی ہم نوا رہی۔

۱۹۲۹ء ہی میں جمعیۃ العلماے ہند قائم ہوئی اور نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد دوسری مسلم جماعتوں کے ساتھ کانگرس سے ناراض ہو گئی، مگر جب کانگرس نے آزادی کامل کی قرارداد پیش کی تو برطانوی حکومت کے خلاف تحریک کی تائید کی۔

مسلم لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو ان مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) جماعتوں کے علاوہ ایک بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کی عنان قیادت ایسے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی جو پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلوں کے پابند ہونے پر رضامند نہ تھے، مثلاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی تھی اور بنگال میں مسٹر فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی۔ ان کی نظر صرف صوبائی معاملات تک محدود تھی اور وہ نئے آئین کے تحت صوبائی اختیار برتنے کے لیے بے قرار تھے۔ ان سب جماعتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کی مرکزیت کا قائم ہونا بہت مشکل تھا، تاہم (قائد اعظم) مسٹر جناح نے پورے ملک کا دورہ کر کے جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں، مسلمانوں میں سرگرمی عمل پیدا کی اور انہیں بےمعنی جوش و خروش کو چھوڑ کر قومی تعمیر کے لیے ٹھوس کام کرنے پر آمادہ کیا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات: کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تاہم دونوں جماعتیں نئے دستور کو غیر اطمینان بخش اور ناقابل قبول ٹھیراتی رہیں ۔ مسلم لیگ نے اپنا نصب‌العین یہ متعین کیا کہ موجودہ صوبائی خود اختیاری اور وفاقی نظام کو بدل کر جمہوری حکومتِ خود اختیاری (Democratic Self Government) قائم کی جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعے وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں ۔ دوسری طرف کانگرس نے یہ طے کیا کہ دستورِ جدید کے ماتحت انتخاب میں ضرور حصہ لیا جائے، لیکن کونسلوں میں پہنچ کر اس کے نفاذ کو بے اثر بنا دیا جائے ۔ انتخابات سے پہلے مسلم لیگ اور کانگرس نے اپنے اپنے منشور شائع کیے ۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور اردو زبان و رسم الخط کی نگہداشت پر خاص زور دیا ۔ اس منشور میں کانگرس کے ساتھ تعاون کی خاصی گنجائش موجود تھی اور (قائد اعظم) مسٹر جناح نے اپنی انتخابی تقریروں میں بھی مصالحتی لب و لہجہ برقرار رکھا البتہ تلخ تجربے کی بنا پر انھوں نے کانگرس پر یہ واضح کر دیا کہ تعاون اسی صورت میں ممکن ہوگا جب کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد جماعت تسلیم کر لیا جائے ۔

انتخابات ہوے تو ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگرس کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ وہ ان میں کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر وزارتیں بنا سکتی تھی، تاہم اس سے قبل کانگرسی رہنماؤں نے حکومت سے اس امر کی یقین دہانی چاہی کہ دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے گورنروں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ برتے نہیں جائیں گے ۔ شروع میں یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور ان صوبوں میں عارضی طور پر غیر کانگرسی حکومتیں قائم کر دی گئیں، لیکن جلد ہی اس اندیشے کے پیش نظر کہ کانگرس کے عدم تعاون سے ملک میں پھر سول نافرمانی نہ شروع ہو جائے، وائسرائے نے گاندھی جی کو یہ یقین دلایا کہ یہ اختیارات استعمال نہیں کیے جائیں گے؛ چنانچہ بنگال اور پنجاب کے سوا تمام صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔

صوبوں میں کانگرس راج: مسلم لیگ کی عوامی تنظیم کا آغاز دراصل اسی انتخاب سے ہوا تھا ۔ تنظیم اور سرمائے کی کمی کے باعث وہ ہر نشست سے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کر سکتی تھی، خصوصاً مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی نوعیت کی مضبوط اور منظم جماعتوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت کمزور تھی ۔ اس کے باوجود ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان نشستوں سے مسلم لیگ کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوے ۔ دستور کے مطابق وزارتوں میں اہم اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنا لازم تھا، لیکن اس سلسلے میں کانگرس نے مسلم لیگ کو یا تو قطعاً نظر انداز کر دیا یا اس قسم کی ناقابل قبول شرائط پیش کیں جن سے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا؛ لٰہذا مسلم لیگ نے اکثر صوبائی مجالس میں حزب اختلاف کی نشستیں سنبھالیں ۔ اسی زمانے میں جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں: کانگرس اور حکومت برطانیہ ۔ یہ صرف مسلم لیگ ہی کے نہیں بلکہ مسلمانان ہند کے جداگانہ قومی وجود سے انکار تھا، لٰہذا (قائد اعظم) مسٹر جناح نے جواب دیا کہ نہیں، تیسری پارٹی مسلمان ہیں اور مسلم لیگ ہے اور کانگرس کو یو۔ پی میں مسلمانوں کی پانچ

نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات میں مقابلہ کرنے کا چیلنج دیا ۔ انتخابات ہوئے تو کانگرس کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہر نشست سے مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوا ۔ اس کے بعد کانگرس نے مسلمانوں میں رابطۂ عوام (Mass Contact) کی مہم چلائی اور اس پر بڑی فراخدلی سے روپیہ صرف ہوا، لیکن مسلمان عوام میں اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور اس کے بعد جہاں بھی ضمنی انتخاب ہوئے، مسلم لیگ کامیاب رہی۔

کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی پھر تلخی شروع ہو گئی اور یو ۔ پی، بہار اور دوسرے ہندو اکثریتی صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے غلبے کے مظاہرے کے لیے ضروری سے ہو گئے یہاں تک کہ پولیس نے ان ہنگاموں میں لاپروائی کا ثبوت دیا اور اگر کہیں حرکت میں آئی بھی تو مسلمانوں کے خلاف ۔ کانگرسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لہرائے؛ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا؛ تعلیم کے میدان میں واردھا سکیم اور ودیامندر سکیم نافذ کرنے کی کوشش کی؛ اردو کو ہر شعبے سے بے دخل کیا جانے لگا؛ مختصر یہ کہ اس نے بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کی کوئی قیمت نہیں اور انہیں اس ملک میں اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا ۔ اس طرز عمل کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظم کیا جائے، چنانچہ مسلم لیگ نے تنظیم کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا ۔ جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں، جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں کانگرس کی صوبائی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایات کی باقاعدہ تحقیقات کرنے کے لیے پیرپور کمیٹی بنائی گئی تو لیگ اور کانگرس میں پوری طرح ٹھن گئی ۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جب منظر عام پر آئی اور ان مظالم اور ناانصافیوں کی تفصیل معلوم ہوئی جو کانگرسی حکومتوں نے مسلمانوں سے روا رکھی تھیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ بطور اقلیت آزاد ملک میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز اور کانگرسی وزارتوں کا استعفا: مسلم لیگ کی تنظیمی سرگرمیاں جاری تھیں، مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں کے اکثر مسلمان ارکان مسلم لیگ کے رکن بن چکے تھے اور پنجاب اور بنگال کے مسلمان وزرا نے کل ہند معاملات میں مسلم لیگ کی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا ۔ مسٹر محمد علی جناح اپنے خلوص و تدبر اور اعلٰی قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر قائد اعظم کے نام سے یاد کیے جانے لگے تھے اور مسلم لیگ کا یہ دعوی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ مسلم لیگ ہی وہ جماعت ہے جو مسلمانان ہند کی نیابت کرتی ہے اور کانگرس کو صرف ہندوؤں کی طرف سے بولنا چاہیے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ کا آغاز ہوگیا ۔ کانگرس نے حکومت برطانیہ سے مقاصد جنگ کی وضاحت چاہی اور اس میں حمایت کرنے کے لیے یہ شرط عائد کی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی ۔ مسلم لیگ نے ایک طویل قرارداد میں اسلامی ممالک میں برطانوی پالیسی کے نقائص اور ہندوستان میں نئے آئین کے ماتحت کانگرسی حکومتوں کے قیام کے دوران میں مسلمانوں کی شکایات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں

کی شکایات کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے، مسلم لیگ جنگ یورپ میں برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتی - اس قرار داد کی منظوری سے قبل بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر چکے تھے، لیکن انہوں نے اپنے اعلانات کو انفرادی قرار دیتے ہوئے لیگ کے فیصلے کو تسلیم کر لیا، جس سے مسلم لیگ کا وقار بہت بڑھ گیا۔

حکومت ہند نے ملک کی مدافعت کے لیے جو سکیم تیار کی تھی وہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں، دونوں جماعتیں صوبائی حکومتوں میں شریک کار ہوں، مرکزی ایگزکٹو کونسل میں ان کے نمائندے شامل کر لیے جائیں اور مرکز اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی قائم ہو جائے؛ چنانچہ وائسرائے نے ان جماعتوں کے رہنماؤں سے متعدد ملاقاتیں کیں - ۱۱ ستمبر کو شاہ انگلستان کے اعلان کی رو سے وفاق کی سکیم ملتوی کر دی گئی تاکہ مسلم لیگ اور والیانِ ریاست کے لیے تعاون کی ترغیب پیدا ہو جائے - مسلم لیگ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ التوا کے بجائے وفاق کو یکسر ترک کر دیا جائے ، کیونکہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ جمہوری اور پارلیمانی حکومت کے بھیس میں فرقۂ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ آئین کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے اور کوئی ایسا دستور نافذ نہ کیا جائے جسے مسلمان منظور نہ کریں - ادھر کانگرس کا مطالبہ تھا کہ حکومت کی طرف سے مقاصد جنگ کی وضاحت کی جائے ، اختتام جنگ کے بعد آزادی مطلق دینے کا غیر مبہم اعلان کیا جائے ، ملک کا آئندہ دستور وضع کرنے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی قائم ہو، جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اور مرکزی حکومت کے اختیارات میں ہندوستانیوں کو حصہ دیا جائے - قائد اعظم نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے صرف اس فرقے کی رائے سے دستور وضع کیا جائے گا جس کی ملک میں عظیم اکثریت ہے - ۱۸ اکتوبر کو وائسرائے نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا، جس میں بتایا گیا کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت ہندوستانیوں کی رائے کی روشنی میں اور ہندوستانیوں کی مختلف پارٹیوں، فرقوں اور مفاد کے نمائندوں اور والیان ملک کے مشورے اور تعاون سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی سکیم میں ترمیم کے لیے تیار ہوگی - اس طرح حکومت نے کانگرس کا یہ دعوٰی عملی طور پر رد کر دیا کہ وہ تمام ہندوستان کی نیابت کرتی ہے - کانگرس کی مجلس عاملہ نے اس بیان کی مذمت کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ برطانیہ کی جنگی مساعی میں مدد نہیں دے سکتی اور وزارتوں کو حکم دیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء تک کانگرس کی تمام صوبائی حکومتوں نے استعفا دے دیا - آسام میں کانگرس کی مخلوط وزارت کی جگہ سر محمد سعد اللہ کی وزارت قائم ہوئی، جس نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا - سندھ میں پہلے ہی سے مسلم لیگی وزارت قائم ہو چکی تھی - پنجاب اور بنگال میں غیر کانگرسی حکومتیں موجود تھیں، جن کی کابینہ کے مسلمان وزرا مسلم لیگ کے رکن تھے - باقی صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

چار پانچ ماہ تک کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی آپس میں اور وائسرائے کے ساتھ

مصالحت کے لیے گفت و شنید جاری رہی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ ہندو مسلم اختلافات کھل کر سامنے آ گئے ۔ کانگرس کو اپنی کل ہند نمائندہ حیثیت پر اصرار تھا ۔ وہ مسلمانوں کے سیاسی، آئینی اور اقتصادی حقوق کو جداگانہ طور پر تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھی ۔ اس کی تمام مساعی اس نقطے پر مرکوز تھیں کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دے دیا جائے، یہاں تک کہ رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ صرف دستور ساز اسمبلی کرے گی ۔ دوسری طرف قائد اعظم اپنی کوشش اور تدبیر سے حکومت برطانیہ کو اس مقام تک لے آئے کہ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اس کی سکیم پر نظر ثانی کی تجویز مان لی اور ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو اہم اور لازمی فریق تسلیم کر لیا ۔

یوم نجات: اب کانگرس نے بڑی شد و مد سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلم لیگ فرقہ دارانہ مسئلے کو ابھار کر ملک کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے ۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے اعلان کیا کہ ”برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور مسٹر گاندھی ہندوستان اور مسلمانوں دونوں پر ۔ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی کو ۔ ہم ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں“ ۔

۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو قائد اعظم کے زیر ہدایت مسلمانوں نے کانگرسی حکومتوں کے خاتمے پر پورے ملک میں یوم نجات منایا اور چھوٹے چھوٹے دیہات سے بڑے بڑے شہروں تک ایسے وسیع پیمانے پر اور اتنے امن و ضبط کے ساتھ مظاہرے کیے کہ یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے منظم اور متحد ہو چکے ہیں اور کانگرس پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے ۔

۱۷-۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنا مطمح نظر ان الفاظ میں پوری طرح واضح کر دیا تھا: ”آزاد ہندوستان میں آزاد و خود مختار اسلام، جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقۂ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں“؛ لیکن کانگرس نے مسلمانوں کے جائز حقوق اور مطالبات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ہندو مسلم تصفیے کو دستور ساز اسمبلی پر موقوف کر کے گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا ۔

۱۹۴۰ء کے آغاز میں قائد اعظم کا ایک بیان انگلستان کے اخبار *Time & Tide* میں شائع ہوا ۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی سیاسی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جمہوری طرز حکومت جو ایسے عناصر قوم کے تصور پر مبنی شو جیسے انگلستان کے لوگ ہیں، ہندوستان جیسے ملکوں کے لیے بالکل مناسب نہیں ہو سکتا جن کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہو اور یہی سادہ واقعہ ہندوستان کی تمام آئینی بیماریوں کی جڑ ہے ۔ انھوں نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور اپنے بنیادی عقائد اور طرز زندگی میں ایک سے دوسرا اس قدر مختلف ہے جتنی کہ یورپ کی اقوام ہیں؛ واقعہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف قومیں ہیں؛ لہٰذا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان میں ایک بڑی قوم ہے اور ایک چھوٹی قوم ہے تو جو پارلیمانی طرز حکومت اکثریت کے اصول پر مبنی ہوگا، لازماً اس کے معنی کثیر التعداد قوم کی

حکومت کے ہوں گے ۔ یہی بات انھوں نے گاندھی جی کے ایک خط کے جواب میں لکھی : ''مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجیے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں اور نہ ایک ملک ہے ۔ یہ بر صغیر ہے، جس میں بہت سی قومیں ہیں اور ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں''۔

دو قومی نظریے کا تاریخی پس منظر : مسلمان ہندوؤں سے قطعاً علیحدہ قوم ہیں ، یہ کوئی نیا احساس نہ تھا ۔ اس دو قومی نظریے کا ایک تاریخی پس منظر ہے ۔ قائد اعظم نے ایک بار کہا تھا : ''جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہ رہا ۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں ۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام و نسب، شعور اقدار و تناسب، قانون و اخلاق، رسم و رواج و روایات اور رجحانات و مقاصد، ہر لحاظ سے مسلمانوں کا اپنا انفرادی زاویۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات ہے، جس کا سر چشمہ خدا کی کتاب قرآن مجید ہے ۔ اس کے مقابلے میں ہندو دھرم ایک بےحد لچکدار مذہب ہے ۔ اس کے پیرووں کے عقائد میں بعد المشرقین نظر آتا ہے، لیکن اس کے معاشرتی نظام نے، جس کا تار و پود منو جی کے زمانے سے تیار ہوتا چلا آیا ہے، مختلف العقائد افراد اور گروہوں کو ہر ایسے نظام کے مقابلے میں متفق و متحد ہونے پر آمادہ کیا ہے جو اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنے پر تلا ہو۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم آریاؤں کی آمد کے بعد سر زمین ہند پر جس قوم نے بھی یلغار کی وہ کچھ عرصے بعد اپنی انفرادیت کھو بیٹھی ۔ صرف مسلمانوں ہی کی

ایک ایسی قوم تھی جس نے ہر زمانے میں اپنی جداگانہ قومیت کو برقرار رکھا ۔ ان کی اس انفرادیت کو مٹانے اور انھیں اپنے اندر ضم کرنے کی غرض سے ہندوؤں نے ان پر مختلف محاذوں سے حملہ کیا ۔ ایک محاذ تو میدان جنگ تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنی تمام عسکری قوتوں کو متحد و مجتمع کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں لے آتے تھے اور ''دھرم رکھشا'' کی خاطر باہمی عناد و مخاصمت کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے ۔ محمد بن قاسم، محمود غزنوی محمد غوری، بابر، اکبر، ابدالی، غرض جس نے بھی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا آغاز یا احیا کیا، اسے اسی صورت احوال کا سامنا کرنا پڑا ۔

دوسرا محاذ سیاسی تھا ۔ اسلامی ہند کی تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات شکست خوردہ ہندو راجا کو مطیع کرنے کے بعد نہ صرف اسے اپنی ریاست پر قریب قریب خودمختارانہ حیثیت سے قابض رہنے دیا جاتا بلکہ مرکزی حکومت میں بھی اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جاتا ۔ جب تک مرکزی سلطنت مستحکم رہتی، یہ راجا دائرۂ اطاعت سے قدم باہر نہ نکالتے، لیکن اسے زوال آمادہ دیکھتے ہی علم بغاوت بلند کر دیتے اور اگر کچھ عرصے کے لیے انھیں کھل کھیلنے کی مہلت مل جاتی تو مسلمان رعایا کی شامت آ جاتی ۔ ایسے حالات میں ان کی جان محفوظ رہتی، نہ ناموس اور نہ عبادت گاہوں اور مقدس کتابوں کا احترام ملحوظ رکھا جاتا؛ جان و مال کے تحفظ کی ضمانت صرف انھیں کو ملتی جو ہندو دھرم سے ناتا جوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ۔ مغلیہ دور میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔

اپنی سلطنت کی بقا اور استحکام کی خاطر مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی مستقل حمایت حاصل کرنے پر مجبور تھے ۔ دور مغلیہ میں ہندوؤں کی دل دہی رفتہ

رفته رفته نازبرداری کی شکل اختیار کر گئی ۔ اگر یه نازبرداری صرف حکومت کی سطح تک محدود رهتی تو شاید اتنی مهلک ثابت نه هوتی، لیکن المیه یه هوا که اسے زندگی کی هر سطح پر روا رکھا گیا ۔ دینِ الٰهی اس کا نقطهٔ عروج تها ۔ اکبر اپنی شخصی حکومت کو مستحکم کرنے کی غرض سے هندو منصب داروں کی خوشنودی کی خاطر اپنے عقائد سے بهی دستبردار هو گیا ۔ حرام چیزیں حلال هو گئیں اور حلال حرام قرار پائیں ۔ ایک دوسرے کی مذهبی تقریبات میں شرکت بهائی چارے کا ثبوت سمجهی جانے لگیں ۔ باهمی ازدواج نے اس اختلاط کو انتها تک پهنچا دیا (رك به دین الٰهی) ۔ فرق صرف یه تها که مسلمانوں کو هندوؤں کی تالیف قلوب مقصود تهی اور هندوؤں کو قرب شاهی مطلوب تها ۔ ریاست اور امیرِ ریاست کے بارے میں اُس اسلامی تصور سے سر زمینِ هند شاید کسی زمانے میں بهی آشنا نه هوئی تهی جو عهدِ خلفاے راشدین کے حوالے سے قائم هوتا هے ۔ اب دین الٰهی کی بدولت سرکاری سطح پر اسلامی تعلیمات و اقدار نشانهٔ تضحیک بنیں تو مسلمانوں کے مجموعی مفاد کا جو خیال ابتدائی فاتحین کے هاں موجود تها وه بهی باقی نه رها اور دارالاسلام اور دارالحرب کے تصورات مسخ هو گئے ۔ اس میں قصور کچھ مغلوں کے منصبداری نظام کا بهی تها، جس کا ڈهانچا هی کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا تها که عوام کی وفاداری کا مرکز اگرچه شهنشاه کی ذات تهی، مگر اپنے راجا یا صوبیدار کے واسطے سے؛ چنانچه جب کسی علاقے کے حاکم کی مرکز سے ٹهن جاتی تو وهاں کی رعایا اسے ٹوکنے کے بجاے اس کے جهنڈے تلے جمع هو جاتی اور اس کے دل میں یه خیال کبهی نه آتا که وه سیادت اعلٰی کے خلاف هتیار اٹها کر بغاوت اور ملت سے غداری کی مرتکب هو رهی هے ۔

مزید براں مسلمانوں میں مغل ۔ پٹهان، ایرانی ۔ تورانی اور سنی ۔ شیعه آویزشوں کے باعث اکثر بادشاه کو مسلمان صوبیداروں کی شورشیں فرو کرنے کے لیے راجپوت راجاؤں اور ان کی فوجوں پر بهروسه کرنا پڑتا تها؛ اسی لیے عام مسلمانوں کو هندو آقاؤں کی ملازمت کرنے اور پهر نمک حلالی کی خاطر اپنے هی بهائیوں پر تلوار اٹهانے میں کوئی قباحت محسوس نه هوتی ۔ غرض ان سیاسی عوامل کے باعث هندوستان کے عام مسلمانوں میں اپنی جداگانه قومیت کا شعور مضمحل هوتا جا رها تها اور هندوؤں نے اس سے خوب فائده اٹهایا، چنانچه معاشرتی اور مذهبی محاذ پر وه بالخصوص بے حد کامیاب رهے ۔

هندوؤں کے مذهبی عقائد بڑی حد تک ان کی معاشرتی رسوم سے عبارت رهے هیں، چنانچه مسلمانوں کے هزار ساله دور حکومت میں انهوں نے حاکم قوم کے دل میں یه بات راسخ کرنے کی پے به پے کوشش کی اس کی سلطنت کا استحکام اور ملک کا امن و امان اس میں مضمر هے که مقامی رسوم اختیار کر کے رعایا کے دل جیت لیے جائیں ۔ مقصد یه تها که مسلمان رفته رفته ان کی رسوم یا دوسرے الفاظ میں ان کے عقائد کو پهلے برداشت، پهر اختیار کر کے ان کے سانچے میں ڈهلتے چلے جائیں تاآنکه حکمران اقلیت، محکوم اکثریت میں اس طرح جذب هو جائے که ان میں کوئی تمیز باقی نه رهے ۔ یه رجحان بهگتی تحریک کی شکل میں پوری طرح نمایاں هوا ۔ اگر اس سے مقصود محض اس قدر هوتا که سیاسی اور معاشرتی سطح پر حاکم و محکوم میں محبت پیدا هو اور ان کی باهمی مغایرت جاتی رهے تو غنیمت تها، لیکن اس کے پردے میں کرشن اور کریم اور رام و رحیم کے ایک هونے کا پرچار اس زور شور سے کیا گیا که عوام و خواص اور علما و صوفیه کی ایک بڑی تعداد اس سے متأثر هوے بغیر نه رهی ۔

یہ اسلامی عقائد پر ایک کاری ضرب تھی، جس نے مسلم قومیت کی قرآنی اساس کو متزلزل کر دیا۔

اکبر اور اس کے بعد جہانگیر کے ابتدائی دور سلطنت میں ہندوؤں کو اس محاذ پر اتنی کامیابی نصیب ہو چکی تھی کہ کفار دارالاسلام میں احکام کفر کا برملا اجرا کرتے تھے۔ اور مسلمان احکام اسلام کا اظہار تک نہ کر سکتے تھے۔ اسلام کی بے چارگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ کفار علی الاعلان اسلام پر طعن کرتے اور مسلمانوں کو برا کہتے۔ احکام شرعی معطل ہو چکے تھے اور مسلمان احکام اسلامی پر عمل کرنے سے عاجز تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے مکتوبات امام ربانیؒ)۔ اس کے خلاف اولیں آواز شیخ احمد سرہندیؒ (حضرت مجدد الف ثانی) نے بلند کی۔ آپ نے فرمایا: ''رام کرشن وغیرہ، جو ہندوؤں کے معبود ہیں، پروردگار کی معمولی مخلوقات میں سے ہیں اور ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ رام و رحمٰن کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق و مخلوق ایک نہیں ہوتا اور چوں بےچوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا''۔ آپ نے ایک طرف تو مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کی اور ایک ایسے طریقۂ تصوف کی اشاعت پر زور دیا جس کی پیروی شرع اسلام کی پیروی تھی، دوسری طرف آپ نے خان اعظم، خان جہاں، صدر جہاں اور دوسرے اکابر سلطنت کو ہدایت دی کہ ملک میں جو خلاف شریعت احکام نافذ ہو چکے ہیں انہیں منسوخ کر کے اتباع شریعت اور ترویج سنت کا انتظام کیا جائے۔ اگرچہ جہانگیر کے اواخر عہد ہی میں بعض شرعی احکام دوبارہ نافذ ہونے لگے تھے، لیکن ان کا کامل طور پر اجرا و نفاذ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں عمل میں آیا جو حضرت مجددؒ کے فرزند شیخ محمد معصومؒ کا ارادت مند تھا۔

عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت اور رعایا میں جو انتشار پھیلا اس سے ہندوؤں نے ایک بار پھر فائدہ اٹھایا اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں پر چھا گئے۔ اس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا: ''جماعت مسلمین قابل رحم ہے۔ اس وقت جو عمل و دخل سرکار پادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے۔ . . . اگر غلبۂ کفر معاذاللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے جس کے دفع کرنے کی قدرت بفضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں''۔ احمد شاہ درّانی نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ اگر اس وقت مغل سلطنت کو سنبھالا دینے کے بجائے یہ فاتح افغان ہندوستان کی زمام حکومت خود تھام لیتا تو شاید اسلامی ہند کی تاریخ کا رخ بدل جاتا، لیکن ہوا یہ کہ درّانی کے رخصت ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

اسلامی دور حکومت میں ہندو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں سے مرعوب نہ تھے بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وہ بعض اوقات ان کے مذہبی احساسات کو بھی مجروح کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ مسلمان لشکروں کی سرداری کرتے، افغانستان جیسے خالص اسلامی صوبوں کی صوبیداری پر فائز ہوتے، بادشاہ کے مقرب‌ترین امیر کا درجہ حاصل کرتے، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور ملازمت، غرض ہر میدان میں مسلمانوں کے دوش بدوش اپنا حصہ پاتے اور ترقی کے وسائل

سے یکساں متمتع ہوتے ۔ انگریزی حکومت کے زمانۂ آغاز میں وہ بڑی بڑی ریاستوں کے خود مختار حاکم اور اسلامی ریاستوں کے بعض کلیدی عہدوں پر قابض تھے ۔ مسلمانوں کی قوت کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے بیشتر مواقع پر انگریزوں کا ساتھ دیا، چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی تو نئے حاکموں نے ان سے ترجیحی سلوک روا رکھا اور زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کا موقع بہم پہنچایا ۔ ان کے مقابلے میں وہ مسلمانوں سے ہمیشہ بدگمان اور انھیں اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے ۔ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے کچلنے کا سبب محض یہ نہ تھا کہ وہ یہاں کے سابق حاکم تھے، بلکہ یہ بھی کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ اخوت دینی کے مضبوط رشتے سے بندھے ہوئے تھے، جو کسی وقت بھی ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا؛ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ برصغیر میں اسلام کو ایک فعال قوت نہ رہنے دیں ۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے معاشی ترقی کی تمام راہیں بند کر دی گئیں اور دوسری طرف سرکاری ملازمین سے لے کر عیسائی مبلغین تک ہر انگریز مسلمانوں کی دل آزاری پر تل گیا ۔ عربی اور فارسی کے بعد اردو کی بیخ کنی، مقدس مقامات کی بے حرمتی، اسلامی تعلیمات کی تضحیک اور اکابر دین کی توہین کے لاتعداد واقعات اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ ادھر سرکاری مدارس میں جو کتابیں داخل نصاب کی گئیں ان میں مذہبی قومیت کو تعصب اور تنگ نظری قرار دے کر وطنی قومیت کے تصور کو ابھارا گیا اور عہد اسلامی کی تاریخ کو مسخ کر کے ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ مسلمانوں کا عہد حکومت ان کے لیے ظلم و تشدد سے عبارت تھا اور انگریزوں کا دور رحمت و برکت کا باعث ہے ۔ اس سے اکثر و بیشتر ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض و عناد کے ایسے جذبات پیدا ہوئے کہ وہ انھیں اپنی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے لگے ۔ انگریزوں کی یہ حکمت عملی اتنی کامیاب ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان اپنی ساری سعی و قوت محض کسب معاش یا ہندوؤں کے حملوں کی مدافعت میں صرف کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ اس سے مسلمانوں میں نہایت شدید احساس محرومی پیدا ہوا اور حکومت کو اپنا مخالف اور اس کے ہر اقدام کو اپنے لیے مہلک سمجھنے لگے ۔ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان یہ خلیج ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اور بھی وسیع کر دی اور جب انگریزوں نے اس ہنگامۂ خونیں کی ذمےداری مسلمانوں کے سر ڈال کر انھیں شہری حقوق تک سے محروم کرنے کی ٹھانی تو ان کی بےبسی اور بےچارگی انتہا تک پہنچ گئی ۔ ایسے حالات میں انگریزی تعلیم پانے اور انگریزی معاشرت اختیار کرنے والے مسلمانوں کو اگر علما نے موردِ طعن و ہدفِ ملامت بنایا تو اسے تعصب اور تنگ نظری قرار دینا درست نہ ہو گا ۔ انگریز اور انگریز سے متعلق ہر شے سے مقاطعے کی تحریک در حقیقت ان کے جذبۂ حریت اور ''خود حفاظتی'' کی دلیل تھی یا یوں کہیے کہ انگریزی حکومت کی حکمت عملی کے خلاف اس کے سوا احتجاج کی اور کوئی صورت انھیں نظر نہ آتی تھی ۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں حالت یہ تھی کہ بقول ہنٹر: ''یہ نظر آ رہا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑھاروں اور سقاؤں سے زیادہ نہ ہو گا'' ۔ اس زمانے میں سر سید نے قومی احیا کا بیڑا اٹھایا ۔ انھوں نے ایک طرف تو حکمرانوں

کے دل سے مسلمانوں کے متعلق بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں، تعلیم حاصل کریں، تجارت سنبھالیں اور دریں اثنا انگریزوں سے دوستانہ تعلقات استوار کریں تاکہ حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینے کے اہل بن جائیں - ابتدا میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور ''دونوں قوموں کو اپنی دو آنکھوں کے مثل'' سمجھتے تھے، لیکن ہندوؤں کے طرز عمل سے وہ جلد ہی دل برداشتہ ہوکر یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ''مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ دو قومیں دل سے کسی کام میں شریک نہ ہوں گی - ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے - جو زندہ رہے گا، دیکھے گا'' - ۱۸۸۳ء میں جب وائسرائے کی کونسل میں بلدیاتی حکومت کے متعلق مسودہ پیش ہوا تو سر سید نے اصرار کیا کہ مسلمانوں کی نامزدگی علیحدہ کی جائے اور اس کا سبب یہ بیان کیا کہ ''ہند جیسے ملک میں جہاں مختلف نسلوں میں کوئی یکجہتی نہیں . . .، جہاں جدید تعلیم نے تمام لوگوں میں مساوی ترقی نہیں کی . . .، جہاں سیاسی و معاشی زندگی میں نسل و عقیدہ کے فرق اور ذات کے امتیازات کو اہمیت حاصل ہے اور یہ عناصر نظم و نسق اور ملکی فلاح سے متعلق مسائل پر اثر انداز ہوتے ہیں، عام انتخابات کے طریقے کو اختیار کرنا قرین مصلحت نہ ہوگا - اکثریت کامل طور پر اقلیت کے مفادات پر حاوی ہو جائے گی'' - ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس قائم ہوئی اور اس نے حکومت پر زور دیا کہ سرکاری نظم و نسق میں ہندوستانیوں کو عام امتحان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جائے - سر سید نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی تجاویز ایسے ممالک میں قابل عمل ہو سکتی ہیں جہاں ایک قوم آباد ہو، لیکن ہند میں، جہاں دو قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں، اس قسم کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا مطلب ہندوؤں کو مسلمانوں پر مسلط کرنا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی کہ انہیں ہرگز ہندوؤں کے ایسے مطالبات کی تائید نہ کرنی چاہیے، کیونکہ نیشنل کانگرس جو اس قسم کے مطالبات کرتی ہے وہ ہرگز ہند کی تمام اقوام بالخصوص مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے - سر سید کا یہ موقف ان کی عظیم سیاسی بصیرت پر شاہد ہے - ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے قومی تشخص کے تصور کا احیا کیا - یہ تصور، جو دراصل مسلمانوں کے عقائد کا جزو تھا، لیکن جسے وہ اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں اپنی رعایا پروری اور رواداری کے باعث نظر سے اوجھل کر چکے تھے اور جسے انگریزوں نے ہندوؤں کے تعاون سے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کی تھی، ایک بار پھر ابھرا - مسلم لیگ کا قیام اور مسلمانوں کی جداگانہ حقوق کے لیے طویل جد و جہد اسی تصور کی مرہون منت ہے.

سر سید کی طرح مولانا محمد علی کا بھی مدت تک یہی نظریہ رہا کہ ہندوستان کی آزادی ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ جد و جہد سے حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس اتحاد کو شروع ہی سے انہوں نے اتحاد برنائے ضرورت "marriage of convenience" قرار دیا تھا، جس کی کامیابی کے لیے حب الوطنی کا پرجوش جذبہ اور آزادی کی بے پناہ تڑپ ایک ضروری شرط تھی - اس جذبے کے زیر اثر وہ اتنی دور نکل گئے کہ تحریک خلافت جیسی خالص اسلامی بلکہ بین الملّی تحریک کی قیادت ایک

غیر مسلم گاندھی جی کے حوالے کر دی۔ بایں ہمہ ہندوؤں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ان کے منافرت انگیز رویّے نے کبھی اردو کی مخالفت کا روپ دھارا اور کبھی گئو رکھشا کا۔ کسی نے مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور قرار دے کر عرب لوٹ جانے کی تلقین کی اور کسی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے مذہب، تاریخ، روایات، ثقافت، ہر شے کو ترک کر کے پراچین بھارت کے کلچر، یعنی ہندو دھرم، کو صدق دل سے اپنا لیں۔ عملاً مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے کے باوجود ہندو ان کی جداگانہ حیثیت کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ سیاسی پلیٹ فارم پر ہمیشہ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ گونجا اور دونوں کو ایک ہی قوم ٹھیرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ مقصد صرف ایک تھا کہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت کے اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیں اور مسلمان ان کے غلام بن کر رہیں۔ نہرو رپورٹ میں ان کے دل کی بات کھل کر سامنے آ گئی تو مولانا محمد علی جیسے کٹّر کانگرسی کے سامنے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اس جماعت سے علیحدہ ہو جائیں جسے نمائندہ حیثیت دلوانے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں کانگرس سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے واشگاف الفاظ میں دو قومی نظریے کا اعلان کیا۔ آپ نے کہا: "نسل اور مرزبوم وہی لفظ ہے جس کو بھومی اور جاتی کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں جانوروں کی پہچان کی ہیں، انسان کی پہچان کے لیے نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اسلام نے تیرہ سو برس ہوئے کہ رسول اللہؐ کی معرفت تمام دنیا کو بتا دیا تھا کہ دنیا کے دو ٹکڑے ہیں: ایک اسلام اور دوسرا کفر۔ ۔ ۔ ۔ کفر ایک ملت ہے اور اسلام ایک ملت۔ ۔ ۔ ۔"۔

مسلم قومیت کی بنیاد نسل و وطن پر نہیں بلکہ دین پر ہے۔ یہی بات ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں کہی تھی: "مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری قوم کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اُس برادری میں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے، لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ وہ قومیت کو بھی کسی خارجی یا حسّی اصول، مثلاً وطن، پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال، جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے، ایک طرح سے مادّی شے کے تابع ہے، جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے، اس لیے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا" (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر)۔ اقبال کا سارا کلام ان کے اسی نظریے کا آئینہ دار ہے۔

۱۹۳۰ء میں کانگرس کی سول نافرمانی سے ڈر کر حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس بلائی تو اقبال نے خبردار کیا کہ "ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہو گا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں، اس کا مطلب

صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ طور پر خانہ جنگی کے لیے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے''۔

اسی سال الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اقبال نے اپنے نظریے کی مزید وضاحت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اہل مغرب کے سیاسی نظام نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی ہے اور ان کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی ذات تک محدود ہے، اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں؛ لیکن مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، روح اور مادّہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں اور اس کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی الٰہی پر ہے؛ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب‌العین اس کے معاشرتی نظام سے الگ نہیں، بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا جو اسلام کے بنیادی اصول کے منافی ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے کہا: ''اب تک ہم نے باھمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں . . . ۔ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیّتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم سب تغلب و اقتدار کے خواھش مند ہیں . . . ۔ ہم اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ جو اختیارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو چکے ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں ۔ اگرچہ ظاھری طور پر ہمیں ایک نہایت روادارانہ حب‌الوطنی کا ادّعا ہے، لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ھوس بدستور کام کر رہی ہے . . . ۔ اگر فرقہ‌وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدّن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے''۔

اسی خطبے میں اقبال نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

اقبال کی تمنا اور آرزو کو چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان کا جامہ پہنایا۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے لنڈن میں پاکستان نیشنل موومنٹ کے نام سے ایک جماعت تشکیل کی اور *The Millet of Islam and the Menace of Indianism* اور دوسرے پمفلٹوں کی اشاعت اور انگلستان میں عام جلسوں کے انعقاد سے پڑھے لکھے مسلمانوں میں یہ تڑپ پیدا کی کہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے اور اس کا نام ان صوبوں کے ناموں کے ابتدائی یا آخری حروف کو لے کر پاکستان تجویز کیا (پ = پنجاب، ا = افغانی یا سرحدی صوبہ، ک = کشمیر، ستان = بلوچستان)۔

الٰہ آباد کے اجلاس ۱۹۳۰ء میں اقبال کے خطبۂ صدارت سے قطع نظر مسلم لیگ کی طرف سے کسی اسلامی ریاست کے فوری قیام کا مطالبہ پیش نہیں ہوا تھا بلکہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار داد کی تعمیل ہی پر زور دیا گیا جس کا منشا

یہ تھا کہ ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جس میں وحدتیں (units = یعنی صوبے) کلّی طور پر بااختیار ہوں اور مرکز ڈھیلا ڈھالا ہو اور اختیارات کے لیے وحدتوں کا محتاج ۔ اس صورت میں ہندوستان متحد رہتا اور مسلم اکثریتی علاقوں کو داخلی اختیارات کے حقوق مل جاتے، لیکن ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی اور کوئی ایسا طرز حکومت نہ بننے دیا جس میں ایک دوسرے کے جائز حقوق کے تحفظ کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ۔ ۱۹۳۵ء کا دستور مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھا اور جب اس کے تحت صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں تو کانگرس کے طرز عمل کی بنا پر مسلمانوں کے سامنے صرف دو راہیں کھلی رہ گئیں کہ یا تو وہ مسلم قومیت کے تصور سے کنارہ کش ہو کر ہندوستانی قومیت اختیار کر لیں اور ہندو معاشرے میں جذب ہو جائیں یا اپنے لیے ملک میں ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کی کوشش کریں ۔ پہلی راہ ہلاکت کی طرف لے جاتی تھی، لہٰذا سیاسی شعور اور بصیرت رکھنے والے مسلمان دوسری صورت پر غور کرنے لگے ۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور قائد اعظم میں عرصے تک گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی ۔ ۱۹۳۶ء ہی میں علامہ اقبال نے اس پر اصرار شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کا برملا مطالبہ کیا جائے ۔ عوامی پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کے باعث یہ مطالبہ خواص کی مجلسوں سے نکل کر عوام کی نوک زبان پر آنے لگا اور ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی طرف سے باقاعدہ پیش کر دیا گیا۔

قرارداد پاکستان : مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاھور میں منعقد ہوا ۔ ۲۲ مارچ کو قائد اعظم نے دو قومی نظریے کی مکمل وضاحت کی اور اس کی روشنی میں ملک کے آئینی مسئلے کا حل تجویز کیا ۔ انھوں نے کہا : ''یہ مسئلہ، جو ہندوستان میں ہے، (دو) فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ (دو) قوموں کے مابین ہے اور اسے بین الاقوامی ہی مان کر حل کیا جائے . . . ۔ اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے (دو) بڑی اقوام کے لیے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں، جن میں وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں . . . ۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ برصغیر ہند کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی رقبے، جو یکجا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے تھے، اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دیے گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں ۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات یا آٹھ خود مختار ریاستیں ہیں . . . ، مگر ہندوستان کے اتحاد کے لیے اور ایک قوم کی بنیاد پر، جس کا کوئی وجود نہیں، یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہیے . . . ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یکجا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو تو اس کے معنی صرف ہندو راج ہوں گے . . . ۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں . . . ۔ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہیے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو''۔

۲۳ مارچ کو عام اجلاس میں یہ قرار داد منظور ہوئی کہ کوئی آئینی منصوبہ اس کے بغیر اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہو گا کہ وہ مندرجۂ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو : حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد و بدل کر کے متصل وحدتوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان باعتبار تعداد اکثریت

میں ہیں (جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی منطقوں میں) یک جا ہو کر خود مختار ریاستیں بن جائیں اور ان میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کی خاطر ان کے مشورے سے بقدر ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کیے جائیں؛ اسی طرح کے تحفظات ہندوستان کے دوسرے حصوں میں، جہاں ہندو اکثریت میں ہیں، وہاں کی اقلیتوں کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں.

خطبۂ صدارت یا قرار داد میں پاکستان کا لفظ نہیں آیا تھا۔ اسے محض تقسیم ہند کا ریزولیوشن کہا گیا، البتہ بیگم محمد علی نے اپنی تقریر میں اسے پاکستان کا ریزولیوشن کہا۔ پھر ہندو اخبارات نے طعن و طنز کے طور پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زد عام ہو گیا اور بالآخر مسلم لیگ نے بھی اسے قبول کر لیا اور اس مملکت کا نام پاکستان ھی قرار دے دیا جس کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھی.

اس قرار داد کے منظور ھوتے ھی کانگرس اور اس کی ہم‌نوا جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ھو گیا ۔ مخالفین کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے، اس لیے وہ تقسیم نہیں ہو سکتا؛ اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے اور تبدیل مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی؛ پاکستان کے معاشی وسائل اس کی کفالت کے متحمل نہیں ہو سکتے، وغیرہ وغیرہ۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیے گئے اور زبردست مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود مسلمانان ہند میں یہ مطالبہ مقبول ہوتا چلا گیا.

اگست کی پیشکش : جون ۱۹۴۰ء میں قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی آئینی تجاویز پیش نہیں کرے گی، چنانچہ حکومت برطانیہ نے ”اگست کی پیشکش“ میں اعلان کیا کہ وہ کوئی ایسا نظام حکومت منظور نہیں کرے گی جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقتور عناصر قبول نہ کریں ۔ حکومت جنگ کے بعد بااثر اور مقامی جماعتوں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی بھی بنانے پر راضی ہوگئی تاکہ نیا آئین تیار ہوسکے۔ فی‌الحال تمام جماعتوں سے جنگی مساعی میں امداد کی درخواست کی گئی ۔ چونکہ مسلم لیگ کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں صرف دو نشستوں کی پیشکش کی گئی تھی اس لیے مسلم لیگ نے اسے مسترد کر دیا ۔ کانگرس نے بھی یہ پیشکش ٹھکرا دی اور گاندھی جی نے ۱۹۴۰ء میں ستیہ گرہ شروع کیا، جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکا ۔ اس کا مقصد حکومت کو مجبور کرنا تھا کہ وہ اقتدار کانگرس کو منتقل کر دے ۔ مسلم لیگ نے اس بنا پر اس کی مذمت کی کہ اس کا مطلب دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا تھا۔ مسلمان اس تحریک سے الگ رہے اور مسلم لیگ کی ہدایت پر تین مسلمان صوبائی وزرائے اعلٰی سر سکندر حیات (پنجاب)، فضل الحق (بنگال) اور سر سعد اللہ (آسام) قومی دفاعی کونسل سے مستعفی ھو گئے ۔ سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز کو ایسا نہ کرنے پر مسلم لیگ سے نکال دیا گیا؛ بعد میں فضل الحق کو بھی اسی باعث جماعت سے خارج کر دیا گیا.

اس زمانے میں اتحادیوں کو جرمنی کے مقابلے میں پے در پے پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستان سے ہر ممکن امداد کی خواھاں تھی ۔ ادھر جاپان بھی جنگ میں شریک ہوگیا اور جب اس کی فوجیں فلپائن، ملایا

اور برما کو فتح کرتی ہوئی ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئیں تو ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے ''منصفانہ اور مکمل حل'' کے لیے سرسٹیفورڈ کرپس کو خاص تجاویز دے کر بھیجا، جو دو حصوں پر مشتمل تھیں: پہلے حصے کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں فوراً ایسی حکومت قائم کر دی جائے جس کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں، صرف امور جنگ کی ذمے داری تا اختتام جنگ حکومت برطانیہ کے ہاتھ رہے اور کمانڈر انچیف قومی حکومت میں وزیر جنگ ہو؛ دوسرے حصے کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے پر انتخابات ہوں اور مختلف صوبوں کی قانون ساز مجالس سے ان کے دس فی صد ارکان مجلس دستور ساز کے لیے چنے جائیں۔ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ اس مجلس کا بنایا ہوا دستور حکومت برطانیہ منظور کر لے گی؛ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی؛ اگر کوئی صوبہ ہند یونین سے الگ رہنا چاہے گا تو اسے اجازت ہوگی اور مذہبی اور نسلی اقلیتوں کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے گا۔ یہ تجاویز کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیں۔ تاریخ پاکستان کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں پہلی بار برطانوی حکومت نے برصغیر کے بعض حصوں کی خود مختاری اور علیحدگی کے حق کو تسلیم کیا اور یہ مطالبۂ پاکستان کی روزافزوں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک: جنگ عظیم کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی قرارداد منظور کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی غرض سے ملک گیر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد اس نے ایک جارحانہ اور متشددانہ شکل اختیار کر لی۔ حکومت نے انتہائی سختی سے اسے دبا دیا۔ بہت سے ممتاز کانگرسی رہنما بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور کئی ماہ بعد امن قائم ہوا۔ مسلمان من حیث المجموع اس تحریک سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ مسلم لیگ نے اس تحریک کی مخالفت کی، مگر حکومت کے تشدد کی بھی مذمت کی۔

اسی دوران میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے صوبوں — بنگال، آسام، سندھ اور سرحدی صوبے — میں وزارتیں بنا کر مسلمان عوام پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ پنجاب میں سر خضر حیات ٹوانہ نے، جو سر سکندر کی وفات (۱۹۴۲ء) کے بعد پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے سربراہ بنے تھے، قائد اعظم کی ہدایت کے باوجود اپنی پارٹی کا نام بدلنے سے انکار کر دیا، لہٰذا انھیں اور ان کے ہم‌نواؤں کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے وہاں مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی مہم شروع کر دی۔

''اچاریہ فارمولا'' اور گاندھی - جناح مذاکرات: مئی ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی جی کو احساس ہوا کہ مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی مؤثر ثابت نہیں ہوسکتی، چنانچہ وہ راجگوپال اچاریہ کی تجویز کی بنیاد پر مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے کے لیے قائد اعظم سے ملنے پر تیار ہوگئے۔ ''اچاریہ فارمولا'' میں مطالبۂ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ایک کمیشن مقرر ہوگا جو مسلم اکثریت کے علاقوں کی حد بندی کرے گا اور بالغ رائے دہی کے اصول پر ان علاقوں کے عوام یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں؛ اگر اکثریت نے علیحدگی کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اس صورت میں دونوں

مملکتیں دفاع، تجارت، رسل و رسائل اور دوسرے ضروری امور میں تعاون کے لیے باہمی معاہدہ کریں گی ۔ اس فارمولے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شرکت، کانگرس سے تعاون اور مسلم مملکت کے قیام اور حد بندی کے سلسلے میں اکثریت پر مکمل اعتماد کرے ۔

دونوں رہنماؤں کے درمیان اٹھارہ روز تک مذاکرات جاری رہے، لیکن کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا، کیونکہ ایک تو ہندو اکثریت والی عبوری حکومت پر مکمل اعتماد مسلم لیگ کے لیے گزشتہ تجربات کی بنا پر قابل قبول نہ تھا، دوسرے یہ کہ ایک طرف گاندھی جی نے دونوں ریاستوں کے باہمی معاہدۂ تعاون میں امور خارجہ اور مالیات کو بھی شامل کرنے پر زور دیا اور دوسری طرف وہ اس بات پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کہ ہندووں اور مسلمانوں کو دو قومیں اور مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیں ۔ بہر حال اس کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ دنیا کی نظر میں گاندھی جی نے تقسیم ہند کا اصول تسلیم کر لیا ۔

ویول منصوبہ : ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم کے خاتمے پر ایک بار پھر ملک کی آئینی گتھی سلجھانے کے لیے نئے وائسرائے لارڈ ویول نے ایک منصوبہ پیش کیا، جس کی رو سے مرکز کی ایگزکٹو کونسل میں ہندووں اور مسلمانوں کے لیے مساوی نمائندگی تجویز کی تھی ۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس شملے میں طلب کی، جو ناکام رہی ۔ ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ کانگرس کو بر صغیر کی جملہ اقوام کی نمائندگی کا دعوی تھا اور وہ تمام ہندو نشستوں کے علاوہ مسلم نشستوں میں بھی اپنا حصہ چاہتی تھی ۔ قائد اعظم اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان نمائندوں کی نامزدگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے ۔ کانفرنس کی ناکامی کے باوجود یہ بات واضح ہو گئی کہ دونوں جماعتوں کے دعوے انتخابات ہی کے ذریعے پرکھے جا سکتے ہیں ۔

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات : ۱۹۴۶ء کے اوائل میں انتخابات ہوئے ۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے کل ووٹوں کا ۷۵ فی صد حاصل کیا اور صوبائی اسمبلیوں میں ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۵ اور مرکزی اسمبلی کی پوری ۳۰ نشستیں جیت کر ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ۔

صوبائی حکومتوں کی تشکیل کے وقت کانگرس نے اپنے سابقہ طرز عمل کو برقرار رکھتے ہوئے ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور وہاں خالص کانگرسی حکومتیں قائم ہو گئیں ۔ اس کے برعکس مسلم اکثریتی صوبوں میں اس نے حتی المقدور کوشش کی کہ وہاں تمام غیر مسلم اور معدودے چند غیر لیگی مسلمان ارکان مل کر مخلوط وزارت بنا لیں تاکہ مسلم لیگ اقتدار سے محروم رہے؛ چنانچہ پنجاب میں اگرچہ مسلم لیگ مسلمانوں کی ۸۶ میں سے ۷۳ نشستوں پر قابض تھی، لیکن کانگرس کی زیر سرپرستی خضر حیات ٹوانہ نے ہندو اور سکھ ارکان کے ساتھ مل کر وزارت بنا لی اور اس سلسلے میں صوبے کے انگریز گورنر نے بھی اس گٹھ جوڑ کا ساتھ دیا ۔ اسی طرح صوبۂ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب نے غیر مسلم ارکان کے تعاون سے کانگرسی وزارت بنائی؛ البتہ سندھ اور بنگال میں یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور وہاں علی الترتیب سر غلام حسین ہدایت اللہ اور حسین شہید سہروردی کی قیادت میں مسلم لیگی حکومتیں قائم ہو گئیں ۔

۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے

منتخب ارکان اسمبلی کا ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ "شمال مشرقی علاقے میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک خود مختار مملکت قائم کی جائے" اور اعلان کیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے یا مرکز میں مسلم‌لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمان اپنی بقا اور قومی تحفظ کے لیے تمام ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں گے۔

کیبنٹ مشن : برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی، جو بوجوہ ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے کی خواہاں تھی، چنانچہ انتقال اقتدار کے طریق کار کے بارے میں ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے لیے ایک وزارتی مشن بھیجا گیا ۔ اس وفد نے، جو لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند)، سرسٹیفورڈ کرپس اور سر اے ۔ وی ۔ الیگزنڈر پر مشتمل تھا، ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچ کر سیاسی مذاکرات شروع کر دیے ۔ طویل مشاورت کے بعد ۱۶ مئی کو وزارتی وفد نے نئے منصوبے کا اعلان کیا، جس میں یہ امورشامل تھے : (الف) برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل وحدتِ ہندوستان کے قیام کے لیے ایک نمائندہ ادارے کی تشکیل؛ (ب) مرکز میں عبوری حکومت کا قیام اور (ج) صوبوں کی گروہ بندی ۔ وحدت (یونین) کے لیے تجویز ہوا کہ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات اس کے دائرۂ اختیار میں ہوں گے اور تمام دوسرے اختیارات صوبوں کو ملیں گے ۔ صوبے مندرجۂ ذیل تین گروہوں میں تقسیم ہوں گے اور ہر ایک کی اپنی انتظامیہ اور مقننہ ہو گی : (الف) شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبے، یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان؛ (ب) شمال مشرق کے مسلم اکثریتی صوبے، یعنی بنگال اور آسام؛ (ج) باقی تمام صوبے ۔ نئے آئین کے بعد صوبوں کو مقننہ میں کثرت رائے کی بنا پر اپنا گروہ تبدیل کرنے کی اجازت ہو گی ۔ عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں یہ تجویز ہوا کہ وائسرائے کا حق تنسیخ اور برطانوی حکومت کی بالا دستی نئی حکومت کو منتقل نہیں ہو گی، البتہ ایگزکٹو کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے اور چودہ ارکان میں سے پانچ پانچ کانگرس اور مسلم لیگ کے اور باقی چار اقلیتوں کے نمائندے لیے جائیں گے ۔ آئین ساز ادارے کے لیے تمام صوبوں کو آبادی کے تناسب سے اس طرح نمائندگی دی جائے گی کہ بڑی اقلیتوں کو ان کی آبادی کے اعتبار سے نیابت مل جائے، نیز کسی صوبے میں ہر فرقے کے لیے جتنے نمائندے معین کیے گئے ہیں ان کا انتخاب اس صوبے کی مجلس قانون ساز کے وہی ارکان کریں جو اس فرقے کے ہوں ۔ اس سلسلے میں صرف تین فرقے تسلیم کیے گئے : عام، مسلمان اور سکھ ۔ تجویز کیا گیا تھا کہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے نمائندے نئی دہلی میں جمع ہو کر چیرمین کا انتخاب کریں گے اور تین فریقوں میں بٹ جائیں گے : (الف) مدراس، بمبئی، صوبجات متحدہ، بہار، صوبۂ متوسط اور اڑیسہ؛ (ب) پنجاب صوبۂ سرحد اور سندھ؛ (ج) بنگال اور آسام ۔ یہ تینوں فریق نہ صرف اپنے مجموعے کے صوبوں کے لیے دستور کا فیصلہ کریں گے بلکہ اس بات کا بھی کہ مجموعے کا بھی کوئی دستور قائم یا وضع کرنا ہے اور اگر کرنا ہے تو کونسے شعبے مجموعے کے مرکز کی تحویل میں ہوں گے اور کونسے صوبوں میں ۔ مجموعوں کے دستوروں کا فیصلہ ہونے کے بعد تینوں فریق پھر یکجا ہو کر اور ریاستوں کے اشتراک سے مکمل مجلس دستور ساز بنا کر کل ہند یونین

کا دستور وضع کریں گے، جس کے بعد حکومت برطانیہ اور مجلس دستور ساز کے درمیان ان امور کے بارے میں گفت و شنید ہوگی جو انتقال اختیارات سے پیدا ہوں گے۔

مسلم لیگ اس منصوبے سے غیر مطمئن تھی، پھر بھی ۶ جون کو اسے اس بنا پر منظور کر لیا گیا کہ اس میں قیام پاکستان کی بنیاد موجود تھی۔ کانگرس مرکزی حکومت کے محدود اختیارات پر خوش نہ تھی، لیکن اس نے آئین ساز اسمبلی میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی۔ دونوں جماعتوں کا خیال تھا کہ نئے حالات اسی کے حق میں جائیں گے۔ ۱۶ جون کو وزارتی وفد نے چھے کانگرسیوں (جن میں ایک کا تعلق پس‌ماندہ اقوام سے ہوگا) پانچ مسلم لیگیوں، ایک سکھ، ایک عیسائی اور ایک پارسی کو نئی ایگزکٹو کونسل میں نمائندگی کے لیے چنا۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ قبول کر لیا، لیکن کانگرس نے اس میں قوم پرست مسلمان کا نام نہ پا کر شمولیت سے انکار کر دیا۔ ۱۶ جون کے اعلان میں وائسرائے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر ایک جماعت شرکت نہ کرے تو وائسرائے دوسری تعاون کرنے والی جماعتوں پر مشتمل عبوری حکومت بنا لے گا؛ لیکن کانگرس کے انکار کے بعد وہ اپنے وعدے سے پھر گیا، جس سے مسلم لیگ کو سخت مایوسی ہوئی۔

۱۰ جولائی کو کانگرس کے نئے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پریس کانفرنس میں وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کے بارے میں کانگرس کا موقف بالکل تبدیل کر دیا۔ انھوں نے صوبوں کی گروپ بندی کے اصول کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم بغیر کسی شرط اور سمجھوتے کے دستور ساز اسمبلی میں جانے پر رضامند ہوئے ہیں؛ اس میں ہم کیا کریں گے، یہ طے کرنے کے لیے ہم بالکل آزاد ہیں۔

مسلم لیگ کا رد عمل اور راست اقدام:

اس اعلان سے یہ عیاں ہو گیا کہ کانگرس نے وزارتی وفد کے منصوبے کو مسمار کرنے کے لیے اسے منظور کیا ہے۔ قائد اعظم نے کانگرس اور حکومت برطانیہ پر کڑے اعتراضات کیے اور شواہد سے ثابت کیا کہ برطانوی حکومت کانگرس کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کے حقوق پامال اور اپنے وعدوں سے روگردانی کر رہی ہے۔ ایک طرف کانگرس مشروط شمولیت کی پیشکش کر رہی تھی اور منصوبے کو من مانے معنی پہنا رہی تھی، دوسری طرف آئین ساز اسمبلی پر خلاف اصول فیصلے کرنے کی صورت میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ چونکہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس لیے جولائی کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کی کونسل نے وزارتی منصوبے کی منظوری واپس لیتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلمان پاکستان کی خود مختار مملکت حاصل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے اور ایسی ہر کوشش کی مخالفت اور اس کا ہر ممکن طریق سے مقابلہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ان کی رضامندی کے بغیر دستور وضع کرنے کی غرض سے کوئی نظام قائم کرنے، یا کوئی دستور مسلط کرنے، یا مرکز میں کوئی عبوری حکومت قائم کرنے کے لیے ہو۔ کونسل نے یہ بھی اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے اور موجودہ برطانوی غلامی اور مستقبل کے اس ہندو تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس کے منصوبے بن رہے ہیں راست اقدام کیا جائے۔ اس سلسلے میں قوم سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد اور منظم ہو کر ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور حکومت کے طرز عمل کے

خلاف احتجاج کے طور پر تمام سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں۔

اب کانگرس کو احساس ہوا کہ اس کے صدر کے بیان کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں ۔ ۱۰ جولائی کو اس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں پنڈت نہرو کے بیان کی تردید تو نہیں کی گئی البتہ یہ اعلان ضرور کر دیا گیا کہ کانگرس نے وزارتی سکیم پوری کی پوری منظور کی ہے ۔

دستور ساز اسمبلی اور عبوری حکومت:

اس اثنا میں دستور ساز اسمبلی منتخب ہو گئی ۔ مسلم لیگ نے اٹھہتر میں سے تہتر مسلم نشستوں پر قبضہ کیا اور کانگرس نے نو کے علاوہ تمام غیرمسلم نشستوں پر۔ عارضی حکومت بنانے کی تجویز از سر نو زندہ ہوئی ۔ کانگرس اگرچہ صوبوں کی مجموعہ‌بندی کی تنسیخ اور دستور ساز اسمبلی کو خود مختاری دینے کا مطالبہ کر رہی تھی، تاہم اسے عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دے دی گئی، جسے صدر کانگرس نے قبول کر لیا ۔ اس کے بعد قائداعظم کو کہا گیا کہ وہ بھی اس میں شرکت کر لیں، جسے انہوں نے اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ صرف ہندو قوم کی جماعت کو وزارت بنانے کی دعوت دے کر وائسرائے نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی توہین کی ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس نے وزارتی بیان کی شرائط قبول نہیں کیں۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی طرف سے یوم راست اقدام منایا گیا تاکہ حکومت کی غلط اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف اظہار احتجاج کرتے ہوئے کامل ہڑتال کی جائے، جلسے کیے جائیں اور مسلم لیگ کے موقف کی تشریح کی جائے ۔ ہندوؤں نے اس سادہ پروگرام کو اپنے خلاف قرار دیا ۔ کلکتے میں مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر حملے ہوئے تو شہر میں فساد برپا ہوگیا، جس میں پانچ ہزار ہلاک اور پندرہ ہزار زخمی ہوئے۔

۲۴ اگست کو سرکاری اعلان میں شاہ انگلستان کی منظوری سے عارضی حکومت کے لیے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ۔ اور طے پایا کہ نئی حکومت ۲ ستمبر کو قائم ہو گی ۔ اس اعلان کے بعد وائسرائے نے کلکتے کا دورہ کیا، جس کے دوران میں اسے احساس ہوا کہ اگر دونوں قوموں میں سمجھوتا نہ ہوا تو سارے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی ۔ لارڈ ویول نے چاہا کہ کانگرس واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دے کہ نئے دستور کے تحت نئے انتخابات تک صوبے انہیں مجموعوں میں رہیں گے جن میں وزارتی وفد نے انہیں رکھا ہے، لیکن ادھر تو کانگرس نے مطالبہ کیا کہ مجموعہ‌بندی کے مسئلے کے بارے میں فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جائے اور ادھر برطانیہ کی لیبر حکومت نے وائسرائے کو ہدایت دی کہ وہ کوئی ایسی کارروائی نہ کریں جس سے کانگرس اور حکومت کے درمیان تعلقات منقطع ہو جائیں؛ چنانچہ ۲ ستمبر کو عبوری حکومت قائم ہوگئی۔

اب لارڈ ویول نے ایک بار پھر مفاہمت پیدا کرنے کے لیے گاندھی جی، پنڈت نہرو اور قائد اعظم سے ملاقاتیں کیں ۔ نواب بھوپال کی وساطت سے قائد اعظم اور گاندھی جی بھی باہم ملے اور اس فارمولے پر ان کا اتفاق رائے ہو گیا کہ جمہوری اصولوں کے مطابق مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی نیابت کا حق رکھتی ہے، لیکن کانگرس بھی اس امر میں آزاد ہے کہ اپنے ارکان میں سے جسے چاہے اپنا نمائندہ منتخب کرسکتی ہے ۔ بایں ہمہ پنڈت نہرو نے اس پر اصرار کیا کہ کانگرس غیر مسلموں کے علاوہ ان مسلمانوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جو کانگرس کے ساتھ ہیں، چنانچہ اس گفت و شنید کا

کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

مسلم لیگ کے لیے بڑا نازک مقام آ گیا تھا۔ ہندو مسلم منافرت اس درجہ پھیل چکی تھی کہ جگہ جگہ خونیں فسادات شروع ہوگئے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے یہ بات انتہائی مہلک تھی کہ مرکزی حکومت کے انتظام کا پورا میدان کانگرس کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے، چنانچہ قائد اعظم نے اس شرط پر حکومت میں شرکت منظور کر لی کہ اگر کانگرس کو اس کے حصے کے ارکان میں ایک مسلمان کو نامزد کرنے کا حق دیا جا رہا ہے تو مسلم لیگ کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنے حصے میں سے پسماندہ اقوام یا دوسری اقلیتوں کے کسی شخص کو نامزد کرے۔ ۱۲ اکتوبر کو وائسرائے نے اس شرط کی توثیق کر دی اور ۲۵ اکتوبر کو مسلم لیگ کی شرکت سے عبوری حکومت مکمل ہوگئی۔

مخلوط حکومت بن جانے کے بعد بھی مسلم لیگ اور کانگرس کی آویزش جاری رہی ۔ ایک تو شعبوں کی تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا تھا، دوسرے کانگرس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ پنڈت نہرو نے ایسا رویہ اختیار کیا گویا وہ وزیراعظم ہیں اور امور داخلہ و نشریات کے وزیر سردار پٹیل نے اپنے محکموں میں ایسی جابرانہ پالیسی پر عمل شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک غیر اور حریف حکومت کے زیر تسلط آ گئے ہیں۔ مسلم لیگ کے نزدیک عبوری حکومت وائسرائے کی مخلوط ایگزکٹو کونسل تھی اور کانگرس کے نزدیک آزاد نیشنل گورنمنٹ۔ اب کانگرس چاہتی تھی کہ مسلم لیگ مجلس دستور ساز میں بھی شریک ہو جائے تاکہ اس کا اجلاس منعقد کر کے وزارتی سکیم کے اس حصے کو کثرت رائے سے منسوخ کر دیا جائے جو مسلم اکثریت کے صوبوں کی مجموعہ بندی اور مجموعوں اور صوبوں کے وضع دستور سے متعلق تھا اور ملک میں ایک مرکزی وحدانی حکومت قائم کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اسی دوران میں بہار میں کانگرسی حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں کے خلاف منظم فسادات برپا ہوئے۔ ۲۵ اکتوبر سے ۱۰ نومبر تک مسلم بستیوں پر ہزاروں کی تعداد میں مسلح ہندو حملہ آور ہوتے رہے۔ تیس ہزار مسلمان قتل ہو گئے اور ڈیڑھ لاکھ پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس کے فوراً بعد گڑھ مکتیشر میں گنگا اشنان کے میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اس طرح بدامنی صوبجات متحدہ کے شمالی اور مغربی اضلاع تک پھیل گئی۔ ان حالات میں قائد اعظم نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ دستور ساز اسمبلی کو غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دیا جائے اور حکومت اپنے تمام وسائل اور پوری توجہ امن و انتظام پر صرف کرے۔ اس مطالبے کو ماننے کے بجائے مجلس دستور ساز کے انعقاد کے لیے ۹ دسمبر کی تاریخ مقرر کر دی گئی ۔ مسلم لیگ نے اس مجلس میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور کانگرس نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ یا تو مسلم لیگ مجلس دستور ساز میں آئے یا عبوری حکومت سے استعفیٰ دے دے۔ مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خان نے وائسرائے پر واضح کیا کہ وہ مستعفی ہونے کے لیے تیار ہیں، لیکن ان کی جماعت وزارتی وفد کا منصوبہ اس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک ملک معظم کی حکومت یہ یقین نہ دلا دے کہ صوبے فریقوں میں مجتمع ہوں گے اور یہ فریق اور ان کے مجموعے کثرت رائے سے اپنا دستور وضع کرنے میں مختار ہوں گے اور مزید یہ کہ ملک معظم کی حکومت کو یہ ذمہ لینا چاہیے کہ جب تک اس ضابطے کی پابندی نہ ہو وہ نتائج کا نفاذ نہیں کرے گی۔

اس گتھی کو سلجھانے کے لیے قائد اعظم، خان لیاقت علی خان، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ وائسرائے کے ہمراہ لنڈن پہنچے، لیکن ملک معظم کی حکومت کے ساتھ گفت و شنید سے بھی دونوں جماعتوں میں اتفاق رائے نہ ہو سکا؛ تاہم حکومت برطانیہ صوبوں کی فریق بندی کے اصول پر مصر رہی اور ۶ دسمبر کو اپنے اعلان میں اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر مجلس دستور ساز میں ہندوستانی آبادی کے ایک بڑے حصے کے نمائندے شامل نہیں ہوں گے تو اس کا بنایا ہوا آئین ناراضمند طبقوں پر نہیں ٹھونسا جائے گا ۔ اس طرح کانگرس کی بالادستی کا خواب ادھورا رہ گیا اور پنڈت نہرو فوراً واپس روانہ ہوگئے۔

آئین ساز اسمبلی نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو اپنا کام شروع کر دیا اور پنڈت نہرو کے ایما پر ایک قابل اعتراض قرارداد مقاصد منظور کرلی ۔ مسلم لیگ نے اصرار کیا کہ چونکہ کانگرس، اچھوتوں اور سکھوں نے وزارتی سکیم کی برطانوی تشریح قبول نہیں کی، اس لیے آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات اور اس کے اجلاس غیر قانونی اور بے بنیاد ہیں ۔ ادھر کانگرس نے وائسرائے پر زور دیا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں سے استعفے طلب کیے جائیں ۔ ۶ فروری کو وائسرائے نے لیاقت علی خان کو بلا کر اس مطالبے سے آگاہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر حکومت کے نزدیک کانگرس نے وزارتی منصوبہ قبول کر لیا ہے تو مسلم لیگ اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن یہ حکومت کی ذمے داری ہو گی کہ کانگرس کو مجلس دستور ساز میں ان حدود کے اندر رکھے جو وزارتی وفد نے معین کر دی ہیں ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وزارتی منصوبہ صحیح معنوں میں کسی نے بھی قبول نہیں کیا، لہٰذا کسی کو بھی اس بنا پر مسلم لیگ سے استعفا طلب کرنے کا حق نہیں ہے ۔ ۱۵ فروری کو سردار پٹیل نے دھمکی دی کہ دریں حالات اگر مسلم لیگ عبوری حکومت میں رہی تو کانگرس اس سے الگ ہو جائے گی ۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے وزیر اعظم ایٹلی اور لیبر پارٹی کے دوست ممبروں کو لارڈ ویول کے خلاف خطوط لکھے اور یہ مہم شروع کی کہ اس کی جگہ کوئی زیادہ اہل وائسرائے بھیجا جائے۔

انخلا کا اعلان : لیبر گورنمنٹ کے لیے اب سخت دشواری کا سامنا تھا ۔ ایک طرف تو وہ اس پر کسی طور بھی آمادہ نہیں تھی کہ کانگرس عبوری حکومت سے الگ ہو کر کوئی مخالفانہ تحریک شروع کر دے، دوسری طرف وہ مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمان راست اقدام کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے، بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی اس کے خطرناک اثرات ہوں گے؛ چنانچہ وزیر اعظم نے ۲ فروری کو اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت برطانیہ تمام اختیارات ایک ایسی ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دے گی جسے عوام کی حمایت حاصل ہو، جو امن قائم رکھ سکے اور عدل و صلاحیت سے نظم و نسق چلا سکے، نیز اگر اقوام ہند متفقہ دستور نہ بنا سکیں تو ملک کا انتظام کسی بھی مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا، یا بعض صوبوں کا انتظام صوبائی حکومتوں کو سونپ دیا جائے گا ۔ اسی بیان میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ انتقال اختیار کے لیے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا ہے اور وہ مارچ ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھال لیں گے۔

مسلم اکثریت کے صوبوں کی حالت :

اس اثنا میں کانگرس مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو اس پر اکسا رہی تھی کہ وہ مجموعوں کی مجلس دستور ساز میں ہرگز شریک نہ ہوں ۔ بنگال میں مغربی بنگال کا ایک علیحدہ صوبہ قائم کرنے کی تحریک شروع ہو گئی تھی ۔ آسام کی کانگرس پارٹی نے اپنے صوبے کی مجلس آئین ساز کے تمام ارکان کو حکم دے دیا تھا کہ وہ وزارتی سکیم کے تحت بنگال کے ساتھ ایک مجموعے میں شریک نہ ہوں ۔ سندھ میں مسلم لیگی حکومت کو متزلزل کرنے کی کوششیں برابر جاری تھیں ۔ صوبۂ سرحد میں پہلے سے کانگرسی وزارت قائم تھی ۔ پنجاب میں گورنر کی حمایت سے مسلم لیگ کو وزارت بنانے سے محروم رکھا گیا تھا ۔ یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی کہ جن صوبوں میں پاکستان قائم ہونا تھا وہاں بھی مسلم لیگ پوری طرح برسر اقتدار نہیں تھی؛ چنانچہ مسلم لیگ نے پنجاب میں دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا ۔ اس پر چڑ کر یونینسٹ حکومت نے جبر و تشدد سے کام لیا اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو خلاف قانون قرار دے کر کئی رہنما گرفتار کر لیے ۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جو پورے صوبے میں پھیل گئی اور چونتیس روز تک جاری رہی ۔ ہزاروں عورتیں اور مرد گرفتار ہوے، جگہ جگہ لاٹھی چارج کیا گیا، پرامن مظاہرین پر گولیاں چلائی گئیں، لیکن تحریک کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ادھر مسٹر ایٹلی کے اعلان کے بعد سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا ۔ سکھوں نے اکالی جتھے بھرتی کرنے شروع کیے اور ہندوؤں میں راشٹریہ سیوک سنگھ سرگرم عمل ہو گئی تاکہ ضرورت پیش آنے پر مسلمانوں کے خلاف گوریلا جنگ کی جا سکے ۔ مسلم لیگ کی تحریک سے یونینسٹ حکومت متزلزل ہوگئی اور فروری کے آخر میں مسلم لیگی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا ۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ ۳ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے ہونے والے اجلاس میں مخلوط وزارت کو توڑنے کی پوری کوشش کی جائے ۔ خضر حیات ٹوانہ نے پہلے تو ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا، مگر مسلمانان پنجاب کے تیور دیکھ کر ۲ مارچ کو انھوں نے اپنی وزارت کا استعفا پیش کر دیا ۔ اگلے روز نواب ممدوٹ نے نئی وزارت بنانے کے لیے یونینسٹ پارٹی کے ہندو سکھ ارکان کو جمع کر کے تعاون کی دعوت دی، لیکن انھوں نے تشدد اور بدامنی کی دھمکی دی اور ۴ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ۔ اسی دن ہندوؤں اور سکھوں نے تمام پنجاب میں مسلمانوں پر حملے شروع کیے اور طرح طرح سے انھیں اشتعال دلایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں جگہ جگہ خونریز بلوے ہونے لگے ۔ پنجاب کے گورنر نے ایک بار پھر جانب داری کا ثبوت دیا اور مسلم لیگ کو وزارت کی دعوت دینے کے بجائے صوبے میں گورنری راج قائم کر دیا ۔

اس اثنا میں مسلم لیگ کی طرف سے صوبۂ سرحد میں بھی پرامن اور منظم مظاہرے ہو رہے تھے؛ حکومت بڑی کثرت سے مظاہرین کو گرفتار کر رہی تھی اور مسلم لیگ کی تحریک کے اثرات آزاد قبائل تک پہنچ چکے تھے ۔

ماؤنٹ بیٹن منصوبہ : لارڈ ماؤنٹ بیٹن Mountbatten نے ۲۲ مارچ کو اپنے عہدے کا حلف اٹھا کر کانگرس اور لیگ کے قائدین سے گفتگو شروع کی اور ابتدا ہی میں ظاہر ہوگیا

کہ اس کے میلانات ھندوؤں کے حق میں ھیں ۔ یہ مذاکرات کئی ھفتوں تک جاری رھے ۔ اب یہ پوری طرح واضح ھو چکا تھا کہ وزارتی سکیم کے منصوبے کے مطابق پورا ھندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتا اور کانگرس کا یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا تھا کہ تقسیم ملک کی صورت میں پنجاب، بنگال اور آسام کے ان حصوں کو تقسیم کر کے ھندو یونین میں شامل کیا جائے جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ھیں ۔ ماؤنٹ بیٹن نے ملک اور صوبوں کی اس تقسیم کے مطالبات کی روشنی میں ایک منصوبہ تیار کیا جسے حکومت برطانیہ نے منظور کر لیا، لیکن جب اسے پنڈت نہرو کو دکھایا گیا تو انھوں نے اسے ناقابلِ قبول ٹھیرایا؛ چنانچہ ترمیمات کے ساتھ نیا منصوبہ تیار ھوا اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے وائسرائے خود لنڈن روانہ ھو گیا اور ۳۱ مئی کو واپس آ کر اعلان کیا کہ اسے ۲ جون کو ھندوستانی رھنماؤں کے سامنے پیش کر دیا جائے گا.

اس منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ (الف) پنجاب اور بنگال کی آئین ساز مجالس اپنے اجلاس دو حصوں میں کریں گی : ایک حصے میں مسلمان اضلاع کے نمائندے اور دوسرے میں باقی اضلاع کے نمائندے شریک ھوں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ ان صوبوں کو تقسیم کرنا چاھیے یا نہیں ۔ اگر ایک حصے کے ارکان سادہ اکثریت سے یہ فیصلہ کر لیں کہ صوبے کو تقسیم ھونا چاھیے تو ایسا ھی ھوگا ۔ تقسیم کی صورت میں دونوں حصے یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ پہلی مجلس آئین ساز میں شامل ھونا چاھتے ھیں یا نئی میں ۔ علاوہ ازیں پنجاب اور بنگال میں مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کی حدبندی کے لیے ایک حدبندی کمیشن مقرر کیا جائے گا؛ (ب) صوبۂ سندھ کی قانون ساز اسمبلی سے پوچھا جائے گا کہ وہ پرانی مجلس دستور ساز میں شریک ھوگی یا نئی میں؛ (ج) صوبۂ سرحد کی شمولیت کا عام رائے شماری سے فیصلہ ھوگا؛ اسی طرح (د) آسام کے واحد مسلم اکثریتی ضلع سلہٹ کا بھی عام رائے شماری ھی سے فیصلہ ھو گا کہ وہ مشرقی بنگال میں شامل ھو گا یا آسام ھی میں رھے گا؛ (ہ) اس کے بعد دونوں مجالس دستور ساز (برائے بھارت و پاکستان) کے لیے نئے انتخابات ھوں گے؛ (و) ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی حکومت اقتدار منتقل کر دے گی .

اس منصوبے کی منظوری کانگرس نے اس شرط پر دی کہ مسلم لیگ بھی ایسا ھی کرے ۔ قائد اعظم نے لیگ کونسل کا اجلاس بلانے کے لیے مہلت طلب کی تو وائسرائے نے دھمکی دی کہ اس صورت میں کانگرس اور سکھ دوسری صبح کے اجلاس میں اسے نامنظور کر دیں گے اور پھر پاکستان شاید کبھی نہ بن سکے ۔ وائسرائے کی اس ھٹ دھرمی اور ملک کی نازک صورت حال کے پیش نظر قائد اعظم کو بامر مجبوری اس پر رضامند ھونا پڑا ۔ ۳ جون کو آل انڈیا ریڈیو سے قائد اعظم، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے اپنی اپنی قوم کی طرف سے منصوبے کی منظوری کے اعلانات نشر کیے، جس کی توثیق ۱۰ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ۱۴ جون کو آل انڈیا نیشنل کانگرس کمیٹی نے کر دی.

صوبوں کی تقسیم اور استصواب رائے عامہ : ۲۰ جون کو بنگال کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ھوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ بنگال تقسیم کر دیا جائے اور مغربی بنگال ھندوستان کی مجلس دستور ساز میں اور مشرقی بنگال اور سلہٹ مل کر نئی مجلس دستور ساز میں شریک ھوں ۔ یہ فیصلہ امن و انتظام کے ساتھ ھو گیا.

پنجاب میں ان دنوں انتہائی بدامنی پھیلی ہوئی تھی - پولیس کے زیر انتظام صوبائی اسمبلی کے ارکان نے فیصلہ کیا کہ صوبے کی تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کے ان اضلاع کے نمائندے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں شریک ہوں گے ۔

۲۶ جون کو سندھ کی اسمبلی نے کثرت رائے سے نئی مجلس دستور ساز میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ۔

یہی فیصلہ بلوچستان کی طرف سے شاہی جرگے اور کوئٹے کی بلدیہ کے غیر سرکاری ارکان کے جلسے میں متفقہ طور پر کیا گیا ۔

جولائی کی ابتدا میں سلہٹ کے لیے استصواب رائے عامہ ہوا اور ۱۸۴۰۴۱ کے مقابلے میں ۲۳۹۶۱۹ راؤں کی تعداد سے سلہٹ کو آسام سے الگ کر کے مشرقی بنگال میں شامل کرنا طے پایا ۔

صوبۂ سرحد میں عرصے سے کانگرسی حکومت قائم تھی ۔ وہاں خان عبدالغفار خاں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ خود مختار پٹھانستان (پختونستان) کے لیے بھی رائے لی جائے، لیکن قائداعظم نے اس کی شدید مخالفت کی اور وائسرائے نے بھی اسے تسلیم نہ کیا؛ چنانچہ خان برادران نے استصواب رائے کے مقاطعے کا اعلان کر دیا ۔ بایں ہمہ صوبے کے لوگوں کی بڑی اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔

اس کے بعد پاکستان کی مجلس دستور ساز میں نمائندگی کے لیے سلہٹ، مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں نئے انتخابات ہوئے ۔ سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں اس کی ضرورت یوں پیش نہ آئی کہ یہ علاقے تقسیم نہیں ہوئے تھے ۔

قانون آزادی ہند : ۱۵ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ نے آزادی ہند کا قانون منظور کیا ۔ ۱۸ جولائی کو بادشاہ نے اس کی منظوری دے دی اور عارضی دستور کے طور پر کام دینے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ضروری ترمیم کر کے اسے انڈیا آرڈر ۱۹۴۷ء کے نام سے نافذ کر دیا گیا۔

انتقال اختیار سے قبل عبوری دور کے لیے دونوں مملکتوں کے لیے گورنر جنرل کے تقرر کا مسئلہ بھی طے ہونا تھا ۔ کانگرس ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کی دعوت دے چکی تھی ۔ قائد اعظم کی تجویز تھی کہ دونوں مملکتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل ہوں اور اختلافی مسائل کو طے کرنے کے لیے ایک بالائی گورنر جنرل مقرر کیا جائے، لیکن اسے ماؤنٹ بیٹن نے قبول نہ کیا ۔ ۲ جولائی کو مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم ہوں گے ۔ اس فیصلے سے ماؤنٹ بیٹن کو سخت صدمہ ہوا اور اس کے بعد وہ ہر معاملے میں ہندوؤں کی حمایت پر تل گیا (دیکھیے *Jinnah, Creator of Pakistan*، ص ۱۹۳)؛ چنانچہ اس کا ثبوت دفاتر، افواج، اسلحہ اور املاک کی تقسیم کے سلسلے میں قدم قدم پر ملتا رہا۔

دونوں مملکتوں کی سرحد کی تعیین کے لیے دو حدبندی کمیشن قائم کیے گئے جن کا صدر سر سرل ریڈ کلف Cyril Radcliffe کو مقرر کیا گیا ۔ کمیشن کے ارکان ہائی کورٹ کے جج تھے ۔ بنگال کمیشن جسٹس ابوصالح محمد اکرم، جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمٰن، جسٹس سی ۔ سی ۔ بسواس اور جسٹس بی ۔ کے ۔ مکرجی پر اور پنجاب کمیشن جسٹس شیخ دین محمد، جسٹس محمد منیر، جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ پر مشتمل تھا ۔ ان کے درمیان اتنا شدید اختلاف پیدا ہوا کہ فیصلہ دینے کا حق کمیشن کے صدر کو سونپ دیا گیا ۔ اس نے جو فیصلہ دیا وہ کتنا جانبدارانہ تھا

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب میں گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلیں، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے، ہندوستان میں شامل کر دی گئیں بلکہ سرحدی خط دیہات وار کھینچا گیا اور ساٹھ فی صد مسلم اکثریت کی تحصیل اجنالہ (ضلع امرتسر) اور اسی طرح زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں بھی پاکستان میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ۔ بقول قائد اعظم ''اس عظیم اور خود مختار مسلم مملکت کی تعمیر میں ہم سے سخت ناانصافیاں کی گئیں ۔ جہاں تک ممکن تھا ہم کو دبایا گیا اور ہمارے رقبے کو کم کیا گیا ۔ جو آخری ضرب ہم پر لگائی گئی ہے وہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ ہے ۔ یہ ایک غیر منصفانہ، ناقابل فہم، بلکہ مکروہ فیصلہ ہے . . . ۔ بہر حال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں، لہٰذا . . . ایک آبرو مند قوم کی طرح ہمیں یہ قبول کر لینا چاہیے'' ۔ در اصل انگریز اور ہندو کی ابتدا ہی سے یہ کوشش رہی تھی کہ ہندوستان متحد رہے اور جب تقسیم ناگزیر نظر آئی تو انہوں نے پاکستان کو ہر ممکن طریق سے اتنا کمزور کر دینا چاہا کہ وہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکے۔

قیام پاکستان : ۷ اگست کو قائد اعظم کراچی پہنچ گئے، جہاں ۱۱ اگست کو پاکستان کی مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس ہوا ۔ ۱۳ اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بر صغیر کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی آ کر ۱۴ اگست کو دولت مشترکہ کی نئی مملکت پاکستان کے اختیارات اس کے گورنر جنرل کے حوالے کر دیے اور ۱۵ اگست کو قائد اعظم نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان حلف اٹھایا ۔ پاکستان باضابطہ وجود میں آ گیا۔

(د) قیام پاکستان کے بعد

(۱) اہم سیاسی واقعات

(الف) اگست ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک

ابتدائی مشکلات اور مہاجروں کا مسئلہ : پاکستان کو ابتدا ہی سے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ نئے ملک کی نہ تو کوئی اپنی منظم فوج تھی، نہ کوئی انتظامیہ تھی ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو مجلس تقسیم ملک (Partition Council) کے اعلان عافیت و آزادی کی رو سے مسلم لیگ کے علاوہ کانگرس اور سکھوں کے رہنما بھی اس امر پر متفق ہو چکے تھے کہ انتقال اختیار کے بعد اقلیتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا ۔ تمام شہریوں کو جان و مال کا تحفظ دیا جائے گا اور کسی حالت میں تشدّد گوارا نہیں کیا جائے گا ۔ علاوہ ازیں پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے اضلاع سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروز پور اور لدھیانہ میں فوجی کمان قائم کر دی گئی تھی، جس کا کمانڈر میجر جنرل ریس اور اس کے مشیروں کے طور پر ہندوستان کی طرف سے بریگیڈیر دگمبر سنگھ اور پاکستان کی طرف سے کرنل محمد ایوب خان مقرر کیے گئے تھے ۔ حصولِ آزادی سے قبل فسادات دوطرفہ تھے، لیکن آزادی ملنے کے بعد حکومت پاکستان نے فتنہ و فساد کو دبانے کی پرزور کوشش کی جو بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ۔ اس کے برعکس سکھوں اور فرقہ پرست ہندوؤں نے مشرقی پنجاب اور دوسرے بھارتی علاقوں میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھا اور حکومت کی سرپرستی میں مسلح اور منظم دستوں نے، جن میں سکھ ریاستوں کے فوجی بھی شامل تھے، مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی

یو - پی کو مسلمانوں سے خالی کرانا شروع کر دیا - لاکھوں مسلمان مارے گئے - ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئیں اور لاکھوں کی تعداد میں زخمی اور لٹے پٹے لوگ پاکستان میں داخل ہونے پر مجبور کر دیے گئے - ہندوستانی لیڈر نئے ملک کو ختم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے - ان کا مقصد تھا کہ پاکستان کی طرف پناہ گزینوں کا ایک بے پناہ سیلاب جاری کر دیا جائے تا کہ اس کی حکومت قائم ھی نہ ہو سکے اور اگر ہو بھی جائے تو انتہائی کمزور اور بودی - اسی پروگرام کے تحت مغربی پاکستان کے ہندوؤں کو پاکستان سے چلے آنے کی ہدایت کی گئی جو وہاں کی تمامتر تجارت، صنعت اور بینکنگ پر قابض اور بیشتر کلیدی ملازمتوں پر فائز تھے تا کہ نیا ملک اقتصادی، تجارتی اور انتظامی بحران کا شکار ہو جائے، چنانچہ ان علاقوں کے بھی ہندو اور سکھ ترک وطن کر گئے جہاں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور جاتے جاتے اپنا مال و متاع، سرکاری دفاتر کا سامان، کارخانوں کی مشینوں کے ضروری پرزے اور ہسپتالوں کے آلات بھی یا تو اپنے ساتھ لے گئے یا تباہ کر گئے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکانیں، بینک، منڈیاں، کارخانے، شفاخانے، سب کچھ عرصے کے لیے بند ہو گئے - اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کو اس کے حصے کا فوجی سامان اور روپیہ بھی نہیں دیا گیا تھا - اس موقع پر اہل پاکستان نے حب الوطنی، حوصلہ‌مندی اور ایثار کا ثبوت دیا اور وزارت مہاجرین نے عوامی کارکنوں کی مدد سے مہاجرین کو ہنگامی طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں آباد کر کے ان کی ضروریات کا انتظام کیا اور انھوں نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اراضی، مکانات، دکانیں اور کارخانے وغیرہ ''الاٹ'' کر کے زراعت، تجارت اور صنعت کا تعطل دور کرنے کے علاوہ لاکھوں نفوس کی بحالی اور آبادکاری کا اہتمام کیا - اسی طرح سرکاری دفاتر میں ملازمین نے انتہائی دشوار حالات میں کام سنبھالا اور حکومت کے نظم و نسق کو کامیابی سے چلانا شروع کر دیا - یوں قائد اعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کر کے اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کر دیں -

قائد اعظم (رک بہ محمد علی جناح) پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے اور لیاقت علی خان وزیر اعظم - کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا - ملک کے لیے مؤثر انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کی گئی اور آئین ساز مجلس بنائی گئی، جس کے پہلے صدر خود قائد اعظم تھے -

نیا ملک زیادہ تر ان حصوں پر مشتمل تھا جنھیں انگریز حکمرانوں نے صنعتی طور پر پس ماندہ رکھا ہوا تھا - اس علاقے سے صرف فوجی سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے اور خام مال انگلستان بھیجا جاتا تھا - تقسیم کے وقت ریڈ کلف نے، جو حد بندی کمیشن کا صدر تھا، سیاسی فیصلے کر کے مسلم اکثریت کے بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیے - بھارت کی کشمیر پر بالا دستی قائم کرنے کے لیے ملحقہ ضلع گورداسپور اس کے حوالے کر دیا - اس کے علاوہ اہم نہری ہیڈ ورکس (Head Works) بھی، جو فیروز پور اور مادھو پور میں واقع تھے اور جہاں سے پاکستانی علاقوں کو نہری پانی فراہم ہوتا تھا، بھارت کو دیے گئے - یہ ایک صریح ناانصافی، تھی لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود پاکستان آگے بڑھتا رہا -

صوبۂ سرحد کا مسئلہ: صوبۂ سرحد میں ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر خان صاحب کے زیر قیادت کانگرسی حکومت قائم ہوئی تھی، جسے معمولی اکثریت حاصل تھی، لیکن صوبۂ سرحد کے مسلمان

اس حکومت کے خلاف ہو گئے اور ۱۹۴۷ء کے ایکٹ کے مطابق یہاں عام رائے شماری ہوئی تو بھاری اکثریت نے صوبے کے پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ دیے؛ چنانچہ قائد اعظم کے حکم سے صوبے کے گورنر نے ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو کانگرسی وزارت برطرف کر دی ۔ انگریز تو فوجی طاقت، سیاسی چالوں اور رشوت کے ذریعے سرحدی قبائل کو قابو میں رکھتے تھے، مگر پاکستان بننے کے بعد یہ طریق کار ترک کر دیا گیا اور قبائلی پٹھانوں نے محسوس کر لیا کہ وہ پاکستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کے شریک کار ہیں۔ جب نئی نئی سڑکیں بنائی گئیں اور سکول کھولے گئے تو صوبۂ سرحد اور دوسرے علاقوں کے باشندوں کے درمیان گہرا رابطہ پیدا ہو گیا اور دوری کا احساس ختم ہو گیا ۔

مسئلۂ کشمیر : انگریزوں نے جموں اور کشمیر کی ریاست ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ۱۸۴۶ء میں ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی ۔ مسلمان اکثریت کی اس ریاست پر نئے حکمران نے تشدد کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی اور اس کے جانشینوں نے بھی کشمیری پنڈتوں کی مدد سے مسلمان عوام پر ظالمانہ تسلط قائم رکھا ۔

جموں و کشمیر کے باشندوں کی ۸۰ فی صد آبادی مسلمان ہے ۔ جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی اعتبار سے اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ ہوسکا ۔ قانون آزادی، مجریۂ ۱۹۴۷ء، کی رو سے ریاستوں کو پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا، البتہ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کو انتباہ کیا تھا کہ وہ جغرافیائی تقاضوں کو مدّ نظر رکھیں ۔

بر صغیر کی آزادی کے موقع پر ہی کانگرسی لیڈروں نے کشمیر کو بھارت کے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں ، چنانچہ گاندھی جی نے ۱۹۴۷ء کے موسم گرما میں کشمیر کا دورہ کیا ۔ مہاراجا ہری سنگھ کو معلوم تھا کہ ریاست کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں ۔ انھیں دھوکا دینے کے لیے اگست ۱۹۴۷ء میں اس نے بظاہر تو پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ فی الحال جو حالات و تعلقات ہیں وہ بحال رہیں (Stand Still Agreement)، لیکن جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا تو اس کے اشارے پر ریاست کے مسلح ہندوؤں اور فوج نے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ان پر منظم حملے شروع کر دیے ۔ ان حالات سے مجبور ہو کر پونچھ کے مسلمانوں نے راجا کے خلاف بغاوت کر دی اور ریاست کی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ پاکستان کے بہت سے مسلمان بھی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے چل پڑے اور ان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو گئے ۔ لڑائی کی آگ ریاست کے کونے کونے میں پھیل گئی ۔ ہر طرف ریاستی فوجوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور مہاراجا اور اس کے ارکان حکومت بھاگ کر دہلی جا پہنچے ۔ مہاراجا نے بھارتی حکومت سے الحاق کی درخواست کی اور فوجی امداد طلب کی، جسے فوراً منظور کر لیا گیا ۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الحاق کی دستاویز پر دستخط ہو گئے ۔ بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتاری گئیں اور مجاہدین کے خلاف صف آرا ہو گئیں ۔ اسی اثنا میں کانگرسی لیڈروں نے ممتاز کشمیری رہنما شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے نکال کر ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعلی بنا دیا ۔

ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق ریڈ کلف ایوارڈ کی ناانصافی کی وجہ سے ممکن ہوا، کیونکہ گورداسپور کا مسلم اکثریتی علاقہ بھارت کو دے دیا

گیا تھا - اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے راستہ مل گیا - دوسرے الحاق کا یہ معاہدہ جلد بازی میں کیا گیا تھا اور چونکہ اس میں عوام کی مرضی شامل نہیں تھی اس لیے اس کی کوئی اخلاقی اور قانونی وقعت نہ تھی - قائد اعظم نے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ وہ ریاست میں غیر جانب دار حکومت قائم کر کے عام رائے شماری کے لیے حالات سازگار بنانے میں مدد دے، لیکن بھارتی حکومت نے ایسا نہ کیا - جنگ شدید ہوتی گئی اور قبائلی مجاهدوں اور دیگر رضاکار جماعتوں کے کچھ دستے بھی کشمیری مسلمانوں کی مدد کو پہنچ گئے - بے بسی کے عالم میں بھارتی حکومت نے جنوری ۱۹۴۸ء میں سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فائر بندی ہوگئی - اس عرصے میں جو علاقے آزاد کرا لیے گئے تھے وہاں کشمیریوں نے آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر لی - ہندوستان اور پاکستان دونوں نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت کے تحت اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا؛ لیکن بعد میں بھارتی حکومت نے تعاون نہ کیا۔

نہری پانی کا جھگڑا : ریڈ کلف نے پاکستانی علاقوں کو سیراب کرنے والی نہروں کے ہیڈ ورکس، جو فیروز پور اور مادھو پور کے مقامات پر واقع تھے، بھارت کو دے دیے - بعد میں بھارتی حکومت نے ستلج، بیاس اور راوی کے پانی پر اپنا مکمل حق جتانا شروع کر دیا - ابتدا میں چند عارضی معاهدے ہوئے جن کی رو سے پاکستان نہری پانی کی فراهمی کے عوض نقد روپیہ ادا کرتا رہا، لیکن بھارتی حکام اکثر ضرورت کے وقت پانی بند کر دیتے تھے جس سے پاکستان کی فصلوں کو نقصان پہنچتا؛ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں یہ معاملہ بین الاقوامی سطح پر پیش کیا گیا۔

قائد اعظم کی وفات : کام کی زیادتی اور ذمے داریوں کے بوجھ کی وجہ سے قائد اعظم کی صحت بہت خراب ہو گئی - اس کے باوجود وہ ملکی کاموں کو بدستور انجام دیتے رہے - آخر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد : قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کے سابق وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نئے گورنر جنرل مقرر ہوے اور لیاقت علی خان بدستور وزیر اعظم رہے - خواجہ ناظم الدین کے دور میں وزیر اعظم کے اختیارات اور ذمے داریوں میں وسعت پیدا ہو گئی۔

قرارداد مقاصد : نئی دستور ساز اسمبلی کے فرائض میں دستور سازی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کی ذمے داریاں شامل تھیں - ابتدا میں اس کے ارکان کی تعداد ۶۹ تھی، جو بعد میں ریاستوں کے نمائندے ملا کر ۷۹ ہو گئی، لیکن تارکین وطن کی بحالی اور اقتصادی و انتظامی امور کی تنظیم نو جیسے مسائل کی وجہ سے دستور سازی پر پوری توجہ نہ دی جا سکی - دستورسازی کی ابتدا قرارداد مقاصد سے ہوئی، جو ۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء کو پیش ہوئی اور مختصر بحث کے بعد منظور کر لی گئی - اس میں پاکستان کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا (دیکھیے تفصیل بذیل ''آئین کی تاریخ'') - اس کے بعد ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی'' مقرر ہوئی، جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا - ستمبر ۱۹۵۰ء میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں پارلیمانی طرز حکومت، دو قانون ساز اداروں (ایوان بالا و ایوان زیریں) اور وزرا پر پارلیمان کی بالا دستی کی سفارشات شامل تھیں - مشرقی پاکستان نے مرکز کے وسیع اختیارات کے خلاف احتجاج کیا اور یہ

معطل ہو گئی۔

چونکہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی مکمل بالا دستی تھی اور حزب اختلاف ابھی وجود میں نہ آئی تھی اس لیے پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے قوانین پر شاذ ھی بحث ھوتی۔ اس دور میں ایک اھم دستوری ترمیم دفعہ ۹۲ الف میں ھوئی، جس کی رو سے آئینی حکومت ناکام ھونے کی صورت میں صوبے کا انتظام براہ راست گورنر جنرل اپنے ھاتھ میں لے سکتا تھا۔ پنجاب میں وزرا کے باھمی اختلافات نازک صورت اختیار کر گئے تو ۱۹۴۹ء کے آغاز میں وزارت بر طرف کر کے صوبے کا انتظام گورنر کے سپرد کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں کی حالت بھی کم و بیش یہی رھی۔

لیاقت علی خان کے عہد میں بالغ رائے دہی کا نظام بہ ترمیم رائج کیا گیا اور پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ۱۹۵۱ء کے انتخاب کے بعد نئی منتخب حکومتیں قائم ھو گئیں۔ اگرچہ مسلم لیگ کی بالا دستی قائم رھی، لیکن عوام سے رابطہ کٹ جانے کی وجہ سے جماعت کمزور ھوگئی تھی۔ لیاقت علی خان کے ایما پر لیگ کے دستور کی وہ شق ختم کر دی گئی جس کی رو سے وزرا کوئی جماعتی عہدہ نہیں سنبھال سکتے تھے۔ وہ خود مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور ان کی پیروی میں تمام صوبائی وزرائے اعلٰی نے صوبائی شاخوں کی صدارت سنبھال لی۔ اس سے یہ نقصان ھوا کہ جماعت اور حکومت میں کوئی فرق نہ رھا۔

بھارت سے تعلقات: تقسیم ملک کے بعد بھی بھارتی حکومت نے کشمیر، نہری پانی اور متروکہ جائداد کے مسائل حل نہ کیے، جس کے باعث پاکستان کے لیے گوناگوں مشکلات پیدا ھو گئیں۔ دہشت‌پسند غیر مسلم جماعتوں نے مسلم کش فسادات برپا کر کے بے شمار مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لیے لیاقت علی خان نے خود ۱۹۵۱ء میں دھلی جا کر بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو سے ''اقلیتوں کا معاھدہ'' طے کیا، جس کی رو سے دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے لیے الگ وزارتیں قائم کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کی ذمے داری قبول کی۔

ھندوؤں کے چلے جانے سے پاکستان کو صنعتی، تجارتی اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان امور پر ھندوؤں ھی کی اجارہ‌داری تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکومت نے منصوبہ‌بندی کمیشن قائم کیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں اھم زرعی اصلاحات نافذ کر کے جاگیرداری پر مؤثر پابندیاں عائد کی گئیں اور کاشت کاروں کو اھم سہولتیں دی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا اور پاکستان کے بارے میں متعدد تقریریں کیں۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں حکومت کے خلاف ایک بغاوت (راولپنڈی سازش) کا انکشاف ھوا، جس میں چند اعلٰی فوجی افسر بھی شامل تھے۔ اسی سال ۱۷ اکتوبر کو لیاقت علی خان کو ایک جلسۂ عام میں ایک آدمی نے گولی مار کر ھلاک کر دیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین بطور وزیراعظم (۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ تا ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء): لیاقت علی خان کی وفات کے بعد گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ھوے اور وزیر مالیات غلام محمد ان کی جگہ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ھوے۔ خواجہ ناظم الدین ایک نیک دل مسلمان تھے، لیکن اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے بطور سربراہ حکومت زیادہ کامیاب نہ رھے۔ ان کے عہد میں غلے کی کمی پیدا ھو گئی، سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے اور آئین‌سازی

کی رفتار بہت سست پڑ گئی ۔ بھارت نے پاکستان کے حصے کا نہری پانی ضرورت کے وقت پھر بند کرنا شروع کر دیا، جس سے فصلوں کو بہت نقصان پہنچا۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی، جس میں سفارش کی گئی تھی کہ مرکز میں دو ایوانی مقننہ قائم کی جائے؛ علما کا ایک بورڈ بنایا جائے، جو یہ دیکھے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے بنائے ہوے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہیں یا نہیں اور کابینہ صرف ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو۔

۱۹۵۳ء کے اوائل میں مجلس احرار نے قادیانی فرقے کے خلاف ایک تحریک چلائی، جس نے پنجاب کے علاقے میں نظم و نسق کی صورت حال بہت خراب کر دی ۔ آخر فوج نے حالات پر قابو پایا ۔ صوبائی حکومت بر طرف ہوگئی اور فیروز خان نون کو نیا وزیر اعلٰی مقرر کیا گیا ۔ ۱۷ اپریل کو گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو بھی جبراً بر طرف کر دیا حالانکہ انھیں مجلس قانون ساز کے ارکان کی حمایت حاصل تھی ۔ یہ فعل پارلیمانی جمہوریت کے معروف اصولوں کے منافی سمجھا گیا۔

محمد علی بوگرا بطور وزیر اعظم (۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء تا ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء) : ملک غلام محمد نے محمد علی بوگرا کو، جو اس وقت واشنگٹن (امریکہ) میں پاکستان کے سفیر تھے، نئی حکومت بنانے کی دعوت دی اور خود ہی وزارتی کونسل کی فہرست تیار کر دی ۔ محمد علی بوگرا ملکی حالات پر قابو نہ پاسکے ۔ بھارت سے نہری پانی کا تنازع نیا رخ اختیار کر گیا ۔ عالمی بنک نے تجویز پیش کی کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج، بیاس اور راوی) پر بھارت کا حق تسلیم کر لیا جائے اور پاکستان میں رابطے کی نہریں بنا کر پانی کی کمی کو پورا کیا جائے ۔ پاکستان کے لیے یہ تجویز ناقابل قبول تھی ۔ اسی زمانے میں بھارت نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ مکمل طور پر ہو چکا ہے ۔ یہ سلامتی کونسل کی قراردادوں سے کھلا انحراف تھا ۔ شیخ عبداللہ نے بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو وزارت عظمی سے بر طرف کر کے جیل میں ڈال دیا۔

محمد علی بوگرا کے زمانۂ وزارت میں پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے خدو خال پوری طرح ابھر آئے ۔ مسلمان ممالک کے ساتھ مراسم مزید گھرے ہو گئے اور پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلمان ملکوں کی ہر طرح امداد کی ۔ بوگرا نے بھارت جا کر دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر بنانے کی بھی کوشش کی ۔ اسی دور میں امریکہ سے فوجی اور اقتصادی معاہدے ہوے، جن میں CENTO (معاہدۂ بغداد) اور SEATO (جنوب مشرقی ایشیا کا دفاعی معاہدہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان کی رو سے کمیونسٹ بلاک کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنا رکن ممالک پر لازم تھا۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوے اور مسلم لیگ کو متحدہ محاذ کے ہاتھوں، جس کے سربراہ فضل الحق تھے، بری طرح شکست ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں ان انتخابات نے مسلم لیگ کا اثر ختم کر دیا اور عوامی لیگ ایک طاقتور سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی، جس کے قائد حسین شہید سہروردی تھے ۔ اس جماعت نے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے بنانے اور توڑنے میں اہم حصہ لیا ۔ ان انتخابات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آئین ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت پر بھی شک کا اظہار کیا جانے لگا ۔ گورنر جنرل

کی مداخلت سے بچنے کے لیے وزیر قانون مسٹر بروھی نے ۳ اگست ۱۹۵۵ء کو ایک مسودۂ قانون پیش کیا، جسے منظور کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں آئین ساز اسمبلی نے ایک اور قرار داد بھی منظور کی، جس کی رو سے گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی کر دی گئی۔ اس کے بعد بنیادی اصولوں کی ترمیم شدہ رپورٹ منظور کی گئی اور اسے مسودۂ آئین کی شکل دینے کے لیے ماہرین کے پاس بھیج دیا گیا۔ طے پایا کہ یہ مسودہ ۲۷ اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کے ہاتھوں میں آ جائے۔ عین اس وقت جب اسمبلی دستور سازی کا کام ختم کر چکی تھی ۲۴ اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے برطرف کر دیا اور اعلان کیا کہ یہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ مولوی تمیز الدین خان نے، جو اس کے سپیکر تھے، گورنر جنرل کے حکم کے خلاف سندھ ھائی کورٹ میں دعوی دائر کر دیا، جس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا؛ لیکن بعد میں فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم ھی کو بحال رکھا۔

محمد علی بوگرا نے گورنر جنرل کی دعوت پر نئی وزارت تشکیل کی، جس میں اسکندر مرزا، سہروردی، ڈاکٹر خان صاحب اور جنرل ایوب خان کمانڈرانچیف کو بھی شامل کرلیا۔ اسی زمانے میں وحدت مغربی پاکستان کا منصوبہ تیار کیا گیا، اناج کی کمی کو بیرونی ملکوں سے غلہ منگوا کر پورا کیا گیا، حکومت نے سمگلنگ کی روک تھام اور قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں دستور ساز اسمبلی کے نئے انتخابات ہوے، جن کے بعد محمد علی بوگرا پارٹی کے سربراہ نہ بن سکے اور سفیر بن کر واپس واشنگٹن چلے گئے۔ خیال تھا کہ اب سہروردی کو حکومت تشکیل کرنے کا موقع دیا جائے گا، لیکن اس اثنا میں غلام محمد، جو انھیں کابینہ میں لائے تھے، بیمار ھو کر رخصت پر چلے گئے اور ان کی جگہ اسکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل بن گئے۔ انھوں نے مولوی فضل الحق سے رشتہ استوار کیا اور سابق وزیر مالیات چودھری محمد علی کو، جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر منتخب ہوے تھے اور جنھیں متحدہ محاذ کی حمایت حاصل تھی، وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کی مخلوط وزارت قائم ہوگئی۔

چودھری محمد علی کا دور وزارت : (۱۱ اگست ۱۹۵۵ تا ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) : ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا دیا گیا اور یوں وحدت مغربی پاکستان وجود میں آئی۔ فروری ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا دستور منظور ھوا، جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کر دیا گیا۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا اور اس میں ملک کو جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کا نام دیا گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل "آئین کی تاریخ")۔

چودھری محمد علی نے اپنے دور وزارت میں کوشش کی کہ "سیٹو" اور "سنٹو" کے معاہدات کا اطلاق صرف اشتراکی جارحیت ھی کے خلاف نہیں بلکہ ہر قسم کی جارحیت کے خلاف کیا جائے، لیکن ان معاہدات میں شامل بڑے ممالک، یعنی امریکہ اور برطانیہ، اس موقف کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اس سلسلے میں پاکستان کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ "سیٹو" کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کا اقتدار "ڈیورنڈ لائن" تک وسیع ہے۔

۱۹۵۶ء تک پاکستان صنعتی میدان میں خاصی ترقی کر چکا تھا، لیکن افراط زر کے باعث ملک

کا میزانیہ بھی متأثر ہو رہا تھا، چنانچہ پاکستانی [illegible] کی قیمت کم کر کے ہندوستانی روپے کے برابر کر دی گئی۔

نئے آئین کے نفاذ کے بعد میجر جنرل اسکندر مرزا کو صدر منتخب کیا گیا تھا ۔ پاکستان کے پہلے صدر کی زندگی انگریزی عہد میں فوج اور محکمۂ خارجہ کی ملازمت میں گزری تھی اور انہیں نوآبادیاتی طرز کے نظم و نسق کا بڑا تجربہ تھا ۔ ذاتی طور پر وہ صدارتی نظام حکومت کے حق میں تھے اور مرکز کے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے تھے ۔ وزیر اعظم نے بھی عمر بھر سرکاری ملازمت ھی کی تھی اور عوام سے ان کا کوئی براہ راست رابطہ نہیں رہا تھا ۔ انھوں نے مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیے ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت کی، جو آزادی سے قبل مشہور کانگرسی رہنما رہ چکے تھے ۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ارکان نے سردار بہادر خان کو اپنا قائد منتخب کر کے گویا چودھری محمد علی کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر دیا ۔ ادھر وزیر اعظم کی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہوے ڈاکٹر خان صاحب نے ریپبلکن کے نام سے اپنی الگ پارٹی بنا لی، جس میں مرکز اور مغربی پاکستان کی اسمبلیوں کے کئی ارکان شامل ہو گئے ۔ مزید برآں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ لیاقت علی خان کے زمانے سے وزیر اعظم ھی کے پاس رہتا آیا تھا، لیکن چودھری محمد علی نے اس روایت کو توڑ دیا ۔ لیگ کے نئے صدر عبدالرب نشتر ہو گئے اور چودھری محمد علی کے تمام مخالفین ان کے پرچم تلے متحد ہو گئے ۔ اختلافات بڑھتے گئے، تاآنکہ مسلم لیگ نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے ۔ مرکزی اسمبلی میں اگرچہ وزیراعظم کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی، تاہم انھوں نے اپنے عہدے سے چمٹا رہنا گوارا نہ کیا اور مستعفی ہو گئے۔

حسین شہید سہروردی (۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء): اسکندر مرزا کی دعوت پر عوامی لیگ کے رہنما سہروردی نے ریپبلکن پارٹی کے اشتراک سے وزارت بنا لی ۔ ان کے عہد میں پناہ گزینوں کی آبادکاری پر خاصی توجہ دی گئی، سرکاری ملازمین کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا گیا اور خوراک کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دس لاکھ ٹن غلہ درآمد ہوا ۔ اسی زمانے میں اسمبلی نے مخلوط انتخاب کے حق میں راے دی۔

سہروردی مغربی بلاک کے ساتھ رہنے کے قائل تھے ۔ ان کے نزدیک فوجی معاهدوں میں شمولیت پاکستان کی بقا کے لیے ضروری تھی اور غیرجانب دار رہنے میں جارحیت کا شکار ہو جانے کا خطرہ تھا ۔ اسی لیے انھوں نے ذاتی مقبولیت کی پروا کیے بغیر ھنگری اور اس کے بعد مشرق اوسط کے مسائل میں، خصوصاً سویز کے بحران کے موقع پر، مغربی ممالک کا ساتھ دیا ۔ اس موقف کی وجہ سے عرب پاکستان کے خلاف ہو گئے ۔ بایں همه وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے جنھوں نے چین کا دورہ کر کے باهمی تعلقات کی بنیاد رکھی۔

سہروردی کی وزارت بڑی حد تک ری پبلکن پارٹی کی حمایت پر قائم تھی، لیکن دونوں کی پالیسی میں بہت زیادہ فرق تھا، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے، جو اتنے بڑھے کہ صدر اسکندر مرزا نے سہروردی کو قانونی تکلّفات پورے کیے بغیر بر طرف کر دیا ۔

آئی ۔ آئی ۔ چندریگر (۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ تا ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء) : سہروردی کے بعد صدر نے اسمٰعیل چندریگر کو وزیر اعظم بنایا، جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے ۔ انھوں نے مسلم لیگ، ری پبلکن، کرشک سرمک اور نظام اسلام پارٹیوں کی

حمایت سے وزارت بنائی، مگر ان چار سیاسی جماعتوں کا اشتراک عمل ممکن نہ تھا، چنانچہ چھے ہفتے بعد انھیں وزارت عظمٰی سے الگ ہونا پڑا۔

فیروز خاں نون (۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ تا ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء): ری پبلکن پارٹی کی حمایت سے یکے بعد دیگرے تین وزرائے اعظم (چودھری محمد علی، سہروردی اور چندریگر) بر سر حکومت آچکے تھے۔ اب اس کے اپنے رہنما فیروز خاں نون کو وزارت بنانے کا موقع دیا گیا۔

نئے وزیر اعظم نے مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کی تعریف کی، لیکن مغربی پاکستان میں اس کی مخالفت کی۔ ان کے زمانے میں گوادر کا علاقہ، جو کسی زمانے میں سلطان مسقط کو اجارے پر دیا گیا تھا، پاکستان کو واپس مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں بیروباری کا علاقہ مدت سے بھارت اور پاکستان کے درمیان متنازع فیہ چلا آ رہا تھا۔ فیروز خاں نون نے دہلی جا کر اس سلسلے میں گفت و شنید کی اور معاہدے کی رو سے بھارت نے اسے پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا (لیکن اس کا قبضہ ابھی تک نہیں مل سکا)۔ اسی زمانے میں کشمیری مہاجرین نے کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک جماعت بنائی تاکہ خط متارکہ پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑی جائے، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

بحیثیت مجموعی فیروز خاں نون کا مختصر دور وزارت بے یقینی، جوڑ توڑ اور انتشار کا دور تھا۔ مغربی پاکستان میں ریپبلکن پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ بر سر اقتدار تھیں، لیکن اصل طاقت صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں تھی۔ مشرقی پاکستان کے گورنر اے۔ کے۔ فضل الحق نے جب عطاءالرحمٰن کی وزارت کو برطرف کیا تو عوامی لیگ کے دباؤ کے باعث نون حکومت نے فضل الحق کو ان کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کا زور تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے فوج طلب کی گئی، لیکن یہ مہم جلد ختم ہو گئی۔ افراط زر، غلے کی کمی اور زر مبادلہ کے ضیاع ایسے مسائل نے خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسی زمانے میں مغربی پاکستان کے وزیر اعلٰی ڈاکٹر خان صاحب کو کسی مخبوط الحواس نوجوان نے ہلاک کر دیا۔ بعض لوگوں نے اسے سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی۔ ادھر عوامی لیگ، جو اب تک مرکزی حکومت میں عہدے قبول کرنے سے گریزاں رہی تھی، وزارت میں حصہ لینے کا مطالبہ کرنے لگی، جو مان لیا گیا۔ اس کے خلاف مسلم لیگ نے جگہ جگہ مظاہرے کیے اور لوگوں میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیل گئی۔

مارشل لا کا نفاذ: حالات اب قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے، چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کو معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ وزارتیں برطرف کر دی گئیں، قانون ساز اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ صدر اسکندر مرزا نے برّی فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ بعد میں انھیں اپنے منصب سے علیحدہ ہونا پڑا اور جنرل ایوب خاں نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

(ب) صدر محمد ایوب خاں کا دور (۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ تا ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء)۔

نئی کابینہ فوجی جرنیلوں اور شہری اکابر پر مشتمل تھی۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور صدر ایوب خاں کے وزرا نے صدارتی کابینہ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔

ابتدائی اقدامات: نئی حکومت نے معاشرتی اور معاشی برائیوں کے استیصال کے لیے فوری اقدامات کیے، جن کے نتیجے کے طور پر سمگلنگ، جس کے باعث کروڑوں روپے کا ناجائز کاروبار ہوتا تھا، تقریباً ختم ہو گئی اور چور بازاری، قیمتوں میں بے جا اضافے، رشوت ستانی، عہدوں کے ناجائز استعمال اور سرکاری واجبات کی عدم ادائی کے خلاف کامیاب کاروائیوں سے عام فضا بہت بہتر ہو گئی اور حکومت پر لوگوں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ حکومت نے مہاجرین کی بحالی اور انہیں بھارت میں چھوڑی ہوئی جائدادوں کا معاوضہ دینے کے لیے مؤثر کارروائی کی اور مختصر عرصے میں ان کی بحالی اور آبادکاری کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ زر مبادلہ کی صورت حال بہتر بنانے کے لیے بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا اور ناجائز تجارت کی روک تھام کی گئی۔ ان اقدامات سے سرکاری اخراجات میں بھی معتدبہ کمی واقع ہوئی اور تعمیری منصوبوں کے لیے کافی روپیہ بچ رہا۔

سیاست دانوں اور سرکاری ملازمین کی تطہیر: سیاسی انتشار کے دور میں انتظامیہ میں بہت سی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں بلکہ سابقہ حکومتوں کی غلطروی کی بھی بڑی حد تک یہی ذمےدار تھی؛ چنانچہ نااہلی، خود غرضی اور رشوت کا خاتمہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کی بڑے وسیع پیمانے پر تطہیر کی گئی اور ہر درجے کے سینکڑوں ملازمین برخاست کر دیے گئے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے اعلان کی رو سے تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے کر ان کی املاک ضبط اور دفاتر سربمہر کر دیے گئے تھے۔ سابق سیاست دانوں کا اثر و رسوخ ختم کرنے اور سیاست میں ان کے دوبارہ داخلے پر پابندی لگانے کے لیے ''ایبڈو'' (Elective Bodies Disqualification Ordinance) نافذ کیا گیا اور سابق وزرا اور دوسرے عہدیداروں کی دھاندلیوں کی تفتیش اور سماعت کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ جن افراد پر اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور طاقت کے غلط استعمال وغیرہ کے الزامات ثابت ہو گئے انہیں چھے سال کے لیے سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دیا گیا۔

دارالحکومت کی تبدیلی: جغرافیائی محل وقوع اور صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے باعث انتظامی اور دفاعی نقطۂ نظر سے کراچی موزوں دارالحکومت نہ تھا اور کسی نئے دارالحکومت کی تلاش عرصے سے کی جا رہی تھی۔ چودھری محمد علی کے دور وزارت میں گڈاپ کو صدر مقام بنانے کی تجویز کسی حد تک منظور ہو گئی تھی، لیکن بعد میں اس پر کوئی عملدرآمد نہ ہو سکا۔ نئی حکومت نے اس مسئلے پر بڑی سرگرمی دکھائی۔ راولپنڈی کے قریب ایک موزوں مقام ملک کے آئندہ دارالحکومت کے لیے پسند کیا گیا۔ اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا، شہر کا نہایت خوبصورت نقشہ تیار ہوا اور بڑی تیزی سے اس کی تعمیر کا کام ہونے لگا۔ اس وقت یہ شہر بہت حد تک مکمل ہو چکا ہے اور بیشتر مرکزی دفاتر اور سفارت خانے یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔

طویل المیعاد اصلاحات: نئی حکومت نے تیس کے قریب کمیشن مقرر کیے تاکہ وہ قومی زندگی کے ہر اہم پہلو کی اصلاح کے لیے رپورٹیں مرتب کریں، چنانچہ زراعت، صنعت، تعلیم، عائلی قوانین، مزدوروں کے مسائل اور مالی حکمت عملی وغیرہ کے سلسلے میں اہم اصلاحات نے قومی زندگی پر بڑا صحت مند اثر ڈالا۔

زراعت: سابقہ حکومتوں نے صنعتی ترقی کی طرف توجہ کرتے وقت زراعت کو، جسے پاکستان کی اقتصادیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، نظر انداز

کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فالتو اناج پیدا کرنے والے ملک کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر سے اناج درآمد کرنا پڑا - نئی حکومت نے زرعی اصلاحات نافذ کیں، جن کی رو سے صوبۂ مغربی پاکستان میں ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی (زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایکڑ زیر کاشت یا ایک ہزار ایکڑ بنجر اراضی)، غیر قانونی طور پر حاصل کی ہوئی اراضی اور جاگیریں ضبط اور حد ملکیت سے زیادہ زمین مالکان اراضی کو مناسب معاوضہ دے کر حاصل کی گئی - اس طرح تقریباً سوا بائیس لاکھ ایکڑ رقبہ حاصل کر کے اسے ڈیڑھ لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن کے پاس چپہ بھر زمین بھی اپنی نہیں تھی - علاوہ ازیں موروثی مزارعین کو حقوق ملکیت دے دیے گئے - اس سے صوبے کی تقریباً پانچ لاکھ زراعت پیشہ آبادی مستفید ہوئی - مزیدبرآں پانی کی تقسیم کا نظام بہتر بنایا اور بہتر بیج، کھاد اور کھیتی باڑی میں مشینوں کے استعمال کو رواج دے کر ملک کو غلے کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی کامیاب کوشش کی.

صنعت: تقسیم برصغیر کے وقت پاکستانی علاقوں میں کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی اگرچہ یہاں وافر مقدار میں خام مال پیدا ہوتا تھا - صنعتی ترقی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۴۹ء کی رو سے ملک میں صنعتوں کے قیام کے لیے مرکزی حکومت کی منظوری لازم قرار دی گئی - پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں لایا گیا - اس ادارے کا کام یہ تھا کہ بہتر منصوبہ‌بندی کے ذریعے بھاری صنعتیں قائم کر کے بعد میں نجی سرمایہ‌کاروں کے ہاتھ منتقل کر دے - اس ادارے کی کارکردگی شروع ہی سے اچھی رہی ہے، لیکن انقلابی حکومت نے اصلاح احوال کے لیے متعدد اقدامات کر کے ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار کو کافی تیز کر دیا اور پارچہ‌بافی، کاغذسازی، سگرٹ‌سازی، دواسازی اور پٹ سن کی صنعت وغیرہ میں ملک نہ صرف خود کفیل ہو گیا بلکہ تیار شدہ مال بیرونی ممالک میں بھی جانے لگا - سوئی گیس کے استعمال اور نئے بجلی گھروں کے قیام نے صنعتی پیداوار کی صلاحیت کو کافی بڑھا دیا ہے.

تعلیم: اگست ۱۹۵۹ء میں صدر کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے اپنی ضخیم رپورٹ پیش کی اور اس میں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے بارے میں متعدد بنیادی تبدیلیاں تجویز کی گئیں، جنھیں عملی جامہ پہنانے میں کثیر رقم صرف ہوئی، تاہم اس سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے.

سندھ طاس کا معاہدہ: نہری پانی کا جھگڑا ہندوستان سے بدستور چلا آ رہا تھا اور اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا - اسے ختم کرنے کے لیے عالمی بنک کے توسط سے ستمبر ۱۹۶۰ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے مغربی پاکستان کے تین مشرقی دریاؤں، یعنی ستلج، بیاس اور راوی، پر ہندوستان کا اور تین مغربی دریاؤں، یعنی چناب، جہلم اور سندھ، پر پاکستان کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور طے پایا کہ دس سال تک ہندوستان پاکستان کو بدستور پانی سہیا کرتا رہے گا، مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں مغربی دریاؤں کا رخ بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا، ۱۹۷۰ء تک پاکستان دو بند تعمیر کرے گا اور چار سو میل لمبی نہریں کھودے گا تاکہ مستقبل میں وہ ان کی مدد سے اپنی ضروریات پوری کر سکے - یہ بھی طے ہوا کہ اس منصوبے کے اخراجات سندھ طاس ترقیاتی فنڈ سے پورے کیے جائیں گے، جسے آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، مغربی جرمنی، امریکہ اور ہندوستان کے

تعاون سے قائم کیا جائے گا ۔ مسئلے کا یه حل کئی پہلوؤں سے پاکستان کے لیے خوشگوار نه تھا، لیکن موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی اور چارہ نظر نه آتا تھا ۔

آئین اور نئے انتخابات : صدر ایوب نے زمام اقتدار سنبھالتے وقت اعلان کیا تھا که جمہوری زندگی بحال کر دی جائے گی ۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریتوں کا حکم جاری کیا گیا، جس کے تحت بالغ رائے دہی کے اصول پر دونوں صوبوں سے دس هزار ارکان منتخب هوے ۔ اگلے سال صدر نے ان سے اعتماد کا ووٹ لے کر اپنی نمائندہ حیثیت مضبوط کر لی ۔ ملک کا نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے سپریم کورٹ کے ایک جج کی سربراهی میں آئین کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا، جس کی رپورٹ میں بہت سی ترمیمات کرنے کے بعد صدر نے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کر دیا ۔ یه ایک جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا دستور تھا، جس میں ملک کے دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی؛ مرکز کو بہت مضبوط رکھا گیا تھا اور صدر مملکت کو انتظامیه اور قانون سازی کے وسیع اختیارات دیے گئے تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'') ۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے رکن چنے ۔ ۸ جون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں نئی قومی اسمبلی کا اجلاس هوا ۔ اسی روز صدر ایوب خاں نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا، مارشل لا ختم کر دیا گیا اور حکومت کا کاروبار عام ملکی قانون کے تحت چلنے لگا.

نئے آئین کے بعد : مارشل لا کے زمانے میں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں لگ جانے کے باعث ملک میں تمام سیاسی سرگرمیاں ختم هوگئی تھیں اور اکثر سیاسی رهنما ''ایبڈو'' کے تحت سیاست میں حصه لینے سے روک دیے گئے تھے؛ اس کے باوجود بنیادی جمہوریتوں اور بعد ازاں اسمبلیوں کے انتخابات کے دوران میں یه بات واضح هوگئی که ابھی تک ملک میں ایک بڑا طبقه صدارتی طرز حکومت کا مخالف اور پارلیمانی جمہوریت کے حق میں ھے اور اس کا مطالبه ھے که سیاسی پارٹیاں بحال کی جائیں اور بنیادی جمہوریتوں کے بجاے بالغ راے دهی کی بنیاد پر اسمبلیوں کے انتخابات عمل میں آئیں ۔ قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی بحالی کا قانون تو منظور کر لیا، لیکن ۱۹۶۵ء میں هونے والے عام انتخابات کے لیے بنیادی جمہوریتوں کی انتخابی ادارے کی حیثیت برقرار رکھی.

حزب مخالف کا ایک گروہ سیاسی جماعتوں کی بحالی اور انتخابات کا قائل نہیں تھا اور چاهتا تھا که ایک متحدہ کمان کے تحت آئین کو جمہوری بنانے کی مہم شروع کی جائے، لیکن بیشتر سیاست دانوں نے اپنی اپنی جماعتوں کو بحال اور منظم کرنے کا فیصله کیا اور یوں ایک اچھی خاصی حزب اختلاف اسمبلی کے اندر اور باهر وجود میں آ گئی ۔ اسی زمانے میں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو هوئی اور اس کی صدارت صدر محمد ایوب خاں نے سنبھال لی.

۱۹۶۴ء میں سیاسی سرگرمیاں تیز هوگئیں ۔ حزب اختلاف کی تقریبًا تمام اهم جماعتوں نے ایک نو نکاتی پروگرام کے تحت متحدہ محاذ بنایا اور صدارتی انتخاب کے لیے اپنے امیدوار کی حیثیت سے قائد اعظم کی همشیرۂ محترمه فاطمه جناح کو چُنا ۔ نومبر ۱۹۶۴ء میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی نتائج کا اعلان هوا ۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو صدارتی انتخاب هوا اور صدر محمد ایوب خاں ایک بار پھر منتخب هو گئے ۔ ان انتخابات کا ایک

اہم پہلو، جس کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوے، یہ تھا کہ انتخابی مہم کے دوران میں سرکاری جماعت کو اپنی کارکردگی ظاہر کرنے کا اور مخالف سیاسی رہنماؤں کو حکومت کی غلطیاں اور نظم و نسق کی خرابیاں عوام کے سامنے پیش کرنے کا پورا موقع مل گیا اور وہ تصویر کے دونوں رخوں سے واقف ہو گئے - عین ممکن تھا کہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کے لیے کوئی تحریک شروع ہو جاتی، لیکن بھارت کی روز افزوں معاندانہ سرگرمیوں سے قوم کی پوری توجہ دفاع مملکت کی طرف مبذول ہو گئی۔

بھارت سے جنگ: ۱۹۶۵ء کے اوائل میں بھارتی فوج نے رن کچھ میں پاکستان کے کچھ علاقے پر فوجی قبضہ کر لیا تو پاکستانی افواج بھی حرکت میں آ گئیں اور انھوں نے حملہ آوروں کو مار بھگایا - ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے اعلان جنگ کیے بغیر مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا - یہ لڑائی سترہ روز تک جاری رہی - اس کے دوران میں پاکستانی افواج نے شجاعت، استقلال اور جوانمردی کا اور عوام نے اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا فقید المثال مظاہرہ کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی حملے میں بھارتی افواج پاکستانی علاقے کے جس محدود رقبے پر قابض ہو گئیں تھیں، وہاں سے نہ صرف یہ کہ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکیں بلکہ پاکستانی فوجوں نے پیش قدمی کر کے ان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۲۳ ستمبر کی صبح کو سلامتی کونسل کی ہدایت پر جنگ بند ہو گئی - ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیجن کی وساطت سے تاشقند کے مقام پر دونوں ملکوں کے سربراہوں نے اس امر پر رضامندی ظاہر کر دی کہ فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پرانی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی اور باہمی تنازعات گفت و شنید کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔

اعلان تاشقند کے بعد: جنگ کے دوران میں کشمیر کی گتھی کچھ سلجھتی دکھائی دی تھی - اعلان تاشقند سے یہ مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا اور مقبوضہ کشمیر کے جو علاقے فتح کر لیے گئے تھے وہ واپس دینے پڑے - اس سے عوام میں بڑی مایوسی اور بےدلی پھیلی اور جگہ جگہ اعلان تاشقند کے خلاف مظاہرے ہوے، جنھیں بڑی سختی سے دبا دیا گیا۔

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد ملک کی تمام خرابیوں کا ذمے دار سیاستدانوں کو ٹھیرایا گیا تھا، اگرچہ اس دوران میں زیادہ عرصہ ایسا گزرا تھا جب سر براہ مملکت کے عہدے پر دو ریٹائرڈ سرکاری ملازم، یعنی ملک غلام محمد اور میجر جنرل اسکندر مرزا، فائز رہے تھے اور انھوں نے وقتاً فوقتاً مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ کر، بار بار وزارتیں بدل کر، عام انتخابات کو التوا میں ڈال کر، سرکاری ملازمین کو سیاست میں دخیل بنا کر، کبھی ایک اور کبھی دوسری جماعت کو بر سر اقتدار لا کر، حتی الامکان اس امر کی کوشش کی تھی کہ وہ اقتدار اعلٰی پر قابض رہیں - انقلابی حکومت کے ابتدائی اقدامات کو تہ دل سے سراہا گیا اور کچھ عرصے کے لیے یوں نظر آنے لگا کہ اب سابقہ حکومتوں کی بدعنوانیوں کا اعادہ کبھی نہ ہو گا؛ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حکومت پر صدر مملکت کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور عوامی نمائندوں کی جگہ نوکر شاہی لیتی گئی - تمام اختیارات مرکز میں مرکوز کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگوں کو اپنی معمولی سے معمولی تکلیف کے ازالے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں - ۱۹۶۴ء کے عام انتخابات ہوے تو انتخابی جلسوں

میں حزب اختلاف نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا اور لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ شخصی حکومت کے ذریعے انھیں جمہوری حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، برسر اقتدار طبقہ اپنے مناصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی وسائل کو محدود مفادات کے تحت استعمال کرنے لگا ہے، انتظامیہ میں زراندوزی اور رشوت‌ستانی زوروں پر ہے اور ملک کی دولت کا ارتکاز معدودے چند گھرانوں میں ہوتا جا رہا ہے ۔ اس سے عوام میں بے چینی روز بروز بڑھنے لگی ۔ اعلان تاشقند نے ایک تازیانے کا کام دیا اور حکومت کے خلاف کھلم کھلا مظاہرے ہونے لگے ۔ ان کے خلاف حکومت نے امن و ضبط کے نام پر جس رد عمل کا اظہار کیا اس سے عوام ایک بار پھر سیاست دانوں سے توقعات وابستہ کرنے لگے ۔

۱۹۶۷ء میں پانچ سیاسی جماعتوں (کونسل مسلم لیگ، قومی جمہوری محاذ، نظام اسلام پارٹی، جماعت اسلامی اور عوامی لیگ) نے مندرجۂ ذیل آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت تحریک جمہوریت پاکستان کا آغاز کیا: (۱) وفاقی پارلیمانی طرز حکومت کا قیام اور بالغ رائے‌دہی کے اصول پر براہ راست انتخابات؛ (۲) مکمل علاقائی خود مختاری؛ (۳) وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع، خارجہ امور، کرنسی، وفاقی مالیات، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کے امور رہنے چاہییں؛ (۴) دس سال کے اندر دونوں صوبوں میں عدم مساوات کا خاتمہ؛ (۵) کرنسی، زرمبادلہ، مرکزی بینکاری، بیرونی تجارت، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کا انتظام کرنے کے لیے دونوں صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کے منتخبہ بورڈ کا قیام؛ (۶) دس سال کے اندر ملازمتوں میں مساوات؛ (۷) دفاعی معاملات میں مساوات؛ (۸) ۱۹۵۶ء کے آئین کی رو سے سات شقوں کا نفاذ ۔ عوامی لیگ آگے چل کر دو دھڑوں میں بٹ گئی ۔

اس کے مشرقی پاکستان کے اکثر ارکان نے شیخ مجیب الرحمٰن (جو اس وقت جیل میں تھے) کی قیادت میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے چھے نکاتی مطالبات پیش کر دیے ۔ تحریک جمہوریت پاکستان کے رہنماؤں نے وسیع پیمانے پر دورے کر کے ملک کے دونوں حصوں کے عوام سے رابطہ پیدا کیا اور یوں یہ تحریک آگے بڑھتی گئی ۔ ۱۹۶۸ء کی آخری سہ ماہی میں حکومت نے صدر ایوب خاں کی حکومت کے دس سال پورے ہونے پر بڑے جوش و خروش سے عشرۂ ترقی و اصلاحات منایا اور اس سلسلے میں سرکاری محکموں اور ملازمین نے انتہائی دلچسپی اور سرگرمی دکھائی ۔ اسی زمانے میں بنیادی جمہوریت کے بعض اداروں میں یہ قرار داد منظور ہوئی کہ صدر ایوب کو تاحیات صدر پاکستان بنا دیا جائے ۔ اس کا عوام میں شدید رد عمل ہوا اور مختلف عنوانات سے ملک بھر میں مظاہرے ہونے لگے اور برسر اقتدار جماعت کنونشن مسلم لیگ کے سوا باقی تمام جماعتوں نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات، خود مختار پارلیمنٹ اور اسلامی جمہوری حکومت کی بحالی کا مطالبہ شروع کر دیا ۔ ان مظاہروں میں طلبہ اور صنعتی مزدور بھی شامل ہوگئے ۔ کئی مقامات پر پر امن مظاہروں کو تشدد سے فرو کرنے کی کوشش کی گئی اور بعض مقامات پر خود مظاہرین نے بھی تشدد کا ثبوت دیا ۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں تین اور جماعتیں (نیشنل عوامی پارٹی کا ولی خاں گروپ، جمعیۃ العلمائے اسلام کا ہزاروی گروپ اور چھے نکاتی عوامی لیگ) بھی تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل ہو گئیں ۔ ۸ جنوری کو ان سب جماعتوں کے نمائندوں نے بحالی جمہوریت کی مشترکہ جد و جہد کے لیے جمہوری مجلس عمل

قائم کی اور اعلان کیا کہ جب تک ان کی آٹھ شرائط پوری نہیں کی جاتیں وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔

صدر ایوب خان نے شروع شروع میں ان مطالبات کو کوئی اہمیت نہ دی، لیکن جب مظاہروں کی شدت سے حکومت کا نظم و نسق معطل ہونے لگا تو انھوں نے یکم فروری کو اعلان کیا کہ وہ آئینی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے حزب اختلاف سے گفتگو کریں گے۔ مجلس عمل نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے ۸ شرائط پیش کیں: (۱) ہنگامی حالت فوراً ختم کر کے ڈیفنس آف پاکستان رولز منسوخ کیے جائیں؛ (۲) تمام سیاسی لیڈروں اور طلبہ کو رہا کیا جائے؛ (۳) پورے ملک سے دفعہ ۱۴۴ ہٹا لی جائے؛ (۴) تحفظ امن عامّہ اور پریس کے قوانین کے تحت اخبارات اور سیاسی کارکنوں کے خلاف کارروائیاں کالعدم قرار دی جائیں اور (۵) طلبہ پر لاٹھی چارج کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ ۱۲ فروری کو مجلس عمل کی اپیل پر ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی اور دو روز بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے سوا، جو ان دنوں اگرتلہ سازش کیس میں مأخوذ تھے، تمام رہنماؤں (مثلاً ذوالفقار علی بھٹو، عبدالولی خان، وغیرہ) کی رہائی اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ ۲۱ فروری کو صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ اگلے روز اگرتلہ کیس واپس لے کر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ۲۶ فروری کو راولپنڈی میں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا، جس میں تمام مخالف جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ آزاد رہنما ایر مارشل اصغر خان اور جسٹس محبوب مرشد نے بھی شرکت کی۔ ذوالفقار علی بھٹو (پیپلز پارٹی) اور عبدالحمید خان بھاشانی (نیشنل عوامی پارٹی) نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ ۱۰ مارچ کو عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کے بعد کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ صدر نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات اور پارلیمانی نظام کی بحالی کے مطالبات تسلیم کر لیے اور کانفرنس ختم ہوگئی۔ اسی روز شیخ مجیب الرحمٰن جمہوری مجلس عمل سے الگ ہوگئے کیونکہ ان کے خیال میں ”چھے نکات“ کی حمایت نہ کر کے مجلس نے مشرقی پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ ۱۷ مارچ کو بھاشانی نے اعلان کیا کہ انتخابات نہیں ہونے دیے جائیں گے اور ”گھیراؤ اور جلاؤ“ پر عمل کیا جائے گا کیونکہ ہماری منزل پارلیمانی جمہوریت نہیں بلکہ عوامی انقلاب ہے۔ اگلے روز ذوالفقار علی بھٹو نے بھی بائیں بازو کی تمام جماعتوں کو متحد ہو کر موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی تلقین کی۔ اس انتشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخابات کے ذریعے پُر امن انتقال اقتدار کی صورت باقی نہ رہی اور ملک بھر میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہنگاموں اور بلووں کی ایک رو چل نکلی۔ ہڑتالوں کے علاوہ آتش زنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کی بھی وارداتیں ہوئیں، جن کی روک تھام کے لیے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے اور افواج پاکستان کے سر براہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔

(ج) دوسرا مارشل لا اور جنرل یحییٰ خان کا دورِ صدارت (از ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء).

نئی فوجی حکومت کے سامنے پہلا مسئلہ قدرتی طور پر امن کی بحالی اور نظم و نسق کی درستی کا تھا، تاہم جنرل یحییٰ خان نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں جلد از جلد عوام

کی امنگوں کے مطابق آئینی حکومت قائم کی جائے گی اور اقتدار ان کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا.

صدر ایوب کی حکومت کے خاتمے کے بعد تین نئے نزاعی مسئلے ابھرے: (۱) وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے سابقہ صوبوں کی بحالی؛ (۲) مشرقی اور مغربی پاکستان کو ان کی آبادی کی اساس پر نمائندگی؛ (۳) صوبائی یا علاقائی خود مختاری.

مارشل لا حکومت نے شروع شروع میں ان اختلافات میں پڑنے کے بجائے نظم و نسق کی اصلاح، ضروری اشیا کی گرانی، پاکستان کی غذائی صورت حال، ملک کے معاشی عدم استحکام، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے باھمی تعلقات اور تعلیم و زراعت جیسے اھم مسائل پر پوری توجه صرف کی؛ عوامی مطالبات کے پیش نظر سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے ان پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن تشکیل کی گئی؛ الیکشن کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا اور انتخابی فہرستوں کی تیاری شروع ہو گئی.

۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو صدر یحیٰی خاں نے ایک نشری تقریر میں اعلان کیا که قومی اسمبلی کے انتخابات ''ایک فرد، ایک ووٹ'' کی بنیاد پر ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو منعقد ہونگے؛ قومی اسمبلی ۱۲۰ دنوں کے اندر دستور تیار کرے گی، جس کی منظوری کے بعد آئینی حکومت قائم کر دی جائے گی؛ یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی اور انتخابات سے پہلے مغربی پاکستان کی وحدت توڑ دی جائے گی (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'').

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو تمام سیاسی جماعتیں انتخابی مہم پر میدان میں نکل آئیں اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا پورے جوش و خروش سے آغاز ہو گیا۔ ۲۸ مارچ کو صدر نے دستور کے بنیادی اصولوں کا اعلان کیا اور ۳۱ مارچ کو انتخابات اور آئین ساز اسمبلی کے سلسلے میں قانونی ڈھانچے کا حکم جاری ہوا (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔ اعلان کے مطابق دستور کے بنیادی اصول یه ھیں: (۱) اسلامی جمھوریۂ پاکستان ایک وفاقی جمھوریه ہوگا؛ (۲) اسلامی نظریے کا، جو قیام پاکستان کی اساس ھے، تحفظ لازمی ہوگا؛ (۳) جمھوریت کے بنیادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا؛ (۴) شہریوں کے بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے؛ (۵) صوبوں کو انتظامی، مالیاتی اور آئین سازی کے امور میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں گے، لیکن وفاقی حکومت کے پاس اتنے اختیارات ضرور رھیں گے که وہ داخلی اور خارجی امور سے متعلق اپنی ذمے داریاں پوری کر سکے اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کر سکے؛ (۶) پاکستان کے ھر علاقے کو قومی امور میں پورا حصه لینے کا موقع دیا جائے گا اور ان میں عدم مساوات کو ختم کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں دستور میں مملکت کی پالیسی کے حسب ذیل رھنما اصول بھی تجویز کیے گئے: (۱) اسلامی نظام کا فروغ؛ (۲) اسلام کی اخلاقی اقدار کی پابندی؛ (۳) پاکستانی مسلمانوں کو قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتیں فراھم کرنا؛ (۴) اس بات کی ھدایت که کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا. یه بھی اعلان کیا گیا که صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے شروع ہونگے؛ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس دستور کے نفاذ کے بعد ھو سکیں گے؛ قومی اسمبلی ۱۲۰ دن کے اندر اندر دستور بنائے گی اور اس میں ناکام رھی تو توڑ دی جائے گی۔ قومی اسمبلی اپنا

تیار کیا ہوا دستور توثیق کے لیے صدر کے سامنے پیش کرے گی اور اگر صدر اس کی توثیق نہ کریں تو اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور اگر توثیق کر دیں گے تو دستور نافذ ہو جائے گا اور اقتدار قومی اسمبلی کو سونپ دیا جائے گا ۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں انتخابات کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

(۲) خارجی تعلقات کی سرگزشت

پاکستان کی خارجہ پالیسی کو تشکیل دیتے وقت دو بنیادی مقاصد ہر دور میں پیش نظر رہے ہیں: ملک کی سلامتی اور ترقی ۔ سلامتی میں ملک اور نظریۂ حیات (ideology) دونوں کا دفاع شامل ہے ۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں کے درمیان ایک ایسے ملک کا ایک ہزار میل لمبا علاقہ حائل ہے جس کا طرز عمل دوستانہ نہیں ۔ اس جغرافیائی علیحدگی اور دوری کے پیش نظر پوری قوم کو متحد رکھنے کے لیے ایک مشترک نظریۂ حیات اور نصب العین کا ہونا لابدی ہے، جس کی بقا اور تحفظ ہی پر قوم کی بقا کا انحصار ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے پاکستان ایشیا کا واحد ملک ہے جس کا ایک حصہ مشرق بعید اور دوسرا حصہ مشرق اوسط کے ممالک میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ اس لحاظ سے اسے زبردست جنگی اہمیت حاصل ہے ۔ ایک طرف تو اس کی سرحدیں برما، بھارت، افغانستان اور ایران کے علاوہ روس اور چین سے ملتی ہیں اور دوسری طرف یہ ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے ساتھ امریکہ کے اقتصادی اور سیاسی مفاد وابستہ ہیں ۔ اس طرح پاکستان دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں کے متضاد مفادات کی راہ میں کھڑا ہے اور اپنی سلامتی اور ترقی کے لیے ان تینوں کے ساتھ متوازن روابط قائم رکھنا اس کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی رہا ہے کہ تمام قومیں برابر ہیں اور ہر قوم کو آزاد رہنے اور اپنے نصب العین کے مطابق اپنی حکومت کا نظام قائم کرنے کا حق حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ دنیا کے ہر محکوم ملک، بالخصوص یورپی استعمار کے شکار افریشیائی ممالک کے حق خوداختیاری اور مطالبۂ آزادی کی بھرپور حمایت کی ہے ۔ علاوہ ازیں نظریاتی مماثلت کی بنا پر اسلامی ممالک سے اہل پاکستان کو جو قلبی تعلق رہا ہے اس کی جھلک بھی ملک کی خارجہ پالیسی میں شروع دن سے نظر آتی رہی ہے۔

قائد اعظم نے قیام پاکستان کے وقت فرمایا تھا کہ ہم دنیا کے تمام ملکوں سے دوستی کے خواہاں ہیں اور کسی سے دشمنی رکھنا نہیں چاہتے ۔ یہ اصول پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اساس ہے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے ۔ دنیا بھر میں صرف بھارت ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ ابھی تک خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔

بھارت: بھارت سے مراسم کی جو کیفیت رہی ہے اس کی وجہ سے پاکستان کے لیے نت نئے مسائل پیدا ہوئے۔

دونوں ملکوں کے درمیان ایک بڑا اختلافی مسئلہ مغربی پاکستان کے دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا تھا ۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں بھارت نے ان دریاؤں سے جن کے طاس اس کے قبضے میں تھے پاکستانی نہروں میں پانی دینا بند کر دیا ۔ کئی برس تک گفت و شنید ہوتی رہی ۔ ۱۹۵۲ء میں عالمی بینک نے اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمے داری لی اور بالآخر ۱۹۶۰ء میں سندھ طاس کا بین الاقوامی معاہدہ

طے پایا (تفصیل پہلے آ چکی ہے)۔

اعلان آزادی کی رو سے ہندوستان کو ہندو اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں تقسیم ہونا تھا اور ریاستوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسی میں شامل ہو جائیں، البتہ اس کا فیصلہ کرتے وقت ریاستی عوام کی خواہشات اور جغرافیائی محل وقوع کا خیال رکھیں ۔ اس بات پر بھی اتفاق ہو چکا تھا کہ جہاں اس معاملے میں حکمران اور رعایا کے درمیان اختلاف پیدا ہو وہاں فیصلہ رعایا کی مرضی کے مطابق کیا جائے ۔ یہ اختلاف برطانوی ہند کی صرف تین ریاستوں — حیدر آباد، جونا گڑھ اور جموں و کشمیر — میں رونما ہوا اور تینوں ریاستوں میں بھارتی حکومت نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کیا اور فوجی کارروائی کے ذریعے حیدر آباد اور جونا گڑھ کا الحاق کر لیا ۔ ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے درمیان ایک سال کے لیے حالات و تعلقات جوں کے توں رکھنے کا معاہدہ (Stand-still Agreement) ہو چکا تھا، لیکن مہاراجا کشمیر بھارت کے ساتھ الحاق پر تلا ہوا تھا ۔ آزادی کا اعلان ہوا تو کشمیر میں ریاستی افواج اور حریت پسندوں کی جنگ جاری تھی ۔ عوام آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کر چکے تھے اور پونچھ کا علاقہ آزاد کرا کے اب وادی میں پیش‌قدمی کر رہے تھے ۔ ان کی فوجی کامیابیوں سے خائف ہو کر ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجا فرار ہو کر دہلی جا پہنچا اور وہاں سے فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے بھارت میں ریاست کی مشروط شمولیت کی دستاویز پر دستخط کر دیے ۔ شرط یہ تھی کہ ریاست کے مستقبل کا آخری فیصلہ وہاں کے عوام کی رائے کے مطابق کیا جائے گا ۔ ۲۷ اکتوبر کو ماؤنٹ بیٹن نے الحاق منظور کر لیا اور اسی روز بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتار دی گئیں، جس سے جنگ میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی ۔ پاکستان نے اس نام نہاد الحاق کو ماننے سے انکار کر دیا اور سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ یہ پاکستان کے خلاف مہاراجا اور بھارتی حکومت کی سازش ہے اور چونکہ کشمیری عوام مہاراجا کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اور اس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دے کر اس پر عدم اعتماد کا واضح طور پر اظہار کر چکے ہیں، لہٰذا اسے ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

یکم نومبر کو پاکستان اور بھارت کے گورنر جنرلوں کی ملاقات ہوئی اور ماؤنٹ‌بیٹن اقوام متحدہ کے زیر نگرانی کشمیر میں استصواب رائے عامّہ پر رضامند ہو گیا، لیکن آگے چل کر پنڈت نہرو نے یہ موقف اختیار کیا کہ بھارتی فوجیں بدستور کشمیر میں رہیں گی، استصواب بھارتی حکومت کرائے گی اور اقوام متحدہ کے نمائندوں کی حیثیت مشیر کی ہوگی ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات پاکستان کے لیے ناقابل تسلیم تھی۔

اس دوران میں مشہور کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کو، جن کے کانگرسی رہنماؤں سے بہت اچھے تعلقات رہے تھے، جیل سے رہا کر کے کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ۔ شیخ عبداللہ کی خواہش تھی کہ ریاست داخلی طور پر خود مختار رہے اور صرف امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کے محکمے بھارتی حکومت کے زیر اختیار ہوں ۔ بھارتی رہنماؤں کی طرف سے انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ ریاست کے مستقبل کا مسئلہ عوام کی رائے معلوم کر کے ہی طے کیا جائے گا .

اسی زمانے میں گلگت کا علاقہ بھی آزاد کرا لیا گیا اور بھارتی حکومت کو نظر آنے لگا کہ وہ کشمیر پر طاقت کے ذریعے قبضہ نہ جما سکے گا ۔

اس نے پاکستان پر یہ الزام لگایا کہ وہ کشمیر میں قبائلی پٹھان اور فوجی دستے بھیج کر بھارت کے داخلی امور میں مداخلت اور جارحیت کا ثبوت دے رہا ہے اور ۳۱ دسمبر کو اس نے یہی شکایت سلامتی کونسل کے سامنے بھی پیش کر دی۔

سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کی کہ جنگ بند کر دی جائے، دونوں ملک اپنی اپنی فوجیں ریاست سے نکال لیں اور اقوام متحدہ کے زیرنگرانی ریاستی عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ یہ قرارداد بھارت اور پاکستان دونوں نے قبول کر لی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی ہو گئی، خط متارکۂ جنگ کے دونوں طرف جنگ بندی کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کے مبصر مقرر کر دیے گئے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کا ایک کمیشن (UNCIP) استصواب کے ضروری انتظامات کرنے کے لیے برصغیر بھیجا گیا، لیکن اسے جلد ھی معلوم ہو گیا کہ پاکستان اور بھارت کے موقف اس معاملے میں مختلف ھیں۔ سلامتی کونسل نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی بار کوشش کی، مگر مذکورۂ بالا وجوہ سے ہر بار ناکامی ہوئی۔

۱۹۵۳ء میں بھارتی نائب وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ بھارت استصواب رائے عامہ کا پابند نہیں اور اس کے ساتھ ھی کشمیر کو بھارت کا ایک صوبہ بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس پر شیخ عبداللہ نے احتجاج کیا تو انھیں بر طرف کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں بھارتی وزیر اعظم نے استصواب کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب اس کا وقت گزر چکا ہے اور حالات تبدیل ہو گئے ھیں۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں درگاہ حضرت بل، سری نگر، سے موئے مبارک چوری ہو گیا تو پوری وادی میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے پر امن مظاہروں کو حکومت نے بڑی سختی سے دبایا، مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا، جنھوں نے جیل سے نکلتے ھی رائے شماری کا مطالبہ کیا۔ وہ دہلی میں پنڈت نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد صدر پاکستان سے ملنے کے لیے راولپنڈی پہنچے۔ اس اثنا میں، پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا (مئی ۱۹۶۴ء) اور گفت و شنید کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں بھارتی غیر مسلموں کی آباد کاری اور مسلمانوں کے اخراج کی رفتار تیز ہو گئی اور پاکستان اور بھارت کے تعلقات بگڑتے چلے گئے۔

۱۹۵۶ء میں بھارتی فوجوں نے رن کچھ میں پاکستان کے علاقۂ چھڈ بیٹ پر قبضہ کر لیا، لیکن پاکستان نے قیام امن کی خاطر کوئی جوابی کارروائی نہ کی۔ اپریل ۱۹۵۸ء میں بھارتی دستوں نے مشرقی پاکستان میں، کچھار۔سلہٹ سرحد کے پار سے فائرنگ شروع کر دی۔ ۱۹۶۲ء میں چین سے شکست فاش کھانے کے بعد کچھ دنوں تک بھارت نے امن پسندی کا اظہار کیا، لیکن جلد ھی حالات پھر بگڑ گئے۔

۱۹۶۵ء میں بھارتی فوج نے چھڈ بیٹ سے پاکستانی علاقے میں مزید پیش قدمی کا آغاز کیا تو اس کا جواب دینا ضروری سمجھا گیا۔ بالآخر وزیر اعظم برطانیہ کی مداخلت پر جنگ بند ہو گئی اور اس علاقے کی ملکیت کا تنازع طے کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی ٹریبونل (tribunal) مقرر کیا گیا، جس نے ۱۹۶۸ء میں فیصلہ کیا کہ چھڈ بیٹ اور کنجر کوٹ کے علاقوں پر پاکستان کا حق ہے۔

مارچ ۱۹۶۵ء میں کشمیر کو بھارت میں باضابطہ طور پر مدغم کر کے اسے ایک صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ اس پر عوام بھڑک اٹھے۔ شیخ عبداللہ اور رائے شماری محاذ کے مقتدر رہنماؤں

کو گرفتار کر کے ریاست میں هنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا ۔ عوامی جلسوں، جلوسوں، مظاهروں اور هڑتالوں کو تشدد سے دبانے کی کوشش کی گئی ۔ ۷ اگست ۱۹۶۵ء کو حریت پسندوں نے ایک انقلابی کونسل قائم کر کے بھارت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بھارتی فوج کو شدید نقصان پہنچایا ۔ بھارت نے حسب معمول پاکستان کو اس کارروائی کا ذمے دار ٹھیرایا اور تمام بین الاقوامی معاهدوں کو نظر انداز کرتے ہوے نہ صرف کشمیر میں کرگل، ٹیٹوال اور درۂ حاجی پیر پر قبضہ کر لیا بلکہ پاکستان کے علاقے میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں اعوان شریف پر گولہ باری کر کے وهاں کی شہری آبادی کو نقصان پہنچایا ۔ اس پر آزاد کشمیر اور پاکستان کی افواج نے مشترکہ طور پر جوابی کارروائی کر کے علاقۂ جموں میں چھمب، دیوا اور جوڑیاں پر قبضہ کر لیا اور قریب تھا کہ جموں بھی فتح هو جاتا کہ بھارت نے ۶ ستمبر کی صبح کو اعلان جنگ کیے بغیر لاهور پر تین طرف سے حملہ کر دیا؛ لیکن انھیں بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا هونا پڑا ۔ پاکستانی افواج نے مقابلةً قلیل‌التعداد هونے کے باوجود انتہائی پامردی اور شجاعت کا ثبوت دیا اور وہ قصور کی طرف سے پیش قدمی کر کے مشہور بھارتی قصبے کھیم کرن پر قابض هو گئیں ۔ اسی طرح سلیمانکی هیڈ کے علاقے میں بھی کچھ بھارتی علاقے پر قبضہ کر لیا گیا ۔ اس جنگ کی شدید ترین لڑائیاں سیالکوٹ اور چونڈہ میں لڑی گئیں ۔ یہاں بھاری تعداد میں بھارتی ٹینک، بکتربند گاڑیاں اور دوسرا فوجی ساز و سامان تباہ هوا اور هزاروں فوجی کام آئے ۔ پاکستانی فضائیہ نے بھارت کی هوائی فوج کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور پٹھانکوٹ، آدم پور، هلواڑہ، انبالہ، جام‌نگر اور جےپور کے هوائی اڈوں کو بےحد نقصان پہنچایا ۔ بھارت کے ۱۱۳ جنگی طیارے تباہ هوے ۔ پاکستانی بحریہ نے دوارکا کے بحری اڈے پر حملہ کر کے اسے بالکل برباد کر دیا اور اس کی آبدوز نے دو بھارتی جہاز غرق کر دیے ۔

۲۳ ستمبر کی صبح کو سلامتی کونسل نے جنگ بند کرا دی ۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیجن نے صدر ایوب خاں اور وزیر اعظم شاستری کے درمیان تاشقند میں مذاکرات کا انتظام کیا، جنھوں نے ۱۰ جنوری کو اعلان تاشقند پر دستخط کر دیے ۔ طے پایا کہ فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی ”پوزیشنوں“ پر واپس چلی جائیں گی، دونوں ملک تعاون سے کام لیں گے اور اپنے تمام جھگڑے پُر امن طور پر طے کریں گے ۔ فوجیں تو محاذ جنگ سے واپس آ چکی هیں، لیکن تنازعات جوں کے توں قائم هیں اور بھارت کے طرز عمل میں کسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے ۔

بھارت کی مسلم اقلیت کا مسئلہ بھی مسلسل وجہ تشویش رها ہے ۔ حصول آزادی کے بعد اب تک وهاں بڑی شدید نوعیت کے پانچ سو سے زیادہ مسلم کش فسادات هو چکے هیں ۔

فرخابند کا تنازع بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ مشرقی پاکستان کی سرحد سے گیارہ میل دور فرخا کے مقام پر بھارت دریاے گنگا پر ایک عظیم الشان بند تعمیر کر رها ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مشرقی پاکستان کی زرعی اراضی کا ایک بہت بڑا رقبہ پانی کی کمی کا شکار هو جائے گا اور تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ افراد اس سے متأثر هوں گے ۔ پاکستان کے مسلسل احتجاج کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں هوا اور سرکاری سطح پر چند کانفرنسوں کے باوجود نہ صرف اس منصوبے کو تیزی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا رها ہے

بلکہ دریاے گنگا کے بڑے بڑے معاونوں پر اسی قسم کے بند بنانے کے کچھ اور منصوبے بھی بھارتی حکومت کے زیرِ غور ہیں۔

افغانستان : شروع شروع میں افغانستان کا رویّہ بھی پاکستان کے بارے میں غیر دوستانہ رہا ۔ یہ واحد ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی تھی ۔ اس کی طرف سے ایک عرصے تک پختونستان کا نعرہ بلند ہوتا رہا، حتّی کہ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے ۔ مئی ۱۹۶۳ء میں شاہنشاہ ایران کی مساعی سے یہ تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے اور دونوں طرف سے خیر سگالی اور باہمی تعاون کا اظہار ہونے لگا ۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں اہل افغانستان نے بھارتی جارحیت کی مذمت کی اور اپنے گھروں میں پاکستان کے تحفظ کے لیے دعائیں مانگیں ۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان فضائی اور برّی مواصلات کا سلسلہ قائم ہے ۔ افغانستان کی تقریباً ساری بیرونی تجارت پاکستان کے راستے ہوتی ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کی طرف سے اسے ہر ممکن معاونت اور سہولت مہیا کی جاتی ہے ۔ مئی ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے ایک سرکاری وفد کا دورۂ افغانستان بہت کامیاب رہا اور اب کئی مشترکہ صنعتی اور تحقیقاتی منصوبے دونوں ملکوں کے زیر غور ہیں۔

چین : عوامی جمہوریۂ چین کا قیام ۱۹۴۹ء میں عمل میں آیا تو جن ممالک نے اسے سب سے پہلے تسلیم کیا ان میں پاکستان بھی شامل تھا ۔ پاکستان کا یہ اہم ترین ہمسایہ ہے اور شروع ہی سے ان دونوں میں اچھے تعلقات چلے آ رہے ہیں ۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت نے اپنے سکّے میں کمی کا اعلان کرکے پاکستانی روپے کو نئی شرح کے مطابق قبول کرنے سے انکار کر دیا تو باہمی تجارت منقطع ہو گئی ۔ پاکستان میں کوئلے کی ساری ضرورت بھارت ہی پورا کرتا تھا اور وہی اس کی پٹ سن اور روئی کا سب سے بڑا خریدار تھا ۔ اس موقع پر چین نے پٹ سن اور روئی کے بدلے میں کوئلہ دینے کی پیشکش کی اور پاکستان کو ایک بڑے معاشی بحران سے بچا لیا ۔ یہ خوشگوار تعلقات کے قیام کی ابتدا تھی ۔ جنگ کوریا میں پاکستان کے اس طرز عمل سے چین کو مزید تقویت ملی کہ اول الذکر نے اقوام متحدہ کی فوج میں اپنے فوجی دستے کوریا اور چین کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجنے سے انکار کر دیا اور اقوام متحدہ میں چین کے خلاف تجارتی پابندیاں عائد کرنے اور اسے جارح قرار دینے کی امریکی قرارداد کے حق میں راے دینے سے احتراز کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اشتراکی ممالک کے برعکس چین نے کبھی پاکستان کی "سینٹو" اور "سیٹو" معاہدات کی رکنیت پر اعتراض نہیں کیا اور اسے چین دشمنی کے مترادف قرار نہیں دیا ۔ اقوام متحدہ میں پاکستان نے چین کی رکنیت کی ہمیشہ پرزور حمایت کی ہے اور اس سلسلے میں پیش ہونے والی تمام قراردادوں کے مجوزین میں پیش پیش رہا ہے ۔ چین نے بھی تنازع کشمیر کے سلسلے میں کبھی بھارت کی حمایت نہیں کی اور اس کا موقف یہ رہا ہے کہ تنازع فی الواقع موجود ہے اور اسے باہمی گفت و شنید سے پرامن طور پر حل کرنا چاہیے ۔ ۱۹۶۰ء میں جب بھارت نے سنکیانگ اور کشمیر کی سرحد متعین کرنے کا مسئلہ اٹھایا تو چین نے اعلان کیا کہ یہ علاقہ فی الوقت پاکستان کے قبضے میں ہے، لہٰذا بھارت سے اس کے بارے میں گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ۱۹۶۱ء میں پاکستان نے یہی تجویز پیش کی تو چین بخوشی رضامند ہو گیا، چنانچہ چار ماہ کی گفت و شنید سے تمام تفصیلات طے کر لی گئیں اور

معاہدۂ حد بندی پر دستخط ہو گئے - اس کی رو سے پاکستان کو ۷۵۰ مربع میل کا ایسا علاقہ مل گیا جو قبل ازیں چین کے قبضے میں تھا - ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو چین نے اس جارحیت کی علانیہ مذمت کی اور پاکستان کو ہر قسم کی امداد پیش کی - دنیا کی تیسری بڑی طاقت کی علانیہ حمایت پاکستان کے لیے بڑی حوصلہ افزا ثابت ہوئی - بعد ازاں چین کے صدر اور وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ اگر آئندہ پاکستان کے خلاف کسی نے جارحیت سے کام لیا تو چین پاکستان کے دوش بدوش نظر آئے گا۔

دونوں ملکوں کے درمیان تجارت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے - ۱۹۶۳ء میں پہلا باقاعدہ تجارتی معاہدہ ہوا اور طے پایا کہ تجارت اور بار برداری کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے گا - پاکستان دھاتیں، فولادی مصنوعات، کوئلہ، سیمنٹ، مشینیں، کیمیاوی خام اشیا اور دالیں درآمد کرے گا اور چین پٹ سن، روئی، سوتی مصنوعات، کھیلوں کا سامان، چمڑا اور کھالیں - اسی سال براہ راست فضائی سروس قائم کرنے کا معاہدہ ہوا، جس پر اپریل ۱۹۶۴ء سے عملدرآمد شروع ہو گیا - ۱۹۶۵ء میں چین نے ۶ کروڑ ڈالر کا بلا سود قرضہ دیا تاکہ پاکستان میں اس کی مدد اور تعاون سے ٹیکسلا کے مقام پر مشینیں بنانے کا ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا جائے اور اس معاملے میں ملک خود کفیل ہو سکے - ۱۹۶۷ء میں سیلابوں کے باعث مشرقی پاکستان میں خوراک کی کمی واقع ہوئی تو چین نے ایک لاکھ ٹن چاول فراہم کیا - اسی سال گلگت اور سنکیانگ کے درمیان مشہور تاریخی راستے "شاہراہِ ریشم" کو دوبارہ جاری کرنے کا معاہدہ ہوا - جون ۱۹۶۸ء میں چین کے تعاون سے مشرقی پاکستان میں اسلحہ سازی کا کارخانہ قائم کرنے کے بارے میں اعلان ہوا۔

پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی روابط استوار کرنے میں بھی سرگرمی کا اظہار ہوا ہے اور دونوں طرف سے مختلف وفود آتے جاتے رہتے ہیں۔

روس: چین کے بعد روس دوسری بڑی عالمی طاقت ہے جس کا شمار پاکستان کے قریبی ہمسایوں میں ہوتا ہے - ۱۹۴۸ء میں دونوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے - ابتدا میں پاکستان پورے طور پر مغربی بلاک میں شامل تھا، جس کے باعث سیاسی تعلقات میں کوئی استحکام پیدا نہ ہو سکا - روس "سیٹو" اور "سنٹو" میں پاکستان کی شمولیت پر ناراض تھا اور پاکستان کو شکایت تھی کہ روس پختونستان کے معاملے میں افغانستان کی اور مسئلۂ کشمیر میں بھارت کی بے جا حمایت کر رہا ہے - بہر حال دونوں ممالک میں اقتصادی اور تجارتی تعلقات قائم رہے - ۱۹۵۲ء میں روسی گندم کے بدلے میں پاکستانی پٹ سن برآمد کرنے کا معاہدہ ہوا - ۱۹۵۶ء میں ایک اور تجارتی معاہدہ ہوا - ۱۹۵۷ء میں روس کا ایک تجارتی نمائندہ کراچی میں متعین کیا گیا اور پاکستان میں روس سے لوہا، کوئلہ اور اخباری کاغذ درآمد ہونے لگا۔

گزشتہ چند سال سے باہمی تعلقات میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اور باہمی غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں - مارچ ۱۹۶۱ء میں روس نے پاکستان کو تیل کی تلاش کے سلسلے میں فنی امداد کے علاوہ تین کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا - اسی سال دونوں ملکوں کی فضائی کمپنیوں کو سفر کی سہولتیں دی گئیں - اپریل ۱۹۶۵ء میں صدر محمد ایوب خان نے روس کا دورہ کیا تو دونوں حکومتوں کو ایک دوسرے کے مسائل اور مشکلات سمجھنے میں مدد ملی اور سربراہوں نے بہت سے عالمی امور پر اظہار اتفاق کیا - اس کے بعد ایک نیا تجارتی معاہدہ

ہوا اور روس نے تین کروڑ ڈالر کا مزید قرضہ دیا ۔ پاکستان اور بھارت کے تنازعات میں بھی روس نے اپنا جانب دارانہ رویہ ترک کر دیا ہے ۔ رن کچھ کی جھڑپ اور بعد ازاں پاکستان پر بھارت کے حملے کے وقت روس نے کامل غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور باہمی تنازعات کو دور کرنے کے لیے تاشقند میں مذاکرات کا اہتمام کیا ۔

۱۹۶۷ء میں صدر محمد ایوب خان نے دوبارہ روس کا دورہ کیا اور اپریل ۱۹۶۸ء میں مسٹر کوسیجن نے پاکستان کا ۔ جنگ عرب و اسرائیل میں دونوں ملکوں نے ایک ہی موقف اختیار کیا ۔ ویت نام کی لڑائی کے بارے میں بھی پاکستان نے امریکی اقدامات کی مذمت کی ہے ۔

پاکستان کی معاشی ترقی میں روس خاصی دلچسپی لے رہا ہے ۔ فروری ۱۹۶۸ء میں ایک سہ سالہ تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے، جس کے تحت روس پاکستان کی پچاس فی صد برآمدی مصنوعات خریدنے پر رضامند ہو گیا، چنانچہ اب روس کے ساتھ برآمدی تجارت ۱۹۵۶ء کے مقابلے میں دس گنی ہو جائے گی ۔ ارضیاتی تحقیقات، خصوصاً تیل اور گیس کی تلاش کے سلسلے میں روس کا تعاون بہت مفید اور نتیجہ‌خیز ثابت ہوا ہے ۔ پاکستان کے کئی اہم منصوبوں کو تکمیل کے لیے روس فنی اور مالی امداد دے رہا ہے، چنانچہ تیرہ کروڑ ڈالر کی لاگت سے ٹیکسلا کے مقام پر برقی سامان اور مشینیں تیار کرنے کا ایک عظیم‌الشان کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے ۔ اسی طرح روس ہی کے تعاون سے کالا باغ میں فولاد سازی کا اور روپ پور میں ایٹمی طاقت کا کارخانہ (Nuclear Power Plant) قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے ۔ دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں پاکستان کو روس سے تقریباً ساڑھے سترہ کروڑ ڈالر کی امداد ملی ہے ۔ جون ۱۹۷۰ء میں صدر آغا یحیی خان کے دورۂ روس سے تعلقات میں مزید خوشگواری اور استواری کی امید ہے ۔

برما : پاکستان کی سرحد برما سے بھی ملتی ہے اور دونوں کے تعلقات دوستانہ ہیں ۔ ۱۹۴۹ء میں برما کو دولت مشترکہ کی طرف سے ساٹھ لاکھ پونڈ کی مدد دی گئی اور اس میں پاکستان کا حصہ پانچ لاکھ پونڈ تھا ۔ ۱۹۵۲ء میں باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا ۔ ۱۹۵۳ء میں برما کی درخواست پر پاکستان سے ماہرین مالیات کی ایک جماعت بھیجی گئی ۔ دونوں ملک کولمبو منصوبے میں شامل ہیں ۔ ۱۹۵۹ء میں برما کے وزیر اعظم نے پاکستان کا دورہ کیا اور دونوں ملکوں کی باہمی سرحد متعین کرنے کے لیے ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا ۔ تمام تنازعات باہمی رضامندی سے طے ہو گئے اور ۱۹۶۰ء میں اس کا کام مکمل ہو گیا ۔ ۱۹۶۱ء میں صدر پاکستان نے برما کا دورہ کیا اور ایک مالی معاہدہ طے کرنے کے علاوہ اقتصادی تعاون اور اراکانی مسلمانوں کے مسئلے پر گفتگو کی ۔ جب برما میں تمام کاروبار قومیا لیا گیا تو برما کے پاکستانی شہریوں کو اپنے وطن واپس آنے میں حکومت پاکستان نے پوری مدد دی ۔ ان کو معاوضہ دیے جانے کا مسئلہ حکومت برما سے جزوی طور پر طے کیا جا چکا ہے ۔ پاکستان برما کے فوجی ملازمین کو تربیت دینے کی پیشکش کرتا رہا ہے ۔ ثقافتی وظیفوں کے منصوبے کے تحت کئی برمی طلبہ پاکستانی اداروں میں اعلی تعلیم پا رہے ہیں ۔ باہمی تجارت زیادہ‌تر برمی چاول اور پاکستانی روئی پر مشتمل ہے ۔ دونوں ملک طبعی آفات، مثلاً سیلاب وغیرہ آنے پر ایک دوسرے کی فراخ دلی سے مدد کرتے رہتے ہیں ۔

نیپال : مشترکہ سرحد نہ ہونے کے باوجود

نیپال پاکستان کی قریبی ہمسایہ ریاست ہے اور پچھلے چند برسوں سے اس کے ساتھ انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے ہیں۔ نیپالی انجینئروں اور ہوا بازوں کی تربیت کے لیے پاکستان فنی امداد دے رہا ہے اور پاکستانی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیپالی طلبہ کو وظائف دیے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا پاکستانی ماہرین نے نیپال میں ٹیوب ویل لگانے کے منصوبے کا جائزہ لیا تھا۔ باہمی تجارت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

سیلون: پاکستان سے ڈیڑھ ہزار میل دور واقع ہونے کے باوجود سیلون اس کے ہمسایہ ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت پاکستان کے حصے میں بحیرۂ عرب یا خلیج بنگال کا کوئی جزیرہ نہیں آیا، للہذا مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین بحری سفر سیلون ہی کے راستے ہوتا ہے۔ دونوں ملک کولمبو منصوبے کے رکن ہیں اور باہمی تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سیلون کو مچھلی، سوتی مصنوعات، گندم اور پٹ سن کی جتنی ضرورت ہے وہ پاکستان پوری کرتا ہے۔ بھارت سے جنگ کے زمانے میں سیلون نے پاکستان کو فضائی سفر کی تمام سہولتیں مہیا کی تھیں۔ وہ سلامتی کونسل کی قرارداد کی روشنی میں تنازع کشمیر کے حل کا پر زور حامی ہے۔

اسلامی ممالک: پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے اور اس کی خارجہ پالیسی میں اسلامی ممالک سے برادرانہ تعلقات کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد قائد اعظم نے اپنا ایک خاص نمائندہ اسلامی ممالک میں خیرسگالی کے دورے پر بھیجا تھا۔ پاکستان تمام اسلامی ملکوں کی آزادی اور کامل خود مختاری کا علمبردار اور ان کے حقوق کی حفاظت میں پیش پیش رہا ہے۔ ان کے درمیان اقتصادی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے کراچی میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا اور تہذیبی اور دینی رشتے مضبوط کرنے کے لیے مؤتمر اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۶۴ء میں ترکیہ اور ایران کے ساتھ مل کر علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم (RCD) قائم ہوئی، جس کے مقاصد یہ ہیں: باہمی تجارت کا فروغ؛ مشترکہ ایوان تجارت و صنعت، مشترکہ صنعتی منصوبوں، مشترکہ انشورنس کمپنی، مشترکہ بین الاقوامی فضائی کمپنی اور مشترکہ جہازران کمپنی کا قیام؛ تینوں ملکوں کو ریل کے ذریعے ملانا؛ ویزا کی پابندیاں ختم کرنا؛ محصول ڈاک میں تخفیف؛ پٹرول اور قدرتی گیس کی تلاش، وغیرہ۔ ان مقاصد کو عملی صورت دینے کے لیے تہران میں ایک سیکرٹریٹ قائم ہے اور کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً تینوں ممالک کے سربراہوں اور ان کے متعلقہ وزرا کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔

ایران اور ترکیہ کے درمیان مشترک دینی، تہذیبی اور تاریخی رشتے موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلقات ہمیشہ سے انتہائی مخلصانہ چلے آ رہے ہیں اور انھوں نے ہر موقع پر باہمی تعاون اور دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ جب ایران میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور اس کے تعلقات برطانیہ سے منقطع ہو گئے تو پاکستان نے ایران کے موقف کی حمایت کی۔ اسی طرح تنازع کشمیر میں اور بھارتی جارحیت کے موقع پر ایران کی حکومت اور عوام نے پاکستان کو اخلاقی اور مادّی امداد دینے میں تأمل سے کام نہیں لیا۔ برطانوی دور حکومت میں ہندوستان اور ایران کے درمیان سرحد پوری طرح متعین نہیں ہو سکی تھی، لیکن اب یہ مسئلہ باہمی رضامندی سے خوش اسلوبی کے ساتھ

طے کر لیا گیا ہے - ۱۹۶۲ء میں شاہنشاہ ایران نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر افغانستان اور پاکستان اور ۱۹۶۶ء میں پاکستان اور ملیشیا کے منقطع تعلقات دوبارہ استوار کرائے۔

ترکیہ سے برصغیر کے مسلمانوں کا ایک جذباتی تعلق رہا ہے، جس کا مظاہرہ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم کے دوران میں بڑے پیمانے پر ہوا - پاکستان کے قیام کے بعد ترکیہ سے تعلقات قائم کرنے میں کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت پیش نہیں آئی - ۱۹۵۱ء میں دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا، ۱۹۵۳ء میں ثقافتی تعاون کا، ۱۹۵۴ء میں دوستانہ تعاون کا اور ۱۹۶۳ء میں باہمی تجارت کا - قبرص کے مسئلے میں ترکیہ کو پاکستان کی اور تنازع کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کو ترکیہ کی غیر مشروط حمایت حاصل رہی ہے اور دونوں ممالک اقوام متحدہ میں ایک دوسرے کے حق میں آواز بلند کرتے رہے ہیں - ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ترکیہ نے ہر سطح پر پاکستان کی مدد کی۔

پاکستان، ایران اور ترکی، تینوں ملک ''سنٹو'' معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور اب علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم (RCD) کے تحت ان کے درمیان سیاسی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

عرب ممالک کے حقوق کی حفاظت میں پاکستان نے اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی اجتماعات میں جس شدت اور تسلسل سے آواز بلند کی ہے وہ اس کی اسلام دوستی اور عرب دوستی کا ناقابل تردید ثبوت ہے - اس نے لیبیا، مراکش، تونس اور الجزائر کی جد و جہد آزادی کی اتنی پر زور حمایت کی کہ اسے اقوام متحدہ میں عربوں کا وکیل سمجھا جانے لگا اور اس سلسلے میں بڑی طاقتوں کی خفگی اور دھمکی بھی اسے اپنی سرگرمیوں سے باز نہ رکھ سکی - اس نے نہ صرف اسرائیل کی تشکیل کی سخت مخالفت کی، بلکہ آج تک اسے تسلیم نہیں کیا - حال ہی میں عرب اسرائیل جنگ اور بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد پاکستان نے جس بےباکی اور دردمندی سے ہر محاذ پر عربوں کے موقف کی حمایت کی ہے اس کا بہت اچھا اثر پڑا ہے اور وہ عرب ممالک بھی اسے اپنا قابل فخر اور قابل اعتماد دوست سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں جن کے رویّے سے قبل ازیں سردمہری کا اظہار ہوتا تھا - ان ممالک میں جمهورية المتحدة العربية (مصر) ممتاز ترین ہے - اب بشمول مصر تمام عرب ممالک — عراق، شام، لبنان، یمن، اردن، سعودی عرب، کویت، سوڈان، لیبیا، تونس، مراکش اور الجزائر — سے پاکستان کے انتہائی خوشگوار تعلقات ہیں اور تجارتی معاہدات اور بین الاقوامی اداروں میں باہمی تعاون سے باہمی روابط روز بروز گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید کے اسلامی ممالک میں انڈونیشیا سے پاکستان کے بڑے قریبی تعلقات ہیں - دونوں ملک ایک دوسرے کے سچے حلیف ثابت ہوئے ہیں - ان کے درمیان جو معاہدات طے پا چکے ہیں، ان میں انڈونیشیا اور پاکستان میں اقتصادی اور ثقافتی تعلقات کا معاہدہ (IPECC) بالخصوص قابل ذکر ہے۔

مشرق بعید کے دوسرے ممتاز مسلمان ملک ملیشیا سے بھی پاکستان کے روابط خوشگوار ہیں - پاک بھارت جنگ کے دوران میں ملیشیا کے ہندو نمائندے نے سلامتی کونسل میں مخالفانہ رویّہ اختیار کیا تھا، جس پر سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے، لیکن شاہنشاہ ایران کی سعی سے یہ تعلقات دوبارہ قائم ہو گئے اور اب دونوں ملک

مختلف سطحوں پر تعاون سے کام لے رہے ہیں ۔

یورپ : یوں تو مغربی بلاک کے تمام یورپی ممالک سے پاکستان کے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم ہیں، لیکن ان میں برطانیہ، فرانس اور جرمنی خاص طور سے ممتاز ہیں ۔

پاکستان اور برطانیہ کے باہمی روابط شروع ہی سے بالعموم خوشگوار رہے ہیں اور انہیں دولت مشترکہ کے وجود سے بڑی تقویت ملی ہے ۔ اس کی جھلک سیاسی، اقتصادی، تجارتی، فنی، تعلیمی، غرض ہر دائرۂ کار میں نظر آتی ہے ۔ برطانیہ میں نہ صرف پاکستانی طلبہ کی کثیر تعداد اعلٰی تعلیم کے حصول کے لیے مقیم ہے، بلکہ ہزاروں پاکستانی باشندے وہاں مستقل طور پر آباد ہوچکے ہیں ۔ اقتصادی اعتبار سے دونوں ملکوں کے تعلقات اطمینان بخش رہے ہیں ۔

مغربی بلاک کے اہم ممالک میں سے فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ، بلجیم اور جاپان وغیرہ سے پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہیں اور ان سے مفید تجارتی تعلقات استوار ہو چکے ہیں ۔ ریاست ہاے متحدۂ امریکہ سے پاکستان کے تعلقات بہت گہرے رہ چکے ہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے پاکستان کو اس سے شکایت ہے ۔ بہرحال علی العموم پاکستان سب ممالک سے خیرسگالی کا رویہ رکھتا ہے، چنانچہ جہاں مغربی بلاک سے تعاون کی صورتیں موجود ہیں وہاں اشتراکی ممالک سے بھی تعلقات بڑھائے جا رہے ہیں۔

افریقی ممالک کے مطالبۂ آزادی کے حق میں پاکستان کی سرگرمیوں کو ہمیشہ سراہا گیا ہے ۔ نسلی منافرت کے مسئلے پر پاکستان ہمیشہ جنوبی افریقہ کی مذمت کرتا رہا ہے اور اس نے جنوبی رھوڈیشیا کی سفید فام اقلیتی حکومت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔

اقوام متحدہ اور بین الاقوامی مسائل :

پاکستان کا شمار اقوام متحدہ کے ان ارکان میں ہوتا ہے جنھوں نے اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد سے ہمیشہ اتفاق کیا ہے اور اپنے قول اور فعل کو تضاد کا شکار نہیں ہونے دیا ۔ اس نے ہر موقع پر عالمی امن، آزاد ملکوں کی سالمیت اور خود مختاری اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے حق میں آواز بلند کی ۔ افریقہ اور ایشیا کی تمام ترقی پذیر ریاستوں خصوصاً مسلمان اور عرب ممالک کی مشکلات کو اقوام متحدہ کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی، نسلی منافرت اور نوآبادیاتی نظام کی ہر صورت کی شدید مخالفت کی، اور قیام امن کی خاطر ان تمام قراردادوں کو صدق دل سے قبول کیا جو اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل نے کشمیر اور بھارت کے ساتھ پاکستان کے دوسرے تنازعات کے بارے میں منظور کیں ۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے تحت قائم شدہ اداروں، کمیٹیوں اور کمیشنوں کے ساتھ بھی کھلے دل سے تعاون کیا اور مفوضہ فرائض دیانت‌داری اور خوش‌اسلوبی سے انجام دیے ۔ کانگو میں مصالحت کے لیے جو کمیشن قائم ہوا تھا، پاکستان اس کا رکن منتخب ہوا تو اس نے نہ صرف اس کے عملے کے لیے اپنے حصے کی مالی امداد دی، بلکہ اس کی فوج کے لیے اپنے سپاہی اور ڈاکٹر بھی بھیجے ۔ اسی مغربی ایریان میں اقوام متحدہ کے تحت پاکستانی فوج کے دستے قیام امن کے لیے متعین ہوئے اور انھوں نے قابل تعریف خدمات سر انجام دیں ۔

بڑے بڑے عالمی مسائل، مثلاً فلسطین، قبرص، نوآبادیاتی نظام کے شکار افریشیائی ممالک کی آزادی، کوریا اور ویت نام میں جنگ، اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت، جنوبی افریقہ اور رھوڈیشیا کی نسلی منافرت پر مبنی پالیسی، ایٹمی ہتیاروں پر

پابندی اور ان کی توسیع پذیری کی روک تھام (non-proliferation)، وغیرہ کے بارے میں پاکستان کا طرز عمل ہمیشہ حق و انصاف کی حمایت رہا ہے۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں اس کے کردار کو ہمیشہ سراہا گیا ہے، چنانچہ پاکستانی مندوب کو ۱۹۶۲ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا صدر چنا گیا۔ پاکستان دوبار سلامتی کونسل کا رکن بھی منتخب ہو چکا ہے۔

(۳) آئین کی تاریخ

حکومت برطانیہ کا تیار کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو ان ترمیمات کے ساتھ جو قیام پاکستان کے ساتھ عمل میں لائی گئیں پاکستان کا پہلا آئین قرار دیا گیا اور اس کی پہلی آئین ساز اسمبلی اس طرح وجود میں آ گئی کہ ۱۹۴۷ء کے پاک و ہند کی آزادی کے قانون کے مطابق غیر منقسم ہندوستان میں جو آئین ساز اسمبلی قائم تھی اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ ارکان جو پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کی نمائندگی کرتے تھے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے ارکان قرار دیدیے گئے۔ اس طرح یہ اسمبلی انہتر ارکان پر مشتمل تھی۔ ان ریاستوں کے دس نمائندے شامل کر کے جنھوں نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا ان کی تعداد اناسی ہو گئی اور قائد اعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بنیادی طور پر ایک خود مختار جمہوری مملکت کا آئین نہیں تھا، بلکہ اسے برطانوی حکومت نے اپنے ماتحت ایک علاقے پر حکومت کرنے کے لیے وضع کیا تھا۔ اس میں ملکی باشندوں کو محدود سے اختیارات دیے گئے تھے، غیر ملکی حکومت کے مفادات کی خاطر بہت سے تحفظات رکھے گئے تھے اور گورنر جنرل غیر معمولی اختیارات کا مالک تھا۔ اس میں محدود حق راے دہی کی بنیاد پر نمائندگی دی گئی تھی اور آبادی کے کوئی چودہ فی صد افراد کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ یہ آئین وحدانی نہیں بلکہ وفاقی تھا، لیکن اس حصے کو کبھی زیر عمل نہیں لایا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں جب آزادی ہند کا ایکٹ ۱۹۴۷ء منظور ہوا تو اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۵ء کے آئین میں کچھ ترمیمات کر دی گئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دی گئیں جن کے ماتحت غیر منقسم ہندوستان کی مجلس قانون ساز معاملات خارجہ کے متعلق کوئی قانون منظور نہیں کر سکتی تھی اور فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سے برطانوی پارلیمنٹ کو پاکستان کے متعلق قانون بنانے کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور یہ کہ پاکستان کا بنایا ہوا کوئی قانون اس وجہ سے ناجائز نہیں قرار دیا جائے گا کہ یہ برطانوی پارلیمنٹ کے کسی قانون سے ٹکراتا ہے اور یہ کہ پاکستان خود مختار ہوگا اور کسی دوسری طاقت کے ماتحت نہیں ہوگا۔ پھر قیام پاکستان کے اعلان سے چند دن پہلے Pakistan (Provisional Constitutional) Order، ۱۹۴۷ء اور گورنر جنرل کا آرڈیننس، عدد ۲۲، ۱۹۴۷ء، جاری کیا گیا۔

پاکستان کی اس پہلی آئین ساز اسمبلی کے سپرد دو کام کیے گئے: اول پاکستان کے لیے جدید آئین کی تیاری؛ دوم اس مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے قانون سازی۔ یہ اسمبلی سات برس تک قائم رہی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے آئندہ آئین کے متعلق اس اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی۔ اس میں پاکستان کا دستور قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ ساری کائنات کی حاکمیت اللہ تعالٰی کے لیے ہے، اور اس کی

مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اہل پاکستان اقتدار کا استعمال کریں گے؛ پاکستان ایک جمہوری مملکت ہوگی، جس میں ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی؛ سب لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی؛ مساوات، رواداری اور معاشرتی عدل کے اسلامی تصورات پیش نظر رکھے جائیں گے اور پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اپنی زندگی کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں؛ اقلیتوں کو اپنے مذہب و تہذیب کے فروغ اور اس پر عمل درآمد کی معقول ضمانت دی جائے گی؛ پاکستان ایک وفاقی مملکت ہوگی، جس میں صوبے متعین حدود کے اندر خود مختار ہوں گے؛ بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا؛ عدلیہ کی آزادی محفوظ رہے گی اور ملک کی سالمیت اور آزادی کا پورا تحفظ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) مقرر کی گئی،' جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا ـ ۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اس کمیٹی نے اپنی عبوری رپورٹ پیش کی، جس میں پارلیمانی طرز حکومت کے علاوہ دو قانون ساز اسمبلیوں کی سفارش کی گئی اور کہا گیا کہ ملک کے سربراہ کا انتخاب مرکزی مقننہ کے دونوں ایوان مشترکہ اجلاس میں کریں گے؛ کابینہ، مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوگی؛ ملک کے سربراہ کو آئین کے مکمل یا جزوی طور پر معطل کرنے کا اختیار ہوگا ـ قومی اسمبلی نے اس پر غور کرنا غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا اور کمیٹی کو ہدایت کی کہ وہ مناسب غور کے بعد دوبارہ اپنی رپورٹ پیش کرے، البتہ ۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء کی اس کمیٹی کی ایک سب کمیٹی یعنی اہل پاکستان کے بنیادی حقوق کی کمیٹی (Committee on Fundamental Rights of the Citizens of Pakistan) کی عبوری رپورٹ پیش ہوئی، جسے منظور کر لیا گیا ـ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی مکمل رپورٹ پیش کی گئی، لیکن اس پر بھی غور و خوض کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دیا گیا ـ آخر بعض اہم ترمیمات کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اس کمیٹی کی سفارشات منظور کر لی گئیں ـ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ آئین کے مسودے پر ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء تک بحث ختم ہو جائے گی اور نیا آئین قائد اعظم کے یوم پیدائش پر نافذ کر دیا جائے گا ـ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو آئینی ماہرین کے پاس مسودے تیار کرنے کے لیے بھیج دیا گیا ـ اب نئے آئین کی تیاری کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی، لیکن اس کے جلد بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ملک کی اس سب سے پہلی آئین و قانون ساز اسمبلی کو گورنر جنرل نے توڑ دیا ـ اس وقت اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خان تھے ـ سندھ کی چیف کورٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جو اب تک ملک کا آئین تھا) کی دفعہ ۲۲۳ الف کی روشنی میں مقدمہ دائر کر دیا اور عدلیہ سے گورنر جنرل کے اس فیصلے کے خلاف پروانۂ عدالت (writ) جاری کرنے کی درخواست کی ـ عدالت نے مولوی تمیزالدین خان کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن حکومت کی اپیل پر پاکستان کی فیڈرل کورٹ نے سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کو منسوخ کر دیا ـ اس صورت حال نے بعض آئینی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، جنھیں سلجھانے کے لیے پھر فیڈرل کورٹ کی طرف رجوع کیا گیا؛ چنانچہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو ایک نئی آئین ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا گیا ـ اس دوسری آئین ساز اسمبلی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو متحد کر کے ''ون یونٹ'' یعنی وحدت مغربی پاکستان کا ایکٹ

۱۹۵۵ء منظور کیا اور اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا پہلا آئین تیار کیا، جس کی ۲۲ مارچ ۱۹۵٦ء کو گورنر جنرل نے منظوری دے دی ۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا ۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ارض پاکستان پر اللہ کی کی حکومت ہے اور عوام کا اقتدار اللہ کی طرف سے مقدس امانت ہے، جس کا استعمال وہ اللہ کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہ کر کریں گے؛ اسلامی اصولوں کے مطابق شہریوں کو آزادی، مساوات، رواداری، معاشرتی انصاف اور جملہ بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی؛ گورنر جنرل کی جگہ منتخب صدر نے لے لی؛ پاکستان کے دونوں حصوں کو مساوی درجہ دیا گیا؛ پاکستان کے علاقے میں اضافے کی گنجائش رکھی گئی، لیکن کسی علاقے کو علیحدگی کی اجازت نہیں دی گئی؛ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی توضیح کی گئی؛ مقننہ یک ایوانی مقرر کی گئی؛ پاکستان کو ایک وحدانی حکومت بنایا گیا؛ پاکستان کے صدر کو وزرا کے مشورے کے مطابق فرائض انجام دینا تھے، لیکن اسے ہنگامی حالات میں خصوصی اختیارات استعمال کرنے کا بھی حق دیا گیا؛ صدر کے لیے مسلمان پاکستانی ہونا لازمی قرار دیا گیا؛ عدلیہ کو متحد اور قوانین کو یکساں بنایا گیا؛ عدالتوں کو خاص حقوق دیے گئے؛ اقتصادی پالیسی وضع کرنے کے لیے قومی اقتصادی کونسل اور صوبوں اور مرکز کے درمیان ٹیکسوں کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کے لیے مالی کمیشن قائم کرنے کی گنجائش رکھی گئی اور ملک کا نام 'جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان قرار پایا ۔ ہر صوبے کا انتظامی سربراہ گورنر تھا، جس کی نامزدگی صدر مملکت کے ہاتھ میں تھی اور گورنر وزیر اعلٰی کا انتخاب کرتا تھا ۔ قومی اسمبلی ۳۱۰ ارکان پر مشتمل تھی اور ان میں دس نشستیں خواتین کی نامزدگی کے لیے مخصوص تھیں ۔ اس طرح ہر صوبائی اسمبلی کے ارکان کی تعداد بھی ۳۱۰ ہی تھی ۔ اسمبلی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی اور ملک کے تمام بالغوں کو حق رائےدہی دیا گیا ۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر نے [illegible] کی تنسیخ کا اعلان کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور ۲۷ اکتوبر کو جنرل محمد ایوب خان نے صدر کو ملک بدر کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ ملک کے عوام کو اختیارات جلد از جلد لوٹا دیے جائیں گے اور ملک کو جدید آئین دیا جائے گا.

۱۹٦۰ء میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس شہاب الدین کی سرکردگی میں آٹھ ارکان پر مشتمل ایک آئین‌ساز کمیٹی قائم کی گئی ۔ ۱۹٦۱ء کے اواخر میں اس کمیٹی کی طرف سے ایک مسودۂ آئین پیش کیا گیا، جس میں کئی ترمیمات کی گئیں ۔ اس ترمیم شدہ مسودے کی یکم مارچ ۱۹٦۲ء کو صدر مملکت نے منظوری دے دی اور ۸ جون ۱۹٦۲ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا .

اس میں کہا گیا تھا کہ (۱) صدر مملکت کا انتخاب پانچ سال کے لیے عمل میں آئے گا ۔ انتخابی ادارہ دونوں صوبوں کی بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار ارکان پر مشتمل ہو گا ۔ صدر کو ایک بار پھر انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہو گی اور قومی اسمبلی کے تین چوتھائی ارکان کی تائید سے صدر کو اس کے عہدے سے علیحدہ کیا جا سکے گا؛ (۲) صوبائی گورنروں سپریم کورٹ اور صوبائی ہائی کورٹوں کے ججوں، صدارتی کابینہ کے ارکان، اٹارنی جنرل، مرکزی پبلک سروس کمیشن کے صدر اور متعدد قومی اداروں (Corporation) کے سربراہوں کا تقرر صدر کرے گا؛ (۳) صدر کسی بھی

پاکستانی کو اپنا وزیر مقرر کر سکے گا، لیکن ایسے قومی اسمبلی کا رکن ہونے کی صورت میں اپنی نشست سے دستبردار ہونا پڑے گا ۔ صدر کے نامزد وزرا قومی اسمبلی کے سامنے حکومت کی پالیسی کی وضاحت کریں گے اور ارکان اسمبلی کے سوالات کا جواب دیں گے، لیکن مملکت کے نظم و نسق اور حکومت کی ذمے داری کامل طور پر صدر کی ہوگی؛ (۴) قومی اسمبلی یک ایوانی ہوگی، جس میں ۵۰ ارکان مشرقی پاکستان اور ۵۰ ہی مغربی پاکستان سے منتخب ہوں گے ۔ ان کے علاوہ ہر صوبے سے تین تین نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہوں گی ۔ قومی اسمبلی معمولاً پانچ سال تک قائم رہے گی؛ (۵) اسمبلی کے منظور کردہ بل کو قانونی حیثیت صدر کی توثیق کے بعد ہی مل سکے گی۔ اس سلسلے میں صدر کو حق تنسیخ حاصل ہو گا ۔ قومی اسمبلی کے ارکان کی دو تہائی اکثریت صدارتی حق تنسیخ کو کالعدم قرار دے سکے گی، لیکن اس صورت میں یہ بل پورے انتخابی ادارے میں استصواب رائے کے لیے مشتہر کرنا ہو گا ۔ اسمبلی بنیادی اصولوں کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکے گی ۔ صدر کو بھی قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں گے اور ان کا استعمال وہ ہنگامی حالات میں یا اس وقت کرے گا جب قومی اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو، لیکن ایسے قوانین اسمبلی کے سامنے برائے توثیق پیش کیے جائیں گے؛ (٦) صدر اسمبلی کو معینہ مدت ختم ہونے سے قبل برخاست کر سکتا ہے، لیکن بدیں صورت خود اسے بھی ۱۲۰ دن کے اندر اپنے عہدے کے لیے دوبارہ منتخب ہونا لازم ہو گا؛ (۷) ہر صوبے میں ۱۰۰ ارکان پر مشتمل ایک صوبائی اسمبلی ہوگی، جن میں پانچ پانچ نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہوں گی ۔ گورنر اپنے فرائض ادا کرنے میں صدر سے ہدایات وصول کرے گا اور وزرا کی کونسل مقرر کر سکے گا؛ (۸) قومی زبانیں اردو اور بنگلہ ہوں گی، لیکن فی الحال سرکاری مقاصد کے لیے انگریزی استعمال ہوتی رہے گی ۔ ۱۹۷۲ء میں صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا، جو سرکاری مقاصد کے لیے انگریزی کو تبدیل کرنے کے مسئلے کا جائزہ لے گا؛ (۹) اسلامی مشاورتی کونسل، سپریم جوڈیشل کونسل اور قومی مالیاتی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جائے گا؛ (۱۰) ریاست پاکستان ایک جمہوریہ ہوگی اور یہاں وفاقی حکومت قائم ہوگی ۔ مرکزی حکومت کے دائرۂ کار میں حتی الامکان دونوں صوبوں میں برابری قائم رکھی جائے گی ۔ صوبوں کو اسی قدر داخلی خود مختاری دی جائے گی جو مجموعی طور پر پاکستان کی وحدت اور مفاد کے مطابق ہو ۔

نومبر ۱۹٦۸ء کو صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خلاف ملک میں ہنگامے برپا ہو گئے ۔ ۲۵ مارچ ۱۹٦۹ء کو مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور جنرل محمد یحیٰی خان پہلے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پھر صدر مملکت مقرر ہوے ۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ عوام کو اختیارات لوٹا دینے کے جلد از جلد انتظامات کریں گے ۔ ۲۸ نومبر ۱۹٦۹ء کو انھوں نے ملک کے آئندہ آئین کے متعلق ایک تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ ہے : (۱) انتخابات سے پہلے وحدت مغربی پاکستان ختم کر دی جائے گی؛ (۲) انتخابات ایک فرد، ایک ووٹ، کی بنیاد پر منعقد ہوں گے؛ (۳) انتخابات کے لیے ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی تاریخ مقرر کی گئی ہے؛ (۴) عام انتخابات قومی اسمبلی کے لیے ہوں گے، جو ۱۲۰ دنوں میں دستور تیار کرے گی اور اس کے بعد آئینی حکومت قائم کرے گی؛ (۵) دستور سازی کے وقت رائے دہی کے طریق کار کا فیصلہ قومی اسمبلی خود کرے گی، مگر اسے ہر علاقے کے لیے

منصفانہ ہونا چاہیے؛ (۶) اگر اسمبلی معینہ مدت میں دستور نہ بنا سکی تو از خود ختم ہو جائے گی اور قومی اسمبلی کے لیے انتخابات دوبارہ ہوں گے؛ (۷) مرکز اور صوبوں کے درمیان مالیات کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ دونوں علاقوں کو اپنے وسائل پر پورا اختیار حاصل ہو گا بشرطیکہ اس کا مرکزی حکومت کی کارکردگی پر برا اثر نہ پڑے؛ (۸) مشرقی پاکستان کی پس ماندگی کو دور کیا جائے گا؛ (۹) ملک کے دونوں بازووں کو اس حد تک مکمل خود مختاری دی جائے گی جو قومی سالمیت اور استحکام کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو؛ (۱۰) پارلیمانی وفاقی طرز حکومت، براہ راست بالغ رائے دہی، شہریوں کے بنیادی حقوق اور ایک آزاد عدلیہ کے ذریعے ان کا نفاذ، دستور کا اسلامی مزاج، جس میں اس ''آئیڈیالوجی'' کو محفوظ کیا گیا ہو جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا، ایسے امور ہیں جنھیں طے شدہ سمجھا جانا چاہیے؛ (۱۱) قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے دستور کو صدر کی باقاعدہ منظوری حاصل کرنا ہو گی؛ (۱۲) یکم جنوری سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی اور سیاسی جماعتوں کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کیا جائے گا؛ اس کے علاوہ (۱۳) جمہوریت کا راستہ روکنے والوں اور تشدد پھیلانے والوں کو سخت الفاظ میں متنبہ کیا گیا.

صدر مملکت کی طرف سے ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو دستور کے بنیادی اصول اور ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو انتخابات اور آئین ساز اسمبلی کے سلسلے میں قانونی ڈھانچے کا اعلان کیا گیا۔ اہم نکات مندرجۂ ذیل ہیں :

(الف) دستور کے بنیادی اصول : (۱) پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگا، جس کا نام اسلامی جمہوریۂ پاکستان ہو گا۔ اس وفاق میں شریک وہ صوبے اور علاقے جو پاکستان کا حصہ ہیں یا بعد میں شامل ہوں، اس طرح متحد ہوں گے کہ پاکستان کی آزادی، علاقائی سالمیت اور قومی استحکام کا تحفظ ہو سکے۔ وفاق کے اتحاد کو کسی طرح بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا؛ (۲) اسلامی نظریہ قیام پاکستان کی اساس ہے۔ اس کا تحفظ لازمی ہو گا۔ مملکت کا سربراہ مسلمان ہو گا؛ (۳) جمہوریت کے بنیادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا؛ (۴) شہریوں کے بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے اور انصاف کے حصول کے لیے عدلیہ کو پوری آزادی دی جائے گی؛ (۵) اختیارات کی تقسیم اس طرح کی جائے گی کہ صوبوں کو قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی امور میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں، لیکن وفاقی حکومت کو اس ضمن میں اتنے کافی اختیارات حاصل رہیں کہ وہ داخلی اور خارجی امور سے متعلق اپنی ذمے داریاں پوری کر سکے اور ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت کا تحفظ کر سکے؛ (۶) پاکستان کے تمام علاقوں کو جملہ قومی امور میں حصہ لینے کا موقع ملے گا اور مختلف علاقوں میں عدم مساوات ختم کی جائے گی؛ (۷) دستور کے دیباچے میں پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنانے کا عہد کیا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزار سکیں، نیز یہ کہ اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی اور انھیں پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے جملہ حقوق، مراعات اور تحفظات حاصل ہوں گے.

(ب) رہنما اصول : دستور میں مملکت کی پالیسی کے رہنما اصول پیش کیے جائیں گے، جن کے ذریعے مملکت کی ان امور میں رہنمائی کی جائے گی : (۱) اسلامی نظام کا فروغ؛ (۲) اسلام کے اخلاقی معیار کی پابندی؛ (۳) پاکستان کے مسلمانوں کو

قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنا؛ (۴) اس بات کی ہدایت کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا.

(ج) قانونی ڈھانچا: (۱) قومی اسمبلی کے ارکان کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۳۱۳ ہو گی:

صوبہ	عام نشستیں	خواتین
مشرقی پاکستان	۱۶۲	۷
پنجاب	۸۲	۳
سندھ	۲۷	۱
بلوچستان	۴	۱
صوبۂ سرحد	۱۸	۱
قبائلی علاقے	۷	
	۳۰۰	۱۳

عام نشستوں پر ارکان کو بالغ رائے دہی اور براہ راست انتخاب کی بنا پر منتخب کیا جائے گا جب کہ خواتین کا انتخاب متعلقہ صوبے کے ارکان قومی اسمبلی کریں گے؛ (۲) ہر صوبے کے لیے الگ صوبائی اسمبلی ہو گی، جس میں خواتین کی مخصوص نشستوں کا انتخاب متعلقہ علاقوں کے ارکان اسمبلی کریں گے - نشستوں کی تفصیل یہ ہے:

صوبہ	عام نشستیں	خواتین
مشرقی پاکستان	۳۰۰	۱۰
پنجاب	۱۸۰	۶
سندھ	۶۰	۲
بلوچستان	۲۰	۱
صوبۂ سرحد	۴۰	۲

صوبائی اسمبلی کا اجلاس آئین کے نفاذ کے بعد ہی ہو سکے گا؛ (۳) قومی اسمبلی کے لیے پولنگ ۵ اکتوبر کو اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے ۲۲ اکتوبر کو ہوں گے؛ (۴) قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کسی معقول وجہ التوا کے روزانہ ہو گا؛ (۵) قومی اسمبلی مسودۂ آئین کی صورت میں ۱۲۰ دن کے اندر اندر دستور بنائے گی - اگر وہ اس مدت میں آئین تیار نہ کر سکی تو اسے توڑ دیا جائے گا؛ (۶) مسودۂ آئین، جسے قومی اسمبلی منظور کرے گی، توثیق کے لیے صدر کو پیش کیا جائے گا - اگر صدر اس کی توثیق نہ کریں تو قومی اسمبلی ٹوٹ جائے گی؛ (۷) اسمبلی کا اجلاس، قومی اسمبلی کی حیثیت سے، آئین کے نفاذ کے بعد ہوگا؛ (۸) قانونی ڈھانچے کی توضیح اور اس میں ترمیم کا اختیار صرف صدر کو حاصل ہے اور ان کے فیصلے کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا.

۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء ھی کو صدر مملکت نے اپنی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ صدر کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں کسی ایسے آئین کی منظوری نہ دوں جو نظریۂ پاکستان اور ملکی سالمیت کے منافی ہو - اگر آئین بنانے تک مشتہرہ قانونی ڈھانچے کا خیال رکھا گیا تو میں اس آئین کی منظوری دے دوں گا - اگر قومی اسمبلی مقررہ مدت یعنی ایک سو بیس دن میں آئین نہ بنا سکی تو چیف الیکشن کمشنر، جس قدر جلد انتظام کر سکیں گے، نئی اسمبلی کے لیے انتخابات کرائیں گے.

بوقت تحریر سب سیاسی پارٹیاں، انتخابات کے سلسلے میں اپنے اپنے حق میں رائے عامّہ کو تیار کر رہی ہیں.

۴ - نظام قانون

پاکستان کا نظام قانون ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری اور تعزیرات پاکستان جیسے مجموعہ ہائے قوانین (Codes) کے علاوہ ان قوانین (Statutes) پر مشتمل ہے جو برصغیر کی تقسیم سے قبل یا قیام پاکستان کے بعد مرکزی اور صوبائی مقننہ کے وضع کردہ ہیں - قیام پاکستان سے قبل یا بعد ہائی کورٹ، فیڈرل کورٹ، سپریم کورٹ اور دوسری

عدالتوں (Tribunals) نے جو فیصلے صادر کیے وہ فی نفسہٖ قانون نہیں بلکہ قانون کی تعبیر یا تفسیر پر مشتمل ہیں، البتہ عدالتہائے عالیہ کے فیصلوں میں جو بات قانون قرار دے دی جائے اسے از روے دستور بطور قانون قبول کرنا ماتحت عدالتوں اور تمام دیگر اداروں یا افراد کا فرض ہے۔

قانون دیوانی: چند مستثنیات سے قطع نظر پاکستان میں ضابطۂ دیوانی (۱۹۰۸ء) مع ترمیمات نافذ ہے۔ اس کا اطلاق تمام دیوانی مقدمات اور ان کی عدالتی کارروائی پر ہوتا ہے، مثلاً مقدمات دائر کرنے اور ان کی سماعت کا طریق کار، فریقین اور شہادتوں کی طلبی، احکام امتناعی اور ڈگری کا اجرا، وغیرہ۔ قانون دیوانی میں محض ضابطۂ دیوانی ہی نہیں، اور قوانین بھی شامل ہیں، مثلاً قانون معاہدات، قانون انتقال املاک، قانون فروخت اشیا، قانون تکمیل معاہدۂ مختص، وغیرہ۔ اصل قوانین یہی ہیں۔ ضابطۂ دیوانی، جیسا کہ ظاہر ہے، محض مقدمات کے ضوابط و قواعد کا قانون ہے، یعنی اضافی قانون ہے۔ ان کے علاوہ کسی حد تک رواج بھی قانون کا حصہ ہے، جو زراعتی قبیلوں یا علاقوں پر عائد ہوتا ہے۔ وراثت، نکاح و طلاق اور ہبہ وغیرہ کے سلسلے میں فریقین پر باعتبار مذہب ان کے شخصی قانون کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً مسلمان شریعت کے پابند ہوں گے اور ہندو مغربی پاکستان میں ''متاکشر'' اور مشرقی پاکستان میں ''دیا بھاگ'' دبستان قانون ہنود کے؛ تاہم مجلس آئین ساز شخصی قوانین میں ترمیم کرنے کی مجاز ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی عائلی قوانین کا ضابطہ (۱۹۶۰ء) بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جس کی رو سے نکاح کی رجسٹری اور طلاق کے مقررہ ضابطۂ کار کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے۔

قانون فوجداری: پاکستان کا فوجداری قانون دو حصوں پر مشتمل ہے: تعزیرات پاکستان اور ضابطۂ فوجداری۔ اول الذّکر قانون موجّبہ (Sub-stantive Law) ہے اور آخر الذّکر قانون اضافی (Adjective Law) ہے۔ ان کا نفاذ علی الترتیب ۱۸۶۰ اور ۱۸۹۸ء میں کیا گیا اور انھوں نے ان قوانین ''شریعت'' کی جگہ لے لی جن پر مغلیہ عہد کے آغاز سے عملدرآمد ہو رہا تھا۔ ان قوانین میں وقتاً فوقتاً ترمیمات بھی ہوتی رہی ہیں۔

ان کے علاوہ قانون شہادت (۱۸۷۲ء) کی رو سے، جو بڑی حد تک انگریزی قانون کے اصولوں پر مبنی ہے، مقدمے کی سماعت کے دوران میں صرف متعلقہ شہادتوں کو پیش کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اس امر کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں کہ عدالت اپنی ذاتی رائے، شکوک اور تعصبات کی بنا پر فیصلہ صادر کرے یا ملزم استغاثے کے بے جا جوش و خروش کا شکار ہو جائے۔

قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص اس وقت تک بے گناہ تصور کیا جاتا ہے جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے اور اس کے ارتکاب جرم میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہ رہے۔

مغربی پاکستان میں بعض مخصوص حالات کے تحت مقدمات جرگے کے سامنے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، جو معزز اور ممتاز شہریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈویژن کے کمشنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے بعض شدید نوعیت کے جرائم کے ملزموں کو جرگہ سپرد کر دے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔

قوانین اور اسلامی نظریہ: دستور کی رو سے یہ لازم ہے کہ کوئی قانون اسلامی تعلیمات کے منافی نہ ہو، موجودہ قوانین کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق بسر

کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ اسلامی مجلس مشاورت (Advisory Council of Islamic Ideology) اس سلسلے میں ضروری سفارشات پیش کرتی ہے ۔ مجلس متعدد مجوزہ قوانین کے بارے میں قرآن و سنت کے پیش نظر اپنی رائے دیتی رہی ہے ۔ اس کے علاوہ مروجہ قوانین میں ضروری ترمیمات کی بھی وہ سفارش کرتی ہے، مثلاً اس کی طرف سے خوراک میں ملاوٹ، بچوں کے اغوا اور سمگلنگ کے مجرمین کے لیے کڑی سزائیں تجویز کی گئی ہیں ۔ ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری، تعزیرات پاکستان اور دیگر قوانین کے بارے میں مجلس کا تحقیقاتی کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے ۔ اور اس ضمن میں سفارشات عنقریب پیش کر دی جائیں گی ۔

قوانین کا ترجمہ : اہم اور ضروری قوانین کا اردو اور بنگلہ میں ترجمہ کرنے کے لیے وزارت قانون کے ماتحت دو شعبے کام کر رہے ہیں اور بہت سے قوانین کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً قانون دفاع پاکستان، اسلامی عائلی قوانین، وغیرہ۔

(٥) حکومت

اس وقت (جون ١٩٧٠ء) میں پاکستان میں عسکری آئین (مارشل لا) نافذ ہے، لیکن حکومت کا نظم و نسق عملاً سول حکام ہی کے سپرد ہے ۔ سر براہ مملکت صدر آغا محمد یحیی خاں ہیں، جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں ۔ ان کی اعانت وزرا کی ایک کابینہ کرتی ہے، جس کے ارکان کو خود صدر پاکستان نے نامزد کیا ہے ۔ صدر مملکت کابینۂ وزرا، گورنروں کی کانفرنس (جس میں صوبائی گورنروں اور مرکزی وزرا کے علاوہ اہم وزارتوں کے سیکرٹری بھی شریک ہوتے ہیں) اور قومی اقتصادی کمیشن کے جلسوں کی صدارت کرتے ہیں ۔

مرکزی حکومت کے دفاتر : صدر کے فیصلوں اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کی ذمےداری مرکزی سیکرٹریٹ Secretariat پر ہے ۔ ہر وزارت مختلف ڈویژنوں میں منقسم ہے اور ہر ڈویژن کا سربراہ سیکرٹری یا جائنٹ سیکرٹری ہوتا ہے ۔ یہ تمام سیکرٹری براہ راست صدر کے ماتحت ہوتے ہیں، البتہ منصوبہ بندی اور اقتصادی امور کی ڈویژن کا سیکرٹری منصوبہ‌بندی کمیشن کے ڈپٹی چیر مین کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے ۔ ڈویژن میں جو انتظامی پالیسی طے ہوتی ہے اس پر ملحقہ محکموں اور ماتحت دفاتر میں عملدرآمد ہوتا ہے ۔ ملحقہ محکموں کے سربراہوں کو عموماً ڈائرکٹر جنرل یا چیف ایڈمنسٹریٹر کہا جاتا ہے اور ان کا منصب سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کے مساوی سمجھاجاتا ہے ۔

صدارتی سیکرٹریٹ (Presidential Secretariat) تین ڈویژنوں پر مشتمل ہے، یعنی (١) منصوبہ بندی ڈویژن، جو ملک کے مادی وسائل اور افرادی قوت کے پیش نظر قومی منصوبے تیار کرتا ہے؛ (٢) اقتصادی امور کا ڈویژن، جس کا تعلق ملک کی اقتصادی ضروریات اور غیر ممالک اور بین الاقوامی اداروں سے فنی اور مالی امداد لینے سے ہے ۔ اسی ڈویژن کے تحت مرکزی دفتر اعداد و شمار کام کرتا ہے اور (٣) ریاستوں اور سرحدی علاقوں کا ڈویژن، جو پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے سیاسی و فوجی نظم و نسق کا ذمے دار ہے ۔

وزارتی سیکرٹریٹ (Cabinet Secretariat) کے دو ڈویژن ہیں : (١) وزارتی ڈویژن، جس کے سپرد کابینہ، اس کی کمیٹیوں اور گورنروں کی کانفرنس کے دفتری امور اور ان کے فیصلوں پر عملدرآمد کی نگرانی ہے ۔ مرکزی محکمۂ خفیہ پولیس (Central Intelligence Bureau) بھی اسی کے ماتحت ہے؛ (٢) امور عملہ کا ڈویژن (Establishment Division)، جس کا تعلق سرکاری ملازمین کی بھرتی، تقرر،

ترقی اور تبادلے، قومی اور مرکزی دفاتر کے نظم و نسق، سرکاری ملازمین کی تربیت، عملے کی بہبود وغیرہ سے ہے۔

مرکزی حکومت کی وزارتیں مندرجۂ ذیل ہیں: (۱) وزارت دفاع: پاکستان کی دفاعی پالیسی بنانے کی ذمے دار ہے، جس میں عملۂ افواج، فوجی سامان، ذخائر اسلحہ، وغیرہ کے امور شامل ہیں۔ شہری ہوا بازی (Aviation)، سیروسیاحت (Tourism)، اصفار (Cyphers) اور موسمیات (Meteorology) کے شعبوں کے علاوہ دفاعی سامان تیار کرنے کے ادارے بھی اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۲) وزارت امور خارجہ؛ (۳) وزارت مالیات: حکومت کے جملہ مالی امور اسی کے زیر اختیار ہیں۔ یہ ملک کا سالانہ میزانیہ تیار کرتی اور اسے عملی جامہ پہناتی ہے۔ مرکزی محکمۂ مال (Board of Revenue) اس کا ملحقہ محکمہ ہے۔ علاوہ بریں بینک دولت پاکستان، نیز پاکستان نیشنل بینک، پاکستان پرنٹنگ کارپوریشن، ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن اور پی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی (PICIC) جیسے خوداختیار مالیاتی ادارے اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۴) وزارت داخلہ میں امور داخلہ کی ڈویژن اندرون ملک کے نظم و نسق اور جان و مال کے تحفظ کی ذمے دار ہے اور امور کشمیر کی ڈویژن مشیر اعلٰی حکومت آزاد کشمیر (جو گلگت اور بلتستان کا ریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے) کے توسط سے امور کشمیر کی نگراں ہے۔ شہری دفاع اور توطن و پاسپورٹ کی نظامتیں (Directorates) بھی اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۵) وزارت صنعت و قدرتی وسائل؛ (٦) وزارت خوراک و زراعت و بحالیات و تعمیرات؛ (۷) وزارت تجارت، جس میں سائنسی و تکنیکی ڈویژن شامل کر دی گئی ہے؛ (۸) وزارت تعلیم و سائنسی تحقیق، جس کے ماتحت محکمۂ آثار قدیمہ، پاکستان سپورٹس کنٹرول بورڈ، اقبال اکیڈمی، قومی کتاب مرکز، اردو و بنگلہ کی ترقی کے مرکزی بورڈ، وغیرہ بھی ہیں؛ (۹) وزارت اطلاعات و نشریات و قومی امور؛ (۱۰) وزارت مواصلات؛ (۱۱) وزارت قانون و پارلیمانی امور؛ (۱۲) وزارت صحت و محنت و سماجی بہبود۔

سول سروس: حکومت برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند کی انتظامیہ کو مؤثر طریق سے چلانے کے لیے اعلٰی ملازمت کا ایک نظام قائم کیا، جسے انڈین سول سروس (ICS) کہتے تھے۔ حکومت پاکستان نے بھی اسی نمونے پر پاکستان سپیریئر سروسز Pakistan Superior Services کا نظام قائم کیا۔ اس کی دو جمعیتیں (cadres) ہیں: (۱) کل پاکستان ملازمتیں (All-Pakistan Services)، جس کے ملازمین مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے ماتحت فرائض ادا کرتے ہیں اور (۲) مرکزی ملازمتیں (Central Services)، جس کے افراد کا تعلق صرف مرکزی حکومت سے ہوتا ہے۔ پاکستان سول سروس (CSP) اور پولیس سروس پاکستان (PSP) کل پاکستان ملازمتیں ہیں۔ پاکستان فارن سروس (PFS) کے افراد سول سروس کے ساتھ ہی بھرتی ہوتے ہیں، لیکن ان کی جمعیت (cadre) بالکل علیحدہ ہے۔ سول سروس اور فارن سروس پاکستان کی اعلٰی ترین ملازمتیں ہیں۔ دوسری مرکزی اعلٰی ملازمتیں یہ ہیں: پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس، پاکستان اکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز سروس، پاکستان پوسٹل سروس، سنٹرل انفرمیشن سروس؛ ان کے علاوہ صوبائی سطح پر بھی اعلٰی ملازمتیں ہیں، جو کلیۃً صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہوتی ہیں۔

حکومت پاکستان کے ملازمین کے چار درجے (classes) ہیں: درجۂ اول کے افسر انتہائی ذمے دار عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اور وہ حکومت

کی نیابت کرتے ہیں ۔ ان کے بعد درجۂ دوم کے افسر آتے ہیں ۔ درجۂ اول اور درجۂ دوم کے ملازمین کا تقرر، ترقی اور تبادلے کے احکام حکومت کے گزٹ میں شائع ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں گزیٹڈ افسر کہتے ہیں ۔ درجۂ سوم کے ملازمین عموماً دفتری فرائض انجام دیتے ہیں اور درجۂ چہارم دفتریوں، چپراسیوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے ۔

سی ۔ ایس ۔ پی افسروں کو بالعموم سیکرٹریٹ یا انتظامی ڈویژنوں اور اضلاع میں انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر متعین کیا جاتا ہے اور وہ اپنے حلقۂ اختیار کے حاکم ہوتے ہیں ۔ بعض اوقات وہ عدلیہ کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں، لیکن اب انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کیا جا رہا ہے ۔

مرکزی اور صوبائی گزیٹڈ افسروں کو مرکزی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن منتخب کرتے ہیں ۔ صوبوں کے لیے مرکزی ملازمتوں کا ''کوٹا'' مقرر ہے، لیکن ۲۰ فی صد اسامیاں خالص اہلیت کی بنا پر پر کی جاتی ہیں ۔ سبکدوشی کی عمر پچپن برس مقرر ہے ۔ تکمیل ملازمت پر پنشن ملتی ہے ۔ ملازمین کی تربیت کے لیے متعدد ادارے قائم کیے گئے ہیں، مثلاً ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA)، سول سروس اکیڈمی، فنانس سروس اکیڈمی، دیہی ترقیات کے ادارے (Academies of Rural Development)، سیکرٹریٹ کا تربیتی ادارہ (Secretariat Training Institute)، وغیرہ ۔

مشرقی پاکستان (صدر مقام : ڈھاکہ) چار انتظامی ڈویژنوں پر مشتمل ہے (قوسین میں ڈویژنوں کے اضلاع درج کیے جاتے ہیں) : (۱) راج شاہی : (دیناج پور، رنگ پور، بوگرا، راج شاہی، پبنہ)؛ (۲) کھلنا : (کشتیا، جیسور، کھلنا، باقر گنج)؛ (۳) ڈھاکہ : (میمن سنگھ، ڈھاکہ، فریدپور)؛ (۴) چٹاگانگ : (سلہٹ، کومیلا، نواکھلی، چٹاگانگ، چٹاگانگ کے پہاڑی خطّے) ۔

مغربی پاکستان (صدر مقام : لاہور) کی ڈویژنیں (مع اضلاع) مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) پشاور : (ہزارہ، مردان، پشاور، کوہاٹ، نیز خیبر، مہمند اور کُرّم کی ایجنسیاں)؛ (۲) ڈیرہ اسمٰعیل خاں : (ڈیرہ اسمٰعیل خاں، بنوں، نیز شمالی و جنوبی وزیرستان)؛ (۳) مالاکنڈ : (مالاکنڈ ایجنسی، دیر، سوات، چترال)؛ (۴) راولپنڈی : (کیمبل پور، راولپنڈی، جہلم، گجرات)؛ (۵) سرگودھا : (سرگودھا، میانوالی، لائل پور، جھنگ)؛ (٦) لاہور : (لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، سیالکوٹ)؛ (۷) ملتان : (ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ، ملتان، ساہی وال)؛ (۸) بہاول پور : (بہاول پور، بہاول نگر، رحیم یار خاں)؛ (۹) خیر پور : (جیکب آباد، سکھر، لاڑکانہ، نواب شاہ، خیرپور)؛ (۱۰) حیدر آباد : (حیدرآباد، دادو، تھرپارکر، سنگھڑ، ٹھٹھہ)؛ (۱۱) کوئٹہ : (کوئٹہ، سبّی، ژوب، چاغی، لورالائی)؛ (۱۲) قلّات (قلّات، مکران، خاران)؛ (۱۳) کراچی (کراچی، لس بیلہ) ۔

یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے مغربی پاکستان چار صوبوں میں منقسم ہو رہا ہے : (۱) صوبۂ پنجاب (صدر مقام : لاہور)، راولپنڈی، سرگودھا، لاہور، ملتان اور بہاولپور ڈویژنوں پر، (۲) صوبۂ سرحد (صدر مقام : پشاور)، پشاور، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور مالاکنڈ ڈویژنوں پر، (۳) صوبۂ سندھ (صدر مقام : کراچی) خیرپور اور حیدر آباد ڈویژنوں پر اور (۴) صوبۂ بلوچستان (صدر مقام : کوئٹہ) کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں پر مشتمل ہوگا ۔ کراچی ڈویژن کا ضلع کراچی صوبۂ سندھ میں اور ضلع لس بیلہ صوبۂ بلوچستان میں شامل ہوگا ۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی جگہ

لاهور هائی کورٹ (برائے صوبۂ پنجاب و اسلام آباد)، پشاور هائی کورٹ (برائے صوبۂ سرحد) اور کراچی هائی کورٹ (برائے صوبۂ سندھ و صوبۂ بلوچستان لے لیں گے ۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد مرکزی حکومت کے ماتحت رہے گا ۔

پنجاب میں انتظامی محکموں کی تعداد چودہ ہوگی : (۱) محکمۂ مال (Board of Revenue)؛ (۲) عمومی انتظامیہ و اطلاعات (Services and General Administration and Information)؛ (۳) منصوبہ‌بندی و ترقیات؛ (۴) قانون؛ (۵) صحت؛ (۶) صنعت، تجارت و معدنیات؛ (۷) آب پاشی و برقیات؛ (۸) تعلیم؛ (۹) مالیات؛ (۱۰) داخلہ؛ (۱۱) زراعت و امداد باہمی؛ (۱۲) خوراک؛ (۱۳) محنت؛ (۱۴) مواصلات و تعمیرات ۔ مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بعض محکمے ایک دوسرے میں مدغم کر دیے جائیں گے اور یوں صوبۂ سندھ میں ان کی کل تعداد تیرہ، صوبۂ سرجد میں دس اور صوبۂ باوچستان میں چھے ہوگی.

صوبائی حکومتوں کے اکثر انتظامی اختیارات ضلعی انتظامیہ کو حاصل ہیں ۔ مرکزی اور صوبائی دفاتر حکومت (Secretariats) میں جو لائحۂ عمل تیار ہوتا ہے اس پر عمل‌درآمد اسی کے ذریعے کرایا جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں شہری اور دیہی علاقوں میں ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' Local Self Government کے اصول پر ڈویژن کونسلیں، ڈسٹرکٹ کونسلیں، نیز تھانہ کونسلیں (مشرقی پاکستان میں) اور تحصیل کونسلیں (مغربی پاکستان میں) اور میونسپل کمیٹیاں، ٹاؤن کمیٹیاں، یونین کمیٹیاں اور یونین کونسلیں بنائی گئی ہیں، جو اپنے اپنے منصب کے مطابق ضلعی انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتی ہیں ۔ صدر ایوب خان نے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کی جو طرح ڈالی تھی ان کے منتخب نمائندوں کا سیاسی اور بنیادی مقصد صدرِ مملکت اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو منتخب کرنا تھا ۔ علاوہ ازیں بنیادی جمہوریتوں کے ارکان مل کر اپنے اپنے علاقوں میں ایک تنظیمی وحدت تشکیل کرتے تھے جسے گاؤں میں یونین کونسل، قصبے میں ٹاؤن کمیٹی اور بلدیاتی علاقے میں یونین کمیٹی کہتے ہیں ۔ بالغ رائے دہی اور ''ایک فرد، ایک ووٹ'' کی بنا پر براہِ راست انتخاب کا اصول طے ہو جانے کے بعد بنیادی جمہورتیں انتخابی ادارے نہیں رہیں، لیکن مقامی حکومت کے نظام کے طور پر ان کی حیثیت ابھی تک قائم ہے .

(٦) ترقیاتی منصوبہ بندی

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان ایک جداگانہ آزاد ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا تو اس کے مشمولہ صوبے برصغیر میں سب سے زیادہ پس ماندہ تھے ۔ مشرقی پاکستان میں، جہاں دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتا ہے، پٹ سن کے کارخانوں کا فقدان تھا ۔ روئی کی گانٹھیں بنانے کی مشینیں اتنی کم تھیں کہ مغربی پاکستان کی کل پیداوار کا دسواں حصہ ہی استعمال ہو سکتا تھا ۔ ان علاقوں کا کوئلے، لوہے، فولاد، تمباکو، شکر، نباتاتی روغن وغیرہ کی تمام مصنوعات کے لیے اُس خطّے پر انحصار تھا جسے اب بھارت کہتے ہیں ۔ تمام ملک میں ایک لاکھ کیلوواٹ سے کم بجلی پیدا ہوتی تھی ۔ ریلوں کے دو نظام تھے : (۱) مغربی پاکستان میں نارتھ ویسٹرن ریلوے، جہاں ریل پٹڑی چوڑی تھی اور (۲) مشرقی پاکستان میں ایسٹ بنگال ریلوے، جہاں پٹڑی کم چوڑی تھی ۔ ان ریلوں کی مجموعی لمبائی ۶۱۰۴ میل تھی ۔ اوّل الذکر ریلوے تجارتی مقاصد سے زیادہ فوجی مقاصد کے لیے بنائی گئی تھی، اور وہ خود کفیل

نہ تھی ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں ریلوں کے انجن اور ڈبے خستہ حال ہو چکے تھے، جنھیں تبدیل کرنے کی ضرورت تھی ۔ مزید برآں آزادی کے وقت کوئلے کی قلت کی وجہ سے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت تقریباً بند ہو گئی تھی ۔ پاکستان کے دونوں خطّوں کا درمیانی فاصلہ بارہ سو فضائی میل اور تین ہزار بحری میل ہے، لیکن پاکستان کے پاس نہ تجارتی بیڑہ تھا، نہ ہوائی سروس ۔ کراچی تو نہایت عمدہ بندرگاہ تھی، لیکن مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ کی بندرگاہ پر کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ۔ زراعت پر ملک کی اسّی فیصد آبادی کی روزی کا انحصار ہے، لیکن اس میں میکانکی طریقۂ کاشت کا آغاز تک نہ ہوا تھا اور وہی قدیم دقیانوسی طریقے رائج تھے ۔ ملک میں صرف ایک ریڈیو سٹیشن تھا ۔ ابتدا ہی سے پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ مہاجرین کے آنے سے ان مسائل میں اضافہ اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ۔ یہ مہاجرین زیادہ تر مفلوک الحال کاشتکار اور اہل حرفہ تھے، جنھیں بہر حال دوبارہ بسانا اور روزگار مہیا کرنا ضروری تھا ۔ ہندو اور سکھ، جو یہاں سے گئے تھے، عموماً تاجر، صنعت کار اور سرکاری دفتروں اور نجی اداروں میں کام کرنے والے تھے، جن کی جگہ پُر کرنا فوری طور پر مطلوب تھا ۔ سکولوں، ہسپتالوں، بینکوں اور دیگر اداروں کو عموماً غیر مسلم چلاتے تھے ۔ اب ان کی دیکھ بھال کرنے والا عملہ نہ رہا تھا ۔

حکومت کا کُل کاروبار چلانے کے لیے انڈین سول سروس کے تقریباً ایک سو افسر پاکستان کے حصے میں آئے تھے ۔ عملہ بھی ناکافی تھا ۔ دفاتر کے لیے کوئی موزوں جگہ تھی، نہ ضروری سامان ۔

ملک کے یہ حالات تھے جن میں قومی ترقی کی منصوبہ‌بندی کا آغاز کرنا پڑا ۔ اگرچہ ملک کو قائم ہوئے تیئیس برس ہونے کو آئے ہیں، لیکن ترقیات کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے ۔ آبادی اب تقریباً بارہ کروڑ ہے اور تیس لاکھ سالانہ شرح سے بڑھ رہی ہے ۔ پاکستان دنیا کے سب سے زیادہ گنجان آباد ممالک میں سے ہے، چنانچہ گزشتہ چند برس میں اقتصادی ترقی کی شرح خاصی بلند رہنے کے باوجود فی کس سالانہ آمدنی ابھی تک ۳۶۵ روپے پر قائم ہے ۔

پاکستان میں منصوبہ‌بندی کا نظام ہنوز انقلابی دور سے گزر رہا ہے ۔ اس کی ترقی کے تین واضح دور ہیں : (۱) ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۳ء؛ (۲) ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۸ء؛ (۳) ۱۹۵۸ء کے بعد.

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حکومت نے ایک ترقیاتی بورڈ (Development Board) قائم کیا، جس کے فرائض میں صوبائی حکومتوں کی تیار کردہ ترقیاتی تجاویز میں ربط و ضبط پیدا کرنا، تقدّمات (priorities) کی سفارشات کرنا، ترقیاتی منصوبوں کی رفتار ترقی پر نگاہ رکھنا اور اس ترقی سے متعلق کابینہ کو باقاعدہ رپورٹ پیش کرنا شامل تھا ۔ علاوہ ازیں سرکاری افسروں اور عوام کے نمائندوں پر مشتمل منصوبہ‌بندی کا ایک مشاورتی بورڈ (Planning Advisory Board) بھی قائم کیا گیا، جس کے فرائض میں منصوبہ‌بندی اور ترقیاتی امور سے متعلق حکومت کو مشورہ دینا، منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کی رفتار ترقی کا جائزہ لینا اور ترقیاتی کوششوں میں عوام کی حمایت حاصل کرنا شامل تھا ۔ اس مشاورتی بورڈ کو مختلف صنعتی بورڈوں اور کمیٹیوں کی اعانت حاصل رہی، جو مرکز اور صوبوں میں قائم کی گئیں .

کولمبو منصوبے کی مجلس مشاورت (Colombo Plan Consultative Committee) کی سفارشات پر ۱۹۵۰ء میں ترقیاتی بورڈ نے بہت جلد ملک کے لیے

ایک چھے سالہ ترقیاتی منصوبہ (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۷ء) تیار کیا۔

۱۹۵۱ء کے اوائل میں چھے سالہ ترقیاتی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ منصوبہ بندی کا مشاورتی بورڈ توڑ دیا گیا اور ترقیاتی بورڈ کی جگہ منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) نے لے لی، جس کے بیس ارکان تھے اور اس کا صدر وزیر امور اقتصادیات تھا، نیز اعلیٰ اختیارات کی حامل ایک اقتصادی کونسل (Economic Council) بھی قائم کی گئی، جس کا صدر وزیر اعظم اور ارکان ترقیاتی وزارتوں کے سربراہ وزرا تھے۔ یہ کونسل چھے سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے، اس منصوبے کے تحت آئندہ منصوبوں کی منظوری دینے اور ان کی رفتار ترقی کی باقاعدہ روداد پیش کرنے کی ذمے دار تھی۔

پہلے ترقیاتی دور میں سنجیدہ کوششوں کے باوجود یہ منصوبہ بندی نظام زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوا۔

منصوبہ بندی بورڈ (Planning Board) : چھے سالہ منصوبے پر عمل درآمد کے دوران میں ایک ایسے مربوط و ہم آہنگ ترقیاتی منصوبے کی ضرورت محسوس ہونے لگی، جس کی بنیاد مالیاتی وسائل کے صحیح اندازے اور تقدمات کے منظم قاعدے پر استوار ہو۔ نتیجةً جولائی ۱۹۵۳ء میں حکومت نے ایک منصوبہ بندی بورڈ کی تشکیل کی اور اسے اپریل ۱۹۵۵ تا مارچ ۱۹۶۰ء کی مدت کے لیے منصوبہ بنانے کی ذمے داری تفویض کر دی گئی تھی۔ منصوبہ بندی بورڈ کو شروع میں معلومات اور عملے کے فقدان کے باعث بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن بیرونی مشیروں کی مدد سے ان پر کسی حد تک قابو پا لیا گیا اور منصوبہ بندی بورڈ ۱۹۵۶ء تک پہلا پنج سالہ منصوبہ بنانے کے قابل ہو گیا، گو اسے ۱۹۵۸ء تک حکومت کی منظوری حاصل نہ ہو سکی۔

منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) : منصوبہ بندی تنظیم کے ارتقاء کا تیسرا دور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب خان کے بر سر حکومت آنے کے بعد شروع ہوا۔ منصوبہ بندی بورڈ کا درجہ بلند کر کے اسے منصوبہ بندی کمیشن کے درجے تک پہنچا دیا اور بعد ازاں کمیشن کا مرتبہ اور بھی اونچا کر کے اسے صدارتی سیکریٹریٹ میں باقاعدہ ڈویژن بنا دیا گیا۔ صدر پاکستان نے اس کمیشن کی صدارت خود سنبھال لی اور منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وزیر بحیثیت عہدہ کے منصب کا ایک ڈپٹی چیئرمین مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے علاوہ منصوبہ بندی ڈویژن کے سیکرٹری اور دونوں صوبوں کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہے۔

اس کمیشن کے مفوضہ امور میں زیادہ اہم یہ ہیں: (۱) قومی منصوبوں کو میعادی وقفوں پر تیار کرنا؛ (۲) قومی منصوبے کی حدود کے اندر سالانہ ترقیاتی دستور العمل تیار کرنا اور وسائل کی تخصیص کی تجاویز پیش کرنا؛ (۳) منظور شدہ ترقیاتی منصوبوں اور بیرونی امداد حاصل کرنے والے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز پیش کرنا؛ (۴) ان منصوبوں کی ترقی کی روداد پیش کرنا؛ (۵) بلحاظ وعدہ کارکردگی کا اندازہ لگانا؛ (۶) ان منصوبوں پر عمل درآمد کرنے میں تاخیر کے اسباب کی تشخیص کرنا؛ (۷) قومی منصوبے پر سرکاری طور پر عمل درآمد کرانے کے لیے تنظیم کی نوعیت پر مشورہ دینا؛ (۸) ملک کے افرادی اور مادی وسائل کی وقتاً فوقتاً تعیین کرنا؛ (۹) اہم اقتصادی حکمت عملیوں اور پروگراموں کا تجزیہ کر کے سفارشات پیش کرنا؛ (۱۰) امداد دینے والے ممالک کے لیے

اقتصادی تخمینے اور قدر و قیمت کی تعیین کے لیے اعداد و شمار فراہم کرنا ۔ یہ کمیشن اپنی بہت سی ذمے داریوں کو تکنیکی شعبوں کے ذریعے پورا کرتا ہے ۔ ہر شعبے میں ایک باقاعدہ تحقیقی عملہ ہوتا ہے ۔ یہ شعبے مختلف اقتصادی دائروں (sectors) میں کام کرتے ہیں، مثلاً خوراک و زراعت، بجلی اور پانی، صنعت و حرفت، تجارت، رسل و رسائل اور نقل و حمل، تعلیم، صحت، سماجی بہبود، رہائشی تعمیرات اور افرادی قوت ۔ ان کے علاوہ چند اور بھی شعبے ہیں، جن کا تعلق مالگزاری، مالیات، بین الاقوامی اقتصادیات اور معاشی تحقیقات وغیرہ سے ہے ۔

حکومت کی تمام ایسی کمیٹیوں میں جو مختلف پالیسیوں کو طے کرتی ہیں منصوبہ‌بندی کمیشن کا نمائندہ ہوتا ہے ۔ کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین قومی اقتصادی کونسل (National Economic Council) کا رکن ہے، جو اقتصادی امور کا فیصلہ کرنے والی سب سے بڑی جماعت ہے ۔ مرکزی ترقیاتی مجلس عمل (The Central Development Working Party) کی صدارت منصوبہ‌بندی ڈویژن کا سیکرٹری کرتا ہے، لیکن ایک خاص حد سے تجاوز کرنے والی تجاویز کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کی صدارت میں پیش ہوتی ہیں ۔ کمیشن کو نجی سرمایہ کاری کی تجاویز کی منظوری دینے والی کمیٹی کے علاوہ بیرونی زر مبادلہ کے کنٹرول کمیشن (Foreign Exchange Controls Commission) میں بھی نمائندگی دی جاتی ہے ۔

قومی اقتصادی کونسل اقتصادی امور پر فیصلہ دینے والی اعلٰی ترین مجلس ہے ۔ اس کے مندرجۂ ذیل فرائض ہیں : (۱) ملک کے اقتصادی حالات کا مجموعی طور پر جائزہ لینا؛ (۲) مالیاتی، تجارتی اور اقتصادی حکمت عملی اور ملک کی اقتصادی ترقی کے لحاظ سے منصوبے وضع کرنا؛ (۳) پنج سالہ منصوبوں، سالانہ ترقیاتی پروگراموں، خاص حد سے اوپر کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی تجاویز، نجی حلقے کی تجاویز اور تمام غیر منصوبہ‌بندی تجاویز کی منظوری دینا؛ (۴) صوبوں کے درمیان اور ایک ہی صوبے کے مختلف علاقوں کے درمیان اقتصادی اور فی کس آمدنی میں عدم توافق کو دور کرنے کے لیے اقدامات کرنا ۔ آخری ذمے داری سے متعلق کونسل کو ہر سال مرکزی مجلس قانون ساز کو اپنی رپورٹ پیش کرنا پڑتی ہے ۔ صدر مملکت اس کونسل کا چیئرمین ہے ۔ اس کے ارکان میں دونوں گورنر، مرکزی وزرا (بجز قانون، امور خارجہ، امور داخلہ اور امور کشمیر کے وزرا کے)، منصوبہ بندی کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین اور وہ صوبائی وزرا جو مالیات، منصوبہ‌بندی و ترقیاتی محکموں کے سر براہ ہیں شامل ہیں۔

منصوبہ بندی کی دیگر تنظیمات : منصوبہ بندی کی دیگر تنظیمات یہ ہیں : مرکز اور صوبوں میں ترقیاتی مجالس عاملہ (Development Working Parties) اور صوبوں میں منصوبہ‌بندی ترقیاتی محکمے (Planning Development Departments) ۔

ابتدائی منصوبہ بندی : ۱۹۴۸ء میں ترقیاتی بورڈ قائم کرنے کے بعد حکومت نے کچھ اور اقدامات بھی کیے، مثلاً صنعت کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے کے لیے بنیادی صنعتوں کو صوبوں کے دائرۂ اختیار سے نکال کر مرکز کی تحویل میں دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

چھے سالہ منصوبہ : مئی ۱۹۵۰ء میں کولمبو منصوبے (Plan) کے تحت پاکستان نے چھے سالہ ترقیاتی منصوبہ تیار کیا، جو جولائی ۱۹۵۱ تا جون ۱۹۵۷ء کے عرصے پر حاوی تھا ۔ اس میں لچک رکھی گئی تھی، چنانچہ اس کے آخری دور میں اس کے اندر خاصی ترمیم و توسیع کی

گئی - سرکاری شعبے میں دو ارب ساٹھ کروڑ روپے صرف کرنے کا منصوبہ تھا، لیکن پہلے پانچ سال ہی میں تین ارب روپے صرف ہو چکے تھے۔

کوریا کی جنگ بند ہو جانے سے ایک طرف تو پاکستان کی برآمدات میں کمی واقع ہو گئی، دوسری طرف درآمدات، مثلاً کارخانوں کے لیے مشینوں اور دیگر سامان کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا - نتیجۃً اس چھے سالہ منصوبے اور اس کے ضمنی دو سالہ منصوبے پر پوری طرح سے عمل درآمد نہ ہو سکا - بہرحال اس کے بعض اچھے نتائج بھی نکلے اور پہلے پانچ سالوں میں قومی پیداوار میں مجموعی طور پر ۱۴ فیصد سے زائد اضافہ ہوا۔

پہلا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۵ تا ۱۹۶۰ء): ان تجربات کے بعد حکومت نے پہلا پنج سالہ منصوبہ تیار کیا - اصل یہ ہے کہ پاکستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کی یہ پہلی مربوط اور بھرپور کوشش تھی - اس منصوبے کے اہم مقاصد یہ تھے: (۱) قومی آمدنی میں ۱۵ فیصد اور فی کس آمدنی میں ۷ فیصد اضافہ کرنا؛ (۲) بیس لاکھ نئی اسامیاں پیدا کرنا؛ (۳) غذائی پیداوار میں ۹ فیصد اور دوسری زرعی پیداوار میں ۱۵ سے ۳۳ فیصد تک اضافہ کرنا؛ (۴) صنعتی پیداوار میں ۶۰ فیصد اضافہ کرنا - علاوہ ازیں، برآمدات اور آبپاشی کی سہولتوں میں اضافے، دیہی ترقی، بجلی، ذرائع رسل و رسائل اور سماجی بہبود کے امور کی ترقی کے لیے بھی حدود قائم کی گئیں۔

اس منصوبے کے دوران میں سرکاری شعبے میں تقریباً دس ارب روپے صرف ہونے تھے، جن میں سے ۳ ارب ۲۰ لاکھ مشرقی پاکستان، ۳ ارب ۵۰ کروڑ ۲۰ لاکھ مغربی پاکستان اور ۲ ارب ۷۳ کروڑ ۱۰ لاکھ مرکزی حکومت کے لیے مخصوص کیے گئے تھے - مشرقی پاکستان کی ترقیاتی سکیموں کے لیے مزید ایک ارب روپے کی گنجائش رکھی گئی تھی - دسمبر ۱۹۵۷ء میں اس منصوبے پر نظر ثانی کی گئی جس کی رو سے کل رقم ۱۰ ارب ۸۰ کروڑ منظور کی گئی (ساڑھے سات ارب سرکاری شعبے کے لیے اور باقی رقم نجی شعبے کے لیے) - ۶ ارب ۶۰ کروڑ روپے ملکی وسائل سے اور ۴ ارب ۲۰ کروڑ روپے بیرونی ممالک سے حاصل کرنا تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس پنج سالہ منصوبے پر بہت اچھے طریقے سے عمل درآمد کیا گیا اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلے، لیکن منصوبہ بندی کا تصوّر چونکہ ابھی تک ملک کے لیے نیا تھا، اس لیے طویل مدت کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابھی مؤثر تنظیمی اداروں کو قائم کرنا باقی تھا - دوسرے اس عرصے میں ملک کے سیاسی حالات چونکہ مستحکم نہ تھے، اس لیے حکومت اپنی ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دلجمعی سے کوشش نہ کر سکی - اسی قسم کے عوامل کے باعث اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ فروگزاشتیں بھی ہوئیں - بہرحال ان کوششوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا ہو گیا۔

دوسرا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۵ء): اس کے اہم مقاصد یہ تھے: (۱) قومی آمدنی میں ۲۴ فی صد اضافہ؛ (۲) اس مدت میں آبادی میں اضافے کا لحاظ رکھتے ہوے فی کس آمدنی میں ۱۲ فیصد کا اضافہ؛ (۳) زراعت کی تقدیم (priority) اور زرعی پیداوار میں ۲۱ فیصد اضافہ کر کے اناج میں خود کفالت؛ (۴) صنعتی پیداوار میں ۶۰ فیصد اضافہ؛ (۵) زر مبادلہ کی آمدنی میں ۳ فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ۲۳ ارب روپے

کی رقم تجویز کی گئی (۱۳ ارب ٦۲ کروڑ روپیہ سرکاری و نیم سرکاری شعبے اور ۸ ارب ۳۸ کروڑ نجی شعبے کے لیے؛ سرکاری شعبے کی رقم میں سے ٦ ارب ۳۸ کروڑ روپیہ مشرقی پاکستان کے لیے اور ۸ ارب ۲۵ کروڑ روپیہ مغربی پاکستان کے لیے مخصوص کیا گیا) ۔ علاوہ ازیں دوسرے پنج سالہ منصوبے کے عرصے میں وہ بنیادی انتظامی اصلاحات کی گئیں جو پہلے پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری سمجھی گئی تھیں، لیکن ان پر عمل درآمد نہ ہو سکا تھا۔

دوسرا پنج سالہ منصوبہ بہت کامیاب ثابت ہوا؛ بعض مقاصد میں تو توقع سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی: (۱) مجموعی قومی آمدنی پانچ برس میں ۳۰.۴ فی صد زیادہ ہوئی حالانکہ منصوبے میں اس کی حد ۲۴ فیصد تھی؛ (۲) فی کس آمدنی ۱۴.۸ فی صد بڑھی، جبکہ منصوبے میں میں اس کی حد ۱۲ فی صد رکھی گئی تھی؛ (۳) اناج کی پیداوار میں ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا، بمقابل ۲۱ فیصد کی مطلوبہ حد کے؛ (۴) صنعتی پیداور میں ٦۱.۴ فی صد کا اضافہ ہوا، بمقابل ٦۰ فی صد کی مطلوبہ حد کے؛ (۵) بیرونی زر مبادلہ کی آمدنی میں ۷ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا، بمقابل ۳ فی صد کی مطلوبہ حد کے۔

زراعت، صنعت و حرفت، پانی اور بجلی، معدنیات و سوختنیات، ذرائع رسل و رسائل و حمل و نقل، عائلی منصوبہ‌بندی اور سکونتی تعمیرات، تعلیم و تربیت، صحت، سماجی و دیہی بہبود کے امور کے منصوبوں میں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

بیس سالہ تناظری منصوبہ (Perspective Plan) (۱۹٦۵ تا ۱۹۸۵ء) : پہلی اور دوسری پنج سالہ منصوبہ‌بندی کی احسن کارکردگی، کامیاب تجربات اور حوصلہ‌افزا نتائج کی بنا پر حکومت نے ۱۹٦۵ء میں بیس سالہ تناظری منصوبہ تیار کیا، جس کے اقتصادی مقاصد یہ ہیں : (۱) قومی آمدنی کو چار گنا بڑھانا، جس سے فی کس آمدنی دگنی سے زیادہ ہو جائے؛ (۲) کل محنت کاروں کے لیے ملازمتیں فراہم کرنا؛ (۳) مشرقی اور مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی میں مساوات پیدا کرنا؛ (۴) ملک گیر خواندگی کا حصول اور (۵) ملک کو بیرونی امداد کی ضرورت سے کلیةً آزاد و بے نیاز کرنا ۔ یہ مقاصد تیسرے پنج سالہ منصوبے سے شروع ہو کر آئندہ پنج سالہ منصوبوں کے ذریعے حاصل کیے جائیں گے۔

تیسرا پنج سالہ منصوبہ ۱۹٦۵ تا ۱۹۷۰ء : تیسرا پنج سالہ منصوبہ بیس سالہ تناظری منصوبے کی حدود کے اندر تیار کیا گیا ۔ اس کے لیے ۵۲ ارب روپے کی رقم منظور کی گئی (۳۰ ارب سرکاری شعبے اور ۲۲ ارب نجی شعبے کے لیے؛ سرکاری شعبے کی رقم میں سے ۱٦ ارب مشرقی پاکستان کے لیے اور ۱۴ ارب مغربی پاکستان کے لیے مخصوص کیے گئے ۔ نجی سرمائے کی رقم دونوں صوبوں میں مساوی تقسیم کی گئی) : اس منصوبے کے مقاصد مختصراً یہ تھے : (۱) قومی معیشت کی تیز تر ترقی کا حصول؛ (۲) دونوں صوبوں میں اور ہر صوبے کے اندر مختلف علاقوں میں فی کس آمدنی کا تفاوت دور کرنا؛ (۳) روزگار کی منڈی میں توسیع؛ (۴) ادائی کی صورت حال کے توازن میں استحکام؛ (۵) مصنوعات تیار کرنے کے لیے بنیادی صنعتوں کی ترقی؛ (٦) زرعی ترقی کی رفتار میں اضافہ؛ (۷) افزائش آبادی کو روکنا؛ (۸) بہتر سکونت گاہیں، نیز علاج و معالجہ اور تعلیم کی زیادہ سہولتیں مہیا کرنا؛ (۹) دولت، مواقع اور دیگر مفادات کی زیادہ بہتر تقسیم کو یقینی بنانا؛ (۱۰) بعض مخصوص سماجی مقاصد کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا۔

اس منصوبے پر بڑی حد تک خوش اسلوبی سے عمل ہو رہا ہے اور اس کے نتائج خاصے حوصلہ افزا نکل رہے ہیں۔

چوتھا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۷۱ تا ۱۹۷۵ء): ۲ جون ۱۹۷۰ء کو قومی اقتصادی کونسل نے چوتھے پنج سالہ منصوبے کی قطعی اور آخری منظوری دے دی ہے۔ اس پر یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے عمل شروع ہوگا اور اسے ۳۰ جون ۱۹۷۵ء تک مکمل کیا جائے گا۔ اس منصوبے پر ۷۵ ارب (نجی شعبے میں ۲۶ ارب اور سرکاری شعبے میں ۴۹ ارب) روپے کے اخراجات کی منظوری دی گئی ہے، جس میں سے ۳۹ ارب ۴۰ کروڑ روپے مشرقی پاکستان میں اور ۳۵ ارب ۶۰ کروڑ روپے مغربی پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں پر صرف کیے جائیں گے۔ منصوبے پر عملدرآمد سے مشرقی پاکستان کی قومی پیداوار میں ساڑھے سات فی صد اور مغربی پاکستان میں ساڑھے پانچ فی‌صد اضافہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی روک‌تھام اور مغربی پاکستان میں سندھ طاس کے پروگرام کے لیے منصوبے کے دائرے سے الگ رقم مختص کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سر دست ان پروگراموں کے لیے ۱۰ ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ سرکاری شعبے کی رقم کا ۶۰ فی‌صد (۲۹ ارب ۴۰ کروڑ روپیہ) مشرقی پاکستان میں خرچ کیا جائے گا، جس سے ملک کے دونوں حصوں میں فی کس آمدنی کا فرق بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ اسی طرح مغربی پاکستان کے نسبةً پسماندہ علاقوں کی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی۔

امید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کی قطعی منظوری کے بعد تذبذب کی وہ حالت ختم ہو جائے گی جو ملک کے ترقیاتی پروگرام کے بارے میں پائی جاتی تھی اور ترقیاتی منصوبے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملکی و بیرونی وسائل کو بروے کار لانے کی سخت جد و جہد کی جائے گی۔ منصوبہ‌بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ منصوبے کے دوران میں تقریباً ساڑھے تین ارب روپے کا مالیاتی خسارہ ہوگا، چنانچہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک ٹیکسیشن کمیشن قائم کیا جائے گا، جو تمام وسائل کو یکجا کرنے کے طریقوں پر غور کرے گا، ملک میں ٹیکسیشن کے پورے نظام کا جائزہ لے گا اور منصوبے پر عملدرآمد کے لیے ٹیکسوں کی موجودہ شرح میں اضافے، نیز اضافی ٹیکسوں کے بارے میں بھی اپنی سفارشات پیش کرے گا۔ چوتھے منصوبے کے دوران میں براہ راست ٹیکسوں پر زیادہ انحصار کیا جائے گا، ارتکاز زر کو روکنے کے لیے نئی صنعتی پالیسی نافذ کی جائے گی، اہم صنعتیں سرکاری شعبے کی تحویل میں دے دی جائیں گی اور تجارتی بینکوں کی قرضے دینے کی موجودہ پالیسی کو بدلنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں گے تاکہ چھوٹے تاجروں کو فائدہ ہو اور ملک میں ایک درمیانی طبقہ وجود میں آ جائے۔

۷ - زراعت

پاکستان کی معیشت میں زراعت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس میں کاشتکاری اور باغبانی کے علاوہ حیوانات‌پروری، ماہی‌پروری اور جنگل‌کاری بھی شامل ہے۔ ملک کی ۸۵ فی صد آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے، جس کی گزراوقات کا یہی ذریعہ ہے۔ قومی پیداوار کا نصف اور برآمدات کا تین چوتھائی حصہ زراعت کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں دفاع کے بعد زراعت ہی کو سب شعبوں پر مقدم سمجھا گیا اور اس کی ترقی کے لیے ۴ ارب ۱۱ کروڑ ۵۲ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی

(مختلف شعبوں پر خرچ ہونے والی رقوم کے لیے دیکھیے گوشوارہ ، در *Pakistan Year Book 1969*، ص ۱۹۲، ۱۹۳) - اس منصوبے میں مندرجۂ ذیل مقاصد پیش نظر رکھے گئے : (۱) ایک کسان کی حقیقی آمدنی میں اضافے کی شرح ملک کے دوسرے طبقات کی فی کس آمدنی میں اضافے کے مطابق ہو جائے؛ (۲) خوراک کے اعتبار سے ملک کو خود کفیل بنا دیا جائے؛ (۳) زراعت کو منظم کر کے مستحکم بنیادوں پر ترقی دی جائے.

پاکستان کا کل رقبہ ۲۳ کروڑ ۴۰ لاکھ (مغربی پاکستان: ۱۹ کروڑ ۸۷ لاکھ؛ مشرقی پاکستان: ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ) ایکڑ ہے اور اس میں زیر کاشت رقبہ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں تقریباً ۶ کروڑ ۳۱ لاکھ (مغربی پاکستان: ۴ کروڑ ۱۴ لاکھ؛ مشرقی پاکستان: ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ) ایکڑ تھا - کوشش کی جا رہی ہے کہ زیر کاشت رقبے میں ہر ممکن طریق سے اضافہ کیا جائے.

مغربی پاکستان میں سیم اور تھور سے اور مشرقی پاکستان میں آئے دن آنے والے سیلابوں سے زمین ناکارہ ہو رہی ہے - ان آفتوں کا سد باب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر بڑی منظم جد و جہد جاری ہے اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی ہے - پہلے پنج سالہ منصوبے کے ختم ہونے پر کل زیر کاشت رقبہ ۶ کروڑ ۸ لاکھ ایکڑ تھا - دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں علی الترتیب ۱۸ لاکھ اور ۵۸ لاکھ کا اضافہ ہوا - امید ہے کہ تیسرا منصوبہ ختم ہونے پر یہ رقبہ ۱۱ کروڑ ۸۴ لاکھ ایکڑ ہو جائے گا .

زرعی ترقیات کے لیے حکومت کے کئی ادارے کام کر رہے ہیں - زراعت کا شعبہ در اصل صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے، لیکن منصوبہ بندی، اعداد و شمار کی فراھمی اور بیرونی ممالک سے گفت و شنید مرکزی وزارت زراعت کے سپرد ہے - ہر صوبے میں محکمۂ زراعت قائم ہے، جس کا سربراہ حکومت کا سیکرٹری ہوتا ہے اور اس کے ماتحت زراعت کے مختلف شعبوں کے ماہرین کام کرتے ہیں - ہر صوبے میں ایک زرعی ترقیاتی کارپوریشن (ADC = Agricultural Development Corporation) بھی قائم کی گئی ہے، جس کا کام یہ ہے کہ کاشتکاروں کو بیج اور کھاد مہیا کرے، ان کی مشکلات کو حل کرنے میں فنی مشورے اور اعانت بہم پہنچائے، زرعی آلات اور مشینیں مستعار دے اور یوں زرعی ترقی کی رفتار کو تیزتر کر دے - ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں میکسی پاک گندم اور اِرّی چاول کے بیج مہیا کیے گئے، جن کے استعمال سے پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ۱۹۷۰ء میں ملک اناج کے اعتبار سے خود کفیل ہو گیا .

مجموعی پیداوار: پاکستان کی بڑی بڑی فصلیں یہ ہیں : چاول، گندم، مکئی، جوار، باجرہ، چنا، گنّا، تیل کے بیج، کپاس، پٹ سن، تمباکو اور چاے - بڑی بڑی فصلوں کا زیر کاشت رقبہ، ان کی مجموعی پیداوار اور اس میں بتدریج ترقی مندرجۂ ذیل گوشوارے سے واضح ہوتی ہے :

فصل	زیر کاشت رقبہ (ہزار ایکڑ میں)		سالانہ پیداوار (ہزار ٹن میں)	
	۱۹۵۵-۱۹۶۰ء	۱۹۶۷-۱۹۶۸ء	۱۹۵۵-۱۹۶۰ء	۱۹۶۷-۱۹۶۸ء
چاول	۲۲۷۶۷	۲۷۹۴۵	۸۴۰۹	۱۲۴۷۰
گندم	۱۱۷۴۱	۱۵۳۷۰	۳۶۴۴	۶۲۵۷
باجرہ	۲۰۶۶	۲۲۵۸	۳۲۲	۴۰۷
جوار	۱۱۷۳	۱۴۴۶	۲۲۶	۲۸۶
مکئی	۱۱۰۹	۱۵۱۱	۴۶۴	۷۸۲
جو	۵۵۷	۵۳۴	۱۵۳	۹۹
چنا	۳۱۹۸	۲۹۱۱	۶۷۴	۵۴۶

گنّا	۱۱۶۱	۱۶۵۷	۱۳۹۷۵	۲۵۹۵۴
توریا و سرسوں	۱۹۱۹	۱۷۱۳	۳۲۵	۲۸۸
تل	۲۰۶	۱۲۴	۳۳	۳۳
پٹ سن	۱۴۶۶	۲۳۵۴	۱۰۶۳	۱۲۰۰
کپاس	۳۴۹۴	۴۲۸۱	۲۹۴	۴۹۴
چاے	۷۷	۱۰۱	۲۳	۲۹
تمباکو	۱۹۵	۲۷۲	۹۰	۱۰۰
میزان	۵۱۱۲۹	۶۲۴۷۷	۲۹۶۹۵	۴۹۰۵۰

ترقیاتی منصوبے: حکومت کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے میں ملک کے کاشتکار طبقے نے جس جوش سے کام کیا اس سے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوے ہیں - زرعی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہیں : زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں پر عمل اور مشینی زراعت کا آغاز؛ کیمیاوی کھاد کا زیادہ سے زیادہ استعمال؛ زمین کی بحالی؛ بہتر قسم کے بیجوں کی تقسیم؛ پودوں کی حفاظت؛ پودوں کی نگہداشت؛ تربیتی و تحقیقی اداروں کا قیام (تفصیلات کے لیے دیکھیے گوشوارہ ۶، در *Pakistan Year Book 1969*، ص ۲۰۰، ۲۰۱).

زراعت کے ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد کے لیے ماہرین کی بے حد ضرورت ہے، لہٰذا تعلیمی و تربیتی سہولتوں کی اصلاح و توسیع پر بھی زور دیا جا رہا ہے - پاکستان میں تین زرعی کالج اور دو زرعی یونیورسٹیاں ہیں - ان کے علاوہ متعدد تربیتی ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں، جہاں زرعی کارکنوں کو تربیت حاصل کرنے کے بعد اسناد ملتی ہیں - دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں زرعی تحقیق پر بھی بہت توجہ دی گئی ہے - اس وقت تین مرکزی ادارے موجود ہیں، یعنی زرعی تحقیقاتی کونسل (Agricultural Research Council)، مرکزی کپاس کمیٹی (Pakistan Central Cotton Committee) اور مرکزی پٹسن کمیٹی (Pakistan Central Jute Committee)- مؤخرالذکر دونوں کمیٹیاں علی الترتیب کپاس اور پٹسن سے متعلقہ صنعتوں کے سلسلے میں بھی تحقیق کر رہی ہیں - صوبائی سطح پر چار تحقیقی ادارے ہیں، جن کے مراکز متعدد مقامات پر قائم ہیں - ان کے علاوہ دو (زرعی) ایٹمی تحقیقاتی مرکز بھی کام کر رہے ہیں - ان سب اداروں میں کاشت کے جدید ترین طریقوں اور زیادہ سے زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں پر مسلسل تحقیق ہو رہی ہے.

اراضی کی اصلاح اور پیداوار میں اضافے کی خاطر مشینی زراعت کو مروج کرنے کے لیے بھی حکومت کی مساعی قابل ذکر ہیں - کاشتکاروں کو ٹریکٹر، بل ڈوزر، اور دوسری مشینیں اور آلات کرائے پر مہیا کیے جاتے ہیں - ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان زرعی ترقیاتی کارپوریشن (EPADC) کی طرف سے ۳۹۹۰ نل لگائے گئے، جس سے سوا دو لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوئی اور چودہ ہزار ایکڑ رقبے کو بحال کرنے کے لیے ۹۳ ٹریکٹر استعمال کیے گئے؛ مغربی پاکستان زرعی ترقیاتی کارپوریشن (WPADC) نے ۷۶۰ بل ڈوزر اور ۸۰ ٹریکٹر مہیا کیے، جن کی مدد سے پونے دو لاکھ ایکڑ رقبہ بحال ہوا اور ۶۰ ہزار ایکڑ اراضی میں کاشت ہوئی - مغربی پاکستان میں دوسرے پنج سالہ منصوبے کے پہلے دو سالوں میں ۵ ہزار ٹیوب ویل لگائے گئے.

کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کی اچھی قیمت وصول ہو، اس غرض سے مرکزی وزارت زراعت کے ماتحت، ایک نظامت Directorate of Marketing and

Agricultural Statistics کام کر رہی ہے ۔ صوبائی حکومتوں کے ماتحت بھی اسی قسم کی نظامتیں قائم ہیں جو منڈیوں کا جائزہ لے کر اجناس کے مناسب نرخ شائع کرتی ہیں اور منڈیوں کے لیے قواعد و ضوابط وضع کر کے نافذ کرتی ہیں۔

ماہی پروری : پاکستان میں ماہی پروری کے وافر مسائل موجود ہیں ۔ خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کو بین الاقوامی معیار کے مطابق ماہی گیری کے بہترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں اندرون ملک میں دریاؤں، جھیلوں اور تالابوں وغیرہ میں بھی ماہی گیری اور ماہی پروری بخوبی ہو سکتی ہے ۔ مچھلی ایک اچھی اور متوازن خوراک ہونے کے علاوہ زر مبادلہ حاصل کرنے کا بھی اہم ذریعہ ہے ۔ ۱۹۶۶ء میں کل ۴ لاکھ ۱۲ ہزار (سمندر سے ایک لاکھ ۵۷ ہزار اور اندرون ملک سے ۲ لاکھ ۷۳ ہزار) میٹرک ٹن مچھلی حاصل کی گئی (مشرقی پاکستان سے ۲ لاکھ ۹۵ ہزار اور مغربی پاکستان سے ایک لاکھ ۳۵ ہزار میٹرک ٹن) ۔ اندازہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے خاتمے پر اس سے ۲۵ کروڑ روپے کا زر مبادلہ کمایا جا سکے گا ۔ دونوں صوبائی حکومتوں کے ماتحت ماہی پروری کے محکمے قائم ہیں، جہاں ترقی و توسیع کے پروگرام پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کارکنوں کو فنی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

حیوانات پروری : زراعت کے میدان میں وصول ہونے والی مجموعی رقم کا ۲۰ فی صد حیوانات اور ان سے حاصل کردہ اشیا سے کمایا جاتا ہے ۔ ۱۹۶۰ء کی حیوانات شماری کے مطابق ان کی کل تعداد مندرجۂ ذیل تھی :- گائیں : ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ؛ بھینسیں : ۸۴ لاکھ؛ بکریاں : ایک کروڑ ۹۲ لاکھ؛ بھیڑیں : ایک کروڑ ۳ لاکھ؛ مرغیاں : ۳ کروڑ ایک لاکھ؛ گھوڑے : ۴ لاکھ ۹۷ ہزار؛ گدھے : ۹ لاکھ ۲۰ ہزار؛ خچر : ۳۱ ہزار؛ اونٹ : ۶ لاکھ ۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ اون، ۸۰ لاکھ پونڈ پشم اور ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ کھالیں حاصل ہوئیں اور اون سے ۳ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے، پشم سے ایک کروڑ ۳ لاکھ روپے اور کھالوں سے ایک کروڑ روپے کا زر مبادلہ کمایا گیا ۔ صوبوں میں پرورش و معالجۂ حیوانات کے محکمے قائم ہیں، جن کی نگرانی میں مویشیوں کی صحت کی دیکھ بھال اور ان کی نسل کی اصلاح و افزائش کے سلسلے میں قابل تعریف کام ہو رہا ہے ۔

جنگل کاری : پاکستان میں جنگلات کا رقبہ ایک کروڑ ایکڑ سے بھی کم ہے ۔ یہ مجموعی رقبے کا صرف ساڑھے چار فی صد ہے اور اس میں بھی صرف نصف رقبے سے تعمیراتی یا سوختنی لکڑی حاصل ہوتی ہے اور باقی حصہ بے کار جھاڑیوں اور بوٹیوں سے پٹا پڑا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جنگلات کی پیداوار نا کافی ہے اور لکڑی غیر ممالک سے منگوانا پڑتی ہے ۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں ساڑھے چار کروڑ روپے کی لکڑی درآمد کی گئی ۔ حکومت اب اس شعبے کی ترقی پر بھی توجہ مبذول کر رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ جدید ترین طریقوں کو کام میں لا کر نہ صرف جنگلات کے موجودہ رقبے کو ترقی دی جائے بلکہ اس میں توسیع بھی کی جائے ۔ محکمۂ جنگلات کی طرف سے ملک کے دونوں حصوں میں فنی تربیت اور تحقیقات کا انتظام کیا گیا ہے ۔

زرعی قرضے : قبل ازیں کاشتکار اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے عموماً مہاجنوں سے قرض لیتے اور سود در سود کے چکر میں پھنس کر اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے ۔ اب نہ صرف تجارتی بینکوں سے انھیں مناسب اور آسان شرائط پر قرضے حاصل

کرنے کی سہولتیں میسر ہیں، بلکہ حکومت نے بھی اس سلسلے میں مفید اقدامات کیے ہیں، مثلاً (۱) تقاوی قرضے، جو براہ راست صوبائی حکومت کی طرف سے ضلعی انتظامیہ کے ذریعے کاشتکاروں کو دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ ۹۰ لاکھ اور مغربی پاکستان میں ۹۶ لاکھ روپے کے تقاوی قرضے دیے گئے؛ (۲) تحریک امداد باھمی کے ماتحت جگہ جگہ امداد باھمی کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں، جو اپنے ارکان کو بوقت ضرورت قرض دیتی ہیں؛ (۳) زرعی ترقیاتی بینک: ۱۹۶۱ء میں زرعی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن (Agricultural Development Financial Corporation) اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان زرعی ترقیاتی بینک (Agricultural Development Bank of Pakistan=ADBP) کا قیام عمل میں آیا ۔ اس بینک کی ۱۲۱ شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۷ء میں ان سے کل ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کے قرضے دیے گئے۔

۸ ۔ صنعت و حرفت

آزادی کے وقت پاکستان کی آبادی برصغیر کی کل آبادی کا ۲۰ فی صد تھی، لیکن اسے صنعت میں صرف ۷ فی صد حصہ ملا، یعنی صرف ۳۴ کارخانے ۔ صنعت کے میدان میں اس کی محرومی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان پٹ سن کا گھر ہے، لیکن یہاں پٹ سن کا ایک کارخانہ بھی موجود نہ تھا ۔ جو کارخانے اس کے حصے میں آئے وہ نسبۃً چھوٹے تھے اور معمولی قسم کی ضروریات پوری کرتے تھے، مثلاً شکر سازی کے چند چھوٹے چھوٹے کارخانے، پھلوں کا رس بنانے اور پھلوں کو ٹین میں بند کرنے کا ایک چھوٹا کارخانہ، دھان اور آٹے کی چند چکیاں، دو بسکٹ فیکٹریاں، دو شراب سازی کے کارخانے، بناسپتی گھی بنانے کا ایک کارخانہ، کھیوڑے میں نمک کی کانیں، سلہٹ میں چائے کی صنعت، اٹک میں تیل کا ایک چھوٹا سا زمین دوز ذخیرہ اور اسے صاف کرنے کا کارخانہ، پانچ سیمنٹ کے کارخانے، نصف درجن کے قریب انجینئری کے ورکشاپ، چند ایک فولاد سے چیزیں بنانے کے چھوٹے کارخانے، ایک دیا سلائی کا کارخانہ، چند ایک شیشہ سازی کے چھوٹے کارخانے۔

آزادی کے فوراً بعد صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے واضح اصول مرتب کیے، مثلاً (۱) ایسی صنعتوں کو مقدم سمجھا جائے جن میں اپنے ھی ملک میں پیدا ہونے والا خام مال استعمال ہوتا ہے، یعنی پٹ سن، کپاس، کھالیں وغیرہ؛ (۲) بعض شرائط کے ماتحت نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ (۳) بنیادی ضروریات عامّہ سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کی سرکاری ملکیت؛ (۴) درآمدات میں کمی کرنے کی غرض سے اشیاے صارفین کی صنعتوں کی ترقی؛ (۵) طویل المعیاد مقاصد کے تحت بھاری صنعتوں کی منصوبہ بندی؛ (۶) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی ذمے داریوں کی تقسیم و تعیین ۔ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوے چند اھم اقدامات کیے گئے، مثلاً ترقیاتی بورڈ Development Board (۱۹۴۸ء)، پاکستان صنعتی مالیاتی کارپوریشن (Pakistan Industrial Financial Corporation)، جس کی جگہ آگے چل کر صنعتی ترقیاتی بینک پاکستان (Industrial Development Bank of Pakistan) نے لے لی؛ صنعتی سرمایہ کاری و اعتباری کارپوریشن Industrial Investment and Credit Corporation (۱۹۵۹ء)؛ ٹیرف کمیشن Tariff Commission (۱۹۵۰ء)؛ چھے سالہ منصوبہ (۱۹۵۱ء)؛ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن Industrial Development Corporation؛ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی نظامت (Directorate of Cottage

(and Small Industries اور بحالیات مہاجرین Refugees Rehabilitation Finance مالیاتی کارپوریشن Corporation (۱۹۵۲ء) اور پہلا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۵-۱۹۶۰ء) - صنعتی پالیسی کو وضع کرتے وقت جو اہم ترین مقاصد پیش نظر رکھے گئے وہ یہ تھے : (۱) نجی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ (۲) بیرونی سرمایہ داروں کو پاکستان میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دی جائے؛ (۳) فنی تربیت کا اہتمام کیا جائے؛ (۴) ملکی خام مال کی زیادہ سے زیادہ کھپت کی خاطر زرعی پیداوار پر مبنی صنعتوں پر زور دیا جائے؛ (۵) پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے نئی صنعتیں وہاں لگائی جائیں؛ (۶) گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دی جائے۔

ان مقاصد کے حصول کی خاطر مقامی سرمایہ کاروں کو ٹیکس میں کئی مراعات دی گئیں، جن میں ایک مدت کے لیے چھوٹ بھی شامل تھی - بیرونی سرمایہ کاروں کو متعدد مراعات اور تحفظات دیے گئے - تجارتی پالیسی صنعتی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوے وضع کی گئی - بیرونی ممالک سے امداد اور قرضوں کا اہتمام کیا گیا - ملک کے مختلف حصوں میں صنعتی رقبے (Industrial Estates) مخصوص کیے گئے - برآمدات میں اضافہ کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کی گئیں اور صنعتی کارکنوں کے لیے فنی تربیت اور تحقیق کے انتظامات میں توسیع و ترقی کی گئی - اس کے نہایت حوصلہ افزا نتائج دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۵ء) کے دوران میں برآمد ہوے - صنعتی استعداد میں بہت وسعت پیدا ہوئی، صنعتی پیداوار میں ساٹھ فی صد کا اضافہ ہوا، اور اشیاے صارفین کی بہت بڑی تعداد میں ملک خود کفیل ہو گیا - تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بھی دوسرے پنج سالہ منصوبے کی حکمت عملی اور اصولوں پر عمل ہوتا رہا - نجی شعبے کے لیے ۸ ارب ۳۰ کروڑ روپے اور سرکاری شعبے میں ۳ ارب ۱۰ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے - اشیاے صارفین کے بجاے اشیاے سرمایہ (capital goods) پر زیادہ زور دیا گیا اور صنعتیں زیادہ تر برآمدات کے لیے قائم کی گئیں- صنعتی خام مواد کی درآمد کے لیے ہر سال زرمبادلہ کی بڑی مقدار مخصوص کی جاتی ہے - برآمدی بونس سکیم اور برآمدات کی بنا پر درآمدی لائسنس جاری کرنے کی سکیم سے صنعت کاروں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے - ۱۹۶۸ء میں ٹیرف کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بعض صنعتوں کو ضروری تحفظات دیے گئے ہیں، جن میں پنسلین، فولاد اور شیشے کی صنعتیں قابل ذکر ہیں- نرخوں میں استحکام کے لیے بھی ایک بورڈ (The Price Stabilization Board) کام کر رہا ہے - مخصوص صنعتی علاقوں کو حمل و نقل، رسل و رسائل اور پانی اور بجلی کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں- ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء تک دو بڑے اور ۱۳ چھوٹے صنعتی علاقے قائم ہو چکے تھے اور ۱۶ بڑے اور ۲۲ چھوٹے صنعتی علاقے دونوں صوبوں میں موزوں مقامات پر قائم کیے جا رہے تھے - ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پندرہ برس کے عرصے میں مجموعی قومی پیداوار میں صنعتوں کا حصہ تقریباً تین گنا زیادہ ہو گیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگلے بیس سالوں میں اس میں پھر اتنا ہی اضافہ ہو گا- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کے قیام کی غرض و غایت یہ تھی کہ ان بڑی بڑی صنعتوں کو ترقی دی جائے جنھیں عام سرمایہ کار یا تو چلانے کے قابل نہ تھے یا ان کے چلانے پر آمادہ نہیں تھے - اس مقصد کی خاطر پی - آئی - ڈی - سی - ایکٹ ۱۹۵۰ء کی جدول میں پندرہ صنعتوں کا نام لیا گیا - اس کارپوریشن کا مقصد نجی سرمایہ کاری کی جگہ لینا نہیں تھا بلکہ

اس میں اضافہ کرنا تھا اور یہ ملکیت پر نہیں، ترقی پر زور دیتی تھی۔

جون ۱۹۶۲ء تک پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی پچپن صنعتی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکی تھی۔ اس کے بعد اسے تقسیم کر دیا گیا اور دونوں صوبوں میں علیحدہ علیحدہ کارپوریشنیں کام کرنے لگیں۔ مشرقی پاکستان کی کارپوریشن (EPIDC) صوبے کی عام صنعتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے، کیونکہ وہاں نجی سرمایہ کاری بہت محدود ہے۔ ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۷ء تک اس نے تیس صنعتوں میں ساڑھے تراسی کروڑ کا سرمایہ لگایا۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں چوالیس صنعتی منصوبے زیر تکمیل تھے، جن میں چٹاگانگ کے فولاد کے کارخانے میں توسیع، کیمیائی کھاد تیار کرنے کے چار کارخانوں اور مشینی پرزے بنانے کے ایک کارخانے کا قیام شامل تھا۔ علاوہ ازیں تیسرے منصوبے میں یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ پٹ سن کے پچیس کارخانے لگائے جائیں گے۔ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نوے کروڑ روپے کی لاگت سے انچاس منصوبے مکمل کر چکی ہے اور ایک ارب سے زیادہ کی مالیت کے انیس منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ تقریباً تین ارب روپے کے انتیس منصوبوں کی تجویز پیش کی جا چکی ہے۔ لانڈھی میں پرزے بنانے کا کارخانہ اور ٹیکسلا میں بھاری مشینیں تیار کرنے کا عظیم الشان کارخانہ تیزی سے مکمل ہو رہا ہے۔ مکمل منصوبوں میں سے انیس کو صنعتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ تیس کارخانے کارپوریشن چلا رہی ہے، جن میں پچیس ہزار سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں اور ان سے پینتیس کروڑ روپے کا مال سالانہ تیار ہوتا ہے۔ زیر تکمیل کارخانوں میں تقریباً چالیس کروڑ روپیہ کا مال تیار ہوگا۔ مغربی پاکستان کی وحدت ٹوٹ جانے کے بعد بھی ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی ایک خود اختیار ادارے کی حیثیت سے بدستور کام کرتی رہے گی اور اس کی انتظامیہ نئے صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے میں بھی صنعت و حرفت کی ترقی پر خاصا زور دیا گیا ہے اور توقع ہے کہ ملکی وسائل اور بیرونی امداد سے کئی ضروری منصوبے مکمل ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صدر پاکستان نے جون ۱۹۷۰ء میں روس کا دورہ کیا اور حکومت روس اس امر پر آمادہ ہو گئی ہے کہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے تحت کراچی میں فولاد کا کارخانہ قائم کرنے کے لیے بیس کروڑ ڈالر کا قرضہ دے گی۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کے لیے ملک میں بڑے ادارے یہ ہیں: صنعتی ترقیاتی بینک (IDBP)، صنعتی اعتباری و سرمایہ کاری کارپوریشن (PICIC)، چھوٹی صنعتوں کی کارپوریشن، مغربی پاکستان (West Pakistan Small Industries Corporation = WPSIC) اور چھوٹی صنعتوں کی کارپوریشن مشرقی پاکستان (East Pakistan Small Industries Corporation = EPSIC)۔

پی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی (قائم شدہ ۱۹۵۷ء) بڑی صنعتوں کو غیر ملکی کرنسی میں قرضے دیتی ہے۔ قرضے کی حد مشرقی پاکستان میں دس لاکھ اور مغربی پاکستان میں پندرہ لاکھ روپے تک ہے۔ ۱۹۶۸ء تک اس نے ۵۹۲ منصوبوں کے لیے ایک ارب ۳۷ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے کے قرضے جاری کیے؛ تیرہ منصوبوں کے لیے تقریباً اٹھائیس کروڑ روپے کے غیر ملکی سرمائے کا بندوبست کیا؛ اشتراک کی بنیاد پر بائیس منصوبے مکمل ہوئے، جن میں ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا غیر ملکی نجی سرمایہ لگایا گیا؛ علاوہ ازیں اس نے مختلف صورتوں میں

۸ کروڑ روپے سے اعانت کی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء تک اس نے ایک ارب ۸۲ کروڑ ۳۶ لاکھ روپیہ دیا۔

آئی۔ ڈی۔ بی۔ پی (قائم شدہ ۱۹۶۱ء) درمیانے درجے کی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے لمبی اور درمیانی مدت کے لیے قرضے مہیا کرتی ہے۔ قرضے کی حد پچیس لاکھ روپے تک ہے۔ زر مبادلہ کی حد حال ہی میں پندرہ سے بڑھا کر بیس لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء تک اس بینک سے ایک ارب ۵۰ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کے قرضے جاری ہوئے (مشرقی پاکستان کے لیے ۱۷ کروڑ ۱۳ لاکھ)۔ ان میں سے ایک ارب ۱۷ کروڑ کے قرضے غیر ملکی کرنسی میں تھے۔

ڈبلیو۔ پی۔ ایس۔ آئی۔ سی (قائم شدہ ۱۹۶۵ء) اور ای۔ پی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ (قائم شدہ ۱۹۵۷ء) نجی شعبے میں چھوٹی صنعتوں کی مالی اعانت کرتی ہیں۔

۱۹۶۲ء میں قومی سرمایہ‌کاری ٹرسٹ (NIT = National Investment Trust) اور ۱۹۶۶ء میں ادارۂ سرمایہ‌کاری، پاکستان (The Investment Corporation of Pakistan = ICP) کے قیام سے عوام کو اپنی بچت کا روپیہ قومی صنعت میں لگانے کا موقع مل گیا ہے۔

محکمۂ ترقی سرمایہ کاری (Investment Promotion Department) مرکزی وزارت صنعت سے ملحق ہے۔ یہ لوگوں کو صنعتی سرمایہ‌کاری کے سلسلے مستند معلومات اور مفید مشورے بہم پہنچاتا ہے اور نئی صنعتوں کے قیام، ان کے لیے حکومت کی منظوری اور غیر ملکی سرمائے کی فراہمی، اراضی، حمل و نقل اور پانی اور بجلی کی سہولتوں، نیز خام مواد، فنی امداد اور درآمدی لائسنسوں، کے حصول میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ محکمہ صنعت کاروں کی رہنمائی کے لیے صنعتوں اور ملکی و غیر ملکی سرمایہ‌کاری کے گوشوارے بھی تیار کرتا ہے۔ اس کے ایک جامع گوشوارے میں دو سو صنعتوں کی فہرست دی گئی ہے، جن پر تیسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے تخمیناً ۱۰ ارب ۸۸ کروڑ پچاس لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا گیا۔

دوسرے قابل ذکر ادارے حسب ذیل ہیں: سرمایہ کاری مشاورتی مرکز (Investment Advisory Centre of Pakistan)، پاکستان سائنسی و صنعتی تحقیقاتی کونسل (Pakistan Council of Scientific and Industrial Research)، مرکزی آزمائشی تجربہ گاہیں (Central Testing Laboratories)، پیٹنٹ آفس Patent Office، صنعتی تکنیکی امداد کا مرکز (PITAC = Pakistan Technical Assistance Centre)، سویڈش۔ پاکستانی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی Swedish - Pakistan Institute of Technology.

صنعتی پیداوار: پاکستان میں صنعت و حرفت نے گزشتہ چند برس میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہ بالکل ابتدائی حالت میں تھی، لیکن اس نے پہلے پندرہ برس میں قومی پیداوار میں ساڑھے گیارہ فی صد کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۹ء کے بعد اس کی ترقی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے اور قومی پیداوار میں ساٹھ فی صد سے زائد اضافہ ہوا ہے اور ملک متعدد اشیائے صرف اور اشیائے سرمایہ میں خودکفیل ہو گیا ہے۔

پاکستان کی اس ترقی کا سرسری جائزہ لینے کے لیے اس کی موجودہ بڑی بڑی صنعتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سوتی کپڑے کی صنعت: یہ پاکستان کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کا تیس فی‌صد اس سے حاصل ہوتا ہے۔ دو لاکھ افراد کا روزگار اس سے وابستہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے بھاری مقدار میں زر مبادلہ بھی کمایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۴-

۱۹۶۵ء میں کھڈیوں کی تعداد پینتیس ہزار اور تکلوں کی ۲۵ لاکھ ۶۰ ہزار تھی ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک ان میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا (۷۰ ہزار کھڈیاں اور ۴۰ لاکھ تکلے) ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں پچاس کروڑ پونڈ دھاگا تیار ہوا ۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں اس کی مقدار تقریباً پچپن کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی اور ۲۸ کروڑ ۲۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کا کپڑا اور دھاگا برآمد ہوا۔

پٹ سن کی صنعت : پٹ سن ایک نہایت ہی کارآمد چیز ہے اور اپنی مضبوطی اور گوناگوں فوائد کے باوجود ارزاں ترین اشیا میں سے ہے ۔ اس کا بدل پیدا کرنے کی کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی اور دنیا میں اس کی مانگ بدستور بڑھ رہی ہے ۔ پاکستان اگرچہ دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا کرنے والا ملک ہے، لیکن آزادی کے وقت ملک میں ایک کارخانہ بھی نہ تھا؛ تاہم اب مشرقی پاکستان میں پٹ سن کے بائیس کارخانے ہیں اور مزید گیارہ زیر تعمیر ہیں ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک کھڈیوں کی کل تعداد ۲۴۶۱۹ ہو جائے گی، جن سے آٹھ لاکھ ٹن مال تیار ہوگا یہ پاکستان کی اہم ترین برآمد ہے ۔ ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں ۶۳ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کی برآمد ہوئی۔

جنگلات سے متعلق صنعتیں : جہاں تک جنگلات کا تعلق ہے، ملک کے وسائل، خصوصاً مغربی پاکستان میں محدود ہیں، لیکن جو وسائل بھی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے؛ چنانچہ عمارتی لکڑی کے رتیاؤ (seasoning) اور تحفظ، نیز آرہ کشی کی مشینیں، پلائی وڈ، گتہ اور کاغذ سازی کی صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ اس وقت اٹھاون ہزار ٹن لکڑی تیار کرنے (processing)، پندرہ لاکھ مربع فٹ پلائی وڈ اور چائے کی سات لاکھ پیٹیاں بنانے کا انتظام ہے۔ مغربی پاکستان میں حویلیاں کے مقام پر پندرہ لاکھ مکعب فٹ اور پیرانوالہ میں چالیس ہزار مکعب فٹ شیشم کی لکڑی کا رتیاؤ اور تیاری کا اہتمام ہوتا ہے ۔ کاک سازی کی صنعت کا بھی آغاز ہوچکا ہے اور بید اور بانس پر منحصر صنعتوں کو بھی ترقی دی جا رہی ہے ۔ ۱۹۴۴ء میں بر صغیر میں ایک لاکھ ٹن کاغذ مشین سے تیار کیا جاتا ہے، لیکن آزادی کے وقت پاکستانی علاقے (جہلم اور سیالکوٹ) میں کاغذ فقط ہاتھ سے تیار ہوتا تھا ۔ سات برس کے اندر ملک نے مشین سے کاغذ بنانا شروع کر دیا اور ۱۹۴۷ء کے صفر کے مقابلے میں موجودہ کاغذ سازی کی صلاحیت ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء تک ایک لاکھ تین ہزار ٹن سالانہ تک ترقی کرچکی تھی، جو امید ہے تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام پر تین لاکھ ٹن ہو جائے گی ۔ کاغذ اب ملیشیا، ھانگ کانگ، ویتنام، سنگاپور، سیلون، برما، تھائی لینڈ اور بعض دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے، جس سے ۱۹۶۵ء میں پچھتر لاکھ روپے کا زر مبادلہ حاصل ہوا تھا ۔ ملک میں کاغذ سازی کے مندرجۂ ذیل کارخانے ہیں : کرنافلی پیپر مل، جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی، مختلف قسم کا کاغذ تینتیس ہزار ٹن سالانہ پیدا کرتی ہے ۔ ۱۹۵۹ء میں کھلنا میں اخباری کاغذ کا کارخانہ قائم ہوا ۔ اس میں گتہ سازی کی کلیں بھی لگائی گئی ہیں ۔ اس کی پیداواری صلاحیت پچپن ہزار ٹن تک بڑھا دی گئی ہے ۔ نارتھ بنگال پیپر ملز، جو ساڑھے سولہ ہزار ٹن اعلٰی قسم کا کاغذ تیار کرے گی ۔ مغربی پاکستان میں نوشہرہ کے مقام پر اعلٰی درجے کا گتہ بنانے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے اور اس کی پیداواری صلاحیت ساڑھے سات ہزار ٹن سالانہ ہے ۔ راهوالی (ضلع گوجرانوالہ) کے کارخانے میں یومیہ تیس ٹن گتہ اور کاغذ تیار کرنے کی صلاحیت ہے ۔ حال ہی

میں لاہور میں بھی اعلیٰ قسم کا کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔

سیمنٹ: سیمنٹ ان صنعتوں میں سے ہے جن کا خام مواد پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی پیداوار تین لاکھ ٹن سالانہ تھی۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں ملک میں سیمنٹ کے نو کارخانے تھے، جن کی سالانہ پیداوار چوبیس لاکھ ٹن تھی۔ حیدرآباد کی زیل پاک فیکٹری کی مزید دو بھٹیاں چلنے کے بعد اس کی پیداوار ۱۹۷۰ء میں ۴ لاکھ ۸۰ ہزار سے بڑھ کر ۱۰ لاکھ ۸۰ ہزار تک پہنچ رہی ہے۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں داؤد خیل کی سفید سیمنٹ کی فیکٹری قائم ہوئی اور پندرہ ہزار ٹن سالانہ سیمنٹ تیار ہونے لگا۔ روہڑی اور واہ کے کارخانوں میں توسیع کے بعد یہاں کی پیداوار علی الترتیب ۳ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن اور ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تک پہنچ گئی ہے۔ چٹاگانگ کی کھنگور (clink) پیسنے کی فیکٹری کی پیداواری صلاحیت تین لاکھ ٹن اور آسام بنگال سیمنٹ فیکٹری کی ڈھائی لاکھ ٹن ہے۔

چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات: پاکستان میں کھالوں کی سالانہ پیداوار تخمیناً ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ہے، جن کی قیمت ساڑھے تیرہ کروڑ روپے ہوتی ہے۔ ان میں سے تقریباً ساٹھ لاکھ کھالوں کی پاکستان میں دباغت کی جاتی ہے اور بقیہ کھالوں کو خام مال کے طور پر برآمد کیا جاتا ہے اور اس سے زر مبادلہ کی اچھی خاصی رقم حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت دباغت کے چھوٹے بڑے اسّی سے زائد کارخانے ہیں اور گھریلو کارخانے تو ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ جوتوں کا بالائی چمڑا پیدا کرنے کی صلاحیت چار کروڑ مربع فٹ اور تلے کا چمڑا پیدا کرنے کی صلاحیت تین کروڑ مربع فٹ ہے۔ اس سے ملک کی مانگ پوری ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات برآمد کی گئی تھیں۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک برآمدی چمڑے کی مالیت چھے کروڑ روپے ہو جائے گی۔

کیمیائی اشیا اور ادویات: کالا شاہ کاکو (پنجاب) اور چندرگونا (مشرقی پاکستان) میں کیمیائی اشیا تیار کرنے کے عظیم الشان کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ اول الذکر میں کیڑے مارنے کی دوائیں، کاسٹک سوڈا، ریان کا تاگا، اور بنولے کا تیل اور آخرالذکر میں ریان کا تاگا اور سامان باندھنے کا شفاف کاغذ تیار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک ایک لاکھ ۷۲ ہزار ٹن سجّی اور نوے ہزار ٹن سوڈا کاسٹک تیار ہونے کی امید ہے۔

۱۹۶۰ء تک تقریباً ساٹھ لاکھ روپے سالانہ کی ادویات درآمد کی جاتی تھیں اور ملک میں پنسلین تیار کرنے کے کارخانے سے قطع نظر دوا سازی کی صنعت کا فقدان تھا؛ لیکن اب دوا سازی کی صنعت کو فروغ دیا جا رہا ہے اور مختلف کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ ملیریا کش دوائیاں تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ایک برطانوی فرم کی شراکت میں قائم کیا جا رہا ہے۔ ڈھاکے میں سٹرپٹومائی سین کی فیکٹری کی سالانہ پیداواری صلاحیت بیس ٹن ہے۔ چٹاگانگ میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی دو فیکٹریاں کام کر رہی ہیں۔ کراچی دواسازی کی صنعت کا مرکز بن رہا ہے اور یہاں مزید کارخانے قائم کرنے کا منصوبہ زیر تکمیل ہے۔

کیمیائی کھاد: پاکستان ان ممالک میں سے ہے جہاں پیداوار فی ایکڑ سب سے کم ہے، اس لیے اسے کیمیائی کھاد کی بہت زیادہ ضرورت ہے؛ چنانچہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے کیمیائی کھاد کے دو کارخانے قائم کیے: ایک داؤد خیل میں اور دوسرا لائل پور میں؛

ان کے علاوہ گھورا شال (Ghorashal ؟)، چٹاگانگ، فنچوگنج، ملتان، داھرکی Daharki، اور کراچی کے کارخانوں میں بھی مختلف قسم کی لاکھوں ٹن کھادیں تیار ہو رہی ھیں ۔ امید ہے چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ملک اس شعبے میں خود کفیل ہو جائے گا.

ٹیلی ویژن سیٹ : ٹیلی ویژن سیٹ کے پرزے تیار کرنے اور جوڑنے کے لیے ملک کے دونوں حصوں میں نو فیکٹریاں قائم ھو رھی ھیں، جو شروع میں ۳۰ فی صد اجزا تیار کریں گی اور تین سال کے اندر اندر ۷۰ فی صد اجزا تیار ہونے لگیں گے.

شکر : آزادی کے وقت پاکستان میں شکر سازی کے کل سات کارخانے تھے، جن میں سے دو مغربی پاکستان میں اور پانچ مشرقی پاکستان میں تھے ۔ ان میں ساڑھے سات کروڑ کی آبادی کے لیے صرف تیس ہزار ٹن چینی تیار ہوتی تھی، لہٰذا اسے بھاری مقدار میں درآمد کیا جاتا تھا ۔ پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی نے شروع میں شکر سازی کے پانچ کارخانے قائم کیے : جوھر آباد اور چار سدہ شوگر ملز مغربی پاکستان میں اور رنگپور، ٹھاکر گاؤں اور زیل ۔ پاک شوگر ملز مشرقی پاکستان میں ۔ ۱۹۷۰ء میں شکر کے کارخانوں کی تعداد تینتیس ہو چکی ہے ۔ مشرقی پاکستان میں نو مزید کارخانے لگائے جا رہے ھیں ۔ مغربی پاکستان میں ایک کارخانہ بنوں اور دوسرا چشتیاں میں زیر تکمیل ہے مشرقی پاکستان میں ایک لاکھ ۸۷ ہزار ٹن اور مغربی پاکستان میں ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ٹن، یعنی مجموعی طور پر ۵ لاکھ ۸۲ ہزار ٹن شکر تیار ہو رہی ہے.

پھل اور سبزیوں کے ذخائر کو محفوظ رکھنے کی صنعت : اس وقت دو سو سے زائد کارخانے زیادہ تر چھوٹے پیمانے پر کام کر رہے ھیں، جن میں مجموعی طور پر ۱۰۲۹۸ ٹن ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ۔ امید ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ان کی برآمد سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ چالیس لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ روپے ہو جائے گا .

مچھلیوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت : یہ ایک فروغ پذیر صنعت ہے ۔ مچھلی کی برآمدات سے ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں آٹھ کروڑ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوا تھا ۔ مچھلی کا تیل بھی اب تجارتی پیمانے پر تیار ہو رہا ہے ۔ اس صنعت کو مزید ترقی دینے کے لیے چٹاگانگ کے علاوہ کراچی اور گوادر میں ماھی گیری کی بندرگاھیں بنائی جا رھی ھیں .

(ج) تمباکو : سگرٹ سازی میں ملک خود کفیل ہو چکا ہے ۔ ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء میں تقریباً بیس ارب سگرٹ تیار ہوتے تھے ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں یہ تعداد دگنی ہو جائے گی.

(ہ) آلات جرّاحی و دیگر سامان : آلات جرّاحی اور مصنوعی اعضا تیار کرنے کا مرکز سیالکوٹ (پنجاب) ہے، جہاں اس کی تنظیم گھریلو دستکاری کے طور پر کی گئی ہے ۔ ۱۹۶۳ - ۱۹۶۴ء میں ایک کروڑ روپے کا سامان تیار ہوا اور اس سے پچیس لاکھ روپے کا زرمبادلہ کمایا گیا ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں اس صنعت کو مزید فروغ ہوا ۔ اب چار کروڑ روپے کا سامان تیار ہوتا ہے اور زر مبادلہ کی رقم ڈھائی کروڑ روپے ہو گئی ہے .

کھیلوں کا سامان: اس صنعت کا مرکز بھی سیالکوٹ ہے اور ہزاروں لوگوں کے روزگار کا سبب ہے ۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں برآمدات کی مالیت تقریباً دو کروڑ روپے تھی، جو ۱۹۷۰ء کے آخر تک تین کروڑ روپے ہو جائے گی .

جہاز سازی اور انجینئری کی صنعت : یہ بڑی اہم صنعت خیال کی جاتی ہے اور دیگر فوائد کے علاوہ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان

مؤثر رسل و رسائل کا سلسلہ قائم رکھنے میں بڑی مفید ثابت ہو رہی ہے ۔ یہ صنعت پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی کے تحت بڑی ترقی کر رہی ہے ۔ کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینئرنگ ورکس (KSEW) حکومت کے عظیم ترین منصوبوں میں سے ایک ہے، جس میں تیرہ ہزار ٹن تک کے جہاز بن سکتے ہیں ۔ یہاں سے ۱۲۸۶۰ ٹن کا جہاز ''العباس'' تیار ہوا ہے ۔ جاپان سے قطع نظر کسی ایشیائی ملک نے اتنا بڑا جہاز ابھی تک نہیں بنایا ۔ ۱۹۶۳ء تک اس کارخانے میں کئی قسم کے چھوٹے چھوٹے بہتّر جہاز بن چکے تھے ۔ یہاں کراچی کی بندرگاہ میں آنے والے ہر قسم کے جہاز کی مرمت کی جا سکتی ہے ۔ علاوہ ازیں جیپور ہاٹ شوگر ملز کے لیے تقریباً پچیس فیصد مشینری اس کارخانے میں تیار ہوتی ہے، نیز پاکستان کے شکر کے تقریباً تمام کارخانوں کے لیے مختلف قسم کے آلات اور پرزے مہیا کیے جاتے ہیں اور اس سے معتدبہ زر مبادلہ کی بچت ہوتی ہے ۔

مشرقی پاکستان میں بھی جہازسازی اور جہازوں کی مرمت اور دیگر سہولتوں کے لیے اس وقت نرائن گنج، کھلنا اور چٹاگانگ میں تین کارخانے کام کر رہے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: نرائن گنج ڈیک یارڈ، کھلنا شپ یارڈ اور چٹاگانگ ڈرائی ڈیک (خشک گودی) .

بھاری صنعتیں: چٹاگانگ (مشرقی پاکستان) میں لوہے اور فولاد کا کارخانہ ستائیس کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے اور ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا کارخانہ ہے ۔ ۱۹۶۷ء میں اسے آزمائشی طور پر چلایا گیا تھا ۔ اس کی صلاحیت پیداوار ڈیڑھ لاکھ ٹن فولادی ڈلے سالانہ ہے ۔ اور اس میں توسیع کے بعد ۱۹۷۰ء تک ڈھائی لاکھ ٹن تک فولادی ڈلے تیار ہونے لگیں گے .

مغربی پاکستان میں بھی کالاباغ (ضلع میانوالی، پنجاب) کے مقام پر ڈبلیو ۔ پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی نے مقامی لوہے سے دس لاکھ ٹن سالانہ فولاد تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے ۔ حال ہی میں روس نے اس کے لیے مالی اعانت دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے ۔ کراچی کا مجوزہ کارخانۂ فولاد بھی چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں مکمل ہو جائے گا، جس میں درآمد شدہ لوہے سے ۴ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن سالانہ فولاد تیار ہو سکے گا ۔ ڈھاکے میں مشینیں بنانے کی ایک فیکٹری زیر تکمیل ہے ۔ اس کی پیداوار تقریباً بارہ ہزار ٹن سالانہ ہو گی ۔ ۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ء میں بجلی کے تار بنانے کا ایک کارخانہ چٹاگانگ میں مکمل ہوا ۔ اس کی پیداواری صلاحیت چھے ہزار ٹن سالانہ ہے ۔ یہاں حکومت روس کے اشتراک سے بجلی کا سامان تیار کرنے کا بھاری کارخانہ لگانے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے ۔ مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن موجودہ منصوبے کے دوران میں مشرقی پاکستان میں پٹسن کی ملوں کے لیے مشینیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہی ہے ۔ دسمبر ۱۹۶۸ء سے لانڈھی (کراچی) میں مشینیں بنانے کے کارخانے نے جزوی طور پر اپنا کام شروع کر دیا ہے ۔ چین کی امداد سے بھاری مشینیں تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ٹیکسلا میں قائم کیا جا رہا ہے، جس پر بارہ کروڑ روپے سے زائد لاگت آئے گی ۔ اسی طرح ٹیکسلا ہی میں حکومت روس کی اعانت سے بجلی کی بھاری مشینیں تیار کرنے کا بھی ایک کارخانہ قائم کیا جائے گا، جس پر تقریباً دس کروڑ روپے لاگت آئے گی ۔ ان کے علاوہ مشینیں اور پرزے بنانے کا ایک کارخانہ اور ایک ڈیزل انجن بنانے کا کارخانہ بھی لگایا جا رہا ہے .

چھوٹی اور گھریلو صنعتیں: چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے حکومت نے وزارت کے تحت ایک نظامت قائم کی ہے اور انہیں

مالی امداد دینے کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقیاتی کارپوریشن کی شاخوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔

گھریلو دستکاریاں شہری بھی ہو سکتی ہیں اور دیہی بھی۔ دیہی گھریلو دستکاریوں میں یہ شامل ہیں: مرغیاں، شہد کی مکھیاں اور ریشم کے کیڑے پالنا پارچہ‌بافی، قالین‌بافی، گڑ بنانا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً تین کروڑ زراعت‌پیشہ افراد ان صنعتوں میں مصروف ہیں۔ شہروں میں اہم گھریلو صنعتیں یہ ہیں: دستکاریاں، مثلاً ہاتھی دانت کا کام، بید کا کام، طلائی و نقرئی زیورات بنانا اور سوزن کاری، دباغت، چمڑے کا ساز و سامان، جفت سازی، قالین‌بافی، مزامیر سازی، کھیلوں کا سامان بنانا، پلاسٹک کا سامان بنانا، کوزہ گری، کانچ کی چوڑیاں بنانا وغیرہ۔ دستی کھڈی سے کپڑا بننا اہم ترین گھریلو صنعت ہے، جس میں تقریباً چار لاکھ اشخاص کام کرتے ہیں۔ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے کاموں کے لیے حکومت نے تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۴۶ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے وقف کیے ہیں۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء میں مشرقی پاکستان میں پینتالیس اور مغربی پاکستان میں سینتالیس منصوبے زیر تکمیل تھے۔

مٹی کا تیل صاف کرنا: کراچی میں تیل صاف کرنے کے کارخانے کی صلاحیت پچیس لاکھ ٹن سالانہ تک اور نیشنل آئل کی ۱۷ لاکھ سے ۸۰ لاکھ ٹن تک بڑھائی جاچکی ہے۔ چاٹگانگ کی Eastern Refinery میں پندرہ لاکھ ٹن سالانہ تیل صاف کیا جا رہا ہے۔

بناسپتی گھی: قیام پاکستان کے وقت صرف دو کارخانے تھے جن میں نو ہزار ٹن بناسپتی گھی تیار ہوتا تھا اور ۱۹۶۰ء میں دس کارخانوں سے پینتیس ہزار ٹن سالانہ۔ اس وقت مشرقی پاکستان کی پیداوار ساڑھے اٹھائیس ہزار ٹن اور مغربی پاکستان کی ایک لاکھ ۶۳ ہزار ٹن ہے۔

صنعتی پیداوار کے مکمل گوشوارے کے لیے دیکھیے Pakistan Year Book 1969، ص ۲۲۶، ۲۲۷

۹ - سوختنیات و معدنیات

برصغیر کی تقسیم کے وقت عمدہ کوئلا، خام لوہا، باکسائیٹ اور دوسری فلزاتی معدنیات بھارت کے حصے میں آئیں۔ پاکستان کے معدنی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی معدنیات کی کیفیت یہ تھی: خام تیل: ایک کروڑ ۷۰ لاکھ گیلن؛ پٹرولیم: ایک کروڑ ۱۰ لاکھ گیلن؛ کوئلا: ۲ لاکھ ۱۴ ہزار ٹن؛ نمک: ۳ لاکھ ۱۸ ہزار ٹن؛ کرومائیٹ: ۱۸ ہزار ٹن؛ چونے کا پتھر: ۳ لاکھ ۴۷ ہزار ٹن؛ جپسم: ۱۰ ہزار ٹن۔

سوختنیات و معدنیات کی یہ مقدار ملکی ضروریات کے لیے ناکافی تھی، اس لیے پاکستان کو ان کی درآمد پر بہت سرمایہ صرف کرنا پڑا ہے۔ گزشتہ آٹھ دس برس میں معدنیات کی تلاش اور پیداوار کی ترقی کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کا خاطر خواہ نتیجہ نکل رہا ہے، چنانچہ جہاں ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں معدنی پیداوار کی کل مالیت ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے تھی وہاں ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں ساڑھے چودہ کروڑ ہو گئی۔ سوختنیات و معدنیات کو ترقی دینے کے لیے مختلف تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ مرکزی حکومت کا شعبۂ قومی وسائل (Natural Resources Division) متعلقہ پالیسی طے کرتا ہے۔ اس کے ماتحت ارضیاتی سروے کی نظامت اعلٰی (Directorate General of Geological Survey) اور تیل و گیس کی ترقیاتی کارپوریشن (Oil & Gas Development Corporation = OGDC) کام کر رہی ہیں۔ تیل کے سوا تمام سوختنیات و معدنیات کی ترقیات صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے۔ صوبائی نظامتیں (The Directorates of Mineral

(Development) کا تعلق نجی شعبے سے ہے ۔ سرکاری شعبے میں معدنیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی صوبائی شاخیں (WPIDC و EPIDC) انجام دیتی ہیں ۔ حکومت کی پالیسی ہے کہ نجی شعبے کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے ۔

معدنیات کی تلاش اور ان کے نکالنے کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ ملک میں فنی ماہرین کی خدمات میسر ہوں ۔ ۱۹۴۷ء میں ماہرینِ ارضیات صرف پانچ تھے، لیکن اب ارضیاتی سروے کی کارپوریشن میں تقریباً چار سو ماہرین کام کر رہے ہیں ۔ مرکزی حکومت کوئٹے میں ایک کالج (College of Mineral Technology) قائم کر رہی ہے، جس میں ارضیات اور کان کنی کے مختلف شعبوں کی تعلیم و تربیت دی جائے گی ۔ مغربی پاکستان انجینئرنگ یونیورسٹی میں کان کنی کا ایک چار سالہ نصاب جاری ہو چکا ہے ۔ او ۔ جی ۔ ڈی ۔ سی ۔ (OGDC) کے زیر اہتمام جولائی ۱۹۶۳ء سے پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ نے کافی ترقی کی ہے ۔ کوئٹہ اور جمال گنج (مشرقی پاکستان) میں کاریگروں اور نگرانوں کو تربیت دینے کے لیے ادارے قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے ۔

تیل : ۱۹۶۷ء میں تیل کی پیداوار ساڑھے چار لاکھ ٹن تھی، جس سے ملک کی بارہ فی صد ضروریات پوری ہو سکتی تھیں ۔ پاکستان میں تیل کا پہلا کنواں ۱۸۶۶ء میں کنڈل (پنجاب) کے مقام پر کھودا گیا اور ۱۹۱۵ء میں علاقۂ پوٹھوہار میں تیل کا علاقہ (Oil field) دریافت ہوا ۔ ۱۹۳۵ء میں ڈھلیاں، ۱۹۴۴ء میں جویا اور ۱۹۴۶ء میں بالکسر کے مقامات پر مزید علاقے دریافت ہوئے ۔ آزادی کے بعد بھی تیل کی تلاش جاری رہی ۔ ۱۹۴۹ء میں چکوال کے مقام پر کامیابی ہوئی ۔ اسی سال مرکزی حکومت نے اس شعبے کو اپنی نگرانی میں لے لیا ۔ اس سلسلے میں دو غیر ملکی اداروں، اٹک آئل کمپنی اور پاکستان آئل فیلڈز سے معاہدات ہوئے ۔ ۱۹۵۰ء میں برما آئل کمپنی کے اشتراک سے پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ (PPL) کا قیام عمل میں آیا ۔ اسی کمپنی نے ۱۹۵۲ء میں سوئی کے مقام پر گیس دریافت کی ۔ اس وقت مذکورۂ بالا کمپنیوں کے علاوہ کئی اور کمپنیاں بھی غیر ملکی ماہرین کی اعانت سے تیل کی تلاش میں مصروف ہیں، مثلاً ۱۹۵۴ء سے Pak. Stanvac، ۱۹۵۵ء سے Pak. Hunt، ۱۹۵۷ء سے Pak Sun Oil اور ۱۹۵۸ء سے Pak. Tidewater ۔ ان کوششوں کا نتیجہ تیل کے تیرہ کنووں کی دریافت کی صورت میں نکلا ہے ۔ ۱۹۶۱ء میں مساعی کو تیزتر کرنے کے لیے تیل و گیس کی ترقیاتی کارپوریشن (OGDC) قائم ہوئی، جس کے لیے حکومت روس نے ماہرین مہیا کیے ۔ اس نے ساری (مغربی پاکستان) اور جلدی (مشرقی پاکستان) میں تیل کے علاقے دریافت کیے اور علاقۂ پوٹھوہار میں کوٹ سارنگ اور ٹٹ کے مقامات سے تیل برآمد کیا ۔ پاکستان شیل آئل کمپنی خلیج بنگال کا جائزہ لے رہی ہے اور وہاں تیل کی برآمدگی کے امکانات خاصے روشن ہیں ۔

اٹک آئل کمپنی (راولپنڈی) کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ گزشتہ پینتالیس سال سے کام کر رہا ہے ۔ اس کی پیداواری صلاحیت پانچ لاکھ ٹن سالانہ ہے ۔ دوسرا کارخانہ The Pakistan Refinery ۱۹۶۲ء میں کراچی میں قائم ہوا ۔ ۱۹۶۴ء میں اس کی پیداوار چوبیس لاکھ ٹن تھی ۔ کراچی ہی میں ایک اور کارخانہ The National Refinery ۱۹۶۶ء میں قائم ہوا، جس کی صلاحیت ۱۹۷۱ء تک سترہ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی ۔ تیل صاف

کرنے کا چوتھا کارخانہ چٹاگانگ میں ۱۹۶۸ء سے کام کر رہا ہے اور اس کی پیداوار پندرہ لاکھ ٹن کے قریب ہے۔

ملک میں چالیس لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ تیل کی کھپت ہوتی ہے، لہٰذا اسے کافی مقدار میں درآمد کرنا پڑتا ہے۔

قدرتی گیس: مغربی پاکستان میں سات اور مشرقی پاکستان میں چھے ذخائر دریافت ہو چکے ہیں، جن میں موجود گیس کی مجموعی مقدار دو ہزار ارب کیوبک فٹ ہے۔ اس وقت تقریباً بیاسی ارب کیوبک فٹ گیس سالانہ نکالی جارہی ہے اور خیال ہے کہ یہ ذخائر ایک صدی تک ملکی ضروریات کے لیے کافی ثابت ہوں گے۔ گیس ملک کے مختلف حصوں میں پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کا ۴۷ فی صد کیمیائی کھاد کی تیاری میں بطور خام مواد استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ۹۸ فی صد گیس صنعتی اور ۲ فی صد گھریلو ضروریات میں استعمال ہو رہی تھی۔

کوئلا: کوئلا پاکستان کی اہم ترین معدنیات میں سے ہے، لیکن اس کی پیداوار ملکی ضروریات کے لیے کافی نہیں اور جو کوئلا نکلتا ہے وہ اعلٰی درجے کا نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۷ء میں کوئلے کی پیداوار پندرہ لاکھ ٹن کے قریب تھی اور ساڑھے چار کروڑ روپے کا کوئلا درآمد کیا گیا تھا۔ امید ہے ۱۹۷۵ء تک اڑتالیس لاکھ ٹن کوئلا نکلنے لگے گا۔ پاکستان میں کوئلے کے ذخائر مندرجۂ ذیل علاقوں میں ہیں: کوہستان نمک اور مکڑوال (پنجاب)، علاقۂ خوست۔ شارغ۔ ہرنائی اور مچ (بلوچستان)، لکھڑا اور جھم پیر (سندھ) اور علاقۂ راجشاھی۔ بوگرا، سلہٹ اور کھلنا (مشرقی پاکستان) میں دلدلی کوئلا پایا جاتا ہے۔

خام لوھا: اندازہ لگایا گیا ہے کہ پاکستان میں چالیس لاکھ ٹن سے زیادہ خام لوہے کے ذخائر ھیں۔ ان میں فلزاتی لوھا ۳۰ فی صد کے قریب ہے۔ سب سے بڑا ذخیرہ (تیس لاکھ ٹن) کالاباغ اور مکڑ وال کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ ہزارہ اور چترال میں بھی ذخائر دریافت ہوے ھیں اور چاغی (بلوچستان) کے قریب بھی عمدہ قسم کا لوھا ملا ہے۔ کالا باغ میں لوھا نکالنے اور کارخانہ لگانے کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کیا گیا ہے، جس پر ایک ارب ۴۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ چٹاگانگ میں فولاد کا کارخانہ کام کر رہا ہے اور کراچی میں جلد ھی قائم ہونے والا ہے۔

نمک: مغربی پاکستان میں نہایت اعلٰی درجے کے نمک کے ذخائر پائے جاتے ھیں اور سمندر کے پانی سے بھی نمک تیار کیا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں صرف سمندر کے پانی سے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ۲ لاکھ ۶۶ ہزار ٹن معدنی نمک اور بیس ہزار ٹن سے زیادہ سمندری نمک پیدا ہوا۔ مغربی پاکستان میں نمک کی چھے کانیں ھیں، جن میں سب سے بڑی کان کھیوڑا (ضلع جہلم) میں واقع ہے۔

تقریباً ڈھائی کروڑ پیپے نمکاب (Brine) کا ایک بڑا ذخیرہ ضلع جہلم میں دھریالہ کے مقام پر دریافت ہوا ہے۔ اس میں پوٹاشیم، سوڈیم، میگنیشیم اور کیلشیم کے قیمتی نمکیات پائے جاتے ھیں، جنھیں برآمد کیا جا سکتا ہے۔

جپسم: یہ بھی پاکستان کی ایک قیمتی معدنی پیداوار ہے۔ اس کے ذخائر مغربی پاکستان کے مختلف خطوں، مثلاً شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں، کوہستان نمک (پنجاب) اور لورالائی (بلوچستان) میں پائے جاتے ھیں۔ اس کی خاصی مقدار برآمد کی جاتی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی آخری ششماھی میں اکسٹھ ہزار

ٹن جپسم نکالی گئی تھی۔

کرومائٹ: هندوباغ، زوب اور خاران (بلوچستان) کے علاوہ وزیرستان کے علاقے میں پائی جاتی ہے اور اس سے کافی زر مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کی دوسری ششماهی میں اس کی پیداوار انیس هزار ٹن تھی۔

سنگ مرمر: پشاور، کوئٹه اور قلات ڈویژنوں میں مختلف اقسام اور رنگوں کے سنگ مرمر کے بڑے ذخیرے دریافت ہوے ہیں۔ حیدرآباد ڈویژن کے ضلع دادو میں بھی کچھ ذخیرے دریافت ہوے ہیں۔ اسے نکالنے اور صاف کرنے کے لیے جدیدترین طریقوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ سنگ مرمر اٹلی سے درآمد بھی کیا جاتا ہے۔

چونے کا پتھر: مغربی پاکستان میں عمدہ قسم کے چونے کے پتھر کے کبھی نہ ختم ہونے والے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں دو کروڑ ٹن کا ایک ذخیرہ مشرقی پاکستان میں دریافت ہوا ہے، جس کا استعمال سیمنٹ کے علاوہ سجّی، شکر، کاغذ اور فولاد کی صنعتوں میں ہو سکتا ہے۔

چکنی مٹی: مشرقی پاکستان میں سفید چکنی مٹی کے ذخائر کا اندازہ دو لاکھ ٹن لگایا گیا ہے۔ مغربی پاکستان کی جنوب مشرقی سرحد کے قریب تین لاکھ ٹن چینی مٹی کے ذخیرے دریافت ہوے ہیں۔ سوات میں شاہ دھری کے قریب عمدہ قسم کی چینی مٹی کے ذخیروں کے آثار ملے ہیں اور وهاں مزید جستجو جاری ہے۔

شیشه ریت (Glass Sand): فنچو گنج کے جنوب مغرب میں بھٹرہ پہاڑی کے دامن میں شیشه ریت کے عدسی ذخیروں کا انکشاف ہوا ہے۔ ضلع چٹاگانگ میں مرزا پور کے گاؤں میں عمدہ قسم کی سلیکا ریت (Silica Sand) کا ایک ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔ مغربی پاکستان میں زیارت کے قریب کچھ کے مقام پر شیشه ریت پائی جاتی ہے۔ جنگشاهی ـ ٹھٹھه سڑک پر تقریباً پچیس هزار ٹن شیشه ریت دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذخیرے دادو اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ضلع هزارہ میں منڈا کچھا کے مقام پر ایک ذخیرے کا پتا چلا ہے۔

تابکاری ریت (Radio-Active Sand): چٹاگانگ سے برما کی سرحد تک پھیلے ہوے ساحل اور اس کے قریبی جزائر میں پائی جاتی ہے۔ کاکس بازار کے ذخائر میں ایک اندازے کے مطابق ۴ لاکھ ۸۷ هزار ٹن زیت میں ۱۰ فی صد، اور ایک لاکھ ۶۳ هزار ٹن ریت میں ۲۰ فی صد اور تریسٹھ هزار ٹن ریت میں ۳۰ فی صد بھاری معدنیات پائی جاتی ہیں۔ تابکاری ریت کا پتا ڈیرہ غازی خان (پنجاب) میں بھی چلا ہے۔

بیرائٹ (Barytes): ضلع ڈیرہ غازی خان میں سنگ سیاہ میں یورینیم پائی گئی ہے، لیکن ابھی تک اس کے کارآمد ذخیرے دریافت نہیں ہوے۔ گلگت میں کڑنے سنگ خارا کی دریافت ہوئی ہے۔ بیرائٹ کا ایک بڑا ذخیرہ خزدار کے نزدیک گنگوا میں ملا ہے۔ ضلع هزارہ میں کوهالہ کے مقام پر بھی بیرائٹ کا ایک ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔

۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں جو معدنیات و سوختنیات نکالی گئیں، ان کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے: پارا (۹۲۴ ٹن)، اراگونائٹ (۵۲۳۴ ٹن)، سلسائٹ (۵۲۴ ٹن)، کرومائٹ (۳۸ هزار ٹن)، کوئلا (۱۴ لاکھ ۱۸ هزار ٹن)، ڈولمائٹ (۵۱۵ ٹن)، آتشی مٹی (۲۰ هزار ٹن)، فُلر مٹی (۲۰ هزار ٹن)، جپسم (ایک لاکھ ۲۲ هزار ٹن)، خام لوها (۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں ۱۲ هزار ٹن)، چونے کا پتھر (۲۲ لاکھ ۸۰ هزار ٹن)، کچا سیسه (۱۹۶۴-۱۹۶۵ء

میں ۱۵ ٹن)، میگنسائٹ (۵۸۷ ٹن)، مینگنیز (۵۹۹ ٹن)، پہاڑی نمک (۲ لاکھ ۳ ہزار ٹن)، سلیکا ریت (۸۷ ہزار ٹن)، سنگ صابون (۲۸۷۰ ٹن)، بیرائٹ (۶ ہزار ٹن)، خام تیل (۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ گیلن)، قدرتی گیس (۷۹ ارب ۹۸ کروڑ کیوبک فٹ).

۱۰ - پانی اور بجلی

پانی اور بجلی کی اهمیت پاکستان کی معاشیات میں سب سے زیادہ ہے، کیونکہ ان قدرتی وسائل کی ترقی ھی پر زراعت اور صنعت کا دارومدار ہے - حکومت نے اس کی بہم رسانی اور ترقی کے لیے ملک کے دونوں حصوں میں ''واپڈا'' (WAPDA = Water and Power Development Authority) کے نام سے ایک خوداختیار ادارہ قائم کیا ہے - مغربی پاکستان واپڈا نے ۱۹۵۸ء میں اور مشرقی پاکستان واپڈا نے ۱۹۵۹ء میں کام شروع کیا تھا - اس کے فرائض میں صوبے کی روزافزوں زرعی، صنعتی اور گھریلو ضروریات کے لیے پانی اور بجلی کی مناسب اور باضابطہ بہم رسانی، ترقیاتی منصوبوں کی تیاری اور ان پر عملدرآمد اور سیم، تھور، سیلابوں اور زمین کے کٹاؤ سے تباہ شدہ اراضی کو دوبارہ قابل کاشت بنانا شامل ہے - دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ساڑھے بیس لاکھ ایکڑ نئی اراضی زیر کاشت لائی گئی (۲ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ مشرقی پاکستان میں اور ۱۸ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ مغربی پاکستان میں) - علاوہ ازیں آبپاشی، پانی کے نکاس اور سیلاب کی روک تھام کے جدید طریقوں کو کام میں لا کر ساڑھے پچاسی لاکھ ایکڑ رقبہ دوبارہ کاشت کے قابل بنایا گیا (ساڑھے بائیس لاکھ ایکڑ مشرقی پاکستان اور تریسٹھ لاکھ ایکڑ مغربی پاکستان میں) - اسی طرح زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے اور اسے ملک کے ہر حصے میں فراہم کرنے میں بڑی کامیابی هوئی ہے.

(الف) پانی

پانی ایک بیش بہا نعمت ہے، لیکن اس کی افراط اور تفریط سے بڑے کٹھن مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن سے ملک کی معاشیات پر برا اثر پڑتا ہے - پاکستان میں بھی ان مسائل نے ہماری زراعت کو بہت متأثر کیا ہے، چنانچہ حکومت ملک کے دونوں حصوں میں ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے.

مشرقی پاکستان: یہ دنیا کے بڑے گنجان آباد علاقوں میں شمار ہوتا ہے - مزید برآں یہاں فی کس ملکیت اراضی کا رقبہ ضرورت سے کم اور آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح حد سے زیادہ ہے، چنانچہ غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے سال میں ایک سے زیادہ فصلیں اگانا ضروری ہے - مشرقی پاکستان میں بارش زیادہ تر مون سون کے موسم میں ہو جاتی ہے اور سال کے باقی حصے میں پانی کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے - اسے دور کرنے کے لیے حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں ان میں سے زیادہ اہم یہ ہیں: پن بجلی تیار کرنے کا منصوبہ، دریاؤں اور ندی نالوں کے پانی سے آبپاشی کا منصوبہ، نلوں اور پمپوں کے ذریعے زیر زمین پانی حاصل کرنے کا منصوبہ.

ان میں سے گنگا کباڈک کا کثیرالمقاصد منصوبہ سب سے بڑا ہے، جس سے سیلاب کی روک تھام اور آب پاشی میں بڑی مدد ملے گی - اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے اور دوسرا ۱۹۷۰ء میں پورا ہو جائے گا - منصوبے کی تکمیل پر کل ۵۰ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا اور کشتیا، جیسور اور کھلنا کا تقریباً ۲۵ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگے گا اور سال میں دو دو تین تین

فصلیں پیدا ہو سکیں گی۔

تیستا بیراج (Teesta Barrage): اس کا مقصد یہ ہے کہ دریائے تیستا پر بند تعمیر کر کے اضلاع رنگ پور، دیناج پور و بوگرا میں نہریں نکالی جائیں، جن سے ۱۱ لاکھ ۱۲ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا ۔ اس پر کل ۴۷ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ صرف ہو گا ۔ جتنا حصہ مکمل ہو چکا ہے اس سے ۳۳ ہزار ایکڑ اراضی سیراب ہونے لگی ہے۔

زیر زمین پانی کے استعمال سے رنگ پور، دیناج پور اور راجشاہی جیسے اضلاع کی اراضی سیراب کی جا سکتی ہے، جہاں کی سطح زمین نسبۃً بلند ہونے کی وجہ سے نہریں نکالنا مشکل ہے ۔ یہاں ٹیوب ویل اور پمپوں (low-lift pumps) کے ذریعے پانی کا انتظام کیا جا رہا ہے ۔ ۱۹۶۷ء کے آخر تک ۱۲ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ۶۳۲ ٹیوب ویل اور ۸۶۰ پمپ لگائے جا چکے ہیں ۔ منصوبہ مکمل ہونے پر ۱۸ لاکھ ۶۸ ہزار ایکڑ رقبے میں آب پاشی ممکن ہو جائے گی ۔ منصوبۂ کرنافلی بھی زیر تکمیل ہے ۔ اس کے تحت پمپوں کے ذریعے دس لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی ہو سکے گی۔

مشرقی پاکستان کی معیشت کو سب سے زیادہ نقصان آئے دن آنے والے طوفانوں اور سیلابوں سے پہنچتا ہے ۔ چٹاگانگ، نواکھلی، کھلنا اور باقر گنج کے ساحلی اضلاع کو سمندر کے مد و جزری سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس سے تقریباً چھے ہزار مربع میل کا علاقہ بری طرح متأثر ہوتا ہے ۔ اسی طرح برسات کے موسم میں بڑے بڑے دریاؤں، پدما، برھم پتر اور میگھنا، میں سیلاب آتے ہیں اور دوسرے اضلاع کی زرعی زندگی مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں ۔ ۱۹۵۵ء میں ایک سیلاب کمیشن (Flood Commission) قائم کیا گیا ۔ ۱۹۵۶ - ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کے ایک وفد نے دورہ کر کے پانی اور بجلی کی ترقیات کے منصوبوں کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کا بھی جائزہ لیا ۔ ۱۹۶۶ء میں اس پر مزید غور و خوض ہوا اور واپڈا نے آبی وسائل کو ترقی دینے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا، جس میں سیلابوں کی روک تھام کے بارے میں بھی تجاویز شامل تھیں ۔ اس پر حکومت مشرقی پاکستان اور عالمی بینک کے ماہرین نے نظر ثانی کے بعد یہ منصوبہ تیار کیا کہ متأثرہ علاقوں میں ساحلِ سمندر اور دریا کے کناروں پر پشتے بنائے جائیں اور پانی کے نکاس کے لیے پمپ لگائے جائیں ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس مد کے لیے ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ۔ کنارہ‌بندی اور پشتے تعمیر کرنے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے ۔ اس سلسلے میں تپرہ ۔ چٹاگانگ منصوبہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس کے ذریعے ایک لاکھ ۸۶ ہزار ۷ سو مربع میل اراضی کی سیلاب سے حفاظت اور ڈیڑھ لاکھ ایکڑ رقبے میں آب‌پاشی ہو سکے گی ۔ اس کا ایک حصہ (چاند پور سکیم) مکمل ہو چکا ہے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ختم ہونے پر ۱۷ لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ نئی اراضی اور ۲۷ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ تباہ شدہ اراضی زیر کاشت آ جائے گی۔

مغربی پاکستان: یہاں ۱۹ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ رقبے میں سے صرف ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ اراضی ایسی ہے جہاں آب پاشی کی سہولتیں میسر ہونے پر کاشت کی جا سکتی ہے ۔ اس وقت تقریباً ڈھائی کروڑ ایکڑ رقبہ نہروں سے سیراب ہو رہا ہے۔

پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں کے دوران میں آب پاشی کے متعدد منصوبوں کا آغاز ہوا، مثلاً غلام محمد بیراج، وارسک ڈیم، گدو بیراج، کرم گڑھی پروجیکٹ، تونسہ بیراج، راول ڈیم اور ٹنڈا ڈیم ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں طے پایا کہ ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۹۰ ہزار ایکڑ اراضی کو

نہری پانی مہیا کیا جائے گا اور اس میں ۹۳ لاکھ ۸۰ ہزار رقبہ پہلی بار زیر کاشت آئے گا ۔ واپڈا نے آغاز کار سے اب تک اڑتالیس میں سے تیئیس منصوبوں کو مکمل کر لیا ہے، جن میں سے مندرجۂ ذیل بہت اہم ہیں : کوہاٹ کے قریب ۶ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ۱۱۶ فٹ اونچا اور ۲۲۰۰ فٹ لمبا بند تعمیر کیا گیا ہے، جو ٹنڈا ڈیم کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے باعث ۷۸۴۰۰ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکے گا جس سے بتیس ہزار ایکڑ اراضی میں آب پاشی ہو گی ۔ جنوبی وزیرستان میں دریائے گومل پر بند بنانے کا کام جاری ہے ۔ ۳۸ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے سے تعمیر ہونے والے گومل ڈیم سے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ایک لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا اور ۸۳ ہزار کیلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہو گی ۔ ضلع ہزارہ میں دریائے ہرو پر ۱۰ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والا خانپور ڈیم مکمل ہونے والا ہے ۔ یہاں چونسٹھ ہزار ایکڑ فٹ ذخیرۂ آب سے ایک لاکھ ۱۳ ہزار ایکڑ اراضی کو فائدہ پہنچے گا ۔ کراچی اور اس کے مضافات کو سیراب کرنے کے لیے دریائے حب پر ۱۴۶ فٹ اونچے کچے پشتے کی تعمیر جاری ہے ۔

سندھ طاس معاہدے (۱۹۶۰ء) کے ماتحت واپڈا نے دو عظیم الشان بندوں کی تعمیر شروع کی ۔ ان میں سے دریائے جہلم پر منگلا ڈیم ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں مکمل ہو چکا ہے ۔ یہ ایک کثیرالمقاصد منصوبہ ہے ۔ اس کی جھیل میں ساڑھے پچپن لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں کے بجلی گھر سے دس لاکھ کیلوواٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی جسے ضرورت پڑنے پر تیس لاکھ تک بڑھایا جا سکتا ہے ۔ اس وقت یہاں سے دو لاکھ کیلوواٹ بجلی مہیا کی جا رہی ہے ۔ منگلا ڈیم کے علاوہ ترمو ۔ سدھنائی ۔ میلسی، میلسی ۔ بہلوال اور بلوکی ۔ قادر آباد کی رابطہ نہریں (link canals)، نیز سدھنائی بیراج، قادرآباد بیراج اور میلسی سائفن بھی مکمل ہو چکے ہیں ۔ سارے منصوبے پر پانچ ارب روپیہ صرف ہوا ہے، جس میں سے ۳ ارب ۳۰ لاکھ روپیہ صرف منگلا ڈیم کی تعمیر پر خرچ ہوا ۔

سندھ طاس کا دوسرا بڑا منصوبہ تربیلا ڈیم ہے، جس کے مکمل ہونے پر دریائے سندھ کا ایک کروڑ ۱۱ لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکے گا اور اس سے ساڑھے تین لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہو سکے گا ۔ اس کی تعمیر ۱۹۶۸ء سے شروع ہو چکی ہے ۔

مغربی پاکستان کا بیشتر علاقہ دوامی نہروں سے سیراب ہوتا ہے، جن میں سے مشہور یہ ہیں: دریائے راوی سے اپر باری دوآب اور لوئر باری دوآب؛ دریائے چناب سے اپر چناب اور لوئر چناب؛ دریائے جہلم سے اپر جہلم اور لوئر جہلم؛ دریائے ستلج سے فیروز پور، سلیمانکی، اسلام آباد اور پنج ند کے مقامات سے گیارہ نہریں نکالی گئی ہیں ۔ دریائے سندھ پر متعدد بیراج بنا کر ان سے کئی اہم دوامی نہریں نکالی گئی ہیں : (۱) کالا باغ کے قریب جناح بیراج سے نہریں نکال کر تھل کے ریگستان کو آباد و شاداب کیا گیا ہے؛ (۲) تونسہ بیراج سے نکلنے والی نہروں سے ڈیرہ غازی خاں اور مظفر گڑھ کے اضلاع کا چودہ لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہو رہا ہے؛ (۳) گدو بیراج کی تکمیل کے بعد سکھر، میرپور، روہڑی اور جیکب آباد کا اکتیس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا؛ (۴) سکھر کے قریب سکھر یا لائڈ بیراج دنیا کے بڑے بیراجوں میں سے ہے ۔ اس سے نکلنے والی سات نہروں سے پچاس لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے؛ (۵) کوٹری کے قریب غلام محمد بیراج مکمل ہونے پر کل اٹھائیس لاکھ

ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگے گا اور اس سے نکلنے والی نہر کوٹری سے کراچی کو پانی ملے گا؛ (۶) راولپنڈی اور اسلام آباد کو پانی کی بہم رسانی کے لیے دریا کورنگ پر راول ڈیم بنایا گیا ہے۔ اس سے دس ہزار ایکڑ اراضی بھی سیراب ہو سکے گی۔

دریاے سندھ کے میدان میں پانی کے نکاس کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث سیم اور تھور سے اراضی بری طرح متأثر ہو رہی ہے، چنانچہ پنجاب میں جزوی طور پر پچاس لاکھ ایکڑ رقبہ متأثر ہو چکا ہے، تیس لاکھ ایکڑ کو شدید نقصان پہنچا ہے اور پندرہ لاکھ ایکڑ رقبہ کاشت کے قابل نہیں رہا۔ اس رقبے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، جس کی سالانہ شرح پنجاب میں ستر ہزار ایکڑ اور پورے مغربی پاکستان میں ایک لاکھ ایکڑ ہے۔ اراضی کو سیم اور تھور سے نجات دلانے کے لیے واپڈا نے تقریبا سات سال پیشتر ایک وسیع منصوبہ بنایا اور وسطی رچنا دوآب میں ۱۸۰۰ ٹیوب ویل لگائے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۲۱۰۰ اور ۱۹۶۶ء میں مزید ۱۳۰۰ ٹیوب ویل لگائے گئے۔ اس سلسلے میں متعدد تجاویز پر عمل کیا جا رہا ہے۔ چج دوآب سکیم کے تحت اضلاع جھنگ، سرگودھا و گجرات کی ۲۲ لاکھ ۷۰ ہزار ایکڑ زمین بحال کرنے کے لیے ڈھائی ہزار ٹیوب ویل لگائے جائیں گے، پانی کے نکاس کے لیے ساڑھے چار سو میل لمبی نالیاں کھودی جائیں گی اور تین سو میل لمبی پرانی نالیوں کی مرمت کی جائے گی۔ لوئر تھل سکیم کے تحت رنگ پور اور مظفر گڑھ کے نہری علاقے میں ۱۳ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ زمین کی بحالی کے لیے ۱۵۰۰ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور ڈیڑھ سو میل لمبی نالیاں بنائی جائیں گی۔ اپر رچنا سکیم کے تحت اضلاع شیخوپورہ، سیالکوٹ و گوجرانوالہ کا ۱۳ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ رقبہ آتا ہے۔ یہاں امریکہ اور یوگوسلاویہ کی اعانت سے ۱۹۴۲ ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں۔ خیرپور سکیم کے تحت تمام ٹیوب ویل لگائے جا چکے ہیں اور ۳ لاکھ ۱۸ ہزار ایکڑ رقبہ سیم سے محفوظ ہو رہا ہے۔ لاڑکانہ۔ شکارپور سکیم کے تحت ۱۲۶ میل لمبی نکاسی نالیاں کھودی جا رہی ہیں۔

مغربی پاکستان کی اراضی کا ایک بڑا رقبہ ہر سال سیلاب یا بارش کے پانی سے کٹاؤ کی نذر ہو جاتا ہے اور سیلابی پانی اپنے ساتھ جو ریت بہا کر لاتا ہے اس کی تہیں قابل کاشت اراضی پر جم کر اسے ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ راولپنڈی، کیمبل پور، گجرات، میانوالی، شاہ پور اور جہلم کے اضلاع میں، جو صوبے کی زیر کاشت اراضی کے نصف سے زیادہ رقبے پر مشتمل ہیں، زمین کے کٹاؤ سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں مناسب حفاظتی تدابیر اختیار کر رہی ہے۔ واپڈا کے ماتحت متعدد سکیموں پر عمل ہو رہا ہے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بحالی اراضیات کے لیے ایک ارب ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔

(ب) بجلی

پاکستان میں سوختنیات کی کمی ہے؛ لہٰذا زراعت و صنعت کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کل ۱۱۳۰۰ کیلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے بیشتر حری نصیے (Thermol Plants) چھوٹے اور ناکافی تھے اور مہنگی درآمد شدہ سوختنیات سے چلتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بجلی کی ضروریات کا تخمینہ لگانے کے بعد پانچ لاکھ کیلوواٹ (ایک لاکھ مشرقی پاکستان کے لیے اور باقی مغربی پاکستان کے لیے) بجلی پیدا کرنے کا

منصوبہ بنایا گیا - ۱۹۵۵ء تک ۳ لاکھ ۴۰ ہزار کیلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہونے لگی - اگلے پانچ سالوں میں یہ مقدار تقریباً سہ چند، یعنی ۹ لاکھ ۱۰ ہزار کیلوواٹ ہوگئی - دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخر (۱۹۶۵ء) تک یہ پندرہ لاکھ کیلوواٹ تک جا پہنچی۔

مشرقی پاکستان: ۱۹۶۵ء تک مشرقی پاکستان میں بجلی کی پیداوار ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں ستائیس گنا ہوگئی - یہ ترقی زیادہ تر بڑے بڑے منصوبوں کی بدولت ہوئی ہے، مثلاً کپتائی میں کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ (اسی ہزار کیلوواٹ)، سدھیر گنج میں بھاپ (تیس ہزار کیلوواٹ) اور ڈیزل (اٹھارہ ہزار کیلوواٹ) کے منصوبے، چٹاگانگ ڈیزل پراجیکٹ (دس ہزار کیلوواٹ) وغیرہ۔

بجلی کی ترسیل اور تقسیم پہلے پہل شہری علاقوں سے قصباتی علاقوں میں کی گئی اور اب دور دراز کے دیہات تک کی جا رہی ہے - اس وقت ۲۳۰۰ میل لمبے ایک سلسلۂ ترسیل و تقسیم کے ذریعے سے بجلی گھروں سے ضرورت کے اہم مراکز تک بجلی پہنچائی جاتی ہے - ۱۹۷۰ء تک تقریباً ۱۰۰۰ دیہات کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

۱۹۶۵ء کے وسط تک مشرقی پاکستان واپڈا نے بجلی کی پیداوار اور تقسیم کے چودہ منصوبے مکمل کیے - تیسرے پنجسالہ منصوبے میں ایک درجن سے زیادہ منصوبے بنائے گئے، جن میں کرنافلی کے بجلی گھر کی توسیع اور روپ پور میں ایک لاکھ چالیس ہزار کیلوواٹ کے ایک ایٹمی بجلی گھر (= nuclear power plant) کا قیام شامل تھا - توقع کی جاتی ہے کہ نئے اور پرانے منصوبوں سے ۱۹۷۰ء تک بجلی کی پیداوار تین لاکھ کیلوواٹ سے بڑھ کر ۸ لاکھ ۳۰ ہزار کیلوواٹ ہو جائے گی - ان تمام منصوبوں کے پیش نظر تیسرے پنجسالہ منصوبے میں اس مد کے لیے ایک ارب ۴۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی جبکہ دوسرے پنجسالہ منصوبے میں پینتیس کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔

بجلی کے بعض موجودہ منصوبوں کی کیفیت درج ذیل ہے: (۱) سدھیر گنج پراجیکٹ: سدھیر گنج کے مقام پر امریکہ کی مالی اعانت سے پچاس ہزار کیلوواٹ کا ایک حرّی نصبیہ ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا؛ (۲) گھوراشال بجلی گھر (Ghorashal Power Station): ایک لاکھ دس ہزار کیلوواٹ کا یہ تھرمل بجلی گھر ۱۹۶۹ء میں مکمل ہوا - اس کے لیے فنی امداد روس نے مہیا کی تھی؛ (۳) کرنافلی پراجیکٹ: مشرقی پاکستان میں پن بجلی کا سب سے بڑا منصوبہ ہے - اس کا تیسرا یونٹ ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا؛ (۴) اشور گنج تھرمل پلانٹ: بارہ لاکھ کیلوواٹ کے اس حرّی نصبیے کی تعمیر ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئی - ۱۹۷۰ء تک اس کے دونوں یونٹ کام کرنے لگیں گے؛ (۵) ایمرجنسی پاور جنریشن سکیم Emergency Power Generation Scheme: اس کے تحت سینتیس ہزار کیلوواٹ کے گیس ٹربائن یونٹ Gas Turbine Units قائم کیے جائیں گے، جن سے سینتیس ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی - ایک یونٹ (تیرہ ہزار کیلوواٹ) دریاے برہم پتر کے مشرق میں اور دوسرا (چوبیس ہزار کیلوواٹ) اس کے مغرب میں کھلنا میں قائم کیا جا رہا ہے؛ (۶) گیس ٹربائن پاورسٹیشن Gas Turbine Power Station: ضلع سلہٹ میں شاھجی بازار میں چھیانوے ہزار کیلوواٹ کا ایک گیس ٹربائن بجلی گھر قائم کیا گیا ہے - یہ ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوا۔

علاوہ ازیں ترسیل کے متعدد منصوبے، مثلاً گول پاڑہ-بھیرامرہ-اشوردی، سدھیر گنج-سلہٹ، ٹھاکر گنج-سیدپور اور سدھیر گنج-اشوردی، مکمل کیے جا رہے ہیں تاکہ صوبے کے ہر حصے

میں زرعی، صنعتی اور گھریلو ضروریات کے لیے بجلی فراہم کی جا سکے۔ ۱۹۶۷ء تک ۵۷۸ میل لمبی لائنیں لگائی جا چکی تھیں اور مزید ۲۸۰ میل لمبی لائنوں پر کام مکمل ہو رہا تھا۔

مغربی پاکستان : بجلی کی پیداوار اور بہم رسانی کی غرض سے مغربی پاکستان کو شمالی اور جنوبی منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شمالی منطقے میں پنجاب، شمالی مغربی سرحد اور بہاولپور کے علاقے شامل ہیں، ان سب کو ایک گرڈ (grid) میں ملا دیا گیا ہے، جس سے بجلی گھر مربوط ہیں: وارسک، مالاکنڈ، درگئی، کرم گڑھی، رسول، شادی وال، چیچوکی ملیاں، گوجرانوالہ اور رینالہ کے ہائیڈل بجلی گھر؛ لائلپور، ساہیوال اور ملتان کے سٹیم بجلی گھر؛ اور لائلپور کا ڈیزل بجلی گھر۔ جنوبی منطقہ بالائی سندھ، کوئٹہ اور قلات کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ مغربی پاکستان میں بجلی کی کل کھپت کا تقریباً ۷۰ فی صد واپڈا مہیا کرتی ہے اور ۱۸ فی صد کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن؛ باقی سات فی صد بجلی راولپنڈی اور ملتان کی نجی خود اختیار کمپنیوں اور واپڈا کے الگ تھلگ بجلی گھر (جیسے کوئٹے میں) سے فراہم ہوتی ہے۔

وسائل : مغربی پاکستان کے جنوبی میدانوں میں قدرتی گیس کے بڑے ذخیرے موجود ہیں جو کم خرچ حرّی بجلی پیدا کرنے کے لیے بہت موزوں ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق دریاے سندھ اور اس کے بڑے معاونین سے تقریباً تین کروڑ کیلوواٹ کی برقابی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں دریاے جہلم اور اس کے معاونین میں بھی اس کی خاصی مقدار موجود ہے۔ برقی قوت کو ترقی دینے کے لیے مغربی پاکستان میں بنائے ہوئے منصوبوں میں سے کچھ یہ ہیں: تربیلا (اکیس لاکھ کیلو واٹ)، پنجو (پندرہ لاکھ)، سکردو (چودہ لاکھ)، ڈھوک پٹھان (ساڑھے بارہ لاکھ)، کالا باغ (بارہ لاکھ)، کنہار (دس لاکھ)، منگلا (دس لاکھ)، مندر (آٹھ لاکھ)، مکھڈ (سات لاکھ)، کلنجی (Kalangai ؟)(سات لاکھ)، خان پور (چھے لاکھ)، چشمہ (پانچ لاکھ)، خزانہ (تین لاکھ)، دریاے گومل (ایک لاکھ تیس ہزار).

اگر سوختنیات اسی طرح گراں قیمت رہیں تو تھرمل بجلی گھروں کے مقابلے میں برقابی بجلی گھر قائم کرنے پر خرچ کم ہوگا۔ ترقیاتی منصوبے کے مطابق ۲۶۷۸۰۰ کیلو واٹ ہائیڈ برقابی قوت کی موجودہ پیداوار ۱۹۷۵ء تک سہ چند ہو جائے گی۔

مغربی پاکستان کے اہم بجلی گھر مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) ملتان بجلی گھر : ملتان میں پیران غیب کے مقام پر ۱۹۶۰ء میں ایک بجلی گھر مکمل ہوا، جہاں سوئی گیس سے ایک لاکھ تیس ہزار کیلو واٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ اس میں توسیع کا کام ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوا جب دو اور ٹربائنیں (Turbines) لگائی گئیں، جن میں سے ہر ایک کی استعداد پینسٹھ ہزار کیلوواٹ کی ہے؛ (۲) موبائل گیس ٹربائنز Mobile Gas turbines : منگلا بجلی گھر مکمل ہونے سے قبل لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اگست ۱۹۶۶ء میں شاہدرہ (لاہور) میں دو mobile gas-fired یونٹ قائم کیے گئے، جن سے کل چھبیس ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہو سکتی ہے؛ (۳) کوئٹہ تھرمل پاور اسٹیشن : یہ بجلی گھر، جو کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں کو پندرہ ہزار کیلوواٹ بجلی فراہم کرتا ہے، دو سٹیم۔ ٹربو یونٹوں (steam-turbo units) پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک ۷۵۰۰ کیلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے۔ ان میں گھٹیا درجے کا دیسی کوئلا استعمال کیا جاتا ہے جو کوئٹے میں پایا جاتا ہے۔ اس بجلی گھر کی ساخت کی ایک خصوصیت تبرید کا

خاص طریقہ ہے جسے Dry Cooling کہتے ہیں۔ اس میں ٹھنڈا کرنے والا پانی ایک بند چکر میں بار بار استعمال کیا جاتا ہے تاکہ پانی زیادہ خرچ نہ ہو، جس کی بلوچستان میں کمی ہے۔ یہاں سے کوئلے کی کانوں، آبپاشی کے ٹیوب ویلوں اور کوئٹہ شہر کے صنعتی اور گھریلو استعمال کے لیے بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ بجلی گھر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا؛ (۴) حیدر آباد تھرمل پاور سٹیشن: یہ بجلی گھر، جو ساڑھے سات سات ہزار کیلو واٹ کے دو سٹیم یونٹوں اور ۷۵۰۰ کیلو واٹ کی ایک گیس ٹربائن پر مشتمل ہے، ۱۹۶۱ء کے نصف اول میں مکمل ہوا۔ اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ زیریں سندھ کے علاقے میں بجلی کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیس ہزار کیلوواٹ کا ایک تھرمل بجلی گھر مع سلسلہ ہائے ترسیل و تقسیم، قائم کیا جائے۔ ذیلی بجلی گھر ٹنڈو آدم، میر پور خاص، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو اللہ یار، نواب شاہ، بدین اور ٹنڈو غلام علی وغیرہ میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان بجلی گھروں سے زیریں سندھ کے علاقے کے بیس قصبوں میں بجلی مہیا کی جا رہی ہے۔ یہ منصوبہ جون ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کے توسیعی منصوبے میں پندرہ ہزار کیلوواٹ کے ایک سٹیم پلانٹ اور آٹھ ہزار کیلوواٹ کے ایک اضافی یونٹ کا قیام شامل ہے۔ اس طرح اس بجلی گھر کی کل گنجائش ۴۳۰۰۰ کیلوواٹ ہو گئی ہے؛ (۵) سکھر تھرمل پاور پراجیکٹ: یہ منصوبہ ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا۔ مرکزی تھرمل بجلی گھر کی ابتدائی استعداد پچیس ہزار کیلوواٹ ہے۔ اس سے شمالی سندھ کو، جس میں شکار پور، جیکب آباد، لاڑکانہ، ھری پور، گمبٹ اور نرناره کا علاقہ شامل ہے، بجلی مہیا ہوتی ہے۔ سیم و تھور کی روک تھام کے سلسلے میں بجلی کی روز افزوں ضرورت کے پیش نظر اس میں توسیع کی گئی ہے؛ (۶) لائل پور سٹیم پاور اسٹیشن: یہ زیر تکمیل بجلی گھر دو سٹیم ٹربائن یونٹوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک چھیاسٹھ ہزار کیلو واٹ کا ہے۔ اس بجلی گھر میں بھی سوئی گیس استعمال کی جاتی ہے؛ (۷) گوجرانوالہ ہائیڈل سٹیشن: یہ بجلی گھر نندی پور کے قریب نہر اپر چناب پر واقع ہے اور مارچ ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کی کل استعداد تیرہ ہزار کیلو واٹ ہے۔ ابتدا میں اس سے مقصود SCARP کے ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کرنا تھا، لیکن بعد میں اسے نیشنل گرڈ سے مربوط کر دیا گیا؛ (۸) شادی وال ہائیڈل سٹیشن: اس بجلی گھر میں نہر اپر جہلم پر تئیس فٹ کی ایک مصنوعی آبشار کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس بجلی گھر میں دو جنریٹر (generator) ہیں، جن میں سے ہر ایک ۶۵۰۰ کیلو واٹ کی استعداد رکھتا ہے۔ اسے گجرات میں واقع نیشنل گرڈ سے مربوط کیا گیا ہے؛ (۹) چیچو کی ملیاں ہائیڈل سٹیشن: یہاں بجلی پیدا کرنے کے لیے نہر اپر چناب پر بائیس فٹ کی ایک مصنوعی آبشار کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ بوقت ضرورت یہاں سے لاہور کو بجلی مہیا کی جا سکتی ہے؛ (۱۰) وارسک پاور سٹیشن: اس بجلی گھر میں، جو ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا، چالیس چالیس ہزار کیلو واٹ کے چار جنریٹر لگے ہیں۔ یہ پشاور کے شمال مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر دریائے کابل پر تعمیر ہونے والے کثیر المقاصد پراجیکٹ کا ایک حصہ ہے۔ بڑا بند تقریباً ۷۵۰ فٹ لمبا، ۲۳۵ فٹ اونچا اور بنیاد میں ۲۱۰ فٹ چوڑا ہے۔ مزید جنریٹر لگنے سے اس کی استعداد ساٹھ ہزار کیلو واٹ سے بڑھ کر دو لاکھ چالیس ہزار کیلوواٹ ہو جائے گی۔

۱۱ - نقل و حمل اور رسل و رسائل

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے، جس کے دو حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے، نقل و حمل اور رسل و رسائل کا ایک اچھا نظام بہت مشکل بھی ہے اور اشد ضروری بھی؛ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد اس نظام کو بہتر بنانے اور اس میں توسیع کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے ۔ اس وقت کوئی ۶ لاکھ ۷۷ ہزار اشخاص اس نظام سے وابستہ ہیں اور مجموعی قومی پیداوار کا ۶ فی صد اس سے حاصل ہوتا ہے ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں اس کی ترقی کو صنعتوں اور سوختنیات و معدنیات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور اس کے لیے کل رقم کا ۱۸۰۲فی صد مخصوص کیا گیا ۔

(الف) نقل و حمل

ملک میں نقل و حمل کے پانچ اہم ذرائع ہیں : ریلوے، سڑکیں، سمندر، دریا اور ہوا ۔ ہوائی ذریعۂ سفر ملک کے دونوں حصوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لیے خاص طور پر اہم ہے ۔

(۱) ریلوے : ریلوے نقل و حمل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کیونکہ اس کا جال بہت وسیع ہے، اس کے ذریعے لمبا سفر سستا رہتا ہے، وقت کم صرف ہوتا ہے اور بھاری باربرداری بآسانی کی جاسکتی ہے ۔ ریلوے کی اقتصادی اہمیت بھی بہت ہے ۔ یہ غلے کو ملک میں دوبارہ تقسیم کرنے، خام مال کو صنعتی مراکز تک لے جانے اور مصنوعات کو ملک کے مختلف حصوں تک پہنچانے کے لیے بہت مفید و ممد ہے ۔

مغربی پاکستان میں ۱۰۵ میل لمبی پہلی پٹڑی مئی ۱۸۶۱ء میں اور مشرقی پاکستان میں تینتیس میل لمبی پٹڑی اس کے ڈیڑھ سال بعد بچھائی گئی ۔ بر صغیر کی تقسیم پر پاکستان کے حصے میں ۴۹۹۹ میل راستہ مغربی پاکستان میں اور ۱۶۱۸ میل راستہ مشرقی پاکستان میں آیا ۔ ۱۹۶۱ء میں ان ریلوے پٹڑیوں کے نام نارتھ ویسٹرن ریلوے اور ایسٹرن بنگال ریلوے سے بدل کر بالترتیب پاکستان ویسٹرن ریلوے (PWR) اور پاکستان ایسٹرن ریلوے (PER) رکھ دیے گئے ۔ پاکستان میں ریلوے میلانہ ۱۰۹ میل فی سو مربع میل ہے، جو بہت کم ہے ۔

تنظیم : ریلوے کی ملکیت اور انتظام حکومت کے پاس ہے ۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں ریلوے کا شعبہ مرکز نے صوبوں کے سپرد کر کے دونوں صوبوں میں ایک ایک ریلوے بورڈ قائم کر دیا، جو تمام انتظامی معاملات میں خود مختار ہے ۔ بورڈ کا چیئرمین ریلوے انتظامیہ کا سربراہ ہے ۔ عملی مقاصد کے لیے ریلوے کو آٹھ ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے : دو ڈویژنیں مشرقی پاکستان میں اور چھے مغربی پاکستان میں ۔

۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء کے مالی سال کے آخر تک ریلوے پر ۲ ارب ۲۷ کروڑ ۲۶ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا (مرکزی حکومت نے ایک ارب ۸۸ کروڑ ۴۸ لاکھ اور صوبائی حکومتوں نے ۳۸ کروڑ ۸۷ لاکھ روپیہ) ۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنی سرمایہ کاری پر مقررہ رقوم واپس وصول کرتی ہیں ۔ ریلوے اپنے بجٹ خود تیار کرتی ہیں، جو صوبائی حکومتوں کے عام بجٹوں کا حصہ نہیں ہوتے ۔ صوبائی حکومتوں کے پاس آنے سے پہلے ریلوے کے شعبے منافع پر چل رہے تھے ۔ اس کے بعد یکم جولائی ۱۹۶۲ء تا ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کی مدت کے دوران میں پاکستان ویسٹرن ریلوے نے کل ۱۸ کروڑ ۲ لاکھ روپے کی بچت دکھائی اور پاکستان ایسٹرن ریلوے نے ۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کا

خسارہ دکھایا؛ تاهم ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں پاکستان ایسٹرن ریلوے سے ۲۴ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی آمدنی هوئی اور ۲۲ کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ خرچ هوا اور پاکستان ویسٹرن ریلوے سے ۶۳ کروڑ ایک لاکھ روپے کی آمدنی هوئی اور ۵۵ کروڑ ۱۱ لاکھ روپیہ خرچ هوا.

قیام پاکستان کے وقت پاکستان ریلوے کی حالت نہایت خستہ تھی، پٹڑیاں بہت پرانی ہونے، نیز دوسری جنگ عظیم میں زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے خراب هو چکی تھیں؛ چنانچہ پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں میں ریلوے کو بہتر بنانے کی طرف بہت توجہ کی گئی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ریلوے کے لیے ۲ ارب ۴۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ (پاکستان ویسٹرن ریلوے کےلیے ڈیڑھ ارب اور پاکستان ایسٹرن ریلوے کے لیے ساڑھے اکانوے کروڑ) مخصوص کیا گیا۔ ریلوے کی اصلاح و ترقی کے لیے جو اقدامات کیے گئے ھیں ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ھیں: نئی پٹڑیاں بچھانا اور پرانی پٹڑیوں کی مرمت؛ نئے انجنوں، مسافرگاڑیوں اور مال‌گاڑیوں کی خرید؛ سگنلوں کا جدید نظام؛ پلوں کی مرمت اور استحکام؛ ریلوے سٹیشنوں کی پرانی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتوں، نیز جدید طرز کے پلیٹ‌فارموں اور آرام‌گاھوں کی تعمیر؛ ٹھنڈے پانی اور پنکھوں کا انتظام وغیرہ۔ ریلوے کی پٹڑیاں زیادہ تر میدانی علاقوں کے زیادہ گنجان آباد حصوں میں بچھائی گئی ھیں۔ پاکستان ایسٹرن ریلوے کے بڑے راستے یہ ھیں: ڈھاکہ -o- چٹاگانگ (۱۹۸ میل)؛ اکھوڑا -o- سلہٹ (۱۰۶٤۲۵ میل)؛ ڈھاکہ -o- درسنہ (۹۴ میل، جس میں سٹیمر سروس کا میلانہ بھی شامل ہے)؛ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے بڑے راستے یہ ھیں: پشاور -o- کراچی (۱۰۴۵ میل)؛ کراچی -o- کوئٹہ (۵۳۳ میل)؛ روهڑی -o- چمن (۳۲۷ میل) اور لاهور -o- ماری انڈس (۳۳۰ میل).

ریلوے ملازمین کی کل تعداد ایک لاکھ ۹۰ هزار ہے، جن میں ۶۸ فی صد مغربی پاکستان میں اور ۳۲ فی صد مشرقی پاکستان میں ھیں۔ ۶۰ فی صد ملازمین کا تعلق شعبۂ انجینئرنگ سے اور ۳۶ فی صد کا ٹریفک سے ہے۔ نئے ملازمین کی تربیت اور پرانے ملازمین کے ریفریشر کورسز کے لیے دونوں حصوں میں تربیت گاھیں قائم کی گئی ھیں۔ مشرقی پاکستان میں لال‌منیرهاٹ سکول سے آٹھ سو اور مغربی پاکستان میں لاهور والٹن ٹریننگ سکول سے دو هزار دو سو افراد سالانہ ریلوے کے مختلف شعبوں کے لیے تربیت پاتے ھیں۔ والٹن سکول میں پاکستان کے علاوہ مشرق اوسط، مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا کے لوگ بھی تربیت پانے آتے ھیں۔ ریلوے ملازمین کو رهائش کے علاوہ طبی اور تعلیمی سہولتیں بھی فراهم کی جاتی ھیں.

(۲) سڑکیں: مسافروں اور سامان دونوں کی نقل و حمل کے لیے ریلوے کی طرح شارعی نقل و حمل بھی بہت اهم ہے اور کئی اعتبار سے ریلوے کی بہ نسبت زیادہ سستی اور آرام دہ بھی ہے۔ دیہات سے منڈیوں تک زرعی پیداوار، کارخانوں تک خام مال اور تمام شہروں اور دیہاتی علاقوں میں مصنوعات زیادہ‌تر اسی ذریعے سے لے جائی جاتی ھیں.

ابتدا میں پاکستان میں بیشتر سڑکیں کچی تھیں اور بارش کے موسم میں استعمال نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں تارکول والی پختہ سڑکیں تقریباً بالکل نہیں تھیں۔ همہ موسمی سڑکوں کی کل لمبائی بمشکل ۲۴۰ میل تھی اور اس سے صوبے کی اقتصادی حالت بہت بری طرح متأثر هوتی تھی؛ چنانچہ اس صوبے میں

سڑکوں کی ترقی کا کام از سر نو شروع کیا گیا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اس صوبے میں سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ساڑھے سولہ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے اور ۷۰۰ میل لمبی ھمہ موسمی سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۹۶۸ میل لمبی ھمہ موسمی سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۲۸۳ میل لمبی نئی سڑکوں کی تعمیر اور ۳۰۰ میل لمبی سڑکوں کی مرمت شامل تھی اور اس کے لیے ایک ارب دس کروڑ روپے مخصوص کیے گئے ۔ ۱۹۶۰ - ۱۹۶۷ء میں ۲۱۷ میل لمبی سڑکیں مزید تعمیر ہوئیں اور یوں ۱۹۶۷ء کے آخر تک سڑکوں کی کل لمبائی دو ہزار میل ھو گئی ۔ مشرقی پاکستان میں پانچ بڑی شاهراهیں بھی مکمل کی جا چکی ھیں ۔ اصل میں مشکل یہ ھے کہ مشرقی پاکستان کو دریاؤں نے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ھے، جس کی وجہ سے مسلسل لمبی سڑکیں تعمیر کرنا بہت دشوار ھے ۔ مشرقی پاکستان میں سڑکوں کے کم ھونے کا ایک سبب یہ بھی ھے کہ وھاں آبی نقل و حمل کا ذریعہ بھی استعمال کیا جاتا ھے جبکہ مغربی پاکستان میں ریلوے کے علاوہ صرف سڑکیں ھی ذریعۂ نقل و حمل ھیں ۔ مغربی پاکستان میں سے برِّ صغیر کی قدیم ترین سڑک شارع عظیم (Grand Trunk Road) گزرتی ھے، جسے سولھویں صدی عیسوی میں شیر شاہ سوری نے تعمیر کرایا تھا ۔ بدیسی حکمرانوں نے مغربی پاکستان میں سڑکوں کی تعمیر سے دانستہ طور پر بے توجہی برتی اور محض اپنے فوجی یا تجارتی مقاصد کے تحت بعض حصوں میں سڑکیں تعمیر کرائیں ۔ قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان میں سڑکوں کی کل لمبائی ۱۳۷۸۱ میل تھی (۵۰۰۷ میل ھمہ موسمی اور ۸۷۳۱ میل کمتر قسم کی) ۔ ان میں سے بیشتر سڑکیں صوبۂ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں تھیں ۔ یہ سڑکیں کم چوڑی تھیں اور دوسری جنگ عظیم میں زیادہ استعمال ھونے کی وجہ سے بہت خراب حالت میں تھیں؛ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد ایک طرف تو نئی سڑکیں تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف موجودہ سڑکوں کی مرمت کی طرف توجہ کی گئی ۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے آخر تک ۱۹۱۷۶ میل لمبی سڑکیں بن چکی تھیں، جن میں ۸۷۷۲ میل لمبی سڑکیں ھمہ موسمی تھیں ۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں پونے تین کروڑ روپیہ سڑکوں کی تعمیر کے لیے مخصوص کیا گیا اور اس کے ختم ھونے پر سڑکوں کی لمبائی مجموعی طور پر ۲۱۷۵۸ ھو گئی (۹۹۷۱ میل ھمہ موسمی اور ۱۱۷۸۷ میل کمتر قسم کی) ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں مغربی پاکستان میں ۱۳۲۵ میل لمبی سڑکوں کی تعمیر اور ۱۱۰۰ میل لمبی سڑکوں کی مرمت (جس میں ۹۰۰ میل لمبی کراچی -ہ- کوئٹہ -ہ- زاھدان سڑک بھی شامل ھے) کے لیے نوّے کروڑ روپے مخصوص کیے گئے ۔ زمانۂ حال کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ھوے تمام اھم سڑکوں کی اصلاح کی جا رھی ھے ۔ کراچی اور حیدر آباد کے درمیان نئی شاھراہ بن جانے سے ان دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ تیس میل کم ھو گیا ھے ۔ لاھور اور ملتان، لاھور اور لائل پور اور شیخوپورہ اور سرگودھا کے درمیان بھی اسی قسم کی شاھراھیں تعمیر ھو رھی ھیں۔

۱۹۴۹ء میں ایک سنٹرل روڈ فنڈ قائم کیا گیا، جس کا ۸۰ فی صد سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر اور ۱۰ فی صد تحقیقی کاموں پر صرف ھوتا ھے ۔

ملکی آبی راستے : ملکی آبی راستے مشرقی پاکستان میں نقل و حمل کا ایک بڑا ذریعہ ھیں اور بعض حصوں میں خصوصاً سیلاب کے موسم میں

یہ آمد و رفت کا واحد ذریعہ ہیں ۔ یہاں کے دریاؤں پر میکانکی نقل و حمل ۲۲۰۰ سٹیمروں، موٹر کشتیوں اور لانچوں وغیرہ پر مشتمل ہے ۔ ان کے علاوہ تقریباً تین لاکھ دیسی کشتیاں بھی کام کر رہی ہیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد سے اندرون ملک آبی نقل و حمل کا شعبہ مکمل طور پر صوبائی حکومت کے ماتحت ہے ۔ اس سال ایک خود مختار ادارہ Inland Water Transport Authority (IWTA=) قائم کیا گیا ۔ پانچ ارکان پر مشتمل ایک بورڈ اس کا ذمے دار ہے ۔ یہ ادارہ سات مختلف شعبوں پر مشتمل ہے اور اس کے قیام کے بعد آبی نقل و حمل میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے ۔ ڈھاکہ، نرائن گنج، چاند پور، باریسال اور کھلنا کے مقامات پر پانچ بڑی دریائی بندرگاہیں ہیں ۔ مذکورۂ بالا ادارے نے ان بندرگاہوں کو جدید طرز کی بندرگاہوں کے مطابق بنایا ہے ۔ ان کے علاوہ لانچوں کے لیے ۱۳۰۷ گھاٹ ہیں ۔ ہر سال دو کروڑ مسافر سفر کرتے ہیں اور چوبیس لاکھ ٹن سامان لایا اور لے جایا جاتا ہے ۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں IWTA کی کل آمدنی ۵۶ لاکھ ۳۰ ہزار روپے تھی۔

ایسٹ پاکستان شپنگ کارپوریشن (EPSC) کا قیام مشرقی پاکستان کی آبی نقل و حمل کو بہتر بنانے کے لیے ایک اہم اقدام تھا ۔ اندرون ملک میں اس کے چھوٹے جہاز (ferries) چٹاگانگ اور کاکس بازار، نیز چٹاگانگ اور کھلنا کے درمیان چلتے ہیں ۔ ان کی بدولت مشرقی پاکستان کے بعض علاقوں کو پہلی بار حمل و نقل کی سہولت میسر آئی ہے ۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان بحری راستے سے ہونے والی جملہ تجارت اور پاکستانی حاجیوں کی آمد و رفت بھی پاکستانی بحری جہازوں کے ذریعے ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں پاکستانی بحری جہازوں کی ترسیل کے راستے یہ ہیں: پاکستان تا برطانیہ، پاکستان تا امریکہ، پاکستان تا مشرقی افریقہ، پاکستان تا بحیرۂ بالٹک، پاکستان تا سنگا پور، ہانگ کانگ، چین، جاپان، پاکستان تا خلیج فارس، پاکستان (مشرقی) تا برما اور پاکستان سے بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں تک.

بحری جہاز سازی: کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینئرنگ ورکس، پاکستان اور ہمسایہ ممالک کے لیے جہازوں کی مرمت اور چھوٹے جہازوں کی تعمیر کرتا ہے ۔ اب اس نے بڑے بحری جہاز بھی تعمیر کرنا شروع کر دیے ہیں ۔ کھلنا اور نرائن گنج کے جہاز سازی کے کارخانوں میں بھی جہازوں کی مرمت کی سہولتیں موجود ہیں (نیز دیکھیے بذیل ''صنعت و حرفت'').

بندرگاہیں: اس وقت پاکستان میں کراچی، چٹاگانگ اور چلنا کے مقامات پر تین بڑی بندرگاہیں ہیں ۔ مغربی پاکستان کی واحد اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کراچی ہے ۔ اس کی لنگرگاہ کا رقبہ ۲۳۷۳ ایکڑ ہے ۔ پوری بندرگاہ کے انتظامی اختیارات کراچی پورٹ ٹرسٹ کے پاس ہیں، جس کے گیارہ ارکان ہیں ۔ اس میں ایک اعلٰی اور ترقی یافتہ بندرگاہ کی تمام سہولتیں موجود ہیں ۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ۹۷۷۶۸ مسافروں نے کراچی سے سفر کیا ۔ ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں ۸۶ لاکھ ۶۳ ہزار ٹن سامان یہاں اتارا اور لادا گیا ۔ مشرقی پاکستان کی بندرگاہ چٹاگانگ دریاے کرنا فلی کے دہانے سے ۹ میل دور خلیج بنگال کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے ۔ اس بندرگاہ کے انتظامی اختیارات بھی ایک پورٹ ٹرسٹ کے سپرد ہیں ۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں یہاں سے گزرنے والے مسافروں کی کل تعداد ۶۹۱۰۲ تھی اور یہاں ساڑھے چالیس لاکھ ٹن سامان اتارا یا چڑھایا گیا ۔ ۱۹۵۰ء میں چٹاگانگ

کی بندرگاہ کا بوجھ کم کرنے کے لیے چلنا سے نو میل جنوب میں ایک لنگرگاہ قائم کی گئی اور تب سے یہ لنگرگاہ تسلی‌بخش طور پر کام کر رہی ہے ۔ اب اس میں ترقی و توسیع کی جا رہی ہے اور ۱۹۷۰ء کے آخر تک یہ ایک مکمل بندرگاہ بن جائے گی۔

شہری ہوا بازی : قیام پاکستان کے وقت کراچی کا ہوائی اڈا پاکستان کا واحد بین الاقوامی ہوائی اڈا تھا اور ''رن وے'' اور عملے سے لے کر ہوائی جہاز تک سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی، لیکن اس کے بعد پاکستان نے ملکی ہوابازی میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے ۔

پاکستان انٹر نیشنل ایئر لائنز (PIA)، جو ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی، ہوائی نقل و حمل کے لیے پاکستان کی واحد ایجنسی ہے ۔ پی آئی اے کے قیام کے ایک سال بعد اورینٹ ایئرویز Orient Airways کو، جس کا دفتر قیام پاکستان سے قبل کلکتے میں تھا اور بعد ازاں کراچی میں منتقل کر لیا گیا تھا، اس میں مدغم کر دیا گیا ۔ پی ۔ آئی ۔ اے ایک خود اختیار عوامی کارپوریشن ہے، جس کا انتظام ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سپرد ہے ۔ پی ۔ آئی ۔ اے کا صدر ملکی ہوابازی کے شعبوں اور محکمۂ سیر و سیاحت کا بھی ناظم اعلٰی ہے ۔

اندرون ملک کی تمام پروازوں، نیز پاکستان سے شروع ہونے والی تمام بین الاقوامی ہوائی پروازوں کی ذمے‌دار پی ۔ آئی ۔ اے ہے ۔ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام اہم شہروں کو آپس میں ملاتی ہے، جن میں گلگت، چترال اور سکردو جیسے دور افتادہ اور دشوار گزار راستوں پر واقع مقامات بھی شامل ہیں ۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اس کی پروازیں روزانہ ہوتی ہیں اور اس طرح یہ راولپنڈی، لاہور اور کراچی کو ڈھاکے سے ملاتی ہیں ۔ بین الاقوامی راستوں پر اس کی پروازکے تحت ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بر اعظم آتے ہیں ۔ لنڈن کے لیے پرواز اب براستۂ کابل، ماسکو اور فرانکفرٹ بھی ہوتی ہے ۔ ایک سروس ڈھاکے کو کینٹن اور شنگھائی سے ملاتی ہے ۔ اب پی آئی اے کی جٹ سروسز Jet Services مغرب میں تہران، دہران، بغداد، کویت، دوبئی، دوحة، بیروت، استانبول، روما، جنیوا، ماسکو، فرانکفرٹ، لنڈن، نیروبی اور قاہرہ اور مشرق میں کینٹن، شنگھائی، رنگون اور بنکاک تک ہوتی ہیں ۔ ڈھاکے سے نیپال اور برما جانے والے جہاز ''فوکر'' قسم کے ہیں ۔

مشرقی پاکستان میں تیز اور ارزاں نقل و حمل کے لیے پی ۔ آئی ۔ اے نے ایئر بس سروسز شروع کی ہیں ۔ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے بھی سفر کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں ہوائی سروس کے ذریعے ان مقامات کو ملا دیا گیا ہے : ڈھاکہ، کھلنا، فریدپور، چاندپور، بیگم گنج، باریسال، بھولا، ہتیہ، سندویپ، چٹاگانگ، سراج گنج، بوگرہ، رنگپور، دیناج‌پور، اشوروی، سلہٹ، کاکس بازار، جیسور، کومیلا، کشتیا اور راجشاہی ۔ اس طرح مغربی پاکستان میں Feeder Services شروع کی گئی ہیں، جو دور دراز کے علاقوں کو بڑے شہروں سے ملاتی ہیں ۔

پاکستان وارسا کنونشن Warsaw Convention (۱۹۲۹ء) اورہیگ پروٹوکول Hague Protocol (۱۹۵۵ء) کے علاوہ مانٹریال کی بین الاقوامی تنظیم برائے شہری ہوا بازی (International Civil Aviation Organization) اور لنڈن کی دولت مشترکہ ایئر ٹرانسپورٹ کونسل (Common Wealth Air Transport Council) کا رکن ہے ۔ جن ممالک سے پاکستان نے ہوابازی کی بابت معاہدے کیے ہیں ان کے نام یہ ہیں: افغانستان، آسٹریلیا، بلجیم، کینیڈا، سیلون، چین، کینیا، تنزانیا، یوگنڈا، حبشہ، فرانس، مغربی جرمنی،

بھارت، انڈونیشیا، ایران، عراق، اٹلی، جاپان، کویت، لبنان، نیدر لینڈ، فلپائن، پولینڈ، پرتگال، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، سوئٹزر لینڈ، شام، ترکی، مصر، برطانیہ، امریکہ اور روس.

ہوائی اڈوں کی ترقی : قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کراچی کا صرف ایک ہی بڑا ہوائی اڈا تھا، لیکن اب متعدد ہوائی اڈے تعمیر ہو چکے ہیں ۔ ڈھاکے میں ایک نیا بین الاقوامی جٹ ہوائی اڈا زیر تعمیر ہے ۔ لاہور، راولپنڈی اور چٹاگانگ کے مقامات پر جٹ ہوائی اڈے تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے ۔ حیدر آباد میں ایک طیارہ گاہ کام کر رہی ہے ۔ پی آئی اے کی فیڈر سروسز کے لیے سکھر، رحیم یار خان، پسنی، گوادر، وغیرہ کی طیارہ گاہوں کی تعمیر زیر تجویز ہے ۔ مشرقی پاکستان میں پی آئی اے کی ہیلی کاپٹر سروسز کے لیے heliports تعمیر کی گئی ہیں ۔ لائلپور، چترال، کومیلا، چٹاگانگ اور گلگت کے مقامات پر موجودہ سہولتوں کو بہتر بنایا گیا ہے ۔ کومیلا، سلہٹ اور اشوروی کی طیارہ گاہوں کے رن ویز کی تجدید کی گئی ہے ۔ چک لالہ کا ہوائی اڈا بھی بہتر بنایا گیا ہے .

مواصلات : نظام مواصلات، نیز اعانات ہوا نوردی کی فراہمی میں ترقی ہوابازی کی ترقی کے لیے اشد ضروری ہے ۔ پچھلے چند سالوں میں اس طرف بڑی توجہ دی گئی ہے اور ایک اعلٰی درجے کا نظام مواصلات قائم کیا گیا ہے ۔ ریڈیو مواصلات کی بدولت پاکستان ہوابازی کے دوسرے مراکز، یعنی لنڈن، قاہرہ، دمشق، بیروت، تہران، بحرین، قندھار، کابل، بمبئی، کولمبو، دہلی، کلکتہ، رنگون، اکیاب اور ماسکو سے بلا واسطہ مربوط ہے ۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام طیارہ گاہوں میں Inter-Tower مواصلات کا سلسلہ فراہم کیا گیا ہے ۔ ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء میں پی - آئی - اے کو تقریباً پانچ کروڑ روپے کا منافع ہوا تھا .

(ب) رسل و رسائل

شعبۂ رسل و رسائل وزارت مواصلات کے ماتحت ہیں، جس کے ساتھ ڈاک، ٹیلیفون اور تار کی نظامتیں (Directorates) ملحق ہیں ۔ ہر نظامت کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل ہے ۔ ان محکموں میں چالیس ہزار اشخاص کل وقتی اور سولہ ہزار اشخاص جز وقتی ملازم ہیں.

محکمۂ ڈاک : ڈاک کی عام سروسز کے علاوہ یہ محکمہ مندرجۂ ذیل خدمات بھی سر انجام دیتا ہے : بینک کاری کی سہولتیں، بیمۂ زندگی، آبکاری کی ٹکٹوں کی فروخت کے ذریعے محاصل آبکاری وصول کرنا، ریڈیو لائسنس جاری کرنا، سبکدوش فوجیوں میں پنشنوں کی تقسیم، ملیریا کُش دواؤں کی فروخت، وغیرہ.

انتظامی مقاصد کے لیے ملک کو ڈاک کے چار حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے مشرقی اور مغربی حلقے مشرقی پاکستان میں اور شمالی اور جنوبی حلقے مغربی پاکستان میں ہیں ۔ حلقوں کے صدر دفاتر مشرقی پاکستان میں ڈھاکے اور کھلنا میں ہیں اور مغربی پاکستان میں لاہور اور کراچی میں ۔ ان چار حلقوں کو متعدد ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے ،جن میں سے ہر ایک کا سربراہ ایک سپرنٹنڈنٹ ہے ۔ محکمۂ ڈاک میں ایک تنظیم بیمۂ زندگی کے لیے بھی قائم کی گئی ہے، جس کا سربراہ Director, Life Insurance Organization ہے ۔ ایک تنظیم ٹکٹوں سے متعلق ہے جس کا سربراہ Controller of Stamps ہے ۔ اسی طرح ایک نظامت تربیت و تحقیق (Directorate of Postal Training and Research) بھی موجود ہے،

جس کے سات علاقائی تربیتی مراکز ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد ڈاک کے نظام میں ہر اعتبار سے توسیع و ترقی ہوئی ہے ۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں ۶۳۷۴ ڈاک خانے کام کر رہے تھے ۔ اب ان کی تعداد دگنی ہو چکی ہے (اضافے کی رفتار ایک نیا ڈاک خانہ یومیہ ہے ۔ اس رفتار کی وجہ سے اب ہر ڈیڑھ ہزار نفوس کے حصے میں ایک ڈاک خانہ آتا ہے) ۔ ڈاک کی ہر قسم کی آمد و رفت ۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں ۱۲۵ فی صد بڑھ گئی ہے ۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ڈاک کی ترسیل کا کام اب ہوائی جہازوں سے بھی لیا جاتا ہے اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے رابطہ قائم ہے ۔ مشینوں کے بتدریج استعمال سے ڈاک کی ترسیل کی رفتار کو تیز کیا جا رہا ہے، مثلاً بعض بڑے ڈاک خانوں میں مہر ثبت کرنے اور خطوط چھانٹنے کے لیے خود کار اور بجلی سے چلنے والی مشینیں مہیا کی گئی ہیں ۔ علاوہ ازیں عوام کو مزید سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے محکمۂ ڈاک نے بہت سے اقدامات کیے ہیں، مثلاً صنعتی اور تجارتی اہمیت کے اہم قصبوں میں ۱۹۵۱ء سے شبینہ سروس شروع کی گئی ہے (اب تقریباً ایک سو شبینہ ڈاک خانے کام کر رہے ہیں) اور دیہاتی علاقوں میں سفری ڈاک خانوں کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے ۔

پوسٹل لائف انشورنس ملک کی سب سے بڑی بیمہ تنظیم ہے ۔ یہ تنظیم کوئی اسی برس پہلے شروع کی گئی تھی ۔ ابتدا میں صرف ڈاک خانے کے ملازمین ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن اب ہر شخص اس سے استفادہ کر سکتا ہے ۔

ڈاک خانے کی بینکاری سے مقصود زیادہ‌تر ان دیہاتی علاقوں کے لوگوں کو بینکاری کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے جہاں دوسرے نجی بینک موجود نہیں ہیں ۔ ڈاک خانے میں شرح منافع نسبۃً زیادہ ہے ۔ مزید براں ڈاک خانہ انعامی بانڈ فروخت کرتا ہے اور ان کے انعامات کی ادائی بھی کرتا ہے ۔

محکمۂ پیغام رسانی : ملک کے سلسلۂ پیغام رسانی کے انتظامی اختیارات کراچی میں قائم نظامت تار و ٹیلی فون (Directorate of Telegraph and Telephone) کے پاس ہیں، جس کے علاقائی دفاتر کراچی، لاہور اور ڈھاکے میں ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں سلسلۂ پیغام رسانی نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس کے بعد پاکستان نے اس شعبے میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے ۔ اب تار، ٹیلیفون اور ٹیلی پرنٹر teleprinter کے نظام کے ذریعے پاکستان کا رابطہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے قائم ہے ۔ سلسلۂ پیغام رسانی کی ترقی و توسیع ان دو مقاصد کے تحت ہو رہی ہے : دیہاتی اور نسبۃً دور دراز علاقوں کو بڑے شہروں سے مربوط کرنا؛ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان حتی الامکان قریب ترین رابطہ قائم کرنا ۔

ٹیلیگراف سروس : ۱۹۴۷ء میں کوئی الگ تارگھر نہ تھا ۔ اب پاکستان میں تقریباً ۱۳۰ تارگھر موجود ہیں، اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ کیا جا رہا ہے ۔ سروس کو بہتر اور خود کار بنانے کے لیے ڈھاکے، کشتیا، کراچی، لاہور، راولپنڈی اور سکھر میں خودکار نظام قائم کیا جا رہا ہے ۔ کراچی ـ راولپنڈی؛ ڈھاکہ ـ کھلنا اور ڈھاکہ ـ کشتیا کے درمیان جدید مائکرو ویو microwave رابطے قائم کیے جا رہے ہیں ۔ اب بین الاقوامی ریڈیو ٹیلیگراف سرکٹ Radio Telegraph Circuits کے ذریعے کراچی کا تہران، پیکنگ، ماسکو، پیرس، لنڈن، نیویارک، ایمسٹرڈم، ہیمبرگ اور جدے کے غیر ملکی شہروں سے اور ڈھاکے کا لنڈن اور منیلا سے رابطہ قائم کیا گیا ہے ۔ جدید مواصلات میں ٹیلی پرنٹر

ایکسچینج سروس ایک عظیم ترقی ہے - کراچی لاہور، ڈھاکہ، چٹاگانگ، راولپنڈی اور کھلنا میں Telex Exchanges قائم کیے گئے ہیں - کوئٹے اور قندھار کے درمیان بہتر سرکٹ فراہم کیے گئے ہیں - پشاور اور کابل، نیز چٹاگانگ اور رنگون کے مابین سرکٹوں کو بھی بہتر بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں ٹیلیفونوں کی کل تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے، جبکہ شروع میں یہ تعداد صرف پندرہ ہزار تھی - اندرون ملک تمام شہروں اور قصبوں کے درمیان اور بیرون ملک مشرق اور مغرب کے تمام بڑے بڑے شہروں کے ساتھ ٹرنک سروس موجود ہے - اب ملک کے اہم شہروں کے درمیان براہ راست گفتگو ہو سکتی ہے - مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مواصلات high frequency radio telephone circuits کے ذریعے ہوتی ہے - اس وقت اس ذریعے سے کراچی اور راولپنڈی کا ڈھاکے سے، نیز پاکستان کا کئی بیرونی ممالک سے رابطہ قائم ہے - کراچی تا انقرہ براستۂ تہران ایک microwave radio relay system جون ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا - یہ sight radio relay System کی پہلی لائن تھی جس نے عمدہ قسم کی ٹیلیفون لائنز پر پاکستان کا ہمسایہ ممالک سے رابطہ قائم کیا - اس رابطے پر لنڈن کو ٹیلیفون کا ایک بلا واسطہ سلسلہ بھی مہیا کیا گیا ہے۔

اخراجات: تیسرے پنج سالہ منصوبے میں حمل و نقل اور رسل و رسائل کے لیے ۱۰ ارب ۶۱ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی (۶ ارب ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ سرکاری شعبے کے لیے) - ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں اس شعبے پر جو رقم صرف ہوئی اس کی تفصیل یہ ہے:

مشرقی پاکستان:

ریلوے	۱۵ کروڑ ۳۰ لاکھ
سڑکیں	۱۴ کروڑ ۹۶ لاکھ
IWTA	۳ کروڑ ۸۴ لاکھ
EPSC، وغیرہ	۱ کروڑ ۷۸ لاکھ
میزان	۳۵ کروڑ ۸۸ لاکھ

مغربی پاکستان:

ریلوے	۳۰ کروڑ ۳۰ لاکھ
سڑکیں	۱۸ کروڑ ۴۷ لاکھ
میزان	۴۸ کروڑ ۷۷ لاکھ

مرکزی شعبے

بندرگاہیں و جہازسازی	۵ کروڑ
شہری ہوابازی	۹ کروڑ ۹۰ لاکھ
سڑکیں	۶ کروڑ ۹ لاکھ
تار، ٹیلی فون وغیرہ	۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ
نشریات، ڈاک وغیرہ	۶ کروڑ ۲۳ لاکھ
میزان	۴۵ کروڑ ۷۲ لاکھ

کل میزان: ایک ارب ۳۰ کروڑ ۳۷ لاکھ

۱۲ - تجارت

بیرونی تجارت: قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی بیرونی تجارت زیادہ تر بھارت سے ہوتی تھی - صنعتی کارخانے اور معدنیات کے تمام معلومہ وسائل بھارت کے حصے میں چلے گئے تھے، اس لیے پاکستان مصنوعات اور معدنیات بھارت سے درآمد کرتا تھا اور بھارت کو خام مال — پٹسن اور روئی — برآمد کرتا تھا؛ لیکن ساڑھے سات ماہ کے بعد جب حالات جوں کے توں برقرار رکھنے کا معاہدہ (stand-still agreement) ختم ہوا تو بھارت نے پاکستان کے مال پر بہت زیادہ محاصل برآمد عائد کر دیے اور پاکستان کی کرنسی کو مقررہ شرح پر قبول کرنے

سے انکار کر دیا؛ چنانچہ پاکستان نے برطانیہ، مغربی یورپ، امریکہ، جاپان اور پھر اشتراکی ممالک، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے کئی ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے ۔ شروع کے کچھ سالوں میں پاکستان کی درآمدی پالیسی آزاد رہی، لیکن پھر اس کی تحدید کر دی گئی ۔ جون ۱۹۵۰ء میں پھر آزاد پالیسی اختیار کر لی گئی اور بہت سی اشیا کو کھلے عام لائسنس (Open General Lincense = OGL) کے تحت رکھ دیا گیا ۔ ۱۹۵۲ء کے آخر میں او ۔ جی ۔ ایل کو ختم کر دیا گیا ۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں فیصلہ کیا گیا کہ روپے کی قیمت میں تخفیف کر دی جائے تاکہ خام مال اور ملکی مصنوعات کی برآمد کو بڑھایا جا سکے؛ چنانچہ اگلے بارہ ماہ میں برآمدات میں ۵۲ فی صد کا اضافہ ہوا، لیکن پھر ۱۹۶۰ء تک ان میں کمی ہوتی چلی گئی ۔ اشیائے سرمایہ، فاضل پرزوں اور صنعتی خام مال کی درآمد کے لیے حکومت کی آزاد حکمت عملی کی وجہ سے درآمدات ہمیشہ برآمدات سے زیادہ رہی ہیں ۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور افراط زر کے دباؤ کو روکنے کے لیے اشیائے صرف بھی درآمد کی جاتی ہیں ۔ ۱۹۶۱ء سے لے کر برآمدات میں خاصا اضافہ ہوا ہے ۔

درآمدات : اب اشیائے صرف کی جگہ اشیائے سرمایہ اور صنعتی خام مال نے لے لی ہے ۔ ۱۹۵۲ء کے بعد سے غلہ بھی درآمدات کی فہرست میں شامل ہو گیا، تاہم ۱۹۶۰ تا ۱۹۷۰ء میں غیر ضروری اشیا کو نظر انداز کر کے اشیائے ترقی کی درآمد میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ درآمدات کی کیفیت یہ ہے : درآمدات پر صرف ہونے والے کل سرمائے کا پانچواں حصہ مشینری کی درآمد پر صرف کیا جاتا ہے؛ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں لوہے، فولاد اور غیر آہنی دھاتوں اور مصنوعات کی درآمد پر کل کا ۱۰ فی صد صرف کیا گیا (اس سلسلے میں ملکی ضروریات برابر بڑھ رہی ہیں؛ ۱۹۷۰ء تک ۱۰ لاکھ ٹن فولاد کی ضرورت ہوگی، اس کا بہت تھوڑا حصہ چٹاگانگ میں فولاد کے نئے قائم شدہ کارخانے سے پورا ہو سکے گا اور باقی درآمد کیا جائے گا) ۔ تقریباً ۱۰ فی صد نقل و حمل کے سامان پر صرف کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں آلات اور بجلی کے سامان پر کل ۷ فی‌صد خرچ کیا گیا ۔ سوختنیات ۔ کوئلا، پٹرولیم ۔ کی درآمد پر بھی بہت روپیہ صرف کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۵۷ء کے بعد غلّے کی درآمد میں بھی اضافہ ہوتا گیا ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں غلّے کی درآمد پر کل کا ۷ فی صد صرف ہوا ۔ اب ملک غلّے کی حد تک خود کفیل ہو رہا ہے ۔

برآمدات : پاکستان کی بڑی برآمدات دو قسم کی ہیں : زرعی پیداوار اور مصنوعات ۔ اول‌الذکر کی برآمد اب بھی کل کے نصف سے کہیں زیادہ ہے اور اس کا تین چوتھائی حصّہ پٹ‌سن اور کپاس پر مشتمل ہے ۔ پاکستان کی برآمدات کی یہ کیفیت ہے :

پٹ‌سن : شروع کے سالوں میں تمام پٹ‌سن برآمد کر دی جاتی تھی، لیکن اب کل پیداوار کا ۴۰ فی‌صد گھریلو مصنوعات میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں کل ۶۳ لاکھ ۶۰ ہزار گانٹھ پٹ سن پیدا ہوئی اور اس کی برآمد سے ۸۶ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کمایا گیا ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں کل ۲۳ لاکھ ۴۷ ہزار گانٹھ کپاس پیدا ہوئی اور ۲۸ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے کی مالیت کی کپاس برآمد کی گئی، لیکن یہ مقدار گھریلو صنعت میں کپاس کے استعمال اور امریکہ میں اس کی وافر پیداوار کی وجہ سے سابقہ سال کی مقدار کی بہ نسبت کم ہے؛ خام اون کی سالانہ پیداوار تقریباً ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ ہے اور اس کی برآمد سے ہونے والی اوسط سالانہ آمدنی چھے اور سات کروڑ کے

درمیان ہے؛ چمڑے اور کھالوں کی برآمد سے بھی تقریباً اتنی ہی آمدنی ہوتی ہے جتنی کہ خام اون کی برآمد سے - ۱۹۶۰ - ۱۹۶۶ء میں چھے کروڑ پونڈ چائے پیدا ہوئی اور نوے فی صد برطانیہ کو برآمد کی گئی - ملک میں چائے کا استعمال بڑھ جانے کی وجہ سے اب اس کی برآمد کم ہو رہی ہے۔ پچھلے سالوں میں مچھلی کی برآمد میں بہت اضافہ ہوا ہے - توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ڈیڑھ کروڑ روپے کی مچھلی برآمد کی جائے گی - ۱۹۶۰ - ۱۹۶۶ء میں چاول کی برآمد سے ۱۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کمایا گیا - برآمد کی جانے والی مصنوعات میں اہم‌ترین پٹ سن اور کپاس کی مصنوعات ہیں - توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ان کی برآمد سے ۸۰ کروڑ روپیہ کمایا جائے گا - ۱۹۶۰ - ۱۹۶۶ء میں برآمدات سے کل ۲ ارب ۱۷ کروڑ ۷۷ لاکھ روپیہ کمایا گیا۔

تجارت کو فروغ دینے کے لیے حکومت کے اقدامات : پاکستان میں تجارت ایک نجی کاروبار ہے اور حکومت صرف ایسے اقدامات کرتی ہے جن سے تجارت کو صحت‌مند بنیادوں پر فروغ حاصل ہو - درآمدات کے لیے حکومت ہر سال اپنی لائسنس پالیسی کا اعلان کرتی ہے اور مختلف قسم کی مراعات دے کر برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے - بین الاقوامی طور پر دو طرفہ تجارت کی راہیں دریافت کرنے کی برابر کوشش کی جاتی ہے - حکومت کی درآمدی حکمت عملی کے پیش نظر یہ مقاصد رہے ہیں : صنعتی استعداد سے مکمل استفادہ؛ برآمدی صنعتوں کی توسیع اور استحکام؛ درآمدات کو رفتہ رفتہ ملکی مصنوعات سے بدلنا؛ ایسی اشیائے صرف و صنعت کی فراہمی کو بہتر بنانا جو ملک میں پیدا نہیں ہوتیں یا کم پیدا ہوتی ہیں، وغیرہ - ان مقاصد کو ۱۹۵۹ء کے بعد سے درآمدات کی بتدریج آزاد حکمت عملی کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے درآمدات کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا؛ چنانچہ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء کی درآمدی حکمت عملی میں چھیاسٹھ اشیا کو آزاد فہرست (Free List) کے تحت، چھیانوے اشیا کو قابل اجازہ فہرست (Lincensable List) کے تحت اور بعض اشیا کو بونس درآمدی فہرست (Bonus Import List) کے تحت رکھا گیا۔

حکومت نے ملکی صنعتوں کو تحفظ دینے کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا ہے، لیکن ٹیرف کمیشن Tariff Commission تحفظ کے دعاوی کی اچھی طرح چھان بین کرتا ہے اور جب ایک مقررہ مدت کے لیے کسی صنعت کو تحفظ دیا جاتا ہے تو اس کی کارکردگی کی نگرانی کی جاتی ہے - حکومت نے برآمدات کو فروغ دینے کے لیے یہ اقدامات کیے ہیں : (۱) برآمدی بونس سکیم (Export Bonus Scheme) جنوری ۱۹۵۹ء میں شروع کی گئی - اس سے مقصود یہ تھا کہ برآمد سے کمائے ہوئے زر مبادلہ پر بونس دینے سے ملکی برآمدات کو فروغ دیا جائے - اس سکیم میں بنیادی برآمدات، یعنی خام پٹ سن، روئی، خام اون، چمڑا، کھالیں، چائے اور چاول کی بعض اقسام پہلے شامل نہ تھیں (اب ان اشیا کو بھی شامل کر دیا گیا ہے) اس طرح حاصل شدہ بونس ووچروں کو مقررہ درآمدی اشیا (جن میں اشیائے صرف، صنعتی خام مال اور اشیائے سرمایہ شامل ہیں) میں سے کسی ایک یا زیادہ اشیا کو درآمد کرنے کے لائسنس میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؛ (۲) برآمدی کریڈٹ گارنٹی سکیم (Export Credit Guarantee Scheme) مارچ ۱۹۶۲ء میں شروع کی گئی - اس کا مقصد برآمد کنندگان کو بعض ایسے مالی خطرات کے خلاف تحفظ دینا تھا جو عام طور پر بیمے کے تحت نہیں آتے - اس مقصد کے لیے پاکستان انشورنس

کارپوریشن Pakistan Insurance Corporation قائم کی گئی؛ تاہم یہ کارپوریشن تجارتی خطرات کے لیے صرف ۷۵ فی صد نقصان اور سیاسی خطرات کے لیے ۸۵ فی‌صد نقصان کو پورا کرتی ہے اور باقی خطرہ برآمد کنندہ کو خود برداشت کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ خریدار کے انتخاب میں پوری احتیاط سے کام لے؛ (۳) ادارۂ ترقی برآمدات (The Export Promotion Bureau) ۱۹۶۳ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے فرائض یہ ہیں: یہ دیکھنا کہ آیا برآمد ہونے والی اشیا مقررہ معیار کے مطابق ہیں؛ مختلف اشیا کی معینہ عرصے میں زیادہ سے زیادہ برآمد کی حد متعین کرنا اور اسے حاصل کرنے کے لیے اقدامات کرنا؛ موجودہ صنعتوں کی برآمدی استعداد کو بڑھانے کے لیے سفارشات پیش کرنا؛ بیرونی تجارت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے سفارشات پیش کرنا؛ بین الاقوامی تجارتی معاہدوں کے لیے گفت و شنید میں مدد دینا؛ تاجروں کو تجارتی مشورے دینا؛ بین‌الاقوامی تجارتی میلوں میں شرکت کرنا، وغیرہ؛ (۴) مجلس ترقی برآمدات (Export Promotion Council) مارچ ۱۹۶۴ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام ادارۂ ترقی برآمدات کو مشورے دینا اور اس سے تعاون کرنا ہے؛ (۵) برآمدی منڈیوں کا ترقیاتی فنڈ (Export Market Development Fund) جنوری ۱۹۶۶ء میں قائم کیا گیا، جس کا کام بیرونی منڈیوں کا جائزہ لینا ہے؛ (۶) پاکستان ہاؤس انٹرنیشنل لمیٹڈ Pakistan House International Ltd. اس کا مقصد پاکستان کے خواہش‌مند تاجروں کو ایک عام سروس ایجنسی مہیا کرنا ہے؛ (۷) لازمی درجہ بندی (Compulsory Grading): اس کا مقصد صنعت کاروں کو اس امر پر مجبور کرنا ہے کہ وہ برآمدی مصنوعات کو مقررہ معیار کے مطابق بنائیں؛ (۸) ڈیزائن کے مراکز (Design Centres): صنعت کاروں کو مصنوعات کے ڈیزائن اور معیار وغیرہ کے مطابق مشورے دینے کے لیے متعدد ڈیزائن سنٹر قائم کیے گئے ہیں؛ (۹) بعض اشیا کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لیے خاص برآمدی کارپوریشنیں (Export Corporations) قائم کی گئی ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات: بین الاقوامی تجارت میں پاکستان عام طور پر تجارت کی تحدیدی حکمت عملی اور بالخصوص ترقی‌پذیر ممالک کے خلاف ترقی یافتہ ممالک کی تحفظ کی حکمت عملیوں کی مخالفت کرتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اس نے واضح اور قطعی موقف اختیار کیا ہے (مثلاً یورپی مشترکہ منڈی سے متعلق)۔

محصول اور تجارت کا معاہدۂ عمومی (General Agreement on Tariffs and Trade = GATT): پاکستان اس معاہدے میں شریک ہے۔ یہ تجارت کا ایک کثیرالاطراف معاہدہ ہے، جس کا مقصد رکن ممالک کے مابین اشیا کی پیداوار میں اضافے اور مبادلے میں توسیع کرنا ہے۔ کم ترقی یافتہ ممالک کی تجارت کو بڑھانے کے لیے اس معاہدے کے متن میں تجارت اور ترقی پر ایک نئے باب کو شامل کیا گیا ہے۔

ترجیحات دولت مشترکہ (Common Wealth Preferences): ۱۹۵۱ء میں پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ایک مالیاتی معاہدہ طے پایا، جس کی رو سے تیس برطانوی اشیا پر محصول کی مراعات ختم کر دی گئیں اور بیشتر دیگر اشیا پر ترجیح کو کم کر دیا گیا۔ پاکستان نے پہلی مرتبہ ترجیحی فہرست میں چند اشیا شامل کیں۔ یہ معاہدہ پاکستان کی نئی مصنوعات کے لیے ایک اہم ترین منڈی قائم کرنے کے لیے ممد و مفید ثابت ہوا۔

یورپی مشترکہ منڈی: پاکستان نے معقول شرائط پر برطانیہ کی اس منڈی میں شمولیت کی

حمایت کی ہے ۔ پاکستان نے مجوّزہ عام بیرونی محصول (Common External Tariff) کو کم کرنے اور دولت مشترکہ کے مختلف ممالک کے لیے درآمدی اشیا کے مقرر ہونے والے حصوں کو بڑھانے کا مطالبہ کیا ہے ۔

علاقائی تعاون برائے ترقی (RCD) : ۱۹۶۴ء میں ایران، ترکی اور پاکستان کے درمیان علاقائی تعاون برائے ترقی کے لیے ایک معاہدہ ہوا، جس میں تجارت کے شعبے میں تعاون کرنا بھی شامل تھا ۔ اس سلسلے میں بہت سے ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں : (۱) پاکستان اور ترکی کے درمیان دسمبر ۱۹۶۴ء میں ایک دو طرفہ تجارتی معاہدہ ہوا ۔ توقع ہے کہ اس کی بدولت ان دو ملکوں کے درمیان تجارت کی ترقی کے لیے بین الاقوامی ڈھانچا مضبوط ہو گا؛ (۲) ہر رکن ملک میں پیدا ہونے والی ایسی اشیا کی فہرستیں بنائی گئی ہیں جن کی دوسرے رکن ممالک کو ضرورت ہے ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ رکن ممالک میں ایسی اشیا کے مبادلے کو بڑھانے کی کوشش کی جائے؛ (۳) ترکی اور پاکستان نے ایک دوسرے سے درآمدات کو بڑھانے کے لیے بخصوص اشیا کے لیے ایک ہی ملک کو اجازہ دینے (Single Country Licensing) کو بطور اصول تسلیم کر لیا گیا ہے؛ (۴) تجارت کے متعلق معلومات کا آپس میں تبادلہ کیا جاتا ہے؛ (۵) آر ۔ سی ۔ ڈی کی وزارتی مجلس کے ایک فیصلے کی رو سے تینوں ملکوں کا ایک مشترکہ ایوان تجارت قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد بین العلاقائی تجارت کو فروغ دینا، رکن ممالک میں روپیہ لگانے کے مواقع کو بڑھانا اور تجارتی میلے منعقد کرنا ہے ۔

اندرونی تجارت اور تنظیم : پاکستان کی اندرونی تجارت (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان) زیادہ تر بحری راستے سے ہوتی ہے ۔ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو برآمدات تیزی سے بڑھ رہی ہیں، کیونکہ مشرقی پاکستان کی معیشت مغربی پاکستان کی معیشت کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۔ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے زیادہ تر چھالیا، گرم مسالے، عمارتی لکڑی، پھل، سبزیاں، چاے، پٹ سن کی مصنوعات، کاغذ، ماچس اور چمڑا درآمد کرتا ہے اور اسے زیادہ تر چاول، گندم اور دیگر غذائی اشیا، روئی، تیل کے بیج، تمباکو، مشینری، سوت، ادویات، تمباکو کی مصنوعات اور فلزاتی مصنوعات وغیرہ برآمد کرتا ہے ۔

ملک میں ستر سے زیادہ تجارتی تنظیمیں قائم ہیں، جن میں پندرہ ایوان تجارت و صنعت بھی شامل ہیں ۔ سب سے بڑی تنظیم وفاق ایوانہاے تجارت و صنعت (Federation of Chambers of Commerce and Industary) ہے، جو ملک میں اور ملک سے باہر تاجروں کی نمائندگی اور ان کے مفادات کی حفاظت کرتی ہے ۔

۳۰ جون ۱۹۶۶ء کو ختم ہونے والے مالی سال کے دوران میں ۲ ارب ۸۱ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی اشیا برآمد کی گئیں اور ۳ ارب ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا سامان درآمد ہوا ۔ اہم درآمدی اور برآمدی سامان کی مالیت مندرجۂ ذیل تھی :-

درآمدات :

خوراک : ۴۲ کروڑ ۸ لاکھ

کیمیائی اشیا : ۴۰ کروڑ

برآمدات :

خام پٹ سن : ۸۲ کروڑ

پٹ سن کی مصنوعات : ۲۷ کروڑ ۷۰ لاکھ

کپاس : ۱۶ کروڑ ۷۳ لاکھ

کپاس کی مصنوعات : ۱۹ کروڑ ۳۱ لاکھ

۱۳ - مالیات

گزشتہ عشروں میں مالیات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے - ایک ترقی پذیر ملک میں حکومت کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ ملک کی مدافعت و محافظت کرے اور اندرون ملک میں امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھے، بلکہ معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی ذمے داری بھی اب اس کے فرائض میں شامل ہے - ملکی ترقی کے لیے طویل مدت کی منصوبہ بندی اور اس کو بروے کار لانے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرنا حکومت کے لیے نا گزیر امر ہے - پچھلے بیس بائیس برسوں میں حکومت کے اخراجات میں جو بیش بہا اضافہ ہوا ہے اس سے رونما ہونے والی تبدیلی کا اندازہ ہو سکتا ہے - ۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ء میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے ڈیڑھ ارب روپے خرچ کیے - اس کے مقابلے پر ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ۱۱ ارب ۷۱ کروڑ ۴ لاکھ روپے خرچ ہوے - اسی سال محض ترقیاتی منصوبوں پر ۹ ارب ۱۴ کروڑ روپے صرف ہوے - پچھلے عشرے میں اخراجات میں گرانقدر اضافے کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے اقتصادی ترقی کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔

پاکستان کا مالی سال یکم جولائی سے شروع ہو کر ۳۰ جون کو ختم ہوتا ہے - حکومت کے میزانیے کی تیاری کئی ماہ پہلے شروع ہو جاتی ہے - آئندہ سال کے لیے ہر وزارت اپنا اپنا میزانیہ تیار کرتی ہے اور اسے جانچ پڑتال کے بعد وزارت مالیات کو بھیج دیتی ہے - میزانیہ مکمل صورت میں پہلے کابینہ کے سامنے پیش ہوتا ہے، پھر منظوری کے لیے اسمبلی میں (قومی اسمبلی کی عدم موجودگی میں کابینہ کے منظور شدہ میزانیے کی توثیق صدر مملکت کرتا ہے) - وزارت مالیات منظور شدہ میزانیے کی شعبہ وار تفصیلات کو تمام متعلقہ وزارتوں کے علم میں لاتی ہے - آمد و خرچ کا فرق میزانیے میں خسارہ یا بچت ظاہر کرتا ہے - ترقیاتی منصوبوں کے لیے وزارت مالیات اور قومی منصوبہ بندی کمشن کے درمیان گہرا رابطہ اور تعاون ضروری سمجھا جاتا ہے۔

آئین کی رو سے ایک کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کا تقرر عمل میں آتا ہے - یہ عہدے دار بحیثیت کمپٹرولر قومی آمد و خرچ کی نگرانی کرتا ہے اور بحیثیت آڈیٹر جنرل تمام حسابات کی پڑتال اور محاسبے کا ذمے دار ہے - اس کے فرائض میں اس امر کا خیال رکھنا بھی شامل ہے کہ تمام اخراجات درست اور جائز ہوں اور کوئی رقم منظور شدہ رقم سے تجاوز نہ کرنے پائے، نیز وہ یہ بھی دیکھے کہ خرچ کے لیے ضروری اجازت حاصل ہو چکی ہے - آڈیٹر جنرل کو مجلس قانون ساز کے سامنے اپنی رپورٹ بھی پیش کرنا ہوتی ہے، جہاں پہلے مجلس حسابات عامّہ (Public Accounts Committee) اس کا جائزہ لیتی ہے - معمولاً ہر مالی سال کا تخمینہ قومی اسمبلی میں بحث و تمحیص اور منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے - قومی اسمبلی کو یہ اختیار ہے کہ وہ زر مطالبہ کی منظوری دینے سے انکار کر دے یا اس رقم میں تخفیف کر دے - نئے ٹیکس قومی اسمبلی کی منظوری کے بغیر عائد نہیں کیے جا سکتے - میزانیہ ایک طرف تو حکومت کے آمد و خرچ میں توازن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف معاشرتی اور اقتصادی اہمیت کے امور کی نشان دہی کرتا ہے - طویل المدت منصوبوں کے لیے قومی اسمبلی کی پہلی مرتبہ کی منظوری کافی ہوتی ہے۔

حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ محاصل (ٹیکس) کی وصولی ہے - مرکزی حکومت میں ٹیکس کے معاملے میں سب سے با اختیار ادارہ مرکزی ریونیو بورڈ (Central Revenue Board) ہے - آب کاری اور

کسٹم کے محاصل کے ضمن میں مرکزی حکومت کو قانون سازی کے خصوصی اختیارات حاصل ہیں اور یہ محاصل حکومت کی آمدنی کی اہم مدات میں شمار ہوتے ہیں - ٹیکسوں میں سیلز ٹیکس بھی قابل ذکر ہے - یہ ٹیکس پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں عائد کیا گیا اور ۱۹۵۱ء میں اسے موجودہ شکل دی گئی - حکومت کی کل آمدنی کا ۳۰۰۳ فیصد کسٹم سے، ۲۳۰۲ فیصد آبکاری سے، ۱۳۰۳۸ فیصد انکم ٹیکس سے اور ۱۷۰۰۴ فیصد سیلز ٹیکس سے وصول ہوتا ہے - مرکزی حکومت کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ اخراجات میں اسی تناسب سے اضافہ ہو گیا ہے - اس اضافے کے اسباب میں قومی دفاع، انتظام مملکت اور قومی قرضوں پر سود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل مرکز کے ہاتھ میں جو محاصل تھے ان میں درآمد، آمدنی، کارپوریشن، ریلوے، ڈاک اور تار کے محاصل قابل ذکر ہیں - قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی بکثرت آمد اور قومی دفاع کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش‌نظر کچھ تبدیلیاں معرض ظہور میں آئیں - مرکزی حکومت کے ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء اور ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء کے میزانیوں میں تھوڑا بہت رد و بدل کیا گیا: ریلوے کے مالیات کو عام میزانیہ میں شامل کر لیا گیا؛ وصول شدہ محاصل کے ذریعے آمدنی میں صوبائی حکومتوں کی شرکت کو عارضی طور پر ختم کر دیا گیا؛ فروخت پر محاصل کو، جو صوبائی حکومتوں کی آمدنی کا ذریعہ تھا، مرکزی حکومت کے سپرد کر دیا گیا، البتہ یہ شرط عائد کر دی گئی کہ اس آمدنی کا ۵۰ فی صد صوبائی حکومتوں کو دیا جائے گا۔

۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کو ایک صوبے میں مدغم کر دینے سے سیاسی حالات کے ساتھ مالی حالات میں بھی تبدیلی ناگزیر تھی، اس لیے دسمبر ۱۹۶۱ء میں مالی حالات کا جائزہ لینے اور نئی تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک مالیات کمیشن (Finance Commission) مقرر کیا گیا، جس کی سفارشات پر ۵ جون ۱۹۶۲ء کو مغربی اور مشرقی دونوں صوبوں کے میزانیے کے لیے مرکزی حکومت کی مختلف مدات میں سے مختلف فیصد تناسب مقرر کیے گئے - مارچ ۱۹۶۴ء میں آئین کی دفعہ ۱۴۴ کے تحت مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان آمدنی کی متناسب تقسیم کے لیے ایک اور مالیات کمیشن مقرر کیا گیا - اس کمیشن نے ترقیاتی منصوبوں اور اقتصادی ضرورتوں کے پیش نظر تیسرے منصوبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرکز اور دونوں صوبوں کے لیے آمدنی کے حصوں سے متعلق جو سفارشات پیش کیں انھیں منظور کر لیا گیا؛ چنانچہ آمدنی، فروخت، آبکاری (بشمول چائے، تمباکو اور چھالیا) اور پٹ سن اور روئی کی برآمد سے وصول ہونے والے محاصل کا ۶۵ فیصد دونوں صوبوں کے لیے اور ۳۵ فیصد مرکز کے لیے مقرر ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد بینک کاری میں بڑا انقلاب رونما ہوا - ۶۳۱ بینکوں میں سے صرف ۱۹۵ بینک رہ گئے، باقی تمام بینک بھارت کو اٹھ گئے - ریزرو بینک آف انڈیا ۱۹۴۸ء تک پاک و ہند دونوں ملکوں کے لیے کام کرتا رہا - بینک دولت پاکستان (State Bank of Pakistan) جولائی ۱۹۴۸ء میں معرض وجود میں آیا - کاروبار اور تجارت کی بینک کاری کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۴۹ء میں نیشنل بینک آف پاکستان قائم کیا گیا، جس میں ایک چوتھائی سرمایہ حکومت پاکستان نے لگایا - نیشنل بینک نے بینکاری کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے - زراعت اور

صنعت و حرفت کی ترقی اور رہائشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کئی خاص بینک اور مالیاتی ادارے بھی قائم کیے گئے ۔ زراعت کی ترقی کے پیش نظر دیہاتی قرضوں کے سلسلے میں کوآپریٹو (= امداد باہمی) بینکوں نے بھی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ھیں ۔ ان کے ذریعے کم سے کم شرح پر روپیہ مہیا کیا گیا اور روپے کی واپسی کے لیے بڑی سہولتیں فراھم کی گئیں۔

بینکاری کی طرح بیمہ کمپنیوں نے بھی قیام پاکستان کے بعد بڑی ترقی کی ۔ اس سلسلے میں ملکی اور غیر ملکی بیمہ کمپنیوں نے ھر طرح کی سہولتیں مہیا کر کے بیمے کے ھر میدان میں خدمت کی۔

مالیاتی نظام کے سلسلے میں کئی ایک ادارے قائم کیے گئے، جن میں صنعتی ترقی، صنعتی قرضہ اور زراعتی ترقی کے لیے الگ الگ بینک اور کارپوریشن برائے تعمیر مکانات خاص طور پر قابل ذکر ھیں۔

۱۹۴۹ء میں کراچی صرافہ (Stock Exchange) قائم ھوا ۔ ۱۹۵۴ء میں ایک صرافہ ڈھاکے میں بھی قائم کر دیا گیا ۔ ۱۹۶۰ء میں صرافے کی سرگرمیاں وسیع ھوگئیں ۔ بونس سکیم کی وجہ سے بونس واؤچر بھی صرافے میں باقاعدہ شامل کر لیا گیا۔

بین الاقوامی حالات بالخصوص پاؤنڈ سٹرلنگ اور ھندوستانی سکے کی قیمت گر جانے کی وجہ سے پاکستان کی مالیات کو کئی بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ جب ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی سکے کی قیمت کو گرایا نہیں جائے گا تو درآمدی عوامل کی افواھوں اور سٹہ بازی کے رجحانات نے کئی ایک مشکلات کا خطرہ پیدا کر دیا، لیکن غیر ملکی زر مبادلہ کے سلسلے میں سٹیٹ بینک کی دانشمندانہ روش آڑے آئی اور حالات مخدوش ھونے سے بچ گئے ۔ ۱۹۵۳ء سے سرکاری اخراجات میں معتدبہ اضافہ ھونے لگا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ھر سال خسارے کا میزانیہ چلنے لگا ۔ ۱۹۵۵ء میں سکے کی قیمت گر جانے سے اور مابعد کے اثرات نے مزید مشکلات پیدا کر دیں ۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں حکومت خسارے کا میزانیہ ترک کر کے نئی راہ پر گامزن ھوئی ۔ پاکستان میں سٹیٹ بینک کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ شرح تین فیصد سے چار فیصد ھو گئی ۔ اس کے ساتھ ھی تجارتی بینکوں اور قرضہ دینے والے اداروں کی شرح میں اضافہ ھو گیا، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ نجی قرضوں کی رفتار سست پڑ گئی، لیکن اس کے بالمقابل سرکاری قرضوں میں نجی اداروں اور افراد نے بکثرت سرمایہ لگانا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے حکومت کو نجی قرضے حاصل کرنے میں نمایاں کامیابی ھوئی۔

۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کے بجٹ میں آمدنی، اخراجات اور سرمایہ کاری کے مصارف کا اندازہ لگانے کے بعد کوئی ۳۹ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے کے خسارے کا تخمینہ لگایا گیا تھا، جسے پورا کرنے کے لیے ۴۰ کروڑ ۳ لاکھ روپے کے نئے ٹیکس لگائے گئے ھیں ۔ اس طرح سال رواں (۱۹۷۰ - ۱۹۷۱ء) کے میزانیے میں ۱۴ لاکھ روپے کی معمولی بچت دکھائی گئی ھے ۔ بیشتر رقم ترقیاتی کاموں پر صرف کی جائے گی ۔ دفاع کے لیے تین ارب روپے کی رقم مخصوص کی گئی ھے ۔ مغربی پاکستان کے چاروں نئے صوبوں کو ایک ارب ۴۵ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے کی رقم دی جا رھی ھے (یہ رقم آمدنی میں شامل نہیں کی گئی) ۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کے لیے ۲ ارب ۹۲ کروڑ روپے رکھے گئے ھیں اور مغربی پاکستان کو اس مقصد کے لیے ۱۵ کروڑ روپے ملیں گے ۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مرکزی

منصوبوں کی تکمیل کے لیئے ایک ارب روپے صرف کیے جائیں گے۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں پاکستان کو ۳ ارب ۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کی غیر ملکی امداد ملے گی جبکہ ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں یہ امدادی رقم ۲ ارب ۷۷ کروڑ ۳ لاکھ تھی۔

۱۴ - بین الاقوامی اقتصادی تعاون

دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان نے بھی دوست ممالک اور زیادہ خوش حال اقوام سے خاصی اقتصادی امداد حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں یہ امداد معمولی تھی، لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد اس کے اعداد و شمار بکثرت بڑھ گئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد کو بہترین مصرف میں لایا گیا اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اپنی مساعی اور کوششوں کو برابر جاری رکھا گیا۔ ۱۹۶۰ء سے شروع ہونے والے عشرے کو اقوام متحدہ نے ترقی کا عشرہ قرار دیا اور سرمایہ دار اور خوش حال ممالک سے پرزور درخواست کی کہ وہ اپنی کل آمدنی کا ایک فیصد سرمایہ ایسی معاونت میں صرف کریں۔

پاکستان کو ہر شعبۂ زندگی میں اس لیے بھی بین الاقوامی امداد کی زیادہ ضرورت تھی کہ یہاں ترقی کا کام بالکل ناپید تھا اور آغاز کار بالکل ابتدائی مراحل سے کرنا پڑا۔ ضروری اور اہم اشیا کے علاوہ اشیاے صرف کی درآمد کے لیے بھی زر مبادلہ کی ضرورت تھی اور زر مبادلہ اپنے ملک کی پٹ سن اور روئی کی برآمد ہی سے حاصل ہوسکتا تھا، لیکن وہ اتنا نہ تھا کہ تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

گزشتہ چند برسوں میں غیر ملکی امداد کی ضرورت بوجوہ شدید ہو گئی ہے، لیکن یہ عزم مصمم بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ بیرونی امداد پر کم سے کم انحصار کیا جائے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۰-۱۹۶۵ء) میں زر مبادلہ کا ۳۶ فیصد بیرونی ذرائع سے قرضے، فنی امداد اور غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی صورت میں حاصل کیا گیا۔ پاکستان نے اپنی برآمدات سے زر مبادلہ تخمینے سے زیادہ کمایا، اس لیے بیرونی امداد کی شرح فیصد کم رہی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں یہ شرح ۳۲ فیصد رہ گئی۔

ابتدائی برسوں میں غیر ملکی امداد فنی نوعیت کی تھی اور منصوبوں کی ضروریات تک محدود تھی، لیکن ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں خراب فصلوں کی وجہ سے غلے کی قلت کے زمانے میں امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا سے گندم کے جہاز آئے۔ ۱۹۵۴-۱۹۵۵ء میں امریکہ نے پہلی مرتبہ فالتو غلے کی پیشکش کی۔ اب غیر ملکی امداد کی مندرجۂ ذیل پانچ صورتیں ہیں:

(الف) فنی امداد: پاکستانیوں کی فنی تربیت، غیر ملکی ماہرین اور مشیروں کی خدمات، تربیتی اور تحقیقی اداروں کے لیے سامان کی فراہمی؛ (ب) منصوبوں کی امداد بصورت اشیاے ضروریہ اور ماہرین کی خدمات، جو منصوبوں کے لیے کارآمد ہوں؛ (ج) خام مال، سوختنی اشیا، زائد پرزے، اور دیگر ضروری سامان رسد؛ (د) غلہ؛ (ہ) فوری ضرورت اور ہنگامی حالت میں امداد، مثلاً طوفان زدہ علاقے کی امداد۔ پہلی دو تو خالص سرمایہ کارانہ نوعیت رکھتی ہیں، تیسری میں لوہا اور فولاد شامل ہیں اور وہ ترقیاتی مقاصد پورے کرتی ہے؛ غلے کی فراہمی بھی بیشتر یہی مقصد لیے ہوئے ہے۔ ریاستہاے متحدۂ امریکہ اور کینیڈا سے درآمد شدہ اجناس کی فروخت سے آمدنی بینک دولت پاکستان میں جمع کرا دی جاتی ہے اور معطی حکومتوں کے مشورے سے پاکستان میں ترقیاتی منصوبوں پر

صرف کی جاتی ہے ۔ اس طرح بیرونی امداد کا معتدبہ حصہ اقتصادی ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔

امداد کی جانب سب سے پہلے اقوام متحدہ نے قدم اٹھایا اور ۱۹۴۸ء کے اجلاس عام میں رکن ممالک کو خطیر رقوم دینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ہر ملک کی حکومت اپنا معیار معیشت بلند کر سکے اور مسئلۂ بےروزگاری کا موزوں حل تلاش کر کے اپنے اقتصادی و معاشرتی حالات کو بہتر بنا سکے ۔ اس میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ اقتصادی اور معاشرتی امور کی مجلس (UNESCO) اور دوسرے عالمی ادارے ترقی پذیر ممالک کے تمام اقتصادی پہلوؤں کو ترقی دینے کے لیے مزید غور و خوض کریں ۔ جہالت، افلاس اور بھوک کے خلاف جہاد کرنے کے لیے ۱۹۵۰ء میں فنی امداد کا ایک وسیع تر پروگرام بھی پیش کیا گیا ۔ یہ پروگرام اقوام متحدہ کے مخصوص اداروں کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے ۔ پاکستان ان اداروں سے سامان کی فراہمی، فنی مہارت اور تربیت کی سہولتوں کی صورت میں امداد حاصل کرتا ہے ۔ بیرونی ممالک کے ماہرین کے تعاون سے جامع قسم کے اقتصادی اور معاشرتی جائزے لیے جاتے ہیں، نیز ایسی ماہرانہ تحقیقات بھی کی جاتی ہیں جن سے ملک کے اہم اقتصادی پہلو متأثر ہوتے ہیں ۔ ''یونسکو'' کا ایک مستقل نمائندہ ہمارے ملک میں مقیم ہے، فوری اور اہم ضروریات کو اوّلیت دی جاتی ہے اور اس کے لیے فنڈ مہیا کیے جاتے ہیں؛ دیگر ضروریات کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے اور مالی حالات کے سازگار ہونے کی صورت ہی میں ان کی باری آتی ہے ۔

ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے کولمبو پلان تیار کیا گیا ۔ اس منصوبے کے تحت کینیڈا، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان سے پاکستان کو امداد ملی ۔ انگلستان اور جاپان نے تربیتی سہولتیں مہیا کیں اور دوسرے ممالک بالخصوص کینیڈا نے اس کے علاوہ سرمایہ بھی فراہم کیا ۔

ریاستہاے متحدۂ امریکہ نے ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے چار نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان سے بھرپور تعاون کیا ۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے عطیات اور قرضے دیے اور خام مال، صنعتی مشینیں، ہوائی جہازوں کے پرزے، ادویات وغیرہ کی شکل میں دست تعاون بڑھایا ۔ امریکہ کا زائد از ضرورت غلہ بھی امدادی اشیا کی فہرست میں شامل ہے ۔

اسی طرح سینٹو CENTO اور سیٹو SEATO کے ذریعے بھی پاکستان مختلف النوع امداد لیتا رہا ۔ امریکہ کے مختلف بینکاری اور رفاہی اداروں کا تعاون بھی حاصل رہا، جس میں برآمد و درآمد کے بینک اور فورڈ فاونڈیشن کی خدمات قابل قدر ہیں ۔ عالمی بینک نے بھی بڑی نمایاں خدمات انجام دیں، بالخصوص مالی اور فنی معاونت میں پاکستان سے بڑا تعاون کیا ۔ ۱۹۶۱ء میں عالمی بینک نے ان ممالک کی ایک مجلس کا انعقاد کیا، جو پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں دست تعاون بڑھانے کے خواہش‌مند تھے ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اکیلے اکیلے امداد دینے کے بجاے سب مل کر پاکستان کی مجموعی ضروریات کو پنجسالہ منصوبہ کے تحت پایۂ تکمیل کو پہنچائیں ۔ ان ممالک میں کینیڈا، جرمنی، جاپان، انگلستان اور ریاستہاے متحدۂ امریکہ نے مشترکہ طور پر دوسرے اور تیسرے پنجسالہ منصوبوں کے لیے بیرونی نوعیت کی امداد کے سلسلے میں کفالت کی ۔ چند ملکوں نے مشترکہ اورالگ الگ بھی تعاون کیا ۔

اشتراکی ممالک میں سے چین، چیکوسلوواکیہ، پولینڈ، روس اور یوگوسلاویہ نے پاکستان کی امداد میں بھرپور حصہ لیا ہے ۔ ان ممالک کی شرائط

نسبۃً آسان تھیں اور قرضے کی ادائی پاکستانی اجناس کی صورت میں اور بیس سال کے طویل عرصے میں بہت ہی خوش‌آئند اور خوش‌گوار نظر آتی۔

سیٹو اور سینٹو کا قیام ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں علی الترتیب عمل میں آیا۔ اگرچہ یہ دونوں بنیادی طور پر دفاعی معاہدے کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر بھی وہ اقتصادی امور میں تعاون کرتے ہیں۔ ایران، ترکی، پاکستان، انگلستان اور امریکہ سینٹو کے ارکان ہیں۔ اس ادارے کے ذریعے فنی تعاون کی صورت میں اقتصادی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ نے ذرائع آمد و رفت کی ترقی میں معاونت کی ہے۔ سیٹو کے ارکان کی تعداد آٹھ ہے، یعنی آسٹریلیا، فرانس، نیوزی لینڈ، پاکستان، فلپائن، تھائی لینڈ، انگلستان اور امریکہ۔ یہ ادارہ زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز کرتا ہے کہ ادارے کے رکن ممالک میں ماہرین کی کمی کو کس طرح دور کیا جائے۔

بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد پر کچھ قدغن بھی لگائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ترقیاتی قرضے زیادہ افادیت کھو دیتے ہیں، مثلاً قرضہ دینے والے بعض ممالک یہ شرط عائد کر دیتے ہیں کہ انہیں کے ملک کے ماہرین کو منصوبوں کی تکمیل کے لیے ملازم رکھا جائے اور انہیں کے ملک سے سامان وغیرہ خریدا جائے۔ ایسی شرائط کی موجودگی میں اکثر اوقات اشیا خاصی مہنگی پڑتی ہیں اور بھاری قیمتیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے قرضوں کی شرح سود بھی ۷ فیصد تک ہوتی ہے، جو خاصی زیادہ ہے۔ پھر قرضے کی ادائی کے لیے بھی یہ شرط عائد کر دی جاتی ہے کہ اسے غیر ملکی سکے میں ادا کیا جائے۔ پاکستان نے ہمیشہ ان کڑی اور غیر مواقف شرائط کے خلاف احتجاج کیا، لیکن اس معاملے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔

ایران، پاکستان اور ترکی نے مل کر ایک ترقیاتی ادارہ آر۔سی۔ڈی RCD کے نام سے ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو قائم کیا۔ تینوں ملکوں کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قومی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے نیز امن و استحکام کے لیے علاقائی تعاون نہایت ضروری ہے۔ چونکہ ان ملکوں کے تاریخی اور ثقافتی روابط بڑے قدیم اور مضبوط ہیں، اس لیے وہاں کے عوام کے لیے بنیادی طور پر یہ ادارہ بڑا کار آمد ثابت ہوگا۔ اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ باہمی تعاون سے آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دی جائے، تینوں ملکوں کے تجارتی اداروں کے درمیان گہرے روابط پیدا کیے جائیں، ان ممالک کے درمیان ہوائی جہازوں کی پروازوں میں اضافہ اور انہیں سستا کیا جائے، ڈاکخانے کی شرح کم کی جائے اور تینوں ملک ایک دوسرے کو فنی امداد کے سلسلے میں ماہرین مہیا کریں اور تربیتی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

پاکستان بھی کولمبو منصوبے کے تحت بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک کو مختلف قسم کی فنی تربیت دے رہا ہے اور اپنے ماہرین فن کے ذریعے ان ملکوں کی فنی اور اقتصادی امداد بھی کر رہا ہے۔ پاکستان نے آر۔سی۔ڈی کے انداز کا ایک معاہدہ ۱۹۶۴ء میں انڈونیشیا سے کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعاون پیدا کیا جائے۔ اس ادارے کو IPECC (Indonesia-Pakistan Economic Cultural Co-operation = انڈونیشیا اور پاکستان کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعاون کی مجلس) کا نام دیا گیا اور اس کا صدر دفتر جکارتا میں تجویز کیا گیا۔ اس کے تحت پاکستان نے انڈونیشیا کو کپاس اور پٹ سن کی مصنوعات خریدنے کے لیے قرضہ دیا۔

۱۵ - تعلیم

پاکستان میں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے، گو اب اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق صرف ۱۵٫۹ فی صد لوگ خواندہ تھے - ۱۹۶۹ء تک خواندگی کا تناسب ۱۷ فی صد ہو گیا - گویا ساڑھے دس کروڑ کی آبادی میں صرف ڈیڑھ کروڑ افراد خواندہ ہیں اور ان خواندہ افراد میں سے بھی پچاس فی صد لوگ ایسے ہیں جن کی تعلیم پانچویں جماعت تک ہے -

خواندگی کا یہ تناسب دیہات میں اور بھی کم ہے - ۱۹۶۱ء میں جب کہ شہری آبادی میں ۳۰٫۲ فیصد لوگ خواندہ تھے دیہات میں صرف ۱۳٫۶ فی صد لکھ پڑھ سکتے تھے - اسی طرح خواتین میں ناخواندگی کی شرح مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے - ہر سو خواندہ مردوں کے مقابلے میں صرف ۲۹ خواتین خواندہ ہیں - خواندہ آبادی کا ۱۳٫۱ فی صد ایسے افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے باقاعدہ مدارس میں تعلیم نہیں پائی، ۵۰٫۳ فی صد نے ابتدائی درجے تک تعلیم حاصل کی ہے اور ۲۱٫۵ فی صد نے وسطانی درجے (جماعت ہشتم) تک تعلیم پائی ہے - ثانوی درجے تک پہنچنے والوں کا تناسب ۱۰٫۵ فی صد ہے اور یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے والے خواندہ آبادی کا صرف ۰٫۶ فی صد ہے -

اس وقت پاکستان میں تعلیم کے مسئلے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ خواندگی کی شرح کو بڑھایا جائے اور ابتدائی سطح پر بچوں کے لیے وافر تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں - دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خواندگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم کو بہتر بنایا جائے تاکہ پاکستانی معاشرے کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں تربیت یافتہ افرادی طاقت مناسب تعداد میں موجود رہے - پاکستان کے ماہرین تعلیم اور ترقیاتی منصوبہ بندی کے ارا کین ان دونوں پہلوؤں کی طرف مناسب توجہ دے رہے ہیں - افرادی طاقت اور تعلیم کے جو کمیشن قائم کیے گئے ان کی غرض و غایت بھی یہی ہے -

انتظامی ساخت : تعلیم کا انتظام و انصرام صوبائی حکومتوں کے ذمے ہے - صوبوں میں صوبائی سطح پر تعلیمی سیکرٹریٹ قائم ہیں، جن میں عمومی اور فنی تعلیم کے الگ الگ شعبے ہیں - مشرقی پاکستان میں تعلیم کی صرف دو نظامتیں (directorates) ہیں: ایک عمومی تعلیم کے لیے اور دوسری فنی تعلیم کے لیے - اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں اس کے وسیع تر رقبے کے پیش نظر آٹھ نظامتیں ہیں، جن میں سے دو فنی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں - ہر حلقے کی نظامت تعلیم کا سربراہ ناظم (Director) تعلیمات ہوتا ہے - ہر نظامت مزید انتظامی وحدتوں میں بٹی ہوئی تھی - ہر قسمت (division) میں مردانے اور زنانے مدارس کے انتظام کے لیے جدا جدا ناظر (Inspector)/ناظرہ (Inspectress) ہوتے ہیں - ابتدائی تعلیم کا انتظام البتہ ضلعی سطح پر کیا گیا ہے اور یہ ذمے داری ضلعی ناظر / ناظرۂ مدارس کے سپرد ہے -

وسطانی مدارس تک نصاب کی تدوین اور امتحانات لینے کی تمام تر ذمے داری مختلف نظامتہائے تعلیم کے سپرد ہے، لیکن ثانوی اور اعلٰی ثانوی (انٹرمیڈیٹ) مدارج میں یہ کام سکینڈری و انٹرمیڈیٹ بورڈوں کو سونپا گیا ہے - مغربی پاکستان میں ایسے چھے تعلیمی بورڈ قائم ہیں اور مشرقی پاکستان میں چار - اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں فنی تعلیم کے لیے الگ الگ بورڈ کام کر رہے ہیں - تعلیمی اور فنی بورڈ اپنے اپنے حلقوں کے ثانوی، اعلٰی ثانوی اور فنی تعلیم کے اداروں کو الحاق کی

منظوری دیتے ہیں اور نصاب کی تشکیل، امتحانات کے انعقاد اور اسناد کی تقسیم کا کام سر انجام دیتے ہیں ۔ یہ بورڈ اپنی ملحقہ تعلیمی اور فنی درسگاہوں میں اساتذہ کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ قابلیت کا تعین بھی کرتے ہیں ۔ یہ بورڈ براہ راست صوبائی معتمد تعلیم کے ماتحت ہیں اور اپنی کارکردگی کے لیے اسی کو جواب دہ ہیں ۔ اعلٰی ثانوی درجے کے بعد کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹیوں کے سپرد ہے ۔ یہ یونیورسٹیاں اگرچہ زیادہ تر سرکاری امداد سے چلتی ہیں، لیکن اپنے داخلی معاملات میں یہ بہت حد تک خود مختار ہیں ۔ صوبے کا گورنر تمام صوبائی یونیورسٹیوں کا چانسلر ہوتا ہے اور ہر یونیورسٹی کے نظام کو چلانے کے لیے ایک وائس چانسلر مقرر کرتا ہے ۔ ہر یونیورسٹی اپنے مخصوص علاقے میں قائم کالجوں کا الحاق کرتی ہے اور ان کالجوں اور اپنے تدریسی شعبوں کے لیے نصاب کا تعیّن، اساتذہ کے تقرر کی منظوری، امتحانات کا انعقاد، اسناد کی تقسیم وغیرہ کے فرائض سر انجام دیتی ہے ۔ اس وقت (۱۹۶۹ء تک) مغربی پاکستان میں سات اور مشرقی پاکستان میں پانچ یونیورسٹیاں قائم ہیں.

تعلیم کا انتظام و انصرام اگرچہ صوبائی حکومتوں کی تحویل میں ہے تاہم مرکزی حکومت تعلیم کے فروغ میں صوبائی حکومتوں کا بہت ہاتھ بٹاتی ہے ۔ اس کے علاوہ مرکزی دارالحکومت میں بھی وہی تعلیمی سہولتیں فراہم کرتی ہے ۔ اس مقصد کے لیے مرکز میں ایک الگ نظامت تعلیم قائم ہے، البتہ امتحانات اور نصاب وغیرہ کے معاملے میں مرکزی حکومت کے مدارس اور کالج اپنے اپنے علاقے کے تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں ۔ مرکزی حکومت میں وزارت تعلیم بھی موجود ہے، جس میں وزیر، معتمد، شریک معتمد، کئی نائب معتمد اور نائب مشیر اور معاون مشیر تعلیم مقرر ہیں ۔ وزارت تعلیم قومی سطح پر وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر تعلیمی پالیسی بناتی ہے اور صوبائی محکمہ ہاے تعلیم کی رہنمائی کے لیے خطوط و اشارات مرتب کرتی ہے تاکہ ملک بھر میں ایک ایسا نظام تعلیم نافذ کیا جا سکے جو پاکستان کے نظریاتی، قومی، مذہبی، ثقافتی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، صنعتی اور زرعی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو؛ چنانچہ دونوں صوبوں میں تعلیمی ہم آہنگی پیدا کرنا، تعلیمی ترقیاتی منصوبے بنانا اور قومی سطح پر عمومی اور فنی تعلیم کا ایک متوازن نظام رائج کرنا اسی وزارت کی ذمےداری ہے ۔ مرکزی وزارت تعلیم نے مندرجۂ ذیل تین ادارے قومی سطح پر قائم کر رکھے ہیں : (۱) بین الجامعی بورڈ؛ (۲) مرکزی کونسل براے فنی تعلیم؛ (۳) مرکزی کونسل براے اعلٰی تعلیم.

مصارف تعلیم :قیام پاکستان کے وقت تعلیم کے مصارف مجموعی قومی پیداوار (GNP) کے ایک فی صد سے بھی کم تھے ۔ اب یہ شرح بڑھتے بڑھتے ۲۰۳ فی صد ہو گئی ہے ۔ حکومت اسے ۴۰۶ فی صد تک لے جانے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ ترقی پذیر ممالک کی ایک بین الاقوامی کانفرنس (منعقدۂ کراچی ۱۹۶۰ء) نے یہی سفارش کی تھی کہ تعلیمی مصارف ہر حکومتیں مجموعی پیداوار کا کم از کم ۴۰۶ فی صد خرچ کریں ۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں پاکستان میں تعلیم پر تہتّر کروڑ کی رقم خرچ کی گئی ۔ قومی سطح پر منصوبہ بندی کرتے وقت تعلیمی ترقیات کے لیے کثیر رقوم مخصوص کی جاتی رہی ہیں؛ چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے چھیالیس کروڑ، دوسرے منصوبے میں ایک ارب پانچ کروڑ اور تیسرے منصوبے میں ۲ ارب ۳۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی

رقم مخصوص کی گئی ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تعلیم پر دس روپے فی طالب علم کے حساب سے رقم خرچ ہوئی۔

مدارج تعلیم : پاکستان میں مدارج تعلیم دیگر ترقی‌پذیر اور ترقی‌یافتہ ممالک کے مدارج تعلیم سے بہت حد تک ہم آہنگ ہیں۔

ابتدائی تعلیم : پاکستان کے آئین کی رو سے مفت ابتدائی تعلیم ہر پاکستانی بچے کا حق ہے، لیکن مالی مشکلات اور دیگر عوامل کے باعث پاکستان کے سب بچے ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت کل ستر لاکھ بچے ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں، یعنی پانچ سے نو برس کی عمر کے بچوں کی کل آبادی کا تقریباً ۵۰ فی صد۔ ملک میں ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۶۰۹۷۲ ابتدائی مدارس تھے۔ اس تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ہر سال چار ہزار نئے مدارس کھولے جا رہے ہیں۔ گویا ہر سال تقریباً زید چار لاکھ بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۰ء تک پانچ سے نو سال کی عمر کے بچوں کا ۷۰ فی صد ابتدائی تعلیم سے مستفیض ہو سکے گا، ۱۹۷۵ء تک پانچویں جماعت تک تعلیم کی سہولت اس عمر کے سو فی صد بچوں کے لیے حاصل ہوگی، اور ۱۹۸۵ء تک آٹھویں جماعت کی تعلیم سب کے لیے لازم ہو گی۔

ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے کل بچوں کا ۹۰ فی صد سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور ان بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ باقی ۱۰ فی صد بچے ایسے نجی اداروں میں پڑھتے ہیں جنھیں فلاحی انجمنیں اور سماجی یا مذہبی تنظیمیں چلاتی ہیں؛ ان میں سے اکثر کو سرکاری امداد ملتی ہے۔ بعض ادارے بچوں سے فیس لیتے ہیں اور انھیں حکومت کی طرف سے گرانٹ نہیں ملتی۔

مشرقی پاکستان ابتدائی تعلیم کی سہولتوں کے اعتبار سے مغربی پاکستان سے کچھ آگے ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مغربی پاکستان کے پانچ سے نو برس کی عمر کے بچوں کا ۳۶ فی صد زیر تعلیم تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ تناسب ۴۸ فی صد تھا۔ ابتدائی سطح پر تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں بھی بڑا تفاوت ہے۔ لڑکیوں کا تناسب کل بچوں کی تعداد کا صرف ۲۰۵ فی صد ہے۔ اسی طرح شہروں کی بہ نسبت دیہات میں تعلیمی سہولتوں کی کمی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ ضیاع کو روکنے کا ہے۔ مدرسے میں داخل ہونے والے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد افلاس، بیماری، حالات کی ناساعدت اور دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر تعلیم کو مکمل کرنے سے پہلے ہی مدرسے کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ بعض علاقوں میں تو پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کا صرف ۱۰ فی صد پانچویں جماعت تک پہنچ پاتا ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ تیسرے منصوبے کے آخر تک کم از کم ۵۰ فی صد بچے پانچویں جماعت تک ضرور پہنچ جایا کریں۔

نصاب : ابتدائی تعلیم کا مقصد بچوں کو ایسی بنیادی مہارتوں سے لیس کرنا ہے جو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اس سطح پر طلبہ اور طالبات کا ایک طبقہ تو ایسا ہے جو صرف پانچویں جماعت تک حاصل کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہے جو اس کے بعد تعلیم جاری رکھتا ہے، چنانچہ نصاب میں ان دونوں طبقوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ نصاب میں پڑھنے، لکھنے اور روزمرہ کے حساب کتاب کے

علاوہ اسلامیات، معاشرتی علوم، ابتدائی سائنس، آرٹ اور عملی فنون ایسے مفید مضامین بھی شامل ہیں اور ایسی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن سے بچوں کی متوازن اور بھرپور نشو و نما ممکن ہو اور ان کی سیرت کی مناسب تشکیل ہو سکے۔ دینی تعلیم کو پورے نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اسی کے ذریعے بچے اسلامی تہذیب و تمدن سے روشناس ہوتے ہیں اور یہی وہ فعّال قوت ہے جو ہمارے اندر ہمدردی، بردباری، خدمت اور ایثار ایسی صفاتِ حسنہ کو جنم دیتی ہے اور نسل و رنگ، امارت و افلاس اور بندہ و آقا کے امتیاز کو ختم کرتی ہے۔

ثانوی تعلیم: ثانوی تعلیم ابتدائی اوراعلٰی مدارج تعلیم کی درمیانی کڑی ہے۔ ایک طرف تو یہ اعلٰی تعلیم کے لیے زینے کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف اس کی حیثیت اختتامی بھی ہے کیونکہ طلبہ کی ایک کثیر تعداد اس کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دس سے پندرہ برس کی عمر کے بچوں کا ۱۲ فی صد ثانوی مدارس میں تعلیم پا رہا تھا۔ دوسرے منصوبے کے اختتام پر ۱۹۶۵ء میں یہ تناسب ۱۶ فی صد تک پہنچ گیا۔ اس وقت ابتدائی سطح پر تعلیم پانے والے بچوں کا تقریباً ۲۰ فی صد ثانوی مدارس میں داخلہ لے رہا ہے جبکہ ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء میں یہ شرح صرف ۱۰ فی صد تھی۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۶۵ء کے درمیان ثانوی درجے پر طلبہ کی تعداد میں ۱۰۸ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ دور میں ثانوی مدرسوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ملک میں اوسطاً ہر روز ایک نیا ثانوی مدرسہ کھل رہا ہے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۴۴۶۲ وسطانی مدارس اور ۳۰۸۹ ثانوی مدارس ہیں۔ طالبات کے وسطانی اور ثانوی مدارس کی تعداد علی الترتیب ۹۲۴ اور ۵۷۴ ہے۔ وسطانی مدرسوں میں طلبہ و طالبات کی تعداد تقریباً آٹھ لاکھ اور ثانوی مدرسوں میں سولہ لاکھ ہے۔ گویا چھٹی سے دسویں جماعت میں کل چوبیس لاکھ طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس سطح پر ۸۸۸۹۶ استاد کام کر رہے ہیں، جن میں خواتین کی تعداد ۱۳۳۹۵ ہے۔

ثانوی مدارس میں سے بعض سرکاری ہیں، بعض کو نجی تنظیمیں اور فلاحی انجمنیں چلا رہی ہیں اور بعض مدرسے بلدیاتی اداروں، یعنی میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں نے کھول رکھے ہیں۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پانے والے کل طلبہ کا ۷۰ فی صد سرکاری اور بلدیاتی مدارس میں زیر تعلیم ہے البتہ نہم اور دہم کے کل طلبہ کا ۶۰ فی صد منظور شدہ نجی مدارس میں پڑھتا ہے۔ یوں تو ملک کے تمام ثانوی مدارس کے نصاب، مدت تعلیم اور تدریسی ڈھانچے میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، تاہم بعض مدارس اپنی ہیئتِ ترکیب کے اعتبار سے دوسروں سے خاصے مختلف ہیں۔

رہنما ثانوی مدارس (Pilot High School): ان مدارس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں روایتی نصاب کے ساتھ ساتھ دیگر متنوع فنی اور تکنیکی مضامین کی تدریس کی سہولتیں بھی موجود ہیں اور تدریس کا معیار عام ثانوی مدارس کی بہ نسبت بلند ہے۔ "استاد۔ شاگرد تناسب" کم ہے۔ اساتذہ کو جدید سمعی بصری اعانتیں مہیّا ہیں اور انھیں نئے تدریسی تجربے کرنے کے لیے زیادہ سازگار ماحول اور آسائشیں میسر ہیں۔

پبلک سکول: یہ ادارے اقامتی ہیں اور انھیں انگلستان کے پبلک سکولوں کے نمونے پر چلایا جاتا ہے۔ ان مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم

انگریزی ہے - یہاں داخلہ مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا ہے - ان ہمہ وقتی درس گاہوں میں کھیلوں اور جسمانی ورزش کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور طلبہ کی سیرت کی بھرپور نشو و نما کے لیے ادبی اور معاشری سرگرمیوں پر زور دیا جاتا ہے - ان اداروں میں عام مدرسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ سہولتیں میسر ہیں اور اسی لیے اخراجات بھی زیادہ ہیں۔

یورپی طرز کے مدارس: یہ مدرسے ملک کے بڑے بڑے شہروں اور پہاڑی مقامات، مثلاً مری اور کوئٹے وغیرہ میں کام کر رہے ہیں - ان میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحانات کے علاوہ سینئر کیمبرج اور جونیر کیمبرج کے امتحانات کی تیاری کے انتظامات بھی موجود ہیں - ان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور عام ثانوی مدرسوں کے مقابلے میں فیسیں بہت زیادہ ہیں۔

جامع مدارس (Comprehensive Schools): تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ثانوی تعلیم کو معیاری اور جامع بنانے کے لیے ایک نیا تجربہ کیا جا رہا ہے - جامع مدارس کے قیام کا مقصد ایک ہمہ گیر اور جامع نصاب کا نفاذ اور تعلیم و تدریس میں نئے تجربات کے لیے سازگار ماحول اور مناسب سہولتیں مہیا کرنا ہے - جامع مدارس میں داخلے کا معیار قابلیت ہے اور طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی ہے - مغربی پاکستان میں ۱۹۷۰ء تک ان مدرسوں کی تعداد چالیس ہو جائے گی۔

ثانوی مدارس کا نصاب: ۱۹۶۰ء سے قبل ثانوی مدارس کے نصاب میں ملک کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور نہ یہ ہماری قومی امنگوں ہی کا آئینہ دار تھا - اس نصاب سے بالخصوص وہ طلبہ جو ثانوی درجے پر ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے تھے مستفیض نہیں ہو رہے تھے؛ چنانچہ قومی تعلیمی کمیشن (۱۹۶۰ء) کی رپورٹ کے ماتحت اصلاح نصاب کی جو مہم چلی اس میں نصاب کو ان نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی، سائنس کی تعلیم کو لازم قرار دیا گیا، انتخابی مضامین کی فہرست میں زراعت، کامرس، فنی اور تکنیکی مضامین، گھریلو اقتصادیات وغیرہ ایسے مضامین شامل کر دیے گئے تاکہ طلبہ اپنے رجحانات اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق مضامین کا انتخاب کر سکیں، پاکستان کی مذہبی اور نظریاتی اقدار کے پیش نظر اسلامیات کی تدریس لازمی قرار پائی اور قومی زبانوں کی تعلیم کو زیادہ مؤثر بنانے پر زور دیا گیا - مزید برآں حال ہی میں ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات کے نصاب میں جدید تحقیقات کی روشنی میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ان مضامین کے فرسودہ تصورات کو نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ جدید نظریات اور حقائق کو شامل کر دیا گیا ہے۔

کالج کی تعلیم: پاکستان میں دو طرح کے کالج ہیں: ایک اعلٰی ثانوی مدرسے یا انٹرمیڈیٹ کالج اور دوسرے ڈگری کالج - انٹرمیڈیٹ کالج، ثانوی مدارس اور ڈگری کالجوں کے درمیان عبوری حیثیت رکھتے ہیں - ان میں دو سال تک تعلیم دی جاتی ہے اور طلبہ اور طالبات کو یونیورسٹی کی اعلٰی تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا ہے - طب، کامرس اور انجینئرنگ کے پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے سے قبل متعلقہ بنیادی مضامین کی تعلیم بھی یہیں ہوتی ہے - ملک میں اس وقت ۱۷۰ سے زائد انٹرمیڈیٹ کالج ہیں، جن میں تقریباً پچاس ہزار طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں اور دو ہزار سے زائد اساتذہ پڑھا رہے ہیں - ان میں چونتیس کالج صرف طالبات کے لیے مخصوص ہیں، جن میں کوئی ساڑھے پانچ ہزار طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

اس تعداد میں وہ طلبہ اور طالبات شامل نہیں جو ڈگری کالجوں کی انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کے نصاب کی تدوین و تعیین، امتحانات کی تنظیم، کالجوں کی منظوری اور الحاق اور ان جماعتوں سے متعلقہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی تشکیل کی تمام تر ذمے داری ثانوی تعلیمی بورڈوں پر ہے۔ ثانوی مدارس کی طرح اس سطح پر بھی نصاب میں بڑی دور رس تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ قومی زبانوں کی تدریس کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ انتخابی مضامین کی فہرست کو وسیع کر دیا گیا ہے اور ریاضی، کیمیا اور طبیعیات کے نصاب کو جدید تحقیقات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

ڈگری کالج: ان کالجوں کے قیام کا مقصد طلبہ اور طالبات کو بی۔اے / بی۔ایس سی کی ڈگری کے لیے تیار کرنا ہے، لیکن بالعموم ان کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا انتظام بھی ہوتا ہے اور یوں ڈگری کالج میں تعلیم کا عرصہ چار سال پر پھیلا ہوتا ہے۔ بعض ڈگری کالج ایسے بھی ہیں جن میں بی۔اے کے بعد ایم۔اے/ایم۔ایس سی کی تعلیم کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ ان کالجوں کی انٹرمیڈیٹ جماعتوں کا الحاق ثانوی تعلیمی بورڈوں سے ہوتا ہے اور بی۔اے / بی۔ایس سی اور ایم۔اے / ایم۔ایس سی کی جماعتوں کا الحاق اپنے علاقے کی یونیورسٹی سے ہوتا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد کی جماعتوں کے لیے نصاب اور کتابوں کی تعیین، امتحانات کا اہتمام، اسناد کی تقسیم اور دیگر قواعد و ضوابط کی تشکیل کی تمام تر ذمے داری یونیورسٹی ہی کی ہوتی ہے۔ ملک میں اس وقت تقریباً ۰۴۲ ڈگری کالج ہیں اور ان میں کل سوا دو لاکھ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ پاکستان کے ۹۰ فی صد گریجویٹ انہیں کالجوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں بیاسی ہزار گریجویٹ تھے، یعنی کل آبادی کا ۶۶ء فی صد۔ ان میں سے ساڑھے اکتیس ہزار افراد کے پاس پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں میں اضافے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۶ء کے دوران میں ۲۱۴۳۳ افراد نے ڈگری حاصل کی۔ ۶۵ فی صد سے زیادہ ڈگری کالجوں کا انتظام نجی تنظیموں کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں حکومت کی طرف سے معقول مالی امداد ملتی ہے اور یہ یونیورسٹی کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیاں: قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف دو یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں اور تیسری یونیورسٹی انہیں دنوں معرض وجود میں آ رہی تھی۔ اس وقت یہاں بارہ یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: (۱) پنجاب (۱۸۸۲ء)؛ (۲) ڈھاکہ (۱۹۲۱ء)؛ (۳) سندھ (۱۹۴۷ء)؛ (۴) پشاور (۱۹۵۰ء)؛ (۵) کراچی (۱۹۵۱ء)؛ (۶) راجشاہی (۱۹۵۳ء)؛ (۷) زرعی یونیورسٹی، لائل پور (۱۹۶۱ء)؛ (۸) زرعی یونیورسٹی، میمن سنگھ (۱۹۶۱ء)؛ (۹) یونیورسٹی آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور (۱۹۶۱ء)؛ (۱۰) یونیورسٹی آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، ڈھاکہ (۱۹۶۱ء)؛ (۱۱) اسلام آباد (۱۹۶۶ء)؛ (۱۲) چٹاگانگ (۱۹۶۶ء)۔ تیرھویں یونیورسٹی جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں اور چودھویں کوئٹے میں قائم ہونے والی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں تقریباً پچیس ہزار طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے ۳۴۱۱ طلبہ زرعی یونیورسٹیوں میں اور ۳۲۴۱ انجینیئرنگ یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ زرعی اور فنی یونیورسٹیوں کے قیام سے

سائنسوں میں ڈگری پانے والے طلبہ کی تعداد میں معقول اضافہ ہوا ہے - ۱۹۶۰ء میں ۵۵۶۹ طلبہ نے پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں حاصل کیں اور ان میں سے ۳۶۳۱ نے سائنس کے مضامین میں یہ اعزاز حاصل کیا۔

ان تمام یونیورسٹیوں میں اپنے تدریسی شعبے ہیں اور ملحقہ کالج بھی - ان سب اداروں میں نصاب کی تدوین و تعیین، درسی کتابوں کا تقرر، اساتذہ کے تقرر کی منظوری، امتحانات کا نظم و نسق ان یونیورسٹیوں کے ذمے ہے۔

نئی یونیورسٹیوں کے قیام سے پرانی یونیورسٹیوں کی وسیع تر ذمے داریاں اور بوجھ قدرے ھلکا ھو گیا ہے اور اس سے انھیں معیار تعلیم کو اونچا کرنے اور تحقیق کی طرف مزید توجہ دینے کا موقع مل گیا ہے۔

تمام یونیورسٹیوں کے انتظامی ڈھانچے میں خاصی یکسانی اور ہم آھنگی پائی جاتی ہے - ہر یونیورسٹی کا منتظم اعلیٰ وائس چانسلر کہلاتا ہے، جس کا تقرر چار سال کے لیے ھوتا ہے - یونیورسٹی کے انتظام و انصرام کے بہت سے اختیارات اس کی سنڈیکیٹ کو تفویض ھوتے ھیں - سنڈیکیٹ کی امداد کے لیے ہر یونیورسٹی میں اکادمک کونسل، مالیاتی کمیٹی، منصوبہ بندی و ترقیاتی پروگرام کی کمیٹی، اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی کمیٹی اور اسی قسم کی چند دوسری کمیٹیاں مقرر ھیں - یونیورسٹیوں کے پروگراموں میں ہم آھنگی پیدا کرنے کے لیے ایک بین الجامعی بورڈ (Inter-Versity Board) قائم ہے - ہر یونیورسٹی کے اخراجات کا ۷۰ فی صد حصہ حکومت کے خزانے سے پورا ھوتا ہے - ۱۹۶۰ - ۱۹۶۳ء میں حکومت نے ۱۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی رقم بطور مالی امداد یونیورسٹیوں کو دی - قریب قریب ہر یونیورسٹی اپنا نیا کیمپس بنانے پر بہت سا روپیہ خرچ کر رھی ہے - تیسرے پنج سالہ منصوبے میں حکومت نے بیس کروڑ روپے کی رقم آٹھ یونیورسٹیوں کے تعمیراتی پروگراموں کے لیے مختص کی۔

ہر یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام میں نئے مضامین کو شامل کیا جا رھا ہے - عمومی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک میں تقریباً سات فیکلٹیاں اور پچیس تدریسی شعبے موجود ھیں - بہت سے مضامین میں پی ایچ - ڈی کی ڈگری دی جا رھی ہے اور تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جا رھا ہے - عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سائنسی مضامین کی تدریس اور تحقیق میں ہر یونیورسٹی نے اپنی سرگرمیاں تیزتر کر دی ھیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم : پاکستان میں پیشہ‌ورانہ تعلیم کے لیے مناسب سہولتیں اور انتظامات موجود ھیں اور ان سہولتوں سے ملکی اور غیر ملکی طلبہ و طالبات دونوں مستفید ھو رہے ھیں - زراعت، انجینئرنگ، طب، تعلیم، قانون، کامرس، سماجی بہبود اور انتظامیات ایسے مضامین کی تعلیم کے لیے ملک میں بہت سے معیاری ادارے قائم ھیں۔

زراعت : ملک میں چار زرعی سکول، پانچ زرعی کالج اور دو زرعی یونیورسٹیاں قائم ھیں - یونیورسٹیوں میں زراعت اور علم حیوانات کے تمام ضروری شعبے موجود ھیں اور مختصر توسیعی کورسوں کے ذریعے ہر شعبے کے متعلق ضروری معلومات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جا رھی ھیں - زرعی یونیورسٹی لائل پور میں چوبیس مضامین میں ایم - ایس سی اور بیس مضامین میں پی ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے انتظامات موجود ھیں۔

انجینئرنگ : پاکستان میں فنی تعلیم کے فروغ کے لیے پانچ انجینئرنگ کالج، دو انجینئرنگ یونیورسٹیاں اور بائیس پولی تکنیک ادارے قائم ھیں -

۱۹۷۰ء تک تیرہ مزید پولی تکنیک ادارے قائم ہو جائیں گے توقع ہے (ان میں سے دو ادارے محض خواتین کے لیے مخصوص ہوں گے) اور یہ سب ادارے چودہ ہزار تربیت یافتہ افراد سالانہ مہیا کر سکیں گے - ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں ان یونیورسٹیوں میں ۲۸۱۴، فنی کالجوں میں ۳۱۲۳ اور پولی تکنیک اداروں میں ۸۳۱۴ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم تھے۔

مندرجۂ بالا فنی اداروں کے علاوہ ایک سو سے زائد ایسے فنی مدرسے موجود ہیں جو ملک کے صنعتی اداروں کے لیے تربیت یافتہ کاریگر مہیا کرتے ہیں - ان مدرسوں میں آٹھویں جماعت پاس طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں - اس وقت ان درس گاہوں میں کل چھے ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں - ان اداروں میں سے بعض کا درجہ بلند کر کے انھیں پولی تکنیک بنایا جا رہا ہے۔

طب : قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف چار میڈیکل کالج تھے؛ اب ان کی تعداد بارہ ہے، جن میں ہر سال ایک ہزار سے زائد ڈاکٹر فارغ التحصیل ہوتے ہیں؛ تیسرے منصوبے کے آخر یعنی ۱۹۷۰ء تک ملک کے ڈاکٹروں کی مجموعی تعداد بیس ہزار تک پہنچ جائے گی جب کہ ۱۹۶۵ء میں یہاں صرف تیرہ ہزار ڈاکٹر تھے - کراچی میں طب کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے انتظامات بھی موجود ہیں - اسلام آباد میں قومی صحت کی تجربہ گاہ قائم کی جا رہی ہے - لاہور اور ڈھاکے میں طبی تحقیق کی جدید ترین سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں - پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل نے طبی تحقیق کے پچاس منصوبے تیار کیے ہیں - ایلوپیتھی کی تعلیم کے علاوہ ہومیوپیتھی کی تعلیم کے لیے دس کالج اور طب یونانی کے لیے چار طبیہ کالج قائم ہیں - کراچی میں یونانی طب کی تحقیق کے لیے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا گیا ہے -

علاوہ ازیں ملک میں دندان سازی اور علاج دندان کے لیے دو جدید طرز کے کالج موجود ہیں - نرسنگ کی تعلیم کے لیے ملک میں تیس تربیتی ادارے کام کر رہے ہیں، جو پاکستان کے بڑے بڑے ہسپتالوں سے ملحق ہیں - نرسنگ کے ابتدائی تین سالہ کورس کے علاوہ اس پیشے کی اعلٰی تربیت کے انتظامات بھی موجود ہیں - قیام پاکستان کے وقت یہاں صرف چار سو نرسیں موجود تھیں، لیکن ان کی موجودہ تعداد چار ہزار سے زائد ہے۔

کامرس : کامرس کی تعلیم کا آغاز ثانوی مدارس ہی سے ہو جاتا ہے - جو طلبہ ثانوی مدرسوں سے فارغ ہونے کے بعد اس مضمون میں مزید دسترس بہم پہنچانا چاہتے ہیں ان کے لیے ملک میں اکتیس کمرشل ادارے موجود ہیں، جن میں اس وقت ۳۲۶۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں - ان اداروں میں ایک سال کی تعلیم کے بعد سرٹیفکیٹ اور دو سال کی تعلیم کے بعد ڈپلوما دیا جاتا ہے - کامرس کی اعلٰی تعلیم کے لیے آٹھ کامرس کالج موجود ہیں، جہاں طلبہ کو بی - کام اور ایم - کام کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا ہے - ان کالجوں میں ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں ۴۳۱۸ طلبہ زیر تعلیم تھے - کامرس کی پوسٹ گریجویٹ تربیت کے لیے کراچی اور ڈھاکے میں بزنس ایڈمنسٹریشن Business Administration کے دو معیاری ادارے قائم ہیں، جو امریکی یونیورسٹیوں کے تعاون سے کام کر رہے ہیں۔

قانون : ملک میں قانون کی دو سالہ تعلیم کے لیے سولہ کالج قائم ہیں، جن میں تقریباً پانچ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں - ان میں سے دس کالج مغربی پاکستان میں، اور چھے مشرقی پاکستان میں ہیں۔

تربیت اساتذہ : تربیت اساتذہ کے لیے دو طرح کے ادارے موجود ہیں، پہلی قسم کے ادارے ابتدائی اور وسطانی مدارس کے لیے استاد تیار کرتے

ہیں اور دوسری قسم کے کالج ثانوی مدارس کے لیے ۔ اول الذکر اداروں کی تعداد ۱۰۲ ہے اور ان میں [illegible] طلبہ او، طالبات زیر تربیت ہیں؛ مؤخرالذکر کالجوں کی تعداد بارہ ہے اور ان میں ۲۶۷۳ اساتذہ زیر تعلیم ہیں ۔ ثانوی مدارس میں فنی تعلیم کے اساتذہ مہیا کرنے کے لیے دو تربیّتی ادارے الگ موجود ہیں ۔ اساتذہ کی پوسٹ گریجویٹ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے لاہور اور ڈھاکے میں ایک ایک ادارۂ تحقیق و تعلیم موجود ہے، جہاں تعلیم کے مضمون میں ایم ۔ ایڈ، اور پی ایچ ۔ ڈی کی تیاری اور جدید طریقہ‌ھاے تعلیم اور تدریسی مسائل پر تحقیق کی سہولتیں موجود ہیں ۔ ابتدائی مدارس کے ناظروں اور تربیت جسمانی کے اساتذہ کی تربیت کے لیے دو، دو کالج ان کے علاوہ ہیں ۔

پاکستان میں دوران ملازمت تربیت کے لیے بھی معقول انتظامات موجود ہیں ۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لیے الگ الگ توسیع کے مراکز کام کر رہے ہیں ۔ ان مراکز کے علاوہ اساتذہ کے تربیتی ادارے بھی موسم گرما کی تعطیلات میں دوران ملازمت تربیتی کورس منعقد کرتے ہیں ۔ یونیورسٹیاں اپنے ملحقہ کالجوں کے اساتذہ کی دورانِ ملازمت تربیت کے لیے تعطیلات میں تعلیمی سیمینار منعقد کرتی ہیں تاکہ اساتذہ اپنے اپنے مضمون میں جدید ترین دریافتوں اور طریقہ‌ھاے تعلیم سے باخبر ہو سکیں ۔

۱۹۶۴-۱۹۶۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کے مختلف مدارس میں تدریس کے لیے مندرجۂ ذیل تعداد میں اساتذہ موجود ہیں : ابتدائی مدارس : ۱۷۱۹۷۳؛ ثانوی مدارس : ۸۰۰۰۵؛ عمومی کالج : ۸۳۳۹؛ پیشہ ورانہ خصوصی کالج : ۱۷۱۶؛ تربیتی ادارے : ۱۳۰۹؛ یونیورسٹیاں : ۱۸۷۷ ۔

اساتذہ کی تعداد میں معقول اضافہ ہو رہا ہے ۔

پچھلے دس برس میں یہ تعداد ابتدائی تعلیم کے تربیتی مدارس کی نو ہزار سالانہ سے سولہ ہزار سالانہ تک پہنچ گئی ہے اور ثانوی تعلیم کے تربیتی کالجوں کی ایک ہزار سے چھے ہزار ہو گئی ہے ۔

اسلامیات اور علوم شرقیہ کی تعلیم : مشرقی پاکستان میں دینی تعلیم کے لیے مدرسے موجود ہیں ۔ یہ مدرسے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے علاوہ حساب، تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس، اردو اور بنگلہ کی تعلیم بھی دیتے ہیں ۔ ان مدرسوں کے نصاب، امتحانات اور دیگر امور کی دیکھ بھال کے لیے ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرز پر مدرسہ تعلیمی بورڈ قائم ہے ۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں دینی تعلیم کے لیے نجی مکاتب اور دارالعلوم موجود ہیں، جو مساجد کے لیے امام اور خطیب اور دینی مدارس کے لیے استاد مہیا کرتے ہیں ۔ ۱۹۶۰ء میں ان مدرسوں اور مکاتب کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی اور ان میں ۵۰۸۰۰۰ طلبہ زیر تعلیم تھے ۔

تعلیم بالغاں : خواندگی کی شرح کو بڑھانے کے لیے ملک میں تعلیم بالغاں کے پروگرام پر عمل درآمد جاری ہے ۔ ۱۹۶۰ء میں ملک میں بالغوں کی تعلیم کے لیے ۵۳۳ مراکز قائم تھے، جن میں ۱۲۶۰۰ بالغ مرد اور عورتیں زیر تعلیم تھے ۔ ان اداروں میں تعلیم مفت ہے اور مقامی بلدیاتی ادارے اور مخیّر حضرات ان کے مصارف کی کفالت کرتے ہیں ۔

تعلیم نسواں : قیام پاکستان سے لے کر اب تک طالبات کے لیے تعلیمی سہولتوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے ۔ ۱۹۶۰ء میں اٹھارہ لاکھ بچیاں ابتدائی مدرسوں میں تعلیم پا رہی تھیں اور ثانوی مدارس میں طالبات کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ تھی ۔ ابتدائی اور ثانوی درجے کی طالبات کی یہ تعداد طلبہ کی تعداد کا بالترتیب ۳۰ اور

۵۰ فی صد ہے - ۱۹۶۵ء میں لڑکیوں کے ابتدائی مدارس کی تعداد ۴۴۹۹ اور ثانوی مدارس کی تعداد ۱۴۹۸ تھی - لڑکیوں کے لیے چونتیس انٹرمیڈیٹ کالج، ترپن ڈگری کالج، ایک میڈیکل کالج، سائنس تعلیم کے تربیتی ادارے، چار ہوم اکنامکس کالج، ایک پولی تکنیک ادارہ، تیس نرسنگ انسٹیٹیوٹ اور پچیس ووکیشنل انسٹیٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ بعض درس گاھوں میں اور تمام میڈیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طالبات طلبہ کے دوش بدوش تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

تعلیمی وظائف : پاکستان میں کل تعلیمی مصارف کا پانچ فی صد تعلیمی وظائف کے لیے مخصوص ہے، جو قابلیت کے لحاظ سے طلبہ اور طالبات کو اندرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں - ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے خصوصی وظائف مقرر ہیں - اور اسی طرح بیرون ملک تعلیم پانے کے لیے بھی وظائف کی سہولت موجود ہے - ملک سے باھر جانے کے لیے وظائف پاکستان کے دوست ممالک اور قومی اور بین الاقوامی فلاحی انجمنوں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں - ۱۹۶۵ء میں ۱۲۴ پاکستانی طلبہ کو بیرون ملک تعلیم کے لیے وظیفے دیے گئے - اسی طرح پاکستان بھی دوست ممالک کے طلبہ اور طالبات کو اپنے ھاں وظائف دے کر تعلیمی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ھماری یونیورسٹیاں "مرکزی سمندر پار تربیتی سکیم" کے تحت اپنے قابل اساتذہ کو دوسرے ممالک میں تعلیم کے لیے بھیجتی ہیں - ۱۹۶۵ء میں اس سکیم کے تحت ایسے ترپن افراد غیر ممالک میں زیر تعلیم تھے - ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق دو ہزار طلبہ اور طالبات محض لنڈن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس کے علاوہ دو ہزار مزید طلبہ و طالبات امریکہ، یورپ اور جاپان میں زیر تعلیم تھے۔

نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ہو چکا ہے لیکن اس کی جزئیات منظر عام پر نہیں آئیں۔

۱۶ - سائنسی تحقیقات

ملک کی تعلیمی، غذائی، طبی، رہائشی اور دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے سائنسی تحقیقات کی طرف بھی توجہ دی ہے - مملکت پاکستان کو اس امر کا احساس تھا کہ سائنسی تحقیقات کے میدان میں وہ پس ماندہ ہے - پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے تھے ان میں ایک بھی قابل ذکر سائنسی شعبہ موجود نہ تھا - اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ چیزیں اس کے حصے میں آئیں : لاھور میں آب پاشی کی ایک تحقیقاتی تجربہ گاہ (Irrigation Research Laboratory)، ڈھاکے میں پٹسن کا ایک تحقیقاتی مرکز اور تین یونیورسٹیاں، جن میں سے ایک کو قائم ہوئے ابھی چند ماہ ھی ہوئے تھے؛ لیکن اس صورت حال نے اھل پاکستان کے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا، کیونکہ مسلمانوں کا شاندار ماضی اور سائنس کے میدان میں اسلاف کی بلند روایات ان کے پیش نظر تھیں (*The Making of Humanity* : Robert Briffault).

پاکستان میں سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل اداروں میں کام ہوا :

(۱) مجلس تحقیقات سائنس و صنعت پاکستان (Pakistan Council of Scientific and Industrial Research = PCSIR) : جب دوسری عالمگیر جنگ ھو رھی تھی تو متحدہ ہندوستان کی حکومت نے کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کے نام سے ایک سائنسی تحقیقاتی ادارہ قائم کیا تھا - تقسیم ملک کے وقت وہ کونسل اور اس کی تجربہ گاھیں بھارت ھی میں رہ گئیں - بٹوارے کے چھے سال بعد

۱۹۵۳ء میں از سر نو اس ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا - ۱۹۶۳ء میں اس کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی کر کے اسے مزید ترقی دی گئی - اس ادارے نے مندرجۂ ذیل پانچ لیبارٹریاں قائم کر رکھی ھیں : ۱ - سنٹرل لیبارٹریز، اسلام آباد؛ ۲ - ویسٹ ریجنل لیبارٹریز، لاھور؛ ۳ - ایسٹ ریجنل لیبارٹریز، ڈھاکہ؛ ۴ - نارتھ ریجنل لیبارٹریز، پشاور؛ ۵ - نارتھ ایسٹ لیبارٹریز، راجشاھی - ان تجربہ گاھوں میں تحقیقاتی شعبے کام کر رھے ھیں اور ان میں پارچہ بافی، ایندھن، غذا، چمڑا، شیشہ، چینی کے برتن، فلزکاری، تعمیرات کا مسالا تیار کرنا، مہندسی، پھلوں کے تحفظ و بقا، بجلی، تیل، موم، معدنیات اور ادویہ وغیرہ بہت سے امور کے متعلق تحقیقات ھو رھی ھے - اس ادارے کی طرف سے متعدد تحقیقاتی مقالے شائع ھو چکے ھیں اور بہت سے زیر تکمیل ھیں - ۱۹۶۸ء تک ۱۱۴ پیٹنٹ حاصل کر لیے گئے تھے، جن میں سے بعض بین الاقوامی سطح پر تھے اور تقریباً چار درجن ایجادات کے کاغذات داخل ھو چکے تھے - اس کے حاصل کردہ بعض پیٹنٹ بڑی عظمت رکھتے ھیں، مثلاً پارچہ بافی میں ڈابی doby کی ایک بالکل جدید قسم، جس سے اس صنعت میں انقلاب کی توقع کی جا سکتی ھے - ۱۹۶۸ء تک دو درجن سے اوپر عملی طریقوں (Processes) کی اجارہ داری دی جا چکی ھے، جن میں سے متعدد صنعتی میدان میں پہنچ چکے ھیں.

۲ - جوھری توانائی کا کمیشن (Pakistan Atomic Energy Commission = PAEC) : جوھری توانائی کی دریافت نے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ھے - دنیا نے اس کا سب سے پہلا مظاھرہ ھلاکت آفرینی کی شکل میں دیکھا تھا، لیکن پاکستان اس کے پرامن استعمال کا علمبردار ھے - پاکستان اٹامک انرجی کونسل Pakistan Atomic Energy Council کے نام سے ایک ادارہ اسی غرض سے قائم ھوا تھا؛ اگلے ھی سال اس کی حیثیت بڑھا کر اس کا نام اٹامک انرجی کمیشن کر دیا گیا - پاکستان کے پہلے پنج سالہ منصوبے کی تیاری کے وقت یہ ادارہ قائم ھو چکا تھا، لیکن منصوبہ بندی کمیشن میں اس ادارے سے متعلق سفارشات شامل نہ کی جا سکیں کیونکہ اس کی رپورٹ تیار نہ ھو سکی تھی، تاھم یہ مدّنظر رکھ لیا گیا کہ پنج سالہ منصوبہ جب سالانہ منصوبوں میں منقسم ھو گا تو جوھری کمیشن کے اخراجات کو بھی شامل کر لیا جائے گا - یہ بھی ایک نیم خود مختار ادارہ ھے اور حکومت کے سامنے سائنٹفک اینڈ ٹیکنالوجیکل ریسرچ کے محکمے کی وساطت سے جواب دہ ھے - یہ ادارہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ھے : اول، تحقیقاتی اور ترقیاتی مراکز؛ دوم، جوھری توانائی حاصل کرنے کے عملی مراکز - اول الذکر کے ماتحت مندرجۂ ذیل مراکز ھیں : ۱ - ادارۂ جوھری سائنس و ٹیکنالوجی، پاکستان (Pakistan Institute of Nuclear Science and Technology = PINSTECH)، اسلام آباد : یہاں دسمبر ۱۹۶۵ء میں ۵ میگاواٹ کا ایک جوھری ری ایکٹر (atomic reactor) نصب کیا گیا تھا اور اس میں جوھری طبیعیات، جوھری مہندسی، جوھری کیمیا، حیاتی تابکاری، فلز کاری، طبی طبیعیات اور برقیات پر کام ھو رھا ھے؛ ۲ - جوھری توانائی کا مرکز (Atomic Energy Centre)، لاھور : یہ ۱۹۶۱ء میں قائم ھوا؛ ۳ - جوھری توانائی کا مرکز، ڈھاکہ : یہ ۱۹۶۰ء میں مکمل ھوا؛ ۴ - جوھری توانائی کا زرعی تحقیقاتی مرکز (Atomic Energy Agricultural Research Centre)، ڈھاکہ : یہ مرکز ۱۹۶۰ء میں قائم ھوا؛ ۵ - جوھری توانائی کا زرعی تحقیقاتی مرکز، ٹنڈو جام (سندھ) :

یہ ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا؛ ۶ - مرکز طبی ریڈیو اسوٹوپ (Medical Radio Isotope Centre)، ٹنڈو جام - علاوہ ازیں طبی اور زرعی تحقیقات کے لیے چھوٹے چھوٹے مراکز کراچی، جام شیرو، ملتان، لاهور، ڈھاکہ، چٹاگانگ اور راجشاهی میں کھولے گئے هیں - ترناب (پشاور) میں ایک زرعی ترقیاتی تحقیقاتی فارم موجود ہے .

جوهری توانائی سے بجلی پیدا کرنے کے دو مرکز قائم کیے گئے هیں : ایک ڈھاکے میں، جو ۱۴۰ میگاواٹ کا هو گا اور دوسرا کراچی میں، جو ۱۳۷ میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا.

پاکستان میں نیلور کے مقام پر ایٹم کو توڑنے کا سب سے پہلا تجربہ ۱۹۶۵ء میں کیا گیا - اس کے بعد سے ریڈیائی هم جائی (Radio Isotope) اور جوهری توانائی سے زراعت، طب اور صنعت کے میدانوں میں فائدہ اٹھانے کے لیے کوشش کی جا رهی ہے اور تغذیۂ نباتات، ارضی کیمیا، کرم کش ذرائع، طبی طبیعیات، غذاؤں کے ابقا و تحفظ اور برقیات کے سلسلے میں کچھ قدم اٹھائے گئے هیں .

اٹامک انرجی کمیشن نے جناح سنٹرل هسپتال کراچی اور میوهسپتال لاهور اور ڈھاکہ میڈیکل هسپتال میں طبی ریڈیو اسوٹوپ (Medical Radio Isotope) کے مراکز قائم کر رکھے هیں - کمیشن اعلٰی توانائی طبیعیات (High Energy Physics) کے مسائل پر بھی مصروف تحقیقات ہے - ان کا کام بین الاقوامی معیار کے مطابق ہے - غیر ملکی معیاری مجلّوں میں اس کے سائنسدانوں کے مقالے طبع هوتے رهتے هیں - اس کے مراکز اپنے اساسی کاموں کے علاوہ زرعی ماهروں، ڈاکٹروں اور محکمۂ صحت میں کام کرنے والوں کے لیے بھی تربیت کا انتظام کرتے هیں اور ان کے ذریعے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اعلٰی جماعتوں کے طلبہ کی تعلیمی رنگ میں راہ نمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے هیں - جوهری توانائی کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالسلام، مشیر سائنسی امور اور ڈاکٹر آئی - ایچ عثمانی، صدر اٹامک انرجی کمیشن، سرگرم کار هیں - جوهری توانائی کے لیے بھاری پانی کی ضرورت هوتی ہے - قدرتی گیس سے کھاد تیار کرنے کے کارخانوں سے ذیلی صنعت کے طور پر یہ پانی حاصل کرنے پر کام کیا گیا ہے - پاکستان میں بجلی کا فی کس استعمال صرف پچاس یونٹ ہے جبکہ کینیڈا میں ساڑھے چھے هزار یونٹ اور امریکہ میں ساڑھے پانچ هزار یونٹ ہے - اس سے ظاهر ہے کہ پاکستان کو جوهری توانائی کی طرف توجہ دینے کی کس قدر ضرورت ہے - ایٹمی توانائی کے بارے میں ابھی حال هی میں پاکستان نے روس سے معاهدے پر دستخط کیے هیں .

۳ - مجلس تحقیقات طب (Medical Research Council) : ڈھاکے میں ایک ادارۂ صحت عامّہ (Public Health Research Institute) قائم ہے - اس میں صحت عامّہ، تغذیہ، ملیریا کے علاج، دیسی جڑی بوٹیوں، نیز یونانی، آیورویدک اور هومیوپیتھک علاج کے اجزا پر کام هو رها ہے - میری لینڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے اشتراک سے صحت عامّہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی مرکز بھی اس سے متعلق ہے - اسی طرح سیٹو (SEATO) کی امداد سے وبائی هیضے پر تحقیقات کے لیے ایک تجربہ گاہ (Cholera Research Laboratory) بھی قائم ہے - کراچی میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے قومی سطح پر ایک نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کی گئی ہے - اس کے علاوہ اس کے پانچ ذیلی مراکز هیں - ایک اهم تحقیقاتی ادارہ Jinnah Post Graduate Medical Centre کے نام سے کراچی میں

ہے ۔ اس میں دل و دماغ کے امراض، وجع المفاصل، فالج، اور تغذیہ پر تحقیقات کا کام ہو رہا ہے ۔

۴ ۔ مجلس زرعی تحقیقات (Agricultural Research Council) : پاکستان میں زراعت کی اہمیت مسلمہ ہے ۔ ملک کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے، غلّے کی پیداوار کو بڑھانے، نئی اقسام کی دریافت، جراثیم کُش ادویہ کی تحقیق اور زراعت کے جدید ذرائع معلوم کرنا اس کونسل کے ذمے ہے ۔ پٹ سن، گندم، کپاس، چاول، نیشکر اور جوار کی جدید اقسام معلوم کی گئی ہیں ۔ کھادوں پر بھی کام ہوا ہے ۔ حیوانات کی افزائش نسل، جنگلات اور ماہی پروری کا تعلق بھی اس کونسل سے ہے ۔ پاکستان کے زیر کاشت رقبے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا اور زمین کو سیم، تھور اور کٹاؤ سے بچانا بھی اس کونسل کا کام ہے ۔ ۱۹۶۴ء سے قبل اس کا نام مجلس تحقیقات خوراک و زراعت (Food & Agricultural Research Council) تھا ۔

۵ ۔ مجلس برائے آب پاشی، نکاس آب و سیم (Pakistan Irrigation, Drainage and Water Logging Council = P.I.W.C.) .

۶ ۔ مجلس برائے مکانات و تعمیرات (Council for Housing and Works) : اس کا کام مندرجۂ بالا اداروں میں روابط قائم کرنا اور مشورے دینا ہے ۔

۷ ۔ قومی مجلس علوم (National Science Council) پاکستان میں سائنس کے مختلف میدانوں میں تحقیقات کے یہ سات ممتاز ترین ادارے ہیں ۔ ان کی امداد حکومت کرتی ہے اور داخلی طور پر یہ اپنے کاموں میں خود مختار ہیں ۔

(ب) مندرجۂ بالا کمیشنوں اور کونسلوں کے علاوہ کچھ سوسائٹیاں بھی سائنسی تحقیقات میں مصروف ہیں، مثلاً (۱) انجمن ترقی علوم پاکستان (Pakistan Association for the Advancement of Sciences = P.A.A.Sc.) : اس کا قیام دسمبر ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا تھا ۔ اس کے زیر اہتمام ہر سال سائنس کانفرنس منعقد ہوتی ہے، جس میں ملکی اور غیر ملکی ماہروں کو مدعو کیا جاتا ہے ۔ اس کی طرف سے سائنسی تحقیقات کے لیے وظائف بھی دیے جاتے ہیں ۔

۲ ۔ پاکستان اکادمی برائے علوم (Pakistan Academy of Sciences = P.A.Sc.) : اس کا آغاز فروری ۱۹۵۴ء میں ہوا ۔ یہ بھی ایک قومی سطح کا ادارہ ہے اور سائنس کے متعدد شعبوں پر تحقیق کا کام کراتا ہے ۔ فنی مجلے شائع کرنا، سائنس سے متعلق کتب خانے قائم کرنا اور تمغے، وظائف اور انعامات تقسیم کرنا بھی اس سے متعلق ہے ۔ اسے حکومت بھی امداد دیتی ہے اور رفاہِ عامّہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی عطیے دیتے ہیں ۔

۳ ۔ جمعیت علوم، پاکستان (Scientific Society of Pakistan) .

۴ ۔ انجمن علوم و مشاغل علمی، پاکستان (Pakistan Association of Sciences and Scientific Professions) : اس کا قیام ۱۹۶۲ء میں ہوا ۔

(ج) یونیورسٹیاں اور کالج : ملک میں سائنسی تحقیقات کے اہم مراکز میں سے اس کی یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں ۔ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ تیزی سے ہو رہا ہے ۔ ۱۹۵۷ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ تھی، جو اب تین لاکھ سے بڑھ چکی ہے ۔ ۷۰ فی صد سے زائد ڈگری کالج غیرسرکاری ہیں، لیکن ان میں سے اکثر کو سرکاری امداد ملتی ہے ۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے تیئیس کروڑ کی رقم رکھی گئی تھی، دوسرے میں ایک ارب دس کروڑ اور تیسرے میں دو ارب انیس کروڑ ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم اور

سائنس کے لیے مضبوط بنیادیں قائم کی جائیں ۔ پاکستان میں اس وقت تیرہ یونیورسٹیاں ہیں، جن میں دو انجینئرنگ اور دو زرعی یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں ۔ ابھی تک کوئی علیحدہ طبی یونیورسٹی (Medical University) قائم نہیں ہوئی، لیکن اعلٰی درجے کے بارہ کالج موجود ہیں، جن میں سالانہ ایک ہزار کے قریب ڈاکٹر اور سرجن فارغ التحصیل ہوتے ہیں ۔ ابھی حال ہی میں برٹش رائل کالج کے خطوط پر College of Surgery and Hygien قائم ہوا ہے ۔ اس طرح ایک ادارۂ صحت و تحقیقات طبی Institute of Health and Medical Research بھی کراچی میں قائم کیا گیا ہے ۔ ایک بین الجامعی ادارہ (Inter-Versity Board) ان تمام تحقیقات میں رابطہ قائم رکھتا ہے جو مختلف یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہیں۔

(د) حکومت کے بعض ادارے بھی ریسرچ کا کام کرتے یا اس میں مدد دیتے ہیں ۔ مرکزی، حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیقات کا ایک علیحدہ شعبہ Scientific and Technology Research Division قائم کر رکھا ہے ۔ اسلام آباد میں نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز دو کروڑ سے زیادہ کی لاگت سے تیار ہوئی ہے ۔ لاہور میں تجزیۂ خوراک اور تحقیق تغذیہ کے لیے ایک تجربہ گاہ Food Analysis and National Research Laboratories کے نام سے قائم ہے ۔ اسی طرح کی دو تجربہ گاہیں کوئٹے میں بھی ہیں ۔ مرکزی حکومت نے ماهی‌پروری کا ایک محکمہ قائم کر رکھا ہے ۔ اس پر تحقیق کا کام بھی اس کے سپرد ہے ۔ تقسیم ملک کے وقت پرورش حیوانات اور ڈیری فارم پر تحقیق کے تمام شعبے بھارت میں رہ گئے تھے ۔ ۱۹۶۹ء میں حکومت پاکستان نے افزائش نسل حیوانات پر تحقیقات کے دو ادارے قائم کیے : ایک پشاور اور دوسرا کومیلا میں ۔ اسی طرح صوبوں میں بھی نظامتہاے پرورش و معالجۂ حیوانات (Directorates of Animal Husbandry) قائم ہیں ۔ ملک میں معالجۂ حیوانات کے دو کالج بھی ہیں : ایک لاہور میں اور دوسرا میمن سنگھ میں ۔ ڈھاکے میں وزارت صحت نے ایک علیحدہ نظامت غذائی مسائل کے لیے قائم کی ہوئی ہے ۔ اس نے اپنی تحقیقات کا پہلا مرحلہ ۱۹۶۴ء میں مکمل کر لیا تھا ۔ مغربی پاکستان کے لیے ایسی ہی ایک نظامت لاہور میں قائم ہے ۔ ادارۂ تحقیقات آبپاشی (Irrigation Research Institute) تقسیم ملک سے پہلے سے لاہور میں قائم ہے، لیکن اس کی حیثیت بہت معمولی سی تھی ۔ ۱۹۶۰ء میں اسے توسیع دی گئی ۔ محکمۂ موسمیات کے مرکز کراچی اور کوئٹے میں ہیں اور ماتحت محکمے کراچی، لاہور، چٹاگانگ اور پشاور میں ۔ اس سلسلے میں محکمۂ دفاع کا اپنا انتظام بھی ہے ۔ قیام پاکستان کے وقت اس خطۂ ملک میں طبعی جغرافیے کی لیبارٹریاں نہ تھیں ۔ حکومت نے سب سے پہلی بلندپایہ رصدگاہ ۱۹۵۲ء میں کوئٹے میں قائم کی ۔ یہ رصدگاہ دنیا کی چوٹی کی سترہ رصدگاہوں میں سے سمجھی جاتی ہے ۔ موسمی پیشگوئیوں کے دفتروں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں چھے تھی، جو ۱۹۶۷ء میں بائیس ہو گئی ۔ سرگودھا، جراٹ، کراچی، چٹاگانگ اور ڈھاکے میں موسم کے متعلق اطلاعات دینے والے راڈر Radar نصب ہیں ۔ ضرورت کے مطابق خاص انتظامات کرنے کے ذرائع بھی موجود ہیں، مثلاً ۱۹۶۵ء میں جاپان اور پاکستان کی کوہ پیمائی مہموں کے لیے خاص انتظامات کیے گئے ۔ ایک الیکٹرونک مشین (Weather Facsemile) بھی موجود ہے، جو موسمی اطلاعات کے نقشوں کو وصول کرنے اور انھیں نشر کرنے کے کام کرتی ہے ۔ حکومت نے ۱۹۶۱ء میں طبعی جغرافیے اور موسمیات

کا ایک ادارہ قائم کیا، جس کے لیے عالمی تنظیم موسمیات (World Meteorological Organization) نے ماہر مہیا کیے تھے۔ اس ادارے کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔

(ہ) جنگلات کے سلسلے میں ریسرچ کا کام چٹاگانگ اور پشاور کی تحقیقاتی تجربہ گاہوں (Forest Research Laboratories) میں ہوتا ہے۔ ماہی پروری کی طرف ایک مرکزی محکمۂ ماہی گیری اس طرف توجہ دے رہا ہے۔ چار اقسام کی مچھلیوں پر حیاتیاتی تحقیقات کی جا رہی ہے۔ مچھلیوں کے ذریعے مچھروں کے انسداد، شارک مچھلی کے جگر کی گاد سے چھاپے خانے کی روشنائی تیار کرنے اور کچھوے سے چکناہٹ کے حصول وغیرہ پر چاند پور (مشرقی پاکستان) اور کراچی کی لیبارٹریوں میں کام ہو رہا ہے۔ مرکز میں ماہی پروری کا ایک مستقل محکمہ موجود ہے۔

پاکستان برطانوی دولت مشترکہ کی سائنسی تنظیم (British Commonwealth Scientific Organization = BCSO) کا رکن بھی ہے۔ اس وجہ سے اسے دولت مشترکہ کے رکن ممالک سے سائنس کے میدان میں روابط کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔

(ھ) مجلّے: سائنسی تحقیقات میں علمی مجلّوں اور رسالوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس وقت پاکستان سے بعض بلند پایہ مجلّے شائع ہو رہے ہیں، مثلاً پاکستان کونسل آف سائنس اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی طرف سے چھے مجلّے شائع ہوتے ہیں: (۱) *Pakistan Journal of Scientific and Industrial Research* (مغربی پاکستان سے)؛ (۲) *Scientific Research* (مشرقی پاکستان سے)؛ (۳) *Science and Industry*؛ (۴) کاروان سائنس (اردو)؛ (۵) *Science Chronicle*؛ (۶) پورگتی بگن (بنگلہ)۔ علاوہ ازیں اٹامک انرجی کمیشن کی طرف سے ایک ماہانہ مجلہ *Nucleus* شائع ہوتا ہے۔ پاکستان اکیڈیمی آف سائنسز کی طرف سے بھی بعض مجلّے شائع ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں جو مجلّے پاکستان سے شائع ہوتے ہیں ان کے مبادلے میں کوئی تین سو مجلّے غیر ممالک سے آتے ہیں۔

(و) کتاب خانے: سائنسی تحقیقات کے بنیادی مآخذ کتاب خانے ہیں۔ چند قابل ذکر کتاب خانوں کے نام درج ذیل ہیں (کتابوں کی تعداد قوسین میں درج کی گئی ہے): ۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (۲ لاکھ)؛ ۲۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور (سوا لاکھ)؛ ۳۔ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری (ایک لاکھ اسّی ہزار)؛ ۴۔ کراچی یونیورسٹی لائبریری (ایک لاکھ دس ہزار)؛ ۵۔ Directorate of Archives and Libraries میں حکومت کی اور بعض دوسری تاریخی دستاویزات محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ اس کے ماتحت تین کتب خانے ہیں، یعنی لیاقت نیشنل لائبریری (ڈیڑھ لاکھ)، سنٹرل سیکرٹریٹ لائبریری (ایک لاکھ ساٹھ ہزار) اور نیشنل آرکائیوز لائبریری (ساڑھے سات ہزار)۔ تجویز ہے کہ حکومت کے ماتحت اس انتظام میں ڈھاکے اور اسلام آباد میں بھی اسی قسم کے دو مزید کتاب خانے قائم کیے جائیں۔ اس انتظام کے تحت کتابیات کا ایک شعبہ National Bibliographical Unit بھی کام کر رہا ہے، جس میں پاکستان سے شائع ہونے والی کتابوں، مجلّوں اور اخباروں کی فہرستیں اور ان سے متعلقہ مواد تیار کرتا رہتا ہے۔ اس طرح کتابوں کے بین الاقوامی مبادلے کا ایک مرکز International Book Exchange Centre بھی ہے، جو دوسرے ممالک سے کتب کا تبادلہ کرتا رہتا ہے؛ ۹۔ کتاب خانۂ سٹیٹ بنک آف پاکستان (۳۰ ہزار)؛ ۱۰۔ کتاب خانۂ محکمۂ آثار قدیمہ (۲۵ ہزار)؛ ۱۱۔ کتاب خانۂ اٹامک انرجی کونسل (۶۰ ہزار)، وغیرہ۔

۱۷ - صحت

آئین پاکستان کی رو سے فرد کی صحت کا تحفظ حکومت کے فرائض میں شامل ہے اور مملکت پاکستان اپنے موجودہ وسائل کے مطابق وہ تمام احتیاطی، انسدادی اور معالجاتی تدابیر اختیار کرتی ہے جن سے انسانی صحت کی بقا ممکن ہے۔ پاکستان کے تیسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق حکومت نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ ۱۹۸۵ء تک ملک کی تمام آبادی کے لیے اچھی صحت کے بنیادی لوازمات مہیا ہوجائیں اور کوئی شخص طبی مراعات سے محروم نہ رہے۔

طبی سہولتوں کی فراہمی صوبائی محکمۂ صحت کے ذمے ہے۔ صوبائی حکومت کی سرپرستی میں مقامی سطح پر میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ کونسلیں شفاخانے بناتی اور بحالی صحت کے لیے ضروری حفاظتی اقدامات کرتی ہیں۔ مرکزی حکومت کا کام صوبائی حکومتوں کے صحت کے پروگراموں کی رہنمائی کرنا اور ان میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ مرکز کے ذمے ایسے اداروں کا قیام بھی ہے جن سے قومی صحت کے معیار کو بلند کیا جا سکے، وبائی اور متعدی بیماریوں کا انسداد ممکن ہو اور مناسب غذائی ضروریات مہیا کی جا سکیں۔ مرکزی ملازمین اور مرکزی علاقے میں بسنے والے شہریوں کے علاج معالجے کی ذمےداری بھی مرکز ہی پر ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی مساعی کے ساتھ ساتھ نجی، سماجی اور مذہبی فلاحی ادارے اور پرائیویٹ پریکٹس کرنے والے اطبّا اور ڈاکٹر طبی سہولتوں کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس وقت ساڑھے سولہ ہزار ڈاکٹروں میں سے پینتیس فی صد ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں اور وہ کسی ادارے کے ملازم نہیں۔

قیام پاکستان کے وقت اس ملک میں صحت کا قومی معیار بہت پست تھا۔ طبی اور غذائی سہولتیں ناکافی تھیں۔ عام اور وبائی امراض کا دور دورہ تھا۔ ترقی‌یافتہ ممالک کے مقابلے میں اموات کی شرح دگنی تھی اور بچوں کی اموات کی شرح تو پانچ گنی کے قریب تھی۔ آزادی وطن کے وقت یہاں صرف بارہ سو سند یافتہ ڈاکٹر تھے، ایک میڈیکل کالج تھا، ہسپتالوں میں بستروں کی مجموعی تعداد پندرہ ہزار تھی، ملک میں دوا سازی کے کارخانے مفقود تھے اور وبائی بیماریوں کی روک تھام کرنے والی ادویات بھی باہر سے منگوانی پڑتی تھیں۔ پچھلے بیس سال میں طبی سہولتوں کی فراہمی اور حفظ صحت کے انتظامات میں خاطرخواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں ڈاکٹروں کی تعداد ۱۹۸۰۰ ہے (۶۶۰۰ افراد کے لیے ایک ڈاکٹر) اور نرسوں کی ۱۰۳۰۰، ہسپتالوں میں ۳۸۳۰۰ بستروں کا انتظام ہے، ملک میں بارہ میڈیکل کالج قائم ہیں، ۸۶۰ دیہی مراکز صحت ہیں، ۲۷۵۰ معالج خصوصی برائے زچہ و بچہ (Lady Health Visitor) ہیں اور ۱۸۱ تپ دق کے معالجاتی مراکز ہیں، جن میں ۳۳۵۰ بستر مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت شہری اور دیہی آبادی میں علاج کی سہولتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ شہری آبادی میں ہر سات سو افراد کے لیے ایک سند یافتہ ڈاکٹر مہیا ہے اور دیہات میں دس سے بیس ہزار افراد کے لیے۔ اس وقت ملک میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی سالانہ پیداوار علی‌الترتیب ایک ہزار اور تین سو پچاس ہے۔

دیہی آبادی کی بہبود کے لیے ۱۹۶۰ء سے ملک میں دیہی مراکز صحت کے قیام کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک مرکز تقریباً پچاس ہزار افراد کو طبی

سہولتیں مہیا کرتا ہے ۔ مرکز میں ایک مرد اور ایک خاتون ڈاکٹر، ایک خصوصی معالج برائے بچہ و زچہ اور دیگر ضروری عملہ ہوتا ہے ۔ اس مرکز صحت کی تین شاخیں ہوتی ہیں اور ہر شاخ میں ایک کمپاؤنڈر، ایک مرہم پٹی کرنے والا، ایک دایہ اور ایک معاون (Health Assistant) کام کرتا ہے ۔

ملک کے بڑے شہروں اور گنجان آباد علاقوں میں تقریباً ہر پچاس ہزار نفوس کی آبادی کے لیے ایک شفاخانہ قائم ہے ۔ ان شفاخانوں میں ماہر ڈاکٹر مقرر ہیں اور ادویات اور محدود پیمانے پر طبی امداد مفت مہیا کی جاتی ہے ۔

ہر ضلع کے صدر مقام پر بڑے بڑے ہسپتال قائم ہیں، جہاں مریضوں کو قیام خوراک اور علاج کی سہولتیں میسر ہیں ۔ ہر سرکاری ہسپتال میں کم از کم چھے ہمہ وقتی ڈاکٹر ہوتے ہیں ۔ مختلف امراض کے علاج کے لیے خصوصی ماہرین بھی مقرر ہیں ۔ مرکزی اور صوبائی صدر مقامات پر قائم ہسپتالوں میں علاج کی سہولتیں اور بھی زیادہ ہیں ۔ ان ہسپتالوں کے عام وارڈوں میں علاج کے تمام مصارف حکومت برداشت کرتی ہے ۔ ان سرکاری ہسپتالوں اور شفاخانوں کے علاوہ فلاحی انجمنوں کے قائم کردہ شفاخانے اور ہسپتال بھی معقول تعداد میں موجود ہیں ۔ اسی طرح ڈاکٹروں کے اپنے پرائیویٹ مطب بھی کثرت سے موجود ہیں ۔

عام امراض اور ان کا علاج : ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں کوئی دو کروڑ افراد ہر سال ملیریا کا شکار ہوتے ہیں اور اس سے انسانی اموات کا اندازہ ڈھائی لاکھ سالانہ ہے ۔ ۱۹۶۱ء سے ملیریا کے انسداد کی ملک گیر مہم جاری ہے اور ۱۹۷۵ء تک اس مرض کے مکمل انسداد کا منصوبہ بن چکا ہے ۔ ریاستہاے متحدۂ امریکہ اور عالمی ادارۂ صحت (WHO) اس کے فنی پہلوؤں میں امداد کر رہے ہیں اور ضروری غیر ملکی زرمبادلہ بھی مہیا کر رہے ہیں ۔ ۱۹۷۰ء تک دو کروڑ افراد کلی طور پر اس سے محفوظ ہو جائیں گے ۔

ایک جائزے کے مطابق اس وقت ایک لاکھ سے زائد افراد تپ دق میں مبتلا ہیں ۔ ۱۹۴۹ء سے بی سی جی (BCG) کے ٹیکے لگوانے کی مہم جاری ہے اور اب تک ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کو تپ دق کے حفاظتی ٹیکے لگائے جا چکے ہیں ۔ ملک میں تپ دق کے چھوٹے بڑے سب ملا کر ایک سو شفاخانے ہیں اور ۱۹۷۰ء تک ان کی تعداد ۱۸۱ ہو جائے گی ۔ ڈھاکے اور راولپنڈی میں تپ دق کی تحقیق کے لیے سو سو بستر کے جدید طرز کے ہسپتال قائم کیے جا رہے ہیں ۔

۱۹۶۰ء میں سیٹو SEATO کے تعاون سے ڈھاکے میں ہیضے کی تحقیق کے لیے ایک تجربہ گاہ قائم ہوئی، جس کی کاوشوں سے ہیضے سے مرنے والوں کی شرح ۵۰ فی صد سے گھٹ کر ۲ فی صد رہ گئی ہے ۔

۱۹۶۰ء میں چیچک کے انسداد کے لیے کومیلا اور فریدپور کے اضلاع میں ایک رہبر منصوبہ (Pilot Project) بنایا گیا، جس کی بدولت اب اس خوفناک مرض سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو چکی ہے ۔

اس وقت ملک میں کوئی ایک لاکھ افراد جذام میں مبتلا ہیں اور ان کی اکثریت بھی مشرقی پاکستان ہی میں ہے ۔ انسداد جذام کے منصوبے کا آغاز ہو چکا ہے اور عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ایک ماہر خصوصی اس پر کام کر رہے ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں چار گشتی شفاخانے

ایک سو ننانوے مختلف مقامات پر کوڑھیوں کے علاج
کے لیے قائم ہیں۔ ڈھاکے اور Nilphamari میں دو مستقل
ہسپتال موجود ہیں۔ مشنری ہسپتال اور نجی شفاخانے
ان کے علاوہ ہیں اور ان میں کل چار سو بستر
کی سہولت موجود ہے ۔ مغربی پاکستان میں کراچی
کے مقام پر دو سو بستر کا ایک ہسپتال قائم ہے،
جسے مرکزی حکومت کی امداد سے میونسپل کارپوریشن
چلا رہی ہے ۔ ضلع بالا کوٹ میں پچاس بستر کا
ایک شفاخانہ ہے ۔ علاوہ ازیں خیراتی شفاخانوں
میں بھی ۲۲۱ بستر مہیا ہیں۔

ملک میں دماغی عارضے میں مبتلا افراد
کی صحیح تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا
گیا، لیکن خیال ہے کہ صنعت کاری کے فروغ،
شہروں میں بسنے کے بڑھتے ہوئے رجحان، تمدن
کی پیچیدگیوں اور روز افزوں تکلفات کی وجہ سے
ذہنی عوارض میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد میں
اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس وقت دماغی امراض کے کل
پانچ ہسپتال ہیں، جن میں دو ہزار مریضوں کے
رکھنے کی گنجائش ہے ۔ عام ہسپتالوں میں بھی
معمولی درجے کے دماغی مریضوں کے علاج کے
انتظامات موجود ہیں۔

انسدادی اقدامات اور حفظ صحت:
امراض کے تدارک اور ان کی روک تھام کے لیے ملک
میں حفاظتی اور انسدادی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔
صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جا رہا ہے ۔ غلاظت
کے نکاس کے معقول انتظامات کیے جا رہے ہیں ۔
صاف پانی کی فراہمی کے کئی منصوبوں پر عمل درآمد
جاری ہے ۔ عوام میں اچھی اور متوازن غذا کا
شعور پیدا کیا جا رہا ہے ۔ حفاظتی ٹیکوں کی
سہولتوں میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور اس وقت
صحت کے منصوبوں پر خرچ ہونے والی کل رقم کا
۶۰ فی صد محض انسدادی تدابیر کے لیے
وقف ہے ۔

امراض پیدا کرنے میں سب سے بڑا دخل ماحول
سے صفائی کے فقدان کو ہے ۔ مشرقی پاکستان میں
۵۰ فی صد امراض کا آغاز معدے اور انتڑیوں کی
خرابی (gastro-intestinal disorders) سے ہوتا ہے
اور معدے کی تمام بیماریاں غلاظت اوز ناصاف پانی
سے جنم لیتی ہیں؛ چنانچہ نئے مکان بناتے وقت اور
نئی مضافاتی بستیاں بساتے وقت صاف پانی کی فراہمی
اور غلاظت کے نکاس کی طرف اب خاص توجہ دی
جاتی ہے ۔

تغذیہ: پاکستان کے اکثر علاقوں میں
غذائیت کی مقدار اور اس کا معیار عالمی ادارۂ
خوراک و زراعت (FAO) کے مقرر کردہ معیار سے
کم ہے ۔ متوازن اور توانائی بخش غذا میسر
نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں قوت مدافعت
گھٹ جاتی ہے ۔ وزارت صحت نے ملک بھر میں
غذا کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کے لیے ایک
نظامت قائم کی ہے ۔ ڈھاکے میں غذائی تحقیق کی
تجربہ گاہ قائم ہے؛ کوئٹے اور سکھر میں بھی
ایسی تجربہ گاہیں قائم کی جا رہی ہیں ۔

صفائی: ۱۹۶۶ء سے صفائی کی ایک وسیع
اور ملک گیر مہم جاری ہے ۔ صفائی کے پرچار
کے لیے اظہار و ابلاغ کے تمام ذرائع سے کام لیا
جا رہا ہے ۔ عوام الناس کو صفائی، تازہ ہوا، صاف
پانی اور پاکیزہ اور متوازن غذا کی اہمیت سے
روشناس کرایا جا رہا ہے ۔ محکمۂ صفائی کے
اہلکار ہوٹلوں اور منڈیوں میں جا کر اجناس
خوردنی کا معائنہ کرتے ہیں اور ملاوٹ کرنے والوں
کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں ۔

تعلیم و تربیت: مشرقی پاکستان میں نظامت
تعلیم صحت (Directorate of Health Education)
اور مغربی پاکستان میں ادارۂ تعلیم صحت قائم ہیں،

جن کا مقصد لوگوں کو اچھی صحت اور اس کے بنیادی لوازمات کا شعور دلانا اور وبائی امراض کے انسداد کے طریقے بتانا ہے ۔ اس سلسلے میں سماجی رضاکار تنظیمیں بھی حکومت کا ہاتھ بٹاتی ہیں ۔

آغاز پاکستان کے وقت ملک میں صرف ایک میڈیکل کالج تھا ۔ اب بارہ کالج کام کر رہے ہیں، جن سے مجموعی طور پر ہر سال ایک ہزار سے زائد ڈاکٹر فارغ التحصیل ہوتے ہیں ۔ ان کالجوں میں غیر ملکی طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں ۔ ان سب کے ساتھ ملحقہ ہسپتال ہیں ۔ تعلیمی کورس کی مدت پانچ سال ہے ۔ طب اور جراحت کے شعبوں میں مزید خصوصی تربیت کے انتظامات کراچی، ڈھاکے اور لاہور میں موجود ہیں ۔ گرم ممالک سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کی تحقیق اور مطالعے کے لیے ڈھاکے میں ایک کالج قائم کیا جا رہا ہے ۔ لاہور میں انسدادی طب اور حفظ صحت کا ایک ادارہ بھی قائم ہے ۔

بڑے بڑے ہسپتالوں میں نرسنگ کے چھبیس تربیتی ادارے موجود ہیں ۔ ان کا کورس تین سال کا ہے ۔ حال ہی میں راولپنڈی میں نرسنگ کی اعلٰی تعلیم کا ایک کالج قائم ہوا ہے، جہاں تین سالہ کورس کے علاوہ دایہ گری کا ایک سالہ تربیتی کورس بھی شامل نصاب ہے ۔

طبی تجربہ گاہوں میں فنی صلاحیتوں سے بہرہ‌ور کارکن مہیا کرنے کے لیے کراچی میں ایک تربیتی ادارہ قائم کیا گیا ہے ۔ اسی طرح ڈھاکے، بہاولپور اور کوئٹے میں صحت اور صفائی کے محکمے کے لیے کارکن تیار کرنے کے ادارے ہیں ۔ اسلام آباد میں بھی میڈیکل ٹکنالوجی Medical Technology کا ایک سکول قائم ہوا ہے، جہاں اس فن میں اعلٰی تربیت کے انتظامات موجود ہیں ۔

۱۹۵۳ء میں پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل Pakistan Medical Research Council کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ طب اور صحت کے مختلف شعبوں میں کی جانے والی تحقیقات کی اس طرح تنظیم ہو کہ ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے، ان کی افادیت عام ہو اور اس سے علم طب کو فروغ حاصل ہو ۔ اس کونسل کی زیر سرپرستی اس وقت پچاس سے زائد منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ کالرا انسٹی ٹیوٹ Cholera Institute، ڈھاکہ جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل سنٹر Jinnah Post Graduate Medical Center، کراچی اور انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ Institute of Puplic Health، ڈھاکہ، طبی تحقیق میں گراں‌قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ اسلام آباد میں نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز National Health Laboratories کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، جہاں تغذیہ، صحت، ادویات اور دیسی جڑی بوٹیوں کی تحقیق کا کام جاری ہے ۔

قومی قرابادین (National Pharmacopia): اب تک پاکستان میں ایسی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی جس میں طب جدید و قدیم کے تمام نسخے درج ہوں ۔ اب ملکی ضروریات اور قومی تقاضوں کے پیش نظر ایک ایسی کتاب الادویہ زیر ترتیب ہے جو جدید طب کے ساتھ ساتھ یہاں کی دیسی ادویات، مرکبات، ان کی تیاری، ترکیب استعمال اور فوائد پر مشتمل ہوگی ۔ اپنی سر زمین میں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیاں یہاں کے لوگوں کے مزاج سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں اور تاثیر کے اعتبار سے غیر ملکی ادویات سے بہتر اور ارزاں بھی ہیں ۔

دیسی طب کا نظام : آیورویدک، یونانی اور ہومیوپیتھی طریقہ‌ہائے علاج سے ملک کی کثیر آبادی فیضیاب ہو رہی ہے ۔ دیہات میں

بالخصوص یہ زیادہ کامیاب اور مقبول ہیں ۔ حکومت نے ان تمام طریقہ‌ہاے علاج کو منظور کر لیا ہے اور ۱۹۶۵ء کے ایکٹ کی رو سے ان تینوں طریقوں میں پریکٹس کرنے والے اطبّا کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنا نام اپنے اپنے طبی بورڈ کے پاس رجسٹر کرائیں ۔ نجی طور پر بعض اداروں نے صحت اور طبی تحقیق کے شعبے قائم کر رکھے ہیں، جن کا مقصد ملک میں دیسی طریقۂ علاج کو فروغ دے کر اسے جدید طبی علوم کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا ہے.

۱۸ - خاندانی منصوبہ‌بندی

پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی ایک مسئلہ بن چکی ہے - ۱۹۶۷ء کے وسط میں آبادی گیارہ کروڑ سے زیادہ تھی ۔ پیدائش کی شرح بڑھ رہی ہے اور صحت کی جانب زیادہ توجہ مبذول کرنے کے نتیجے میں اموات کی شرح میں کمی پیدا ہو گئی ہے ۔ بےروزگاری، افلاس، جہالت کی فراوانی اور زرعی پیداوار کی قلت، یہ سب چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے پر کوئی قدغن لگائی جائے.

ماہرین اقتصادیات کے نزدیک اقتصادی ترقی کے پہلو بہ پہلو آبادی کے مسئلے پر غور کرنا بھی کچھ کم اہم نہیں ۔ تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنا بھی اقتصادی خوش حالی اور ترقی کا ایک حصہ ہے، چنانچہ خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے ایک مہم کا آغاز کیا گیا ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی آبادی کے درمیان عمر کی ناہمواری کو رفع کیا جائے، ۱۹۷۰ء تک خوراک کے معاملے میں ملک کو خود کفیل بننے کے قابل بنا دیا جائے، نیز موجودہ فی کس آمدنی کو برقرار رکھا جائے بلکہ منصوبہ بندی کے تحت آمدنی میں اضافہ کیا جائے ۔ ان اغراض و مقاصد کے پیش نظر ۱۹۷۰ء تک دو کروڑ شادی شدہ جوڑوں کو خاندانی منصوبہ بندی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی.

اسی طرح یہ بھی تجویز کیا گیا کہ پیش نظر عرصۂ منصوبہ بندی (۱۹۶۵ تا ۱۹۸۵ء) کے دوران میں علاوہ دیگر فوائد کے فی کس سالانہ آمدنی کو تین گنا بڑھا دیا جائے اور تعلیم عام کر دی جائے، نیز یہ کہ شرح پیدائش کو ۵۰ فی ہزار سے کم کر کے ۳۶ فی ہزار کر دیا جائے.

پاکستان کے روایتی ماحول میں خاندانی منصوبہ‌بندی کی شدید مخالفت ناگزیر ہے ۔ غیر اخلاقی قرار دینے کے علاوہ مندرجۂ ذیل دلائل بھی اس کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں : اولاد اقتصادی سہارا ہے؛ لڑکے جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی بڑھاپے میں بےفکری اور استحکام حاصل ہوگا؛ اولاد والدین کے درمیان خوشگوار اور مضبوط تعلقات کی ضامن ہوتی ہے، وغیرہ ۔ خاندانی منصوبہ‌بندی کی راہ میں ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ عوام تعلقات زنا شوئی کے بارے میں گفتگو کرتے شرم محسوس کرتے ہیں.

بایں‌ہمہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ شہروں اور دیہات میں لوگ آہستہ آہستہ خاندانی منصوبہ‌بندی کی ضرورت و اہمیت کے قائل ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے پورا نظم و نسق مصروف عمل ہے، چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اس کے لیے پچاس لاکھ روپے، دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۳ کروڑ ۰ لاکھ روپے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۲۸ کروڑ ۰م لاکھ روپے رکھے گئے ۔ وزارت صحت کے ماتحت خاندانی منصوبہ‌بندی کا ایک پورا محکمہ کام

کر رہا ہے اور اس کے مراکز ملک کے کونے کونے میں قائم کیے گئے ہیں ۔ اندازہ ہے کہ اس پروگرام پر عمل کرنے سے مشرقی پاکستان میں ۸ لاکھ ۵٦ ہزار اور مغربی پاکستان میں ۸ لاکھ ١٦ ہزار بچے کم پیدا ہوے ۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے Pakistan Year Book 1969، ص ۳۷۳ تا ۳۷۵ ۔

١٩ ۔ محنت

١٩٦١ء کی سر شماری کی رو سے ملک کی غیرفوجی افرادی قوت ۳ کروڑ ۲ لاکھ افراد (۲ کروڑ ٦۴ لاکھ مرد اور ۳۸ لاکھ عورتیں)، یعنی آبادی کے ایک تہائی حصے پر مشتمل تھی اور ان میں بر سر روزگار اور روزگار کے خواہاں دونوں شامل تھے ۔

١٩٥١ اور ١٩٦٠ء کے درمیان دس سال میں آبادی ۲۳۰٩ فی صد کے حساب سے اور افرادی قوت ۳۱۰۳ فی صد شرح سے بڑھی ۔ منصوبہ بندی کمیشن کے تخمینے کے مطابق ١٩٦٠ سے ١٩٦٥ء تک ۷ لاکھ ۲۰ ہزار افراد سالانہ اور ١٩٦٥ سے ١٩٧٠ء تک ۸ لاکھ ۴۰ ہزار افراد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا اور یوں ١٩٧٠ء تک نوے لاکھ افراد کا اضافہ ہوا ۔

١٩٦١ء میں محنت کشوں کی تین چوتھائی تعداد کا پیشہ زراعت تھا (مغربی پاکستان میں ۴۰۰۰۷ فی صد اور مشرقی پاکستان میں ٩١٠٦ فی صد) ۔ عورتوں کا تناسب بھی زراعتی پیشوں میں سب سے زیادہ ہے ۔

صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ محنت کشوں کی تقسیم کار میں نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہو رہی ہے ۔ اب صنعت و حرفت میں محنت کشوں کی زیادہ کھپت ہو رہی ہے اور زراعت پر جو بہت زیادہ انحصار کرنا پڑ رہا تھا اس میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے ۔

١٩٦١ء کی سر شماری کی رو سے بے روزگار محنت کشوں کی تعداد تقریباً تین لاکھ ٦ ہزار تھی، لیکن یہ اعداد و شمار روزگار کی صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں کرتے ۔ تیسرے منصوبے کا تخمینہ ہے کہ ملک کی ۲۰ فی صد افرادی قوت ضائع ہو رہی ہے ۔ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو جانے اور بھارت سے لگاتار ہجرت کر کے آنے والوں کی وجہ سے بےروزگاری بڑھ گئی ہے ۔ محنت کاروں کے شہری مرکزوں کی طرف نقل مکانی کرنے کے رجحان کے باعث دیہی علاقوں میں تو بےروزگاری کم ہو رہی ہے لیکن شہری علاقوں میں بڑھ رہی ہے ۔

افرادی قوت میں اضافے کے مدّ نظر دوسرے منصوبے میں چھتیس لاکھ اور تیسرے منصوبے میں پچپن لاکھ نئی ملازمتوں کے مواقع فراہم کیے گئے، لیکن اس سے بےروزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکا ۔ اب چوتھے پنج سالہ منصوبے (١٩٧٠ تا ١٩٧٥ء) میں ایک جامع لائحۂ عمل تیار کیا گیا ہے ۔

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ زیریں سطح پر ملازمتوں کی اور اعلٰی سطح پر مناسب اور موزوں افراد کی کمی ہے، خصوصاً تربیت یافتہ ہنرمندوں اور اعلٰی تربیت یافتہ افراد کی بےحد ضرورت ہے ۔ محنت پہلے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا مشترکہ مسئلہ تھا، لیکن ١٩٦٢ء کے ایک نئے قانون کی رو سے یہ صوبائی مسئلہ بن گیا، لٰہذا اب اس شعبے میں آئین‌سازی صوبائی حکومتوں کی ذمےداری ہے؛ تاہم مرکزی حکومت توافق و ہم آہنگی پیدا کرنے، نظم و ضبط قائم رکھنے اور بین الاقوامی ذمےداریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ملک میں محنت کی صورت حال پر نظر رکھتی ہے ۔

۱۹۵۹ء میں مرکزی حکومت نے محنت کے طریق کار پر نظرثانی کی، جس کے چند بنیادی مقاصد یہ تھے: (۱) آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانا؛ (۲) ہر طبقے کے محنت کشوں کو معاشرتی سہولتیں بہم پہنچانا؛ (۳) صنعتی میدان میں امن و امان قائم رکھنا؛ (۴) ٹریڈ یونینوں کی صحت مند سرگرمیوں کا فروغ؛ (۵) بے روزگاری میں تخفیف؛ (۶) محنت کشوں کی کارخانوں اور گھروں میں گزربسر کے متعلق معلومات جمع کرنا؛ (۷) امداد باہمی کے خطوط پر ان کی سماجی بہبود؛ (۸) دوست ممالک سے تکنیکی امداد کا حصول؛ (۹) بین الاقوامی تنظیم محنت (ILO = International Labour Organization) کی سفارشات اور قراردادوں کے مطابق پالیسی وضع کرنا۔

محنت کے متعلق اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدّد قوانین وضع کیے گئے ہیں - ۱۹۶۹ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد حکومت نے ملک کے لیے نئی لیبر پالیسی طے کی ہے، جس سے مزدوروں کو مزید مراعات اور تحفظات مل گئے ہیں۔

آزادی کے حصول کے فوراً بعد پاکستان ILO کا رکن بن گیا اور وہ اب تک اس کے انتیس معاہدوں کی توثیق کر چکا ہے - مزدوروں، مالکوں اور حکومت کے نمائندوں کی ہر سال ایک کانفرنس ہوتی ہے، جس میں مزدوروں اور انتظامیہ کے مختلف مسائل اور حکومت کی پالیسی زیر بحث آتی ہے۔

دوسرے پنج‌سالہ منصوبے کی سفارشات پر عمل درآمد کرتے ہوے قومی افرادی قوت کی مجلس (National Manpower Council) کا قیام عمل میں آیا، جس کا سربراہ وزیرِ صحت و محنت و معاشرتی بہبود ہے اور اس کے ارکان منصوبہ بندی ڈویژن، جملہ اہم مرکزی وزارتوں، صوبائی حکومتوں اور ریلوے بورڈوں سے لیے گئے ہیں - اس کونسل کے متعدّد وظائف میں سے دو یہ ہیں: اولاً انسانی وسائل کی ترقی اور ان سے استفادے کے لیے لائحۂ عمل تیار کرنا اور ثانیاً ایک طرف تو صنعتی ضروریات کے مطابق محنت کشوں کی تربیت کا لائحۂ عمل تیار کرنا اور دوسری جانب تربیت‌یافتہ اور غیر تربیت‌یافتہ محنت کشوں کے لیے مناسب روزگار مہیا کرنے کا منصوبہ تیار کرنا۔

اس کونسل کی معاونت کے لیے کچھ مخصوص شعبے بھی قائم کیے گئے ہیں، مثلاً اعلٰی سطح کی مجلس عملہ (High-Level-Personnel Committee)، قومی تربیتی بورڈ (National Training Board) اور ترقی روزگار کا دفتر (Employment Promotion Board) یا (Civil Works Board)۔

دفاتر روزگار و تربیت (Employment And Training Services): اعلٰی درجے کی خالی اسامیوں کو بذریعۂ اخبارات مشتہر کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک ادنٰی درجے کی ملازمتوں کا تعلق ہے حکومت شہری علاقوں میں تیئیس سے زائد دفاتر روزگار (Employment Exchanges) چلا رہی ہے - ان دفاتر کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے - ۱۹۴۸ء میں ان کی وساطت سے پانچ ہزار سے کچھ کم اشخاص کو روزگار ملا تھا - اب یہ تعداد ستر سے اسّی ہزار سالانہ تک پہنچ گئی ہے - قومی افرادی قوت کی مجلس بھی ایک قومی دفتر روزگار (National Employment Bureau) چلاتی ہے، جس کا کام ہنرمند (Technical) اشخاص کو ملک کے اندر اور باہر روزگار کے حصول میں مدد دینا ہے - اسی مجلس کے زیر اہتمام نوجوانوں کو ان کی افتاد طبع کے مطابق پیشوں کے انتخاب اور روزگار مہیا کرنے کے لیے ۱۹۶۴ء سے صیغۂ روزگار نوجوانان (Youth Employment

(Services) کام کر رہا ہے۔

برصغیر میں ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز ۱۸۹۰ء میں ہوا، لیکن اسے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد فروغ حاصل ہوا۔ آزادی کے وقت پاکستان صنعت و حرفت میں بےحد پسماندہ تھا، اس لیے ۱۹۴۷ء میں منظورشدہ مزدور انجمنوں (Registered Trade Unions) کی تعداد صرف پچھتر تھی اور وہ بھی اچھی طرح منظم نہ تھیں۔ صنعت و حرفت میں ترقی اور انجمن سازی کی حوصلہ افزائی کے سبب مئی ۱۹۶۶ء میں ان کی تعداد ۹۸۷ اور ان کے ارکان کی تعداد ۵۱۷۶۵۹ تک پہنچ گئی۔ یہ انجمنیں زیادہ‌تر بڑے بڑے صنعتی مرکزوں، مثلاً ڈھاکے، چٹاگانگ، کراچی اور لاہور میں، قائم ہیں۔ یہ عموماً مقامی ہوتی ہیں، لیکن بیشتر کا الحاق کسی نہ کسی مرکزی وفاقیہ (Federation) سے ہوتا ہے، مثلاً آل پاکستان کنفیڈریشن آف لیبر All Pakistan Confederation of Labour، آل پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز All Pakistan Federation of Trade Unions، پاکستان مزدور فیڈریشن Pakistan Mazdoor Federation، پاکستان کے بحری کارکنوں کی فیڈریشن (Pakistan Sea Farers Federation) اور یونائیٹڈ ٹریڈ یونین فیڈریشن United Trade Union Federation۔ ان میں سب سے بڑی آل پاکستان کنفیڈریشن لیبر ہے، جس سے ۱۹۶۵ء تک پچیس مختلف صنعتوں کی ۲۹۵ جمعیتیں ملحق تھیں، جن کے ارکان کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی۔

پاکستان میں بہت عرصے تک ۱۹۲۹ء کا صنعتی تنازعات کا قانون نافذ رہا، جس میں آزادی کے بعد وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوتی رہیں، لیکن حکومت پاکستان کو آخرکار اس قانون کو منسوخ کرکے اس کی جگہ ایک نیا قانون نافذ کرنا پڑا، جسے صنعتی تنازعات کا ضابطہ (Industrial Dispute Ordinance) کہتے ہیں۔ اس ضابطے سے تنازعات کے تصفیے کا طریق کار پہلے سے کہیں زیادہ سہل اور بہتر ہوگیا اور صنعتی عدالت بننے سے انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوگئے ہیں۔

۲۰ - سماجی بہبود

پاکستان ایک فلاحی مملکت ہے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دستوروں میں حکومت کا فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل ہر شہری کے معیار زندگی کو ترقی دے، دولت کے ارتکاز کو روکے، ملک کے سب طبقوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے، ہر شخص کے لیے روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے اور جو لوگ جسمانی نقص یا کسی اور وجہ سے اپنی روزی نہ کما سکیں ان کی کفالت کرے۔ دراصل خود اسلام نے، جس پر پاکستان کی بنیاد ہے، حکومت پر یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جس وسیع پیمانے پر نقل آبادی ہوئی اسے حکومت سنبھال نہیں سکتی تھی۔ لوگوں نے کچھ اپنی سعی و کوشش سے اور کچھ محکمۂ بحالیات کی امداد سے سر چھپانے کی جگہیں اور بعض کاروبار حاصل کیے۔ کچھ کام محکمۂ تعلیم، صحت عامّہ، محنت، عدلیہ، زراعت، امداد باھمی اور عوامی انجمنوں کے ذریعے بھی سر انجام دیا گیا؛ لیکن اس سلسلے میں حکومت کے سامنے مسائل و مشکلات کا انبار تھا۔ حکومت نے اپنے انتظامی ڈھانچے میں سماجی بہبود کا کام وزارت صحت و محنت و سماجی بہبود کے سپرد کر رکھا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رو سے اسے صوبجاتی ذمےداری قرار دیا گیا؛ چنانچہ اس کے بعد سے سماجی بہبود کے تمام کام اور منصوبے اور ادارے

صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دیے گئے، البتہ بالائی نگرانی اور بین الاقوامی سطح کے کام بدستور مرکز کے سپرد رہے۔

حکومت کے سماجی بہبود کے محکمے کے دو بنیادی کام ہیں: (۱) صنعت و زراعت اور ملازمتوں وغیرہ کے سلسلے میں ایسا معتدل معاشرتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ملک میں دولت کا ارتکاز نہ ہو سکے، کوئی طبقہ پس ماندہ نہ رہ جائے اور سب کے لیے کھانے، پینے، رہنے سہنے، لباس، علاج اور تعلیم کی سہولتیں پیدا ہو جائیں؛ (۲) اگر پھر بھی سماج میں سے کچھ لوگ پس‌ماندہ رہ جائیں تو ان کی عملی امداد کی جائے۔

اس محکمے نے محسوس کیا کہ ٹھوس بنیادوں پر کام کرنے کے لیے سب سے زیادہ کمی تربیت یافتہ عملے کی ہے۔ تقسیم ملک کے وقت چھوٹے پیمانے پر محنت مزدوری کرنے والوں کی بہبود کے لیے حکومت کے ڈھانچے میں ایک شعبہ موجود تھا، جس میں افسران سماجی بہبود (Labour Welfare Officers) بھرتی کیے جاتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ اور بعض دوسرے اداروں کے تعاون سے سماجی بہبود کے لیے کارکنوں کی تربیت کا اہتمام کیا گیا، جس کے ذریعے پہلے پنج سالہ منصوبے کے آغاز سے پہلے ۱۲۳ کارکن تیار ہو چکے تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس Post Graduate Course کا بندوبست کر لیا گیا تھا اور عملی امداد کے سلسلے میں دیہات کی زرعی و صنعتی ترقی (V.A.I.D. = Village Agricultural and Industrial Development)، قومی ترقی، زچہ و بچہ کے امدادی مراکز کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اسی طرح گونگوں، بہروں، اندھوں اور یتامیٰ کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

پہلے پنج سالہ منصوبے (۱۹۵۵ - ۱۹۶۰ء) میں تین چیزوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی تھی: سماجی منصوبہ بندی، سماجی تحقیقات اور سماجی کام۔ اس طرح حکومت کے ڈھانچے میں Social Welfare اور Housing and Settlement کے دو جدید محکمے قائم کیے گئے اور سماجی بہبود کے لیے منصوبے میں تین کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی۔ جنوری ۱۹۵٦ء میں مرکزی حکومت نے سرکاری اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل سماجی بہبود کی ایک قومی مجلس (National Council of Welfare) قائم کی۔ اس کونسل کا ایک اہم کام یہ تھا کہ رضاکارانہ طور پر کام کرنے والے نجی اداروں کی ضروریات اور ان کی کارکردگی کا اندازہ کرے، ان کی راہنمائی کرے اور انھیں مالی اور فنی امداد دے۔ بعد میں ایسی کونسلیں صوبوں میں بھی قائم کر دی گئیں۔ ان کونسلوں کی حیثیت مشیرِ حکومت کی تھی۔ اس منصوبے میں عملاً زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ کارکنوں کی تربیت کی جائے؛ چنانچہ پانچ سو کارکن تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، لاہور کے علاوہ ایک مرکز ڈھاکے میں اور تیسرا کسی اور جگہ کھولنے کی تجویز کی گئی (ڈھاکے کا مرکز ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا) اور مشورہ دیا گیا کہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں سوشل ورکس Social Works کا شعبہ قائم کیا جائے اور اسی طرح بعض دوسرے ذرائع سے تربیت‌یافتہ عملہ مہیا کیا جائے؛ لہٰذا پہلے پنج سالہ منصوبے کی بیشتر رقم تربیت کی ان تنظیموں، عمارات، موٹر گاڑیوں اور دفتری ساز و سامان پر لگ گئی، جس میں ستر لاکھ کا غیرملکی زر مبادلہ بھی شامل تھا، نیز اس رقم سے سماجی بہبود کے دو سو نجی ادارے امداد لیتے رہے۔ اس منصوبے میں حکومت کو اس طرف بھی توجہ دلائی

گئی کہ زکوٰۃ و اوقاف کے روپے کو سماجی بہبود کے لیے صرف کرنے کے لیے قوانین بنائے جائیں ۔ اس منصوبے میں جو رقم رکھی گئی تھی اس کی نسبت ۲۰ فی صد کے قریب نتائج برآمد ہوئے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں کوئی ۸ کروڑ ۴۷ لاکھ روپیہ رکھا گیا تھا ۔ اس میں سماجی بہبود کے نجی اداروں کی طرف توجہ دی گئی ۔ جو کارکن تیار ہو چکے تھے انھیں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت کام پر لگایا گیا ۔ زکوٰۃ، صدقات اور اوقاف کی رقوم کو سماجی بہبود پر صرف کرنے کا پروگرام بنایا گیا ۔ صوبائی حکومتوں میں سماجی بہبود کی نظامتیں قائم کی گئیں اور تجویز کی گئی کہ ہر صوبے میں سوشل ورک کا ایک ایک سکول کھولا جائے اور چار سو یونیورسٹی گریجویٹ اور سات سو دوسرے تربیت یافتہ کارکن تیار کیے جائیں؛ دس کالجوں میں سوشل ورک کے شعبے قائم کیے جائیں؛ شہری حلقوں میں اٹھانوے سکیمیں جاری کی جائیں؛ سینتالیس طبی امداد کے مرکز کھولے جائیں اور تین سو نجی رضاکارانہ کام کرنے والے اداروں کی مالی امداد کی جائے ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے رکھے گئے تھے۔

اس وقت ملک کے بیس کالج سوشل ورک میں گریجویٹ تیار کر رہے ہیں اور ان کی تعداد کو مزید بڑھایا جا رہا ہے ۔ مندرجۂ ذیل یونیورسٹیوں میں اس کے مستقل شعبے قائم ہیں : پنجاب، کراچی، ڈھاکہ، راجشاہی اور پشاور ۔ اندازہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک دو ہزار تربیت یافتہ کارکن تیار ہو جائیں گے ۔ ۱۹۵۵ء میں ان نجی اداروں کی تعداد دو سو تھی جو سماجی بہبود کا کام کر رہے ہیں ۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی تعداد چار ہزار تھی، جن میں بعض بڑے اہم ہیں، جیسے عورتوں کے لیے کل پاکستان انجمن خواتین (APWA)، مجلس بہبود اطفال (Pakistan Council for Child-Welfare)، عوامی بہبود کے لیے Pakistan Conference for Social Work، اندھوں کی بہبود کے لیے National Federation for the Welfare of the Blind، تپ دق کے مریضوں کی بہبود کے لیے Pakistan T. B. Welfare Association، جذامیوں کی بہبود کے لیے Pakistan Leprosy Association، ابتدائی طبی امداد کے لیے انجن صلیب احمر Red Cross Society اور St. John Ambulance Association ۔ کراچی میں رضاکارانہ طور پر ایک مجلس رابطہ Social Services Co-ordinating Council سماجی بہبود کے ساتھ سے اوپر اداروں میں رابطے کا کام کر رہی ہے ۔ ۱۹۶۱ء میں سوشل ویلفیئر ایجنسیز (رجسٹریشن اینڈ کنٹرول) آرڈیننس جاری کیا گیا تاکہ نجی اداروں کی کارکردگی کو بڑھایا جائے اور اداروں کی نگرانی کی جائے اور دیکھا جائے کہ چندہ دینے والوں نے جن مصارف کے لیے روپیہ دیا ہے ان کا صرف صحیح ہو رہا ہے ۔ مستحق امداد عورتوں کے تین مراکز (ڈھاکہ، کراچی، پشاور) اور بچوں کی امداد کے لیے حکومت کے پندرہ مراکز ملک میں کام کر رہے ہیں ۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ، اردو اور انگریزی میں اچھے مضامین لکھنے والے بچوں کے لیے تین، اچھے فنکاروں کے لیے دو اور خدمت اور جرأت کا ایک انعام ہر سال دیا جاتا ہے ۔ ہر سال ماہ اکتوبر کے پہلے دو شنبے کو بچوں کا دن منایا جاتا ہے ۔ اقوام متحدہ کے ادارے UNICEF کی طرف سے ملنے والی امداد سے ایک لاکھ عورتیں اور بچے مستفید ہو رہے ہیں ۔ اس ادارے کی طرف سے بچوں کی بہبود کے دو تربیتی مراکز (ڈھاکہ اور لاہور) قائم ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں حکومت کے قائم کردہ سترہ یتیم خانے ہیں اور ایسے یتیم خانے جنھیں حکومت

امداد دے رہی ہے چوبیس ہیں ۔ مغربی پاکستان میں حکومت کا اپنا قائم کردہ کوئی یتیم خانہ نہیں؛ امداد سے چلنے والے یتیم خانوں کی تعداد انیس ہے ۔ نجی یتیم خانوں کی کل تعداد کوئی پانچ سو ہوگی ۔ کراچی میں ۱۹۶۳ء سے کس مپرس بچوں کی نگہداشت کا ایک مرکز کام کر رہا ہے ۔ نوجوانوں کی امداد کے لیے بھی ملک میں بعض ادارے قائم ہیں؛ گرلز گائیڈ اور بوائے سکاؤٹس کے علاوہ ڈھاکے میں ایک ورکس کیمپ ایسوسی ایشن اور لاہور میں یوتھ ہوسٹل ایسوسی ایشن قائم ہے ۔ کراچی کے ثانوی تعلیمی بورڈ نے نیشنل یوتھ سنٹر قائم کیا ہے ۔ مشرقی پاکستان میں ایسے سولہ مراکز موجود ہیں۔

حکومت کی طرف سے ایسے قواعد بھی موجود ہیں جن کے مطابق ملازم رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ان حادثات کا معاوضہ ادا کریں جو کام کرنے کے دوران میں کسی ملازم کو پیش آ جائیں، مثلاً دیکھیے Workmen's Compensation Act, 1923 و Employte's Social Insurance Ordinnnce, 1962 ۔ اسی طرح زچگی کی رخصتیں بھی دی جاتی ہیں۔

گداگری بہت بڑی لعنت ہے ۔ اسلام نے اسے سختی کے ساتھ روکا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بے وسیلہ لوگوں کی حفاظت و امداد کا بندوبست کیا جائے ۔ حکومت اس طرف توجہ دے رہی ہے اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہے جو سماجی برائیوں کے انسداد کے کمیشن نے اس بارے میں پیش کی ہیں ۔ حکومت مشرقی پاکستان نے ڈھاکے اور میمن سنگھ میں گداگروں کی بحالی کے لیے دو مرکز کھول رکھے ہیں ۔ اس طرح اپنی امداد آپ کے اصول پر کھلنا، بوگرا، رنگپور، کومیلا اور فریدپور میں مراکز قائم ہیں ۔ پاکستان میں ۱۹۶۲ء سے مجرموں کو قبل از وقت رہائی کی سہولتیں دے کر ان کی اصلاح و نگرانی کا محکمہ بھی قائم ہے ۔

جسمانی اور دماغی لحاظ سے پس‌ماندہ طبقوں کی بحالی کے بھی کچھ انتظامات ہیں ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں تقریباً پانچ لاکھ افراد نابینا ہیں ۔ حکومت نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی مراکز کھول رکھے ہیں ۔ نجی ادارے، مثلاً Association for the Prevention of Blindness اور Adult Blind Centre بھی اس سلسلے میں مفید کام کر رہے ہیں ۔ ایک درجن سے اوپر مراکز بہروں اور گونگوں کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ۔ دماغی لحاظ سے معذوروں کے متعلق Pakistan Institute of Mental Hygiene اور Pakistan Association of Mental Health مفصل جائزہ لے رہے ہیں۔

افلاس جہالت، امراض، عصمت فروشی، گداگری، بے روزگاری، غذائی قلت، سیلاب اور طوفان، مکانوں کی قلت، مجرموں کی بحالی اور جنگ سے پیدا شدہ برے اثرات کے سلسلے میں ملک جس پس‌ماندگی میں مبتلا ہے اس سے بہت سی سماجی برائیاں بھی جنم لے رہی ہیں ۔ انہیں دور کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیشن بھی قائم کیا ہے (Commission for the Eradication of Social Evils) ۔ ریٹائرڈ فوجیوں اور شہدا کے پسماندگان کی بہبود کے لیے بھی حکومت نے متعدد شعبے قائم کر رکھے ہیں؛ تاہم سماجی بہبود کے سلسلے میں بہت سا کام کرنا ابھی باقی ہے ۔

۲۱ ۔ رہائشی منصوبے اور تعمیرات

شہری ضروریات کی تکمیل کے لیے میونسپل اور ٹاؤن کمیٹیاں تو تقسیم ملک سے پہلے سے موجود تھیں لیکن یہ ذمے داری روز بروز اتنی بڑھ رہی تھی کہ بڑے شہروں کے لیے امپروومنٹ ٹرسٹ قائم کیے گئے ۔ پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے تھے ان میں

پہلا ٹرسٹ ۱۹۳۶ء میں قائم کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں ملک میں ایسے بائیس ٹرسٹ اور ۱۰۹ میونسپل کمیٹیاں موجود تھیں۔ دیہات کی رہائشی ضروریات کا کام ضلعی کونسلوں کے سپرد ہے۔ حکومت کی طرف سے محکمۂ تعمیرات عامّہ (Public Works=PWD Department) اور محکمۂ منصوبہ بندی (Planning Department) شہروں کے قیام اور تعمیرات کے سلسلے میں حکومت کی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ حکومت کے دارالحکومتوں کی تعمیر کا کام کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (Capital = C.D.A Develpment Authorty) کے سپرد ہے اور ریلوے، ڈاک و تار اور آب‌پاشی وغیرہ کے محکمے اپنے ملازمین کی سکونتی ضروریات کی طرف خود توجہ کرتے ہیں۔ منصوبہ‌بندی کمیشن وسیع پیمانے کی سکیموں کی طرف توجہ دیتا ہے۔

پاکستان کی آبادی میں سالانہ تیس لاکھ نفوس سے بھی زیادہ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ صنعت و تجارت کی ترقی سے شہری آبادی میں اضافے کی مقدار بہت زیادہ ہے، پھر ہندوستان سے بھی مسلمانوں کی نقل آبادی ہوتی رہتی ہے۔ ان وجوہ سے پاکستان میں رہائش کا مسئلہ نازک سے نازک تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور سالانہ کوئی ساٹھ ہزار مکانوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے؛ چنانچہ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے شروع کرتے وقت صرف شہری آبادی میں چھے لاکھ مکانوں کی کمی تھی اور تیسرے منصوبے کے شروع کرتے وقت یہ کمی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ حکومت کو اس کا احساس ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے تعمیر مکانات کے لیے تحقیقات کا کام بھی شروع کروایا تھا تاکہ دیکھا جائے کہ کس طرح کم خرچ مکانات تعمیر ہو سکتے ہیں اور مقامی مسالے سے انہیں تیار کیا جا سکتا ہے۔ پینے کے پانی کی بہم رسانی اور گندے پانی کے نکاس اور قومی اجتماعوں کے مراکز کی تعمیر، نیز شہروں اور مکانات کے نقشوں کی تیاری اور نئے مکانات کے بنوانے کے مسائل بڑے اہم ہیں؛ چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے کے مطابق شہروں کی منصوبہ‌بندی (Town Planning) اور تعمیرات کے دو مراکز کھولے (ایک ڈھاکے میں اور دوسرا لاہور میں)، نیز انہیں مقامات پر عمارتی تحقیقات کے ادارے (Building Research Institutes) قائم کیے گئے اور پورے منصوبے کے لیے ۸۶ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی۔ دوسرے منصوبے میں یہ رقم ۸۹ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی، لیکن اس میں اسلام آباد اور ڈھاکے میں دارالحکومتوں کی تعمیر کے اخراجات بھی شامل تھے جو اس رقم کا کوئی چوتھا حصہ تھے۔ تیسرے منصوبے کی رقم ۳ ارب ۲ کروڑ ۶۱ لاکھ تھی۔

۱۹۶۰ء کے اعداد و شمار کی رو سے ملک میں ۳۹۱ شہر اور ایک لاکھ دیہات تھے اور کوئی ساڑھے پانچ فی صد سالانہ کی شرح سے شہری آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں شہری آبادی ایک کروڑ ۲۶ لاکھ ۱۰ ہزار تھی، جو ۱۹۶۵ء میں ایک کروڑ ۶۴ لاکھ ۸۰ ہزار ہو گئی اور ۱۹۷۰ء میں اندازہ ہے کہ یہ تعداد ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت ملک میں مکانات بنانے کی چار سو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ انہیں مقامی امپرووَمنٹ ٹرسٹ ایسی اراضی مہیا کرتے ہیں جہاں پانی، بجلی اور سڑکوں وغیرہ کے انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت امداد باہمی کی انجمنوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ کرایوں کو اعتدال پر رکھنے کے لیے ملک میں رینٹ کنٹرول ایکٹ (Rent Control Act) بھی نافذ ہے۔ بیالیس ذیلی شہر بسائے گئے ہیں۔ حکومت نے مکان بنانے کے لیے قرضے دینے کے لیے مالیاتی کارپوریشن برائے تعمیر مکانات (House Building Finance Corporation) بنائی

ہوئی ہے، جس کے چار ریجنل اور بارہ سب ریجنل دفاتر کام کر رہے ہیں ۔ اس کارپوریشن کا ابتدائی سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے، جو حکومت نے مہیا کیا۔ اس کے علاوہ جون ۱۹۶۵ء تک اس نے حکومت سے چھے کروڑ روپیہ بطور قرض بھی لیا اور مزید ۱۲ کروڑ روپیہ دوسرے ذرائع سے حاصل کیا ۔ ۱۹۶۷ء تک اس کارپوریشن کی امداد سے صرف چوبیس ہزار مکانات تعمیر ہو سکے۔ بینک اور انشورنس کمپنیاں عموماً تعمیر مکان کے لیے قرضے نہیں دیتیں۔

۲۲ - نشریات

ریڈیو : پاکستان میں ریڈیو نشریات کا انتظام وزارت اطلاعات کے توسط سے کلیۃً حکومت کے ہاتھ میں ہے ۔ اس وقت ملک میں بارہ ریڈیو سٹیشن کام کر رہے ہیں : مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ، چٹاگانگ، راجشاہی، سلہٹ اور رنگپور اور مغربی پاکستان میں لاہور، پشاور، کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد، حیدر آباد اور کوئٹہ ۔ ان سے اٹھارہ زبانوں میں نشریات ہوتی ہیں ۔ ریڈیو کے محکمے کا اعلٰی افسر ڈائرکٹر جنرل کہلاتا ہے ۔

قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف تین ریڈیو سٹیشن تھے : لاہور (۵ کیلوواٹ، میڈیم ویو)، ڈھاکہ (۵ کیلوواٹ، میڈیم ویو) اور پشاور (۱۰ کیلوواٹ، میڈیم ویو) ۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں کراچی کا ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا، جس میں میڈیم ویو اور شارٹ ویو کا ایک ایک ٹرانسمٹر Transmitter نصب کیا گیا ۔ ایک سال بعد اس میں دس کیلوواٹ کے ایک میڈیم ویو ٹرانسمٹر کا اضافہ ہوگیا ۔ اسی سال ۷.۵ کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ایک ٹرانسمٹر ڈھاکے میں اور پچاس پچاس کیلوواٹ (شارٹ ویو) کے دو ٹرانسمٹر کراچی میں لگائے گئے ۔ ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی سٹیشن قائم کیا گیا اور اس میں ۷.۵ کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ٹرانسمٹر لگا ۔ اس سال پاکستان کے ان مراکز سے سترہ زبانوں میں نشریات ہوتی تھیں۔

پہلے پنج سالہ منصوبے میں نشریات کے لیے ڈھائی کروڑ، دوسرے میں چار کروڑ اور تیسرے میں نو کروڑ روپیہ رکھا گیا تھا ۔ تیسرے منصوبے میں یہ بھی مدنظر تھا کہ ملتان میں ۱۰۰ کیلوواٹ کا اور کھلنا اور خیر پور میں دس دس کیلوواٹ کے بالواسطہ نشریات کے "ریلے سٹیشن" قائم کیے جائیں اور اسلام آباد اور ڈھاکے میں ایک ایک ہزار کیلوواٹ (میڈیم) کا اور اسلام آباد میں ڈھائی سو کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ٹرانسمٹر لگایا جائے۔

۱۹۵۸ء میں ملک کے سب سٹیشنوں سے نشریات مجموعی طور پر ۲۹۳۱۵ گھنٹے ہوئی تھیں (میڈیم ویو : ۲۳۸۶۸ اور شارٹ ویو: ۲۳۵۴۷ گھنٹے) اور ۱۹۶۸ء میں ۹۳۰۱۸ گھنٹے (میڈیم ویو: ۴۲۹۳۶ اور شارٹ ویو: ۵۰۰۸۲ گھنٹے) ۔ اندرون ملک کے علاوہ دس غیر ملکی سروسیں بھی ہیں : برطانیہ، مشرقی افریقہ، جنوب مشرقی افریقہ، برما، افغانستان، عرب، جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، ایران اور ترکی۔ ان میں کل تیرہ زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔

اندرون ملک کے پروگراموں میں کوئی پچاس فی صد وقت گانے بجانے کو دیا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل پروگرام ہوتے ہیں: تلاوت قرآن مجید مع ترجمہ (مغربی پاکستان کے لیے اردو میں اور مشرقی پاکستان کے لیے بنگلہ میں)، خبریں (اردو، بنگلہ اور انگریزی میں)، تقریریں، مقالے، مشاعرے، مباحثے، مکالمے، مذاکرے، فیچر، بچوں، عورتوں، دیہاتیوں اور فوجیوں کے لیے خاص پروگرام، زراعتی پروگرام،

مشرقی پنجاب کے سننے والوں کے لیے پروگرام (یہ صرف لاہور سے نشر ہوتا ہے) ۔ سکول براڈکاسٹ، اور یونیورسٹی میگزین ۔ نومبر ۱۹۶۱ء کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سٹیشنوں سے کمرشل سروس بھی جاری ہے ۔ تمام بیرونی سٹیشنوں سے نشر ہونے والی خبریں اور ان پر تبصرے سننے کا انتظام موجود ہے اور اس طرح جمع ہونے والی معلومات حکومت پاکستان کو مہیا کی جاتی ہیں۔

ریڈیو پاکستان میں ۴۴۹ گانے والوں کی آوازوں کے ریکارڈ محفوظ ہیں ۔ پروگراموں کی پندرہ روزہ ماہانہ اشاعت، اردو، بنگلہ، انگریزی، عربی، ایرانی اور برمی زبانوں میں کی جاتی ہے ۔ نشریات سے حکومت کو ۱۹۶۰ء میں ستائیس لاکھ روپے آمد ہوئی، جو پانچ سال میں بڑھ کر ستر لاکھ روپے تک پہنچ گئی۔

ٹیلیویژن : پاکستان میں ٹیلیویژن سٹیشن قائم کرنے کا فیصلہ حکومت نے ۱۹۶۴ء میں کیا تھا ۔ اس سلسلے میں جاپان کی نوپن الیکٹرک کمپنی Noppon Electric Co. سے معاہدہ کیا گیا کہ وہ بطور تجربہ چھوٹے سے پیمانے پر دو سٹیشن قائم کرے، چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو لاہور میں اور دسمبر ۱۹۶۴ء میں ڈھاکے میں ابتدائی ٹیلیویژن سٹیشن قائم کیے گئے ۔ فروری ۱۹۶۵ء میں پانچ کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک ٹیلیویژن کارپوریشن (Television Promoters Co.) قائم کی گئی، جس میں نصف سے زیادہ سرمایہ حکومت پاکستان نے لگایا اور نصف نوپن الیکٹرک کمپنی جاپان اور انگلستان کی کمپنی (Thomson Televisioh (International) Ltd.) نے مہیا کیا ۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی سٹیشن نے کام شروع کیا ۔ اس کا ٹرانسمٹر چھے کیلوواٹ کا ہے اور لاہور اور ڈھاکے کی بہ نسبت بڑا بھی ہے اور مکمل بھی ۔ ۱۳ جنوری ۱۹۶۷ء کو راولپنڈی ۔ اسلام آباد میں بھی ایک سٹیشن قائم کیا گیا ۔ لاہور اور ڈھاکہ سٹیشنوں کو ترقی دی گئی ۔ چٹاگانگ اور پشاور میں اور اس کے بعد راجشاہی، ملتان، کھلنا، لائلپور، کومیلا اور حیدر آباد (سندھ) میں بھی سٹیشن قائم کرنے کا پروگرام ہے ۔ ۱۹۶۷ء ہی میں مغربی جرمنی کے اشتراک سے ٹیلیویژن کے کام کی تربیت کے لیے راولپنڈی میں ایک مرکز بھی کھولا گیا ہے ۔ لاہور اور ڈھاکے میں تین تین سو واٹ کا ٹرانسمٹر نصب کیا گیا ہے۔

ملک میں ۱۹۶۷ء تک پندرہ ہزار سے زائد ٹیلیویژن سیٹ درآمد ہو چکے تھے ۔ نو کمپنیوں کو درآمدی پرزے جوڑ کر سیٹ تیار کرنے کے لائسنس جاری ہو چکے ہیں، جن میں سے بعض نے عملاً کام شروع کر دیا ہے ۔ ریڈیو کی طرح ٹیلیویژن میں بھی کمرشل سروس کا اہتمام ہے ۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں ٹیلیویژن کے لیے ساڑھے پانچ کروڑ روپیہ رکھا گیا تھا۔

فلم : قیام پاکستان کے وقت صرف لاہور میں دو سٹوڈیو تھے اور وہ بھی نامکمل، چنانچہ یہاں فلم سازی کا بالکل نئے سرے سے آغاز ہوا ۔ ۱۹۴۸ء میں صرف ایک فلم بنی ۔ ۱۹۴۹ء میں سات اور ۱۹۵۰ء میں نو فلمیں مکمل ہوئیں ۔ اس وقت ملک میں گیارہ فلم سٹوڈیو ہیں، تقریباً چھے سو سینما ہال ہیں اور ہر سال دو سو کے لگ بھگ فلمیں تیار ہوتی ہیں ۔ چھے فلم سٹوڈیو لاہور میں ہیں، دو کراچی میں اور تین ڈھاکے میں ۔ ان میں سے بعض سٹوڈیو سازو سامان کے اعتبار سے خاصے معیاری ہیں ۔ زیادہ تر فلمیں اردو، بنگلہ اور پنجابی زبان میں ہوتی ہیں ۔ چند ایک فلمیں سندھی میں بھی تیار ہوئی ہیں اور اب پشتو فلمیں بھی بننے لگی ہیں ۔ ایک فلم پر دو سے سات لاکھ روپے تک خرچ آتا ہے اور اسے مکمل ہونے میں چھے ماہ سے

ایک سال تک کا عرصہ درکار ہوتا ہے ۔ فلم کا سارا خام مواد باہر سے درآمد کیا جاتا ہے ۔

پاکستان نے برلن، کینس Cannes، وینس، ماسکو، کولمبو، ایڈنبرا اور دوسرے مقامات پر ہونے والے بین الاقوامی فلمی میلوں میں شرکت کی ہے اور متعدد انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔

سنسر بورڈ کی منظوری حاصل کیے بغیر کوئی فلم نمائش کے لیے پیش نہیں کی جا سکتی ۔ فلمیں سنسر کرتے وقت خاصی آزاد خیالی سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ایسی فلموں کی نمائش کی اجازت نہیں دی جاتی جن سے ملک کا امن و امان متاثر ہو، قومی سالمیت اور تحفظ پر آنچ آتی ہو، اخلاقی اقدار مجروح ہوتی ہوں، جرائم کی حوصلہ‌افزائی ہوتی ہو یا کسی ملکی یا غیر ملکی فلم کا چربہ ہوں ۔

فلمی صنعت سے ملک کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے اور اس مد سے حکومت کو تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ وصول ہوتا ہے ۔

ڈاکومنٹری فلمیں (documentries) زیادہ‌تر حکومت کا شعبۂ فلم و مطبوعات (Department of Film and Publication = DFP) تیار کرتا ہے ۔ ان میں خبر نامے (news-reels) اور پاکستانی ثقافت سے متعلق فلمیں شامل ہیں ۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء تک اس شعبے میں ڈھائی سو نیوزریل اور دو سو ڈاکومنٹری فلمیں تیار ہوئی تھیں ۔ اس شعبے کی بہترین ڈاکومنٹری فلم ''پاکستان کی کہانی'' (*Pakistan Story*) ہے، جو ۱۹۶۶ء میں پیش کی گئی ۔ یہ سب فلمیں مقامی سینماؤں کے علاوہ آٹھ سے زیادہ بیرونی ممالک میں بھی باقاعدگی سے دکھائی جاتی ہیں ۔ شعبۂ فلم و مطبوعات میں اقوام متحدہ اور یونسکو جیسے اداروں کی تیار کردہ فلمیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں ''ڈب'' کرنے کے بعد عوام کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔

فلمی صنعت کے فروغ کے لیے حکومت کی طرف سے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں ۔ اس سلسلے میں فلم ڈیویلپمنٹ کارپوریشن Film Development Corporation، ڈھاکہ، کا قیام بھی قابل ذکر ہے، جہاں ہدایت کاروں، مصنفوں، فن کاروں اور فنی کارکنوں کو اعلیٰ درجے کی تربیت دی جاتی ہے ۔ دوسرے ممالک میں پاکستانی فلمیں برآمد کرنے کے لیے بھی ایک کارپوریشن قائم کی گئی ہے ۔ اس کی ایک شاخ لنڈن میں بھی کھل چکی ہے ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں فلموں کی برآمد سے تقریباً چھے لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی ۔ اب پاکستان میں رنگین فلمیں بھی بڑی تعداد میں تیار ہونے لگی ہیں، جس سے امید ہے کہ برآمدات میں بہت اضافہ ہو جائے گا ۔ انڈونیشیا، افغانستان، مشرقی افریقہ، سوڈان، عدن، برما، بحرین، سیلون، چین، ایران، ہانگ کانگ اور برطانیہ پاکستانی فلموں کے لیے اچھی منڈیاں ثابت ہو سکتے ہیں ۔ پاکستان میں فلمی صنعت کو تحفظ دینے کے لیے بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد ہے، البتہ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان، مصر، ایران وغیرہ سے فلمیں درآمد ہوتی اور نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

۲۳ ۔ صحافت

صحافت نے پاکستان کے قیام اور پھر اس کے استحکام میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے ۔ آج وہ نہ صرف قوم کو ہر لحظہ بدلتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی منظر سے آگاہ رکھتی ہے بلکہ معیار زندگی کو بہتر بنانے اور شہری آزادیوں کی حفاظت کرنے میں بھی مؤثر امداد دیتی ہے ۔ صنعتی ترقی اور معاشرتی نشو و نما کے ساتھ تعلیم کی توسیع سے پاکستانی صحافت کی قوت اور تاثیر میں خاصا اضافہ

ہوا ہے۔

پاکستانی صحافت زمانۂ قبل از آزادی کے برصغیر کے مسلم پریس کی وارث ہے۔ متحدہ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے اخبارات نکالے تو ہندوؤں اور سکھوں کے اخبارات پوری طرح اپنے قدم جما چکے تھے۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں الہلال (کلکتہ)، کامریڈ، ہمدرد اور الجمعیت (دھلی)، زمیندار (لاھور) اور وکیل (امرتسر) مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے رہے اور اسلامیان ہند میں مقبول رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمانوں کے اخبارات کی اھمیت میں اضافہ ہوا اور ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تو بیشتر اخبارات تحریک پاکستان کے طاقتور اور باثر ترجمان بن گئے۔ برصغیر کے مسلمان اپنی منزل مقصود کا تعین کر چکے تھے، جسکی تبلیغ و اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ اخبارات کی ضرورت تھی؛ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں کلکتے سے بنگالی روزنامہ آزاد جاری ہوا۔ اگلے سال شام کا انگریزی اخبار سٹار The Star اور ۱۹۴۲ء میں انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز The Morning News نکالے گئے۔ اسی سال دھلی سے انگریزی ہفت روزہ ڈان The Dawn جاری ہوا، جو اگلے ھی سال روزنامہ بن گیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں لاھور سے پاکستان ٹائمز The Pakistan Times اور نوائے وقت نکلے۔ یہ تمام اخبارات مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کرتے تھے، لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے پر مسلمانوں کے قابل ذکر اخبارات میں سے پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت پاکستان کے حصے میں آئے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ The Civil & Military Gazette (لاھور) اور سندھ آبزرور The Sind Observer (کراچی) کے سوا باقی غیر مسلم اخبار نقل وطن کر گئے، تاھم مسلمانوں کے بعض موقر اخبارات ھندوستان سے پاکستان میں منتقل ہوئے۔ کراچی سے ڈان کا اجرا ٹھیک یوم استقلال پر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جنگ اور انجام بھی دھلی سے کراچی منتقل ہو گئے۔ غیرمسلم اخبارات کے ترک وطن پر لاھور کی صحافت میں جو خلا پیدا ہوا اسے پورا کرنے کے لئے پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت کی صوری اور معنوی خصوصیات میں اضافہ کیا گیا۔ جلد ھی امروز اور کچھ اور نئے اخبارات بھی نکل آئے۔ مشرقی پاکستان میں صحافت کی ضرورت کلکتے سے ڈھاکے منتقل ہونے والے اخبارات نے پوری کی۔ مارننگ نیوز ہفت روزہ کی حیثیت سے اپریل ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے سے نکلا اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں روزنامہ بن گیا۔ آزاد بھی کلکتے سے ڈھاکے آ گیا۔ ڈھاکے سے ایک انگریزی روزنامہ پاکستان آبزرور *The Pakistan Observer* بھی شائع ہونے لگا۔

نوزائیدہ مملکت کے ساتھ نوخیز پاکستانی صحافت کو بھی گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے وہ صنعتی اعتبار سے نہایت پس ماندہ تھے۔ طباعت کی سہولتیں نہایت محدود تھیں۔ چھاپہ خانے کی مشینری کے فالتو پرزے اس علاقے میں نہیں بنتے تھے۔ ایک ایک مطبع میں کئی کئی اخبار طبع ہوتے تھے۔ ھندوستان سے مسلمان صحافیوں اور چھاپہ خانوں کے کارکنوں کی آمد سے اخبارات کی تدوین و اشاعت کا سلسلہ تو جاری ہو گیا لیکن ایک آزاد مملکت کی ضرورت اور عظمت کے لیے صحافت کا جو معیار درکار تھا اس تک پہنچنے کے لیے موزوں اخبارنویسوں کی کمی ایک عرصے تک محسوس ہوتی رھی۔ عام معاشرتی اور اقتصادی عوامل بھی صحافت کی ترقی میں حائل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں خواندگی

کی شرح ۱۳۰۸ فیصد تھی اور شہری آبادی کا تناسب ۱۰ فیصد سمجھا جاتا تھا - ایک اور اندازے کے مطابق ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آبادی میں سے صرف دو لاکھ افراد صنعتی میدان سے متعلق تھے - ان حالات میں اخبارات کا حلقۂ اشاعت محدود اور آمدنی قلیل رہی - اشتہارات اخبارات کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، لیکن وہ بھی صنعتی ترقی کا ثمر ہوتے ہیں - مصائب و مشکلات کے خلاف صحافت کی جدوجہد جاری رہی اور اس دوران میں دو مشہور اخبارات لقمۂ اجل بن گئے - یہ دونوں انگریزی اخبارات تھے - سندھ آبزروز کے مالک ترک وطن کرتے ہوئے اسے فروخت کر گئے اور وہ چھے سال تک مالی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں بند ہوگیا - قیام پاکستان کے بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ، جو کراچی سے بھی شائع ہونے لگا تھا، ۱۹۵۰ء میں فروخت ہوا - دو سال کے بعد کراچی ایڈیشن بند کر دیا گیا اور ایک سال بعد لاھور ایڈیشن بھی بحران کا شکار ہو گیا - اسے زندہ رکھنے کی جرأت مندانہ کوشش کی گئی، مگر وہ کامیاب نہ ہوئی اور اس طرح برطانوی ہندوستان کا ایک قدیم اخبار، جسے نامور انگریز مصنّف رڈ یارڈ کپلنگ Rudyard Kipling کی ادارت کا فخر بھی حاصل رہا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان سے نکل گیا - دوسری جانب ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان تین نئے انگریزی اخبار نکلے: مارننگ نیوز ڈھاکے کے بعد کراچی سے بھی شائع ہونے لگا، کراچی کے ایک شام کے اخبار ایوننگ ٹائمز *The Evening Times* کو ٹائمز آف کراچی *The Times of Karachi* کے نام سے صبح کا اخبار بنا دیا گیا؛ پاکستان سٹینڈرڈ *The Pakistan Standard* مسلم لیگ کے جماعتی ترجمان کی حیثیت سے نکلا - مؤخرالذکر دو اخبار کامیاب نہ ہوئے - پاکستان سٹینڈرڈ تو ایک ہی سال کے اندر ختم ہو گیا، لیکن ٹائمز آف کراچی، جس کا آغاز خاصا زوردار تھا، کوئی آٹھ سال تک لشتم پشتم چلتا رہا.

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو حکومت برسراقتدار آئی اسکے تقریباً گیارہ سالہ دور میں صحافت پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات مترتب ہوئے - حکومت نے براہ راست اور بالواسطہ اخبارات پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے - سب سے پہلے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ The Progressive Papers Ltd. کو سرکاری تحویل میں لیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد بذریعۂ نیلام فروخت کر دیا گیا - کمپنی مزید دو بار فروخت ہوئی اور بالآخر نیشنل پریس ٹرسٹ National Press Trust معرض وجود میں آیا - پروگریسو پیپرز کے اخبارات پاکستان ٹائمز (لاھور و راولپنڈی) اور امروز (ملتان و لاھور) اور ہفت روزہ سپورٹائمز *The Sportimes* (لاھور) کے علاوہ مشرق (لاھور، کراچی و پشاور)، انجام (کراچی)، مارننگ نیوز (ڈھاکہ و کراچی) اور بنگالی روزنامہ دینک پاکستان (ڈھاکہ) یکے بعد دیگرے ٹرسٹ کی تحویل میں آ گئے.

پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں بالخصوص صنعت اور تعلیم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی بدولت اخبارات کے دائرہھاے اشاعت میں توسیع اور آمدنی (بالخصوص اشتہارات کی آمدنی) میں خاصا اضافہ ہوا - کارکن صحافیوں کی شرائط کار اطمینان‌بخش نہ تھیں؛ تنخواھیں معمولی، سہولتیں براے نام اور ملازمت کا تحفظ مفقود تھا - حکومت نے ۱۹۶۰ء میں پاکستان پریس کمیشن قائم کیا اور اسی سال ۲۷ اپریل کو کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت کا ہنگامی قانون جاری کیا - اس قانون کی رو سے صحافیوں کو ملازمت کا تحفظ دیا گیا، پراویڈنٹ فنڈ لازمی قرار دیا گیا؛ کام کا ہفتہ

۲۴ گھنٹے کا قرار پایا؛ صحافیوں کو ایک سال میں ایک ماہ کی استحقاقی رخصت، بیماری کی رخصت اور اتفاقیہ چھٹیوں کا حقدار قرار دیا گیا؛ تین سال یا زیادہ مدت کی ملازمت والے صحافی کی ملازمت ختم کرنے سے پہلے مالک کے لیے یہ لازم قرار پایا کہ وہ اسے دو ماہ کا نوٹس یا اس کے عوض دو ماہ کی تنخواہ ادا کرے؛ علاوہ ازیں صنعتی عدالتوں کو صحافیوں اور منتظمین کے تنازعات پر فیصلہ دینے کا اختیار دیا گیا۔

ہنگامی قانون کے تقاضوں کے مطابق مرکزی حکومت نے ۳۰ مئی ۱۹۶۰ء کو ایک ویج بورڈ Wage Board قائم کیا، جس نے کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت، صحافتی اداروں کے مالی وسائل، قیمتوں اور اجرتوں کے مروجہ ڈھانچے اور دوسرے متعلقہ امور کا جائزہ لینے کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۶۱ء کو اپنا ایوارڈ دیا اور اس میں کارکن صحافیوں کے مختلف طبقوں کی تنخواہ کے سکیل scales مقرر کر دیے۔ ویج بورڈ نے کارکن صحافی کی جو تعریف کی اس میں خوش‌نویس اور پروف‌ریڈر بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ اس سے اخباری کارکنوں کے ان دو بڑے طبقوں کو بھی ایوارڈ کا فائدہ پہنچا۔ ویج بورڈ نے مراعات کی تفویض کے لیے صحافتی اداروں کو ان کے مالی وسائل کے اعتبار سے مختلف زمروں میں تقسیم کیا: روزانہ اخبارات کو تین زمروں میں، ہفتہ وار یا وقفوں سے شائع ہونے والے جرائد کو دو زمروں میں اور خبررساں ایجنسیوں کو تین زمروں میں۔ ویج‌بورڈایوارڈ کے اساسی نکات یہ تھے: اجرتوں کے معاملے میں اردو اور انگریزی اخبارات کے کارکنوں کا امتیاز ختم کر دیا گیا؛ ہنگامی الاؤنس، سواری الاؤنس، ذمے‌داری الاؤنس، رات میں کام کرنے کا خاص الاؤنس، مہمانداری الاؤنس اور بڑے اخبارات کے رپورٹروں کے لیے وضع‌داری الاؤنس منظور ہوا؛ شاگرد پیشہ کارکنوں کے لیے اجرت مقرر ہوئی؛ انتظامیہ کو صلۂ خدمت (gratuity) کی ادائی کا پابند کیا گیا؛ کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت کے ہنگامی قانون مجریہ ۱۹۶۰ء کی رو سے منتظمین کارکن صحافیوں کے علاج معالجے کے اخراجات کا کفیل قرار دیا گیا تھا۔ قانون میں ۱۹۶۷ء کی ایک ترمیم کے ذریعے کارکن صحافیوں کے اہل و عیال کے لیے بھی یہ سہولت منظور کی گئی؛ ویج بورڈ کے ایوارڈ کی آخری شق یہ تھی کہ کوئی ایسی ہیئت حاکمہ جسے مرکزی حکومت قائم کرے پانچ سال بعد اس فیصلے پر نظرثانی کرے گی۔ کارکن صحافیوں نے ۱۹۶۵ء کے بعد اس پر نظرثانی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بالآخر ۱۹۶۹ء میں نئی فوجی حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوے دوسرا ویج بورڈ قائم کیا، جس میں کارکن صحافیوں کی وفاقی تنظیم (PFUJ) اور مالکان جرائد کی انجمن (APNS) کے نمائندے برابر تعداد میں لیے گئے۔ بورڈ نے ۷ جنوری ۱۹۷۰ء کو ایک عبوری فیصلہ دیا، جس کا تقاضا تھا کہ کارکن صحافیوں کی اجرتوں میں اضافہ کیا جائے، لیکن اے۔ پی۔ این۔ ایس نے اس فیصلے کی تعمیل سے معذوری ظاہر کی۔ اس پر پی۔ ایف۔ یو۔ جے نے ۱۰ اپریل سے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ہڑتال کا نوٹس ان چار مطالبات پر مبنی تھا: کارکن صحافیوں کو دوسرے ویج بورڈ کے عبوری فیصلے کے مطابق مالی امداد دی جائے؛ (۲) اخباری صنعت سے متعلق دوسرے کارکنوں کو بھی اسی شرح سے عبوری امداد دی جائے؛ (۳) اے۔ پی۔ پی کو حسب سابق زمرۂ الف کی خبر رساں ایجنسی قرار دیا جائے اور (۴) پی۔ پی۔ آئی کو حسب سابق زمرۂ بی کی خبر رساں ایجنسی قرار دیا جائے۔ اکثر صحافتی اداروں نے کارکنوں کو "عبوری امداد" دینا منظور کر لیا، لہٰذا ۴ اپریل

کو ہڑتال ختم ہو گئی اور تمام اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا ۔

پاکستان (کنونشن) لیگ نے، جو ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک برسراقتدار رہی، معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی ایک جماعتی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور روزنامۂ کوہستان خرید لیا، لیکن جب یہ جماعت برسراقتدار نہ رہی تو اخبار مالی اور انتظامی بحران کا شکار ہو گیا اور اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی ۔ اخبار کے کارکنوں نے اپنے واجبات کی وصولی اور اخبار کی زندگی کے لیے طویل جدوجہد کی، جو بالآخر بارآور ہوئی اور نئی حکومت نے ایک ایڈمنسٹریٹر کا تقرر کر کے اخبار ایک ایسے ادارے کو منتقل کرنے کے اقدامات کیے جو اخبار کو چلتا رکھنے کا ضامن بنا ۔ بہرحال تسنیم، پاکستان سٹینڈرڈ اور کوہستان (دور دوم) کے خاتمے کی کہانیاں ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان میں کسی سیاسی جماعت کے لیے اپنے ترجمان کے طور پر کوئی اخبار نکالنا بہت دشوار رہا ہے ۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں برسراقتدار آنے والی فوجی حکومت نے شہری آزادیاں، بالخصوص اخبار نکالنے کی سہولتیں بحال کر کے جو فضا پیدا کی اس سے ہفتہ وار صحافت کو خاص طور سے تازہ ولولہ ملا اور چند ماہ کے اندر متعدد ہفت روزہ جرائد منظر عام پر آئے اور بعض پرانے جرائد نے نئی اہمیت حاصل کر لی ۔ چونکہ سیاسی سرگرمیوں کی بحالی سے ملک میں سیاسی گہما گہمی پیدا ہوئی، قومی مسائل پر سوچ بچار کا شوق بیدار ہوا اور ہفتہ وار جرائد نے سیاسی معاملات اور رجحانات پر مفصل اور غیر مبہم انداز میں اظہار خیال شروع کر دیا، جس سے ان کے حلقۂ اشاعت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ۔ ایسے جرائد میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: (الف) اردو: لاہور سے چٹان، نصرت، جہاں نما، زندگی، ایشیا، قندیل اور کہانی اور کراچی سے اخبار جہاں اور لیل و نہار؛ (ب) انگریزی: مشرقی پاکستان سے *The Eastern Herald*، *The People*، *The Forum*، *The Holiday* اور *The Wave* اور مغربی پاکستان سے *The Sunday Post*، *The Citizen*، *The Punjab Times*، *The Inter-Wing*، *The Combate* اور *The Pakistan Monitor*.

نئی حکومت نے ایک عبوری یا محافظ حکومت کا کردار اختیار کیا اور ملک میں بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست عام انتخابات کرانے کے لیے قانونی اقدامات کیے ۔ عبوری حکومت نے رائے عامہ کی بنیاد پر ملک میں سیاسی اداروں کے مستقبل کی بھی تعیین کر دی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ نظام حکومت پارلیمانی اور وفاقی ہوگا ۔ حکومت نے یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے ملک میں سیاسی سرگرمیوں کی عام اجازت دے دی اور اس طرح صحافت کو بھی ایک نئی تب و تاب میسر آئی ۔ حکومت چونکہ خود کوئی سیاسی عزائم نہیں رکھتی اور ملکی سیاسیات میں غیر جانبداری کی دعویدار ہے، اس لیے اس نے نہ صرف پرانے اخبارات کے معاملات میں مداخلت سے احتراز کیا بلکہ نئے اخبارات کے لیے بھی فراخدلی سے اجازت نامے جاری کیے؛ چنانچہ سازگار حالات میں فوری طور پر چند نئے اخبارات شائع ہونے لگے: وسط ۱۹۶۹ء میں لاہور سے اردو کا ندائے ملت اور آغاز ۱۹۷۰ء میں راولپنڈی سے انگریزی کا نیو ٹائمز *The New Times* نکلا ۔ پھر ڈھاکے سے بنگلہ روزنامہ سنگرام، ملتان سے اردو کا جسارت اور لاہور سے مساوات جاری ہوا ۔ مئی ۱۹۷۰ء میں کوہستان بھی ایک نئی انتظامیہ کے تحت دوبارہ شائع ہونے لگا ۔ اب ملک کے ممتاز اخبارات یہ ہیں: (الف) اردو: جنگ، امروز، مشرق، نوائے وقت، حریت، ندائے ملت، کوہستان، جسارت اور مساوات؛ (ب) انگریزی: پاکستان ٹائمز،

مارننگ نیوز، ڈان اور پاکستان آبزرور؛ (ج) بنگلہ: ڈیلی پاکستان، آزاد، اتفاق، اور سنگرام؛ (د) علاقائی اخبارات: انڈس ٹائمز *The Indus Times* (حیدرآباد)؛ خیبر میل *The Khyber Mail* (پشاور)؛ زمانہ (کوئٹہ)؛ یونٹی *The Unity* (چٹاگانگ)؛ مغربی پاکستان (لاہور، بہاول پور و سکھر)؛ نیو ٹائمز (راولپنڈی)؛ وفاق (لاہور و سرگودھا)؛ کائنات (بہاول پور)؛ ڈیلی بزنس، عوام اور غریب (لائل پور).

پاکستان کی معیشت بنیادی طور پر زرعی ہے، لیکن وہ زراعتی بنیاد پر صنعتی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور جوں جوں یہ کوشش آگے بڑھتی ہے صنعتی، تجارتی اور مالی معاملات کے مطالعے کی ضرورت اور اہمیت بڑھتی جاتی ہے ۔ اس ضرورت کو پورا کرنے میں صحافت نے بھی کچھ حصہ لیا ہے اور اس سلسلے میں ہفتہ وار جرائد *The Business Recorder* اور *The Business Post* کے علاوہ اردو میں ایک روزنامہ اخبار ڈیلی بزنس بھی شائع ہوتا ہے ۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ہاں خواتین کے جرائد کی ایک عمدہ روایت سرسید کی تعلیمی تحریک کے ثمرات کا آغاز ہوتے ہی قائم ہو گئی تھی، چنانچہ ان جرائد میں تہذیب نسواں اور حور وغیرہ کئی سال تک خواتین کی دلچسپی کا مواد مہیا کرتے رہے، لیکن ان جرائد پر ادبی رنگ غالب تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم نسواں عام ہونے کے ساتھ جب عملی زندگی کے میدانوں میں خواتین کی سرگرمیاں بڑھیں تو اردو اور انگریزی روزناموں نے بطور خاص ان سرگرمیوں کی رودادیں شائع کرنی شروع کر دیں ۔ اب وہ نہ صرف اخبارات خواتین کی سرگرمیوں اور ان کے معاملات کو خاطر خواہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ، اخبار خواتین، مرر *The Mirror*، شی *She* اور ویمن ورلڈ *The Women World* خواتین کے مکمل جریدے ہیں ۔ ادبی روایت نباہنے والے ماہوار رسالے الگ ہیں اور ان میں عصمت، حور، خاتون، زیب النساء، بتول اور چلمن شامل ہیں ۔ پاکستان کی ادبی صحافت کی جو مضبوط روایت ورثے میں ملی اس میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے ۔ ماہوار، دو ماہی اور سہ ماہی رسالے بڑی تعداد میں موجود ہیں، جو اہل قلم کی ادبی تخلیقات اہل ذوق تک پہنچاتے ہیں ۔ ان جرائد میں نقوش، ادبی دنیا، ادب لطیف، سویرا، افکار، ساقی، اردو زبان، قومی زبان، فنون، سیپ، نیا دور، اوراق، اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ نمایاں ہیں ۔ بعض سرکاری اور نیم سرکاری علمی، فنی اور تحقیقاتی اداروں کے اپنے جریدے ہیں، جو بیش قیمت علمی اور ٹیکنیکل مواد مہیا کرتے ہیں، مثلاً صحیفہ، اردو، المعارف، اقبال ریویو، ملّة، فکر و نظر ۔ کالجوں کے جرائد میں اورینٹل کالج میگزین، راوی، کریسنٹ، خیابان اور مہران قابل ذکر ہیں ۔ دینی رسالوں میں ترجمان القرآن، ترجمان الحدیث، طلوع اسلام، الرحیم اور البلاغ ممتاز ہیں ۔ ملک کے اندر ایک طاقتور فلم پریس بھی موجود ہے ۔ روزنامہ اخبارات کے فلمی ایڈیشنوں اور فلمی صفحات کے علاوہ کراچی، ڈھاکے اور لاہور سے متعدد ہفتہ وار اور ماہوار فلمی رسالے شائع ہوتے ہیں.

طرز ملکیت: پاکستان کے تمام اخبارات اور جرائد افراد یا جائنٹ سٹاک کمپنیوں کی ملکیت ہیں ۔ ۱۹۶۴ء میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام سے ایک نئی طرز ملکیت پیدا ہوئی ۔ حکومت کے ایما پر بعض ممتاز صنعت کار یکجا ہوئے اور انھوں نے ٹرسٹ کی بنیاد رکھی ۔ وقف نامے میں ٹرسٹ کو ایک غیر سیاسی اوز غیر کاروباری ادارہ ظاہر کیا گیا اور صحت مند خطوط پر قومی صحافت کے نشو و نما کو مقصود ٹھیرایا گیا ۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کا چیئرمین کل وقتی ہے اور اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز

Board of Trustees میں تعلیمات، مالیات اور تجارت کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اصحاب شامل ہیں ۔ ۱۹۷۰ء میں واقفوں نے وقف نامے میں ترمیم کی اور نظریۂ پاکستان کی حفاظت اور معاشرتی عدل کے اسلامی احکامات پر مبنی ایک نظام معیشت کو ترقی دینا ٹرسٹ کے اخبارات کی ذمے داریوں میں شامل کیا ۔ ٹرسٹ کے زیر اہتمام مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں سے انگریزی، اردو اور بنگلہ میں یہ اخبارات اور جرائد شائع ہوتے ہیں : مارننگ نیوز *The Morning News* (کراچی و ڈھاکہ)؛ پاکستان ٹائمز *The Pakistan Times* (لاہور و راولپنڈی)؛ امروز (لاہور و ملتان)؛ مشرق (لاہور، پشاور و کراچی)؛ دینک پاکستان (ڈھاکہ)؛ اخبار خواتین (کراچی)؛ سپورٹائمز *The Sportimes* (لاہور) ۔ ٹرسٹ کے علاوہ مندرجۂ ذیل ادارے بھی ایک سے زیادہ اخبارات و جرائد شائع کر رہے ہیں : (۱) پاکستان ہیرلڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی) : ڈان *The Dawn* (انگریزی)؛ ڈان (گجراتی)؛ ایوننگ سٹار *The Evening Star*؛ السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان *The Illustrated Weekly of Pakistan*؛ ایسٹرن فلم *The Eastern Film* اور حریت (ڈان گجراتی اور ایوننگ سٹار شام کے اخبارات ہیں)؛ (۲) نوائے وقت پبلیکیشنز لمیٹڈ (لاہور) : نوائے وقت اور قندیل؛ (۳) ملت گروپ، کراچی : ملت (گجراتی) اور شام کو شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ لیڈر *The Leader*؛ (۴) جنگ گروپ : جنگ؛ شام کو شائع ہونے والا ڈیلی نیوز *The Daily News* اور اخبار جہاں؛ (۵) پاکستان آبزرور گروپ (ڈھاکہ) : پاکستان آبزرور *The Pakistan Observer*؛ ہفتہ وار فلمی جریدہ چترالی (بنگلہ، اردو)؛ ہفت روزہ پوربودیش؛ (۶) یونٹی پبلیکیشنز لمیٹڈ (چٹاگانگ) : انگریزی روزنامہ یونٹی *The Unity*؛ روزنامہ انصاف (بنگلہ) اور پندرہ روزہ مشرق (اردو)؛ (۷) کرانیکل گروپ (چٹاگانگ) : انگریزی روزنامہ کرانیکل *The Chronicle* اور بنگلہ روزنامہ بنیاد۔

کردار: پاکستانی صحافت کا کردار روایتی اور جبلّی طور پر سیاسی ہے ۔ برصغیر کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کی جنگ جن وسائل سے جیتی ان میں تحریر اور تقریر سرفہرست تھے ۔ مسلمانوں کے اخبارات نے اپنی بےسروسامانی اور ناتوانی کے باوجود نہایت کامیابی کے ساتھ برطانوی صحافت اور ہندو صحافت کا مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان کو مخالفت کے شدید طوفانوں میں آگے بڑھاتے رہے ۔ ایک ایسے زمانے میں جب ریڈیو اور دوسرے وسائل نشرو اشاعت مخالفوں کے قبضے میں تھے، برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی اور علیحدہ قومیت کا شعور پیدا کرنے اور انھیں اتحاد و تنظیم کی لڑی میں پرو کر پاکستان کی راہ پر ڈالنے کا زیادہ‌تر کام اخبارات ہی نے کیا ۔ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد جب ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تو صحافیوں نے اخبارات کے کالم بھرنے کے لیے رفتہ رفتہ ترقیاتی منصوبوں، ثقافتی سرگرمیوں اور عالمی امور میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی ۔ جرائم کی خبروں کو زیادہ تفصیلات اور تصاویر کے ساتھ شائع کرنے اور نسوانی حلقوں کی سرگرمیوں کو زیادہ جگہ دینے کا رواج بھی اسی زمانے میں ہوا ۔ انگریزی اخبارات کا حلقۂ اشاعت گو اردو اخبارات کے مقابلے میں نہایت محدود ہے لیکن یہ سرکاری امور میں انگریزی کی بالا دستی اور اس زبان کی عالمی اہمیت کی وجہ سے زیادہ بااثر شمار ہوتے ہیں ۔ صبح کو شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کا انداز نظر عام طور پر معروضی اور عالمگیر ہے ۔ وہ قومی معاملات کے علاوہ بین‌الاقوامی امور کی خبریں بھی صحت اور اہتمام سے شائع کرتے ہیں ۔ اکثر انگریزی اخبارات نے غیر ملکی اخبارات کے خاص

کالم اور فیچر حاصل کرنے کے انتظامات کر رکھے ھیں اور اس طرح انھیں عالمی واقعات اور رجحانات پر عالمی شہرت کے اخبار نویسوں کی تحریریں مل جاتی ھیں - بیشتر اردو اور بنگلہ اخبارات زیادہ توجہ ملکی حالات پر مرکوز کرتے ھیں - شام کو نکلنے والے اخبارات، خواہ وہ اردو میں ھوں یا انگریزی میں، عام طور پر سنسنی خیز خبروں پر تکیہ کرتے ھیں - پاکستان کے بعض انگریزی اخبارات آبزرور *The Observer* (لنڈن) اور نیویارک هیرلڈ ٹریبون *The New York Herald Tribune* کی فیچر سروس کے خریدار ھیں اور اس طرح انھیں ان دو اھم اخبارات کے نامہ‌نگاروں کے لکھے ھوے خاص فیچر اور خصوصی رپورٹیں سستے داموں مل جاتی ھیں - کئی ممتاز بین الاقوامی خبررساں ایجنسیوں کے اپنے نامہ‌نگار پاکستان میں موجود ھیں.

ملک میں اھل صحافت کی بڑی تنظیمیں یہ ھیں : آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS)، اخبارات کے مالکان کی انجمن ھے؛ کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز (CPNE)، مدیران اخبارات و جرائد کی تنظیم ھے؛ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کارکن صحافیوں کی تنظیموں (Trade Unions) کا وفاق ھے - [حالیہ هڑتال کے بعد صحافیوں کی خاصی تعداد نے پی - ایف - یو - جے سے مستعفی ھو کر نیشنل یونین آف جرنلسٹس (NUJ) کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی ھے] - کارکن صحافیوں نے کراچی، ڈھاکہ، لاھور، ملتان، بہاولپور، کوئٹہ اور کئی دوسرے صحافتی مرکزوں میں پریس کلب قائم کر رکھے ھیں.

خبر رساں ادارے : پاکستانی اخبارات کو تین تسلیم شدہ خبر رساں ادارے خبریں مہیا کرتے ھیں : (۱) اینوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP)؛ (۲) پاکستان پریس انٹرنیشنل (PPI) اور (۳)؛ یونائیٹڈ پریس آف پاکستان (UPP) - اول الذکر دو اداروں نے اخبارات کو ٹیلی پرنٹرز مہیا کر رکھے ھیں جبکہ تیسرا ادارہ اپنی خبریں دستی مہیا کرتا ھے -

اے - پی - پی تقریباً چوّن اخبارات، ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن کارپوریشن کے تمام ٹیلیویژن سٹیشنوں کو خبریں مہیا کرتا ھے - یہ ادارہ چوبیس تجارتی اداروں اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مختلف دفتروں کو بھی خبریں دیتا ھے - ادارے کا مرکزی دفتر کراچی میں ھے اور ذیلی دفاتر راولپنڈی، لاھور، ڈھاکہ، چٹاگانگ، پشاور، لائلپور، ملتان، بہاولپور، سکھر، حیدرآباد، اور کوئٹے میں واقع ھیں - ادارے نے دوسرے اھم شہروں میں بھی اپنے جز وقتی نامہ‌نگار رکھے ھوے ھیں - حکومت پاکستان کے ایک فیصلے کی رو سے غیر ملکی خبررساں اداروں کو پاکستانی اخبارات اور جرائد کو براہ راست خبریں مہیا کرنے کی اجازت نہیں، اس لیے بہت سی غیر ملکی خبررساں ایجنسیوں نے پاکستانی خبررساں اداروں سے خبروں کے تبادلے کی بنیاد پر معاھدے کر لیے ھیں اور وہ پاکستانی اداروں کے توسط سے پاکستانی اخبارات کو خبریں، فیچر اور تصویریں مہیا کرتی ھیں- اے - پی - پی نے غیرملکی خبروں کی فراھمی اور ترسیل کے لیے مندرجۂ ذیل غیرملکی خبررساں ایجنسیوں سے معاھدے کر رکھے ھیں : رائٹر (لنڈن)؛ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ (نیویارک)؛ نیو چائنا نیوز ایجنسی (پیکنگ)؛ تاس (ماسکو)؛ اے - پی - این (ماسکو)؛ انتارا (جکارتا)؛ پارس (تہران)؛ اناطولیا (انقرہ)؛ کیودو (ٹوکیو)؛ مینا (قاھرہ) .

پاکستان پریس انٹر نیشنل، جو ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ قائم ھوئی تھی اور ۱۹۶۸ء تک پاکستان پریس ایسوسی ایشن (پی - پی - اے) کہلاتی تھی، ایک نجی جائنٹ سٹاک کمپنی ھے - پاکستان میں غیرملکی خبررساں ایجنسیوں پر پابندی کے بعد

۱۹۶۸ء میں فرانس، مغربی جرمنی، چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، بلغاریا، رومانیا، اٹلی، پولینڈ، ہنگری، مصر، ملیشیا، اور جاپان کے کوئی ایک درجن غیر ملکی اداروں نے پی - پی - اے سے الحاق کیا اور یوں اس کا نام پی - پی - آئی ہوگیا۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP) غیر ملکی خبروں کی فراہمی کے لیے لنڈن، نیویارک، کھٹمنڈو، وغیرہ میں اپنے مستقل نمائندے بھی رکھتی ہے - اے - پی - پی اور بعض اخبارات کے مستقل نمائندے شروع ہی سے نئی دھلی میں متعین تھے، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یہ نمائندے واپس بلا لیے گئے اور پاکستان میں مقیم بھارتی اخبار نویس بھی واپس چلے گئے۔

اے - پی - پی خبروں کی صورت میں اوسطاً پچاس ہزار الفاظ روزانہ اپنے ٹیلی پرنٹروں پر تقسیم کرتی ہے - ساٹھ سے زیادہ صحافی خبروں کی فراہمی اور تدوین پر مامور ہیں اور تقریباً ایک سو ٹیلی پرنٹر آپریٹر اور مکینک خبروں کی وصولی اور تقسیم کے کام میں حصہ لیتے ہیں - اے - پی - پی اپنے غیر ملکی حلیفوں کو روزانہ پانچ ہزار سے زیادہ الفاظ میں خبریں مہیا کرتی ہے - ۱۹۶۳ء تک اے - پی - پی میں صرف دو بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں (رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ) کے نمائندے کام کرتے تھے؛ اب بارہ صحافی غیر ملکی خبررساں اداروں کی نمائندگی کے لیے اس ادارے سے منسلک ہیں اور ان میں چار پاکستانی ہیں۔

پی - پی - آئی خبروں کی صورت میں اوسطاً چالیس ہزار الفاظ روزانہ دو سرکٹوں پر تقسیم کرتی ہے - ان میں سے ایک ملکی اور دوسرا غیر ملکی مواد کے لیے مخصوص ہے - تقریباً تمام اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سرکاری دفاتر اور کاروباری ادارے پی - پی - آئی سے خبریں خریدتے ہیں - ملک کے تمام بڑے شہروں میں ایجنسی کے دفاتر ہیں اور نسبتاً چھوٹے شہروں میں کل وقتی یا جز وقتی نامہ نگار متعین ہیں - پی - پی - آئی کے دائرۂ عمل میں توسیع اور اے - پی - پی سے اس کے صحت مند مقابلے کی بدولت اخبارات کو زیادہ مواد زیادہ تیزی کے ساتھ ملنے لگا ہے - پی - پی - آئی نے ایک فیچر سنڈیکیٹ بھی قائم کیا ہے، جو ملکی اور غیرملکی اخبارات کو عام دلچسپی کے خاص مضامین مہیا کرتا ہے - اے - پی - پی نے اہم واقعات اور تقریبات کے لیے فوٹو سروس بھی شروع کر دی ہے۔

یونائیٹڈ پریس آف پاکستان United Press of Pakistan ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی - ایجنسی بالعموم ملک کے ایک حصے کے اہم اخبارات میں شائع ہونے والی خاص خبریں دوسرے حصوں کے اخبارات کو مہیا کرتی ہے - ایجنسی کے بیشتر خبر نامے اردو میں تیار کیے جاتے ہیں اور ان کی نقول دستی مہیا کر دی جاتی ہیں - یو - پی - پی (UPP) کے دفاتر کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں ہیں۔

اگرچہ پاکستان میں آزادی صحافت کو دوسری شہری آزادیوں کی طرح شروع ہی سے محترم سمجھا جاتا ہے اور اہل صحافت نے اس آزادی کے حصول اور تحفظ کی خاطر طویل جدوجہد بھی کی ہے، تاہم پاکستانی صحافت ملک کے تمام قوانین کی پابند ہے - ۱۹۶۳ء میں دونوں صوبوں کی حکومتوں نے مطبوعات و مطابع سے متعلق مروجہ قوانین کو یک جا کر کے ایک نیا ہنگامی قانون جاری کیا، جس کی رو سے اخبار نکالنے اور اخبار چلانے میں خاصی دشواریاں پیدا ہوئیں - صحافیوں نے اس قانون کی بعض دفعات کے خلاف احتجاج کیا اور صحافتی ادارے بھی اس احتجاج میں شریک ہوئے؛ چنانچہ حکومت نے اہل صحافت کو یہ پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے لیے خود کوئی ضابطۂ اخلاق مرتب

کر لیں تو ہنگامی قانون کی تعزیری دفعات پر عملدرآمد معطل کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر سرکاری نمائندوں اور مدیران جرائد کے درمیان سال بھر کی گفت و شنید کے بعد ۴ جولائی ۱۹۶۳ء کو مدیران اخبارات کی تنظیم (CPNE) نے ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کیا اور اس کی رو سے ایک اخلاقی عدالت بھی قائم کی گئی جو ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کی شکایات کی سماعت اور قصور وار کی مذمت کرنے کی مختار ہے۔ یہ ضابطۂ اخلاق فی‌الحقیقت عام اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے، جس کی رو سے مدیران جرائد توہین آمیز، شر انگیز، امن و امان کے منافی، فحش اور نجی زندگیوں کے بارے میں رسوا کن مواد کی اشاعت سے اجتناب کرتے ہیں۔

ضابطۂ اخلاق کی رو سے خبروں کے ذرائع کو حسب منشا صیغۂ راز میں رکھنا چاہیے؛ اگر خبروں کے ذرائع کسی مواد کو اخبار نویس تک رکھنے کی درخواست کریں یا کسی مواد کی اشاعت کی تاریخ اور وقت مقرر کریں تو ان کی خواہش کا احترام ہونا چاہیے؛ معروضیت خبر نویسی کا معیار ہونا چاہیے؛ سرخیاں لازمی طور پر مواد سے ہم آہنگ ہونی چاہییں؛ علاوہ ازیں افراد، اداروں یا معاصرین کے خلاف جھوٹے الزامات شائع کرنے سے منع کیا گیا ہے؛ کسی شخص کے بیان کو توڑ مروڑ کر یا اصل مدعا کے خلاف شائع کرنا بھی معیوب ہے؛ اخبارات کو معاشرے کے مختلف طبقات میں منافرت کی آگ بھڑکانے کی اجازت نہیں، البتہ وہ علاقوں یا طبقوں کے مابین عدم مساوات پر بصائر و نظائر پیش کرنے میں آزاد ہیں؛ دوسرے ملکوں کے سربراہوں کے بارے میں توہین آمیز مواد اور ایسے امور کا شائع کرنا ممنوع ہے جن سے دوست ملکوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو؛ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی کارگزاری کی رپورٹ کا اصول یہ ہے کہ سپیکر جس بات کا تذکرہ ایوان کی کسی روداد سے حذف کرنے کا حکم دے، اخبارات بھی اس کی اشاعت سے احتراز کرتے ہیں۔ ایوان کے تمام ارکان کے ساتھ یکساں سلوک کے پابند ہیں؛ عدالتوں کی کارروائی کی رپورٹ میں یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی فریق کے موقف کو بڑھا کر یا گھٹا کر پیش نہ کیا جائے اور انصاف گستری کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے؛ محنت کشوں کی خبریں اس طرح شائع کی جانی چاہییں کہ محنت کشوں کے حقوق اور مسائل کی ترجمانی ہو جائے، مگر انھیں ہڑتال، تشدد یا پیداوار میں کمی پر اکسانے سے احتراز کیا جائے؛ طالب علموں کے ضمن میں بھی یہی اصول قائم کیا گیا ہے؛ ضابطۂ اخلاق کی رو سے اخبارات یا دوسرے اشاعتی اداروں کو کسی بیرونی ملک سے کوئی مالی امداد قبول کرنے یا اس سے کوئی اور فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں؛ البتہ غیر ممالک کے نمائندے اپنے اشتہارات شائع کرا سکتے ہیں۔

مسلم صحافت شروع ہی سے خداداد صلاحیتوں کے مالک اہل قلم کی مرہون منت رہی ہے۔ قیام پاکستان تک صحافت، بالخصوص اردو صحافت، میں تبصروں کو خبروں پر ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ پوری قوم کے ساتھ مسلمانوں کے بیشتر اخبارات بھی ایک نظریاتی مملکت کے قیام کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو صحافت نے فنی اعتبار سے ترقی کی اور نئے معیاروں کو برقرار رکھنے اور انھیں مزید آگے لے جانے کے لیے تربیت یافتہ کارکن صحافیوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں صحافت میں ایم-اے کے کورس جاری ہیں اور ان کورسوں میں عملی تربیت پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔ کارکن صحافیوں کی تنخواہوں

کے سکیل مقرر ہونے کے بعد اخبارات کے مالک نئی بھرتی کے معاملے میں تربیت یافتہ نوجوانوں کو ترجیح دینے لگے ہیں ۔ اس طرح یونیورسٹیوں سے ایم ۔ اے صحافت کی ڈگری لے کر نکلنے والے نوجوان نہ صرف اخباری صنعت میں جگہ پاتے ہیں بلکہ اطلاعات، تعلقات عامّہ اور نشرواشاعت کے سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں بھی قبول کیے جاتے ہیں۔

۲۴ ۔ ادب اور فنونِ لطیفہ

پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ادب پر علیحدہ علیحدہ مقالات شامل کیے جا رہے ہیں؛ رک بہ اردو، بلوچی، براھوئی، بنگلہ، پشتو، پنجابی، پوٹھوھاری، سندھی اور ھندکو۔

پاکستان میں فنونِ لطیفہ سے متعلق سرگرمیوں کی تفصیلات کے لیے رک بہ فن، فنون۔

۲۵ ۔ کھیل

آزادی سے قبل ان علاقوں کے مسلمان جو اب پاکستان میں شامل ہیں کھیل کے میدان میں اپنی اعلٰی مہارت کا ثبوت دیا کرتے تھے، خصوصاً ھاکی اور پہلوانی میں تو برصغیر کی شہرت کا دارومدار زیادہ‌تر انہیں پر تھا ۔ قیام پاکستان کے وقت ملک بھر میں مختلف کھیلوں کی مقامی انجمنیں اور کلب موجود تھے ۔ انہیں منظم کرنے کے لیے ایک سپورٹس کنٹرول بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا اور حکومت کی سرپرستی کے باعث پاکستانی کھلاڑی بہت جلد بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے کے قابل ہوگئے۔

کرکٹ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کھیلوں میں ھوتا ہے ۔ پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ (BCCP=Board of Control for Cricket in Pakistan) اعلٰی ترین سرکاری ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ہر سال دو بڑے علاقائی ٹورنامنٹ (قائداعظم ٹرافی اور ایوب ٹرافی) ھوتے ھیں، نیز کھلاڑیوں کی تربیت کا بندوبست اور غیرممالک میں پاکستانی ٹیم کے دوروں اور پاکستان میں غیرملکی ٹیموں کے دوروں کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ پاکستانی ٹیم نے کرکٹ کی دنیا میں اپنا ایک اھم مقام پیدا کیا ہے اور اسکے بعض کھلاڑی، مثلاً فضل محمود، کاردار، امتیاز، حنیف، مشتاق، آصف، انتخاب اور ماجد وغیرہ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔ حنیف محمد نے ٹسٹ میچوں کی طویل ترین اننگ (۱۶ گھنٹوں میں ۳۳۷ رنز) کھیل کر اور آصف اقبال اور انتخاب عالم نے نویں وکٹ پر ۱۹۰ رنز بنا کر عالمی ریکارڈ قائم کیے ۔ اب تک پاکستانی ٹیم برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ویسٹ انڈیز اور بھارت کا دورہ کر چکی ہے اور ان تمام ملکوں کی ٹیمیں پاکستان آ چکی ہیں۔

ھاکی کو اب پاکستان کے قومی کھیل کا درجہ مل چکا ہے ۔ برصغیر گزشتہ چالیس سال سے اس کھیل میں اپنی برتری تسلیم کراتا چلا آ رہا ہے، چنانچہ اب تک تمام اولمپک ٹورنامنٹ یا تو بھارت نے جیتے ہیں یا پاکستان نے ۔ پاکستانی ٹیم کی کامیابیوں کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ھوتا ہے جب اس نے ٹوکیو میں ایشیائی کھیلوں کا فائنل میچ جیتا ۔ ۱۹۶۰ء میں روم میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں پاکستان نے ھاکی کے عالمی چیمپین کا اعزاز حاصل کیا ۔ یہ اعزاز جکارتا کے ایشیائی کھیلوں میں بھی برقرار رکھا گیا ۔ ۱۹۶۲ء کے بعد پاکستان میں اس کھیل پر زوال آنے لگا کیونکہ اس کے اکثر کھلاڑی میدان سے نکل گئے تھے، چنانچہ ۱۹۶۴ء میں بھارت کو اولمپک کھیلوں میں فتح حاصل ھوئی؛ تاھم ۱۹۶۸ء میں پاکستان نے ایک بار پھر اپنی اعلٰی صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور میکسیکو میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں

کھویا ہوا اعزاز دوبارہ حاصل کر لیا ۔ اس وقت پاکستان کی ٹیم کو دنیا کی بہترین ہاکی ٹیم تسلیم کیا جاتا ہے ۔ پاکستان ہاکی فیڈریشن (PHF) اس کھیل کا اعلیٰ ترین تنظیمی ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ہر سال نیشنل ہاکی چیمپین شپ اور آغا خان گولڈ کپ ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں اور کھلاڑیوں کے لیے تربیتی کیمپ لگائے جاتے ہیں۔

سکواش (Squash) ایک اور کھیل ہے جس میں پاکستانی کھلاڑیوں، خصوصاً ''خان برادران'' نے اپنے ملک کا نام بلند کیا ۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک ہاشم خاں نے، ۱۹۵۷ء میں اسکے چچازاد بھائی روشن خاں نے، ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ہاشم خاں کے چھوٹے بھائی اعظم خاں نے اور ۱۹۶۲ء میں اسکے بھتیجے محب اللہ خاں نے یکے بعد دیگرے British Open Title جیتا ۔ ۱۹۶۳ء میں یہ اعزاز مصری کھلاڑی ابو طالب نے چھین لیا، لیکن اسی سال اور پھر ۱۹۶۴ء میں آفتاب جاوید نے شوقیہ کھیلنے والوں کا عالمی اعزاز جیت کر اس شکست کا ازالہ کر دیا۔

تقسیم برصغیر سے قبل لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، اور امرتسر پہلوانی کے بڑے مرکز تھے ۔ حصول آزادی کے بعد امرتسر کے نامور پہلوان بھی پاکستان چلے آئے ۔ اس میدان میں پاکستان کی شہرت رستم زمان گاماں پہلوان اور اسکے خاندان کی عدیم المثال کامیابیوں کی مرہون منت ہے ۔ اس وقت گاماں پہلوان کے بھتیجے بھولو پہلوان کو عالمی چیمپین کا اعزاز حاصل ہے اور گزشتہ کئی سال سے دنیا کا کوئی پہلوان اس کے مقابلے میں اترنے پر آمادہ نہیں ہو سکا ۔ ''شوقیہ کشتی'' میں بھی پاکستان نے کئی میڈل جیتے ہیں جن میں ۱۹۶۲ء کے ایشیائی کھیلوں میں سونے کا اور ۱۹۶۴ء کے اولمپک میں کانسی کا میڈل بالخصوص قابل ذکر ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں دولت مشترکہ کے کھیلوں کے مقابلے میں پاکستانی پہلوانوں نے متعدد اعزاز حاصل کیے ہیں ۔ اسی طرح مکہ بازی کے میدان میں بھی پاکستان اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے ۔

فٹ بال بھی ایک مقبول عام کھیل ہے، لیکن اس میں پاکستانی کھلاڑی ابھی اولمپک کھیلوں کے معیار پر نہیں پہنچ سکے؛ تاہم پاکستان فٹ بال فیڈریشن (PFF) کوشش کر رہی ہے کہ غیر ملکی اتالیقوں کی خدمات حاصل کر کے ان کا کھیل بہتر بنایا جائے ۔ اس سلسلے میں تربیتی مرکز قائم کیے جا رہے ہیں' اور ملک میں غیر ملکی ٹیموں کے دوروں کی حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی ہے ۔

لان ٹینس، ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن میں بھی بین الاقوامی معیار حاصل نہیں ہو سکا، تاہم ہارون رحیم نے انگلستان میں چند چھوٹے درجے کے لان ٹینس ٹورنامنٹوں میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے ۔ پاکستان ٹیبل ٹینس فیڈریشن بھی عالمی مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے ٹیمیں بھیجتی رہتی ہے ۔

گھڑ دوڑ کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں ہوتی ہے ۔ پاکستان کی جاکی کلب Jockey Club کا الحاق لنڈن کی جاکی کلب سے ہے ۔ سب سے بڑی دوڑیں قائداعظم گولڈ کپ اور پاکستان ڈربی ہیں، جن میں جیتنے والے کو اسّی ہزار روپیہ انعام ملتا ہے ۔ ''ریس'' کے گھوڑے زیادہ تر ربنالہ اور ساہی وال میں پالے جاتے ہیں ۔

تیراکی کے بین الاقوامی مقابلوں کے لیے تربیت دینے کا ملک میں کوئی انتظام نہیں، چنانچہ ابھی تک کوئی پاکستانی تیراک اولمپک کھیلوں میں حصہ نہیں لے سکا ۔ اس کے باوجود بروجن داس اور عبدالمالک نے آبنائے انگلستان کو عبور کر کے تیراکی کی تاریخ میں پاکستان کا نام شامل کر دیا ہے ۔ بروجن داس نے آبنائے انگلستان چھے بار

عبور کی ہے۔ وہ پہلا ایشیائی ہے جس نے اپنی پہلی ہی کوشش میں یہ کامیابی حاصل کی۔ اس نے فرانس سے انگلستان تک آبنائے کو ۱۰ گھنٹے ۳۰ منٹ میں پار کر کے عالمی ریکارڈ بھی قائم کیا ہے۔

۲۶ - اکتشافیات و تحفظِ آثار قدیمہ

برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے مسلم حکمرانوں نے آثار قدیمہ کو محفوظ کرنے میں دلچسپی لی۔ ان میں فیروز شاہ تغلق کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ سر ولیم جونز Sir William Jones نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال Asiatic Society of Bengal کی بنیاد رکھی، جس سے برصغیر میں جدید اثریات کا آغاز ہوتا ہے؛ تاہم شروع میں اس سوسائٹی کا کام زیادہ تر سنسکرتی اور لسانیاتی تحقیقات تک محدود رہا۔ ۱۸۶۰ء میں صحیح اور باقاعدہ اثریاتی تحقیق کے لیے شمالی ہندوستان کا اثریاتی جائزہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلا ناظم آثارِ قدیمہ (Director of Archaeology) سر الیگزانڈر کننگھم Sir Alexander Cunningham تھا، جس کا تقرر ۱۸۷۱ء میں ہوا۔ اس کا دائرۂ عمل پہلے صرف شمالی ہندوستان تک محدود تھا، لیکن ۱۸۷۴ء میں جنوبی ہندوستان بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ اس نے وسطی اور شمالی ہندوستان میں تیئیس سال سیاحت کی اور پھر اپنے تجربات کو تیئیس جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب *Archaeological Survey of India Reports* میں پیش کیا۔ ۱۸۸۱ء میں میجر کول A.H. Cole کو قدیم یادگاروں کا محافظ (Curator) مقرر کیا گیا۔ کننگھم کے بعد ڈاکٹر جیمز برجس Dr. James Burgess ڈائرکٹر جنرل بنا۔ مشہور جرائد *Indian Antiquary* اور *Epigraphia Indica* کی اشاعت میں اس کا بہت دخل تھا۔ ۱۸۸۹ء میں اس کی سبکدوشی کے بعد وائسرائے لارڈ کرزن نے اس شعبے میں ذاتی دلچسپی لے کر اسے مستحکم اور مستقل بنیادوں پر از سر نو منظم کیا اور ایک نوجوان برطانوی ماہر اثریات جان مارشل John Marshall کو اس کا ناظم مقرر کیا۔ مارشل ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اس عہدے پر فائز رہا اور برصغیر میں کھدائی اور آثار قدیمہ کی حفاظت وغیرہ کا کام بہت حد تک اسی کا مرہون منت ہے۔ سر جان مارشل کے بعد مسٹر ہارگریوز Mr. Hargreaves، رائے بہادر دیا رام ساھنی، میجر بلیکسٹن Blakiston، راؤ بہادر کے۔این۔ ڈکشٹ اور سر مارٹیمر وھیلر Sir Mortimer Whealer اس شعبے کے سربراہ بنے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں قدیم یادگاروں، مقامات، فنون لطیفہ اور ثقافت سے متعلق جو چیزیں آئی ھیں وہ انھیں ممتاز افسروں کی کوششوں کا ثمرہ ھیں۔

۱۹۴۷ء میں اثریات کے بڑے مقامات مغربی پاکستان میں موھنجوڈارو (= موئن جودڑو) اور ھڑپا (وادی سندھ کی تہذیب کے دو بڑے مقامات)، ٹیکسلا اور گندھارا، اور مشرقی پاکستان میں پہاڑپور Paharpur تھے۔ ان مقامات میں سے بیشتر کی کھدائی سر جان مارشل کے زیر ھدایت ھوئی۔ قدیم تاریخ کے میدان میں اس کی سب سے بڑی خدمت وادی سندھ کی تہذیب کی دریافت ہے۔

اس ملک میں عہد حجری کے باقیات کا مطالعہ سب سے پہلے de Terra نے ۱۹۳۵ء میں وادی سوان (راولپنڈی) میں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک مزید کوئی نمایاں کام نہ ھو سکا۔

وادی سندھ کی تہذیب، جیسے سر جان مارشل نے دریافت کیا، صرف "پیتل کے زمانے" (Chalcolithic Period) کے دور عروج کی حالت کو پیش کرتی ہے اور اس کی ابتدائی حالتوں کے متعلق بہت کم معلوم تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں سفید

ہنوں کے حملے اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی آمد کے درمیانی زمانے میں پاکستان کے علاقوں کی سیاسی تاریخ حکایات اور لوک گیتوں میں ملتی ہے ۔ ابتدائی اسلامی دور سے متعلق دو طرح کے مسائل درپیش تھے : (۱) ایسا اثریاتی مواد بالکل ناپید تھا جس سے تقابلی مطالعے میں استفادہ کیا جا سکے، اس لیے اس فن کے علما کو زیادہ تر تحریری ماخذ پر ھی اعتماد کرنا پڑتا تھا؛ (۲) برصغیر میں قدیم مسلمانوں کے فنون لطیفہ اور فنِ تعمیر کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا ۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بھی اثریات سے متعلق کئی مسائل درپیش تھے، مثلاً یہ کہ سیلابوں، گھنے جنگلات اور دلدلی زمین کی وجہ سے رسل و رسائل میں دشواری کے سبب صحیح اثریاتی تحقیق محال تھی.

قیام پاکستان کے بعد محکمۂ آثار قدیمہ نے راولپنڈی کے قریب پوٹھوھار کے علاقے اور سندھ میں روھڑی کے مقام پر عہد حجری کے باقیات کو دریافت کرنے کے لیے کوشش کی ۔ نتائج حوصلہ افزا رہے اور قدیم حجری (Palaeolithic) ثقافت کے نئے مقامات بھی دریافت ہوے ۔ اب محکمۂ آثار قدیمہ غیر ملکی ماھرین کی مدد سے بلوچستان کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے علاقوں کا جائزہ لے رہا ھے ۔ ۱۹۵۵ء میں کوٹ ڈیجی Kot Diji کے مقام پر کھدائیوں سے وادی سندھ کی تہذیب کے ابتدائی ادوار پر نئی روشنی پڑی ھے اور یہ بات ثابت ھو گئی ھے کہ کوٹ ڈیجی کی ثقافت وادی سندھ کی ثقافت کی ابتدائی حالت ھے ۔ یہ دریافت واقعی پاکستان کی اثریات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ھے، کیونکہ اس نے تحقیق کے لیے نئی راھیں کھول دی ھیں ۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں مہاستھان گڑھ اور مینامتی کے مقامات پر کھدائیوں سے وھاں کی ساتویں سے دسویں صدی عیسوی کی ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے میں مدد ملی ھے ۔

بھنبھور میں پہلی بار کھدائیاں کی گئی ھیں اور یہاں سے ابتدائی اسلامی عہد کی جو چیزیں برآمد ھوئی ھیں ان سے تقابلی مطالعے کے لیے بڑا اھم مواد فراھم ھو گیا ھے ۔ ان کھدائیوں سے ایک قلعہ بند شہر کا منصوبہ اور کثیر تعداد میں ابتدائی اسلامی سکے، برتن، کتبات اور دوسری اشیا دریافت ھوئی ھیں، جن کی مدد سے اس علاقے کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تاریخ کی ترتیب نو میں مدد ملتی ھے .

ایک کروڑ گیارہ لاکھ روپے کی لاگت سے اسلام آباد میں پاکستان کا ایک قومی عجائب گھر قائم کرنے کے منصوبے کی قومی اقتصادی کونسل (NEC) نے منظوری دے دی ھے ۔ علاوہ ازیں قلعۂ لال باغ (ڈھاکہ) اور حیدر آباد میں نئے عجائب گھر قائم کیئے جائیں گے ۔ مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ، مینا متی اور مہاستھان گڑھ میں اور مغربی پاکستان میں کراچی اور سوات کے عجائب گھروں میں توسیع کی جائے گی ۔ ملک کے دونوں حصوں میں کل چالیس لاکھ روپیہ مساوی طور پر خرچ کیا جائے گا.

نسلیات سے متعلق (Ethnological) چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں اور سندھ اور بلوچستان میں آباد قبائل سے جو مفید معلومات دستیاب ھوئی ھیں ان سے چٹاگانگ کے نسلیاتی عجائب گھر (Ethnological Museum) میں فائدہ اٹھایا جائے گا.

وادی سندھ کی تہذیب کے تقابلی مطالعے کے لیے ھڑپا کے اثریاتی عجائب گھر کو موھنجوڈارو (= موئن جودڑو)، کوٹ ڈیجی، امری اور روھڑی سے قدیم نوادر حاصل کر کے دوبارہ منظم کیا گیا ھے ۔ حکومت پاکستان نے دوسرے پنج‌سالہ منصوبے کے

دوران میں موھنجوڈارو کے عجائب گھر کی ایک نئی عمارت تعمیر کرائی ۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے بھنبھور میں ایک نیا عجائب گھر تعمیر کرایا اور عمرکوٹ میں بھی ایک عجائب گھر ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء کے دوران میں مکمل ہوا۔

کراچی کے مرکزی عجائب گھر میں ایسی خاص تصویریں (dioramas) مکمل ہو چکی ہیں جن میں عہد حجری اور دورِ قبل از تاریخ کی زندگی، کافرستان اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قدیم قبائل کی معاشرت، ایک بدھ سٹوپا، تخت بائی کی ایک خانقاہ اور محمد بن قاسم کے محاصرۂ دیبل کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ کی مساعی سے ٹیکسلا کے قریب سرائے کالا میں ایک اہم قدیم مقام دریافت ہوا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس علاقے کی ثقافت ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے ۔ دوسری قابلِ ذکر کھدائیاں وہ ہیں جو تلمبہ (ملتان) اور منصورہ (ضلع سنگھڑ) میں کی گئی ہیں ۔ ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان میں تمر گڑھ، ہڑپا، تیموگرام اور پن ڈھیری کے مقامات پر اور مشرقی پاکستان میں مینامتی میں کھدائیاں کی گئیں۔

اسلامی دور کی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے خاصا کام کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے یونسکو UNESCO کا تعاون بھی حاصل کیا ہے ۔ اسلامی دور کے آثار کے لیے رک بہ فن تعمیر، باب، باغ، برج، قلعہ، مسجد اور منار.

۲۷ - سیاحت

پاکستان کی سر زمین کا حسن اور یہاں کے باشندوں کا اخلاق دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے موجب کشش ہے، چنانچہ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے ۔ وہ یہاں جو رقم صرف کرتے ہیں وہ گزشتہ دس برس میں ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ سے بڑھ کر ۱۱ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔

۱۹۶۵ء میں محکمۂ سیاحت نے ایک بیس سالہ منصوبہ تیار کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سیاحت کو اس حد تک ترقی دی جائے کہ ۱۹۷۰ء میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ کا اور ۱۹۸۵ء میں ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا زرمبادلہ کمایا جا سکے ۔ تیسرے پنج‌سالہ منصوبے میں سیاحت کی ترقی کے لیے حسب ذیل اقدامات شامل تھے : ملک کے مختلف حصوں، خصوصاً چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے، سندر بن، گلگت، ہنزہ اور چترال میں ریسٹ ہاؤسوں کی تعمیر اور حمل و نقل کی سہولتیں فراہم کرنا؛ کوہ‌پیمائی، سرمائی کھیلوں، ماہی گیری اور سیرو شکار کا اہتمام؛ تاریخی اہمیت کے مقامات اور آثار قدیمہ کی دیکھ بھال اور انھیں جاذب توجہ بنانا؛ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کا قیام؛ وسیع پیمانے پر نشرو اشاعت کا انتظام تاکہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک پاکستان میں کم از کم دو لاکھ سیاح سالانہ آئیں اور یہاں تین سے چھے روز تک قیام کر سکیں۔

سیاحت کو ترقی دینے کے لیے ملک کے مختلف شہروں میں محکمے کے دفاتر موجود ہیں (مرکزی دفتر کراچی، لاہور اور ڈھاکے میں اور علاقائی دفاتر راولپنڈی، پشاور، مری، سوات، ایبٹ‌آباد، گلگت، چٹاگانگ، کپتائی، کاکس بازار، سلہٹ اور کھلنا میں) ۔ ہوائی اڈوں پر مرکز اطلاعات اور بڑے بڑے شہروں میں ہوٹل کھولے گئے ہیں ۔ بیرون ملک بھی ترقی سیاحت کے دفتر موجود ہیں (نیویارک، لنڈن، فرانکفرٹ اور سان فرانسسکو؛ بارہ مزید شہروں میں بھی ایسے دفتر کھولے جا رہے ہیں) ۔ محکمے کے کارکنوں کی تربیت کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور انھیں پاکستان

کی تاریخ، ثقافت، فنون لطیفہ اور جغرافیائی حالات کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ بعض کارکنوں کو اعلیٰ تربیت کے لیے دوسرے ممالک میں بھی بھیجا جاتا ہے۔

غیر ممالک میں نمائش کے لیے محکمۂ سیاحت پاکستان پر رنگین فلمیں بھی تیار کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف زبانوں میں پاکستان سے متعلق کتابچے، راہنمائے اور نقشے وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔

حکومت نے ملک میں غیر ملکی سیاحوں کے داخلے اور مختلف علاقوں میں سفر کے لیے بہت سی رعایتیں دی ہوئی ہیں اور متعدد سابقہ پابندیاں اٹھا لی ہیں، چنانچہ اب انہیں اپنی آمد اور رخصت کے لیے پولیس کے تھانوں میں اپنا نام درج کرانے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ کئی قبائلی علاقوں میں بھی آسانی سے آ جا سکتے ہیں۔

۱۹٦٦ء میں، جو "سیاحت کا سال" قرار دیا گیا تھا، پاکستان نے لوزان Lausanne کے بین الاقوامی میلے میں شرکت کی، جہاں پانچ لاکھ سے زیادہ افراد نے پاکستانی سٹال دیکھا۔ علاوہ ازیں پراگ Prague کی نمائش میں پاکستان نے ملک کے خوبصورت مناظر کی بڑی بڑی تصاویر بھیجیں جو سیاحوں کے لیے بے حد پرکشش ثابت ہوئیں۔ جنوری ۱۹٦۷ء میں *Natural Graphic Magazine* نے *Pakistan Story* کے عنوان سے ایک طویل مصور مقالہ شائع کیا اور نیشنل گرافک سوسائٹی نے واشنگٹن میں پاکستانی نوادر پر ایک نمائش منعقد کی۔ دسمبر ۱۹٦۷ء میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کی عالمی انجمن کے ایک وفد نے مشرقی اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا اور یہاں کے جنگلات اور حیوانات پر ایک مختصر فلم تیار کی۔

محکمۂ سیاحت کی درخواست پر لاڑکانہ ایکسپریس کا نام موہنجوڈارو (= موئن جو دڑو) ایکسپریس رکھ دیا گیا ہے۔ ڈھائی لاکھ روپے کے خرچ سے موہنجوڈارو میں آنے والے سیاحوں کی سہولتوں کا انتظام کیا جا رہا ہے، مثلاً مرکز اطلاعات اور تفریحی مرکز کا قیام، پانی اور بجلی کی بہم رسانی، عجائب گھر کو ایرکنڈیشنڈ کرنا اور آثار قدیمہ میں روشنی کا انتظام وغیرہ۔ اسی طرح ٹیکسلا میں محکمے کی طرف سے ریسٹ ھاوس، پروجیکشن ہال اور کیفے ٹیریا کے علاوہ ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کی ایک دکان بھی تعمیر کی جا رہی ہے۔ کالام (سوات) میں بارہ خواب گاھوں پر مشتمل "فلک سیر ہوٹل" اگست ۱۹٦۷ء کھولا گیا۔ پشاور، ڈھاکے، اور چٹاگانگ میں بھی نئے ہوٹل کھولے جا رہے ہیں۔

اب سیاحوں کو خشکی اور پانی میں سفر کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع حمل و نقل بڑی تعداد میں میسر آ چکے ہیں۔ محکمے کی طرف سے شہروں اور آثار قدیمہ کی سیر کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے نے سیاحوں کی سہولت کے لیے موہنجوڈارو اور کاکس بازار تک اپنی پروازیں شروع کر دی ہیں۔ محکمۂ سیاحت نے چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے عوامی ناچ پیش کرنے کے لیے ایک طائفہ بھی تیار کیا ہے۔ کراچی کے ساحل پر سمندر میں ڈوبنے والوں کو بچانے کے لیے ایک حفاظتی دستہ منظم کیا گیا ہے۔ ایبٹ آباد میں گاف کے میدان تیار کیے گئے ہیں۔ گلگت میں پولو کے ٹورنامنٹ منعقد کیے جاتے ہیں۔ لاھور میں ہر سال گھوڑوں اور مویشیوں کی مشہور عالم نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

پاکستان کی سر زمین بڑے متنوع مناظر پیش کرتی ہے۔ اس میں بلند و بالا پہاڑ بھی ہیں اور وسیع و زرخیز میدان بھی، چٹیل صحرا بھی ہیں اور گھنے جنگلات بھی، گنجان آباد شہر بھی ہیں اور آثار قدیمہ بھی۔ سیاحت کے نقطۂ نظر سے اہم مقامات

میں سے مندرجۂ ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:

ڈھاکہ: مشرقی پاکستان کا دارالحکومت، جو ۱۶۰۸ء میں بسایا گیا۔ یہ بنگال کے مغل صوبیداروں کا صدر مقام تھا۔ شہر کا رقبہ اٹھائیس مربع میل ہے اور آبادی پانچ لاکھ سے متجاوز ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کی ململ کی دنیا بھر میں شہرت تھی اور یہاں تیار ہونے والے سوتی اور ریشمی کپڑے کی بڑی مانگ تھی۔ یہاں کی تاریخی عمارات میں قلعۂ لال باغ، مقبرۂ بی بی پری، بارہ کٹرہ، حسینی دالان، ستارا مسجد، سات گنبد مسجد اور ڈھکیشوری مندر اور جدید عمارتوں میں کرزن ہال، ہائی کورٹ، گورنمنٹ ہاؤس، ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ، سیکرٹریٹ، پبلک لائبریری اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے عجائب گھر میں قدیم زمانے کے اسلحہ، زیورات، بت، تصویریں، سکے، مخطوطات، پارچات اور دوسرے فنی نوادر موجود ہیں۔

چٹاگانگ: یہ خوبصورت شہر اور مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ دریائے کرنافلی کے کنارے واقع ہے۔ جامع مسجد، اندر قلعہ، مسجد قدم مبارک، اور روضۂ سلطان بایزید بسطامیؒ یہاں کی بعض قدیم یادگار عمارتیں ہیں۔

کپتائی: چٹاگانگ سے پچیس میل کے فاصلے پر واقع یہ چھوٹا سا گاؤں کرنا فلی پن بجلی منصوبے کے باعث بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہاں بر صغیر کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل (۳۶۰ مربع میل) واقع ہے، جس میں سیر کے لیے موٹر لانچوں کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ یہاں ہر قسم کا شکار بھی دستیاب ہے۔

رانگا ماٹی: چٹاگانگ سے پینتالیس میل دور، دریائے کرنافلی کے کنارے، چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کے ضلع کا صدر مقام ہے، جہاں کے اصل باشندے ابھی تک قدیم طرز کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کے جنگل بے حد گھنے ہیں اور وہاں جنگلی درندوں کی کثرت ہے۔ موسم سرما میں یہاں ہاتھی پکڑے جاتے ہیں، جس کا سیاحوں کو نظارا کرانے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

کاکسں بازار: چٹاگانگ سے چورانوے میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں دنیا کا طویل ترین قدرتی ساحل (۷۵ ۳ میل) ہے۔ اس علاقے میں موگھ قبیلہ آباد ہے، جس کے رسم و رواج منفرد ہیں۔

سندر بن: ضلع کھلنا کے یہ سدا بہار گھنے جنگلات، جن میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے، دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ شکار کی کشش دور دراز کے سیاحوں کو یہاں کھینچے لیے آتی ہے۔

سلہٹ: مشرقی پاکستان میں چاے کے باغات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ۷۸ ہزار ایکڑ رقبے میں تقریباً ایک سو باغات پھیلے ہوے ہیں۔ یہاں شیر اور مرغابی کے شکار کے شائقین کے ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی ہے۔

مہاستھان گڑھ: بنگال کا قدیم ترین دارالحکومت، جو بوگرہ ریلوے سٹیشن سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی کوششوں سے یہاں بدھ، ہندو اور اسلامی ادوار کے آثار برآمد ہو چکے ہیں۔

میناستی: یہاں کھدائیوں کے ذریعے قدیم بدھ ثقافت کے آثار منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ مقام کومیلا سے پانچ میل مغرب کی جانب واقع ہے۔

پہاڑ پور: ضلع راجشاہی میں واقع ہے۔ یہاں ایشیا کی سب سے بڑی اور سب سے نفیس بدھ خانقاہ موجود ہے، جو اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے قابل دید ہے۔

کراچی: مغربی پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم ترین شہر اور بندرگاہ ہے۔ اسلام آباد میں دارالحکومت منتقل ہونے سے قبل یہی ملک کا

صدر مقام تھا۔ یہ صنعت و تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں کا قومی عجائب گھر، چڑیا گھر اور کلفٹن کا ساحل قابل دید مقامات ہیں۔

بھنبھور: کراچی سے چالیس میل شمال مشرق میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض علما کے نزدیک یہی دیبل تھا، جہاں سے محمد بن قاسم نے اپنی فوج کشی کا آغاز کیا۔

ٹھٹھہ: کراچی کے شمال میں تریسٹھ میل دور یہ شہر، تین صدیوں تک (۱۳۷۰ تا ۱۷۳۷ء) صوبۂ سندھ کا دارالحکومت رہا۔ اس سے دو میل شمال مغرب میں مکلی کی پہاڑیاں ہیں، جہاں چھے مربع میل رقبے پر ایک گورستان واقع ہے۔ یہاں کے بعض مقابر فنِ تعمیر کے نادر نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کے مضافات میں، خصوصاً جھیل کالری میں آبی پرندوں کا شکار بکثرت ہوتا ہے۔

حیدر آباد: اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں صوبۂ سندھ کا دارالحکومت، جو کراچی سے ۱۲٦ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہاں بعض آثارِ قدیمہ بھی ملتے ہیں۔ دریائے سندھ پر بنا ہوا غلام محمد بیراج جدید انجینیئرنگ کا شاہکار ہے۔

سکھر: حیدرآباد سے ۲۱۲ میل شمال مشرق میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ سکھر بیراج یہیں ہے، جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین آب پاشی کے منصوبوں میں ہوتا ہے۔ یہاں سے سات نہریں نکالی گئی ہیں، جن سے سّتر لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک نہر ایسی ہے جو نہر پانامہ اور نہر سویز سے بھی زیادہ طویل و عریض ہے۔

موھنجوڈارو (= موئن‌جودڑو): پاکستان کے مشہور ترین آثارِ قدیمہ، سکھر سے اسّی میل جنوب مغرب میں ملتے ہیں۔ یہاں پانچ ہزار سال پرانی وادی سندھ کی تہذیب کی باقیات دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ اسی قسم کے آثار ساھیوال (پنجاب) کے نزدیک ھڑپا کے مقام پر موجود ہیں۔

کوئٹہ: بلوچستان کا دارالحکومت اور صحت افزا مقام، سطح سمندر سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سے باسٹھ میل دور، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر، ایک اور تفریحی مقام زیارت ہے۔

لاھور: صوبۂ پنجاب کا دارالحکومت اور مغربی پاکستان کا ثقافتی مرکز، کراچی سے آٹھ سو میل شمال مشرق میں دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک قدیم تاریخی شہر ہے جہاں قدم قدم پر باغات اور قدیم و جدید عمارات نظر آتی ہیں۔ ہندی اسلامی فن تعمیر کے بعض نادر نمونے عالمگیر کی بادشاہی مسجد، شاھجہان کا شالا مار باغ، جہانگیر کا مقبرہ اور اکبر کا شاھی قلعہ ہیں۔ جناح باغ کا شمار ایشیا کے بہترین تفریحی باغات میں ہوتا ہے۔ لاھور میں ہر سال گھوڑوں اور مویشیوں کا قومی میلا منعقد ہوتا ہے، جس میں طرح طرح کے کھیل تماشوں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس میلے میں شرکت کے لیے سیاح خاصی تعداد میں آتے ہیں۔

راولپنڈی: قیام پاکستان سے قبل یہ شمالی ہند کی ایک اہم چھاؤنی کی حیثیت سے مشہور تھا، لیکن آزادی کے بعد، خصوصاً عبوری دارالحکومت بننے کے بعد، اس شہر نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہاں کا ایوب نیشنل پارک قابل دید ہے۔ اکثر صحت افزا پہاڑی مقامات کو یہیں سے راستے جاتے ہیں، مثلاً مری، نتھیا گلی، ایوبیہ، ایبٹ آباد، سوات اور کاغان۔

اسلام آباد: راولپنڈی سے سات میل شمال مشرق میں پاکستان کا نیا دارالحکومت۔ اگرچہ ابھی یہ شہر مکمل نہیں ہوا تاھم بہت سے سفارت

خانے اور سرکاری دفاتر یہاں منتقل ہو چکے ہیں ۔ یہ شہر جدید ترین طرز پر بسایا گیا ہے ۔

ٹیکسلا : راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلے پر دورِ قدیم کا مشہور شہر اور گندھارا تہذیب کا مرکز، جس کے آثار قدیمہ ھخامنشی، موریا، ھند یونانی، سیتھین، پارتھین اور کشان حکمرانوں کی یادگار ہیں۔

مری : تقریباً ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر راولپنڈی سے چالیس میل دور واقع ہے ۔ اچھی آب و ھوا اور قیام کی بہترین سہولتوں کے باعث یہ موسم گرما میں پاکستان کا مقبول ترین پہاڑی مقام ہے ۔ اس کے قریب کئی اور چھوٹے چھوٹے صحت افزا مقامات ہیں، مثلاً اپرٹوپہ، لوئرٹوپہ، گھوڑا گلی، چھانگلا گلی، ایوبیہ ۔

نتھیا گلی اور ایبٹ آباد بھی اسی علاقے میں عمدہ پہاڑی مقامات ہیں۔

وادی کاغان : نوے میل لمبی اور بعض مقامات پر ساڑھے تیرہ ہزار فٹ تک بلند ہے ۔ اس وادی کے حسین مناظر اور ٹراوٹ مچھلی کا شکار سیاحوں کو دنیا کے ہر حصّے سے کھینچ لاتا ہے ۔

وادی سوات : ملک کے انتہائی خوبصورت علاقوں میں سے ہے، جہاں بعض قدیم آثار قدیمہ بھی دریافت ہوئے ہیں۔

پشاور: لاھور سے ۲۷۰ میل شمال مغرب میں ایک اور قدیم تاریخی شہر، جو وسط ایشیا کا تجارتی مرکز رہا ہے ۔ یہاں کے عجائب گھر میں "رومی ۔ بدھ" فن بت تراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں ۔ یہاں سے گیارہ میل دور درۂ خیبر، اُنتیس میل کے فاصلے پر لنڈی کوتل اور اس سے ذرا آگے افغانستان کی سرحد پر تورخم واقع ہے ۔

گلگت : سوات کی طرح قدرتی حسن سے مالا مال ہے ۔ یہاں کی بعض چوٹیاں انیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں اور ایک چوٹی "کے ۔ ٹو" تو ۲۸۲۵۰ فٹ اونچی ہے اور مونٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی بلند ترین چوٹی سمجھی جاتی ہے ۔ راولپنڈی سے گلگت تک فضائی سفر کریں تو بعض حسین ترین مناظر دیکھنے میں آتے ہیں ۔ ان میں دنیا کی خوبصورت ترین جھیل سیف الملوک کا نظارہ بالخصوص ناقابل فراموش ہے ۔ سکردو میں بھی بعض بہت خوبصورت جھیلیں موجود ہیں، مثلاً ست پارہ اور کچھورہ ۔ ان تمام مقامات پر سیاحوں کے آرام اور سہولت کا انتظام و اہتمام موجود ہے ۔

۲۸ ۔ سکّہ اور قومی نشان

سکہ : پاکستان کا سکہ روپیہ ہے، جو ایک سو پیسوں پر مشتمل ہے ۔ اس کی بین الاقوامی شرح تبادلہ یہ ہے : ایک پاکستانی روپیہ = ۰.۲۱ ڈالر = ۰.۰۷۵ پونڈ یا ۱۸ پنس۔

قومی پھول : پاکستان کا قومی پھول یاسمین ہے ۔

قومی پرچم : قومی پرچم مستطیل شکل کا ہے، جس کا ایک تہائی حصہ سفید اور دو تہائی گہرے سبز رنگ کا ہے ۔ سفید حصہ اقلیتوں کی اور سبز حصہ (جس کے وسط میں سفید ھلال اور پانچ کونوں والا تارا بنا ہے) مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔

قومی ترانہ : جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کا مندرجۂ ذیل قومی ترانہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ہے :

پاک سر زمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزم عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سر زمین کا نظام قوتِ اخوتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچم ستارہ و ھلال رھبر ترقی و کمال
ترجمان ماضی، شان حال جان استقبال
سایۂ خداے ذوالجلال

[مقالے کے آخری حصے میں جو اعداد و شمار دیے گئے ھیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء سے ہے اور یہ *Twenty Years of Pakistan* اور *1947 - 1967* *Pakistan Years Book 1969* پر مبنی ھیں۔

اس مقالے کی تحریر و ترتیب میں جن اصحاب کی اعانت شامل حال رھی ان کے اسماے گرامی درج ذیل ھیں :

جغرافیہ : ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد؛ ارضیات : پروفیسر اسرار اللّٰہ؛ نباتات، مغربی پاکستان : ڈاکٹر آر - آر - سٹیورٹ؛ نباتات، مشرقی پاکستان : ڈاکٹر مجید احمد؛ حیوانات : ڈاکٹر حامد خان بھٹی؛ تاریخ : ڈاکٹر ریاض الاسلام اور پروفیسر محمد اسمعیل بھٹی؛ ریلوے : جناب احمد ربانی۔

"صحت" اور "تعلیم" سے متعلق حصے ڈاکٹر اصغر علی نے اور "صحافت" پر مضمون سیّد اکمل علیمی نے لکھا۔

ادارہ ان سب اصحاب کا ممنون ہے اور بالخصوص ڈاکٹر جسٹس ایس - اے - رحمٰن کا، جنھوں نے از راہ کرم "قانون" کے باب پر نظر ثانی فرمائی ــــــ رئیس ادارہ]۔

مآخذ : (الف) جغرافیہ : (۱) Cunningham : *Ancient Geography of India*؛ (۲) F. C. Richards : *Geographical Factors in Indian Archaeology*، در *Indian Antiquary*، ج ۶۲، ۱۹۳۲ء؛ (۳) O. H. K. Spate : *India and Pakistan : a general regional geography*، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۴) Jane Hill : *Pakistan, Land and People*، لاھور ۱۹۶۰ء؛ (۵) E. C. Stamp : *First Geography of Pakistan and India*، لاھور ۱۹۶۲ء؛ (۶) قاضی سعید الدین احمد : *A Geography of Pakistan*، کراچی ۱۹۶۴ء؛ (۷) A. Tayyeb : *Pakistan : A Political Geography*، لنڈن ۱۹۶۶ء؛ (۸) ابن الحسن : *Pakistan*، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۹) مشتاق الرحمٰن : *Bibliography of Pakistan Geography*، جامعۂ کراچی ۱۹۶۸ء؛ (۱۰) میاں محمد اسلم : ھمارا ملک اور اس کے لوگ، در معاشرتی علوم، لاھور ۱۹۶۹ء؛ نیز دیکھیے (۱۱) *Imperial Gazetteer of India*، ج ۱ تا ۲۶۔

(ب) تاریخ : (۱۲) *The Cambridge History of India*؛ (۱۳) Dowson و Elliot : *The History of India as told by its own Historians*، ۱۸۶۷ تا ۱۸۷۷ء؛ (۱۴) H. Rahman و M. Arshad : *History of Indo-Pakistan*، ڈھاکہ ۱۹۶۶ء؛ (۱۵) آر - سی - موجمدار، وغیرہ : *An Advanced History of India*، نیو یارک ۱۹۶۷ء؛ (۱۶) *A Short History of Pakistan*، مرتبۂ اشتیاق حسین قریشی، مطبوعۂ جامعۂ کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۱۷) علی کوثر : *New History of Indo-Pakistan*، بار دوم، ڈھاکہ ۱۹۶۸ء؛ (۱۸) ھاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ۲ جلد، کراچی ۱۹۵۳ء؛ نیز خصوصی مطالعے کے لیے دیکھیے :

عہد قبل از اسلام : (۱۹) F. E. Pargiter : *Ancient Indian Historical Tradition*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۲۰) H. C. Raychaudhuri : *Political History of Ancient India*، بار ششم، کلکتہ ۱۹۵۳ء؛ (۲۱) وھی مصنّف : *Studies in Indian Antiquities*؛ (۲۲) Stuart Pigott : *Prehistoric India*؛ (۲۳) سری نواس آئینگر : *Life in Ancient India*؛ (۲۴) V. A. Smith : *The Early History of India*، آوکسفرڈ ۱۹۱۴ء؛ (۲۵) Majumdar و Pusalkar : *History and Culture of the Indian People : Vedic Age*، لنڈن ۱۹۵۱ء؛ (۲۶) بدھ پرکاش : *Political and Social*

Movement in Ancient Panjab، دہلی ۱۹۶۳ء؛ (۲۷)
McCrindle : Invasion of India by Alexander the
Great؛ (۲۸) A. T. Olmstead : History of Persian
Empire، شکاگو ۱۹۳۹ء؛ (۲۹) J. W. Crindle :
Ancient India as described by Magasthenese...،
کلکتہ ۱۸۷۷ء؛ (۳۰) R.C. Mookerji : Chandragupta
Maurya and His Times، مدراس ۱۹۴۳ء؛ (۳۱)
D.R. Bhandarkar : Ashoka، کلکتہ ۱۹۲۶ء؛ (۳۲)
رومیلا تھاپر : Asoka and the Decline of Mauryas،
اوکسفرڈ ۱۹۶۳ء؛ (۳۳) A. K. Narain : The Indo -
Greeks، اوکسفرڈ ۱۹۵۷ء؛ (۳۴) S. Beal : Travels
of Hieun Tsang، کلکتہ ۱۹۵۸ء؛ (۳۵) Rhys
Davids : Buddhist India؛ (۳۶) V. S. Agrawala :
Indian as Known to Panini، لکھنؤ یونیورسٹی
۱۹۵۳ء؛ (۳۷) Majumdar و Altekar : Gupta -
Vakataka Age، لاہور ۱۹۴۶ء؛ (۳۸) A. Cunnin-
gham : Later Indo - Scythians، بنارس ۱۹۶۲ء؛
(۳۹) موجمدار : History of Bengal، ج ۱، ڈھاکہ
یونیورسٹی، ۱۹۴۳ء؛ (۴۰) A. A. Macdonell :
A History of Sanskrit Literature، لندن ۱۹۰۰ء؛
(۴۱) Al-Biruni's India، انگریزی ترجمہ از E. C.
Sachau، لاہور ۱۹۶۲ء۔

عہد اسلامی : (۴۲) S. Lane - Pool :
The Mohammadan Dynasties، لندن ۱۸۹۳ء؛ (۴۳)
C. Mabel - Duff : Chronology of India، ۱۸۹۹ء؛
(۴۴) Ikram و Spear : The Cultural Heritage
of Pakistan، لندن ۱۹۵۵ء؛ (۴۵) شیخ محمد اکرام :
History of Muslim Civilisation in India and
Pakistan، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۴۶) A. Rahim : Social
and Cultural History of Bengal، کراچی ۱۹۶۳ء؛ (۴۷)
افضل اقبال : The Culture of Islam : an analysis of its
earliest pattern، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۴۸) S. Lane-Pool :
Mediaeval India under Mohammedan Rule، لندن
۱۹۰۳ء؛ (۴۹) A.B.M. Habibullah : The Found-
ation of Muslim Rule in India، الہ آباد ۱۹۶۱ء؛
(۵۰) M. Nazim : Mahmud of Ghazna؛ (۵۱)
عزیز احمد : Political History and Institutions of the
Early Turkish Empire of Delhi، لاہور ۱۹۳۹ء؛ (۵۲)
اشتیاق حسین قریشی : The Administration of the Sul-
tanate of Delhi، کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵۳) K.A. Nizami :
Some Aspects of Religion and Politics in India
during the Thirteenth Century، علی گڑھ ۱۹۶۱ء؛ (۵۴)
مہدی حسین : Tughluq Dynasty، کلکتہ ۱۹۰۳ء؛ (۵۵)
S.M.H. Haq : Barani's History of the Tughluqs
کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵۶) عبدالحلیم : History of the
Lodi Sultans، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء؛ (۵۷) N.K.
Bhattasali : Coins and Chronology of the Early
Independent Sultans of Bengal، کیمبرج ۱۹۲۲ء؛
(۵۸) J.N. Sarkar : History of Bengal، ج ۲، ڈھاکہ
یونیورسٹی، ۱۹۴۸ء؛ (۵۹) A. Karim : Social History
of the Muslims of Bengal، ۱۹۵۹ء؛ (۶۰) M. Hasan :
Kashmir under the Sultans، علی گڑھ ۱۹۵۹ء؛ (۶۱)
S. Lane-Pool : Babur، ۱۸۹۹ء؛ (۶۲) W. Erskine :
History of India under Babur and Humayun،
کلکتہ ۱۸۰۳ء؛ (۶۳) K. Qanungo : Sher Shah،
۱۹۲۱ء؛ (۶۴) V. Smith : Akbar, the Great Moghul،
دہلی ۱۹۵۸ء؛ (۶۵) D.H. Moreland : India at the
death of Akbar، ۱۹۲۰ء؛ (۶۶) بینی پرشاد : History
of Jahangir، الہ آباد ۱۹۳۰ء؛ (۶۷) بنارسی پرشاد سکسینہ :
History of Shah Jahan of Dehli، الہ آباد ۱۹۳۰ء؛
(۶۸) جادو ناتھ سرکار : History of Aurangzeb، کلکتہ
۱۹۲۱ء؛ (۶۹) W. Irvine : Later Mughals، کلکتہ
۱۹۲۱ء؛ (۷۰) عبدالعزیز : The Mansabdari System
of the Mughal Army، لاہور ۱۹۳۲ء؛ (۷۱)

اشتیاق حسین قریشی : The Administration of the
Mughal Empire، کراچی ۱۹۶۶ء۔
برطانوی دور : (۷۲) Chronology of : J. Burgess
Modern India، ایڈنبرا ۱۹۱۳ء؛ (۷۳) Peter Auber :
Rise and Progress of the British Power in India
۲ جلد، ۱۸۳۷ء؛ (۷۴) History : Edward Thornton
of the British Empire in India، ۲ جلد، ۱۸۴۱ء؛
(۷۵) E. Thompson و G. T. Garrat : Rise and Ful-
filment of British Rule in India؛ (۷۶) H. Beveridge :
A Comprehensive History of India—Civil, Military
and Social، ۳ جلد، ۱۸۶۷ء؛ (۷۷) لارڈ کرزن :
British Government in India، ۲ جلد، ۱۹۲۵ء؛ (۷۸)
C. R. Wilson : Early Annals of the English in
Bengal، ۳ جلد، کلکتہ ۱۸۹۵ - ۱۹۱۷ء؛ (۷۹)
K. K. Datt : Aliverdi and His Times؛ (۸۰)
R. C. Datt : Economic History of India under Early
British Empire؛ (۸۱) A. R. Mallick : British Policy
and the Muslims in Bengal؛ (۸۲) R. Burton :
Sindh, the unhappy valley، ۲ جلد، ۱۸۵۱ء؛ (۸۳)
J. D. Cunningham : History of the Sikhs، لاہور
۱۹۱۸ء؛ (۸۴) Gough و Innes : The Sikhs and the
Sikh Wars : the rise, conquest and annexation of
the Punjab States، ۱۸۹۷ء؛ (۸۵) William Barton :
India's North-West Frontier، لندن ۱۹۳۹ء؛
(۸۶) Kay و Malleson : History of the Sepoy War
in India، ۸ جلد، ۱۸۶۴ تا ۱۸۸۰ء؛ (۸۷) سید محمود :
History of English Education in India 1781-1893،
علیگڑھ ۱۸۹۵ء؛ (۸۸) پی - مکرجی : Indian
Constitutional Documents، ۲ جلد، کلکتہ ۱۹۱۸ء؛
(۸۹) W. A. J. Archibold : Outlines of Indian
Constitutional History، لندن ۱۹۲۶ء؛ (۹۰)
C. Ilbert و Lord Meston : The Constitution of
India، لندن ۱۹۳۶ء؛ (۹۱) Maurice Gwyer و
A. Appadorai : Speeches and Documents on the
Indian Constitution, 1921-1947، ۲ جلد، بمبئی
۱۹۵۷ء؛ (۹۲) J. Cumming : Political India, 1832-
1932، لندن ۱۹۳۲ء؛ (۹۳) چنتا منی : Indian Politics
since the Mutiny؛ (۹۴) V. Lovett : A History of
the Indian Nationalist Movement, 1800-1919، لندن
۱۹۲۳ء؛ (۹۵) R. Coupland : The Indian Problem
1833-1932، لندن ۱۹۴۳ء؛ (۹۶) وہی مصنف : Indian
Politics 1936-1942، لندن ۱۹۴۳ء؛ (۹۷) وہی مصنف :
The Cripps Mission، جولائی ۱۹۴۲ء؛ (۹۸) وہی
مصنف : India : A Restatement، لندن ۱۹۴۵ء؛ (۹۹)
John Stratchey : India, its administration،
۱۹۱۱ء؛ (۱۰۰) آغا خان : India in Transition،
۱۹۱۸ء؛ (۱۰۱) J. Ramsey Macdonald : The
Awakening of India، ۱۹۱۰ء؛ (۱۰۲) وہی مصنف :
The Government of India، ۱۹۲۰ء؛ (۱۰۳)
John Coatman : Years of Destiny : India 1926-
1932، لندن ۱۹۳۲ء؛ (۱۰۴) R. Craddock : The
Dilemma in India، ۱۹۲۹ء؛ (۱۰۵) Mirza B. M.
Ahmad : The Nehru Report and Muslim Rights،
۱۹۳۰ء؛ (۱۰۶) لاجپت رائے : The Political Future
of India، ۱۹۳۰ء؛ (۱۰۷) لارڈ زٹلینڈ : The New
India، ۱۹۳۲ء؛ (۱۰۸) محمد اشرف : Cabinet Mission
and After، لاہور ۱۹۴۶ء؛ (۱۰۹) سبھاش چندر بوس : The
Indian Struggle، ۱۹۴۸ء؛ (۱۱۰) پٹابھی سیتا رامیہ :
History of Indian National Congress؛ (۱۱۱)
اندر پرکاش : The History of Hindu Mahasabha؛
(۱۱۲) جواہر لال نہرو : An Autobiography، ۱۹۳۷ء؛
(۱۱۳) وہی مصنف : Discovery of India، ۱۹۴۶ء؛
(۱۱۴) ایم - کے - گاندھی : My Experiments with
Truth، ۱۹۴۰ء؛ (۱۱۵) پام دت : India Today؛

۱۹۳۷ء؛ (۱۱٦) موجمدار : History of Freedom Movement in India، ۳ جلد، کلکته ۱۹٦۲ - ۱۹٦۳ء؛ An Australian in India : R. G. Cassey (۱۱۷) ۱۹۳۴ء؛ (۱۱۸) While Memory : Sir F. Tucker Serves ، لندن ۱۹۵۰ء؛ (۱۱۹) لارڈ سونٹ بیٹن : Time Only to Look Forward، لندن ۱۹۳۹ء؛ Mission with : Alan Campbell Johnson (۱۲۰) Mountbatten، لندن ۱۹۵۲ء؛ (۱۲۱) L. Mosley : The Last Days of the British Raj، نیویارک ۱۹٦۲ء؛ (۱۲۲) The Transfer of Power : E. W. R. Dumby in India، لندن ۱۹۵۴ء؛ (۱۲۳) وی - پی - مینن : The Story of the Integration of the Indian States نیویارک ۱۹۵٦ء؛ (۱۲۴) وهی مصنّف : The Transfer of Power in India، کلکته ۱۹۵۷ء؛ (۱۲۵) P. Moon : Divide and Quit، برکلے ۱۹۵۷ء؛ (۱۲٦) ابوالکلام آزاد : India Wins Freedom، کلکته ۱۹۵۹ء؛ (۱۲۷) عبدالوحید خان : India Wins Freedom : The Other Side، کراچی ۱۹٦۱ء؛ (۱۲۸) H. V. Hodson : Great Divide، لندن ۱۹٦۹ء؛ (۱۲۹) The Evolution of India and Pakistan : C.H. Phillips 1858-1947، منتخب دستاویزات، لندن ۱۹٦۲ء.

تحریک پاکستان اور اس کا تاریخی پس منظر؛ قیام پاکستان اور اس کے بعد : (۱۳۰) W. W. Hunter : Indian Mussalmans، لندن ۱۸۷۱ء؛ (۱۳۱) خالده ادیب خانم : Inside India، ۱۹۳۷ء؛ (۱۳۲) رام گوپال : Indian Muslims—A Political Study، بمبئی ۱۹۵۹ء؛ (۱۳۳) Modern Islam in India : C. Smith (۱۳۴) Britain and Muslim India : کے - کے - عزیز، لندن ۱۹٦۳ء؛ (۱۳۵) عبدالحمید : Muslim Separatism in India, a brief survey, 1858-1947، لاهور ۱۹٦۷ء؛ (۱۳٦) محمد نعمان : Muslim India : Rise and Growth of All India Muslim Leauge، اله آباد ۱۹۴۲ء؛ (۱۳۷) عبدالوحید خان : History of the Muslim League؛ (۱۳۸) وهی مصنّف : Presidential Addresses of All India Muslim League، مطبوعه دہلی؛ (۱۳۹) وهی مصنّف : Resolutions of All India Muslim League, from 1936 to October 1946، مطبوعه دہلی؛ (۱۴۰) اے - بی - راجپوت : Muslim League—Yesterday and Today، لاهور ۱۹۴۸ء؛ (۱۴۱) پاکستان هسٹری بورڈ : History of the Freedom Movement، کراچی ۱۹۵۷-۱۹٦۳ء؛ (۱۴۲) فضل الحق : Muslim Suffering under the Congress Rule، کلکته ۱۹۳۹ء؛ (۱۴۳) آر - ایم - اگروال : The Hindu Muslim Riots، لکھنؤ ۱۹۴۳ء؛ (۱۴۴) راجندر پرشاد : India Divided؛ (۱۴۵) سی - راجگوپال اچاریه : The Way Out، نومبر ۱۹۴۳ء؛ (۱۴٦) ایم - اے - مېتر : Ways of the Great Indian Conflict، لاهور ۱۹۴۵ء؛ (۱۴۷) سید عبدالعزیز : Reflections on Bihar Tragedy، دہلی ۱۹۴۷ء؛ (۱۴۸) میر لائق علی : Tragedy of Hyderabad، کراچی ۱۹٦۲ء.

نیز دیکھیے :

(۱۴۹) چودھری رحمت علی : Now or Never، کیمبرج ۱۹۳۳ء؛ (۱۵۰) وهی مصنّف : The Millat and the Menace of Indianism، کیمبرج ۱۹۴۰ء؛ (۱۵۱) وهی مصنّف : ....Pakistan، لندن ۱۹۴۷ء؛ (۱۵۲) سیّد عبداللطیف : The Cultural Problem of India، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۱۵۳) وهی مصنّف : The Muslim Problem in India، بمبئی ۱۹۳۹ء؛ (۱۵۴) سکندر حیات خان : Outlines of a Scheme of Indian Federation، لاهور ۱۹۳۹ء؛ (۱۵۵) آغا خان : The Memoirs of Aga Khan، لندن ۱۹۵۴ء؛ (۱۵٦) مولانا محمد علی : My Life—a fragment، طبع افضل اقبال؛ (۱۵۷) وهی مصنف : Select Writings and Speeches، طبع افضل اقبال، لاهور ۱۹٦۳ء؛ (۱۵۸) علامه اقبال : Presidential Address, Allahabad Session, 1930، دہلی ۱۹۴۰ء؛ (۱۵۸) وهی مصنف : Speeches and Statements of

Iqbal، طبع Shamloo، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱٦۰) وھی مصنف : *Letters to Jinnah*، لاہور ۱۹٦۰ء؛ (۱٦۱) سروجنی نائیڈو : *Mohammad Ali Jinnah : An Ambassador of Unity*، مدراس ۱۹۱۸ء؛ (۱٦۲) *Correspondence between Mr. Gandhi and Mr. Jinnah, Panidt Nehru and Mr. Jinnah and Mr. S. Bose and Mr. Jinnah*، مطبوعۂ مسلم لیگ، دہلی؛ (۱٦۳) جمیل الدین احمد : *Speeches and Writings of Mr. Jinnah*، ۲ جلد، لاہور ۱۹٦۰ - ۱۹٦۴ء؛ (۱٦۴) سید شریف الدین پیرزادہ : *Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence*، کراچی ۱۹٦٦ء؛ (۱٦۵) رفیق افضل : *Selected Speeches and Statements of the Quaid-e-Azam : 1911-1948*، لاہور ۱۹٦٦ء؛ (۱٦٦) *Thus spoke the father : a code of political conduct as prescribed by the Quaid-e-Azam*، مطبوعۂ شعبۂ نظم و مطبوعات، کراچی ۱۹٦٦ء؛ (۱٦٧) *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah*، ۲ جلد، مطبوعہ لاہور؛ (۱٦۸) عبدالرؤف : *Meet Mr. Jinnah*، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱٦۹) مطلوب حسن سید : *Mohammad Ali Jinnah : A Political Study*، لاہور ۱۹۵۳ء؛ (۱٧۰) *Jinnah, Creator of Pakistan* : Hactor Bolitho، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۱٧۱) جمیل الدین احمد : *Quaid-e-Azam as seen by his contemporaries*، لاہور ۱۹٦٦ء؛ (۱٧۲) میرزا ابوالحسن اصفہانی : *Quaid-e-Azam Jinnah, as I knew him*، بار دوم، کراچی ۱۹٦٧ء؛ (۱٧۳) جی - الانہ : *Quaid-e-Azam Jinnah : The Story of A Nation*، لاہور ۱۹٦٧ء؛ نیز دیکھیے : (۱٧۴) چودھری افضل حق : *Pakistan and Untouchability*، لاہور ۱۹۴۱ء؛ (۱٧۵) M.R.T. : *Nationalism in Conflict in India*، بمبئی ۱۹۴۳ء؛ (۱٧٦) وھی مصنف : *Pakistan and Muslim India*، دہلی ۱۹۴٦ء؛ (۱٧٧) Bevetley Nicholes : *Verdict on India*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱٧۸) El-Hamza : *Pakistan : A Nation*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱٧۹) شوکت اللہ انصاری : *Pakistan — The Problem of India*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱۸۰) فضل کریم خان درانی : *The Meaning of Pakistan*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱۸۱) جمیل الدین احمد : *Some Aspects of Pakistan*، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۲) زیڈ - اے - سلیری : *The Road to Peace and Pakistan*، لنڈن ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۳) سعید الدین احمد : *The Communal Pattern of India*، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۴) بی - آر - امبیڈکر : *Pakistan or the Partition of India*، بمبئی ۱۹۴٦ء؛ (۱۸۵) Patrick Lacy : *Fascist India*، لنڈن ۱۹۴٦ء؛ (۱۸٦) فرید ایس - جعفری : *The Spirit of Pakistan*، کراچی ۱۹۵۱ء؛ (۱۸٧) اے - ایچ - البیرونی : *Makers of Pakistan and Modern India*، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۱۸۸) Richard Symond : *The Making of Pakistan*، لنڈن ۱۹۵۰ء؛ (۱۸۹) حسن محمود : *A Nation Is Born*، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۱۹۰) چودھری خلیق الزمان : *Pathway to Pakistan*، لاہور ۱۹٦۱ء؛ (۱۹۱) حفیظ ملک : *Muslim Nationalism in India and Pakistan*، واشنگٹن ۱۹٦۳ء؛ (۱۹۲) جمیل الدین احمد : *Muslim Political Movement (Early Phase)*، کراچی ۱۹٦۴ء؛ (۱۹۳) وھی مصنف : *Final Phase of Struggle for Pakistan*، کراچی ۱۹٦۴ء؛ (۱۹۴) عبدالعزیز : *Discovery of Pakistan*، لاہور ۱۹٦۴ء؛ (۱۹۵) وحیدالزمان : *Towards Pakistan*، لاہور ۱۹٦۴ء؛ (۱۹٦) اشتیاق حسین قریشی : *The Struggle for Pakistan*، کراچی ۱۹٦۵ء؛ (۱۹٧) چودھری محمد علی : *The Emergence of Pakistan*، لنڈن ۱۹٦٧ء؛ (۱۹۸) کے - کے - عزیز : *The Making of Pakistan*، لنڈن ۱۹٦٧ء؛ (۱۹۹) جی - الانہ : *Pakistan Movement : Historic Documents*، کراچی ۱۹٦٧ء؛ نیز دیکھیے : (۲۰۰) اشتیاق حسین قریشی : *Pakistan, An*

Islamic Democracy، کراچی ۱۹۵۱ء؛ (۲۰۱) لیاقت علی خان : Pakistan: Heart of Asia، کیمبرج (میسا چوسٹس) ۱۹۵۱ء؛ (۲۰۲) Speeches and Statements of Quaid-e-Millat Liaquat Ali Khan 1941-1951، طبع رفیق افضل، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۲۰۳) W.C. Smith : Pakistan as an Islamic State، لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۲۰۴) Keith B. Callard : Pakistan: Political Study، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ (۲۰۵) وہی مصنف : Political Forces in Pakistan 1947-59، نیویارک ۱۹۵۹ء؛ (۲۰۶) اسلم صدیقی : Pakistan Seeks Security، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۲۰۷) کے - سرور حسن : Pakistan and the United Nations، نیویارک ۱۹۶۰ء؛ (۲۰۸) محمد ایوب خان : Towards a New Pakistan، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲۰۹) وہی مصنف : Speeches since October 1958، مطبوعہ کراچی؛ (۲۱۰) وہی مصنف : Friends Not Masters، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۲۱۱) عزیز بیگ : Before and After Revolution، کراچی ۱۹۶۲ء؛ (۲۱۲) سید شریف الدین پیرزادہ : Evolution of Pakistan، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۳) جی- ڈبلیو- چودھری : Democracy in Pakistan، ڈھاکہ ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۴) Leonard Binder : Religion and Politics in Pakistan، برکلے و لاس اینجلز ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۵) W. A. Wilcox : Pakistan : the Consolidation of a Nation، نیو یارک و لنڈن ۱۹۶۳ء، (۲۱۶) Pakistan, its people, its society, its culture، طبع D.N. Wilber، نیوہیون ۱۹۶۴ء؛ (۲۱۷) Karl Von Vorys : Political Development in Pakistan، پرنسٹن ۱۹۶۴ء؛ (۲۱۸) Ian Stephens : Pakistan, Old Country/New Nation، لنڈن ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۹) سید عابد حسین : The Destiny of Indian Muslims، لنڈن ۱۹۶۵ء؛ (۲۲۰) Lord Birdwood: Two Nations and Kashmir؛ (۲۲۱) شیخ محمد عبداللہ : Kashmir, India and Pakistan، در Foreign Affairs اپریل ۱۹۶۵ء؛ (۲۲۲) Alstair Lamb : Crisis in Kashmir 1947-1966، لنڈن ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۳) Pakistan Repels Aggression، مطبوعۂ حکومت پاکستان، راولپنڈی ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۴) Pakistan—Documents on the Foreign Relations of Pakistan، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۵) منظورالدین احمد : Pakistan, the Emerging Islamic State، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۶) مشتاق احمد : Government and Politics in Pakistan؛ (۲۲۷) خالد بن سعید : Pakistan a Formative Phase، کراچی ۱۹۶۰ء؛ (۲۲۸) وہی مصنف : The Political System of Pakistan، بوسٹن ۱۹۶۷ء۔

عہد اسلامی کے لیے ہم عصر مؤرخین کی مندرجۂ ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوگا : (۲۲۹) ابن خرداذبہ : کتاب المسالک، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۸۹ء؛ (۲۳۰) المسعودی : مروج الذہب، پیرس ۱۸۶۱-۱۸۷۷ء؛ (۲۳۱) البلاذری : فتوح البلدان، لائڈن ۱۸۶۶ء؛ (۲۳۲) ابن بطوطہ : تحفۃ النظار، پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۸ء؛ (۲۳۳) القلقشندی : صبح الاعشی، قاہرہ ۱۹۱۳-۱۹۱۹ء؛ (۲۳۴) العمری : مسالک الابصار، مصر ۱۹۲۴ء؛ (۲۳۵) حمد اللہ مستوفی : تاریخ گزیدہ، طبع براؤن؛ (۲۳۶) میر خواند : روضۃ الصفا، بمبئی ۱۸۴۹ء؛ (۲۳۷) خواندامیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء؛ (۲۳۸) ابن عرب شاہ : عجائب المقدور، کلکتہ ۱۸۱۸ء؛ (۲۳۹) الکوفی : چچ نامہ؛ (۲۴۰) میر معصوم بھکری : تاریخ معصومی، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۲۴۱) میر علی شیر قانع تتوی : تحفۃ الکرام؛ (۲۴۲) العتبی : کتاب الیمینی؛ (۲۴۳) ابوالفضل بیہقی : تاریخ مسعودی؛ (۲۴۴) منہاج سراج : طبقات ناصری، لاہور ۱۹۵۴ء؛ (۲۴۵) امیر خسرو : خزائن الفتوح؛ (۲۴۶) السہرندی : تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۲۴۷) عصامی : فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء؛ (۲۴۸) شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی،

(۲۴۹) یزدی : ظفرنامہ، مطبوعۂ کلکتہ؛ (۲۵۰)
عبدالرزاق سمر قندی : مطلع سعدین، طبع محمد شفیع، لاہور
۱۹۴۱ء؛ (۲۵۱) غلام حسین سلیم : ریاض السلاطین،
بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۸۹۰ء؛ (۲۵۲) حسن النظامی :
تاج المآثر؛ (۲۵۳) احمد یادگار : تاریخ سلاطین
افاغنہ؛ (۲۵۴) بابرنامہ (= توزک بابری)، طبع Beveridge،
لائڈن و لنڈن ۱۹۰۵ء و انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۹۲۱ء؛
(۲۵۵) میرزا حیدر دوغلات : تاریخ رشیدی، انگریزی
ترجمہ از ڈینی سن راس، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۲۵۶) گلبدن بیگم :
ہمایوں نامہ، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۲۵۷) جوہر آفتابچی :
تذکرۃ الواقعات؛ (۲۵۸) نظام الدین احمد : طبقات اکبری،
کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۲۵۹) ابوالفضل : اکبر نامہ، لکھنؤ
۱۸۷۷ء؛ (۲۶۰) وہی مصنف : آئین اکبری، لکھنؤ
۱۸۶۹ء؛ (۲۶۱) بداؤنی : منتخب التواریخ، لکھنؤ
۱۸۸۳ء؛ (۲۶۲) محمد عبدالباقی : مآثر رحیمی؛ (۲۶۳)
توزک جہانگیری، طبع سید احمد خان، غازی پور
۱۸۶۴ء؛ (۲۶۴) معتمد خان : اقبال نامۂ جہانگیری،
کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۲۶۵) عبدالحمید لاہوری : پادشاہ نامہ،
کلکتہ ۱۸۶۷ء؛ (۲۶۶) محمد صالح کنبوہ : عمل صالح؛
(۲۶۷) سجان رائے : خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء؛
(۲۶۸) محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری، کلکتہ
۱۸۷۱ء؛ (۲۶۹) عاقل خان رازی : ظفر نامۂ عالمگیری؛
(۲۷۰) مرزا محمد کاظم : عالمگیر نامہ، کلکتہ ۱۸۶۸ء؛
(۲۷۱) خافی خان : منتخب اللباب، کلکتہ ۱۸۶۹ -
۱۸۷۴ء؛ (۲۷۲) شاہ نواز خان : مآثر الامراء،
انگریزی ترجمہ از Beveridge؛ (۲۷۳) نعمت خان عالی :
بہادر شاہ نامہ؛ (۲۷۴) وقائع نعمت خان عالی،
کانپور ۱۸۷۰ء؛ (۲۷۵) فرشتہ : تاریخ فرشتہ، مطبع
نولکشور، لکھنؤ؛ (۲۷۶) آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ؛
(۲۷۷) اسکندر منشی : تاریخ عالم آرای عباسی، تہران
۱۸۹۶ء؛ (۲۷۸) غلام حسین طباطبائی : سیرالمتاخرین؛
(۲۷۹) سید احمد خان : آثار الصنادید، بار دوم ۱۸۵۴ء؛
(۲۸۰) وہی مصنف : اسباب بغاوت ہند، ۱۸۵۹ء؛
نیز دیکھیے :
(۲۸۱) ذکاءاللہ : تاریخ ہندوستان، علی گڑھ
۱۹۱۵ء؛ (۲۸۲) انتظام اللہ شہابی : تاریخ ملت،
ج ۱۰ و ۱۱، دہلی ۱۹۵۵ - ۱۹۵۷ء؛ (۲۸۳)
ریاست علی ندوی : عہد اسلامی کا ہندوستان، پٹنہ
۱۹۵۰ء؛ (۲۸۴) باری علیگ : کمپنی کی حکومت،
مطبوعۂ لاہور؛ (۲۸۵) سر سید کے لیکچروں کا مجموعہ،
لاہور ۱۸۹۰ء؛ (۲۸۶) الطاف حسین حالی : حیات جاوید،
لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۲۸۷) مناظر احسن گیلانی :
سوانح قاسمی، دیوبند ۱۳۷۳ھ؛ (۲۸۸) محمد امین
زبیری : تذکرۂ وقار، مطبوعۂ علی گڑھ؛ (۲۸۹) وہی
مصنف : محسن الملک، مطبوعۂ علی گڑھ؛ (۲۹۰)
رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی، دہلی ۱۹۳۲ء؛
(۲۹۱) وہی مصنف : مقالات محمد علی، حیدر آباد دکن
۱۹۴۳ء؛ (۲۹۲) عبدالماجد دریا بادی :
محمد علی کی ڈائری، ۱۹۵۲ء؛ (۲۹۳) محمد میاں :
علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ۲ جلد،
مراد آباد ۱۹۴۶-۱۹۴۸ء؛ (۲۹۴) طفیل احمد منگلوری :
مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں ۱۹۳۹ء؛ (۲۹۵)
محمد مرزا دہلوی : مسلمانان ہند کی حیات سیاسی، دہلی
۱۹۴۰ء؛ (۲۹۶) حمید انور : پاکستان (پس منظر و
پیش منظر)، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۲۹۷) ابوالاعلی مودودی :
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، ۳ جلد، مطبوعہ لاہور؛
(۲۹۸) قائد اعظم : تصورات پاکستان، ترجمۂ شاہین فاروقی،
حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء؛ (۲۹۹) عبدالقدوس ہاشمی :
تشریحات پاکستان، حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء؛
(۳۰۰) سکھ منصوبہ، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۳۰۱)
راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب میں، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۳۰۲)
محمد اسمعیل اے - بیگ : جونا گڑھ، حیدر آباد (سندھ)
۱۹۶۰ء؛ (۳۰۳) عبدالوحید خان : تأثرات و تصورات، لاہور
۱۹۶۰ء؛ (۳۰۴) سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا،

کراچی ۱۹٦۷ء.

(ج) ترقیات: (۳۰۵) World Muslim Gazetteer، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹٦۵ء؛ (۳۰٦) World Almanac 1965؛ (۳۰۷) Whitakar Almanac 1968؛ (۳۰۸) The Statesman's Year Book 1968-1969؛ (۳۰۹) Twenty Years of Pakistan, 1947-1967، مطبوعۂ پاکستان پبلی کیشنز، کراچی؛ (۳۱۰) Pakistan Year Book, 1969، کراچی ۱۹٦۹ء (پاکستان کے مختلف شعبوں میں ترقی کے بارے میں مفصل مآخذ کے لیے دیکھیے ص ۴۸۰ تا ۵۱۰).

(ادارہ)

پالاھنگ: (= پالہنگ؛ ف)، لفظی معنی ڈوری، رسّا، کمند، طناب، وہ ڈوری جو درویشوں کے گلے میں پڑی ھوتی ھے اور جس کے سرے پر عقیق کا ایک کئی نوکوں والا ستارہ لٹکا ھوتا ھے۔ اس ستارے کو "تسلیم طاش" کہتے ھیں اور یہ نوجوان درویشوں کو تکمیلِ سلوک کر لینے پر دیا جاتا ھے۔ بعض درویش، خصوصاً بکتاشی (رک بہ بکتاشیہ)، اس ڈوری میں بہت سے زیتونی شکل کے سفیدی مائل خاکستری رنگ کے شفاف پتھر پرو لیتے ھیں۔ یہ پتھر عراق میں ملتے ھیں اور دُرِ نجف (= نجف کے موتی) کہلاتے ھیں۔ کہتے ھیں کہ وہ یشب (Jasper، ترکی: یشم) جس سے تسلیم طاش بنتے ھیں حاجی بکتاش کے مقبرے کے آس پاس پایا جاتا ھے۔ [لغوی معنی: کوتل گھوڑے کو کھینچنے والی رسی؛ نیز باعث، تعلق، سبب، رشتہ، دیکھیے فرھنگ آنند راج، بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) Th. Ippen: Skutari und die nordalbaniche Küstenebene، سراجیوو ۱۹۰۷ء، ص ۷۸ (قرویہ Kruja (البانیا) کے بکتاشی کے ذکر میں)؛ (۲) John Portor Brown: The Dervishes or Oriental Spiritualism، بار دوم، طبع H. A. Rose، لندن ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۴.

(FRANZ BABINGER)

پالمائرا: (Palmyra)، تدمُر، اب تدمُر [بضمتین]، قدیم تدمُر۔ یونانی اس کو پالمیرا کہتے ھیں (غالباً کسی زیادہ پرانے نام کی ایک عوامی اشتقاق کے ذریعے تصحیف؛ قب Hommel، در ZDMG، ۴۴: ۵۴۷؛ M. Hartmann، در ZDPV، ۲۰/۲: ۱۲۸ ببعد)، دمشق سے شمال مشرقی جانب صحرائے عرب کے ایک ایسے نخلستان میں واقع ھے جو دو چشموں سے سیراب ھوتا ھے۔ پانی گندھک آمیز ھے، لیکن جب وہ تہ میں بیٹھ جائے تو پینے کے قابل ھو جاتا ھے۔ آب و ھوا ناموافق ھے، کیونکہ دن اور رات میں درجۂ حرارت بہت مختلف ھو جاتا ھے۔ گرمی میں ناقابلِ برداشت حد تک گرمی اور جاڑے میں بعض اوقات برف پڑتی ھے۔ آب و ھوا کے اس نقص کی تلافی جائے وقوع سے ھو جاتی ھے، جس نے تدمُر کو اُن کاروانی راستوں میں ایک اھم مقام اتصال بنا دیا جو مشرق سے مغرب، بالخصوص فرات سے دمشق کو جاتے تھے۔ اس قدرتی قیاس کی کہ یہ مقام پہلے سے اھم تھا اور بہت ھی قدیم زمانے میں آباد ھوا ھوگا اب بارھویں صدی ق۔ م کے تجلات پلسر Tiglat-Pileser اوّل کے متعدد کتبات سے تصدیق ھو گئی ھے کیونکہ "سر زمینِ اَمورو Amurru کا شہرِ تدمُر"، جس کا آشوری بادشاہ تذکرہ کر رھا ھے، یہاں کے سوا مشکل سے کہیں اور ھو سکتا تھا (R. Meissner، در OLZ، ۱۹۲۳ء، ص ۱۵۷؛ Dhorme، در RB، ۱۹۲۴ء، ص ۱۰٦)۔ اس کتبے کے سوا اس کا نام کہیں ملتا ھے تو سن عیسوی کے آغاز سے کچھ ھی پہلے اور عہدنامۂ عتیق میں اور وہ بھی ایک عجیب ملتبس صورت میں، یعنی یوں کہ تورات

کے مسلمہ متن (الملوک الاول، ۹ : ۱۸) میں کہا گیا ہے کہ سلیمان[ؑ] نے "تمر" (جنوبی فلسطین میں) اور شہروں کے ساتھ آباد کیا، لیکن الایام الثانی، ۸ : ۴ میں اس کی جگہ تدمر Tadmor تحریر کرتا ہے، جس کا تتبع دوسروں کے علاوہ Josephus : *Archaeology*، ۸ : ٦، س ۱ میں بھی کیا گیا ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مؤخرالذکر کے زمانے میں یہ شہر ضرور کچھ شہرت اور وسعت رکھتا تھا، نیز یہ کہ بعد کی یہ مشہور عام روایت پہلے سے موجود تھی کہ حضرت سلیمان[ؑ] نے یہ عجیب شہر آباد کیا ۔ یہ قصہ ایک زمانے کے بعد اہل عرب کو معلوم ہوا اور حضرت سلیمان[ؑ] کے جو مفصل خیالی افسانے بن گئے تھے، انہیں کی ہم آہنگی میں عربوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس شہر کی تعمیر میں جنات نے بادشاہ (سلیمان[ؑ]) کی مدد کی تھی (قب النابغۃ [الذبیانی]، شعر ۲۲ ببعد؛ البکری، طبع وسٹنفلٹ، ص ۳۱۰ اور مذکورۂ ذیل متعدد عرب جغرافیہ نویس؛ بقول ابن الاثیر، طبع ٹورن برگ، ۱ : ۱٦٦، ملکۂ بلقیس نے [حضرت] سلیمان[ؑ] سے تدمر میں ملاقات کی تھی اور وہیں دفن ہوئی) ۔

تدمر کا سلطنت روم میں شمول اس کے لیے سب سے بڑی اہمیت کا باعث ہوا ۔ شہر میں پہلے ہی سے خوب تجارت ہوتی تھی؛ اب اس میں بےحد ترقی ہوئی اور سنسان صحرا سے گھری ہوئی اس بستی میں روپے کی ریل پیل ہونے لگی (ان سڑکوں کے لیے جو پالمائرا کو بیرونی دنیا سے ملاتی تھیں دیکھیے Dussaud : *Topographie historique de la Syrie antique et médiévale*، ۱۹۲۷ء، ص ۲۴۸ تا ۲۷۰) ۔ اسی زمانے میں بلیناس (Pliny) نے اس کا مختصر مگر صحیح حال تحریر کیا ہے (*Hist. Nat.*، ۵ : ۲۵) ۔ یہاں کے سوداگر ایسے ہشیار تھے کہ وہ روم اور پارتھیا کی عداوت سے فائدہ حاصل کرنا جانتے تھے اور ان حالات سے جو ہدریان Hadrian کی اس عقلمندانہ حکمت عملی سے پیدا ہو گئے کہ اس نے آشوریا اور عراق کو پارتھیا والوں کے حوالے کر کے امن کے ایک طویل دور کا آغاز کیا، جس سے تدمر کی خوش حالی میں بہت مدد ملی ۔ ۱۳٦ء کا محصول نامہ، جو آرامی اور یونانی میں لکھا ہوا ہے، جمہوریۂ تدمر کی اس عہد کی کاروباری زندگی کی ایک بہت واضح تصویر پیش کرتا ہے ۔ دوسری طرف سورج کا مندر اور متعدد دوسری نفیس عمارتوں کے شاندار کھنڈر ظاہر کرتے ہیں کہ یونانی اثر سے یہاں کے باشندوں کا ذوق فنون لطیفہ کس قدر ترقی کر گیا تھا ۔ تیسری صدی میں بعض اور ایسے مواقع پیدا ہوے کہ کچھ دن تک اہل تدمر مشرق میں ایک نئی سلطنت کا خواب دیکھنے لگے، جس کا دارالحکومت وہ تدمر کو بنانا چاہتے تھے ۔ اسی صدی کے آغاز میں ایران میں ساسانیوں کا خاندان ابھرا، جس نے رومیوں سے [ایران کی] دیرینہ عداوت تازہ کر دی ۔ اہل تدمر کو پھر اپنے سیاسی تدبر سے کام لینے کا موقع ہاتھ آیا، اور ان کے امیر اذینہ (Odenathus) ثانی نے پہلے شاپور (۲۴۱ تا ۲۷۲ء) کے عہد میں ایرانیوں سے مل جانے کی خواہش کی، لیکن جب اس کی پیشکش مسترد کر دی گئی تو وہ ایشیاے کوچک کے رومی سپہ سالار بالسٹا Ballista سے مل گیا اور پسپا ہونے والے ایرانیوں کو بھاری شکست دی ۔ قیصر جالینوس Gallienus کے عہد میں وہ روما کے تمام مشرقی مقبوضات کا حقیقی فرمانروا ہو گیا اور قیصر نے اس کو "اغسطس" Augustus کا خطاب عطا کیا ۔ جب ۲٦٦ ۔ ۲٦۷ء میں وہ مار ڈالا گیا، تو اس کا منصب اس کے بیٹے وبلاتوس Vaballathus کو ملا، لیکن اصلی طاقت مقتول امیر کی بیوہ زینوبیا (زینب) کے ہاتھوں میں

تھی جو بہت ہی قابل خاتون گزری ہے ۔ اس نے اپنی سلطنت کو خاص طور پر مصر فتح کر کے وسیع کیا ۔ یہ سب قیصر اورلیان Aurelian کی منظوری سے ہوا تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں تدمر نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور ۲۷۰ء میں ایک جنگ ہوئی، جس میں زنوبیا نے شکست کھائی اور اس پر تدمر نے ہتیار ڈال دیے، لیکن جب اس نے دوبارہ بغاوت کی تو اورلیان Aurelian نے شہر کو مع اس کی نفیس عمارتوں کے مسمار کرا دیا ۔ زنوبیا بھاگی، گرفتار ہوئی اور روم بھیجی گئی ۔ اس ملکہ نے جو حسن اور ذہانت دونوں میں ممتاز تھی، اپنے معاصرین پر گہرا نقش چھوڑا اور اس کی یاد عربوں میں ''الزبّاء'' کے نام سے بہت دن تک تازہ رہی، گو وہ ایسے خارق عادت افسانوں کی شکل میں رہی جن میں تاریخی حصّہ بہت ہی تھوڑا رہ گیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عرب بادشاہ جذیمة الأبرش [رکّ بآں، نیز رکّ بہ حیرة] کو ورغلایا اور پھر اس کی شریانوں میں فصد دے کر اسے مار ڈالا ۔ جذیمة کے بھانجے عَمرو بن عَدی نے چاہا تھا کہ خون کا انتقام لینے کا فرض ادا کیا جائے، لیکن عیار قَصِیر نے زور دے کر اسے انتقام پر آمادہ کر لیا ۔ اور جب اس نے ایک چال سے مکّار ملکہ کو اپنی گرفت میں لے لیا، تو ملکہ نے غیرت میں آ کر کہ عَمرو کے ہاتھ سے ماری نہ جائے زہر کھا لیا ۔ یہ زہر ایک انگوٹھی میں تھا، جسے وہ اسی خیال سے ہمیشہ پہنے رہتی تھی ۔

زنوبیا کے خاتمے کے ساتھ تدمّر کی عظمت بھی رخصت ہو گئی ۔ شہر پناہ از سرِ نو تعمیر کر لی گئی، گو یہ سابقہ پیمانے پر نہ تھی ۔ تجارت بھی، جو اس شہر کی وجہ معاش تھی، کم ہونا شروع ہو گئی ۔ اسی زمانے میں عیسائیت نے اس شہر میں پھیلنا شروع کیا، [کئی] اسقفوں کا ذکر آتا ہے اور منجملہ اوروں کے قیصر جسٹینین Justinian نے بھی یہاں ایک کلیسا تعمیر کیا ۔ تدمر رومی حکومت میں تقریباً $3\frac{1}{2}$ صدی تک رہا ۔ اس حکومت کا خاتمہ عرب فتوحات نے کیا ۔ جب حضرت خالدؓ بن الولید اپنی مشہور مہم پر اس شہر میں پہنچے تو باشندوں نے اُن کے مقابل ہو کر مدافعت کا ارادہ کیا، لیکن پھر یہ خیال چھوڑ دیا اور اپنی خوشی سے اس شرط پر ہتیار ڈال دیے کہ ذمیّوں [رکّ بہ ذِمّہ] کے حقوق انھیں دیے جائیں گے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دوبارہ بغاوت کی، کیونکہ یزید نے دمشق کو فتح کرنے کے بعد دِحْیَہ کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا تھا، تب کہیں جا کر یہ علاقہ قطعی طور پر مطیع ہوا ۔

انقلابات کے باعث اسے سابقہ خوش حالی کبھی حاصل نہ ہوئی ۔ یہاں زیادہ تر بنو کلب کی آبادی تھی، اور یہ ان شہروں میں سے ایک تھا جو مروان ثانی سے منحرف ہو گئے تھے، جس نے اس پر فوج کشی کی، لیکن صلح صفائی کی صورت نکل آئی ۔ تاہم بقول ابن الفقیه [۲۹۰ھ/۹۰۳ء (تاریخ تدوین کتاب)] مروان نے شہر پناہ کا ایک حصّہ گروا دیا ۔ مشہور ہے کہ اس نے شہر کے مکمل انہدام کا قصد اس وقت ترک کیا جب وہاں ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی، جو قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور اس کی پیشانی پر سونے کی ایک تختی تھی، جس پر یہ تنبیہ کندہ تھی کہ وہ شہر کو مسمار نہ کرے ۔

مختلف عرب جغرافیہ‌نویسوں نے تدمر کا تذکرہ کیا ہے، لیکن بہت ہی مختصر ۔ اُن میں سے چند اس کی حیرت‌انگیز عمارتوں اور کھنڈروں کا ذکر کرتے ہیں، اور عام طور پر وہ پرانی روایت دہراتے ہیں کہ یہ شہر حضرت سلیمانؑ نے جنات کی مدد سے تعمیر کرایا تھا ۔ اس ضمن میں یاقوت

نے یہ دانشمندانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ لوگوں کا عام میلان یہ ہے کہ وہ بڑی عمارتوں کو حضرت سلیمان سے منسوب کر دیتے ہیں ۔ ۱۱۵۷ء کے ہولناک زلزلے کا پالمائرا پر اثر پڑا ۔ تُطَیْلہ Tudela کے بنیامین Benyamin (۱۱۷۳ء) کا یہ بیان خاصا قابل ذکر ہے کہ شہر میں اکٹھے دو ہزار ایسے یہودی آباد تھے جو لڑنے کے قابل تھے ۔ الدمشقی وہاں کے بےمثال کھنڈروں کے ساتھ جامع مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے، جس کی چھت پندرہ پتھروں سے تیار ہوئی تھی ۔ یہاں کے باشندے مضبوط قَلْعَۃُ المَعْن کو، جو شہر کے شمالی جانب ہے مشہور دروزی بادشاہ فخر الدین [قرقماس] [رك بآں] سے منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ مشکوک ہے ۔ جب ممالک مشرق میں عظیم زوال آیا تو تدمر نظر سے بالکل اوجھل ہو گیا ۔ اس کے باشندے بالآخر ایک فلاکت‌زدہ گاؤں میں رہنے لگے، جو سورج کے مندر کے احاطے میں آباد تھا اور مغرب والے اسے بالکل بھول گئے تھے ۔ اس شہر کا، جو کسی زمانے میں ایسا مشہور تھا، کہیں ۱۶۷۸ء میں جا کر حلب کے انگریزی کارخانے کے ارکان نے دوبارہ پتا لگایا اور ۱۷۵۱ء میں رابرٹ وڈ Robert Wood نے زیادہ غور سے تحقیق و تفتیش کی اور ایک دیدہ‌زیب جلد میں اس کی کیفیت لکھی ۔ آمد و رفت نے پھر سے رواج پایا تو پالمائرا بھی دوبارہ کاروانی راستوں کی ایک مشہور منزل بن گیا اور بالکل قریب زمانے میں موٹروں کی وجہ سے اسے نئی زندگی مل گئی ہے، جو ریگستان میں نقل و حمل کا نیا ذریعہ ہیں ۔ ان کی بدولت پالمائرا اور مشرق و مغرب کے شہروں کے درمیان بہت سرعت اور آرام سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے ۔

مآخذ : (۱) Partsch: *Palmyra, eine historisch-klimatische Studie* (*Berichte d. sächs. Ges. d. Wiss*، ج ۳۷)؛ (۲) E. Honigmann، در *Z.D.P.V.*، ۴۷ : ۲۷ ببعد؛ شرح نامۂ گمرک پر: (۳) Beckendorf، در *Z.D.M.G.*، ۴۲ : ۳۷۰ تا ۴۱۵؛ زنوبیا پر : (۴) الطَّبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۷۵۷ تا ۷۶۶؛ (۵) ابن الاَثیر، طبع Tornberg، ۱ : ۱۶۶، ۲۷۴؛ (۶) Caussin de Perceval : *Essai sur l' histoire des Arabes*، ۲ : ۲۸، ۳۶، ۱۹۶ تا ۱۹۸؛ (۷) المیدانی : الاَمثال، طبع Freytag، ۱ : ۴۳۴ ببعد؛ (۸) A. v. Sallet : *Die Fürsten von Palmyre*، ۱۸۶۶ء؛ (۹) L. Double : *Les Césars de Palmyre*، ۱۸۷۷ء؛ (۱۰) Grimme: *Palmyrae sive Tadmur urbis fata quae fuerint tempore muslimico*، ۱۸۶۶ء؛ (۱۱) البلاذری : فتوح، طبع ڈخویہ، ص ۳؛ (۱۲) الطَّبری، ۱ : ۲۱۰۹، ۲۱۵۳، ۳۳۴۷، ۳ : ۵۳ ببعد؛ (۱۳) ابنُ الاَثیر، ۵ : ۲۶۹ ببعد، ۳۳۲؛ ۶ : ۷۶؛ ۸ : ۳۳۸، ۱۰ : ۳۱۳؛ ۱۱ : ۱۲۲۳؛ (۱۴) الیعقوبی، در *B.G.A.*، ۷ : ۳۲۴؛ (۱۵) الاِصْطَخْری، وهی کتاب، ۱ : ۱۳؛ (۱۶) المقدسی : وهی کتاب، ۳ : ۱۵۶، ۱۸۶؛ (۱۷) ابنُ الفَقیہ : وهی کتاب، ۵ : ۱۱۰، ۱۶۵؛ (۱۸) ابن خُرَّداذبہ : وهی کتاب، ج ۶؛ (۱۹) یاقوت : مُعْجَم، طبع ووسٹنفلٹ، ۱ : ۸۲۸ تا ۸۳۱؛ (۲۰) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۳۹؛ (۲۱) *The Itinerary of Benjamin of Tudela transl. and ed. by Asher*، ۱۸۴۳ء، ص ۸۷؛ (۲۲) Wood و Dawkins : *Les Ruines de Palmyre*، ۱۸۱۲ء؛ (۲۳) v. Oppenheim : *Vom Mittelmeer bis zum Persischen Golf*، ۱۸۹۹ء، ص ۲۷۸ تا ۲۳۷؛ (۲۴) W. Wright : *An Account of Palmyra and Zenobia*، ۱۸۹۵ء؛ (۲۵) Cumont : *Fouilles de Doura-Europos*، متن ۱۹۲۶ء، ص xlvii تا lxiv؛ [(۲۶) البستانی : دائرة المعارف، بذیل مادّۂ تدمر)]۔

(Fr. Buhl)

پالم بانگ : رک به انڈونیشیا.

پالن پور : غیر منقسم ہندوستان کی ایک مسلم ریاست، جو بعد ازاں ریاستہاے مغربی ہندوستان کی ایجنسی میں شامل کر دی گئی [اور اب بھارت کے صوبۂ بمبئی میں شامل ہے] - اکتوبر ۱۹۲۴ء میں جب یہ ایجنسی قائم ہوئی، تو حکومت صوبۂ بمبئی کی نگرانی ختم ہو گئی اور براہِ راست حکومت ہند سے تعلقات قائم ہو گئے - ۹ جون ۱۹۴۸ء تک پالن پور کا شمار ہندوستان کے صوبۂ بمبئی میں گجرات کی ان سترہ با اختیار ریاستوں میں تھا جو شمالاً °۲۳ '۲۵ اور °۲۴ '۴۱ عرض بلد، اور شرقاً °۷۱ '۱۶ اور °۷۱ '۴۶ طول بلد کے درمیان واقع تھیں - اس ایجنسی کا حدود اربعہ حسب ذیل تھا : شمالی جانب راجپوتانے کی دو ریاستیں اودے پور اور سِروھی، مشرقی سمت مہی کانٹھا ایجنسی، جنوبی سمت ریاست بڑودہ اور کاٹھیاوار، اور مغرب کی طرف رَن کچھ.

ریاست پالن پور کو سولھویں صدی عیسوی کے خاتمے پر لوھانی پٹھانوں نے فتح کیا، جو بعد میں جھالوری کہلانے لگے - مغل شہنشاھوں کے زمانے میں ریاست کی مختصر تاریخ *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ۵ : ۳۱۸ تا ۳۲۴ اور ''مرآۃ احمدی'' (Ethé، عدد ۳۰۹۹، ورق ۱۷۳) میں ملے گی - انگریزوں کے تعلقات اس ریاست سے ۱۸۰۹ء سے شروع ہوتے ہیں، جب ان کے اثر سے یہ طے ہوا کہ ریاست بڑودہ کے گائکواڑ کو خراج ادا کرے (Aitchison، ۶ : ۸۹) - ۲۸ نومبر ۱۸۱۷ء کو ایک معاھدے پر دستخط ہوے، جس سے یہ انتظام اور پختہ ہو گیا (کتاب مذکور، ص ۹۱) - ۱۸۴۸ء میں مہاراجا گائکواڑ کی طرف سے ایجنٹ کا تقرر منسوخ ہوا اور ریاست کے مالیات برطانوی نگرانی میں رہے، یہاں تک کہ ۱۸۷۳ء میں مالیات کا انتظام خود رئیس پالن پور کے سپرد ہوا.

[۱۰ جون ۱۹۴۸ء کو یہ ریاست انڈین یونین (موجودہ بھارت) کی ریاست بمبئی میں مدغم کر دی گئی - مدغم ہوتے وقت پالن پور کا رقبہ ۱۷۹۴ مربع میل تھا اور مجموعی آبادی ۳۱۰۸۰۰، ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، لیکن غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی - اس وقت اس کی سالانہ آمد کی اوسط تقریباً ۲۰۲۳۰۰۰ (ہندوستانی) روپے تھی - ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ کچھ جینی بھی رہتے تھے - باشندوں میں اکثر و بیشتر لوگ گجراتی زبان بولتے ہیں].

مآخذ : (۱) C. U. Aitchison : *Treaties*, *Engagements and Sanads*، ج ۶، ۱۹۰۹ء؛ (۲) *Census of India*، ج ۱۰، ایجنسی ریاستہاے غربی؛ (۳) *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۵، ۱۸۸۰ء؛ (۴) *Imperial Gazetteer of India*، بذیل مادّۂ پالن پور؛ (۵) علی محمد خان : مرآۃ احمدی (انڈیا آفس، Ethé، عدد ۳۰۹۷ تا ۳۰۹۹)؛ (۶) *Selections from the Records of the Bombay Government*، عدد ۲۵، ۱۸۵۶ء.

(C. COLLIN DAVIES و [حمید الدین احمد])

پامیر : وسطی ایشیا کے ایک پہاڑی سلسلے کا نام - اس نام کا اشتقاق وجہ تسمیہ ''پاے میر'' سے بتایا جاتا ہے، جس کا لغوی معنی ''پہاڑ کی چوٹی کا زیریں حصہ'' ہے - پامیر کا کوہستانی مرکز تبت کی سطح سے مختلف ہے، پامیر میں گلیشی (glacial) ساخت کی بلند وادیاں ملتی ہیں - سطح سمندر سے انتہائی بلندی ۲۴ ہزار فٹ سے زیادہ ہے - پامیر کی سطح مرتفع صاری کول اور موستا آتا نامی پہاڑیوں کی موجودگی سے دو حصوں

میں بٹ گئی ہے ۔ مغربی حصّے کی ڈھلان مغرب کی طرف اور مشرقی حصّے کی مشرقی جانب ہے ۔ دونوں حصّے کافی مختلف ہیں ۔ پامیر کا اصل لفظ متذکرۂ بالا گلیشی وادیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ خاص خاص گھاٹیاں حسب ذیل ہیں :

(۱) پامیر کلاں، جس میں جھیل وکٹوریا واقع ہے؛ (۲) پامیر خورد، جسے نکولس کا پہاڑی سلسلہ اوّل الذکر سے جدا کرتا ہے؛ (۳) پامیر واخان، جو دریاے جیحون [= آمودریا] کے خاص معاون دریا واخان کی وادی سے متعلق ہے؛ (۴) پامیر کلان کے شمال میں علی چُور کی گھاٹی اور (۵) دریاے مرغاب کی وادی.

ان تمام وادیوں کے مابین بلند پہاڑی سلسلے ہیں، جو کوہ ہمالیہ سے متعلق ہیں اور جن کی چوٹیاں مستقل طور پر برف سے ڈھکی رہتی ہیں ۔ بالائی پامیر کی اوسط بلندی سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ ہے ۔ اس کی اس بلندی کی وجہ سے اسے اکثر "دنیا کی چھت" بھی کہتے ہیں ۔ اس علاقے کا اہم ترین پہاڑی سلسلہ صاری کتول ہے، جس کی ایک چوٹی ۲۳۳۸۸ فٹ بلند ہے ۔ اس علاقے میں پامیر نامی ایک دریا بھی بہتا ہے، جس کا کچھ حصّہ روسی اور کچھ افغانستانی علاقے میں ہے .

طاغ و نیش پامیر کا سلسلہ اپنے جاے وقوع کی بنا پر سیاسی اہمیت بھی رکھتا ہے ۔ یہاں روس، افغانستان، کشمیر، پاکستان، چین، ترکستان اور تبت کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ اس سلسلۂ کوہ کو پار کرنے کے بعد کسی بھی ملک میں داخل ہو سکتے ہیں ۔ گو یہاں کے پہاڑی راستے کافی دشوار گزار ہیں، تاہم مندرجۂ بالا ممالک کے درمیان بری تجارت انہیں کے ذریعے ہوتی ہے .

(سعید الدّین احمد)

⊗ پانچ پیر : رک بہ پنج پیر.

پانی پت : غیر منقسم پنجاب [رک بآن] کے ضلع کرنال کی ایک تحصیل اور قصبہ [اب بھارت میں ہے] ۔ پانی پت کے میدان میں تین بار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے : ۱۵۲۶ء میں، جب بابر [رک بآن] نے ابراہیم لودی [رک بآن] کو شکست دی؛ ۱۵۵۶ء میں، جب اکبر [رک بآن] نے ہیمو کی فوجوں کا قلع قمع کیا؛ اور آخری بار، ۱۷۶۱ء میں، جب مرہٹوں کو احمد شاہ دُرّانی [رک بآن] نے شکست دی ۔ ان واقعات کا بڑا سبب جغرافیائی عوامل، اندرونی انتشار اور سرحدی نظام مدافعت کی کمزوری تھی ۔ ہندوستان کے شمال میں افغانستان کے جنگی مرکز سے جو راستہ حملہ آوروں کے لیے سب سے سہل ہے وہ خیبر، کرّم، ٹوچی اور گومل کے دروں سے پنجاب کے میدانوں تک آتا ہے، اس لیے کہ دریاے سندھ کبھی کسی منچلے سپہ سالار کی راہ میں حائل نہیں ہوا ۔ چونکہ جنوب میں راجپوتانے کے ریگستان مزاحم ہوتے تھے، لہٰذا حملہ آور لشکر لامحالہ گنگا اور جمنا کی وادیوں میں اسی تنگ نالے سے داخل ہوتے تھے جو صحرا کے شمال مشرقی سرے اور ہمالیہ کے دامن کے مابین واقع ہے .

۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودی پر بابر کی فتح کا سبب عرصے تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس نے توپوں سے وسیع پیمانے پر کام لیا تھا ۔ اس غلط فہمی کا سبب لفظ "عَرَبَہ = (گاڑی)" کا ناقص ترجمہ ہے ۔ یہ سچ ہے کہ بابر نے سات سو گاڑیوں سے کام لیا تھا، لیکن یہ درست نہیں کہ ان سے وہ گاڑیاں مراد لی جائیں جن پر توپیں چڑھی ہوتی ہیں، کیونکہ اس لفظ کے معنے محض "گاڑیاں" ہیں ۔ متون یا قرائن کی ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے یہ مانا جا سکے کہ بابر کے پاس اتنی توپیں تھیں جن کے کھینچنے کے لیے سات سو توپ گاڑیاں درکار ہوں ۔

واقعہ یہ ہے کہ بابر کی ''توزک'' سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس صرف دو توپیں تھیں، اور بابر خود اس فتح کو تیر اندازوں کی کامیابی قرار دیتا ہے ۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے لودی خاندان کا خاتمہ ہو گیا، اس سے کہیں زیادہ سخت مقابلہ راجپوتوں نے اگلے سال تھانواہ [مقامی تلفّظ : کان واہ یا کن واھہ، ابو الفضل نے خانواہ لکھا ہے] میں کیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی ۱۵۵۶ء میں ہوئی، جس میں اکبر نے ہیمو کو شکست دی ۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اکبر سے پہلے در اصل کوئی سلطنت مغلیہ نہ تھی بلکہ اسے قائم کرنے کا صرف اقدام کیا گیا تھا۔

احمد شاہ درّانی نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں پر فتح پا کر اپنے قدم ہندوستان میں نہیں جمائے بلکہ انغانستان واپس چلا گیا ۔ مرہٹے عارضی طور سے مغلوب ہوے تھے، کیونکہ بہت جلد انھوں نے دوبارہ قوت حاصل کر کے ۱۷۷۱ء میں پھر ہندوستان کے امن کو خطرے میں ڈال دیا ۔ اس لڑائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے برطانوی اقتدار کے بڑھنے میں سہولت پیدا کی۔

مآخذ : (۱) A. S. Beveridge : بابر نامہ، ج ۲؛ (۲) H. Beveridge : اکبر نامہ ۲ : ۵۸ ببعد؛ (۳) علی محمد خان : مرآۃ احمدی، (Ethé)، عدد ۳۵۹۸، ورق ۵۸۳ ببعد)؛ (۴) نگارنامۂ ہند، Orme ۱۸۹۶ء، (نیز دیکھیے *Asiatic Researches*، جلد ۳، اور Elliot و Dowson، ۸ : ۳۹۶ تا ۴۰۲)؛ (۵) *Selections from the Peshwa's Daftar, Letters and Dispatches relating to the Battle of Panipat* 1747-1761، ۱۹۳۰ء.

(C. COLLIN DAVIES)

پاہنگ : (= پاھانگ) رک بہ ملایا، جزیرہ‌نما.

پتْرونہ : (Patrona) رک بہ ریالہ.

پٹنی : (= پٹنی)، تھائی لینڈ (سابق سیام) کا ایک ضلع، جو اس ملک کے انتہائی جنوب میں جزیرہ نماے [ملایا] کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ جنوب کی طرف اس کی حدود [مایشیا] کی دو ریاستوں کیلان تان Kĕlantan اور کیدا Kĕda سے ملتی ہیں۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی یہی (پٹنی) ہے۔

مقامی باشندے زیادہ‌تر مسلمان ہیں ۔ جامع مسجدیں دیگر مساجد سے ممیز ہیں؛ مؤخرالذکر مسجدوں کو ''سوراؤ'' (surau) کہتے ہیں اور ان کا اپنا عملہ ہوتا ہے ۔ اس ضلع میں قانون خاندانی سے متعلق امور میں شریعت اور دوسرے معاملات میں سیامی قانون کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔

پٹنی تمام تر کوہستانی علاقہ ہے ۔ صرف ساحل پر ایک میدانی پٹی چھٹی ہوئی ہے ۔ ضلع کا رقبہ ۱۳ ہزار مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی [۱۹۳۶ء میں] تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھی ۔ اس میں بڑی اکثریت ملایا والوں کی ہے، باقی سیامی اور چینی ہیں ۔ زراعت بہت ھی کم ہے ۔ صرف پٹنی اور نانگ ۔ چک Nawng-Chik کے نواح میں، چاول کی کاشت ہوتی ہے ۔ آبادی کا بڑا حصہ مچھلی کے شکار پر گزر کرتا ہے ۔ جو مچھلی پکڑی جاتی ہے اس پر نمک لگا لیتے ہیں، جو وھیں نکلتا ہے ۔ ٹین کی کان کنی ترقی پر ہے ۔ اشیاے برآمد خشک کی ہوئی مچھلی، نمک، مویشی، ھاتھی اور ٹین ہیں۔

پٹنی کا نام یقینی طور پر سولھویں صدی میں اس وقت سنا ہے جب پرتگیزوں نے تجارت کی غرض سے یہاں آنا شروع کیا ۔ یہ مقام صدیوں سے سیام کے ماتحت تھا ۔ جنوبی جانب بڑھتے ہوے ۱۲۸۳ء کے قریب تھائی لیگور Ligor پہنچے (یہ ساحل

پر؛ پٹنی سے کسی قدر شمال مغرب میں واقع ہے؛ سوکھوتائی Sukhotai کتبہ) ۔ ۱۳۵۰ء میں پورے جزیرہ نمائے ... کا سیاسی حکومت کے تابع تھا ۔ پٹنی کی فتح انھیں تاریخوں کے درمیان ہوئی ہوگی ۔ ناگرا ۔ کرتا گاما Nāgarakṛtāgama میں آیا ہے کہ ۱۳۶۵ء میں جاوا کی مجاپت سلطنت نے جیرہ Djĕre، موجودہ جیرِنگ Djĕring فتح کر لیا، جو ضلع کی سات ریاستوں میں سے ایک ہے اور جس کا صدر مقام سمندر کے کنارے شہر پٹنی سے کسی قدر مشرق میں واقع تھا ۔ پرتگیزوں نے ۱۵۱۱ء میں شہر ملکا فتح کرنے کے بعد جلد ہی پٹنی میں بھی تجارت شروع کر دی ۔ ان کی ایک بڑی تعداد یہاں رہنے لگی ۔ ۱۶۰۰ء کے قریب ولندیزی اور انگریز نمودار ہوے ۔ اس وقت پٹنی تجارت کا بارونق مرکز اور ملکا اور چین کے درمیان ایک مستقر تھا، جہاں ایک طرف چین کا اور دوسری طرف مجمع الجزائر شرق الہند کی سب سے اہم بندرگاہوں کا مال مبادلے کے لیے ذخیرہ کیا جاتا تھا ۔ ۱۶۲۰ء میں جب یہ آخری کاروبار رو بہ تنزل ہوا تو یہ مقام اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور یورپ والوں نے یہاں کی سکونت ترک کر دی.

یہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ پٹنی والوں نے کب اسلام قبول کیا؛ ۱۶۰۰ء کے حدود میں یہ ایک اسلامی ملک ہو گیا تھا ۔ اس وقت جو ملکہ حکومت کر رہی تھی، وہ پندرہ برس پیشتر اپنے خاوند کی جانشین ہوئی تھی ۔ غالبًا یہ ملک مینڈز پنٹو Mendez Pinto (۱۵۳۴ تا ۱۵۴۰ء) کے یہاں آنے سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا ۔ ملکی روایات کے مطابق، اس سر زمین کا فاتح چاؤسری بنگسا Chaw Sri Bangsa، شاہ سیام کا ایک بیٹا تھا، جو پہلے خود مسلمان ہوا اور اپنا نام و لقب سلطان احمد شاہ رکھا ۔ پھر اس نے سارے ملک کو مسلمان بنایا ۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ملکّا Malacca کی سیادت تسلیم کر لی تھی، جو پندرھویں صدی میں جزیرہ نمائے ملایا کی بالا دست طاقت تھی.

مآخذ : (۱) G. P. Rouffaer : Oudste ontdekkingstochten tot 1497، در Encyclopaedie van Nederlandsch-Indië، بذیل مادّۂ Tochten، ۴ : ۳۸۰ (مع فہرست مآخذ)؛ (۲) P.A. Tiele : De Europeërs in den Maleischen Archipel، در Bijdragen Kon. Instituut، سلسلہ ۴، ۳ : ۳۵، ۶۶؛ ۴ : ۳۰۱؛ ۶ : ۱۷۸ ببعد؛ ۸ : ۷۷؛ سلسلہ ۵، ۱ : ۲۶۷ ببعد، ۲ : ۲۳۱ ببعد؛ (۳) Begin ende Voortgangh van de Oost-Indische Compagnie، اسٹرڈم ۱۶۴۶ء، ۱ : ۷؛ (۴) Peter Floris، طبع Moreland (Hakluyt Society، سلسلۂ ثانی، ج ۷۴) لنڈن ۱۹۳۴ء؛ (۵) T.J. Newbold : British Settlements in Malacca، لنڈن ۱۸۳۹ء، ۲ : ۶۷ ببعد؛ (۶) Nāgara - kṛtāgama، طبع Krom، Hague ۱۹۱۹ء، ص ۵۱؛ (۷) F. Mendez Pinto : Wonderlijke reize، اسٹرڈم ۱۶۵۳ء؛ (۸) A. W. Graham : Siam، لنڈن ۱۹۱۲ء.

(R.A. KERN)

پِٹْرووارادین : (Petrovaradin)، ہنگروی Pétervárad، ترکی وارا دین [سامی بک : قاموس الاعلام، پتروواردین]، ضلع سِرمیہ Sirmia (یوگوسلاویا) کا ایک مشہور فوجی قلعہ اور شہر، جو بلغراد (– پٹروورادین) – نووی سد – سبوٹیکا – بوڈا پسٹ کی بڑی ریلوے لائن پر ڈینیوب کے دائیں کنارے پر نووی سد (Neusatz) کے مقابل واقع ہے، نووی سد ضلع (banate) ڈینیوب کا صدر مقام اور بڑا شہر ہے جس سے وارادین دو پلوں کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، اور ۱۹۲۹ء سے انتظامًا بھی اس شہر میں شامل ہے ۔ یہاں دو فوجی قلعے ہیں : ایک بالائی، جو ڈینیوب سے ۱۰۰ فٹ بلند چتکبرے (serpentine)

پتھر کی پہاڑی پر تین طرف سے دریا سے گھرا ہوا ہے (کوہ Fruška Gora کی ۴ سو فٹ اونچی سب سے زیادہ شمالی سمت میں واقع چوٹی یہی قلعہ ہے) اور ایک زیرین قلعہ ہے، جو شمال میں ڈھلوان پہاڑیوں کے دامن میں بنا ہوا ہے۔ بالائی قلعے میں لوگوں کے ذاتی مکانات نہیں ہیں، بلکہ صرف فوجی عمارتیں ہیں ۔ انویں میں وہ نامی اسلحہ‌خانہ بھی ہے جس میں ترکی لڑائیوں کے بہت سے غنائم رکھے ہیں؛ لیکن دوسرے قلعے میں ایک عمدہ بازار، ایک بڑی اور دو بغلی سڑکیں ہیں ۔ دونوں قلعوں کے رقبے کے اندر متعدد خندقیں ہیں، جن میں دس سے بارہ ہزار آدمیوں تک کی گنجائش ہے ۔ قصبہ خود نصف ڈینیوب کے کنارے آباد ہے اور نووی سد سے اتصال سے پہلے اس کی آبادی ۵ ہزار سے زائد تھی (۱۹۲۱ء) - اس کے آس پاس بہت سے تاکستان ہیں ۔

اس جگہ رومی عہد میں بھی ایک بستی تھی، جسے Cusum کہتے تھے اور جس میں روشنی کے دیوتا متھرا Mithra کی پرستش کے واضح آثار پائے گئے ہیں ۔ ایک افسانے کے مطابق اس آبادی کا بعد کا نام Petricum اس ''پیٹر دی ہرمٹ'' Peter the Hermit سے منسوب تھا جس نے پہلی صلیبی جنگ کے لیے یہاں فوجیں جمع کی تھیں ۔ بہر کیف اتنا ضرور ہے کہ یہ قصبہ ان لڑائیوں کے زمانے میں پٹریکن (Petrikon) کے نام سے موسوم تھا جو بوزنطی شہنشاہ مونوئل کمنینوس Manuel Comnenos (۱۱۴۳ تا ۱۱۸۰ء) اور ہنگری کے درمیان ہوئی تھیں ۔ ایک مختصر زمانے تک بوزنطی سلطنت میں شامل رہنے کے بعد پٹرو وارادین شاہان ہنگری کے پاس واپس آیا، اور بیلا Bela چہارم نے ۱۲۳۷ء میں یہ بستی اور اس کا شاہی محل وہاں کی سسٹارکی (Cistercian) خانقاہ B.M.V. Belefontis de monte Varadinipetri کی نذر کر دیا ۔ یہ خانقاہ قرون وسطی میں ۱۵۲۱ء تک برابر باقی رہی؛ لیکن ۱۳۳۹ء سے یہ اور پٹرووارادین کا شہر دونوں کچھ عرصے کے لیے Mačva کے حاکم کے تسلط میں بھی رہے ۔

ہنگری کے خلاف سلیمان اول کی دوسری جنگ میں پہلی ضرب پٹرووارادین پر لگی : سلطان کے وزیر اعظم اور برادر نسبتی ابراہیم پاشا نے (قب سجل عثمانی، ۱ : ۹۳ تا ۹۴) دھاوا کر کے شہر پر ۱۵ کو اور قلعے پر بہادرانہ مقاومت کے بعد ۲۷ جولائی کو قبضہ کر لیا ۔ ترک پٹرو وارادین پر ۱۶۸۷ء تک قابض رہے ۔ پھر سقوط اوفن Ofen کے بعد انھوں نے بتدریج پیچھے ہٹنا شروع کیا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس شہر پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا (قطعی طور پر ۱۶۹۱ء میں)؛ سورملی [=سورمہ لی] علی پاشا نے (۲۹ اگست سے) ۱۶۹۴ء میں اس کا تئیس دن تک ناکام محاصرہ کیا، پھر ۱۶۹۹ء کے معاہدۂ کارلوبی (Carlowitz) کی رو سے اسے باقاعدہ آسٹریا ھی کے حوالے کر دیا گیا؛ لیکن پٹرووارادین کی زیادہ شہرت ۱۷۱۶ تا ۱۷۱۸ء کی جنگ سے ہوئی ۔ وزیر اعظم شہید علی پاشا کا (اس کے بارے میں قب عبدالرحمان شرف، ۲ : ۱۳۸، اور سجل عثمانی، ۳ : ۵۲۸ تا ۵۲۹) اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس شہر کے قریب سیوائے Savoy کے شہزادۂ یوجین (Eugene) سے مقابلہ ہوا اور شہید علی نے اس کے باقاعدہ محاصرے کی کوشش کی، مگر آسٹروی سپہ سالار نے یہ تدبیر چلنے نہ دی بلکہ اپنی ۶۴ ہزار فوج لے کے پانچ گھنٹے جم کر لڑا، جس کا خاتمہ ترکوں کی شکست پر ہوا (۵ اگست ۱۷۱۶ء) ۔ اس لڑائی سے، جس میں تیمسور اور بلغراد کے سقوط (۱۷۱۷ء)

کے ساتھ ہی علی پاشا خود بھی میدان جنگ میں کام آیا جنگ کا فیصلہ ہو گیا اور نتیجے میں صلح نامۂ پشاروتز Požarevac (رک بآں) مرتب ہوا، جس سے ترکی سرحد پٹرووارادین سے بہت دور جنوب میں فی الواقع صاوہ (= ساوہ Save ندی پر) قائم ہوئی - کچھ دنوں کے بعد ملکۂ ماریا تھریسیا Maria Theresia نے یہاں کا نیا قلعہ بنوایا - ہنگری کی جنگ آزادی (۱۸۴۸ تا ۱۸۴۹ء) میں پٹرووارادین نو ماہ سے زیادہ ہنگرویوں کے ہاتھ میں رہا، تاآنکہ ۶ ستمبر ۱۸۴۹ء کو اس نے آسٹریا کی اطاعت قبول کر لی - جب ۱۹۱۸ء میں آسٹریا - ہنگری کی بادشاہت ختم ہو گئی تو یہ قصبہ یوگوسلاویا کے پاس چلا گیا۔

مآخذ: (مقالے میں مذکور حوالوں کے علاوہ): (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ج ۷ (استانبول ۱۹۲۸ء)، ص ۱۳۰ تا ۱۷۴ (وہ ترکی قبضے کی بہت مکمل روداد دیتا ہے؛ دوسرے بیانات کسی قدر مبہم ہیں کیونکہ بہت سے اعداد و شمار غائب ہیں)؛ (۲) *G.O.R.* : Hammer، بار دوم، ۲ : ۵۰؛ ۳ : ۸۶۶ و ۴ : ۱۳۵؛ (۳) Zinkeisen : *G.O.R.*، ۲ : ۲۰۶ اور ۵ : ۵۳۳ تا ۵۳۴؛ (۴) سامی بک : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۴۸۹ (وہ غلطی سے خیال کرتا ہے کہ پٹرووارادین سلطان احمد ثالث کے عہد (۱۷۰۳ تا ۱۷۳۰ء) کے بعد تک ترکوں کے پاس رہا)؛ (۵) عبدالرحمٰن شرف : تاریخ دولت عثمانیہ، ۲ : ۱۴۳؛ (۶) Meyers Reisebücher : *Turkei*، وغیرہ، بار پنجم لائپزگ - وی انا ۱۸۹۸ء، ص ۳۳؛ (۷) J. Modestin، در *Narodna enciklopedija*، ج ۳ (Zagreb ۱۹۲۸ء)، ص ۳۳۶ تا ۳۳۷ (جہاں اس موضوع پر کچھ مزید کتابوں کے نام مذکور ہیں)؛ (۸) *Almanah kraljevine Jugoslavije*، Zagreb ۱۹۳۱ء، ص ۵۳۱؛ (۹) *Glasnik Istoriskog društva u Novom Sadu*، ج ۶، حصہ ۱ تا ۲، Sremski Karlovci ۱۹۳۳ء (نووی سد اور پٹرووارادین پر خاص شمارہ، اہم مضامین اور مؤخرالذکر شہر کے متعدد قدیم (۱۶۸۸ء سے) نقشوں کے ساتھ).

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

⊗ **پٹنہ** : بھارت کے صوبۂ بہار کا سب سے بڑا شہر اور صدر مقام؛ یہ دریاے گنگا کے دائیں کنارے پر آباد ہے اور اس کی آبادی ۲۸۲۰۰۷ ہے - ۱۹۱۲ء میں برطانوی ہند کا صوبۂ بہار و اڑیسہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ۱۹۱۶ء میں پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا اور ایک سال بعد پٹنہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا - خاص شہر دریا کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا ہے؛ صنعتی اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس شہر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، البتہ صوبے کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ شہر خاصا وسیع اور خوبصورت ہے - پرانے شہر کے مغرب میں بانکی پور [رک بآں] ہے، جو نئی طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔

یوں تو تاریخی اعتبار سے پٹنہ بہت پرانا شہر ہے، لیکن اسے خاص اہمیت سب سے پہلے ۱۵۴۱ء میں حاصل ہوئی جب شیر شاہ سوری نے اسے پہلی بار بہار کا دارالحکومت قرار دیا - سلطنت مغلیہ کے زمانے میں بھی یہ بہار کا دارالحکومت اور ایک تجارتی مرکز تھا - یہ شہر قدیم تاریخی مقام پاٹلی پتر کی جگہ پر آباد ہوا - پاٹلی پتر کے کھنڈر شہر کے جنوب مغربی حصے میں دریافت ہوے ہیں اور ان میں سو ستونوں کا وہ ایوان (hall) بھی شامل ہے جو مہاراجا اشوک نے بنوایا تھا - قدیم ترین تاریخی عمارت، جو اب تک صحیح و سالم ہے، ایک مسجد ہے، جس کا صحن سنگ مرمر کا ہے؛ یہ ۱۴۹۹ء میں بنگال کے فرمانروا حسین شاہ نے تعمیر کرائی تھی - اس کے علاوہ شیر شاہ سوری کی مسجد اور جہانگیر کے بیٹے شاہزادۂ پرویز کی مسجد بھی

قابل دید ہیں ۔ سکھوں کا ایک گوردوارہ بھی عین اس جگہ واقع ہے جہاں ۱۶۶۵ء میں گورو گوبند سنگھ کی پیدائش ہوئی تھی ۔ اس گوردوارے میں گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے، جو روایت کے مطابق خود گورو گوبند سنگھ کا عطیہ تھا ۔ قدیم اینٹ کی خاص عمارت ''گولہ'' بھی محفوظ ہے، جو ۱۷۸۶ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ یہ تقریباً ایک سو فٹ بلند ہے اور شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند ہے ۔ روایت کے مطابق یہ چھت اس مقصد سے تعمیر کی گئی تھی کہ قحط کے زمانے میں اس میں چاول کا ذخیرہ محفوظ کیا جا سکے ۔ یہاں ''خدا بخش'' کتب خانہ ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایشیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے ۔ اس کتب خانے میں آنحضرتؐ کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک کی اسلامی تصنیفات موجود ہیں ۔ ضلع کا رقبہ ۲۰۶۸ مربع میل ہے اور قریب قریب سارا ضلع ایک ہموار میدان ہے، صرف جنوب کی جانب سے راج گیر کی پہاڑیاں اس میں کچھ دور تک داخل ہو گئی ہیں ۔ یہ پہاڑیاں تقریباً تیس میل تک پٹنے کو گیا کے ضلع سے الگ کرتی ہیں ۔ زمین زرخیز ہے اور زرعی پیداوار کے لیے نہایت موزوں ۔ زمین کی ڈھلان مغرب سے مشرق کی جانب ہے، خاص پیداوار چاول ہے، اس کے علاوہ گیہوں، جو، مکئی اور دالوں کی کاشت بھی ہوتی ہے ۔ نہر سون ضلع کے شمال مغربی حصے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتی ہے، اس کے علاوہ متعدد مقامی نہروں اور کنووں سے آبپاشی ہوتی ہے ۔

پٹنہ ڈویژن میں پٹنہ، گیا اور شاہ آباد کے اضلاع شامل ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۱۱۳۳۸ مربع میل اور آبادی ۸۳ لاکھ ہے ۔ یہ پورا ڈویژن دریاے گنگا کے جنوبی کنارے پر ہے ۔

(سعید الدین احمد)

⊗ **پٹیالہ** : برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے صوبۂ پنجاب میں سکھوں کی سب سے بڑی ریاست تھی ۔ بعد ازاں یہ ریاست نئی ریاستی یونین ''پیپسو'' PEPSU میں شامل ہوگئی، جس کا افتتاح ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل نے پٹیالے کے مقام پر کیا تھا ۔ جب بھارت نے ریاستوں کے نظام کو ختم کر دیا تو پٹیالے کو پنجاب میں مدغم کر دیا گیا (۱۹۵۶ء) ۔ [۱۹۶۶ء میں جب لسانی اعتبار سے پنجاب کی تقسیم عمل میں آئی تو پٹیالہ پنجابی صوبے میں شامل کیا گیا] ۔ مقامی زبان پنجابی ہے اور بیشتر آبادی جاٹ قوم کے لوگوں کی ہے، جو برصغیر پاک و ہند کے بہترین کاشتکاروں میں شمار ہوتے ہیں؛ کاشتکار ہونے کے علاوہ یہ اچھے سپاہی بھی ہیں ۔

پٹیالے کا علاقہ مشرقی پنجاب کے وسط میں دریاے جمنا اور ستلج کے درمیان واقع ہے ۔ اس کی لمبائی شرقاً غرباً ۱۳۰ میل کے قریب اور چوڑائی شمالاً جنوباً ۱۲۰ میل ہے ۔ جنوب کی طرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دریاے گھاگھرا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے ۔ پٹیالہ ندی کے علاوہ ریاست میں بعض موسمی ندیاں بھی ہیں ۔ اس ریاست کو مشرقی پنجاب کی شکارگاہ کہہ سکتے ہیں ۔ چیتل، چرخ، مشکی ہرن اور تیندوے بکثرت ہیں ۔ بارہ سنگھے اور نیل گائیں بھی ملتی ہیں ۔

قدیم ریاست کا رقبہ ۵۹۴۲ مربع میل ہے اور ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب تھی ۔ یہ ریاست ایک سکھ سردار [لا] نے ۱۷۶۳ء میں قائم کی تھی ۔ صدر مقام پٹیالہ مشرقی پنجاب ریلوے کی راجپورہ ۔ بھٹنڈہ شاخ پر پٹیالہ ندی کے مغربی کنارے پر آباد ہے ۔ انبالہ چھاؤنی یہاں سے چونتیس میل مشرق کی طرف واقع ہے ۔ [۱۹۶۰ء میں یہاں پنجابی یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ ۱۹۶۱ء

کی مردم شماری کی رو سے پٹیالہ شہر کی آبادی سوا لاکھ کے قریب تھی]۔

(سعیدالدین احمد [و ادارہ])

⊗ **پٹھان**: رک بہ افغان، افغانستان، نیز پشتو۔

* **پچنک**: Pečenegs، قرونِ وسطٰی کی ایک ترکی النسل قوم ۔ ان کا نام بہت سی مختلف شکلوں میں آتا ہے (بجنک، بجناک، پچنک، Πατζινακῖται، Πατζινάκαι، Patzinacitae، Patzinacae، Piecinigi، Pincenakiti، Pecenaci وغیرہ؛ اسی طرح Bysseni، Bessi، ہنگری کی زبان میں Besenyök وغیرہ) ۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ لوگ ترک قوم کی ایک شاخ تھے۔ رشیدالدین (تیرھویں صدی؛ رک بہ غازان) اور محمود کاشغری (۱۰۷۳ء) انہیں غز [رک بآں] قبائل میں شمار کرتے ہیں، مؤخرالذکر (دیوانُ لغات الترک، ۱ : ۲۷؛ قب *K.Cs.A.*، ۱ : ۳۶) انہیں ترک قوم کے شمالی گروہ میں رکھتا ہے، جس سے قپچاق [قفجاق]، اُغوز (اُغز)، وغیرہ متعلق ہیں اور لکھتا ہے کہ وہ رومیوں (Rhomaeans)، یعنی سب سے زیادہ مغربی ترک قبیلے کے بعد آتے ہیں۔

غالباً پچنک بہت پہلے اپنے بھائیوں سے ترکستان ہی میں، جو ترکوں کا اصلی وطن تھا، جدا ہو گئے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ شروع میں وہ اِمبا ۔ یورال ۔ والگا کے خطّے میں آباد ہوئے ۔ البکری اور گردیزی کے بیان کے مطابق یہ علاقہ طول و عرض میں تیس دن کی مسافت تھا ۔ وہاں وہ غالباً ایک معتدبہ وقت تک رہے، ان کے ہمسائے جنوب مغرب میں خزر اور جنوب مشرق میں اُغوز تھے اور وہ ایران اور خوارزم سے تجارت کرتے تھے۔

۸۶۰ء سے اُغوز نے مغربی سمت بڑھنا اور پچنک کو یورال کے خطّے سے نکالنا شروع کیا ۔ نویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب اُغز (اُزن Uzen، Οὖζοι) نے خزر سے معاملہ کر لیا اور پچنک کی بڑی جماعت کو ان کے پرانے وطن سے نکال باہر کیا؛ چنانچہ ۹۲۲ء میں ابن فضلان نے وہاں پچنک کی محض چھوٹی چھوٹی باقی ماندہ جماعتیں دیکھیں؛ *De administrando imperio*، ص ۱۶۶، کے مطابق مؤخرالذکر وہاں اپنی مرضی سے رہ گئے تھے۔

پناہ گزین پچنک مغرب میں مجاروں (Magyars) سے آبھڑے اور انہیں ہنگری میں دھکیل کر ان کے ملک پر قابض ہو گئے، یعنی اولاً اس علاقے پر جو طونہ Don اور ڈنیپر Dnieper کے درمیان ہے اور پھر ڈینیوب تک Constantine Porphyrogennētos (نواح ۹۵۰ء) کہتا ہے کہ یہ واقعہ "پچاس برس پہلے" ہوا ۔ تاریخی وقائع نویس Regino (م ۹۱۰ء) اس کی تاریخ ٹھیک ۸۸۹ء میں متعین کرتا ہے ۔ پچنک کی قوت آخر میں جنوبی روس سے بس‌سربیا [رک بہ بجاق] اور مولداویہ Moldavia میں مشرقی قارپات Carpathians کے پہاڑوں تک پھیل گئی تھی۔

جنگجو اور زور آور ہونے کے باعث پچنک اپنے ہمسایوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، لیکن یہاں ہم صرف مختصراً اُن کے ہنگری، روس اور بوزنطہ سے تعلقات کا تذکرہ کر سکتے ہیں ۔ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں انہوں نے بار بار ہنگری پر مشرقی قارپات کی طرف سے حملے کیے، یا صلح و آشتی سے ہنگری کے مختلف اضلاع میں سکونت پذیر ہو گئے (قب اُن کی نو آبادیوں کا نقشہ، در Neméth : *Die Inschriften des Schatzes von Nagy-Szent-Miklós*، ضمیمہ ۱) ۔ تیرھویں صدی عیسوی تک پچنک کی نوآبادیاں ہنگری میں بعض سیاسی حقوق و امتیازات سے بہرہ‌اندوز تھیں، آخرکار وہ قومانوں (Komans) میں ضم ہو گئیں۔

روسیوں سے، پچنک کے مراسم پہلے دوستانہ رہے (بموجب *De adm. imp.*، ص ۶۹، وہ روسیوں کے ہاتھ مویشی، گھوڑے اور بھیڑیں بیچتے تھے)، بعض اوقات وہ بوزنطہ اور بلغاریا کے خلاف روسیوں کے حلیف تھے (Igor کے زمانے ۹۴۴ء میں)، لیکن زیادہ تر ہم انہیں روسیوں پر حملے کرتے دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کیف Kiev کا محاصرہ کیا، ۹۷۱ء میں اُنھوں نے گرینڈ ڈیوک سویاٹوسلاف Sviatoslav کو، جب کہ وہ بلغاریا سے واپس آ رہا تھا، قتل کر ڈالا۔ روسیوں کو ان کی روک تھام کے لیے بہت سے قلعے بنانے پڑے۔ ان کا آخری حملہ (۱۰۳۴ء) کامل طور پر پسپا کر دیا گیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد (۱۰۶۵ء) خود اُن پر اُزن (Uzen) قوم کا سخت دباؤ پڑا، جو بڑھتی چلی آتی تھی؛ لہٰذا پچنک کو پہلے ڈینیوب کی طرف اور زیادہ ہٹنا پڑا اور بعد میں وہ پلٹ کر جزیرہ نمائے بلقان کی طرف ہٹ آئے۔

بوزنطی شاہی مؤرخ *De. adm. imp.* (ص ۶۸) میں پچنک کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کے قیام کی سفارش کرتا ہے، اور فی الواقع ان سے مصالحت بھی ہو گئی تھی، لیکن ۹۷۰ء سے ہم انہیں روسیوں کے ساتھ مل کر بوزنطہ کے خلاف لڑتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس کے بعد سے پچنک مسلسل بوزنطیوں سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہنشاہ Alexius اول نے ۱۰۹۱ء میں انہیں مرتزہ Maritza کے دہانے پر شکست فاش دی اور ۱۱۲۲ء میں جان John ثانی نے انہیں ایک اور بھاری زک پہنچائی۔ باقی ماندہ پچنک میں سے کچھ بوزنطیوں کی فوجی خدمت میں لے لیے گئے اور کچھ بلقان میں، خصوصاً بلغاریا میں، آباد ہو گئے۔ گاگوز [رک بآں] Gagauz قبیلے کو بعض اوقات انہیں کی باقیات شمار کیا گیا ہے، لیکن ان کی موجودہ زبان سے اس کی بہت کم شہادت ملتی ہے (قب ۳ : ۹۹۲)؛ تاہم بلقانی مقامات کے بہت سے نام اب بھی اس واقعے کو یاد دلاتے ہیں کہ پچنک کبھی وہاں رہے تھے۔

پچنک کے اس طرح خانہ بدوش پھرتے رہنے سے ان میں لازماً قبائلی تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ C. Prophyrogennētos کے قول کے مطابق پچنک آٹھ قبائل میں منقسم تھے (چار ڈنیپر کے اُس طرف اور چار اِس طرف)۔ ہر ایک کا ایک بڑا سردار تھا۔ پھر چالیس کنبے تھے، جن میں سے ہر ایک کا ایک ایک چھوٹا سردار تھا۔ بقول Neméth قبائل کے نام زیادہ تر گھوڑوں کے ناموں اور سب سے بڑے سردار کے القاب پر رکھے جاتے تھے، مثلاً Συρουκαλπέη = سورو کول بے، یعنی سفید گھوڑوں والے کول بے کے قبائل۔ تین قبیلے شجاعت اور فضیلت میں ممتاز تھے۔ اُن کا نام Porphyrogennētos نے ''کنگر'' (Κάγγαρ) لکھا ہے۔ سرداروں کے ناموں میں سے قبیلۂ جُولہ (Γύλα) کے سردار کا نام، یعنی قورقود Kor Kut [رک بآں] غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ Kedrenos (۲ : ۵۸۱ تا ۵۸۲) کے زمانے میں تیرہ پچنک قبائل تھے اور ''ہر ایک کو اُس کا نام اُس کے مورث اور سردار سے وراثۃً ملا تھا''۔

پچنک کے مذہب کے متعلق ہمیں بہت کم علم ہے۔ البکری کے مطابق وہ گزشتہ زمانے میں آتش پرست (مجوسی) تھے، لیکن دوسرے مآخذ کے مطابق دسویں صدی عیسوی کے آغاز کے قریب بھی ان میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

جہاں تک پچنک زبان کا تعلق ہے، Anna Comnena (بارھویں صدی عیسوی) بہت پہلے اُسے قومانوں (دیکھیے قپچاق) کی زبان بتا چکا ہے۔ قریب کے زمانے تک اس زبان کے بچے کھچے

آثار بیشتر صرف پچنک قبائل، رؤسا اور فوجی قلعوں کے ناموں پر مشتمل تھے، جن کی فہرست C. Porphyrogennētos نے تحریر کی ہے؛ لیکن جب ۱۹۳۱ء میں Németh خزانۂ Nagy. Szent Miklos کے کتبات کو حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے یہ پتا چلا کہ سونے اور چاندی کے جو برتن خزانے میں رکھے تھے وہ پچنک سردار بوتاؤل چبان Bota-ul Čaban (تقریباً ۹۰۰ تا ۹۲۰ء) کی ملک تھے اور یہ کہ یہاں پچنک زبان کے مزید نمونے موجود ہیں۔ ان سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ پچنک کی زبان ہنگری کی قومانی زبان اور قومانی نقوش Codex Cumanicus سے قریبی تعلق رکھتی تھی۔ ان کتبات کے حروف کو پچنک حروف (runes) کہہ سکتے ہیں، جو گوک ترک Kök türk رسم الخط کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ہنگری کی تحریر کی علامتوں سے ان کا قریبی رشتہ ہے۔

آخر میں اس واقعے سے کہ خزانۂ Nagy-Szent-Miklos میں بپتسمے کے دو برتن موجود ہیں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ کئی پچنک سرداروں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ پچنک کی نسبت مزید معلومات بہت ہی کم ملتی ہیں؛ تاہم قب K. Dieterich کا اشاریہ (دیکھیے مآخذ)۔

مآخذ: پچنک سے متعلق قدیم ترین عربی (ابن رستہ اور البکری) اور فارسی (گردیزی) مصادر الجیہانی (دسویں صدی) پر اور نویں صدی کے نصف اول کے ایک مآخذ پر مبنی ہیں اور ان میں پچنک کے صرف ابتدائی وطن کا حوالہ ملتا ہے، البتہ المسعودی کے بیان میں ان لوگوں کے والگا کے خطّے سے نکالے جانے کے بعد کا زمانہ بھی شامل ہے۔ مآخذ کی دونوں صنفیں [عربی و فارسی] J. Marquart اور W. Barthold کے استعمال میں رہی ہیں۔ دیکھیے نیز: (۱) Constantine Porphyrogennētos، مطبوعۂ بون، ج ۳، (۱۸۴۰ء)، دیکھیے تاریخی اشاریہ (پورا باب سینتیس پچنک سے بحث کرتا ہے)؛ (۲) P. Golubovskiy: Pečenĕgi, torki i polovcī do nashestviya tatar، کیف ۱۸۸۴ء؛ (۳) سامی: قاموس الأعلام، ۲: ۱۳۹۱؛ (۴) K. Krumbacher: Geschichte der byzantinischen Litteratur، بار دوم ۱۸۹۷ء، ص ۱۱۰۵؛ G (۵) Enciklopedičeski Slovar' Brokgaus-Efron، ج ۲۳، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۸ء، ص ۵۳۸ ببعد؛ (۶) J. Marquart: Osteuropäische und ostasiatische Streifzüge، لائپزگ ۱۹۰۳ء، دیکھیے اشاریہ؛ (۷) Révai Nagy Lexikona، ج ۳، بوڈاپسٹ ۱۹۱۱ء، بذیل Besenyök؛ (۸) K. Dieterich: Byzantinische Quellen zur Länder- und Volkerkunde، ۱۹۱۲ء، جز ۲، خصوصاً ص ۵۱ تا ۵۸، ۱۳۷ اور ۱۸۶؛ (۹) ن - عاصم و م - عارف: عثمانلی تاریخی، ج ۱، قسطنطینیہ ۱۳۳۵ھ، ص ۷۵ ببعد؛ (۱۰) E. Oberhummer: Die Türken und das Osmanische Reich، لائپزگ و برلن ۱۹۱۷ء، دیکھیے اشاریہ؛ (۱۱) Z. Gombocz: Über den Volksnamen besenyö، در Turán، بوڈاپسٹ ۱۹۱۸ء، ص ۲۰۹ تا ۲۱۵؛ (۱۲) W. Bang: Über den Volksnamen besenyö، در مجلۂ مذکور، ص ۴۳۶ تا ۴۳۷؛ (۱۳) G. Fehér: Die Petschenegen und die ungarischen Hunnensagen، در K. Cs. A.، ۱: ۱۲۳ تا ۱۴۰ (من جملہ اور باتوں کے یہ فرض کرتا ہے کہ اباؤن کا شاہی خاندان سبا Csaba یا قبیلۂ پچنک Τζοπόν کی نسل سے ہے)؛ (۱۴) Gy. Czebe: Turco-byzantinische Miszellen (I)، در K. Cs. A.، ۱: ۲۰۹ تا ۲۱۹ (Fehér کے مفروضے کی تردید کرتا ہے، Németh کے لسانی نتائج کی تصدیق اور باب پچنک در Porphyrogennētos کا مکرر تجزیہ کرتا ہے)؛ (۱۵) W. Barthold: Orta Asya Türk Ta'rīkhine

hakkinda Dersler، استانبول ۱۹۲۷ء، ص ۲۳ و ۲۹ بعد؛ (۱۶) J. Németh : Zur Kenntnis der Petschenegen، در K. Cs. A.، ۱ : ۲۱۹ تا ۲۲۵؛ (۱۷) وهی مصنّف : Die petschenegischen Stammesnamen، در Ungarische Jahrbücher، ج ۱۰، ۱۹۳۰ء، ص ۲۷ تا ۳۳؛ (۱۸) وهی مصنّف : Die Inschriften des Schatzes von Nagy-Szent-Miklós، بوڈاپسٹ ۔ لائپزگ ۱۹۳۰ء، بخصوصاً ص ۳۶ و ۴۵ تا ۵۹؛ (۱۹) حسین نامق، پچنکلر، (ترکی)، استانبول ۱۹۳۳ء.

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

* پچوی : ابراهیم [افندی]، ترک مؤرخ جو ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں فونفکیرخن Fünfkirchen (هنگری، هنگری زبان میں : Pécs، ترکی میں پچوی Pečewi، یعنی پچویلی Pečewili) میں پیدا هوا، اور اسی سے اس کی نسبت پچوی هے (قب پچوی : تاریخ، ۱ : ۲۸۶ اور ۲ : ۴۳۳؛ نیز J. v. Hammer : GOR، ۴ : ۵، حاشیه) ۔ اس کے اجداد بوسنه اور هنگری میں جاگیردار تھے ۔ پچوی نے اپنے باپ کا نام نہیں لکھا (قب تاریخ، ۱ : ۸۷)؛ بہر حال اس نے پہلے سے فونفکیرخن میں بودو باش اختیار کر لی تھی ۔ اس کی ماں مشہور خاندان صوقللی (Sokolović) سے تھی ۔ پچوی کے اوائل عمر کی بابت هم یه جانتے هیں که چوده برس کی عمر میں جب وہ یتیم هو چکا تھا، اس کے چچا فرهاد پاشا، حاکم اوفن Ofen نے اسے اپنے هاں رکھ لیا، اور کچھ عرصے بعد وہ ایک دوسرے رشته دار لالا محمد پاشا کے پاس چلا گیا (قب اس کی تاریخ، ۲ : ۳۲۳)؛ اس نے پندرہ برس مؤخرالذکر کے متوسلین میں بسر کیے ۔ ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳ء میں وہ فوج میں داخل هوا، سنان پاشا کے هنگروی معرکوں میں حصه لیا اور محاصرۂ غران Gran (قب تاریخ، ۲ : ۱۳۶ تا ۱۸۰)، معرکۂ ارلاؤ Erlau اور محاصرۂ پٹرووارادین [رک بآں] کا عینی شاهد تھا ۔ بعد کے چند سال اس نے زیادہ تر لالا محمد پاشا کے عملے میں بسر کیے، جو ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء سے وزیر اعظم هو گیا تھا ۔ اس نے ان مختلف عہدوں کی، جن پر وہ کام کرتا رها تھا، مفصل کیفیت اپنی تاریخ میں لکھی هے ۔ اپنے مربی محمد پاشا کی وفات (۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) کے بعد وہ اس کے جانشین کی طرف سے آناطولی بھیجا گیا تاکه وهاں کی کئی سنجاقوں کے احوال مرتب کرے ۔ اس کے بعد وہ تھوڑے عرصے کے لیے توقات [۔ توقاد] کا ''دفتر دار'' هو گیا، اسی منصب پر روم‌ایلی گیا، اور بالآخر محض رعایةً دفتر آناطولی کا عہدہ دے دیا گیا ۔ اس نے بقیه زندگی اپنے پیدائشی ضلع میں بسر کی ۔ وہ شتول وائسن برگ Stuhlweissenburg کا متصرف اور پھر تمسوار Temesvar کا دفتر دار رها ۔ ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء میں اس نے سرکاری خدمت سے کنارہ کشی کی اور اوفن چلا گیا ۔ اس نے اپنے آخری ایام یہیں اپنے مولد هی میں اپنی تاریخ لکھنے میں صرف کیے ۔ اس کی تاریخ وفات ٹھیک معلوم نہیں، لیکن اس کا انتقال ضرور حدود ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء میں هوا هو گا.

ابراهیم پچوی، جو عنفوان شباب سے برابر تاریخ کا شوقین نظر آتا هے ایک ایسی کتاب کا مصنف هے جو سنین ۹۲۶/ ۱۵۲۰ء تا ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء کے لیے بہترین ترکی مآخذ میں سے هے ۔ اگرچه قدیم واقعات کے ذکر میں وہ اپنے ترک پیشرووں کے بیانات پر اعتماد کرتا هے اور جیسا که N.v. Istvánffy. اور K. Heltai نے دکھایا هے، هنگری مآخذ سے بھی مدد لیتا هے، تاهم بعد کے زمانے کا حال اس نے خود مشاهدے یا معلومات کی بنا پر لکھا هے ۔ اس کی تصنیف صاف اور سلیس زبان

میں لکھی گئی ہے اور اس کے قلمی نسخے بکثرت موجود ہیں۔ (ان مخطوطوں میں جن کی تفصیل Babinger: GOW، ص ۱۹۳، نے دی ہے اب دو کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو اوپسال یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہیں، قب Zetterstéen : Katalog، ص ۳۳۱، اور ایک روڈس Rhodes میں، جو حافظ احمد کی ملکیت ہے، عدد ۶۳۴)، لیکن اب تک اس کا کوئی ناقدانہ نسخہ شائع نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے کئی ابتدائی مسودے بھی لوگوں کے پاس موجود ہیں، جن میں زیر تحریر زمانوں کا کافی فرق پایا جاتا ہے اور قیاس یہ ہے کہ بعد میں ان میں اضافے کیے گئے ہوں گے۔ استانبول کی مطبوعہ تاریخ پچوی دو حصوں میں شائع ہوئی ہے (۱۰ + ۵۰۳ اور ۷ + ۴۸۷ صفحات، طبع ۱۲۸۳ھ)، قب JA، ۱۸۶۸ء، ۱ : ۴۷۱ و ۴۸۳؛ اور Kraelitz، در Isl.، ۸ : ۲۰۹)۔ اس میں سلطان سلیمان اعظم کی تخت نشینی سے ۱۰۳۹ھ میں مراد چہارم کی وفات تک کے زمانے کا حال آیا ہے۔

مآخذ: F.v. Kraelitz، در Isl.، ج ۸ : (۱۹۱۸ء)، ص ۲۵۲ بعد؛ اور وہ مآخذ جو Babinger : GOW، ص ۱۹۵ میں درج ہیں۔

(FRANZ BABINGER)

* **پرتو پاشا**: دو عثمانی سیاستدانوں کا نام۔

۱ - پرتو محمد پاشا، عثمانی امیر البحر اور وزیر۔ سرکاری ملازمت کا آغاز شاہی حرم سرا کے عملے میں تقرر سے ہوا، پھر قپوجی باشی [رک بآں] اور کچھ مدت بعد ینی چری کا آغاز ہوا۔ ۹۶۲ھ / ۱۰۵۵ء میں وزیر کے درجے تک ترقی ملی۔ ۹۶۸ھ / ۱۰۶۱ء میں وزیر سوم مقرر ہوا، ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء، میں وزیر دوم اور بالآخر قپودان پاشا [=امیرالبحر] مؤذن زادہ علی پاشا کی ماتحتی میں شاہی بیڑے کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ وہ بعد میں مورد عتاب ہوا، اور استانبول میں وفات پائی، جہاں وہ قبرستان ایوب میں اپنی خاص تُربہ [مقبرے] میں مدفون ہوا۔

مآخذ: (۱) J.v. Hammer : GOR، ۳ : ۳۸۲، ۴۳۸؛ (۲) محمد ثریا : سجل عثمانی، ۲ : ۴۷ بعد۔

۲ - پرتو محمد سعید پاشا، ترک منصب دار اور شاعر۔ یہ تاتاری النسل تھا اور آربیہ کے قریب قریۂ داریجہ میں پیدا ہوا۔ عنفوان شباب میں وہ دارالخلافہ استانبول آیا اور سرکاری ملازمت میں داخل ہوا۔ محرم ۱۲۴۰ھ / ستمبر ۱۸۲۴ء میں وہ بیلک جی افندی صدر محکمۂ مراسلات (referendary) بنایا گیا، اور شعبان ۱۲۴۲ھ / مارچ ۱۸۲۷ء میں "رئیس الکتاب"۔ دو برس کے بعد وہ رئیس (chancellor)، کا عہدہ کیھو بیٹھا اور ایک خاص کام پر مصر گیا۔ واپسی کے بعد ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء میں وہ وزیر اعظم کا نائب (کیا یہ)[= کہیا، مخفف کتخدا] مقرر ہو گیا۔ ۲۳ ذوالقعدۃ ۱۲۵۱ھ / ۱۲ مارچ ۱۸۳۶ء کو وہ دیوانی امور کا وزیر (ملکیہ ناظری) مقرر ہوا اور مارشل (مشیر) کا خطاب ملا۔ ۱۸۳۶ء کے موسم بہار میں اسے پاشا کا خطاب ملا، لیکن اسی سال موسم خزاں میں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۸۳۶ء کے آغاز میں سلطان محمود ثانی نے اسے سقوطری (البانیا) میں جلا وطن کر دیا۔ حکم جلا وطنی کے چند ہفتے بعد پرتو پاشا جلا وطنی کے مقام کی طرف روانہ ہوا، لیکن وہاں نہ پہنچ پایا، کیونکہ ادرنہ میں وہاں کے والی مصطفی پاشا (بقول گب : HOP، ۴ : ۳۳۳، امین پاشا) نے اس کے اعزاز میں دعوت دی؛ اس کے تین گھنٹے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس میں کسی کو شک نہ تھا کہ یہ اچانک موت زہر خورانی کا نتیجہ تھی اور عام رائے نے اس جرم کا

مرتکب خود سلطان محمود کو قرار دیا۔ اس کے خاندانی حالات کے لیے دیکھیے سجلِ عثمانی، ۲ : ۳۸؛ اس کا داماد وصّاف ہے، جو اپنے خسر کا ہم‌خیال، اور سلطان محمود کا سازشی ذاتی دبیر (پرائیویٹ سیکرٹری) تھا، اعلٰی تعلیم یافتہ تھا، لیکن کردار سے محروم اور رشوت کی دست رس کے اندر تھا۔ یہ بھی پرتو پاشا کی طرح اسی زمانے میں اپنا عہدہ کھو بیٹھا اور توقات [= توقاد] (آناطولی) میں جلا وطن کر دیا گیا؛ قب Geschichte der Türkei : G. Rosen، ج ۱، لائپزگ ۱۸۶۶ء، ص ۲۵۵ ببعد۔ پرتو پاشا کا جانشین اس کا سیاسی بد مقابل عاکف پاشا ہوا، قب GOW : Babinger، ص ۳۰۷ ببعد۔ بحیثیت مدبّر پرتو پاشا کی روش علانیہ روس کے خلاف رہی اور عیسائیوں کے ساتھ بھی کم معاندانہ نہ تھی۔

شاعر کی حیثیت سے پرتو پاشا نے ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے، جس کے متعلق یہ رائے ہے کہ وہ سلطان محمود کے عہد کے فن شاعری کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کی دو اشاعتیں ہیں : بولاق ۱۲۵۳ھ (۹۱ صفحات) اور استانبول ۱۲۵۶ھ (۱۳۰ صفحات)۔ پرتو پاشا کی دوسری تصنیفات کے لیے دیکھیے بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۱۱۳ ببعد۔ اس کا گرانقدر کتب خانہ، جو مخطوطات سے مالا مال ہے اب ستوطری (= سُقُطری) میں وہاں ہے جہاں پہلے خانقاہ سلیمیہ تھی۔

مآخذ : (۱) Geshichte der Türkei : G. Rosen، ج ۱، لائپزگ ۱۸۶۶ء بمواضع کثیرہ، خصوصًا ص ۲۵۵ ببعد؛ (۲) گب : HOP، ۴ : ۳۳۲ ببعد، جہاں ادرنہ میں پرتو پاشا کے انتقال کے ذکر میں Jouannin اور Turquie : J. van Gaver، پیرس ۱۸۴۳ء، کے حوالے دیے گئے ہیں؛ (۴) محمد ثریّا : سجلّ عثمانی، ۲ : ۳۸؛ (۵) سامی : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۴۹۴ ببعد؛ (۶) بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۱۱۳۔

اس پرتو پاشا کو سیاستدان اور شاعر پرتو ادہم پاشا سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے، جس کا انتقال ۵ ذوالقعدہ ۱۲۸۹ھ/ ۶ جنوری ۱۸۷۳ء کو بحیثیت گورنر قسطمونی (رک بآن) ہوا اور جس کی کئی نظمیں شائع ہو چکی ہیں، مثلاً ایک ''شاہنامہ'' اور ''لاحقہ'' دیکھیے جلد ۱ (= استانبول)، بدون تاریخ، اور ''اطلاق الافکار فی عقد الابکار''، استانبول ۱۳۰۳ھ۔ اس پرتو پاشا پر قب محمد طاہر : کتاب مذکور، ۲ : ۱۱۳ ببعد۔

(Franz Babinger)

پرشیا : رک بہ ایران۔

پرگنہ : دیہات کے ایک مجموعے کا ہندوستانی نام۔ سلطنت دہلی کی تواریخ میں یہ اصطلاح سب سے پہلے بظاہر شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی (*Bibliotheca Indica*، ۱۸۹۱ء، ص ۹۹) میں ملتی ہے، کیونکہ حسن نظامی نے اپنی کتاب تاج المآثر یا منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں اسے استعمال نہیں کیا ہے۔ اگرچہ یہ اصطلاح پہلے چودھویں صدی عیسوی میں نمایاں ہوئی اور اس نے جزوی طور پر ''قصبہ'' کی جگہ لے لی، تاہم غالبًا یہ اور زیادہ قدیم تقسیموں پر مبنی ہے، جو مسلم فتوحات سے پہلے موجود تھیں؛ لہٰذا اس کی ابتدا کی ٹھیک تاریخ غیر یقینی ہے۔

پرگنے کے اندرونی نظم و نسق کا حال شیر شاہ کے عہد کی تاریخوں میں ملتا ہے، جس نے انتظام مالیات کی تفصیلات اپنے والد کے دو پرگنوں کے انتظام میں سیکھی تھیں، جو سہسرام (بہار) میں واقع تھے۔ جب وہ ہندوستان کا حکمران ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کو انتظامی وحدتوں میں منظم کیا، جو ''سرکاریں'' کہلاتی تھیں، اور انہیں دیہات کے مجموعوں میں تقسیم کر دیا گیا، جو پرگنوں کے نام سے موسوم ہوے۔ ہر پرگنہ ایک

''شقدار'' یا فوجی پولیس افسر کی نگرانی میں تھا، جو ''امین'' یعنی دیوانی حاکم پرگنہ کو مدد دیتا تھا ۔ امین کے دیوانی ماتحت ایک ''فوطہ دار'' یا خزانچی اور دو ''کارکن'' یا منشی ہوتے تھے، ایک ہندی اور دوسرا فارسی خط و کتابت کے لیے [یہ عہدے اگرچہ شیر شاہ سے پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کی تنظیم باقاعدہ طور پر شیر شاہ ہی نے کی] ۔ بہر حال یہ انتظام چلتا رہا یہاں تک کہ اکبر نے سلطنتِ مغلیہ کو صوبوں میں منظم کیا، جو سرکاروں میں منقسم تھے ۔ اکبر کے عہد میں سب سے چھوٹی مالی اکائی پرگنہ یا ''محل'' تھی ۔ مثال کے طور پر، اودھ کا صوبہ پانچ ''سرکاروں'' اور اڑتیس پرگنوں میں منقسم تھا (آئین اکبری، در *Bibliotheca Indica*، ۲ : ۱۷۰ تا ۱۷۷ [مترجمۂ Jarrett]، ۱۸۹۱ء).

مغل شاہنشاہوں کے ماتحت پرگنے کے بڑے عمال قانون گو، امین، اور شقدار تھے، جو پرگنے کے حسابات، تشخیصِ مالگذاری، زمینوں کی پیمائش، اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کے ذمےدار ہوتے تھے ۔ اسی طرح ہر گاؤں میں ایک پٹواری یا محاسبِ دِہ مقرر کیا جاتا تھا، جس کے فرائض گاؤں میں اسی قسم کے ہوتے تھے جیسے پرگنے میں قانون گو کے ۔ یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہیے کہ پرگنہ کوئی مستقل اور یکساں اکائی تھا، بلکہ نہ صرف یہ کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں رقبے کے لحاظ سے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا بلکہ اکثر زمین کے نئے بندوبست کے بعد ان مالی اکائیوں کی نئی تقسیم اور حد بندی کر دی جاتی تھی ۔ ایک ہی پرگنے کا کسی ایک ہی خاندان یا قبیلے کے زیر تصرف دیکھ کر یہ قیاس بھی پیدا ہوتا ہے، کہ وہ نہ صرف ادائے مالگذاری کے لیے ایک معین رقبہ تھا، بلکہ اپنی تخلیق کے وقت جائداد کی تقسیم پر مبنی تھا ۔

چوبیس پرگنہ: بنگال کا ایک ضلع، جو °۲۱ '۳۱ اور °۲۲ '۵۷ عرض بلد شمالی اور °۸۸ '۲۱ اور °۸۹ '۶ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے ۔ اس کا نام ان پرگنوں کی تعداد پر مبنی ہے جو اس زمینداری میں شامل تھے جسے ۱۷۵۷ء میں میر جعفر، بنگال کے نواب ناظم نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا ۔ اس کی توثیق مغل شہنشاہ نے ۱۷۵۹ء میں کی، جب اس نے کمپنی کو اس رقبے پر دوامی حقوق مالکانہ عنایت کر دیے ۔ اسی سال لارڈ کلائو Clive کو، ان خدمات کے صلے میں جو اس نے میر جعفر کے لیے انجام دی تھیں، اس ضلع کے محاصل دے دیے گئے ۔ اس عطیے نے، جس کی میزان ۳۰،۰۰۰ پونڈ سالانہ تھی، کلائو کو کمپنی کا نوکر ہونے کے علاوہ کمپنی کا زمیندار بھی بنا دیا ۔ یہ رقم اسے اس کی وفات کے وقت تک، جو ۱۷۷۴ء میں ہوئی، برابر ملتی رہی، جس کے بعد شہنشاہ کی منظورکردہ ایک دستاویز کی رو سے، زمین اور محاصل کا پورا مالکانہ حق کمپنی کی طرف منتقل ہو گیا ۔

مآخذ: متن میں دے دیے گئے ہیں [نیز Moreland : *Agrarian System of the Mughals*، اور جو مآخذ اس میں ہیں] ۔

(C. Collin Davies)

پرنگ سبل: Prang Sabil (= پرانگ سابل)، مجمع الجزائر ہند شرقی میں جہاد (رَنْگ ہاں) کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ Prang ''پرنگ'' انڈونیشی زبان میں جنگ کو کہتے ہیں ۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje : *De Atjèhers*، بٹاویا ۱۸۹۳ تا ۱۸۹۴ء، ۱ : ۱۸۳ ببعد؛ ۲ : ۱۲۳؛ (۲) وہی مصنف : *Verspreide Geschriften*، ۴/۲ : ۲۲۳ ببعد؛ (۳) H. T. Dameté : *Atjehsche*

oorlogspapieren، در Indische Gids، ۱۹۱۲ء، ۱ : ۶۱۷ ببعد، ۷۷۶ ببعد؛ (۳) وہی مصنف : Hikajat Prang Sabil (متن و ترجمہ)، در BTLV، ۸۳ : ۵۰۵ ببعد.

(R. A. Kern)

* پروانہ : رک بہ معین الدین سلیمان .

* پریم : (= پیرم Perim) بحر احمر کے دہانے پر ایک جزیرہ، جس کا عرض بلد شمالی ۱۲ درجے ۴۰ دقیقے ۳۰ ثانیے اور طول بلد شرقی ۴۳ درجے ۳ دقیقے ہے ۔ عرب اسے مایون کہتے ہیں ۔ اس پر انگریزوں کا تسلط رہا ہے ۔ یہ جزیرہ عدن کے ملحقات میں سے ہے اور عدن سے مغرب کی طرف چھیانوے میل دور اور ساحل عرب سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔

اس جزیرے کو سرزمین عرب سے جدا کرنے والی تنگ آبنائے باب المنہلی کہلاتی ہے ۔ اس طرح پریم کے ذریعے بحر احمر کے دہانے کی نگرانی کی جا سکتی ہے اور خود پریم کی نگرانی جبل المنہلی سے ہو سکتی ہے، جو بندرگاہ شیخ سعید کی ایک پہاڑی ہے، بشرطیکہ اس کی قلعہ بندی اسی طرح کر دی جائے ، جیسے پہلی جنگ میں ترکوں نے کی تھی۔

جزیرے کا طول چار میل ہے اور عرض ڈیڑھ میل ۔ شکل نعل اسپ کے مشابہ ہے اور رقبہ پانچ مربع میل ہے ۔ جنوب کی راس البرٹ (Cape Albert) اور ساؤتھ پوائنٹ South Point کے درمیان دو بندرگاہیں ہیں، جن میں سے بڑی بندرگاہ یعنی ''براؤن بے'' Brown Bay کا زیادہ سے زیادہ عرض ڈیڑھ میل اور کم سے کم نصف میل ہے ۔ یہاں جہاز بحفاظت تمام لنگر انداز ہو سکتے ہیں، کیونکہ اس کی گہرائی تین سے لے کر آٹھ مسمار (fathom) تک ہے ۔ جزیرے کے مشرقی سرے پر روشنی کا وہ مینار ہے جو انگریزوں نے ۱۸۶۱ء میں تعمیر کیا تھا ۔ یہ جزیرہ اس برکانی چٹان سے بنا ہے جو بحر احمر کو جانے والے اتھلے دہانے پر واقع ہے ۔ جزیرے کا زیادہ تر حصہ برکانی طبقۂ ارضی سے ڈھکا ہوا ہے جس کے اوپر برکانی مادے کی ایک سیاہی مائل سخت تہ جمی ہوئی ہے ۔ کہیں کہیں پہاڑیاں بھی ہیں، جن میں سب سے اونچی دو سو پچاس فٹ ہے اور جو ساحل کی طرف رفتہ رفتہ ڈھلوان ہوتی چلی گئی ہیں ۔ جزیرے پر نباتی مواد بہت کم ہے اور پینے کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے عدن سے لانا پڑتا ہے ۔ اس طرح بڑے پیمانے پر کاشت اور گنجان آبادی کاری کے ذرائع بالکل مفقود ہیں ۔ آب و ہوا کے لحاظ سے پریم کا موسم مغربی اور جنوبی تہامہ کے موسم کے بین بین ہے ۔ اس کا انتہائی درجۂ حرارت مغربی تہامہ کے انتہائی اوسط درجۂ حرارت سے بھی زیادہ ہے (جولائی میں ۳۷۰۸ سنٹی گریڈ) ۔ موسم گرما کی آمد پر درجۂ حرارت بڑھنا شروع ہوتا ہے، پھر جولائی سے ستمبر تک خاصا یکساں رہتا ہے، یعنی ان میں سے کوئی مہینا بھی دوسروں سے نمایاں طور پر زیادہ گرم نہیں ہوتا ۔ بارش کا انحصار موسمی ہواؤں پر ہے ۔ اپریل کے آخر میں طوفان برق و باد کے ساتھ تیز بارش ہوتی ہے ۔ آج کل پریم کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں بحر احمر میں جانے والے جہازوں کے لیے کوئلا اور سامان خور و نوش جمع رکھا جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں ایسٹرن ٹیلیگراف کمپنی (Eastern Telegraph Co.) نے یہاں اپنا سٹیشن بھی بنا رکھا ہے، جو تار کے ذریعے، عدن، شیخ سعید اور الحدیدۃ کی بندرگاہوں سے مربوط ہے ۔

قدیم جغرافیہ نگار پریم کو Διοδώρου νῆσος کے نام سے جانتے تھے (Periplus maris Erythraei، فصل ۲۵)؛ Pliny (Nat. hist.، ۶ : ۱۷۵) نے اسے ایڈنو Adanu [= عدن] کا جزیرہ کہا ہے ۔ پرتگیز اس سے میہو Meho کے نام سے واقف تھے ۔ البوکرک

Albuquerque نے ۱۵۰۳ء میں اسے ویرا کروز Veracruz کا نام دیا تھا۔

ایک بے آب و گیاہ جزیرہ ہونے کی وجہ سے غالبًا اس کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی، اس کے سوا کہ بحری ڈاکوؤں نے اسے ایک زمانے میں اپنا اڈا بنا لیا تھا اور یہاں سے وہ بحر احمر اور بحرِ ہند کے جہازوں پر دھاوے بولا کرتے تھے؛ لیکن یہاں ضروری اشیا کی فراہمی کی دقت کی وجہ سے انھوں نے بعد میں اس کے بجائے مدغاسکر کے ساحل پر سینٹ ماری St. Marie کو اپنا مرکز بنا لیا۔ جس زمانے میں فرانس نے مصر پر حملہ کیا تھا (۱۷۹۹ تا ۱۸۰۱ء) تو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی نے عارضی طور پر پریم کو اپنے تصرف میں لے لیا تاکہ فرانسیسی لوگ اس راہ سے نہ آ سکیں، جیسا کہ نپولین کا منصوبہ تھا، اور اپنی کچھ فوج یہاں بھیج دی اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں سے افریقی ساحل پر آنے جانے والے جہازوں پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی تو یہ فوج واپس بلا لی گئی۔ اس کے بعد انگلستان نے ۱۸۵۷ء میں پریم پر دوبارہ قبضہ کر کے جزیرے کی قلعہ بندی کر دی اور براؤن بے Brown Bay پر بارکیں بنوا دیں۔

مآخذ: (۱) C. Niebuhr: *Reisebeschreibung nach Arabien und anderen umliegenden Ländern*، کوپن ہیگن ۱۷۷۴ء، ۱: ۴۴۸ ببعد؛ (۲) C. Ritter: *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۸/۱: ۶۶۶ تا ۶۶۸؛ (۳) J. S. King: *Description and history of the British outpost of Perim*، ۱۸۷۷ء؛ (۴) M. Hunter: *Statistical Account of Aden*، ۱۸۷۷ء، ص ۱۷۱ ببعد؛ (۵) A. Spalding: *Historical Sketch of the Coaling Station at Perim-Island*، لیورپول ۱۸۹۰ء؛ (۶) E. Glaser: *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ۲: ۱۶۹؛ (۷) W. Schmidt: *Das südwestliche Arabien*، فرانکفرٹ Frankfurt ۱۹۱۳ء، ص ۳۴، ۳۵، ۷۸، ۱۰۶؛ (۸) *Handbooks prepared under the direction of the Foreign Office*، شمارہ ۶۱: *Arabia*، لنڈن ۱۹۲۰ء، ص ۱، ۴، ۵۳، ۶۴، ۱۱۶؛ (۹) *Die Insel Perim und die Eingänge in das Rothe Meer*، در *Peterm. Mitt.*، ۴ (۱۸۵۸ء): ۱۶۳ ببعد۔

(A. GROHMANN)

پریم چند: اردو اور ہندی کے مشہور اور ہردلعزیز افسانہ نگار اور ناول نویس۔ اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ گھر میں انھیں پیار سے نواب رائے کہا جاتا تھا اور اسی نام سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، لیکن آگے چل کر وہ پریم چند کے نام سے لکھنے لگے۔

منشی پریم چند کے والد منشی عجائب لال بنارس سے پانچ چھے میل دور لمہی نام کے ایک گاؤں کے رہنے والے کائستھ تھے۔ یہیں "دھنپت رائے" ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوے۔ ان کے والد کی تھوڑی سی زمین تھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈاک خانے میں پندرہ بیس روپے ماہوار کے منشی تھے۔ زندگی بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پہلے پریم چند نے گاؤں کے مولوی صاحب سے مکتب میں پڑھا اور جب ان کے والد کا تبادلہ گاؤں سے گورکھ پور ہو گیا تو انھیں شہر کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس دوران میں پریم چند کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہوے جنھوں نے ان کی خارجی اور داخلی زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ سات سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد والد نے دوسری شادی کر لی اور اس طرح گھر کی فضا پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی۔ گورکھ پور میں قیام کے زمانے میں انھوں نے ایک کتب فروش سے لے کر سرشار،

شرر، رسوا، محمد علی کے ناول، رینالڈز Reynolds کے ناولوں کے ترجمے اور طلسم ہوش ربا کے کئی حصے پڑھے - کچھ عرصے بعد منشی عجائب لال تبدیل ہو کر پھر اپنے گاؤں کے ڈاک خانے میں آ گئے اور یہاں آ کر پندرہ سال کی عمر میں پریم چند کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی - تھوڑے دن بعد منشی عجائب لال کا انتقال ہو گیا اور بیوی، سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کی ذمےداری پریم چند کے سر پر آ گئی - انھوں نے ابھی انٹرنس پاس نہیں کیا تھا - وہ روزانہ ننگے پیر دس میل چل کر بنارس آتے جاتے، ٹیوشن کرتے اور رات کو گھر لوٹ کر کپی کی روشنی میں پڑھتے - اس طرح ۱۸۸۹ء میں انٹرنس پاس کیا - حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہ مل سکا، چنانچہ ایک سکول میں اٹھارہ روپے مہینے پر ملازم ہو گئے اور مدتوں فاقہ مستی میں زندگی بسر کی - ۱۹۰۴ء میں الٰہ آباد ٹریننگ کالج سے تدریس کی سند حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں سرکاری ملازم ہو کر کانپور چلے گئے - یہاں منشی دیا نرائن نگم، مدیر زمانہ، سے مراسم بڑھے - ۱۹۰۸ء میں ان کا تبادلہ ھمیر پور ہو گیا، لیکن وہاں صحت خراب رہنے لگی، چنانچہ ۱۹۱۴ء میں بستی میں تبادلہ کروا لیا - ۱۹۱۰ء میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے - ۱۹۱۸ء میں وہ تبدیل ہو کر گورکھ پور آ گئے - اگلے سال وہ بی - اے ہو گئے - ۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک عدم تعاون پورے شباب پر تھی اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، گاندھی جی گورکھ پور آئے - ان کی ایک تقریر کا پریم چند نے یہ اثر لیا کہ بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا - اب تک زندگی صحت کی خرابی اور شدید ذھنی اضطراب کا شکار رہی تھی، اب انھیں معاشی بد حالی کا پہلے سے کہیں زیادہ مقابلہ کرنا پڑا - ۱۹۲۲ء میں انھوں نے چرخوں کی دکان کھولی، لیکن وہ نہ چلی؛ کانپور کے ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت کی، لیکن نہ نبھی؛ بالآخر بنارس میں سرسوتی پریس قائم کیا اور اس میں بھی نقصان اٹھایا - ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء میں دو مرتبہ نولکشور پریس لکھنؤ میں ملازمت کی - وھاں درسی کتابیں لکھیں اور ایک ھندی رسالے مادھوری کی ادارت کی - بیچ کا عرصہ بنارس میں گزارا اور ۱۹۲۹ء میں وھاں سے اردو اور ھندی میں ایک رسالہ ھنس جاری کیا - حکومت نے کئی بار اس کی ضمانت ضبط کی، لیکن پریم چند آخرِ دم تک اسے کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے - ۱۹۳۴ء میں وہ ایک فلم کمپنی کے بلاوے پر بمبئی گئے، جہاں ان کی ایک کہانی پر مبنی فلم مل مزدور تیار ہوئی، لیکن حکومت نے اس کی نمائش پر پابندیاں عائد کر دیں - دوسری فلموں کے سلسلے میں فلم کمپنیوں کے مالکوں اور ان کے خیالات میں ہم آھنگی پیدا نہ ہو سکی اور وہ دل‌برداشتہ ہو کر بنارس لوٹ آئے - یہاں پہنچ کر ان کی زندگی کے آخری ایام تنگدستی اور مسلسل علالت کے باعث بہت تکلیف میں گزرے - ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انھوں نے وفات پائی - [ان کا اپنی پہلی بیوی سے نباہ نہ ہو سکا تھا، چنانچہ دونوں میں جلد ہی علیحدگی ہو گئی تھی - ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اپنے خاندان کی مرضی اور رواج کے خلاف ایک نو عمر بیوہ شیورانی دیوی سے شادی کر لی، جو صحیح معنوں میں ان کی رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں - منشی پریم چند نے ایک بیٹی کملا اور دو بیٹے شری‌پت رائے اور امرت رائے اپنے پیچھے چھوڑے]-

پریم چند کی پہلی تخلیق ایک مزاحیہ ڈراما

تھا، جو انھوں نے چودہ سال کی عمر میں اپنے ایک بد اطوار ماموں کی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ [اگلے سال انھوں نے ایک اور ڈراما ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات لکھا۔ یہ دونوں ڈرامے طبع نہیں ہوے اور ان کے مسودے بھی ضائع ہو چکے ہیں۔ باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز پانچ چھے سال بعد ہوا]۔

پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ایک بڑے افسانہ‌نگار اور اس سے بھی بڑے ناول‌نگار سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی تقریباً پینتیس سال کی ادبی زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس پر ایک بلند قومی نصب العین کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں ایک شدید قسم کا جذبۂ وطنیت جھلکتا ہے، قومی آزادی کی تڑپ پائی جاتی ہے اور بیسویں صدی کے ابتدائی تیس پینتیس برسوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا صحیح عکس ملتا ہے۔

[عام طور پر کہا جاتا ہے کہ منشی پریم چند کی ادبی تخلیقات کا آغاز ایک مختصر ناول اسرار محبت سے ہوا، جو ۱۸۹۸ء میں بنارس کے ہفتہ وار آوازۂ خلق میں بالاقساط شائع ہوتا رہا؛ لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ اس ناول کا نام در اصل اسرار معابد تھا اور یہ ۱۹۰۳ اور ۱۹۰۴ء کے درمیان سلسلہ وار آوازۂ خلق میں نکلتا رہا (عبیداللہ خان، ص ۲۰۲ بعد)۔ پریم چند کے ایک قریبی دوست منشی بیتاب بریلوی کا بیان ہے کہ ان کا پہلا ناول پرتاب چندرا تھا (زمانہ، پریم چند نمبر، ص ۴۵)، جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا، لیکن شائع نہیں ہو سکا اور کچھ عرصے بعد جلوۂ ایثار کی شکل میں منظر عام پر آیا (مدن گوپال، ص ۶۱)۔ ان کا تیسرا ناول کشنا ۱۹۰۴ء کے آخر میں شائع ہوا، لیکن اب نایاب ہے۔ چوتھا ناول ہم خرما وہم ثواب غالباً ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہی ناول ۱۹۰۵ء میں پریما (نیز پرتگیا اور وبھو) کے نام سے ہندی میں چھپ چکا تھا (مدن گوپال، ص ۶۰)۔ اسی کے پلاٹ کو انھوں نے بعد ازاں اپنے ایک اور ناول بیوہ (بنارس ۱۹۰۹ء) میں پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار نمودار ہوا (جو بعد ازاں ہندی میں وردان کے نام سے نکلا)۔ ۱۹۱۶ء میں منشی پریم چند نے اپنا ضخیم ناول بازار حسن ختم کیا، لیکن اس کے لیے کوئی ناشر نہ مل سکا، چنانچہ یہ کہیں ۱۹۲۲ء میں طبع ہو سکا حالانکہ اس کا ہندی ترجمہ سیوا سدن اس سے بہت قبل شائع ہو کر مقبول و معروف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جو ناول لکھے گئے ان کی اشاعت کے سلسلے میں بھی یہی کیفیت برقرار رہی۔ گوشۂ عافیت ۱۹۲۲ء میں ختم ہوا اور ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا، لیکن اس کا ہندی ایڈیشن پریم آشرم ۱۹۲۲ء ہی میں چھپ گیا تھا۔ ہندی میں نرملا ۱۹۲۳ء میں چھپا اور اردو میں ۱۹۲۹ء میں۔ چوگان ہستی ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا۔ اس کا ہندی ایڈیشن رنگ بھومی اسی سال شائع ہو گیا اور ہندوستانی اکیڈمی نے اسے سال کی بہترین تصنیف قرار دیا، لیکن اردو ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں چھپ سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند آہستہ آہستہ ہندی ہی کے ہو رہے تھے، کیونکہ ہندی ناشرین کتب سے انھیں بہتر معاوضہ مل جاتا تھا۔ اردو میں ناولوں کو بعد میں منتقل کیا جاتا اور اس کام میں سحر ہنگامی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے (عبیداللہ خان، ص ۳۶۲)۔ ۱۹۲۸ء میں منشی پریم چند نے اپنا ہندی ناول کایا کلپ اپنے ہی پریس میں چھاپا۔ اس کا اردو ایڈیشن پردۂ مجاز ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ غبن ہندی میں ۱۹۳۱ء میں اور اردو ترجمہ ۱۹۳۲/۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ میدان عمل ان کا ممتاز ترین ناول ہے۔ یہ بھی پہلے ہندی میں لکھا اور چھاپا گیا (کرم بھومی،

سرسوتی پریس بنارس ۱۹۳۲ء) اور اردو ترجمہ ان کی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۳۶ء میں مکتبۂ جامعہ، دہلی نے شائع کیا ۔ یہ ناول پچھلے پندرہ سال کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی اور حقیقت پسندانہ مطالعہ تھا ۔ گئو دان (ہندی) پریم چند کا آخری ناول ہے، جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۔ سحر ہنگامی نے ان کی وفات کے بعد اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ۔ بعض نقادوں کے نزدیک یہ ان کی بہترین تخلیق ہے اور "جیسی مکمل، جیتی جاگتی اور سچی تصویر دیہاتی زندگی کی انھوں نے اس ناول میں کھینچی ہے، ادب اردو میں ایسی دوسری چیز میسر نہیں (کشن پرشاد کول، ص ۱۷۸، ۱۷۹) ۔ اپنے آخری ایام میں پریم چند نے منگل سوتر لکھنا شروع کیا تھا، مگر صرف چار باب لکھ سکے ۔ یہ نامکمل ناول ہندی میں شائع ہو چکا ہے] ۔

ناولوں کے علاوہ پریم چند کے افسانوں کے گیارہ مجموعے شائع ہوے ہیں ۔ [ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۰۷ء میں ہوا جب زمانہ میں ان کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن شائع ہوئی ۔ ۱۹۳۶ء تک انھوں نے کئی سو کہانیاں لکھیں، لیکن اردو کہانیوں کی تعداد تقریباً دو سو ہے، کیونکہ بہت سی ہندی کہانیاں اردو میں منتقل نہیں ہو سکیں] ۔ پہلا مجموعہ سوز وطن ۱۹۰۷ء میں نواب راے کے قلمی نام سے زمانہ پریس کانپور میں چھپا ۔ اس کی اشاعت پر ان سے سرکاری طور پر باز پرس ہوئی اور اس کے نسخے نذر آتش کر دیے گئے ۔ اس کے بعد انھوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا ۔ دوسرے مجموعوں کے نام یہ ہیں : پریم پچیسی، ۲ حصے (دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۱۴ء)؛ پریم بتیسی، ۲ حصے (دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۲۰ء)؛ پریم چالیسی، ۲ حصے (گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، بدون تاریخ)؛ فردوس خیال (انڈین پریس، الہ آباد ۱۹۲۹ء)؛ خاک پروانہ اور خواب و خیال (مطبوعۂ لاجپت راے اینڈ سنز، لاہور، بدون تاریخ)؛ آخری تحفہ اور زادراہ (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۳۶ء)؛ دودھ کی قیمت (عصمت بکڈپو، دہلی ۱۹۳۷ء)؛ واردات (مکتبۂ جامعہ، دہلی ۱۹۳۷ء) .

دیگر تصانیف میں باکمالوں کے درشن (سوانحی مضامین کا مجموعہ)، کربلا (تاریخی ڈراما) اور رام چرچا (حالات رام چندر جی) قابل ذکر ہیں.

[اردو کا افسانوی ادب جتنا پریم چند سے متأثر ہوا ہے اتنا کسی اور مصنف سے نہیں ہوا ۔ ان کی متعدد تخلیقات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ جہاں تک تحقیق و تنقید کا تعلق ہے]. پریم چند کے بارے میں اردو اور انگریزی میں کم اور ہندی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے .

مآخذ : انگریزی میں: (۱) مدن گوپال : *Prem Chand*، مطبوعۂ لاہور؛ (۲) اندر ناتھ مدان : *Prem Chand*، لاہور ۱۹۴۶ء؛ [(۳) رام بابو سکسینہ : *History of Urdu Literature* (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری، ص ۱۳۸)؛ (۴) شائستہ اکرام اللہ : *A Critical Survey of the Development of Urdu Novel and Short-Story*]؛ ہندی میں : (۵) رام بلاس شرما : پریم چند، مطبوعۂ سرسوتی پریس، بنارس؛ (۶) رام رتن بھٹناگر : پریم چند، الہ آباد ۱۹۳۲ء؛ (۷) جنار دھن جھا : پریم چند کی اپنیاس کلا، ودیا مندر ۱۹۴۱ء؛ (۸) پریم نرائن ٹنڈن : پریم چند، الہ آباد ۱۹۴۲ء؛ (۹) رام بلاس شرما: پریم چند اور ان کا یگ، دہلی ۱۹۵۲ء؛ (۱۰) اندر ناتھ مدان : پریم چند، مطبوعۂ دہلی؛ (۱۱) شیو رانی دیوی : پریم چند گھر میں، مطبوعۂ سرسوتی پریس، بنارس؛ [(۱۲) ہنس، آتم کتھا نمبر]؛ اردو میں : (۱۲) ہنس راج رہبر :

پریم چند، دہلی ۱۹۵۰ء؛ (۱۳) زمانہ، پریم چند نمبر، کانپور ۱۹۳۷ء؛ [(۱۴) کشن پرشاد کول : نیا ادب، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، دہلی؛ (۱۵) عبید اللہ خان : پریم چند، ان کا عہد اور فن، مقالہ براے پی ایچ ۔ ڈی، در کتاب خانۂ جامعۂ پنجاب، لاہور ۔ اس میں مزید مآخذ بھی درج ھیں]۔

(سید وقار عظیم [و ادارہ])

* پزنترن : رکّ بہ پسنترن.

* پسارو وتز: رکّ بہ پشاروتز Požarevac .

* پست : (ف)، غذا کی ایک قسم، جسے غزالوں کی کلیجی اور باداموں وغیرہ کو ملا کر بناتے ھیں ۔ وہ درویش اور دوسرے لوگ جو طویل روزہ رکھتے ھیں، مثلاً چلّہ یا چالیس دن کا روزہ، اس کی ایک پستے کے برابر خوراک روزانہ کھاتے ھیں اور وہ آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ھوتی ھے ۔ [فرھنگ آنند راج میں پست کے معنی ہر قسم کا آٹا عموماً اور بھنا ھوا آٹا (ستّو) خصوصاً لکھے ھیں ۔ سند میں یہ دو شعر پیش کیے ھیں:

منم روی از جہان در گوشہ کردہ
کفی پستِ جوین را توشہ کردہ
(نظامی)

اشک چشمم در دہان افتد کہ افطار از آنک
جز بآب گرم پستی نگزرد در نای من
(خاقانی)]۔

مآخذ: (۱) Vullers : *Lexicon Persico-Latinum*، بذیل مادۂ پست؛ چلّہ؛ [(۲) فرھنگ آنند راج، بذیل مادّہ]۔

(R. Levy)

* پسیر: سلطنت پسیر جنوب مشرقی بورنیو میں واقع اور دریاے پسیر یا کندلو کی وادی پر مشتمل تھی ۔ یہ دریا شمال میں کوتی Kutei کی سرحدوں سے نکل کر جنوب مشرق کا رخ کرتا ھے اور براتس Beratos کے مشرقی کنارے کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ جاتا ھے؛ پھر مشرق کی طرف مڑتا ھے اور ایک دلدلی علاقے سے گزر کر آخر کار آبناے مکسّر میں جا گرتا ھے ۔ یہ ملک رقبے میں تقریباً ۱۱۲۵ مربع کیلو میٹر تھا ۔ [۱۹۳۶ء] تک یہاں اس تمام اراضی پر پرانے جنگل پھیلے ھوے ھیں، جنھیں یہاں کی قلیل آبادی نے دھان کی کھیتی کے لیے درختوں سے صاف نہیں کیا ۔ یہ آبادی زیادہ‌تر پسر میں، جہاں سلطان رہتا تھا یا تنہ گروگوٹ Tanah Grogot میں جہاں سرکاری دفاتر تھے، پائی جاتی تھی ۔ باوجودیکہ کچھ سونا، پٹرولیم اور معدنی کوئلا پسر میں پائے جاتے ھیں، اھل یورپ نے انھیں نکال کر فائدہ نہیں اٹھایا؛ انھوں نے زراعت کی طرف اور بھی کم توجہ دی ۔ ایک یورپی انتظامی اھلکار سب سے اوّل ۱۹۰۱ء میں تنہ گروگوٹ میں دریاے کندلو کے دھانے پر متعین ھوا تھا ۔ اس لحاظ سے سواحل بورنیو پر یہ ریاست اس بات کی ایک اچھی مثال ھے کہ یورپی اثر سے آزاد رہ کر یہاں اسلام نے کیا ترقی کی۔ ریاست کی آبادی [۱۹۳۶ء میں] تقریباً سترہ ہزار تھی اور یہ تین گروھوں پر مشتمل ھے: (۱) دیک (Dayak)، جو دھان کی کاشت سے زندگی بسر کرتے ھیں؛ (۲) جزائر سلاویسی Celebes کے تارک الوطن بنجاری Bandjarese اور بگنی Buginese، جن کے ھاتھ میں تجارت ھے: یہ لوگ خاص طور پر دریا کے دھانے پر میدانی قطعات میں پائے جاتے ھیں؛ (۳) ساحل پر ماھی گیروں کی ایک نسل باجو (Badjos) اپنے دیہات میں رہتی ھے، جو سمندر میں لکڑیاں گاڑ کر بنائے جاتے ھیں۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے قبیلۂ دیک کے نو ہزار افراد میں سے تقریباً چار ہزار نے اسلام قبول کر لیا، باقی پانچ ہزار پہاڑیوں میں رہنے لگے ۔ ان کا کوئی

دین مذہب نہیں - پانچ ہزار بگنی اپنی بڑی تعداد اور خوش‌حالی کے باعث غالب اثر رکھتے ہیں - بارہ سو بنجاریوں کو کم اہمیت حاصل ہے - پسر میں گنتی کے چند ہی یوروپین ہیں اور معدودے چند چینی اور عرب - اس حساب سے نصف آبادی بدیشی ہے؛ لیکن دیک کی طرح یہ باہر والے بھی ملائی نسل کے ہیں اور ایک دوسرے سے میل جول رکھتے ہیں۔

پسر پر سلطان اور اس کے ارکان خاندان کی مطلق العنان حکومت تھی، جس میں رعایا کی کوئی آواز نہیں تھی - سلطان اور اس کے ولی عہد کے ساتھ پانچ عمائد کی ایک مجلس تھی، جس سے سلطان اہم مواقع پر مشورہ کرتا تھا - یہ ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی تھی - یہ ممتاز اشخاص اور شاہی خاندان کے دیگر متعدد افراد جاگیروں کے طور پر جائدادیں رکھتے تھے - ۱۸۴۴ء سے ہر سلطان تخت نشینی کے وقت شرق الہند ولندیزی حکومت سے عہد نامہ کرتا رہا - ۱۹۰۸ء میں انھوں نے اس حکومت کے خراج گزار بن جانے کا اعلان کیا - ۱۹۰۰ء میں اشیاے در آمد و برآمد کے محاصل اور اسی کے ساتھ افیون اور نمک کا اجارہ نقد رقم کے معاوضے میں ولندیزی حکومت کو تفویض کر دیا - معاوضے کی سالانہ مقدار ۱۶۸۰۰ گلڈن gulden تھی، جس میں سے ۱۱۲۰۰ سلطان کو جاتے تھے اور ۵۶۰۰ دوسرے عمائد کو۔

سلطان حسب ذیل محاصل بھی وصول کرتا تھا: جزیہ بالغ مردوں سے؛ دسواں حصہ دھان کے کھیتوں کی فصلوں اور جنگل کی پیداوار سے اور دو ناریل ہر بارآور درخت سے؛ فوجی خدمت اس کے علاوہ تھی۔

[پسر اب جمہوریۂ انڈونیشیا کے صوبۂ کالی منتان کا حصہ ہے]۔

اس ملک کی اسانوی تاریخ سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مطلق العنان حکومت، جو دیک کے لیے بدیشی تھی، مشرقی جاوا سے یہاں داخل ہوئی - حکمران جماعت سے نیچے چھوٹے درجے کے سردار، مذہبی پیشوا، زمیندار، اور آزاد لوگ یہاں کا متوسط طبقہ تھے - اس صدی کے آغاز تک پسر میں غلام اور قرضدار غلام پست طبقے کے طور پر تھے، اگرچہ غلامی بہت پہلے ولندیزی اثر کے ماتحت جزائر شرق الہند کی دوسری ریاستوں میں موقوف کر دی گئی تھی - جیسا کہ دیگر دیک قبائل میں معمول ہے یہاں بھی غلام آزاد آدمیوں کی طرح رہتے سہتے تھے، ہر قسم کے کھیلوں اور تہواروں میں حصہ لیتے تھے، جائداد کے مالک ہو سکتے تھے اور ان کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا - اگر ان کا قرض ان کے آقا کو کوئی دوسرا ادا کر دیتا تو وہ پہلے کو چھوڑ کر اس دوسرے کے پاس آ جاتے - غلام بیچے نہیں جاتے تھے۔

چونکہ مسلم بگینوں، بنجاریوں اور باجوؤں کی معاشرتی حالت پہلے اور جگہ بیان کی جا چکی ہے، لہٰذا ذیل کے ملاحظات بے دین دیکوں اور ان کے مسلمان ہم قوم پسریوں تک محدود ہیں۔

روایت کے بموجب ایک عرب مسمّی توان سید نے پسر کو اسلام سے روشناس کیا - یہاں کے حاکم وقت کی لڑکی سے اس کی شادی نے اس ملک میں اسلام کی ترقی کو بہت تقویت پہنچائی۔

پسریوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کی معاشرتی زندگی صرف سطحی طور پر اسلام سے متأثر ہوئی تھی - ان کی روز مرّہ کی زندگی میں بت‌پرستی اور عالم ارواح کی پرستش کا مشرکانہ عقیدہ عام رہا، مثلاً انسان کی قسمت پر روحوں کے خاص اثر کا پرانا عقیدہ اور ان کی نشانیوں پر یقین - یہ واقعہ بھی معنی خیز ہے

کہ پسر بھر میں صرف ایک مسجد (Missigit) اور چند چھوٹی عبادت‌گاہیں ہیں ۔ مسلمان مولویوں اور حاجیوں کی تعداد بھی کم ہے اور مکّے کے سفر حج کا زیادہ شوق بھی نہیں پایا جاتا۔ اہم موقعوں پر روحوں کی اعانت طلب کی جاتی ہے، اور ایسا خاص کر اس موقع پر کیا جاتا ہے جب پسریوں میں کوئی بیمار پڑ جاتا ہے؛ چنانچہ وہ مشرکوں کی طرح بلیان blian ضیافتیں کرتے ہیں اور ایسی تقریبات جنوبی بورنیو میں بھی منعقد کی جاتی ہیں ۔ اس میں گھنٹیوں اور ڈھولکوں کے بڑے شور اور غل غپاڑے کے درمیان جو دور سے سنا جا سکتا ہے کفّار کے پروہت یا بالیان balian پر روح مسلّط ہو جاتی ہے اور اسی حال میں بیماری کی دوا اسے اِلقا کرتی ہے ۔ پایۂ تخت پسر میں بھی جو مختص طور پر مسلمانوں سے آباد ہے، ان بالیان عاملوں سے مشورہ کیا جاتا ہے؛ صرف ماہ رمضان کے اندر سلطان اس کی ممانعت کر دیتا ہے ۔

پسر کے اعلٰی طبقات میں؛ اب تک خرافی اور مظاہر پرستانہ عقائد کی مقبولیت اس اساطیری افسانے سے عیاں ہے جو ابھی تک لوگوں میں زبان‌زد ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی کے وسط میں یہاں کے سلطان آدم کی عادت تھی کہ سال کے چند دنوں میں روحوں کے پہاڑ ''گُنُنگ ملکت'' Gunung Melikat پر تنہا رہتا تھا ۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں اس نے کسی جنیّہ سے شادی کر رکھی تھی، جس سے ایک لڑکا تِینڈَک نامی پیدا ھوا جو آپ اپنے کو غائب کرنے کا ملکہ رکھتا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکا جزیرۂ مادورا میں رہتا تھا، جہاں اس نے ایک جن شہزادی سے شادی کر لی تھی ۔ وہ وقتاً فوقتاً پسر میں نمودار ھوتا اور اس کے نام کی قربانی چڑھا کر بڑی ضیافت دی جاتی (قدیم زمانے میں انسان کی قربانی بھی چڑھاتے تھے) ۔ یہ ضیافتیں اب بھی کبھی کبھی دی جاتی ہیں، خصوصاً اس غرض سے کہ ملک کو کسی مصیبت یا بیماری سے نجات دلائی جائے ۔ موضع بسوئی میں تندنگ کے لیے ایک مکان بنایا گیا ہے، جس کی چھت کے تین حصے ہیں اور ایک لمبی بَلّی پر قائم کی گئی ہے اور اس طرح کبوتر خانے سے مشابہ ہو گئی ہے ۔

مذہبی پیشواؤں کی آمدنیاں اس رقم پر مشتمل ہوتی ہیں جو وہ ماہ صیام کے آخر میں زکوٰۃ اور ''پطرہ'' (=فطرہ) کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں ۔ ہر شخص حسب استطاعت دیتا ہے ۔ رؤسا اس میں کوئی دباؤ نہیں ڈالتے ۔ مولوی ملاّ کو شادی یا طلاق کے موقع پر تھوڑا سا نذرانہ بھی ملتا ہے ۔

تقویم، جو ریاست میں آج کل عام طور پر رائج ہے، اسلامی ہے ۔ دوسرے مقامات کے دیکوں کی طرح یہاں بھی کھیتوں کی جتائی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک خاص جھمکا (مجمع نجوم) آسمانوں میں دکھائی دیتا ہے ۔

پسریوں کی عائلی زندگی کسی حد تک اسلامی رسوم کے مطابق مرتّب ہو گئی ہے ۔ اسلام کے ماننے والوں میں شادی کسی مذہبی پیشوا کے توسط سے اور باپ یا کسی ولی کے ذریعے انجام پاتی ہے، لیکن پہلے بہت معقول مہر کے متعلق کوئی اقرار نامہ ہو جاتا ہے ۔ یہ دلہن کے والدین کو دیا جاتا ہے ۔ وہ خود اس کا صرف تھوڑا سا حصّہ پاتی ہے ۔ دیک رواج کے مطابق نوجوانوں کو شادی سے قبل بہت آزادی سے ملنے کی اجازت ہے ۔ اپنا گھر بنانے سے پیشتر دولھا کم از کم ایک سال اپنی سسرال میں رہتا ہے ۔ طلاقوں کی کثرت ہے کیونکہ نکاح کی بات چیت کے وقت فقط والدین کی مرضی چلتی ہے اور عورت کی خواہشات پر شاذو نادر توجہ کی جاتی ہے ۔ مرد اور عورت شادی

کے بعد اپنی اپنی جائداد پر بدستور قابض رہتے ہیں؛ طلاق کے بعد یہ خاندان کو واپس کر دی جاتی ہے ۔ شادی کے درمیان حاصل کی ہوئی جائداد دو برابر حصوں میں شوہر اور بیوی کے درمیان تقسیم کر دی جاتی ہے ۔ ایک یا دوسرے کی موت کے بعد پسماندہ تمام کا وارث ہو جاتا ہے ۔ مسلمانوں کی تجہیز و تکفین اسلامی رسوم کے مطابق ہوتی ہے ۔

مآخذ: (۱) *Beschrijving* : A.H.F.J. Nusselein *van het landschap Pasir*، در BTLV، ۱۹۰۵ء۔

(A.W. Nieuwenhuis)

⊗ **پَسْرُور**: ضلع سیالکوٹ (مغربی پاکستان) کا پرانا شہر، جو سیالکوٹ سے سولہ میل جنوب میں نارووال سے ہوتی ہوئی امرتسر (بھارت) کو جانے والی شاہراہ پر واقع ہے ۔ کہا جاتا ہے اسے شاہنشاہ بابر کے زمانے میں ایک باجوہ جاٹ منکہ پسر بندو نے آباد کیا تھا، جس نے بالآخر مرتے وقت اسے ایک برہمن پروہت پرس رام کو دے دیا ۔ اس کے نام کی مناسبت سے یہ پرسرور کہلایا، جو بعد میں پسرور ہو گیا (*Gazetteer of the Sialkot District*، ص ۱۷۳ و ۱۳، ۲۷) ایک زمانے میں اس شہر کی بڑی اہمیت تھی ۔ اس کی پرانی اور پر رونق آبادی کے آثار شہر اور نواح میں اب بھی باقی ہیں ۔ ان میں ایک تالاب بھی ہے، جو شاہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بنا تھا ۔ اس میں نالہ ڈیک کا پانی ڈالا جاتا ہے ۔ اسی غرض سے داراشکوہ نے ایک نہر بھی بنوائی تھی ۔ نہر اور اس کے پل کے آثار اب بھی موجود ہیں ۔ پسرور میں ایک مشہور صوفی میاں برخوردار کا مزار ہے، جس کی زیارت کے لیے اکثر لوگ ماہ محرم میں آتے ہیں ۔ یہ مزار حضرت امام علی الحقؒ نے بنوایا تھا، جن کا اپنا مزار سیالکوٹ میں مرجع عوام ہے ۔ شمالی جانب ٹیلے کے اوپر کسی بزرگ کی قبر ہے، جو ''مہر منکا کی ماڑی'' کہلاتی ہے ۔

قدیمی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ پسرور کا پانی کھاری ہے؛ بقول دلشاد:

شورِ ملاحتش ہمہ پنجاب را گرفت
دلشاد پرسرورِ تو دارد نمک در آب

(دیوان دلشاد پسروری، مخطوطہ، ۱۳۶۴ / ۴۰۱۴، دانشگاہ پنجاب لاہور، ص ۲۹ ب) اور اب بھی یہی حالت ہے ۔ اس دیوان میں (ص ۳۷ ب) مدح پسرور پر ایک نظم بھی موجود ہے، جس کا مطلع ہے:

شہر ما پرسرور می گویند
کانِ علم و شعور می گویند

اکثر مقامات کو جانے والی سڑکیں یہاں سے گزرتی تھیں ۔ اس لیے پرانے زمانے میں اسے تجارتی منڈی کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے ۔ یہاں کی میونسپل کمیٹی ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی تھی ۔ اس وقت یہ ضلع میں دوسرے درجے کا شہر ہے ۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

* **پَسَنْتَرِن**: (= پزنترن)، جاوی زبان میں بمعنی ''سنتری کی جگہ''، جاوا اور مادورا کے جزیروں میں دینیات کے طلبہ کی تربیت گاہ (سنتری)، مادوری زبان میں ''پنجنترن''، سونڈا کی زبان میں عموماً ''پندک'' یعنی مدرسے کے طلاب کی قیام گاہیں (پندک جانا = پسنترن میں حاضری دینا) ۔ مجمع جزائر شرق الہند کے تمام مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم (یعنی قرآن مجید پڑھنا اور فرائض دین کا علم) ایسے مدرسین دیتے ہیں جو اپنے کو انہیں مضامین تک محدود رکھتے ہیں ۔ جاوا اور مادورا کے زیادہ بڑے دیہات اور شہروں میں ایسے معلم بھی ہیں جو شاگردوں کو کسی مسجد میں یا اپنے گھر میں یا کسی خاص عمارت میں جمع کر لیتے ہیں ۔ اگر ان کی شہرت زیادہ ہو جاتی ہے تو ایسا

اکثر ہوتا ہے کہ طلبہ دور دور سے آنے لگتے ہیں، اور کچھ مدت تک وہیں رہ کر ان کی تعلیم سے بہرہ‌اندوز ہوتے ہیں۔

لیکن پسنترن اعلیٰ دینی تعلیم و تربیت کے ادارے ہیں - یہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جب گاؤں کے باہر الگ نہیں بنائے جاتے تو بھی گاؤں کا کم از کم علیحدہ محلّہ بن جاتے ہیں - جاوی والیانِ ملک وقتاً فوقتاً ایسے فرامین جاری کرتے رہے ہیں جن میں بعض دیہات کو ''معافی'' قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ لگان اور خدمات جو سرکار ان سے لیتی وہ دائماً ان معلّموں کا حق ہو جاتی ہیں جنھوں نے وہاں پسنترن قائم کر رکھے ہیں - کئی دیندار افراد نے بھی ایسے مدرسوں کے لیے اوقاف قائم کر دیے ہیں - دوسرے پسنترن ایسے نجی ادارے ہیں جن کی ابتدا کسی عالم شخص کے اقدام کی رہینِ منت ہے جو خود تعلیم دینے لگا ہو - اسی لیے ان کا قیام اور ترقی و تنزل اس معلّم کی شخصیت اور اس کے مبلغ علم کے بارے میں لوگوں کی رائے سے وابستہ ہوتی ہے، بلکہ وہ پسنترن بھی جن کے لیے با ضابطہ طور پر وقف موجود ہیں ان عوامل سے متأثر ہوتے ہیں۔

پسنترن میں پہلے تو معلّم اور اس کے معاونوں کے مکانات ہوتے ہیں، پھر درس کے کمرے، ایک مسجد، شاذ و نادر ایک جامع مسجد، طلبہ کے حجرے (پندک pondok) اور چاول رکھنے کی کوٹھیاں - یہ سب مل کر خاصی بڑی جگہ گھیرتے ہیں - صرف اقامت خانے کی ایک مخصوص طرز تعمیر ہوتی ہے، جو اور عمارتوں میں نہیں پائی جاتی - یہ ایک چوکور عمارت عام مسالوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے - اندرونی حصّے کو دو دیواروں کے ذریعے تین لمبے اور تقریباً برابر عرض کے حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے - ان میں بیچ کا حصّہ راستے کا کام دیتا ہے اور عمارت کے ایک سرے سے دوسرے تک چلا جاتا ہے - بازووں کے دونوں حصّوں میں رہنے کے کمرے ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو اوٹوں کی مدد سے یکساں ناپ کے حجروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے - پندک کا دروازہ باہر کی چھوٹی دیواروں میں سے ایک کے وسط میں ہوتا ہے اور راستے کے اندر کھلتا ہے - جب کوئی اندر جاتا ہے تو دائیں اور بائیں صرف سادہ دیواریں دکھائی دیتی ہیں، بعد ازاں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دیواروں میں بہت نیچے اور چھوٹے چھوٹے دروازے رکھے گئے ہیں - جو اسی مسالے کے بنے ہوتے ہیں جس کی یہ دیواریں ہیں، ان سے حجروں کے اندر داخل ہوتے ہیں - یہ چھوٹے چھوٹے دروازے دونوں دیواروں میں یکساں فاصلے پر ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر دو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوتے ہیں - حجروں میں باہر کی طرف سے روشنی چھوٹی کھڑکیوں سے آتی ہے جو دیوار میں ہوتی ہیں - حجروں کی چھتیں اس قدر نیچی ہوتی ہیں کہ مکین صرف بیٹھ سکتا یا فرش پر لیٹ سکتا ہے، کیونکہ طالب علم [عموماً] لیٹ کر مطالعہ کرتے ہیں - ایک حجرے میں کئی طلبہ رہتے ہیں - بہت مقبول پسنترنوں میں دارالاقامۃ دو منزلہ بھی ہو سکتے ہیں - طلبہ کی تعداد چند سو تک ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے بہت تھوڑی ہو - ایسے سینکڑوں پسنترن موجود ہیں - ہر دارالاقامۃ میں کوئی پرانا طالب علم یا چھوٹے درجے کا معلّم ضبط و نظم قائم رکھتا ہے - صدر اقامت خانہ اتالیق کا کام بھی کرتا ہے اور اپنے زیر نگرانی طلّاب کا ہر طرح ہاتھ بٹاتا ہے - بعض پسنترنوں میں عورتیں بھی تعلیم حاصل کرتی نظر آتی ہیں، لیکن یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے کہ وہ ان میں رہیں بھی۔

پسنترنوں کی اپنی خاص طرز زندگی ہے ۔ صبح ہونے سے پہلے ہی بڑی گہما گہمی ہونے لگتی ہے ۔ فجر کی نماز معلم خود پڑھاتا ہے ۔ نماز کے بعد ''ذکر'' ہوتا ہے ۔ پھر درس شروع ہو جاتے ہیں ۔ معلّم مبتدیوں کو ایک ایک کر کے پڑھاتا ہے اور سبق کے بعد وہ اقامت خانے کو واپس چلے جاتے ہیں ۔ یہاں وہ پڑھا ہوا سبق خود یا اونچے درجے کے کسی طالب علم یا صدر پندک کی مدد سے دوپہر تک دہراتے ہیں ۔ پھر طلبہ دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں ۔ ہر اقامت خانے کے ''سنتری'' کا ایک جگہ کھانا ہوتا ہے ۔ عملاً یہی ایک وقت کا کھانا ان کی خوراک ہے ۔ پھر سب مسجد کو ظہر کی نماز کے لیے چلے جاتے ہیں ۔ وہ دن بھر میں تین اور نمازوں کے لیے بلائے جاتے ہیں ۔ ان کے درمیان کے وقفے درس اور مطالعے میں صرف ہوتے ہیں ۔ زیادہ اونچے درجے کے طالب علموں کو معلّم اکھٹا پڑھاتا ہے ۔ وہ خود عربی متن پڑھتا ہے، اس کا ترجمہ کرتا ہے اور ضروری تشریح کرتا جاتا ہے ۔ عشا کی نماز کے بعد دن کا کام ختم ہو جاتا ہے اور طلبہ سونے کے لیے چلے جاتے ہیں ۔ بعض طلبہ (سنتری) اب بھی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، جس سے انھیں کچھ آمدنی ہو جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر میں یہ کام بھی رُک جاتے ہیں اور سارے میں سکوت چھا جاتا ہے ۔ جمعے کے روز اس یکساں معمول میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے ۔ سب کے سب قریب ترین مسجد جامع میں صلاۃ الجمعة ادا کرنے جاتے ہیں ۔ فصل کاٹنے کا زمانہ بھی طلبہ کے لیے مصروفیت کا وقت ہوتا ہے ۔ وہ دہقان کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں یا زکوٰۃ جمع کرنے چلے جاتے ہیں ۔ بہت سے طلبہ رمضان المبارک کے مہینے میں گھر چلے جاتے ہیں ۔

پسنترنوں میں مطالعے کا مقدّم مضمون فقہ ہے ۔ یہاں وہی عربی کتابیں استعمال ہوتی ہیں جو اور شافعی ملکوں میں رائج ہیں ۔ ان کے علاوہ جاوی تصنیفات کی بھی ایک بڑی تعداد متداول ہے ۔ وہ کتابیں جو عربی مآخذ پر یا عربی سے لی گئی دینی تصنیفات پر مبنی ہیں، ''کتاب'' کہلاتی ہیں ۔ پسنترنوں میں جاوی زبان بولی جاتی ہے ۔ سونڈانی بولنے والے اضلاع (مغربی جاوا) میں جاوی تصانیف کی جگہ سونڈانی تصنیفات روز بروز زیادہ لے رہی ہیں ۔ فقہ کے علاوہ اصول دین کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اس معاملے میں کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں کی جاتی اور نہ رائج تصنیفات صرف شافعیوں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں ۔ راسخ العقیدہ نوع کے تصوّف کا مطالعہ کم کیا جاتا ہے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ تصوّف کی ایک مقبول عام شکل ''ہمہ اوست'' کی ہلکی سی جھلک لیے ہوئے موجود ہے، لیکن پسنترنوں میں اس کی تعلیم بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے ۔ طالب علم فقہ کی بڑی کتاب کو، جو اس کے مطالعے میں رہی ہو، کتاب پیکہ Pĕkih [= فقہ] کہتا ہے اور اس کی مزید صراحت نہیں کرتا (وہ مشکل سے اس کا نام جانتا ہے) اور اصول دین کی کتاب کو ''کتاب اصول'' کہنے پر اکتفا کرتا ہے ۔ فرائض مذہبی اور اصول دین پر ابتدائی تعلیم کی کتابیں بھی ''کتاب اصول'' کہلاتی ہیں ۔

طریق درس بھی پسنترن کے ساتھ مخصوص ہے ۔ جب طالب علم ابتدائی درسی کتابیں ختم کر لیتا ہے تو اس کو زیادہ اہم عربی متون سے روشناس کرایا جاتا ہے ۔ وہ انھیں اس معلّم کی نگرانی میں جملہ بجملہ پڑھتا ہے جس نے خود بھی شاید عربی کا کبھی اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا ہوتا اور جو اعراب کے معاملے میں صرف اپنے

حافظے پر اعتماد کرتا ہے ۔ معلم جملے کا جاوی زبان میں ترجمہ اور مطلب بیان کرتا جاتا ہے ۔ آخر کار طالب علم اس حد تک ترقی کر جاتا ہے کہ آسان متون کا عربی سے جاوی میں ترجمہ کر لیے (TBGKW، ۳۱ (۱۸۸۶ء) : ۵۱۸ ببعد، میں ایک فہرست ان کتابوں کی دی ہوئی ہے جو اس وقت سب سے زیادہ رائج تھیں) ۔ اس میں بڑا وقت لگتا ہے؛ تاہم یہ دیکھ کر کہ طالب علم کا علم بالاستقلال بڑھ رہا ہے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے، نیز یہ پر لطف احساس کہ وہ متون کو ان کی اصلی زبان میں پڑھنے کے قابل ہو گیا ہے طالب علم کے سمند شوق کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے ۔ لیکن مکۂ معظمہ اور حضرموت کے زیر اثر اس طریقے کی جگہ رفتہ رفتہ ایک دوسرا طریقہ لیتا جا رہا ہے جو عربی صرف و نحو سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ یقیناً زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے ، لیکن دشواری یہ ہے کہ عربی کا سیکھنا کسی انڈونیشیا والے کے لیے اتنی مشکلات پیدا کر دیتا ہے کہ بہت سے طلبہ عربی کتابیں پڑھنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی همت ہار بیٹھتے ہیں ۔

پسنترنوں میں مطالعہ بالکل مفت ہے ۔ سندیں نہ تو طلب کی جاتی ہیں اور نہ دی جاتی ہیں ۔ طالب علم اپنی مرضی سے آتا اور چلا جاتا ہے ۔ اکثر طلاب کی ابتدائی تعلیم پسنترن میں داخل ہونے سے پہلے گھر پر ہو چکتی ہے ۔ علم دین کے حصول کا ذوق و شوق، دولتمند اور سرکردہ خاندانوں میں یہ خواهش کہ اپنے کسی بیٹے کو دین کے مطالعے میں منہمک دیکھیں اور بعض دوسروں کی یہ امید کہ اس طرح وہ وجہ معاش حاصل کر سکیں گے، نوجوانوں کو پسنترن میں لے آتی ہے ۔ طلبہ کوشش کرتے ہیں کہ کئی معلموں کے درس میں شرکت کریں ۔ ہر معلم اپنے مخصوص موضوع پر درس دیتا ہے، اسی لیے طلبہ ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں جاتے رہتے ہیں حتی کہ بعض تو واقعی تمام عمر طلب علم کے لیے سفر کرتے رہتے ہیں ۔ بعض جب یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے خاصا علم حاصل کر لیا ہے تو کہیں (لیکن اپنے ضلعوں میں نہیں) بحیثیت معلّم سکونت پذیر ہو جاتے ہیں، یا کسی پسنترن میں نائب معلّم بن جاتے ہیں اور یا ''آزاد اہلِ علم'' رہنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ کوئی ایسا محکمہ نہیں جس کے لیے کسی پسنترن کی تعلیم ملازمت کی شرطِ اوّل ہو ۔ علماے دین عموماً ہر اس چیز سے بیزار ہیں جو سرکاری ہو یا حکومت سے تعلق رکھتی ہو، لیکن مسجد کے بڑے اہلِ خدمت معمولاً کسی نہ کسی پسنترن میں کچھ مدت تک تعلیم پا چکے ہوتے ہیں ۔

یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیم دینے کی کوئی مقررہ یا طے شدہ اُجرت لی جائے، تاہم اکثر معلّم خوش حال ہیں ۔ اس خیال سے کہ وہ باعثِ برکت ہیں، خوش عقیدہ لوگ ان کو بڑے بڑے نذرانے دیتے رہتے ہیں ۔ مذہبی تقریبات میں، جو جاوی زندگی میں بکثرت ہوتی ہیں، معلم بہت ہی بابرکت مہمان ہوتا ہے ۔ سب لوگ سب موقعوں پر اس کی علمیت کی طرف رجوع کرتے یا اس کی شفاعت کے آرزومند ہوتے ہیں اور ان درخواستوں کے ساتھ نذرانے پیش کیے جاتے ہیں ۔ طلبہ اگر مستطیع ہیں تو داخلے کے وقت اپنی طرف سے نذر دیتے ہیں ۔ خوش‌حال والدین کے بچے جب گھر جاتے ہیں تو واپسی میں تحائف لاتے ہیں اور نادار طلبہ معلّم کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں ۔

بیشتر طلبہ نادار ہوتے ہیں اور در اصل خیرات و صدقات پر بسر کرتے ہیں ۔ خاص خاص ایام میں وہ ضلع کے چاروں طرف نکل جاتے ہیں ۔ ان کا

آنا وبال جان نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کی اعانت بلا تامّل کی جاتی ہے، کیونکہ وہ مقدس تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور انہیں دینا باعث برکت ہوتا ہے۔ کھیت میں کام کرنے اور قرآن حکیم کے نسخوں کی کتابت وغیرہ کی طرح کے کاموں سے بھی انہیں کچھ تھوڑا بہت مل جاتا ہے، جو ان کی کم خرچ زندگی کے لیے کفایت کرتا ہے۔ مستعمراتی حکومت کو [مراد ولندیزی حکومت سے ہے، جو اب ختم ہو چکی ہے] پسنترنوں سے صرف اتنا سروکار تھا کہ وہ ان پر عام نگرانی رکھتی تھی۔ نئے پسنترنوں کے قیام کی اطلاع حکام کو دی جاتی ہے اور صدر مدرسہ کو ایک رجسٹر رکھنا پڑتا ہے، جس میں طالب علموں اور درسی کتابوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔

یورپی طرز کے مدارس کی کثرت نے زمانۂ حال میں پسنترنوں پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ مذہبی تعلیم صرف پسنترن دے سکتے ہیں، کیونکہ [ولندیزی حکومت کے زمانے سے جو] پبلک سکول قائم کیے گئے وہ یہ تعلیم بالکل نہیں دیتے۔ اس کے برعکس وہ لوگوں کو روز مرہ زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے نجی مدارس کو ترقی ہو رہی ہے جو یہ دونوں کام انجام دیں۔ یہ ''مدرسے'' کہلاتے ہیں اور ان کا مقصد سب طرح کے لوگوں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ ان مدرسوں کے ساتھ اعلٰی تعلیم کے سکول منسلک ہیں، جن میں مذہبی تعلیم کو نمایاں حصہ دیا جاتا ہے۔ ان سکولوں کی بنیاد اس طبقے کے لوگوں کی بدولت پڑی جن پر جدید خیالات کا اثر پڑ چکا ہے؛ لہٰذا ان کا طریق تعلیم یورپی نمونوں سے لیا گیا ہے، لیکن ان کی وسعتِ نظر کسی طرح قدیم پسنترنوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ''مدرسہ'' کا لفظ مصر یا شاید عرب سے مأخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیم کے ماسوا مدارس کی تنظیم بالکل سرکاری سکولوں کے نمونے پر کی گئی ہے۔

منِنگ کباؤ Minangkabau ملائیوں کے ملک (یعنی وسطی سماترا) میں ایسی دینی درس گاہیں ہیں جو بحیثیت مجموعی پسنترن سے مشابہ ہیں۔ انہیں سوراؤ Surau کہتے ہیں۔ یہ نام ابتدائی سکولوں، عبادت گاہوں، مردانے مکانوں کو بھی دیا جاتا ہے، اور ادارے کی الگ الگ عمارتیں بھی ''سوراؤ'' کہلاتی ہیں۔ طلبہ کے مکانات حجروں میں منقسم نہیں ہوتے بلکہ ان میں مقیم طلبہ کے درس اور سونے کا کمرہ مشترک ہوتا ہے۔

اچیے [رکّ بآں] میں بھی ایسی درس گاہیں ہیں جو جاوی درسگاہوں کی ہم پلّہ ہیں، البتہ یہاں صرف وہ طریق تعلیم رائج ہے جسے جاوا میں جدید کہا جا سکتا ہے۔ وہاں ملائی زبان جاوی کی جگہ لے لیتی ہے؛ اسی لیے اچیے میں اس زبان کا جاننا طلبہ کے لیے لابدی ہے۔ طلبہ کی قیام گاہیں (رَنگ کَنگ rang kang) بالکل اسی نقشے پر بنی ہوتی ہیں جو جاوا کے دارالاقامة (پندوک pondok) کا ہوتا ہے؛ جس طرح پورے پسنترن کو پندوک بھی کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح اچیے میں رنگ کنگ کے نام کا اطلاق تمام ادارے پر بھی ہوتا ہے۔ [اس مقالے میں جو معلومات ہیں وہ ۱۹۳۶ء تک کی ہیں]۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: *De Atjehers*، بٹاویا ۱۸۹۴ء، ۲: ۱ ببعد؛ (۲) وہی مصنف: *Der Islam in Nederlandsch-Indië*، در *Gesammelte Schriften*، ۴/ ۲: ۳۷۷ ببعد؛ (۳) *De masdjids in inlandsche godsdienstscholen in de Padangsche bovenlanden*، در *IG*، ۱ (۱۸۸۸ء): ۳۱۸ ببعد۔

(R. A. Kern)

پشاروتز: Požarevac (ملفوظ Posharevatz؛ فرانسیسی املا Pojarévatz، Passarovitz؛ ترکی پساروفچه کی طرح ایک تصحیف ہے)، یوگوسلاویا میں ضلع (= بانات) ڈینیوب کا ایک ترقی پذیر تجارتی قصبہ ـ یہ اسی نام کے ضلع کا صدر مقام ہے اور موراوہ Morava اور ملاوہ Mlava کے درمیان کے زرخیز ہموار خطّے میں دبراویکا Dubravica کی ڈینیوبی بندرگاہ سے صرف دس میل کے فاصلے پر واقع ہے ـ ۱۹۳۰ء میں اس کی آبادی ۱۳۷۳۱ تھی ـ اس قصبے کا ذکر، جس کا نام عام طور پر سربی کرواتی Serbo-Croat لفظ požar (= آگ) سے متعلق بتایا جاتا ہے (*Kneževina Sribija*: M.D. Milićević، بلغراد ۱۸۷۶ء، ص ۱۷۲ و ۱۰۵۸))، سب سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب آتا ہے، مگر یہ یقیناً پہلے سے موجود ہوگا اور ۱۴۵۹ء میں گردو پیش کے علاقے کی طرح ترکی کے زیر نگیں ہو گیا ہوگا ـ ترکی خزانے کے دفاتر متعلقہ ہنگری، بابت ۱۵۶۰ء، کے مطابق (A. Velics : *Magyarországi török kincstari defterk*، بوڈاپسٹ، ۱۸۹۰ء، ص ۳۴۷) یہ بستی سمندرہ (Semendria، Smederevo) کی ترکی سنجاق میں داخل تھی اور سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں حاجی خلیفہ اسے ایک قاضی کا مستقر (قاضی لِق) بیان کرتا ہے (قبّ *Spomenik*، ج ۱۸، بلغراد ۱۸۹۲ء، عمود ۲۶) ـ اس صدی کے خاتمے کے قریب بہت سے سربیوں نے پشاروتز سے ہجرت کی ـ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بعض اوقات اس کا ذکر ایک گاؤں کے طور پر ملتا ہے ـ

پشاروتز کی شہرت اس صلح نامے کی مرہون منت ہے جس کی وجہ سے ۱۷۱۶ تا ۱۷۱۸ء کی جنگِ ترکیہ و آسٹریا کا خاتمہ ہوا ـ ۱۷۱۴ء کے اختتام پر ترکی وینس کے خلاف اس وجہ سے اعلانِ جنگ کر چکا تھا کہ صلح نامۂ کارلوونز Carlovitz کی پابندی نہیں کی جا رہی تھی اور ۱۷۱۵ء میں اس نے مورا اور چند جزائر ارخبیل (Ionian Islands) پر قبضہ کر لیا ـ آسٹریا، جو ابتدا میں وینس کے ایک حلیف کی حیثیت سے مصالحت کے لیے بیچ میں پڑا تھا، ۱۷۱۶ء میں خود بھی میدان میں آ گیا اور اس کی فوج نے شہزادۂ یوجین کی قیادت میں پٹرو واردین، تمسوار اور بلغراد میں تین بڑی کامیابیاں حاصل کیں ـ اس پر انگلستان صلح کرانے کی غرض سے بیچ میں پڑا ـ طویل تیاریوں کے بعد (قبّ GOR : von Hammer بار دوم، ۴ : ۱۵۹ تا ۱۶۴) مؤتمر پشاروتز منعقد کی گئی ـ گفت و شنید، جس میں ترکی، آسٹریا، وینس کے وکلاے مختار نے حصہ لیا اور جس میں انگلستان اور ہالینڈ ثالث تھے، ۵ جون ۱۷۱۸ء کو شروع ہوئی اور ۲۱ جولائی کو صلح نامے پر دستخط ہوگئے ـ

صلح نامہ اس بنیاد پر طے ہوا کہ جو علاقہ اس وقت دونوں حریفوں کے ہاتھ میں تھا وہ انھیں کے حوالے کر دیا جائے؛ چنانچہ مشرقی حصۂ سیرمیہ، تیمسوار اور اس کا پورا ضلع (بانات Banate)، تمام شمال مشرقی سربیا مع بلغراد، پشاروتز وغیرہ اور افلاق کوچک آسٹریا کے پاس رہے، وینس کے پاس بھی دلماتی اور البانی ساحلوں کے وہ چند مقامات باقی رہے جو اس نے لے لیے تھے ـ اسے چند تجارتی رعایتیں اور جزیرۂ چوقہ (Cerigo) بھی مل گیا، لیکن اسے تمام جزیرہ نماے مورا اور ہرسک (Hercegovina) کے جنوب مشرقی اضلاع ترکی کو واپس کرنا پڑے ـ ایک تجارتی معاہدے کی رو سے، جو ۲۷ جولائی کو پشاروتز ہی میں طے پایا، آسٹریا کو دولت عثمانیہ میں بعض تجارتی اور دوسری مراعات حاصل ہوگئیں ـ

کسی معاہدۂ صلح کے طے ہونے کے بعد جو مراسم ادا کیے جاتے ہیں ان کے مطابق پہلا ترکی وکیل مختار ابراہیم پاشا مع اپنے خدم و حشم کے ویانا گیا اور گفت و شنید میں آسٹریا کا وکیل کاؤنٹ ورمونٹ Wirmont قسطنطینیہ آیا ۔ ترکی سفارت کے ایک رکن نے ۱۷۲۶ء میں ایک دلچسپ روداد لکھی تھی، جسے Fr. van Kraelitz نے متن اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے (*Bericht über der Zug des Gross-Botschafters Ibrahim Pascha nach Wien im Jahre 1719*، در *SBAk. Wien*، ج ۱۵۸ (۱۹۰۸ء)؛ در *TOEM*، ۷ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳-۱۹۱۴ء) : ۲۱۱ تا ۲۲۷، اس اشاعت کا ترکی متن اسے ۔ رفیق نے دوبارہ طبع کیا).

آسٹروی قبضے (۱۷۱۸ تا ۱۷۳۹ء) کے دوران میں پشاروتز اس علاقے کا سب سے اہم مقام تھا ۔ ترکی کے خلاف سربیا کی جنگ آزادی میں اس کا عرصے تک محاصرہ رہا اور بالآخر اسے سربیوں کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے (۱۸۰۴ء) ۔ ۱۸۱۳ء میں یہ شہر دوبارہ ترکوں کے ہاتھ آ گیا، لیکن ۱۸۱۵ء میں پھر سربیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

اس کے بعد جو امن کا دور آیا (۱۸۱۵ تا ۱۹۱۵ء) اس میں پشاروتز ترقی کرتا گیا ۔ شہزادہ میلوس Milos نے ۱۸۲۵ء میں اسے اپنا دوسرا مستقر بنایا اور وہاں دو قصر (قوناق) بنوائے ۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ایک پروشیائی Prussian افسر اس شہر میں آیا، اور اس نے وہاں کے حالات پر ایک دلچسپ یادداشت چھوڑی (Otto. v. Pirch : *Reise in Serbein im Spätherbst 1829*، برلن ۱۸۳۰ء، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۱) ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں آبادی برابر بڑھتی رہی، لیکن اور کسی لحاظ سے ''یہاں کوئی دلچسپی کی بات نہیں تھی'' (F. Kanitz : *Serbien*، لائپزگ ۱۸۶۸ء، ص ۱۳).

بیسویں صدی کے آغاز میں پشاروتز سربیا کے اہم ترین قصبوں میں شمار ہوتا تھا ۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جرمنوں نے ۱۹۱۵ء میں اس پر قبضہ کر لیا اور پھر یہ (اکتوبر ۱۹۱۶ء سے) بلغاریوں کے قبضے میں رہا، لیکن ۱۹۱۸ء کے جاڑوں میں اس پر پھر سربیوں کا قبضہ ہو گیا ۔ اس وقت سے یہ یوگوسلاویا میں شامل ہے ۔

مآخذ: (متن میں درج حوالوں کے علاوہ) : (۱) V. Bianchi (صلح کی گفت و شنید میں وینس کا وکیل مختار) : *Istorica relazione della pace di Posaroviz*، پیڈوا Padua ۱۷۱۹ء؛ (۲) عبدالرّحمٰن شرف: تاریخ دولت عثمانیہ، ۲ (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) : ۱۳۰ تا ۱۳۷؛ (۳) G. Noradounghian : *Recueil d'actes internationaux de l'empire ottoman*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۶۱ تا ۶۲ (عدد ۳۰۸ و ۳۰۹)، ۲۰۸ تا ۲۱۶ (آسٹریا کے ساتھ صلح نامہ کا لاطینی متن)، ۲۱۶ تا ۲۲۰ (فرانسیسی میں اس کا خلاصہ)؛ (۴) Drag. M. Pavlović : *Požarevački mir (1718. g)*، در *Letopis matice srpske*، Novi Sad ۱۹۰۱ء، ۲۰۷ : ۲۶ تا ۴۷ و ۲۰۸ : ۴۵ تا ۸۰ (معاہدۂ پشاروتز کا ایک اچھا تاریخی مطالعہ)؛ (۵) V. Popović، در *Naronda enciklopedija*، ۳ (زغرب ۱۹۲۸ء) : ۴۲۸؛ (۶) *Almanah Kraljevine Jugoslavije*، زغرب ۱۹۳۰ء، ۱ : ۶۱۵؛ (۷) M. A. Purković : *Požarevac*، پشاروتز ۱۹۳۳ء (اس شہر اور اس کی تاریخ پر ایک مخصوص تصنیف کی پہلی کوشش).

(Fehim Bajraktarević)

پشاور: تاریخ: تاریخ میں وادی پشاور کا ذکر پہلے پہل وہاں ملتا ہے جہاں اسے ریاست گندھارا کا ایک حصہ بتایا گیا ہے، لیکن قدیم دور کی تاریخ ابھی تک تاریکی میں ہے ۔ سکندر

کے حملے کے بعد اس کے حالات سے تاریکی چھٹنے لگتی ہے - ۳۲۶ ق م میں سکندر کی فوجیں دو الگ الگ راستوں سے دریائے سندھ تک پہنچی تھیں : ایک درۂ خیبر سے ہو کر اور دوسری خود سکندر کی رہبری و سرکردگی میں کُنڑ سے باجوڑ سے سوات سے بنیر ہوتی ہوئی گئی - یونانیوں کے اس پہلے حملے نے بھی پشاور پر اپنے اثرات قائم نہیں کیے، نہ کچھ آثار چھوڑے، البتہ سکندر کی واپسی کے بعد یہ وادی چندرگپت کی فرمانروائی میں شامل ہوگئی (۳۲۱ تا ۲۹۷ ق م) - پھر چندرگپت کے پوتے اشوک کے عہد میں بدھ مت پھیلتے پھیلتے کشمیر، پشاور اور کابل تک پہنچ گیا - اس کے بعد وقفے وقفے سے یونانیوں، برھمنوں، ساسانیوں اور آخر میں پھر ہندووں کا تسلّط قائم ہوتا رہا، جو ساتویں صدی عیسوی تک چلا۔

ساتویں صدی عیسوی کے اختتام سے کچھ پہلے، پشتون [یا پختون] (افغان یا پٹھان) اس وادی میں نمودار ہوے - انھوں نے آتے ہی حاکمان لاہور (پنجاب) سے دریائے سندھ کے قریب کا میدانی علاقہ چھین لیا اور بعد میں گھکھڑوں کی امداد و اعانت سے دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیانی علاقے پر مسلّط ہو گئے - اس کے بعد پشتونوں نے لاھور کے حاکموں کو مجبور کیا کہ وہ دریائے سندھ کے مغرب اور دریائے کابل کے جنوب کا درمیانی پہاڑی علاقہ بھی ان کے تصرف میں دے دیں۔

دسویں صدی عیسوی میں پشاور پھر بیرونی طاقت کے زیر تسلط آ گیا، جب کہ سبکتگین نے لاھور کے حکمران راجہ جے پال کو شکست دی - سبکتگین کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بیس پچیس سال تک، ہندوستان پر حملوں کے لیے پشاور کو مستقر بلکہ ایک طرح کی چھاؤنی بنائے رکھا - سلطان محمود کے بعد بھی تقریباً سو سال تک پشاور غزنہ کا صوبہ شمار کیا جاتا رہا - آخر پندرھویں صدی عیسوی میں غوریوں کے ھاتھوں، غزنوی دور حکومت کا خاتمہ ھوا اور ۱۵۰۰ء تک یہاں مختلف حکمرانوں کی حکومت چلتی رھی - آخر سال مذکور میں بابر درۂ خیبر کے راستے حملہ آور ھوا - بابر اپنی حکومت کے دسویں سال افغانوں کی جانب متوجہ ھوا - اس نے باجوڑ اور سوات کو مطیع کیا - ھمایوں کے زمانے میں یہاں خلیل، مہمند، داؤد زئی اور دلازاک قوموں کی آپس میں خانہ جنگیاں ہوتی رھیں - اکبر نے ان شورشوں کو رفع کرنے کی خاطر میدانی علاقوں میں جگہ جگہ فوجی قلعے تعمیر کر کے ان لوگوں پر قابو پا لیا، مگر اس علاقے پر قبضہ و اقتدار کا مقصد شاھراہِ کابل کی حفاظت اور اس راستے پر نقل و حمل اور رسل و رسائل کی سہولت اور مقامی قبائل میں قیامِ امن کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسی زمانے میں یوسف زئی، مندنڑ اور خٹکوں کی شورشیں اور اختلافات رونما ھوے - یہ علاقہ ان دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا جنھوں نے اپنے آپ کو یہاں کا اصلی حاکم قرار دیا، مگر دہلی کے تخت سے برائے نام الحاق بھی قائم رکھا - یہ حالات جہانگیر اور شاھجہاں کے عہد تک قائم رھے - ۱۸۶۸ء میں پشتونوں نے بھاری جمعیت کے ساتھ دریائے سندھ کی حدود سے نکل کر علاقۂ چھچھ پر قبضہ کر لیا، اور اس طرح دہلی اور کابل کا راستہ منقطع کر دیا اور یوں ایک عرصے تک پشاور کے پورے میدانی علاقے پر اپنا قبضہ جمائے رکھا - اس عرصے میں مسلسل جنگوں کی بنا پر اورنگ‌زیب خود اپنی سرکردگی میں فوج لے کر آیا تاکہ ان قبائل پر دوبارہ اپنا تسلّط قائم کرے - یہ جد و جہد اور کشمکش تقریباً دو سال (۱۶۷۳ء

سے ۱۶۷۵ء) تک جاری رہی۔ ان مہمات میں
پشتو کے نامور شاعر خوشحال خان خٹک نے
بڑا حصہ لیا۔ یہ واقعات اس کی نظموں اور دیگر
تاریخی دستاویزات میں بڑے نمایاں طریقے سے
قلمبند ہوئے ہیں۔

اورنگ زیب کے جانشینوں نے بعد میں پشاور پر
اپنا قبضہ قائم رکھا، مگر سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر
ہونے کی وجہ سے ۱۷۳۸ء میں پشاور نادر شاہ
افشار کے قبضے میں آ گیا، جس کے باعث مغلوں
نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا سارا علاقہ
بھی نادر شاہ کے حوالے کر دیا۔ اس دوران میں
نادر شاہ کی خراسان میں مصروفیات کے باعث
یوسف زئی، خٹک، اور کوہستانی قبائل تو بالکل آزاد
اور خود مختار رہے، البتہ خلیل، مہمند، داؤد زئی،
محمد زئی اور گگیانڑی قبائل سے جبرًا خراج لیا جاتا
رہا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد سدوزئی درانیوں نے
احمد شاہ ابدالی کے زیر تسلط قندھار میں اپنی
حکومت قائم کر لی، جس کے عہد میں وادی پشاور
پر ان کا مکمل قبضہ و اقتدار قائم ہو گیا۔ ۱۷۹۳ء
میں سدوزئیوں کے آخری مدعی شاہ شجاع نے پشاور
میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ بالآخر بڑے
انقلابات و تغیرات کے بعد شاہ شجاع نے ۱۸۱۰ء
میں دستبردار ہو کر انگریزوں کے زیر حفاظت
لدھیانے میں سکونت اختیار کر لی، اور یہ سارا علاقہ
سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں پشاور پر اپنا
تسلط قائم کیا اور ہری سنگھ نلوا کو یہاں کی
زمام حکومت سونپ دی۔ ہری سنگھ ظالم و جابر
سردار تھا اور یوں بھی سکھ حکومت نے اندرون
ملک میں تدبر سے نظم و نسق قائم کرنے کی کوئی
کوشش نہیں کی، اس لیے سکھ اپنے زمانۂ حکومت
میں یہاں امن اور چین سے نہ رہ سکے۔ ہری سنگھ
پشتونوں سے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے
بعد سکھوں کی طرف سے ایک فرنگی جرنیل General
Avitabile (جسے لوگ ابو طبیلہ کہتے تھے)
آیا اور یہاں ۱۸۳۸ سے ۱۸۴۲ء تک رہا۔ آخر اسے
بھی ۱۸۴۲ء میں فارغ کیا گیا۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں
کی پہلی بڑی لڑائی کے کچھ عرصے بعد یعنی
اوائل ۱۸۴۷ء میں جب دربار (سکھوں کی مرکزی
حکومت) نے سردار گلاب سنگھ کو پشاور کا گورنر
بنا کر بھیجا تو اسکے ساتھ ہی ریزیڈنٹ لاھور
کے نمائندے کی حیثیت سے میجر جنرل لارنس کو بھی
پشاور بھیجا۔ پشاور ڈسٹرکٹ گیزٹیئر میں لکھا ہے:
General Avitabile was relieved in 1842۔ چنانچہ
اس جرنیل کی پوری تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ اسے خود سکھوں نے ہٹایا، کیونکہ ابو طبیلہ کے
ہٹتے ہی یہاں سردار تیج سنگھ گورنر پشاور کی
حیثیت سے آیا اور چار سال تک رہا۔ یہی تیج سنگھ
اس جرنیل کا کسی قدر مخالف تھا۔ ۱۸۴۹ء میں
سکھوں کو آخری شکست ہوئی اور وادی پشاور
انگریزوں کی مملکت میں شامل ہو گئی۔ میجر لارنس
کو پشاور کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا اور
اس تاریخ سے پشاور، پنجاب گورنمنٹ کا ایک
انتظامی ضلع قرار دے دیا گیا۔ جب نومبر ۱۹۰۱ء
میں، ایک چیف کمشنر کے ماتحت شمال مغربی
سرحدی صوبے کے نام سے یہ ایک علیحدہ صوبہ بنایا
گیا تو پشاور ہی کو نئی صوبائی حکومت کا
صدر مقام بنایا گیا (بحوالۂ امپیریل گیزٹیئر آف انڈیا،
نیو ایڈیشن، جلد ۹، ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۸)۔ یہاں
کا پہلا چیف کمشنر لفٹننٹ کرنل سر ایچ
اے ڈین Lieut. Col. Sir H. A. Deane تھا۔
۱۹۳۷ء تک تحصیل مردان اور تحصیل صوابی،
پشاور ضلع میں شامل رہیں (بحوالۂ مردم شماری
رپورٹ، ضلع پشاور، ۱۹۶۱ء، ص ۱ تا ۸)،

لیکن مردان کے ضلع بن جانے کے بعد وہ پشاور سے علیحدہ کر دی گئی ۔ اب پشاور میں یہ تین تحصیلیں شامل ہیں : تحصیل پشاور، تحصیل چارسدہ اور تحصیل نوشہرہ ۔ ان میں سے ہر ایک، ایک اسسٹنٹ کمشنر کے ماتحت ایک الگ سب ڈویژن ہے ۔

وحدت مغربی پاکستان میں پشاور ریجن :

۱۹۵۵ء کے وسط تک مغربی پاکستان چار صوبوں پر مشتمل تھا، جن میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ شامل تھے ۔ چنانچہ بعض اہم سیاسی و انتظامی وجوہ کی بنا پر یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ان صوبوں اور ملحقہ و متعلقہ ریاستوں کو ایک کر دیا جائے؛ لہٰذا اگست ۱۹۵۵ء میں، آئین ساز اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا، جسے قیام صوبۂ مغربی پاکستان (Establishment of West Pakistan Bill) کا نام دیا گیا ۔ بل میں چاروں مذکورہ صوبوں اور ریاستوں کو مدغم کر کے پورے مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بنانے کی تجویز تھی ۔ چنانچہ یہ بل منظور کر لیا گیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو وحدت مغربی پاکستان کے نام سے ایک صوبہ وجود میں آ گیا ۔ اس طرح پاکستان دو یونٹوں (Units) یا وحدتوں میں منقسم ہو کر ایک مغربی یا پچھمی پاکستان اور دوسرا مشرقی یا پوربو پاکستان کہلایا ۔ ساتھ ہی انتظام و انصرام کے لحاظ سے نیا صوبہ مغربی پاکستان تین بڑے علاقوں (Regions) اور بارہ بڑی قسمتوں (Divisions) میں منقسم کر دیا گیا ۔ ۱۹۷۰ء میں ایک ریجن اور ایک ڈویژن اور بڑھا دیا گیا ہے ۔ وہ مالا کنڈ ریجن اور مالا کنڈ ڈویژن ہے جو مالاکنڈ ایجنسی اور اضلاع سوات، دیر اور چترال پر مشتمل ہے ۔ منجملہ تین بڑے علاقوں اور بارہ بڑے حصوں کے پہلا پشاور ریجن اور پشاور ڈویژن ہے جو پشاور، ہزارہ، مردان، کوہاٹ اور قبائلی علاقوں پر مشتمل ہے ۔ قبائلی علاقوں میں مالا کنڈ ایجنسی، مہمند ایجنسی، خیبر ایجنسی اور کُرّم ایجنسی کے ساتھ ساتھ پشاور، ہزارہ، مردان اور کوہاٹ کے کچھ ملحقہ علاقے شامل ہیں ۔

پشاور کا نام : مختلف مؤرخوں اور سیاحوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے ۔ ہیروڈوٹس (۵۰۰ ق م) نے اسے ''پسکا پورس''؛ چینی بدھ سیاح فاہیان Fa-hien (۳۹۹ تا ۴۱۳ء) نے ''فولیوشا'' اور دوسرے چینی سیاح ہیون سانگ (Hiuen Tsang) [۶۲۹ تا ۶۴۵ء] نے اسے ''پولوشا پولو'' بتایا ہے ۔ ان کے بعد المسعودی (۱۰۰۰ء) اور ابو ریحان البیرونی (۱۱۰۰ء) نے اس کا نام ''پرشاور'' لکھا ہے ۔ بعد میں مغل بادشاہ بابر اور اس کے بعد اکبر نے اسے فارسی میں ''پیش آور'' اور ''پیشہ ور'' کر دیا ۔ اس کے بعد سے یہ نام باقاعدہ پشاور ہو کر رہ گیا ۔ بعض کتابوں میں اس کا قدیم نام پُرشور۔ پَشہ وَر۔ پرشپور اور باگرام بھی لکھا ہے ۔ باگرام کا نام خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمٰن بابا نے بھی اپنی نظموں اور غزلوں میں استعمال کیا ہے ۔

جغرافیہ : نقشے میں پشاور، ۷۱ درجے ۲۵ دقیقے اور ۷۲ درجے ۱۵ دقیقے طول بلد مشرق میں اور ۳۳ درجے ۴۰ دقیقے اور ۳۴ درجے ۲۵ دقیقے عرض بلد شمال میں واقع ہے ۔ بہ لحاظ حدود اربعہ مشرق میں ضلع مردان اور تقریباً تیس میل نیچے دریائے سندھ ضلع اٹک سے اسے جدا کرتا ہے، اور جنوب مشرقی گوشے میں کوہ نیلاب غاشے اسے ضلع کوہاٹ سے علیحدہ کرتا ہے ۔ جنوب میں حسن خیل آفریدی اور درے کے آدم خیل آفریدی، مغرب میں خیبر کے آفریدی اور ملاگوری واقع ہیں ۔

آگے شمال میں اور دریائے کابل کے اس پار، مہمند قبائل جو ایک کوہستانی سلسلے میں آباد ہیں، جن کی حدود دریائے سوات کے کناروں تک پہنچتی ہیں، نیز مالا کنڈ ایجنسی اور شمال مشرق میں مردان ہے۔ یہ ضلع قدرتی طور پر چاروں طرف سے مسلسل پہاڑوں اور پہاڑیوں کے ایک مدور حلقے کے اندر گھرا ہوا ہے۔ صرف مشرق کی جانب اٹک کے سامنے کچھ کھلا ہوا ہے۔ اس کے وسط میں دریائے کابل ہے، جو جنوب مشرق کی سمت بہتا ہے۔ وادی کی زمین شمال اور جنوب دونوں جانب سے دریا کی طرف جھکتی ہے، جس کے باعث علاقے کے پانی کے نکاس کا رخ دریائے کابل کی جانب ہے۔

اس وادی کا عمومی منظر خوشنما اور دلکش ہے۔ اس میں جگہ جگہ چشمے، نہریں، نالے، ندیاں اور دریا بہتے ہیں۔ بعض علاقوں کی زمین ہر موسم میں سبزے سے ڈھکی رہتی ہے۔ بعض مقامات پر پورے کے پورے گاؤں پر ہرے بھرے اونچے اونچے جھنڈ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں پھل دار درختوں کے بڑے بڑے باغ اور کہیں مکئی اور نیشکر کے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت یا گیہوں اور جو یا دھان کی لہلہاتی فصلیں ہوتی ہیں۔ ہشتنگر اور یوسفزئی کی میدانی زرعی زمینوں میں آب پاشی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ مشرق کی جانب خٹکوں کی کچھ زمینیں رہٹ کے کنووں کے ذریعے سیراب ہوتی ہیں اور خٹکوں کا جنوبی علاقہ خشک اور بارانی زمینوں پر مشتمل ہے۔

رقبہ: ضلع پشاور کا کل رقبہ ۱۶۶۴ مربع میل ہے۔ اور پشاور شہر اور چھاؤنی دونوں کا مجموعی رقبہ تقریباً ۹ مربع میل ہے۔

آب و ہوا اور موسمی کوائف: پشاور ایک ایسا مقام ہے جہاں تقریباً آٹھ نو مہینے آب و ہوا خوشگوار، فرحت بخش اور صحت افزا رہتی ہے۔ البتہ گرمیوں کے تین مہینے گرمی منطقۂ حارہ کے بعض مقامات سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ وسط مئی سے وسط جولائی تک درجۂ حرارت میدانی علاقوں کی طرح بہت بڑھ جاتا ہے۔ خشک گرمی پڑتی ہے۔ تیز و تند لوئیں چلنے لگتی ہیں اور یہ گرمی مضر صحت ہوتی ہے۔ پھر وسط جولائی سے ستمبر تک گرمی کسی قدر کم مگر زیادہ مرطوب ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں درجۂ حرارت عموماً ۱۱۶ فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے اور جنوری میں کم و بیش ۲۶ تک گر جاتا ہے۔ بارشوں کا اوسط ۱۶۰۵ انچ ہے۔ بارشیں زیادہ تر موسم سرما میں ہوتی ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں اور کبھی سردیوں میں بھی تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں، جن سے کبھی کبھی نقصان پہنچتا ہے۔

زلزلے: پنجاب کے شمال مغرب میں پہاڑوں کا سلسلۂ زلزلوں کے لیے مخصوص مانا گیا ہے اور پشاور کا محلِ وقوع اس منطقے میں ہے، اس لیے راولپنڈی، اٹک اور پشاور کے گرد و نواح کا علاقہ ہمیشہ زلزلوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی پشاور میں شدید جھٹکے بھی محسوس ہو جاتے ہیں، جن سے مکانات کو نقصان پہنچتا ہے۔ زلزلے ہر موسم میں آتے رہتے ہیں۔

سیلاب: یہاں سیلاب بھی آتے ہیں اور عموماً ان دنوں میں آتے ہیں جب سرحد اور کشمیر کے پہاڑوں پر زیادہ بارش ہوتی ہے، ساتھ ہی کوہستان ہمالیہ سے برف پگھل کر آنے لگتی ہے اور ہوا میں نمی کی زیادتی کے باعث عمل تبخیر بہت کم ہو جاتا ہے، اس وقت دریا غیر معمولی طور پر بھرپور ہو کر امنڈنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی دریائے اٹک کی بالائی گزرگاہوں میں کسی گلیشیئر (تودۂ برف) کے باعث پانی رک کر جمع ہو جاتا ہے تو

گلیشیئر کے پگھلنے یا اس کے سرک جانے سے ایک دم تباہی خیز سیلاب آ جاتا ہے ۔ اس کی وجہ سے اٹک کے مقام پر دریا میں پانی کی سطح بہت اونچی ہو جاتی ہے ۔ اور اس میں دریاے کابل کا پانی نہیں سما سکتا، اس لیے وہ واپس جانے لگتا ہے ۔ یوں دریاے کابل کے سیلاب سے آس پاس کے علاقے میں تباہی آ جاتی ہے ۔ اس قسم کے زبردست سیلاب ۱۸۳۰ء، ۱۸۴۶ء، ۱۸۵۸ء اور ۱۹۲۹ء میں آ چکے ہیں ۔ ان دو آخری سیلابوں میں اٹک کے مقام پر دریاے سندھ کے پانی کی سطح ریلوے پل کے بالائی کناروں تک پہنچ گئی تھی۔

دریا : دریاے کابل، افغانستان سے چل کر مہمندوں کے پہاڑی علاقۂ سے ہوتا ہوا ورسک کے مقام پر وادی پشاور میں داخل ہوتا ہے ۔ یہاں سے کسی قدر آگے جا کر میچنی کے مقام پر تین شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے ۔ ان میں سے بالائی شاخ ادے زئی، وسطی ناگمان اور زیریں شاہ عالم کہلاتی ہے ۔ یہ تینوں دریا تقریباً بارہ میل آگے جا کر موضع نِیسّتہ کے قریب پھر آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں ۔ اسی جگہ شمالی علاقے سے ہوتا ہوا دریاے سوات اور آفریدیوں کے علاقۂ تیراہ سے نکل کر دریاے باڑا بھی وادی کے جنوبی علاقے سے ہوتا ہوا اس سے مل جاتا ہے ۔ یہاں سے دریاے کابل، "لنڈے سیند" یا "دریاے لنڈا" کہلاتا ہے ۔ یہ ضلع کے وسط سے گزرتا ہوا تیس میل آگے جا کر اٹک کے مقام پر "ابابین" یعنی دریاے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔

نہریں : (۱) نہر لوئر سوات، دریاے سوات سے آبازئی کے مقام پر نکالی گئی ہے ۔ اس سے تحصیل چارسدہ کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں؛ (۲) نہر کابل : یہ نہر دریاے کابل سے میچنی کے قریب نکالی گئی ہے، جس سے تحصیل پشاور کا اکثر حصہ سیراب ہوتا ہے؛ (۳) نہر ورسک : یہ نئی نہر ہے، جو ورسک میں دریاے کابل سے نکالی گئی ہے ۔ اس سے کھجوری، خلیل اور زیریں مہمندوں کا علاقہ سیراب ہوتا ہے ۔

پہاڑ : ضلع کی حدود کے اندر اونچے پہاڑ خٹکوں کے علاقے میں واقع ہیں ۔ ان میں چراٹ اور نیلاب غاشے کی بلندی ۳۰۰۰ سے ۵۰۰۰ فٹ تک ہے ۔ سب سے اونچی چوٹی جلالاسر کی ہے، جس کی بلندی ۵۰۳۶ فٹ اور "توروسّر" کی بلندی ۴۷۳۶ فٹ ہے ۔

زمین : وادی کی زمین کے بہت بڑے حصے میں اعلٰی قسم کی خالص مٹی پائی جاتی ہے، جو ہلکے گیروا رنگ کی ہے ۔ کہیں کہیں ہلکی سیاہی مائل اور کہیں سفیدی مائل بھی ملتی ہے، مگر ہر جگہ کی مٹی زرعی پیداوار کے لیے بہت سازگار ہے ۔ ضلع پشاور کی آباد زیر کاشت زمین کا کل رقبہ ۳۱۱۰۰۰ ایکڑ ہے ۔

قدرتی پیداوار: پشاور کے پہاڑ زیادہ تر خشک ہیں ۔ کہیں کہیں ان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں، جو تنور کے ایندھن کے کام آتی ہیں ۔ خٹکوں کے جنوبی علاقے کے پہاڑوں میں بعض مقامات پر کارآمد لکڑی کے پیڑ پائے جاتے ہیں ، جیسے زیتون اور ببول جن سے کوئلا بھی تیار کیا جاتا ہے ۔ انھیں پہاڑوں میں پھٹکری اور پتھر کا کوئلا پایا جاتا ہے ۔ مگر بہت کم مقدار میں ۔ میدانی خشک علاقے میں غز (گِج ، مائیں)، بیری، اور کیکر کے درخت اور مرطوب علاقے میں شیشم، توت اور بکائن کے درخت زیادہ ہوتے ہیں ۔ ضلع میں جنگلات کا کل رقبہ ۱۹۶۸۶ ایکڑ ہے، جس کی حفاظت اور انتظام محکمۂ جنگلات کے سپرد ہے ۔ اس کے علاوہ ایک منصوبے کے تحت ورسک کے پہاڑوں میں

تقریباً دو ہزار ایکڑ کے رقبے کا ایک نیا جنگل لگایا گیا ہے۔

آب پاشی: آب پاشی کے لیے دریاے کابل کی نہر، دریاے سوات کی نہر اور ورسک کی نہر کے علاوہ نوشہرہ اور اٹک کے درمیان ٹیوب ویلز اور تنگی، کنڈر مرداره اور خویشگی، تین مقامات پر لفٹ اری گیشن (Lift Irrigation Scheme) کے ذریعے آب پاشی کی جاتی ہے۔

برقابی: پشاور میں ورسک کا پن بجلی گھر ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کلوواٹ بجلی مہیا کرتا ہے، جس سے ضلع بھر کی بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ پنجاب کو بھی بہم پہنچائی جاتی ہے۔

زرعی پیداوار: فصلوں میں بالخصوص گیہوں، مکئی اور گنا اور بالعموم چاول، دالیں، سرسوں، مرچ، تمباکو اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔ نیشکر زیادہ تر تحصیل چارسدہ میں پیدا ہوتا ہے، جس سے شکر کے علاوہ گڑ بھی بنتا ہے، جو پشاوری گڑ کے نام سے دور دور بھیجا جاتا ہے۔

آبادی: (۱) مجموعی آبادی: ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع پشاور کی مجموعی آبادی ۱۲۱۳۳۶۸ تھی۔ اس میں ۶۵۱۵۵۸ مرد اور ۵۶۱۹۱۰ عورتیں تھیں۔ گزشتہ دس سال، یعنی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے بعد آبادی میں اضافے کی شرح ۳۰.۴۷ فیصد رہی؛ (۲) شہری آبادی ۲۸۲۳۱۸ نفوس پر مشتمل تھی اور (۳) دیہاتی آبادی ۸۳۱۰۵۰ تھی اور (۴) صرف پشاور شہر اور چھاؤنی دونوں کی مجموعی آبادی ۲۱۸۶۹۱ تھی، جس میں ۱۲۶۰۲۰ مرد اور ۹۲۶۷۱ عورتیں تھیں۔ ضلع بھر میں تقریباً چھے سو گاؤں ہیں۔

مہاجرین: ۱۹۴۸ء میں سابق صوبۂ سرحد میں مہاجرین کی آمد شروع ہوئی، چنانچہ ایک سال کے اندر اندر مجموعی حیثیت سے یہاں ۶۵۶۰۸ مہاجرین آئے۔ ان میں سے ۳۲۱۰۳، یعنی تقریباً آدھے مہاجروں کو صرف ضلع پشاور میں بسایا گیا اور بقیہ مہاجرین باقی پانچ ضلعوں میں آباد کیے گئے۔

زبان: ضلع پشاور میں خصوصاً دیہاتی آبادی کے نوے فیصد لوگوں کی مادری زبان پشتو ہے۔ باقی دس فیصد میں، جس میں زیادہ تر شہری آبادی شامل ہے، ہندکو یا پشاوری بولی، پنجابی، لہندا، اردو اور فارسی بولی جاتی ہے۔ شہری آبادی میں پشاور میونسپلٹی، پشاور چھاؤنی، نوشہرہ کلاں میونسپلٹی، نوشہرہ چھاؤنی، چارسدہ میونسپلٹی، قصبۂ تنگی، قصبۂ اتمان زئی، امان گڑھ صنعتی علاقہ، رسالپور چھاؤنی، قصبۂ شبقدر، قصبۂ اکوڑہ خٹک، قصبۂ پبی، پشاور یونیورسٹی ٹاؤن، جہانگیرہ صنعتی علاقہ، چراٹ چھاؤنی، اور "نشاط مل" کا علاقہ شامل ہیں۔

تعلیم: تعلیم کے لحاظ سے پشاور شہر اور چھاؤنی، شمال مغربی صوبۂ سرحد کے تمام شہروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ رہا ہے۔ (بوقت تحریر مقالہ) پشاور شہر اور چھاؤنی میں تیس پرائمری، آٹھ لوئر مڈل، تین مڈل اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے ملا کر نو ہائی سکول ہیں، تین کالج لڑکوں کے لیے اور ہوم اکنامکس سمیت تین کالج لڑکیوں کے لیے ہیں۔ پشاور اور ضلع پشاور کے لیے منظور شدہ تعلیمی ادارے حسب ذیل ہیں:

(۱) یونیورسٹی	۱۰
(۲) آرٹس اینڈ سائنس کالج	۵
(۳) لاء کالج	۱
(۴) ایجوکیشن (بی ایڈ) کالج	۱
(۵) خیبر میڈیکل کالج	۱
(۶) انجینیرنگ کالج	۱
(۷) ایگریکلچرل کالج	۱
(۸) کامرس کالج	۱

(۹) فاسٹ انسٹیٹیوٹ	۱
(۱۰) انٹرمیڈیٹ کالج	۶
(۱۱) ہوم اکنامکس کالج	۱
(۱۲) ہائی سکول	۳۵
(۱۳) مڈل سکول	۵۸
(۱۴) پرائمری سکول	۳۱۰
(۱۵) نارمل ٹریننگ سکول	۱
(۱۶) ٹیکنیکل سکول	۱
(۱۷) پالی ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ	۲
(۱۸) کمرشل انسٹیٹیوٹ	۱

تعلیم یافتہ افراد : ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق خواندہ افراد ۱۵۲۹۵۷ تھے۔ ان میں مرد ۱۲۹۷۴۸ اور عورتیں ۲۳۲۰۹ تھیں۔ یعنی مجموعی آبادی کا ۱۳۰۰۷ فیصد۔

وسائل حمل و نقل : پشاور میں تانگوں کا رواج بہت پرانا ہے، جو ابھی تک چل رہا ہے۔ چند سال سے چھاؤنی میں ٹیکسی کاریں اور موٹر رکشائیں عام ہو گئی ہیں؛ البتہ دور افتادہ دیہات میں، جہاں سڑکیں ابھی نہیں پہنچیں، پیدل آمد و رفت کی جاتی ہے، یا بائیسکلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ بس سروس شروع ہوئی ہے؛ شہر اور چھاؤنی میں اومنی بس سروس کے علاوہ یہ گرد و نواح کے تمام ضروری مقامات تک آتی جاتی ہیں۔ بار برداری کے لیے اگرچہ موٹر ٹرک عام ہو گئے ہیں، پھر بھی قدیم بیل گاڑیاں ابھی عام طور پر سامان ڈھوتی نظر آتی ہیں۔

سڑکیں : ضلع پشاور میں پکی سڑکیں ۲۸۲ میل اور کچی ۱۷۲ میل لمبی ہیں۔ ضلع بھر میں اچھی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ شاہراہ کا تعلق پشاور سے راولپنڈی، لاہور نوشہرہ، چراٹ، صوابی، مردان، بنیر، سوات، دیر، چارسدہ، ورسک، باڑا، لنڈی کوتل، کابل، کوہاٹ بنوں اور پارہ چنار سے براہ راست قائم ہے، جن پر یہی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس باقاعدہ کام کر رہی ہے۔

ریلوے : پشاور، لاہور اور کراچی وغیرہ سے بذریعۂ پاکستان ویسٹرن ریلوے براہ راست منسلک ہے۔ اٹک سے پشاور تک خیر آباد، کُنڈ، جہانگیرہ روڈ، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ جنکشن، خوشحال کوٹ، پیر پیائی، پبّی، تاروجبّہ، ناصر پور، پشاور شہر اور پھر پشاور چھاؤنی ریلوے سٹیشن آتے ہیں۔

برانچ لائن : (۱) پشاور چھاؤنی سے جمرود، شاہگئی اور لنڈی کوتل؛ (۲) نوشہرہ جنکشن سے کابل ریور، رسالپور چھاؤنی، رشکئی، مردان جنکشن، گوجر گڑھی، کلپانی، تخت بھائی، پرخو ڈھیری، ھاتھیان، سخا کوٹ، درگئی؛ (۳) مردان جنکشن سے قدرت، منگا، قلات ناصر، سر ڈھیری، چارسدہ ریلوے سٹیشن پڑتے ہیں۔

ہوائی سفر : پشاور سے پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز (PIA) سروس کے ذریعے چترال، کابل، راولپنڈی، لاہور اور کراچی کا سفر کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، افغانستان کے آریانا ایر لائنز نے پشاور سے اپنی سروس شروع کی ہے اور اب یہ سروس براستۂ لاہور، امرتسر اور دہلی تک بڑھا دی گئی ہے۔

ہسپتال : شہر اور چھاؤنی میں کئی زنانے، مردانے، سول اور فوجی ہسپتال موجود ہیں۔ شہر میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال، افغان مشن ہسپتال، زنانہ ہسپتال، زچہ و بچہ کا (میٹرنٹی) ہسپتال، کینٹونمنٹ جنرل ہسپتال اور کمبائینڈ ملٹری ہسپتال CMH ہے۔ ان کے علاوہ ٹی بی کلینک، کئی زچہ خانے، صحت اطفال کے ادارے اور ڈسپنسریاں کام کر رہی ہیں۔ [بوقت تحریر] پشاور شہر اور ضلع میں ہسپتالوں کی مجموعی تعداد سولہ ہے اور

ڈسپنسریوں کی مجموعی تعداد تیس ھے۔

صنعت و حرفت: قیام پاکستان سے پہلے ضلع پشاور میں صنعت و حرفت برائے نام تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد ضلع بھر میں بڑی تیزی سے صنعتی ترقی رونما ھوئی۔ اب ضلع بھر میں اٹھارہ صنعتی ادارے اور کارخانے قائم ھیں، جن میں زیادہ اھم سوتی کپڑا بننے، سگریٹ بنانے، آٹا پیسنے، پھلوں کو محفوظ کرنے، شکر سازی، کاغذ اور گتا بنانے، سوڈا کاسٹک (صابن کا تیزاب) نشاستہ، گلوکوز اور دیگر ادویہ تیار کرنے کے کارخانے ھیں۔ لوھا ڈھالنے، سنگ مرمر کی گھڑائی اور اسلحہ سازی کا کام بھی قابل ذکر ھے۔

گھریلو دستکاریاں: اس میں شک نہیں کہ گزشتہ بیس پچیس سال سے ترقیاتی منصوبوں کے تحت کارخانوں کے قیام کے باعث گھریلو دستکاریوں کو خاصا نقصان پہنچا ھے، پھر بھی یہاں کے جلاھے بہت اعلٰی قسم کی لنگیاں، چادریں اور کمبل بناتے ھیں۔ یہاں کلاہ اور جوتوں پر کلابتوں کا کام بہت اعلٰی ھوتا ھے۔ چپلیاں، بوٹ، جوتے، لباس اور دوسرے خانگی ضروریات کے پارچہ جات، دریاں اور قالین وغیرہ تیار ھوتے ھیں۔ پشاور کچے چمڑے اور کھالوں کی تجارت کا مرکز ھے۔ تانبے کے مختلف قسم کے سادہ اور گلدار برتن بھی شہر میں بڑے پیمانے پر تیار کیے جاتے ھیں۔ مٹی کے سادہ برتن ضلع بھر میں بنائے جاتے ھیں، مگر مٹی کے پختہ روغنی گلدار و رنگدار برتن صرف شہر میں بنائے جاتے ھیں۔ سونگھنے اور منہ میں ڈالنے کی نسوار (ناس) اور کپڑا دھونے کا صابن بھی بڑے پیمانے پر شہر میں بنایا جاتا ھے۔

انتظامیہ: پشاور ڈویژن کے لیے ایک ڈویژنل کمشنر مقرر ھے، اور عمومی طور پر ضلع پشاور کا نظم و نسق ایک ڈپٹی کمشنر کے ماتحت ھے، جسے ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت بھی حاصل ھے۔ ساتھ ھی ضلع کے تمام قومی ترقیاتی اور تعمیراتی محکموں کے ساتھ رابطہ رکھنا بھی اس کے ذمے ھے۔ عدلیہ کو سنبھالنے کے لیے بھی مناسب انتظامات ھیں۔ صوبۂ مغربی پاکستان میں مغربی پاکستان ھائی کورٹ کا ایک بنچ پشاور میں کام کرتا تھا۔ [اب شمال مغربی سرحدی صوبے کا دوبارہ قیام عمل میں آنے کے بعد علیحدہ ھائی کورٹ قائم ھو گیا ھے]۔ مالیاتی انتظام کے لیے ضلع تین سب ڈویژنوں اور تین تحصیلوں، یعنی پشاور، چارسدہ اور نوشہرہ میں تقسیم کیا گیا ھے۔ تحصیل کا صدر مقام تینوں مقامات پر الگ الگ قائم ھے۔ [یکم جولائی ١٩٧٠ء سے پشاور شمال مغربی سرحدی صوبے کا دارالحکومت ھے]۔

دیگر شعبے: محکمہ زراعت اور اس میں تحقیقاتی شعبہ، محکمۂ افزائش نسل حیوانات، محکمۂ امداد باھمی، محکمۂ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (تعمیرات اور آب پاشی)، محکمۂ پولیس، محکمۂ صحت عامّہ، محکمۂ صنعت و حرفت، محکمۂ جنگلات، محکمۂ تعلیمات، محکمۂ غذا، محکمۂ پرورش ماھی، محکمۂ آبکاری، محکمۂ انکم ٹیکس، محکمۂ ڈاک و تار وغیرہ ھیں۔

پشاور شہر: کچھ عرصہ پیشتر تک یہ شہر پرانی اینٹوں کی بنی ھوئی بھاری فصیل کے اندر محصور تھا، جس میں چاروں طرف باھر جانے کے لیے بارہ بڑے اور چار چھوٹے دروازے تھے، لیکن گزشتہ برسوں میں شہر کی آبادی میں بہت توسیع و ترقی ھوئی۔ گرد و پیش میں شہر سے ملحق بہت سی نوآبادیاں بن گئیں، جن میں بالکل جدید طرز و وضع میں نئے سے نئے نمونے کے مکانات بنائے جا رھے ھیں، اس لیے ان کو ملانے کے لیے چاروں طرف سے فصیل جگہ جگہ سے توڑ دی گئی،

اور کئی حفاظتی دروازے بالکل ہٹا دیے گئے، جیسے باجوڑی، کابلی، کچہری اور ہشتنگری دروازے ۔ اندرون شہر کا منظر قدیم ساخت کے شہروں کا سا ہے ۔ مکانات اکثر دو منزلہ، سہ منزلہ اور چہار منزلہ، اکثر پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں ۔ اوپر کی منزلوں کی دیواریں لکڑی کے کٹہروں اور چوکھٹوں کے اندر ایک ایک اینٹ کی چنائی کی ہیں ۔ گلیاں تنگ اور ٹیڑھی میڑھی ہیں، مگر ان کے فرش پختہ ہیں ۔ اکثر مکانوں میں تہ خانے اور کہیں کہیں کنویں بھی ہیں ۔ گرمیوں میں لوگ ان تہ خانوں میں دن گزارتے ہیں ۔ اب بجلی کے آ جانے سے ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے ۔ دکانیں مکانات کے زیریں حصوں میں بنی ہیں، جو بہت آباد و بارونق ہیں اور ضروریات زندگی کی جملہ اشیا سے بھرپور رہتی ہیں، جن میں کثرت تنوری روٹی، کباب اور چاے کی دکانوں کی ہے اور عموماً خشک و تر میوے، سبزی ترکاری، گوشت، مچھلی، انڈے، بنیادی اور روزمرہ ضروریات کی اشیا، کپڑا، لوہے کا سامان اور تانبے کے گلدار اور سادہ برتن بھاری مقدار و تعداد میں مہیا رہتے ہیں ۔ بڑے بازاروں کی دکانوں میں ہر قسم کی زندگی کے لوازم بھی وافر دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ پشاور شہر میں مسجدیں بھی بہت سی ہیں، ان میں شاہجہان کے زمانے کی چند مسجدیں بہت مشہور ہیں ۔ سب سے بڑی مسجد مہابت خان (اندرونِ شہر) ہے، دوسری مسجد گنج علی خان (بازار ہاپڑ گراں)، تیسری مسجد دلاور خان (محلۂ قاضی خیلاں)، چوتھی مسجد خواجہ معروف (محلۂ گنج) اور مسجد قاسم خان (بازار قصہ خوانی) ہے ۔

شہر میں قصہ‌خوانی اور چھاؤنی میں صدر بازار سب سے بڑے اور با رونق بازار ہیں، جن میں ہر وقت بڑی گہما گہمی اور چہل پہل رہتی ہے، شہر کے بازار قصہ خوانی میں چونکہ پہلے داستان گو لوگوں کو منظوم قصے سنایا کرتے تھے، اس لیے اس بازار کا یہی نام پڑ گیا ۔ اس کے علاوہ بازار کلاں، گھنٹہ گھر، مینا بازار، موچی لڑا، کٹڑا ابریشم گراں، بازار صرافاں، بازار اندر شہر، بزاز ہٹہ، لنگی فروشاں، بٹیر بازاں، دال گراں، غلہ منڈی، سبزی منڈی، پیپل منڈی، نمک منڈی، میوہ منڈی، لکڑ منڈی، بازار ڈبگری، رامداس بازار، جہانگیر پورہ، کریم پورہ بھی مشہور بازار ہیں ، اب بیرون کابلی دروازہ نئی آبادی میں خیبر بازار اور چوک سوکارنو بھی قابل دید بازار ہیں ۔ شہر میں پرانی طرز کی سرائیں، مسافر خانے اور جدید طرز کے ہوٹل اور ریستوران بھی بکثرت ہیں۔

قابل دید اور اہم مقامات: ضلع پشاور میں بہت سے قابل دید مقامات ہیں : قلعۂ بالا حصار، مسجد مہابت خان، شاہی باغ، وزیر باغ، اور چھاؤنی میں کمپنی باغ، عجائب گھر، اسمبلی ہال، میونسپل ہال اور بیرون شہر اسلامیہ کالج کی خوبصورت اور عظیم الشان عمارت (جو خیبر کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے اور جو اپنے زمانے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل اور نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی مساعی سے قائم کیا گیا تھا ۔ اب یہیں پشاور یونیورسٹی بھی بنی ہے) ۔ ورسک پن بجلی گھر، درۂ خیبر، درۂ کوہاٹ، اور آثار قدیمہ کے مقامات، پنج تیرتھی، شاہ جی کی ڈھیری، اور گور کٹھری قابل دید ہیں۔

باشندگان پشاور: ضلع پشاور میں زیادہ‌تر مہمند، محمد زئی، خلیل، داؤد زئی اور خٹک آباد ہیں ۔ بحیثیت مجموعی یہ سب پشتون متناسب قد و قامت کے مالک، کھلتے ہوئے گندمی رنگ، لمبوترے چہرے اور کھڑے نقشے والے تنومند، شکیل اور وجیہ لوگ ہیں ۔ مردوں کا ڈھیلا ڈھالا

سفید لباس، جو زیادہ تر ڈھیلی اور لمبی آستینوں کے لمبے کرتے یا خلقے، ڈھیلے اور چوڑے پائینچوں کے گھیردار بھاری پاجامے (تنبا)، سر پر اکثر بغیر کلاہ کے سادہ پگڑی، یا کلاہ لنگی، ایک چادر اور پیروں میں چپلی یا جوتے پر مشتمل ہوتا ہے ۔ غذا سادہ ہوتی ہے ۔ گوشت روٹی بہت مرغوب غذا ہے ۔ گرمیوں میں گیہوں کی خمیری تنوری روٹی اور سردیوں میں مکئی کی روٹی کھائی جاتی ہے ۔

دیہات کے مکانات اکثر سادے نظر آتے ہیں، جو ایک یا دو کوٹھوں اور صحن پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ بڑے بڑے محلّوں کا ایک حجرہ ہوتا ہے؛ یہ ایک طرح کا مشترک ڈیرہ یا نشست گاہ ہوتی ہے جو کسی مَلک، نمبردار یا ذی حیثیت شخص کے نام پر مشہور ہوتا ہے ۔ اس میں صحن کے علاوہ ایک یا دو کوٹھے ہوتے ہیں ۔ حجرے میں چارپائیاں، پینے کا پانی، حقہ اور تمبا کو اور اکثر سرسوں کے تیل کا چراغ بالالتزام رکھا جاتا ہے ۔ اس میں ہر قسم کے اجتماعات، جرگے، مشورے، شادی و غمی کی تقریبات اور مہمانداری سب کچھ مشترکہ طور پر کیا جاتا ہے ۔ بعض جگہ غیرشادی‌شدہ نوجوان بھی رات کو حجرے ہی میں سوتے ہیں، ورنہ ویسے بھی رات کو بات چیت ہوتی ہے، منظوم رومانی داستانیں سنائی جاتی ہیں؛ یا رباب اور مٹکے کے ساتھ راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔

پشتونوں کی اکثریت عقائد کے لحاظ سے راسخ العقیدہ اہل السنت والجماعت ہے ۔ البتہ پشاور شہر میں زیادہ اور علاقے میں کہیں کہیں شیعہ بھی ہیں ۔ پشتونوں کی بیاہ شادی اور موت، خیرات صدقات وغیرہ سب مذہب اسلام کے مطابق ہے ۔ لوگ عقیدةً سادات، پیروں، درویشوں اور اولیاے کرام کی دل و جان سے تعظیم و تکریم کرتے ہیں ۔ بزرگانِ دین اور اولیاے کرام کے مزاروں پر دور دور سے بڑی عقیدت کے ساتھ آتے ہیں اور نذرانے چڑھاتے ہیں ۔ علاقے میں بعض بزرگوں کے مزار پر عرس کے سلسلے میں ہر سال بڑے بھاری اجتماعات ہوتے ہیں، جسے عوام میلا کہتے ہیں ۔ پشاور میں دو میلے بہت مشہور ہیں ۔ ایک، شہر میں، حضرت سخی سرور[؟] کے نام پر جھنڈوں کا میلا اور دوسرا حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب[؟] کا میلا، موضع زیارت کاکا صاحب[؟] (تحصیل نوشہرہ) میں ہر سال ماہ رجب کی اٹھارھویں سے چوبیسویں تک منعقد ہوتا ہے ۔ ان دونوں میلوں میں گرد و نواح کے علاقوں سے لوگ جوق در جوق بڑی عقیدت اور شوق سے آ کر شامل ہوتے ہیں۔

ساتھ ہی پشتون، اپنی قدیمی روایتی پشتون ولی کے آئین و دستور کا بھی بہت لحاظ رکھتے ہیں، جس میں غیرت، ننگ و ناموس، حمیت، پت، انتقام، تربورولی، مہمانداری، جرگہ، ننواتی وغیرہ جیسی کچھ باتیں ایسی ہیں؛ جن کی پابندی اور پاسداری وہ جان و مال سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

دیہاتی زندگی میں نوجوان الگ الگ موسم کے لحاظ سے مختلف مردانے کھیلوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں، جیسے کبڈی، تتی اور الڈوخر وغیرہ ۔ موسیقی اور راگ رنگ کے بھی بڑے دلدادہ ہیں، لیکن باقاعدہ آلات موسیقی کے استعمال کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں ۔ بہت ہوا تو بڑوں کی نظریں بچا کر، کہیں گھر سے باہر رباب بجانا سیکھ لیتے ہیں، جس کے ساتھ ڈھولکی یا طبلے کی جگہ مٹکا (گھڑا) بجا لیتے ہیں ۔ البتہ قومی ناچوں میں بلا تکلف شامل ہو جاتے ہیں، جو بنگڑہ (بھنگڑہ) اتنڑ، شاڈولہ یا بلبلہ کہلاتے ہیں اور عام خٹک ناچ کے بہت مشابہہ ہوتے ہیں۔

مآخذ: (۱) تاریخ ضلع پشاور (اردو، مصور)

۱۸۹۷ء، جلد اوّل؛ (۲) گزیٹیر آف دی پشاور ڈسٹرکٹ، ۱۸۹۷، ۱۸۹۸ء؛ (۳) این ڈبلیو ایف پراونس گزیٹیر، پشاور ڈسٹرکٹ، جلد اے، ۱۹۳۱ء؛ (۴) پاپولیشن سنسس آف پاکستان، ڈسٹرکٹ سنسس رپورٹ، پشاور ۱۹۶۱ء؛ (۵) دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونس ائیربک ۱۹۵۲ء؛ (۶) ویسٹ پاکستان ایگریکلچرل سٹٹسٹکس ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء؛ (۷) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ۱۹۰۸ء؛ [دیگر ماخذ قدیم کے لیے دیکھیے Ellis : *A Descriptive Catalogue of Persian MSS.*، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ پشاور].

(سیّد انوارالحق)

⊗ **پشتو**: (= پختو)، پشتو ادب کا جائزہ لینے سے پہلے، مختصر طور پر، پشتو زبان اور اس کے بولنے والوں کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے.

پشتو، پشتونوں کی زبان ہے، یہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کے ضلعوں، ایجنسیوں اور ریاستوں، بلوچستان کے ایک حصّے میں اور تقریباً نصف افغانستان میں بولی جاتی ہے.

چونکہ پشتون، آریوں کی آمد سے بہت پہلے، اپنے پرانے وطن پشتونخوا (پکتی ایکا) میں رہتے تھے، اس لحاظ سے ان کی بولی بھی یقیناً بہت پرانی ہے۔ پشتو ایک قدیم زبان ہے جو بعض کے نزدیک باختر قلمرو کی مختلف اقوام میں بولی جاتی تھی۔ پشتو سے ایک انوکھی خصوصیت وابستہ ہے اور وہ یہ کہ پشتو بولی کا نام بھی ہے اور پشتو بولنے والوں کے معاشی اور معاشرتی آئین و دستور یا ضابطۂ اخلاق کا نام بھی۔ گویا پشتون پشتو بولتے بھی ہیں اور ''پشتو کرتے اور برتتے'' بھی ہیں، یعنی پشتو کے قاعدوں اور ضابطوں پر عمل پیرا بھی ہیں (دیکھیے عبد القادر: پشتو فلسفہ، پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی).

مشرق و مغرب کے قریب قریب تمام مؤرخین و محقّقین اس امر پر متفق ہیں کہ انسانی تمدن کی نشو و نما و ارتقا کا گہوارہ وسط اشیا کا خطّہ ہے، جہاں کم از کم پچیس ہزار سال ق۔م انسان نے تمدّن کی بنیاد رکھی، نشو و نما پائی (مرتضٰی احمد خان: تاریخ اقوام عالم، ۱: ۶۶ تا ۶۷)۔ اسی سر زمین پر اس نے ترقی کی اور اطراف عالم میں پھیل گیا.

باختر جو اب صرف ''بلخ'' کہلاتا ہے، گو وہ آج کل افغانستان کا ایک ضلع بھی ہے، در حقیقت وہ قدیم و شکستہ حال فصیل اور گرد و پیش کے بے شمار کھنڈروں کے درمیان گھرا ہوا، لگ بھگ پانچ چھے سو گھروں کا ایک قصبہ ہو کر رہ گیا ہے، مگر زمانۂ قدیم کا باختر (بلخ) ایک وسیع علاقہ بھی تھا اور ایک آباد و با رونق شہر بھی، جو بقول بعض مؤرخین کے بابل و نینوا کا ہمسر تھا (کرنل سرتھامس ہالڈچ: ''دی گیٹس آف انڈیا''، ۱۹۱۰ء، ص ۱۷)۔ اس کا حدود اربعہ یوں تھا کہ شمال میں آمو دریا، مشرق میں بدخشان، جنوب میں سلسلۂ کوہ ہندو کُش اور مغرب میں صحرا یا ریگستان، اور اس کا رقبہ شمالاً جنوباً دریاے آمو سے لے کر کوہ ہندو کش تک تقریباً ایک سو بیس میل چوڑا، اور شرقاً غرباً مزار شریف تک تقریباً اڑھائی سو میل لمبا، یعنی تیس ہزار مربع میل تھا۔ اس کا بالائی حصہ خشک، بے برگ و گیاہ اور بنجر ریگستان تھا، مگر اس سے نیچے کا علاقہ بہت سر سبز و شاداب تھا، جو اس وقت اونچے اونچے جھنڈوں والا ملک یا سر زمین کہلاتا تھا (لغت نامۂ دھخدا، ایران، حصہ ب ۱، ص ۱۸۶)۔ یونانی اور عرب مؤرخوں نے اسے اُمّ البلاد، امّ القُرٰی یعنی مادر شہرہا اور جنت ارضی کے ناموں سے یاد کیا ہے (ڈبلیو ڈبلیو مارن: دی گریکس ان بیکٹریا اینڈ انڈیا، ۱۹۵۱ء، ۲: ۱۱۴)۔ وہاں کی سرسبزی،

شادابی اور زرخیزی بڑی پر کشش تھی، وہاں کے پھل خصوصاً انگور اور سیب خاصے بڑے اور رسیلے ہوتے تھے - حیوانات خصوصاً دو کوہانوں والے اونٹ، گھوڑے، گدھے اور دنبے تو جب سے آج تک مشہور چلے آرہے ہیں، بلکہ آج بھی لغت کی کتابوں میں وہی قدیم نام بختی (فیروز اللغات، ص ۱۹۱؛ نسیم اللغات، ص ۱۴۳؛ فرہنگ کاروان، ص ۱۰۴)، بڑے اور تیز رفتار اونٹ کے لیے پایا جاتا ہے - غرض یہ سر زمین اپنی آبادی اور زرخیزی کے باعث بڑی اہم رہی ہے (*Asiatic Nations* : Heeren، ۱ : ۳۲۴).

آریا قبائل جو پانچ چھے ہزار سال پہلے، شمالی میدان اعظم کی چراگاہوں میں مقیم تھے، تقریباً دو ہزاز سال ق م میں (تاریخ اقوام عالم، ص ۱۷۰)، جب کہ قدرتی موسمی کوائف کی تبدیلی کی وجہ سے وہاں اچانک سردی پڑنے لگی، سب کچھ برف سے ڈھک گیا، چراگاہیں ختم ہونے لگیں، زندگی گزارنا محال ہو گیا تو انہوں نے مجبوراً اپنی قدیم زاد بوم سے، جسے وہ اپنی آریک زبان میں ''آریانیم وایجو'' (آریانہ ویجہ) کہتے تھے، اٹھ کر جنوب کی طرف کوچ کرنا شروع کیا - ان قافلوں نے پہلے پہل سکھدا اور مورا (یعنی سغدیانہ مرو اور بدخشان) میں آ کر قیام کیا - کچھ عرصہ وہاں رہے، مگر مغول کے حملوں سے تنگ آ کر وہاں سے اٹھ آئے اور جنوب مشرق کی طرف، باختر (بلخ) میں آ ٹھیرے - یہ ان کا دوسرا پڑاؤ تھا - یہ جگہ سکھدا (سغدیانہ) سے بہت زیادہ اچھی تھی - یہاں ان نوواردوں (آریوں) نے دیکھا کہ اس علاقے کے لوگ متمدن اور زراعت پیشہ ہیں اور ہر قبیلے نے اپنے امتیازی نشان کے طور پر اونچے اونچے جھنڈے نصب کر رکھے تھے تاکہ پہچانے جائیں - یہ زمین چونکہ بہت اچھی اور آباد تھی، اس لیے آریوں کو بہت پسند آئی اور اسے ایک مستقل مستقر بنا لیا - اب آریوں کے یہ کوچی قبیلے سیدھے یہاں آتے، کچھ عرصہ گزارتے اور پھر آگے کوچ کرتے، (انوارالحق : پشتون، پشتو اور پشتونخوا (قلمی)، باب اوّل؛ *The Cyclopaedia of* : Edward Balfour *India and of Eastern and Southern Asia*، بار دوم، ۱ : ۳۸).

آریوں نے رگ وید میں باختر قدیم کا پکھت یا پکھتہ، بلْہیہ (بلخ) اور بلْہکا کے ناموں سے ذکر کیا ہے - سنسکرت ڈکشنری میں رگ وید کے حوالے سے ''پکتھہ'' ایک گروہ یا طبقے کا نام لکھا ہے اور پکتھیں اس کے ایک فرد کا نام بتایا ہے؛ *Sanskrit-English* : Sir Monier-Williams *Dictionary*، ص ۵۷۵)، ایسے ہی ژند آوستا میں اسے بخدے اور بخت وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے (عبدالحی حبیبی : دپشتو ادبیاتو تاریخ، کابل، ص ۲۹ تا ۳۰) اور مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں پکھت کے باشندوں کے لیے پکتو، پکتویس اور پکتوان نام لکھے ہیں اور پکتوان کو بہت جری، قد آور تنومند، جنگجو، پوستین پہننے والے اور خاص قسم کے خنجر اور جنگی اسلحہ رکھنے والے بتایا ہے - ساتھ ہی رگ وید اور ہیروڈوٹس کی تاریخ میں اس شمال مغربی سرحدی علاقے کے تین چار قبائل کے نام ملتے ہیں (رگ وید : گندھرو، گندھارا اور گندھاری؛ ہیروڈوٹس: گنداریوے، ستاگودایے، آپارتیوے اور دادیکایے) - ان قبائل کے لیے یہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہ آریا تھے، بلکہ ہیروڈوٹس نے ان چاروں قبیلوں کے علاقے کو اکھٹی ایک اقلیم شمار کیا ہے اور انہیں ہندی باشندہ اور تمام دیگر آریا قبائل سے ممیز و مختلف گردانا ہے اور پکتوان وغیرہ سے جو پکتی ایکا (پختونخوا) میں

رہتے تھے بہت مشابہ قرار دیا ہے (*The Pathāns*، اردو ترجمہ، پشتو اکیڈیمی، ص ٥، مقدمہ مصنف، ص ٥ تا ٧)۔

مؤرخین نے رگ وید کے لکھے جانے کا عرصہ زیادہ سے زیادہ ١٥٠٠ ق م، ژند آوستا کا ١٠٠٠ ق م اور ہیروڈوٹس کا ٥٠٠ ق م تک مقرر کیا ہے۔ ان تینوں حوالوں میں سے پہلے دو تو خود آریوں کی مذہبی کتابیں ہیں جن کی تاریخی حیثیت مانی جا چکی ہے۔ وید علی‌الخصوص سب سے پہلا یعنی رگ وید جس کے ذریعے آریوں کے تاریخی حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں (A: Arthur A. Macdonell: *History of Sanskrit Literature*، ١٩٢٨ء، ص ٨، ٩؛ گستاو لیبان: تاریخ تمدن ہند، ص ٢٠٨)۔ شمال مغربی سر زمین پاک و ہند میں لکھے گئے ہیں، اور ژند (زرتشت کی مذہبی کتاب) خاص باختر (بلخ) میں لکھی گئی ہے، اور تیسرا حوالہ مشہور ایرانی بادشاہ داریوش کبیر (٥٢١ سے ٤٨٥ ق م) کے یونانی مؤرخ و سوانح نگار اور جغرافیہ‌دان ہیروڈوٹس (٤٢٣ سے ٤٨٣ ق م) کی تاریخ کا ہے جس میں اس نے داریوس کی مملکت میں باجگزار اقالیم کی فہرست بھی دی ہے اور اس کی سلطنت کی وسعت اور فوجی طاقت و سطوت کی تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ پکھت، پکھتہ، پکھتین، بخدی، بختی، پخت، پکتو اور پکتوان وغیرہ کا ذکر کرنے والے خود وہی قدیم ہندی اور پھر ایرانی آریا ہیں اور ان کے بعد یونانی مؤرخ ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے اور تیسرے کئی یونانی، چینی اور عرب مؤرخوں اور سیاحوں کا نام بھی لیا جاتا ہے، مگر وہ سب ان مذکورۂ بالا مآخذ کے بہت بعد کے ہیں۔

علاوہ ازیں سائبیریا کی چراگاہوں کے رہنے والے آریاؤں نے اپنے اسی قدیم مسکن یعنی میدان اعظم کا نام "آریا نیم وائجو"، "ایرین ویجہ" یا "آریانہ ویجہ" رکھا تھا۔ ایران میں مقیم ہو کر اس کا نام "ایران ویج" رکھا اور آخری پڑاؤ میں جب وہ شمالی ہند کے کوہ دامانوں میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تو وہاں کا نام انھوں نے "آریا ورش" رکھا اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں اور ضابطوں کو "آریا ورت" کا نام دیا، لیکن باختر قدیم کا نام انھوں نے نہیں بدلا اور نہ اپنے نام سے، کسی شکل میں منسوب و موسوم کیا (عبدالحی حبیبی: تاریخ ادبیات پشتو، کابل، ص ٥١؛ مانک جی نسیروان جی ڈھلا: زورسٹرین تھیالوجی، ١٩١٣ء، ص ٢٧٣؛ عبدالحی حبیبی: پشتو ادبیاتو تاریخ، ص ٢٣) بلکہ وید میں پکھت، پکھتہ، بلہہ، بلہہ، بلہکا اور باشندوں کا پکھتین یا پکھتین اور ژند آوستا میں بخدی، بختی، پخت اور ہیروڈوٹس نے پکتویس، پکتو اور پکتوان اور جگہ کا نام پکتی‌ایکا صاف صاف بیان کیا ہے۔

بعض کا خیال ہے (A: Sir Percy Sykes: *History of Persia*، ص ٩٨) کہ آریا قبائل باختر میں پہلے پہل ٢٥٠٠ سال ق م سے بھی بہت پہلے آئے ہیں۔ پشتو ادبیاتو تاریخ کے صفحہ ٥١ پر جناب عبدالحی حبیبی نے بحوالۂ ایران قدیم "صفحہ ٩ اور" تمدن ایرانیان خاوری "صفحہ ٦٣ تا ٧٠"، آریوں کے ترک سکونت کر کے باختر آنے کا زمانہ ٤٠٠٠ سال ق م لکھا ہے، اس بیان سے باختر کے متمدن اور زراعت پیشہ باشندوں کی قدامت اور بھی زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

بعض مؤرخوں (احمد علی کہزاد: تاریخ افغانستان، کابل؛ عبدالحی حبیبی: دپشتو ادبیاتو تاریخ، ص ٢٠) نے آریوں کے لیے لکھا ہے کہ وہ زراعت پیشہ اور کاشتکار تھے، کیونکہ "آریا" نام مرکب ہے آر اور یائے نسبتی سے۔ آر کہتے ہیں

نوکدار چیز کو، جس سے مراد ھل کی پھال ہے، مگر یہ توجیہ اور تشریح غلط معلوم ہوتی ہے۔ آر اور آریا دونوں مفرد نام ھیں، آر نوک کو اور ھر نوکدار چیز کو کہتے ھیں، جیسے نیزے کی انی، تیر کی نوک، میخ (کیل) کا نوکدار سرا، بیلوں کو ھانکنے کی چھڑی یا لکڑی، جس کے سرے میں لوھے کی چھوٹی سی میخ لگی ہوتی ہے، اور آریا کے معنی ھیں شریف، نجیب، معزز، بلند مرتبہ۔ سنسکرت کی کسی لغت میں آریا کے معنی زراعت پیشہ کے اب تک نظر سے نہیں گزرے۔ قیاس کہتا ہے کہ آریوں نے زراعت اور کاشتکاری پہلی بار باختر میں آن کر دیکھی، اگر سیکھی بھی تو یہیں پکتھینوں سے سیکھی ہوگی، جو ان کی آمد سے ہزاروں سال پہلے متمدن ہو چکے تھے۔

آریوں کی ان محولۂ بالا تحریروں اور حوالوں سے ثابت ہوگیا کہ پکھت (پخت، پشت)، پخد اور پکتی ایکا (پختیخا، پختونخوا، پشتونخوا) میں رھنے والے پکھتین (پختین، پشتین) اور ھیروڈوٹس کے پکتوان، جو باقاعدہ متمدن اور کاشت کاری کی زندگی گذارتے آ رھے تھے، یہی پشتون یا پختون ھیں۔

پشتو: اس میں شک نہیں کہ ایسی بین تاریخی شہادت اب تک دستیاب نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ یقین سے کہا جا سکتا کہ قدیم پشتونوں کی بولی کا نام پشتو تھا اور وہ شروع سے یہی پشتو بولتے آ رھے ھیں، لیکن یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پشتون آریوں کی آمد سے بہت پہلے اپنے قدیمی وطن پشتونخوا میں رہتے تھے، لہذا ان کی بولی بھی یقینًا بہت پرانی ہوئی۔ ایسے ھی یہ بھی قیاس غالب ہے کہ پشتونوں کی بولی پشتو ھی ہو۔

یورپی محققین اس ایک خیال میں بالکل متفق ھیں کہ ھندی۔ یورپی زبانیں ایک ایسی زبان سے نکلی ھیں، جو ان سب زبانوں کی ماں تھی (میکس مولر: علم الالسنہ، جلد اول، صفحہ ۳۰۹؛ ڈاکٹر گستاو لیبان: تمدن ھند۔ بار دوم، صفحہ ۱۰۲ اور صفحہ ۳۳۲؛ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا، جلد اول، صفحہ ۱۷۴ تا ۱۷۶؛ انسائیکلو پیڈیا امریکانا، جلد دوم صفحہ ۳۷۲؛ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسیز، جلد دوم، صفحہ ۲۶۴؛ مسٹر کول بروک: ایشیاٹک ریسرچز، جلد ھفتم، صفحہ ۲۰۰؛ وانز کینیڈی: دی پرنسپل لینگویجز آف ایشیا اینڈ یورپ، باب سیزدھم، صفحہ ۲۱۳)۔ مگر وہ زبان کیا تھی؟ کہاں تھی؟ اور کیا ہوئی؟ اس عقدے کو حل کرنے سے وہ سب قاصر رھے۔ انھوں نے عالم تصور میں ایک زبان کو ام الالسنہ فرض تو کر لیا، لیکن وہ اسے متعین نہ کر سکے، بلکہ اکثر مؤرخوں نے لکھ دیا کہ وہ زبان اب ناپید و معدوم ہے بعینہٖ جیسے ویدی، اوستائی اور یونانی مؤرخ کی صریح شہادتوں کے باوجود پشتون قوم کی قدامت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کسی نے اسے آریا یا بنی اسرائیل بتایا، اور کسی نے میدی یا پارتھی۔ ایسے ھی پشتون زبان کے بارے میں بھی تحقیق کا حق ادا نہیں ہوا۔ ورنہ اکثر قرائن اس بات کے حق میں ھیں کہ باختر قدیم کے قبائل میں پانچ ھزار سال ق۔م۔ بلکہ اس سے بھی پہلے بولی جانے والی زبان پشتو ھی تھی، جس کا بہر حال اعتراف مناسب تھا۔ علم الالسنہ کے ماھروں نے ھندی۔ یورپی زبانوں کو تین گروھوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) ھندی یا ھندوستانی: سنسکرت، پراکرت، قدیم کتبوں کی زبانیں، پالی اور تعلیمات بدھ کی زبان، جین مت کی آردھ ماگھدی، پاک و ھند کی علاقائی زبانیں (پراکرتیں): جیسے مراٹھی، گجراتی، بنگالی، سندھی پنجابی، بلوچی کشمیری، تبتی، اوڑی اور پراچی وغیرہ بہت سی زبانیں؛ (۲) ایرانی: ژند۔ پاژند کی

زبان اوستا، هخامنشیوں کی زبان، قدیم فارسی، پہلوی، فارسی جدید، دری، ارمنی، میدی اور پارتھی وغیرہ؛ (۳) یورپی : کلتی، ہیلینک، اِتالک، تیوتانک، سلیوانک اور لتھوانک وغیرہ ۔ چنانچہ ان تینوں گروہوں کی زبانوں میں قدیم پشتو کسی اور زبان سے کم قدیم معلوم نہیں ہوتی .

تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان تمام مذکورۂ بالا ہندی ۔ یورپی زبانوں کے کلمات اور لغات، جن کی بنا پر ان زبانوں کا آپس میں رشتہ و تعلق ثابت ہوتا ہے وہ سب پشتو میں موجود ہیں، بلکہ آج بھی رائج ہیں، حتی کہ آریوں کی قدیم زبان ''اریک'' کا بھی پشتو سے گہرا تعلق ہے Monier Monier-William) : Sanskrit-English Dictionary، ص ۱۲؛ The Origin of the Aryan Family of Languages (۱۸۶۱ء)، بحوالۂ دبستان (انگریزی ترجمہ)، جلد اول، صفحہ ۲۲۲، حاشیہ ۱؛ سید انوار الحق : پشتون، پشتو اور پشتون‌خوا، (قلمی)، پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی؛ پشتو اور پشتون کے مابین ربط و تعلق کی قدامت اس امر سے ثابت ہوتی ہے کہ پشتو، پشتونوں کی صرف بولی یا زبان ہی کا نام نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے پشتونوں کے دستور و آئین حیات اور ان کی تہذیب و تمدن کا نام بھی شروع سے پشتو یا پختو چلا آ رہا ہے، اسی لیے پشتو شروع ہی سے پشتون سے وابستہ ہے .

دنیا میں کسی بھی پرانی قوم اور زبان کے بارے میں یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خالص ہے، اسی طرح پشتونوں میں بھی آریا، میدی، ہخامنشی، منگول، ھن، تاتاری، عرب، اور جانے کون کون سی قومیں آ آ کر ملتی اور مدغم ہوتی رہی ہیں اور آہستہ آہستہ سب پر پشتونوں اور پشتو کا رنگ چڑھتا گیا اور ایک وقت میں ان کے ساتھ مل کر سب پشتون ہو گئے .

بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس قدامت کے پشتو زبان میں نسبۃً کچھ زیادہ فرق و اختلاف رونما نہیں ہوا ۔ آج بھی اس کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ، اکثر بجنسہ و بعینہ یا معمولی سے فرق کے ساتھ، سنسکرت، پراکرت، اوستا، پہلوی، فارسی، یونانی، جرمنی، اور فرانسیسی زبانوں میں پائے جاتے ہیں، حتی کہ پشتو میں شین اور سین، ژے اور گ، جیم یا زے کا اختلاف بھی شروع سے چلا آ رہا ہے، جس کی وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی .

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک تو پشتون خود اپنی زاد بوم سے اٹھ اٹھ کر گرد و پیش میں جہاں جہاں انہیں سازگارمقامات ملتے گئے وہاں گئے اور بسے، دوسرے خود ان میں بھی اطراف و اکناف کی بہت سی قومیں آ آ کر گھلتی ملتی رہیں، جن میں سب سے مقدم آریا ہیں اور پھر ان کے بعد اور چار پانچ مذکورۂ بالا بڑی بڑی قومیں ہیں ۔ اس آمد و رفت اور تفرق و اتصال کا اثر قدرۃً زبان پر بہت زیادہ پڑنا چاہیے ۔ بہت سے الفاظ آنے والی قومیں اپنے ساتھ لائی ہوں گی اور کتنے ہی الفاظ پشتونوں سے اخذ کیے گئے ہوں گے ۔ ایک دوسرے کے ساتھ زبانوں کے خلا ملا اور اختلاط و آمیزش کا یہ سلسلہ دنیا میں یونہیں چلتا رہے گا ۔ اس کے ثبوت میں انگریزی زبان کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جس میں دخیل الفاظ کی حیران کن کثرت ہے (English Oxford Dictionary بڑی تقطیع کی تیرہ جلدیں اور امریکہ کی Webster's Zino International English Dictionary پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے) ۔ یہی حال اردو، ہندی، فارسی، عربی اور پشتو وغیرہ کا ہے، کیونکہ ایسا ہونا ناگزیر ہے ۔ یہ بات نہ تو قابل فخر و مسرت

ہے اور نہ لائق تأسف و نفرت، بلکہ یہ تو ایک قدرتی امر ہے - نتیجہ یہ نکلا کہ پشتو کی بنیاد و اساس وہی زبان ہے جو تقریباً پانچ ہزار سال ق م وسط ایشیا اور باختر قدیم میں بولی جاتی تھی، بالخصوص وہ بولی جو پکھتین، بخدی، یا بکتوان (پشتون یا پختون) بولتے تھے اور اس میں آمیزش دوسری تیسری زبانوں کی پائی جاتی ہے، جو بعد میں ہوئی، ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی.

پشتو رسم الخط:

جب ہم پشتو کے متعلق یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ قدیم ترین زبانوں میں سے ہے، تو قدرۃً دوسرا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تحریری ثبوت کیا ہے اور کب سے ملتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں معلومات بہت محدود ہیں - حقیقت پر ابھی تاریکی کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ جہاں دنیا کے اور ہزاروں واقعات ابھی نظروں سے اوجھل ہیں، وہاں یہ چیزیں بھی مستور و پوشیدہ ہیں - اب تک صرف اس قدر علم حاصل ہو سکا ہے کہ پہلے یہاں خط میخی کا رواج رہا ہے، پھر خروشتی کا، اس کے بعد یونانی، براهمی، دیوناگری، اور آوستا وغیرہ کا، اور بالآخر عربی رسم الخط نے آکر دیوناگری کے سوا اور سب کو ختم کر دیا؛ اس لیے وہ پرانے خطوط و نقوش، جو یوں بھی کوئی زیادہ نشو و نما یافتہ نہیں تھے، آهستہ آهستہ مٹتے گئے - صرف یادداشت کے طور پر، تاریخ کی بعض بہت اہم کڑیاں ملانے کی غرض سے تھوڑے تھوڑے اور ادھورے سے نمونے کچھ لوگوں کے گھروں میں اور کچھ عجائب گھروں میں محفوظ ہیں، جن میں بہت سے خط اب بھی ایسے ہیں جو پڑھے نہیں جا سکتے.

قیاس کہتا ہے کہ پشتو جس جس دور سے گزری اور جیسے جیسے رنگ میں رہی ہے، یقیناً وقت وقت کے مختلف لہجوں میں بولی گئی ہوگی اور وقت وقت کے مختلف خطوں میں لکھی گئی ہوگی - اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ داریوس کبیر (٥١٦ ق م) کے سنگی کتبوں میں جو میخی خط میں کندہ کیے گئے ہیں، تین جملے پشتو سے اس قدر مشابہ ہیں کہ خالص پشتو معلوم ہوتے ہیں - وہ جملے لہجے کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ یوں ہیں:

نے اَرِیکَہ آھم - نے دِروَغنَہ آھم - نے زوُرکَرَہ آھم

(قدیم سنگی کتبہ)

نہ اڑیکے یم - نہ دروغژن یم - نہ زور ور یم

(پشتو صورت)

(نہ اڑیل ہوں، نہ دروغ گو ہوں، نہ جابر ہوں)

(اردو ترجمہ)

(رضا زادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران، اردو ترجمۂ از سید مبارزالدین رفعت، حیدرآباد دکن، صفحہ ۲۹) - ایسے ہی سنگی کتبوں کا، جو خروشتی یا کسی دوسرے براهمی خط میں کندہ ہیں اور پشتونوں کے علاقے میں پائے گئے ہیں، اگر بغور و بدقت نظر مطالعہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پشتو نکل آئے - کیونکہ جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے ادھر آوستا، پہلوی اور فارسی میں اور ادھر سنسکرت، ہندی اور دیگر ملحقہ علاقوں کی پراکرتوں میں، پشتو کے سیکڑوں الفاظ آج بھی پائے جاتے ہیں - بہر کیف باقاعدہ تحریری شکل میں پشتو ادب صرف عربی رسم الخط ہی میں سامنے آیا ہے - کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی، کے اواخر میں سلطان محمود غزنوی کے ایک وزیر احمد بن حسن میمندی نے کی تھی، مگر پشتو چونکہ ہندی-یورپی زبانوں کی ماں ہے، اس لیے لب و لہجہ اور صوتیات میں عربی اور عبرانی

یعنی سامی زبانوں سے مختلف ہے، پشتو کے لیے
عربی حروف تہجی (الفبا) کافی نہیں تھے، اس لیے
بزرگوں نے عربی حروف تہجی ہی میں حسب
ضرورت کچھ حروف بڑھا لیے، مگر بجائے نئے حروف
وضع کرنے کے انہیں مقررہ سابقہ حروف میں سے
چند ایک میں کچھ علامات و نشانات کو گھٹا
بڑھا کر اور الٹ پلٹ کر کے استعمال کے لیے مفید
بنا لیا، جو آج تک چل رہے ہیں - پشتو زبان
کے الفبا:

ا ب پ ت ټ ث ج ځ چ څ ح خ د ډ ذ ر ړ ز ژ
ږ س ش ښ ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ګ ل م
ن ڼ و ہ ء ی ے۔

ان میں سے ا، و، ہ اور ی چار حروف علت (vowels)
ہیں، اس طرح کہ الف سے مراد عام زبر (فتحه)
اور "ہ" سے مراد خاص زبر (فتحه)، "و" پیش
(ضمه) کے لیے اور "ی" زیر (کسره) کے لیے استعمال
ہوتی ہے اور باقی حروف صحیح (consonants) ہیں۔

ان حروف صحیحه (یا صامته) میں پ، چ اور ژ
ایسے حروف ہیں جن میں سے پہلے دو صوتی لحاظ
سے ہندی اور سنسکرت میں شامل ہیں اور ویسے
تینوں حروف فارسی، ترکی، روسی اور چینی زبانوں
میں شامل ہیں ۔

ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ع عربی کے
خصوصی حروف ہیں - جس لفظ میں ان میں سے ایک
حرف بھی آ جائے تو اسے عربی کا سمجھنا چاہیے - بعض
علما نے ف اور ق کو بھی عربی کے خصوصی حروف
شمار کیا ہے، لیکن یہ حروف فارسی اور ترکی میں عام
ہیں، اس لیے انہیں عربی کے مخصوص حروف میں
شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ټ ځ څ ډ ړ ږ ښ ګ اور ڼ پشتو کے نو
خصوصی حروف مانے جاتے ہیں ان میں سے ټ
(ٹ)، ډ (ڈ)، ړ (ڑ)، ګ (گ) اور ڼ (نڑ) صرف صوری
اختلاف رکھتے ہیں، ورنہ آواز کے لحاظ سے ان میں اور
ٹ ڈ ڑ گ اور نڑ میں کوئی اختلاف نہیں ہے - البته
ځ څ ږ اور ښ صرف چار حروف ایسے ہیں
جو صوتی اختلاف کی بنا پر ج چ ژ اور ش کے بدلے
رکھے گئے ہیں - جہاں ہندی لہجوں میں ج کی
آواز ز، چ کی آواز س، ژ کی آواز گ یا ج
اور ش کی خ سے بدلتی ہے، ان آوازوں کے اظہار
کے لیے ج کا نقطہ ہٹا کر اس کے سرے پر همزه
لگا دیا، یعنی "ج" سے ځ (دْزِیم = زِیم)، جس کی
آواز دْ زّ = ز ہو گئی (جیسے جناور = ځناور = دْزناوَر =
زناور؛ جاے = ځاے = دزاے = زاے؛ جان = ځان
= ڈزان = زان)؛ "چ" کے تین نقطے نیچے سے ہٹا کر اس
کے اوپر لگا دیے، یعنی "چ" سے څ (تسے = سے)
بنا دی (جیسے چمچا = څمڅه = تسمتسه = سمسه؛ چار
پاے = څاروے = تساروے = ساروے؛ چادر = څادر =
تسادر = سادر)؛ ژ سے تین نقطے ہٹا کر ایک نقطه اوپر
اور ایک نقطه نیچے لگا کر ژ سے ږ (گے) کر دیا،
جیسے ژ لئی (ژاله = اولے) سے ږ لئی یا ږ لئے = گلئی
یا گلئے؛ ژیره (داڑھی) سے ږیره (گیره)]؛ کہیں ژ کی
آواز ج سے بدلتی ہے، جیسے ژاوله (موم) کو جاوله؛
وریژه (چاول) کو وریجه؛ ژامه (ڈاڑھ) کو جامه؛
ژبه (زبان) کو جبه]؛ "ش" کے تین نقطے ہٹا کر
ایک نقطه اوپر اور ایک نیچے لگا کر اسے ش سے
ښ (خین) بنا دیا جیسے شاخ سے ښاخ (خاخ)؛ پیش
(ضمه) سے پښ (پیخ) اور شیشه سے ښیښه (خیخه)؛
وغیره۔

ج کی جگه ځ (دْزّ) اور چ کی جگه څ (تسّ)
تو پنجاب کے بعض علاقوں، مارواڑ، میواڑ اور بنگال
کے بعض حصوں میں بھی بولا جاتا ہے - چینی اور
روسی میں بھی سننے میں آتا ہے اور یه اختلاف
بھی قدیمی معلوم ہوتا ہے - ایسے ہی جو لوگ
"ژ" کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے وہ قدرةً اس

کی جگہ ی کی آواز نکالیں گے جیسے پلیژر Pleasure پلیژ اور میژر Measure کو میژ بولتے ہیں۔ ایسے ہی پشتونوں میں بھی جن کے لہجے میں شروع سے ژ شامل نہیں، وہ قدرۃً ژ کی جگہ ی، ج، گ یا ز کی آواز نکالتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ش کا دو مختلف لہجوں میں بولا جانا بھی زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے ۔ ش کی اختلافی آواز کے لیے دیوناگری میں ایک حرف ہے جو یہی آواز دیتا ہے وہ ښ ہے ۔ اس حرف کی صحیح آواز ش اور خ کے بین بین ہے جو ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو کھ، ھہ، خہ یا، شہ بن جائے گی ۔ ورنہ اس کی آواز میں ش، خ اور ہ کی آوازیں ملی ہوئی ہیں، اسی لیے ہندی لفظ بابا، باکھا (یا بابا) پڑھا جاتا ہے، جس کا غلط تلفظ پاشا ہے ۔ آدمی اپنی مادری زبانوں کی، یہ باتیں بچپن ہی سے از خود سیکھتا ہے ۔ ښ اور ږ کا صحیح تلفظ قندہار کے باشندے ادا کرتے ہیں، کیونکہ وہاں کی پشتو میں یہ دونوں حروف اپنی اصلی آواز کے ساتھ شامل ہیں، بعینہٖ جیسے عربی میں ث، ذ اور ض یا سندھی میں پ، ج، ڈ اور گ کا صحیح تلفظ غیر اہل زبان کے لیے بہت مشکل ہے۔

چنانچہ پشتو بولنے والے شروع سے دو طبقوں میں منقسم ہیں ۔ ایک وہ جو "ژ" اور "ش" اپنی اسی آواز کے ساتھ بولتے ہیں جو فارسی میں بھی پائی جاتی ہے ۔ دوسرے وہ جو "ژ" کی جگہ گ، ج، یا ز بولتے ہیں اور "ش" کی جگہ خ ۔ ان میں امتیاز کے لیے عام طور پر ژ اور ش بولنے والے خٹک لہجے کے پشتون اور گ، ج اور خ بولنے والے یوسف زئی لہجے والے کہلاتے ہیں۔

پشتونوں میں لہجے کے اختلاف کی یہ امتیازی لکیر اٹک سے لے کر افغانستان میں دور تک کھنچی چلی گئی ہے جو سر اولف کیرو (The Pathans) نے بالوضاحت بتلائی ہے کہ شمال مشرقی قبیلے، پشتو (پختو) اور جنوب مغربی قبیلے پشتو بولتے ہیں۔ دونوں کے درمیان حد فاصل قریب قریب شرقاً غرباً اٹک کے جنوب میں دریائے سندھ سے کوہاٹ اور وادی میراں‌زئی ہوتی ہوئی ٹل تک اور وہاں سے دریائے کرم کے جنوب میں ہریوب اور درۂ شترگردن تک جاتی ہے، اس حد کے شمال مشرق میں پشتو (پختو) بولی جاتی ہے اور یہ پشاور کے تمام قبائل، دیر، سوات، بنیر اور باجوڑ کی زبان ہے ۔ اس حد کے جنوب مغرب میں جو قبائل پشتو بولتے ہیں، ان میں سب خٹک، درانی، قریب قریب تمام خلجی (جلال آباد کے قریب کے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر)، خوست، وزیرستان کے سارے قبائل، بنوں اور ڈیرہ جات کے قبائل، ژوب اور بلوچستان کے ان دوسرے علاقوں کے پشتون بھی جو قندھار کے قریب واقع ہیں، پشتو بولتے ہیں۔

مگر تحریر میں عرصۂ دراز سے یکسانیت تسلیم کر لی گئی ہے، یعنی لہجہ چاہے خٹکوں کا ہو، چاہے یوسف زئی کا، اختلافی ژ کو ږ اور ش کو ښ لکھا جائے گا ۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پشتو کے اور فارسی، اردو رسم الخط میں فرق صرف ان چار حروف ځ څ ږ اور ښ کا رہ جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ اور کوئی اختلاف نہیں ۔ رہا لہجے کا اختلاف یا رسم الخط میں نسخ اور نستعلیق کا سوال، تو وہ ان دوسری پڑوسی زبانوں کے ساتھ مشترک ہے، جیسے خود اردو، پنجابی اور بنگلہ میں لہجوں کا اختلاف پایا جاتا ہے، یا اردو اور فارسی زبانوں کے مدعیوں میں نسخ اور نستعلیق کے لیے پسند و ناپسند کا اختلاف چلا آ رہا ہے، ایسے ہی پشتو میں ایک طبقہ نستعلیق رسم الخط پسند کرتا ہے تو دوسرا نسخ کا خواہش‌مند ہے ۔ اس معاملے کا تعلق

کثرت رائے پر رہے گا، یا حکومت وقت کی سر پرستی پر، جدھر کا پلّہ بھاری رہا، وہی غلبہ حاصل کر لے گا، ورنہ یہ اختلاف یونہیں چلتا رہے گا۔

پشتو ادب:

پشتون اور پشتو زبان کی قدامت تسلیم کر لینے کے بعد پشتو ادب کی قدامت بھی لازماً ماننی پڑتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ پشتو کی قدامت کے باوجود قدیم زمانے کا کوئی واضح اور قطعی نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہوا جو پیش کیا جا سکے۔ یہ صحیح ہے کہ پانچویں صدی ق م کے مذکورہ تین جملوں کا پتا چلتا ہے جو داریوش کے سنگی کتبے میں شامل ہیں اور جنھیں ہمارے بعض تذکرہ‌نگاروں نے بحر خفیف میں تین مصرعے قرار دیا ہے، لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ چونکہ افغانستان کے مؤرخوں نے پشتونوں کو اپنی طرف سے آریا ثابت کر رکھا ہے اور پشتو کو آریوں کی زبان، اس لیے پشتو ادب کا آغاز ویدوں کے اشعار سے کرتے ہیں، حالانکہ پشتو ٹپے بھی قدامت میں ویدوں سے زیادہ پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پشتو ٹپہ: سپوږمۍ سروهه راخیژه، یارم دگلو لوَکوی، گټے دیبی نه! (=چاند! سر اٹھا کے جلدی سے نکل آ۔ محبوب میرا، پھولوں کی کٹائی (درو) کر رہا ہے، (اندھیرے میں) اپنی انگلیاں کاٹ لے رہا ہے)، (پشتنے سندرے، پشتو ٹولنہ، کابل، ص ۱۹۴)، بالکل رگ وید زمانے کا ہے (جو پہلا وید ہے اور تخمیناً ۱۵۰۰ سال ق م میں سر زمین پاک و ہند کے اسی شمال مغربی علاقوں میں مرتب کیا گیا تھا)۔ اس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔ ٹپوں میں چونکہ شاعر اور وقت کا ذکر نہیں ہوتا، اس لیے صحیح طور پر تعین زمان و مکان نہیں کیا جا سکتا، البتہ نظم میں جو قدیم ترین نمونۂ کلام ہاتھ آیا ہے وہ بقول تذکرہ نگار محمد ہوتک (۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء): پټه خزانه مطبوعۂ پشتو ٹولنہ، کابل، ص ۳۱ تا ۳۵، امیر پولاد سوری کے بیٹے امیر کروڑ پہلوان بادشاہِ غور (۱۳۹ / ۷۵۶ء) کی رجزیہ نظم ہے، جس کا پہلا شعر یا بند یوں ہے:

زه یم زمرے، پردے نړئی، لـه مـا اتل نشته
میں ہوں شیر اس آبادی پر، مجھ سا بےمثال کوئی نہیں
په هند و سند و پرتخار او پر کابل نشته
ہند و سندھ اور طخارستان و کابل میں نہیں
بل پـه زابل نشته ـ لـه مـا اتل نشته
دوسرے زابلستان میں نہیں! مجھ سا بےنظیر اور کوئی نہیں۔

اگرچہ امیر کروڑ کی نظم اپنی صنعت و ساخت، سلاست و روانی اور باقاعدگی کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ نظر آتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو ادب کا آغاز اس سے کافی مدت قبل ہو چکا ہو گا۔ تاہم اس بیّن تاریخی شہادت کے سبب، پشتو ادب کی ابتدا دوسری صدی ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے لینا پڑتی ہے اور اس مناسبت سے تاریخی پشتو ادب کو عموماً چار ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے: (۱) ۲۰۰ تا ۱۰۰۰ھ؛ (۲) ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ھ؛ (۳) ۱۲۰۰ تا ۱۳۰۰ھ؛ (۴) ۱۳۰۰ تا عہد حاضر۔

پشتو ادب کی تاریخی تفصیل میں جانے سے پہلے، یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پشتو ادب دو اصناف پر مشتمل ہے، ایک عوامی، جس کے لیے تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا؛ دوسرا علمی اور کتابی، یعنی تاریخی۔ ان میں سے عوام (لوک = Folk) سے جو ادب منسوب ہے، وہ شروع سے زبانی چلا آ رہا ہے۔ نہ ان میں کہنے والوں کا پتا چل سکتا ہے، نہ مقام اور وقت کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس

نظم و نثر میں یہ چیزیں، ہر علاقے میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ، یونہیں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں ۔ بعض قسمیں جیسے چار بیتے، لوبے اور بدلے وغیرہ، اگر کسی دور کے خواندہ شائقین ادب نے لکھ کر محفوظ کر لیں تو رہ گئیں، ورنہ کہنے والے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے جاتے رہتے ہیں اور نئے آنے والے نئی نئی وضع کرتے رہتے ہیں ۔ صرف انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے کچھ تحریری مجموعے، کچھ مطبوعہ، کچھ غیر مطبوعہ، کچھ مقامی ادیبوں کے ہاتھ کے اور کچھ یورپی مستشرقین کے مطبوعہ دستیاب ہوتے ہیں، باقی بھاری قدیم ذخیرہ اپنے اپنے وقت کے کہنے والوں کے ساتھ ساتھ مدفون و معدوم ہوتا رہا ہے ۔

عوامی ادب میں پہلے قصے کہانیاں، کہاوتیں، پہیلیاں، مقولے، لوریاں اور مرثیے ہیں، اور پھر ٹپہ، چاربیتہ، اوبہ، نیمکئی، بدلہ، رباعی، غاڑے، نارے (نعرے)، غزونہ، بابولالہ، شاڈولہ اور بلبلہ وغیرہ کے سندرے (گیت) ہیں جن کا مختصر بیان یہاں مناسب رہے گا:

کیسئی (قیصئی) : یعنی قصے کہانیاں، جو عموماً نثر میں زبانی چلی آ رہی ہیں ۔ ان چھوٹی بڑی کہانیوں میں بڑا حصہ بچوں کے لیے فرضی کہانیوں کا ہے، جو سادہ بھی ہوتی ہیں اور رنگین بھی ۔ یعنی ان میں کہیں کہیں دلچسپی بڑھانے کی خاطر رنگ آمیزی بھی کی جاتی ہے، جس میں کچھ منظوم مکالمے ہیں، جو کہانی سناتے وقت ترنم سے یا سادہ طریقے پر مگر نظم کی شکل میں بولے جاتے ہیں ۔ (حسن و عشق کی طویل رومانی داستانوں میں یہی منظوم مکالمے ''نارے'' یا ''غبزونہ'' کہلاتے ہیں) ۔

اڑ : (پہیلی، بجھارت یا چیستان)، یہ بڑی دلچسپ صنف ہے ۔ اور زیادہ‌تر بچوں کے لیے بطور ذہنی اور علمی مشغلے کے وضع کی جاتی ہے ۔

متل (مثل یا کہاوت) : متل درحقیقت عوامی ادب کا ایک بیش بہا اور اہم جز ہے ۔ اپنی ساخت اور ترکیب میں انفرادیت لیے ہوئے ہے ۔ متل نظم میں بھی شامل ہے اور نثر میں بھی، مگر چونکہ متل میں کہنے والے کا نام، مقام اور وقت کا ذکر نہیں ہوتا، اس واسطے اس کی قدامت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ لیکن ان کے ذریعے ایک قوم کے فطری خاصوں، ان کے ماحول اور روزمرہ کے پیش آئند واقعات و حالات کا بڑا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ پشتو زبان خواہ وہ علمی اور کتابی ہو یا عامیانہ، کہاوتوں سے مالا مال ہے ۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ضرب الامثال کی کثرت کے لحاظ سے پشتو بڑی فوقیت رکھتی ہے ۔

ٹپہ : پشتو ادب کی یہ مخصوص و منفرد صنف، بڑی عالمگیر خصوصیات کی حامل ہے ۔ عام و خاص ہر دو طبقوں کے ادب میں یکساں شامل ہے ۔ اگرچہ اس کے کہنے والے زیادہ تر خواندہ عوام ہوتے ہیں ۔ یہ ڈیڑھ مصرع کا ایک شعر، اپنی ترکیب اور ساخت میں مخصوص و منفرد، کہاوت سے بھی زیادہ جامع و مانع، پوری زندگی پر حاوی، ہر قسم کے فطری جذبات و حسیات سے پر، خارجی و داخلی، ذہنی و قلبی تأثرات و کوائف کا مکمل آئینہ ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے سیکڑوں ٹپے بطور ضرب المثل بھی زبان زد ہیں ۔ ٹپے میں حسن و عشق، فرحت و انبساط، غم و الم، نفرت و حقارت، انس و محبت، طعن و تشنیع، تحسین و آفرین، مدحت و منقبت، ہجو و مذمت، ترغیب و تحریص، صبر و قناعت، شجاعت و بسالت، بے جگری و سر فروشی، ملک و قوم کی حفاظت، ننگ و غیرت،

مروت و حمیت، خود داری و عزتِ نفس، غمخواری، غرباپروری، مہمان نوازی، غرض کہ معاش و معاد، دین و دنیا اور رزم و بزم میں کیا بچ رہتا ہے جو ٹپے میں بیان نہیں کیا جاتا - ٹپے ہر دور میں کہے جاتے ہیں - عورت و مرد، خواندہ و ناخواندہ، عالم و جاهل سب ٹپہ کہتے اور وضع کرتے رہتے ہیں - کہاوتوں کی طرح ان میں بھی کہنے والے کا نام، وقت اور مقام کا ذکر نہیں ہوتا - وہ تو سدا بہار پھول بوٹے کی طرح ہمیشہ ترو تازہ ہی رہتا ہے، یعنی اس کا اطلاق اپنے مناسب موقع و محل پر ہمیشہ یکساں رہتا ہے - عام خیال یہی ہے کہ ٹپہ پشتو کا مخصوص ادبی ورثہ ہے، جو قدامت میں اسی زمانے تک پہنچتا ہے، جہاں سے خود زبان چلتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ پشتو عوامی ادب کا دو تہائی سرمایہ صرف اسی صنعت میں ہے، کیونکہ مرکب شکل میں بدلہ اور ٹپہ ساخت میں تو ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے مگر بحر اور سر کے لحاظ سے ہر علاقے میں الگ الگ گایا جاتا ہے، یہی ٹپے بعض جگہ مصرے (مصرع)، کہیں لنڈئی اور کہیں ٹکئی بھی کہلاتے ہیں .

چار بیتہ : قدامت اور مقبولیت کے لحاظ سے ٹپے کے بعد چار بیتہ دوسرے نمبر پر آتا ہے - پشتو شاعری میں چار بیتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، چار بیتہ جب گایا جاتا ہے تو اکثر اس کے ساتھ رباب اور گھڑا (مٹکا) بطور ساز ضرور بجایا جاتا ہے اور اس قسم کے گانے بجانے کو "ٹنگ ٹکور" بھی کہتے ہیں - اس کے گانے کی مخصوص دھنیں ہیں - عرصۂ دراز سے یہ چار بیتے زبانی چلے آ رہے تھے اور ان کے کہنے والے شاعر بھی اکثر و بیشتر ان پڑھ ہوتے ہیں - چار بیتہ میں موضوع و مضمون کے لحاظ سے بڑی ہمہ گیری ہوتی ہے - ہر قسم کا مضمون بڑی روانی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے،

اکثر ملکی و ملّی لڑائیاں، مشہور حادثات اور سانحے، بعض افراد کے اہم کارنامے، قصے، افسانے اور رومانی داستانیں، مذہبی اور اخلاقی پند و نصیحت جیسے مضامین ہوتے ہیں - چار بیتہ محض اسی طرز کا نام ہے - ممکن ہے کہ اس صنف کا آغاز چار شعروں کے بندوں سے ہوا ہو، لیکن اس میں چار بیتوں یا شعروں کی کوئی خصوصیت نہیں - مربّع، مخمّس، مسدّس، مسبّع اور مثمّن بھی شامل ہیں - بلکہ ترکیب بند اور ترجیع بند کے لحاظ سے تو اس کی بہت مختلف قسمیں ہیں - بعض میں بڑے بڑے بند غزل کی طرح متحد القوافی ہوتے ہیں - کسی میں صرف بند کا پہلا اور آخری مصرع، کسی میں مطلع کے اول مصرع سے پورے بند کے اول مصرع اور مطلع کا دوسرا مصرع، باقی دوسرے مصرعوں کے هم قافیہ ہوتے ہیں - کسی میں شعر کی ترکیب ہی مقفّی ارکان سے ہوئی ہے - اس قسم کے چار بیتے کو زنحیٹری (زنزیرئی، زنجیری) کہتے ہیں - مضامین کے لحاظ سے چار بیتے کی دو قسمیں ہیں : ایک حقیقی، جس میں تخلیق کائنات، پیغمبروں کی داستانیں، شہدا کے مرثیے، اولیا کے مناقب اور آبا و اجداد کے شاندار کارنامے بیان کیے گئے ہیں؛ دوسری مجازی، جس میں آدم خانؒ در خانئی، موسیٰ خان گلمکئی، فتح خان رابیا (رابعہ) اور جلات محبوبا جیسے پشتونوں کے مشہور و معروف رومان اور دیگر حسن و عشق کی داستانیں، جہاد و غزا، جدال و قتال کے واقعات، حملے، ڈاکہ زنی، جلاوطنی، بہادروں کے معرکوں کے تذکرے ولولہ انگیز طریقے سے بیان کیے گئے ہیں - چار بیتے کہنے والے عوامی شعرا میں مشہور نوردین (نورالدین)، احمد دین طالب، فرید جان استاد، غلام سرور کوهالی، رحمت، حافظ عبداللطیف، بیدل، سید بوعلی شاہ، سید عمر، حسین، محمود جان، علی حیدر، عبدالغفار، احمد گل، دلاسہ خان، یسین

اخون، ملا مقصود، عبدالرحیم، محمد جی، عبدالوہاب، عبدالعلی، صاحبزادہ غلام قادر، حسیب گل میاں کاکا خیل، توکل، میرا، نوروز اور تورسم وغیرہ اور موجودہ شعرا میں عبدالواحد ٹھیکیدار اور راحت اخون، محمد فیاض، میاں غلام صدیق، عبدالاکبر خان، محمد نواز طائر، برہان الدین کاکا خیل، فدا مطہر وغیرہ جیسے اور بھی بہت سے شعرا ہیں۔ مذکورۂ بالا شاعروں میں دیر، باجوڑ، سوات، ایجنسیوں، ڈیرہ، بنوں، کوہاٹ، پشاور، مردان، ہزارہ، کوئٹہ، قندھار، جلال آباد اور کابل کے شاعر یکساں شامل ہیں۔

لوبہ یا لیبہ : لوبہ اور نیمکئی ساخت اور ترکیب میں ملتی جلتی سی ہیں۔ لوبہ کی بندش مستزاد جیسی ہوتی ہے۔ لوبہ کے بند کو کڑئی کہتے ہیں، البتہ لوبہ کی یہ حقیقت نیمکئی سے مختلف ہے کہ لوبہ میں عموماً عاشق و معشوق کا آپس میں سوال و جواب ہوا کرتا ہے۔ پہلے بند میں عاشق کی طرف سے اظہار عشق و محبت اور درخواست، دوسرے میں معشوقہ کی طرف سے انکار، دھمکی اور ڈراوا ہوتا ہے۔ تیسرے بند میں عاشق پھر اپنی جاں‌نثاری، وفاداری اور فداکاری کا اظہار کرتا ہے۔ بالآخر چوتھے یا پانچویں بند میں معشوقہ راضی ہو جاتی ہے۔ شاید اسی کار و بار عشق و معاشقہ کے باعث اسے لوبہ یعنی کھیل [عربی : لُعبۃ] کہتے ہیں۔

نیمکئی : یہ چار بیتہ سے ملتی جلتی سی ایک صنف ہے، اس میں بھی لوبے کی طرح عموماً عشقیہ جذبات و تأثرات کا اظہار ہوتا ہے، مگر یہ چار بیتہ کی طرح طویل نہیں ہوتی۔ کبھی یہ ٹپوں سے بنائی جاتی ہے اور کبھی الگ طرز میں کہی جاتی ہے۔ اس میں ''سر'' (ابتدا) یعنی پہلے شعر کا پہلا مصرع بڑا اور دوسرا چھوٹا ہوتا ہے۔ غالباً مصرع ثانی کے آدھا ہونے کی وجہ سے ہی نیمکئی یعنی آدھی کہا جاتا ہے اس کے ہر بند کے آخر میں اس چھوٹے مصرع کی تکرار ہوتی ہے۔ بند، جسے ٹکئی کہتے ہیں، کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے تین تین اور چار چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔

رُباعی : یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ پشتون عوام میں غزل رباعی کہلاتی ہے۔ یہ نام کب اور کیونکر اختیار کیا گیا تحقیق طلب ہے۔ عوام کی رباعی اور حقیقی غزل میں صرف اتنا فرق ہے کہ رباعی کہلانے والی غزلوں میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوتے ہیں، جیسے پند و نصائح، دنیا کی بے ثباتی یا علم و حکمت کی باتیں اور جن غزلوں میں حسن و عشق کی باتیں ہوتی ہیں وہ غزلیں ہی کہلاتی ہیں۔

اَللّٰھو : (پشتو لوری)، یہ عموماً دودھ پیتے بچوں کو سلانے کے لیے، پالنے میں لٹا کر جھونٹے دیتے وقت یا گود میں لے کر تھپک تھپک کر کہی جاتی ہے۔ اس کی ایک مخصوص لَے ہے۔ چھوٹے مصرع نما اور مُقفّٰی جملوں کے ساتھ اَللّٰھو، لَلی لَلئی، لَلی لَلو، اَللّٰھو، کی تکرار ہوتی ہے۔ ان مصرعوں میں بچے کے لیے ماما کے نیک جذبات اور اچھی خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔ بچے کی تعریف، تسلّی تشفی اور دعائیں ہوتی ہیں۔ بعض جگہ شاعروں نے اللّٰھو میں بھی طبع آزمائی کر کے باقاعدہ نظمیں شامل کر رکھی ہیں۔ مگر دیہات میں جو عام لوریاں رائج ہیں وہ بہت سیدھی سادی ہوتی ہیں۔

ساندے : (بین، ماتم)، اس میں مردے کی تعریف و توصیف سادہ بیانی سے کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی وساطت سے پہلے گزرے ہوئے رشتہ‌دار مُردوں کو پیغامات بھی بھیجے جاتے ہیں، (اگرچہ اس قسم کی باتیں عقیدت کی رُو سے نہیں بلکہ محض جذباتی اور خیالی

ہوتی ہیں) ۔ عموماً عورتیں مردے کی چارپائی کے اردگرد بیٹھے بیٹھے یا الگ ایک دائرے میں کھڑی ہو جاتی ہیں، ایک اُن میں آگوا بن کے ساندے شروع کرتی ہے، جس کے جملے ایک خاص لَے میں ادا کرتی ہے اور یونہیں ساندوں کے جملے ختم ہوتے ہیں، وہ خود اور باقی تمام عورتیں اونچی آواز سے روتی ہیں اور دو تین بار ہو ہو کر کے رو لینے کے فوراً بعد پھر ساندے شروع ہو جاتے ہیں ۔ اور جب تک مردے کو کفن کے لیے لے جایا نہیں جاتا اسی طرح ٹھیر ٹھیر کر ساندے کہے جاتے ہیں ۔ بعض قبائل میں روتے وقت سینہ، منہ اور سر بھی پیٹا جاتا ہے اور ایک ساتھ ہاے کرتی ہیں ۔ اگر رونے یا آہ و گریہ کی آواز ساتھ شامل نہ ہو تو ساندے دور سے بالکل گیت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کام کے لیے ماہر عورتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر عورت ایسی روانی اور خوش آوازی سے ساندے نہیں کہہ سکتی۔

کتابی ادب : اس میں شک نہیں کہ محمد ہوتک : پٹہ خزانہ (گنج مخفی)، ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء، کی فراہم کردہ معلومات سے پہلے تاریخ پشتو ادب کا آغاز بمشکل تمام دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی تک پہنچتا تھا، لیکن اس بیش بہا خزانے کے ظاہر ہو جانے سے تاریکی کے کئی پردے ہٹ گئے، اب پشتو ادب کی تاریخ ۱۳۹ھ / ۷۵۶ء سے شروع ہوتی ہے، یعنی اس کا پہلا دور دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی سے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک لیا جانے لگا ہے، لیکن آٹھ سو سال کے اس طویل دور کے متعلق چونکہ معلومات کا سارا ذریعہ لے دے کر یہ ایک مذکورہ کتاب ہی ہے، اور یہ معلومات محدود ہیں، اس لیے زیادہ تفصیل میں جانا مشکل ہے، ورنہ قیاس کہتا ہے کہ پہلے دور میں بھی شاعروں اور عالموں فاضلوں کی کمی نہیں رہی ہوگی۔

اس عرصے کی نمایاں خصیتیں دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے امیر کروڑ سوری [رک بآں]، تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے ابو محمد ہاشم سروانی، چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے بیٹ بابا، شیخ اسمٰعیل سڑبنی اور شیخ رضی لودی، پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے خرشبون، شیخ اسعد سوری اور شیخ عیسی مشوانڑی، چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے شکارلدوئے، شیخ تایمنی، سلیمان ماکو، ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے بابا ہوتک، شیخ متی، حضرت شیخ بختیار کاکیؒ، احمد بن سعید لودی، آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے شیخ ملکیارغرشین، شیخ ملی یوسف زئی، شیخ کٹہ متیزی، اکبر زمینداوری، نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے سلطان بہلول لودی، خلیل خان نیازی، شیخ محمد صالح، بی بی رابعہ قندھاری، دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے پیر روشن (بایزید انصاری [رک بآں])، خواجو ملیزی (مؤرخ تاریخ خان کجو)، بی بی زرغونہ خاتون دختر ملا دین محمد کاکڑ، شیخ تیمن، شیخ بستان بڑیچ، زرغون خان، دوست محمد کاکڑ، شیخ ارزانی، اخون چالاک خٹک، مولانا عبدالوہاب (اخون پنجو بابا)، نعمت اللہ ہروی اور اللہ یار الکوزی ہیں ۔

مذکورۂ بالا افراد میں بایزید انصاری زیادہ نمایاں اور اہم شخصیت کے مالک ہو گزرے ہیں۔ یہ کانی گرام (گرم) (وزیرستان) میں قبیلہ اُرمڑ کے عبداللہ کے بیٹے بایزید انصاری (المعروف بہ میاں روشن یا پیر روشن) طبقۂ روشنیاں کے بانی، اپنے وقت کے بڑے صوفی اور پیر تھے ۔ انھوں نے تصوف اور طریقت میں

کئی کتابیں لکھی ھیں، جن میں سب سے اھم اور مشہور کتاب خیرالبیان ھے جو ایک ساتھ علی الترتیب چار زبانوں، یعنی عربی، فارسی، ھندوستانی اور پشتو میں لکھی گئی ھے ۔ اس میں انھوں نے یہ دعوی بھی کیا ھے کہ پشتو رسم خط میں خصوصی حروف تہجی انھوں نے وضع کر کے اس کتاب میں بیان کر دیے ھیں تا کہ لوگ انھیں سیکھ کر خیرالبیان کی پشتو عبارت بآسانی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں ۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کئی کتابیں پائی گئی ھیں جیسے مقصود المومنین اور صراط التوحید وغیرہ، مگر وہ عربی میں ھیں.

پہلے دور کے ادب کا عمومی جائزہ لینے سے معلوم ھوتا ھے کہ دوسری صدی ھجری کے امیر کروڑ کے عہد کی پشتو میں عربی اور فارسی کا اثر و نفوذ زیادہ نہیں ھوا تھا، اس کے کلام میں پشتو زیادہ‌تر اپنے قدیمی رنگ میں نظر آتی ھے، بلکہ چوتھی صدی ھجری کے شیخ اسعد سوری کے المیہ قصیدے اور چھٹی صدی کے شکارندوئے کے مدحیہ قصیدے کی زبان بھی بہت حد تک عربی فارسی الفاظ سے معرا ھے، حالانکہ ان کے درمیانی عرصے کے دیگر شعرا کے کلام میں معاملہ اس کے برعکس پایا جاتا ھے ۔ بظاھر اس کا سبب یہ ھے کہ جن لوگوں نے علوم و فنون باقاعدہ عربی و فارسی میں پڑھے تھے ان کی زبان قدرۃً بدل گئی تھی اور جنھوں نے عربی علوم مروجہ سے اکتساب نہیں کیا ان کی زبان بچی رھی ۔ مگر چھٹی صدی ھجری میں جب عربی فارسی کی تعلیم عام ھو گئی تو اس کے بعد پشتو زبان یکسر بدل گئی ۔ اس امر کی تائید عوامی ادب سے بھی ھوتی ھے ۔ جو بلی ادب بےعلم و ناخواندہ پشتون عوام سے منسوب ھے وہ آج بھی ایک حد تک عربی الفاظ سے خالی ملتا ھے .

غرض کہ پہلے دور کے پشتو ادب میں موضوع سخن کے لحاظ سے حمد و مناجات، نعت و منقبت، دینیات و اخلاقیات، تصوف، سلوک، حماست و سیاست، حسن و عشق، اور صنف سخن کے لحاظ سے قطعہ، مثنوی، غزل، قصیدہ، اور مرثیہ آ چکا تھا ۔ ساتھ ھی چوتھی و پانچویں صدی ھجری سے فارسی اور عربی الفاظ، اصطلاحات، بندشیں اور ترکیبیں وغیرہ بھی شامل ھوگئی تھیں، ترجمے، تصنیفات، تالیفات، دیوان، تذکرے، تاریخ اور دینیات میں بھی کئی کئی کتابیں لکھی گئی تھیں ۔ یہاں نثر و نظم دونوں میں اُن چند کتابوں کا نام دیا جا رھا ھے جن کا علم بعض تحریروں سے ھو سکا، چنانچہ دسویں صدی ھجری تک کی لکھی ھوئی کتابیں حسب ذیل ھیں:

نظم: ابو محمد ھاشم: رسالو ورسہ؛ شیخ بستان بڑیچ: بستان الاولیا؛ شیخ متی ; دخدائے مینہ؛ بابڑ خان: غورغشت نامہ ۔ نثر: محمد بن علی: تاریخ سوری؛ سلیمان ماکو: تذکرۃ الاولیا؛ شیخ کٹہ متیزی: لرغونی پشتانہ؛ خان کجو: تواریخ افاغنہ؛ شیخ ملی: دفتر شیخ ملی؛ خان جہان لودی: مرآۃ الافاغنہ؛ اللہ یار الکوزی: تحفۂ صالح؛ بایزید انصاری: خیرالبیان.

ان کتابوں کے اقتباسات کو دیکھ کر یہ اندازہ ھوتا ھے کہ اس دور کی نظم و نثر دونوں ھی اچھی، صاف اور عالمانہ طرز کی ھیں، بلکہ یوں معلوم ھوتا ھے جیسے ان پر ارتقا کی صدیاں گزر چکی ھوں.

ان کے علاوہ چند دواوین بھی ھیں، جیسے دیوان ارزانی، دیوان علی محمد مخلص وغیرہ.

پشتونوں میں فطرۃً شعر و سخن کا ذوق و شوق عام اور استعداد ذھنی بہت ھے، یعنی اللہ تعالی نے اُنھیں اس کمال سے خوب نوازا ھے، لیکن خیال

ہوتا ہے کہ پہلا دور کا یہ طویل عرصہ یا تو بے انتہا سیاسی بےچینی، بےاطمینانی اور کشمکش میں گزرا ہے۔ ایسے پر آشوب اور پر انقلاب زمانے میں خود قوم کو سکون و آرام میسّر نہیں آیا ہو گا، نہ دلجمعی اور آسودگیِ خاطر انھیں نصیب ہوئی ہو گی کہ ان باتوں کی جانب خاصی توجہ مبذول کرتے۔ حالانکہ تذکرہ نگاروں اور مؤرخوں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ پشتون سلاطین اپنے اپنے عہد کے پشتون اہلِ قلم اور اہلِ علم و کمال کی پرورش اور سرپرستی کرتے رہے ہیں، مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ خود پشتون حاکموں کی زندگی، کب خاطر خواہ عرصے تک کہیں امن و سکون سے گزری ہے! بہر کیف پہلے دور کے متعلّق اس سے زیادہ معلومات ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہیں.

دوسرا دور: (۱۰۰۰ھ/۱۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ھ/ ۱۸۰۰ء تک).

یہ دور پہلے کے مقابلے میں زیادہ شاندار گزرا ہے، کیونکہ کم و بیش دو سو سال کے اس عرصے میں پشتو ادب میں نمایاں ترقی نظر آتی ہے۔ یہ دور اخوند درویزہ [رک بآن] پسرِ اخوند گدائی (۹۴۰ھ/ ۱۵۳۳ء تا ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء) سے شروع ہوتا ہے ان کے آبا و اجداد، ننگرھار سے علاقۂ یوسف زئی کے ملیزئی قبائل میں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ اخوند موصوف حضرت سیّد علی ترمذی (پیر بابا[۳]) کے مرید و ماذون، عالم دین اور متشرع بزرگ تھے۔ عمر کا بیشتر حصّہ وعظ و تبلیغ میں گزرا۔ شریعت و طریقت اور فقہ و حدیث میں درسی طرز پر فارسی اور مسجّع و مقفّی قسم کی پشتو نثر میں کئی کتابیں لکھیں جن میں مخزن الاسلام، تذکرۃ الابرار و الاشرار اور ارشاد الطالبین زیادہ مشہور ہیں۔ مخزن میں پشتونوں کی مختصر تاریخ اور کچھ نسب نامے بھی دیے ہیں۔ اخوند درویزہ کے بعد ان کا بھائی ملا اصغر، بڑا بیٹا عبدالکریم (عرف کریم‌داد)، پوتا عبدالحلیم (رحیم داد) پرپوتا مصطفٰی محمد اور شاگردوں میں عمر خان، میر خان، شیر محمد، عبدالرحیم اور احمد وغیرہ کئی پشتون تک عالم اور شاعر گزرے ہیں.

ملا الف ھوتک: علاقۂ قلات میں کسی جگہ گزرا ہے، اس کا ادبی کارنامہ (۱۰۱۹ھ/ ۱۶۱۰ء) بحر خفیف کی پشتو مثنوی میں، دینی اور اخلاقی تعلیم کی دو کتابیں بحر الایمان اور نصیحت نامہ ہیں.

ارزانی: پیر روشن کا ہم خیال ساتھی، صوفی شاعر، بقول اخوند درویزہ، ایک تیز فہم اور فصیح شاعر جو عربی، فارسی، ہندی اور پشتو میں شعر کہتا تھا۔ دیوان کے علاوہ ایک کتاب چار رسالہ (= چار زبان) بھی لکھی ہے.

علی محمد مخلص: پیر روشن کا مرید اور خلیفہ، بقول اخوند درویزہ، ارزانی کا بھائی تھا۔ دیوان مخلص (قلمی) میں بجائے عالم مجاز کی عام غزلوں اور نظموں کے علمِ تصوّف اور علمِ طریقت کی شرح و تعریف ہے یا عشق حقیقی.

مرزا خان انصاری: پیر روشن کا مرید، ملا ارزانی و مخلص کا ہم پایہ، دولت اللہ کا استاد، اونچے پائے کا صوفی منش شاعر تھا، جس کا کلام اپنے دوسرے ہم‌عصر عالموں اور شاعروں کے مقابلے میں زیادہ صاف اور شستہ ہے اور اس میں عشق حقیقی کا رنگ غالب ہے۔ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء میں شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے دکن کی ایک جنگ میں کام آیا.

دولت اللہ لوانڑی (نوحانی) ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء: مرزا خان انصاری کی وساطت سے بایزید انصاری کا مرید تھا۔ مجموعۂ کلام میں اکثر اصنافِ سخن پائی جاتی ہیں جیسے قطعہ، رباعی، غزل اور

قصیدہ وغیرہ

واصل : خوشحال خان خٹک کا معاصر، دولت اللہ وغیرہ کا ہم مسلک، صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔

امیر : بڑا ضخیم دیوان مرتب کیا اور ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء میں ایک مثنوی علم تجوید میں لکھی ہے۔

اخون قاسم پاپین خیل : پشتو نثر میں فوائد شریعت کے نام سے شرعی مسائل کی ایک کتاب کا مصنف ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء تک زندہ رہا۔ مذکورہ کتاب کی پشتو نثر بالکل اخوند درویزہ کی طرز پر ہے، مگر مقابلۃً صاف۔

بابوجان لغمانی : ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء، اچھا عالم و شاعر تھا۔ ایک دیوان، دعاے سریانی کا منظوم پشتو ترجمہ اور ایک کتاب دینی مسائل کی چھوڑی ہے۔ نظم و نثر دونوں خیر البیان اور مخزن الاسلام کی طرز پر ہیں۔

خوشحال خان خٹک : (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء تا ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء)، خوشحال خاں یوں تو صرف ایک شاعر کا نام ہے، لیکن پشتو ادب میں تنہا خوشحال ایک پورے دور اور ایک مکتب فکر کا نام ہے۔ اللہ تعالٰی نے اس ایک ہستی میں بہت سی صفات جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ایک مدبر سردار، تجربہ‌کار جرنیل، جری سپاہی و تیغ‌زن، نشانہ باز شکاری اور نڈر شاہسوار تھا، اور ساتھ ہی ایک عالم فاضل نازک‌خیال شاعر، باریک‌بین نقاد و مبصر، مشفق ناصح، مہمان نواز، غریب پرور، ہمدرد، غیرتمند اور ننگ و ناموس کا محافظ بھی تھا۔ وہ بیک وقت صاحب سیف بھی تھا اور صاحب قلم بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں کمال جامعیت، بڑا تنوع اور بلا کا زور ہے۔ اس کی شاعری میں ہر موضوع پر ہر صنف سخن کے وافر نمونے پائے جاتے ہیں، مثلاً غزلوں، رباعیوں اور قصیدوں کے علاوہ فرد سے لے کر طویل ترکیب بند اور ترجیع بند بھی موجود ہیں۔ اس نے بھاری دیوان کے علاوہ چھے سات کتابیں نظم و نثر میں اور بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے دستارنامہ پشتو نثر میں ہے اور دوسری کتابیں باز نامہ، فراق نامہ، سوات نامہ، فضل نامہ، اخلاق نامہ، اور طب میں صحت‌البدن منظوم ہیں۔

خوشحال خان نے پشتو انشا و املا دونوں میں بڑی اصلاح کی ہے۔ پشتو نثر کو بھی مقابلۃً بہت سادہ، رواں اور سلیس بنایا۔ پشتو نظم کو بھی اپنے پیشرووں اور ہم‌عصروں کے مقابلے میں ہر قسم کے صنائع و بدائع سے مالا مال کیا۔ پھر مفہوم کے لحاظ سے سیاست و حماست، دینیات اور اخلاقیات، جنسیات، نفسیات، فلسفہ و تصوف، طنز و مزاح، تعریض و تنقید، ہجو و مدح، تاریخ گوئی، عشق مجازی و عشق حقیقی، غرض کہ کوئی نفسِ مضمون ایسا نہیں جس میں بہت کچھ اور کئی کئی طریقے سے نہ کہا ہو۔ علامہ اقبال نے بھی خوشحال خان کی تعریف کی ہے۔ پانچ چھے پشتوں تک خوشحال خان کی اولاد و احفاد میں بڑے نامی گرامی عالم، شاعر، مترجم اور مؤلف و مصنف گزرے ہیں جن کا مختصر ذکر آگے اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

اشرف خان ہجری : (۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء تا ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳ء)، خوشحال خان خٹک کا سب سے بڑا بیٹا، اچھا عالم فاضل اور شاعر تھا۔ ادبی آثار میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔

عبدالقادر خان خٹک : (۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء)، بلند پایہ عالم، ادیب اور شاعر۔ حدیقۂ خٹک کے نام سے ایک دیوان کے علاوہ گلدستہ (پشتو ترجمۂ گلستان سعدی)، منظوم ترجمۂ یوسف زلیخا۔ چہل حدیث کا پشتو منظوم ترجمہ، آدم خان درخانئی (مشہور رومان منظوم) اور نصیحت نامہ، ادبی

آثار ہیں۔

صدر خان خٹک: خوشحال خان کا بیٹا، چھوٹی بحر کی مثنوی میں پشتو ادب کے تین مشہور رومانی افسانے لکھے ہیں: (۱) آدم خان درخانئی؛ (۲) دلے شہئی اور (۳) نظامی کے خسرو و شیریں کا منظوم پشتو ترجمہ۔

سکندر خان: خوشحال خان کا بیٹا، علاوہ دیوان کے ایک منظوم کتاب بنام مہر و مشتری بھی لکھی ہے۔

گوہر خان: خوشحال خان کا بیٹا، ایک دیوان چھوڑا ہے۔

بہرام خان: خوشحال خان کا بیٹا، اچھا شاعر تھا۔

بی بی حلیمہ: خوشحال خان کی بیٹی، چند اشعار کے سوا اور کوئی ادبی آثار دستیاب نہیں، لیکن اشعار سے پتا چلتا ہے کہ کلام بڑا پختہ ہے اور عشق حقیقی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

خواجہ محمد بنگش: خوشحال خان کا معاصر، اچھے پائے کا شاعر گزرا ہے۔ اس کا دیوان جو اب تک ناپید تھا پشتو اکیڈیمی (پشاور یونیورسٹی) نے ابھی ابھی شائع کیا ہے۔

رحمٰن بابا (عبدالرحمٰن مہمند غوریا خیل: (۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء تا ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء)، والد کا نام عبدالستار تھا۔ نواح پشاور کا ایک مشہور صوفی شاعر، ایک عارف باللہ، ہمدرد و مشفق بزرگ، جس کی شخصیت ہر دلعزیز، کلام عام فہم، سادہ و شیریں، اور بے حد مقبول خاص و عام ہے۔ ہر طبقے کے پشتون رحمٰن بابا کو بڑی عقیدت و عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پشتون خواتین تک ان کے دیوان کو متبرک جان کر جزدانوں میں لپیٹ کر رکھتی ہیں۔ لوگ دیوان سے فال نکالتے ہیں اور اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔

عبدالحمید مہمند: (۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء تا ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء)، تخلص حمید، رحمٰن بابا کے بعد حمید لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔ نازک خیالی میں "موشگاف" کہلایا۔ اس لیے مجموعۂ کلام یا دیوان دُر و مرجان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کلام بہت پختہ ہے اور زیادہ تر مجازی حسن و عشق کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ دیوان کے علاوہ قصۂ شاہ و گدا اور نیرنگ عشق کے نام سے دو کتابیں اور بھی لکھی ہیں۔ یہ دونوں پشتو مثنویاں، فارسی مثنوی شاہ و گدا (ہلالی) اور نیرنگ عشق (مولانا غنیمت) کا پشتو منظوم ترجمہ ہے۔

محمد افضل خان خٹک: (۱۰۷۵ھ/ ۱۶۶۴ء تا ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء)، اشرف خان ہجری کا بیٹا اور خوشحال خان خٹک کا پوتا، اپنے دور میں سب سے بڑا اور اچھا نثر نگار، ادیب اور عالم تھا۔ اس نے پشتو میں تاریخ مرصع کے نام سے ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے۔ علم خانۂ دانش کے نام سے انوار سہیلی کا ترجمہ اور اعثم کوفی کی تاریخ کا ترجمہ کیا ہے۔ شعر بھی کہے ہیں، لیکن دیوان کہیں نہیں ملتا۔

معزاللہ مہمند: (۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء تا ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء)، کوللہ محسن خان (پشاور) کے ملک عبداللہ کا بیٹا تھا۔ دیوان تین زبانوں میں کلام پر مشتمل ہے، پشتو، فارسی اور اردو۔ اردو ولی دکنی کی سی ہے۔ فارسی کلام بمقابلہ پشتو زیادہ زور دار ہے۔

کامگار خان خٹک: (۱۰۸۰ھ تا ۱۱۷۰ھ)، اشرف خان ہجری کا پوتا، اچھے پائے کا شاعر گزرا ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے جس میں مختلف اصناف سخن پائی جاتی ہیں۔

علی خان: (۱۱۸۰ء)، هشنغر (= هشت نگر، چارسده) کا ایک مشہور و معروف عالم فاضل شاعر جس کے کلام میں سادہ سے سادہ اور مشکل سے مشکل بندشوں اور ترکیبوں کے نمونے موجود ہیں ۔ نزاکت تخیل کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اصطلاحات بھی زیادہ پائی جاتی ہیں ۔ دیوان زیادہ ضخیم نہیں۔

کاظم خان شیدا : (۱۱۳۵ تا ۱۱۹۳ھ)، افضل خان خٹک کا بیٹا، سرائے اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوا، مگر لڑکپن ہی میں بڑے بھائی کے ڈر سے وطن عزیز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر کشمیر، پھر وہاں سے سرھند ہوتا ہوا رام پور جا بسا ۔ ساری عمر وہاں گزاری اور وہیں فوت ہوا ۔ ادبی آثار میں صرف دیوان باقی رہا ہے ۔فاضل شہیر امیر مینائی نے اپنے تذکرے انتخاب یادگار(۱۸۷۳ء) جلد دوم میں اورحافظ احمد علی شوق نے اپنے تذکرے کاملانِ رامپور میں کاظم خان کی شخصیت اور اس کے پشتو اور فارسی کلام کی بڑی تعریف کی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مضمون آفرینی، لطافت بیان اور ندرتِ تخیل میں بیدل اور صائب کا ہم سر تھا ۔

ان کے علاوہ حضرت شیخ محمد قاسمؒ، ملا نور محمد، مولانا احمد شاہ، پیر سباق، محمد یوسف (رحمن بابا کے استاد)، مبین، اللہ داد، میاں داد اور مصری خان گگیانی وغیرہ کئی نام اور بھی تذکروں میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے علاوہ شعر و سخن کے کچھ تاریخ کی کتابیں بھی لکھی ہیں، جو اب نایاب ہیں۔

دوسرے دور پر عمومی ڈالنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دینی علوم و فنون کی درس تدریس عام ہو جانے کے باعث، پشتو ادب میں عربی اور فارسی کا دخل و تصرف بہت زیادہ ہو گیا ۔ شعر میں حمد و ثنا، مناجات و منقبت، مدحیہ قصائد اور حسن و عشق کے علاوہ بہت سے دوسرے موضوعات و مضامین داخل ہو گئے، رجزیہ و رزمیہ، بزمیہ و طربیہ، منظر کشی و فطرت نگاری، تصوف، معرفت، جذب، سلوک، شریعت اور طریقت کے سلسلے میں بہت سی عربی اور فارسی اصطلاحات و الفاظ کا ذخیرہ شامل ہوگیا ۔ دوسری تحریک، پشتونوں اور شاہانِ وقت کی مخالفتوں اور چپقلشوں کے سبب سے ہوئی، کیونکہ پیر روشن کئی سال مسلسل، شہنشاہ اکبر کے خلاف نبردآزما رہے ۔ خوشحال خان، اورنگ زیب سے بر سرِ پیکار رہے اور اخوند درویزہ، اختلاف عقائد کی بنا پر پیر روشن کی مخالفت میں سر گرم رہے ۔ اس طرح ان مذھبی اور سیاسی رہنماؤں کو خوب دل کھول کر لکھنے کی تحریک ہوئی ۔ ہر ایک نے اپنے اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ میں سعی بلیغ سے کام لیا ۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالوھابؒ اور اخون سالاک جیسے کئی دیگر پیشواؤں اور ان کی اولاد، متبعین، مریدین اور تلامذہ نے بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق بہت سی چھوٹی موٹی کتابیں لکھیں۔ اس طرح پشتو نظم کے ساتھ ساتھ پشتو نثر نے بھی کافی ترقی کرلی۔

تیسرا دور : (۱۲۰۰ھ/۱۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ھ/۱۹۰۰ء تک)۔

یہ تیسرا دور جو ایک صدی کے لگ بھگ قرار پاتا ہے، احمد شاہ ابدالی (۱۱۳۵ تا ۱۱۸۶ھ) سے شروع ہوتا ہے ۔ احمد شاہ درانی، سدوزئی، خود شاعر تھا (کیونکہ تقریباً تین ہزار پشتو اور فارسی اشعار پر مشتمل ایک دیوان بطور اس کی یادگار کے چلا آ رہا ہے)، اس لیے یقیناً علم دوست اور علما و شعرا کا قدردان بھی رہا ہو گا ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بھی، جو اپنے باپ کا جانشین ہوا، اپنے باپ کی طرح شاعر نکلا۔

حضرت میاں عمرؒ (چمکنی، پشاور) :

احمد شاہ ابدالی کے ہم‌عصر، مشہور عالم اور روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ بلند پایہ اہلِ قلم بھی تھے۔ پشتونوں کا منظوم نسب نامہ ان کے ادبی آثار میں سے ہے، جس کا نمونہ حیات خان نے اپنی تاریخ حیات افغانی میں درج کیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب توضیح المعانی ہے۔ ان کے صاحبزادے میاں محمدی، دوسرے صاحبزادے عبید اللہ میاں (جنھوں نے عبرت نامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے) اور مرید مسعود گل بھی اچھے عالم اور شاعر گزرے ہیں۔ ان سب کے دیوان بھی موجود ہیں۔ مسعود گل کی لکھی ہوئی دو مثنویاں بھی کتاب خانۂ موزۂ بریطانیہ میں محفوظ ہیں، ایک میں اپنے مرشد کی منقبت اور ان کے حسب نسب اور دوسری میں احمد شاہ ابدالی کی جنگوں کا ذکر ہے۔

ملا عبدالرشید پسر سلطان حسین: اس نے ۱۱۶۹ھ میں ایک منظوم کتاب رشید البیان لکھی، جس میں اسلامی عقائد اور ضروری ضروری شرعی احکام درج ہیں۔ یہ کتاب اب بھی نورنامہ اور شمائل نامہ (پشتو) کے ساتھ پشتون خواتین کو لازماً پڑھائی جاتی ہے۔ ایسے ہی پیر محمد کاکڑ اور رحمت داوی قندھاری ہیں۔

آخون گدا: معاصر احمد شاہ ابدالی، اس نے نافع المسلمین کے نام سے ایک کتاب نظم کی ہے۔ ان کا دیوان بھی تھا، لیکن اب نہیں ملتا۔

سعادت خان: بہار (ہند) کی پیدائش، بیشتر عمر ننگرہار میں گزاری۔ ۱۱۵۰ھ میں کیمیاے سعادت کے نام سے منظوم کتاب لکھی ہے، جس میں کچھ دینی مسائل اور کچھ علم طب سے متعلق باتیں ہیں۔

قاسم علی افریدی (۱۱۸۳ھ-) : اس نے ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے، جس میں اردو، پشتو اور فارسی میں اشعار ہیں، زیادہ‌تر غزلیں ہیں، آخر میں چار زبانوں میں ایک مختصر لغت بھی دی ہے۔

نواب حافظ رحمت خان: پسر شاہ عالم خان بڑیچ، (م ۱۱۸۸ھ)، احمد شاہ ابدالی کا معاصر، حاکم روہیلکھنڈ، اعلی پائے کا ادیب اور شاعر تھا۔ ادبی آثار میں ایک دیوان، تواریخ حافظ رحمت خانی، خلاصۃ الانساب اور ریاض المحبت (ایک لغت) یادگار ہیں۔ اس کے بیٹے اللہ یار خان نے ۱۲۲۸ھ میں عجائب اللغات کے نام سے ایک پشتو لغت لکھی ہے، جس کے پہلے نصف میں پشتو زبان کی قواعد ہے۔ دوسرا بیٹا، نواب مستجاب خان بھی عربی، فارسی، اردو اور پشتو کا اچھا عالم تھا، جس نے نثر میں گلستانِ رحمت کے نام سے اپنے خاندان اور ہند میں رہنے والے دیگر پشتونوں کی ایک تاریخ لکھی ہے۔ سعادت یار، پسر محمد یار پسر حافظ رحمت خان نے بھی گلِ رحمت کے نام سے، تاریخ قبیلۂ بڑیچ، ہندوستانی پشتونوں کے حالات میں لکھی ہے، نیاز احمد ہوش، حافظ رحمت خان کے پرپوتوں میں گزرا ہے اور اس نے بھی روہیلکھنڈ کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ تمام کتابیں کتاب خانۂ موزۂ بریطانیہ، لندن میں موجود ہیں۔ نواب علی محمد خان، حافظ رحمت خان کا معاصر شاعر تھا۔

امیر محمد انصاری (۱۲۰۰ھ): کلکتے میں رہتا تھا، ۱۲۲۸ھ میں اس نے گلستان سعدی کا پشتو ترجمہ کیا۔

حافظ الپوری: (۱۲۰۰ھ)، موضع الپوری (سوات) کا باشندہ، بڑا عالم اور شاعر گزرا ہے۔ دیوان حافظ الپوری کے نام سے مجموعۂ کلام چھپ چکا ہے۔ کلام میں عربی اور فارسی الفاظ و اصطلاحات بہت زیادہ ہیں۔

عبدالعظیم رانڑی زئی، حضرت عبید اللہ میاں گل، خوشحال شہید، نواز خٹک، بیدل، مرزا حنان

صدیق اخون زادہ، بابا سیّد گل، میاں نعیم، احمد کلاچوی، محمد رفیق، نجیب، مراد علی صاحبزادہ (جس نے ۱۲۸۲ھ میں پشتو میں تفسیر یسیر لکھی جو متعدد بار طبع ہو چکی ہے)۔ دوست محمد خٹک (۱۲۹۰ھ)، جس نے واعظ کاشفی کی مشہور تفسیر حسینی (فارسی) کا تفسیر بدر منیر کے نام سے پشتو ترجمہ کیا اور نظم میں بحر العلوم اور اخلاق احمدی کے نام سے، دو پشتو مثنویاں لکھیں۔ رسول‌داد نے چھوٹی بحر کی پشتو مثنوی میں اخلاقیات پر ایک کتاب دُرّالبیان لکھی ہے۔ عبدالکریم کاکڑ نے ۱۲۳۳ھ میں دو منظوم کتابیں عین العلم اور زین العلم کے نام سے لکھیں۔ محمود رفیق نے فارسی، پشتو اور اردو میں کلام کہا ہے اور علمِ تجوید کے بیان میں ایک پشتو مثنوی جو اردو کا ترجمہ ہے، لکھی ہے۔ مُلّا فرخ الدین قندھاری نے تعداد الکبائر کے نام سے اخلاق و تصوف کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ایسے ہی خواجہ رزق اللہ، امام الدین، مُلّا حسن (چارسدہ، پشاور)، معین الدین (جس نے رومانی افسانہ عذرا وامق کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا ہے)۔ مطیع اللہ، سپینہ خاتون، بی بی گلہ خاتون، سیّد حسین، معزالدین خٹک (جس نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے دینیات میں ایک کتاب ربقۃ الاسلام، دوسری علم طب میں دلیل العلیل دستیاب ہوئی ہیں)۔ میاں محمد فہیم کاکا خیل، ابراہیم (سوات)، حافظ عبدالکبیر (تہکال، پشاور) نے دُرِّ مجالس اور معجزات پشتو مثنوی میں لکھی ہیں۔ بیاض، محمد یوسف، حافظ محمد (جس نے مستخلص الحقائق شرح کنزالدقائق لکھی ہے)۔ حافظ دلاور خان، فیض اللہ اخونزادہ (جس نے ذخیرۃ القراء کے نام سے ایک منظوم کتاب علم تجوید میں لکھی)۔ صالح محمد تخلص غریب، میر عالم خان، عبدالرحیم (امان کوٹ، مردان)، جس نے پنج گوہر اور ہفت ہیکل لکھی ہے۔ خان زمان (نے فقہ کی مشہور کتاب خلاصۂ کیدانی کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا ہے)۔ دوستم، ارباب عبدالرحیم خلیل اور تخلّص ارباب وغیرہ سب اسی دَور کے شاعر اور اہلِ قلم گزرے ہیں۔ اختصار کی خاطر بہت سے وہ نام چھوڑ دیے گئے جو صرف شاعر گزرے ہیں اور ان کا تھوڑا بہت کلام کسی نے اپنے مجموعے میں دے رکھا ہے۔

علمی ترقی کے لحاظ سے اس صد سالہ دَور کا پلّہ گزشتہ دو سو سال کے دَور سے بھاری رہتا ہے، کیونکہ اس تیسرے دَور میں مذکورۂ بالا افراد سے کہیں زیادہ اہلِ قلم پاک و ہند اور افغانستان میں گزرے ہیں، جن کے ہاتھوں پشتو ادب کو ترقی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ زیر نظر دَور میں شاہان و حاکمانِ وقت کی جانب سے کوئی خاص حمایت و سرپرستی بھی نہیں ہوئی؛ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ملک و ملّت میں علمی ترقی کا طبعی رجحان بہت زیادہ رہا۔ اس دَور کی لکھی ہوئی کتابوں میں بلحاظ موضوع و نفس مضمون، دینیات اور اخلاقیات کا غلبہ نظر آتا ہے، دوسرے نمبر پر تواریخ و سیر اور تذکرے ہیں، اس کے بعد اور مختلف عنوانات ہیں، لیکن بہت کم۔ پشتو نظم پر عربی اور فارسی کا رنگ بہت غالب معلوم ہوتا ہے۔ نثر دوسرے دَور کے مقابلے میں کسی قدر اور بھی سدھر گئی ہے اور اس کی عبارت کی پیچیدگی اور اشکال میں ایک حد تک کمی آ گئی ہے۔

چوتھا دور (۱۳۰۰ھ/۱۹۰۰ء سے تا عصر حاضر):

اس دور کے مشاہیر اہل قلم، اہلِ علم اور اہلِ ادب میں ہر قسم کی ہستیاں نمایاں ہیں، ان میں عوامی ادب کے سرپرست ہیں، جن کا تعارفہ عوامی ادب کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ ان کی

فہرست یوں تو بڑی طویل ہے، مگر چند بہت مشہور نام گنوا دیے ہیں۔ یہاں اتنی وضاحت اور کر دی جائے کہ عوامی شعرا کی کئی قسمیں ہیں، ان میں کوئی ''غزلچی'' کہلاتے ہیں اور کوئی ''چار بیت مار'' یعنی چار بیتہ کہنے والے، اور کوئی مترجم شاعر ہیں، جیسے سید بو علی شاہ، ملا نعمت اللہ، طالب احمد دین اور مولوی احمد وغیرہ، جنھوں نے ملکی و غیر ملکی عشقیہ افسانے، قصے، جنگ نامے، شاہنامہ، الف لیلہ، انوار سہیلی، داستان امیر حمزہؓ، اور یوسف زلیخا، وغیرہ جیسی کتابیں ترجمہ کی ہیں۔

چوتھے دور کے پہلے تہائی زمانے میں یہاں انگریزی اقتدار کا آغاز تھا، ہر طرف حملے اور یورشیں تھیں، ہر جگہ میدان جدال و قتال گرم تھا، ہنگامہ و فساد تھا، بے چینی اور بدامنی تھی؛ اس لیے وہ پینتیس چالیس سال کا عرصہ کسی قدر جمود کا گزرا ہے۔ البتہ ان دنوں میں چار بیتے اور بدلے بہت کہے گئے۔ اور اس دور کے چار بیتے اکثر سیاسی نوعیت کے ہیں، جن میں انگریزوں کی، یہاں کی اور افغانستان کی لڑائیوں کا مفصل تاریخی حال منضبط ہے۔ ان دنوں یہاں کے باشندے دو گونہ مصیبت میں مبتلا تھے اور وہی اس جمود و تعطل کے دو بڑے اسباب تھے، ایک تو انگریز جن علاقوں پر قبضہ کرتے گئے، انھیں لوٹتے رہے۔ اس ہنگامۂ داروگیر میں اگر انھیں ایک دو ورقی کتاب بھی ہاتھ آ جاتی، ہتیا لیتے۔ اس طرح انھوں نے علاقے سے کافی ذخیرہ ان قلمی آثار کا جمع کیا۔ بعد میں انتخاب کر کے اپنے خیال کے مطابق مفید مطلب ساری کتابیں یورپ بھجوا دیں اور باقی تلف کر دیں۔ دوسرے یہاں کے باشندوں کو کشمکش میں ایسا مبتلا و مصروف رکھا کہ کسی کو لکھنے کی فرصت ہی نہ دی۔

بہر کیف، جب انگریز یہاں پورے طور پر مسلّط ہو گئے تو آہستہ آہستہ نئے سرے سے پھر ادھر متوجہ ہوئے۔ مگر حالات بدل گئے تھے۔ انگریزی دور کے مقتضیات کے زیر اثر یہاں کا طریقۂ تعلیم و تعلّم بدل گیا۔ ساتھ ہی مغربی تعلیم پھیلنا شروع ہوئی، یوں بوڑھے اور جوان ذہن ان جدید تقاضوں اور نئے ماحول سے متاثر ہوئے اور قوم نے علم و ادب کے نئے میدان میں قدم رکھا اور کچھ نہ کچھ کام کیا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے مشاہیر عنوان الدین میاں کاکا خیل اور ان کے خاندان کے کئی اور علما، میاں حسیب گل کاکا خیل، غلام محمد خان پوپلزئی جیسے اہلِ قلم نے نمایاں کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب حالات نے پلٹا کھایا، قوم میں آزادی و بیداری کی لہر دوڑی تو اہل قلم زیادہ تندہی سے ادھر متوجہ ہوئے، اب قوم کے نوجوان مغربی علوم و فنون سے بھی بہرہ یاب ہو چکے تھے، از سر نو پشتو زبان کا کاروانِ ادب ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہوا، گویا پشتو ادب کی یہ نشأۃ ثانیہ ہے۔

ادب کے اس دور جدید میں فکر و نظر کے زاویے بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علوم جدیدہ سے بہرہ ور شاعر و ادیب، گل و مل اور نغمہ و بلبل کے طلسمات اور کاکل پیچاں کے ظلمات سے نکل کر زندگی کے دیگر حقائق و مقتضیات کو سمجھنے لگے۔ خواب و خیال کی فرضی دنیا سے نکل کر جیتی جاگتی دنیا میں زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہونے لگے، اب ان میں نئے افکار و خیالات نے جنم لینا شروع کیا۔ چنانچہ ماضی و حال کی آمیزش نے پشتو شعر و سخن میں رنگینی و تنوع پیدا کر دیا؛ نثر میں بھی بڑی صفائی، سادگی اور روانی آ گئی۔

پشتو کے فروغ و ترقی، بلکہ نشأۃ ثانیہ میں

نواب سر صاحبزادۂ عبدالقیوم خان نے غیر معمولی حصہ لیا ۔ ان کے بارے میں وحدت مغربی پاکستان (One Unit) سے پہلے کے آخری گورنر سر اولف کیرو اپنی کتاب *The Pathans*، ص ۳۲۶ میں کہتے ہیں : ''. . . صاحبزادۂ عبدالقیوم بڑی محترم اور با وقار شخصیت کے مالک تھے، وہ پشاور اور دہلی میں اور پھر گول میز کانفرنس کے دوران میں لنڈن میں اپنے تمام ساتھیوں سے بلند رہے ۔ وہ دیکھنے میں بڑے شاندار تھے ان کا انداز پر وقار، خد و خال واضح، مونچھیں گھنی اور آنکھیں عقابی تھیں ۔ ان کی شخصیت قابلِ احترام تھی، لیکن ان کے انداز و اطوار بڑے دلکش تھے۔ وسیع النظری اور مستقل مزاجی میں پورے ہندوستان میں گنتی کے لوگ ان کے ہمسر تھے۔ یہ صاحبزادے ہی تھے جنھوں نے انگریزوں کی حکومت سے مختصر عرصے میں اصلاحات کی دو قسطیں وصول کر لیں''.

صاحبزادہ صاحب کے قائم کیے ہوے اسلامیہ کالج (پشاور) کے متعلق کیرو لکھتے ہیں: ''. . . اسلامیہ کالج کے وجود سے پٹھان قومیت کا جو احساس بیدار ہوا، اسے اس وسیع النظری نے متوازن کر دیا، جو ان جماعتوں میں سکھائی جاتی تھی (*The Pathans*، ص ۴۳۰) ۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامیہ کالج نے قوم کے نوجوان طبقے میں بیداری پیدا کر کے نئی زندگی کی روح پھونکی۔

اس نئے دور میں پشتو ادب میں بہت سی نئی چیزیں شامل ہو گئیں، جیسے سیاست، صحافت ناول، افسانہ، ڈراما (سٹیج کا، ریڈیائی اور محض کتابی)، تنقید و تبصرہ، مقالہ‌نگاری، ادب لطیف کے نام سے اپنے لطیف رومانی جذبات کے اظہار کا انداز اور فن لغت نویسی وغیرہ ۔ اس کے علاوہ پشتو نصاب تعلیم کے لیے درسی کتابیں (پشتو قاعدہ سے لے کر بارھویں تک)، السنہ شرقیہ کے امتحانات میں پشتو کی علیحدہ درجہ بندی اور اس کے نصاب کی کتابیں ۔ پشتو اکیڈیمی کا قیام، جس میں پشتونوں اور پشتو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا کی تحقیق کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے ۔ پشتو میں ایم ۔ اے کی جماعتیں کھل گئیں، اس کے علاوہ بےشمار ادبی انجمنوں کا قیام، پشتو ٹائپ رائیٹر، پشتوٹائپوگرافی، ''پشتو اکیڈیمی میں مشترک ٹائپ رائیٹر مشین کے لیے ایک ایسے کیبورڈ (Key - board) کی ایجاد جس کے ذریعے اردو، پشتو، عربی، فارسی اور سندھی وغیرہ ایک ہی مشین سے چھاپی جا سکیں گی ۔ اس میں راقم الحروف نے بھی خدمت کی ہے ۔ ایک سہ لسانی پشتو جامع اللغات کا کام، رومن رسم‌الخط میں پشتو لکھنے (ٹرانس لٹریشن) کے واسطے خصوصی رومن حروف وضع کرنا)'' (جو بین الاقوامی مسلمہ حروف کے علاوہ ہیں).

ایسے ہی پشتو شعر میں نظم اور آزاد نظم وغیرہ کے نمونے شامل ہو گئے ۔ ترجمے، تصنیف اور تالیف کا رنگ بدل گیا ۔ اب پشتو میں دینیات اور اخلاقیات کے علاوہ سائنسی، تحقیقاتی اور فنی مضامین شامل ہو گئے ہیں ۔ آج کل کتابیں بالکل جدید طرز پر لکھی جانے لگی ہیں ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کام آزادی کے حصول، یعنی پاکستان کے قیام کے بعد شروع ہوے ہیں .

دور جدید کے مشاہیر کی فہرست بھی بہت طویل ہے، لیکن ان میں دو قسم کی وہ شخصیتیں شامل ہیں جو اس نئے دور کی تعمیر ادب میں بمنزلہ سنگ بنیاد شمار کی جاتی ہیں، اس لیے تیمناً و تبرکاً ان کا ذکر ضروری ہے ۔ ان میں سے اکثر اصحاب نے پشتو زبان، اور اردو ادب میں ہر جہت سے، ہر نوع کی خدمت کی ہے ۔ بالفاظِ دیگر پشتو ادب کی موجودہ ترقی بیش از بیش انھیں کی رہین منت ہے .

انیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں، میدانِ ادب کے اس کاروان میں کئی طرح کے رہ نوردانِ شوق و ذوق شامل رہے ہیں۔ ان میں پہلی جماعت روس، جرمنی، انگلستان، فرانس اور ناروے کے فاضل مستشرقین، پشتوٹولنه، کابل (افغانستان) کے گرامی قدر حبیبی، خادم، بینوا، مجروح، الفت اور ریشتین، بلوچستان کے نامور علما، فضلا اور شعرا کی قابل قدر مساعی کے علاوہ علاقۂ پشاور کے پیشرووں میں پیرزادہ سید عبداللہ شاہ، مولوی میر احمد شاہ رضوانی، میاں محمد یوسف (سرخ ڈھیری)، میاں حسیب گل کاکا خیل، مولوی عبدالمجید افغانی، منشی احمد جان، قاضی رحیم اللہ، سید راحت اللہ زاخیلی، میاں آزاد گل کاکا خیل، حافظ محمد ادریس، میجر ایس - اے - رحمٰن، نصراللہ خان نصر، مولانا عبدالقادر (مرحومین)، پھر امیر حمزہ شینواری، عبدالحلیم اثر، سمندر خان، میاں سید رسول رسا، دوست محمد خان کامل، فضل حق شیدا وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں - دوسری جماعت ان ناقابل فراموش اہم ہستیوں پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریک ''خدائی خدمتگار'' اور انگریزی تسلط سے استخلاص کی خاطر جنگ آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا - اس صف میں خان عبدالغفار خان، محمد اکبر خادم، میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، عبدالخالق خلیق، صنوبر حسین، حاجی خانمیر ہلالی، عبدالکریم مظلوم، عبدالغنی خان اور ماسٹر عبدالکریم وغیرہ شامل ہیں - تعلیم یافتہ نوجوان اور تعلیم یافتہ خواتین بھی پشتو ادب کی ترقی میں عملی حصہ لے رہی ہیں۔

مآخذ: پشتو (۱) سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل: پشتانه د تاریخ په رڼا کښې، پشاور ۱۹۶۰ء؛ (۲) قاضی عطاء اللہ خان: د پشتو تاریخ، بار اول، جلد اول، پشاور؛ (۳) افغانستان، در آریانا دائرة المعارف، کابل ۱۹۵۵ء؛ (۴) عبدالحی حبیبی: د پشتو ادبیاتو تاریخ، کابل ۱۹۴۵ء؛ (۵) وہی مصنف: پشتانه شعراء، لومړے ټوک، کابل؛ (۶) صدیق اللہ ریشتین: د پشتو د ادب تاریخ، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۷) عبدالحلیم اثر افغانی: تیر ھیر شاعران، پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۳ء؛ فارسی: (۸) احمد علی کہزاد: تاریخ افغانستان، جلد اول، کابل؛ (۹) علی اکبر دھخدا: لغت نامۂ دھخدا، ایران ۱۳۲۵ شمسی؛ (۱۰) محمد حسین برہان تبریزی: برہان قاطع، (شرح برہان قاطع از ڈاکٹر معین)، تہران ۱۳۴۲ھ؛ اردو: (۱۱) لیبان: تمدن ہند، اردو ترجمہ از سید بلگرامی، بار دوم، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۱۲) مرتضٰی احمد خان: تاریخ اقوام عالم؛ حصۂ اول، بار اول، لاہور؛ (۱۳) تاریخ ادبیات پشتو، شعبۂ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور (زیر طبع)؛ (۱۴) سر اولف کیرو: دی پٹھانز، اردو ترجمہ پٹھان (از سید محبوب علی)، پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۸ء؛ (۱۵) محمد عبدالسلام خان: نسب افاغنه، رامپور ۱۹۱۳ء؛ انگریزی: (۱۶) Edward Balfour: *Cyclopaedia of India and of Eastern and Southern Asia*، جلد اول، بار دوم، ۱۸۷۱ء؛ (۱۷) *Gazetteer of the Peshawar District*، ۱۸۹۷-۱۸۹۸ء، (پنجاب گورنمنٹ)؛ (۱۸) *Pathans*، نئی دہلی ۱۹۳۸ء؛ (۱۹) Kennedy: *Researches into the Origin and Affinity of the Principal Languages of Asia and Europe*، لنڈن ۱۸۲۸ء؛ (۲۰) Seshagiri Shastri: *Aryan and Dravidian Philology*، جلد اول، ۱۸۸۴ء؛ (۲۱) Percy Sykes: *A History of Persia*، جلد اول، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۲۲) Denzil Ibbetson: *A Glossary of the Tribes and Casts of the Punjab and N.W.F.P.*، جلد ۳، ۱۹۱۳ء؛ (۲۳) *Encyclopaedia Britannica*، جلد ۱ و ۳، ۱۹۰۶ء؛ (۲۴) *Encyclopaedia Americana*، جلد ۱ و ۳؛ (۲۵) Monier Monier Williams: *Sanskrit - English*

Dictionary، تعارف، ص *xii*، آوکسفرڈ ١٩٠٦ء؛ (٢٦) *Zoroastrian Theology* : Maneckji Nusseruanji Dhalla، انڈیا ١٩١٣ء؛ (٢٧) Arthur A. Macdonell : *A History of Sanskrit Literature*، بار ٨، ١٩٢٨ء.

(سیّد انوارالحق)

تعلیقہ : [مندرجۂ ذیل عبارت مرحوم مولانا عبدالقادر سابق ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی، کے قلم سے ہے ـ پشتو کے بارے میں ان کی یہ رائے عام مسلمات سے کچھ مختلف ہے مگر بہر حال قابل توجّہ ہے] :

پشتونوں کی تاریخ آج تک پردۂ خفا میں رہی ـ اس لیے جس مؤرّخ یا محقق کے خیال میں جو کچھ آیا وہ لکھ گیا ـ کسی نے انھیں فرعون کی قوم قبطیوں میں شامل کیا ـ کسی نے ضحاک کی نسل سے وابستہ کیا ـ کسی نے انھیں اس لیے افغان سے منسوب کیا کہ شور و فغان اور غوغا ان کا خاصّہ تصوّر کیا گیا اور بہتوں نے انھیں بنی اسرائیل، یعنی سامی النسل گردانا.

مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے انھیں کئی ایک نسلوں مثلاً آرین، یونانی، سیتھیں سے وابستہ کیا اور آخر میں ایک مخلوط النسل قوم بنا کر چھوڑا، مگر پشتون کو اپنا حسبی اور نسلی نام پشتون کبھی نہیں دیا گیا ـ نہ کسی نے اس نام سے ان کا ذکر کیا ہے ـ البتہ لغت‌نامۂ دہخدا میں پشوتن، یا پشوتنو نامی ایک شجاع پہلوان کا ذکر اوستا کے حوالے سے ضرور ملتا ہے ـ کئی اور قدیمی ایرانی کتابوں مثلاً بندھشن، دتکرو، بہمن یشت وغیرہ اور دقیقی اور فردوسی کے شاہناموں میں پشوتن پسر کیگشتاسپ کا خاصا ذکر ملتا ہے، جو تحقیق طلب نکتہ ہے ـ صدیوں کے اس طرزِ عمل کا جو افسوسناک اثر ہونا چاہیے تھا، وہ ہوتا رہا اور آج تک اس میں کمی واقع نہیں ہوئی.

پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی کی تاسیس کے بعد اس مسئلے کا محققانہ مطالعہ شروع ہوا ـ گزشتہ دس سال میں، جو قلمی کتابیں اور دیگر دستاویزات دستیاب ہو سکیں ان کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ علماء محققین اور مؤرّخین کے اپنے نوشتوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پشتون قوم زمانۂ قبل التاریخ سے پشتون ہی ہے ـ نہ وہ آریا ہے، نہ قبطی، نہ سامی وغیرہ وغیرہ ـ وہ بنی نوع انسان کا وہی قدیم ترین طبقہ ہے جس نے سب سے پہلے غلّہ دریافت کیا ـ خود اسے استعمال کیا اور دوسروں کے لیے تمدّن کی ابتدا کی.

آریا اقوام نے اپنی مذہبی کتابوں (ویدوں) اور ژند اوستا میں دو ہزار سال ق م میں ان کی تہذیب کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام پکتورن (پختون) بیان کیا ہے ـ اسی طرح دوسرے محقّقین اور مؤرخین نے مختلف ادوار میں پشتون قبائل کا ذکر کیا ہے ـ پختون یا پشتون ہی ہے دوسرا کچھ نہیں بن سکا ـ اسکی زبان بھی وہی پشتو ہے جسکی قدامت مسلّم ہے ـ بلکہ قوی شواھد کی رو سے ھندی یورپی اور ھندی ایرانی اور کئی دیگر زبانیں اس کے ساتھ اصل اور فرع کا تعلّق رکھتی ہیں.

(عبدالقادر)

⊗ پَشِین : صوبۂ بلوچستان کے ضلع کوئٹہ کی تحصیل جو ضلع کے وسط میں واقع ہے ـ اس کا علاقہ زیادہ تر طوبی کی پہاڑیوں کی جنوبی ڈھلانوں پر مشتمل ہے؛ باقی علاقہ موسمی ندی پشین لورا کی بالائی وادی میں واقع ہے ـ تحصیل کا رقبہ ٢٧١٧ مربع میل ہے اور بیشتر حصہ سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے ـ ١٩٠١ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ٦٩٥٧٩ ہے ـ

آب پاشی کے دو خاص ذریعے ہیں : ایک نہر شیبو، اور دوسرا حوض خوشی دل خان ـ یہ دونوں

دریاے پشین لورا سے پانی حاصل کرتے ہیں ۔ یہ ندی تقریباً ۲۰۰ میل لمبی ہے ۔ گندم، جوار اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ پھلوں کی بھی کاشت ہوتی ہے جن میں انگور اور انار خاص طور پر مشہور ہیں ۔ گھریلو صنعتوں میں قالین سازی اور اونی پارچہ بافی خاص ہیں ۔ معدنیات میں کرومائیٹ Chromite قابل ذکر ہے ۔ تحصیل کا صدر مقام پشین ہے، جو سندھ پشین ریلوے لائن سے چھے میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک مربع میل اور آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۱۰۶ ہے ۔

(سعیدالدین احمد)

⊗ **پکتھال** : (Marmaduke William Pickthall)، اسلامی نام محمد مارماڈیوک)، ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کو لنڈن میں پیدا ہوے اور ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء کو کارن‌وال Cornwall میں انتقال کر گئے ۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لنڈن میں پائی، انھیں اپنی عمر سے زیادہ ذہین سمجھا جاتا تھا ۔ جغرافیے اور لسانیات سے انھیں بہت لگاؤ تھا اور لکھنے کا بھی انھیں بہت شوق تھا، جو انھیں اپنے دادا اوبرائن O'Brien سے ورثے میں ملا تھا ۔ انھوں نے اپنی مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی، اطالوی، جرمن، ہسپانوی اور عربی زبانیں بھی سیکھیں۔

پکتھال کو یورپ کی فضا پسند نہ تھی اور وہ طبعاً مشرقی ممالک کی آب و ہوا میں زندگی گزارنے کی آرزو رکھتے تھے ۔ ۱۸۹۴ء میں انھیں شام اور مصر میں زندگی گزارنے اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور دینی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور ان سے وہ اتنا متأثر ہوے کہ انھوں نے اپنے ان تأثرات کو اپنی تصنیف *Oriental Encounters* میں بیان کیا ۔ وہ رفتہ رفتہ اسلامی طرز زندگی کے دلدادہ بنتے چلے گئے اور انھوں نے اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ ناول بعنوان ''ماہی گیر سعید'' *Said the Fisherman* لکھا، جس کا یورپ کی کئی زبانوں، مثلاً فرانسیسی، جرمن اور ڈینش Danish میں ترجمہ ہوا ۔ کچھ عرصے انھیں پھر مجبوراً لنڈن سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں رہنا پڑا ۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں وہ لارڈ کرومر Lord Cromer کی دعوت پر مصر گئے اور اس طرح انھیں پھر مسلمانوں کے مانند رہنے سہنے اور اسلامی تعلیمات کے مطالعے کا موقع ملا، انھوں نے اپنے مشاہدات کو اپنی ان دو کتابوں میں بیان کیا ہے : (۱) *The Children of the Nile* اور (۲) *Veiled Women* (برقع پوش خواتین)؛ پکتھال کچھ مدت بیروت میں بھی رہے، جہاں انھوں نے ایک دیہاتی مدرس کی مدد سے عربی بولنے کی مشق کی ۔

۱۹۱۳ء میں پکتھال ترکی کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے مطالعے کے لیے وہاں گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کو ''مرد بیمار'' سمجھ کر یورپ کی تمام طاقتیں (بشمول روس) اسے ہڑپ کرنے کی کوشش میں تھیں اور ترکی کے اندر اور باہر سازشوں کے جال بچھے ہوے تھے ۔ پکتھال کو ترکی سے بڑی ہمدردی تھی اور وہاں سے واپس آنے پر انھوں نے اپنے مشاہدات کو مقالوں کی صورت میں قلمبند کیا، جو *New Age* میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ۔ پھر ان مشاہدات و تأثرات کو اپنے ناول *With the Turk in Wartime* (جنگ میں ترکوں کے ساتھ) میں بیان کیا ۔ اب پکتھال دل میں اسلام کی صداقت و حقانیت گھر کر چکی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اور پھر عمر بھر اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہے ۔

جنگ عظیم کے دوران میں ان کی تین کتابیں شائع ہوئیں : (۱) *Tales from five Chimneys*

(۱۹۱۵)؛ (۲) The House of War (۱۹۱۶)؛ (۳) Knights of Araby (۱۹۱۷ء) - جنگ عظیم کے بعد وہ کچھ عرصے لنڈن میں ادارۂ معلومات اسلامی Islamic Information Bureau سے منسلک رہے - ۱۹۲۰ء کے اواخر میں پکتھال بمبئی کے ایک صاحب دل انسان عمر سبحانی کی دعوت پر بمبئی گئے اور بمبے کرانیکل Bombay Chronicle کے مدیر مقرر ہوے، اور ستمبر ۱۹۲۳ء تک ادارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے - ڈاکٹر سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری کی دعوت پر وہ نظام دکن کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے اور انهیں چدرا گهاٹ ہائی سکول کا پرنسپل مقرر کیا گیا - ۱۹۲۷ء میں انهوں نے ایک بورڈ کی زیر سر پرستی، جس کے صدر سر اکبر حیدری اور سیکرٹری نواب یاور جنگ تهے، اسلامک کلچر Islamic Culture ایک سہ ماہی رسالہ نکالا - اس رسالے کی اشاعت کا مقصد غیر اسلامی دنیا کو اسلامی ثقافت اور علوم و فنون سے روشناس کرانا تها - پکتھال کی مساعی جمیلہ اور ذوق و شوق کی وجہ سے اس رسالے نے علمی دنیا میں بہت جلد اپنا مقام حاصل کر لیا - وہ اس کی ادارت کے فرائض دس برس تک بڑے ھی خلوص و محبت سے انجام دیتے رہے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں سالانہ اسلامی خطبات کے سلسلے میں، جس کی بنیاد جمال محمد نامی ایک نیک دل تاجر نے رکهی تهی، "اسلام کا ثقافتی پہلو" کے موضوع پر خطبے دیے، جو بعد میں The Cultural Side of Islam کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں نظام دکن نے پکتھال کو دو برس کی رخصت دی تا کہ وہ قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کی تکمیل کریں، جسے انهوں نے چند برس پہلے شروع کیا تها، چنانچہ جب انهوں نے یہ ترجمہ ختم کر لیا تو اسے لے کر قاہرہ گئے، جہاں انهوں نے احمد بے الغمراوی، جامعۃ الازهر کے شیخ (Rector) مصطفی المراغی کے صلاح و مشورے سے اپنے مسودے پر نظر ثانی کی - علاوہ بریں انهوں نے دوسرے عرب علما سے بهی مشورہ کیا - قرآن حکیم کا یہ انگریزی ترجمہ (The Glorious Quran) ۱۹۳۰ء میں لنڈن اور نیو یارک میں شائع ہوا، بعد ازاں کئی مرتبہ مع متن اور بغیر متن شائع ہو چکا ھے - یہ ترجمہ صحت، سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے مقبول ترین تراجم میں شمار ہوتا ھے۔

پکتھال نے اپنی زندگی کے آخری سال اسلامک کلچر کی ادارت، چدرا گهاٹ ہائی سکول کی پرنسپل شپ، اور آخر میں نظام دکن کے چهوٹے بهائی صاحبزادۂ بسالت جنگ کے کمپٹرولر کے دفتر میں گذارے - اس دوران میں وہ پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حیدر آبادی مندوبین کے سیکرٹری اور پهر نظام دکن کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے لنڈن گئے۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں وہ حیدر آباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو گئے اور اسی سال اپریل میں لنڈن چلے گئے - وہ اب بهی اسلامک کلچر کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تهے، اس کے علاوہ وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں سرگرم عمل رہے - آخری موسم سرما انهوں نے کارن‌وال Cornwall میں گزارا، جہاں وہ اپنی بعض تصانیف پر نظرثانی کر رہے تهے کہ بروز منگل ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء کو ایک گهنٹے کی مختصر علالت کے بعد اپنے خالق سے جا ملے - انهیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

پروفیسر Krenkow نے پکتھال کے متعلق ان

کی وفات پر اپنے خط میں لکھا ہے : ''حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ مغرب میں اسلام کی اشاعت کے لیے کام کرتے رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک انجمن کی بنیاد بھی رکھی - وہ ایک قابل اعتماد دوست اور پکّے مسلمان تھے'' (قبّ اسلامک کلچر، جولائی ۱۹۳۷ء، جلد ۱۰، ص ۷) - پکتھال طومار نویس مصنّف تھے - ان کی تصانیف مفصلۂ ذیل ہیں : (۱) *All Fools* (۱۹۰۰ء)؛ (۲) *Said the Fisherman* (۱۹۰۳ء)؛ (۳) *Enid* (۱۹۰۴ء)؛ (۴) *Brendle* (۱۹۰۵ء)؛ (۵) *The House of Islam* (۱۹۰۶ء)؛ (۶) *The Myopes* (۱۹۰۷ء)؛ (۷) *The Children of the Nile* (۱۹۰۸ء)؛ (۸) *The Valley of the Kings* (۱۹۰۹ء)؛ (۹) *Pot-au-feu* (۱۹۱۱ء)؛ (۱۰) *Larkmeadow* (۱۹۱۲ء)؛ (۱۱) *Veiled Women* (۱۹۱۳ء)؛ (۱۲) *With the Turk in War-Time* (۱۹۱۴ء)؛ (۱۳) *Tales from five Chimneys* (۱۹۱۵ء)؛ (۱۴) *The House of War* (۱۹۱۶ء)؛ (۱۵) *Knights of Araby* (۱۹۱۷ء)؛ (۱۶) *Oriental Encounters* (۱۹۱۸ء)؛ (۱۷) *Sir Limpidus* (۱۹۱۹ء)؛ (۱۸) *The Early Hours* (۱۹۲۱ء)؛ (۱۹) *As Others see Us* (۱۹۲۲ء)؛ (۲۰) *The Meaning of the Glorious Koran* (۱۹۳۰ء)؛ (۲۱) *Quranic Advices*، لاھور (بدون تاریخ)؛ (۲۲) *Cultural Side of Islam*، ترینولی Trinnevelly، ۱۹۳۷ء (= *Islamic Culture*، لاھور بدون تاریخ)؛ (۲۳) *Al-Amin, Life of the Holy Prophet*، کراچی ۱۹۵۹ء.

مآخذ : (۱) *The New Century Cyclopedia of Names*، نیو یارک ۱۹۵۴ء، بذیل مادّۂ Pickthall؛ (۲) E. E. Speight : "*Marmaduke Pickthall*" در *Islamic Culture*، حیدر آباد (دکن)، جولائی ۱۹۳۷ء، ۱ : ۳ تا ۴؛ (۳) نظامت جنگ : ''محمد پکتھال'' (نظم)، در اسلامک کلچر، حیدر آباد (دکن)، جولائی ۱۹۳۷ء؛ (۴) نجیب العقیقی : اَلمستشرقون، ۲ : ۵۱۲؛ (۵) Harold Bowen : *British Contributions to Turkish Studies*، لنڈن ۱۹۴۵ء، ص ۴۹ تا ۵۰؛ (۶) *Webster's Biographical Dictionary*، بذیل مادّہ *Loyal Enemy*.

[ادارہ]

پُل : Pul فُلبِہ، مغربی افریقہ کا ایک قبیلہ، ابتدا میں یہ لوگ خانہ‌بدوش گلّہ‌بان تھے، اب بڑی حد تک اقامت پذیر ہو گئے ہیں اور زراعت کرتے ہیں - فُلبہ Fulbe، خود کے لیے ان کا اپنا نام، پلو Pulo کی جمع ہے؛ الحوصہ Hausa انھیں فُلنی Fulani کہتے ہیں، کنری Kanuri فلتہ Felata اور فرنچ مصنّفین Peuel؛ ان کی زبان کا نام خود اُن کے ہاں فُلفُلدہ Fulfulde ہے.

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال مشرق سے اور شاید اصل میں فزان Fezzan سے اس علاقے میں آئے تھے، لیکن زیادہ زمانۂ حال میں ان کی سمت مغرب سے مشرق کو، نہ کہ مشرق سے مغرب کو رہی ہے - Migeod نے ۱۹۲۳ء میں انھیں اس علاقے میں پایا جو اب برطانوی تولیت میں علاقۂ کیمرون Cameroons ہے اور یہاں وہ ان لوگوں کی زندگی میں داخل ہوے تھے جن سے یہ مصنّف خود ملا - ان کی تقسیم کے بڑے مرکز فرانسیسی گنی Guinea میں فوتہ‌جالون Futadjallon اور Haut-Sénégal-Niger - (بالائی سینی گال) میں ماسینہ Massina ہیں.

جہاں تک ان کی نسل کا تعلّق ہے، اگرچہ متعدّد نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں، لیکن اب انھیں حامی النسل تسلیم کیا جاتا ہے - Meek (۱ : ۹۴) کا خیال ہے کہ یہ لوگ قدیم مصریوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں - ڈیلافوس Delafosse کے نزدیک وہ ایک دوغلی نسل سے تھے جو کسی پُر اسرار بنی اسرائیل (جن کی اب تک معقول طور سے توضیح نہیں ہو سکی) اور اس

قبیلے یا قبیلوں سے مل کر بنی تھی جنھیں انھوں نے پہلے سے یہاں قابض و متصرف پایا تھا۔ ایک بیان کے مطابق یہ تکرور [رك بآن] تھے جو اب تُوکُولیور Toucouleur کہلاتے ھیں۔ فرابی نیوس Frobenius (کتاب مذکور، ص ١٦٥) کہتا ھے کہ انھوں نے فزّان سے جنوب مغرب کو اس غرض سے ہجرت کی کہ گارا Gara کے ظلم سے بچکر نکل جائیں اور گارا کو خود یہ مصنف اور دوسرے لوگ بھی ہیروڈوٹس کے Garamantes قرار دیتے ھیں۔ سُنِنکہ Soninke روایت میں اسے ان کا ذکر بُرُورُو Bororo کے نام سے ملتا ھے (آدماوہ Adamawa کے خانہ بدوش فُلبیوں کا ١٨٩٣ء میں پاسارج Passarge کی آمد تک یہی نام باقی تھا)، یا بُروجُوگو Borojogo کے نام سے بحیثیت ایک ذلیل محکوم قبیلے کے۔ اسے ان قصص و روایات میں کوئی جدّت نظر نہیں آتی جو ان کے گویّوں (Mabube) سے جمع کیے گئے ھیں، بلکہ اس کا قول ھے کہ آزاد ہوتے ھی انھوں نے اپنے سابقہ حکمرانوں کی روایات اختیار کر لی تھیں۔ ضمناً یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ فرابی‌نیوس Frobenius کا یہ کہنا صریحاً غلط ھے (وھی کتاب) کہ بارتھ Schon Barth انھیں قدیم حبشی (Leucaethiopen) کا مرادف قرار دے چکا ھے، لیکن میں انھیں قدیم حبشی Leucaethiopen قرار دینا پسند نہیں کرونگا۔ بارتھ کی ذاتی رائے ھے کہ یہ لوگ ایک مخلوط عرب و بربر اور ایک خالص حبشی نسل کے درمیان ھیں۔ اسی عبارت میں وہ ان کی زبان اور کافر جنوبی افریقہ (Kaffer Südafrika) کی زبان میں تعلّق ہونے کی علامت کا ذکر کرتا ھے اور یہ تعلّق دونوں زبانوں میں مختلف قسم کے اسما کی موجودگی پر مبنی ہوگا۔ اس بارے میں ہم آئندہ سطور میں بحث کریں گے۔

میک Meek متعدّد مفروضات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ھے (١ : ٩٦) کہ ”فُلَنی غالباً ایک بہت قدیم لیبیائی قبیلہ ھے، جس کا اصلی وطن مصر یا ایشیا تھا“۔ غالباً وہ خانہ‌بدوش فُلبیوں کو نائجیریا Nigeria میں حامی نسل کے خالص ترین نمائندے سمجھتا ھے (١ : ٢٦)۔

ان کی جسمانی خصوصیات کا شاید بہترین خلاصہ میک نے ذیل کے الفاظ میں کیا ھے (١ : ٢٦)، جو مجموعی طور پر منگو پارک Mungo Park، بارتھ Barth، نختیگل Nachtigal، پاسارج Passarge اور دوسرے سیّاحوں کے بیان سے مطابقت رکھتا ھے: ”اُن کا رنگ کُھلے ہوے گندمی سے لے کر سرخی مائل گندمی تک ہوتا ھے اور بقول پاسارج ”hellrötlich gelb“ [= ”ھلکا سرخی مائل زرد“]؛ ان کی جسمانی ساخت چھریری اور مضبوط رگ پٹھے کی ہوتی ھے اور بعض اوقات نسوانی بھی؛ چہرہ بیضوی، ہونٹ پتلے، کھوپری لمبوتری، پیشانی قدرے کنپٹی کی طرف ڈھلواں، ناک سیدھی، نیز عقّابی اور نوک کے پاس اکثر ذرا سی گولائی لیے ہوے؛ جبڑا قدرے آگے کو نکلا ہوا، یا بالکل ھی نکلا ہوا نہیں ہوتا۔ بال گھونگریالے اور اکثر سیدھے ھیں؛ . . . مردوں کی ٹھوڑی پر چٹکّی سی ڈاڑھی کا ایک گچھا ہوتا ھے؛ آنکھیں بادامی اور ان پر لمبی سیاہ اور ریشمین پلکیں سایہ کیے ہوے ہوتی ھیں۔ فلنی عورتوں کے چہرے کا حسن اور دلربا چال مشہور ھے۔ سیرت میں فُلا شکّی اور شرمیلا، سیانا اور چالباز ہوتا ھے۔ افریقہ کا کوئی مقامی باشندہ زمانہ سازی اور عیاری میں اس کی برابری نہیں کر سکتا۔“

یہ تخمینہ مجموعی طور پر ان مبصرین کی رائے کے مطابق ھے جن کا اوپر ذکر آیا ھے۔ پاسارج انھیں ایک بہادر اور سورما قوم ("eine ritterliche

"nation") کہتا ہے، اس معنی میں کہ وہ محنت مزدوری اور تجارت دونوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور صرف جنگ، شکار اور چوپانی ہی کو مرد کے شایانِ شان کام سمجھتے ہیں ۔ یہ حبشیوں کی بہ‌نسبت زیادہ خودداری اور اعلیٰ کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

پاسارج ان کو ''مذہب میں متعصب'' بیان کرتا ہے، لیکن چونکہ خانہ‌بدوش فُلبی اب تک کسی حد تک تو ضرور بے دین ہیں (میک، ۱ : ۲۰۰ و بمواضع کثیرہ)، لہٰذا اس کی مراد اقامت پذیر فلبیوں سے ہوگی، جنہیں حوصہ Housa فُلَنِن گِدّہ Fulanin Gidda کہتے ہیں اور جو معلوم ہوتا ہے کہ نائجیریا کے اور قبائل کی طرح گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گئے تھے (میک ۲ : ۱ تا ۱۱) ۔ یہ آباد شدہ فُلبی ''ان قوموں کے ساتھ جنہیں انھوں نے مغلوب کیا تھا آزادانہ شادی بیاہ کرنے اور نیز کنیزیں رکھنے کی وجہ سے تیزی کے ساتھ حبشیوں میں مدغم ہو رہے ہیں ۔ اب ان کی ناکیں چوڑی اور لب موٹے ہوتے جاتے رہے ہیں ۔ اُن کے بال گھونگر والے ہو رہے ہیں ۔ ان کے جسم کی ساخت بھدی ہو رہی ہے اور حبشی ساخت کا منہ آگے کو نکلتا جا رہا ہے ۔ اگرچہ انھوں نے ان لوگوں کی حبشی شکل و صورت میں بہت تغیر پیدا کر دیا ہے جن کے ساتھ وہ مقیم ہوگئے ہیں، تاہم فُلبی خون کی تازہ آمیزش نہ ہونے کی وجہ سے یہ تبدیلی تیزی سے غائب ہونے کا میلان رکھتی ہے ۔ وہ خود اپنی نسل کے خانہ بدوش بے دین فلبیوں کے ساتھ اب شادی بیاہ بھی نہیں کرتے'' (میک ۱ : ۲۸).

لیبورِہ Labouret کے (بیان کے) مطابق خانہ بدوش فلبی ملک میں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں منتشر ہیں ''اور بالعموم اقامت پذیر گانوؤں کے پہلوؤں میں گلّوں اور ریوڑوں کی حفاظت کے لیے رہتے ہیں (généralement installées à côté des villages) (sédentaires pour en garder les troupeaux''۔ یہ لوگ حضری آبادی کو دودھ، مکھن وغیرہ مہیا کرتے ہیں ۔ دودھ اور مکھن فروخت کرتی ہوئی فلبی عورتیں سیاحوں کے لیے ایک مانوس منظر ہیں ۔

فلبی بالائی سینی‌گال Senegal کے علاقے میں تقریباً ۱۳۰۰ء میں پہنچے، جب کہ سلطنتِ غانہ اپنی قوت کے اوج پر تھی ۔ حدود ۱۴۰۰ء میں قبیلے کا ایک حصّہ تِرمِس Termes سے آ کر جالو Djallo خاندان کے رئیسوں کے ماتحت شمال مغرب میں ماسِینہ میں قیام پذیر ہو گیا ۔ اس سلطنت کو سنغائی Songhai سردار اسکیا عمر نے ۱۴۹۴ء میں فتح کیا ۔ تقریباً اسی زمانے میں یا تھوڑے ہی دن بعد ایک فُلبی رئیس (ardo) مسمی تِنگلّا Tengella نے عمر کے خلاف بغاوت کی، لیکن ۱۵۱۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بیٹے کولی Koli نے ایک آزاد کافر حکومت بادیار Badiar میں قائم کی، جو بالائی گیمبیا میں ہے ۔ اس کے جانشین، جو خاندان دِینیَانکہ Denianke کہلاتے ہیں، ۱۵۵۹ء سے ۱۷۷۶ء تک یہاں حکومت کرتے رہے ۔

فُلبی لوگ بورنو Bornu میں سولھویں صدی عیسوی میں داخل ہوئے جیسا کہ انھوں نے دوسری جگہ بھی کیا تھا اور ملک میں بے ضرر گڈریوں کے بھیس میں پھیلتے گئے ۔ وہ موقع کی تاک میں تھے، یہاں تک کہ ''ایک ناگہانی بھرپور وار کے ذریعے انھوں نے اپنے کو ملک کا مالک بنا لیا'' (میک) ۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب شیحو عثمان دان فودیو Shéhu Usuman dan Fodio (ولادت ۱۷۵۴ء) نے ایک احیاے دین کی بنا ڈالی اور آخر میں نائیجیریا کے شمالی حصے کو فتح کر لیا ۔ عثمان نے اپنا پایۂ تخت سکوٹو Sokoto میں رکھا

(جسے اس کے بیٹے بِلّو Bello نے ۱۸۱۰ء میں تعمیر کیا تھا) اور اپنی وفات سے پہلے، جو ۱۸۱۷ء میں ہوئی، وہ اپنی سلطنت میں مسلمانوں کا مذہبی پیشوا (Sarkin Musulmi) تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بِلّو تخت نشین ہوا۔ یہ وہی "سلطان بِلّو" ہے جس سے ۱۸۲۱ء میں ڈِنہم Denham، کَلَیپَرٹن Clapperton اور اوڈنی Oudney نے ملاقات کی تھی۔ اس کا پایۂ تخت سکوٹو تھا اور بعد کو وُرنو Wurno ہوا، جب کہ اس کا چچا عبداللہ Abdulahi گندُو Gando میں حکومت کرتا تھا۔

اس اثنا میں، مغرب میں، ایک فُلبی سردار (marabout)، مسمّٰی شیخ حمدو Seku Hamadu نے ماسینہ کے فلبیوں کو حدود ۱۸۱۰ء میں مشرف باسلام کیا، اور جِنّہ (Djenne) پر قابض ہو گیا، بلکہ ۱۸۲۶ء میں ٹمبکٹو کا بھی مالک و متصرف ہو گیا؛ لیکن جس حکومت کی اس نے بنیاد ڈالی وہ تھوڑے ہی عرصے تک قائم رہی اور اس کے پوتے کو الحاج عمر نے ۱۸۶۲ء میں مغلوب کر لیا۔ اس سے پیشتر ۱۷۷۶ء میں مسلمان تکرور Tekror نے فوتہ تورو Futa Toro میں فلبی دِینیآنکہ Denianke کے خلاف بغاوت کی تھی، اور ایک "دینی انتخابی بادشاہی" (Delafosse) کی بنیاد ڈالی تھی، جو ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی الحاق تک قائم رہی۔ تکرور کے ایک اور گروہ کے سردار کی حیثیت سے عمر نے مقامی فُلبی لوگوں کو مطیع کر لیا تھا اور اپنی وفات تک، جو ۱۸۶۴ء میں واقع ہوئی، برابر فرانسیسی حکام کو پریشان کرتا رہا (ڈیلا فوس)۔

اقامت پذیر فُلبی اپنے رسم و رواج میں دوسرے نو مُسلم قبائل سے زیادہ مختلف نہیں ہیں، اگرچہ ان قبائل نے بھی بظاہر اپنے کافر آبا و اجداد کے کچھ آثار قائم رکھے ہیں؛ چنانچہ بعض مسلمان خاندانوں میں کچھ حیوانات کی ممانعت کی پابندی کی جاتی ہے، خواہ اس کا تعلّق قدیم حیوان پرستی (totemism) سے ہو یا نہ ہو (میک ۱ : ۳۷)؛ بظاھر اس کی مراد خوصّہ سے ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان میں کم از کم ایک "فلنی مسلم قبیلے کی شاخ" کو شامل کرنا مقصود ہے۔ مزید برآن جب محمد التُونسی کہتا ہے (میک، ۱ : ۹۹) کہ "سوڈان میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک گرگٹ کی نسل سے ہیں" تو یہ خیال کرنا صحت سے بعید ہو گا کہ یہ بیان محض ایک افسانہ ہے، جو از راہ تحقیر گھڑا گیا ہے"، بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک حقیقی حیوان پرست عقیدے (totemism) کی جھلک پائی جاتی ہو۔

ذات پات کا نظام، جو حبشی اور بنتو افریقہ میں کہیں اور نہیں پایا جاتا، فُلبہ، وُلُوف Wolof، مالِنکِہ Malinke، مرکہ Marka اور بامنّہ Bamanna قبائل میں عام ہے، اس فرق کے ساتھ کہ فلبہ کے ہاں "ذاتوں" کی ابتدا قبائلی امتیازات سے ہوئی (فرابِی نیوس Frobenius، ص ۱۶۶) اور اسی لیے ان میں زیادہ سختی ہے، درآن حالیکہ ماندہ Mande قوم میں ذات پات کا اتنا تعصب اور سختی نہیں ہے۔ فلبہ کی ذاتیں یہ ہیں:۔

امرا و اشراف	رِمبےِ Rimbe (Dimu کی جمع)
غلام (نوکر چاکر)	رِمیبے Rimaibe
تاجر اور گلّہ بان	دِیاوَمبے Diawambe
گویّے اور جُلاہے	مابُوبے Mabube
چمڑے کا کام کرنے والے	سکیبہ Sakebe
	(اور بعض جگہ گرگسابہ Gargassabe)
لکڑی کا کام کرنے والے	لَوبے Laobe
	(اور بعض جگہ سکیبہ Sekaebe)

دھات کا کام کرنے والے ویلبے Wailbe (Bailu کی جمع)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فلبه نے دیگر قبائل مذکورہ کے برخلاف غلاموں کا کوئی جداگانہ طبقه تسلیم نہیں کیا ۔ کمینے (جن کو Frobenius : "Hörige" کہتا ہے) رِمبے کے وہ اخلاف ہیں جو اسیر عورتوں کے بطن سے پیدا ہوے ۔ لکڑی کا کام کرنے والے اور تجار کی ذاتیں فلبه کے ساتھ مخصوص ہیں؛ بقیه تمام دوسرے قبائل میں عام ہیں۔

گلاّ، سومالی اور حامی نسل کے دوسرے گلّه بان قبائل کے برعکس فلبه میں وہ رسوم اور ارکان عبادت نظر نہیں آتے جن کا تعلق دودھ سے ہے ۔ ان کے پاس دو خصوصی نسلوں کے مویشی ہیں، جن میں سے ایک نسل کے یا دونوں کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ اُن کی جانب جنوب ھجرت میں ساتھ آئے تھے ۔ اُن کے مویشیوں سے متعلق بعض تفصیلات میک نے دی ہیں (۱ : ۱۱۵ تا ۱۱۸).

فُلبه کی ''فُلفُلده'' زبان عرصے تک کلیةً منفرد سمجھی جاتی رہی ۔ اگر Barth نے اسے جنوبی افریقه کی کافر زبان کے خاندان سے تصور کیا ہے تو اس کے ذہن میں ضرور اصناف اسم (noun-classes) کا نظام رہا ہوگا، جو بعض حیثیتوں سے بنتو بولیوں کے خاندان کے نظام سے مشابه ہے، اگرچه بنتو سے یه زیادہ مکمل اور زیادہ معقول ہے ۔ مُولر F. Müller نے اس زبان کو بجاے خود ایک الگ قسم قرار دیا، جو ''نوبا ۔ فُله گروہ'' کی ایسی شاخ ہے جس کی وہ کوئی اور قرابت معلوم نه کر سکا ۔ A.W. Schleicher (۱۸۹۱ء) نے کوشش کی که سُومالی سے اس کا تعلق ثابت کرے ۔ اس میں اُس نے زیادہ تر الفاظ کی اتفاقی مشابہتوں کا سہارا لیا اور اصناف اسمی سے بالکل اعراض کیا، اگرچه وہ تسلیم کرتا ہے که فُلفلده صرف و نحو کی ایک اہم خصوصیت سومالی میں نہیں پائی جاتی ۔ اس لحاظ سے که وہ اس زبان کو حامی کی ایک شاخ بتاتا ہے، وہ کسی حد تک Meinhof سے متفق ہے، جو کچھ آگے چل کر اس نتیجے پر پہنچا که یه ایک حامی طبقے سے قبل کی نمائندہ ہے جس سے ایک طرف تو وہ حامی زبانیں بنیں جن سے ہم آج واقف ہیں (شِلْحه، ساھو، گلاّ، وغیرہ) اور دوسری طرف بنتو زبانوں کا خاندان بنا.

اصناف اسمی کے نظام کے سوا جس کا اُوپر ذکر ہوا (جس میں جمع بنتو کی طرح حرف سابق کی تبدیلی سے نہیں بنتی بلکه حرف لاحق کے تغیّر سے) فُلفلده میں ایک اور عجیب ذیلی تقسیم نظر آتی ہے : (ا) انسانی اور غیر انسانی؛ (ب) بڑی اور چھوٹی چیزیں ۔ یہاں شروع کے حرف صحیح کے تغیّر سے جمعیں بنائی جاتی ہیں جس کے لیے خاص قواعد مقرّر ہیں، جنھیں Meinhof نے قانون قطبیت (Law of Polarity) کے نام سے بیان کیا ہے ۔ اس مؤخرالذکر تقسیم سے اس نحوی تذکیر و تانیث (gender) کے آغاز کا ایک مفروضه تیار کیا، جو بہت حد تک قابل قبول ہے اور جسے اس نے اپنی کتاب *Sprachen der Hamiten* (۱۹۱۲ء) میں پیش کیا ہے؛ تاہم زمانۂ قریب میں اس نے بنتو مادّوں کی نسبت اپنی راے میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی اور اب وہ کم از کم یه سمجھتا ہے که نظامِ اصناف اسمی فُلفلده کی کوئی قدیم خصوصیت نہیں ہے، بلکه ہو سکتا ہے که کسی بنتو یا ''نیم بنتو'' زبان سے لی گئی ہو ۔ Westernmann مؤخرالذکر کے لیے اصطلاح قبائلی بولی "Klassensprachen" کو ترجیح دیتا ہے اور اسے وسیع کر کے اس میں اُن زبانوں کے علاوہ جو H.H. Johnston کی *Compartive Study* میں شمار کی

گئی ہیں، دوسری زبانوں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہ بھی اب ظاہر ہوتا جا رہا ہے کہ فُلفلدہ زبان سب سے اتنی الگ اور انوکھی نہیں جیسی کہ شروع میں معلوم ہوئی تھی، بلکہ اس میں سِرِر Serer اور دوسری ملحقہ زبانوں کے ساتھ اور خصوصاً پرتگیزی گنی کی غیر معروف بیافدہ Biafada کے ساتھ، جس کا مطالعہ G.A. Krause نے بہت پہلے یعنی ۱۸۹۵ء میں کیا تھا، کئی باتیں مشترک ہیں۔ A. Klingenheben کے دو اہم مقالوں سے، جو *Ztsch. r. f. Eingeborenensprachen*، ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے تھے، امید ہے کہ اس پیچیدہ مسئلے پر نئی روشنی پڑے گی۔ فُلفلدہ بھی حوصہ کی طرح ایک تحریری ادب کی مالک ہے، جس کے لیے عربی خط، جو مقامی طور پر اجمی (عجمی) کہلاتا ہے، غالباً ترویج اسلام کے وقت سے مستعمل ہے۔ اس خط کی کچھ خصوصیات ہیں جن کی بدولت وہ نمایاں طور پر اس خط سے مختلف ہے جسے سواحلی Swahili استعمال کرتے ہیں۔

اس کی بعض نفیس عکسی نقلیں کیپٹن ایف۔ ڈبلیو۔ ٹیلر Taylor کی *Fulani-Hausa Readings* میں موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) عبدالرحمٰن السعدی: تاریخ السودان، مترجمہ Houdas، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۲) H. Barth: *Reisen und Entdeckungen in Nord-und Central-Afrika in den Jahren 1849 bis 1855*، ۵ جلد، گوتھا ۱۸۵۷ء؛ (۳) Abbé P. D. Boilat: *Esquisse Sénégalaise, physionomie du pays, peuplade, commerce, religion, passé, avenir, récits et légendes*، پیرس ۱۸۵۳ء؛ (۴) R. N. Cust: *A Sketch of the Modern Languages of Africa*، ۲ جلد، لندن ۱۸۸۳ء؛ (۵) Denham، Clapperton و Oudney: *Narrative of Travels and Discoveries in Northern and Central Africa in the years 1822, 1823 and 1824*، لندن ۱۸۲۶ء؛ (۶) L. Desplagnes: *Le Plateau Central Nigérièn*، پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۷) Maurice Delafosse: *Haut-Sénégal-Niger*، ۳ جلد، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۸) وہی مصنف: *Traditions historiques et légendaires du Soudan occidental traduit d'un manuscrit arabe inédit*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۹) وہی مصنف و H. Gaden: *Chroniques du Fouta sénégalais*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۱۰) وہی مصنف: *Les Noirs de l' Afrique*، Payot (مجموعۂ عدد ۱۰)، پیرس ۱۹۲۲ء (اس میں مآخذ کے متعلق نہایت مکمل تعلیقات ہیں)؛ (۱۱) C. Faidherbe: *Essai sur la Langue Poul*، پیرس ۱۸۷۵ء؛ (۱۲) Leo Frobenius: *Atlantis*، ج ۶، Jena ۱۹۲۱ء؛ (۱۳) Henri Gaden: *Le Poular, dialecte Peul du Fouta Sénegalais*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۱۴) وہی مصنف: *Proverbes et maximes peuls et toucouleurs traduits, expliqués et annotés*، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۱۵) T. G. de. Guiraudon: *Manuel de la langue Foule*، پیرس و لائپزگ ۱۸۹۴ء؛ (۱۶) A. Klingenheben: *Die Präfixklassen des Ful*، در *Ztschr. für Eingeb.-Spr.*، ج ۱۴، ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴ء، ص ۱۸۹ تا ۲۲۲، ۲۹۰ تا ۳۱۵؛ (۱۷) وہی مصنف: *Die Permutation des Biafada und des Ful*، در مجلۂ مذکور، ج ۱۵، ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵ء، ص ۱۸۰ تا ۲۱۳، ۲۶۶ تا ۲۷۲؛ (۱۸) H. Labouret: *La situation linguistique en Afrique Orientale Française*، در *Africa*، ج ۳، ۱۹۳۱ء، ص ۵۰۶؛ (۱۹) وہی مصنف: *La parenté à plaisanteries en Afrique Occidentale*، در *Africa*، ج ۲، ۱۹۲۹ء، ص ۲۴۴؛ (۲۰) Meinhof: *Die Sprachen der Hamiten*، ہیمبرگ ۱۹۱۲ء؛ (۲۱) وہی مصنف: *Das Ful in seiner Bedeutung für die Sprachen der Hamiten, Semiten und Bantu*، در *ZDMG*

(۲۲) C. K. Meek: *The Northern Tribes of Nigeria*، ۱۹۱۱ء؛ ج ۱ (خصوصًا ص ۲۳، ۲۸، ۹۳ ببعد) و ۲، آوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲۳) F. W. H Migeod: *Through British Cameroons*، لنڈن ۱۹۲۵ء؛ (۲۴) وہی مصنف: *A View of Sierra Leone*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۲۵) C. Monteil: *Une Cité Soudanaise—Djenné*، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۲۶) Gustav Nachtigal: *Sahara und Sudan: Ergebnisse sechsjähriger Reisen in Afrika*، تین حصے، برلن - لائپزگ ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء؛ (۲۷) Mungo Park: *Travels in the Interior Districts of Africa*، ۱۷۹۵ تا ۱۷۹۷ء، ۳ جلد، لنڈن ۱۷۹۹ء؛ (۲۸) Siegfried Passarge: *Adamaua, Bericht über die Expedition des Deutschen Kamerun - Komitees in den Jahren 1893-1894*، برلن ۱۸۹۵ء؛ (۲۹) L. N. Reed: *Notes on some Fulani Tribes and Customs*، در *Africa*، ج ۵، ۱۹۳۲ء، ص ۲۲۴ ببعد؛ (۳۰) H. Reeve: *The Gambia*، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۳۱) Ch. A.L. Reichardt: *Grammar of the Fulde Language*، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۳۲) A. W. Schleicher: *Afrikanische Petrefakten*، برلن ۱۸۹۱ء؛ (۳۳) Flora. L. Shaw (Lady Lugard): *A Tropical Dependency*، لنڈن ۱۹۰۵ء؛ (۳۴) F. W. Taylor: *Fulani-Hausa Readings in the Native Scripts. With Transliterations and Translations*، (ٹیلر کے Fulani-Hausa سلسلے کی ج ۵)، آوکسفرڈ ۱۹۲۹ء؛ (۳۵) وہی مصنف: *Fulani-English Dictionary*، آوکسفرڈ ۱۹۳۲ء؛ (۳۶) R. Thurnwald: *Social Systems of Africa*، در *Africa*، ج ۲، ۱۹۲۹ء، ص ۲۲۱ تا ۲۳۷؛ (۳۷) D. Westermann: *Handbuch der Ful-Sprache*، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۳۸) J. R. Wilson-Haffenden: *The Red Men of Nigeria*، لنڈن ۱۹۳۰ء۔

(A. WERNER)

پَلّای: (پولی Polei) جس کا املا عرب مصنفین نے بلّای (بلائی) کیا ہے، جنوبی ہسپانیہ میں ایک قلعے کا قدیم نام، جس کی جگہ زمانۂ حال کا چھوٹا سا قصبہ اگوئلی لار د لا فرونتیرا Aguilar de la Frontera آباد ہے ۔ اس کی آبادی تقریبًا تیرہ ہزار ہے ۔ یہ قرطبہ کے صوبے میں قبرہ Cabra اور الیسانہ Lucena سے بارہ میل شمال مغرب میں ہے ۔ ۱۲۵۸ء کے ایک فرمان کی بنا پر اگوئلی لارکو ڈوزی نے شناخت کیا کہ یہی سابقہ بلای تھا ۔ شہرۂ آفاق عمر بن حفصون [رک بآن] نے قرطبہ کے اموی امرا کے خلاف خروج کیا تو اس شہر نے اس کی بغاوت میں خاصا حصہ لیا ۔ پھر اس کا ذکر بارھویں صدی عیسوی میں جغرافیہ نویس الادریسی کے ہاں بھی آتا ہے ۔ یہاں ایک قلعے کے آثار، جو مسلمانوں کے زمانے میں بنا تھا، ابھی تک دیکھے جا سکتے ہیں ۔

مآخذ: (۱) الادریسی: *Description de l'Espagne*، طبع و مترجمۂ ڈوزی Dozy و ڈخویہ de Goeje، متن ص ۲۰۵، ترجمہ ص ۲۵۳؛ (۲) ابن حیان: المقتبس، مخطوطۂ بوڈلین، بمواضع کثیرہ؛ (۳) ڈوزی: *Histoire des Musulmans d' Espagne*، طبع جدید، لائڈن ۱۹۳۲ء، ۲: ۶۲ ببعد؛ (۴) وہی مصنف: *Recherches*، بار سوم، ۱: ۳۰۷؛ [(۵) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، بذیل مادۂ بلّائی]۔

(E. LEVI-PROVENÇAL)

پِلونہ: (Plevna و Plewna؛ ترکی: پلونہ) شمالی بلغاریا [رک بآن] کا ایک اہم شہر، سطح سمندر سے ۳۵۰ فٹ بلند، توچنیچہ Tučenica ندی کی گہری وادی میں واقع ہے، جو شہر کے دائیں جانب قریب ہی سے بہتی ہوئی دریاے وِید سے جا ملی ہے جو ڈینیوب کا معاون ہے ۔ پہاڑیوں سے گھرا ہوا اور وِدین، نیقیہ (نیکیا=ازنیق)، صوفیا اور کوہ بلقان کے دڑوں کو جانے والی شاہراہوں کے نقطۂ تقاطع پر ہونے کے

باعث پلونہ مدت سے جنگی اہمیت کا مقام رہا ہے ۔ وہاں سے اب ایک بڑی ریلوے لائن (صوفیا۔پلونہ۔شمن۔ورنہ) بھی گزرتی ہے ۔ یہ شہر، جس میں تجارت کی گرم‌بازاری ہے، ایک حلقے (circle) کا صدر مقام ہے ۔ یہاں بڑا کاروبار مویشی اور شراب کا ہے اور وہ عجائب خانے ہیں جن سے جنگ روس و ترکی کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔ پلونہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے ۔

اگرچہ پلونہ کے قرب و جوار میں رومن بستیوں کے کھنڈر موجود ہیں، تاہم یہ شہر در اصل ترکوں کے عہد ہی میں وجود میں آیا؛ پھر بھی اس ابتدائی دور کی تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات بہت کم ہیں ۔ اولیا چلبی کا یہ بیان کہ پلونہ کی بنیاد افلاق (ولاشیہ) کے بان [= حاکم] لادقہ؟ نے رکھی تھی قبول کرنے میں یقیناً تامّل سے کام لینا چاہیے ۔ دوسری طرف اس کا یہ دعوٰی کہ "۷۰۲ھ / ۱۳۲۰ء میں غازی خداوند گار (سلطان مراد اوّل) کے عہد میں اسے میخال بیگ نے فتح کیا" ترتیب زمانی کی بنا پر اعتراضات سے خالی نہیں ہے [اس لیے کہ مراد اوّل کا عہد حکومت ۱۳۶۰ تا ۱۳۸۹ء تھا] ۔ اس مصنّف کے قول کے مطابق پلونہ فتح ہونے کے بعد میخال بیگ کے بیٹوں کی آر پہ لیق [= جو کا کھیت، ایک مخصوص قسم کی جاگیر] تھا اور آگے چل کر بھی میخال اوغلو [رك بآں] کے معزز خاندان کے حلقۂ اثر میں رہا جنھوں نے وہاں متعدد عمارتیں تعمیر کی تھیں ۔ اولیا چلبی اور دوسرے ترک مآخذ کے مطابق (قب ۳: ۵۹۰م (الف) اور *Glasnik Skopskog naučnog društva*، ۱۳ : ۷۳ و ۸۱) پلونہ میں کو سہ میخال کا ایک بیٹا محمد بیگ (م ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ - ۱۴۲۲ء) اور مشہور علی بیگ میخال اوغلو، جو کہا جاتا ہے کہ ۱۵۰۷ء کے بعد فوت ہوا، مدفون ہیں ۔ بقول اولیا چلبی علی بیگ اُس مسجد میں دفن ہوا جو اُس نے بنوائی تھی ۔ ہمیں یہ بات نہ صرف اولیا چلبی بلکہ حاجی خلیفہ سے بھی معلوم ہوئی ہے کہ پلونہ نیقبہ کی سنجاق میں ایک ضلع کا صدر مقام تھا (*Rumeli und Bosna*، ترجمہ از v. Hammer : *Spomenik*، ۱۸ : ۲۳) ۔ سترھویں صدی میں جب اولیا چلبی اس شہر میں آیا تو یہاں دو ہزار مکانات، ایک ویران جنگی قلعہ، مذکورۂ بالا [غازی] علی بیگ کا قائم کردہ ایک بڑا دارالعلوم، سات مدرسے، چھے تکیے اور چھے سرائیں وغیرہ تھیں ۔ ترکی حکومت کے آخری دنوں میں پلونہ میں، بقول سامی بک (قاموس الاعلام، ۲ : ۱۵۳۲ تا ۱۵۳۳) سترہ ہزار باشندے اور اٹھارہ مسجدیں تھیں ، لیکن چونکہ بہت سے مسلمان جنگ روس و ترکی کے بعد ہجرت کر گئے، لہٰذا آبادی گھٹ کر چودہ ہزار رہ گئی اور ۱۸۸۹ء میں اکثر مسجدیں خستہ و شکستہ بتائی جاتی تھیں ۔

پلونہ کو عالمگیر شہرت ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء کی جنگ روس و ترکی ہی کے سلسلے میں حاصل ہوئی، جب روسی ڈینیوب کو پار کر کے ۱۹ جولائی ۱۸۷۷ء کو پلونہ کے سامنے نمودار ہوے اور انھیں عثمان پاشا کی غیر متوقّع مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جو ودِین سے آگے بڑھ کر یہاں پہنچ گیا تھا ۔ اُنھوں نے ۲۰ اور ۳۰ جولائی کو ناکام حملے کیے اور بھاری نقصان اٹھایا ۔ چونکہ پلونہ میں جنگی استحکامات نہ تھے، لہٰذا عثمان پاشا نے اس کے چاروں طرف اب مستحکم اور وسیع مٹی کی دیواریں بنوائیں ۔ ۱۱ اور ۱۲ ستمبر کو روسیوں نے رومانویوں کی مدد سے، جنھیں انھوں نے اپنی اعانت کے لیے بلایا تھا، پلونہ کے لینے کی تیسری کوشش کی ۔ انھوں نے پیدل فوج سے یورش کی، لیکن پھر بڑے نقصانات کے ساتھ پسپا کیے گئے ۔ ان سب ہزیمتوں اور (۱۸ ستمبر اور ۱۹

اکتوبر کی) مزید ناکامیوں کے بعد اتحادیوں نے فیصلہ کر کے شہر کا باقاعدہ محاصرہ شروع کیا، جس کی قیادت سباستو پول Sebastopol کا محافظ روسی سپہ سالار Totleben خود کر رہا تھا۔

بایں ہمہ عثمان پاشا لب تک مغربی سمت سے گھرا ہوا نہ تھا اور اُدھر سے اسے سامان جنگ اور رسد ۱۰ اکتوبر تک پہنچتی رہی، مگر نومبر کے وسط میں محاصرہ مکمل کر لیا گیا اور ۱۰ دسمبر کی صبح کو عثمان پاشا نے ٹھان لی کہ آخری بار جان کی بازی لگائے، اور قلعے سے نکل کر محاصرہ کرنے والی [اپنے سے سہ گنی یعنی] ایک لاکھ بیس ہزار فوج پر (جس میں زار بھی شامل تھا) حملہ کرے اور ممکن ہو تو اس کی مغربی صف بندی کو توڑ کر نکل جائے - یہ بہادرانہ کوشش چند گھنٹوں تک کامیاب رہی، لیکن اس اثنا میں بہادر عثمان پاشا (''شیر پلونہ'') خود زخمی ہو گیا اور اس نے اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ اسی دن دوپہر تک تقریباً چالیس ہزار فوج کے ساتھ ہتیار ڈال دے - روسی فوج پہلے ھی پلونہ میں داخل ہو چکی تھی، جس کے لیے پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران میں انھیں اور رومانویوں کو چالیس ہزار آدمیوں سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

سقوط پلونہ نے روسیوں کے لیے ادرنہ اور آگے سان سٹیفانو San Stefano تک کا راستہ کھول دیا، جہاں صلح نامہ مرتّب ہوا اور انھوں نے من مانی شرطیں لکھوائیں۔

مآخذ: (متن مقالہ میں حوالوں کے علاوہ) (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۸ھ، ۶: ۱۶۳ تا ۱۶۵؛ (۲) F. Kanitz: *Donau-Bulgarien und der Balkan*، بار دوم، لائپزگ ۱۸۸۲ء، ۲: بالخصوص ص ۹۶ ببعد؛ (۳) C. Jireček: *Das Fürstenthum Bulgarien*، ویانا ۱۸۹۱ء، ص ۱۸۹، ۲۸۶، ۵۴۵؛ (۴) Reisebücher Meyers: *Türkie ....*، بار پنجم، لائپزگ و ویآنا ۱۸۹۸ء، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱؛ (۵) S. Lane-Poole: *Türkey*، بار پنجم، لنڈن ۱۹۰۸ء، ص ۳۶۱؛ (۶) N. Jorga، در *GOR*، ج ۵، گوتھا ۱۹۱۲ء، ص ۵۷۵ تا ۵۷۷؛ (۷) A. Ischirkoff: *Bulgarien, Land und Leute*، لائپزگ ۱۹۱۷ء، ۲: ۹۹ و ۱۰۸؛ (۸) کمال الدین شکری: *Plevne*، (استانبول ۱۹۳۲ء) - اس چھوٹی سی کتاب میں صرف ۱۸۷۷ء کے محاصرے کا مشہور عوام بیان ملتا ہے؛ (۹) Jordan Trifonov: *Istoria na grada Pleven do osvoboditelnata voina*، (اس شہر کی جنگ آزادی تک کی تاریخ بلغاری زبان میں) صوفیا ۱۹۳۳ء، (باتصویر)، قب *Bibliographie Géographique Internationale*، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱۹۔

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

⊗ **پنجاب**: (= پانچ دریاؤں کی سرزمین) - اس نام کا اطلاق برصغیر پاک و ہند کے اس علاقے پر ہوتا ھے جو دریاے ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور سندھ کے درمیان واقع ھے - اس کی حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں (تفصیل آگے دیکھیے) - آج کل اس کا مغربی حصہ مغربی پاکستان کے موجودہ صوبۂ پنجاب پر مشتمل ھے اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں ہماچل پردیش، پنجابی صوبہ اور صوبۂ ہریانہ میں منقسم ہو چکا ھے -

وجہ تسمیہ اور حدود: یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے کے لیے پنجاب کا نام دور مغلیہ سے قبل قدیم مآخذ میں کہاں کہاں آیا ھے - عطا ملک جوینی: تاریخ جہاں گشای (۲: ۱۰۸) میں جس پنجاب کا ذکر آیا ھے وہ حدود بلخ و ترمذ میں دریاے جیحون کے کنارے ایک مقام ھے - اسی طرح منہاج سراج: طبقات ناصری (طبع عبدالحی

حبیبی) میں پنجاب سے مراد دریاے سندھ کے پانچ معاون (''با سلطان قطب الدین ایبک او را بحدود پنج آبِ سند مضاف افتاد''، ۱ : ۳۸۴) اور دریاے پنج ندیا خود دریاے سندھ مراد ہے (''و در ہمیں ماہ ملک ناصر الدین قباچہ از حصار بھکر خود را در پنجاب غرق کرد''، ۱ : ۵۲۳) - تاریخ بیہقی، کتاب الھند، تاریخ فیروز شاہی، وغیرہ میں اس صوبے کے مختلف علاقے اپنے مرکزی شہروں، مثلاً سرھند (= سہرند)، جالندھر، لاھور، دیپالپور اور ملتان سے منسوب کیے گئے ھیں - عہد مغلیہ میں اور اس سے پہلے پنجاب کے مشمولہ علاقوں کو صوبۂ ملتان اور صوبۂ لاھور کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، البتہ اکبر کے زمانے سے پنجاب کا نام بکثرت اور بالعموم استعمال ھونے لگا - ابوالفضل نے آئین اکبری اور اکبر نامہ میں، نیز اپنے مکاتیب میں متعدد موقعوں پر پنجاب کا ذکر کیا ھے اور کشمیر کو اس سے الگ قرار دیا ھے - اس کے بیان سے کچھ ایسا ظاھر ھوتا ھے کہ صوبۂ لاھور ھی اصل پنجاب ھے - منشی سجان راے نے خلاصة التواریخ میں پنجاب کی جو تفصیل دی ھے وہ مغلیہ دور کے نصف ثانی کے احوال کی نمائندگی کرتی ھے - منوچی، جو شاھجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں موجود تھا، پنجاب کو عمل داری لاھور کا قائم مقام قرار دے کر لکھتا ھے: ''بھکر کے نزدیک سات دریا ملتے ھیں ان میں سے پانچ عمل داری لاھور کے علاقوں سے نکلتے ھیں - ان کا منبع سری نگر اور کشمیر کے پہاڑوں میں ھے - یہی وجہ ھے کہ عمل داری لاھور کو پنجاب (= پانچ دریاؤں کی زمین) کہا جاتا ھے'' (*Storia*، ۱ : ۳۲۲)؛ لیکن یہ بیان پنجاب کی حدود کو تنگ کر دیتا ھے - اکبر نے پنجاب کو پانچ دوآبوں کا ملک قرار دے کر ان دوآبوں کے نام خود رکھے تھے: (۱) بیت (= بست) جالندھر دوآب : بیاہ (بیاس) اور ستلج کے درمیان؛ (۲) باری دوآب : بیاس اور راوی کے درمیان؛ (۳) رچنا دوآب : راوی اور چناب کے درمیان؛ (۴) چنہت (= چج) دوآب : چناب اور بہت (= جہلم) کے درمیان اور (۵) سندھ ساگر دوآب : جہلم اور سندھ کے درمیان (آئین اکبری، اردو ترجمہ، ۲ : ۱۰۱۹) - چہار گلشن نے ان پر علاقۂ کانگڑہ کا اضافہ کیا ھے، جو دوآبوں سے باھر ھے اور پہاڑی علاقہ ھے - غرض یہ ھے کہ پنجاب کی حدود کے بارے میں قدیم مصنفوں نے اپنی اپنی حدبندی کی ھے - خود برطانوی عہد کے بعض مصنف کمی بیشی کے مرتکب ھیں، چنانچہ مفتی غلام سرور لاھوری نے تاریخ مخزن پنجاب میں لکھا ھے : ''یہ ایک فراخ احاطہ شمال مغرب کی طرف ھندوستان کے ھے''۔ ان کا بیان ھے کہ یہ نام سندھ کو چھوڑ کر باقی پانچ دریاؤں کی وجہ سے ھے - انھوں نے انگریز مصنفوں کے اس خیال کی تردید کی ھے کہ ان پانچ دریاؤں میں سندھ تو شامل ھے، مگر بیاس شامل نہیں - بہر حال ان کے نزدیک بھی یہ نام اکبر کا دیا ھوا ھے اور اس کی پرانی حدود یہ ھیں : مشرق اور جنوب مشرق میں دریاے ستلج اور سندھ، مغرب اور شمال مغرب میں دریاے سندھ، شمال میں کوہ کشمیر و کوہ جموں، شمال مشرق میں کوہ کانگڑہ، جنوب میں دریاے ستلج اور جنوب مغرب میں ملتان - مغلوں کے زمانے میں یہی عمل داری لاھور (= پنجاب) کی حدود تھیں، چنانچہ ابوالفضل نے تقسیم ملک کی جو تفصیل دی ھے اس کی رو سے برطانوی دور کے صوبۂ پنجاب کے باقی ماندہ علاقے اس زمانے میں صوبۂ دھلی اور صوبۂ ملتان میں شامل تھے - مفتی غلام سرور نے یہ قول بھی نقل کیا ھے کہ پہلے اس کا نام ''پنج دوآب'' تھا، بعد میں ''دو'' کا لفظ زبان سے حذف ھو گیا اور صرف ''پنج آب''

(= پنجاب) رہ گیا (ص ۹۳۱ ببعد) ۔ سکھوں کے زمانے میں جہاں جہاں ان کی حکومت قائم ہوئی وہ علاقے پنجاب میں شامل سمجھے گئے، چنانچہ ان کے اقتدار کی بدولت پنجاب کا دائرہ پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، کشمیر، تبت، لداخ، جموں، کانگڑہ، منڈی، سکیت، کلّو، بہاول پور اور کوہ سلیمان تک پھیل گیا (اس فرق کے ساتھ کہ ایک میدانی پنجاب اور دوسرا کوہی پنجاب سمجھا گیا) ۔ انگریزوں کے زمانے میں پنجاب کی حدود میں قسمت دہلی، حصار و انبالہ کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ۔

قیام پاکستان سے پہلے صوبۂ پنجاب مندرجۂ ذیل قسمتوں (اور اضلاع) پر مشتمل تھا : (۱) انبالہ (انبالہ، شملہ، حصار، رہتک، کرنال، گوڑگانوہ)؛ (۲) جالندھر (جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، فیروز پور، لدھیانہ)؛ (۳) لاہور (لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گورداسپور)؛ (۴) ملتان (ملتان، منٹگمری [= موجودہ ساھیوال]، لائل پور، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان)؛ (۵) راولپنڈی (راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک، میانوالی) ۔

قیام پاکستان کے وقت انبالہ اور جالندھر کی قسمتوں کے علاوہ تحصیل شکر گڑھ کو چھوڑ کر پورا ضلع گورداسپور اور ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں کا تقریباً نصف حصہ بھارت میں چلا گیا اور مشرقی پنجاب کہلایا ۔ باقی ماندہ علاقہ پاکستان کا صوبۂ مغربی پنجاب بنا ۔ ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مدغم کر کے صوبۂ مغربی پاکستان کی تشکیل ہوئی ۔ یکم جولائی ۱۹۷۰ء میں وحدت مغربی پاکستان ختم کر دی گئی اور صوبے بحال ہو گئے ۔ موجودہ صوبۂ پنجاب سابقہ صوبۂ مغربی پنجاب اور ریاست بہاول پور پر مشتمل ہے ۔

زمانۂ قبل از اسلام : پنجاب کی تاریخ کا ابتدائی دور تاریکی میں چھپا ہوا ہے، البتہ محکمۂ آثار قدیمہ کی کوششوں سے جو آثار برآمد ہوے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں انسانی آبادی قدیم ترین عہد ہی میں موجود تھی ۔ راولپنڈی کے قریب وادی سواں میں قدیم حجری (Palaeolithic) ثقافت کے آثار ملے ہیں، جو ماہرین کے اندازے کے مطابق دو سے چار لاکھ سال پرانی ہے ۔ ہڑپا (ضلع ساہیوال) کی کھدائی سے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کے آثار دستیاب ہوے ہیں ۔ یہ مثن جودڑو (= موہنجوڈارو، سندھ) کے آثار سے مشابہ اور پیتل کے زمانے (Chalcolithic Period) کے عروج کی حالت پیش کرتے ہیں ۔ ان سے اس زمانے میں ایک منظم تہذیب اور آبادی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے ۔ یہ لوگ سات آٹھ ہزار سال قبل عراق عرب سے آئے تھے اور انھیں دراودی (= دراوڑی) نسل سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ ہمیں جو نیم تاریخی روایات ملتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں اس علاقے کی زرخیزی اور خوشحالی غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے باعث کشش رہی؛ چنانچہ اس سلسلے میں مصر کے نامور فرمانروا اوسیرس Osiris اور سیسوترس Sesotris کے نام قابل ذکر ہیں ۔

تقریباً ۲۰۰۰ ق م میں وسط ایشیا کے آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کے اصل باشندوں کو یا تو تہ تیغ کر دیا یا غلام بنا لیا؛ جو بچے وہ جنوب کی طرف بھاگ گئے یا شمالی پہاڑوں میں جا چھپے ۔ یہاں کی قدیم تہذیب تباہ کر دی گئی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔ آریاؤں کے مختلف گروہ دریاے سندھ اور اس کے معاونین کے کنارے آباد ہو گئے ۔ اس زمانے میں ان کی معاشرت کا عکس ہمیں رگ وید میں ملتا ہے ۔ ۱۰۰۰ ق م کے قریب آریا دریاے گنگا کی وادی تک پہنچ چکے تھے ۔ رامائن اور مہابھارت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''دور شجاعت'' میں پنجاب کے

مختلف دریاؤں کے کنارے خود مختار آریا راجاؤں کی ریاستیں قائم تھیں ۔ ان میں سے ایک بڑی ریاست گندھارا تھی، جس کا دارالحکومت تکشیلا (= ٹیکسلا) تھا اور یہ مغربی پنجاب، صوبۂ سرحد اور آزاد قبائل کے علاقے پر مشتمل تھی۔ فریدون پہلا ایرانی فرمانروا تھا جس نے تقریباً ٥٠٧ ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس کے بعد روایات کی رو سے سائرس، افراسیاب اور دارا نے بھی اس علاقے پر فوج کشی کی ۔ دارا کے زمانے میں لاھور، ملتان اور غالباً گجرات کے صوبے ایرانیوں کے زیرنگین تھے ۔ یہاں کے راجا افریدوں کے زمانے ھی سے ایرانی بادشاھوں کو خراج دینے لگے تھے ۔ انوشیروان کے عہد میں بھی ہندوستان کے مختلف حکمران اس کی سیادت تسلیم کرتے تھے کیونکہ اس کا ایک لقب ایران و ہندوستان بھی تھا ۔

داریوش اول (۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م) نے کشمیر سے جنوب میں سمندر کے ساحل تک اور مشرق میں ستلج اور بیاس تک سارا علاقہ (موجودہ مغربی پاکستان) اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسے اپنے کتبے میں ''ولایت ہند'' کا نام دیا ۔ سکندر یونانی نے جب ایران فتح کیا تو یہ علاقے دولت ایران سے الگ ہو کر خود مختار ریاستوں میں بٹ چکے تھے، جن میں سخت رقابت پائی جاتی تھی ۔ سکندر کی فوج کشی کی خبر سنتے ھی ریاست تکشیلا (ٹیکسلا) نے اقرار اطاعت کے ساتھ امداد و تعاون کی پیشکش کی اور ۳۲٦ ق م میں یونانی فوجیں سندھ عبور کر کے پنجاب میں داخل ہو گئیں ۔ جہلم کے پار راجا پورس کی ریاست تھی ۔ اس نے مقابلے کی ٹھانی، لیکن اپنی کثیر فوج، جنگی ہاتھیوں اور ذاتی شجاعت کے باوجود شکست کھائی ۔ سکندر نے اس کا علاقہ واگزاشت کر کے اسے اپنا حلیف بنا لیا ۔ اگلے سال سکندر واپس چلا گیا تو اسکے ہندی مقبوضات میں شورشیں ہونے لگیں اور شمالی صوبے کا یونانی حاکم مارا گیا ۔ ۳۲۳ ق م میں سکندر کی وفات کے بعد باختر (= بلخ) کی نیم یونانی ریاست مغربی پاکستان کے علاقے کی وراثت کی مدعی ہوئی، لیکن اس کے والی سلیوکس نے چندرگپت موریا سے شکست کھا کر یہ علاقہ اس کے حوالے کر دیا ۔ چندر گپت کے پوتے اشوک (۲۷۲ تا ۲۳٦ ق م) نے بدھ مت قبول کر لیا اور اس کی بدولت پنجاب میں جگہ جگہ اس نئے مذہب کی عبادت گاھیں اور خانقاھیں تعمیر ہو گئیں ۔ یوں پنجاب میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، جس کا سب سے بڑا مرکز تکشیلا تھا ۔ موریا خاندان کے زوال کے بعد باختر کے یونانی حکمرانوں نے کابل و قندھار فتح کرنے کے بعد مغربی پاکستان کا رخ کیا، مناندر (۱۵۰ ق م) نے تقریباً سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا ۔ یہاں سے دستیاب ہونے والے قدیم سکّوں سے ظاہر ہوتا ھے کہ دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں کئی نیم یونانی خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں ۔ ان کا خاتمہ یوچیوں نے کیا، جن کی ایک شاخ کشان نے پہلی صدی عیسوی میں ایک زبردست سلطنت قائم کی ۔ اس میں ترکستان، افغانستان، مغربی پاکستان اور بنارس تک شمالی ہند کا علاقہ شامل تھا اور دارالحکومت پرش پور (= پشاور) تھا ۔ ۱۲۲ء میں کنشک کی موت کے بعد یہ سلطنت کئی ریاستوں میں بٹ گئی اور چوتھی صدی عیسوی تک پنجاب اور کابل پر ''شاھی'' خاندان حکومت کرتا رہا ۔ چھٹی صدی عیسوی میں پنجاب ہونوں اور ان کے حلیف گورجروں کی تاخت کا نشانہ بنا ۔ راج ترنگنی سے پتا چلتا ھے کہ کشمیر کے راجا للتا دیتا نے آٹھویں صدی عیسوی میں پنجاب فتح

کر لیا ۔ دسویں صدی میں شمالی پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ایک مضبوط ریاست قائم ہو چکی تھی ۔ اسی کے حکمرانوں کا مقابلہ سلاطین غزنی سے ہوا ۔

عہد اسلامی : پنجاب میں مسلمانوں کے دورحکومت کا آغاز آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں محمد بن قاسم [رک بآن] کی فوج کشی سے ہو گیا تھا، لیکن عربوں کی فتوحات مشرق میں ملتان اور شمال میں پنج ند سے آگے نہیں بڑھیں ۔ پنجاب میں مسلمانوں کا داخلہ صحیح معنوں میں غزنویوں کے زمانے میں ہوا ۔ ان دنوں ملتان میں قریشی امیروں کی ریاست قائم تھی جو مذہباً باطنی تھے ۔

سبکتگین [رک بآن] کے حملے بھی پشاور سے آگے نہ بڑھے ۔ ۳۸۰ھ / ۹۹۰ء میں شہر پشاور میں غزنی کی دو ہزار فوج متعین کی گئی اور یہاں پہلا مسلمان حاکم مقرر ہوا (سید ہاشمی : تاریخ مسلمان پاکستان و بھارت، ۱ : ۱۱۶) ۔ ۳۹۲ھ/ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی [رک بآن] نے پشاور میں جے پال کو شکست دے کر دریاے جہلم کے کنارے نندنہ (= نندونہ) کے مضبوط پہاڑی قلعے پر بھی قبضہ کر لیا اور یوں ”ملک پنجاب کی پہلی گھاٹی اس معرکے میں سر ہو گئی“ (کتاب مذکور، ۱ : ۱۱۸) ۔ اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات کبھی جنوب اور کبھی مشرق کی طرف بڑھتی گئیں ۔ ان میں سومنات، نگر کوٹ (= کانگڑہ) اور قنوج کی کشور کشائیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ بہر حال ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء میں سلطان محمود نے پنجاب کا الحاق کر لیا اور لوہور (یا لہاوور = لاہور) میں ایاز کو اپنا نمائندہ (صوبہ دار) مقرر کیا ۔ اس کے بعد غزنوی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور جالندھر، جہلم، ملتان، سندھ، وغیرہ مختلف اضلاع قرار دیے گئے ۔ پھر کشور کشائی کا یہ سلسلہ تھانیسر، میرٹھ اور بنارس تک جا پہنچا ۔

اس زمانے میں لاہور مسلمانوں کا ایک اہم مرکز بن گیا ۔ اس عہد میں فارسی کے بعض اہم شعرا غزنویوں کے ہندی مقبوضات میں ملتے ہیں، مثلاً مسعود سعد سلمان، نکتی لاہوری اور ابوالفرج رونی ۔ شیخ اسمٰعیل، حضرت ہجویری (داتا گنج بخش) اور شیخ حسین زنجانی جیسے نامور عالم اور صوفی بزرگ کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے ۔ اس دور میں پنجاب میں وارد ہونے والوں میں البیرونی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ علاوہ ازیں فرخی اور عنصری کے قصائد فتوحات ہند پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے اس زمانے میں جو تین دیوان مرتب کیے، ان میں ایک فارسی آمیز ہندی میں تھا، جسے اردو کا نقش اول سمجھا جا سکتا ہے ۔ دارالحکومت غزنہ میں ہندی اور ہندو کثیر تعداد میں موجود تھے ۔ یہ لوگ پنجاب سے محمودی افواج کے ہمراہ گئے تھے ۔ ان میں تلک بن جے سین بھی تھا، جو فارسی سے خوب واقفیت رکھتا تھا ۔ گویا سندھ کے بعد پنجاب اس باثروت مخلوط تمدن کا پہلا گہوارہ تھا، جسے بعد میں ہم مسلم ہندی تمدن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں (دیکھیے محمود شیرانی : پنجاب میں اردو؛ سید عبداللہ : ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ؛ شیخ محمد اکرام : موج کوثر) ۔

۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں سلطان معزالدین بن سام (شہاب الدین محمد غوری) نے لاہور فتح کیا تو پنجاب کی حکومت غزنویوں کے ہاتھ سے نکل کر غوریوں کے قبضے میں آ گئی ۔ ایبک (رک بآن) کی تخت نشینی (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء) کے بعد اسلامی سلطنت کا مرکز دہلی میں منتقل ہو گیا، لیکن پنجاب اور سرحد کو اپنے حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لیے سلطان کا قیام زیادہ تر لاہور ہی میں رہا اور یہیں اس نے وفات پائی (۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء) ۔

اس زمانے میں پنجاب کے لاکھوں افراد نقل مکانی کر کے دہلی چلے گئے (پنجاب میں اردو، ص ۷۵، ۷۶) - ان میں پنجابی فوجیوں کی بھی بڑی تعداد تھی - ملتانی سوداگر بھی بکثرت دہلی میں منتقل ہو گئے - علاء الدین خلجی کے عہد میں ان کی ایک تعداد بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز نظر آتی ہے، مثلاً الپ خان امیر ملتانی، خواجہ حمید الدین ملک التجار ملتانی وغیرہ - ان میں مشاہیر علما کے نام بھی آتے ہیں (کتاب مذکور، ص ۸۷) - اسی طرح بعض مقامی شعراے فارسی کا بھی پتا چلتا ہے، مثلاً التتمش [رک بآن] کے زمانے میں تاج الدین سنگریزہ.

شمسی غلاموں اور خلجیوں کے عہد میں سیاسی حالات کے تحت پنجاب کو بڑی سیاسی اہمیت نصیب ہوئی - اس کی ایک وجہ شمال سے مغول کے پے بہ پے حملے بھی تھے، جن کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سلاطین کو لاہور، دیپال پور اور ملتان وغیرہ میں خاص استحکامات کرنا پڑتے تھے - ان حملوں میں لاہور اور ملتان مغول کی خاص زد میں رہے اور لاہور کو کئی بار سخت بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے التتمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو اور ناصرالدین محمود نے مشہور جنگ آزما شیر خان کو لاہور کا اور بلبن نے اپنے شہزادے سلطان محمد شہید کو اور جلال الدین خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خان کو لاہور اور ملتان کا صوبےدار بنایا - اس اقدام سے پنجاب کو سلطنت دہلی کے معاملات میں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا اور خاندان غلاماں اور خاندان خلجی کے اکثر سلاطین اپنی آزمائش کے زمانے میں پنجاب ہی سے تقویت حاصل کرتے رہے - یہی صورت حال تغلقوں کے عہد میں پیش آئی اور مختلف سیاسی انقلابات میں دہلی کی سیاسیات میں پنجاب کی تائید حاصل کی گئی.

خاندان تغلق کے بانی غازی ملک کو پنجاب کے ساتھ گہرا تعلق ہے - اس کا باپ بلبن کا ترک غلام تھا اور ماں ایک مقامی راجا کی بیٹی تھی - اس کا تمام وقت پنجاب میں گزرا - والی دیپال پور کی حیثیت سے اس نے مغل حملہ آوروں کا بیس بار مقابلہ کیا اور انھیں شکست دی - جب خسرو ملک نے خلجی خاندان کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت دہلی پر قبضہ کیا تو غازی ملک پنجابی لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا اور خسرو کو ہلاک کرنے کے بعد عوام کی خواہش سے تخت نشین ہوگیا - پنجاب نے ایک مرتبہ اور سید خضرخان کی صورت میں حملہ کیا، جو ملتان کا حاکم تھا - اس نے ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں دہلی پر قبضہ کیا - پنجاب کی اہمیت کا یہ سلسلہ لودھیوں کے زمانے میں بھی قائم رہا.

سلطنت دہلی کے اس دور میں پنجاب سے متعلق کئی مقتدر اشخاص، مشائخ اور مشاہیر اہل علم کے نام ملتے ہیں، مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی، ملک تاج الدین کہرامی؛ ملک نصیرالدین کہرامی؛ سامانہ سے سید عزیز، سید معین الدین، قاضی رکن الدین اور مولانا ضیاءالدین؛ لاہور سے مولانا علاءالدین؛ قصور سے مولانا سراج الدین اور مشائخ عظام میں شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی اور شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج.

اکبر [رک بآن] کی تخت نشینی کے وقت پنجاب سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا - ایک حصہ براہ راست مغلوں کی عملداری میں تھا، لیکن یہاں کی صورت حال بھی تسلی بخش نہ تھی؛ دوسرا حصہ زیادہ شمالی جانب تھا، جو خودمختار کوہستانی راجاؤں اور سرداروں کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم تھا - ان میں کانگڑہ، جموں، کشمیر، مظفر آباد، راجوری، پونچھ، بھمبر اور کوٹلی

وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ پوری طرح مغلیہ حکومت کے زیر نگین آ گیا ۔ اس عہد میں پنجاب کے مختلف حصے دہلی، لاہور، ملتان اور کابل کے صوبوں میں شامل تھے ۔ مغل عہد میں یہاں جو شورشیں ہوئیں انھیں آسانی سے دبا دیا گیا ۔ اس خاندان کے شہنشاہ اکثر لاہور میں طویل عرصے تک قیام کرتے تھے، چنانچہ ان کے عہد میں دہلی کی طرح لاہور بھی ایک علمی و ثقافتی مرکز بنا رہا ۔ دور مغلیہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص یہاں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی شریک تھے ۔ علوم اسلامی کے علاوہ فارسی شعر و انشا میں بھی پنجاب والوں کا بڑا حصہ نظر آتا ہے ۔ عہد عالمگیر میں اور اس کے بعد ہریانہ کے علاقے میں اردو (ہریانوی) میں نظم و نثر کی بہت سی تصانیف وجود میں آئیں (ہریانوی ادب کے بارے میں دیکھیے پنجاب میں اردو اور مقالات شیرانی) ۔ فارسی شعرا اور ادبا میں ابوالبرکات منیر لاہوری، ملا محمد صالح کنبوہ، ملا عبدالحمید لاہوری، عنایت اللہ کنبوہ، سعد اللہ چنیوٹی، چندر بھان برہمن، انند رام مخلص، وارستہ سیالکوٹی، غنیمت کنجاہی، محمد علی رائج سیالکوٹی، واقف بٹالوی، آفرین لاہوری، عبدالحکیم حاکم لاہوری وغیرہ بڑی شہرت رکھتے ہیں ۔ مغلوں کے زمانے میں پنجاب میں علم و ادب کے کئی اہم مراکز نظر آتے ہیں ۔ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ، ملتان، بٹالہ، قصور، سوہدرہ، پسرور، جالندھر، ایمن آباد، گھڑتل وغیرہ بعض مصنفوں کے مولد و منشا ہونے کے اعتبار سے مشہور ہوے ۔ اس عہد کے بزرگ علماے دین میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، شیخ احمدؒ سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی)، ملا محمد یوسف، ملا جمال لاہوری اور محمد اکرم لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

پنجاب میں عہد مغلیہ کا ایک نہایت اہم واقعہ سکھوں کا عروج [رک بہ سکھ] ہے ۔ ابتدا میں یہ ایک صلح جو مذہبی فرقہ تھا، جس کی بنیاد گورونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء) نے بھگتی تحریک کے زیر اثر رکھی تھی، لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک جنگجو سیاسی جماعت کی شکل اختیار کر گیا ۔ مغل شہنشاہوں نے اس جماعت کے گوروؤں کو وقتاً فوقتاً جاگیروں اور انعامات سے نوازا، جس سے ان کی مالی حالت بڑی مستحکم ہو گئی، حتٰی کہ جہانگیر کے عہد میں پانچویں گورو ارجن دیو نے فقیرانہ زندگی ترک کر کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنا شروع کر دیا اور اپنی سپاہ بھرتی کر لی ۔ سکھوں کی تعداد اور طاقت میں اضافہ ہوا تو وہ سیاست میں بھی دخل انداز ہونے لگے ۔ لاہور کے ہندو دیوان چندو شاہ کی دشمنی کے باعث اگرچہ گورو ارجن کو شاہی عتاب کا نشانہ بننا پڑا، لیکن اس کے جانشین گورو ہرگوبند سے جہانگیر حسن سلوک سے پیش آیا اور شاہی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے پیرووں کو مسلح اور منظم کرنا شروع کر دیا ۔ یہ سرپرستی شاہجہان کے عہد میں بھی جاری رہی اور یوں سکھ پنجاب کی ایک مؤثر اور مستحکم طاقت بن گئے ۔ جنگ تخت نشینی کے دوران میں گورو ہرسہاے نے دارا شکوہ کا ساتھ دیا، تاہم اورنگزیب نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کے بیٹے رام راے کو اپنے دربار میں جگہ دی ۔ کچھ عرصے بعد جب گورو تیغ بہادر کو، جسے رام راے کے بجاے نیا گورو چنا گیا تھا، حکم عدولی کی پاداش میں موت کی سزا دی گئی تو حکومت اور مسلمانوں کے خلاف سکھوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی ۔ گورو تیغ بہادر کے بیٹے گورو گوبند سنگھ نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور سکھوں کی ایک مضبوط فوج تیار کر لی ۔ اس کے بعد وہ

مشرقی پنجاب کی پہاڑیوں میں واقع چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں میں تاخت و تاراج کرنے لگا ۔ ناھن اور نالہ گڑھ کے راجاؤں نے شہنشاہ سے فریاد کی تو لاھور کے صوبیدار زبردست خان اور سرھند کے صوبیدار شمس الدین خان کو حکم ملا کہ اسے قرار واقعی سزا دی جائے ۔ ماکھو وال کے مقام پر گوبند سنگھ کو شکست فاش ہوئی اور وہ فرار ہو گیا ۔ مدت تک وہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں چھپتا پھرا ۔ آخر ایک منظوم عریضہ لکھ کر بادشاہ سے معافی کا خواستگار ہوا اور وعدہ کیا کہ آئندہ فقیرانہ طور پر زندگی بسر کرے گا ۔ بادشاہ نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سکھوں کا پنجاب میں زور ہو گیا اور بندا بیراگی نے مسلح سکھوں کے جتھے منظم کر کے لوٹ مار شروع کر دی ۔ پہلے اس نے لدھیانے سے کرنال تک تمام علاقہ مسلمانوں سے صاف کر دیا ۔ ہزاروں مسلمان قتل ہوے، ان کے گھر بار لوٹ لیے گئے اور مسجدیں اور خانقاھیں مسمار کر دی گئیں ۔ پھر اس نے لاھور کا رخ کیا ۔ وہ شہر کو تو فتح نہ کر سکا لیکن اس نے قرب و جوار کے دیہات کو خوب لوٹا ۔ بہادر شاہ اس وقت دکن میں تھا ۔ یہ حالات سن کر وہ پنجاب کی طرف روانہ ھوا ۔ سرھند میں شاھی فوج کے اجتماع کی خبر سن کر بندا لوہ گڈھ کے قلعے میں محصور ہو گیا ۔ تین ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ھوا، لیکن بندا فرار ہو گیا ۔ بہادر شاہ سکھوں کو ھمیشہ کے لیے کچل دینا چاھتا تھا، لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی ۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت میں ابتری پھیلی تو بندا نے پھر سر اٹھایا اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنے لگا ۔ سرھند اور بٹالہ خاص طور پر اس کی سفاکی کا نشانہ بنے ۔ اس وقت اس کی فوج پینتیس ہزار کے قریب تھی ۔ آخر فرخ سیر کے عہد میں نواب عبدالصمد خان، صوبیدار لاھور، نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست پر شکست دی ۔ انجام کار اس کی جمعیت منتشر ہو گئی اور وہ خود گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا، جہاں اسے قتل کر دیا گیا ۔ عبدالصمد خان اور اس کے بعد یحیٰی خان اور میر منو نے پنجاب میں سکھوں کے مقابلے میں اقدامات کیے اور وہ کچھ عرصے کے لیے سر اٹھانے کے قابل نہ رہے ۔

سکھوں کا زمانہ : احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے پنجاب میں جو انتشار پھیلا اسے غنیمت جان کر پہاڑوں میں چھپے ہوے سکھ پھر نکل آئے ۔ ۱۷۵۸ء میں انھوں نے جسّا کلال کی زیر قیادت کثیر تعداد میں لاھور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن جلد ھی آدینہ بیگ [رَکَ بآں] مرھٹہ افواج کو لاھور پر چڑھا لایا اور سکھ شہر خالی کر گئے ۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ نے مرھٹوں کی کمر توڑ دی اور وہ شمالی ھند سے نکل گئے ۔ ابدالی واپس چلا گیا تو سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور جا بجا قلعے بنا کر دوسری قوموں کا استیصال کرنے لگے ۔ ۱۷۶۲ء میں انھیں کچلنے کے لیے ابدالی نے یلغار کی ۔ لدھیانے کے قریب سخت جنگ ہوئی اور تقریباً بیس ہزار سکھ تہ تیغ ہوے ۔ اس مقام کو سکھ گھلو گھاڑہ (= قتل عام کی جگہ) کہتے ھیں ۔ بایں ھمہ ابدالی کے رخصت ھوتے ھی سکھوں نے مجتمع ھو کر لاھور میں اس کے ھندو صوبیدار کابلی مل کو نکال باھر کیا اور جہلم سے ھانسی تک کا علاقہ اس کے سرداروں نے باھم تقسیم کر لیا ۔ ان سرداروں کے بارہ بڑے گروہ تھے، جنھیں مثلیں کہا جاتا ہے ۔ ان میں سے سب سے طاقتور بھنگی مثل تھی، جو لاھور اور امرتسر سے جہلم تک کے علاقے پر متصرف تھی ۔ اسی مثل میں رنجیت سنگھ پیدا ھوا ۔ ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان، والی کابل،

نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور فتح کر لیا، لیکن اگلے ہی سال اسے واپس جانا پڑا ۔ واپسی کے وقت اس کی چند توپیں دریاے جہلم میں گر گئیں ۔ رنجیت سنگھ نے انھیں دریا سے نکلوا کر شاہ زمان کی خدمت میں پیش کیا اور اس سے لاہور کی حکومت کا پروانہ حاصل کر لیا اور یوں ایک مسلمان بادشاہ کی عنایت سے پنجاب میں سکھوں کی باقاعدہ سلطنت قائم ہو گئی ۔

لاہور پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ نے پاؤں پھیلائے اور تمام حریف سرداروں کو یکے بعد دیگرے مغلوب کرتے ہوے کانگڑے سے ملتان تک کے علاقے پر مسلّط ہو گیا اور ستلج کے جنوب میں بھی دھاوے کرنے لگا ۔ ۱۸۰۹ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان عہدنامۂ امرتسر طے ہوا، جس کی رو سے رنجیت سنگھ نے دریاے ستلج کو اپنی سرحد تسلیم کر لیا ۔ ۱۸۱۳ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان اٹک، پشاور، ہزارہ، کشمیر اور ڈیرہ‌جات بھی اس کی قلمرو میں شامل ہو گئے ۔ اسی زمانے میں ہندوستانی مسلمان مجاہدین سندھ کے راستے سے سرحد میں پہنچے اور سید احمد شہیدؒ کے زیر سرکردگی سکھوں سے ٹکرا گئے ۔ اس جہاد نے سکھ حکومت کی بنیادیں متزلزل کر دیں اور سندھ سے مغرب میں تمام علاقہ آزاد ہو گیا، لیکن ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء میں بعض خوانین کی سازش سے مجاہدین کی تنظیم درہم برہم ہوگئی اور حضرت سید احمدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی شہادت کے بعد خیبر تک دوبارہ سکھوں کا قبضہ ہو گیا ۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں لاقانونیت اور بدنظمی کا دور شروع ہوگیا اور انگریزوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا ۔ ۱۸۴۵ء میں انھوں نے پنجاب پر چڑھائی کر کے سکھوں کو شکست پر شکست دی اور صلح پر مجبور کر دیا ۔ عہد نامۂ لاہور کی رو سے جالندھر دوآب کا علاقہ انگریزوں کے سپرد ہوا اور تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے سکھ حکومت نے جموں اور کشمیر کا صوبہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔ چند روز بعد سکھوں کے دل میں جوش انتقام پھر ابھرا ۔ سکھ دربار میں جو انگریز مشیر مقرر ہوا تھا اس کی دخل اندازیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، چنانچہ جگہ جگہ بغاوت برپا ہو گئی اور ۱۸۴۸ء میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ۔ چیلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیوں نے پنجاب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ۲ اپریل ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے پنجاب کا اپنی حکومت کے ساتھ الحاق کر لیا ۔

رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھ حکمرانوں کی داخلی حکمت عملی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اصول و قواعد سے بےنیاز تھی ۔ ان کا کوئی آئین تھا نہ قانون ۔ حکمران مطلق العنان تھے اور عدلیہ و انتظامیہ کے جملہ امور ان کے اشارۂ ابرو پر منحصر تھے ۔ ان کے عہد میں مسلمان خاص طور پر ان کے ظلم و تشدد کا شکار ہوے ۔ ان کی تاریخی یادگاروں، دینی مدرسوں، عبادت گاہوں اور مقبروں کو سخت نقصان پہنچا اور ان کی دینی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی زندگی بری طرح متأثر ہوئی ۔ قانون اور عدل و انصاف کے فقدان اور سکھ گردی کے باعث پنجاب میں مسلمان برابر خوف و ہراس کا شکار رہے ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی میں ابتری پھیل گئی ۔

برطانوی عہد : ابتداءً نئے مفتوحہ علاقے ایک مجلس نظم و نسق (Bord of Administration) کے ماتحت رکھے گئے ۔ ۱۸۵۳ء میں اسے توڑ کر اس کے اختیارات اور فرائض ایک چیف کمشنر کو تفویض ہوے ۔ ۱۸۵۹ء میں صوبۂ شمال مغربی سے دہلی کی منتقلی کے بعد، پنجاب اور ملحقہ اضلاع ایک لفٹننٹ گورنر کا صوبہ بنا دیے گئے ۔

پنجاب کے الحاق نے برطانوی علاقے کو دریائے سندھ کے پار تک بڑھا دیا اور حکومتِ ہند کا شمال مغربی سرحد کے پٹھان قبائل اور امیر افغانستان [رکّ بآن] سے قریبی واسطہ پیدا ہو گیا۔ یہ سرحد اتنی لمبی اور ایسی کوہستانی تھی کہ اس کی محافظت تنہا فوج سے نہ ہو سکتی تھی، بلکہ اس کا مدار بہت کچھ قبائل کو سیاسی قابو میں رکھنے پر تھا ۔ ابتداءً وہاں کوئی خاص ایجنسی قبائلی علاقوں سے معاملہ کرنے کے لیے نہ تھی اور اہل قبیلہ سے تعلقات رکھنے کا کام اضلاع ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر انجام دیتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں تین شمالی اضلاع سے پشاور کی کمشنری اور تین جنوبی اضلاع سے ڈیرہ جات کی کمشنری بنی ۔ اس کے بعد پولیٹیکل ایجنسیوں کا نظام قائم ہوا اور یہ ایجنسیاں پنجاب گورنمنٹ کے تحت رہیں ۔ ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحد کا الگ صوبہ بن گیا ۔ پنجاب کی حدود ۱۹۱۱ء میں پھر متعیّن ہوئیں جب کہ دہلی ایک علٰیحدہ صوبہ ہوگیا ۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب کو گورنری صوبے کے درجے پر ترقی دی گئی۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ صوبہ دو حصّوں میں منقسم تھا : برطانوی قلمرو اور دیسی ریاستیں۔ برطانوی علاقے کا رقبہ ۹۹۲۶۵ مربع میل تھا اور ریاستوں کا ۳۷۶۹۹ مربع میل ۔ دجانہ، پٹودی، کلسیہ اور شملہ پہاڑی کی ستائیس ریاستوں میں سیاسی امور کی انجام دہی پنجاب کی گورنمنٹ کرتی تھی؛ بقیہ ریاستیں لوہارو، سرمور، بلاسپور، منڈی، سکیت، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، فرید کوٹ، چمبہ، بہاولپور اور پھلکیاں ریاستیں (یعنی پٹیالہ، جیند اور نابھہ) براہ راست سرکار ہند کے ماتحت تھیں۔

۱۸۴۹ء میں سکھ حکومت کا خاتمہ ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا ۔ انھیں اذانِ دینے اور باجماعت نماز ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور ان کی مسجدیں اصطبل اور بارود خانے بن چکی تھیں، تاہم انگریزی عملداری قائم ہونے کے بعد بھی عرصے تک مسلمانوں کی حالت نہ سدھر سکی ۔ قبائلی علاقوں میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے باعث انگریز ان سے سخت بدگمان تھے، چنانچہ مدت تک ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند رہے ۔ تعلیم و تدریس کے میدان سے بھی انھیں بے دخل کر دیا گیا ۔ تجارت اور صنعت پہلے ہی سے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی ۔ زراعت پیشہ مسلمانوں کا بال بال ہندو مہاجنوں کے قرض میں بندھا ہوا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی اپنی آواز بلند نہ کر سکتے تھے ۔ ۱۸۹۸ء میں پنجاب میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی تو اس میں مسلمانوں کو بہت کم نمائندگی دی گئی ۔ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخابات کا طریق رائج ہوا ۔ تو بھی کچھ زیادہ فرق نہ پڑا کیونکہ خالص مسلمان نشستیں اقلیت میں تھیں اور کسی ہندو یا مخلوط حلقے سے کسی مسلمان کا منتخب ہونا نا ممکن تھا ۔ دراصل ہندوؤں اور سکھوں کا مسلمانوں کے خلاف ایک خاموش سمجھوتا ہو چکا تھا، جس کی رُو سے وہ کسی نمائندہ ادارے میں مسلمانوں کی اکثریت قائم نہیں ہونے دیتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں سر مائیکل اوڈوائر کا تقرّر بطور لفٹننٹ گورنر ہوا ۔ وہ مقامی باشندوں کو آئینی اصلاحات دینے کا سخت مخالف تھا ۔ اپنے شش سالہ دور میں اس نے کسی قومی اور سیاسی تحریک کو سر نہ اٹھانے دیا ۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کی کثرت اور جہالت سے فائدہ

اٹھا کر اسے نہ صرف شہری آبادی کا حریف بنانے کی کوشش کی بلکہ ''ہوم رول'' کی تحریک چلی تو اس نے جاگیرداروں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور ان سے بار بار یہ اعلان کرایا کہ پنجاب بالکل مطمئن اور خوشحال ہے اور اسے شورش پسند شہری سیاستدانوں سے کوئی واسطہ نہیں - دیہاتی اور شہری باشندوں میں اس نے تفرقے کا جو بیج بویا تھا وہ آگے چل کر خوب رنگ لایا اور پنجابی مسلمانوں نے متحد و منظم ہونے کے بجائے اپنی برادریوں کی تنظیمیں قائم کر لیں - یہ جماعت بندی آج تک پنجاب کی معاشرتی زندگی کو متأثر کر رہی ہے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی - غیر معمولی حالات سے فائدہ اٹھا کر اوڈوائر نے قانون تحفظ ہند کی آڑ میں رائے عامہ کو بری طرح کچلا - فوجی بھرتی میں پنجاب کا حصہ سب سے زیادہ تھا - ۱۹۱۸ء تک تقریباً سات لاکھ جوان فوج میں بھرتی ہوئے؛ ان میں پنجابیوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار تھی - بھرتی کے لیے حکومت نے جو جابرانہ اور متشددانہ طرز عمل اختیار کیا اس کے باعث جابجا فساد برپا ہوئے، جنھیں بڑی سختی سے کچلا گیا - اتحادیوں کے خلاف جنگ میں ترکیہ کے شریک ہو جانے سے مسلمان خاص طور پر جبر و تشدد کا نشانہ بنے - ان کے اخبار ضبط ہوئے اور رہنما جیل میں ڈال دیے گئے۔

۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے ماتحت کانگرس اور مسلم لیگ میں سیاسی اصلاحات کے بارے میں سمجھوتا ہو گیا - اس سے پنجاب کے مسلمان یوں متأثر ہوئے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مزید تحفظات دینے کی خاطر انھیں اسمبلی میں اپنی ۵۵ فی صد اکثریت سے دستبردار ہو کر ۵۰ فی صد پر قناعت کرنا پڑی - ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی اور اسی سال ہندوستانی اراکین کی مخالفت کے باوجود ہندوستان کی مجلس قانون ساز نے رولٹ ایکٹ منظور کر لیا، جس کے خلاف عوام میں اتنا جوش اور ہیجان برپا ہوا کہ ۱۹۱۹ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں مانٹگو چیمسفورڈ تجاویز کی بنیاد پر جدید آئینی اصلاحات کا قانون منظور ہوا تو مقتدر سیاسی جماعتوں نے انھیں مسترد کر دیا - مارچ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے ستیا گرہ کا اعلان کر دیا - اسی سلسلے میں ۱۲ اپریل کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا خونیں سانحہ پیش آیا - نہتے شہریوں پر فوج کی بے تحاشا فائرنگ کے بعد پنجاب کے متعدد اضلاع میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور عوام پر ایسے مظالم ڈھائے گئے جن کی مثال ۱۸۵۷ء کے بعد دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں امرتسر ہی کے مقام پر کانگرس اور لیگ دونوں کے اجلاس منعقد ہوئے اور ہند و مسلم اتحاد کی بےنظیر فضا قائم ہو گئی - اسی جلسے میں خلافت کے حفظ و بقا کے لیے خلافت کمیٹی قائم کی گئی - آئندہ دو تین سال تک پنجاب میں تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کا بڑا زور رہا اور ان میں ہندو مسلمان مل کر حصہ لیتے رہے، لیکن ان تحریکوں کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم منافرت کی آگ، جو عارضی طور پر دب گئی تھی، بہت تیزی سے بھڑک اٹھی اور جا بجا فرقہ‌دار فسادات ہونے لگے - اس ضمن میں شردھانند نے شدھی کی اور پنڈت مالویہ نے سنگھٹن کی تحریکیں جاری کر دیں - رہی سہی کسر آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے قیام سے پوری ہو گئی - پنجابی ہندوؤں نے، جو آریا سماج سے بہت متأثر تھے، ان تحریکوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا - اس سے دونوں قوموں میں نفرت اور عداوت کی خلیج گہری ہوتی گئی - ۱۹۲۰ء میں

سکھوں نے اپنی جداگانہ قومی حیثیت منوانے کا مطالبہ پیش کیا اور اپنے لیے مبالغہ آمیز رعایتیں طلب کیں ۔ ہندوؤں نے ان کی پوری تائید کی اور اسطرح مسلمانوں کے خلاف ہندو سکھ متحدہ محاذ قائم ہو گیا، جس نے مسلمانوں کے ہر جائز مطالبے کی ہمیشہ مخالفت کی۔

۱۹۲۱ء میں جدید اصلاحات کے تحت نئی اسمبلی قائم ہوئی تو اس کے بیشتر ارکان دیہاتی حلقوں سے منتخب ہو کر آئے ۔ ان میں سے اکثر سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ، انگریزی اقتدار کے حامی اور شہری آبادی سے خائف اور متنفر تھے ۔ مسلمانوں کی طرف سے میاں فضل حسین کو وزیر نامزد کیا گیا ۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں اور سرکاری کالجوں میں مسلمانوں کے تقرر اور داخلے کا تناسب مقرر کرایا، جس سے ہندو ان کے سخت مخالف ہو گئے ۔ ۱۹۲۳ء میں دوسری لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب ہوا تو اس میں سیاسی جماعتوں نے بھی حصہ لیا ۔ میاں فضل حسین دوبارہ وزیر مقرر ہو گئے ۔ ہندوؤں نے جو زیادہ‌تر غیر زراعت پیشہ تھے، ایک طاقتور حزب اختلاف قائم کر لی ۔ میاں فضل حسین نے تیس دیہاتی مسلمان ارکان اور چودھری لال چند (بعد ازاں چودھری چھوٹو رام) کے چھے زراعت پیشہ ہندو رفقا پر مشتمل نیشنل یونینسٹ پارٹی قائم کر لی، جو ۱۹۴۷ء تک صوبے میں بر سر اقتدار رہی ۔

یونینسٹ پارٹی نے میاں سر فضل حسین اور اس کے بعد سر سکندر حیات کے زیر قیادت مسلمانوں، بالخصوص دیہاتی مسلمانوں، کے حقوق کے تحفظ کے لیے قابل قدر کام کیا، لیکن اس جماعت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ پنجابی مسلمان کسی عوامی تحریک میں حصہ نہ لیں اور حکومت سے کسی صورت متصادم نہ ہونے پائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی دیہاتی آبادی سیاسی تحریکوں میں سرگرم تھی، پنجاب میں زیادہ‌تر شہری عوام ہی نے ان میں حصہ لیا ۔ اس دوران میں اگر کوئی عوامی تحریک اٹھی تو اسے سختی سے کچل دیا گیا (مسجد شہید گنج کا مسئلہ، خاکسار تحریک، وغیرہ).

پنجاب میں ہندوؤں کے برعکس شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی تصادم نہ تھا، لہٰذا شہری حلقوں کے اکثر نمائندے بھی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے ۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جب قائداعظم کی کوششوں سے مسلم لیگ کا احیا ہوا تو پنجاب اسمبلی میں باقاعدہ مسلم لیگ پارٹی قائم نہ ہو سکی ۔ انفرادی طور پر بیشتر مسلمان ارکان مسلم لیگ کے رکن تھے، لیکن اسمبلی کے اندر ان کی وفاداری کا مرکز یونینسٹ پارٹی ہی رہی ۔ سر سکندر حیات نے اپنے دور وزارت میں دونوں جماعتوں کے درمیان تصادم کا موقع پیدا نہ ہونے دیا اور وہ کل ہند مسائل میں قائد اعظم کی پیروی کرتے رہے .

اسی زمانے میں پنجاب کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کے دارالحکومت لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی.

۱۹۴۲ء میں سر سکندر حیات کی وفات کے بعد سر خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیر اعظم بنے تو یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی ۔ اس وقت سیاسی حالات کا تقاضا یہ‌تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہو کر حصول پاکستان کی تحریک متحد اور منظم ہو کر چلائیں ۔ سر خضر حیات نے اس سلسلے میں صوبائی مفادات کی آڑ لی اور قائداعظم کی ہدایت کے باوجود اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ انھیں اور ان کے رفقا کو جماعت سے خارج

کر دیا گیا اور پنجاب میں یونینسٹ حکومت ختم کر کے مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی مہم شروع ہو گئی.

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ اسے پنجاب سے مرکزی اسمبلی کی سو فی صد مسلمان نشستیں اور صوبائی اسمبلی کی چھیاسی میں سے پچھتر مسلمان نشستیں ملیں ۔ بعد ازاں چار اور ارکان بھی اس میں شریک ہو گئے ۔ اس کے باوجود اسے وزارت بنانے کی دعوت نہ دی گئی اور گورنر کے ایما سے سر خضر حیات کے زیر قیادت یونینسٹ ۔ کانگرس ۔ اکالی مخلوط وزارت قائم ہو گئی، جو عملاً غیر مسلم تھی ۔ مسلم لیگ نے پنجاب میں دوبارہ انتخابات کا مطالبہ کیا اور جب صوبائی حکومت نے جبر و تشدد سے کام لیا تو سول نافرمانی کا آغاز کر دیا ۔ یہ تحریک ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک بڑی کامیابی سے پورے صوبے میں چلائی گئی اور بالآخر ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو سر خضر حیات نے اپنی وزارت کا استعفا پیش کر دیا ۔ مسلم لیگ پارٹی کے قائد خان ممدوٹ نے غیر مسلم ارکان اسمبلی سے تعاون کی درخواست کی، جس کے جواب میں ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر گویا مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ اسی دن پورے صوبے میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جگہ خونریز بلوے ہونے لگے ۔ گورنر نے مسلم لیگ کو وزارت کی دعوت دینے کے بجائے ''گورنری راج'' کا اعلان کر دیا ۔ قیام پاکستان تک یہی صورت حال قائم رہی (مزید تفصیلات کے لیے رک بہ پاکستان).

آزادی کے بعد : (۱) پاکستانی پنجاب : قیام پاکستان کے بعد اس صوبے میں پیش آنے والے اہم واقعات کا ذکر مقالۂ پاکستان میں آ چکا ہے ۔ یہاں اس صوبے کے گورنروں اور وزرائے اعلٰی کے نام دیے جاتے ہیں:۔

(الف) گورنر : (۱) سر فرانسس مودی (۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹ء)، جن کے آخری ایام میں گورنری راج نافذ رہا؛ (۲) سردار عبدالرب نشتر (۱۹۴۹ تا ۱۹۵۱ء)؛ (۳) مسٹر اسمعیل چندریگر (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۳ء)؛ (۴) میاں امین الدین (۱۹۵۳ تا ۱۹۵۴ء)؛ (۵) مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ (۱۹۵۴ء)؛ (۶) میاں مشتاق احمد گورمانی (۱۹۵۴ تا ۱۹۵۵ء)، پھر وحدت مغربی پاکستان کی تشکیل کے بعد ۱۹۵۷ء تک صوبۂ مغربی پاکستان کے گورنر رہے؛ (۷) مسٹر اختر حسین (۱۹۵۷ تا ۱۹۵۹ء)، انہیں کے عہد میں ایوب خان کی فوجی حکومت قائم ہوئی؛ (۸) نواب امیر محمد خان آف کالا باغ (۱۹۵۹ تا ۱۹۶۶ء)؛ (۹) جنرل محمد موسی (۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۹ء)؛ (۱۰) ایر مارشل نور خان (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء)؛ (۱۱) لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمن (۱۹۷۰ء) اور جب یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو وحدت مغربی پاکستان ٹوٹ گئی تو صوبۂ پنجاب کے گورنر لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمن مقرر ہوے.

(ب) وزرائے اعلٰی : (۱) خان افتخار حسین خان ممدوٹ (۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹ء)؛ (۲) میاں ممتاز محمد خان دولتانہ (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۳ء)؛ (۳) ملک فیروز خان نون (۱۹۵۳ تا ۱۹۵۵ء)؛ (۴) عبدالحمید خان دستی (۱۹۵۵ء) ۔ اسی سال صوبۂ مغربی پاکستان کی تشکیل ہوئی اور (۵) ڈاکٹر خان صاحب کو اس کا وزیر اعلٰی مقرر کیا گیا (۱۹۵۵ تا ۱۹۵۷ء) ۔ اس طرح صوبے میں مسلم لیگ کے بجاے ری پبلکن پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی ۔ ۱۹۵۷ء میں ری پبلکن پارٹی کو اکثریت حاصل نہ رہی تو گورنری راج نافذ ہو گیا، لیکن دو ماہ بعد پھر یہی جماعت بر سر اقتدار آ گئی اور (۶) سردار عبدالرشید اور ان کے بعد (۷) نواب مظفر علی قزلباش وزیر اعلٰی مقرر

ہوے ۔ فوجی حکومت (۱۹۵۸ء) کے بعد وزیر اعلٰی کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔

صوبۂ پنجاب کی مختلف قسمتوں کا رقبہ اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رُو سے اس کی آبادی حسب ذیل ہے:۔

قسمت	رقبہ (مربّع میل)	آبادی
راولپنڈی	۱۱۲۰۶	۳۹۷۹۱۳۹
سرگودھا	۱۷۰۹۵	۵۹۷۶۹۳۹
لاھور	۸۹۰۷	۶۳۳۸۵۷۵
ملتان	۲۳۸۲۶	۶۶۰۲۹۲۳
بہاول پور	۱۷۵۰۸	۲۵۷۳۰۶۶
میزان	۷۹۵۳۲	۲۵۵۱۱۶۴۳

مہاجر آبادی کا تناسب ۲۵ سے ۳۰ فی صد ہے ۔ عام زبان پنجابی ہے (جس میں پوٹھوھاری اور سرائیکی بھی شامل ہے)، لیکن اردو پورے صوبے میں سمجھی اور لکھی جاتی ہے اور یہی عام اجتماعی امور کے علاوہ خط و کتابت اور کاروبار کی زبان ہے۔

پنجاب کا صوبہ پاکستان کے لیے قلب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس پر ملک کی اقتصادی ترقی اور عسکری برتری کا بہت کچھ دارومدار ہے ۔ یہاں کے لوگ طاقتور، بہادر اور اپنی عسکری روایات کی وجہ سے مشہور ہیں ۔ اس کا بیشتر حصہ میدانی ہے ۔ شمال مغربی گوشے میں پوٹھوھار کی سطح مرتفع ہے، جس کی جنوبی حد پر کوھستان نمک واقع ہے ۔ جنوب مغربی سرحد پر کوہ سلیمان کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے ۔ یہ پہاڑ بالکل خشک اور بنجر ہیں ۔ کوھستان کے جنوب میں سارا علاقہ میدانی ہے ۔ اس میں دریاے سندھ اور اس کے معاونین ستلج، راوی، چناب اور جہلم بہتے ہیں ۔ شمال مشرقی حصہ چھے سو سے ایک ہزار فٹ کے درمیان بلند ہے، لیکن لائلپور سے جنوب مغرب کی طرف اس کی اونچائی چھے سو فٹ سے کم ہے ۔ یہ میدان دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بنا ہے اور عام طور پر زرخیز اور ہموار ہے ۔ دریاؤں اور نہروں کے کناروں کے علاوہ کوئی اونچی زمین مشکل سے نظر آتی ہے، البتہ کہیں کہیں (مثلاً سانگلا ھل اور چنیوٹ کے قریب) پرانی چٹانوں کی چھوٹی چھوٹی اور کم بلند پہاڑیاں ملتی ہیں، جو بالکل خشک ہیں۔

یہ میدان کئی دوآبوں میں منقسم ہے، جن کی تفصیل مقالے کی ابتدا میں دی جا چکی ہے ۔ سندھ ساگر دوآب کا بڑا حصہ ریگستان ہے، جسے تھل کہتے ہیں ۔ سندھ پار کا علاقہ ڈیرہ جات کہلاتا ہے ۔ جنوبی حصہ پہلے بنجر یا ریگستان تھا اور آبادی بھی بہت کم تھی، لیکن موجودہ صدی میں نہری آب پاشی نے اسے سرسبز اور شاداب بنا دیا ہے اور یہاں بہت سی نئی بستیاں اور شہر آباد ہو گئے ہیں ۔ تھل کے ریگستان کو بھی اب نہروں اور ٹل دار کنووں کے ذریعے زیر کاشت لایا جا رہا ہے ۔

آب و ہوا سخت گرم، سخت سرد اور خشک ہے ۔ جون میں درجۂ حرارت ۱۱۰ اور ۱۲۰ درجے فارن ھائیٹ تک پہنچ جاتا ہے ۔ دن میں گرم لو چلتی ہے، جس کی تپش سے گھاس تک جھلس جاتی ہے ۔ جنوب مغرب میں ملتان اور تھل میں لیّہ کے آس پاس کا علاقہ خاص طور پر گرم رہتا ہے ۔ موسم سرما میں خوب سردی ہوتی ہے ۔ سب سے زیادہ سردی پوٹھوھار اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں پڑتی ہے ۔ شمال مشرقی کوھستانی علاقے کو چھوڑ کر بارش کی عام طور پر قلت رہتی ہے ۔ کوہ ھمالیہ کی تلہٹی میں اس کا سالانہ اوسط ۲۰ سے ۳۰ انچ تک ہے، لیکن جنوب مغرب میں ۱۰ انچ سے بھی کم

ہے - بارش زیادہ تر موسم گرما کے آخر میں جولائی سے ستمبر تک کے مہینوں میں مون سون ہواؤں سے ہوتی ہے - کچھ بارش موسم سرما میں مغربی طوفانوں سے بھی ہو جاتی ہے.

بحیثیت مجموعی پنجاب کا صوبہ ملک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ سمجھا جاتا ہے - پاکستان کے قیام کے بعد زرعی، صنعتی، تجارتی اور دوسرے میدانوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی تفصیل مقالۂ پاکستان میں آ چکی ہے - لاہور، سیالکوٹ، ساہیوال، لائل پور، ملتان، بہاول پور، گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا، جہلم، راولپنڈی اس صوبے کے اہم شہر ہیں - راولپنڈی میں مری اور اس کے مضافات ملک کے بہترین صحت افزا پہاڑی مقامات میں شمار ہوتے ہیں - پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد بھی راولپنڈی کے قریب واقع ہے - مزید معلومات کے لیے رک بہ پاکستان.

(۲) **بھارتی پنجاب**: حصول آزادی کے بعد سابقہ صوبۂ پنجاب کا مشرقی حصہ ریڈ کلف ایوارڈ کے تحت بھارت کے حوالے کر دیا گیا تھا، جس پر مشتمل صوبۂ مشرقی پنجاب وجود میں آیا - بعد ازآں اس کا نام پنجاب رکھ دیا گیا - ۱۹۴۸ء میں یہاں کی پہاڑی ریاستوں پر مشتمل ہماچل پردیش کا علیحدہ صوبہ تشکیل کیا گیا اور مہاسو، سرمور، منڈی، چمبہ، بلاس پور اور کنور اس کے اضلاع بنائے گئے- ۱۹۵۶ء میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین (PEPSU) پنجاب میں مدغم کر دی گئی - ۱۹۶۶ء میں اس صوبے کی تقسیم لسانی بنیادوں پر عمل میں آئی: (ا) پنجاب: جہاں پنجابی بولی جاتی ہے - یہ اضلاع گورداسپور، امرتسر، کپورتھلہ، جالندھر، فیروزپور، بٹھنڈا، پٹیالہ اور لدھیانہ کے علاوہ اضلاع سنگرور، ہوشیارپور اور انبالے کی تحصیل کھرڑ کے کچھ حصوں پر مشتمل ہے - اس کا رقبہ ۴۷۲۰۵ مربع میل اور آبادی ۲۰۳۵۶۸۱۲ (۱۹۶۱ء) ہے؛ (ب) ہریانہ، جہاں ہندی بولی جاتی ہے - یہ اضلاع حصار، مہندرگڑھ، گوڑگاؤں، رھتک اور کرنال کے علاوہ اضلاع سنگرور اور انبالہ کی تحصیل کھرڑ کے کچھ حصوں پر مشتمل ہے - اس کا رقبہ ۱۷۶۰۰ مربع میل اور آبادی تقریباً ستر لاکھ (۱۹۶۶ء) ہے - پنجاب اور ہریانہ دونوں صوبوں کا دارالحکومت چنڈی گڑھ ہے؛ (ج) ہماچل پردیش: اسی تقسیم کے ذریعے سابقہ پنجاب کے اضلاع شملہ، کلو، کانگڑہ، لہاؤل Lahaul اور سپیٹی Spiti کے علاوہ اضلاع ہوشیار پور و انبالہ کے کچھ حصے بھی ہماچل پردیش میں شامل کر دیے گئے - اس صوبے کا دارالحکومت شملہ ہے، جو پنجاب میں واقع ہے - اس کا رقبہ ۱۰۸۸۵ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۱۳۵۱۱۴۴ تھی - مزید تفصیلات کے لیے رک بہ ہندوستان.

مآخذ: (۱) ابن حوقل: صورۃ الارض، لائڈن ۱۹۳۸ء؛ (۲) ابن خرداذبہ: المسالک و الممالک، لائڈن ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء؛ (۳) الاصطخری: المسالک و الممالک، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۴) ابن بطوطہ: عجائب الاسفار، پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۸ و اردو ترجمہ از محمد حسین (سفر نامہ ابن بطوطہ)، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۵) البیرونی: کتاب الہند، اردو ترجمہ از اصغر علی، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۱ء؛ (۶) تاریخ بیہقی، طبع سعید نفیسی، تہران ۱۳۴۲ھ ش؛ (۷) طبقات ناصری، طبع عبدالحی حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ - ۱۹۵۴ء؛ (۸) عوفی: لباب الالباب، لائڈن ۱۹۰۶ء؛ (۹) برنی: تاریخ فیروز شاہی، طبع سیّد احمد خان، ۱۸۶۲ء؛ (۱۰) جوینی: تاریخ جہانگشای، لائڈن ۱۹۱۶ء؛ (۱۱) بداؤنی: منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۱۲) انشاے ابو الفضل، مطبع نولکشور؛ (۱۳) ابو الفضل: آئین اکبری، انگریزی ترجمہ از بلاخمن و جیرٹ، مطبوعۂ

کلکتہ و اردو ترجمہ از فدا علی خان، جامعۂ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۹ء؛ (۱۴) انتظام اللہ شہابی: تاریخ ملت، ج ۱۰ و ۱۱، دہلی ۱۹۵۰ء؛ (۱۵) کنہیا لال: تاریخ پنجاب، لاہور ۱۲۹۸ھ؛ (۱۶) مفتی غلام سرور: تاریخ مخزن پنجاب، مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء؛ (۱۷) سیّد محمد لطیف: تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، لاہور ۱۸۸۸ء؛ (۱۸) نور احمد: تحقیقات چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء؛ (۱۹) عباد اللہ گیانی: سکھ عہد اسلامی میں، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۲۰) عبد اللہ چغتائی: لاہور سکھوں کے عہد میں، لاہور ۱۹۶۴ء؛ (۲۱) ٹھاکر سنگھ: پنجاب اور انگریز، مطبوعۂ امرتسر؛ (۲۲) محمود شیرانی: پنجاب میں اردو؛ (۲۳) ہاشمی فرید آبادی: تاریخ پاکستان و بھارت، کراچی، ۱۹۵۳ء؛ (۲۴) عاشق حسین بٹالوی: اقبال کے آخری دو سال، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲۵) محمد ایوب خان: جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، مطبوعۂ لاہور؛ (۲۶) حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۲۷) A. Cunningham: The Ancient Geography of India، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۲۸) John Marshall: Mohenjo-Daro and the Indus Civilisation، لنڈن ۱۹۳۱ء؛ (۲۹) M.S. Vats: Excavations at Harappa، کلکتہ ۱۹۴۰ء؛ (۳۰) Elliot و Dowson: The History of India as told by its own Historians، ۱۸۶۷ - ۱۸۷۷ء؛ (۳۱) The Cambridge History of India؛ (۳۲) Smith: Early History of India، اوکسفرڈ ۱۹۲۴ء؛ (۳۳) Mortimer Wheeler: Early India and Pakistan، لنڈن ۱۹۵۹ء؛ (۳۴) بدھ پرکاش: Political and Social movements in Ancient Punjab، دہلی ۱۹۶۴ء؛ (۳۵) A short History of Pakistan، طبع اشتیاق حسین قریشی، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۳۶) موجمدار: An Advanced History of India، نیویارک ۱۹۶۷ء؛ (۳۷) Steinbach: The Punjaub، لنڈن ۱۸۴۶ء؛ (۳۸) History of the Punjab، مطبوعۂ ایلن اینڈ کمپنی، لنڈن ۱۸۴۶ء؛ (۳۹) سید محمد لطیف: History of the Punjab، مطبوعۂ پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور و لنڈن؛ (۴۰) Travaskis: The Land of the Five Rivers، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۸ء؛ (۴۱) ہری رام گپتا: Studies in the later Mughal History of the Punjab 1707-1793؛ (۴۲) محمد اکبر: Punjab under the Mughals، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۴۳) گلشن لال چوپڑہ: The Punjab as a Sovereign State (1799-1839)؛ (۴۴) J.D. Cunningham: A History of the Sikhs، آوکسفرڈ ۱۹۱۸ء؛ (۴۵) Bell: Annexation of the Punjab، ۱۸۸۲ء؛ (۴۶) Griffen و Massy: Chiefs and Families of note in the Punjab، ۳ جلد، ۱۹۰۹-۱۹۱۱ء؛ (۴۷) The Punjab: a review of the first six years (August 1947-August 1953)، مطبوعۂ حکومت پنجاب؛ (۴۸) محمد باقر: Lahore، لاہور ۱۹۵۲ء؛ (۴۹) Statesman's year book 1964-65؛ (۵۰) Statesman's year Book 1968-69. (۵۱) Pakistan year Book 1969؛ (۵۲) Encyclopaedia Britannica، ج ۱۸، مطبوعۂ ۱۹۶۹ء؛ (۵۳) وو، لائڈن، بار اول، ج ۳، بذیل پنجاب.

مزید مآخذ کے لیے رک بہ پاکستان.

(ادارہ)

⊗ **پنجابی**: برصغیر پاک و ہند کے اس خطّے کی زبان جس کی حدود دہلی (بھارت) سے لے کر خیرپور (سندھ) تک اور پشاور و درّۂ کاغان (صوبۂ سرحد) سے لے کر جمّوں و سری نگر (مقبوضہ کشمیر) تک پھیلی ہوئی ہیں۔ [اگرچہ مقامی طور پر ہر علاقے میں اس زبان کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے تاہم ادبی اظہار کے لیے ایک ہی ٹکسالی زبان کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بابا فرید شکر گنج (ساہیوال)، شاہ حسین اور بلھے شاہ (لاہور)،

سلطان باھو (جھنگ)، خواجہ فرید (بہاولپور)، سچل سر مست (خیر پور)، میاں محمد بخش (میر پور)، احمد علی سائیاں (راولپنڈی)، بردا پشاوری (پشاور)، مولوی غلام رسول (ھوشیارپور) وغیرہ نے جغرافیائی یا بدلتی ھوئی انتظامی حدود کی پابندی نہیں کی ھے بلکہ اسی ٹکسالی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا ھے جسے عرف عام میں پنجابی کہا جاتا ھے]۔

تحقیقات سے پتا چلتا ھے کہ اس زبان کے لیے یہ نام بہت بعد میں استعمال کیا گیا ۔ دسویں صدی عیسوی کے مؤرخ المسعودی اور جغرافیہ‌نگار ابن حوقل نے اسے ملتانی لکھا ھے ۔ البیرونی نے اپنی کتاب الصیدنہ (یا الصیدلہ) میں پنجاب اور اس کے نواح کی زبان کو ''النہندیہ'' لکھا ھے ۔ مقامی زبان میں مسعود سعد سلمان (۴۴۰ تا ۵۱۵ھ) کے دیوان کو ھندوی بتایا گیا ھے (لباب الالباب، ۲ : ۲۴۶) ۔ بعد کے پنجابی مصنفین بھی اس زبان کو ھندوی یا ھندی ھی کہتے ھیں، مثلاً عبدالکریم نجات المؤمنین (۱۶۷۵ء) میں، احمد یار (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۲ھ) کام روپ کام لتا میں، [نیز حافظ معز الدین (۱۰۸۹ھ)، شاہ مراد (۱۱۴۴ھ)، حمل فقیر (۱۲۳۰ تا ۱۲۹۲ھ)، مولوی محمد مسلم (۱۲۵۰ھ)، میاں محمد بخش (۱۲۷۹ھ)، مولوی محمد اللہ جواپا جہاوریاں (۱۲۸۰ھ) وغیرہ]، جبکہ دبستان مذاھب (ص ۱۸۸) میں گورو نانک کی زبان کو ''زبان جٹان پنجاب'' کہا گیا ھے ۔ حامد نے ھیر رانجھا میں اپنی زبان کے لیے ''جٹکی'' کا نام استعمال کیا ھے ۔ امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) کے ھاں ایک لاھوری زبان کا ذکر ملتا ھے اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے ملتانی لکھا ھے ۔

[سوال پیدا ھوتا ھے کہ اس زبان کے لیے پنجابی کا لفظ کب اختیار کیا گیا؟ حافظ برخوردار پہلا مصنف ھے جس نے مفتاح الفقہ (۱۰۸۰ھ) پنجابی کا لفظ استعمال کیا اور اس کے بعد مولوی کمال الدین نے انتخاب الکتب (۱۱۱۳ھ) میں اور سندر داس آرام نے قصۂ سسی پنوں (۱۱۷۲ھ) میں]۔

پنجابی زبان کی ابتدا اور تعمیر کے بارے میں مختلف مصنفین میں کافی اختلاف پایا جاتا ھے ۔ باوا بدھ سنگھ کی رائے میں ''پنجابی کا جسم سنسکرتی ھے، لیکن اس کا لباس بدلتا رھا ھے ۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپرانس (= اَپ ونش، اپ بھرنش) اور اس سے پنجابی'' (پریم کہانی ص ۵۲)۔

بنارسی داس جین نے پنجابی کو قدیم سنسکرت کی وارث قرار دیا ھے ۔ انھوں نے لکھا ھے کہ چار ھزار سال قبل آریا یہاں وارد ھوے ۔ ان کے ساتھ ھی آریا تہذیب اور سنسکرت زبان بھی یہاں پھیلتی چلی گئی اور مقامی زبانیں دراوڑی وغیرہ بنتی چلی گئیں ۔ آخرکار ۶۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ء کے درمیانی عرصے میں سنسکرت زبان پراکرت میں بدل گئی اور اس کے بعد پنجابی زبان کی موجودہ شکل وجود میں آئی (پنجابی زبان تے اوھدا لٹریچر، ص ۱۸)۔

[سنت اندر سنگھ چکرورتی نے اپنے مضمون سنسکرت تے پنجابی (در ماھنامہ پنجابی ادب، لاھور، جون ۱۹۶۱ء) میں ھندی زبان کے مشہور عالموں پنڈت مہاں ویر پرشاد، وجے چندر موجمدار اور بھگوتی شرن اپادھیاے کے حوالے سے ثابت کیا ھے کہ سنسکرت کے قواعد نویسوں نے یہاں کی مقامی زبان کو پراکرت کا نام دیا تھا، جس کے معنی ھیں : خود رو اور فطری، یعنی جو عام لوگوں کی زبان ھو ۔ اسی پراکرت کا جدید نام پنجابی زبان ھے ۔ انھوں نے لکھا ھے کہ جہاں تک سنسکرت کا تعلق ھے یہ اس قدیم پراکرت ھی کا ادبی روپ ھے کیونکہ سنسکرت کے معنی ھیں : سنواری اور

تراشی ہوئی زبان]۔

ھیرا لال کا خیال ھے کہ پنجابی بگڑی ہوئی بولیوں (اپ بھرنش) سے نکلی ھے اور مخلوط زبان ھے۔

گریرسن Grierson پنجابی کو مستقل زبان مانتا ھے اور اس کے لیے بعض لسانی شواھد پیش کرتا ھے۔

موھن سنگھ دیوانہ نے اپنے ایک مضمون میں سنسکرت کو پنجابی کا مأخذ قرار دینے پر اصرار کیا ھے اور متعدد مثالیں دے کر پنجابی اور سنسکرت میں کم از کم فرق ثابت کیا ھے، مثلاً:۔

پنجابی	سنسکرت	پنجابی	سنسکرت
سر	شر	پیر	پاؤ
اکھ	اکھشی	نک/ناس	ناسکا
ککڑ	ککت	گھوڑا/گھوڑی/ گھوڑولی	گھت
متھا	مستکا	کن	کرنڈ
کنک	کنک	کپڑا	کرپٹ
ھتھ	ھت	پٹ	پٹ
دُدھ	دگدھ	ترکالاں	ترکال
جوں	یو	جنگھ/جانگھیا	جانگھ

[اس سلسلے میں صحیح نظریہ یہ ھے کہ اس زبان کا تعلق اس قدیم زبان سے ھے جو آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں پر مستعمل تھی۔ جب مستشرقین نے پنجابی کی لسانی حیثیت کے متعلق اپنے نقطہ ھاے نظر پیش کیے تھے تو اس وقت ھڑپا، روپڑ، چنڈی گڑھ، موئن جودڑو، کوٹ ڈیجی وغیرہ سے آریاؤں سے قبل کی تہذیبوں کے مظاھر دریافت نہ ہوئے تھے۔ ان ماھرین لسانیات کا علم صرف آریاؤں اور ان کی زبان سنسکرت تک ھی محدود تھا ۔ اسی لیے انھوں نے اپنے نظریے کی بنیاد پنجابی زبان میں سنسکرت الفاظ (تتسم' اور 'تدبھو' روپ) کی وافر مقدار کو مدِّ نظر رکھتے ہوے قائم کی تھی اور بعد میں دوسرے مقامی ماھرین لسانیات نے بھی انھیں نظریات کو اپنا لیا۔ اس سے انکار نہیں کہ پنجابی زبان میں سنسکرت الفاظ ان گنت اور بے شمار ھیں ۔ اس کے علاوہ پنجابی گرامر پر بھی سنسکرت کا تھوڑا بہت اثر مل سکے گا، لیکن یہ عوامل پنجابی زبان کو سنسکرت سے مأخوذ یا اس کی بگڑی ہوئی شکل ثابت کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ھیں۔ تقابلی لسانیات کی رُو سے کسی زبان کا لسانی تجزیہ کرتے وقت اس کے ذخیرۂ الفاظ کے بجاے اس کی اندرونی اور بیرونی ساخت کو مدِّ نظر رکھا جاتا ھے ۔ مثال کے طور پر عربی نے فارسی اور ھسپانوی زبانوں پر واضح اثرات مرتسم کیے ھیں، لیکن ان زبانوں کو کبھی سامی خاندان سے متعلق تسلیم نہیں کیا گیا۔

کسی زبان کا لسانی تجزیہ کرتے وقت تاریخی شواھد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رادھا کمود مکرجی نے اپنی کتاب *Indus Civilization* میں ھڑپا، موئن جودڑو وغیرہ کے کھنڈرات سے دستیاب شدہ انسانی کھوپڑیوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ھے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے حبشی (Negrites)، پھر آسٹرک، دراوڑ اور آریا آئے تھے ۔ اس کے بعد کی تاریخ تاریکی میں پنہاں نہیں اور ھمیں واضح ثبوت ملتے ھیں کہ آریاؤں کے بعد سیتھین، پہلوی، یونانی، عرب، ایرانی، ترک اور انگریز اس خطّے میں وارد ہوے، اس لیے ظاھر ھے کہ یہاں کی مقامی زبان نے یکے بعد دیگرے ان سب اقوام کی زبانوں کے اثرات قبول کیے ۔ سنیتی کمار چیٹرجی نے اپنی کتاب *Origin and Development of Bengali Language* میں ویدوں میں استعمال کیے گئے الفاظ پھل، نیلا، وَل، شام وغیرہ کو مقامی

زبان سے مستعار بتایا ہے ۔

اس سلسلے میں محمد آصف خان : پنجابی زبان کے اجزائے ترکیبی (در روزنامۂ امروز، لاہور، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) اور عین الحق فرید کوٹی : پنجابی زبان دیاں جڑھاں (در پنجابی ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء) کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا ۔ ان مضامین میں متعدّد مثالیں دے کر پنجابی اور دراوڑی زبانوں کے مشترک الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے، مثلاً :۔

دراوڑی	پنجابی	اردو
پنو	پنا	سونا
ولا	ولنا	گھیرنا
ولگ	ول	ٹھیک، بہتر
کُو	کُونا	بولنا
پیٹی	پیٹی	صندوق
آنو	آھنا	کہنا
سڑنگو	سونگڑنا	سکڑنا
کنڈ	کنڈ	کمر
کچھ	کچھ	بغل
پٹو	پٹ	ریشم
اٹی	اٹی	دھاگہ
چاٹی	چاٹی	گھڑا
لون	لون	نمک

سندھی زبان کی لسانی ساخت کے متعلّق لکھتے ہوئے ارنسٹ ٹرمپ (*Sindhi Grammar*) اور سراج (سندھی بولی) نے بھی دراوڑی اثرات کی نشان دہی کی ہے ۔

مختصر یہ کہ پنجابی زبان سنسکرت سے بھی قدیم ہے اور مختلف ادوار میں مختلف زبانیں اس کے ذخیرۂ الفاظ کے سرمائے کو بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں ۔ سنسکرت کے بارے میں مزید اتنا اضافہ کرنا کافی ہوگا کہ آریا اپنے ساتھ ویدک سنسکرت لائے تھے، یعنی وہ سنسکرت جس میں رگ وید، اتھر وید، یجر وید اور سام وید لکھے گئے ۔ جب آریاؤں کو یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو وہ مقامی زبان سے متأثر ہونے لگی ۔ ان مقامی اثرات سے بچانے کے لیے یاسک (۷۰۰ ق م)، پانِنی (۵۰۰ ق م) اور پتنجلی (۱۵۰ ق م) نے سنسکرت کی گرامریں لکھیں ۔ ان قواعد کے سانچے میں جو زبان ڈھالی گئی اسے کلاسیکی سنسکرت یا صرف سنسکرت کہا جاتا ہے ۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے پنجابی زبان ایک وسیع و عریض خطّے کی زبان ہے اور انتظامی حد بندیوں کی پابند نہیں، اس لیے لازمی امر ہے کہ جو زبان جتنی جغرافیائی وسعت کی حامل ہو گی اس کے محاورے اور لہجے میں اتنا ہی اختلاف بھی ہوگا ۔ اگرچہ آج کل ان الگ الگ محاوروں کو الگ الگ زبانوں کا درجہ دینے کی کوشش ہو رہی ہے، مگر اس کے اسباب سیاسی زیادہ اور علمی و لسانی کم ہیں ۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں ہورنیل Hornell نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ آریائی زبانیں اندرونی اور بیرونی شاخوں میں منقسم ہیں ۔ اس کے بعد ٹسڈل Tisdall نے اپنی کتاب *Punjabi Grammar* (۱۸۸۹ء) میں اسی مفروضے کو آگے بڑھایا ۔ اس نے پنجابی اور لہندی (ملتانی) کو دو علیحدہ علیحدہ زبانیں قرار دیا ۔ گریرسن نے *Linguistic Survey of India* میں لہندا (ملتانی) کا رشتہ نہ صرف پنجابی سے توڑ دیا بلکہ لہندا کو کشمیری زبان سے ملا دیا ۔ اگرچہ سنیتی کمار چیٹر جی اور گراھم بیلی وغیرہ نے انھیں دنوں اس مفروضے کو بے بنیاد اور غلط ثابت کر دیا تھا اور بعد میں پنجابی ماہرین لسانیات نے بھی اس پر تفصیلی طور پر لکھا ہے، اس کے باوجود سیاسی مقاصد کے لیے انھیں آج تک استعمال کیا جا رہا ہے ۔ محمود

شیرانی بھی اس تقسیم کو غلط قرار دے چکے ھیں - ان کی رائے میں مشرقی اور مغربی بولیوں میں جو فرق ھے وہ اصولی نہیں بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر ھوتا چلا گیا ھے (پنجاب میں اردو : ص ۹۱).

پنجابی زبان کے متعلق اکثر کہا جاتا ھے کہ یہ بارہ کوس پر بدل جاتی ھے اور اس پر خاص طور سے زور دیا جاتا ھے؛ لیکن یہی بات ھر زبان پر صادق آتی ھے - سندھی زبان میں کہاوت ھے : سندھ میں چپے چپے تے بولی بٹی (= سندھ میں چپے چپے پر دوسری بولی ملتی ھے، دیکھیے اڈوانی : سندھی بولی) - اسی طرح گجراتی زبان کی کہاوت ھے : بارگاویں بولی بدلے، تروور بدلے شاکھا (= بارہ کوس پر زبان اسی طرح بدل جاتی ھے جس طرح درخت اپنی شاخیں بدلتا ھے).

آب و ھوا اور جغرافیائی، معاشرتی، سیاسی عناصر ایسے عوامل ھیں جو کسی بھی علاقے کی زبان کو متأثر کرتے ھیں - یہی عناصر آگے چل کر زبان کو بولیوں میں منقسم کر دیتے ھیں، تاھم ان سے زبان کی بنیادی لسانی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ ھر جگہ ایک ھی رھتی ھے.

پنجابی زبان کی بولیوں کو تین بڑے گروھوں، یعنی مشرقی، مغربی اور مرکزی میں تقسیم کیا جا سکتا ھے.

مشرقی :

۱ - بھٹیانی : حصار، گوڑگاؤں، بیکانیر وغیرہ میں.

۲ - پوادھی : انبالہ، پٹیالہ، جیند وغیرہ میں.

۳ - دوآبی : لدھیانہ، جالندھر، ھوشیار پور وغیرہ میں.

۴ - مالوئی : مالیر کوٹلہ، فرید کوٹ، فیروز پور وغیرہ میں.

۵ - پہاڑی : کانگڑہ، شملہ، جموں وغیرہ میں.

مغربی :

۱ - سرائیکی : خیر پور ڈویژن (سندھ) میں.

۲ - ریاستی : رحیم یارخاں، بہاولپوروغیرہ میں.

۳ - ملتانی : ملتان، ڈیرہ غازی خاں وغیرہ میں.

۴ - ھندکو : پشاور، ایبٹ آباد وغیرہ (صوبۂ سرحد) میں.

۵ - چھاچھی : کیمبل پور وغیرہ میں.

۶ - پوٹھوھاری : راولپنڈی وغیرہ میں.

۷ - دھنی : جہلم، میر پور (آزاد کشمیر) وغیرہ میں.

۸ - شاہ پور : سرگودھا، جھنگ وغیرہ میں.

مرکزی :

۱ - ماجھی : لاھور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گورداسپور، امرتسر وغیرہ میں.

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ھوگا کہ ادبی اور ٹکسالی زبان ماجھی اور ملتانی بولیوں کی حسین آمیزش سے مرتب ھوئی ھے اور قدما سے لے کر موجودہ دور تک کے مسلمان، سکھ اور ھندو شاعروں اور ادیبوں نے اپنی علمی و ادبی تخلیقات کے لیے اسی کو وسیلۂ اظہار بنایا ھے.

سکھی پنجابی اور گورمکھی رسم الخط : اس سے پہلے کہ پنجابی زبان کے متعلق بات ختم کی جائے بہتر یہ ھوگا کہ سکھی پنجابی کی مروج اصطلاح کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کیا جائے - یہ اصطلاح گورمکھی رسم الخط اور اس میں استعمال کی جانے والی زبان کے لیے استعمال کی جاتی ھے.

بر صغیر پاک و ھند کے مشہور بادشاہ اشوک (۲۷۳ ق م - ۲۳۲ ق م) سے قبل یہاں ایک رسم الخط رائج تھا جسے ''برھمی لپی'' کہا جاتا ھے - اشوک کے کتبے اسی رسم الخط میں

لکھے گئے تھے - ۵۰۰ ق م سے لے کر ۲۳۶ء تک پنجاب باقی ہندوستان سے کٹا رہا تھا اور یہ ایرانی، یونانی، پارتھی، شاکا اور کشان حکومتوں کے زیر نگین رہا تھا - ان اقوام نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں خروشتی، یونانی وغیرہ رسم الخط رائج کیے تھے، اس لیے برھمی لپی یہاں پر رائج نہ ہو سکی - جب ۳۲۰ء میں ملک کی باگ ڈور گپتا خاندان کے ہاتھ میں آئی تو یہاں برھمی لپی رواج پذیر ہوئی - اسی دور میں یہ دو خطوں میں بٹ گئی : ایک وہ جو شمالی ہندوستان میں اور دوسرا وہ جو جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے لیے استعمال میں لایا گیا - شمالی ہندوستان میں اپنائے گئے خط سے ''کٹل لپی'' وجود میں آئی - یہ تقریباً ۵۰۰ء سے لے کر ۹۰۰ء تک مستعمل رہی اور اس کے بعد اس نے دیوناگری، شاردا، ٹاکری، گورمکھی، لنڈے وغیرہ کی شکل اختیار کی - مندرجۂ ذیل خاکہ گورمکھی اور مذکورۂ بالا خطوں کے باہمی تعلق کی وضاحت کر دے گا :

	ٹاکری	شاردا	دیوناگری
گورمکھی میں ایک جیسے حروف	۵	۷	۲
گورمکھی میں مماثلت رکھنے والے حروف	۵	۱۲	۵
گورمکھی میں قدرے مماثل حروف	۶	-	۱۳
گورمکھی میں بالکل مختلف حروف	۸	۱۵	۱۴

موجودہ دور میں سکھ عالموں نے اس نظریے کو بالکل باطل قرار دیا ہے کہ گورمکھی کو دوسرے گورو انگد دیو (۱۵۰۴ تا ۱۵۵۳ء) نے اختراع کیا تھا - ان کا بیان ہے کہ یہ رسم الخط بہت پہلے رائج ہو چکا تھا؛ گورو صاحبان نے صرف اتنا کیا کہ اسے اپنی بانی کے لیے منتخب کیا۔

سکھ مذہب کے بانی گورو نانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء) کی زبان موجودہ پنجابی کے کافی حد تک قریب ہے اور اس میں چالیس فیصد الفاظ عربی، فارسی اور ترکی سے لیے گئے ہیں (سیّد عبداللہ : ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ، ضمیمہ) - گورو انگد دیو سے لے کر نویں گورو تیغ بہادر (۱۶۲۱ تا ۱۶۷۵ء) تک تمام گوروؤں کے کلام میں بھگتی لہر کے شاعروں، مثلاً راما نند، رامانج، آچاریہ ولبھ، تلسی داس وغیرہ کی زبان کے اثرات واضح صورت میں ملتے ہیں - دسویں گورو گوبند سنگھ (۱۶۶۶ تا ۱۷۰۸ء) پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے تھے اور تقریباً تمام عمر پنجاب سے باہر رہے؛ اس لیے ان کے کلام پر برج بھاشا، پوربی ہندی، بنگالی اور بھگتی لہر کی زبان کا آمیزہ ہے - کسی حد تک چنڈی دی وار اور ان کے چند ایک شبدوں کو پنجابی کی اس شکل کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جس میں دوسرے گورو صاحبان نے اپنا کلام لکھا تھا۔

گورو صاحبان نے جس قسم کی مخلوط زبان میں اظہار خیال کیا تھا بعد کے پنجابی شاعروں، ادیبوں اور افسانہ‌نگاروں نے اسے نہیں اپنایا بلکہ وہ اپنی تخلیقات اسی زبان میں پیش کرتے رہے جو مسلمان کلاسیکی شعرا کی تھی - بھائی ویر سنگھ، دھنی رام چاترک، نانک سنگ ناولسٹ، موہن سنگھ ماہر، امرتا پریتم، سنت سنگھ سکھوں، وغیرہ نے اپنا تمام شعری سرمایہ اور افسانے، ڈرامے وغیرہ اسی زبان میں پیش کیے ہیں اور نئی نسل بھی پیش کر رہی ہے۔

بایں ہمہ تقسیم پنجاب (۱۹۴۷ء) کے بعد مشرقی پنجاب کی پنجابی زبان میں ایک اہم تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے - اگرچہ افسانوی ادب کی زبان میں زیادہ تبدیلی نظر نہیں آتی، لیکن غیر افسانوی ادب کی زبان ہندی سنسکرت زدہ ہوتی جا رہی ہے - اکثر اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ ان تحریروں میں ہندی

سنسکرت الفاظ کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ پنجابی زبان کا عالم فاضل بھی اس تحریر کا مطلب اخذ کرنے میں قاصر رہتا ہے بلکہ سکھوں کے لیے بھی یہ کچھ اجنبی ہی ہے، اس لیے کہ ان کے تمام مقدس مقامات پاکستانی پنجاب میں ہیں اور سکھ دانشور مسلمان صوفی شعرا کے ادبی خزانوں سے بھی تعصب نہیں رکھتے۔ بہرحال سیاسی حکمت عملی کے تحت پنجابی زبان و ادب کی ترقی کے نام پر تالیف و تصنیف کا شعبہ قائم کیا گیا، جس نے چند ہی برسوں میں زبان کی کایا کلپ کر دی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ غیر افسانوی نثر میں اس قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے کہ ہندی سنسکرت کا کوئی عالم سمجھے تو سمجھے، ایک عام پنجابی اسے سمجھنے سے معذور ہے۔

[مشرقی پنجاب میں ہندی۔ سنسکرت زدہ پنجابی کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۶۷ء میں جالندھر میں رکھی گئی تھی۔ اب تک اس کی چار کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور آئے دن اس کے حق میں اور خلاف مشرقی پنجاب کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں]۔

یہاں اس امر کا بھی لحاظ رہے کہ گرنتھ صاحب گورمکھی میں مرتب ہوا تھا اور بعد ازاں سکھوں کا سارا لٹریچر اسی میں لکھا گیا، چنانچہ سکھوں کے ہاں اسے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس نے ان کی ایک قومی علامت کی صورت اختیار کر لی۔ یہیں سے ''سکھی'' پنجابی اور ''مسلمانی'' پنجابی میں، جس کا رسم الخط ہمیشہ فارسی رہا، امتیاز پیدا ہونے لگا۔ سکھوں کی زبان اسلامی (فارسی، ترکی، اردو) اثرات سے دور ہوتی گئی اور تقسیم بر صغیر کے بعد رسم الخط کے اختلاف کے باعث مشرقی (بھارتی) اور مغربی (پاکستانی) پنجاب کی زبانیں ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئیں۔

زبان کے یہ دو رنگ ادب میں بھی نمودار ہوئے۔ مسلمان صوفیوں اور عالموں نے عوام میں تبلیغ اسلام کی خاطر پنجابی کو اپنایا تھا۔ یہ سلسلہ رفتہ رفتہ خالص دینی اور صوفیانہ تصنیف سے نکل کر ادبی کتابوں تک جا پہنچا، چنانچہ پرانے پنجابی ادب کا ایک بڑا حصہ اسلامی صوفیانہ روایات کا حامل ہے۔ انگریزی عہد میں مغربی اثرات کے تحت دوسری اصناف بھی وجود میں آئیں جن کی روح سیکولر (secular) ہے، یا کم از کم ادب کی اسلامی روایات سے ہٹی ہوئی ہے۔

پنجابی ادب کی خصوصیات: پنجابی زبان و ادب کے ادوار قائم کرنے سے پہلے اس کی ممتاز خصوصیات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا:

پنجابی ادب پر علمائے دین اور اولیا و مشائخ کی تعلیمات اور مقامی ماحول کا بڑا گہرا اثر ملتا ہے۔ شاعری پر تصوف کا رنگ غالب ہے، لیکن اس کی بعض منفرد خصوصیات بھی ہیں۔ اول تو اردو اور فارسی کے برعکس اس میں اظہار عشق ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے؛ دوسرے اس میں مجاز اور حقیقت متصادم نہیں ہوتے۔ صوفی شعرا نے اپنے افکار و تاثرات کو صوفیانہ شاعری اور عارفانہ کلام ہی میں بیان کرتے ہیں اور ان کا مطلوب ہمیشہ معشوق حقیقی ہوتا ہے۔ رومانی قصوں کے کردار ان کے ہاں بطور علامت استعمال ہوتے ہیں، مثلاً وہ اکثر اپنی ذات اور روح کو ہیر، سوہنی اور سسّی اور اپنے خدا کو (نیز مرشد کو، جو وصال الٰہی کا وسیلہ ہے) رانجھا، مہینوال اور پنّوں کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ اسی طرح سلطان باھو کے ہاں کھیڑے اور رانجھے کو شر اور خیر کی علامتوں کے طور پر لیا گیا ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی مذہبی اور اخلاقی بے راہ روی شاعری میں

بار نہیں پا سکی۔

پنجابی ادب کی ایک بنیادی خصوصیت ایک مربوط معاشرے کی عکاسی ہے۔ تمام تشبیہات اور استعارات مقامی زندگی اور مشاغل سے مستعار ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ادب عوام کے ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ رہا ہے۔ وارث شاہ، بلّھے شاہ، حامد شاہ اور نجابت کوی اپنے اپنے معاشرے کی جامع تصویر پیش کرتے ہیں۔

پنجابی میں جن اصناف سخن کا بکثرت استعمال ہوا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) سی حرفی: پرانے شاعروں کا اکثر کلام اسی صنف میں ملتا ہے۔ اس میں الف سے ی تک ایک ایک حرف سے شروع کر کے مصرعے یا بند لکھے جاتے ہیں، جو عموماً بحر طویل میں ہوتے ہیں۔ سی حرفیوں میں عشقیہ اور متصوفانہ دونوں قسم کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ علی حیدر، غلام رسول، ہدایت اللہ اور عشق لہر کی سی حرفیاں قابل ذکر ہیں۔

(۲) کافی: یہ تین تین چار چار مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور آخری مصرع بار بار آتا ہے۔ یہ گانے کے لیے لکھی جاتی ہے اور عارفانہ شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ شاہ حسین اور بلّھے شاہ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔

(۳) طویل رومانوی نظمیں: یہ صنف مثنوی سے مختلف ہے اور اس کی بحر بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس میں محض ایک واقعے یا داستان کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اپنے دور کے معاشرتی اور تمدنی حالات کی بھی مکمل ترجمانی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پیلو اور حافظ برخوردار کی مرزا صاحباں؛ مقبل اور وارث شاہ کی ہیر؛ ہاشم کی سسی پنوں؛ [عبدالحکیم بہاولپوری اور] مولوی غلام رسول کی احسن القصص؛ فضل شاہ کی سوہنی مہینوال اور لیلٰی مجنوں [اور مولوی لطف علی بہاولپوری] اور میاں محمد بخش کی سیف الملوک کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) جنگ نامہ: وہ نظم جس میں لڑائی کے واقعات درج ہوں، خاص طور پر جس کا موضوع واقعۂ کربلا ہو۔ [اس سلسلے میں جنگ نامۂ مقبل؛ جنگ نامۂ حامد؛ مولوی محمد اعظم: جنگ نامۂ حضرت علیؓ اور احمد یار: جنگ بدو وغیرہ مشہور ہیں]۔

(۵) وار: ایک رزمیہ نظم، جس میں اہل پنجاب کی بہادری کے واقعات اور جنگ کے حالات بڑے ولولہ انگیز ڈرامائی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں، مثلاً نجابت: نادر شاہ دی وار؛ پیر محمد: چٹھیاں دی وار اور شاہ محمد: سکھاں دی وار۔

(۶) گلزار: اس میں جنگ ناموں کی طرز پر انبیائے کرام کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ محمد مسلم اور عبدالستار کی گلزاریں مشہور ہیں۔

(۷) بارہ ماہے، اٹھوارے، ست وارے: اس میں عاشق اپنے محبوب کے فراق میں سال کے بارہ مہینوں یا ہفتے کے آٹھ یا سات دنوں کی کیفیت ہر مہینے یا ہر دن کا نام لے لے کر بیان کرتا ہے اس صنف کے مشہور شاعر بلّھے شاہ، فرد فقیر، میاں ہدایت اللہ اور غلام حسین کیلیانوالہ ہیں۔

(۸) نور نامہ: اس میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت با سعادت یا حضورؐ سے متعلق مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔ الٰہی بخش اور دولت علی کے نورنامے مشہور ہیں۔

(۹) شلوک: ہیئت کے اعتبار سے یہ بیت یا شعر ہیں، جن میں درویشانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً بابا نانک اور فرید ثانی کے شلوک۔

(۱۰) چرخہ نامہ: اس میں شاعر تصوف کے رنگ میں اپنی مثال چرخے سے دیتا ہے اور کاتے ہوئے سوت کو اعمال حسنہ سے تشبیہ دیتا ہے۔

عبدالستار، مولوی اکبر اور عبدالعزیز واحد کے چرخه نامے اهم هیں۔

(۱۱) اشتر نامه : اس میں شاعر اپنے آپ کو اونٹ کی طرح بردبار تصوّر کر کے عشق کی تکالیف کا ذکر کرتا ہے۔ سلطان باهو، [شاه مراد] اور شاه شرف بٹالوی کے اشتر نامے قابل مطالعه هیں۔

ان کے علاوه ''چوهڑی نامه'' میں شاعر اپنے آپ کو بهنگن اور ''جوگی نامه'' میں جوگن یا جوگی تصوّر کر کے عجز و انکسار کے ساتھ محبوب حقیقی سے وصال کی درخواست کرتا ہے۔ ''معراج نامه'' کا موضوع حضور پاکؐ کا واقعۂ معراج هوتا ہے۔ ''جنڈڑی'' میں شاعر اپنی جان کو ایک اجنبی مسافر قرار دیتے هوے اسے اعمال حسنه کی ترغیب دیتا ہے۔

پنجابی ادب کے ادوار : موهن سنگھ دیوانه نے *A History of Panjabi Literature* میں پنجابی ادب کے پانچ ادوار متعیّن کیے هیں : (۱) دورِ قبل از نانک؛ (۲) دورِ نانک؛ (۳) دورِ مغلیه؛ (۴) دورِ رنجیت سنگھ اور (۵) برطانوی دور۔ اپنی ایک اور کتاب *An Introduction to Panjabi Literature* میں پهلے دور کو گورکھ ناتھ یا کن پاٹے جوگیوں کا عهد یا عهد فرید؛ مغلوں کے دور کو عهد وارث شاه؛ رنجیت سنگھ کے دور کو عهد هاشم اور برطانوی دور کو عهد فقیر لکھا ہے۔ انهوں نے یه بهی خیال پیش کیا ہے که اگر ادوار کا تعیّن هیئت کے اعتبار سے کیا جائے تو یه تین ادوار بنتے هیں: (۱) راگ اور راگنی میں لکھے هوے پد اور اشلوک کا دور؛ (۲) بیت اور مثنوی کا دور اور (۳) متفرق نظم کا دور۔

۱۵۲۶ء سے پهلے کا پنجابی ادب : موهن سنگھ نے پنجابی ادب کا آغاز ناتھ جوگیوں کے عهد (۸۵۰ تا ۱۴۵۰ء) سے کیا ہے۔ ان کی راے میں قدیم پنجابی وهی اپ بهرنش ہے جو پشاچی کے نام سے مشهور ہے اور جس میں آگے چل کر عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا اضافه هو گیا۔ اس زمانے میں پنجابی ادب کی ترقی میں کچھ حصّه تو ''کن پاٹے'' جوگیوں کا ہے اور کچھ مسلمان صوفیه کا۔

جوگی شعرا میں چرپٹ ناتھ (۸۹۰ تا ۹۹۰ء)، گورکھ ناتھ (۹۴۰ تا ۱۰۳۱ء)، چورنگی ناتھ یا پورن بهگت (۹۷۰ تا ۱۰۷۰ء) اور رتن ناتھ یا حاجی بابا رتن (۱۰۰۰ تا ۱۱۲۰ء) مشهور هیں اور ان کے بعض شبد اور شلوک دستیاب هیں۔

مسعود سعد سلمان (م ۱۱۲۱ یا ۱۱۳۱ء) : روایت ہے که اس نے پنجابی میں بهی ایک دیوان مرتب کیا تها، جس میں باره ماهے اور ست وارے بهی شامل تهے۔

شیخ مسعود فرید الدین یا بابا فرید شکر گنجؒ (۱۱۷۳ تا ۱۲۶۵ء) : آپ کا کچھ کلام هندی قلمی نسخوں (بانی سنکلناں) میں ملتا ہے اور بعض شلوک گرنتھ صاحب میں بهی موجود هیں۔ [چند سال قبل مقبول الٰهی نے ان شلوکوں کا انگریزی نظم میں ترجمه کیا تها (مطبوعۂ مجلس شاه حسین، لاهور)۔ حال هی میں عبدالمجید بهٹی نے ان کا اردو نظم میں ترجمة کیا ہے]۔

خواجه امیر خسروؒ (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ء) : فارسی کے مشهور شاعر، جنهوں نے بقول سجان راے (خلاصة التواریخ) ایک پنجابی وار غازی الملک تغلق شاه اور ناصرالدین خسرو خاں کی جنگ کے بارے میں لکھی تهی۔ ان کی پنجابی پهیلیاں بهی ملتی هیں (پنجابی ادب دی مختصر تاریخ، ص ۲۴ تا ۲۸)۔

بابا فرید کے ایک هم عصر نے سسّی پنّوں کا قصه نظم کیا تها۔ ڈبلن یونیورسٹی میں قصّۂ

یوسف زلیخا کا ایک پندرھویں صدی کا مخطوطہ موجود ہے۔

گورو نانک صاحب (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء): ان کے کلام کو پنجابی کا اولین مستند کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، جو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ بابا نانک سکھ مت کے بانی تھے۔ انہوں نے لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی باتیں بتائیں اور انہیں پنجابی نظم کی صورت میں ڈھالا۔ اسی ''گوروبانی'' کو جمع کر کے آد گرنتھ مرتب کیا گیا۔ بعد ازاں سکھوں کے دوسرے گورووں [کے علاوہ ہندو سادھو سنتوں اور مسلمان صوفیوں] کا کلام بھی اس میں شامل کیا گیا۔ آخری گورو کا کلام دسم گرنتھ کے نام سے علیحدہ مرتب ہوا۔

گورو نانک کے ایک ہمعصر شیخ فریدالدین ابراہیم المعروف بہ فرید ثانی (۱۴۵۰ تا ۱۵۷۵ء) پنجابی کے صوفی شاعر تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرنتھ صاحب میں دراصل انہیں کا کلام موجود ہے۔

پنجابی ادب ۱۵۲۶ سے ۱۷۰۷ء تک: اس دور میں پنجابی کے بہت سے مقتدر شعرا ملتے ہیں، مگر نثر کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔

شاہ حسین (۱۵۳۹ تا ۱۵۹۳ء): بلند پایہ صوفی شاعر تھے۔ مست الست رہتے تھے اور طریقۂ ملامتیہ اختیار کر رکھا تھا۔ آپ کے خلفا میں سے مادھو لال سب سے مشہور ہوا۔ ہر سال باغبان پورہ (لاھور) میں ان کے مزار پر چراغاں کا میلہ منعقد ہوتا ہے، جس میں قوال ان کا کلام سناتے ہیں۔ شاہ حسین پہلے شاعر تھے جنھوں نے کافیاں لکھیں اور مختلف راگ راگنیوں کے اوزان پر انہیں ڈھالا۔ انہیں الفاظ کے انتخاب پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ کلام سادہ اور پاکیزہ ہے، جس میں بڑی تأثیر اور لطافت پائی جاتی ہے۔ مقامی تلمیحات کا استعمال نمایاں ہے، چنانچہ انہوں نے ہیر رانجھے کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ جدید دور میں نقادوں نے ان کے کلام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ کافیاں کئی بار شائع ہو چکی ہیں (طبع موہن سنگھ دیوانہ؛ طبع محمد افضل مع شرح؛ طبع مجلس شاہ حسین)۔ [عبدالمجید بھٹی نے اردو نظم میں اور] غلام یعقوب انور نے ان کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

دمودر (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء): بعض نقاد اسے ہیر رانجھے کا ہم عصر مانتے ہیں۔ ان کا قصہ پہلی بار اسی نے پنجابی میں نظم کیا۔ اس کی کہانی مقبل، وارث شاہ اور فضل شاہ سے مختلف، لیکن واقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ [تمام استعارات و تشبیہات مقامی زندگی سے مستعار ہیں اور ایک مربوط اور مکمل معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے]۔ زبان سادہ ہے اور انداز بیان راست اور بے تکلف ہے۔

پیلو (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء): اس کے مذہب کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض اسے ماجھے کا مسلمان زمیندار بتاتے ہیں، جو گورو ارجن دیو کا ہم عصر تھا اور بعض اسے ہندو لکھتے ہیں۔ مرزا صاحباں کا قصہ سب سے پہلے اسی نے لکھا۔ اس کا انداز بیان ڈرامائی ہے۔ آنے والے شعرا (مثلاً حافظ برخوردار اور احمد یار) نے اسے استاد تسلیم کیا ہے۔

سلطان باھو (۱۶۳۱ تا ۱۶۹۱ء) ان کا شمار صوفیۂ عظام میں ہوتا ہے۔ تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ کلام نہایت عمدہ اور شستہ ہے اور اس سے عشق حقیقی، حق گوئی اور راست کرداری جھلکتی ہے۔ افکار و خیالات مولانا روم سے مشابہ ہیں۔ زبان پر علاقۂ جھنگ کا اثر غالب ہے۔ ہر مصرع لفظ ''ھُو'' پر ختم ہوتا

ہے، جو خاص ان کی ایجاد ہے ۔ مدت ہوئی مجموعۂ ابیات کشمیری بازار لاہور سے شائع ہوا تھا ۔ زمانۂ حال میں باھو اکیڈیمی نے آپ کے کلام اور تعلیمات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ [مقبول الٰہی نے ان کی ابیات کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا ہے]۔

حافظ برخوردار (۱۶۶۹ء) : عالم فاضل تھے ۔ انہوں نے عوامی قصے نظم کرنے کے علاوہ فقہ و تفسیر میں کئی کتابیں لکھیں ۔ ان کے نام سے جو کتابیں ملتی ہیں ان میں مرزا صاحباں، یوسف زلیخا، سسّی پنّوں، فرائض ورثہ، جنگ نامۂ امام حسینؓ، قصیدۂ غوثیہ اور قصیدۂ بانت سعاد کے ترجمے، چرخہ نامہ اور انیس رسائل پر مشتمل انواع برخوردار قابل ذکر ہیں ۔ ان تصانیف کی روح مذہبی ہے ۔ حافظ برخوردار کو سولھویں صدی کے نصف آخر کا نمائندہ شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے فارسی اوزان کے علاوہ عربی اور فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال کیے ہیں۔

احمد گوجر : ۱۶۹۲ء میں قصۂ ہیر رانجھا لمبے بیتوں میں منظوم کیا ۔ خیال ہے کہ وارث شاہ نے اس سے اثر قبول کیا۔

اس عہد کے دیگر شعرا میں چھجو بھگت لاہوری (م ۱۶۳۲ء) نے شبد کہنے کے علاوہ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا اور ستھرا شاہ (۱۶۱۵ء) نے شلوک لکھے ۔ فقہی مسائل پر متعدد رسالے منظر عام پر آئے، مثلاً عبداللہ لاہوری : باراں انواع (بارہ رسائل پر مشتمل ہے جو ۱۶۱۶ء اور ۱۶۵۴ء کے مابین لکھے گئے)؛ ان کے مقلد درویش محمد : فرائض درویش محمد؛ دولت علی : نورنامہ (۱۶۴۴ء)؛ مولوی عبدالکریم : نجات المؤمنین (۱۶۷۵ء) اور نجات الایمان؛ عبدی (م ۱۷۰۷ء) : رسالۂ مہتدی؛ کمال الدین بھٹو کی فقہی مسائل پر مشتمل ایک کتاب (۱۷۰۰ء) اور عبدالرحمٰن منہاس : بحر المسائل (۱۷۰۲ء)؛ حکیم درویش نے رسالہ پران سکھ میں طب ہندی کی رو سے اہم امراض کا علاج بیان کیا (۱۶۵۵ء)؛ شاہ ظریف (۱۶۲۴ تا ۱۶۹۸ء) کی حضرت علیؓ کی مدح میں سی حرفی مشہور ہے؛ پیر محمد کاسبی نے جنگ نامۂ امام حسینؓ لکھا (۱۶۸۱ء) اور حافظ معز الدین نے قصیدۂ امالی کا منظوم ترجمہ کیا (۱۶۸۶ء)۔

پنجابی ادب ۱۷۰۷ سے ۱۸۴۹ء تک : اس دور میں پنجابی ادب کے اندر مزید وسعت پیدا ہوئی اور نثر کا بھی آغاز ہوا، اگرچہ اس کی حیثیت ابتدائی ہے ۔ انگریزوں نے جس طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں میں دلچسپی لی، پنجابی کی بھی گرامریں لکھیں ۔ ان میں ایک W. Carey : *A Grammar of the Panjabi Language*، ۱۸۱۲ء، ہے اور دوسری C.B. Leach : *Panjabi Grammar*، ۱۸۳۸ء ۔ [علاوہ ازیں انجیل مقدس کے تراجم بھی ہوئے]۔ مسلمان علمائے دین نے متعدد رسائل تصنیف کیے، جن میں حضور پاک صلّی اللہ علیہ و سلّم کی سوانح عمریاں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

اس دور کی شاعری کے اہم کارنامے یا تو مذہبی اور دینی نوعیت کے ہیں، یا رزمیہ نظمیں ہیں جنھیں "وار" کہا جاتا ہے ۔ مؤخرالذکر نظموں میں ان تمام لڑائیوں کا ذکر ہے جو اس دور میں لڑی گئیں ۔ اس کے علاوہ جنگ نامے اور بعض بلند پایہ منظوم عوامی قصے بھی لکھے گئے۔

اس عہد کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ شعرا حسن بیان اور غنائیت کی طرف خاص توجہ کرنے لگے ۔ فارسی کا اثر پنجابی شاعری پر گہرا ہوتا گیا اور فارسی محاورہ زبان کا جزو بن گیا ۔ مختلف مقامات کے شعرا کے کلام میں اگرچہ مقامی لب و لہجہ بھی ملتا ہے، تاہم بحیثیت مجموعی ایک باقاعدہ، یکساں اور یکرنگ اسلوب بیان ترقی کرتا

دکھائی دیتا ہے۔

یہ دور وارث شاہ کا دور ہے، جس میں پنجابی کے عظیم‌ترین شاعر وارث شاہ کے علاوہ، جنھیں علی‌الاطلاق بھی عظیم کہا جا سکتا ہے، بلّھے شاہ، علی حیدر، خواجہ فرد فقیر، ہاشم شاہ، مقبل، قادر یار، احمد یار، حامد، نجابت کوی اور [پیر محمد] وغیرہ جیسے اہم نظم گو ہو گزرے ہیں۔

سیّد بلّھے شاہ (١٦٨٠ تا ١٧٥٨ء): پنجابی کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ حصول تعلیم کے بعد انھوں نے قادری سلسلے کے ایک بزرگ عنایت شاہ شطاری کی بیعت کر کے آزادانہ روش اختیار کر لی۔ ان کے کلام میں صوفیانہ شاعری کے مختلف انداز ملتے ہیں۔ اس میں شدت احساس بھی ہے اور فکری عنصر بھی۔ حق‌گوئی، بےباکی اور راست کرداری کا دامن وہ کہیں نہیں چھوڑتے۔ عالمانہ اصطلاحات کے بجائے ان کے ہاں مخصوص پنجابی تشبیہات و استعارات کا استعمال نظر آتا ہے۔ اخلاقی رنگ ہر جگہ غالب ہے اور کلام میں جوش و تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کی کافیاں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔ پنجابی ادبی اکادمی نے کلیات بلّھے شاہ حال ہی میں شائع کی ہے [مزید تفصیلات کے لیے رکّ بہ بلّھے شاہ]۔

علی حیدر (١٦٩٠ تا ١٧٨٥ء): ان کی سی‌حرفیاں مشہور ہیں۔ اسلوب بیان مرصع ہے۔ کلام میں موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ملتانی الفاظ کی کثرت ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ و محاورات بھی خوش اسلوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ بیشتر کلام صوفیانہ ہے۔ ١٣٢٥ء میں مکمل مجموعۂ ابیات علی حیدر لاھور سے شائع ہوا تھا۔

نجابت کوی (اٹھارھویں صدی کے اوائل میں): ان کی تصنیف نادر شاہ دی وار کا شمار اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ موضوع نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ (١٧٣٩ء) ہے۔ قلم میں زور ہے اور بیان میں روانی۔ [جزئیات نگاری اپنے کمال پر ہے۔] اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوانہ روایات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

مقبل (١٧١٨ تا ١٧٤٨ء): تصانیف میں ہیر رانجھا، سی حرفی در مدح پیران پیر اور جنگ نامۂ امام حسینؓ مشہور ہیں۔ ہیر رانجھا ٹھیٹھ پنجابی میں ہے۔ وارث شاہ کی ہیر اس سے مأخوذ معلوم ہوتی ہے۔ جنگ نامہ میں پنجابی معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔

خواجہ فرد فقیر (١٧٢٠ تا ١٧٩٠ء): مجموعۂ کلام دریاے معرفت کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں کسب نامۂ بافندگاں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نظم میں ایک بافندے کی صورت میں مسائل تصوف بیان کیے گئے ہیں اور ضمناً اپنے دور کی سیاست اور معاشرت کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ فرد فقیر کی سی حرفیوں اور بارہ ماھوں کا رنگ بھی جداگانہ ہے۔ ان کی ایک اور کتاب روشن دل میں اسلامی مسائل بیان کیے گئے ہیں [اور یہ پنجابی نصاب میں ایک مدت تک شامل رہی ہے]۔

وارث شاہ: ہیر ان کی زندۂ جاوید تصنیف ہے، جو ١٧٦٦ء میں مکمل ہوئی۔ یہ قصہ شاعر کے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس نے اپنے مشاھدات و تأثرات کو کہانی کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وارث شاہ کی سی قادرالکلامی پنجابی زبان کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ ان کے پاس الفاظ کا بےپایاں ذخیرہ ہے، جسے وہ انتہائی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ بیان میں واقعیت، سوز وگداز اور جذبات کا خلوص جھلکتا ہے۔ یہ نظم موقع نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہیر وارث شاہ کو شائع کرتے وقت مرتبین کئی مقامات پر ترمیم و تنسیخ سے کام لیتے

اور بہت سے اشعار کا اضافہ کرتے رہے ہیں - پنجابی ادبی اکادمی کے مطبوعہ نسخے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل کے مطابق ہے - [یہی دعوٰی جیت سنگھ سیتل نے اپنی ہیر وارث شاہ کے دیباچے میں کیا ہے، جو انھوں نے متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے تقابلی جائزے کے بعد مرتّب کی ہے] - مزید تفصیلات کے لیے رک بہ وارث شاہ.

حامد شاہ (پیدائش ١٧٤٨ء) : ان کا جنگ نامہ مشہور ہے - زبان پر فارسیت غالب ہے اور واقعات میں صحت اور ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا.

احمد یار (١٧٦٨ تا ١٨٤٨ء) : انھوں نے ہیر رانجھا، سسی پنوں، [شاھنچی نامہ، سیف الملوک، طب احمد یار، وغیرہ وغیرہ چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں] - ان میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں - [علاوہ ازیں احمد یار پنجابی کے پہلے نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں].

قادر یار (١٨٠٢ تا ١٨٥٠ء) : مصنف پورن بھگت، ہری سنگھ نلوا، راجہ رسالو، سی حرفیاں، معراج نامہ؛ اول الذکر کتاب کا شمار پنجابی کی اہم منظومات میں ہوتا ہے.

ہاشم شاہ (-- تا ١٨٢٣) : عہد سکّھاں کے سب سے بڑے شاعر تھے - بہت سے عوامی قصے نظم کیے، جن میں سسی پنوں اور سوھنی مہینوال ممتاز ہیں - قصوں میں جزئیات نگاری سے گریز کرتے ہیں - ان کے متصوفانہ دوہڑے بہت مشہور ہیں - کلام میں جذبات کی شدت اور خیالات کی رفعت ہے - اسلوب بہت مؤثر ہے.

عبدالحکیم بہاولپوری : ١٢١٨ھ/١٨٠٣ء میں یوسف زلیخا لکھی - [فارسی کے حید عالم تھے، چنانچہ اس زبان سے بہت استفادہ کیا ہے].

[میاں لطف علی : مولوی عبدالحکیم کے ہم عصر تھے - انھوں نے سیفل نامہ (١٢٠٦ھ) تصنیف کیا، جو شگفتگی اور زور بیان کا نادر نمونہ ہے].

شاہ محمد (١٧٩٩ تا ١٨٦٢ء) : مصنف سکھاں دی وار کو پنجاب کا پہلا حماسی شاعر کہا جا سکتا ہے، جس نے حب الوطنی کو اپنا موضوع سخن بنایا اور انگریزوں کی مخالفت میں قلم اٹھایا - اندازِ بیان پُر زور ہے اور الفاظ کے صوتی اثرات سے خوب کام لیا ہے.

مولوی محمد مسلم (١٨٠٥ تا ١٨٨٠ء) : فقہی مسائل کے علاوہ ایک کتاب عجائب القصص لکھی جس میں انبیاے کرام کے حالات درج ہیں.

پنجابی ادب ١٨٤٩ء کے بعد : انگریزوں نے جب ١٨٤٩ء میں صوبۂ پنجاب کا الحاق کر لیا تو اس کے زیرِ اثر سیاسی اور معاشرتی حالات میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں - آہستہ آہستہ انگریزی زبان و ادب کو قبول عام حاصل ہوتا گیا - ادھر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان بنا دیا گیا - اس دور میں آریا سماج کے زیرِ اثر ہندوؤں نے اردو کی سخت مخالفت شروع کر دی - ردِعمل کے طور پر مسلمانوں نے اردو کو اس حد تک اپنا لیا کہ اسے اپنی قومی و ملی زبان کا درجہ دے دیا اور مقامی زبان سے ان کی دلچسپی کم سے کم ہوتی گئی - ادھر سکھوں نے، جو اس صوبے کی سیاسیات میں ہندوؤں کی ہم نوائی کرتے تھے، [سنگھ سبھا تحریک کے تحت] پنجابی کے حق میں شدّت اختیار کی - اس فضا میں اردو کے اخبارات و رسائل کثرت سے نکلے اور مسلمانان پنجاب کی جملہ تخلیقی صلاحیتیں اردو کے لیے وقف ہو گئیں - بایں ہمہ ایک سطح پر پنجابی کے لیے بھی کام ہوتا رہا - اردو مشاعروں کے طریق پر پنجابی کوی دربار منعقد ہوتے رہے اور انگریزی اور اردو ادب کے اثرات سے پنجابی بھی مستفید ہوتی رہی، ترجمے

بھی ہوئے، نئی اصناف کی سرپرستی بھی ہوئی، نثر کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سیاسی و مذہبی (مناظرانہ) موضوعات پر بھی لکھا گیا۔

تقسیم پنجاب (١٩٤٧ء) کے بعد مشرقی پنجاب پنجابی زبان و ادب کا سرکاری طور پر اہم مرکز بن گیا؛ مگر وہ سارا ادب گورمکھی رسم الخط میں ہے، جس سے مغربی پنجاب بہت کم مستفید ہے؛ تاہم مغربی پاکستان میں پنجابی زبان اور ادب کے لیے کام ہو رہا ہے ۔ پنجابی کی ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے بعض اداروں کو امداد ملتی ہے ۔ پنجابی ادبی اکادمی اور مجلس شاہ حسین، لاہور، پنجابی ادب کی اشاعت میں خاصی سرگرم ہے ۔ ١٩٧٠-١٩٧١ء سے پنجاب یونیورسٹی میں ایم ۔ اے، پنجابی، کی جماعتیں شروع ہو چکی ہیں ۔

اس دور میں دو الگ الگ روایتیں نظر آتی ہیں : شعر و شاعری کی پرانی روایت اور انگریزی اور اردو ادب کے زیر اثر ادب کی جدید روایت ۔

(الف) قدیم روایت : اس کے ممتاز نمائندوں میں مندرجۂ ذیل بہت ممتاز ہیں:

سیّد فضل شاہ (١٨٢٧ تا ١٨٩٠ء) : مصنف سوہنی مہینوال، الفاظ کی صنعت گری میں کمال رکھتے تھے ۔ صنعت تجنیس اور ایہام سے بہت کام لیتے تھے اور ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں بہت خوبی سے استعمال کرتے تھے ۔ سوہنی مہینوال کے علاوہ انھوں نے دوسرے رومانی قصے بھی نظم کیے ۔ اخلاقی اشعار کا ایک مجموعہ بھی تحفۂ فضل کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔

میاں محمد بخش (١٨٢٨ تا ١٩٠٦ء) : عربی فارسی کے عالم تھے ۔ پہلے پہل سی حرفیاں اور دوہڑے لکھے ۔ پھر کئی قصے نظم کیے، جن میں سیف الملوک کو شہرت دوام حاصل ہوئی ۔ ان کے کلام میں غیر معمولی تاثیر اور سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔

ھدایت اللہ (١٨٣٨ء تا ١٩٢٩ء) : دوہڑے، چو مصرعے، سی حرفیاں اور باراں ماھے لکھے اور ہیر وارث شاہ میں متعدد اشعار کا اضافہ کیا ۔ کلام میں پختگی، روانی اور سوز ہے اور اس پر تصوف اور مجاز کا رنگ چھایا ہوا ہے ۔

خواجہ غلام فرید (١٨٤١ تا ١٩٠١ء) : پنجابی کی صوفیانہ شاعری میں بلّھے شاہ کے بعد انھیں کا نام آتا ہے ۔ خواجہ ظاہری و باطنی علوم سے مالا مال اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور مارواڑی زبانوں پر عبور رکھتے تھے ۔ تصوف کے حقائق کو کافیوں میں ڈھالتے تھے ۔ ان کی کافیوں میں بڑی غنائیت ہے، عام لوگوں کی زندگی سے گہرا تعلق بھی جھلکتا ہے اور عشق مجازی اور عشق حقیقی کے ڈانڈے ملتے نظر آتے ہیں ۔ ان کے ہاں درد و فراق کے مضامین اکثر ملتے ہیں اور وہ صوتی کیفیات کو الفاظ کے قالب میں بڑی خوبی سے منتقل کرتے ہیں ۔ ان کا دیوان دستیاب ہے ۔

مولوی غلام رسول (١٨٤٢ تا ١٩٠٣ء) : مصنّف احسن القصص (قصۂ یوسف زلیخا) کی زبان پُرزور اور اسلوب پُرکشش ہے ۔ ان کی ایک اور قابل ذکر تصنیف داستان امیر حمزہ ہے ۔ علاوہ ازیں ان کی ''چٹھیاں'' (خصوصاً سیّد روشن علی کے نام) بہت درد انگیز اور رقت آمیز ہیں۔

محمد بوٹا گجراتی (١٨٥١ تا ١٩٣٠ء) : بہت پُر گو شاعر تھے ۔ تصانیف میں سے قصۂ مرزا صاحباں اور سی حرفی پنج گنج کو بہت مقبولیت نصیب ہوئی ۔ کلام سادہ اور پُرسوز ہے اور بلند خیالی بھی پائی جاتی ہے ۔

سر شہاب الدین (١٨٦٥ تا ١٩٤٩ء) : تقسیم ملک سے پہلے کے ایک دور میں پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور پنجابی کے مستند شاعر

تھے - دیگر منظومات کے علاوہ ان کا خاص کارنامہ مسدس حالی کا پنجابی ترجمہ ہے۔

فیروز دین شرف (۱۸۹۸ تا ۱۹۵۳ء) : مصنف سنہری کلیاں، نورانی کرناں، شرف نشانی وغیرہ - [انھوں نے قومی اور سماجی مسائل پر بہت سی نظمیں لکھنے کے علاوہ] دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

بابو کرم امرتسری (۱۸۵۳ تا ۱۹۰۹ء) : کلام کا مجموعہ گلدستۂ کرم چھپ چکا ہے - شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا - [ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اس دور کے مقبولِ عوام شاعروں میں پائی جاتی تھیں]۔

استاد گام (۱۸۶۰ تا ۱۹۳۸ء) : چو مصرعے اور نعتیں خوب لکھتے تھے۔

سائیں مولا بخش (پیدائش ۱۸۶۷ء) : بہت سی کافیوں کے علاوہ کئی قصے نظم کیے، جن میں سے ہیر رانجھا کو موھن سنگھ دیوانہ نے ہیر وارث شاہ کے برابر قرار دیا ہے۔

عشق لہر (۱۸۶۹ تا ۱۹۴۸ء) : اصل نام چراغ دین؛ بارہ ماہ، سی حرفی، سسی پنوں اور بہت سی نظمیں ان کی یادگار ہیں - کلام میں روانی، بلند خیالی اور شعریت ملتی ہے - [پچھلے دنوں ان کا مجموعۂ کلام عشق دی لہر کے نام سے مشتاق بٹ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے)۔

سوختہ امرتسری (۱۸۷۶ تا ۱۹۴۳ء) : پنجابی کے اچھے شاعر تھے - ہیر وارث شاہ میں چھے سو اشعار کا اضافہ کیا۔

مولا بخش کشتہ (۱۸۷۶ تا ۱۹۵۵ء) : مصنف دیوان کشتہ، ہیر کشتہ، وغیرہ - ان کے علاوہ پنجاب دے ہیرے اور پنجابی شاعراں دا تذکرہ، نام کی دو کتابیں بھی تالیف کی ہیں، [جن میں پنجابی شعرا کا تعارف اور نمونۂ کلام دیا گیا ہے]- کشتہ کے کلام میں شوخی اور رنگینی کے ساتھ سوز اور تڑپ بھی ہے۔

عبدالغنی وفا (پیدائش ۱۸۸۷ء) : بلند پایہ نعت گو ہیں۔

لال دین قیصر (۱۸۹۹ تا ۱۹۵۶ء) : لاہور کے مقبول شاعر اور سیاسی کارکن تھے - [سیاسی نظمیں لکھنے کی پاداش میں کئی بار جیل گئے - ۱۹۲۰ء میں] اخبار امام جاری کیا - کئی کتابیں مطبوعہ ہیں۔

فیروز سائیں عارف (۱۹۰۲ تا ۱۹۶۴ء) : مجموعۂ کلام ھاڑے شائع ہو چکا ہے۔

جوشوا فضل الدین (۱۹۰۳ء ...) : نظم و نثر پر یکساں عبور حاصل ہے - کلام میں شیرینی اور بلند خیالی ہے - [۱۹۳۵ء میں ادبی ماھنامہ پنجابی دربار جاری کیا - حال ہی میں انجیل شریف کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے]۔

استاد دامن (۱۹۰۷ء ...) : موجودہ زمانے میں پنجابی کے نامور شاعر اور ہیر کے علاوہ بہت سی منظومات اور گیتوں کے مصنف ہیں - بعض سیاسی نظمیں بھی خوب لکھی ہیں۔

اس دور میں قدیم روایت پر کاربند پنجابی کے ہندو سکھ شعرا میں بھائی ویر سنگھ، ملکھی رام، موھن سنگھ دیوانہ، کشن سنگھ عارف، سوھن سنگھ سیتل، [دیوان سنگھ اور پورن سنگھ] ممتاز ہیں۔

(ب) پنجابی ادب کی جدید روایت پر انگریزی، روسی، فرانسیسی اور اردو وغیرہ کا اثر نمایاں ہے - جدید خیالات اور نظریات کے پیش نظر انداز فکر میں نمایاں تبدیلی ہوئی - تحریک آزادی، تحریک حصول پاکستان اور جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے علاوہ عوام کے روز افزوں سیاسی و معاشی شعور کی بدولت پرانی قصہ گوئی، بیت بازی اور چومصرعہ نگاری کی جگہ قومی، ملی اور اصلاحی

...ری نے لے لی، غزل کو فروغ ہوا، ہیئت میں نت نئے تجربے ہوئے اور آزاد طرز کی نظمیں لکھی جانے لگیں - جدید دور کے اکثر پنجابی شعرا تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے - علاوہ ازیں اردو کے کئی مستند شعرا بھی پنجابی کی طرف متوجہ ہوئے؛ چنانچہ پنجابی شاعری میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عالمی ادب میں مختلف ادبی تحریکوں کی بدولت وجود میں آ رہی تھیں - اس سے ... طرف تو حقیقت پسندی سے کام لیا جانے لگا ہے اور دوسری طرف پنجابی شاعری کی دیہاتی فضا میں ایک نیا شہری رنگ بھی پیدا ہو چلا ہے - ان جدید شعرا میں معمّر لوگ بھی شامل ہیں اور نوجوان بھی - ان میں سے بعض نے قدیم خیالات کو جدید اسلوب میں ادا کرنے پر اکتفا کیا ہے اور بعض کے ہاں خیالات بھی جدید ہیں اور اسلوب بھی نیا ہے، مثلاً :

پیر فضل حسین گجراتی (۱۸۹۷ء ...) : پنجابی کے بہترین غزل گوؤں میں شمار ہوتے اور پنجابی کے حافظ کہلاتے ہیں - ڈوہنگے پینڈے اور ٹکوراں ان کے کلام کے مجموعے ہیں .

صوفی غلام مصطفٰی تبسم (۱۸۹۹ء ...) : فارسی، اردو اور پنجابی کے نغزگو شاعر ہیں - تینوں زبانوں میں ان کے کلام کا مجموعہ انجمن کے نام سے شائع ہو چکا ہے - جنگ ستمبر کے دوران میں انھوں نے بعض نہایت مقبول گیت لکھے .

فقیر محمد فقیر (۱۹۰۰ء ...) : متعدّد پنجابی کتب [صدائے فقیر، رباعیات فقیر، ہیر رانجھا، وغیرہ] کے مصنف ہیں - مہکدے پھل کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے - ان کے علاوہ وہ پنجابی ادبی اکادمی کے لیے ... کتابیں مرتب کر چکے ہیں .

عبدالمجید بھٹی (۱۹۰۲ء ...) : اردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر ہیں - دل دریا ان کے گیتوں کا مجموعہ ہے اور آکتارہ میں نظمیں بھی ہیں اور گیت اور غزلیں بھی - ان کا ایک ناول ٹھیڈا اور افسانوں کا مجموعہ دل دیاں باریاں شائع ہو چکا ہے .

حکیم شیر احمد ناصر (۱۹۰۸ء ...) : مصنف سجرا سورج، ناصر دا خمسہ، زندگی دے چار حصے، وغیرہ، کلام میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے .

محمد علی فائق (۱۹۱۲ء ...) : قرآن مجید کا منظوم پنجابی ترجمہ نورانی شعلے ختم کر چکے ہیں، لیکن ابھی ایک سپارہ طبع ہوا ہے - دوسری تصانیف میں سراپائے حبیبؐ (حلیۂ مبارک) اور پنجابی قواعد قابل ذکر ہیں.

غلام یعقوب انور (۱۹۱۵ء ...) : انگریزی، اردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں - سلطان باہو کی ابیات اور شاہ حسین اور بلّھے شاہ کی کافیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - [ان میں سے شاہ حسین کی کافیوں کا ترجمہ شائع ہو گیا ہے] .

شریف کنجاہی (۱۹۱۵ء ...) : [جگراتے کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے - اکثر نظموں کا موضوع موجودہ معاشرے کی بے انصافیاں اور چیرہ‌دستیاں ہیں - پنجابی میں تنقید بھی کرتے ہیں - تنقیدی مضامین کا مجموعہ جھاتیاں چھپ گیا ہے .

کیپٹن محمد رمضان تبسم : اردو، فارسی اور پنجابی کے صاحب دیوان ہیں - علامۂ اقبال کی پیام مشرق کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے .

صفدر میر (۱۹۲۲ء ...) : اردو میں بھی لکھا، لیکن اب اکثر پنجابی ہی میں لکھتے ہیں - [نیلے دا اسوار ایک ڈرامائی نظم ہے، جس نے پنجابی شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے - کلام

میں زندگی کے آفاقی دکھ اور ازلی مجبوری کا احساس ملتا ہے]۔

احمد راهی (۱۹۲۳ء ...) : موجودہ دور میں پنجابی کے ممتاز ترین شعرا میں سے ہیں ۔ پنجابی لوک گیتوں سے بہت متأثر ہیں اور ان کے جانے پہچانے استعاروں کی مدد سے جدید موضوعات پیش کرتے ہیں ۔ ترنجن ان کا مجموعۂ کلام ہے ۔ پنجابی فلموں کے لیے کئی مقبول گیتوں کے علاوہ کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے ہیں ۔

منیر نیازی (۱۹۲۸ء ...) : اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ۔ اردو میں متعدد مجموعوں کے علاوہ پنجابی میں بھی دو مجموعے سفر دی رات اور چار چپ چیزاں شائع ہو چکے ہیں ۔ جدید شعرا میں ان کا ایک خاص مقام ہے ۔ کلام میں شدت احساس بدرجۂ اتم ملتی ہے ۔

[انجم حسن سید (۱۹۳۴ ...) : کافیاں اور چندن رکھ دا ویہڑا دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ دو طویل نظمیں بار دی وار اور ملتان شہر دی وار بھی لکھی ہیں، جن میں اپنے ثقافتی ورثے سے عدم توجہی اور معاشرتی اقدار کی پامالی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

دوسرے جدید شعرا میں عبدالقدیر اشک (من ترنگ)، احمد ظفر (بیلے بیلے)، باقی صدیقی (کچے گھڑے)، اسمعیل متوالا (هلارے)، افضل احسن (شیشہ اک لشکارے دو)، رؤف شیخ (کرناں اور واٹاں)، سلیم کاشر (تتیاں چھانواں)، ڈاکٹر رشید انور (منزلاں)، بشیر منذر (کلا رکھ)، ماجد صدیقی (وتھاں ناپدے هتھ اور سوهاں لیندی اکھ)، نذیر چودھری (چانن دا کھڑکار)، الطاف قریشی (اکھیاں دے پرچھانویں)، سلیم الرحمن (آون والے)، مشتاق باسط (سپنی دا ڈنگیا)، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن شعرا کا کلام ادبی جرائد میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے ان میں قیوم نظر، اکبر لاهوری، جانباز جتوئی، رضا همدانی، جوهر میر، طالب جالندهری، افضل پرویز، منو بھائی، ظفر اقبال، نور کاشمیری، شفقت تنویر مرزا، عبدالحمید امر، سلطان محمود آشفتہ، سعید جعفری، احمد سلیم، سعیدہ تصدق ہاشمی، رضیہ ناهید، نجمہ اقبال، رشیدہ سلیم سیمیں اور امّ لیلٰی سیما کے نام لیے جا سکتے ہیں] ۔

مشرقی پنجاب کے شعرا میں دیوان سنگھ (۱۸۹۴ تا ۱۹۴۴ء) نے پنجابی میں آزاد شاعری کو رواج دینے میں بڑا حصہ لیا ۔ مجموعۂ کلام وگدے پانی ہے ۔ امرتا پریتم (۱۹۱۵ء ...) مشرقی پنجاب کے جدید شعرا میں بہت مقبول و ممتاز ہیں ۔ لہراں (۱۹۳۵ء) کے بعد ان کی کئی اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ گوپال سنگھ دردی (۱۹۱۷ء ...) کے کلام میں فلسفیانہ حقائق ملتے ہیں]۔

پنجابی شاعری کے بعض نقاد پوٹھوهاری اور سرائیکی (یا ملتانی یا بہاول پوری) کو پنجابی سے علیحدہ زبانیں قرار دینے پر زور دیتے ہیں، لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے بنیادی طور پر ان میں صرف مقامی لب و لہجے کا فرق ہے ورنہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی زبان ہے ۔

سرائیکی کے ممتاز ترین شاعر خواجہ فرید اور یوسف زلیخا کے مصنف عبدالحکیم کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ الٰہی بخش کا نورنامہ پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ میاں نوروز اور لطف اللہ بہاول پور کے اور میاں بخش ملتان کے صوفی شاعر تھے ۔ استاد گلموں خاں بہاولپوری (۱۸۶۰ تا ۱۹۱۶ء) نے پنجابی غزل کی ابتدا کی ۔ جدید شعرا میں شیر افضل جعفری قابل ذکر ہیں ۔

پوٹھوهاری میں، جو ضلع راولپنڈی اور اس کے

نواحی علاقے میں بولی جاتی ہے، سر فہرست پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی (م ۱۹۳۷ء) کا نام آتا ہے، جن کی نہایت درد بھری نعتوں کا مجموعہ پنج گنج عرفان چھپ چکا ہے ۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں احمد علی سائیاں (م ۱۹۲۹ء)، میاں قائم دین، سائیں وارث اور محمد حسین آور غیر مسلم شعرا میں هیرا سنگھ درد، ایشر سنگھ، ودھاوا سنگھ تیر اور موهن سنگھ ماهر کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ جدید دور میں کرم حیدری، افضل پرویز اور باقی صدیقی کا شمار پنجابی کے ممتاز شعرا میں هوتا ہے ۔

نثری ادب : اس دور میں پنجابی نثر کو بھی ترقی هوئی ۔ سب سے زیادہ توجه افسانه، ناول اور ڈراما کی طرف هوئی ۔

پنجابی ناول کا آغاز بھائی وِیر سنگھ (۱۸۷۲ تا ۱۹۵۷ء) نے کیا ۔ ان کے ناول مذهبی اور تاریخی نوعیت کے بھی هیں اور اصلاحی بھی ۔ چرن سنگھ شہید (۱۸۹۳ تا ۱۹۳۵ء) نے نیم تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے ۔ ماسٹر تارا سنگھ اور نرندر سنگھ نے اپنے ناولوں میں سکھوں کو قومی بیداری کا سبق دیا ۔ نانک سنگھ نے صرف سکھ معاشرے هی کو نہیں بلکه پوری سماج کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ۔ جوشوا فضل دین اس دور کے ناول نگاروں میں سب سے زیادہ ممتاز هیں ۔ پربھا، برکتے اور منڈے دا مُل ان کے مقبول ناول هیں ۔ میراں بخش منهاس کو پنجابی کا پہلا مسلمان ناول نویس کہا جا سکتا ہے، جن کے ناول جٹ دی کرتوت عرف نواب خاں میں دیہاتی زندگی کی جھلک ملتی ہے ۔ سنت سنگھ سکھوں (لہو مٹی) کے هاں حقیقت نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے هیں ۔ سریندر سنگھ نرولا (پیو پتّر، لو ۔ دشمن) اور کرتار سنگھ دگل (آندراں، توںہه تے ماس) کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے ۔ جدید ترین دور میں جسونت سنگھ کنول (پالی، پورن ماشی)، نریندر پال سنگھ (ملاح، امن دے راہ) اور امرتا پریتم (اعلنا، بلاوا) قابل ذکر هیں ۔ پاکستان کے پنجابی ناول نگاروں میں عبدالمجید بھٹی کا ٹھیڈا شہری زندگی کی اور افضل احسن کا دیواتے دریا دیہاتی زندگی کی عمده اور دلکش تصویر پیش کرتا ہے ۔ سلیم خاں گمی کا ساهنجھ اور منظور انور قریشی کا بولدے پتھر بھی معیاری ناول هیں۔

پنجابی ڈرامے کی ابتدا مذهبی ناٹکوں (رام لیلا، کرشن لیلا وغیره) سے هوئی ۔ بھائی ویر سنگھ کے راجا لکھ داتا کو پہلا ڈراما کہا جا سکتا ہے ۔ جدید ڈرامے کا آغاز ایشور چندر نندا نے کیا؛ سبھدرا ان کا ممتاز ڈراما ہے ۔ ڈراموں کے قابل ذکر مجموعے مندرجۀ ذیل هیں : بھارتی پنجاب سے : سنت سنگھ سکھوں : چھ گھر؛ سردار گور بخش سنگھ : پریم مکٹ اور پورب پچھم؛ [بلونت گارگی: لوها کُٹ؛] چرن سنگھ: جیون لیلا اور پریتم سنگھ سفیر : پنج ناٹک [اور مغربی پاکستان سے : صوفی تبسم : دو ناٹک؛ اکرم بٹ : سجاول ۔ آج کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تقاضوں کے تحت زیاده تر ایکانکی ڈرامے لکھے جا رهے هیں ۔ مندرجۀ ذیل مجموعے شائع هو چکے هیں: سجاد حیدر: هوا دے هوکے؛ اشفاق احمد : ٹاهلی دے تھلّے؛ آغا اشرف : نمها نمها دیوا بلے اور دهرتی دیاں ریکهاں؛ فخر زماں، چڑیاں دا چنبه] ۔ ان کے علاوه بانو قدسیه، کشور نصیر، انور سجاد، سلیم خان گمّی، شفقت تنویر مرزا، شیخ اقبال اور سلطان علی کھوسٹ وغیره کے ڈرامے ریڈیو، سٹیج اور ٹیلی ویژن پر اکثر پیش کیے جاتے هیں ۔

مختصر افسانے کو سکھ ادیبوں نے ناول اور ناٹک کے بعد اپنایا ۔ پنجابی زبان کا ادب و تاریخ کے مصنف کے نزدیک رشید احمد پنجابی کے پہلے افسانه نگار هیں ۔ مشرقی پنجاب کے ممتاز

افسانہ نگاروں میں بلونت گارگی، کرتار سنگھ دگل، دیوندر ستیارتھی، سنت سنگھ سکھوں، گور بخش سنگھ، گوردیال سنگھ، اوپندر ناتھ اشک، امرتا پریتم، سریندر سنگھ نرولا اور گورمکھ سنگھ مسافر، وغیرہ کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

[ماہنامۂ سارنگ اور پنجابی دربار کی اشاعت کے ساتھ ساتھ جوشوا فضل الدین، اظہر حیدر اور فضل شاہ وغیرہ نے فارسی رسم الخط میں پنجابی افسانے لکھنے کا آغاز کیا ۔ ان میں سے جوشوا فضل الدین کا مجموعہ ادبی افسانے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا ۔ تقسیم پنجاب (١٩٤٧ء) کے بعد پنجابی کے متعدد ماہنامے جاری ہوے، مثلاً پنج دریا، پنجابی ادب، لہراں، حق اللہ، وغیرہ اور بعض روزناموں (مثلاً امروز) اور اکثر کالجوں کے رسائل میں چند صفحات پنجابی کے لیے مخصوص رکھے جانے لگے تو پاکستان میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی ۔ اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: نواز : ڈونگھیاں شاماں؛ آغا اشرف : وا ورولے؛ رفعت : اک اوپری کڑی؛ نسیمہ اشرف علی : سکّے پتّر؛ حنیف چودھری : کچ دی گڈّی؛ انور علی : کالیاں اٹّاں کالے روڑ ۔ ان کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے، لیکن ان کے مجموعے تاحال شائع نہیں ہو سکے، ان کے نام یہ ہیں : سجاد حیدر، انور سجاد، سلیم خاں گمّی، ستنام محمود، رشیدہ سلیم سیمیں، شفقت تنویر مرزا افضل احسن، راحت نسیم ملک، محمد آصف خاں، شمس نعمان، فوزیہ نقوی، حنیف باوا، حسین شاہد، وغیرہ ۔ منتخب افسانوں کے دو مجموعے بھی شائع ہوے ہیں، یعنی دل دیاں باریاں، مرتبۂ عبدالمجید بھٹی اور اجوکی کہانی، مرتبۂ محمد آصف خاں، خالد لاہوری و شہباز ملک] ۔

جہاں تک ادب کی تاریخ و تنقید کا تعلق ہے بعض پرانے شاعروں مثلاً احمد یار (ہیر رانجھا) اور میاں محمد بخش (سیف الملوک) نے اپنے کلام میں قدیم اور معاصر شعرا کا ناقدانہ انداز میں ذکر کیا ہے، لیکن مستقل تصنیف و تالیف کا سلسلہ باوا بدھ سنگھ سے شروع ہوا ۔ ان کی گورمکھی رسم الخط میں کتابوں [ہنس جوگ (١٩١٣ء)، کوئل کو (١٩١٦ء)، بمبیہا بول] سے قطع نظر پریم کہانی فارسی رسم الخط میں شایع ہوئی ۔ [اس کے بعد مولا بخش کشتہ نے پنجاب دے ہیرے (١٩٣٢ء) شائع کی، جس میں بعد ازاں اضافے اور ترمیم کر کے پنجابی شاعراں دا تذکرہ (١٩٦٠ء) میں شائع کیا گیا ۔ اس تذکرے سے پہلے عبدالغفور قریشی کی کتاب پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ چھپ چکی تھی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر فقیر محمد فقیر : مہکدے پھل؛ شریف کنجاہی : جھاتیاں؛ قریشی احمد حسین : پنجابی تذکریاں نے اک جھات؛ نجم حسین سید : سیدھاں اور حال ہی میں حافظ عبدالحمید سرشار کی ادبی رشماں شائع ہوئی ہیں ۔ ان کے علاوہ مجلس شاہ حسین نے بنارسی داس جین کی کتاب پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر دوبارہ شائع کی ہے اور لاجونتی راما کرشنا کی انگریزی کتاب کا پنجابی ترجمہ بھی چھاپا ہے] ۔

پنجابی اخبار و جرائد کے اجرا کے ساتھ علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی مقالات لکھنے کی ابتدا ہوئی ۔ ابتدائی دور میں قاضی فضل حق، موہن سنگھ دیوانہ وغیرہ لکھا کرتے تھے ۔ پاکستان بننے پر فقیر محمد فقیر، مولانا عبدالمجید سالک، چودھری محمد افضل خاں وغیرہ نے لکھنا شروع کیا ۔ اب عبدالسلام خورشید، محمد باقر، وحید قریشی، صوفی تبسم، عین الحق فرید کوٹی، غلام یعقوب انور، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا،

محمد آصف خان، راجہ رسالو وغیرہ کے مضامین اور مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں .

مشرقی پنجاب میں تاریخ ادب کے علاوہ دوسری اصناف پر بھی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں - لکھنے والوں میں ہرنام سنگھ شان، جیت سنگھ سیتل، سریندر سنگھ کوھلی، ہربھجن سنگھ، گوپال سنگھ دردی، سریندر سنگھ نرولا، سرجیت سنگھ سیٹھی، ایس - ایس - امول، شمشیر سنگھ اشوک، وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں .

گرامر اور لغت نگاری پر ہمارے ادیبوں نے خاص توجہ نہیں کی [اور جنھوں نے کچھ کام کیا ہے (مثلاً بشیر احمد ظامی، ایس۔خانم، ارشاد پنجابی، الطاف رانا) وہ ابھی تک کسی ناشر کے منتظر ہیں]؛ البتہ اس سلسلے میں انگریزوں [اور غیر مسلموں] نے قابل قدر کام کیا ہے، مثلاً لغات میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے: (۱) Captain Starkey: *Dictionary of English and Punjabi*، ۱۸۵۳ء؛ (۲) *A Dictionary of the Punjabi Language*، طبع لدھیانہ مشن، ۱۸۵۴ء؛ [(۳) بھائی میّا سنگھ : پنجابی کوش، ۱۸۹۵ء؛ (۴) T.G. Bailey : *English Punjabi Dictionary*، ۱۹۱۹ء؛ (۵) بھائی بشن داس : پنجابی شبد بھنڈار، ۱۹۲۲ء؛ (۶) منشی جواھر سنگھ : *Anglo-Punjabi Vocabulary*، ۱۹۲۲ء؛ (۷) سالک رام : *Anglo-Punjabi Dictionary*، ۱۹۲۲ء؛ (۸) پادری ھیرز Hares : *English Punjabi Dictionary*، ۱۹۲۶ء؛ (۹) اردو پنجابی کوش، طبع شعبۂ لسانیات، پٹیالہ یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء؛ (۱۰) پنجابی - پنجابی کوش، طبع شعبۂ لسانیات، پٹیالہ یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء] - صرف و نحو کی کتابوں میں *Punjabi Grammar* کے نام سے کئی انگریزوں کی تالیفات ملتی ہیں (مثلاً کیری W. Carey (سیرام پور ۱۸۱۲ء)، لیچ C. B. Leach (۱۸۳۸ء)، نیوٹن J. Newton (لدھیانہ ۱۸۵۱ء)، ٹسڈل Tisdall (لنڈن ۱۸۸۹ء) اور گراھم بیلی (وزیر آباد ۱۹۰۴ء) - ان کے علاوہ بہاری لال (پنجابی ویا کرن، ۱۸۶۹ء)، موھن سنگھ (پنجابی ویا کرن بودھ) اور دُنی چندر (پنجابی بھاشا دا ویا کرن، مطبوعۂ چنڈی گڑھ یونیورسٹی، ۱۹۶۴ء) کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں - مقامی مصنفین میں بھی فیروز الدین فیروز ڈسکوی : قواعد پنجابی؛ محمد علی فائق : قواعد پنجابی اور بشیر احمد ظامی : نخلستان قواعد شائع ہو چکی ہیں].

پنجابی زبان میں ابھی تک سائنسی ادب کی طرف توجہ نہیں کی گئی، البتہ لوک ادب پر خاصا کام ہوا ہے - پنجابی لوک گیتوں پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں رام سرن : پنجاب دے گیت؛ [ساجد علوی : من دی موج؛ پنجابی لوک گیت، طبع پنجابی ادبی لیگ؛ نازش کاشمیری و راجہ رسالو: پنجابی دے لوک گیت؛ مہر عبدالحق : سرائیکی لوک گیت اور کرم حیدری : پوٹھوھاری لوک گیت] سر فہرست ہیں - پنجابی ضرب الامثال کے بارے میں بہت مدت پہلے کینن W. Cannon [و پادری ھیرز Hares] : *A Collection of Punjabi Proverbs* شائع ہوئی تھی - اس کے بعد مرزا سلطان بیگ : پنجابی دے اکھان [اور شہباز ملک : سو سیانا اِکو مت] شائع ہو چکی ہیں - اسی طرح برطانوی دور میں پہیلیوں کی ایک کتاب پنجابی بجھارتاں، مطبوعۂ سیٹھ آدم جی عبداللہ، بمبئی، دستیاب تھی - [اب اسی سلسلے میں ارشد میر کی کتاب بُجھ میرا بُجھکا چھپ گئی ہے].

قدیم پنجابی ادب پر مذہبی خصوصاً اسلامی رنگ غالب رہا، لیکن جدید دور میں بھی شرعیات پر کچھ کم توجہ نہیں دی گئی - اس سلسلے میں حافظ محمد لکھوی (م ۱۸۹۲ء) کا نام سب سے پہلے آتا ہے، جنھوں نے تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید

کا منظوم پنجابی ترجمہ مع تفسیر پیش کیا ۔ ان کی دوسری تصانیف انواع مولوی بارک اللہ، انواع محمدی، احوال الآخرت، زینت اسلام اور سیف السنۃ ھیں ۔ ان کے بعد مولوی حبیب اللہ (۱۹۱۳ء) اور فیروز الدین ڈسکوی نے تفسیر قرآن لکھی ۔ میاں جان نے تیسویں پارے اور مولوی نور محمد نے سورۃ الملک، غلام کبریا اور ظہور الدین اکمل نے سورۃ الرحمٰن، عبدالکریم قریشی نے سورۃ الفاتحۃ اور مولوی محمد عالم قلعداری نے سورۃ الاخلاص، سورۃ الفیل، سورۃ الکہف، سورۃ الضحی اور سورۃ الکوثر کی تفسیریں لکھیں ۔ حیات محمد واعظ (۱۸۴۳ تا ۱۹۲۳ء) نے نویں پارے تک تفسیر مکمل کی تھی کہ موت نے آلیا ۔ ان کے بعد ان کے بھتیجے محمد علی فائق نے اسے تکمیل تک پہنچایا ۔ دیگر ممتاز تصنیفات یہ ھیں : ظہور الدین اکمل : شرح کافیہ؛ مولوی محبوب عالم : ستر المومنات، ترتیب الصلوٰۃ، شرح قصیدۂ مالی، شرح خلاصۂ کیدانی؛ ھدایت نامہ و عقد نامہ اور آداب الفقرا؛ نجم الدین فائز : کتاب المناقبات؛ عبدالکریم قرشی : روح المیلاد فی ذکر المیلاد، صلح نامۂ حدیبیہ اور تاریخ فتح مکہ؛ محمد اعظم قریشی : نماز اعظم (۱۹۲۴ء)؛ نورالحسن خادم : ستر النساء (۱۹۳۶ء)؛ غلام رسول عادل گڑھی : ترجمۂ قصیدۂ غوثیہ؛ مولوی دلپذیر بھیروی : قصص المحسنین، وعظ دلپذیر، گلزار چہار یار، گلزار موسٰی، انواع دلپذیر اور ترجمۂ دیوان حافظ، وغیرہ؛ میاں محی الدین مہدی : ترجمۂ فقہ اکبر، ردّ تقلید، شرح نجات المؤمنین اور پند نامہ؛ خواجہ قمر الدین : رسالۂ روایت؛ امام الدین واعظ : حقوق الزوجین؛ محمد امین : اظہار السنن، احوال الآخرۃ، معجزۂ محمدی اور شرح اسماء الحسنٰی؛ جان محمد : وفات نامہ؛ نوری : سفر نامۂ حج؛ خان محمد : نعتیہ دیوان اور علی اکبر : چرخہ رسولی ۔ ان کے علاوہ اکبر علی قانونگو، حاتم علی ڈسکوی، میاں مصطفی، کریم بخش اور امیر علی کے جنگ نامے اور خادم حسین ھاشمی، اشرف فاروقی، عارف گجراتی، نذیر احمد اختر اور منظور احمد بٹ کے معراج نامے بھی قابل ذکر ھیں ۔

نثر میں "سکھی ادب" بہت لکھا گیا ۔ ابتدائی تحریروں میں سکھ گوروؤں کی جنم ساکھیاں، گوشٹاں (گفتگوئیں) اور پرچیاں ٹیکے (گرنتھ صاحب کے شبدوں کی تشریح) آتے ھیں ۔ گراھم بیلی نے انجیل کا اور امام دین شہباز نے زبور کا پنجابی میں ترجمہ کیا ۔ حال ھی میں جوشوا فضل الدین نے بائبل کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے ۔ عیسائی پادریوں نے پنجابی میں خاصا تبلیغی لٹریچر تیار کیا ۔ فقیر نور حسین سیالکوٹی نے بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے کو پنجابی میں منتقل کیا ۔ اسلامی ادب میں حافظ برخوردار کی بوھل نماز پہلی نثری تصنیف ملتی ہے ۔ ان کے دوسرے رسالے پکی روٹی، مکھن روٹی اور مسی روٹی تعلیم اطفال کے لیے لکھے گئے ۔ سوال و جواب کے انداز میں فقہی مسائل پر متعدد کتابیں لکھی جاتی رھیں ۔ عبدالکریم بگھیانوی کی تصنیف نجات المؤمنین کی مبسوط شرح میر سید مخدوم نے لکھی ۔ ان سے قطع نظر قرآن مجید کے نثر میں ترجمے بھی ھوے، جن میں سے [نبی بخش حلوائی]، عبداللہ چکڑالوی اور میاں محمد چٹو کے ترجمے مشہور ھیں ۔ [حال ھی میں پنجابی ادبی لیگ، لاھور نے میاں ھدایت اللہ کا ترجمہ مع متن شائع کیا ہے]۔

مآخذ : (۱) Grierson : *Linguistic Survey of India*، ج ۶ و ۹؛ (۲) R.V. Jahagirdar : *An Introduction to the Comparative Philology of Indo-Aryan Languages*، پونا ۱۹۳۲ء؛ (۳) بنارسی داس جین : *A Phonology of Panjabi and Phonetic Reader*؛ (۴) انور شبنم دل : *Studies in Pakistani Linguistics*،

لاہور ۱۹۶۵ء؛ (۵) سیّد محمد لطیف : History of the Punjab، لاہور ۱۸۸۸ء؛ (۶) تارا چند : Influence of Islam on Indian Culture؛ (۷) لاجونتی راما کرشنا : Panjabi Sufi Poets، مطبوعۂ مجلس شاہ حسین، لاہور؛ (۸) موہن سنگھ : A History of Panjabi Literature، مطبوعۂ لاہور؛ (۹) وہی مصنف : An Introduction to Panjabi Literature، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) وحید قریشی : A Survey of Panjabi Language and Literature، در Journal of the Pakistani Historical Society، اپریل ۱۹۶۷ء؛ (۱۱) نجم حسین سیّد : Recurrent Patterns in Punjabi Poetry، لاہور ۱۹۶۸ء؛ (۱۲) I. Sereleryakev: Panjabi Literature، ماسکو ۱۹۶۸ء؛ (۱۳) Pakistan Year Book 1960، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۱۴) بدھ سنگھ : پریم کہانی، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۵) موہن سنگھ : پنجابی ادب دی مختصر تاریخ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۶) مولا بخش کشتہ : پنجابی شاعراں دا تذکرہ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۷) عبدالغفور قریشی : پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۸) بنارسی داس جین : پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۹) اعجاز الحق قدوسی : تذکرۂ صوفیائے پنجاب، کراچی ۱۹۶۲ء؛ (۲۰) محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، طبع وحید قریشی، لاہور ۱۹۶۳ء - دیگر مآخذ کے لیے دیکھیے متن مقالہ.

(ادارہ [و محمد آصف خان])

⊗ پنج پیر : (= پانچ پیر).

۱ - تمہید : برصغیر پاک و ہند (شمالی) میں پانچ پیروں کا عقیدہ عام ہے - اسی سے وہ کیش بنا جسے "پانچ پیریہ" کہتے ہیں اور جس کی نہ صحیح اسلام میں کوئی جگہ ہے نہ ٹھیٹھ ہندو مت میں - بایں ہمہ ان دونوں مذاہب کے پیرو اس کیش میں شامل ہیں - اور یہ عقیدہ خاصے وسیع پیمانے پر مروج ہے - ان پڑھ مسلمانوں کو ان سے بڑی ارادت ہے اور نیچ ذات ہندوؤں میں بھی ان کی عبادت کا مخفی طریق رائج ہے.

"پانچ پیری" کیش یا عقیدۂ پنج پیریہ اس پنجکڑی کے کسی ایک پیر سے ارادت پر مبنی نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی سب پر اعتقاد سے عبارت ہے - اگرچہ اس پنجکڑی کے ہر پیر کی اپنی اپنی مخفی روحانی قوتیں ہیں، لیکن اسے معیّن طرر پر پنجکڑی کے ارکان میں شامل کرتے ہی اس کی یہ قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، کیونکہ پنجکڑی سے متعدّد قوتیں مخصوص تصوّر کی جاتی ہیں؛ ان میں سے اکثر کسی انفرادی نوعیت کی حامل نہیں بلکہ مل کر یہ قوتیں حاصل ہوتی ہیں.

۲ - تشریح مصطلحات : بنگال، بہار اور صوبجات متحدّہ (موجودہ اتر پردیش) میں تو یہ پنجکڑی "پانچ پیر" کے نام سے مشہور ہے اور پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) میں "پنج پیر" ہے - یہ ترکیب دو لفظوں سے بنی ہے - پہلا لفظ "پانچ" یا "پنج" ہے اور دوسرا "پیر" - اوّل الذکر تو صاف ظاہر ہے کہ آریائی لفظ "پنچ" کی صوتی تصریف ہے - "پنچ" آج بھی سنسکرت زبان میں محفوظ ہے، جو آریاؤں کی زبان کی ہندی شاخ ہے - پھر اگر "پنج" کو فارسی ہی کا لفظ قرار دیا جائے تو اس کا اصل آریائی زبان کی ہندی شاخ سے مشتق ہونا خارج از امکان نہیں سمجھا جا سکتا.

"پانچ پیر" یا "پنج پیر" کی ترکیب غالباً ہندی مسلمانوں ہی کی وضع کردہ ہے تاکہ "پنج تن" کے عقیدے کے مماثل، جو ایران اور ہندوستان میں رائج ہے، اپنی ایک پنجکڑی قائم کر سکیں؛ چنانچہ انھوں نے لفظ "تن" کو "پیر" سے بدل دیا - معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) نے چونکہ ایرانی اسلامی ثقافت کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ

قوی اثرات خاصے طویل عرصے تک قبول کیے، لہٰذا ان کے یہاں اصوات کا نشو و نما جس طرح ہوا اس میں انھوں نے آریائی پانچ یا پنچ کی ایرانی شکل کو برقرار رکھا ۔ یہی بات بعینہٖ ہمیں لفظ پنجاب میں نظر آتی ہے، جو الفاظ ”پَنْج“ (پانچ) اور ”آب“ (پانی) کا مجموعہ ہے اور جس کے معنی ہیں پانچ دریاؤں کی سر زمین.

دوسرا لفظ ”پیر“ فارسی ہے اور ”پنج پیر“ اور ”پانچ پیر“ دونوں تراکیب میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس لفظ کے اولیں معنی اگرچہ ”بوڑھے“ یا ”بوڑھے آدمی“ کے ہیں، تاہم ثانوی طور پر اس سے ”مقدّس انسان“ یا ”ولی اللہ“ بھی مراد لے لیا جاتا ہے؛ چنانچہ ہم اس کا مقابلہ پالی لفظ ”تھیرا“، بمعنی ”بوڑھا آدمی“، سے کریں تو غیر مناسب نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ پالی لفظ سنسکرت لفظ ”ستھَوِیر“ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ”بوڑھا“، ”معمر آدمی“؛ لہٰذا ممکن ہے فارسی لفظ ”پیر“ اصل میں سنسکرت لفظ ستھَوِیر ہی سے مأخوذ ہو، پھر اصل سنسکرت لفظ میں صوتی تغیر کے باعث اس کے معنی بھی بدل گئے ہوں، کیونکہ پرانے لوگوں کا یہ عام خیال تھا کہ عُمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسان کی دانائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس لیے اس قسم کے انسان کے جسم کو حنوط کر کے مقبرے میں محفوظ کر لینا ضروری ہے، تا کہ موقع پڑنے پر ان سے مشورہ اور برکت حاصل کی جا سکے ۔ اس طرح ان بُدھ یادگاروں کی ابتدا ہوئی جنھیں ”چَیْتْیَہ“ کہا جاتا ہے اور جو ”تھیروں“ کے مقبروں پر بنائی گئیں اور یونہیں مسلمانوں کے یہاں پیروں کے مزاروں پر مقبرہ سازی کا آغاز ہوا.

۳ - پنج پیریہ کے ارکان خمسہ : پنج پیری کیش کے ارکان خمسہ کی ٹھیک ٹھیک تعیین دشوار سی بات ہے، اس لیے کہ ان پیروں کی فہرست اپنے معتقدین کے مختلف حلقوں میں مختلف ملتی ہے؛ یہی حال ان مقامات کا ہے جہاں انھیں مقبولیت حاصل ہے اور ان کے پیرو رہتے بستے ہیں.

پنجاب میں بعض اوقات یہ پنجکڑی خواجہ قطب الدینؒ (۱۱۳۲ - ۱۲۳۶ء)؛ خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری (۱۱۴۲ - ۱۲۳۵ء)، شیخ نظام الدینؒ اولیا دہلوی (۱۲۳۶ - ۱۳۲۵ء)، نصیر الدینؒ ابوالخیر (م ۱۳۵۶ء) اور سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۹ - ۱۲۶۶ء) پر مشتمل تصور کی جاتی ہے، لیکن ان کی ایک اور فہرست بھی ملتی ہے جو حسبِ ذیل ہے : بہاء الدین زکریاؒ ملتانی (۱۱۶۹ - ۱۲۶۶ء)، شاہ رُقعۂ عالمؒ حضرت لکھنوی، شاہ شمس تبریزؒ ملتانی (م ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء)، اُچ کے شیخ جلال مخدومؒ جہانیاں جہاں گشت (۱۳۰۷ - ۱۳۸۴ء) اور پاکپٹن کے بابا شیخ فرید الدینؒ شکر گنج (۱۱۷۶ - ۱۲۶۹ء) (*ERE*، طبع J. Hastings، ۱۹۱۷ء، ۹ : ۶۰۰).

ان دو فہرستوں کے علاوہ پنجاب میں پانچ پیروں کی اور بھی فہرستیں ہیں، جن میں نہ صرف ایسے مشہور مشائخ کے نام ملتے ہیں جن کی شخصیت تاریخی ہے اور جن کا مثلاً اوپر ذکر آ چکا ہے، بلکہ سخی سرور سلطان اور غازی میاں وغیرہ جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں.

سخی سرور کی شخصیّت کے متعلق ایسی حکایتیں مشہور ہیں جو افسانوی معلوم ہوتی ہیں۔ وادی سندھ میں پیر مذکور کو جس مقام سے نسبت دی جاتی ہے اس کا نام بھی اس کے نام پر سخی سرور رکھا گیا ہے، جو گویا اس سر زمین کے قدیم مذہب اور اس کی زرخیزی کا مرکز ہے اور

فرقۂ سلطانی کے لیے ایک زیارت گاہ ہے (دیکھیے H. A. Rose کا مقالہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے بارے میں، در ERE، ۹، ۱۹۱۷ء: ۶۰۳ بعد).

البتّہ غازی میاں کی شخصیت، جو زیادہ تر سالار مسعود غازی کے نام سے مشہور ہیں اور جنھوں نے شمالی ہند میں تقریباً ایک افسانوی حیثیت اختیار کر رکھی ہے، ایک تاریخی ہستی ہیں - ہندوستان میں ان کے کارناموں کا بیان مرآۃ المسعودی میں ملے گا، اس میں لکھا ہے کہ محمود غزنوی (۹۹۸ تا ۱۰۳۰ء) نے اپنے بھتیجے سالار مسعود غازی کو مشرقی علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا، جہاں سے ہندو کثیر تعداد میں پنجاب میں غزنوی عساکر پر حملہ کرنے کے لیے بڑھے آ رہے تھے - مسعود غازی نے ہندوؤں کے خلاف بڑے زور کی لڑائی جاری رکھی اور گنگا کا سارا میدان فتح کر لیا، گو آگے چل کر ۱۰۳۴ء میں وہ اودھ میں بھڑائچ کے قریب شہید ہو گئے (بحوالۂ اقتباس مندرجہ در Dowson and Elliot : *History of India*، لنڈن ۱۸۶۹ء، ۲: ۵۱۳ بعد) - کہا جاتا ہے کہ غازی موصوف نے اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں سترکھ کے مقام پر شہادت پائی (نیز دیکھیے ابن بطوطہ : عجائب الاسفار (اردو ترجمۂ خلیفہ محمد حسین، بذیل حواشی)، جہاں ہر سال مارچ کے مہینے میں ان کی عقیدت میں ایک بڑا میلا لگتا ہے اور بعض دوسرے مقامات پر بھی اسی قسم کی تقریبات منائی جاتی ہیں، مثلاً صوبجات متحدہ کے مقامات گورکھ پور اور بھادوہی ضلع میرزا پور، جہاں سنگ یادگار بھی نصب کیے ہوے ہیں (ERE، طبع Hastings، ۹، ۱۹۱۷ء : ۶۰۱).

شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) کے علاقۂ یوسف زئی میں ایک پہاڑی ہے، جسے "پنج پیر" کہتے ہیں - یہ پہاڑی سطح سمندر سے تقریباً ۲۱۴۰ فٹ بلند ہے اور اس کی چوٹی اس کے دامن سے کوئی ۹۴۰ فٹ اونچی ہے - اس چوٹی پر پنج پیر کی زیارت ہے، جو ایک معمولی سے مکان پر مشتمل ہے - پنج پیر کی اس زیارت ہی کی وجہ سے اس پہاڑی کا نام بھی پنج پیر رکھا گیا تھا - یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مرجع عقیدت ہے - ان پانچ پیروں میں بہاءالدین زکریا ملتانی (۱۱۶۹ تا ۱۲۶۰ء) کا نام سر فہرست ہے، لیکن مقامی ہندوؤں کا خیال یہ ہے کہ اس پہاڑی کا پرانا نام "پنج پانڈو" ہے، اس لیے کہ اسے زمانۂ قدیم ہی سے پانچ پانڈووں سے نسبت چلی آ رہی ہے - اسلامی فتح کے بعد اس پہاڑی کو پانچ پیروں کا مسکن ٹھیرایا گیا اور یوں اس کا نام پنج پیر ہوا (وشوَ کوش، مطبوعۂ کلکتہ، ۱۰ : ۵۹۹) - ضلع ہزارہ (مغربی پاکستان) کے شہر ایبٹ آباد میں بھی ایک تکیہ "پنج پیر" کے نام سے منسوب ہے.

"صوبجات متحدہ (= یو - پی، بھارت) میں مجموعۂ (پنج پیر) کے ارکان میں نسبۃً بہت کم درجے کی ہستیاں شامل ہیں - ایک فہرست غازی میاں، امینہ ستی، ہیرون، بڈھنا اور ہندے کے ناموں پر مشتمل ہے - امینہ ستی ہو گئی تھی یعنی وفا شعار بیوی تھی، جو اپنے خاوند کی چتا پر جل کر مر گئی - آخری وہ تین ارواح بد ہیں، جن میں خدائی صفات پیدا کر لی گئی ہیں اور جنھیں نیچ جاتیاں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں (ERE، طبع Hastings، ۹، ۱۹۱۷ء : ۶۰۰) - ان فہرستوں کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان سب میں سر فہرست غازی میاںؒ یا سالار مسعودؒ کا نام ہوتا ہے اور ان کے بعد چار دوسرے مقامی پیروں کا، خواہ ان کی شخصیت تاریخی ہو یا غیر تاریخی، مثلاً مکن پور کے شاہ مدار، گیا کے

سلطان شہیدؒ، اور شیخ سدوؒ وغیرہ۔ شاہ مدارؒ کوئی افسانوی بزرگ نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ان کا پورا نام ہے بدیع الدین شاہ مدارؒ (م ۱۴۳۶ء) اور گجرات، اجمیر، قنوج، کالپی، جونپور، لکھنؤ، کنتور اور بنگال میں ان کی تبلیغ اسلام کی روداد بھی ملتی ہے (مرآۃ المداری، تذکرۂ صوفیہ کا ایک مخطوطہ، عدد ۸۸، بوھار Buhar لائبریری، کلکتہ)۔

بہار، مغربی بنگال اور بالخصوص پیر بھوم، بنکورا اور بردوان کے ضلعوں میں، جو بہار سے ملحق ہیں، پانچ پیری فہرستوں کی تقریباً یہی کیفیت ہے۔ یہاں اس پنجکڑی میں بڑے معروف پیر اور بعض افسانوی شخصیتیں بھی شامل ہیں، مثلاً غازی میاں، پیر بدر، زندہ غازی، شیخ فرید اور خواجہ خضر بلکہ شیخ سدو بھی۔ گو ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیے تو یہ نام بھی بدل جائیں گے، بایں ہمہ پانچ پیروں سے نہ صرف بعض مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں سے کلوروں، حلوائیوں، تیلیوں اور بھوئیوں اور بہار کی متعدد جاتیوں کو عقیدت ہے (*Census of India*، ۱۹۰۱ء، ج ۶، باب ۴: ص ۱۸۰، طبع E.A. Gait)۔

جہاں تک مغربی اور شمالی بنگال کا تعلق ہے پانچ پیروں کی ان فہرستوں میں اسمٰعیل غازی کے نام کا اضافہ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے شمالی بنگال اور کامروپ کے ہندو راجاؤں سے جنگ کی، ان پر فتح پائی اور پھر اس سارے علاقے میں اسلام کی تبلیغ کی۔ انھیں سلطان باربک شاہ (۱۴۵۹ تا ۱۴۷۴ء) نے ۱۴۷۴ء میں قتل کر دیا تھا۔ ضلع رنگ پور میں کانتا دوار کے مقام پر ان کی درگاہ مشہور ہے، اور اسے ہندو اور مسلمان دونوں احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں (دیکھیے *Notes on Shah Ismail Ghazi*، در *JSAB*، ۴۳، ۱۸۷۴ء: ۲۱۵ ببعد)۔

مشرقی پاکستان میں تقریباً نصف صدی پہلے تک غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نیچ ذات کے ہندوؤں پر پانچ پیروں کا اثر نہایت گہرا تھا، جس کا ثبوت ملک میں جگہ جگہ پانچ پیری درگاہوں سے ملتا ہے۔ لوگ اب بھی ان درگاہوں کی زیارت کرتے اور منت پوری ہونے پر شیرینی چڑھاتے ہیں۔ ایسی دو درگاہیں بالخصوص اہم ہیں۔ ایک ڈھاکے کے قریب سنار گاؤں میں ہے اور دوسری تالورا میں، جو (ضلع) بوگرا میں ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ قبل ازیں تالورا میں پانچ پیروں کے اعزاز میں ہر سال ایک مداری میلا لگتا تھا، اب اس نے ایک سالانہ عرس کی شکل اختیار کر لی ہے (قاضی محمد مست: *Bagndār Itikāhini*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۸۵)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پانچ پیروں کی اس جماعت کی سربراہی شاہ مدار کے حصے میں آئی تھی۔

مشرقی پاکستان میں چونکہ دریاؤں اور پانی کی فراوانی ہے، للھذا قدرتی امر ہے کہ اس صوبے کے ملاح اور کشتی ران اس پیر سے برکت کے جویا ہوں جس کا تعلق پانی سے ہے، چنانچہ بدر کو بھی جنھیں چاٹ گام اور اس کے نواحی ضلعوں کے ملاحوں اور کشتی رانوں کے محافظ ولی کی حیثیت حاصل ہے، "پانچ پیری" فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی بڑے دریا کو عبور کرنا ہو یا سمندر کا کوئی سفر در پیش ہو تو اس علاقے کے مسلمان کشتی ران اب بھی ایک عوامی دعا مانگتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

"اللہ، نبی، پنج پیر، بدر بدر، بدر"، جس کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ، ہم تجھے پکارتے ہیں کہ تو ہم پر رحم کرے اور تیرے رسول کو کہ ہمیں برکت دے اور اے پانچ پیرو ہم آپ سب کو پکارتے، بالخصوص آپ کے سردار بدر ہیں

دو کہ ہماری حفاظت کریں"

مشرقی پاکستان کے مسلمان کشتی رانوں کے یہاں اس پنجکڑی کی متعدّد فہرستیں ہیں ۔ ایک فہرست یوں ہے : شاہ بدر، شاہ سلطان، شاہ جلال، شاہ محسن اور شیخ فرید ۔ بعض اوقات شاہ محسن کی جگہ شاہ پیر کو دے دی جاتی ہے ۔ یہ سب پیر تاریخی شخصیتیں ہیں اور مشرقی پاکستان میں ان کی درگاہیں یا ''استھان'' موجود ہیں : بدر شاہ کی (جو ۱۲۳۶ - ۱۳۵۲ء میں زندہ تھے) درگاہ بخشی بازار چاٹ گام شہر میں واقع ہے، شاہ سلطان، یا سلطان بایزید بسطامی (م ۸۷۴ء) کا فرضی مقبرہ نصیر آباد چاٹ گام میں ہے؛ شاہ جلال (م ۱۳۴۶ء) کی درگاہ سلہٹ میں؛ شاہ محسن (م ۱۳۹۷ء) کی درگاہ بٹ ٹالی Bat-tali تھانہ انورا، چاٹ گام میں؛ شیخ فرید (۱۱۷۶ - ۱۲۶۹ء) کی ''چشمہ'' سلوک بحر (جو اب بدل کر شولا شہر ہوگیا ہے) چاٹ گام میں اور ان کا فرضی مقبرہ فرید پور میں ہے ۔ شاہ پیر کی مشہور درگاہ ست کنیا، چاٹ گام میں ہے (ایم - ای - حق : بنگے صوفی پربھوا، کلکتہ ۱۹۵۵ء، ص ۳۴۱ بعد) ۔

ایسے ہی جب کبھی دریا یا سمندر کے راستے کوئی خطرناک یا طویل سفر در پیش ہو تو میمن سنگھ اور ڈھاکے کے ہندو اور مسلمان کشتی ران اب بھی غازی میاں اور پانچ پیروں سے اظہار ارادت کے لیے ایک عوامی وظیفہ پڑھتے ہیں جو ذیل میں درج ہے، تا کہ اس سفر میں آنے والی مصیبت کا سدّ باب ہو جائے :

امرا اچھی پولا پین
غازی آچھے نِکابان
شی رے گنگا دریا
پنچ پیر ! بدر، بدر، بدر؛
ہم تو بچے ہیں،
لیکن غازی (پیر) ہمارے نگہبان ہیں،
ہمارے سامنے گنگا دریا ہے ۔
پانچ پیرو! ہم آپ سب کو پکارتے ہیں،
بالخصوص آپ کے سردار (پیروں کے پیر) بدر کو ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس پنجکڑی میں، جس میں پیر بدر کا نام سر فہرست ہے، غازی میاں کا نام ایک افسانہ ہے، گو انہیں از راہِ ادب اس سے الگ رکھ لیا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کشتی رانوں کے محافظ ہیں اور انہیں وہ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں ۔

سنار گاؤں میں (جہاں کبھی مشرقی بنگال کا پرانا دارالسلطنت آباد تھا)، جو ایک موضع ہے اور جو نرائن گنج اور ڈھاکے سے کچھ زیادہ دور نہیں، ایک درگاہ ہے، جس کی قریب و دور کے دیہات کے رہنے والے کشتی ران بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں؛ یہاں پانچ پیروں کی ایک نئی فہرست ملتی ہے ۔ یہ درگاہ پہلو بہ پہلو بنے ہوے پانچ ٹوٹے پھوٹے لمبے قبوں پر مشتمل ہے، جن میں کہا جاتا ہے کہ پانچ پیر یعنی شاہ سکندر، شمس الدین، غیاث الدین، غازی میاں اور غازی کالو عبادت گزاری کرتے تھے (وشوکوش *Viswakos*، ۱۱، کلکتہ : ۱۹۰۹) ۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس فہرست کے پہلے تین پیر وہ ہیں جو بنگال کے پہلے تین خود مختار سلطان تھے، جنھوں نے یکے بعد دیگرے یہاں حکومت کی، صراحت حسب ذیل ہے :

۱ ۔ شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۷ء)۔
۲ ۔ سکندر شاہ (۱۳۵۷ تا ۱۳۹۳ء) ۔
۳ ۔ غیاث الدین اعظم شاہ (۱۳۹۳ تا ۱۴۱۰ء)۔

ان تینوں بادشاہوں میں پہلے دو کی شہرت کا انحصار محض ان کی شجاعت پر نہیں تھا کہ انھوں نے سلاطین دہلی کا مقابلہ بڑی جوانمردی اور بہادری

سے کیا اور انھیں شکست دی بلکہ اس امر پر بھی کہ انھوں نے بہار، اڑیسہ، نیپال اور مشرقی بنگال کے ہمسایہ ہندو راجاؤں اور سرداروں سے جنگ کی اور ان کے علاقوں کو جزوی یا کُلّی طور پر اپنی حکومت میں شامل کر لیا ۔ تیسرا بھی بڑا صاحبِ سطوت اور روشن خیال حکمران تھا اور رعایا سے اپنے عدل و انصاف میں ضرب المثل ۔

غازی کالو یا کالو غازی اسلامی بنگالی ادب کے متأخّر متوسط دور کی ایک روحانی شخصیّت ہے ۔ مورخینِ اسلام کے نزدیک تو وہ افغانی الاصل تھا، لیکن ہندو روایات کی رو سے نو مسلم، جس کا خطاب تھا، ''کالا پہد (Kālāpahad)'' اور جو غالباً ہندووں نے اسے بنگال، بہار، اڑیسہ اور آسام کی بادشاھتوں کو تباہ کر دینے کی بنا پر دیا تھا ۔ وہ بنگال کے کرانی حکمرانوں کا ایک سپہ سالار تھا اور ۱۵۸۰ء میں اکبر سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ (ایس مترا : سرل ینگلا ابھی دان، بار ششم، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص ۳۴۶؛ R.C. Majumdar and others : *An advanced History of India*، لنڈن، ص ۳۸۶) .

۴ - پنج پیری عقائد و اعمال : ''پانچ پیری'' فہرست کی طرح اس کیش کے عقائد اور اعمال بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ بایں همه، کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس بنیادی اور عام عقیدے کا ایک لازمی نتیجہ ہیں کہ یہ پیر اگرچہ جسمانی طور پر مردہ ہیں لیکن روحانی طور پر زندہ، اور انھیں مافوق الفطرت قوتیں حاصل ہیں، جن کی بدولت وہ اپنے ماننے والوں کے کام آتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں .

پھر وہ مقامات بھی، جو پانچ پیروں سے ارادت کے سلسلے میں قائم ہوے، باھم مختلف ہیں؛ نہ ان میں کوئی ایک تصوّر کام کر رہا ہے، نہ طرز تعمیر میں وہ ایک سے ہیں، نہ تسمیه ھی ایک سا ہے ۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں انھیں '' زیارت'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ مقام جہاں لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں، اور پنجاب میں درگاہ ۔ صوبجات متحدہ، بہار اور بنگال کے مسلمان بھی انھیں درگاہ کہتے ہیں یا آستانہ ۔ ہندووں کے یہاں ان کے نام ہیں: ڈھیری (ٹیلے)، آسن (نشستیں) ویدی (چبوترہ) ۔ وہ عام طور پر چھوٹے چھوٹے پانچ گنبدی مقبروں پر یا کسی پیپل (اسوتھا) Asvattha یا برگد (وٹا Vata) کے پیڑ تلے بنے ہوے سادے ٹیلوں پر مشتمل ہوتے ہیں، یا پھر ان ٹیلوں پر پھوس کی معمولی چھتیں بنی ہوتی ہیں، یا یہ مسکونہ مکانات کے کمروں میں بنے ہوے چبوتروں سے عبارت ہیں، جہاں حصولِ اولاد یا کسی ناقابلِ علاج بیماری سے نجات یا کاروبار میں کامیابی وغیرہ کے لیے بکروں، مرغوں، مٹھائیوں اور پھولوں وغیرہ کے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں.

مغربی بنگال اور بہار میں پانچ پیروں کے مرید اپنے مکان میں کوئی کمرہ اس لیے الگ کر دیتے ہیں کہ وہاں وہ ان پیروں کی بحیثیت خاندانی دیوتاؤں کے عبادت کو سکیں ۔ عام طور پر کمرے کے شمال مغربی گوشے میں سے اٹھائی ہوئی چوکی پر چھوٹا سا چبوترہ ان کی نمائندگی کرتا ہے ۔ چبوترے کے قریب چوکی پر انسانی ہاتھ سے مشابہ لوہے کا ایک پنجہ رکھ دیا جاتا ہے، جس کی کلائی پر ایک زرد پارچہ لپٹا رہتا ہے؛ پانچ پیروں کی علامت کے طور پر پنجے کی پانچوں انگلیوں کے ارد گرد کپڑے کے ٹکڑے لپیٹ دیے جاتے ہیں ۔ ہر چہار شنبے کو یہ چبوترہ دھویا جاتا ہے (چوکی پر کھریا مٹی سے لپائی کی جاتی ہے)، کوئی خوشبودار چیز جلائی جاتی ہے اور پھلوں کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے ۔ خاص خاص موقعوں پر (کوئی منت پوری ہونے یا پوری ہونے کی توقع پر) بکروں یا مرغوں کی قربانی بھی کی جاتی ہے ۔ اگر مرید ہندو ہے تو وہ بالعموم

کسی مسلمان دفلی فقیر (ڈھول بجانے والے مسلمان فقیر) سے کہے گا کہ اس تقریب کو اس کی طرف سے ادا کر دے ۔ ہندو پنج پیری مسلمان قصائیوں کا ان کی شریعت کے مطابق ذبح کردہ بکریوں کا گوشت کھا لیتے ہیں، لیکن ایسے جانور کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے جو کسی ہندو دیوتا کی بھینٹ چڑھایا گیا ہو؛ تاہم ہندو دیوتاؤں کی پوجا پاٹ میں کوئی کمی نہیں کرتے (*Sensus of India*، ۱۹۰۱ء، E.A. Gait، ج ۶، Bengal Report، حصہ ۱، ص ۱۸۵ ببعد).

مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ میں البتّہ پانچ پیروں کی خوشنودی جس طرح حاصل کی جاتی ہے اس کا طریقہ اس صوبے کے دوسرے ضلعوں سے بالکل مختلف ہے ۔ زیادہ تر مسلمان ہی ان کے ارادت مند ہیں ۔ وہ پانچ پیروں کے لیے شیرینی کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں، جو زیادہ تر دودھ، ناریل، شکّر اور چاول پر مشتمل ہوتا ہے ۔ پھر چند مقررہ الفاظ کا ورد بطور دعا کر لینے کے بعد یہ شیرینی محلے کے بچوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے ۔ بڑی عمر کے آدمی شیرینی لینے سے اجتناب کرتے ہیں ۔ یہ پانچ پیری تقریب عام طور پر ملّاؤں کی وساطت سے ادا کی جاتی ہے ۔ جو رقم شیرینی کے خرچ کے لیے ضروری ہے وہ آنے ہوں یا روپے، اسے مریدوں کی مالی استطاعت کے مطابق ہمیشہ پانچ یا پانچ کا حاصل ضرب ہونا چاہیے.

مشرقی بنگال میں بھی شیرینی کی نذر چوبیس پرگنہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی ۔ علاوہ دودھ، ناریل، چاول، شکر وغیرہ کے خاص خاص موقعوں پر بکروں اور مرغوں کی قربانی بھی دی جاتی ہے اور شیرینی، جو گویا ہر قسم کی قربانی کے لیے ایک عام اصطلاح ہے، تمام حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر دی جاتی ہے.

پانچ پیروں کے مریدوں کا اعتقاد ہے کہ اس پنجکڑی سے اگر دلی عقیدت اور مقرّرہ طریق پر اظہارِ ارادت کیا جائے تو اس کا نتیجہ لازماً ہمہ گیر خوش حالی کی صورت میں برآمد ہو گا؛ چنانچہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر وباؤں، مثلاً ہیضہ، چیچک، ملیریا، زرد بخار، تپِ محرقہ اور امراضِ مویشیاں سے محفوظ رہنے کے لیے اس پنجکڑی ہی سے رجوع کرتے ہیں ۔ ارواحِ بد کے دفعیے یا زیرِ سماعت مقدمات اور اپنے موجودہ کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ پانچ پیروں ہی سے مدد طلب کرتے ہیں ۔ وہ منت مانتے ہیں کہ اگر انہیں ناقابلِ علاج بیماریوں سے شفا ہوئی، یا ان کی فصلیں برباد نہ ہوئیں، یا جس گائے کا دودھ سوکھ گیا ہے وہ پھر سے دودھ دینے لگی، یا جو درخت پھل نہیں لاتا وہ ثمردار ہو گیا، یا بانجھ عورت حاملہ ہو گئی تو وہ ان کی خدمت میں ''شیرینی'' چڑھائیں گے ۔ علاوہ ازیں، دریا یا سمندر کے راستے صحیح سلامت مسافرت کے لیے بھی وہ پنج پیر کی ارواح سے دعا مانگ کر استمداد کرتے ہیں (ایم ۔ ای ۔ حق : *Bange Sufi Prabhava*، ۱۹۳۰ء، ص ۲۴۴ ببعد).

۵ ۔ پانچ پیر کی اصل : صوفیہ کی روحانی اور فوق الفطرت قوتوں پر اعتقاد رکھتے ہوئے پیروں کو الوہی مرتبہ دینا اس ملک میں نیا عقیدہ نہیں، لیکن پانچ پیروں کا یہ مجموعہ برصغیر پاک و ہند کی سر زمین میں یقیناً بڑا انوکھا نظر آتا ہے؛ چنانچہ اسے دیکھتے ہوئے ای ۔ اے ۔ گیٹ E.A. Gait یہ کہنے پر مجبور ہو گیا : ''ایک ایسے ملک میں بھی، جہاں مذہب نے غیر معمولی شکلیں اختیار کر رکھی ہیں، پنج پیریہ کو انتہائی عجیب و غریب عقائد میں شمار کرنا

چاہیے۔ اگرچہ اس فرقے کی اصل و ابتدا کا صحیح سراغ لگانا ناممکن ہے، تاہم اتنا واضح ہے کہ یہ ان مفاہمت پسند کیشوں میں سے ایک ہے جن کا ظہور اس دور میں ہوا جب یہاں مسلمانوں کا غلبہ تھا اور اکثر لوگ اس ملک کے حکمران طبقے اور محکوموں کے درمیان مذہبی اختلافات میں مفاہمت پیدا کرنے کی راہ نکالنے پر غور کرنے لگے تھے" (Sensus of India، ۱۹۰۱ء، ج ۶، بنگال، حصۂ اول : ص ۱۸۵)۔ اب اس پیچیدہ عبارت کا غور سے جائزہ لیا جائے گا تاکہ ہمیں پانچ پیری کی اصل معلوم ہوسکے۔

ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ پانچ پیروں کی فہرست اور ان کے متعلق عقائد و اعمال میں طرح طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں، لہٰذا اس کیش کی ابتدا کسی ایک پیر سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ پانچ پیروں کے ارادت مند بھی یہ نہیں مانتے۔ پھر ان میں اگرچہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن نہ تو ٹھیٹھ ہندومت نے پانچ پیروں یا ان کے کیش سے کسی گہرے تعلق کا دعوٰی کیا ہے اور نہ راسخ العقیدہ مسلمانوں نے؛ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ پانچ پیریہ ایک مفاہمت پسند کیش ہے، جو اسلام اور ہندو دونوں مذاہب کی حدود سے باہر وجود میں آیا۔ رہی یہ بات کہ کہاں، کب اور کیسے پاک و ہند میں اس مفاہمت پسندیّت کا آغاز ہوا، سو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کسی قابل قبول حل کا محتاج ہے۔

پانچ پیری فہرستوں میں کیسا بھی اختلاف پایا جائے ان کا بغائر مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بجز خواجہ خضر کے ان میں کسی کا تعلق بھی بیرون ملک سے نہیں ہے، لہٰذا بعض فہرستوں میں جو خضر کا نام آ گیا ہے اسے ایک مسلّمہ امر نہیں بلکہ محض اتفاق سمجھنا چاہیے۔ اسلامی دنیا اور بالخصوص اسلامی ہند میں (M. T. Titus : Indian Islam، سلسلہ Religius Quest of India، ۱۹۳۰ء، لنڈن، ص ۱۳۹ ببعد) خضر کا پانی سے تعلق مانا جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی پنجپیڑی میں یہ نام آ گیا ہے تو وہ ایک قدرتی بات ہے کیونکہ اس کے ماننے والوں کی بہت بڑی تعداد ملّاحوں یا کشتی رانوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے کشتی ران اس فہرست میں چاٹگام کے پیر بدر کا نام کیوں شامل کرتے ہیں۔ پیر بدر چاٹگام کے محافظ پیر ہی نہیں بلکہ اس سارے علاقے کے ملّاحوں اور کشتی رانوں کے سر پرست پیر بھی مانے جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ملّاحوں اور کشتی رانوں کو پیر بدر سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر غلطی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ اور خواجہ خضر ایک ہی شخصیت ہیں (دیکھیے Census of India، ۱۹۰۱ء ج ۶، حصۂ اول : ص ۱۲۸؛ W. Crooke : Popular Religion and Folklore of North India، ۱۸۹۶ء، ۱ : ۱۳۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ خضر کا پیر بدر سے کوئی تعلق نہیں، جو کہ ۱۳۳۹ اور ۱۳۰۲ء کے مابین سنار گاؤں کے فخر الدین مبارک شاہ کے عہد حکومت میں بقید حیات تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے بعض اوقات ایک غلط استدلال کی بنا پر بعض لوگ پانچ پیر کی اصل کو "پنج تن" کی شیعی پنجکڑی سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور پنج تن سے مراد ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم، آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ، آپؐ کے داماد حضرت علیؓ، آپؐ کے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ۔ ہو سکتا ہے کہ دیگر ثقافتی تصوّرات کی طرح "پنجتنی" کا خیال بھی اس کے ارکان کے

ناموں سمیت ایران سے ہندوستان میں آیا ہو اور یہی وجہ ہو کہ بلا تغیّرِ ارکان وہ ہندوستان میں ہر کہیں پھیل گیا ۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ''پنجتن پاک'' اور ''پانچ پیر'' کے عقائد ہندوستان میں پہلو بہ پہلو قائم تھے، جن میں کوئی ایک دوسرے کے رواج کو روک سکا نہ اسے میدان سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوا، دریں صورت قرین قیاس یہی ہے کہ 'پنج پیریہ' کیش اصلاً ہندی پاکستانی ہے۔

ڈاکٹر وائز J. Wise نے اپنے دلائل کی بنا اس بات پر رکھتے ہوے کہ پنج پیری فرقہ کے ''گورو'' کی اس میں وہی حیثیت ہے جو نانک شاہی سلسلے میں ''مہنت'' کی، یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ پنج پیری عقیدے کی اصل پنجاب کے گورونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء) تک پہنچتی ہے (دیکھیے J. Wise: *Notes on the Races, Castes and Trades of East Bangal*، لنڈن، ۱۸۸۳، ص ۱۷ ببعد)؛ لیکن ڈاکٹر موصوف کی یہ راے صحیح نہیں، کیونکہ ان کا خیال واقعات پر مبنی نہیں ہے ۔ بنگال کے بول فرقے کے اپنے گورو ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس پانچ پیروں کے پیشوا ہوتے ہیں، جنھیں وہ ''فقیر'' کہتے ہیں ۔ بول گورو تو ''اکھد'' (سنسکرت اَکْشَوتَ سے مأخوذ)، یعنی باقاعدہ اجتماعات، کے لیے ایک مجلس بول کی تنظیم کرتے ہیں ۔ انھیں ''مہنت'' نہیں کہا جاتا، جو کہ ایک ہندی لفظ ہے (سنسکرت مَہنتَ سے مأخوذ)، اور اس کی اس صوتی شکل سے مشرقی بنگال سرے سے ناآشنا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بول اصطلاح ''نلکھ سنی'' کو، جو الکھ سنی (مأخوذ از سنسکرت : نرلکشیہ سواسی اور الکشیہ سوامی) کے طور پر بھی مستعمل ہے (ان دونوں کے معنی ہیں ''نظر نہ آنے والا خدا'') غلطی سے سکھ مت کی اصطلاح ''نانک شاہی'' سے خلط ملط کر دیا گیا تا کہ مشرقی بنگال کے پنج پیروں کے ساتھ، جہاں سکھ پنتھ کو کوئی جانتا بھی نہیں، گورو نانک کا ایک خیالی رشتہ جوڑ دیا جائے۔

مزید برآں اس ہندی ۔ پاکستانی کیش کی فہرستوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ تیرھویں سے سولھویں صدی عیسوی تک کے اولیا یا ایسے انسان تھے جنھیں الوہیت کا درجہ دیتے ہوے مریدوں نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا ۔ ان کی ''درگاہوں'' پر بھی، جو مختلف مقامات میں واقع ہیں، مصیبت زدہ لوگ ہی زیارت کے لیے جاتے ہیں، کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ یہاں پر مدفون پیر اس قسم کی کرامتوں کے حامل ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں؛ علٰی ھذا یہ کہ ان کی برکت سے ہر آفت دور ہو سکتی ہے ۔ لہٰذا ہم یہ راے رکھنے میں از روے قیاس حق بجانب ہونگے کہ ''پنج پیری'' کے فرقے کی ابتدا کسی خاص زمانے میں، کسی خاص شخص کے ہاتھوں، کسی خاص مقام پر نہیں، بلکہ بتدریج ایک دوسرے سے بے تعلق مختلف مقامات اور مختلف موقعوں پر ذاتی یا جماعتی اعتقاد کی خاطر بطور ایک مخفی طریق کے ہوئی ۔ ہماری ثقافتی تاریخ میں یہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی ایک ایسا زمانہ ہے جب ہندی اور اسلامی ثقافت کا امتزاج ذہنی سرگرمیوں کے مختلف گوشوں میں ہوا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دو صدیوں کا یہی دور ہے جس میں پانچ پیری عقائد نے ایک باقاعدہ کیش کی شکل اختیار کی ہوگی۔

پھر یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ پانچ پیروں کا خیال سب سے پہلے مغربی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور پنجاب میں پیدا ہوا، وہیں یہ ایک مسئلہ بنا اور وہیں اس نے ایک معیّن شکل اختیار کی، اور پھر جیسے جیسے اسلام کو ہندوستان میں غلبہ حاصل ہوتا گیا یہ خیال

صوبجات متحدہ (اتر پردیش، بھارت)، بہار اور بنگال میں پہنچا۔ یہی مفروضہ ہے جس کی بنا پر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی پانچ پیری فہرستوں میں پنجاب اور صوبجات متحدہ کے بعض نام کیوں شامل ہیں۔

بطور ایک پنجکڑی یا ارکانِ خمسہ کے پانچ پیری مجموعہ ہمیشہ ایک عجیب و غریب چیز رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں، جہاں پیروں یا ان کی درگاہوں اور آستانوں کی کوئی کمی نہیں، انھیں اکھٹا کیا گیا تو پانچ ہی کے مجموعے میں، نہ اس سے زیادہ نہ کم؛ لہٰذا یہ عدد بڑا معنی خیز ہے، جس کی اربابِ علم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس موضوع کی گہرائی میں اتر کر توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگرچہ تعلیم یافتہ مسلمان شرفا کی طرح اونچی جاتیوں کے نیز پڑھے لکھے ہندو بھی پانچ پیروں کی پوجا نہیں کرتے، بایں ہمہ ان کا خیال ہے کہ ان پیروں کے آستانوں یا تھانوں (دونوں الفاظ سنسکرت کے ''ستھان'' بمعنی مقام سے ماخوذ ہیں) کا تعلق مہابھارت کے پانچ پانڈووں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بارہ برس کا طویل بن باس پورا کرنے کے بعد پانچوں پانڈووں نے گمنامی کی حالت میں سال بھر ہندوستان کے جن مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کیا انھیں متبرک خیال کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر ہندوؤں کے متبرک مقامات بن گئے۔ اسلامی فتوحات کے بعد ان میں سے کئی ایک مقام پانچ پیروں کی درگاہ یا آستانہ بن گئے۔ یوں پانچ پیروں کی درگاہیں یا آستانے پاکستان و ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مشترک مقامات اجتماع بن گئے۔ اس کے باوجود کوئی ہندو بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کون کون سے مقامات ہیں جنھیں ہم پانڈووں سے منسوب کریں گے، بالخصوص مشرقی بنگال، جسے تحریری شہادت کی بنا پر پانڈو ''ورجیت دیس'' کہتے ہیں، یعنی ایک ایسا ملک جس سے پانڈو قطع تعلق کر چکے تھے'' (ایس - سی مترا : سرل بنگلہ ابھی دھان، بار ششم، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص ۷۶۲)، جہاں ''پانچ پیریہ آستانے'' بڑی تعداد میں موجود ہیں؛ لہٰذا ''پانڈو استھان'' کا ''پانچ پیریہ آستانے'' میں تبدیل ہو جانے کا سوال کم از کم مشرقی بنگال میں تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اسلامی ہند کی تاریخ میں کسی پانڈو استھان کو پانچ پیریہ آستانے میں تبدیل کرنے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

پانچ پیری فہرستوں میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ (ا) افسانوی پیروں، (ب) تاریخی شخصیّت کے حامل اولیا، (ج) سلاطین اور (د) ہنود کے خلاف جہاد کرنے والے غازیوں کے ناموں پر مشتمل ہیں۔ ان فہرستوں میں افسانوی یا تاریخی شخصیتوں کے حامل مقامی، غیر مقامی اور پیروں کے ناموں کی شمولیت قابل فہم ہے؛ کیونکہ ''ہندوستانی مسلمانوں کا پیروں پر اعتقاد یا ان کی درگاہوں اور مقبروں سے عقیدت کوئی ایسی بات نہیں جو ہندی مسلمانوں ہی سے مخصوص ہو۔ یہ چیز باہر سے ان لوگوں کے توسّط سے یہاں پہنچی جنھوں نے افغانستان، ایران اور عراق کے مذہبی سلسلوں کو یہاں رواج دیا۔ پھر ''گورو، چیلا'' کا رواج ہندوؤں میں قدیم سے رائج تھا اور مسلمانوں کی غالب تعداد نے بھی مقامی دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کا عالمگیر عقیدہ اپنے ہندو آبا و اجداد سے ورثے میں پایا تھا، اس لیے پیرپرستی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا بڑی آسانی سے ایک حصہ بن گئی، (Murray T. Titus : *Indian Islam*، بسلسلۂ *The Religious Quest of India*،

۱۹۱۰ء، لنڈن، ص ۱۳۱).

پھر اس بات کا سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ دہلی کے تاجدار ناصر الدین محمود (۱۲۴٦ تا ۱۲٦٦ء) اور بنگال کے شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۷ء)، سکندر شاہ (۱۳۵۷ تا ۱۳۹۳ء) اور غیاث الدین اعظم شاہ (۱۳۹۳ تا ۱۴۱۰ء) ایسے سلاطین کے اسما شاملِ فہرست ہیں تو از روے احترام، اس لیے کہ ان کی ہندو اور مسلمان رعایا نے ان کے بے داغ کردار اور ان کی دینداری، دادرسی اور غیر معمولی شجاعت کے پیش نظر انھیں بزرگ اور مقدّس ٹھیرایا تھا.

لیکن بعض اوقات اس امر کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ غازی میاں (سالار مسعود)، اسمٰعیل غازی اور کالو غازی، (کالا پہّد) وغیرہ ایسے کفر و شرک کے دشمنوں اور بت شکنوں کے نام ہندووں اور مسلمانوں کی پانچ پیری فہرستوں میں کیسے شامل ہو گئے - سرسری نظر سے دیکھیے تو یہ عقدہ لاینحل نظر آتا ہے، لیکن فی‌الواقع وہ ایسا نہیں - مسلمانوں کے نزدیک غازی کی ہستی بڑی مقدس ہے، للهذا ممکن ہے کہ اس ارقے کے مسلمانوں نے انھیں بلند روحانی درجہ دیتے ہوے اپنی فہرستوں میں شامل کر لیا ہو اور یہ اس وقت جب پانچ پیری عقائد رفتہ رفتہ ایک ایسے کیش کی شکل اختیار کر رہے تھے جو نیچ ذات ہندووں کے لیے قابل قبول تھا! وجہ یہ کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اس امر کے لیے تیار تھے کہ غازیوں کو پیر مان لیں، جن کے متعلق خیال تھا کہ انھیں کرامتیں دکھلانے کی مافوق الفطرت طاقت حاصل ہے - للهذا وہ اپنے خانگی دیوتاؤں یا اپنی دیو مالا کے کسی دوسرے دیوتا کی طرح حصول انعام کی خاطر یا ان کے غضب سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی پرستش کرنے لگے؛ چنانچہ آج بھی وہ اس خیال کے تحت فطرت کے کسی غیر معمولی مظہر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور کسی سادھو یا فقیر کو پوجنے پر آمادہ رہتے ہیں کہ وہ قدرت الٰہی کے تجسیمی مظاہر ہیں.

٦ - پنجکڑی کی تشریح : پانچ پیری کیش کی اصل کچھ بھی ہو، اس کی ابتدا ایران کے پنجتن سے ہوئی ہو یا ہندووں کے پانچ پانڈووں سے، پیروں کے اس مجموعے میں پانچ کا عدد بڑا غور طلب ہے؛ للهذا پنجکڑی کی بنیادی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے پیچھے پانچ کے عدد کا طلسماتی تصور موجود ہے اور یہ معلوم ہے کہ دنیاے قدیم میں ہر کہیں پانچ کے عدد کو مقدس اور روحانی طور پر پر اسرار تصور کیا جاتا تھا - [تفصیل کے لیے دیکھیے لا، لائڈن، بار دوم، جس میں ہندووں مسلمانوں، اور دوسری اقوام میں اعداد کے بارے میں عقائد کا مفصل ذکر آیا ہے] - یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں، جس کی ابتدا ۱۸۵۰ء سے ہوتی ہے، مسلمانانِ ہند کی زندگی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ان کی وجہ سے مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں، مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۸۲۳ء)، سیّد احمد بریلوی (۱۷۸۲ تا ۱۸۳۱ء)، تیٹو میر حیدر پوری (۱۷۸۳ تا ۱۸۳۱ء)، مولانا کرامت علی جونپوری (۱۸۰۰ تا ۱۸۷۳ء)، حاجی شریعت اللہ اور ان کے صاحبزادے دودھو میاں فریدپوری (۱۸۱۹ تا ۱۸٦۲ء) ایسی متشرع ہستیوں کی مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں، نیز وہ تحریکیں جن کی ابتدا ان سے ذرا کم تر ہستیوں نے کی - یہ ایک وجہ تھی جس کی بدولت پاکستان و ہند کے عام مسلمانوں میں راسخ العقیدہ مذہبی شعور کا احیا ہوا.

بہر حال مذہبی اصلاح کا عمل، جس کی ابتدا

آج سے بہت پہلے ہوئی، بدستور جاری ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان و ہند کے عام مسلمانوں میں اب پانچ پیروں کا عقیدہ بھی کمزور پڑتا جا رہا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اب اس کے خاتمے کے دن قریب ہیں، حتّٰی کہ جو لوگ ابھی اس کیش سے وابستہ ہیں انھیں بھی یہ تسلیم کرنے میں تأمل نہیں؛ پھر بھی ان اصلاحی تحریکوں اور جدید تعلیم کی توسیع و اشاعت کے باوجود پانچ پیری عقیدہ، جو پیر پرستی کا ضروری نتیجہ ہے، ہندوستان و پاکستان میں تزلزل کی حالت ہی میں سہی، لیکن قائم ضرور ہے۔

(محمد انعام الحق)

⊗ **پنج تن** : عام رائے یہ ہے کہ اس سے مراد نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے قریبی اہل بیت ہیں، یعنی حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کی ذات گرامی ۔ پنج تن کے بارے میں عوام میں مختلف خیالات ہیں ۔ اس کے لیے نیز رک بہ پنج پیر.

[ادارہ]

* **پَنْج دِہ** : سوویٹ روس (USSR) کی جمہوریۂ ترکمان [رک بآں] میں ایک قریہ، جو وود کُشک کے مشرق میں پلِ کشتی، یعنی کُشک اور مرغاب کے سنگم کے قریب واقع ہے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس رقبے کے باشندے، یعنی قبیلۂ سرِک (= سرق، سریق) ترکمان، پانچ فرقوں : سکتی، هرز گی، خراسانی، بیرچ، اور علی شاہ میں تقسیم تھے اور پنج دہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے؛ لیکن اس میں کوئی وزن نہیں، کیونکہ سرِک محض انیسویں صدی میں یہاں آکر بسے، حالانکہ یہ نام پندرھویں صدی میں بھی مستعمل تھا۔

یہ سرسبز قطعہ غیر معروف ہے، لیکن ۱۸۸۵ء کے حادثۂ ''پنج دہ'' نے اسے ایک ملال انگیز سی شہرت بخش دی، جب کہ افغانی فوج نے روسی لشکر سے ایک معرکے میں بھاری نقصانات اٹھائے ۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ایک غلط حد بندی لڑائی کا بڑا اہم سبب ہوتی ہے، چنانچہ اسی باعث، نیز روس کا ۱۸۸۴ء میں مَرْو پر قبضہ ہو جانے سے روس و برطانیہ میں گفت و شنید کا سرگرمی سے آغاز ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان کی شمالی حد کے تعیّن کے لیے ایک اینگلو روسی سرحد کمیشن مقرّر کر دیا گیا ۔ اس وقت ایک فوری قضیہ پنج دہ میں یہ پیدا ہوا کہ روسی یہ دعوٰی کرتے تھے کہ پنج دِہ کے باشندے آزاد ہیں، مگر انگریزوں کی رائے یہ تھی کہ وہ امیر افغانستان کی رعایا ہیں ۔ انگریز کہتے تھے کہ پنج دِہ کا ضلع، کُشک اور مُرغاب دریاؤں کے درمیان بندِنادر سے آق تپّہ تک، مع بقیہ حصّۂ باد غیس، پر مشتمل ہے اور افغانستان کے صوبۂ ہرات کا حصّہ ہے ۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل میں پنج دہ میں جمشید اور ہزارہ قبائل سکونت رکھتے تھے ۔ اس دَور کے خاتمے کے قریب قبیلۂ ارساری کے بعض ترکمان، جن کی بستیاں دریاے جیحوں کے کنارے کنارے چرجوی اور بلخ کے درمیان منتشر تھیں، پنج دہ کی طرف چلے اور وہاں سکونت پذیر ہونے کی اجازت حاصل کی ۔ سَلّر ترکمان بھی اسی رقبے میں آباد تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے قریب ارساریوں نے پنج دہ سے نقلِ وطن کیا اور تھوڑے دن بعد ہی سرِک ترکمانوں پر ان کے زیادہ طاقتور ہمسایوں، تکّہ کا دباؤ پڑا اور وہ مجبوراً جنوب میں یلَتّن اور پنج دہ چلے آئے اور انھوں نے سَلّر خاندانوں کو وہاں سے نقلِ مکانی پر مجبور کیا ۔ غرض یہ تو درست ہے کہ پنج دہ وقتاً فوقتاً مختلف قبائل کے قبضے میں رہا، لیکن وہ سب، خواہ جمشیدی، ہزارہ، ارساری اور سَلّر

ہوں یا سرک، تسلیم کرتے تھے کہ وہ افغانی علاقے میں تھے اور ہرات کے افغان حاکم کے نائب کو خراج دیتے تھے۔ سرک ترکمان امیر کابل کی فوج میں بھرتی بھی ہوتے تھے، لہٰذا انگریزوں کا استدلال یہ تھا کہ بادغیس کا ضلع، جس کا پنج دہ ایک حصہ ہے، عرصے تک افغانی عملداری میں رہا ہے (دفتر امور خارجہ کے مخطوطات، ٦٥، ١٢٠٥).

دوسری طرف روسی دعوی کرتے تھے کہ اس نخلستان کے باشندے ہمیشہ آزادی سے لطف اندوز رہے ہیں۔ Lessar ایک روسی انجینیئر، جو پنج دہ میں مارچ ١٨٨٣ء میں آیا تھا، افغانی اقتدار کا کوئی نشان دریافت نہ کر سکا، لیکن ایک روسی ڈاکٹر Regel نامی نے، جو یہاں اسی سال جون میں آیا تھا، ایک افغان فوجی دستے کی موجودگی کی اطلاع دی۔ لہٰذا ان لوگوں کی رائے تھی کہ پنج دہ صرف حال میں افغانی فوجی قبضے میں آیا ہے۔

یہ واقعہ کہ افغانوں نے مستقل طور سے محافظ فوج اس رقبے میں نہیں رکھی، اس کی آزادی کا ثبوت نہ تھا۔ اس کے برعکس یہ قدرتی امر تھا کہ مرو اور پل خشتن پر روسی قبضے کے بعد، امیر عبدالرحمن خان اس رقبے پر اپنے شاہانہ حقوق جتانے کا اقدام کرے؛ لہٰذا جب افغان محافظ فوج نے پنج دہ پر قبضہ کیا تو روسی حکومت نے فوراً احتجاج کیا اور اس علاقے کی نسبت امیر کے دعوے بر رد و قدح کی۔ اس ثنا میں، جبکہ لنڈن اور سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان گفت و شنید ہو رہی تھی، افغانستان کی سرحدوں پر سرعت سے کئی طرح کے واقعات پیش آئے۔ ٢٩ مارچ ١٨٨٥ء کو جنرل کوماروف Comarov نے ایک حتمی جنگی پیام (الٹی میٹم) بھیجا، جس میں افغان محافظ فوج کے وہاں سے ہٹا لینے کا مطالبہ تھا۔ افغانوں نے ہٹ جانے سے قطعی انکار کیا، جس پر روسیوں نے ان پر حملہ کر کے پل کشتی کے پار تک، ان کو دھکیل دیا اور تقریباً نو سو جانوں کا نقصان پہنچایا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ افغان فوج کی پنج دہ میں تعیناتی، اور مرغاب کے کنارے یلتن پر اور ہری رود کے کنارے پل خشتن پر روسی پیش قدمی افسوس ناک اقدام تھے، جن کا یہ نتیجہ تقریباً یقینی تھا کہ فوراً جنگ چھڑ جائے۔ اس تمام کارروائی کو روکنا چاہیے تھا، لیکن برطانوی کمشنر لمسڈن Lumsden کی دفتر خارجہ کو مبہم و پریشان کن اطلاعوں نے اور روسی کمشنر زیلینوئی Zelenoi کی سرخس پہنچنے میں تاخیر نے مسائل کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔

اس وقت ایسا نظر آتا تھا کہ یہ واقعہ غالباً روس و برطانیہ کو جنگ میں مبتلا کر دے گا، لیکن خوش قسمتی سے امیر کے فہم سلیم نے، جو اس نازک زمانے میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا، اور لارڈ ڈفرن کے حسن تدبر نے اس خطرے کو ٹال دیا، حالانکہ امن پسند مسٹر گلیڈ سٹون نے بھی پارلیمنٹ میں تحریک پیش کر دی تھی کہ ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ لڑائی کی تیاری پر خرچ کرنا چاہیے۔

آخر کار یہ طے کیا گیا کہ روس کو پنج دہ دے کر اس کے بدلے میں ذوالفقار لے لیا جائے۔ ١٨٨٦ء سے افغانستان کی شمالی حد ذوالفقار سے دکچی کے بالائی سرے تک مقرر کی گئی، جو دریاے جیحوں سے چالیس میل کے اندر واقع ہے۔ اس بات پر بھی جھگڑا پیدا ہوا کہ وہ ٹھیک نقطہ کون سا ہو جہاں حد بندی کا خط جیحوں سے آملے، لیکن یہ بھی بالآخر رفع دفع ہو گیا اور ١٨٨٨ء میں حد بندی کا کام مکمل ہو گیا۔ روس اور افغانستان کے درمیان ایک معین سرحد تسلیم کر لی گئی تو

وسطی ایشیا کے مسئلے کی پیچیدگی بھی یقیناً کسی حد تک سلجھ گئی۔

مآخذ: (۱) *Délimitation Afghane. Négociations entre la Russie et la Grande-Bretagne*، ۱۸۷۲ تا ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء؛ (۲) *Parliamentary Papers*, *Central Asia*، ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء، جلد ۸۷، عمود ۴۳۸۷ تا ۴۳۸۹، ۴۴۱۸؛ (۳) *Public Record Office*، لنڈن، دفتر امور خارجہ کے مخطوطات، عدد ۶۵، ۱۲۰۵ و ۱۲۳۸ تا ۱۲۴۰؛ (۴) C. E. Yate : *Northern Afghanistan*، ۱۸۸۸ء۔

(C. COLLIN DAVIES)

⊗ **پَنج نَد** : پانچ دریا، یعنی جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج ۔ یہ سب دریاے سندھ کے معاون ہیں اور مغربی پاکستان کو سیراب کرتے ہیں ۔ اس بڑے دریا میں گرنے سے پہلے یہ پانچوں دریا پنجاب (پاکستان) میں بہاولپور (اب پنج نَد) کے مقام پر باہم مل جاتے ہیں ۔ یہاں سے اس دریا کو ''پنج ند'' کہا جاتا ہے (یعنی پانچ دریاؤں کا ایک دریا) ۔ پنج ند مٹھن کوٹ کے مقام پر دریاے سندھ سے مل جاتا ہے ۔ پنجند کے مقام پر ''پنج ند ہیڈ ورکس'' ہے؛ وہاں سے متعدد نہریں نکالی گئی ہیں، جو مغربی پاکستان کے جنوب مغربی علاقے کو سیراب کرتی ہیں۔

(قاضی سعیدالدین احمد و ادارہ)

⊗ **پِنْگَلُو** : رَكّ بہ پِنْگُولُو ۔

پِنْگُولُو : یا (پنگلو (جاوی)، پنگھولو panghulu (سُنْدَنی)، پنگوالوا pangòlò (مادوری)؛ لغوی معنی : سربراہ، مکھیا، کارفرما؛ سابق [ولندیزی] مجمع الجزائر شرق الہند میں دینی و غیر دینی امور کے ناظم اعلٰی کو کہتے تھے، مگر جزائر جاوا اور مادورا میں مسجد کے ایک عہدے دار، یعنی اپنے علاقے میں حاکم کا نام تھا ۔ مذہب کے سرکاری نمائندوں کی وہاں اسی قاعدے کے مطابق تنظیم کی جاتی تھی جس طرح مقامی انتظامیہ کے عملے کی ۔ نائب حکومت (regent) سب سے اعلٰی انتظامی حاکم ہوتا تھا، جس کے پہلو بہ پہلو اس نیابت (regency) کا پنگولو ہوتا؛ حاکم ضلع کے پہلو بہ پہلو ضلع کا پنگولو تھا، جو ''پنگولو نائب'' یا مختصراً ''نائب'' کہلاتا تھا، وقس علٰی ہٰذا ۔ مسجد کے عمال کی درجہوار طبقہ بندی کی گئی تھی : ولایت کے صدر مقام کا پنگولو سارے علاقے کی مساجد کے تمام عملے کا صدر تھا، لیکن دیہات میں نماز کا انتظام کرنے والا بالکل دوسری قسم کا کاوکن ہوتا تھا ۔ وہ گاؤں کی حکومت کا ایک رکن ہوتا تھا اور گاؤں کی مذہبی ضروریات کی خبر گیری اس کا فرض تھا؛ مگر مسجد کے عملے سے اس کا تعلق نہیں تھا ۔ یہ شخص بانتن (مغربی جاوا) میں مستثنی طور پر پنگلو کہلاتا تھا اور اس کے علاوہ ہر جگہ اس کے دوسرے نام ہوتے تھے ۔ پنگولو مسجد کا ناظم اور اس کے عملے کا سردار ہوتا تھا ۔ قانون ''اَدَت'' کے مطابق مسجد کے اور اہلکاروں کی طرح اس کا تقرر بھی قائم مقام حکمران کرتا تھا ۔ معمولاً یہ اسی یا کسی دوسری مسجد کے عملے میں سے منتخب کر لیا جاتا تھا ۔ اس طریقِ تقرّر میں یہ بھی لازمی نہیں ہوتا تھا کہ وہ شخص خاص طور پر اس کام کی قابلیت رکھتا ہو (دیکھیے ذیل میں) ۔

دینیات کی تعلیم خاص شرائط کی پابند نہ تھی ۔ علم دین کا طالب، چاہے اس کا ارادہ کوئی سرکاری عہدہ اختیار کرنے کا ہو، یا ذاتی طور پر مطالعہ کرتے رہنے کا، مدارس میں تحصیل علم کرتا (یہ سب مدرسے لوگوں نے بطور خود بنا رکھے تھے اور ملک میں بہت سے تھے) ۔ پھر ہر طالب علم جو مضمون چاہتا پڑھتا

اور چھوٹی بڑی جتنی مدت تک چاہتا تعلیم حاصل کرتا ۔ اس کی یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ کئی مدرسوں میں شریکِ درس ہو ۔

پنگولو کے فرائض منصبی گونا گوں تھے، لیکن سارے علاقے میں یکساں نہیں تھے ۔ مسجد کے ناظم کا فرضِ منصبی پہلے مذ تور ہو چکا ہے ۔ زیادہ بڑے مواضع، خصوصاً ملک کے صدر مقام میں بڑا عملہ ہوتا ۔ وہاں پنگولو بذاتِ خود کام میں حصہ نہیں لیتا تھا ۔ پنگولو کے ذمے نکاح کا بھی انتظام تھا، جو اس کی موجودگی میں ہوتا ۔ وہ ''طلاق'' اور ''رجوع'' کا فیصلہ صادر کرتا اور نکاحوں کو رجسٹر میں درج کرتا تھا ۔ جب بہت ممتاز خاندانوں کا معاملہ ہوتا تو فقط ملک کا صدر پنگولو ھی یہ فرض ادا کرتا ۔ اس صورت میں دستور یہ تھا کہ نکاح خوانی اس خاندان کے مکان میں ہوتی ۔ پنگولو اس وقت بھی نکاح کی رسم انجام دیتا تھا جب دلھن کا ''والی'' (=ولی) اسے ''وکیل'' نامزد کرتا؛ عام رسم یہی تھی، جس پر اکثریت عمل کرتی تھی، اگرچہ اس کا کوئی سبب صاف طور پر نہیں جانتی ۔ عوام کے خیال میں پنگولو ھی وہ شخص تھا جو عقد نکاح میں فریقین کو منسلک کرتا تھا؛ اسی لیے یہ بہت پرانی رسم تھی کہ نکاح مسجد میں پنگولو سے پڑھوایا جائے ۔ اس بن لکھے دستور کو، جو ۱۸۹۵ء سے جاری تھا، ایک قانون کی حمایت حاصل ہو گئی، جو ۱۹۲۹ء میں نافذ ہوا ۔ اس قانون کی رو سے وہ اجرتیں (فیسیں) بھی منضبط ہو گئیں جو نکاح، طلاق اور رجوع کے اعلان کے وقت ادا کی جاتی تھیں ۔ ان قاعدوں میں پرانے دستور کو ملحوظ رکھا گیا ۔ یہ اجرتیں پنگولو اور اس کے عملے کی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ ہوتی تھیں ۔ مؤخر الذکر کو بھی ان کا حصہ ملتا تھا ۔ جو لوگ بخوبی اہل ہوتے تھے وہ شادیوں میں اکثر پنگولو کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے ۔ جو عورتیں ''والی'' (ولی) نہ رکھتیں ان کی شادیاں پنگولو ''والی حاکم'' کی حیثیت سے کرا دیتا ۔ اس لیاقت اور استعداد کے حامل پنگولووں کی تعداد ان اہلکاروں کی تعداد سے ہمیشہ کم ہوتی تھی جو نکاح خوانی کے لیے مقرر کیے جاتے ۔ بعض اضلاع میں قائم مقام حکمران خود اپنے کو ''والی حاکم'' مقرر کرتا تھا، لیکن عملاً سارے اختیارات پنگولو کو دے دیتا تھا.

''جکات'' (عربی: زکوٰۃ) جاوا اور مادورا میں حکام وصول نہیں کرتے تھے ۔ اگر یہ کبھی وصول بھی کی جاتی تو بالکل اختیاری نذرانہ اور بہت سے مقامات میں نہایت معمولی رقم ہوتی تھی ۔ صرف مغربی جاوا میں تحصیل زکوٰۃ کسی زمانے میں باقاعدہ ہوتی تھی اور مسجد کے کارکنوں کے ہاتھ میں تھی ۔ محاصل بھی وھی رکھ لیتے تھے ۔ زکوٰۃ پنگولوں کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھی، خصوصاً مغربی جاوا میں.

صرف صدر مقام کا پنگولو قاضی بھی ہوتا تھا، لیکن اس کا دائرۂ اختیار عائلی قانون اور ''وقپ'' (عربی: وقف) جائدادوں تک محدود تھا ۔ قاضی کا عہدہ اس کا خاص دائرۂ کار ہوتا تھا ۔ پنگولو کے ان عدالتی فرائض کی تاریخ عجیب سی ہے ۔ نوآبادیاتی حکام نے مسجد کے ملازموں کی سرکاری حیثیت سے یہ خیال کیا کہ وہ سب مولوی بلکہ ایک جماعت افتا کے رکن ھیں ، کیونکہ پنگولو عدالتی اجلاس کے وقت اپنی مدد کے لیے چند ماتحتوں کو ساتھ بٹھا لیتا تھا؛ چنانچہ اس غلط فہمی کو نو آبادیاتی قانون میں مستقل صورت دی گئی ۔ پنگولو کو منصفوں کی ایک جماعت

کا صدر بنا دیا گیا ۔ اس کے پنچ حکّام کی طرف سے نامزد اور پنگولو کے ماتحتوں اور غیر سرکاری ماہرینِ قانون سے منتخب ہوتے تھے ۔ اس طریقے سے ایک ادنٰے درجے کا پنگولو جماعت علما کا رکن ہو سکتا تھا ۔ پھر یہ قانون وضع کیا گیا کہ قدیم طریق کار کو بحال کیا جائے، جماعت افتا موقوف کی جائے اور اس کی جگہ پنگولو کی عدالت قائم کی جائے، جس میں وہ اپنے معاونوں کے ساتھ اجلاس کرے اور بلا شرکت غیرے فیصلے صادر کرے ۔ جماعت افتا کے جلسے مسجد کے ایک کمرے میں ہوتے تھے ۔ سب سے زیادہ مقدمات عورتیں دائر کرتی تھیں ۔ مغربی اور مرکزی جاوا میں شوہر کے لیے یہ مقررہ دستور تھا کہ شادی کے فوراً بعد اس سے ''تعلیق'' کا بجبر اقرار کرایا جاتا، جو [ظاہر ہے کہ] قانونی سقم سے خالی نہیں تھا ۔ اگر وہ ان ذمے داریوں کو پورا نہ کرتا جو اس نے ''تعلیق'' کے اقرار میں اپنے اوپر لی تھیں اور بیوی مطمئن نہ ہوتی تو وہ اپنے معاملے کو جماعت کے سامنے لے جاتی، جو طلاق واقع ہو جانے کا اعلان کر دیتی ۔ یہ مقدمات عام تھے ۔ مشرقی جاوا اور مادورا میں ''فسخ'' کی ایک آسان شکل اس ''تعلیق'' کی جگہ لے لیتی تھی ۔ ہمیں ایسے واقعات بھی جاوا کے باقی حصّوں میں ملتے تھے جہاں جماعت افتا فسخ کے مسائل طے کرتی تھی ۔ جو عورتیں ''نفقہ'' سے محروم ہوتیں وہ بھی جماعت افتا سے رجوع کرتی تھیں ۔ اگر طلاق کے بعد شادی کے زمانے کی جائداد کی تقسیم کے متعلق مشکلات پیدا ہوتیں، یا ایک جائداد کے وارث کسی عام پنگولو کے فیصلوں پر مطمئن نہ ہوتے تو مقدمہ فیصلے کے لیے جماعت میں بھیجا جاتا ۔ کارروائی کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جماعت فیصلہ دیتی کہ کس

طرح جائداد کو شریعت کے مطابق تقسیم ہونا چاہیے ۔ اگر فریقین یا متعلقہ افراد اس کی تعمیل پر تیار نہ ہوتے تو تجویز صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتی تھی کہ سرکاری عدالت اس کی توثیق کر دیتی ۔ اگر جماعت افتا کا فیصلہ قاعدے کے مطابق صحیح ہوتا تو عدالت ہمیشہ توثیق کر دیتی تھی اور اس کی مادّی صحت کو نہیں جانچا جاتا تھا ۔ فیسیں اسی وقت ادا کرنی ہوتی تھیں جب عرضی جماعت کو پیش کی جائے ۔ ایک معقول آمدنی جائدادوں کی تقسیم سے ہوتی تھی، کیونکہ ایسے مقدّموں میں ''جماعت'' کو مابہ‌النزاع املاک کا اکثر دس فی صد ملتا تھا ۔ اس سے وہ ''اُسُر'' (عربی: عُشر) کہلانے لگا ۔ عائلی قانون کے دوسرے معاملات میں بھی جماعتِ افتا سے رجوع کیا جاتا، لیکن وہ چنداں اہم نہیں ہیں ۔ آخر میں ''وقپ'' (= وقف) کے ادارے تھے، جن کے بانیوں نے ان کی آمدنی مسجدوں، مذہبی مدرسوں یا قبرستانوں کے لیے مخصوص کی تھی ۔ جماعت افتا کا یہ فرض منصبی تھا کہ جب ایسے جھگڑے کھڑے ہوں تو وہ انھیں شریعت کے مطابق طے کرے اور عام طور سے اوقاف کی دیکھ بھال کرتی رہے ۔

پنگولوؤں کا تقرّر مقامی ریاستوں میں والیانِ ریاست کرتے تھے؛ ان کا میدان عمل یہاں بھی وہی ہوتا تھا ۔ جب کبھی کسی نئے پنگولو کو مقرر کیا جاتا تو بہ حیثیت ''قاضی'' اس کا تقرر ایک فرمان کے ذریعے ''میرے زبانی حکم کی تصدیق میں'' ہوتا تھا؛ یہ جملہ ''شریعت'' کے مصالح کی تکمیل کے لیے لکھتے تھے اور خود فرمان کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا تھا کہ والیِ ریاست اپنا عدالتی اختیار پنگولو کو سونپ رہا ہے ۔

سابق جزائر شرق الہند کے ولندیزی مقبوضات

کے قانون کی رو سے پنگولو کی حاضری اس وقت ضروری ہوتی تھی جب مسلمان دیوانی یا فوجداری مقدموں میں بطور ملزم سرکاری عدالتوں میں حاضر ہوتے تھے ۔ ایسے امدادی پنگولوؤں کی ایک تعداد ہر عدالت سے اس کی ضرورتوں کے مطابق منسلک رہتی تھی۔ یہ لوگ حکومت کی طرف سے مقرر اور مسجدوں کے عملے میں سے منتخب ہوتے تھے ۔ یہ بات پہلے سے طے تھی کہ مسجد کا ناظم لازماً پنچ (assessor) کا فرض ادا کرے گا ۔ اس طرح پنگولوؤں کے تقرر کا حق قائم مقام حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر نو آبادیاتی انتظامیہ کے حکّام کے ہاتھ میں چلا گیا ۔ چونکہ پنگولو عموماً نیچے درجے کے اہلکاروں میں سے منتخب ہوتا تھا، لہذا حکومت اپنا اثر ان چھوٹے افسروں کے تقرر پر اس حد تک ڈال سکتی تھی کہ وہ پنگولو بنائے جانے کے اہل ضرور ہوں ۔ مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لائق لوگ چُنے جائیں ۔ ولندیزی حکومت کا منشا یہ تھا کہ عدالت کو ''ادت'' (رواجی) قانون کی بابت مشورہ دیا جائے۔ اس کام کے لیے پنگولو کا انتخاب کرنا غلطی تھی کیونکہ مؤخر الذکر فقہ کی کتابوں پر چلتا تھا ۔

لفظ پنگولو مسجد کے عہدے دار کے معنی میں جزائر جاوا و مادورا کے باہر نامعلوم نہیں۔ بعض مقامات میں ایسے پنگولو موجود تھے جن کا کام جاوا، مثلاً پالم بانگ (سماترا) کی سابقہ سلطنت کے مرکز کے پنگولوؤں سے مشابہ ہے ۔ نوآبادیاتی حکام نے یہ نام قائم رکھا، بلکہ عدالت کے پنچوں کا بھی یہی نام رکھ دیا، جنھیں وہ ایسے اضلاع میں مقرر کرتے تھے جہاں یہ نام پہلے مستعمل نہ تھا ۔

مآخذ : (۱) C. Snouck Hargronje *Verspreide Geschriftne*، ۱/۳ : ۲۷۹ ببعد، ۸۹ ببعد و ۲/۳ : ۳۶۹ ببعد؛ (۲) C. van Vollenhoven : *Het Adatrecht van Nederlandesh-Indië*، ۲ : ۱۶۰ ببعد۔

(R.A. Kern)

پواسا : (=پُوسَہ؛ سنسکرت : اُپَوَاسا upawâsa) مجمع الجزائر شرق الہند میں ماہ رمضان کا نام؛ اس مہینے میں یا دیگر ایام میں روزہ رکھنے کو بھی پواسا کہتے ہیں، مگر عربی نام بھی غیرمعروف نہیں ۔ روزہ رکھنا انڈونیشیا میں ایک پسندیدہ عبادت سمجھی جاتی ہے، نہ صرف ان دنوں میں جو شریعت کی طرف سے فرض یا مستحب کیے گئے ہیں، بلکہ کسی مراد کے حصول کے لیے لوگ نفلی روزہ بھی رکھتے ہیں۔ رمضان میں روزے کی پابندی دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی نہایت ضروری ارکانِ اسلام میں شمار کی جاتی ہے ۔ یہاں کے لوگوں میں یہ عقیدہ بھی مقبول ہے کہ روزہ سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہوسکتا ہے ؛ جو لوگ بیماریٔ یا کسی اور وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے وہ اس کا وہی احترام ضرور کرتے ہیں جو سب کے دلوں میں بھرا ہوا ہے اور جو سب مہینوں سے بڑھ کر رمضان کو خاص اسلامی مہینے کی حیثیت سے ممتاز کرتا ہے ۔ طلبہ، تجّار اور ایسے تمام لوگ جن کا کاروبار انہیں گھر سے دور لے جاتا ہے کوشش کرتے ہیں کہ کم از کم یہ مہینا اہلِ خاندان میں بسر کریں ۔ متعدّد اضلاع میں پواسا کی آمد اس لیے بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے کے مہینے کے آخری دنوں میں مویشی زیادہ ذبح کیے جاتے ہیں اور گوشت استعمال کے لیے محفوظ کر کے رکھ لیا جاتا ہے ۔ پواسا میں لوگوں کی خوراک معمول کی بہ نسبت قدرے بڑھ جاتی ہے تاکہ روزوں کی تکان برداشت کرنے کی قوت آ جائے ۔ بازاروں میں بھی اس ماہ کے آخری دنوں میں گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے

اور یہ دیکھ کر کہ رمضان قریب الاختتام ہے یہ خریداریوں کا زمانہ ہوتا ہے ۔ اس مہینے کے آغاز کا عام اعلان کیا جاتا ہے، مثلاً خاص انداز سے نوبت بجائی جاتی ہے، جو عموماً اسی غرض سے مسجدوں میں رکھی جاتی ہے ۔ نوبت بجانے کا کام مہینا بھر مخصوص اوقات میں جاری رہتا ہے، یعنی افطار کے وقت تاکہ مسلمان روزہ کھول لیں اور سحری کے وقت تاکہ وہ سحری تیار کریں، نوبت بجائی جاتی ہے ۔ جب ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے تو عید کے اعلان کے طور پر نوبت زیادہ زور زور سے بجائی جاتی ہے ۔ رمضان کے آغاز و انجام کی تحقیق میں عموماً ہر سال نزاع کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جو لوگ مذہبی معاملات میں آزاد خیال ہیں وہ تقویم کو استعمال کرتے ہیں اور قبل از وقت مہینے کے خاتمے کا اعلان کرنے میں تأمّل نہیں کرتے؛ مگر وہ سب لوگ جن کو اصرار ہے کہ شرع کی سختی سے پابندی کی جائے اور ان میں نئی روشنی والے بھی شامل ہیں رؤیتِ ہلال پر سختی سے پابند ہیں ۔ ''تروح'' (عربی : تراویح) کی نماز عام مسجدوں میں عشا کے فوراً بعد پڑھی جاتی ہے؛ اس میں وہ لوگ بھی شوق سے شریک ہوتے ہیں جو اور مواقع پر مذہب کے احکام کی پابندی نہیں کرتے ۔ اس مہینے کی آخری پانچ طاق راتوں کو لیلۃ القدر سے تعلق کی بنا پر عوماً سب سے بڑھ کر اھمیت دی جاتی ہے اور ان میں خوب عبادت کی جاتی ہے ۔ لوگ اس پر متفق نہیں کہ ان راتوں میں سے کون سی رات بظن غالب اصلی شبِ قدر ہے، تاھم اکیسوین اور ستائیسویں کو ترجیح دی جاتی ہے، لیکن مختلف مقامات میں صورتِ حال مختلف ہے ۔ ان راتوں کی رسوم میں سے ایک رسم یہ بھی ہے کہ مکاناتِ مسکونہ کے سامنے کے رُخ پر چراغاں کیا جاتا ہے ۔ جاوا میں خاص زور اس پر دیا جاتا ہے کہ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا جائے ۔ ہر شخص، جو ذرا بھی استطاعت رکھتا ہے، ہر شام عقیدۃً ضیافت دیتا ہے ۔ پھر لوگ دوستوں کے گھر ملنے جاتے ہیں ۔ گھر عام طور سے کھلے رکھتے ھیں اور رات گئے تک خوشی مناتے ھیں ۔ [ولندیزیوں کے عہد حکومت میں] یہاں سرکاری قسم کی ضیافتیں بھی ہوتی تھیں ۔ دیہات کے لوگ اپنے مُکھیا کے گھر ضیافت کی تقریب مناتے تھے اور ہر شخص اپنا حصہ لے کر آتا تھا ۔ اعلٰی حکّام خصوصاً انتظامی محکمے کے حاکم اپنے ماتحتوں کو دعوت دیتے تھے ۔ ان پانچ راتوں کو جاوا کے والیانِ ریاست کے محلّات میں بہت شاندار طریق سے منایا جاتا تھا اور قدیم دستور کے مطابق یہ دعوتیں مغرب کے بعد بڑی شان و شوکت کے ساتھ دی جاتی تھیں ۔ محلوں کے وسیع صحن ان کے لیے بہت ھی موزوں ہوتے تھے ۔ ان دعوتوں کو ملے مان (Malĕ Man) کہتے تھے، جن کے ساتھ بہت سی حکایات وابستہ تھیں ۔ یہ درجہوار ترتیب و تسلسل سے ہوتی تھیں ۔ پہلے اکیسویں تاریخ کو حکمران دعوت دیتا تھا؛ اس کے بعد ولی عہد، شاھی خاندان کے ارکان، اعلٰی حکّام اور وزیروں کی باری آتی تھی ۔ یہ کھانے میزبان کے ماتحتوں کو کھلانے مقصود ہوتے تھے ۔ قریبی زمانے میں یہ دعوتیں محدود ہو گئیں؛ چنانچہ صرف پہلی دعوت کی سرکاری حیثیت قائم رہ گئی ۔ '' چھوٹی'' دعوت کا دن خوشی منانے میں ''بڑی'' دعوت سے بھی کہیں بڑھا ہوا ہوتا ہے ۔ '' فطرہ'' ادا کرنے (جو رمضان کے آخری دن یا اس سے پہلے بھی دیا جاتا ہے) اور خاص احتیاط کے ساتھ غسل وغیرہ کرنے کے بعد (جس میں اھل جاوا اپنے مویشیوں کو بھی شریک کرتے ہیں) گھر میں کھانے پکوائے جاتے ہیں اور افطار کے بعد شام

کو ضیافت کی جاتی ہے ۔ زیادہ دیندار لوگ اس سے پہلے بھی ماہِ صیام میں سیدھا سادا کھانا کھلاتے ہیں اور مُردوں کی ان روحوں کو ایصالِ ثواب کر کے رخصت کرتے ہیں جو (ان کے عقیدے کے مطابق) رمضان کے دوران میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہیں اور اب اپنے مسکن کو واپس جاتی ہیں ۔ یکم شوّال کو آچیے میں عید کی ''صلوٰۃ'' کی زیادہ پابندی نہیں کی جاتی، لیکن اور مقامات میں یہ ایک بڑی مذہبی تقریب ہے ۔ تمام سال میں ایک نماز بھی ایسی نہیں جس میں اتنی حاضری ہوتی ہو ۔ وہ لوگ بھی جو بصورتِ دیگر کبھی مسجد میں نہیں آتے، یہ نماز پڑھنے سے کبھی نہیں چوکتے ۔ ولندیزی عہد میں بھی جاوا میں اعلٰی ترین مقامی حکام یعنی ریجنٹ اپنے دفتر کے تمام عملے کے ساتھ پورے سرکاری لباس میں صبح کو طلوعِ آفتاب سے قبل نماز پڑھنے کے لیے مسجد کو جاتے اور نماز پڑھنے کے بعد اسی طریقے سے واپس آتے ۔ پھر ریجنٹ کی خدمت میں آدابِ عقیدت بجا لاتے ۔ یہی دستور جنوبی سلیبس (Celebes) میں عام تھا، اس کے سوا کہ ریجنٹوں کی جگہ یہاں مقامی رئیس ہوتے تھے ۔ اس دن نوجوان آتش بازیاں چھوڑتے ہیں ۔ عید کی ''صلوٰۃ'' کے بعد لوگ عید کے نئے کپڑے زیبِ تن کیے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے جاتے ہیں، مبارکبادیاں دی جاتی ہیں کہ روزے بخیر و خوبی پورے ہوے اور گزشتہ سال کے دانستہ و نادانستہ گناہوں کے لیے استغفار کیا جاتا ہے ۔ یہ بھی اکثر جگہ دستور ہے کہ لوگ اس دن بزرگوں کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں، جن کی پہلے سے صفائی کی جاتی ہے اور وہاں کچھ دیر تک از رہِ عقیدت پھول چڑھاتے اور بخورات سلگاتے ہیں ۔ جاوا میں مزید برآں بڑے عہدے داروں کا یہ دستور بھی رہا ہے کہ اپنے ماتحتوں کو اس دعوت میں بلاتے ہیں، جس کا نام ہے ''کھانے کے پہاڑ'' (یعنی خوان جن میں تمام اقسام کی قابیں خوشنما طریقوں سے چنی ہوئی ہوتی ہیں) ۔ دیسی ریاستوں میں ماہِ رمضان کے اختتام پر تین عام تعطیلات میں سے ایک تعطیل یہی ہوتی تھی ۔ اس کی اصلی خصوصیّت یہ ہے کہ حکمران کی ذات میں ریاست کی وحدت نمایاں کی جاتی تھی ۔ تینوں جشن مجموعی طور پر ایک ہی طرز پر منائے جاتے تھے ۔ حکمران مشرقی شان و شوکت سے نمودار ہوتا اور لوگوں کے مجمع کو محل کے بیرونی صحن سے اپنا دیدار کراتا ۔ کھانے بہت بڑی مقدار میں پہلے سے شاہی مطبخوں میں تیار رہتے اور نہایت باقاعدگی سے بڑے بڑے خوان (کھانے کے پہاڑوں) میں ٹھیک مقررہ ترکیب اور صورتوں میں لگائے جاتے ۔ یہ ''پہاڑ''، جو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ایک کو لے جانے کے لیے کئی آدمی درکار ہوتے تھے، رئیس کے اپنی نشست پر بیٹھتے ہی اس کے سامنے لائے جاتے اور پھر اس کے حکم سے مسجد تک پہنچائے جاتے ۔ یہاں جب مسجد کا متولی حکمران اور ملک کے لیے دعا کر چکتا تو یہ کھانا تقسیم کر دیا جاتا ۔ چونکہ یہ کھانا ''تبرک'' سمجھا جاتا تھا، لہٰذا اس میں سے حصہ مل جانے کو خوش نصیبی سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔

شوال میں چھے دن کے روزے، جو شرع کی رو سے مستحب ہیں بعض متقی لوگ رکھتے ہیں ۔ اس مہینے کی آٹھویں کو ان روزوں کے ختم ہونے کی نشانی کے طور پر ایک معمولی تقریب منائی جاتی ہے ۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje : *De Atjehers*، بٹاویا ۱۸۹۳ء، ۱ : ۲۴۴ ببعد؛ (۲) وہی مصنّف: *Verspreide Geschriften*، ۴ / ۱ : ۳۴۹ ببعد؛ (۳) R. Soedjono Tirtokoesoemo : *De Garěběg's in het Sultanaat Jogjakarta*، یوگ یکارتا ۱۹۳۱ء؛

(۴) B. F. Matthes : *Ethnologie van Zuid-Celebes*، گرافنہاگ s-Gravenhage، ۱۸۷۵ء، ص ۸۵ ببعد؛ (۵) C. Poensen : *Brieven over den Islām uit de binnenlanden van Java*، لائڈن ۱۸۸۶ء، ص ۳۱ ببعد، ۵۰ ببعد؛ (۶) L. Th. Mayer و J.F.A.C. van Mill : *De sĕdĕkah's en slamĕtan's in de dĕsa Semarang*، ۱۹۰۹ء.

(R.A. KERN)

⊗ **پوپ** : آرتھر اپہم پوپ Arthur Upham Pope، جس کا سن پیدائش ۱۸۸۱ء ہے، امریکہ میں اسلامی ملکوں اور خصوصاً ایران کے آرٹ کا بہت بڑا ماہر خصوصی تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس نے کورنل اور ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور بعد ازاں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں خدمات انجام دیں ۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو مشرقی آرٹ کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا اور امریکہ میں ایرانی آرٹ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے؛ ایرانی آرٹ کے عمدہ اور نادر نمونے جمع کیے، عجائب خانوں کی ترتیب و تنظیم میں مدد دی، مختلف صنائع و حِرَف کے متعلق مختلف یونیورسٹیوں اور علمی مجلسوں میں لیکچر دیے اور علمی رسائل میں فنون جمیلہ پر مقالات لکھے ۔ ۱۹۳۰ء میں لنڈن میں ایرانی آرٹ کی جو بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی اس کی تنظیم میں بھی اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ وہ چند سال تک سان فرانسسکو کے عجائب خانے کا مدیر رہا اور امریکہ میں متعدد علمی اداروں کی بنیاد ڈالی، جن میں Iranian Institute خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ اس نے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں مشرقی ملکوں اور خصوصاً ایران کی سیر و سیاحت کی ہے اور وہاں کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے ۔

جہاں تک تالیف و تصنیف کا تعلق ہے پروفیسر پوپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایرانی آرٹ کے متعلق ایک جامع کتاب A Survey of Persian Art کے نام سے فضلا کی ایک کثیر جماعت کے تعاون سے مدوّن کی، جو ۱۹۳۸ء میں چھے ضخیم جلدوں میں آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے شائع ہوئی ۔ اس میں اپنے اپنے فن کے پینسٹھ متخصص حضرات نے مختلف ابواب لکھے اور ان میں ایران کے مختلف صنائع و حِرَف، مثلاً فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، کوزہ گری، پارچہ بافی، قالین سازی، فلز کاری وغیرہ فنون پر سیر حاصل بحث کی اور اپنے مفہوم و مطلب کی وضاحت کے لیے بہت سی تصاویر بھی شامل کی ھیں، جن کی تعداد پندرہ سو تک پہنچتی ہے ۔ ان کے علاوہ ان مجلدات میں ۴۰۰ نقشے بھی ھیں ۔ الغرض یہ مجموعہ عہد حاضر میں اپنے باب میں ایک فقید المثال علمی اور فنّی تحفے کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے تمام اھلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب : فرہنگ خاور شناسان، تہران، ص ۲۶۳؛ (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، قاھرہ ۱۹۶۵ء، ۳ : ۱۰۰۹ .

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **پوپر** : ولیم پوپر William Popper، ریاست ھاے متحدہ امریکہ کے عربی‌دان مستشرقین میں ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے ۔ وہ سینٹ لوئی (مسوری) میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا اور نیویارک کی جامعۂ کولمبیا میں اس نے پروفیسر گوٹھائل (Gottheil) سے اکتساب فیض کیا اور بعد ازاں شٹراسبورگ کی یونیورسٹی میں پروفیسر نولدکہ کا بھی شرف تلمّذ حاصل کیا ۔ مشرقی ملکوں کی سیر و سیاحت کے بعد جب وہ وطن واپس آیا تو

۱۹۰۵ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں درس و تدریس پر مقرر ہوا اور بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں سامی زبانوں کا پروفیسر ہوگیا۔

پروفیسر پوپر کو مصر کے مملوکی عہد سے خاص دلچسپی رہی ہے؛ چنانچہ اس نے اس ضمن میں مشہور مصری مؤرخ ابن تَغری بِردی [رک بآں] کی دو تاریخی کتابوں کو کمال استقلال اور جانفشانی سے شائع کیا اور انھیں تاریخوں کی محتثانہ اشاعت اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تصور ہوتا ہے ۔ اس سے پہلے ولندیزی مستشرق یوئن بول (Juyn boll) نے ابن تغری بردی کی کتاب النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر و القاھرۃ کی اشاعت شروع کی تھی، لیکن وہ اس کی ایک دو جلدوں سے زیادہ مرتب نہ کر سکا تھا ۔ پوپر نے اس ناتمام کام کو ہاتھ میں لیا اور ۱۹۰۹ء میں اس کی تصحیح و تدوین کی ابتدا کر دی ۔ بیس سال تک یہ کتاب متواتر بریل Brill (لائڈن) کے مطبع سے بالاقساط شائع ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں اس کی طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ اس کے بعد مصر میں دارالکتب المصریہ کے اہتمام سے اس کتاب کا جو اڈیشن شائع ہوا وہ بیشتر اسی مغربی اڈیشن پر مبنی ہے، لیکن اس کے باوجود اس پر مصری ناشرین کی طرف سے ''الطبعۃ الاولٰی'' (بار اول) کے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں۔

پروفیسر پوپر نے النجوم الزاھرۃ کی اشاعت سے فراغت پانے کے بعد ابن تغری بردی کی ایک اور تصنیف یعنی حوادث الدّھور فی مَدَی الایام والشّھور کی تصحیح و ترتیب کا بیڑا اٹھایا اور دس بارہ سال کے عرصے میں اسے چار اجزا میں مکمل کر دیا (مطبوعۂ لائڈن ۱۹۳۰ تا ۱۹۴۲ء)۔

پروفیسر پوپر کے علم و فضل کی بنا پر اس کے ہمعصر فضلا اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں اس کے احباب نے اس کے اعزاز میں علمی مقالات کا ایک یادگار مجموعہ بعنوان *Semitic and Oriental Studies* شائع کر کے پروفیسر پوپر کی خدمت میں پیش کیا (کیلیفورنیا یونیورسٹی پریس، برکلے ۱۹۵۱ء)۔

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی: المستشرقون، قاھرہ ۱۹۶۵ء، ۳ : ۱۰۱۵؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات۔

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **پوٹھوھار** : رک بہ پاکستان؛ پنجاب۔

⊗ **پوٹھوھاری** : رک بہ پنجابی۔

* **پورٹ سعید** : (ع : بور سعید)، بحیرۂ روم پر مصر کی ایک بندرگاہ، جو نہر سویز کے دہانے پر اس کے مغربی کنارے ۳۱ درجے ۱۵ دقیقے ۵۰ ثانیے عرض بلد شمالی، ۳۲ درجے ۱۸ دقیقے ۳۲ ثانیے طول بلد مشرقی پر واقع ہے ۔ قاھرہ سے ریل کے ذریعے براہِ زقازیق و اسمعیلیہ ۱۴۵ میل اور براہِ ساحل دمیاط سے چھتیس اور اسکندریہ سے ۱۲۵ میل کا فاصلہ ہے ۔ جب مصر کے نائب السلطنت (وائسرائے) سعید پاشا (رک بآں) کے عہدِ حکومت میں نہر سویز بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو اسی وقت ۱۸۵۹ء میں سعید پاشا کے نام پر پورٹ سعید کی بنیاد رکھی گئی ۔ ریگستانی زمین کی ایک پٹی جو کم و بیش دو سو سے تین سو گز تک چوڑی ہے، جھیل منزلہ اور بحرِ روم کے درمیان حائل تھی ۔ موجودہ شہر کا مقام تہ آب رہتا تھا ۔ یہ مقام انجینئروں کی ایک جماعت نے، جو لاروش Laroche اور د لسپس de Lesseps کے زیرِ قیادت تھی، انتخاب کیا ۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ یہ خاکنائے کے پار سویز تک قریب ترین جگہ تھی، بلکہ یہ تھا کہ یہاں پانی کی گہرائی تجویز کردہ نہر کی ضرورتوں کے عین مطابق نظر آئی ۔ جونہیں نہر پر

کام شروع ہوا، لکڑی کے پانچ مکانات پانی پر تیار کر دیے گئے، جن کو بڑے بڑے بھاری کھمبوں پر اٹھایا گیا تھا اور ان میں ایک جدید قسم کا تنور (بیکری) اور ایک تقطیر آب کا کارخانہ بھی تھا کہ ان اوّلیں کام کرنے والوں کے کام آئے۔ ایک سال بعد سمندر کی تہ سے کیچڑ نکالنے والے آلات نے نئی بندرگاہ کے پانی کو گہرا کرنا شروع کیا اور جو کیچڑ نکالی جاتی تھی وہ ساتھ کے ساتھ مزید عمارتوں کے لیے کام میں لائی جاتی تھی، چنانچہ تھوڑی سی مدت میں ۱۵۰ مکانات اور ۱۰۰ بنگلے تعمیر ہوگئے؛ انھیں کے ساتھ ایک ہسپتال، ایک کیتھولک اور ایک آرتھوڈکس Orthodox فرقے کا گرجا اور ایک مسجد بنائی گئی۔ ان کے علاوہ مرمّت کے کارخانے بنائے گئے، جو سب ملا کر تیس ہزار مربع میٹر پر پھیلے تھے؛ لیکن یہ بھی روز افزوں آبادی کے لیے کافی نہ تھے، کیونکہ نہر پر اسمٰعیلیہ کی طرف کام بڑھ رہا تھا۔ اس وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اور پورٹ سعید سے مناسب حال فاصلے پر پتھر کی کانیں نہ ہونے کی وجہ سے ایسے مصنوعی پتھر تیار کیے گئے جن پر سمندر کا پانی اثر نہ کر سکے۔ یہ کام دسو Dussaud کمپنی نے ۱۸۶۵ء میں شروع کیا۔ پتھر بنانے کی تفصیلات علی پاشا مبارک کی خطط (۱۰ : ۳۸ تا ۴۰) میں تحریر ہیں۔ مصنوعی پتھروں میں ہر ایک کا وزن تقریباً بائیس ٹن تھا اور یہ بیرونی بندرگاہ کے دو بہت بڑے بحری پشتے بنانے کے علاوہ مزید عمارتی زمین تیار کرنے میں استعمال ہوتے تھے۔ اسی سال نہر پر ڈاک کی دخانی کشتیاں اسمٰعیلیہ تک چلنے لگیں اور دساور کا مال بھی ان کشتیوں میں پورٹ سعید آنے لگا۔ ۱۸۶۸ء میں یہ بحری پشتے تیار ہو گئے اور ۱۸۶۹ء میں نہر مکمل ہو گئی۔ پھر تو پورٹ سعید مختلف قوموں کے نمائندوں اور قنصلوں سے معمور ہو گئی اور آبادی دس ہزار تک پہنچ گئی۔

اس زمانے میں عالم مشرق کی اکثر نئی بستیوں کی طرح پورٹ سعید میں بھی ابتدا سے مصری اور یورپی محلّے الگ الگ بنے۔ مصری بستی مغرب اور جنوب مغرب میں مسجد کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ سرکاری طور پر اس کا افتتاح بروز جمعہ، ۱۴ شعبان ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء کو ہوا۔ اہل یورپ کا محلّہ نہر کے دہانے اور ساحل کے قریب شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ آب رسانی کا باقاعدہ انتظام کر دیا گیا، یعنی نہر اسمٰعیلیہ کے ذریعے اور نلوں کی وساطت سے نیل کا پانی ایک بڑے ذخیرۂ آب تک پہنچایا گیا، جس میں متعدد دنوں تک کے لیے آب رسانی کی گنجائش تھی۔ پورٹ سعید کی سرعت سے ترقی کا ثبوت اس کی آبادی میں روز افزوں اضافے سے مل سکتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں یہ آبادی ۴۹،۸۸۴ تھی۔ [۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۱۷۸۴۳۰ تھی، جو ۱۹۶۵ء میں اڑھائی لاکھ کے قریب ہوگئی، لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس میں بہت کمی آ چکی ہے].

شہر نے اس لیے اور بھی جلد اہمیت حاصل کرلی کہ مصر کے دساور مال کی بڑی منڈی بن گیا، چنانچہ اسکندریہ کے بعد ملک میں دوسرا درجہ اس کا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مشرق و مغرب کے درمیان بحری آمد و رفت کے لیے بہت ہی اہم مقامات میں سے ایک ہو گیا ہے۔ نہر سویز کی راہ چلنے والے جہازوں کے لیے کوئلا لینے کا یہ اہم مقام اور اعلٰی درجے کی تجارتی منڈی ہے۔ اس کی بیرونی لنگر گاہ ۵۷۰ ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے، اس کے دو بندوں یا پشتوں میں، جو اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہر کو سمندر کے پانی اور ریت کی رَو کے مسلسل حملے سے محفوظ رکھ سکیں، نیز مغربی کنارے پر اس کی

گودیوں میں، جو ابتدا میں تین تھیں، ان سب میں توسیع کی گئی۔ ایک بڑی تیرتی گودی (۲۰۹ فٹ لمبی، پچاسی فٹ چوڑی اور اٹھارہ فٹ گہری، جو ساڑھے تین ہزار ٹن وزن اٹھا سکتی ہے) تیار کی گئی اور ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۹ء کے مابین مشرقی کنارے پر نئی گودیاں تعمیر کی گئیں۔ ان گودیوں میں کام کرنے والوں کے رہنے کے لیے مشرق کی جانب پورٹ فؤاد نام کا ایک نیا قصبہ بسایا گیا، جس کا نام مصر کے بادشاہ فؤاد اوّل کے نام پر رکھا گیا۔

ان جہازوں کی حفاظت کے لیے جو رات کے وقت نہر کی طرف آتے ہیں خدیو اسماعیل نے حکومتِ مصر کے خرچ پر رشید Rosetta، بُرلُس Burullus، دمیاط کے قریب برج العزبہ، اور پورٹ سعید کے مقامات پر چار منارے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ مؤخّر الذّکر ۱۷۴ فٹ بلند ہے۔ اس کی روشنی کی شعاع باقی تینوں کی روشنی سے ممتاز ہے اور بیس میل کے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ یہ مغربی پشتے کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی پشتے کی بحری سمت کے سرے پر فرمییہ E. Fermiet کا بنایا ہوا فرڈیننڈ د لسپس Ferdinand de Lesseps کا دیو پیکر مجسمہ استادہ ہے جس کی ۱۸۹۹ء میں نقاب کشائی کی گئی۔

پورٹ سعید کی ممتاز عمارتوں میں سوئز کینال کمپنی کے دفاتر ہیں۔ شہر میں کثرت سے ملک ملک کے لوگ رہتے ہیں، مگر یہاں کی کوئی صنعت مشہور نہیں۔ چھوٹے دکان دار مشرق یا مغرب کی طرف سیاحت کرنے والوں کے ہاتھ مشرقی سامان یا نادرات بیچ کر بسر اوقات کرتے ہیں۔

مآخذ: بڑا معاصر مأخذ ہے (۱) علی پاشا مبارک: الخطط التوفیقیۃ، ۲۰ جلد، قاہرہ (بولاق) ۱۳۰۵-۱۳۰۶ء؛ نیز دیکھیے (۲) نہر سویز اور اس کی تاریخ پر تالیفات؛ (۳) سالانہ تقاویم، اعداد و شمار اور تجارتی گوشوارے شائع کردۂ حکومت مصر و سویز کینال کمپنی؛ (۴) مصر کی بابت رہنما کتابیں، مثلاً از بدکر Baedeker، از مرّے Murray (طبع Mary Brodrick) و از کُک Cook (طبع Sir E. A. Wallis Budge)۔

(A.S. ATIYA)

پُورٹو نُووو: Porto-Novo، جنوب مغربی افریقہ میں گھانا اور نائیجیریا کے درمیان لاگوس Lagus کے مغرب میں، ساحل سمندر سے کچھ ہٹ کر کوئی ساٹھ میل کے فاصلے پر جمہوریۂ دہومی Dahomey [رکّ بآں] کا دارالحکومت، جو ۶ درجے ۲۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۲ درجے ۴۳ دقیقے طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ پورٹو نووو ریلوے سٹیشن بھی ہے اور اس طرح اندرون ملک سے اس کا رابطہ قائم ہے؛ لاگوس اور دوسرے شہروں کے ساتھ بھی اس کے ذرائع رسل و رسائل موجود ہیں۔ دہومی کے جنوبی حصے میں ساحل سمندر کے قریب جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے، جن میں چھوٹے جہاز چل سکتے ہیں۔ یہ جھیلیں باہم ملی ہوئی ہیں اور دو مقامات پر سمندر کے ساتھ بھی مربوط ہیں۔ ان میں سے ایک جھیل کا نام پورٹو نووو ہے (پورٹو = جھیل)، جس کے شمالی سرے پر پورٹو نووو شہر آباد ہے [آبادی: تقریباً ۶۰ ہزار]۔ عہد قدیم میں اس قصبے کے متعدد نام رہے ہیں۔ اسے پورٹو نووو کا نام پرتگیزوں نے سترھویں صدی میں دیا تھا [مزید تاریخی تفصیلات کے لیے رکّ بہ دہومی]۔

مآخذ: (۱) World Muslim Gazetteer، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۹۹ تا ۱۰۰؛ (۲) Melville J. Herskovitz: *Dahomey, ancient West African Kingdom*، ۱۹۳۸ء؛ (۳) *Dohamey*، انگلستان کے محکمۂ خارجہ کی ایک یادداشت، ۱۹۲۰ء؛ (۴) P. Bouche: *Ewe-Speaking Peoples of the Slave Coast*، ۱۸۹۰ء؛ (۵) *Encyclopaedia of*

Britannica، بذیل مادّۂ Dahomey.

(۲) پورٹو نووو کے نام سے بھارت میں پانڈی چری کے قریب جنوبی جانب بھی ایک ساحلی شہر ۱۱ درجے ۳۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۹ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد مشرقی پر مدراس کے ضلع ارکاٹ کے جنوب میں مدراس سے ایک سو چوالیس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ یہاں سلطان حیدر علی سے انگریزوں کی ۱۷۸۱ء میں جنگ ہوئی تھی۔

(عبدالمنان عمر)

* **پوست** : فارسی : ڈھال؛ ترکی : پوستکی؛ کمایا ہوا بھیڑ کا چمڑا، جو درویش فرقے کے کسی پیر یا شیخ کے لیے رسمی سجادے یا تخت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے سر، دونوں پہلوؤں اور پائیں سے بھی روحانی اسرار منسوب کیے جاتے تھے۔ یہ عربی ''بساط'' کا مترادف ہے۔ بقول اولیا چلبی (استانبول، ۱ : ۴۹۵)، مرید اپنے مرشد کی آزمائش میں پورا اترنے کے بعد ''صاحب پوست'' کہلاتا ہے۔ بکتاشی فرقے کی رسمی تقریبات میں صدر دالان یا خانقاہ کو بارہ اماموں کی یاد میں سفید بھیڑ کی بارہ پوستوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔

مآخذ : (۱) J.p. Brown : *The Darvishes*، اوکسفرڈ ۱۹۲۷ء؛ (۲) G. Jacob، در *Türkische Bibliothek*، ج ۹، برلن ۱۹۰۸ء؛ (۳) H. Thorning، وہی کتاب، ج ۱۶، ۱۹۱۳ء۔

(R. Levy)

⊗ **پوکاک** : ایڈورڈ پوکاک (پوکوک) Edward Pococke، انگلستان کا ایک مشہور عربی دان مستشرق، جو بلاد مغرب میں سترھویں صدی کے مستشرقین میں ایک بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا، جو ۱۶۰۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اوکسفرڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ پوکاک نے اوائل عمر ہی میں عربی کی تحصیل شروع کر دی تھی اور اس سلسلے میں ولیم بیڈویل جیسے فاضل سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں اس نے بلاد مشرق کا سفر اختیار کیا اور حلب (شام) کے شہر میں پانچ برس گزارے، جہاں اس نے بہت سے علما سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ ان علما میں شیخ فتح اللہ قابل ذکر ہیں، جن سے پوکاک نے عربی پڑھی اور جن سے پوکاک کے دوستانہ مراسم تمام عمر قائم رہے۔

جب ۱۶۳۶ء میں پوکاک انگلستان واپس آیا تو انھیں ایام میں لنڈن کے اسقف اعظم ولیم لاڈ W. Laud نے، جو اوکسفرڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے، اوکسفرڈ میں عربی کی ایک مسند (Chair) قائم کی اور پوکاک کو اسے قبول کرنے کی دعوت دی؛ چنانچہ پوکاک نے اگست ۱۶۳۶ء میں اپنے فرائض منصبی سنبھالے اور اپنے افتتاحی خطبے میں عربی زبان و ادب کی اہمیت اور ان کے مطالعے کی ضرورت بیان کی۔ ۱۶۳۶ء میں پوکاک نے دوبارہ بلادِ مشرق کا رخ کیا، استانبول میں تقریبًا تین برس گزارے اور وہاں نئی معلومات کے علاوہ بہت سی قلمی کتابیں حاصل کیں۔ ۱۶۴۱ء میں پوکاک واپس اوکسفرڈ آیا اور باقی عمر وہیں علمی کاموں میں صرف کر دی۔ پوکاک نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں سے چند ایک کے نام ذیل میں درج ہیں :

(۱) *Specimen Histtoriae Arabum*، اوکسفرڈ ۱۶۴۹ء، جس میں پوکاک نے ابوالفرج کی تاریخ سے بہت سے اقتباسات لیے ہیں اور ان پر لسانی، ادبی اور تاریخی حواشی لکھے ہیں۔

(۲) لامیۃ العجم، جو طغرائی کی ایک مشہور نظم ہے؛ پوکاک نے اسے ترجمے اور تبصرے کے ساتھ شائع کیا (اوکسفرڈ ۱۶۶۱ء)۔

(۳) المختصر فی الدول، ابوالفرج ابن العبری

کی تاریخ کا متن مع ترجمہ، مطبوعۂ ۱۶۶۳ء۔

پوکاک کے علمی کارناموں نے یورپ میں عربی علوم کی تحقیقات کے لیے ایک نیا باب کھول دیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں کے طلبہ اس کی شہرت سن کر اس سے فیض حاصل کرنے کے لیے آوکسفرڈ میں آنے لگے، کیونکہ یورپ میں ولندیزی مستشرق گولیس (Golius) کے سوا اور کوئی دوسرا عالم اس کا ہم پایہ نہ تھا - پوکاک کی وفات (۱۶۹۱ء) کے بعد اس کی عربی کتابوں کا تمام ذخیرہ آوکسفرڈ کی بوڈلین لائبریری نے حاصل کر لیا۔

پوکاک نے اپنے بعد چھے بیٹے چھوڑے - اس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام بھی ایڈورڈ پوکاک (۱۶۴۸ تا ۱۷۲۷ء) تھا، جس نے اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل کر عربی علوم میں اختصاص پیدا کیا اور منجملہ دیگر کتابوں کے مشہور اندلسی فلسفی ابن طفیل (م ۵۸۱ھ) کا رسالہ حی بن یقظان، مع لاطینی ترجمہ، بعنوان *Philosophus Autodidactus* شائع کیا - اس رسالے میں ابن طفیل نے ایک دور افتادہ شخص کا فرضی قصہ لکھا ہے، جس نے محض اپنی خداداد عقل کی روشنی میں مادّی اور روحانی زندگی کے بہت سے مراحل طے کر لیے تھے - اس رسالے کی اشاعت علمی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بہت سے علما کی رائے ہے کہ مغرب میں رابنسن کروسو *Robinson Crusoe* کی طرز کے قصے لکھنے کی تحریک ابن طفیل کے اسی رسالے سے ہوئی تھی۔

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ۲ : ۴۶۷؛ (۲) *Encyclopaedia Britannica*، بذیل مادّۂ Pococke, W.؛ (۳) *Dictionary of National Biography*، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس؛ (۴) B. Lewis : *British Contributions to Arabic Studies*، ص ۱۳ تا ۱۵، لنڈن ۱۹۴۱ء؛ (۵) J. Fück, *Die Arabischen Studien in Europa*، ص ۸۰، لائپزگ ۱۹۵۵ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

پولا : مغل شہنشاہ اکبر کے نظام زر میں $\frac{1}{4}$ دام ($\frac{1}{4}$ پیسہ) کا نام تھا۔

(J. Allan)

پولینڈ : [اس مقالے میں پولینڈ کی عمومی تاریخ اور دیگر جغرافیائی کوائف نہیں - ان کے لیے دیکھیے *Encyclopaedia Britannica* طبع آخری، موجودہ مقالے میں پولینڈ میں اسلام کا ذکر ہے]۔

یہاں جو قوم بستی ہے، اسے لِہ (Lch) کہتے ہیں، اس لیے یہ ملک لہستان بھی کہلاتا ہے - چونکہ صدیوں تک یہ ملک اور لتوانیا متحد تھے، خاص کر اس منطقے کے مسلمانوں کی تاریخ میں پولینڈ اور لتوانیا غیر منفک طور پر ملے ہوے ہیں، اس لیے یہاں دونوں کا ذکر مشترک طور پر کیا جاتا ہے۔

یہاں اسلام کی آمد کا ذکر کرنے سے پہلے کچھ اہم واقعات پس منظر کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں - یہاں کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ۱۳۸۶ء میں لتوانیا کی گرینڈڈچ حکومت میں اس کا ادغام ہے - اس زمانے میں اگر پولینڈ اتنا وسیع تھا کہ اس کے حدود میں صوبۂ گالیسیا بھی شامل تھا تو خود لتوانیا بھی سیاسی وسعت کے نقطۂ عروج پر تھا اور اس وقت اس کے خاص رقبے کے علاوہ "روس سفید" اور یوکرین کی ریاستیں بھی شامل تھیں - ۱۳۸۶ تا ۱۵۶۹ء، پولینڈ اور لتوانیا کے اس اتحاد کی نوعیت یہ تھی کہ دونوں مملکتوں کا حکمران مشترک تھا، جو لتوانیا کے خانوادۂ یاگویلّو (Jaguello) سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا تھا - یاگویلّو (۱۳۷۷ تا ۱۴۳۴ء) لتوانیا کا ایک گرینڈ ڈیوک تھا، جو ۱۳۸۶ء میں پولینڈ سے وقتی اتحاد کا باعث بنا - یہ گیدیمین (Guédimine)

۱۳۱۵ تا ۱۳۴۱ع) کی نسل سے تھا، جو لتوانیا کا ایک ممتاز مدبّر اور اس کی عظمت کا بانی گزرا ہے ۔ یاگویلّو کی نسل کے آخری فرد Sigismonde August (۱۵۴۸ تا ۱۵۷۲ع) نے ۱۵۶۹ع میں اس وقتی اتحاد کو دائمی اتحاد سے بدل دیا اور لتوانیا مع اپنے روسی صوبوں کے پولینڈ میں مدغم ہو گیا ۔ یہی وجہ تھی کہ جب جنگ عظیم کے بعد علاقوں کی تقسیم کے خاکستر سے پولینڈ نے دوبارہ جنم لیا تو ۱۹۲۱ع کے معاہدۂ ریگا کے مطابق اسے اس کے چند قدیمی روسی صوبے بھی واپس دلائے گئے، مگر لتوانیا کو مناسب معلوم نہ ہوا کہ قدیم اتحاد کی تجدید کرے، بلکہ اس نے مکمل آزادی کو ترجیح دی ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پولینڈ اپنے تمام روسی صوبوں سے تو محروم ہو گیا، لیکن اسے اس کے اکثر مغربی (جرمن) صوبے واپس مل گئے ۔

مسلمان یا اُردوے مُطّلا (آلتون اردو) کے تاتاری، جو چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لتوانیا میں بسنے کے لیے آنے لگے تھے ۔ ان کے ساتھ شروع ہی سے بہی خواہانہ برتاؤ رہا، جو اسلام اور عیسائیت کی شدید کشمکش کے اس دور کو دیکھتے ہوے غیر متوقع تھا؛ چنانچہ انھیں نہ صرف مکمل مذہبی آزادی ملی بلکہ مراعات بھی دی گئیں ۔ ان کے بلند تر طبقات کو بیگار میں عیسائی کسان (Serf) حاصل کرنے کا حق تھا ۔ چونکہ ان تاتاریوں کی پوری تاریخ مذکورۂ بالا زمانے سے لے کر اٹھارھویں صدی کے نصف آخر تک، جب کہ پولینڈ کا بٹوارا عمل میں آیا، لتوانیا کے ساتھ وابستہ رہی ہے، اس لیے ان کا مشہور تر نام لتوانیائی تاتاری ہے ۔ عثمانی ترک بھی انھیں ''لپکہ تاتار'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ ''لپکہ'' اصل میں ''لتوا'' کا ترکی تلفظ ہے، اور یہ ۱۹۲۱ع میں ہوا جب کہ وہ تین مملکتوں میں بٹ گئے، یعنی پولینڈ میں ۵۴۲۰ افراد لتوانیا میں تقریبًا ایک ہزار افراد اور اشتراکی روس کے علاقۂ منسک Minsk میں ۳۶۱۵ افراد ۔ چونکہ ان کی اکثریت پولینڈ میں تھی اس لیے وہ پولستانی تاتاری کہلانے لگے ۔ پھر بھی ۱۹۳۸ع میں ان کے حالات پر پولینڈ میں جو اہم کتاب شائع ہوئی اس میں انھیں لتوانی تاتاری ہی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔

ان کے لتوانیا میں آ بسنے کے بعد سے ان کی تاریخ اچھی طرح معلوم ہے، لیکن ان کے خود وہاں آنے اور ان سے وہاں اچھا برتاؤ ہونے کے اسباب پر کم توجہ ہوئی ہے ۔ آآ لائڈن، طبع اوّل، میں مادّۂ تاتار کے تحت ان کا جو مختصر تذکرہ ہے وہ محض غلط ہے ۔

۱ ۔ اصل و آغاز :

تاتاریوں کا لتوانیا ہجرت کر جانا نہ تو کوئی اتفاقی بات تھی اور نہ اس علاقے کے حکمرانوں کی رواداری کو اس میں کوئی دخل تھا، بلکہ وہ محض سیاسی صورت حال کا نتیجہ تھا؛ چنانچہ تاتاری یہ جان کر وہاں جاتے تھے کہ ان سے اچھا برتاؤ ہونے والا ہے ۔ اصل میں لتوانیا اور آلتون اُردو کی ایک شاخ، یعنی جوچی کے اولوس، آپس میں ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے ۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لتوانیوں نے قبیلہ‌واریت کی جگہ ایک مرکزی حکومت کی تدریجی تشکیل شروع کی، جو ایک گرینڈ ڈیوک کی ریاست بنی ۔ اس مرکزی نظام کی ضرورت اس بنا پر پیدا ہوئی تھی کہ ایک طرف پولینڈ کے دباؤ کا مقابلہ کیا جائے اور دوسری طرف جرمن راہبوں کے فوجی جتھوں کا، جو ان کو جبراً کیتھولک بنا لینا چاہتے تھے، حالانکہ لتوانی اپنے آبائی مذہب بت پرستی کے شیدا تھے ۔ اسے انھوں

نے اس وقت تک ترک نہ کیا جب تک وہ ۱۳۸۶ء میں پولینڈ میں مدغم نہ ہو گئے ۔ اس دہرے دباؤ کے تحت ان کے لیے سلامتی کا ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا اور وہ روس کا تھا، جو اس زمانے میں طوائف الملوکی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا؛ چنانچہ مغول نے ۱۲۲۳ء میں جب پہلی مرتبہ یورپ پر حملہ کیا تو اس وقت وہاں ستّر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں اور یہ سب ایک دوسری سے ہمیشہ برسر پیکار رہتی تھیں ۔ اس سلسلے میں قپچاق رضا کاروں کو بخوشی بھرتی کیا جاتا تھا، جو بحر اسود کے شمالی ساحل سے متصل صحرا میں بڑی تعداد میں بس گئے تھے ۔ بظاہر لتوانیوں کا روس میں پھیلاؤ پہلے منگول حملے کے زمانے میں بہت زیادہ کامیاب نہ رہا، لیکن پہلے اور دوسرے حملے کے مابین وہ اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ روس سیاہ کے علاقے میں (جو دریاے نیمن کی گزرگاہ کے درمیانی علاقے کا نام ہے) پھیل جائیں ۔ جب باتو خان ۱۲۴۲ء میں ہنگری سے واپس آیا تو نہ صرف اس نے یہ کوشش غیر ضروری خیال کی کہ لتوانیوں کو روس سیاہ سے نکال باہر کرے، بلکہ خود پولوتسک Polotsk کی ریاست بھی، جس کے بعض اضلاع جرمن سرداروں (Knights) کے قبضے میں آ چکے تھے، لتوانیوں ہی کے زیر اثر رہنے دی ۔ غرض تاتاروں کا جوا ان دونوں روسی صوبوں کی گردن پر کبھی نہ رکھا گیا، بلکہ وہ وہاں شروع ہی سے لتوانیوں کے اشتراک کے ساتھ دخیل رہے ۔ باتو خان کے اس طرز عمل کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ جرمن سرداروں کے پھیلاؤ سے واقف تھا، پھر بھی اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے روسی مقبوضات اور ان جرمنوں کے مابین ایک حاجز سلطنت قائم کرے ۔ یہی طرز عمل اس نے ریاست گالیسیا کے متعلق بھی اختیار کیا، جو براے نام آلتون اردو کے ماتحت تھی ۔ اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ اس نے تاتاریوں کو کبھی خراج دیا ہو۔

لیکن لتوانی اس قدر اولوالعزم اور سرگرم تھے کہ محض دو روسی صوبوں پر قناعت نہ کر سکے، بلکہ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں انھوں نے آلتون اردو کے روسی مقبوضات پر چھاپا مارنے کی بھی کئی بار کوشش کی، خاص کر اس لیے کہ ان علاقوں میں تاتار کہیں نہیں ملتے تھے ۔ وہ اس پر اکتفا کرتے تھے کہ ماتحت روسی رئیسوں پر اپنے قائم مقاموں کی وساطت سے اقتدار قائم رکھیں ۔ چونکہ لتوانیوں کی ایسی ہر کوشش ناکام رہی تھی، اس لیے گرینڈ ڈیوک گیدیمین (۱۳۱۵ تا ۱۳۴۱ء) کے برسر اقتدار آنے پر یہ سیاست بدل دی گئی۔

گیدیمین نے خان ازبک کی، جس کے دور حکومت (۱۳۱۳ تا ۱۳۴۱ء) میں آلتون اُردو کے اجزاے ترکیبی کی اکثریت نے اسلام قبول کیا، ہمدردیاں حاصل کر لیں اور دونوں میں بہت گہری دوستی اور اتحاد ہو گیا ۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر گیدیمین اور خان ازبک کے جانشین بھی اسی حکمت عملی پر قائم رہے ۔ ابتداءً یہ فوجی اتحاد تھا جو شروع میں ٹیوٹانی (جرمن) جنگجو سرداروں (Kinghts) کے خلاف (۱۳۱۹ء میں) اور بعد ازاں پولینڈ کے خلاف عمل میں آیا ۔ پھر جب چودھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں آلتون اُردو کمزور ہونا شروع ہوا تو ریاست ماسکو کے خلاف، جو روز بروز قوی تر ہوتی جاتی تھی، یہ اتحاد عمل میں آیا ۔ جب تک لتوانی اور آلتون اُردو پولینڈ کے خلاف متحد رہے، کاسیمیر اعظم Casimir (۱۳۳۳ تا ۱۳۷۰ء) کی کوششیں گالیسیا پر تسلط حاصل کرنے کے متعلق ناکام رہیں ۔ ۱۳۰۰ء کے آغاز

میں آلتون اُردو کی غیر جانبداری معلوم کرنے کے بعد البتہ وہ وہاں اپنا اقتدار جما سکا۔

لتوانیا اور آلتون اُردو کا سیاسی اتحاد صرف جنگی مسائل کی حد تک محدود نہ رہا، بلکہ سارے روس کو زیرِ اثر لا کر اسے آپس میں بانٹ لینا ان کا مقصد ٹھہرا ۔ جب آلتون اُردو نے پولینڈ کے خلاف لتوانیا سے حلف کا تعلق منقطع کر دیا تو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد لتوانیا نے مغربی روس کی متعدد ریاستوں (خصوصاً چرنیگوف Tchernigov اور طوروبو پنسک Tourovo-Pinsk) پر قبضہ کر لیا اور آلتون اردو اس کے خلاف احتجاج نہ کر سکا۔

۱۳۶۰ء اور ۱۳۸۰ء کے مابین آلتون اُردو (اردوے مطلا) کے اضمحلال کا پہلا دور شروع ہوا ۔ لتوانیا نے اس سے فائدہ اٹھا کر یوکرین اور روس سفید کی متعدد ریاستوں پر قبضہ کر لیا ۔ خروشیف سکی Hrovchevsky اور لوبافسکی Lubavsky جیسے مؤلفوں نے اس مسئلے کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ لتوانیا کے روس میں ان فتوحات کا باعث آلتون اردو کا غیر جانبدارانہ طرزِ عمل ہے ۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ آلتون اردو کی جب خان تقتمیش [رلکّ نان] (تختمیش) (۱۳۷۸ تا ۱۳۹۵ء) کے باعث حالت سنبھلی تو خان مذکور نے ۱۳۰۰ء کے قبل کی سرحدوں کا بالکل مطالبہ نہ کیا، بلکہ لتوانیوں کے ساتھ ہی حلف کی تجدید کی، جیسا کہ اس کے مکتوب (یارلک) بنام یاگویلّو، مؤرخۂ ۱۳۹۲ تا ۱۳۹۳ء، سے صاف نظر آتا ہے ۔ مزید برآں ایسے سکّے دستیاب ہوئے ہیں جن پر لتوانی حکمران کے نام کے ساتھ تاتاری تمغہ بھی کندہ ہے، جو اس حکمران کے آلتون اردو کے ماتحت ہونے کی علامت ہے ۔ مذکورۂ صدر مؤلفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ۱۳۰۰ء کے بعد سے لتوانیا اور آلتون اردو ان ریاستوں پر جن کا تاریخ مذکور کے بعد لتوانیا سے الحاق ہوا، ایک طرح کی مشترک حکمرانی کرتے تھے۔

روس کے اندر لتوانیا کا اس طرح پھیل جانا دراصل اس کی اندرونی سیاست کے باعث ممکن ہوا ۔ خود گیدیمین کے زمانے میں لتوانیا ایک سیاسی وحدت بن چکا تھا، جس کے باعث اسے فتوحات میں مدد ملی ۔ جب ۱۳۸۶ء میں پولینڈ اور لتوانیا کا باہم ادغام ہو گیا تو اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ۔ یہ ایک جاگیردارانہ وفاق تھا، جس کے اجزاے ترکیبی لتوانی گرینڈ ڈیوک کے تحت، علاوہ مکمل مذہبی آزادی کے، انتظامی اور معاشی خود مختاری سے بھی بڑی حد تک متمتع تھے ۔ اس سے اس بات کی توجیہ ہوتی ہے کہ کیوں روسی مؤرخوں کے مطابق روسی ریاستیں لتوانیا کی جانب ایک کشش رکھتی تھیں، یعنی لتوانیا کا روس میں پھیلاؤ بغیر کسی مقابلے یا لڑائی کے عمل میں آیا تھا ۔ یہ ریاستیں لتوانیا کو آلتون اُردو پر ترجیح دیتی تھیں، کیونکہ مؤخر الذکر (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) خراج کا مطالبہ کیا کرتا تھا ۔ یہ روسی لتوانیا کو ماسکو کی بڑی روسی ریاست پر بھی ترجیح دیتی تھیں، جو ۱۳۱۷ء کے بعد سے روسی ریاستوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر چکی تھی، مگر جس کی سیاسی حکمت عملی یہ تھی کہ تمام ماتحت ریاستیں مرکزی قوت کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔

۱۳۶۰ تا ۱۳۸۰ء میں آلتون اُردو میں جو ضعف پیدا ہوا اس سے فائدہ اٹھانے میں ریاست ماسکو نے مطلق دریغ نہ کیا ۔ وہ آس پاس کی روسی ریاستوں کو ماتحت بنا کر اپنے رقبے میں اضافہ کرتی رہی، خاص کر ریاست طویر Tver پر اس نے قبضہ جمایا، جو اس کی حریف تھی اور ازدواجی تعلقات کے

باعث لتوانیا کے حلف اور پشت پناہی سے مستفید بھی ہو رہی تھی۔ لتوانیا نے کئی بار کوشش کی کہ طویر کی گلو خلاصی کے لیے فوجی امداد کرے، مگر ہر دفعہ اسے ناکامی کا سامنا ہوا، کیونکہ اس کی مغربی سرحد پر (غالباً ماسکو کے اشارے سے) ٹھیک اسی وقت دباؤ پڑنے لگتا تھا۔

یہ بات مشہور ہے کہ آلتون اُردو کے شاہ گرد ممای سے یاگویلو نے ۱۳۷۰ء میں حلیفانہ تعلق پیدا کر لیا تھا، مگر ممای کہ روسیوں نے ۱۳۸۰ء میں ماسکو کے حکمران دمتیری کی قیادت میں مشہور جنگ کولیکوفو Koulikovo میں شکست دی تھی اور لتوانی فوجیں اس کی مدد کو بروقت نہ پہنچ سکی تھیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اس جنگ کے چند ماہ بعد آلتون اُردو کے تخت کا جائز حق دار خان تقتمیش (امیر تیمور کی مدد سے) تخت نشین ہوا اور ممای کو شکست دے کر پورے آلتون اُردو کو دوبارہ اپنے ماتحت متحد کر لیا۔ عام طور پر جنگِ کولیکوفو کے سیاسی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ تاتاریوں سے ایک بڑی جنگ کی پہلی مرتبہ جسارت کرتے ہوئے ماسکو کے اربابِ اقتدار نے خاص طور پر یہ چاہا تھا کہ خان تقتمیش سے عذر خواہی کریں اور اسے اس کے دشمن ممای کی شکست میں مدد دیں، گویا اس بات کا جائز حق جتانا تھا کہ ۱۳۶۰ تا ۱۳۸۰ء میں انھوں نے اپنی آزادی کے لیے جو لڑائی کی تھی اسے معاف کر دیا جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہو گئے، چنانچہ تقتمیش نے اس پر قناعت کی کہ ۱۳۸۲ء میں ماسکو کے خلاف ایک مہم بھیج کر اس کا مزاج تو درست کر دے، لیکن وہاں کی زمامِ حکومت دمیتری ہی کے ہاتھوں میں رہنے دے۔

آلتون اُردو کا تقتمیش کی سرداری میں دوبارہ متحد ہو جانا مشرقی ہمسایوں سے تعلقات کے سلسلے میں یاگویلو کے لیے بھی مفید ثابت ہوا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ اگر ماسکو نے ریاست طویر پر (جو یاگویلو کی ماں شہزادی یولیانا Juliana کا علاقہ تھا) حملہ کیا تو اس کا تاتاری حلیف آڑے آئے گا۔ اس طرح یاگویلو اپنی پوری توجہ مغربی سرحد پر مرتکز کرسکا، جو پہلے سے زیادہ پولینڈ اور جرمن جنگجو سرداروں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس بارے میں اس نے صرف اپنی قوت بازو پر اکتفا کی، کیونکہ تقتمیش کو مغرب کے مسائل سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تو ساری توجہ اس پر مبذول تھی کہ اپنے سابق محسن امیر تیمور کو کسی نہ کسی طرح ماتحت بنائے۔

اس زمانے میں لتوانیا ایک بڑی ریاست تھی، جو گالیشیا کو چھوڑ کر سارے مغربی روس میں پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں لتوانیوں کی مختصر سی قوم روسی عنصر میں جذب ہو گئی (کیونکہ روسیوں کا معیارِ ثقافت بہت بلند تھا) اور خاص کر یاگویلو کے کئی بھائیوں نے آرتھوڈکس عیسائی مذہب اختیار کر لیا، لیکن لتوانیوں کے روسیت اختیار کرنے کے معنی یہ تھے کہ روسی مذہب (آرتھوڈکس عیسائیت) اختیار کریں اور اس کے نتیجے کے طور پر ماسکو کے کسی حد تک ماتحت بھی بن جائیں، کیونکہ اس مذہب کے مطران پادری کا مستقر بھی ماسکو تھا۔ لیکن لتوانیوں کے اس مذہب کو اختیار کر لینے سے جرمن راہبوں کے فوجی جتھوں کا دباؤ کسی طرح نہ گھٹتا، کیونکہ وہ کیتھولک مذہب پھیلانا چاہتے تھے اور اُن کی نظر میں بدعقیدہ عیسائی (آرتھوڈکس)، بت پرست اور مسلمان سب برابر تھے۔ ان تمام وجوہ، نیز جرمن دباؤ سے نکل جانے، اور ساتھ ہی اپنی ریاست میں روسی عناصر کے ساتھ توازن پیدا کرنے اور اپنی

قوم کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے سبب لتوانیا نے اس بات کو ترجیح دی کہ پولینڈ میں مدغم ہو جائے؛ اس بنا پر سارے لتوانیوں نے کیتھولک مذہب قبول کرلیا۔ تاتاری نوواردوں سے لتوانیا کے حسن سلوک کی توجیہ بھی اسی سیاسی صورت حال کے اندر نکل آتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ لتوانیا میں تاتاریوں کی موجودگی کا سب سے پہلا تذکرہ لتوانیا اور پولینڈ کے ادغام سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ یاگویلّو کا ۱۲ فروری ۱۳۸۶ء کو کراکوف Krakaw آ کر پولینڈ کے بادشاہ کی حیثیت سے تاج پہننے اور ملکہ یدویگا (Jadviga، Hedvige) سے مناکحت کا ذکر کرتے ہوئے پولستانی مؤرّخ واکونسکی Wakowski بیان کرتا ہے کہ لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے جلو میں اس کے ذاتی محافظ فوجی سپاہیوں کے طور پر ایک تاتاری دستہ (سکواڈرن) بھی تھا؛ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا تاتاری اس سے پہلے ہی لتوانیا میں آ بسے تھے یا یہ کہ گویلو نے یہ محافظ دستہ آلتون اُردو والوں میں سے بھرتی کیا تھا۔

۱۳۹۳ء میں ایک اور اُہم واقعہ پیش آیا، جس نے لتوانیا کی قسمت پر بڑا اثر ڈالا۔ یاگویلو نے اپنے برادر عم زاد ویتولد Witold سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رُو سے ویتولد کو لتوانیا کا گورنر جنرل بنایا گیا؛ نیز اسے گرینڈ ڈیوک کا لقب عطا ہوا، اور مشرقی ہمسایوں سے تعلقات کے متعلق غیرمحدود آزادی بھی دے دی گئی۔ اس عظیم مدبّر کے زمانے میں، جو گیدیمین کی اولاد میں غالباً سب سے زیادہ قابل گزرا ہے، لتوانیا اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ یہ بتانا کافی ہے کہ جب ۱۴۳۰ء میں وہ فوت ہوا تو اُس زمانے میں سارا روس اور ماسکو کی بڑی ریاست بہر حال اس کے زیر نگین اور باجگزار ہو چکی تھی۔ آلتون اردو کے متعلق اس نے گیدیمین کی بہترین روایتوں کی پیروی کی، لیکن بد قسمتی سے اس کے برابر کے رفیق آلتون اردو میں نہ مل سکے؛ چنانچہ اس کے بر سر اقتدار آنے کے دو ہی سال بعد آلتون اردو کا دوبارہ زوال شروع ہوا، جو غیر منقطع طور پر جاری رہا۔ ویتولد پوری کوشش کے باوجود اسے روک نہ سکا۔ اس نے تاتاری نو آبادکاروں سے جو برتاؤ کیا وہ اصل میں آلتون اردو کے متعلق اس کی عام سیاسی حکمت عملی ہی کا ایک جُز تھا۔

جب ۱۳۹۵ء میں تقتمیش نے امیر تیمور کے ہاتھوں آخری شکست کھائی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لتوانیا آ کر پناہ گزین ہوا۔ یہ تاتاریوں کے لتوانیا میں بسنے کا پہلا بڑا تاریخی واقعہ ہے جو ہمیں معلوم ہے۔ ویتولد نے ان سے بہترین سلوک کیا۔ آلتون اُردو کے متعلق اس کی عظیم الشان سیاست کا اسی سے آغاز ہوا۔ ۱۳۹۷ء اور ۱۳۹۹ء میں اس نے صحرائے وسط ایشیا کی طرف متعدد مہمیں بھیجیں تاکہ تاتاریوں کو لتوانیا آنے اور تقتمیش کے رفقا کی تعداد بڑھانے کا موقع ملے اور ایک بڑی مہم کے لیے راستہ صاف ہو۔ ۱۳۹۹ء میں اس نے تقتمیش سے ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق مؤخرالذکر نے اس کے نام اپنی ساری روسی باجگزار ریاستوں کا حق منتقل کر دیا۔ پھر دونوں مل کر خان تیمور قتلغ سے لڑنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ شاہ گرد اصل میں ایدیگہ Edyguée کا، جو (آلتون اُردو کے متعلق امیر تیمور کا آلۂ کار تھا)، ساختہ پرداختہ تھا۔ اگرچہ یہ مہم ہوشیاری کے ساتھ تیار ہوئی تھی (اور سارے مغرب نے، جس میں پوپ بھی شامل تھا، اسے فوجی اور مالی مدد دی تھی)، لیکن تاتاریوں اور لتوانیوں کی مخالف فوجوں

کو فورکسلا (Vorksla) کی مشہور لڑائی میں شکست ہوئی ۔ چونکہ یہ مہم بالواسطہ امیر تیمور کے خلاف تھی (جو عثمانی ترکوں کا دشمن تھا)، اس لیے ترکوں اور پولینڈ اور لتوانیا میں ہمدردی اور دوستی پیدا کرنے کا بھی باعث بنی۔

ویتولد نے اس شکست سے ہمت نہ ہاری وہ مرتے دم تک آلتون اُردو کے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا، اور وقتاً فوقتاً تقتمیش کے تخت پر اس کے بیٹوں کو متمکن بھی کراتا رہا، لیکن بُعدِ مسافت کے باعث اس کی کوششوں کا کوئی پائدار اثر ظاہر نہ ہوا ۔ اس کا کارگر اثر آلتون اُردو میں اس کی مغربی سرحدوں خاص کر قریم (کریمیا) ہی تک محدود رہا، جیسے شوالیئے دلانوا (Chevalier de Lanoy) نے اچھی طرح واضح کیا ہے ۔ ساتھ ہی وہ اس کی بھی پوری کوشش کرتا رہا کہ تاتار زیادہ سے زیادہ تعداد میں لتوانیا میں آ بسیں، تاکہ نہ صرف آلتون اُردو کے متعلق انھیں اپنے نظریوں کا آلۂ کار بنائے، بلکہ اپنی ریاست میں لتوانیوں کے اثر کو بھی یوں مستحکم کرے؛ لہٰذا یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ پہلی تاتاری بستیاں جو لتوانیا میں بسیں پایۂ تخت کے مضافات میں تھیں ۔ جہاں تک خود تاتاروں کا تعلق ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ ان کے خاص وطن میں جو بدنظمی تھی اس کے باعث وہ بارہا جلا وطنی پر مجبور ہوے، خاص کر وہ لوگ جو کسی شکست خوردہ خان کے ملازم ہوتے تھے ۔ ہمعصر مآخذ اس بات کا اکثر ذکر کرتے ہیں کہ ویتولد کے زمانے میں جوچی کی نسل کے بہت سے آدمی لتوانیا میں رہتے تھے ۔ ان میں سب سے مشہور خان حاجی گرای تھا، جو لتوانیا میں پیدا ہوا ۔ اسی کی مدد سے بعد کو وہ قریم (کریمیا) پر قابض ہو گیا۔

ویتولد کی اس سیاسی حکمت عملی پر اس کے جانشین بھی برابر قائم رہے، زیادہ صحیح میں یاگویلو کی اولاد، کیونکہ ویتولد نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی۔

۲ ۔ تاریخ :

ویتولد کی وفات پر لتوانیا میں اندرونی خلفشار شروع ہو گیا، جس کے باعث آلتون اُردو اور اس کے باقی ماندہ اجزاے ترکیبی کے متعلق بھی اس کی سیاست معطل ہو گئی ۔ جیسا کہ مشہور ہے آلتون اُردو کا یورپی حصہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مزید کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور قازان، قریم، استراخان اور اُردوے کبیر پر الگ الگ خان حکومت کرنے لگے ۔ لتوانیا نے جو واحد کامیابی حاصل کی وہ یہ تھی کہ اس کی کوشش سے ۱۴۴۹ء میں قریم (کریمیا) میں حاجی گرای نے اقتدار حاصل کیا اور اپنی وفات (۱۴۶۶ء) تک وہ اپنے آپ کو لتوانیا کا، جو اس کا پیدائشی وطن بھی تھا، وفادار متوسل (Vassal) سمجھتا رہا ۔ قریم (کریمیا) میں صورتِ حال مستحکم ہونے تک وہاں سے تارکینِ وطن لتوانیا جاتے رہے، لیکن لتوانیا کی اندرونی صورت حال درست ہو جانے کے بعد وہاں تاتاریوں سے بڑے سیاسی اغراض کے لیے دوبارہ کام نہیں لیا گیا، اگرچہ سولھویں صدی کے اواخر تک لتوانیا کی صفوں میں جوچی کی اولاد اور احفاد موجود نظر آتے ہیں ۔ لتوانیا نے تاتاریوں سے اب صرف درمیانی اغراض، مثلاً ترجمانی کا کام لینا شروع کیا، یعنی آلتون اردو کے اجزاے ترکیبی، اور بعد میں عثمانی ترکوں سے بات چیت میں یہ لوگ سفیر یا ایلچی ہوتے تھے ۔ اس سلسلے میں ایک لتوانی تاتاری کیرئی (Cuirei) قابل ذکر ہے، جس نے ۱۴۷۰ء میں اُردوے کبیر کے خان احمد اور لتوانیا کے مابین ماسکو کے خلاف حلف کا تعلق قائم کیا تھا ۔ سولھویں صدی عیسوی

کے اواخر کے بعد سے درمیانی اغراض کے لیے بھی تاتاریوں سے بہت کم کام لیا گیا، کیونکہ وہ اپنی مادری (چغتائی) زبان بھی بھول چلے تھے۔ آخری تاتاری سفیر ۱۷۱۶ء میں خان قریم (کریمیا) کے پاس بھیجا گیا تھا۔

اس کے برخلاف ماسکو نے ویتولد کے طرزِ سیاست سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ فائدہ اٹھایا اور تقریباً ۱۴۵۲ء میں اپنی سر زمین کے اندر ریازان (Riazan) کے علاقے میں قاسموف کی خانیہ ریاست قائم کی، جس سے اُردوے کبیر کے باقی ماندہ اجزا، خاص کر قازان کی خانیہ کے خلاف خوب کام لیا۔ مزید برآں اس تاریخ کے بعد سے دربارِ ماسکو جوچی کی نسل کے لوگوں سے معمور ہو گیا، جن سے وہ چالاکی کے ساتھ لتوانیا کے خلاف کام لیتا رہا، مثلاً وہ جنگیں جو منگلی ابن حاجی گرای نے لتوانیا کے خلاف کیں۔ منگلی کے بھائی اور حریف نور دولت اور آیدر (یا حیدر) بھی ماسکو آ گئے تھے اور ان کو لتوانیا بدقسمتی سے اپنے ہاں رکھ نہ سکا تھا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے لتوانی تاتاریوں کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آلتون اُردو کی یادگار ہیں، لیکن پندرھویں صدی عیسوی کے مآخذ کمیاب ہونے کے باعث ان میں اور ان کی اصل آلتون اُردو میں ربط محض اٹکل ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اس بات کا بہت ہی کم علم ہے کہ ان کے خاندانوں نے وہاں کیا کارھاے نمایاں انجام دیے۔

لتوانیا میں تاتاری سولھویں صدی کے اواخر تک جس حسنِ سلوک سے مستفید ہوتے رہے وہ سیاسی اور انسانی دونوں نقطہ‌ھاے نظر سے عقلمندانہ تھا۔ انھیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کی مسجدوں کے لیے امام اسلامی ممالک خاص کر قریم (کریمیا) سے بلائے جا سکتے تھے۔ ان کو حج کرنے کی اجازت تھی۔ مؤخرالذکر کا ثبوت ایک اہم عثمانی دستاویز سے ملتا ہے، جو ترکی زبان میں موجود ہے، یعنی ''رسالۂ تاتارلہ'' (لہستان، یعنی پولینڈ کے تاتاریوں کے حالات؛ اسے سلطان سلیمان قانونی کے وزیر رستم پاشا کے حکم سے ۱۵۵۸ء میں ایک لتوانی تاتاری نے، جو حج کو جا رہا تھا، استانبول کے زمانۂ قیام میں مرتب کیا تھا؛ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے)۔

قانونی نقطۂ نظر سے لتوانی تاتاری براہِ راست گرینڈ ڈیوک کے متوسّل سمجھے جاتے تھے۔ ترکِ وطن کر کے آ بسنے پر ان میں سے ہر ایک کو آلتون اُردو میں اس کی جو حیثیت رہ چکی تھی، اس کے مطابق زمینیں عطا ہوئیں۔ امیر بیگ یا مرزا اوغلان میں سے ہر ایک کو، نیز جوچی کے خاندان کے لوگوں کو، جو پندرھویں صدی عیسوی کے بعد سے زیادہ تعداد میں نہیں رہے، جاگیریں عطا ہوئیں تو عام سپاھی بھی دیہات میں گروہ در گروہ بسائے گئے۔ یہ زمینیں جاگیردارانہ اصول پر عطا ہوئیں۔ تاتاری ان سے متمتع تو ہو سکتے تھے، لیکن کسی اور کے نام منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے معاوضے میں گرینڈڈیوک کی پہلی ہی طلبی پر فوجی خدمت کے لیے انھیں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس میں گرینڈڈیوک کا یہ فائدہ تھا کہ عیسائی جاگیرداروں کے برخلاف ان تاتاریوں کے طلب کرنے میں اسے اپنی مجلس پارلیمان سے اجازت لینے کی حاجت نہ تھی۔ ہر امیر اپنی جاگیر کے مطابق ایک معیّن تعداد میں سوار مہیا کرنے کا پابند تھا اور عام سپاھی بھی بذاتِ خود حاضر ہوتے تھے۔ تاتاری امیروں کی عطا شدہ جاگیریں زیادہ بڑی نہ تھیں۔ بڑے سے بڑا تاتاری آٹھ سوار پیش کر سکتا تھا، حالانکہ طاقتور لتوانی جاگیردار طلبی پر پانچ پانچ سو سوار

تک پیش کرتے تھے - بہرحال تاتاریوں پر فوجی خدمت کا یہ التزام اس امتیاز کا حامل تھا کہ وہ اپنی مستقل فوجی جمعیتیں قائم کرتے اور خود اپنے آدمیوں کو افسری پر مامور کرتے تھے - ان جمعیتوں کے ناموں میں آلتون اُردو کے اثرات نظر آتے ہیں - زیادہ صحیح الفاظ میں ان قبائل کے نام، جن سے ان کے مختلف گروہ تعلق رکھتے تھے، یہ چھے تھے: اویشون (Ouichoune)، نیمان (Naiman)، جلائر (Djalair)، کونگرات (Koungrate)، برین (Barine) اور اوغلان (Uhlān) - اوّل الذکر پانچ قبائلی نام ہیں، جو ترکوں اور منگولوں کے درمیان وسطی ایشیا اور قریم (کریمیا) میں ہمیشہ رائج رہے ہیں - آخری لفظ اوغلان، جس کے لفظی معنے بچے کے ہیں، ایک افسرانہ رتبہ تھا، جو آلتون اُردو میں عطا ہوتا تھا - بلند درجے کے تاتاریوں کو یہ حق بھی تھا کہ بیگار کے عیسائی کسانوں کے مالک بنیں - ایک تیسرا طبقہ عوام (پرولتاری) کا بھی تھا، جو شہروں میں رہتا اور دباغت، حمل و نقل، باغبانی اور ڈاک رسانی کا کام انجام دیتا - یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان قیدیوں کی اولاد تھے جو پندرھویں صدی کے اواخر کے بعد سے قریم (کریمیا) سے جنگوں میں گرفتار کر کے لائے گئے تھے - رفتہ رفتہ یہ سہ گانہ طبقاتی امتیاز جاتا رہا اور صرف تونگری اور علم کا فرق باقی رہ گیا.

اندرونی معاملات میں لتوانی تاتاریوں کو قانون شریعت پر عمل کرنے کا حق تھا - ایسے مقدمات ان کے قاضی سنتے، جو عام طور پر مسجدوں کے امام ہوتے تھے - ۱۵۹۳ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کے اوپر لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے علاقے کے سارے تاتاریوں کا قاضی تھا، جس کے نام کے ساتھ درویش حاجی کے القاب شامل تھے - تاتاری اپنی مرضی سے اسلامی عدالتوں کے بجائے ملک کی عام عدالتوں سے بھی رجوع کر سکتے تھے، جہاں لتوانی قوانین کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا.

لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک ان تاتاریوں پر جس قدر اعتماد کرتے تھے، اس کا پتا یوں بھی چلتا ہے کہ یہ اکثر ان کے جلو میں محافظ دستے کے طور پر رہتے تھے - سولھویں صدی کے وسط کے بعد سے لتوانیا میں تنخواہ‌دار سپاہی رکھے جانے لگے - اس بارے میں تاتاریوں کا حق دوسرے ملکیوں کے برابر تھا، البتہ انھیں اٹھارھویں صدی کے اواخر تک سیاسی حقوق عطا نہیں ہوے تھے؛ وہ نہ تو مرکزی یا صوبائی مجالس شوری کے رکن بن سکتے تھے، نہ عام ملکی نظم و نسق کے محکموں میں ملازمت کر سکتے تھے.

سولھویں صدی کے اواخر سے پہلے بھی بعض وقت صوبائی افسر تاتاریوں کے حقوق میں دست‌اندازی کرتے تھے، لیکن یاگویلو خانوادہ ہمیشہ ان کی مدد کو آتا اور انصاف کرتا - یاگویلو خانوادے کے آخری حکمران نے تو ۱۵۶۸ء میں ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ان کے اور عیسائی امرا کے حقوق مساوی ہیں، لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر تک اس پر عمل نہ ہوا.

سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب یاگویلو خانوادہ ختم ہوا تو تاتاریوں پر مذہبی مظالم بھی شروع ہو گئے - چند عورتوں کو اس بہانے زندہ جلا دیا گیا کہ وہ جادوگر ہیں - مساجد کی تعمیر بلکہ مرمت تک ممنوع قرار دی گئی - ان کا عیسائی عورتوں سے نکاح ممنوع ہوا - ایک روایت، جس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا، یہ چلی آتی ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر تک عیسائی ماؤں کے بچے باپ کے مذہب پر مسلمان سمجھے جاتے

تھے ـ بعض کا خیال ہے کہ اسی مخلوط نکاح کے باعث وہ اپنی اصلی (تُرکی) زبان بھول گئے ـ ان کے متعدد خانوادوں کے نام بھی صقلبی (slav) ہیں، جو ننھیال کے نام ہیں ـ عیسائی عورتوں سے نکاح کا حق پولینڈ میں اس کے زمانۂ احیا (۱۹۱۹ء) تک ان کے لیے ممنوع رہا ـ ان تاتاریوں میں تعدّدِ ازدواج کا بھی پتا نہیں چلتا ـ ان کی عورتیں زندگی کی عام روش میں عام عیسائی عورتوں سے مختلف نہ تھیں ـ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے ان میں خاندانی نام رائج ہونے لگے، ورنہ اس سے پہلے شخصی نام ہوتے تھے ـ مذکورۂ بالا مذہبی مظالم زیادہ دنوں تک جاری نہ رہے، کیونکہ ایک تو تاتاری بہت منتشر طور پر بسے ہوے تھے، دوسرے ان کی تعداد بہت کم تھی (اس زمانے میں وہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھے)، تیسرے یہ کہ بادشاہ کو ان کے سواروں کی ضرورت تھی اور عام عیسائی امرا بھی ان کو اپنے ذاتی محافظ دستے میں بھرتی کرنے کے شائق تھے۔

لیکن ان کی تاریخ کا سب سے مشکل دَور ۱۶۵۵ تا ۱۶۶۰ء تھا جب کہ علاقۂ ولنو پر ماسکو کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور پولینڈ والوں پر سویڈن کے لوگوں نے حملہ کر دیا ـ بہت سے تاتاری بھاگ کر ترکیہ چلے گئے، لیکن راستے میں لٹیروں اور سویڈن کے حامیوں نے ان میں سے بہتوں کو مار ڈالا ـ اسی زمانے میں تاتاریوں کے فوجی دستے یوکرین کے قازقوں سے جنگ میں مشغول تھے، لیکن چونکہ سرکاری خزانہ خالی تھا اور کئی سال سے ان تاتاریوں کو تنخواہ نہیں ملی تھی، اس لیے ان میں سے کچھ ترکیہ چلے گئے ـ پولینڈ کی صورت حال بحال ہونے پر ان میں سے کچھ واپس بھی گئے اور بادشاہ یان سوفیسسکی Jansovieski (۱۷۷۴ تا ۱۷۹۶ء) کی سفارش پر، جو انہیں بہت پسند کرتا تھا، ان کا قصور معاف کر دیا گیا ـ قتل اور خلفشار کے اس دَور میں تاتاریوں کی تعداد خاصی گھٹ گئی۔

۱۷۰۳ تا ۱۷۰۹ء کی خانہ جنگی میں بھی ان کا یہی حال ہوا، مگر کسی قدر چھوٹے پیمانے پر، جب کہ روس کا پیٹر اعظم اور سویڈن کا چارلس دوازدھم دخل انداز ہوے اور تاتاری مجبور ہوگئے کہ کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیں ـ اس زمانے میں بھی ترکیہ کی طرف تاتاریوں کی نقل مکانی کا پتا چلتا ہے، جہاں حالت امن میں بھی ان کے لیے ایک کشش تھی اور اب پولینڈ کی حالت جنگ میں تو یہ اور بھی بڑھ گئی۔

اوغلان (= ہلکے سواروں) کا، جن کے لیے یورپ کی ساری زبانوں میں لفظ بگاڑ کر اولان Uhlan مستعمل ہے، دراصل انہیں لتوانی تاتاریوں سے آغاز ہوا ـ بادشاہ آگسٹ دوم (۱۶۹۷ تا ۱۷۳۳ء)، جو ساکسنی کا بھی بادشاہ تھا، کرنل علی اوغلان کی تاتاری جمعیّت کا اتنا شیدا تھا کہ ان کو ۱۷۱۷ء میں ڈریسڈن (جرمنی) لے گیا ـ یہاں ان تاتاری سواروں نے ایسی ہردلعزیزی حاصل کی کہ کرنل کی طرح سارے سوار اولان Uhlan کہلانے لگے اور دوسرے جرمن حکمرانوں نے بھی مماثل جمعیتیں قائم کیں ـ انہیں اسی قسم کے ہتھیار دیے اور اسی قسم کے جنگی گر سکھائے اور ان کو اولان ہی سے موسوم کرنے لگے ـ یورپ کی اُولان سوار جمعیتوں میں سر پر جو خود استعمال ہوتے ہیں وہ بھی تاتاری نمونے کے ہیں۔

جب اٹھارھویں صدی عیسوی میں پولینڈ میں باقاعدہ فوج رکھی گئی تو تاتاریوں نے بھی اس میں بڑی تعداد میں حصہ لیا، اور اس صدی کے وسط میں تو ان کا ایک فرد جرنیل بھی بن گیا ـ پولینڈ کا آخری بادشاہ سٹینسلاس آگسٹ (Stanislas

August ۱۷۶۴ تا ۱۷۹۴ء) ان کے ساتھ خاص طور پر اچھا برتاؤ کرتا رہا، چنانچہ اس نے ان کے پرانے امتیازات بحال کر دیے۔ اظہار شکر گزاری کے طور پر انھوں نے ۱۷۹۲ تا ۱۷۹۴ء کی جنگ آزادی میں اس کے تخت کی حفاظت کے لیے سواروں کی چھے رجمنٹیں قائم کیں۔

جب ۱۷۹۴ء میں پولینڈ کی آخری بار تقسیم عمل میں آئی تو یہ تاتاری روس کے ماتحت ہو گئے۔ روس کی ملکہ کیتھرائن دوم (۱۷۶۲ء تا ۱۷۹۶ء) کو سیاست خارجہ میں کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی مسلمان رعایا کی بغاوتوں کے استیصال اور ان کی حالت سدھارنے کے لیے بھی وسیع مذہبی رواداری کا ثبوت دیا تھا۔ اب اس نے تاتاریوں کو پولینڈ کا ساتھ نہ دینے پر مائل کرنا شروع کیا، چنانچہ ۱۷۹۴ء کے ایک فرمان میں اس نے اپنی سلطنت کی ملکی اور فوجی تمام ملازمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے۔ اس کے بیٹے پال اول (۱۷۹۶ تا ۱۸۰۱ء) نے ۱۷۹۷ء میں سواروں کا ایک دستہ قائم کیا، جو صرف تاتاریوں پر مشتمل تھا۔ اس کے جانشینوں نے تاتاری امرا کو روسی امرا کے ساتھ مساوات عطا کی۔ مذہبی مسائل میں انھیں قریم (کریمیا) کے محکمۂ افتا کے ماتحت کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۸۱۲ء میں نپولین اول نے روس پر حملہ کیا اور چاہا کہ ایک پوری تاتاری رجمنٹ تیار کرے تو اسے ایک دستے سے زیادہ کے لیے رضا کار نہ مل سکے۔ اس دستے نے ۱۸۱۳ء کے معرکۂ فرانس میں پورا حصہ لیا۔ انھیں اسباب سے ۱۸۳۱ تا ۱۸۶۳ء کی پولستانی بغاوتوں میں تاتاری زیادہ حصہ نہ لے سکے۔

اگر پولینڈ کی تقسیم تک ان تاتاریوں میں مغربی انداز کی تعلیم بہت ہی پست درجے کی تھی تو روسی قبضے کے بعد اس کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی، خصوصاً ان لوگوں میں جو فوج میں ملازم ہو گئے تھے، جہاں اور پیشوں کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ کشش تھی۔ اس کی بہترین مثال پہلی عالمگیر جنگ میں ملتی ہے، جب روسی فوج میں بیس تاتاری جرنیل تھے؛ چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کا تو شمار نہیں۔ ان جرنیلوں میں سب سے مشہور یعقوب یوسفووچ تھا، جو شروع میں قفقازی ڈویژن موسوم بہ ''وحشی'' کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس ڈویژن کا کمانڈر زار روس کا بھائی مائیکل تھا۔ یعقوب جنگ کے آخری زمانے میں جرمن محاذ پر ایک پوری فوج کا کمانڈر بن گیا تھا۔

۱۸۶۳ء کی پولستانی بغاوت تک ان تاتاریوں میں پولستانی تہذیب غالب تھی۔ اس کے بعد سے انھوں نے روسی اثرات قبول کیے اور اب تو ان کی اکثریت دو زبانیں (پولستانی اور روسی) بولتی ہے۔ ان کی پولینڈ سے وابستگی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ حکومت پولینڈ کے صدر مارشل پلسودسکی Pilsudski کے قریب ترین رفقاے کار میں ایک تاتاری Alexander Sulkiewicz بھی تھا۔

ہمارے مآخذ میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ پندرھویں صدی عیسوی میں ان تاتاریوں کا معیار تہذیب کیا تھا؛ سولھویں صدی عیسوی میں البتہ اسلامی ممالک، خصوصاً عرب، میں تعلیم پائے ہوے افراد کے باعث وہ خاصا بلند ہوگیا۔ اس کا پتا اس مذہبی لٹریچر سے چلتا ہے جو انھوں نے سفید روسی اور پولستانی زبانوں میں (جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں) پیدا کیا، مثلاً عربی زبان و خط سکھانے کی کتابیں، قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر، سیرة النبیؐ، کتب تاریخ و دینیات، کتب حمائل (جن میں قرآن مجید کی ضروری سورتوں کے علاوہ عبادات کی بہت سی دعائیں بھی ہوتی

تھیں) ۔ بعض کتابیں ان لوگوں نے چغتائی زبان میں بھی لکھیں، مگر یہ کتابیں بہت نادر ھیں ۔ روسی مستشرق کراچ کوفسکی Kratch Kovski نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ تاتاریوں کے اس مذہبی لٹریچر پر تحقیقی کام اب تک نہیں ھوا ۔ قرآن مجید کے کئی مکمل یا نامکمل ترجمے پولستانی میں (بخطِ لاطینی) ملتے ھیں ۔ ان میں سے ایک، جو سوبولیفسکی (Sobolewski) کی طرف منسوب اور بظاہر ناتمام ھے، ۱۸۲۸ء میں طبع ھوا ۔ مکمل ترجمہ ایک تاتاری مسلمان مرزا طارق بوچاتسکی Jan Murza Tarak Buczacki نے دو جلدوں میں ۱۸۵۸ء میں وارسا میں طبع کیا ۔ منتخب سورتیں (عربی مع ترجمہ) پولینڈ کے مفتی یعقوب شنکئے وچ (J. Szynkiewicz) نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیں ۔ قدیم عربی رسم الخط کے تراجم کو، جو بین السطور ھیں، محض نمونے کے طور پر ایک آدھ ورق فوٹو لے کر شائع کیا گیا ھے ۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں جو ھنگامے ھوئے ان کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کا معیار تہذیب گرتا ھی چلا گیا ۔ اس دورِ انحطاط میں اُن کے امام غریب ترین اور کم تعلیم یافتہ طبقے سے چُنے جاتے تھے ۔ ان کا مبلغ علم بس یہ تھا کہ عربی خط لکھ پڑھ سکیں اور نماز پڑھادیں ۔ روس کے پہلے انقلاب (۱۹۰۵ء) کے بعد نوجوان مسلمانوں میں بھی نشأة ثانیہ کی تحریک شروع ھوئی ۔ ۱۹۰۷ء میں مسلمان طلبہ نے سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) میں ایک انجمن بنائی؛ جس سے ان کے مستقبل کے رہنما پیدا ھوے ۔ اسی بناء پر ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب میں وہ غافل نہیں رہے، بلکہ روسی ھم‌وطنوں کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں خاصا حصّہ لیا؛ چنانچہ قریم (کریمیا) کی حکومت میں ۱۹۱۸ء میں مسلمان وزیرِ اعظم جنرل ماتیوش سلکئے وچ (M. Sulkiewicz) کے علاوہ تین اور وزیر تاتاری تھے ۔ آذر بیجان [رك بآں] کی حکومت میں ایک نائب وزیر اور متعدّد اعلٰی عہدہ دار بھی تاتاری تھے ۔

پولینڈ کے ۱۹۱۹ء کے احیا نے ان کا معیار تہذیب بلند کرنے میں خوب حصّہ لیا ۔ رواداری کی قدیم عمدہ روایات پر دوبارہ عمل کرتے ھوے حکومت نے انہیں مکمّل مذہبی اور مدنی آزادی دی ۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں کے مفتی یعقوب شنکئے وچ (Szynkiewicz) کو مسلمانانِ ملک کا صدر مقرر کر کے کامل اندرونی خود مختاری عطا کر دی گئی ۔ انہیں ملکی و فوجی ھر محکمے میں پوری مساوات کے ساتھ قبول کیا جاتا تھا ۔ یہ تاتاری محکمۂ عدالت میں زیادہ تھے ۔ پہلی عالمگیر جنگ کی خونریزی میں ان کی تعداد فوج میں بہت گھٹ گئی تھی ۔

محکمۂ افتا کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اماموں کا معیار بلند کرے؛ چنانچہ ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور دینیات کی کئی درسی کتابیں شائع کی گئیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ملک کی سترہ مسجدوں میں جو قرآنی مکتب تھے ان کا معیار تعلیم بھی خود بخود بلند ھو گیا ۔ دو نوجوان جامعۂ ازھر میں تعلیم پانے کے لیے مصر بھیجے گئے ۔ ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ ھی پہلے کئی طالب علم مصر جانے کی تیاری کر رہے تھے اور پولینڈ کی جامعات میں مشرقی زبانیں سیکھ رہے تھے ۔

یہاں کی تمدنی تحریک نے جو صورت اختیار کی وہ یہ تھی کہ اپنے مذہب، اپنی تاریخ اور علم تاریخ اسلام کے عمیق تر مطالعے کا خیال پیدا ھوا ۔ اس غرض کے لیے ارسلان کری‌چنسکی (A. Kryčzynski) اور اولگرد کری‌چنسکی (Olgerd Kryczynski) دو

بھائیوں نے ایک انجمن بنائی اور ۱۹۲۹ء میں سلسلۂ نشریات کا آغاز اس طرح ہوا کہ تاتاری امرا کے فوجی مانوگرام (Armorial) پر ایک کتاب شائع کی گئی - اس کے کچھ ہی بعد انھوں نے پولستانی زبان میں ایک سالنامہ تاتار (*Roczink Tarski*) شائع کرنا شروع کیا - اس میں عام اسلامی معلومات کے علاوہ دینیات پر عمدہ مضامین بھی ہوتے تھے - اس انجمن میں ایک غیر مسلم شخص سٹینسلاس کریچنسکی (Stanislas Kryczynski) نے بڑا حصہ لیا (یہ تاتاری نسل کا تھا اور اس کے اجداد میں سے کسی نے کیتھولک مذہب قبول کر لیا تھا) - اس مؤرخ، ادیب اور شاعر نے تاتاریوں کی تاریخ پر کئی عمدہ کتابیں لکھیں، بالخصوص وہ طویل مقالہ جو ۱۹۳۸ء میں ''سالنامۂ سوم'' کے طور پر شائع ہوا - اسلام کی جانب اس کا ہمدردانہ رُجحان اس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے: اچھے سے اچھا مسلمان بھی اس سے زیادہ نہ لکھ سکے گا - یہ تینوں کریچنسکی دوسری عالمگیر جنگ میں افسوس ناک طور پر مارے گئے خصوصاً گڈینیا Gdynia کی عدالت کا نائب میر مجلس تھا، جرمنوں نے گولی مار دی - شہر وارسا میں ایک سہ ماہی رسالہ پولستانی زبان میں *Przegeadislamski* نکلتا تھا اور ولناس میں محکمۂ افتا کا ماہنامہ *Zyciatarski* (یعنی حیاتِ تاتار) شائع ہوتا تھا - ۱۹۳۹ء کی جنگ سے کچھ پہلے عربی میں بھی چند کتابیں پولستانی اسلام کے حالات پر شائع کی گئیں اور لاہور کے *Islamic Review* میں بھی ۱۹۳۵ء میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا - یہاں کے مسلمان کثرت سے اسلامی ممالک کی سیاحت کرنے لگے، خاص کر مفتی شنکئے وچ نے تو بین الاسلامی مؤتمروں میں بھی حصہ لیا۔

۱۹۳۹ء کے بعد کے حالات موجودہ سیاسی معرکہ آرائی کا حصہ ہیں - وارسا کی جدید اشتراکی حکومت نے روس سے ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت ان تاتاری مسلمانوں کو پولینڈ کی رعایا بن جانے کا حق ملا گیا - کچھ لوگ ساڑھے پانچ سو برس کے بعد بصد حسرت ملک سے ہجرت بھی کر گئے۔

۳ - پولینڈ کے تعلقات اسلامی ممالک سے:

پولینڈ اور لتوانیا کی سلطنتِ متحدہ نے امیر تیمور کے خلاف اقدام کر کے عثمانی ترکوں کے دلوں میں اپنے متعلق ہمدردی کے جو جذبات پیدا کر لیے تھے ان میں آگے چل کر مفادات کے اشتراک نے مزید استحکام پیدا کر دیا - بابِ عالی (ترکیہ) نے ہمیشہ اپنے اصول کو نباہا اور کبھی پولینڈ کے خلاف پیش قدمی نہیں کی، بلکہ اس کی تاریخ کے اندوھناک لمحات میں ترکیہ ہی اس کا واحد مددگار رہا البتّہ پولینڈ کا برتاؤ ترکیہ کے ساتھ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا؛ چنانچہ تیسرا لادسلاس Ladis Las (۱۴۳۳ تا ۱۴۴۴ء) ابن یاگویلو جب ۱۴۴۰ء میں ہنگری کا بھی بادشاہ بن گیا تو اس جدید حیثیت میں آ کر اس نے ترکی سے جنگ چھیڑ دی - ۱۴۴۳ء میں دس سال کے لیے ایک صلح کی گئی، لیکن دوسرے ہی سال لادسلاس نے پوپ کے ورغلانے سے عہد شکنی کی اور وارنا کی لڑائی میں شکست کھائی اور جان سے بھی مارا گیا، لیکن ان جنگوں کے باوجود ترکیہ کے دل میں میل نہیں آیا - ۱۴۹۷ء میں پولینڈ کے بادشاہ یان آلبریشت (Jan Albrecht) نے مولدیویا Moldavie پر (جو ترکی، ہنگری اور پولینڈ سب کا باجگزار تھا) دھاوا بول دیا تاکہ اپنے چھوٹے بھائی کو وہاں کا تخت دلائے - مولدیویا کے حکمران نے ترکوں کی مدد سے آلبریشت کو شکست دی، لیکن جلد ہی بلا کسی دقّت کے بابِ عالی نے پولینڈ سے دوستانہ تعلقات بحال کر لیے - اس تاریخ کے بعد سے خانوادۂ یاگویلو کے اختتام تک

دونوں ملکوں کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ اس خانوادے کے جانشینوں نے بھی اس پر عمل جاری رکھا، لیکن زیگیسموند Sigismond سوم نے طرزِ سیاست میں تبدیلی کی۔ اس زمانے میں ترکیہ کے خلاف یورپی محاذ قائم ہو رہا تھا، اس میں شرکت کی تجویزیں شروع ہوئیں، تاکہ مولدیویا پر قبضے کا خواب پورا ہو؛ لیکن اس کے زمانے میں زیادہ‌تر یہ ہوا کہ یوکرین کے قزاق اکثر ترکیہ پر دھاوے بولتے، بلکہ بعض اوقات خود استانبول کو دھمکی دیتے رہے۔ چونکہ پولینڈ ان پر قابو رکھنے کے ناقابل تھا اس لیے یہ ۱۶۲۰ء اور ۱۶۲۱ء کی جنگوں کا باعث بنے۔ کچھ عرصے بعد پولینڈ نے یوکرینیوں پر مذہبی سختیاں شروع کیں تو انھوں نے بغاوت کر دی۔ اب انھیں قریم (کریمیا) اور ترکیہ دونوں نے مدد دی، کیونکہ انھیں خوف تھا کہ کہیں ہم مذہب ہونے کی بنا پر ماسکو یوکرین کا اپنے ساتھ الحاق نہ کر لے؛ مگر یہ ہو کر رہا۔ اور ۱۶۵۴ء میں مشرقی یوکرین نے حکومت ماسکو کی حمایت قبول کر لی۔ اس کے باعث ایک طرف پولینڈ اور ماسکو میں اور دوسری طرف پولینڈ اور ترکیہ میں جنگیں چھڑیں۔ چونکہ یوکرینی ماسکو کی حکومت میں خوش نہ رہ سکے اور پولینڈ سے بھی ان کا نباہ نہ ہو سکا، جو ان کے پرانے امتیازات بحال کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس لیے انھوں نے ۱۶۶۷ء اور ۱۶۷۱ء میں ترکیہ کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ ترکیہ نے دخل دے کر ۱۶۷۶ء کے معاهدے کے مطابق کامنیتس پودولسک Kameniets Podolsk کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ اس صورت حال کو برداشت نہ کرسکا اور ترکیہ کے مخالف محاذ میں شریک ہوگیا، جس کے باعث ترکیہ کو ۱۶۸۳ء کی شکست اٹھانا پڑی۔ ۱۶۹۹ء میں معاهدۂ کارلوفتس Karlovitz کے مطابق ترکیہ نے کامنیتس پودولسک

کا مفتوحہ علاقہ خالی کر دیا۔ ترکیہ نے اس پر بھی نہ صرف یہ کہ پولینڈ کے خلاف سیاست میں شدت اختیار نہیں کی بلکہ ۱۷۱۰ء میں جب ترکیہ نے روس کے پیٹر اعظم کو پروت Pruth کی لڑائی میں شکست دی تو اسے اس پر مجبور کیا کہ پولینڈ کا تخلیہ کرے اور آئندہ اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے۔ پولینڈ نے سویڈن سے حلف کا تعلق قائم کیا تو روسیوں نے مشرقی پولینڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۷۶۳ء میں پولینڈ کا آخری بادشاہ سٹیسلاس آگسٹ پونیاٹوفسکی Stanislas-August Poniatowski روس کی ملکہ کیتھرائن دوم کے دباؤ کے سبب تخت پر بٹھایا گیا، اور اس طرح پولینڈ عملاً روس کا متوسّل بن گیا۔ ترکیہ نے دوبارہ الٹی میٹم دیا کہ روس کی فوجیں پولینڈ خالی کریں اور وہاں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں۔ روس نے انکار کیا تو ۱۷۶۸ تا ۱۷۷۴ء روس اور ترکیہ میں جنگ ہوئی، مگر خود پولینڈ نے اس میں عملاً کوئی حصّہ نہیں لیا (وہاں کے دو هزار باغیوں سے بحث نہیں)۔ ترکوں کو شکست ہوئی تو پولینڈ کے بھی حصّے بخرے ہوے، مگر ترکیہ ہی دنیا کی وہ واحد سلطنت ہے جس نے پولینڈ کی اس تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن پولینڈ والوں کو اپنے ذاتی مفاد کی سمجھ انیسویں صدی تک نہ آئی۔ انھوں نے روس کے خلاف بغاوت کی، مگر اس وقت نہیں جب وہ ترکیہ سے ۱۸۲۸ء تا ۱۸۲۹ء بر سرِ پیکار تھا، بلکہ ایک سال بعد جب کہ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اس بغاوت کے بعد پولینڈ کے کئی هزار آدمی ترکیہ میں پناہ گزین ہوے، جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ان میں سے بہت سے ترکی فوج میں بھرتی ہو گئے اور دس اعلٰی افسر، جو مسلمان ہو گئے تھے، جنرل کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ترکیہ میں ایسے فوجی

دستے بھی بھرتی ھوے جن میں صرف پولینڈ والے تھے ۔ ان دستوں نے قریم (کریمیا) کی جنگ (۱۸۵۴ تا ۱۸۵۵ء) میں روس کے خلاف ترکی فوج کا ساتھ دیا، مگر خود پولینڈ اس زمانے میں بھی خاموش رھا، بلکہ اس کے پورے آٹھ سال بعد روس کے خلاف تن تنہا ایک بغاوت شروع کی ۔ اس نے مغربی یورپ سے آس لگائی، مگر مایوسی ھوئی ۔ جب ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا احیا ھوا تو ترکیه سے دوستانه تعلقات دوبارہ قائم ھوے ۔ اس دوستی کی یادگار ایک گاؤں ھے، جو استانبول کے محاذی ساحل باسفورس پر آباد ھے ۔ ترکیه میں اس کا نام پولنیز کوی ھے ۔ پولینڈ والے اسے آدم پول Adam Pol کہتے ھیں، کیونکه شہزادہ آدم تسار توریسکی Adam Czartoryski نے زمین خرید کر یه گاؤں بسایا تھا ۔ اسی شہزادے نے قائد بن کر ۱۸۳۱ء کے بعد یه تحریک چلائی تھی که پولینڈ والے ترکیه کی طرف ھجرت کر جائیں.

زمانۂ حال میں پولینڈ کے سفارتی تعلقات دوسرے اسلامی ممالک سے بھی رھے ھیں، لیکن بعض مصنوعات کی برآمد کے سوا کوئی خاص امر قابلِ ذکر نہیں.

آخر میں یه بات بھی قابل ذکر ھے که پولستانی غیر مسلم مستشرقوں نے بھی اور ممالک کے مستشرقین کی طرح اسلامیات پر معتدبه لٹریچر پیدا کیا ھے ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے وقت یہاں پانچ جامعات تھیں، جن میں سے ھر ایک میں اس موضوع کی کرسیاں قائم تھیں؛ خاص کر جامعۂ کراکوف، جو ملک کی سب سے قدیم درسگاہ ھے، اسلامیات پر اپنے سلسلۂ نشریات کے باعث خاص امتیاز رکھتی ھے ۔ اس کا سلسله اب بھی جاری ھے.

مآخذ: (۱) علی فورونوفتش و محمد سیدالحموی: الاسلام فی بولونیا، قاهره ۱۹۳۶ء؛ (۲) مصطفی الکسندروفیتش: یوسف بیلسدسکی، قاهره ۱۹۳۶ء؛ (۳) رسالۂ تاتارله (ترکی میں؛ تالیف ۱۵۵۸ء)، مع پولستانی ترجمه و حواشی از اے ۔ مخلنسکی، ولنا ۱۸۵۸ء؛ (۴) ایس ۔ کریچنسکی: ''تاتارِ لتوانیا'' پر مقاله، بزبان پولستانی، در ''سالنامۂ تار''، ج ۳؛ (۵) اے ۔ مخلنسکی: ''لتوانی تاتاریوں کی تاریخ اور موجودہ حالت'' (روسی میں)، ۱۸۵۷ء؛ (۶) ''روسی تواریخ کا مکمل مجموعه'' (روسی میں)، ۲۳ جلد؛ (۷) لیونتوویچ: ''روسی لتوانی قوانین کا خاکه'' (روسی میں)، ۱۸۹۴ء؛ (۸) لوبافسکی: ''روسی لتوانی مملکت کی حالت لتوانیا کے اتحاد تک'' (روسی میں)، ۱۹۱۰ء؛ (۹) هروشیفسکی: ''تاریخ یوکرین'' (یوکرینی میں)، ۱۹۰۴ - ۱۹۰۸ء.

(Arslan Bohdanowiez)

پوماق: بلغاری زبان بولنے والے مسلمانوں کو بلغاریا اور تراکیا (Thrace) میں ''پوماق'' کہتے ھیں ۔ عام طور پر ان کے عیسائی ھموطن مسلمانوں کو اس نام سے یاد کرتے ھیں، لیکن بعض اوقات بلغاریا والے ان مسلمانوں کو بھی پوماق کہه دیا کرتے تھے جو مغربی مقدونیا میں سربی زبان بولتے ھیں، لیکن سربی مسلمان اپنے عیسائی اھلِ وطن میں عموماً توربسی Torbeši (واحد توربس Torbeš) اور بعض اوقات پتوری Poturi اور شاذ و نادر طور پر کُرکی Kurki وغیرہ کہلاتے ھیں ۔ بعض لوگوں کا آج کل بھی سربی مسلمانوں کو ''پوماق'' موسوم کرنا زیادہ تر بلغاری دبستان اور بلغاری ادب کے اثر پر مبنی ھے اور یه تسمیه صرف اس حد تک صحیح ھوگا جب ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا جائے جو فی الواقع بلغاریا سے ھجرت کر کے یہاں آئے تھے؛ مثلاً ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء میں (قب *Južna Stara Srbija*: J. H. Vasiljević، ۱: ۱۸۷ تا ۱۸۸، ۲۰۷ اور ۲۳۶) ۔ کوهستانی رودوپس Rhodopes میں بلغاری مسلمان اَخریانی Achrjani، یا

اگریانی Agarjani بھی کہلاتے ھیں (Ischirkoff، ۲ : ۱۰) ۔ جنوبی سربیا اور بلغاریا کے بعض حصوں میں کبھی کبھی یہ نام چتاک Čitak (جمع چتاچی Čitaci) سنا جاتا ھے ۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا تھا (جیسا کہ بالکل حال میں A. Urosevic نے، در *Glasnik Skopskog naučnog društva*، ج ۵، ۱۹۲۹ء، ص ۳۱۹ تا ۳۲۰، ثابت کیا ھے) کہ یہ نام صرف ان سربیوں کو دیا گیا تھا جو مسلمان ہوگئے تھے، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ھے کہ یہ لفظ بلغاریا [رک بآں] اور سربیا [رک بآں] کے ترکوں تک محدود ھے (قب Vasiljević : *Muslimani*...، ص ۳۳، اور Elezović، در *Srpski Književni glasnik*، ۲۸، ۱۹۲۹ء : ۶۱۰ تا ۶۱۳ اور در *Rečnik Kosovskometohiskog dijalekta*، ۲ : ۴۳۹) ۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ apovci وہ نام ھے جو سربی مسلمانوں کو جنوبی سربیا میں دیا گیا ھے؛ کیونکہ معلوم ہوتا ھے کہ یہ لفظ صرف البانیوں میں قریبی رشتہ داروں (بھائیوں اور چچیرے بھائیوں) کے لیے بولا جاتا ھے (بقول H. Vasiljevič : *Muslimani*...، ص ۳۳).

ان ناموں کی اصل و اشتقاق کم و بیش مبہم اور کہیں کہیں من گھڑت ھے ۔ عام طور پر یہ تشریح کی جاتی تھی کہ پوماق کا لفظ فعل ''پوموچی'' "Pomoći" (بمعنی مدد کرنا) سے ھے اور اس کے معنی پوماغاچی Pomagači (مددگار) کے ھیں، یعنی ترکوں کی امدادی افواج ۔ یہ تشریح سب سے پہلے کانتز F. Kanitz (*Donau-Bulgarien und der Balkan*، ج ۲، لائپزگ ۱۸۸۲ء، ص ۱۸۲) نے کی تھی، لیکن تھوڑے عرصے بعد (۱۸۹۱ء میں) ییرچک Jireček (دیکھیے مآخذ) نے بتایا کہ یہ تسلی بخش نہیں ھے ۔ ایک اور ایسی ھی بعید از قیاس، مگر عام توجیہ وہ ھے جس کی رو سے ''پوماق'' بلغاری لفظ ماق mǎk، بمعنی ''اذیت، جبر'' سے مشتق ھے اور جس میں یہ کہہ کر اسے صحیح ثابت کرنے کی غلط کوشش کی گئی ھے کہ بلغاریوں کا قبول اسلام خاصے بڑے پیمانے پر جبرو اکراہ سے عمل میں آیا تھا (Ischirkoff، ۲ : ۱۰) ۔ اس کے بعد لیکوف Lekov (دیکھیے مآخذ) نے پوماق کی تشریح لفظ پوتورنیا ک poturnjak (لفظی معنی : ''وہ شخص جو ترک بنایا جائے'') سے کی ھے ۔ آیا لفظ چوماق Čomak، جس کے معنی ترکی میں ڈنڈا سونٹا اور ایگوریہ (Uigur) زبان میں ''مسلم'' اور جنوبی روس میں ''بساطی'' کے ھیں (قب بارٹولڈ Barthold : *Orta Asia*...، ص ۸۲ تا ۸۳) 'پوماق' کے ساتھ کوئی علاقہ رکھتا ھے، یا یہ کہ بلغاری لفظ پورتورنیا ک poturnjak سے متأثر ہوا، یا اس کے ساتھ گڈ مڈ ہو گیا ھے؟ یہ سب باتیں ابھی تک تحقیق طلب ھیں۔

پوماق یا توربسی Torbeši کے تبدیل مذہب کی تاریخ تفصیل سے بہت کم معلوم ھے ۔ بہرکیف قبول اسلام ہر جگہ دفعۃً وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ تدریجًا اور مختلف زمانوں میں ہوا ۔ جنگ ماریکا Marica (۱۳۷۱ء) کے بعد ھی اور پھر ٹرنوفو Trnovo کے سقوط (۱۳۹۳ء) کے بعد اس کا آغاز ہوا ۔ اس زمانے کے سربیوں اور بلغاریوں کی بڑی تعداد، بالخصوص (جیسا کہ ییرچک Jireček خیال کرتا ھے) امرا اور بگومیل Bogomils نے اسلام قبول کیا ۔ یہ ابتدائی تبدیلی مذہب با یزید ثانی کے زمانے میں ہوئی ۔ اس کے بعد ملکی روایت کی رو سے سلیم اوّل (۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰ء) کے عہد حکومت میں خاصی بڑی تعداد اسلام لائی ۔ اس مقصد کے لیے کہا جاتا ھے کہ اس نے اپنے ''منظور نظر سنان پاشا'' کو جبال السار šar-mountains کے علاقے میں بھیجا تھا ۔ رودوپس Rhodopes میں چیپنو Cepino کے کوھستانی

خطّے کے لوگ مقامی تواریخ کے مطابق سترھویں صدی کے آغاز میں مسلمان ہو گئے تھے، مگر بقول یریچک Jireček (Fürstenthum، ص ۱۰۳) یہ واقعہ وسط صدی کے بعد سلطان محمد چہارم (۱۶۴۸ تا ۱۶۸۷ء) کے عہد میں ہوا - وزیر اعظم محمد کوپرولو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا تھا - علاقۂ ڈینیوب کا قبولِ اسلام (Loveč وغیرہ) اسی زمانے کا واقعہ ہے - اسی (سترھویں) صدی کے خاتمے کے قریب خطّۂ دِبر Debar میں بہ رے سربیوں نے دینِ اسلام اختیار کیا - بعض اضلاع میں اسلام کو بڑے پیمانے پر قدم جمانے کا موقع صرف اٹھارھویں صدی کے دوران میں میسّر آیا، بلکہ بعض اوقات تو انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ایسا نہ ہو سکا (مثلاً پرزرن Prizren کے جنوب گورہ Gora میں).

قریبی زمانے تک یہ میلان موجود تھا کہ عیسائیوں کا یہ اسلام لانا جبری بلکہ تلوار کے زور سے تھا، لیکن اب یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ مسلمان حکّام نے کبھی اپنی عیسائی رعایا کو مسلمان بنانے کے لیے کوئی قدم براہِ راست نہیں اٹھایا - اس کے بر خلاف قبولِ اسلام کا یہ عمل بطیبِ خاطر اور بالکل دوسرے اسباب (یعنی اسلام کی حقانیت، عقیدۂ توحید وغیرہ) کی بنا پر ہوا (قب مثلاً H. Vasiljevic : *Muslimani*، خصوصاً ص ۵۳ تا ۶۱).

انیسویں صدی کے خاتمے کے قریب، جب کہ اشاعتِ اسلام کا کام ہر جگہ سالہا سال سے رُکا ہوا تھا، سلافی مسلمانوں (بلغاری اور سربی) کی بڑی اکثریت رودوپس اور مشرقی مقدونیہ کے پہاڑوں میں پائی جاتی تھی - مقدونیہ کے شمال جنوب میں بھی البانیا کی سرحد تک جگہ جگہ ان کی خاصی معقول تعداد کے گروہ پائے جاتے تھے - یہ وسیع رقبہ شمال میں پلوفدیف Plovdiv (فلپّو پولیس) سے لے کر جنوب میں سالونیکا تک پھیلا ہوا ہے؛ مشرق میں دریائے اَردا Arda کے وسط سے فردار Vardar کے اوپر تک بلکہ کرنی درِم Crni Drim کے پار تک چلا گیا ہے، یعنی اضلاع اُہرید Ohrid، دِبر Debar، گستیفار Gostivar اور پرزرن Prizren سے گزرتا ہوا مغرب میں پھیلتا چلا گیا ہے - مذکورۂ بالا زمانے میں اس خطّے کا ایک چھوٹا سا حصہ، جس میں جابجا عیسائی اقطاع تھے، بلغاریا کی ریاست میں داخل تھا - زیادہ بڑا حصہ اس وقت تک ترکیہ کے زیر نگین تھا، اور صرف جنگ بلقان کے بعد سربیا کو یا عالمی جنگ کے بعد یوگوسلاویا کو ملا - کوھستان رودوپس میں مسلم بلغاریوں کے سواد اعظم کے علاوہ ان کی متفرق بستیاں کوھستان بلقان کے شمال میں علاقۂ ڈینیوب کے اندر بھی موجود تھیں - یہ لوفچ Loveč بلونہ Plevna اور اُریہوفو Orehovo کے حلقوں میں بستی تھیں .

بہر حال، اس زمانے سے لے کر اب تک ''پوماقوں'' کی سرحدیں خاصی گھٹ گئی ہیں - پلونہ کے محاصرے کے دوران میں تقریباً تمام بلغاری مسلمان اضلاع ڈینیوب سے مقدونیہ چلے گئے - گو وہ ۱۸۸۰ء میں واپس آ گئے، لیکن پھر جلد ھی ترکیہ کو ھجرت کر گئے - ۱۸۸۵ء میں مشرقی رومایلی اور بلغاریا کے اتحاد کے بعد رودوپس کے پوماق بھی نقل مکان کرنے لگے - اسی طرح توربسی Torbeši کی سرحدیں بھی متأثر ہوے بغیر نہیں رہیں - جنگِ بلقان اور عالمگیر جنگ کی وجہ سے بعض تغیرات ہوے اور نتیجۃً سربی مسلمانوں کی بعض جماعتیں جنوبی سربیا سے ھجرت کر گئیں .

مختلف محاربات اور ان کے عواقب میں ملکی حدود میں جو ردّ و بدل ہوے ان کی وجہ سے مسلمان سلاویوں کی بلغاریا، مقدونیہ (یا جنوبی

سربیا) اور تراکیا میں تعداد، نیز مجموعی تعداد کی نسبت بیانات بہت مختلف اور اکثر ناقابل اعتماد ہیں ۔ مثال کے طور پر ییرچک Jireček (۱۸۷۶ء) نے کل تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ لگایا، جس میں لوونچ lovec اور پلونہ Plevna کے ایک لاکھ نفوس شامل ہیں (دیکھیے مآخذ) ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں گئریلوفچ Gavrilović (دیکھیے مآخذ) نے صرف چار لاکھ تخمینہ کیا اور اشیرکوف Ischirkoff نے ۱۹۱۷ء میں قریب قریب یہی تعداد بتائی۔

جہاں تک ان مسلمان سلاویوں کی تقسیم باعتبار ممالک کا تعلق ہے ذیل کے اعداد و شمار نقل کیے جا سکتے ہیں ۔ ییرچک Jireček نے (۱۸۹۱ء) سابقہ ریاست بلغاریا کے مسلمانوں کا زیادہ سے زیادہ اندازہ اٹھائیس ہزار نفوس کیا؛ اور جو جنگ بلقان سے پہلے وہاں بلغاریا کی قدیم سرحدوں کے اندر تھے (۱۹۱۰ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق) وہ ۲۱۱۴۳ (آبادی کا ۰.۴۹ فی صد) تھے۔ جنگ بلقان میں جو نئے اضلاع ہاتھ آئے ان کی وجہ سے جنوبی بلغاریا میں پوماقوں کی تعداد بڑھ گئی؛ یہ زیادہ تر اردا Arda، مستا Mesta اور سٹروما Struma دریاؤں کے علاقوں میں تھے، چنانچہ ۱۹۲۰ء کی سرکاری سر شماری ان کی تعداد ۸۸۳۹۹ (پوری آبادی کا ۱.۸۲۰ فی صد) بتاتی ہے ۔ ۱۹۲۹ء کے مجلّے Annuaire du Monde Musulman (ص ۳۰۰) میں یہ تعداد کچھ زیادہ ہے؛ یعنی سولہ ہزار پوماق بلغاریا خاص میں اور ۷۵۳۳۲ تراکیا میں، کل ۹۱۳۳۲ ۔ ۱۹۲۶ء کی سر شماری کے اعداد و شمار یہ ہیں : ۱۰۲۳۵۱ بلغاری بولنے والے مسلمان بلغاریا میں، یعنی آبادی کا ۱.۸۷ فی صد؛ لیکن بلغاریا میں مسلمانوں کی کل تعداد بلا امتیاز السنہ ۷۸۹۲۹۶ یا آبادی کا ۱۴.۴۱ فی صد تھی ۔ ان ۱۰۲۳۵۱ بلغاری بولنے والے مسلمانوں میں سے صرف ۵۷۹۹ شہروں میں رہتے تھے، اور بقیہ ۹۶۵۵۲ دیہات میں؛ مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک ہزار بمقابل ۱.۰۶۵ تھا ۔ خواندہ پوماق تمام بلغاریا میں ۱۹۲۶ء میں صرف ۶۶۵۹ تھے (جن میں ۵۵۳۴ مرد تھے).

مقدونیہ میں پوماقوں کی (یعنی درحقیقت مسلمان سلاویوں کی) تعداد، بقول فرکوفچ S. Verković (۱۸۸۹ء؛ دیکھیے مآخذ)، ۱۴۴۰۵۱ مرد تھی (اس لیے یہ ہندسہ دگنا کر دیا گیا ہے در Données statistiques sur l'ethnographie de la Macédoine، شائع کردۂ Comité national de l'Union des organisations des émigrés macédoniens en Bulgarie، صوفیہ ۱۹۲۸ء، اور مجموعی آبادی ۲۸۸۰۹۲ بتائی ہے [اس میں دس نفوس کم کی غلطی ہے])؛ G. Weigand (Die nationalen Bestrebungen der Balkanvölker، لائپزگ ۱۸۹۸ء) نے ایک لاکھ مرد، اور کانکوف V. Kăncov (۱۹۰۰ء؛ دیکھیے مآخذ) نے ۱۳۸۸۰۰ اور سیس Vl. Sis (Mazedonien، زیورخ ۱۹۱۸ء) نے ۱۵۰۰۳۰ نفوس کا تخمینہ دیا ہے.

جہاں تک جنوبی سربیا میں سربی بولنے والے مسلمانوں کی آبادی کا تعلق ہے اس کا اندازہ H. Vasiljević (Muslimani...، ص ۱۱ ببعد) نے ایک لاکھ نفوس لگایا تھا، جو اگرچہ کسی حد تک جنگ بلقان کے پہلے کے حالات پر مبنی تھا، اور ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد ساٹھ ہزار بتائی گئی ۔ سربی ۔ کروٹی زبان بولنے والے مسلمانوں کی تعداد تمام یوگوسلاویا میں تقریباً نو لاکھ تھی (صحیح اعداد نہیں دیے جا سکتے، کیونکہ مذاہب کے مطابق اعداد و شمار شائع نہیں کیے گئے ہیں).

تراکیا کے لیے ۷۵۳۳۲ مسلمان بلغاریوں کی

تعداد *Annuari* سے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں؛ صرف مغربی تراکیا میں مارچ ۱۹۲۰ء کی بین الحلفاء (inter-allied) سر شماری کے مطابق ان کی تعداد ۱۱۷۳۹ تھی (قب *La question de la Thrace*، مطبوعۂ Comite suprême des réfugiés de Thrace، صوفیہ ۱۹۲۷ء).

ان اعداد و شمار پر ملاحظات ذیل پیش کرنے مناسب ہیں :

اہلِ بلغاریا (مثلاً Kăňčov) "پوماقوں" میں عموماً تمام مقدونی سلاویوں کو، جو مسلمان ہوں، شامل کر لیتے ہیں؛ چنانچہ جنوبی سربیا کے سربی باشندے بھی ان کی تخمین میں پوماق ہیں ۔ دوسری طرف یہ سلاوی مسلمان مذہب کی بنا پر بعض اوقات بےپروائی سے ترکوں میں شمار کر لیے گئے ہیں ۔ مزید برآں، بعض اعداد و شمار جذبۂ وطنیت اور سیاسی تعصّب سے بھی کلیۃً آزاد نہیں ہیں ۔ رہے اہلِ یورپ کے تخمینے، تو وہ اندازے پر مبنی ہیں یا محض ذاتی رائے سے لکھ دیے گئے ہیں .

اس واقعے کے باوجود کہ پوماق اور توربسی کبھی کبھی ترکوں میں شمار کیے گئے ہیں اور بعض اوقات اپنے کو ترک کہتے ہیں وہ پھر بھی قدیم بلغاری یا سربی آبادی کا خالص ترین طبقہ ہیں، جنھوں نے سلاوی خال و خد اور سلاوی زبان (خصوصاً متروک الفاظ) کو بہت اچھی طرح محفوظ رکھا ہے؛ چونکہ وہ عیسائیوں سے منقطع ہو گئے اور دور افتادہ اضلاع میں رہے اور اس کے مقابلے میں ان کے ہم قوم عیسائی باشندے اکثر دوسرے نسلی عناصر کی آمیزش سے محفوظ نہ رہ سکے لہٰذا ان مسلمانوں میں بعض نسلی خصوصیات عیسائیوں سے بھی زیادہ اچھی حالت میں سلامت رہیں ۔ وہ ترکوں سے، جن کی زبان وہ نہیں سمجھتے، قدرے اجتناب کرتے ہیں ۔ صرف شہروں میں یہ ہوا کہ ان سلاویوں میں سے بعض نے مرور ایام سے ترکی زبان اختیار کر لی، مگر جس چیز نے انھیں عثمانیوں سے وابستہ کیا وہ زبان نہ تھی بلکہ زیادہ تر ایک مشترک مذہب، یعنی اسلام، بشمول احکام و رسوم تھا (مثلاً عورتوں کا پردہ)؛ اسلام اور ترکوں کی حکومت کی وجہ سے قدرتی طور پر ان میں بہت سے عربی اور ترکی الفاظ رواج پا گئے ۔ باوجود اس کے ان کے اندر بہت سی قبل اسلام رسوم اور عیسائیت کی یادگاریں (جیسے بعض عیسائی تیوہار منانا وغیرہ) باقی رہیں .

بلغاری مسلمان خاص طور پر کبھی کبھی (خصوصاً ۱۸۷۶ تا ۱۸۷۸ء میں) ترکوں کے ساتھ مل کر عیسائی بلغاریوں کے خلاف لڑے ۔ سو اس کی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ ایک تو وہ مذہب کو وطنیت پر ترجیح دیتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے عیسائی ہم وطن بھی انھیں تُرک سمجھ کر غیروں کا سا برتاؤ کرتے تھے ۔ وہ چونکہ انھیں اپنی برادری سے نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے جنگ بلقان میں مسلمانوں کے ساتھ غیروں بلکہ دشمنوں کا سا سلوک کیا؛ چنانچہ فاتح بلغاری فوجوں اور انتہا پسند پادریوں نے پوماقوں کو رودوپس اور دوسرے اضلاع میں دباؤ اور تلوار کے زور سے عیسائی بنایا، لیکن معاہدۂ صلح طے ہوا تو وہ دوبارہ اسلام کے دائرے میں آ گئے ۔ ایسے صاف گوئی کے ساتھ بلغاری جغرافیہ‌نویس اشیر کوف Ischir Koff اور بلغاری مصنف کرہ ایفانوف Iv. Karaivanov نے (اپنے بلغاری رسالے *National Education*، Küstendil، ۱۹۳۱ء بقول Ćamalović [دیکھیے مآخذ] تسلیم کیا ہے ۔ اسّی یا نوّے برس پہلے "پوماقوں" کے گیت اور چار بیت بہت کچھ محلّ نزاع رہے ۔ بوسنہ کا سابق پادری Stefan Verković (۱۸۲۷ تا ۱۸۹۳ء) نے، جو شہر سیرس Seres میں

نوادر قدیمه کی دکان کرتا تھا، Veda Slavena (یعنی ''سلاویوں کا وید'' بلغراد ۱۸۷۴ء، ج ۱) کے نام سے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ۔ اس کا بیان تھا کہ یہ گیت زیادہ تر ''پوماقوں'' سے جمع کیے گئے ہیں، اور ان میں ''قبل مسیح اور قبل تاریخ'' موضوعات (ترک وطن کر کے اس ملک میں اس قوم کی آمد، غلّہ، شراب، فن تحریر کی دریافت اور ہندو ناموں کے دیوتاؤں اور اورفیوس Orpheus وغیرہ کی اساطیری کہانیوں) کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ A. Chodzko و A. Dozon (*Chansons populaires bulgares inédites*، پیرس ۱۸۷۵ء؛ قب نیز *Revue de littérature comparée*، ج ۱۴، ۱۹۳۴ء، ص ۱۰۰ ببعد) اور L. Geitler (*Poetické tradice Thráků i Bulharů*، پراگ ۱۸۷۸ء) نے بھی اس ''سلاوی وید'' کو صحیح ماننے کی پر زور حمایت کی: یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ پوماق تراکیا کی قدیم نسل سے ہیں، جن پر پہلے سلاوی تہذیب کا اثر پڑا اور پھر اسلام کا۔

با ایں ہمه موضوعات مذکورہ پر کسی چاربیت کا پتا نہ تو مسلمانوں سے چلا نہ عیسائی بلغاریوں سے؛ ییرچک Jireček نے موقع پر اس سوال کی چھان بین کی اور اس ''سلاوی وید'' کو صاف صاف بعض بلغاری معلّموں کی جعل سازی بتایا (*Fürstenthum*، ص ۱۰۷ الف) ۔ ہمیں اب معلوم ہے کہ پادری ورکوفتش Verković کا خاص شریک کار مقدونی معلّم گولوگانوف Iv. Gologanov تھا (قب Pentscho Slawejkoff : *Bulgarische Volkslieder*، لائپزگ ۱۹۱۹ء، ص ۱۵).

اس واقعے کو دیکھتے ہوے کہ زیر بحث مسلمان زیادہ تر پہاڑوں اور دیہات میں بود و باش رکھنے والے قدامت پسند ہیں، جو نہایت محنتی، متدین اور امن پسند، مگر لکیر کے فقیر اور بیشتر ناخوانده ہیں، ان میں کسی ادبی سرگرمی کا امکان نہیں ہو سکتا ۔ ان میں فقط ''خوجے'' لکھنا جانتے ہیں اور اکثر لکھتے وقت ترکی زبان عربی حروف میں استعمال کرتے ہیں ۔ وہ اکثر عربی حروفِ تہجی اس وقت بھی استعمال کرتے ہیں جب اپنی مادری زبان لکھتے ہیں ۔ بلغاری مسلمانوں کی اگلی پشتوں میں بہتیروں نے ترکی فوج یا بصورت دیگر ترکی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ۔ جدید نسل، جس نے سرکاری سکولوں میں تعلیم پائی ہے، قومیت کا زیادہ احساس رکھتی اور زیادہ ترقی‌پذیر ہے، لیکن یہ لوگ گنتی میں اتنے تھوڑے ہیں کہ سیاست یا دیگر امور میں اپنا اثر و نفوذ نہیں رکھتے۔

مآخذ : (متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ) : (۱) C. Jireček : *Geschichte der Bulgaren*، پراگ ۱۸۷۶ء، ص ۳۵۶، ۳۵۷، ۵۲۰، ۵۶۸ اور ۵۷۸؛ (۲) وہی مصنف: *Das Fürstenthum Bulgarien*، پراگ ۔ وی انا ۔ لائپزگ ۱۸۹۱ء، ص ۱۰۲ تا ۱۰۸ (اہم ترین حصه)، ص ۱۳۰، ۳۳۶، ۳۵۳ اور ۳۵۴ تا ۳۵۶؛ (۳) S. I. Verković : *Topografičesko etlmografičeskij očerk Makedonij*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۹ء (بعض اضلاع نیز دیہات کے پوماقوں کے تعداد کی مکمل جدولیں دیتا ہے)؛ (۴) V. Kančov : *Makedonija etnografija i statistika*، صوفیا ۱۹۰۰ء، ص ۴۰ تا ۵۳ (جہاں قدیم ادب کا ایک حصّه دیا ہوا ہے، خصوصاً ص ۴۲)، مع بلغاریا کے علم الاقوامی نقشے کے جس میں ''مسلم بلغار'' آبادیاں خصوصیت سے دکھائی گئی ہیں؛ (۵) J. Cvijić : *Osnove za geografiju i jgeologiju Makedonije i Stare Srbije*، ۱، بلغراد ۱۹۰۶ء : ۱۸۲؛ (۶) Vl.R. Dordević : *U Srednjim Rodopima, putopisne beleške od Plovdiva do Cepelara*، در *Nova iskra*، سال ۸، بلغراد ۱۹۰۶ء، ص ۱۴۲ تا ۱۴۶؛ اور ص ۱۹۸ تا ۲۰۰ (۱۹۰۵ء میں پوماقوں کی زندگی

اور رسوم پر ایک سربی سفر کا دلچسپ بیان)؛ (۷) M. Gavrilović، در *Grande Encyclopédie*، بذیل مادّہ؛ (۸) A. Ischirkoff : *Bulgarien, Land und Leute*، ۲، لائپزگ ۱۹۱۷ء : ۳۱ تا ۷۱؛ (۹) J. Hadži Vasiljević : *Muslimani naše krvi u Juznoj Srbiji*، بار دوم، بلغراد ۱۹۲۴ء؛ (۱۰) وہی مصنّف : *Skoplje i njegova okolina*، بلغراد ۱۹۳۰ء، ص ۳۱۲؛ (۱۱) J. M. Pavlović : *Maleševo i Malešević*، بلغراد ۱۹۲۹ء، ص ۳۵ و ۳۴۳ تا ۳۴۵ اور ۱۰۵؛ (۱۲) S. Čemalović : *Muslimani u Bugarskoj*، در *Gajret*، سال ۱۳، Sarajevo، ۱۹۳۲ء : ص ۳۴۵ ببعد، ۳۶۳ ببعد اور ۳۷۵ ببعد (نیز در *La Nation Arabe* برائے ۱۹۳۲ء، عدد ۱۰ تا ۱۲؛ ۱۹۳۳ء کے اسی رسالے عدد ۱ تا ۳ میں A. Girard نے مسلمانوں کی صورت حال کو موضوع بحث بنایا؛ Čamalović کے دعاوی کے ردّ میں الفتح، قاھرہ میں ضیاء الدین الازہری کا وہ مقالہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا جس کا ذکر مؤخرالذّکر عبارت میں ہے)؛ (۱۳) A. Bonamy : *Les musulmans de Pologne, Roumanie et Bulgarie*، در *R. E. Isl.*، برائے ۱۹۳۲ء (پوماقوں کے متعلق (ص ۸۸) سطحی بحث کرتا ہے)؛ (۱۴) Iv. Lekov : *Kam văpros za imeto pomak* (''پوماق'' نام کے سوال پر)، در *Sbornik poluvekovna Bălgarija*، صوفیا ۱۹۳۳ء، ص ۳۸ تا ۱۰۰ (قب *Bibliographie Géographique Internationale*، پیرس ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۷، جو Loveč-Pomaks کی تاریخ پر G. Ivanov کے ایک مختصر مقالے کا حوالہ بھی دیتا ہے *Za minaloto na lovčenskite pomačí*، در *Loveč i Lovčensko*، ج ۵، صوفیا ۱۹۳۳ء)؛ (۱۵) *Annuaire statistique du royaume de Bulgarie*، صوفیا ۱۹۳۳ء، ص ۲۳، ۲۵، ۲۸.

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

* **پُونا** : ایک شہر اور ضلع، بھارت کے صوبۂ مہاراشٹر میں واقع ہے۔ اس ضلع کا رقبہ ۵۳۳۲ مربع میل اور ۱۹۳۱ء کی سر شماری کی رُو سے آبادی ۱۱۶۹۷۹۸ تھی، جس میں ۵۳۹۹۷ مسلمان تھے (*Census Report*، ۱۹۳۱ء) ـ یہ دکن کی طاقت ور اندھرا حکومت میں شامل تھا، جو تقریباً تیسری صدی عیسوی کے وسط میں ختم ہوئی۔ جو شواہد دستیاب ہوئے وہ اس واقعے کی طرف بھی دلالت کرتے ہیں کہ بعد کو مغربی چالوکیوں، راشٹر کوٹوں، اور دیوگیری کے یادو راجاؤں نے اس رقبے پر حکومت کی ـ دکن کے خلجی اور تغلق [دیکھیے محمد تغلق] حملوں سے یہ مسلم تسلّط کے اندر آیا ـ پونا کی ایک دلچسپ روئداد، جب کہ یہ بہمنی سلطنت کا ایک حصہ تھا، ضبط تحریر میں آئی ہے ـ یہ ایک روسی سیاح اثناسیوس نیکیتن Athanasius Nikitin (۱۴۶۸ تا ۱۴۷۴ء)، کا بیان ہے؛ معلوم ہوتا ہے چینی سیاح فاھیان Fa-hien کے بعد وہ پہلا غیر ملکی سیاح تھا جس کے تأثرات ہمارے لیے محفوظ رہے ـ فاھیان کی سیاحت پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئی تھی (میجر R.H. Major : *India in the fifteenth century*، ھکلیوت Hakluyt سوسائٹی)ـ پونا مسلمانوں کی عملداری میں رہا، یہاں تک کہ مرہٹہ قوت کو اورنگ زیب کے عہد حکومت کے نصف آخر میں نشو و نما ہوئی؛ اسی لیے یہ ضلع مرہٹہ تاریخ کے آغاز ھی سے تعلق رکھتا ہے اور شیواجی کی سوانح کے ساتھ اسے قریبی نسبت ہے ـ پیشواؤں [رك بہ پیشوا] کے دور میں یہ برطانوی فتح تک مرہٹہ طاقت کا مرکز رہا ـ یہ برطانوی فتح انیسویں صدی کی ابتدا میں حاصل ہوئی .

پونا شہر، مُٹھا اور مُولا ندیوں کے سنگھم پر واقع ہے ـ اس کی کل آبادی (بوقت تحریر مقالہ ۲۵۰۱۸۷ تھی، جس میں ۲۸۹۲۵ مسلمان تھے (*Census Report*، ۱۹۳۱ء) ـ [۱۹۶۱ء کی سر شماری کی رو سے اس کی آبادی ۵۹۷۰۶۲ ہے (*Census of*

(India, 1951 and 1961]) - جب وہ صرف ایک موضع تھا تو مالوجی بھونسلا، شیواجی کے نانا کی جاگیر میں تھا - بعد کو شیواجی نے پونا کو غیر محفوظ دیکھ کر اپنا دارالحکومت راے گڑھ منتقل کیا، جہاں اس کی تخت نشینی کی رسم عمل میں آئی - پونا ہی وہ مقام تھا جہاں اس نے شائستہ خان پر حملہ کیا - پیشواؤں کی طاقت کی ترقی کے ساتھ پونا ایک بار پھر مرہٹہ حکومت کا صدر مقام اور مرکز ہو گیا - پیشوؤں کا مستحکم قصر، جو شاناواری کہلاتا تھا، ۱۸۲۷ء میں آگ سے جل کر تباہ ہو گیا - ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس پونا ہی میں منعقد ہوا تھا.

مآخذ: (۱) *Administration Reports of the Bombay Presidency* (سالانہ مطبوعات)؛ (۲) J. M. Campbell: *Gazetteer of the Bombay Presidency*، پونا، ج ۱۸، ۱۸۸۵ء؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، بذیلِ مادّۂ پونا؛ (۴) D. B. Parasnis: *Poona in Bygone Days*، ۱۹۲۱ء؛ (۵) J. Sarkar: *Shivaji and his Times*، ۱۹۱۹ء؛ (۶) S. Sen: شیوا چھتر پتی، ۱۹۲۰ء؛ (۷) L. W. Shakespear: *A Local History of Poona and its Battlefields*، ۱۹۱۶ء؛ [(۸) *The Statesmen's Year-Book 1966-67*، لندن ۱۹۶۶ء، ص ۳۸۶، ۳۹۱، ۴۲۲؛ (۹) *Census of India, 1951 and 1961 : Reports and Papers, Decennial series* (مطبوعاتِ حکومتِ ہند)؛ (۱۰) S. N. Agarwala: *India's population*، لندن ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) گیان چند: *Some Aspects of the Population Problem in India*، پٹنہ، ۱۹۵۶ء].

(C. Collin Davies)

پونتیانک: انڈونیشی بورنیو کی ایک سابق ولندیزی ریزیڈنسی، ویسٹر افڈیلنگ Wester-Afdeeling، کے ایک حصے کا اور دریاے کپواس کے ڈیلٹے کی ایک ریاست [جس کا موروثی حاکم سلطان کہلاتا ہے] اور اس کے صدر مقام کا نام؛ [صدر مقام قریب خطِ استوا پر واقع ہے].

پونتیانک کی سلطانی ریاست ولندیزیوں کے زیرِ سیادت خود مختار تھی - اس کا رقبہ ۵۰۴۵ مربع کیلومیٹر ہے - ۱۹۳۰ء میں آبادی ایک لاکھ ملاوی اور ڈیاک، ۵۶۲ فرنگی، ۲۶۴۲۵ چینی اور ۲۳۷۸ دوسرے مشرقی باشندوں پر مشتمل تھی - اصطلاح ملاوی تمام مقامی مسلمانوں پر حاوی ہے، جن میں بہتیرے عربی النسل، جاوی، بوگنی اور ڈیاک ہیں، جو مسلمان ہو گئے ہیں - اندرونِ ملک کے ڈیاک اب تک کافر ہیں - رومن کیتھولک مبلّغ ان کافر لوگوں میں اور چینیوں میں (تبلیغی) کام کر رہے ہیں - آبادی کے اس طرح مخلوط و مرکب ہونے کی وجہ پونتیانک کی بنا اور نشو و نما کے حالات سے عیاں ہوتی ہے.

شہر کی بنیاد ۱۷۷۲ء میں شریف عبدالرحمٰن نے رکھی، جو شریف حسین بن احمد القادری کا بیٹا تھا - حسین ایک عرب تھا، جس نے ۱۷۳۵ء میں بمقام متّن توطّن اختیار کیا اور ۱۷۷۱ء میں جب اس کا مپاوا میں انتقال ہوا تو وہ وزیر ہو گیا تھا اور اس کے تقوے کی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے - ۱۷۴۲ء میں عبدالرحمٰن پیدا ہوا، جو ایک ڈیاک حرم کا بیٹا تھا اور بالکل شروع سے اپنے عزم و ہمت کی بدولت ممتاز ہو گیا تھا - اس نے حاکمانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، پہلے مپاوا، پھر پلیم بنگ، پھر بنجرماسین میں، جہاں کئی مقامی اور فرنگی جہاز چھین لینے کے بعد اسے اپنے بحری فوج کے جتھے کے ساتھ، باوجودیکہ سلطان اس کا مربی تھا، یہ مقام چھوڑ دینا پڑا - اس وقت تک اس نے مپاوا اور بنجرماسین کی ایک

شہزادی سے شادی کی تھی، اور اس طرح وہ بڑا دولت‌مند بن گیا تھا۔ مپاوا کو واپسی سے تھوڑی مدت پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ اسے اس جگہ کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس نے طے کیا کہ اپنا ایک شہر بنانا چاہیے۔ لنڈک اور کپواس کے سنگھم کے دہانے پر ایک غیر آباد رقبہ، جو بھوتوں کا خطرناک گھر مشہور تھا، اسے موزوں نظر آیا۔ کئی گھنٹے کی گولہ باری کے بعد جب بھوت بھگا دیے گئے، تو وہ پہلا شخص تھا جو چھلانگ لگا کر کنارے پر اترا؛ جنگل کٹوا ڈالا گیا اور اس نے وہاں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے بھدّے سے مکانات بنوائے۔

یہ بہت موقع کی جگہ تھی۔ یہاں تاجروں کی خاطرخواہ حفاظت کی جاتی تھی۔ ان اسباب نے تھوڑے ہی دنوں میں بوگنی، ملاوی اور چینی تاجروں کو اس کی طرف کھینچا؛ چنانچہ پونتیانک نے تیزی سے ترقی کی اور شریف عبدالرحمٰن اپنی پیش بینی اور مستعدی کی بدولت ماتان، سکادانہ، مپاوا، اور سنگاؤ کی ہمسایہ ریاستوں کے مقابلے میں اپنی جگہ پر جما رہا۔

اس نے رعایا کے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک پر سردار مقرر کیے اور تجارت کو مناسب محصولوں کے ذریعے باضابطہ بنایا۔ بٹاویا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں کو اس نے اتنا متأثر کیا کہ جب کمپنی متن سے مغربی بورنیو تک کے علاقے پر تمام حقوق خرید چکی تو پونتیانک اور سنگاؤ کی ریاستیں اسے جاگیر کے طور پر دے دیں۔ بوگنیوں کے سلطان راجہ حاجی نے اسے بہت پہلے، یعنی ۱۷۷۲ء ہی میں سلطان کا خطاب دے دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد ۱۸۰۸ء میں اس کا بیٹا شریف قاسم جانشین ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دربار کے عربی آداب و رسوم کو جدیدتر طریقوں سے بدلا۔

اس عہدنامے کے مطابق جو ۱۸۵۵ء میں شرق‌الہند کی ولندیزی حکومت سے طے ہوا تھا سلطان کو ولندیزیوں سے ایک مقررہ رقم ملتی تھی اور وہ ریاست کی عدالت اور پولیس کا انتظام کرتے تھے؛ شرق‌الہند کی ولندیزی حکومت کے ساتھ ۱۹۱۲ء کے طویل اقرار نامے میں باہمی روابط کا مزید تعیّن کیا گیا، جس سے عدالت اور محاصل کے انتظام کا بھی تصفیہ ہو گیا۔ مقامیٔ خزانے سے، جس کی اس وقت تشکیل ہوئی تھی، سلطان کو ماہانہ ۶۸۰۰ ولندیزی اشرفیاں (gulden) ملنے لگیں؛ نیز زراعت اور معادن پر پچاس فی صد مالیہ اسے ملنے لگا۔

پونتیانک کی جس طرح بنیاد پڑی اس کے مطابق وہ اپنی نوعیت میں بدرجۂ غالب مسلمانوں کا شہر ہے اور اسی نسبت سے یہاں کے لوگوں کی بڑی تعداد حج مکّہ میں شریک ہوتی ہے۔ سلطان نے جب ۱۸۸۰ اور ۱۸۹۰ء کے درمیان حج ادا کیا تو ان حاجیوں کے لیے جنھیں ''جاوا فنتیانا'' کہا جاتا ہے مکّۂ معظمہ میں اس نے متعدد وقف مسافرخانے تعمیر کرائے۔

تمام آبادی کی بڑی وجہِ معاش زراعت اور اس کے ساتھ جنگلات کی پیداوار کی تجارت ہے۔ اشیاے برآمد کھوپرا، سیاہ مرچ، گم بیر (ایک قسم کا رنگ) سابو (ساگو) دانہ، ربڑ اور روٹن (بید rotan) ہیں، جو دساور، خاص طور پر سنگاپور اور جاوا کو بھیجی جاتی ہیں۔ چاول، پارچہ‌جات اور دوسری اشیا، جن کی یورپی اور زیادہ خوشحال چینی اورعرب باشندوں کو ضرورت ہوتی ہے، باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ درآمد اور برآمد کی تجارت زیادہ تر چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ چینیوں کے محلّے میں اکھٹے رہتے

ہیں، جو پونتیانک کے نصف یوربی حصے میں بائیں کنارے پر آباد ہے ۔ وہاں دوسرے غیر ملکی مشرقی لوگ بھی آباد ہو گئے ہیں؛ اسی لیے یہ شہر کپواس کی وادی میں تجارت اور کاروبار کا مرکز ہے ۔

پونتیانک کی دلدل والی زمینوں میں بیرونی دنیا کے ساتھ آمد و رفت کا تعلق تقریباً تمام و کمال بحری راستے سے ہے ۔ ماضی قریب میں موٹر کی سڑکیں مرتفع زمینوں پر پونتیانک سے مپاوا اور سمبسس تک، سنگی کا کپ تک اور مندور سے لنڈک تک نکالی گئی ہیں۔

یہ خاص طور سے بیان کرنا مناسب ہے کہ پونتیانک ایک صحت بخش مقام ہے، کیونکہ شہر میں اکثر پانی آ جاتا ہے اور وہ سمندر سے اتنی دور ہے کہ وہاں موسمی بخار (ملیریا) نہیں ہوتا۔

مآخذ: (۱) P. J. Veth: *Borneo's Wester-Afdeeling*؛ (۲) J. J. K. Enthoven: *Bijdragen tot de geographie van Borneo's Wester-Afdeeling* (*Tijdschrift Kon. Aardrijkskundig Genootschap*)، ۱۹۱۲ء، ص ۲۰۳ تا ۲۱۰ ۔

(A.W. NIEUWENHUIS)

پہلوان: محمد بن ایلدگیز، شمس الدین، آذربیجان کا اتابک [روضۃ الصفا، ۴ : ۱۰۲ میں اس کا پورا نام نصرۃ الدین محمد اور خطاب "جہان پہلوان" تحریر ہے] ۔ اس کا باپ ایلدگیز [رک باں] ترقی کرتا ہوا سلطنت سلجوقیہ میں حقیقی فرمانروا ہو گیا تھا ۔ سلطان طغرل [رک باں] کی بیوہ پہلوان کی ماں تھی اور ارسلان بن طغرل [رک باں] اس کا سوتیلا بھائی تھا ۔ ایلدگیز اور حاکم مراغہ، ابن آق سنقرالاحمدلی کی جنگ میں پہلوان نے نمایاں حصہ لیا [رک بہ مراغہ] ۔ اپنے باپ سے اسے ۵۶۸ھ / ۱۱۷۲ - ۱۱۷۳ء میں ارّان، آذر بیجان، الجبال، ہمذان، اصفہان اور الرّی مع اپنے ماتحت علاقوں کے ورثے میں ملے، اور چند سال کے بعد اس نے تبریز بھی لے لیا، جو اپنے بھائی قزل ارسلان [رک باں] کو دے دیا ۔ ایلدگیز کی طرح پہلوان بھی حقیقی حکمران ہو گیا ۔ سلطان ارسلان بن طغرل کامل طور سے اس کے قابو میں تھا، اسی طرح اس کا نوجوان لڑکا طغرل [رک باں] بھی رہا، جسے پہلوان نے ارسلان کا زہر کے ذریعے خاتمہ ہونے کے بعد سلجوقی تخت پر بٹھایا تھا [زہر خورانی کا ذکر روضۃ الصفا کی ایک ضعیف روایت میں آیا ہے، ابن الأثیر اور حمد اللہ المستوفی اس کا ذکر بالکل نہیں کرتے] ۔ پہلوان کی وفات ذوالحجہ ۵۸۱ھ / فروری - مارچ ۱۱۸۶ء یا آغاز ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں ہوئی اور اس کا بھائی قزل اس کا جانشین ہوا۔

ابن الأثیر (۱۱ : ۳۴۶، ۵۲۵) نے پہلوان کی مدبرانہ خوبیوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے ۔ اس کی عہدے داری کے زمانے میں اس کی ولایت میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ رہا، مگر اس کی وفات کے بعد خونریزی اور بے چینی پھیل گئی ۔ اصفہان میں شافعیہ اور حنفیہ ایک دوسرے سے لڑ پڑے اور الرّی میں سنّی اور شیعی، تاآنکہ تدریجاً امن و امان دوبارہ قائم ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن الأثیر: **الکامل** (طبع Tornberg)، ج ۱۱ و ۱۲، بمدد اشاریہ؛ (۲) **حمد اللہ المستوفی قزوینی**: تاریخ گزیدہ (طبع براؤن)، ۱ : ۳۶۶، ۳۷۰، ۳۷۳ تا ۳۷۵؛ (۳) Defrémery: *Histoire des Seldjoukides*، در *JA*، سلسلہ ۴، ۱۳ : ۱۵ ببعد؛ (۴) میر خواند: *Historia Seldschukidarum* (طبع فولرز Vullers)، باب ۳۴؛ (۵) *Recueil de textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides* (طبع ہوتسما Houtsma)؛ (۶) ہوتسما:

‹Some Remarks on the History of the Saldjuks در *AO*، ۳ : ۳۶ ببعد.

(K. V. ZETTERSTÉEN)

• **پیاسٹر** : رکّ بہ غروش.

• **پیالہ پاشا** : عثمانی امیرالبحر کبیر، بقول St. Gerlach : *Tage-Buch* (فرانکفرٹ M/a، ۱۶۷۴ء، ص ۴۴۸) ٹولنا Tolna (ہنگری) کا باشندہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ غالبًا کروٹ نسل سے ایک موچی کا لڑکا تھا - تقریبًا تمام معاصر تحریریں اس کے کروٹ نسل ہونے کا تذکرہ کرتی ہیں (قبّ *‹Relazioni degli ambasciatori Veneti al Senato* کا تیسرا سلسلہ، طبع E. Albéri، فلارنس ۱۸۴۴ - ۱۸۴۵ء، خصوصاً ۳ / ۲ : ۲۴۳ : *di nazione croato, vicino ai confini d'Ungheria*؛ ص ۳۰۷ : *di nazione croato*؛ ۳/۳ : ۲۹۴ : *di nazione unghero*؛ ص ۴۱۸) - اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کے باپ کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا اور اسے مسلمان بتایا گیا (قبّ F. Babinger، در *Litteraturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit*، برلن اور لائپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۳۵، حاشیہ ۱) - پیالہ لڑکپن میں استانبول کی سرائے میں خدمتگار کی حیثیت سے آیا اور قپوجی باشی [رکّ باں] تک ترقی کر کے وہاں سے گیا - ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء میں اسے امیر البحر (قپودان پاشا، [رکّ باں] کا عہدہ اور ''سنجق بے'' کا رتبہ ملا اور چار برس بعد اسے بیلر بای [= بیگلر بیگی، [رکّ باں] کا درجہ دیا گیا (J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۰۶) - وہ وزیر اعظم رستم پاشا [رکّ باں] کے بھائی سنان پاشا کا اس عہدے پر جانشین ہوا، جہاں وہ ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء تا ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء رہا تھا - تسخیر جربہ اور دوسری دلیرانہ بحری فتوحات کے بعد اسے خیال آیا کہ اب وہ منصب وزارت اور اوچ طوغ ویر لمک [نشان، جو کسی پاشا کو بلند ترین طبقے تک ترقی دینے کے لیے گھوڑے کے تین دم چھلوں کے طور پر دیا جاتا تھا] کا استحقاق رکھتا ہے تو سلطان سلیمٰن نے ایسی ترقی کو بہت قبل از وقت اور توقیر وزارت کی کسرشان کے اندیشے سے (قبّ حاجی خلیفہ : تحفة الکبار، طبع اول، ورق ۳۶ اور J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۰۶) پہلے اس کی شادی اپنی پوتی جوہر سلطان بنت سلیم ثانی کے ساتھ کر دی (قبّ J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۳۹۲ : ۱۵۶۲ء کا موسم گرما)، پھر کہیں پانچ برس کے بعد اسے داماد وزیر کی حیثیت سے محمد صوقللی پاشا کی طرح اوچ طوغ ویرلمک کا نشان عطا ہوا - اس اثنا میں وہ سمندر میں بہت سے معرکے کے کام کرچکا تھا اور وہ عثمانی حکومت کے عظیم‌ترین امراء البحر میں سے ایک کے طور پر مشہور ہو چکا تھا - طور غود رئیس کی معیت میں فرانسیسی سفیر دارامون d'Aramon کی شہ سے اس نے نیپلز کے گرد ساحل پر چھاپے مارے؛ رجیو Reggio کو محاصرہ کر کے لے لیا اور اس کے باشندوں کو غلام بنا کے لے گیا - ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں اس نے البہ Elba اور پیومبینو Piombino کے محاصرے کی ناکام کوشش کی (قبّ J. v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۱۸) - آخر میں الجزائر کی مستحکم بندرگاہ وہران (Oran) کو پینتالیس بادبانی جہازوں سے فتح کرلیا - آئندہ سال ساٹھ جنگی جہازوں سے اس نے بزرتا Bizerta (= بنت زرت) کی بندرگاہ پر قبضہ کیا - ایک سال بعد ایک سو پچاس بادبانی جہازوں سے جزیرۂ میورقہ (Majorca) کو تاراج کر ڈالا اور نیپلز کے قریب سورنتو Sorrento کو جلا دیا - ۹۶۵ھ / ۱۵۵۸ء میں وہ نوّے جنگی جہازوں کے بیڑے کے ساتھ البانیا میں والونا (= فالونا) Valona کے سامنے خاموش پڑا رہا؛ غرض یہ تھی کہ وہاں دشمن کے بیڑوں کی تاک لگائے، جو جربہ اور طرابلس پر ہاتھ

مارنے کی تیاری کر رہے تھے - ۳۱ جولائی ۱۵۶۰ء اس کے سب سے بڑے بحری کارنامے یعنی تسخیر جربہ [رک بآں] کی تاریخ ہے، جسے کچھ ہی پہلے ہسپانویوں نے لے لیا تھا - یہ کام اس نے ایک سو بیس جہازوں سے انجام دیا، جو مُدن (Modon) سے روانہ ہوئے تھے - ۲۷ ستمبر ۱۵۶۰ء کو فتح کے پھریرے اُڑاتا ہوا استانبول میں داخل ہوا، جہاں اپنی کامیابی کی خبر ایک بادبانی جہاز کے ذریعے پہلے سے بھیج دی تھی (قب J. v. Hammer : GOR، ۳ : ۳۲۱ ببعد) - یہ امیرالبحر کبیر بعد کے چار برس تک سمندر میں نہیں نکلا - لیکن پھر اگست ۱۵۶۴ء میں اُس نے چھوٹا سا چٹانی جزیرہ نما Peñon de Vélez de la Gomera، ہسپانویوں سے لے لیا؛ مقصد یہ تھا کہ تسخیر مالٹا کی تیاری کی جائے، جس کا انتظام سلطان کی چہیتی بیٹی ''مہر ماہ'' (رک بہ رستم پاشا) اپنے تمام وسائل سے کر رہی تھی؛ لیکن اس موقع پر تقدیر نے یاوری نہ کی، کیونکہ مالٹا کا محاصرہ جون - جولائی ۱۵۶۵ء میں عیسائی محافظین کی مدافعت کے آگے ناکام ہو گیا، جنھوں نے عسکری قوت کا زبردست مظاہرہ کیا اور عثمانیوں کو بھاری نقصانات پہنچائے - سلطان سلیمان نے ہنگری پر ۱۵۶۶ء کی فصل بہار میں لشکر کشی کی تو اس وقت پیالہ پاشا استانبول کی بندرگاہ اور سلاح خانے کا نگران مقرر ہوا (قب J.v. Hammer : GOR، ۳ : ۴۳۸) - اس سے پہلے وہ جزیرۂ خیوس Chios اور ساحل اپولی (Apulian) پر ایک کامیاب حملہ کر چکا تھا (وہی کتاب، ۳ : ۵۰۶ ببعد)، جس میں جزیرۂ خیوس اور اس کی بندرگاہ پیالہ پاشا کے ہاتھ آ گئی (عیدالفصح Easter Sunday ۱۵۶۶ء) - اپنے خسر سلیم ثانی کے عہد حکومت میں پیالہ موردِ عتاب ہوا اور امیر البحر کبیر کے عہدے سے معزول کیا گیا، کیونکہ اسے یہ الزام دیا جاتا تھا کہ اس نے جزیرۂ خیوس کے مالِ غنیمت کا بڑا حصہ خود رکھ لیا تھا (Albrecht de Wijs کے سفارت خانے کے اطلاع نامے مورخۂ مئی ۱۵۶۸ء، در J.v. Hammer : GOR، ۳ : ۸۲۷ کے مطابق) اور اس کی جگہ مؤذّن‌زادہ علی پاشا کا تقرر ہوا - پیالہ پاشا نے فوراً تگ و دو شروع کی کہ سمندر میں نئے کارہائے نمایاں کے ذریعے دوبارہ شاہی خوشنودی حاصل کرے - اپریل ۱۵۷۰ء میں وہ پچھتر بادبانی جہاز اور تیس جنگی کشتیاں لے کر روانہ ہوا اور سب سے پہلے جزیرۂ تینہ Tine کے ساحل پر اُترا، جسے اس نے فتح کر لیا اور قبرص (Cyprus) کی فتح میں حصہ لیا - ۲۰ جنوری ۱۵۷۸ء کو اور عثمانی مآخذ کے مطابق ۱۲ ذوالقعدہ ۹۸۵ھ / ۲۱ جنوری ۱۵۷۸ء کو اس نے بقول جرلاخ Stephan Gerlach استانبول میں وفات پائی (قب اس کی Tage-Buch، فرینکفرٹ a/M. ۱۶۷۴ء، ص ۴۴۸) - اس کے نہایت وسیع املاک کچھ شاہی خزانے میں گئے اور کچھ اس کی بیوہ اور بچوں کو ملے - اس کی بیوہ نے آگے چل کر محمد پاشا وزیر سوم سے شادی کی اور اس کا دوسرا بیٹا ۱۵۹۴ء میں کلیس Clissa کا سنجاق بک ہو گیا، جو دالماچیا Dalmatia میں سپلیت (Spalato) کے اوپر واقع ہے (قب اطالوی اطلاع محولّہ در J. v. Hammer : GOR، ۴ : ۱۰۴، حاشیہ ۱ : *La Sultana fo moglie di Piale ora di Mohammedbassa terzo vezir, ha ottenuto dal Sign. il Sangiaco di Clissa per il secondo suo figlio con Piale*) - پیالہ پاشا کی تدفین استانبول کے محلۂ قاسم پاشا کی اس مسجد میں ہوئی جسے اس نے تعمیر کیا تھا (قب حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، ۲ : ۲۵ ببعد).

مآخذ : متن میں محوّلہ تصنیفات کے علاوہ (۱)

Zinkeisen اور Lorga کی تاریخیں؛ اور (۲) رامز پاشا زادہ محمد افندی : خریطۂ قبودان دریا، استانبول ۱۲۸۵ھ؛ نیز (۳) حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، ۲ : ۲۵ ببعد؛ اور (۴) محمد ثریا : سجل عثمانی، ۲ : ۱۴ ببعد.

(FRANZ BABINGER)

* **پِیر** : (ف) بمعنی عمر رسیدہ؛ تصوّف میں ''مرشد'' یا ''روحانی ہادی'' کو کہتے ہیں ۔ وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ بذریعۂ طریقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی تعلیمات سکھانے والوں کے براہِ راست سلسلے میں ہے اور اسی سے اسے مریدوں کو طریقت میں رہنمائی کرنے کی سند حاصل ہوتی ہے؛ لیکن اسے خود قابل اتباع ہونا چاہیے ۔ صوفیانہ زندگی کے تین مدارج سے اسے نظری اور عملی دونوں طرح کی کامل معرفت ہونی چاہیے اور جسمانی علائق سے بری ہونا چاہیے ۔ جب ایک پیر کو اس کا ثبوت مل جاتا ہے، خواہ اپنے بلا واسطہ علم سے یا اپنی روحانی طاقت (ولایت) سے کہ مرید دوسرے صوفیوں کے ساتھ رفاقت کا اہل ہے تو وہ اپنا ہاتھ مرید کے سر پر رکھتا ہے اور اسے خرقہ عطا کرتا ہے ۔ مرید کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسی پیر سے خلافت حاصل کرے جس نے اسے تعلیم دی ہے اور جو ''پیرِ صحبت'' کہلاتا ہے ۔ پیر وہ لقب ہے، جو درویشی طریقوں کے بانیوں کو دیا جاتا ہے.

مآخذ : (۱) R.A. Nicholson : *Studies in Islamic Mysticism*، کیمبرج ۱۹۲۱ء اور اسی موضوع کی کتابیں جن کا وہاں حوالہ دیا گیا ہے؛ (۲) J.P. Brown : *The Darvishes*، آوکسفرڈ ۱۹۲۷ء.

(R. LEVY)

* **پیرا** : (= پیرہ) رک بہ استانبول.
* **پیراک** : رک بہ ملایا، جزیرہ نما.

⊗ **پیر پنجال (سلسلۂ کوہ)** : پیر پنجال سلسلۂ کوہ ان سات مشہور سلسلہ ہائے کوہ میں سے ہے جن سے مل کر سلسلۂ ہمالیہ خورد بنتا ہے ۔ یہ ہمالیہ کے عظیم سلسلۂ کوہ سے دریاے ستلج پر جُدا ہوتا ہے اور ایک طرف دریاے چناب اور دوسری طرف بیاس اور راوی کے درمیان فاصل آب بن گیا ہے ۔ راوی کے منبع کے قریب پیر پنجال دھولدار سلسلۂ کوہ کی جانب مڑتا ہے اور پھر ان دونوں سلسلوں کے اتصال سے بنگھل کے بنیادی خط کی کوہستانی گرہ بنتی ہے.

یہ سلسلۂ کوہ ہزارے کی سرحد پر دریاے اٹک کے کنارے ختم ہوتا ہے ۔ خاتمے پر اس کی مشہور چوٹی مہابن ہے، گو سوات کے سلسلۂ کوہ کو شاید ہم اسی کا ماوراے اٹک توسیعی سلسلہ کہہ سکتے ہیں .

بحیثیت مجموعی اس سلسلے کا رخ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف ہے اور بڑے بڑے دریا، جو اس سلسلے کو چیر کر بہتے ہیں، اسے چند حصّوں میں تقسیم کر دیتے ہیں ۔ اس کی چوٹیوں کی اوسط بلندی انیس ہزار فٹ، دروں کی بلندی ۱۰،۵۰۲ اور پورے سلسلے کی اوسط بلندی سترہ ہزار فٹ ہے.

پیر پنجال میں بڑے بڑے یخ تودے (گلیشیر glaciers) نہیں ہیں، پھر بھی اکثر مقامات پر سال کے معتدبہ حصے میں برف جمی پڑی رہتی ہے ۔ ہمالیہ کا سلسلۂ کلاں شمالی جانب ہے اور پیر پنجال جنوب میں، اور ان دونوں کے درمیان بیضوی شکل کی وادیِ کشمیر واقع ہے، جو اپنی خوبصورتی اور دلفریب منظر کی وجہ سے مشہور ہے.

(سعیدالدین احمد)

پیری محمد پاشا : ایک عثمانی وزیر اعظم، آماسیہ کا باشندہ اور مشہور جلال الدین اقسرائی کی اولاد میں سے تھا؛ لہٰذا اس کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ تک پہنچتا تھا ۔ اس نے پہلے قانون کا

پیشہ اختیار کیا اور نوبت بہ نوبت صوفیہ، سلوری اور غلطہ کا قاضی ہوا؛ استانبول میں محمد ثانی کے لنگر خانے (عمارت) کا مہتمم ہوا اور بایزید ثانی کے عہد حکومت کے آغاز میں ''باش دفتر دار'' کا رتبہ حاصل کیا۔ سلیم اول کے عہد میں اس نے ایرانی جنگوں میں اپنے حکیمانہ مشورے سے امتیاز پایا (قب J.v. Hammer : *GOR*، ۲ : ۳۱۲ و ۳۱۷ ببعد)، وہ مقدمۃ الجیش کے طور پر تبریز بھیجا گیا تھا تا کہ سلطان کے نام سے اس شہر پر قبضہ کر لے۔ ستمبر ۱۵۱۴ء کے آخر میں مصطفی پاشا کی جگہ، جسے برخاست کیا گیا تھا، وزیر سوم مقرر ہوا (قب J.v. Hammer، ۲ : ۴۲۰)۔ کچھ عرصہ استانبول میں ''قائم مقام'' کی خدمت انجام دی، پھر مصری مہم کے اختتام پر یونس پاشا کی جگہ، جسے مصر سے پسپائی پر ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں سزائے موت دی گئی تھی، وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اپنی اس حیثیت میں اس نے ۱۵۲۱ء میں فتح بغداد میں حصہ لیا۔ ردوس Rhodes پر قبضے کے بعد جلد ہی پیری پاشا سلطان کی عنایات سے محروم ہو گیا، یہ حاسد احمد پاشا کی افترا پردازیوں کا نتیجہ تھا، جسے اس کے عہدے کی طمع تھی۔ پیری پاشا دو لاکھ اسپر Aspers (چاندی کا چھوٹا ترکی سکہ تقریباً ۱/۳ درہم کے برابر) کا وظیفہ دے کر ۱۳ شعبان ۹۲۹ھ/۲۷ جون ۱۵۲۳ء کو سبکدوش کیا گیا۔ اس کا جانشین ابراہیم پاشا [رك بآں] ہوا، جو اصلاً پرغہ Praga کا یونانی تھا۔ پیری محمد دس برس اور زندہ رہا اور ۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء یا ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء، میں بمقام سلوری وفات پائی، جہاں اپنی تعمیر کردہ مسجد میں دفن کیا گیا۔ اس کا ایک بیٹا محمد بیگ حاکم ایچ ایل ۹۳۲ھ میں باپ سے پہلے فوت ہو چکا تھا۔ پیری محمد پاشا نے بہت سے اوقاف خیر کی بنیاد ڈالی، جن میں سے استانبول کی ایک مسجد اس کے نام سے منسوب ہے (قب حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۳۰۸)۔ ایک مدرسہ اور ایک دارالمساکین اور ایک وقف، جو ''تاب خانہ'' کے نام سے مشہور تھا، اس نے جاری کیے۔ اگرچہ اس کا لقب پیری تھا مگر شعر میں رمزی ''مخلص'' (تخلّص) کرتا تھا۔ اس کی نظمیں متوسط درجے کی ہیں (قب J. v. Hammer : *Geschichte der Osmanischen Dichtkunst*، ۲ : ۳۲۷ ببعد، جہاں غلط سال وفات درج ہے، نیز ۱ : ۱۸۷، بذیل ''پیری'' جہاں یہ نہیں سمجھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں؛ قب مزید لطیفی : تذکرہ، ص ۱۶۸ بذیل ''رمزی'')۔

مآخذ : (۱) محمد ثریا : سجلّ عثمانی، ۲ : ۳۰؛ (۲) زیادہ تفصیل کے ساتھ، در عثمان زادہ محمد تائب : حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۲۲ ببعد؛ اور (۳) سولھویں صدی کے عثمانی واقعہ نگار؛ (۴) بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۱۱۱ ببعد؛ پیری محمد پاشا سے بحیثیت ایک انشا پرداز کے بحث کرتا ہے۔ اس کے بقول اس نے نظموں کا ایک چھوٹا مجموعہ (دیوانچہ) تصنیف کیا اور مثنوی کے ایک حصے کی ایک شرح اور شاعدی کی شرح، جس کا نام تحفۂ میر ہے، لیکن دونوں کتابیں تاحال مخطوطات میں بیان کی گئی ہیں۔

(FRANZ BABINGER)

* **پیری محی الدین رئیس** : عثمانی جہازران اور ماہر نقشہ کشی، غالباً یونانی الاصل تھا اور مشہور جہازران کمال رئیس کا بھتیجا بیان کیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر پر دیکھیے مقالہ Hans-Albrecht von Burski : *Kemal Re'is, ein Beitrag zur Geschichte der türkischen Flotte*، بون ۱۹۲۸ء اور بالخصوص J. H. Mordtmann : *Zur Lebensgeschichte des Kemal Re'is*، در *MSOS*، جلد ۳۲، حصہ ۲، برلن ۱۹۲۹ء، ص ۳۹ تا ۴۰، اور

ص ۲۳۱ ببعد) ۔ کہا جاتا ہے کہ پیری کا باپ کوئی شخص حاجی محمد نامی تھا، مگر خود پیری اپنی جہازرانی کی کتاب کے دیباچے میں اپنے کو حاجی حُقیری کا لڑکا کہتا ہے ۔ اگرچہ یہ خیال کرنا ممکن ہے کہ ''حقیری'' محض پیری سے قافیہ ملانے کے لیے انتخاب کیا گیا ہو (قب سنان بن عبدالمنان یا داؤد بن عبدالودود، اور نارکانِ مسیحیت کے آباء و اجداد کے اسی طرح کے ہم قافیہ نام، جو عموماً ''عبد'' لگا کر بنائے جاتے ہیں) ۔ چونکہ حُقیری اسمِ علم نہیں ہو سکتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک ''مَخلص'' ہے، اس لیے پیری کا خالص ترکی النسل ہونا اور بھی زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ خالی حُقیری محمد کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا بلکہ اس کا دوسرا نام تھا، جس کی شہادت موجود ہے، گو یہ سچ ہے کہ یہ شہادت زمانۂ ما بعد کی کتاب سجلِ عثمانی، ۲ : ۲۳۹ میں آئی ہے ۔ یہ مآخذ (۲ : ۴۴) بتاتا ہے کہ اس بحر نورد کا پورا نام پیری محی الدین رئیس تھا ۔ بہر حال یہ بلا خدشہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ پیری تخلّص کے طور پر اختیار کیا گیا تھا، جب کہ اصلی نام (عَلَم) غالباً محمّد تھا ۔ سولھویں صدی میں پیری محمّد کی ترکیب بالکل عام تھی اور محمد کے ساتھ محی الدین ''خطاب'' کے طور شامل تھا (قب *Isl*، جلد ۱۱، ۱۹۲۱ء، ص ۲۰، تعلیقہ ۳) ۔ پیری رئیس کی زندگی کے متعلق جس نے اپنے چچا کمال رئیس (م ۱۶ شوال ۹۱۶ھ / ۱۶ جنوری ۱۵۱۱ء) کی زیر قیادت متعدّد بحری سفر کیے اور بعد کو خیرالدین بربروسہ؛ (م ۴ جولائی ۱۵۴۶ء) [رک بآں] کی ماتحتی میں امتیاز پایا ۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ان مہموں میں اس نے بحر روم کے ملکوں کے متعلق لاجواب واقفیت حاصل کر لی تھی ۔ بعد

میں مصر کا ''قپودان'' ہوا، اور اس حیثیت میں اُس نے سویز سے خلیج فارس اور بحر عرب تک جہازی سفر کیے ۔ [۹۵۴ھ] / ۱۵۴۷ء میں اس نے عدن پر قبضہ کیا (قب *Die osmansiche Chronik des Rusten Pascha*، طبع Ludwig Forrer، [*Türk. Bibl.* جلد ۲۱، لائپزگ ۱۹۲۳ء]، ص ۱۷۴ ببعد ۔ پوری شرح کے ساتھ) ۔ ۹۰۹ھ / ۱۰۰۱ - ۱۰۰۲ء میں ساحل عرب پر اس کے تیس جہازوں میں سے کئی ضائع ہو گئے، پھر بھی مسقط کی بندرگاہ فتح کی اور وہاں کے بہت سے باشندوں کو جنگی قیدی بنا کر لے گیا ۔ پھر اس نے ہُرمز کا محاصرہ کیا، لیکن اٹھا لیا اور بصرے لوٹ گیا ۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے رشوتیں لے لی تھیں (بقول پچوی، عالی، حاجی خلیفہ : تحفۃ الکبار، بار اول، ورق ۲۸، مطابق J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۱۰) ۔ یہ سن کر کہ دشمن کے جنگی جہازوں کا ایک بیڑا قریب آ رہا ہے اس نے وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے پاس صرف تین بادبانی جہاز رہ گئے تھے، لیکن تمام مال و متاع جو اکھٹا کیا تھا، ساتھ تھا ۔ اس کا جہاز جزیرۂ بحرین میں ٹوٹ کر تباہ ہو گیا، لیکن وہ دو جہازوں کے ساتھ سویز، اور پھر قاہرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ادھر قباد پاشا، والیِ بصرہ اس اثنا میں باب عالی کو اطلاع بھیج چکا تھا کہ مہم ناکام رہی ۔ اس پر پیری رئیس کی گردن مارنے کا حکم قاہرہ بھیج دیا گیا تھا؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ۹۶۲ھ / ۱۰۰۴ - ۱۰۰۰ء میں، لیکن غالباً زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۹۰۹ھ یا ۹۶۰ھ میں اس کا وہاں سر قلم کیا گیا اور اس کے املاک استانبول بھیج دیے گئے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد ہُرمز کے قاصد استانبول پہنچے جو لٹے ہوئے باشندوں کی وکالت میں مطالبہ کرتے تھے کہ جو مال و زر وہ لوٹ کر لے گیا وہ

واپس کر دیا جائے - ظاہر ہے کہ اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی - قپودان مصر کا عہدہ ایک دوسرے شخص مراد نام کو دیا گیا، جو قطیف کا معزول سنجاق بے (والی) تھا (غالبًا وھی جو اس مثل میں ''اس طرح جیسے مراد کپتان'' بقول H.F. v. Diez : *Denkwürdigenkeiten von Asien*، حصۂ اوّل، برلن ۱۸۱۱ء: ص ۵۵ زندہ ہے.

پیری رئیس بحر ایجہ اور بحیرۂ روم پر ایک کتاب جہازرانی کا مصنّف ہونے کی حیثیت سے عام طور پر معروف ہے - اس کتاب کا نام بحریہ ہے؛ اس میں تمام سواحل کی، جن کا اس نے بحری سفر کیا، کیفیت لکھی ہے اور پایاب اور لنگر ڈالنے کے مقامات، روؤں اور خلیجوں، آبناؤں اور بندرگاھوں کی تفصیل دی ہے - پیری رئیس اس تصنیف کا آغاز سلیم اوّل (م ستمبر ۱۵۲۰ء) کے عہد ھی میں کر چکا تھا، اگرچہ وہ دیباچے میں کہتا ہے کہ اس نے اس کی ابتدا ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰-۱۵۲۱ء کے خاتمے تک نہیں کی تھی، مقصد یہ کہ سلطان سلیمان قانونی کے نام کتاب کا انتساب زیادہ دلنشین بنایا جائے - اس نے موخرالذکر کو اپنا مکمل اطلس ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۳-۱۵۲۴ء میں پیش کیا - پال کالہ Paul Kahle نے متن اور ترجمے کے ساتھ، جو مشہور قلمی نسخوں پر مبنی ہے، اسے شائع کیا - کتاب کا نام پیری رئیس بحریہ ہے - *Das türkische Segelhandbuch für das Mittelländische Meer vom Jahre 1521*، جس کے ۱۹۳۰ء کے وسط تک جلد اوّل کے متن کا حصۂ اوّل اور جلد دوم، حصۂ پنجاهم فصل ۱ تا ۲۸ لائپزگ اور برلن میں ۱۹۲۶ء میں چھپے - علیحدہ فصلیں پہلے شائع ھو چکی ھیں، مثلاً H.F.v. Diez، کتاب مذکور؛ زخاؤ E. Sachau : *Sizilien*، در *Centenario delle Nascita di Michele Amari*، ۲، Palermo ۱۹۱۰ء: ۱ ببعد؛ R. Herzog : *Ein türkisches Werk über das Agäsische Meer aus dem Jahr 1520*، در *Mitteilungen des Kaiserl. Deutschen Archäolog. Instituts, Athenische Abteilung*، ۲۷، ۱۹۰۲ء: ۲۱۷ ببعد؛ E. Oberhummer، Zypern، فصل، در *Die Insel Zypern*، میونخ ۱۹۰۳ء، ص ۴۲۷ تا ۴۳۳ - دیگر فصول، در Carlier de Pinon، طبع E. Blochet (مع تصاویر) اور K. Foy، در *MSOS*، حصّہ ۲ و ۱۱، ۱۹۰۸ء: ص ۲۳۴ ببعد، قبّ برآں F. Taeschner، در *ZDMG*، ۷۷ (۱۹۲۳ء): ۴۲، دوسرے حوالوں کے ساتھ.

مبینہ ''کولمبس کا نقشہ'' اکتوبر ۱۹۲۹ء میں خلیل ادھم بے کو کتاب خانۂ سرای استانبول میں دستیاب ہوا، اس پر پیری رئیس کے ۱۵۱۳ء کے دستخط ثبت ہیں اور اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ پیری رئیس ھی کے وقت میں تیار ہوا - یہ ترکی زبان میں جھلّی پر شوخ رنگوں میں ہے، ۸۵×۶۰ سنٹی میٹر، اور دنیا کے نقشے کا مغربی حصّہ پیش کرتا ہے - یہ نقشہ بحر اوقیانوس مع امریکہ اور پرانی دنیا کے مغربی کنارے پر مشتمل ہے - دُنیا کے دوسرے حصّوں کا نقشہ ضائع ہو گیا - یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ وھی نقشہ ہوگا جسے پیری نے بحریہ میں اپنے ایک بیان کے مطابق سلطان سلیم کو ۱۵۱۷ء میں پیش کیا تھا؛ چنانچہ شاہی کتاب خانے میں اس کے محفوظ ہونے کی یہی توجیہ ہے؛ اس پر قبّ Paul Kahle : *Impronte Colambiane in una Carta Turca del 1513*، در *La Cultura*، سال دھم، ج ۱، حصّہ ۱، میلان (روم)، ۱۹۳۱ء؛ وھی مصنّف: *Una mapa de América hecho por el turco Piri Re'is, en el ano 1513, basándose en una mapa de Colón y en mapas portugueses*، در *Investigación y Progreso*، ۵: ۱۲، میڈرڈ ۱۹۳۱ء، ص ۱۶۹ ببعد؛ ''C'' در *The Illustrated London News*، ج ۱۸۰، عدد ۴۸۵۰،

۲۷ فروری ۱۹۳۲ء : ص ۳۰۷ : *A Columbus Contro-versy-and two Atlantic charts* (مع نقول)؛ P. Kahle : *Die verschollene Columbus-Karte von 1498 in einer türkischen Weltkarte von 1513* (مع ۹ نقشے)، ۵۲ صفحات، برلن اور لائپزگ ۱۹۳۳ء)؛ نیز Eugen Oberhummer : *Eine türkische Karte zur Entdeckung Amerikas*، در *Anzeiger der Akademie der Wissens-chaften in Wien*، phil.-hist. Kl.، ۱۹۳۱ء، ص ۹۹ تا ۱۱۲؛ وہی مصنف : *Eine Karte des Columbus in türkischer Überlieferung*، در *Mitteilungen der Geogra-phischen Ges. in Wien*، ۷۷، ۱۹۳۳ء : ۱۱۵ ببعد؛ اور آخر میں P. Kahle، در *Geographical Review*، ۱۹۳۳ء، ص ۶۲۱ تا ۶۳۸.

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہان نما، استانبول ۱۱۳۵ھ، ص ۱۱؛ (۲) وہی مصنف : تحفة الکبار فی اسفار البحار، استانبول ۱۱۴۱ھ، ص ۲۸ الف؛ (۳) وہی مصنف : کشف الظنون، طبع فلوگل، ۲ : ۲۲ ببعد (عدد ۱۶۸۹)؛ (۴) محمد ثریا : سجلّ عثمانی، ۲ : ۴۴؛ (۵) P. Kahle : کتاب مذکور، مقدمہ؛ (۶) Hans v. Mžik : *Piri Re'is und seine Bahrîje*، در *Beiträge zur historischen Geographie* وغیرہ، طبع Hans v. Mžik، لائپزگ اور وی انا ۱۹۲۹ء، ص ۶۰ تا ۷۶.

(FRANZ BABINGER)

پَیسا : [برصغیر پاکستان و ہند میں] انگریزی pice، تین پائی یا چوتھائی آنے کے برابر برطانوی ہند میں مروّج تانبے کا ایک سکّہ؛ مغلوں کے زمانے میں اس نام (پیسا) کا اطلاق قدیم سکّے ''دام'' پر ہوا، جسے شیر شاہ نے جاری کیا تھا اور ایسے چالیس پیسے، تانبے کے ایک سکّہ روپے کے برابر تھے؛ مگر ان سکّوں پر معمولاً صرف ''فلوس'' یا ''روانی'' کا نام کندہ ملتا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں سلطنت مغلیہ کے بجائے ملک میں بہت سی آزاد ریاستیں قائم ہوئیں اور ان میں بکثرت تانبے کے سکّے مضروب ہوئے؛ یہ سب عام طور پر پیسا کہلاتے تھے (قب J. Prinsep : *Useful Tables*، طبع E. Thomas، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۶۲ ببعد)۔ [برصغیر کی آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سکّے کا نظامِ اعشاریہ رائج ہوا تو پیسے کی قیمت $\frac{1}{64}$ کے بجائے $\frac{1}{100}$ روپیہ مقرر ہوئی]۔

(J. ALLAN)

پیش گوئی : آئندہ کی خبر دینا (رکَ بہ کہانت، نیز جفر، فال، رمل، تعبیر)۔

پیشوا : (۱) ایک لقب جو دکن کے بہمنی سلاطین کے وزرا میں سے ایک کو دیا گیا؛ (۲) شیواجی کا وزیر اعظم؛ (۳) مرہٹہ جمعیت کا سردار [فارسی، رہنما، پہلوی، ''پیشوبی'' ارمنی، پشپی؛ زیادہ قدیم شکلوں کے لیے دیکھیے Hübschmann : *Armenische Grammatik*، ۱ : ۲۳۰]۔

شیواجی دکن میں مرہٹہ حکومت کا بانی تھا، جس کی معاون وزیروں کی ایک مجلس تھی، یہ اشٹا پردھان کہلاتے تھے اور اس جماعت میں سے ایک پیشوا یا مکھیا پردھان ہوتا تھا۔ پیشوا کا منصب موروثی نہ تھا اور شیواجی کی استبدادی حکومت کی نوعیت کا اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے وزرا کو یہ اجازت بھی نہ تھی کہ اپنے نائب انتخاب کریں۔ ان کا تقرر خود شیواجی کرتا تھا۔ شیواجی کے بعد پیشوا دیوانی اور فوجی دونوں قسم کے انتظامات کا اعلٰی حاکم ہوتا تھا اور تمام دفتری مراسلات و دستاویزات پر اپنی مہر ثبت کرتا تھا۔ راجہ رام کے عہدِ حکومت میں پیشوا کا اقتدار پنت پرتی نیدھی کے اقتدار کے سامنے ماند پڑ گیا۔ بالاجی وشواناتھ (۱۷۱۴ تا ۱۷۲۰ء) کو معمولاً پہلا پیشوا شمار کیا جاتا ہے،

کیونکہ وہ ان مرہٹہ حکمرانوں کے سلسلے کا حقیقی بانی تھا جو بتدریج ستارا کے راجاؤں کو اکھاڑ کر خود مرہٹہ جمعیت کے سرخیل بن گئے، لیکن در اصل بالاجی سے پہلے چھے پیشوا گزر چکے تھے، یعنی شام راج، نیل کنٹھ رزکر، مورو ٹرمبک پنگلے، نیل کنٹھ مریشور پنگلے، پرش رام ٹرمبک پرتی نیدھی، بہرو مریشور پنگلے اور بال کرشنا واسدیو۔

بالاجی وشواناتھ بھٹ (۱۷۱۴ تا ۱۷۲۰ء) پیشواؤں کے خاندان کا ایک قابل چتپاون یا کنکستھ برھمن تھا، جسے شاھو (۱۷۰۸ تا ۱۷۴۹ء) نے وزیرِ اعلی مقرر کیا۔ شاھو کی مشکلات، جو اسے پیش آئیں، مہاراشٹر میں سیاسی ابتری اور ستارا کے متأخر راجاؤں کی کمزوری، یہ سب پیشواؤں کی طاقت بڑھنے کے اسباب ہو گئے۔ پرتی نیدھی دادوبا (جگ جیون راؤ) کی شاھو کی وفات کے وقت اسیری نے ایک اور روک ان کی ترقی کے راستے سے ھٹا دی، اور یہ واقعہ دکن میں دشاستھ برھمنوں کے سیاسی اثر ختم ھونے کا نشان تھا۔ بالاجی وشواناتھ نے ملک کو خانہ جنگی کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے پایا، لیکن جب مرا تو اسے پرامن اور خوشحال چھوڑا۔ مال گزاری کے حسابات کو پیچیدہ بنا کر اس نے ریاست کے مالیات پر برھمنوں کا اختیار بڑھا دیا۔ اس کے منصب کے زمانے میں مغل شہنشاہ محمّد شاہ نے تسلیم کیا کہ شاھو کو پورے دکن سے چوتھ (مال گزاری کا $\frac{1}{4}$) کی تحصیل کا حق ھے اور اس تحصیل کے تکملے کے لیے اسے ایک زائد محصول "سردیس مکھی" (مال گزاری کا $\frac{1}{10}$) لگانے کی اجازت دی۔ اس کے بیٹے باجی راؤ اول (۱۷۲۰ تا ۱۷۴۰ء) نے مزید علاقے دبا لینے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس کی موت سے ایک سال قبل زیادہ تر تجارتی قسم کا ایک معاھدہ بمبئی کے انگریز گورنر Law کے ساتھ کیا گیا (Aitchison، ج ۶، عدد ۱)۔ تیسرے پیشوا بالا جی راؤ (۱۷۴۰ تا ۱۷۶۱ء) نے حکومت اپنے چچا زاد سدا شیوراؤ بھاؤ کو اور اپنی فوجوں کی سپہ سالاری اپنے بھائی رگھوناتھ راؤ کو تفویض کی، جو رگھوبا کے نام سے زیادہ معروف ھے۔ اس کے اقتدار کا زمانہ مرہٹہ قوت کی تیز رفتار وسعت کے لحاظ سے ممتاز ہوا؛ اس کی فوجیں ملک کو کرناٹک سے پنجاب تک تاراج کرتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت [رک بآں] میں عبرتناک شکست کھائی۔ اس سے پہلے ۱۷۵۵ء میں ایک قرار داد کی بنا پر ایک انگریز مرہٹہ مہم نے بحری قزّاقوں کے سردار انگریا کا قلع قمع کیا، جس کی غارت گری سے ساحل کونکَن کی جہازرانی برابر خطرے میں رھتی تھی۔ اس مہم کے خاتمے پر ایک معاھدہ (Aitchison، ج ۶، عدد ۳) پیشوا کے ساتھ ھوا، جس میں مرہٹہ عملداری سے ولندیزی سوداگروں کو نکال دینے کی بھی شرط تھی۔ اس پیشوا کی موت کے بعد جھگڑے اٹھ کھڑے ھوے جنھوں نے مرھٹوں کی طاقت کو بہت کمزور کر دیا۔ اب اقتدار چند مرہٹہ سپہ سالاروں، یعنی گوالیار کے سندھیا، ناگپور کے بھونسلا، اندور کے ھُلکر، اور بڑودہ کے گائیکوار کے پاس منتقل ھو گیا۔

مادھو راؤ کی حکومت کے دوران میں (۱۷۶۱ تا ۱۷۷۲ء) سندھیا نے ۱۷۷۱ء میں ایک بار اور مرہٹہ اثر شمالی ھندوستان میں قائم کر دیا، اور شاہ عالم مغل شہنشاہ، جس نے انگریزوں سے منہ موڑ لیا تھا، مرھٹوں کے ھاتھ میں کٹھ پتلی بن کے رہ گیا۔ مادھوراؤ کا جانشین اس کا بھائی نرائن راؤ (۱۷۷۲ تا ۱۷۷۳ء) ھوا، جو اپنے چچا رگھوبا کی شہ سے قتل کیا گیا۔ ایک زمانے تک مرھٹے دو معاندانہ صفوں میں بٹے رھے۔ ایک طرف رگھوبا کے حامی تھے، جو پیشوائی کا مدّعی تھا۔ دوسری طرف نانا فرنویس کی سر براھی میں دربارِ پونا کا فریق تھا،

جو مادھوراؤ نرائن (۱۷۷۴ تا ۱۷۹۵ء) کے حق وراثت کا مؤیّد تھا۔ جو نرائن راؤ کا بیٹا تھا اور اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا ۔ حکومت بمبئی نے رگھوبا کے دعووں کی حمایت میں جو اقدامات کیے ان کی بنا پر انگریزوں اور مرہٹوں میں جنگ چھڑ گئی، جس کا خاتمہ وارن ہیسٹنگز کی کد و کاوش کی بدولت ۱۷۸۲ء میں صلحنامۂ سالبائی پر ہوا ۔ یہ صلح، جس نے واقعۃً سندھیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا، بیس برس کے لیے انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان امن و امان کی ضامن رھی ۔ مرہٹہ تاریخ اب نانا فرنویس اور سندھیا کے درمیان ایک کشمکش بن کے رہ جاتی ھے، چنانچہ نانا فرنویس (بالاجی جنادھن) تو پیشوا کی گرتی ھوئی طاقت کو سہارا دینے کی کوشش کر رھا تھا اور ماھاداجی سندھیا پیشوا پر قابو پانے کی تگ و دو میں لگا تھا، تاکہ اسے اپنی دست درازی کی آڑ کے طور پر استعمال کرے۔

ساتواں اور آخری پیشوا باجی راؤ دوم (۱۷۹۶ تا ۱۸۱۸ء) تھا ۔ گورنر جنرل ولزلی Marquis Wellesley کے زمانے میں جب نانا فرنویس ۱۸۰۰ء میں فوت ھوا تو ھلکر اور دولت راؤ سندھیا کے درمیان پونا میں اقتدار اعلٰی کے لیے کشمکش شروع ھو گئی ۔ دولت راؤ ۱۷۹۴ء میں ماھاداجی سندھیا کا جانشین ھوا تھا ۔ اس کشمکش کے درمیان پیشوا بسین بھاگ گیا، جہاں اس نے اپنے کو انگریزوں کی حفاظت میں دے دیا ۔ ۱۸۰۲ء میں عہدنامۂ بسین (Aitcheson، جلد ۶، عدد ۳) کی رو سے ولزلی نے اپنے کو پیشوا کا محافظ قرار دیا، جو ایک امدادی ''فوج'' رکھنے اور انگریزوں کو اپنے اور دوسرے ھندوستانی راجاؤں کے ساتھ تنازعات میں ثالث بنانے پر راضی ھو گیا تھا ۔ یہ چیز لازمی طور پر مرہٹوں کے دوسرے سرداروں کے لیے قابل قبول نہ ھوئی ۔ بد قسمتی سے باجی راؤ ایک بے اصول سر چڑھے ترمبک جی کے زیر اثر آ گیا ۔ ترمبک گائیکوار کے ایلچی کو قتل کرانے میں خفیہ طور پر شریک تھا، جو انگریزوں کی طرف سے ذاتی حفاظت کی ضمانت پر پونا بلایا گیا تھا ۔ جب ریزیڈنٹ الفنسٹن Elphinstone نے اطلاع دی کہ پیشوا انگریزوں کے خلاف مرہٹہ طاقت کو منظم کرنے کے لیے ساز باز کر رھا ھے تو پیشوا سے جبراً صلحنامۂ پونا (۱۸۱۷ء) پر دستخط کرا لیے گئے، جس نے بسین کے عہدنامے کی تکمیل کر دی، لیکن باجی راؤ کے وعدے نقش بر آب تھے؛ کیونکہ جب لارڈ ھیسٹنگز نے مرہٹوں کے کچلنے کے لیے قدم بڑھایا تو پیشوا نے بغاوت کر دی اور برطانوی ریزیڈنسی کو تاخت و تاراج کر دیا ۔ آخر کار اس کی فوجوں نے شکست کھائی اور پیشوائی ختم کر دی گئی ۔ تاھم باجی راؤ کو وظیفہ دے کر بٹھور [ضلع کان پور] میں رھنے کی اجازت دی گئی، جہاں وہ ۱۸۵۱ء میں مر گیا ۔ اس کا متبنّٰی نانا صاحب ۱۸۵۸ء میں روپوش ھو گیا.

مآخذ: (۱) C.U. Aitchison: Treaties, Engage-ment, and Sanads وغیرہ، ج ۶، ۱۹۰۹ء؛ (۲) Cambridge History of India، ج ۵، باب ۱۳ و ۲۲ اور ۲۳؛ (۳) T.E. Colebrooke: Life of Mountstuart Elphinstone، ۲ جلد، ۱۸۸۴ء؛ (۴) M. Elphinstone: Report on the Territories Conquered from the Paishwa، ۱۸۳۸ء؛ (۵) G.W. Forrest: Selections from the letters etc. preserved in the Bombay Secretariat، Maratha Series، ۱۸۸۵ء؛ Home Series، ۱۸۸۷ء؛ (۶) J.H. Gense و D.R. Banerji: The Third English Embassy to Poona، ۱۹۳۴ء؛ (۷) J.C. Grant Duff: A History of the Mahrattas، ۲ جلد، ۱۹۲۱ء؛ (۸) V.V. Khare: (ایتہاسک لیکھا سنگرھا) Aitihāsik Lekha Sangraha، ۱۲ جلد؛ (۹) A. Macdonald: Memoir of the Life of

the late Nana Furnuwees، ۱۸۰۱ء؛ (۱۰) ایم - ایس مہتہ : Lord Hastings and the Indian States، ۱۹۳۰ء؛ (۱۱) D.B. Parasnis : اتہاس سنگرھا، (Itihās Sangraha)، ۷ جلد، مطبوعات بھارت اتہاس سنشودھک منڈل، پونا؛ (۱۲) V.K. Rajwade : *Marāthānchyā Itihāsānchi Sādhānen*، ۲۲ جلد؛ (۱۳) G.S. Sardesai : مرہٹی ریاست، ۸ جلد؛ (۱۴) *Selections from the Peshwa's Daftar*، طبع (G.S. Sardesai)، ۴۵ جلد؛ (۱۵) S. Sen : *The Administrative System of the Marathas*، ۱۹۲۳ء۔

(C. COLLIN DAVIES)

⊗ **پیلا** : شارل پیلا Charles Pellat، بیسویں صدی کا ایک معروف فرانسیسی عربی‌دان مستشرق، جو ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۶۹ء میں پچپن سال کی عمر میں فوت ہوا - فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ پیرس کے مدرسۂ السنۂ شرقیہ میں عربی کا استاد مقرر ہوا - ۱۹۵۶ء میں پیرس یونیورسٹی میں عربی زبان اور حضارت کا پروفیسر مقرر ہوا - ۱۹۵۴ء میں جب پروفیسر لیوی پرووانسال Levi-Provençal نے پیرس میں رسالۂ *Arabica* کی بنیاد ڈالی تو شارل پیلا اس کی مجلس ادارت کا رکن قرار پایا - اس نے اس رسالے میں عربی ادب پر بہت سے قابل قدر مقالے لکھے اور بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے - جب ۱۹۵۶ء میں پروفیسر لیوی پرووانسال نے وفات پائی تو پروفیسر پیلا اس کی جگہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے فرانسیسی ایڈیشن کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور وہ اپنی وفات تک اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا - پروفیسر پیلا نے الجاحظ [رک بآں]، اس کی مؤلفات اور اس کے عہد کے علمی حالات کو اپنی تحقیقات کا خاص موضوع بنایا تھا - چند سال سے وہ المسعودی کی مروج الذھب کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف تھا، لیکن موت نے اسے اس علمی منصوبے کی تکمیل کی مہلت نہ دی اور وہ اس کی ایک جلد سے زیادہ شائع نہ کر سکا - اس کے علاوہ پروفیسر موصوف کی حسب ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں :-

(۱) الجاحظ : کتاب التربیع و التدویر، بتحقیق و مقدمہ، دمشق ۱۹۵۶ء؛ (۲) *Langue et Litterature arabes*، پیرس ۱۹۵۲ء، جس کا موضوع عربی زبان اور اس کا ادب ہے؛ (۳) *La Milieu Basrien et la Formation de Gahiz*، پیرس ۱۹۵۳ء، جس میں الجاحظ کے زمانے کے بصرے کا ایک دلچسپ علمی اور معاشرتی مرقع پیش کیا گیا ہے؛ (۴) *Le Livre de la Couronne*، پیرس ۱۹۵۴ء، جو الجاحظ کی کتاب التاج کا فرانسیسی ترجمہ ہے۔

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱ : ۳۲۶، قاہرہ ۱۹۶۴ء؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **پینانگ** : (یا پلاوپینانگ)، ملیشیا فیڈریشن کا ایک جزیرہ، عرض بلد ۵°، ۲۴′ شمالی اور طول بلد ۱۰۰°، ۲۱′ مشرقی پر واقع ہے، رقبہ ۲۷۶ کیلومیٹر مربع ہے - اندرون ملک سے اسے ایک آبنائے جدا کرتی ہے، جو تین سے سولہ کیلومیٹر تک چوڑی ہے - پینانگ کا شہر شمال مشرقی راس پر تعمیر ہوا ہے، جہاں سے ملیشیا کا ساحل چار کیلومیٹر دور ہے؛ سرکاری نام جزیرۂ پرنس آف ویلز اور جارج ٹاؤن کبھی مقبول عام نہیں ہوے اور صرف سرکاری دستاویزات میں مرقوم ہیں - یہ جزیرہ ۱۷۸۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کیدہ Kĕdah کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض کپتان لائٹ Light نے بروے معاہدہ حاصل کیا اور اسی سال نوآبادی کی بنیاد رکھی - اسے امید تھی کہ یہ مقام مشرقی سمندروں کی منڈی بن جائے گا - یہ اس وقت تک

تقریباً غیر آباد تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد ایک تعزیری بستی بنا دیا گیا ۔ یہ ۱۸۰۵ء تک ہندوستان کا کالا پانی رہا ۔ ۱۸۰۵ء میں اسے جداگانہ پریذیڈنسی (صوبہ) بنا دیا گیا ۔ ۱۸۲۶ء میں جب سنگاپور اور ملاکا اس کے ساتھ ملائے گئے تو پینانگ ہی دارالحکومت رہا ۔ ۱۸۳۷ء میں سنگاپور صدر مقام قرار دیا گیا ۔ ۱۸۶۷ء میں ایک نئی شاہی نو آبادی (Strait Settlement) بنائی گئی تو پینانگ کو ایک ریذیڈنٹ کے زیر انتظام کر دیا گیا ۔ ۱۹۶۰ء میں ملیشیا کو آزادی ملنے کے بعد پینانگ کی نو آبادی فیڈریشن میں شامل ہو گئی ۔ پینانگ کی بندرگاہ بہت عمدہ ہے اور جہازوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے ۔ اس جزیرے میں اب ہر جگہ آمد و رفت کے راستے بن گئے ہیں ۔ آبادی نے تیزی سے ترقی کی ہے ۔ اس میں زیادہ‌تر چینی اور تامل ہیں، گو ملاویوں کی خاصی نمائندگی ہے، ان میں سے اکثر سابق جزیرہ‌نمائے ملایا اور سماترا سے آئے ہوے لوگ ہیں ۔ یہ سب شافعی المذہب مسلمان ہیں ۔ صوبۂ ولزلی Wellesley کا قطعہ گو ملک کے بڑے خطّے کے سامنے واقع ہے مگر پینانگ کی نو آبادی کا ایک حصہ ہے ۔ یہ قطعہ ۱۸۰۰ء میں کیدہ کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض حاصل کیا گیا؛ اس میں ایک اور ضلع بھی شامل ہے، جو ۱۸۷۴ء میں پیراک کے سلطان سے خریدا گیا تھا ۔ پینانگ میں زمین کی کاشت خوب ہوتی ہے ۔ یورپی اور چینی لوگ بڑی بڑی املاک کے مالک ہیں ۔ قریبی زمانے تک ایک دوسرا قطعۂ زمین جو ملک کے بڑے حصے میں ہے اور اس سے ملحق جزائر جو ڈنڈنگس کے نام سے مشہور ہیں، پینانگ کے علاقے میں داخل تھے ۔ یہ قطعہ ریاست پیراک نے حوالے کیا تھا اور اب اسی کو واگذار کر دیا گیا ہے ۔ پینانگ ملیشیا فیڈریشن میں شامل ہونے کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہا ہے ۔

مآخذ: (۱) *Memoir of Captain Francis Light*، در *Journal Straits Branch R. A. S.*، عدد ۲۸، ص ۱ ببعد؛ (۲) F.A. Thomas : *A school geography and history of Penang*، سنگاپور ۱۹۰۶ء؛ (۳) *Malaya*، طبع R.O. Winstedt، لنڈن ۱۹۲۳ء؛ [(۴) *World Muslim Gazetteer*، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی، تاریخ ندارد].

(R. A. KERN)

زیادات و تصحیحات

زیادات

جلد ۵

صفحہ	عمود	سطر	زیادات
۲۳	۱	۲۷ کے بعد	بَاینْدَر : رکَ بہ بیَنْدِر

تصحیحات

جلد ۱

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۸۳۲	۱	۲۱	۲۵ مارچ	۲۶ مارچ
۹۹۹	۲	۷	(م ۵ رجب ۲۱۴ھ / ۹ ستمبر ۸۲۹ء)	(ولادت : رجب ۲۱۳ھ / ستمبر ۸۲۹ء؛ وفات : ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء)

جلد ۲

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۲۳۸	۲	۱۰	۳ ذوالحجّة	۸ ذوالحجّة
۶۸۶	۲	۳	معانعت	ممانعت

جلد ۴

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۹۹۱	۲	۲۵	چاٹ	چھت

جلد ۵

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۱۷	۱	۸	ہِرزْگ	ہِرزِگ
۶۳	۲	۲۰	نجي	نِجي
۹۳	۱	۱۱	بِہیة	بَہیة

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۹۹	۲	۱۵	Devine	Divine
۱۲۹	۱	۳۱	عمرِ	عمر نے
۱۸۰	۲	۱۹	شبہ	شبہ
۱۹۶	۲	۳۰	نمازا	نماز
۲۱۳	۲	۲۸	حفض	حفص
۲۲۳	۱	۲۷	دُرِ مکتون	دُرِ مکنون
۲۹۵	۲	۱۳ بعد	اس کے خاص معیّن معنی اس وقت واضح ہو سکتے ہیں جب استعمال کرنے والوں کے معاشرتی اور اداری حالات اور اصطلاحات کا علم ہو۔ زیادہ تر ایک مرکب لفظ کے آخری حصے کے طور پر (اون بیگی ''دس کا افسر'' دفعدار، آلتون اردو (Golden Horde) عثمانی اصطلاح سنجاق بے (بائی) وغیرہ یا بطور لقب جب کسی خاص نام کے ساتھ استعمال کیا جائے اس وقت یہ آخر میں بڑھایا جاتا ہے۔ برس بیگ، محمد بک، مؤنث خطاب بیگم [ارک بان] بیگ کے مرکب اضافی واحد متکلم کی ایک سادہ شکل ہے (بیگ ام ''میرے آقا'' اور اس کے بعد ''میری محترمہ'' قپ خان ام (خانم) جو اسی طرح کی ایک اضافی ترکیب ہے جو آگے چل کر مونث کے لیے مخصوص ہو گئی)۔	اس کے معنی اس وقت متعین ہوتے ہیں جب یہ لفظ کسی معاشرتی یا اداری اصطلاح میں، بالخصوص بطور لاحقہ، استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً آلتون اردو کا اون بیگی = دس کا افسر = دفعدار یا کارپورل Corporal، یا سلطنت عثمانیہ کا سنجاق بے یا سنجاق بای، وغیرہ) یا جب یہ کسی شخص کے نام کے ساتھ بطور لقب آتا ہے، مثلاً برس بیگ، محمد بے۔ لفظ بیگُم دراصل بیگ کا مؤنث واحد متکلم ہے (بیگ اَم = میرے آقا، لہٰذا بیگ اُم = میری آقا؛ قپ خانُم = خان۔ اُم بھی اسی طرح [خان کا] مؤنث واحد متکلم ہے)۔
۳۵۳	۱	۱۵	موہنجوڈارو	موہنجوڈارو (= مئن جو دڑو)
۴۰۰	۲	۸	بند کر دیے کے گئے	بند کر دیے گئے
۴۰۱	۱	۱	گاندھی جی	سوامی شردھانند
۴۳۷	۲	۲۲	کر دیا گیا	کر دیا
۴۶۹	۱	۱۷	سرجد	سرحد
۴۷۱	۱	۹	اختیارت	اختیارات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۴۷۵	۲	۵	ساڑے	ساڑھے
۴۷۹	۱	۹	انخمنین	انجمنین
۵۴۰	۲	۹	انجز	انجمن
۶۲۳	۲	۲	ارو	اور
۶۶۳	۲	۲۳	حطّے	خطّے
۶۷۹	۲	۱۹	ملتانی با بہاول پوری	ملتانی یا بہاول پوری
۷۳۸	۲	۱۰	خبر	خبر

علامات و رموز و إعراب

۱

علامات

*	مقاله، ترجمه از وا، لائڈن
⊗	جدید مقاله، براے اردو دائرۂ معارف اسلامیه
[ ]	اضافه، از ادارۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیه

۲

رموز

ترجمه کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجۂ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے :

= f., ff., sq., sqq.	ببعد	= op. cit.	کتابِ مذکور
= s. v.	بذیل مادّہ (یا کلمه)	= cf.	قب (قارِب یا قابِل)
= see ; s.	دیکھیے : کسی کتاب کے حوالے کے لیے)	= B. C.	ق.م (قبل مسیح)
		= d.	م (متوفّی)
= q. v.	رك به (رجوع کنید به) یا	= loc. cit.	محلّ مذکور
	رك بان (رجوع کنید بان) :	= ibid.	وهی کتاب
	وا کے کسی مقالے کے	= idem.	وهی مصنف
	حوالے کے لیے	= A. H.	ھ (سنه هجری)
= passim.	بمواضع کثیره	= A. D.	ع (سنه عیسوی)

۳

إعراب

(ا)

Vowels

فتحه (ـَ) = a

کسره (ـِ) = i

ضمّه (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل : āj kal)

ی = ī (سیم : Sīm)

و = ū (هارون الرشید : Hārūn al-Rashīd)

اے = ai (سیر : Sair)

(ج)

ـٍ = e کی آواز کو ظاهر کرتی هے (پن : pen)

ـٓ = o کی آواز کو ظاهر کرتی هے (مول : mole)

ـٗ = ü کی آواز کو ظاهر کرتی هے (گل : Gül)

وا = ö کی آواز کو ظاهر کرتی هے (کول : Köl)

ـ = ä کی آواز کو ظاهر کرتی هے (ارجب : ärädjäb

رجب : rädjäb)

ـ = علامت سکون یا جزم (بسمل : bismil)

طبع	------	اول
سال طباعت	------	۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء
مقام اشاعت	------	لاہور
ناشر	------	سید شمشاد حیدر، ایم اے، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور
طابع	------	مسٹر امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز)، ناظم مطبع
مطبع	------	پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
صفحات	------	۷۴۲

بارِ دوم

سال طباعت	------	۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء
مطبع	------	ادبستان ۔ ۴۳ ریٹی گن روڈ، لاہور

زیر نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف (نگران صدر شعبہ)

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE

Vol. V

Bozantiya -- Pinang

1390/1971

Reprint: 1425/2004